رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

محمد طفیل نمبر

جلد اوّل

شمارہ نمبر ۱۳۵

جولائی ۱۹۸۷ء

بانی

محمد طفیل

مدیر

جاوید طفیل

ادارۂ فروغ اردو ○ لاہور

قیمت جلد اول و دوم: ۲۰۰ روپے

ترتیب جلد اوّل

طلوع	محمد طفیل	

شخصیت

(۱) محمد طفیل (میری نظر میں)	میرزا ادیب	۱
(۲) ایک رودادِ رفاقت و محبت	احمد ندیم قاسمی	۱۶
(۳) نہ ادیب نہ شاعر اور سب کچھ	ڈاکٹر محمد باقر	۲۴
(۴) ہم قلم	کرشن چندر	۲۷
(۵) کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے	آغا بابر	۳۰
(۶) چُپ کی چادر	صادق حسین	۴۶
(۷) یادِ یارِ مہربان	منظور الٰہی	۵۱
(۸) محمد طفیل امٹ نقوش	احمد سعید	۵۹
(۹) ڈگریاں	احمد شریف	۶۷
(۱۰) محمد نقوش	مجتبیٰ حسین	۷۱
(۱۱) گرم دمِ جستجو	ڈاکٹر سلیم اختر	۷۳
(۱۲) طفیل صاحب کی یاد میں	فتح محمد ملک	۷۸
(۱۳) دھیما آدمی	بریگیڈیر صدیق سالک	۸۵
(۱۴) میرا بھائی، میرا دوست	ارشد میر	۸۸
(۱۵) فضول آدمی کا دوست	ستار طاہر	۹۶
(۱۶) محمد نقوش، نقشِ جاوداں	رضوان اللہ آروی	۹۹
(۱۷) محمد طفیل	حفیظ صدیقی	۱۱۵

(۱۸) طفیل صاحب کچھ یادیں	نور الحسن جعفری	۱۲۲
(۱۹) محمد طفیل، ادب کی تیسری دنیا کے بُت گر	رشید نثار	۱۲۸
(۲۰) وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ	جاوید طفیل	۱۳۰

غیر مطبوعہ تحریریں

۱۔ ناچیز	محمد طفیل	۱۴۹
۲۔ روزنامچہ	محمد طفیل	۱۹۹
۳۔ سفرنامہ	محمد طفیل	۳۴۵

نقوش اور اس کے اہم نمبر

۱۔ مجلاتی صحافت میں "نقوش" کا مقام	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۳۷۹
۲۔ طفیلِ نقوش	سید ضمیر جعفری	۳۸۳
۳۔ سلیوٹ	کرنل محمد خان	۳۸۷
۴۔ نقوش منزل بہ منزل	ڈاکٹر تحسین فراقی	۳۹۰
۵[1]۔ اردو افسانہ — نقوش کے آئینے میں ۱۹۵۲ء — ۱۹۷۴ء	ڈاکٹر سلیم اختر	۴۰۱
۶۔ نقوش کا غزل نمبر ۱۹۵۴ — ۱۹۶۰	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	۴۱۹
۷۔ نقوش، شخصیات نمبر ۱۹۵۵ — ۱۹۵۶	ڈاکٹر صدیق جاوید	۴۲۸
۸۔ منٹو، نقوش اور ہم	ڈاکٹر سلیم اختر	۴۳۷
۹۔ نقوش، مکاتیب و خطوط نمبر ۱۹۵۷ - ۱۹۶۸	عبدالقوی دسنوی	۴۴۸
۱۰۔ محمد طفیل کے نام	فکر تونسوی	۴۵۸
۱۱۔ نقوش کا لاہور نمبر	میرزا ادیب	۴۶۹
۱۲۔ نقوش کا آپ بیتی نمبر۔ محمد طفیل کا ایک بے مثل کارنامہ	ڈاکٹر انور سدید	۴۷۸

---

[1] نقوش کے مختلف نمبر جس ترتیب سے چھپے، مقالہ نگاروں کے مضامین بھی اُسی ترتیب سے شامل ہیں۔ (ادارہ)

نقوش ایوارڈ

۱۹۸۶ء

ڈاکٹر نجم الاسلام	تحقیق	۱۰ ہزار روپے
کبیر احمد جائسی	″	۷½ ہزار ″
	☆○☆	
ممتاز مفتی	افسانہ	۷½ ہزار ″
میرزا ادیب	″	۷½ ہزار ″
	☆○☆	
سید ضمیر جعفری	طنز و مزاح	۵ ہزار ″
	☆○☆	
ڈاکٹر آفتاب احمد	خاکہ	۵ ہزار ″
	☆○☆	
عبدالعزیز خالد	شاعری	۷½ ہزار ″

۱۳۔ نقوش اور مطالعہ غالب — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — ۴۹۰
۱۴۔ محمد طفیل اور نقوش کے اقبال نمبر — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — ۵۰۸
۱۵۔ دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا — ڈاکٹر تحسین فراقی — ۵۱۴
۱۶۔ نقوش کا ادبی معرکے نمبر — ڈاکٹر گیان چند — ۵۲۸
۱۷۔ نقوش کا میر انیس نمبر — کسریٰ منہاس — ۵۴۰
۱۸۔ نقوش کا رسولؐ نمبر — ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ — ۵۵۰
۱۹۔ نقوش اور محمد نقوش کتابیات — سید جمیل احمد رضوی — ۵۵۸

طلوع

شمارہ ۱۹ تا ۱۳۳ — محمد طفیل — ۵۹۱
۱۔ محمد طفیل اور نقوش عکس اور شخص (طلوع کی روشنی میں) — عبدالقوی دسنوی — ۷۴۲
۲۔ محمد نقوش کا اسلوبِ تحریر (طلوع اور خطوط کی روشنی میں) — اکبر حیدری کاشمیری — ۷۷۰

برادرم مکاتیبِ محمد طفیل (مدیرِ نقوش)

۱۔ آزاد جگن ناتھ ۸۵۱
۲۔ آصف علوی ۹۰۶
۳۔ آغا سرخوش ۹۰۱
۴۔ آل احمد سرور ۸۵۹
۵۔ آنند نرائن مُلّا ۸۶۸
۶۔ ابنِ انشاؔ ۸۶۳
۷۔ ابن حسن برنی ۹۱۰
۸۔ ابوالخیر مودودی ۸۶۴
۹۔ ابوالفضل صدیقی ۸۵۲
۱۰۔ ابو محمد سحر ۸۸۴
۱۱۔ اثر، جعفر علی خاں لکھنوی ۸۳۸
۱۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر ۸۳۶
۱۳۔ احمد جمال پاشا ۸۳۹
۱۴۔ احمد علی ۸۹۱
۱۵۔ احمد فاروقی خواجہ، ڈاکٹر ۸۵۳
۱۶۔ اختر الایمان ۸۶۲
۱۷۔ اختر انصاری ۸۶۱
۱۸۔ اختر اورینوی ۸۷۵
۱۹۔ اختر جمال، احسن علی خاں ۸۴۳
۲۰۔ ارتضیٰ زیدی ۹۱۰
۲۱۔ ارشد میر ۸۹۵
۲۲۔ اشفاق احمد ۸۱۰
۲۳۔ اعجاز حسین، سید، ڈاکٹر ۸۶۵
۲۴۔ اعظمی، خلیل الرحمٰن ۸۴۸
۲۵۔ افتخار حسین آغا ۷۹۴
۲۶۔ اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر ۷۹۶
۲۷۔ الطاف حسن قریشی ۸۴۶
۲۸۔ امتیاز علی عرشی ۸۸۰
۲۹۔ انتظار حسین ۸۴۱
۳۰۔ انصار ناصری ۸۱۵

۳۱۔ انور سدید ۸۰۳
۳۲۔ ایم۔ آر۔ کیانی ۸۷۴
۳۳۔ ایوب جاوید ۸۸۵
۳۴۔ بانو قدسیہ ۸۷۶
۳۵۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر ۸۹۰
۳۶۔ بشریٰ رحمٰن ۹۱۲
۳۷۔ بیگم طفیل ۸۲۹
۳۸۔ پروین فنا سید ۹۰۲
۳۹۔ پریم وار برٹنی ۹۱۴
۴۰۔ تمکین کاظمی ۸۹۱
۴۱۔ تنویر احمد علوی ۸۰۲
۴۲۔ جگر مراد آبادی ۸۷۷
۴۳۔ جمیل اختر خان ۹۱۴
۴۴۔ جمیلہ ہاشمی ۷۹۹
۴۵۔ جوش ملیح آبادی ۸۷۷
۴۶۔ جوگندر پال ۸۷۵
۴۷۔ جیلانی بانو ۸۳۳
۴۸۔ حافظ الدین ۸۴۷
۴۹۔ حامد حسن قادری ۸۸۹
۵۰۔ حجاب امتیاز علی ۸۵۶
۵۱۔ حسن جعفری سیّد ۹۱۵
۵۲۔ حفیظ جالندھری ۸۷۲
۵۳۔ حفیظ ہوشیارپوری ۸۷۰
۵۴۔ حیدر، ڈاکٹر ۸۱۱
۵۵۔ حیرت شملوی ۸۶۷
۵۶۔ خالد، عبدالعزیز ۸۴۹
۵۷۔ خدیجہ مستور ۸۸۸
۵۸۔ خلیق انجم، ڈاکٹر ۸۱۸
۵۹۔ خواجہ احمد عباس ۸۳۱
۶۰۔ خورشید خاور امروہوی ۸۹۷
۶۱۔ راجندر سنگھ بیدی ۸۸۸
۶۲۔ راجہ مہدی علی خاں ۸۲۶
۶۳۔ راز مراد آبادی ۸۸۲
۶۴۔ رشید احمد صدیقی ۸۷۹
۶۵۔ روشن صدیقی ۸۶۳
۶۶۔ ریاض احمد ۸۸۵
۶۷۔ زور، محی الدین ڈاکٹر ۸۸۰
۶۸۔ ساغر نظامی ۸۷۰
۶۹۔ ساقی (ایڈیٹر ساغر) ۷۹۸
۷۰۔ سبط حسن ۷۹۷
۷۱۔ سجاد احمد جان، جسٹس ۷۹۳
۷۲۔ سحر انصاری ۹۱۱
۷۳۔ سرفراز صاحبہ ۸۰۰
۷۴۔ سلطان رشک ۸۹۷
۷۵۔ سہیل عظیم آبادی ۸۵۵
۷۶۔ سیّد انور ۸۰۴
۷۷۔ شاہد احمد دہلوی ۸۳۵
۷۸۔ شریف الدین پیرزادہ ۸۴۵
۷۹۔ شکیلہ اختر ۸۴۲
۸۰۔ شور (علیگ) پروفیسر ۸۶۸
۸۱۔ شوق، سمت پرکاش ۸۰۲
۸۲۔ شوکت تھانوی ۸۵۲
۸۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر ۸۶۶
۸۴۔ شوکت صدیقی ۸۸۳
۸۵۔ شہاب الدین، خواجہ ۸۴۵
۸۶۔ شہاب، قدرت اللہ ۷۹۱
۸۷۔ صادق حسین ۸۴۳
۸۸۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، سید ۸۹۴
۸۹۔ ضیا احمد بدایونی ۷۹۸
۹۰۔ ضمیر جعفری، سیّد ۷۹۴
۹۱۔ طاہر فاروقی ۸۲۱
۹۲۔ طاہرہ اعظم ۹۱۲
۹۳۔ ضمیر اختر نقوی ۸۹۹
۹۴۔ عبدالرحمٰن چغتائی ۸۱۴
۹۵۔ عبدالرحیم چغتائی ۸۹۶
۹۶۔ عبدالقوی دسنوی ۸۰۹، ۹۱۶
۹۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر ۹۰۷
۹۸۔ عبدالماجد دریابادی، مولینا ۸۷۹
۹۹۔ عبدالمغنی، پروفیسر ۹۰۹
۱۰۰۔ عبدالواحد درانی ۹۰۰
۱۰۱۔ عدم، عبدالحمید ۸۷۶
۱۰۲۔ عذرا مسعود ۸۹۸
۱۰۳۔ عصمت چغتائی ۸۸۶
۱۰۴۔ علی عباس جلالپوری ۹۰۵
۱۰۵۔ علی عباس حسینی ۸۵۴
۱۰۶۔ عندلیب شادانی ۸۷۸
۱۰۷۔ غلام عباس ۸۸۳
۱۰۸۔ غلام مصطفیٰ ۸۴۱

۱۰۹- فاروقی، نثار احمد ۸۲۰
۱۱۰- فتح محمد ملک ۹۱۴
۱۱۱- فراق گورکھپوری ۸۷۲
۱۱۲- فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ۹۰۱
۱۱۳- فرہاد زیدی ۹۰۷
۱۱۴- فضل احمد کریم فضلی ۸۸۲
۱۱۵- فکر تونسوی ۸۶۹
۱۱۶- فیض احمد فیض ۸۷۱
۱۱۷- قاسمی، احمد ندیم ۸۳۸
۱۱۸- قرۃ العین حیدر ۸۲۲
۱۱۹- کرتار سنگھ دُگّل ۸۴۴
۱۲۰- کرشن چندر ۸۸۷
۱۲۱- کشور ناہید ۸۹۸
۱۲۲- کلیم الدین احمد ۸۶۱
۱۲۳- کنہیالال کپور ۸۰۶
۱۲۴- گیان چند، ڈاکٹر ۸۳۷
۱۲۵- لطیف الزمان خاں
۱۲۶- مالک رام ۸۲۳
۱۲۷- مجروح سلطان پُوری
۱۲۸- مجنوں گورکھپوری ۸۲۸
۱۲۹- مجید امجد ۸۷۱
۱۳۰- مجید ملک ۸۶۸
۱۳۱- مختار مسعود ۹۰۸
۱۳۲- محمد اکرام، شیخ ۸۲۶
۱۳۳- محمد باقر، ڈاکٹر ۸۵۳
۱۳۴- محمد جاوید اقبال، پروفیسر ۹۰۰
۱۳۵- محمد حسن، ڈاکٹر ۸۱۷
۱۳۶- محمد حمیداللہ (پیرس) ۹۰۵
۱۳۷- محمد خان کرنل ۸۱۳
۱۳۸- محمد نواز، سید ۹۰۶
۱۳۹- محمد یوسف قادری فاروقی ۸۸۶
۱۴۰- محمد یونس بھٹی (لندن) ۹۱۵
۱۴۱- محمود عالم قریشی ۸۸۴
۱۴۲- محمود ہاشمی ۸۷۴
۱۴۳- مختار زمن ۹۰۳
۱۴۴- مسعود حسن رضوی، سید ۸۷۸
۱۴۵- مسعود مفتی ۸۰۷
۱۴۶- مسیح الزماں ۸۴۴
۱۴۷- مشتاق احمد یوسفی ۸۹۴
۱۴۸- مشفق خواجہ ۸۵۰
۱۴۹- ممتاز شیریں ۸۸۱
۱۵۰- ممتاز مرزا ۹۰۴
۱۵۱- ممتاز مفتی ۷۹۱
۱۵۲- منظور الٰہی ۹۰۳
۱۵۳- مہندر ناتھ ۸۵۱
۱۵۴- نارنگ، گوپی چند ۸۱۵
۱۵۵- نذیر احمد پرنسپل، ڈاکٹر ۸۹۴
۱۵۶- نعیم صدیقی ۸۵۶
۱۵۷- واجدہ تبسم ۸۵۵
۱۵۸- وحید قریشی، ڈاکٹر ۸۶۵
۱۵۹- وزیر آغا ۸۵۰
۱۶۰- ہاشم رضا، سیّد ۸۴۹
۱۶۱- ہاشمی، رفیع الدین ۸۹۹
۱۶۲- یوسف حسن، حکیم ۸۶۰
۱۶۳- یوسف حسین خاں، ڈاکٹر ۸۹۰
۱۶۴- نامعلوم ۹۱۶

ترتیب جلد دوم

چند کرم فرما (انتخاب)

محمد طفیل

(۱) منٹو صاحب ۹۱۹ (۲) شوکت صاحب ۹۴۱ (۳) جگر صاحب ۹۵۳ (۴) مدیر نقوش ۹۷۱
(۵) نیاز صاحب ۹۹۶ (۶) جوش صاحب ۱۰۱۳ (۷) حکیم صاحب ۱۰۷۱ (۸) شاہد احمد دہلوی ۱۱۴۰

محمد طفیل اور ان کے خاکے

(۱) شخصیت نگار کی تلاش	ممتاز مفتی	۱۱۵۲
(۲) ایک جدید شخصیت نگار	مجنوں گورکھپوری	۱۱۵۸
(۳) طفیلیات	ڈاکٹر محمد حسن	۱۱۶۱
(۴) محمد طفیل کے خاکے اور فنِ خاکہ نگاری	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	۱۱۶۵
(۵) صاحب سے مجی تک (طفیل صاحب کی خاکہ نگاری پر ایک نظر)	میرزا ادیب	۱۱۹۴
(۶) نقوش کے نقاش	شوکت تھانوی	۱۲۱۲
(۷) محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں تخلیقی آگہی	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۲۱۹
(۸) اِکلو تا جِن	ڈاکٹر طارق عزیز	۱۲۲۷

انتظاریہ

(۱) میرا بھتیا	شکیلہ اختر	۱۲۳۱
(۲) محمد طفیل	غلام رسول ازہر	۱۲۵۵
(۳) نصف صدی کا قصہ	محمود عالم قریشی	۱۲۶۲

انتخاب

(رسائل، اخبارات، تعزیتی تقریبات، منظوم نذرانہائے عقیدت، ۵ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد)

(۱) طفیل بھائی کا آخری سفر	اختر جمال	۱۳۰۹
(۲) محمد طفیل	مالک رام	۱۳۲۰
(۳) طفیل کی یاد میں	آل احمد سرور	۱۳۲۳
(۴) محمد طفیل ـــ وہ موت میں بھی نصیبے ور نکلے (بی۔ بی۔ سی۔)	رضا علی عابدی	۱۳۲۶
(۵) نقوشِ محترم (جنگ لاہور، ۸ جولائی ۱۹۸۶ء)	بشریٰ رحمٰن	۱۳۲۸
(۶) زندہ کون رہتا ہے اور مرتا کون ہے! (جنگ لاہور، ۹ جولائی ۱۹۸۶ء)	عبدالقادر حسن	۱۳۳۱
(۷) طفیل اور نقوش، من تو شدم، تو من شدی (مشرق لاہور ۱۰ جولائی ۸۶ء)	انتظار حسین	۱۳۳۳
(۸) محمد طفیل کی اپنے بارے میں آرا (جنگ راولپنڈی، ۱۴ جولائی ۱۹۸۶ء)	قدرت اللہ شہاب	۱۳۳۵

(۹) محمد طفیل کے خطوط بنام ممتاز مفتی — مرتبہ قدرت اللہ شہاب ۱۳۳۹
(۱۰) اوکھے لوگ — ممتاز مفتی ۱۳۴۱
(۱۱) A ONE MAN INSTITUTION ۱۳۴۲
(DAWN KARACHI, 6 JULY 1986)
(۱۲) MOHAMMAD TUFAIL THE LEGEND THAT WAS. ۱۳۴۲
(DAWN KARACHI JULY10, 1986)
(۱۲) محمد طفیل - ادبی ریفرنس (دائرہ اسلام آباد، ۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء) ۱۳۴۶
(۱۳) محمد طفیل، موجودہ دور کی ناقابلِ فراموش شخصیت (پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی، ۱۵ جولائی ۱۹۸۶ء) ۱۳۵۸
(۱۴) موت کی آغوش میں ایک اور سفینہ ڈوب گیا (رائٹرز بک کلب لاہور، ۱۹ جولائی ۱۹۸۶ء) جمیلہ ہاشمی ۱۳۶۴

منظومات

(۱) محمد طفیل "نقوش" — عبدالعزیز خالد ۱۳۶۷
(۲) بآں گروہے کہ از ساغرِ وفا مستند — غلام رسول ازہر ۱۳۶۸
(۳) محمد طفیل — سید عطا حسین کلیم ۱۳۶۹
(۴) پیشوائی — جمیل ملک ۱۳۷۰
(۵) محمد طفیل مدیرِ نقوش کی یاد میں — طاہر شادانی ۱۳۷۲
(۶) محمد طفیل نقوش — ڈاکٹر اقبال سرہندی ۱۳۷۴
(۷) نذرِ نقوش — رزاق افسر ۱۳۷۶
(۸) مجھے محمد نقوش کہتے — ماجد صدیقی ۱۳۷۷
(۹) محمد طفیل — نذیر احمد ناظر ۱۳۷۹
(۱۰) محمد نقوش کے لیے ایک نظم — سلمان سعید ۱۳۸۰
(۱۱) تیرے دم سے تھا فروزاں دیدۂ کلک و قلم (اردو) — بشیر حسین ناظم ۱۳۸۱
(۱۲) شو جوان وِ ڈوان طفیلؒ ہیسی (پنجابی) — بشیر حسین ناظم ۱۳۸۲
(۱۳) سوزِ دل (فارسی) — بشیر حسین ناظم ۱۳۸۴
(۱۴) علیٰ اِرتحالِ الطفیل (عربی) — بشیر حسین ناظم ۱۳۸۵
(۱۵) TO TUFAIL — بشیر حسین ناظم ۱۳۸۶
ترجمہ
(۱۶) کیتا عشقِ رسولؐ دا حق پورا — کیپٹن ڈاکٹر محمد مکرم بشیر ۱۳۸۷
(۱۷) قطعۂ تاریخِ رحلت — تنویر بخاری ۱۳۸۹
(۱۸) قطعاتِ تاریخ بروفات جناب محمد طفیل — علی احمد جلیلی ۱۳۹۰
کسریٰ منہاس ۱۳۹۱

قطعات تاریخ

(۱) شان الحق حقی ۱۳۹۵
(۲) عبدالصمد صارم ۱۳۹۵
(۳) مغیث الدین فریدی ۱۳۹۵
(۴) سید عارف محمود مہجور رضوی ۱۳۹۶

(۵) صاحبزادہ خضر عباسی نوشاہی ۱۳۹۶ (۶) محمد عالم مختارِ حق ۱۳۹۷
(۷) محبوب احمد تقابل ۱۳۹۸ (۸) محمد شریف بگل ۱۳۹۸

مادہ ہائے تاریخ وفات

(۱) صاحبزادہ خضر عباسی نوشاہی ۱۳۹۹ (۲) میاں سعید الرحمٰن ۱۳۹۹
(۳) صاحبزادہ خضر عباسی نوشاہی ۱۴۰۰ (۴) میاں سعید الرحمٰن ۱۴۰۰

اشاریۂ نقوش مرتبہ سید جمیل احمد رضوی ۱۴۰۱

پہلا حصہ شمارہ ۱ تا ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء - مارچ ۱۹۵۰ء

ابواب کی ترتیب

(۱) مقالات ۱۴۰۸
(۲) نظمیں، غزلیں ۱۴۱۳
(۳) افسانے، ڈرامے ۱۴۲۵
(۴) خاکے، طنز و مزاح ۱۴۳۰
(۵) سمپوزیم ۱۴۳۲
(۶) متفرقات ۱۴۳۴

دوسرا حصہ شمارہ ۱۹ تا ۱۳۳ اپریل ۱۹۵۱ء - ستمبر ۱۹۸۶ء

(۱) مقالات ۱۴۳۶
(i) دینی مقالات ۱۴۳۶ (ii) ادبی مقالات ۱۴۵۱
(۲) منظومات ۱۵۰۳
(i) حمد و نعت ۱۵۰۳ (ii) نظمیں، غزلیں ۱۵۲۱
(۳) شخصیات (بشمول آپ بیتی) ۱۶۵۹
(۴) مکاتیب ۱۶۸۵
(۵) افسانے، ڈرامے (بشمول ناولٹ) ۱۷۳۷
(۶) خاکے، طنز و مزاح ۱۷۸۰
(۷) سمپوزیم ۱۷۹۴
(۸) رپورتاژ ۱۷۹۸
(۹) سفرنامہ ۱۸۰۰
(۱۰) انٹرویو ۱۸۰۲
(۱۱) متفرقات ۱۸۰۴

جاوید طفیل ایڈیٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہردم میرے پاس تھے مگر میں ان کے پاس نہیں تھا۔
آج وہ مرحلہ بھی طے ہُوا، میں اُن کے قدموں میں موجود تھا۔

خواب میں کوئی نورانی صورت مجھے اُڑائے لے جا رہی تھی۔ پہلے وہ مجھے خانہ کعبہ
لے گئی۔ وہاں کے سب آثار دکھائے۔ چاروں طرف گھمایا۔

اس کے بعد وہ ہستی مجھے مسجد نبویؐ لے گئی۔ مسجد نبویؐ میں گھمایا۔ معاً ایک اور ہستی
نمودار ہوئیں، انھوں نے بتایا؛

آپ کے ساتھ رسولِ عربیؐ ہیں!

دھیان میں آیا مجھ سے مخاطب حضرت علیؓ ہیں۔

اس کے بعد جاگ اٹھا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا، پلنگ ہل رہا تھا، خوف تھا مگر
سکون آمیز خوف!

مجھے زندگی بھر سچے خواب آتے رہے۔ میری زندگی میں خوابوں کو بڑا عمل دخل ہے
مگر یہ کیسے یقین کر لُوں کہ جو کچھ دکھایا گیا اور بتایا گیا وُہ سچ تھا!

زندگی میں پہلی بار اپنے خواب کے سچّے ہونے پر متذبذب ہُوں — اِس لیے کہ میں
تو گنہگار انسان ہُوں — اتنا گنہگار کہ رُوئے زمین پر اور کوئی نہ ہوگا!

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلّم ہردم میرے ساتھ تھے، مگر میں اُن کے پاس نہ تھا۔
آج وہ مرحلہ بھی طے ہوا۔
میں اُن کے قدموں میں موجود ہُوں۔

محمد طفیل

اِس شمارے میں

۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو والدِ محترم کی اچانک وفات پر میں حیران و پریشان رموزِ قدرت کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ یہ بات مجھ پر عیاں ہُوئی کہ نقوش ہی تو ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہے — والدِ محترم کی ۳۵ سالہ ریاضت کا نتیجہ ہماری شناخت اور پہچان! اِس طرح ناقابلِ یقین قیمت کی ادائیگی کے بعد نقوش کی ذمہ داری میری طرف منتقل ہُوئی۔

آج میں ایک ایسے شخص پر نمبر پیش کر رہا ہُوں جس نے زندگی بھر قابلِ ذکر نمبر چھاپے اور ہر موضوع کا حق ادا کیا، سب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ایسا نمبر صرف نقوش ہی چھاپ سکتا تھا۔ میری ذمہ داری دوہری ہے، مجھ پر دو قرض واجب ہیں، ایک اردو ادب کی اِس نمایاں شخصیت کا حق ادا کرنے کا اور دوسرا ایک کم علم بیٹے کا اپنے والد کو قابلِ ذکر انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا۔ اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وہ پیشگوئی بھی پُوری ہوگئی جو انہوں نے کوئی ایک تہائی صدی پہلے ۱۹۵۶ء میں شخصیات نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کی تھی:

> ”اب صرف ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔
> اِس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا، کئی ہوں گے، عجب
> نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔“

میں اللہ تعالیٰ کی رحمت پر شاکر ہُوں، اسی لیے ہر دم اُسی سمت میں محوِ سفر ہُوں جو سمت والدِ محترم نے متعین کی تھی۔

جاوید طفیل

محمد طفیل (میری نظر میں)

میرزا ادیب

[یہ خاکہ طفیل صاحب کے اُس روز تک محیط ہے جب وہ اپنی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں منتقل ہوئے تھے۔

آج طفیل صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر وہ اپنی زندگی میں جو کچھ تھے اس کی کچھ زندہ جھلکیاں اس تحریر میں دکھائی گئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں مرحوم و مغفور کے کردار کو سمجھنے کے لئے یہ جھلکیاں اہم رول ادا کرتی ہیں۔

طفیل صاحب نے اپنی زندگی کے بقیہ شب و روز میں کئی بڑے معرکے کے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور سب سے بڑا اور ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ "رسولؐ نمبر" ہے لیکن "نقوش" کے اس غیر فانی نمبر کی تعمیر و تشکیل میں سب سے نمایاں حصہ طفیل صاحب کی اُس مسلسل جد و جہد کا ہے جس کا ذکر بار بار اِس خاکے میں کیا گیا ہے۔

یہ جد و جہد ہی اُن کے سارے کارناموں کا سرچشمہ ٹھہرتی ہے۔

یہ خاکہ میں نے بالاقساط لکھا تھا اور ہر قسط طفیل صاحب کی نظروں سے گزر چکی ہے۔ انہوں نے یہاں اپنے قلم سے کوئی ترمیم نہیں کی تھی۔ کہیں کہیں یہ ضرور کیا تھا کہ حقیقتِ حال کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

بس میں نے سارے مضمون میں صرف تین چار سطریں تبدیل کی تھیں۔

۱۹ر مئی ۱۹۸۷ (م ۔ ا)

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے کسی مضمون میں ایک بڑا خوبصورت اور وجد آور فقرہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا میں بعض لوگ فساد پیدا کرنے کے لیے آتے ہیں اور بعض اولاد۔ یہ بات یا مقولہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ مگر شاید اس میں عمومی نوعیت کی سچائی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض لوگ جو دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ فساد اور اولاد کے علاوہ بھی بہت کچھ پیدا کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ یہ لوگ اِن دو مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ اور بھی کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی یہاں موجود ہوتے ہوں جو فساد اور اولاد میں سے صرف ایک نعمت کو اپنے حق میں جائز سمجھتے ہوئے اپنی کوشش اور توجہ کسی اور قسم کی پیداوار پر بھی صرف کر دیں اور اپنے پیارے دوست محمد طفیل کو بھی لوگوں کے اسی گروہ سے وابستہ گردانتا ہوں۔

طفیل صاحب کو فساد انگیزی سے نہ تو کوئی تعلق ہے اور نہ دلچسپی البتہ اولاد انگیزی' میں انہوں نے ضرور اچھی خاصی دلچسپی لی ہے۔

اور اس ضمن میں اُن چار[1] نوجوانانِ رعنا کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن کے قد و قامت میں فقط انچوں کا فرق ملتا ہے اور یہ نوجوان جو اپنی خوش خلقی کے لحاظ سے ماں باپ ہی نہیں باپ کے وسیع طبقۂ احباب کی آنکھ کا بھی تارا ہیں۔ طفیل صاحب منہ میں سونے، چاندی حتیٰ کہ پیتل کا چمچہ بھی لیے پیدا نہیں ہوئے تھے مگر ان کا منہ خالی بھی نہیں تھا۔ اس میں ایک لٹّا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ کھولا گیا تو اس میں ان کاموں کی فہرست درج تھی جو انھیں بڑے ہو کر انجام دینا تھے اور انجام دینا ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کاموں کی اس طویل فہرست کے وسط میں سُرخ سیاہی سے دو لفظ لکھے ہوئے پائے گئے تھے اور یہ دو لفظ تھے۔ "خاکہ نگاری"۔ کہنے والوں کا یہ بیان اس حد تک سو فی صد درست ہے کہ خاکہ نگاری کے لفظوں کو سرخ سیاہی سے لکھا گیا تھا اور میری اس معاملے میں دلیل یہ ہے کہ سرخی علاوہ اور پہلوؤں کے شوخی و شرارت کی بھی علامت ہے اور طفیل صاحب نے اپنی سات کتابوں میں لکھے ہوئے خاکوں کی شوخی سے ثابت کر دیا ہے کہ کاتبِ تقدیر نے جو ان کی خاکہ نگاری کو سُرخ سیاہی سے ظاہر کیا ہے تو ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر کاتبِ تقدیر کا یہ منشا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان سرخ خاکوں کا مصنف خود ہمیشہ سنجیدہ رہے اپنی کسی حرکت سے بھی شوخی کا اظہار نہ کرے۔ اسی لیے تو اس نے سرخ لفظوں کے اردگرد کالی سیاہی کے حروف اجاگر کر دیے تھے۔

طفیل صاحب شوخ زبان، بہت ہی کم ہوتے ہیں لیکن "شوخ قلم" ہمیشہ رہتے ہیں۔ لگتا ہے شوخیوں کا جتنا خزانہ وہ مختلف طریقوں اور وسیلوں سے جمع کر سکے ہیں اسے انھوں نے اپنے قلم کیلئے وقف کر دیا ہے مگر اپنی زبان کو اس خزانے کی وراثت سے عاق کر دیا ہے۔ وہ شوخ طبعی کا بھی دل کھول کر مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ان کی یہ شوخ طبعی ایک ایسی شہزادی ہے جسے متانت کے کالے دیو نے اپنے محل میں قید کر رکھا ہے۔

جو حضرات طفیل صاحب کے قریب رہے ہیں اُن کا بیان ہے کہ ان کا چہرہ کیفیت آفرینی میں بہت حد تک نہیں تو ایک معقول حد تک ناقابلِ اعتماد ہے۔ ان کے چہرے کی کیفیت بس دھوپ چھاؤں ہی کا نقشہ پیش کرتی رہتی ہے۔ ابھی دھوپ چمک رہی ہے اور ابھی دھوپ کی ساری چمک دمک غائب اور اس کی بجائے ایک گہرا سایہ نمودار ہو گیا ہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر سایہ چھپ گیا ہے اور دھوپ نے اُس کی جگہ لے لی ہے۔

طفیل صاحب کی اس خصوصیت کو دیکھ کر انھیں پراسرار شخصیت کہنے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب! جس شخص کے چہرے کے اثرات صریحاً دھوکا دے جائیں وہ پُراسرار نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا مگر میرے پاس انھیں ایسا سمجھنے کی ایک اور قوی دلیل بھی ہے اور اس کا ذکر میں ابھی کرتا ہوں۔

میری زندگی کے ہزاروں شب و روز بھاٹی دروازے کے اندر محلہ ستھاں، چوک دیوی دتا میں بیتے ہیں اور چوک دیوی دتا سے آگے بازار حکیماں کی طرف جائیں تو بائیں جانب ایک ایسی گلی نظر آتی ہے جس کے عین قلب میں گول شکل کا ایک وسیع کنواں نہ جانے کس زمانے سے اب تک موجود ہے۔ لوگ اسے پوڑا کھوہ کہتے ہیں اس کھوہ یعنی کنویں کے پاس اس تنگ سی گلی میں طفیل صاحب نے زندگی کا کافی حصہ گزارا ہے اور میں کہ کوچہ گردی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ طفیل صاحب کو نہ تو کبھی دیکھ سکا نہ مجھے کبھی یہ معلوم ہوا کہ اس گلی میں ایک دبلا پتلا، گورا چٹا طفیل نامی شخص بھی رہتا ہے۔

---

[1] اور اب آٹھ (ادارہ)

اس "چوڑے کھوہ" کے سامنے سلطان محمود کی شاندار حویلی کھڑی ہے۔ سلطان محمود الیکشن کے شہزادے تھے، الیکشن میں شہزادوں کی سی شان و شوکت دِکھایا کرتے تھے۔ اِن کے ہاں دعوتیں اور قوالیاں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ اور جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ صاحب جو بعد میں طفیل آف نقوش بنے اس پرنس آف الیکشن کی کسی محفل میں کبھی نہیں پائے گئے ورنہ میں انھیں دیکھ لیتا۔ بڑی مدت بعد جب انھوں نے شہرت کے آسمان پر چمکنا شروع کر دیا تھا تو انھوں نے اپنے بھائی کی شادی اپنے پرانے مکان میں رچائی اس وقت معلوم ہوا کہ طفیل صاحب اِس گھر میں رہتے تھے۔ بعد میں حکیم احمد شجاع مرحوم نے "لاہور کا چیلسی" کے عنوان سے ایک طویل مضمون 'نقوش' میں چھپوایا تو طفیل صاحب کی چوڑے کھوہ سے نسبتِ ہمسائیگی کا مزید علم ہوا۔ طفیل صاحب اس زمانے میں کس طرح چھپے رہتے تھے۔ یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں اِس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اس دَور میں طفیل صاحب بڑی خاموشی کے ساتھ بڑے پُراسرار انداز میں وہ فرائض انجام دینے میں منہمک ہوں گے جو کاتبِ تقدیر نے اُن کے کاموں کی فہرست میں کالی سیاہی سے لکھے تھے، ورنہ مجھ جیسے آوارہ گرد کی نظروں سے ان کا پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ طفیل صاحب انفرادیت پسند آدمی ہیں۔ یہ انفرادیت پسندی ان کی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً میں نے عرض کیا ہے کہ اُن کے چہرے کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ ابھی دھوپ ابھی چھاؤں۔ مجھے اُن کے قریب بیٹھنے کا بارہا موقع ملا ہے۔ باتیں کرتے، ہنستے ہنساتے، ایکدم سنجیدہ ہو جاتے، دل بہلاتے اور بڑے آرام سے دل میں چٹکی لیتے۔ اس میں بھی ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ بڑی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ یکایک وہ اس گھمبیر ماحول میں ایک ایسا شوشہ چھوڑ دیں گے کہ سب کے سب حاضرین بے اختیار ہنس پڑیں گے اور ابھی آپ قہقہہ بہ لب ہیں کہ وہ مسئلہ زیرِ غور پر غور کرنے کے لیے از سرِ نو مستعد ہو جائیں گے۔

طفیل صاحب کی کوشش غالباً یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں دوسروں سے مختلف رہیں اور اِس اندازِ فکر کو وہ معمولاتِ حیات میں شامل کر چکے ہیں۔ آپ اگر طفیل صاحب کو جانتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ بڑے لطافت پسند واقع ہوئے ہیں۔ خوش سلیقگی ان کی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ دیکھئے 'نقوش' کیسی کیسی لطافتیں لے کر شائع ہوتا ہے۔ مجھے یہ شرف بھی حاصل ہوا ہے کہ میں اُن کے دفتر کے اوپر ان کے رہائشی کمروں میں پہنچا ہوں۔ ان کے اپنے کمرۂ خاص میں بیٹھ کر باتیں بھی کی ہیں ہر کمرہ سجا سجایا ہے۔ آراستہ و پیراستہ ہے۔ اور اُن کے کمرۂ خاص کی تو بات ہی نرالی ہے لیکن ذرا اِن کے دفتر پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ سچ کہئے ایک کباڑی کی دکان لگتا ہے یا نہیں۔ جا بجا کتابوں کے، کاغذوں کے، فائلوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ ہر چیز انتشار کے عالم میں ہے اِلّا اُس شخص کے جو میز کے ایک طرف بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور آپ سے گفتگو کر رہا ہے — خود خوش وضع بھی ہے اور خوش پوش بھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دفتر میں بیٹھ کر طفیل صاحب کی لطافت پسندی کہاں چلی جاتی ہے؟

میں نے ایک بار پوچھا "طفیل صاحب؟ اس بیچارے دفتر کی قسمت کب جاگے گی۔" کہنے لگے "جب میں جاگوں گا" میں آج تک اِس فقرے کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ طفیل صاحب اگر سو رہے ہیں تو پھر ہم تو قریب قریب مر ہی چکے ہیں۔

طفیل صاحب اس کباڑ خانے میں بھی اپنی شان برقرار رکھتے ہیں۔ آپ اندر داخل ہوں گے تو بہت خوشگوار موڈ ہوگا تو اُٹھ کر مصافحہ کریں گے ورنہ اپنی کرسی پر ذرا کسمسائیں گے۔ کسمساتے ہوئے اُن کی نظریں آپ سے کہیں گی۔ آج تو اس کسمساہٹ ہی کو غنیمت سمجھ لیں۔ اور یہ کہہ کر وہ اپنا دایاں ہاتھ بڑی فراخ دلی سے آگے بڑھا دیں گے۔

کبھی تو اس ہاتھ میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ لگتا ہے یہ ہاتھ ابھی ابھی جلتے ہوئے کوئلوں سے ہٹایا گیا ہے اور کبھی اتنا ٹھنڈا کہ احساس ہوتا ہے کہ اس ہاتھ نے ابھی ابھی برف کا ایک ٹکڑا اٹھا کر گلاس میں ڈالا ہے۔

اگر آپ نے بیٹھ کر میز کے اوپر بکھری ہوئی کتابوں میں رخنہ اندازی یا مداخلت کی کوشش کی تو طفیل صاحب صرف ایک لمحے کے لئے گھور کر آپ کو دیکھیں گے اور آپ جلدی سے کتابیں وہیں رکھ کر اُن دو تین چھوٹی چھوٹی شیشیوں کو دیکھنے لگیں گے جو آپ کو کتابوں اور رسالوں کے انباروں سے الگ تھلگ ان بچوں کی طرح نظر آئیں گی جو سکول سے آتے ہوئے اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہوں۔

ان شیشیوں میں ننھی ننھی گولیاں بھری رہتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ طفیل صاحب بڑے دھڑکے کے ہومیوپیتھ ہیں۔ مگر دو سوال مجھے ہمیشہ پریشان کر دیتے ہیں۔ ایک سوال یہ کہ یہ شیشیاں ہمیشہ بھری ہوئی کیوں رہتی ہیں اور دوسرا یہ کہ یہ شیشیاں طفیل صاحب کے اپنے لیے ہیں یا دفتر میں آنے والوں کے لئے۔ اگر دوسری بات صحیح ہے یعنی دفتر میں آنے والوں کے لیے ہیں تو میں آج تک ان سے محروم رہا ہوں اور اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

ہومیوپیتھ کے ذکر سے یاد آیا کہ طفیل صاحب مستند قسم کے ہومیوپیتھ ہیں مگر ڈاکٹر کہلوانا کبھی پسند نہیں کرتے — اور دوسری طرف ہمارے کئی محترم دوست ہیں کہ ہومیوپیتھ ہیں اور اگر انہیں ڈاکٹر نہ کہا جائے تو بُرا مان جاتے ہیں۔ اب اس معاملے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اپنا اپنا انداز نظر ہے!

طفیل صاحب کا کوئی دوست دفتر میں آئے تو وہ چائے کا ضرور پوچھیں گے گھنٹی بجائیں گے۔ چائے آ جائے گی اور آتے ہی گم ہو جائے گی۔ اس گم ہو جانے کی وضاحت یوں کرتا ہوں کہ جب تک چائے والا لڑکا طفیل صاحب کے قریب نہیں پہنچتا۔ لڑکا بھی نظر آتا ہے اور چائے کے برتن بھی، لیکن جیسے ہی وہ طفیل صاحب کے قریب پہنچ جاتا ہے تو بس وہی نظر آتا ہے۔ برتن کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ برتن کہاں گئے کہ ایک پیالی چائے کی بھری ہوئی آپ کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آ جائے گی۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ چائے کی پیالی آ کہاں سے گئی۔ میں بھی حیران ہوتا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے ایک محرم راز نے بتایا تھا کہ طفیل صاحب نے اپنی کرسی کے پاس ایک BASEMENT بنا رکھی ہے، چائے کے برتن وہیں رکھے جاتے ہیں اور طفیل صاحب کا ہاتھ بہ قدر ضرورت طویل ہو کر چائے بناتا رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ BASEMENT والی بات کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے BASEMENT کیا وہ ایک چھوٹا سا کنواں بھی کھود سکتے ہیں۔ آخر زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ انہوں نے جوہڑے کھوہ کی قربت میں کاٹا ہے مگر یہ ہاتھ طویل کرنے والی بات سمجھ میں نہیں آ سکی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ چائے بناتے وقت ایک طرف جھکتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ خبر نہیں یہ ساری کارروائی کس طرح کرتے رہتے ہیں؟

چائے کے خیال کے ساتھ طفیل صاحب کے دفتر میں اُس بڑے گول زنگار رنگ ڈبے کا بھی خیال آ جاتا ہے جو ایک کونے میں پڑا رہتا تھا اور ہر آنے والے کا اس ڈبے کے ساتھ مختلف رویہ ہوتا تھا۔ وضعدار اور شائستہ لوگ اس ڈبے کی طرف دیکھے بغیر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ بعض حضرات صرف کنکھیوں سے اسے دیکھ لیتے تھے اور اطمینان کے ساتھ تشریف فرما ہو جاتے تھے اور ہمارے ڈاکٹر رشید انور صاحب اندر داخل ہوتے ہی اس ڈبے کو اس طرح اپنے بانہوں کے سپرد کر دیتے تھے جیسے محمد حسین آزاد کے اردو قاعدے میں ماں بچے کو

گود میں لیے بیٹھی ہے۔

آپ پوچھیں گے آخر اس ڈبے میں کیا کرامت تھی کہ ہم لوگ زید، بکر اور ڈاکٹر رشید انور اس کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ میں کیا بتاؤں آپ جانتے ہوں گے کہ یہ خوبصورت ڈبہ بہت خوبصورت بسکٹوں سے بھرا رہتا تھا مگر افسوس آج کل نظر نہیں آتا۔

چند روز ہوئے میں نے طفیل صاحب سے اس کی گم شدگی کی وجہ پوچھی تھی۔ بولے۔ "اور تو کوئی بات نہیں تھی۔ ایک شخص نے خاصا تنگ کر دیا تھا۔" معلوم نہیں یہ خاصا تنگ کرنے والا شخص کون ہے۔

طفیل صاحب کو اپنی کرسی پر خاموش بیٹھے ہوئے دیکھ کر کئی بار مجھے سمندر کے اس ساحل کا احساس ہوا ہے جس سے کچھ دور تاریک پانیوں کے اندر طوفان موج زن ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اُن کے ہونٹ بے حرکت ہیں مگر ان کے چہرے کا تاثراتی نشیب فراز واضح طور پر بتا دے گا کہ ان کے باطن میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں بہت ساری باتیں سوچ کر ان کے پاس پہنچا ہوں اور خیال یہ کیا ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ صرف ہوگا مگر ہوا یہ ہے کہ میں نے دس باتیں کیں اور انہوں نے دو تین فقروں میں جواب دے دیا۔ دس بارہ اور کیں اور پہلے دو تین فقروں میں بس ایک آدھ کا اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ میرا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا اور اُدھر طفیل صاحب میری طرف یوں دیکھ رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں: "فرمائیے۔ اور کچھ ارشاد فرمائیے۔"

اِس حالت میں انھیں دیکھیے۔ ان کا چہرہ بتا رہا ہے کہ گہری سوچوں میں غرق ہیں لیکن جو کچھ کہا جائے گا "ہوں ہاں" میں اس کا فی البدیہہ قسم کا جواب دیتے جائیں گے۔

مجھے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ طفیل صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور جب یہ کام ختم ہو گیا یا ختم کر دیا گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بار بار کے جھٹکوں میں میری ‘دماغی صحت’ برقرار رہ سکی ہے یا میں جیسا تھا اس حادثے کے بعد بھی ویسا ہی رہا ہوں۔

حادثہ یہ ہوا کہ انجمن ادبی رسائل (پاکستان) کا قیام عمل میں آیا۔ میں اور طفیل صاحب اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن چنے گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انجمن کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ان لوگوں سے چندہ مانگا جائے جنھیں حُسنِ اتفاق سے دولت کے علاوہ ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ مہم کا آغاز ایک بہت بڑے سرمایہ دار ناشر کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی مجوزہ کاروائی سے ہوا۔ ہم دونوں صبح سویرے ان کے بہت بڑے ادارے میں جا پہنچے۔ اطلاع بھجوائی کہ نقوش اور ادبِ لطیف کے ایڈیٹر درِ دولت پر حاضر ہیں۔ بتایا گیا۔ بیٹھیے۔ میں اور طفیل صاحب بیٹھ گئے پریس کے قریب ایک بنچ کے اوپر۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے طفیل صاحب کو دیکھا۔

"طفیل صاحب!"

"جی میرزا صاحب!"

"آپ دیکھ رہے ہیں۔"

"اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں۔"

"آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ وہی فقرے دہرائے گئے۔ چند منٹ اور گزر گئے تو میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"طفیل صاحب چلیے اور میں جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ طفیل صاحب بڑے مزے سے مسکرا رہے تھے۔ میری جھنجھلاہٹ کے باوجود اُن کے

موڈ میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ آخر اس وقت ہم ادارے سے باہر نکلے جب نوکر نے آ کر بتایا کہ صاحب تیار ہو کر ہم سے ملیں گے۔" گویا ایک گھنٹہ مزید تیاری میں گزرے گا۔

طفیل صاحب نے راستے میں بتایا کہ کل پھر آئیں گے۔ مجھ پر تو بجلی ہی گر پڑی۔ لیکن انہوں نے یہ بات اس سہولت سے کہہ دی جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں دوسرے دن اُن سے نہیں ملا دو تین روز کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ وقت تو بہت ضائع ہوا۔ سخت کوفت بھی ہوئی مگر میں چندہ لے کر ہی نکلا ہوں۔ اور یہ رقم جو طفیل صاحب حاصل کر سکے تھے متوقع رقم کے قریباً لہ کے برابر تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان سے اتنی رقم بھی حاصل کر لینا ایک معرکہ کا بلکہ تاریخی کارنامہ تھا۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ طفیل صاحب کا پیمانۂ صبر کچھ اتنا بڑا ہے کہ عام ذہنی کوفت کے ڈرم کے ڈرم خالی کر دیے جائیں۔ جب بھی اس کے چھلکنے کی نوبت نہیں آتی۔

طفیل صاحب سے جب کوئی اجنبی ملتا ہے تو اس کا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب جو اتنے بڑے رسالے کے ایڈیٹر ہیں، اتنے بڑے ادارے کے مالک ہیں اور خاکوں کی اتنی ساری کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ایک بالکل سادہ لوح آدمی ہیں اور اس تاثر کے نتیجے میں اجنبی اس زُعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ طفیل صاحب سے وہ سب کچھ اگلوا لے گا جو وہ اگلوانا چاہتا ہے۔ اس بے چارے کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اگلوا نہیں، خود اگل رہا ہے۔ طفیل صاحب بڑی نرمی سے، متانت سے شفقت سے، پیار اور محبت سے اس کے ارد گرد جالا سا بنتے رہتے ہیں اور اپنے شکار کی سادہ لوحی پر مسکراتے بھی رہتے ہیں۔

ایسے موقعے پر جب میں کسی شکار کو دیکھتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں۔

"ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر"

طفیل صاحب عام قسم کے تالے کے نہیں قفلِ ابجد کے قائل ہیں۔ وہ اپنے ہر راز کو سینے میں چھپا کر یہی قفل باہر لگا دیتے ہیں۔ اب اب اُن سے ایک نہیں ہزار باتیں کیجیے۔ ہزار طریقے آزمائیے۔ جو دل میں آئے کیجیے یہ قفل نہیں کھلے گا۔ اور قفل نہیں کھلے گا تو راز کا انکشاف کیونکر ہوگا۔ آپ سے سب کچھ معلوم کریں گے اور اپنا راز۔ راز ہی رہنے دیں گے۔

طفیل صاحب کو میں کافی لمبی مدت سے جانتا ہوں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ انارکلی کے پہلو میں ایبک روڈ پر ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان کے اندر صبح سے لے کر رات تک مستقل طور پر بیٹھا کرتے تھے۔ "نقوش" شائع ہوئے بہت کم مدت گزری تھی اور اس کی ادارت محترمہ ہاجرہ مسرور اور جناب احمد ندیم قاسمی کے سپرد تھی۔ طفیل صاحب اُس زمانے میں ایک اور پرچہ بھی نکالتے تھے اور اس کا نام تھا 'روحِ ادب'۔

اس زمانے میں طفیل صاحب ایک عام سے نوجوان تھے۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اور آج بھی میں انہیں دیکھتا ہوں۔ ایبک روڈ کی دکان میں نہیں۔ اُردو بازار میں "نقوش پریس" سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اس زمانے سے لے کر اس زمانے تک وہ گوناگوں مراحل میں سے گزر چکے ہیں۔ زندگی کی شیرینی اور زندگی کا زہر چکھ چکے ہیں لیکن میں آج بھی انہیں دیکھتا ہوں تو مجھے وہ اپنے بھولے بھالے چہرے، اپنی پیشانی کی طمانیت اور اپنے اندازِ مختصر گوئی سے مجھے اس نوجوان سے مختلف معلوم نہیں ہوتے جسے میں نے ستائیس اٹھائیس برس پیشتر دیکھا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی کے سفر کے لیے انہوں نے کسی رہ گزار کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خارزاروں میں جادہ پیمائی کی ہے۔ مسلسل مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ کبھی کسی سہارے کی آس

نہیں لگائی۔ کسی کی تقلید کی کوشش نہیں کی۔ صرف اپنی ذات پر اعتماد کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ ذاتی اعتماد ہی اُن کے لیے سب سے بڑا اور سب سے قیمتی سرمایہ حیات ہے۔ ہزاروں تجربات انہوں نے سمیٹے ہیں اور ان سارے تجربات کو بڑی خاموشی سے دل کی گہرائیوں میں اتار لیا ہے، انھیں دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ان کے باطن میں شہد اور تلخیوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور وہ وقتِ ضرورت ان دونوں ذخیروں سے کچھ نہ کچھ نکالتے اور ان میں برابر اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ میں جب ان کے انہی سارے متنوع تجربات کا احساس کرتا ہوں تو مجھے ان کا وہی پرانا چوڑا کھوہ یاد آجاتا ہے جس سے پانی نکلتا بھی رہتا ہے اور پھر بھی وہ ویسا کا ویسا ہی رہتا ہے۔

مجھے خبر نہیں کہ طفیل صاحب نے بچپن میں کرکٹ سے بھی شوق فرمایا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے ضرور کھیلتے رہے ہوں گے۔ دو تین سکور لینے کے تو وہ قائل ہی نہیں ہوں گے۔ چھکے مارتے ہوں گے۔ یہ چھکے مارنے کی عادت بدلی نہیں ان کی۔ "نقوش" کے معاملے میں انہوں نے چھکے ہی تو مارے ہیں۔ تو ذکر تھا ان کے کرکٹ کے شوق کا۔ قیوم نظر سے اُن کی یاری اِسی اشتراکِ شوق ہی کا نتیجہ ہے!

میں نے اپنی آنکھوں سے اِن صاحبوں کو کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا مگر جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں - تماشائیوں میں داد یا بے داد دینے میں یہ دونوں سب سے بازی لے جاتے ہیں۔

طفیل صاحب کے کرکٹ کے شوقِ فراواں کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ میچ کہیں بھی ہو اور کسی حالت میں بھی ہو وہ لازماً وہاں پہنچ جائیں گے اور سارا میچ دیکھنے کے بعد ہی کوئی اور کام کریں گے۔ چنانچہ ایک بار "نقوش" کا سارا پرچہ تیار ہوچکا تھا صرف طلوع کا صفحہ لکھا جانا باقی تھا طفیل صاحب نے کرکٹ گراؤنڈ میں یہ صفحہ لکھا اور اپنے قارئین کو یہ اطلاع بھی دے دی کہ میں یہ صفحہ میچ دیکھتے ہوئے لکھ رہا ہوں اور اس وقت سکور کی کیفیت یہ ہے اور فلاں فلاں کھیل رہا ہے اور فلاں کے ہاتھ میں بیٹ ہے اور فلاں کے ہاتھ میں بال ہے۔

طفیل صاحب کے ہاں ہر جذبہ صاف ستھرا، سچا اور نکھرا ہوا ملتا ہے، وہ بے مروت، بدلحاظ اور "بدتمیز" تک کہلوانا پسند کریں گے۔ مگر کسی ایسی مروت کے روادار نہیں ہوں گے جس میں جھوٹ کی تھوڑی سی آمیزش بھی ہو۔ ان کی بے مروتی کا ایک واقعہ سنئے:

ایک صاحب کے ساتھ اِن کے دوستانہ روابط ایک مدت سے قائم تھے۔ دونوں ہی جیسا کہ ایک محاورہ مشہور ہے، دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی، کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ایک نے منہ شمال کی طرف کر لیا اور دوسرے نے جنوب کی طرف۔ کسی شاعر نے اس کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے۔

تم اپنا منہ اُدھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کرلیں

اس وقت ایک صاحب نے کہ دونوں کے دوست تھے چاہا کہ انھیں گھیر گھار کر کسی ایسے مقامِ اتصال پر لایا جائے کہ دونوں کے ہاتھ اور ہاتھوں کے ساتھ دل بھی ایک بار پھر مل جائیں۔

تو مقامِ اتصال اُن کا اپنا گھر ٹھہرا۔ شاندار دعوت کی گئی۔ سیروں کے حساب سے مٹھائی منگائی گئی کہ جب اِن کی تلخی دور ہو جائے گی تو ہر ایک کو مٹھائی پر پل پڑنے کی دعوتِ عام دی جائے گی۔

جب پردہ اُٹھا تو صلح صفائی کرانے والے دوست نے فریقِ ثانی سے پوچھا۔

"کیوں صاحب! آپ کو طفیل صاحب سے کوئی شکایت ہے؟"

وہ از راہِ مروت بولے: "نہیں صاحب! مجھے اِن سے کوئی گلہ شکایت نہیں ہے۔"

اس پر وہ صاحب طفیل صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"طفیل صاحب! آپ کو ان سے کوئی شکوہ؟"

توقع یہی تھی کہ طفیل صاحب بھی وہی الفاظ کہہ دیں گے جو ان کے روٹھے ہوئے دوست نے کہے تھے۔ وہ دو تین لمحے تو خاموش رہے اور جب سب کو اپنی توقع کے پورا ہونے کا مکمل یقین ہو گیا تو کہنے لگے۔

"مجھے ان سے ایک نہیں کئی شکایتیں ہیں اور جب شکایتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بات پہنچی قیامت تک۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل صاحب شمال کی طرف تیز گام ہو گئے اور فریقِ ثانی نے اپنا رُخ جنوب کی طرف کر لیا اور اب اِن دونوں کے درمیان کم و بیش اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا قطب شمالی اور قطب جنوبی میں ہے۔

طفیل صاحب دوست نوازی میں بڑے حاتم ہیں لیکن جہاں تک 'نقوش' کا تعلق ہے وہ حاتم کی گور پر لات مارنا گناہ سمجھتے ہیں اگر وہ کسی کو پرچہ دینا نہ چاہیں تو ٹالیں گے نہیں صاف جواب دے دیں گے اور اگر کوئی صاحب، میری طرح ایک کاپی لے کر دوسری پر نظر رکھیں تو مانگنے والے کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیں گے کہ وہ بے چارہ خاموشی سے کھسک جانے ہی میں اپنی عافیت پائے گا۔ اس قسم کا ایک حادثہ میرے سامنے بھی ہوا تھا۔

ایک صاحب جو اُردو کے نامور افسانہ نگار ہیں طفیل صاحب کے پاس آئے۔

"طفیل صاحب! آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"جی ہاں ضرور ہوں۔" طفیل صاحب نے بلا تکلف جواب دیا۔

"میں چاہتا ہوں آپ اس سے بھی زیادہ اچھے آدمی ہو جائیں جتنا کہ لوگ آپ کو سمجھتے ہیں۔"

طفیل صاحب بلا کے ذہین آدمی ہیں۔ فوراً سمجھ گئے کہ اس زیادہ اچھے آدمی کہنے کا مطلب کیا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے۔

"جی نہیں — میں زیادہ اچھا آدمی بننا نہیں چاہتا — لوگ مجھے لُوٹ کر کھا جائیں گے۔"

اور وہ صاحب حرفِ مطلب زبان پر لا ہی نہ سکے۔

ایک بار ایک صاحب نے نیا شمارہ طلب کیا۔ طفیل صاحب پرچہ دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ بولے۔

"آپ نے "نقوش" کا پچھلا پرچہ پڑھا ہے؟"

وہ صاحب جواباً بولے "جی ہاں۔"

طفیل صاحب نے انھیں چند لمحے گھور کر دیکھا اور کہا "فلاں افسانے کا آپ نے مطالعہ کیا ہے اور اگر کیا ہے تو بتائیے —" اور مانگنے والے نے یہ سوچ کر کہ کہیں طفیل صاحب امتحان لینا ہی نہ شروع کر دیں — جلدی سے موضوعِ گفتگو ہی بدل دیا۔

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی خاکہ نگاری کے دوران میں طفیل صاحب نے اپنے بارے میں کہا ہے:۔

"میں اپنے جسم کے اعتبار سے ہی کمزور ہوں اور دل کے اعتبار سے بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اعتدال پسند ہوں۔"

یہ تسلیم کہ طفیل صاحب جسم کے اعتبار سے کمزور ہیں اور یہ بات بھی سو فی صد صحیح کہ وہ اعتدال پسند ہیں لیکن ان کا دل بھی کمزور ہے یہ میں اسے ایک لمحے کے لیے حقیقت ماننے کے لیے تیار نہیں۔

یہ خیال رہے کہ میں دل اور ذہن کے فرق میں نہیں پڑتا۔ دل کو زندگی کی تمام سرگرمیوں کے معاملے میں قوتِ محرکہ سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بوڑھے جسم کے اندر دلِ جوان دھڑک رہا ہو۔ دل کی توانائیاں اگر نشاطِ حیات کو محیط ہیں تو یہ دل جسم کے ضعیف ہونے کے باوجود کمزور نہیں ہے اور طفیل صاحب کے پہلو میں جو دل ہے وہ تو طوفانوں کی جولانگاہ ہے یہ دل کسی معاملے میں، کسی مشکل اور کسی مصیبت میں مایوس ہونا تو جانتا ہی نہیں۔

کچھ مدت ہوئی ان کے مادی دل پر موت نے بھرپور حملہ کر دیا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی طفیل صاحب کارزارِ حیات میں اپنے حال اور مستقبل کے پروگرام سے غافل نہیں تھے۔ یہ درست کہ ڈاکٹروں نے مرض کا علاج بڑی توجہ اور مستعدی سے کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی صحتیابی ان کی اپنی جواں ہمتی اور خود اعتمادی کی مرہونِ منت تھی۔ موت کے سایے کو بالکل قریب دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے بھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ سایہ پیچھے ہٹنے لگا اور ہٹتا چلا گیا۔

طفیل صاحب پہ لکھتے وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک دریائے بے پایاں کا سفر کر رہا ہوں۔ کہیں پانی نیلگوں ہے، کہیں سیاہ نظر آنے لگتا ہے، کہیں چمکتا دمکتا ہوا۔ کہیں گہرا اور کہیں بہت ہی گہرا۔ کہیں گردابوں کی ایک دنیا سی آباد ہے اور کہیں سطح صاف شفاف ہے، دوسرا کنارہ کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ وہاں تک پہنچنا شاید امرِ محال ہے اس لیے دو ایک باتیں کہہ کر کشتی کا رخ قریب ہی کے ساحل کی طرف موڑ لیتا ہوں۔

طفیل صاحب کا حافظہ بلا کا ہے، کوئی بات ان کے حق میں کہی جائے یا خلاف بھولتے نہیں۔ حق میں کہی ہوئی بات پر دلی شکریہ ادا کریں گے اور احسان یاد رکھیں گے۔ کوئی ایسی بات کہہ دی جائے جو ناپسندِ خاطر ہو تو اسے بھی سنبھال کر دل میں رکھ لیں گے۔ خاموش رہیں گے۔ موقعہ ملے گا تو اس بات کی روٹی کو طنز کے توے پر خوب سینک کر انہی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں گے جنہوں نے کچھ مدت پہلے یا طویل مدت پہلے یہ بات کہی تھی۔

آپ کہیں گے طفیل صاحب! آپ مجھے جلی ہوئی روٹی دے رہے ہیں۔ آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔

طفیل صاحب فرمائیں گے۔ "جناب! یہ روٹی آپ ہی کی ہے۔ میرا توا ذرا زیادہ گرم ہو گیا تھا۔ قصور میرا نہیں ہے"۔

تو یہ جلی ہوئی روٹی نگلنی ہی پڑتی ہے۔ میں خود ایسی جلی ہوئی روٹی کھا چکا ہوں۔ آپ نے وہ واقعہ پڑھ ہی لیا ہو گا یا کم از کم ان کی اپنی زبانی سن لیا ہو گا جو انہوں نے میرے متعلق لکھا ہے۔

انہوں نے "نقوش" کا ایک شمارہ بڑی محنت سے مرتب کر کے مجھ سے اس کے بارے میں رائے پوچھی۔ میری جو شامت آئی تو کہہ دیا "ہاں ٹائیٹل اچھا ہے"۔ انہوں نے بات گرہ میں باندھ لی اور جب میں نے ادبِ لطیف کا سالنامہ نکالا تو ان سے رائے پوچھ بیٹھا۔ فرمانے لگے۔ "اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں ہے"۔

ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ 'نقوش' کی کوئی سالگرہ تھی۔ ایک خاص تقریب ہوئی۔ میں نے نہ جانے اپنی جہالت کی وجہ سے یا کسی

اور وجہ سے ’ادبِ لطیف‘ میں لکھ دیا۔ ’نقوش‘ کی بڑی بڑی شان سے منائی گئی‘‘۔ دو تین روز بعد طفیل صاحب ’ادبِ لطیف‘ کے دفتر میں آئے میں نے پوچھا: طفیل صاحب! کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ بولے۔ آپ نے مجھے دفن کر دیا تھا۔ قبر سے اٹھ کر آ رہا ہوں‘‘۔

طفیل صاحب کے بارے میں ایک اور بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طفیل صاحب کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ طفیل صاحب بس طفیل صاحب ہیں۔ اُردو بازار میں ’’نقوش پریس‘‘ کے پاس ایک چھوٹے سے دفتر میں ایک میز کے سامنے عام سی کرسی میں بیٹھنے والے مگر ذرا دیکھئے اس ایک طفیل میں کتنے سارے طفیل نکل آئے ہیں۔

میں صرف ادب اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے گفتگو کروں تو وہ بیک وقت مجھے کئی مقامات پر نظر آ رہے ہیں — گویا کئی طفیل ہیں۔ مختلف گوشوں میں، مختلف مقامات پر، مختلف جگہوں پر۔

کسی بھی لائبریری میں جائیے۔ ’نقوش‘ کے انبار در انبار ضخیم پرچوں کے پیچھے آپ کو محنت کش، پسینے میں شرابور اور ایک لگن کی روشنی سے دمکتا ہوا ایک چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ کس کا چہرہ ہے۔

یہ رائٹرز گلڈ کا دفتر ہے — فائلوں کے ہجوم کے پیچھے آپ کو سوچ بچار میں ڈوبا ہوا ایک چہرہ دکھائی دے گا۔ کیا آپ اس چہرے کو پہچانتے ہیں۔

اور یہ دیکھئے کلک ایک دو فائلوں کو بغل میں دبائے ایک دفتر سے دوسرے دفتر میں اور اس دفتر سے کسی اور دفتر میں جاتا ہوا بار بار ایک شخص نظر آتا ہے — کیا آپ کو اس کی شکل شناسا نہیں لگتی؟

اور پھر کون اس شخص سے ناواقف ہے جسے سیکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دل اپنے بہت قریب پاتے ہیں اور ان میں ایک میرا دل بھی ہے۔

میں کہتا ہوں طفیل صاحب کو پوری طرح سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ قسطوں میں انکشافِ ذات کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ تو یہ بات بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ قسطوں کا یہ معاملہ یک دم رک بھی جاتا ہے اور تعاقب کرنے والا کچھ یوں محسوس کرتا ہے جیسے یہ حضرت ہمیں چھڑا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں اور اب وہ ایک سایے ہی کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اندر ہی اندر جو کچھ ہیں وہ باہر باہر نہیں ہیں برف کے اُس تودے کی مانند جس کا بیشتر حصہ سمندر کے پانیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔

یہ تو جانتا تھا کہ وہ زود حس ہیں، ان کا جمالیاتی ذوق اعلیٰ درجے کا ہے۔ لطیف الطبع ہیں مگر طفیل صاحب تو میرے تصور سے بہت زیادہ زود حس ہیں اور ان کی لطافتِ طبع کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی ’کثافت‘ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کی جنرل باڈی کی میٹنگ کے لئے بڑے زور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ گلڈ کے تمام ممبر، وہ پاکستان کے کسی علاقے میں بھی ہوں، اس میٹنگ میں شامل ہوں۔ طفیل صاحب نے دعوت نامے پر ادیبوں کے پتے لکھنے کے لیے ایک خوشخط صاحب کو منتخب کیا اور انھیں دفتر میں بلا کر یہ ذمے داری اُن کے سپرد کر دی۔

دو روز بعد طفیل صاحب کے ہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے دائیں بائیں اور سامنے لفافوں کی پہاڑیاں کھڑی ہیں اور وہ ایک ایک لفافہ اٹھاتے ہیں۔ اس پر جو پتا درج ہے اسے ایک صاف لفافے پر اتار دیتے ہیں۔ سمجھ لیا لکھنے والے صاحب نے پتے غلط لکھ دیے ہیں

پوچھا "پتے غلط لکھے گئے ہیں؟"

"نہیں۔"

"آپ نقل کیوں کر رہے ہیں؟" استفسار کیا۔

"اور کیا کروں؟" طفیل صاحب نے فوراً جواب دیا۔

یہ کیسا معما تھا، پتے غلط بھی نہیں مگر طفیل صاحب انھیں دوسرے لفافوں پر نقل کر رہے ہیں۔ یہ تو صرف وقت اور پیسے کا زیاں ہے۔

"طفیل صاحب! معاف کیجیے میں آپ کی یہ حرکت سمجھ نہیں سکا۔" عرض کیا۔

"اور آپ وہ حرکت سمجھ گئے ہیں جو اس حضرت نے کی ہے؟"

"کیا حرکت کی ہے؟"

طفیل صاحب نے اِس کے جواب میں ایک لفافہ دائیں جانب سے اٹھایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

اب صورت یہ ہے کہ میں گھور گھور کر لفافے پر لکھے ہوئے پتے کو دیکھ رہا ہوں اور وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

"پتا بالکل درست ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ پتا غلط ہے۔ ذرا اِس کی پیشانی پر تو نگاہ ڈالیے۔"

پیشانی پر رائٹرز گلڈ کا نشان چسپاں تھا۔

"آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ نشان اُلٹا ہے۔" طفیل صاحب نے حساب کے ماسٹر کی طرح ایک کند ذہن شاگرد کو حساب کا سوال سمجھاتے ہوئے کہا۔

عرض کیا "طفیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اسے کون پرکھے گا کہ نشان اُلٹا ہے یا سیدھا۔ بےکار محنت کر رہے ہیں چلنے دیں۔ کوئی شخص بھی اس غلطی کو نہیں پکڑے گا۔ میرا ذمہ!"

اور بھی لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی اپنی متفقہ یہی رائے تھی مگر طفیل صاحب ٹھہرے ہٹ کے پکے۔ کہنے لگے "لوگ کیا کہیں گے۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سب کو گرفتارِ بلا ہونا پڑا اور سیکڑوں پتے دوسرے لفافوں پر اتارتے رہے۔

اسے طفیل صاحب کی لطافتِ حس کہا جائے یا وہم؟

طفیل صاحب طبعاً کچھ متلون مزاج عاشق واقع ہوئے ہیں۔ ان کے عشق کے محور عموماً ایک خاص مدت کے بعد بدل جاتے ہیں سوائے ایک محور کے جو نہ تو کبھی بدلا ہے اور یہ بات یقین واثق سے کہی جاتی ہے کہ یہ محور ان کے دمِ واپسیں تک بدلے گا بھی نہیں۔ یہ محور ہے "نقوش" جس پر وہ اپنی جان تک چھڑکنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کی عاشقانہ متلون مزاجی کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر عرض کر دوں کہ ان کا عشق جب اپنے عالمِ شباب پر ہوتا ہے تو جنوں کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ اس کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔

ان کا پریس ان کی معاشی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ بقول ان کے اپنے پریس سے انھیں دال روٹی ملتی ہے، اس سے انھیں جتنی محبت بھی ہو جائز ہے۔ اپنے پریس کو ترقی دینے کے لئے انھوں نے بڑے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ بڑے بڑے ادھار لئے ہیں اور دوسروں کے احسانات کے بھاری بوجھ بھی ہنسی خوشی اٹھائے ہیں۔ میں نے ہنسی خوشی کے الفاظ اس وجہ سے استعمال کئے ہیں کہ وہ احسان کے معاملے میں غالب کے اس شعر کا عملی نمونہ بنے رہتے ہیں ؎

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

مگر آج کل ان کے سر پر گلڈ کے عشق کا جنون سوار ہے۔ وہ پریس کو بھی کم و بیش بھول چکے ہیں۔ چنانچہ میری موجودگی میں ایک صاحب نے طفیل صاحب کے صاحبزادے جاوید سے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے طفیل صاحب کو آج کل اپنے پریس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔"

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کچھ زیادہ کی بات کرتے ہیں۔ انھیں پریس سے دلچسپی ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر کس سے دلچسپی ہے؟" انھوں نے سوال کیا۔"

جاوید نے ایک لمحہ تامل کئے بغیر کہا۔

"باؤ جی کو تو صرف گلڈ سے دلچسپی ہے۔ اس کے لیے گھر بار تک بھول چکے ہیں۔"

جاوید نے بالکل درست کہا ہے میں طفیل صاحب کے گلڈ سے عشق کی شہادت دیتا ہوں۔ انھوں نے گلڈ سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے کئی جھمیلے پال رکھے ہیں۔ گلڈ کالونی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، گلڈ بہبود فنڈ۔ ان کی ذات ان تینوں کے عشق میں بری طرح گرفتار ہے۔

'گلڈ' کا دفتر جس عمارت میں ہے گلڈ از روئے قانون اس کا مالک ہے۔ حکومت مطلوبہ رقم وصول کر کے یہ عمارت جو پرنس ہوٹل کہلاتی ہے، گلڈ کو دے چکی ہے مگر جو لوگ مدت سے اس پر قابض تھے وہ طرح طرح کے قانونی ہتھکنڈوں سے کام لے کر یہ عمارت اس کے جائز حق دار کو دینے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ طفیل صاحب نے جب گلڈ کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا تو یہ نہایت پیچیدہ معاملہ انھیں اپنے عہدے کی نسبت سے وراثت میں ملا۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ اس معاملے کو نپٹا کر ہی دم لیں گے اور انھوں نے اپنی مسلسل کوشش سے، حکمت عملی سے، دنیادارانہ سوجھ بوجھ سے اس معاملے کو نپٹا لیا اور آج رائٹرز گلڈ اس وسیع و عریض عمارت کی واحد مالک ہے۔

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ طفیل صاحب نے اس عمارت کی واگزاری کے لیے کیا کچھ کیا، کس قدر جدوجہد کی ہے، کس طرح اس جدوجہد کے دوران میں اپنے سارے ذاتی معاملات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اپنے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لی ہے۔

معاملہ سخت تھا اور انھیں جان بھی عزیز تھی مگر وہ اس آگ میں کود پڑے اور خیر و عافیت کے ساتھ باہر نکل آئے۔

وہ عشق کرتے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر اور جب عشق کے میدان میں کود پڑتے ہیں تو پھر انھیں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا میں نے ان کے عشق کا تجزیہ کیا ہے۔ اور میری دانست میں ان کے عشق کے تین عناصر ہیں۔ یعنی ان کا عشق تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔

ا۔ نیک نیتی۔

ب۔ بھرپور جد و جہد۔

ج۔ استقامت اور مستقل مزاجی۔

وہ عشق کرتے ہیں تو اس میں اُن کی اپنی ذات کا دخل بہت کم ہوتا ہے۔ ان کا عشق ذاتی اور شخصی مفادات سے اگر مکمل طور پر ماورا نہیں تو بہت حد تک ماورا ضرور ہوتا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ کوئی انسان بھی مکمل انسان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور جب مکمل انسان کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو مکمل نیک نیتی کا امکان بھی خارج از بحث ہے۔

وہ اپنی طرف سے نیک نیتی ہی سے آغازِ عشق کرتے ہیں۔

اس کے بعد جد و جہد کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جد و جہد بھرپور نوعیت کی ہوتی ہے وہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ جو کچھ ان کے حیطۂ امکان میں ہوتا ہے وہ کر گزرتے ہیں۔

ظاہر ہے انسان کو اپنی ہر کوشش میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ مگر ان کی کوشش ہار نہیں مانتی ہر ہر مرحلے پر استقامت کے ثبوت دیتے ہیں۔ ہوتا کیا ہے یہ ایک الگ معاملہ ہے بقول امیر مینائی ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

قسمت کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے!

یہ مسئلہ جبر و اختیار کا ہے اور اس وقت سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا ہے جب سے ابنائے آدم نے زندگی اور کائنات پر غور کرنا شروع کیا ہے۔ اس مسئلے پر میرے اپنے خیالات ہیں مگر ایک بات کہنے میں مطلقاً جھجک محسوس نہیں کرتا کہ طفیل صاحب کی زندگی میں قسمت نے ایک نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

برسوں پہلے ایک واقعہ ہوا تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز آرٹسٹ اسلم کمال آج بھی کانپ جاتے ہیں۔

گفتگو طفیل صاحب کی اور کانپ اُٹھتے ہیں اسلم کمال! معاملہ سمجھ میں نہیں آتا مگر جب اس واقعے کا تفصیلاً ذکر کروں گا تو ساری حیرت دور ہو جائے گی۔

ہوا یوں کہ طفیل صاحب اور اسلم کمال صاحب اپنے ایک مشترکہ دوست کے ہاں مہمان تھے۔ یہ میزبان نوشہرہ میں رہتے تھے۔ شکاریات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے ہاں طرح طرح کی بندوقیں موجود تھیں۔

اپنی ایک بندوق کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مہمانوں کا اشتیاق اس قدر بڑھایا کہ اسلم کمال نے وہ بندوق اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت طفیل صاحب عین اُن کے سامنے کھڑے تھے۔

اسلم کمال نے پوچھا۔

"یہ بندوق خالی ہے؟"

جواباً کہا گیا۔ "بالکل خالی ہے!"

اسلم کمال نے یونہی لبلبی دبا دی۔ صرف ایک لمحہ پیشتر طفیل صاحب اپنی جگہ سے ذرا کھسک گئے تھے۔ بندوق سے گولی نکلی اور شاں کرتی ہوئی بالکل اس جگہ سے گزر گئی جہاں فقط ایک گھڑی پہلے طفیل صاحب کھڑے تھے اگر وہ وہیں کھڑے رہتے تو ہمارے اس مصور نے مصورِ قدرت کے ایک نہایت خوب صورت نقش کو ہمیشہ کے لیے محو کر دیا ہوتا۔

طفیل صاحب اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ رات مجھے خواب میں جگہ بدلنے کی ہدایت مِل گئی تھی۔ توجیہ درست ہے یا طفیل صاحب کی چھٹی حس کا یہ کارنامہ ہے بہرحال طفیل صاحب کی خوش قسمتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

ایک حادثہ حال ہی میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

محترمہ جمیلہ ہاشمی کے شوہر کا انتقال بیرونِ ملک ہوا تھا۔ نعش ان کے گھر پہنچائی گئی تو طفیل صاحب جنازے میں شامل ہونے کے لئے بھائی جان کے ہمراہ کار میں بیٹھ کر بہاولپور کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسری کار میں جمیلہ ہاشمی کی دوسری بہن سائرہ ہاشمی اور طفیل صاحب کی بیگم تھیں۔

دونوں کاریں آدھی رات کو چل پڑی تھیں۔

ملتان کے قریب یہ کاریں الگ الگ ہو گئیں۔ طفیل صاحب والی کار پیچھے رہ گئی اور دوسری کار آگے نکل گئی۔

طفیل صاحب والی کار کے ڈرائیور نے، اس خیال سے کہ جلد سے جلد پہلی کار کے قریب پہنچ جائے اپنی کار کی رفتار تیز تر کر دی۔ طفیل صاحب انہیں روکتے رہے۔ مگر وہ اپنی دھن میں مست تھا۔

یکایک کار ایک درخت سے جا ٹکرائی اور اسے گرا کر اوپر سے گزر گئی۔

طفیل صاحب نہ صرف بُری طرح زخمی ہو گئے بلکہ کار کے کچلے ہوئے حصے میں بھی پھنس کر رہ گئے۔

بھائی جان اور سائرہ ہاشمی والی کاریں چلی گئی تھیں اور حادثہ زدہ کار میں طفیل صاحب پر قیامت کی گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ زخموں سے بے تحاشا لہو بہ رہا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں جو زخم لگا تھا اس میں درخت کی ایک شاخ کے پتے داخل ہو گئے تھے۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ کار سے باہر آنا بہت مشکل تھا۔

خدا خدا کر کے انہیں باہر نکالا گیا۔ ایک ٹرک اُدھر سے گزرا اس نے بعجلتِ تمام طفیل صاحب کے ایک دوست کو حادثے کی اطلاع دی اور یوں طفیل صاحب ملتان کے نشتر ہسپتال میں داخل کرا دیئے گئے۔

زخموں کو دھونے صاف کرنے بالخصوص سر کے عقبی زخم میں سے پتے نکالنے کے لئے مریض کو بے ہوش کرنا ضروری تھا مگر صد آفریں ہے

طفیل صاحب پر کہ بے ہوش ہونے سے انکار کر دیا اس خیال سے کہ بیگم آئیں گی اور اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھیں گی تو بے تاب ہو جائینگی۔

یہ واقعہ ان کے مثالی صبر و تحمل کا بھی مظہر ہے۔

دس روز ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد وہ لاہور لوٹ آئے۔

چند روز ہوئے طفیل صاحب کی نئی شاندار کوٹھی میں اردو کی نامور افسانہ نگار جیلانی بانو اور اُن کے شوہر ڈاکٹر انور عظیم کی دعوت تھی۔ لاہور کے متعدد ادبا اس تقریب میں شریک تھے۔ طفیل صاحب ہر ایک مہمان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔

طفیل صاحب کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس مرتبہ بھی موت کی گرفت سے نکل آئے۔

یوں لگتا ہے کہ موت جو ان کا تعاقب کر رہی تھی اُن کے قریب پہنچی اور ایک لمحہ توقف کے بعد آگے نکل گئی اور طفیل صاحب دوبارہ دنیائے رنگ و بو میں وارد ہو گئے

اگر وہ حادثے کا شکار ہو جاتے تو آج اس کوٹھی میں جسے انہوں نے گذشتہ تین سال کی مدت میں تعمیر کروایا تھا اور جس کے ایک ایک پہلو کو اپنے جمالیاتی معیار کے مطابق مکمل کروایا تھا۔ کون گھومتا پھرتا؟

کیا طفیل صاحب ایک انتہائی خوش قسمت انسان نہیں ہیں؟

ایک رُودادِ رفاقت و محبّت

احمد ندیم قاسمی

طفیل صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کی تاریخ ۴۵ برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں سب انسپکٹر آبکاری کی ملازمت ترک کر کے لاہور آیا اور سید امتیاز علی تاج کے اشاعتی ادارے 'دار الاشاعت پنجاب' کی طرف سے شائع ہونے والے دو مشہور ہفت روزوں —— "پھُول" اور "تہذیبِ نسواں" —— کی ادارت سنبھالی تو انہی دنوں طفیل صاحب سے تعارف ہُوا۔ وہ ان کے اور میرے ایک مشترکہ دوست لطیف فاروقی مرحوم کے ہمراہ میرے پاس تشریف لائے اور اشاعت کے لیے میرے کسی مجموعے کی فرمائش کی۔ ویسے تو وُہ اُن دنوں اندرون لوہاری دروازہ کی اس بیٹھک میں کتابت کرتے تھے جہاں تاج الدین زریں رقم کی رہنمائی میں نستعلیق اور نسخ کتابت کی ایک تربیت گاہ چل رہی تھی۔ اس بیٹھک میں تربیت حاصل کر کے حافظ یوسف سدیدی مرحوم کے سے وہ خطاط منظرِ عام پر آتے جنہوں نے اس فنِ شریف کی عظمتوں اور خوب صورتیوں میں بے پناہ اضافے کیے۔ طفیل صاحب بھی زرّیں رقم کے نہایت ذہین شاگردوں میں شمار ہوتے تھے اس لیے اگر کتابت بھی کرتے رہتے تو بڑے نامور ہوتے۔ مگر قدرت نے انہیں ایک اور عظیم کام کے لیے چُن رکھا تھا۔

میں نے طفیل صاحب کو اپنے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "کیسر کیاری" پیش کر دیا۔ یہ نام میرے استادِ گرامی حضرت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے منتخب کیا تھا، فرماتے تھے کہ "زعفران زار" کا اس سے بہتر اردو ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ جس ادارے نے میری یہ کتاب شائع کی اس کا نام مکتبۂ شعر و ادب یا اس طرح کا کوئی نام تھا، بہرحال ادارۂ فروغِ اردو نہیں تھا۔ طفیل صاحب نے یہ ادارہ بعد میں قائم کیا اور اس ادارے میں کوئی دوسرے صاحب ان کے شریکِ کار نہیں تھے۔ میں نے کچھ عرصہ بعد دار الاشاعت کے متذکرہ دو ہفت روزوں کے علاوہ ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت بھی سنبھال لی اور ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران میں طفیل صاحب سے قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ میں اندرون بھاٹی دروازہ میں کئی بار ان کے آبائی مکان میں بھی گیا۔ وہ گھر تو بہت مختصر سا تھا مگر اس کے مکین بڑے فراخ دل اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ میں نے وہاں کتنی ہی شامیں اس گھر کے ایک فرد کی طرح گزاریں اور طفیل صاحب کے علاوہ ان کے بزرگوں اور بھائیوں کی محبتیں وصول کرتا رہا۔ میں ۱۹۴۵ء میں اعصابی تھکن کا شکار ہو کر گاؤں چلا گیا تو جب بھی طفیل صاحب مجھے اپنے خوب صورت خطوں کے ذریعے دلاسے دیتے رہے۔ صحت یاب ہو کر میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے بحیثیت

مسودہ نویس وابستہ ہوگیا اور ۱۹۴۶ء میں پشاور منتقل ہوگیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد چودھری نذیر احمد نے رسالہ "سویرا" جاری کرنے کا اہتمام کیا اور پشاور آکر اس کی ادارت میرے سپرد کر گئے۔ "سویرا" کے ابتدائی تین شمارے مَیں نے ہی مرتب کیے۔ یہ سلسلہ شاید جاری رہتا اگر میں مستقل طور پر پشاور سے لاہور منتقل نہ ہوجاتا۔

جب بہن خدیجہ مستور اور بہن ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں تھیں اور بعد میں بمبئی چلی گئی تھیں تو ادبِ لطیف کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ پھر یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ ہم لوگ بھائی بہن کے رشتے میں منسلک ہوگئے۔ چنانچہ جب قیامِ پاکستان کے بعد ان بہنوں کا خاندان ہجرت کرکے لکھنؤ سے بمبئی ہوتا ہوا پہلے کراچی اور پھر لاہور آیا تو مجھے طفیل صاحب ہی نے لاہور میں ان کی آمد کی اطلاع دی۔ میں پشاور سے لاہور پہنچا تو طفیل صاحب ہی مجھے نسبت روڈ کے اس مکان پر لے گئے جہاں میں بعد میں سولہ برس تک اپنے اہلِ خانہ سمیت مقیم رہا۔ انہی دنوں طفیل صاحب نے اس شرط کے ساتھ ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جس کی ادارت بہر صورت مجھے اور میری ادیب بہنوں میں سے کسی ایک کو سنبھالنی تھی۔ میں نے رسالے کا نام "نقوش" تجویز کیا۔ طفیل صاحب کو اس کا ڈیکلریشن بھی مل گیا۔ ہاجرہ بہن اور میں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ ہم تینوں کا مشترکہ رسالہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ ہم دونوں اپنی ایک ایک کتاب طفیل صاحب کے اشاعتی ادارے کی نذر کردیں گے اور ان کا معاوضہ رسالے کے دو حصص شمار ہوگا۔ تیسرے حصے کی ملکیت طفیل صاحب کی ہوگی، وہی رسالے میں سرمایہ لگائیں گے اور رسالے کے مہتمم یا منیجر ہوں گے۔

۱۹۴۸ء میں جب "نقوش" کا پہلا شمارہ "زردی" کے سرورق کے ساتھ افقِ ادب پر طلوع ہُوا تو صائب الرائے اصحاب نے غیر مشروط طور پر اعلان کردیا کہ "نقوش" پاکستان کے اردو شعر و ادب کی ترجمانی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرے گا۔ اس لیے اس کی پیشانی پر مَیں نے "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان" کے الفاظ درج کیے تھے۔ اربابِ حکومت کو ہمارا زندگی آمیزی اور زندگی آموزی کا پروگرام پسند نہ آیا اور پھر وُہ عناصر بھی بہت زوروں میں تھے جو ادب کو زندگی کی آلائشوں سے 'آلودہ' کرنے کے سخت مخالف تھے۔ ساتھ ہی ہم مدیرانِ "نقوش" انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے بلکہ اس کے عہدہ دار بھی تھے اس لیے خفیہ پولیس کے اہل کاروں نے ادارۂ فروغِ اردو کے باہر مستقل ڈیرا ڈال دیا تھا۔ طفیل صاحب اس صورتِ حال سے پریشان تو تھے مگر ساتھ ہی وُہ ہماری محبت میں بھی مبتلا تھے اور "نقوش" کو جاری رکھنے کے بھی خواہشمند تھے، چنانچہ اس عرصے میں وُہ حالات کا مطالعہ خاموشی اور سنجیدگی سے کرتے رہے۔ میں نے منٹو کا ایک افسانہ "کھول دو" "نقوش" میں درج کیا تو حکومت کو حملہ آور ہونے کا بہانہ مل گیا۔ چنانچہ "نقوش" کو (اور ساتھ ہی کسی بہانے "ادبِ لطیف" اور "سویرا" کو بھی) سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے بند کردیا گیا۔

ہم نے ان چھ ماہ میں آئندہ شماروں کی تیاریاں جاری رکھیں۔ پابندی ختم ہُوئی تو "نقوش" کے جشنِ آزادی نمبر اور عالمی امن نمبر کی سی خصوصی اشاعتوں نے اس رسالے کا قد مزید بڑھا دیا۔ پھر نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ کل پاکستان ترقی پسند

مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سارے ملک کے ترقی پسند اہلِ قلم جوق در جوق شامل ہوئے مگر ساتھ ہی انتہا پسندی کا شکار ہو گئے۔ اور بعض ایسے فیصلے کر ڈالے جنھیں کچھ ہی عرصے بعد نامناسب قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس کانفرنس میں کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ سونے پر سہاگے کا کام کر گیا اور یہ انھی دنوں کا ذکر ہے جب طفیل صاحب نسبت روڈ کے مکان پر میرے پاس آئے اور "نقوش" کو عملاً بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ہماری شخصی محبت اپنی جگہ مگر خفیہ پولیس کی مسلسل دھمکیاں اور پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ اب ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اس لیے رسالے کو موجودہ صورت میں جاری رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

ہم لوگ روپے پیسے سے محروم تھے۔ ہمارے پاس تو صرف ایک ہی دولت تھی اور وہ ہمارا قلم تھا۔ اتفاق سے اس وقت ہاجرہ بہن گھر میں موجود نہ تھیں ورنہ جارحانہ بحث مباحثے کا ایک طویل دور شروع ہو سکتا تھا۔ طفیل صاحب کی سیاسی بے بسی اور اپنی اقتصادی بے بسی کا تقاضا یہی تھا کہ اس اشتراک کو ختم کر دیا جائے۔ میں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں جا کر معاہدے کی وہ نقل اٹھا لایا جو "نقوش" کی ملکیت کے اشتراک سے متعلق تھی۔ پھر میں نے طفیل صاحب کے سامنے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور عرض کیا کہ آپ بھی مجبور ہیں، ہم بھی مجبور ہیں۔ مگر انسانی سطح پر ہمارے تعلقات میں کوئی رخنہ نہیں پڑنا چاہیے۔ طفیل صاحب کے خیالات بھی ایسے ہی تھے چنانچہ اتنے بڑے المیے کے بعد بھی ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ بعد میں جب ہاجرہ بہن گھر آئیں اور میں نے انہیں اس حادثے کی اطلاع دی تو وہ اس حد تک آزردہ ہوئیں جیسے ہمارے کسی پیارے عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر طفیل صاحب کے پاس بھی گئیں اور وہاں دل کی بھڑاس نکالی۔ مگر ہماری طرح ان کے سامنے بھی اشتراکِ عمل کا کوئی فارمولا نہ تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہماری کومٹمنٹ اٹل تھی، اس لیے کسی سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بعد میں "نقوش" سید وقار عظیم کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ ہمارے زخم تازہ تھے اس لیے "نقوش" کی چند اشاعتیں ہماری تحریروں سے خالی رہیں مگر بعد میں ہم دونوں نے "نقوش" میں مسلسل لکھا اور آخر تک لکھا۔ یہ اس محبت کے رشتے کی فتح تھی جس میں ہم دونوں کے علاوہ طفیل صاحب بھی بصمیمِ قلب منسلک تھے۔

طفیل صاحب سے ہماری ملاقاتیں کم ہو گئی تھیں مگر طویل وقفوں کے بعد جب کبھی ملاقات ہوتی تھی ہم دیر دیر تک اس محترم رشتے پر سے واقعات و حالات کی اڑائی ہوئی گرد کو جھاڑتے رہتے تھے اور جب الگ ہوتے تھے تو دلوں پر میل کا کوئی ذرا سا بھی دھبا نہیں ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ طفیل صاحب کے دمِ آخر تک جاری رہا۔

یہاں میں اپنے ایک مضمون کا اقتباس دینا پسند کروں گا جو میں نے طفیل صاحب کی موجودگی میں ۸ر اگست ۱۹۸۵ء کو "نقوش" کے سالنامے کی اشاعت کی تقریب منعقدہ واپڈا ایڈیٹوریم میں پڑھا تھا۔

”۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۹ء تک کے پانچ چھ برسوں میں طفیل صاحب نے بے خیالی میں بھی مجھ پر اس امر کا کوئی ثبوت افشا نہ کیا کہ ان کے اندر ایک مدیر اور ادیب چھپا بیٹھا ہے۔ ”نقوش“ سے میری اور ہاجرہ بہن کی علیحدگی کے بعد اُنھوں نے دو تین مدیر آزمائے مگر پھر یکایک ایک روز ”نقوش“ کا ایک شمارہ ملا جس پر مدیر کی حیثیت سے محمد طفیل صاحب کا نام درج تھا۔ میں سوچنے بیٹھ گیا کہ طفیل صاحب نے یہ اپنا ہم نام —— محمد طفیل —— کہاں سے ڈھونڈ نکالا جسے انہوں نے اتنے بڑے ادبی رسالے کی ادارت سونپ دی ہے۔ پُوچھ گچھ کی تو معلوم ہُوا کہ یہ مدیر محمد طفیل تو اپنے طفیل صاحب ہی ہیں۔ یقین نہیں آیا کیونکہ طفیل صاحب نے اس یقین کے لیے میرے ذہن میں زمین ہی تیار نہیں کی تھی۔ سچی بات ہے، اس روز میں ”نقوش“ کے مستقبل سے متعلق تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے سوچا، ٹھیک ہے، طفیل صاحب رسالے کے مالک ہیں مگر ہر مالک، مدیر کا منصب تو ادا نہیں کرسکتا۔ ایک اعلیٰ پائے کے مدیر کے اندر تو یہ خصوصیت ہونی چاہیے اور وہ خصوصیت ہونی چاہیے اور اپنے طفیل صاحب تو سیدھے سادے، شرمیلے لجائے لجائے سے نوجوان ہیں جو اچھے شعر کی داد بھی یُوں دیتے ہیں جیسے درد سے کراہ رہے ہوں۔ مگر جب ”نقوش“ کے بھاری بھرکم شمارے آنے لگے تو مندرجات کے مطالعے سے اندازہ ہُوا کہ طفیل صاحب میں ایک عمدہ مدیر کی متعدد خوبیاں موجود ہیں۔ انھیں ادبی تخلیقات کو پرکھنا آتا ہے اور ان کے پاس شعر و افسانہ اور تنقید و تحقیق کی معیاری کسوٹیاں موجود ہیں! اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ادیب ہونے کا ثبوت یُوں فراہم کردیا کہ چند ہم عصر ادیبوں کے خاکوں پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ”صاحب“ کے نام سے شائع ہوگیا..... طفیل صاحب نے خاکہ نگاری کا ایک اپنا اسلوب وضع کیا اور اس میدان میں بھی بڑے بڑوں سے اپنی انفرادیت تسلیم کرالی۔ اور پھر ”نقوش“ کے نمبروں کا سیلاب آگیا..... میں سوچتا ہُوں اگر میں ۱۹۴۹ء کے بعد بھی ”نقوش“ کا مدیر رہتا اور طفیل صاحب مجھ سے (اپنے بے شمار مرتب کردہ نمبروں میں سے) کوئی ایک بھی نمبر مرتب کرنے کی فرمائش کرتے تو میں تو بھاگ کھڑا ہوتا۔ بھاگتا یوں کہ میرے معیاروں کے مطابق ادارتی لحاظ سے میری کومٹمنٹ صرف تخلیقی ادب سے ہے اور وُہ بھی بیشتر معاصر تخلیقی ادب سے۔ پھر ”نقوش“ کے سب نمبر مرتب کرنے کے لیے جس جانکاہی اور ناقابلِ شکست استقامت اور تلاش و جستجو اور تحقیقی لگن کی ضرورت ہوتی ہے، وہ طفیل صاحب کے ہاں بدرجۂ اُتم موجود (ہے) تھی اور میں تحقیق و تطبیق کے ساتھ اس حیرت انگیز شغف کا احترام تو یقیناً کرتا ہُوں مگر اس سے بدکتا بھی ہُوں۔ طفیل صاحب نے ”نقوش“ کے متنوع نمبروں کے ذریعے اردو ادب اور ہماری تہذیب و ثقافت کی

> جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی تحسین سیکڑوں نے کی ہے اور وہ اس ہمہ جہت تحسین کے ہر طرح مستحق ہیں۔ جب میں اس ننھی سی بات کو اپنا ایک اعزاز قرار دے رہا ہوں کہ "نقوش" کا نام میں نے رکھا اور اس کا پہلا مدیر میں تھا تو طفیل صاحب "نقوش" کی ان کارکردگیوں اور کارگزاریوں پر کیوں فخر نہ کریں جنھوں نے ہمارے علم و ادب کو زیادہ تہ دار، اور ہماری علمی و ادبی تاریخ کو زیادہ باوقار بنایا ہے۔"

طفیل صاحب کے بارے میں میرا ایک مفصل مضمون ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی مرتب کردہ کتاب "محمد نقوش" میں شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طفیل صاحب کی شخصیت میں کتنی سادگی اور پھر کتنی گہرائی تھی چنانچہ یہاں صرف بعض واقعات کا ذکر کروں گا۔

طفیل صاحب مبالغے کی حد تک حساس انسان تھے۔ ایک دو بار میں بھی ان کی اس انتہا درجے کی حساسیت کی زد میں آیا۔ "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر شائع ہوا تو میں روزنامہ "امروز" کا مدیر تھا۔ طفیل صاحب نے بطورِ خاص فرمائش کی کہ اس نمبر پر تبصرہ میں خود لکھوں، چنانچہ میں نے لکھا اور اس نمبر کے ہر پہلو کی جی بھر کر تعریف کی، البتہ آخر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس نمبر میں حاجی لق لق کے سے مزاح نویس کی کوئی ایک سطر بھی شامل نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حاجی لق لق عوامی سطح کے ایک ہر دلعزیز اور بہت پڑھے جانے والے مزاح نویس تھے اس لیے ان کے ساتھ اس بے انصافی کی تلافی ہونی چاہیے۔ طفیل صاحب میری طرف سے کسی بھی قسم کے تنقیدی جملے کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ غصے میں آ کر مجھے اس روز ایک ایسا خط لکھا جس نے مجھے دنوں تک اداس رکھا۔ ما فیہ اس خط کا یہ تھا کہ طنز و مزاح نمبر میں میرے مزاحیہ کالم کم تعداد میں درج ہوئے ہیں اور میں اسی لیے ان پر حملہ آور ہوا ہوں! حالانکہ میرے کالموں کا ایک معقول انتخاب اس نمبر میں شامل تھا اور میرے ذہن میں اس امر کا شائبہ تک نہ تھا! اس واقعے کے بعد چند ماہ تک ہمارے درمیان بالمشافہ ملاقات یا خط یا ٹیلی فون تک کے ذریعے بھی کوئی رابطہ نہ رہا۔ پھر بابائے اردو مولوی عبدالحق لاہور تشریف لائے تو میں اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے مدیر سید سبطِ حسن ان کے استقبال کو لاہور ریلوے سٹیشن پہنچے۔ وہاں طفیل صاحب بھی موجود تھے۔ مصافحہ ہوا اور طرفین کے گِلے شکوے کچھ کہے سُنے بغیر دُور ہو گئے۔

پھر جب میں مجلس ترقی ادب کا ناظم مقرر ہوا تو ایک بار طفیل صاحب کو بھی مجلس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ وہ مجلس کے سہ ماہی جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ایک اجلاس میں جب چھاپے خانوں کے نرخ بڑھانے کا مسئلہ درپیش تھا تو طفیل صاحب نے کہا کہ وہ ان نرخوں سے بھی کم نرخوں پر مجلس کی کتابیں طبع کرا سکتے ہیں، جو مجلس آج کل ادا کر رہی ہے۔ جسٹس ایس اے رحمٰن مجلس کے صدر بھی تھے اور اس اجلاس کی بھی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اس پیش کش کا خیر مقدم کیا اور مجھے ہدایت کی گئی کہ مطابع کے سلسلے میں طفیل صاحب سے رجوع کیا کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر مجلس کی مطبوعات کی رفتار میں تشویشناک کمی واقع ہو گئی۔ کیونکہ بیک وقت چار پانچ

پریس طفیل صاحب کی بات ماننے پر تیار نہیں تھے۔ شاید ایک پریس مانا تھا مگر سال میں ایک درجن کتابیں صرف ایک پریس سے طبع کرانا مشکل تھا۔ میں نے اگلے اجلاس میں یہ صورتِ حال اجلاس کے سامنے رکھی تو طفیل صاحب خفا ہو گئے۔ بعد کے ایک اجلاس کے لیے انہیں خط لکھا گیا تو انھوں نے صدرِ مجلس جسٹس رحمٰن کو براہِ راست خط لکھ ڈالا جس میں وضاحت کی گئی کہ ندیم صاحب ویسے تو ہر طرح ٹھیک ٹھاک ہیں مگر انتظامی معاملات میں کوتاہ ہیں اور اپنے عملے پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں اس لیے میں آئندہ کسی اجلاس میں شرکت نہیں کروں گا۔ اس پر جسٹس رحمٰن صاحب نے انہیں جو خط لکھا وہ حیرت انگیز منصفانہ توازن کا آئینہ دار تھا۔ اس میں انھوں نے واضح طور پر میری مدافعت کرتے ہوئے بھی طفیل صاحب کے لیے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اس کے باوجود طفیل صاحب مسلسل غیر حاضر رہے مگر جب میری میعادِ نظامت میں اضافے کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہ میرے حق میں ووٹ دینے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر تشریف لے آئے اور دونوں رُوٹھے ہوئے، کسی رسمی معذرت وغیرہ کے بغیر پھر سے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات کی استواری میں لگ گئے۔

بعض صورتوں میں طفیل صاحب اپنے عزیز دوستوں کو ممنون کرنے کے لیے بڑے ایثار سے کام لیتے تھے۔ صرف ایک دو مثالیں عرض کروں گا۔ ایک بار میرے ایک محترم دوست، جن کا ادب کی تنقید میں بڑا نام ہے (اور جن کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) میرے گھر تشریف لائے اور بتایا کہ طفیل صاحب کسی وجہ سے ان کے سخت مخالف ہو گئے ہیں۔ انھیں کراچی کے ایک صاحب کے توسط سے چند ایسے خطوط حاصل ہو گئے ہیں جو نقادِ موصوف نے بابائے اردو کو لکھے تھے اور جن میں بعض قابلِ اعتراض جملے بھی درج ہو گئے تھے۔ میرے دوست نے مجھے بتایا کہ طفیل صاحب ”نقوش“ کے آئندہ شمارے میں یہ خطوط شامل کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں وہیں اپنے گھر میں بٹھا کر دفتر ”نقوش“ کی راہ لی۔ خوش قسمتی سے طفیل صاحب اس وقت تنہا تھے۔ میں نے اُن سے پُوچھا کہ کیا آپ کے پاس اس نوعیت کے خطوط موجود ہیں؟ بولے: ”جی ہاں، موجود ہیں۔“ میں نے پُوچھا کہ کیا آپ انھیں ”نقوش“ میں درج کر رہے ہیں؟ بولے: ”ہر صورت میں درج کروں گا۔“ میں نے عرض کیا کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ انہوں نے بڑے دُکھ اور حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر میز کا ایک دراز کھول کر ایک پوسٹ کارڈ نکالا اور بولے: ”مشتے نمونہ از خروارے، اسے پڑھ لیجئے۔“ یہ نقادِ موصوف کا خط مولوی عبدالحق صاحب کے نام تھا اس میں انھوں نے مولوی صاحب کو پنجابیوں سے خبردار رہنے کو کہا تھا اور ساتھ ہی پنجابیوں کے بارے میں ایسی ناگفتہ بہ باتیں لکھی تھیں کہ قطعی طور پر بے تعصب ہونے کے باوجود میرا سارا خون جیسے میرے سر میں جمع ہو گیا۔ طفیل صاحب نے میری حالت دیکھی تو پوچھا: ”کیا اب بھی آپ ”نقوش“ میں ان خطوط کو درج نہ کرنے کا مطالبہ کریں گے؟“ میں نے کہا کہ ”اب تو میں کسی صورت میں انہیں نقوش میں درج نہیں ہونے دوں گا کیونکہ ان کی اشاعت سے پنجاب میں اردو بولنے والے حضرات کے خلاف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ جائے گی اور ایک شخص کی جلد بازی کی سزا سیکڑوں ہزاروں کو ملنے لگے گی۔ ویسے بھی اہلِ پنجاب بحیثیتِ مجموعی

اس طرح کے صوبائی اور علاقائی تعصبات سے محفوظ ہیں اور اگر یہ خطوط چھپ گئے تو ان کی بے تعصبی حد درجہ متاثر ہو گی۔" طفیل صاحب ان خطوط کی اشاعت پر تلے ہوئے تھے مگر جب میں نے واضح کیا کہ ان پر اور "نقوش" پر میرے بے شمار حقوق ہیں تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ یہ خطوط "نقوش" میں نہیں چھپیں گے ـــــ اور واقعی یہ خطوط "نقوش" میں کبھی شائع نہ ہوئے۔ یوں طفیل صاحب نے مجھے حد درجہ ممنون کیا۔ (ضمناً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چند برس بعد یہی خطوط ایک ہفت روزہ میں چھپ گئے۔ بڑی لے دے ہوئی۔ مگر میں نے کراچی کے روزنامہ "حریت" میں متعلقہ نقاد صاحب کا باقاعدہ دفاع کیا اور لکھا کہ ہجرت کے فوراً بعد کسی ایک آدھ واقعے سے انہوں نے اہلِ پنجاب کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا ہوگا ورنہ وہ تو سالہا سال سے پنجاب میں مقیم ہیں اور ان کے حلقۂ احباب میں پنجاب میں رہنے والے ہم بے شمار اہلِ قلم شامل ہیں۔ یوں یہ طوفان بہت حد تک رُک گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب انہی محترم نقاد نے مجھ سے عملاً قطع تعلق کر رکھا ہے! خدا انہیں خوش رکھے!)

ایک اور واقعہ ہمارے ایک مشترکہ دوست کا ہے۔ ان کا نام مولانا عبدالسلام ندوی تھا۔ کوہاٹ کے پٹھان تھے اور خان عبدالغفار خاں کے معتقد تھے۔ طفیل صاحب نے جب کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا اور ساتھ ہی "نقوش" کی تعدادِ اشاعت میں اضافہ ہوا تو مولانا عبدالسلام ان کے دستِ راست ثابت ہوئے۔ دوڑ بھاگ کا ہر کام ان کے سپرد تھا اور وہ یہ کام اتنی لگن کے ساتھ کرتے تھے جیسے عبادت کر رہے ہیں۔ طفیل صاحب کو عمر بھر مولانا کے اس بے لوث تعاون کا پاس رہا۔ بعد میں مولانا انارکلی میں ایک ادارے ضیاء الدین لمیٹڈ سے منسلک ہو گئے۔ اس ادارے کا دفتر انارکلی میں "فنون" کے سابقہ دفتر کے سامنے تھا۔ چنانچہ مولانا سے روزانہ میری ملاقات رہتی تھی۔ وہ خلوصِ نیت اور بے غرض محبت کی خوب صورت تجسیم تھے۔ فنون کی کتابت اور طباعت سے لے کر اس کی ترسیل تک کے مراحل کو انہوں نے یوں سنبھال رکھا تھا کہ میں اس طرف سے قطعی طور پر بے فکر ہو گیا تھا۔ آخری عمر میں وہ شدید بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے۔ آخر انھیں یو، سی، ایچ میں داخل کرایا گیا۔ افاقہ ہوا اور انھیں ہسپتال سے فارغ کیا جانے لگا تو میں خاصی رقم کا بندوبست کر کے ہسپتال پہنچا تاکہ ہسپتال کا بل ادا کر سکوں۔ اتنے میں طفیل صاحب بھی تشریف لے آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہا "اگرچہ مولانا بعض وجوہ کی بنا پر مجھ سے کچھ رُوٹھے رہتے ہیں مگر مجھ پر ان کے بہت سے حقوق ہیں اور ہسپتال کا بل میں ادا کروں گا!" میں نے اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر دکھائی جو میں یہ بل ادا کرنے کے لیے لایا تھا۔ پھر عرض کیا: "چلیے یوں کرتے ہیں بل کی آدھی رقم آپ ادا کر دیجئے، آدھی ادا کرنے کی مجھے اجازت دیجئے۔" مگر طفیل صاحب بضد رہے کہ وہ ساری رقم خود ادا کریں گے اور اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اب طفیل صاحب اشاعتی دنیا کی ایک خوشحال شخصیت تھے اور وہ مولانا کو بآسانی نظر انداز بھی کر سکتے تھے مگر ان کا ضمیر زندہ تھا چنانچہ مولانا کی یہ ننھی سی خدمت کر کے انہوں نے بڑی روحانی آسودگی محسوس کی۔

میں نے ۱۹۶۳ء میں "فنون" جاری کیا تو میرے پاس آئے اور کہا کہ "یہ آپ نے کوئی الگ رسالہ نہیں نکالا، نقوش اور فنون، طفیل اور ندیم کی طرح دو بھائی ہیں اور جس طرح ہم دونوں نے زندگی کے نشیب و فراز میں رفاقت کا حق ادا کیا ہے، اس طرح نقوش اور فنون بھی ادب کی دنیا کے مثالی رفقائے کار ثابت ہوں گے۔" اور طفیل صاحب نے "فنون" کی تعمیر میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔

مجھے دکھ ہے کہ میں ان کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک جگہ ملاقات ہوئی تو بولے: "آپ کسی روز "نقوش" کے دفتر تشریف لائیے نا! اب اس کا دفتر نقوش پریس کی اوپر کی منزل میں منتقل ہو گیا ہے جہاں نیو مسلم ٹاؤن میں منتقل ہونے سے پہلے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ دراصل میں آپ کو اس کرسی پر بٹھا کر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں آپ مجھے بٹھا گئے تھے!" ——— میں ان کے اس بالواسطہ اظہارِ محبت اور اعترافِ رفاقت سے بے حد متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ کسی روز ضرور آؤں گا۔ انتقال سے چند ہی روز پہلے انہوں نے ایک تقریب میں پھر سے یہی فرمائش کی اور میں نے پھر سے وعدہ کر لیا مگر ارادے کے باوجود یہ وعدہ پورا نہ کر سکا اور وہ وعدوں کے پورا ہونے یا نہ ہونے کی الجھنوں سے آزاد ہو گئے۔

نہ ادیب نہ شاعر اور سب کچھ

ڈاکٹر محمد باقر

یہ غالباً ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ مجھے ایئر فورس چھوڑے ابھی شاید ایک سال بھی نہیں ہُوا تھا۔ صوبیدار محمد اسلم نے ٹیلی فون کیا: ملنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ محمد طفیل بھی ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: تشریف لائیے۔ میں مکان کے چمن میں بیٹھ گیا۔ دھوپ بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ اسلم ایک قد آور فوجی جوان تھے۔ اُن کے ساتھ ایک مجوب دھان پان اور ہوا سے لہراتا ہوا ایک نوجوان تھا۔ ہم نے چائے پی۔ اسلم نے کہا: یہ طفیل صاحب ہیں۔ اردو کا رسالہ نکال رہے ہیں نام ہو گا ـ "نقوش"۔ ابھی ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، ساقی اور شاید نیرنگِ خیال (؟) بھی حیات تھے۔ ایک معروف قلمکار کا ذکر آیا۔ "وہ مدیر ہوں گے۔" میں نے پوچھا: اور یہ کیا ہوں گے؟ طفیل خاموش رہے۔ اسلم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا: "یہ بھی!" اسلم نے مضمون لکھنے کے لیے کہا۔ طفیل کاملاً خاموش رہے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور مضمون بھی بھجوا دیا۔ معلوم نہیں تھا کہ طفیل کا مالہٗ اور ماعلیہ کیا ہے؟ اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ اسلم کا آجانا کافی تھا۔ فوج میں لوگ ساتھیوں پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور ساتھی اُن کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگاتے۔

اس طرح نقوش نکل آیا۔ وقت کے کئی معروف ادبا اور شعرا نے اپنی بہترین تخلیقات اس کے حوالے کیں۔ یہ طفیل کا کمال تھا کہ وہ یکایک جست لگا کر اس ردیف میں آ کر کھڑا ہو گیا اور ۳۵ سال تک نہایت پامردی سے اپنے مدارج پر قائم رہا۔ اس سے پہلے نہ وہ ادیب تھا نہ شاعر۔ اور اب وہ سب کچھ آناً فاناً بن گیا تھا۔ اس وقت اُس کی دکان ایبک روڈ پر تھی۔ سامنے ایک مُٹھ والا حلیم بیچتا تھا۔ ایک مٹکے والا مٹکا سا آدمی۔ وہ ساری رات اپنی اہلیہ سے گھر پر حلیم پکواتا اور صبح اُسے مٹی کے مٹکے میں ڈال کر لے آتا۔ نیچے آگ جلاتا اور اُوپر مٹکا رکھ دیتا۔ نماز پڑھنے کے بعد حلیم کھانے والے اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ طفیل ہمیں حلیم کھلانے کے بہانے دکان پر جمع کر لیتا۔ عبادت بریلوی، وقار عظیم، مشرف انصاری، ابواللیث صدیقی اور کئی اور آدمی۔ الغرض پوری یونیورسٹی حلیم کا چسکا لینے کے لیے جمع ہو جاتی۔ مٹکے والا ہماری افتادِ طبع کو جان گیا یقیناً طفیل نے جتوا دیا تھا۔ وہ حلیم کے اوپر کچا ادرک لپ بھر کر ڈال دیتا۔ سردی کے موسم میں ہماری پیشانی سے پسینہ بہ رہا ہوتا اور ہم سی سی اور نقوش کی باتیں کرتے ہوئے یہ حلیم کھاتے جاتے۔

بات بڑھی تو انارکلی کے ہوٹل (نام یاد نہیں) میں دعوتیں ہونے لگیں۔ اور یہاں سے نکل کر ایبٹ روڈ، مال روڈ اور لاہور کی ہر سڑک پر طفیل نے ہمیں دعوتیں دیں۔ نقوش کے خاص نمبر نکالے۔ اُن کی افتتاحی تقریب کر دیتا۔ ایک ایسی ہی تقریب میں پاکستان کے ادبی زعما جمع تھے۔ جب تازہ نقوش تقسیم ہُوا تو میں نے حضار کے امضا اس پر لیے۔ لاہور میں مقیم شاید ہی کوئی ناموَر ادیب اور شاعر ہو جو اِس محفل میں شامل نہ تھا۔ عبدالرحمٰن چغتائی بھی تھے۔ یہ پرچہ بڑا وقیع ہو گیا۔

طفیل مسلک کے اعتبار سے بڑا بے ریا، مخلص اور وسیع المشرب تھا۔ لاہور میں جوش ملیح آبادی آئے یا جگر مراد آبادی

وہ سب کی دعوت کرتا۔ خود بڑا پاکباز اور نیک کردار۔ نہ شراب، نہ جوا نہ عورت۔ وہ خاموشی سے اِن میں سے کسی کی طرف تکتا۔ نہ کسی کی غیبت نہ عیب جوئی کرتا۔ اِس اعتبار سے وہ بہت بڑا انسان تھا۔ معلوم نہیں اُس کی تربیت کن مخلصوں نے کی تھی۔

اردو کے ماہانہ جرائد کبھی کبھار خاص نمبر وقت پر نکال لیا کرتے تھے۔ طفیل نے بہت جلد اُردو جراید کی صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس پر کچھ لوگ ناراض بھی ہوئے۔ اُس نے بے وقت خاص نمبر خاص مقصد کے پیشِ نظر نکالنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ کہ ۳۵ سالوں میں اُس نے صرف ۱۲۳ پرچے ترتیب دئیے۔ آخری پرچہ اُس کی موت کے بعد شایع ہوا۔ پہلے پہلے اُس کی توجہ صرف ادبی اشیا کی طرف رہی۔ اور اُس نے افسانہ نمبر، غزل نمبر وغیرہ شائع کئے لیکن پھر اُس نے دامن پھیلایا تو عمدہ تنقیدی اور خالص تحقیقی نمبر بھی شائع کئے۔ جن میں لاہور نمبر ایک ایسی معرکے کی تخلیق ہے کہ فروری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور لوگ آج تک اُس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اس سال کے شروع میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک افسر نے مجھ سے اِس کے لیے تقاضا کیا تو میں نے طفیل کو ٹیلی فون کیا۔ کہنے لگا: آپ کے پاس ہے تو کسی کو مت دیجئے۔ نایاب ہے۔ میں نے مانگنے والے کو اطلاع دے دی۔ اُس نے اِس کی فوٹو کاپی میرے کتاب خانے سے کرالی۔ شخصیات نمبر میں اُس نے اپنے ملنے والوں کی خود جو تصویر کشی کی ہے وہ بے نظیر ہے (اِس فقیر کا بھی اُس میں ذکر ہے) اور اس پرچے کا حاصل ہے۔

میں نے طفیل کو انتہائی احتیاج اور انتہائی ثروت کے زمانوں میں دیکھا ہے۔ وہ نہ تو کبھی گھبرایا ہوا نظر آیا اور نہ کبھی نمائشی اسراف کا مرتکب۔ آخری ملاقات دو سال قبل ہوئی تھی۔ میرے ایک عزیز پشاور سے آئے: انھیں طفیل کے حوالے سے کسی سے ملاقات کرنا تھی۔ میں انھیں لے کر صبح صبح ہی ان کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ دفتر جا چکے ہیں۔ وہاں پہنچا تو طفیل بدستور ایک پرانی میز کے سامنے بیٹھ کر کام کر رہے تھے۔ میں نے دیر کے بعد دیکھا۔ صحت گری ہوئی تھی۔

میں نے کہا: "اِس صحت کے ساتھ کیوں کام کرتے ہو؟"

کہنے لگا۔ "اور کوئی کام بھی تو نہیں۔"

میں دیر تک بیٹھا رہا اور اسکی طرف تکتا رہا۔ وہ شاداب پُرعزم محجوب ہوا سے لہراتا ہوا نوجوان جو ۳۵ سال پہلے ماڈل ٹاؤن میں نقوش کی خبر دینے مجھے آیا تھا۔ آج علالت اور بڑھاپے کے بوجھ سے مرجھا چکا تھا۔ لیکن اُس کا عزم آج جوان تر تھا۔ اچھی اور کامیاب زندگی گزارنے والے لوگ غالباً اِسی نوع کے ہوتے ہیں۔

دنیا کے ادب و شعر میں طفیل ایک کارنامے کے مالک کی حیثیت سے ابدی یادگار کا مالک بن گیا ہے۔ یہ کارنامہ نقوش ہے۔ جسے اُس نے زمین پر ترتیب دے کر آسمان تک پہنچا دیا۔ پاکستان میں اس وقت تک اَن گنت جرائد شائع ہوتے لیکن جو کامرانی اور کامیابی طفیل کے نقوش کو نصیب ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ ایک عدیم المثال منتظم تھا۔ جسے اپنے ذاتی مراسم کو خوب صورتی سے نبھانے کا فن آتا تھا۔ بات چھوٹی ہی سہی لیکن گزشتہ عید الفطر پر بھی اُس نے اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے مجھے ایک نہایت پیارا عید نامہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ جیسے میرے سارے ٹبر نے بڑھ کر

داد دی۔ اور جب میں نے انھیں بتایا کہ طفیل گزشتہ ۳۵ سال سے یہ روایت نبھا رہا ہے تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس عقیدے کا حال تھا۔ ؎

بیا تا قدرِ یک دیگر بدانیم
کہ تا ناگہ بہم دیگر نمانیم

اللہ اُسے غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

جاوید سلمہٗ نے نقوش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ باری تعالیٰ اُسے موفقیت ارزانی کرے۔ آمین۔

ہم قلم

کرشن چندر

میں برائی کرنے کے موڈ میں ہوں، خاص کر دوستوں کی بُرائی۔ عمر کے جس حصے میں ہوں اُس میں یہی عارضہ لاحق رہتا ہے۔

آج صبح سے تُلا بیٹھا ہوں کہ اپنے دوست محمد طفیل مدیرِ نقوش ساکن لاہور پاکستان کی بُرائی کروں۔ مگر جس آدمی میں کوئی بُرائی ہی نظر نہ آتے۔ اُس کی کوئی برائی بھی کرے تو کیا کرے۔ حالانکہ یہ بات محمد طفیل کے حق میں نہیں جاتی، کیونکہ عیوب ہی سے انسان کی شخصیت دلچسپ بنتی ہے۔ نیکی ہمیشہ بور کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عیوب سے خالی ذات صرف اللہ ہی کی ہے اس لیے محمد طفیل میں بھی بہت سی برائیاں ضرور ہوں گی مگر آدمی کائیاں ہے۔ اپنی برائیوں کو اس طرح سینچ سینچ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا کر رکھتا ہے۔ جہاں کسی قریبی سے قریبی دوست کا بھی گزر ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب کہیں وہ اپنے آپ کو اکیلا دیکھ پاتا ہو تو دل کے خفیہ لاکر کو کھول کر، اپنی برائیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔

ذخیرہ اندوزی اس کی پرانی عادت ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ نقوش کے ضخیم نمبر موجود ہیں۔ میں نے نقوش کے لیے خصوصی کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اس کمبخت رسالے کا ہر نمبر ہی خصوصی ہوتا ہے۔ کسی دن اُس لاکر کی کنجی اگر مل گئی تو طفیل صاحب کی ساری برائیاں طشت از بام کر دوں گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موقع موقع سے اپنی برائیوں کو دُھوپ دکھانی چاہیے ورنہ برائیوں میں دیمک لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر وہ دوست ہی کیا جو بُری صلاح نہ دے۔

خوش قسمتی سے میرا شمار بھی طفیلیوں میں ہی ہوتا ہے۔ گو کہ یہ بات طفیل صاحب کو معلوم نہیں، طفیل کی ظاہری شکل و صورت کا کہوں کہ بالکل اپنے رسالہ نقوش کی طرح گرانڈیل اور بھاری بھرکم ہے۔ وہی سنجیدگی، وہی وقار، جس سے جی الجھتا ہے۔ طفیل کو چھپائیے نقوش کو نکالیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے طفیل کو نقوش کے لیے پیدا کیا یا نقوش کو طفیل کے لیے تولد کیا۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ ہیں۔ کسی نے جڑواں بھائیوں میں بھی ایسی یکسانیت نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ایسی محبت! اگر کبھی نقوش کے کسی نمبر کے صفحات کی تعداد ایک ہزار سے کم ہو، تو طفیل کی صحت کے بارے میں اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں اور اب تو جب سے مجھے قلب کا عارضہ لاحق ہوا ہے ڈاکٹروں نے مجھے کتابوں کی الماری سے نقوش اٹھا کر لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب اگر مجھے نقوش پڑھنا مقصود ہے تو ایک ملازم آئے گا اور وہ بیچارہ جیسے تیسے کر کے ہانپتا کانپتا نقوش کا نمبر اٹھا کر میرے سامنے لائے گا اور اسے میرے مطالعہ کے لیے لکڑی کی رحل پر رکھ دے گا۔ صفحات اُلٹتے جائیے طفیل کے دل و دماغ کی

پرتیں خود بخود کھلتی جائیں گی کہ ان دنوں پاکستان کے اردو ادب میں کیا ہو رہا ہے! تمام مواقع، حادثے، رونمائیاں، رسوائیاں، دوستوں کے جھنجھٹ، تخلیقات کے ہجوم، وہ سب آپ کو گھیر لیتے ہیں اور جس دن گھر میں نقوش وارد ہوتا ہے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔

طفیل کسی قدر خبر رس بلکہ کنجوس بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ لاہور سے دلّی میرے ہاں آیا تو میرے لیے گوجرانوالا کے مالٹوں کی ایک پیٹی لایا، حالانکہ احمد ندیم قاسمی کو لا سکتا تھا، میرزا ادیب کو لا سکتا تھا، عبد المتین عارف کو لا سکتا تھا، ابنِ انشا کو لا سکتا تھا، حامد علی خان، صلاح الدین احمد اور نذیر چودھری کو لا سکتا تھا۔ اور اسے کرنا بھی کیا تھا۔ ان سب دوستوں کو جن کے میں نے نام لیے اور ان تمام احباب کے جن کے میں نے نام نہیں لیے ان سب کو مکھی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے لے آتا۔ نہ کسٹم کا ڈر نہ ویزے کا خوف۔ یہاں آ کر ہم منتر پڑھتے، ڈبیا کھولتے تو وہ سب لگ ہم میں موجود ہوتے، وہ ہمنفسانِ رفتہ اور یارانِ دل گرفتہ اور وہ سب جو ہمارے دل کے پیارے ہیں اور وہ سب جو خدا کو پیارے ہوئے اور وہ سب جن کو ہم نے گویا صدیوں سے نہیں دیکھا۔ ان سب سے ہم گلے مل لیتے۔ طفیل سے اتنا بھی نہ ہوا، اس لیے کہ وہ جب میرے گھر کے آنگن میں مجھ سے بغلگیر ہوا تو اتنی دیر تک نہ صرف اس کے سینے بلکہ لاہور کے دوسرے تمام احباب کے سینوں کی حرارت مجھ تک پہنچتی رہی۔ اور جب میں نے اس سے اکیلے آنے کا سبب پوچھا تو اپنے مخصوص سنجیدہ اور نیم شریر لہجے میں وہ بولا، کس کس کو ساتھ لاتا، بھئی وہ سب تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔

میں نے کہا، جھوٹ مت بولو، لاہور میں رہ کر کوئی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا سدا بہار جگمگاتا ہوا فانوس بدن شہر اپنی لافانی جوانی کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر میں رہ کر اگر کوئی بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے، اور منڈی بہاؤ الدین، بستی چھپڑاں والا اور چک نمبر چار سو بیس میں جا کر سکونت اختیار کرے، مگر لاہور کے نام کو بٹہ نہ لگائے۔ اس پر وہ مجھ سے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر بغل گیر ہوا اور بولا:

نہیں! میرے سب دوست جوان ہیں اور خوش ہیں اور خیریت سے ہیں اور اس مالٹے کی پیٹی میں ان سب کے خلوص کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔

مجھ پر کبھی کبھی جھک چڑھتی ہے تو بمبئی چھوڑ کر دلّی چلا آتا ہوں اس لیے کہ لاہور تو جا نہیں سکتا، سوچتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دوں گا اور اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دوں گا۔ کبھی چھ مہینے اور کبھی سال بھر دلّی میں رہتا ہوں اتنے میں وہاں کے پبلشر مجھ سے اوبھ جاتے ہیں۔ وہ میری تہی دستی اور میں ان کی بالا دستی کا قائل ہونے لگتا ہوں اور پھر دلّی چھوڑ کر بمبئی کی فلمی دنیا میں لوٹ آتا ہوں۔ ایسا دو تین بار کر چکا ہوں۔

اب کے جو طفیل صاحب سے دلّی میں ملاقات ہوئی تو میں بے حد تفریحی موڈ میں تھا۔ طفیل مسز ممتاز مرزا کے ہاں ٹھہرے تھے۔ مگر تقریباً ان سے ہر روز ملاقات رہتی تھی۔ وہ نو دس دن ایسی ہماہمی میں گزر گئے کہ کچھ اندازہ

ہی نہیں ہُوا اُن نو دس دنوں میں مَیں لاہور میں رہا اور وہ دِلّی میں رہے۔ اور ایک ایک کر کے انھوں نے اپنے تمام دوستوں کو ڈھونڈ نکالا اور اپنی خرابیِ صحت کے باوجود اس نے ہم سے زبردست دعوتیں کھائیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے جو مزا زبردستی کی دعوت میں ہے وہ اُن ملاقاتوں اور دعوتوں میں بھی نہیں ہوتا، جہاں خود اصرار سے بلائے اور مدعو کئے جاتے ہیں۔ شام کو اکثر ہم کہیں نہ کہیں کسی بہانے اکیلے بیٹھ جاتے۔ دن کو تو میں انھیں گھومنے کا موقع دے دیتا تھا مگر شام ہوتے ہی انہیں پکڑ لیتا اور پھر یادوں کے گھنے گلزار میں ہم دوستوں کے جھرمٹ آباد کرتے اور محبت اور خلوص کے ان حسین لمحوں کو یاد کرتے جن کی نشیلی چھاؤں میں اُردو، ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں نے ادبی تخلیقات کے کیسے کیسے حسین پیکر تراشے ہیں۔

طفیل احساس کی نازکی کو بہت سمجھتے ہیں۔ خود بھی جلدی آزردہ خاطر اور زود رنج ہو جاتے ہیں کیونکہ طفیل صرف ایک پبلشر ہی نہیں ہے بلکہ ادیب بھی ہے۔ "محترم" ان کا ایک مشہور سفر نامہ ہے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس پر جانے کے بعد لکھا گیا۔ مگر طفیل بالخصوص اپنے نازک خاکوں کی تخلیق کے لیے مشہور ہیں جن میں انھوں نے جگر مراد آبادی سے لے کر اختر اورینوی جیسی مقتدر شخصیتوں کے قصر تعمیر کئے ہیں۔ یہ سب کے سب ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:

نمبر ایک "صاحب" نمبر دو "جناب" نمبر تین "آپ"۔

ان کے بعد دو اور مجموعے ان کے آنے چاہئیں۔

اور نمبر چار "آپ جناب" نمبر پانچ "اناپ شناپ"۔

مؤخر الذکر مجموعہ طفیل کے دشمنوں کے متعلق ہوگا یا ایسے مضمون نگاروں کے متعلق جن کی تخلیقات کسی وجہ سے نقوش میں شامل نہیں ہو سکیں۔

طفیل کے یہ خاکے بڑی بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں فاصلے بھی ہیں اور قُربتیں بھی، دُوریاں بھی ہیں اور طرف داریاں بھی۔ مگر کہیں کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں ہے مگر چھینٹے ضرور اُڑائے ہیں۔ طفیل ان خاکوں میں اُس بچے کی طرح ہے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہے اور برابر دوسروں پر چھینٹے اڑائے جاتا ہے اور جب کوئی دوسرا انہیں ملتا تو اپنے آپ پر ہی چھینٹے اڑانے لگ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل کا بچپن کیسا تھا! مجھے تو ایسا لگتا ہے وہ ابھی تک بچپن کے عہد سے باہر نکلا ہی نہیں۔

سنا ہے آج کل طفیل دھڑا دھڑ ٹیکسٹ بک چھاپ رہا ہے اور نقوش سے آج کل اس لیے بیزار ہے کہ اس کے دوست اس کے رسالے کے لیے اس کی پسند کی چیزیں نہیں بھیجتے۔ لیجئے چلتے چلتے میں نے طفیل کی ایک برائی تو پکڑ لی۔ طفیل بھائی! تم بے شک ٹیکسٹ بک کے انبار لگا دو چھاپ چھاپ کر، لیکن تمہارے نقوش کا صرف ایک شمارہ ان سب پر بھاری رہے گا، علم و ادب دونوں کے اعتبار سے۔ آؤ گلے ملو، جھوٹے کہیں گے ہر سال آنے کا وعدہ کرتے ہو اور

کہ نہ تم آ

کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے

آغا بابر (مقیم نیو یارک)

کوئی مکتبہ، تنظیم، ادارہ قایم کرتے وقت سب سے پہلے نام پر غور کیا جاتا ہے۔ نام کئی دماغ میں آتے ہیں۔ ایک نام بار بار نگاہوں کے سامنے کودتا پھاندتا ہے کہ آدمی اُس نام کے آگے زچ ہو جاتا ہے۔ داناؤں کا قول ہے:

> بچے کا نام آپ نہیں رکھتے، چچا رکھتا ہے نہ تایا ابّا۔ نام کوئی پُراسرار طاقت رکھتی ہے۔ خواہ مخواہ کی داد نام رکھنے والے کو ملتی ہے حالانکہ انجانی طاقت ایک نام کو بار بار اچھالتی ہے کہ تان بس اس نام پہ ٹوٹتی ہے۔

خدا جانے "ادارۂ فروغِ اردو" نام کس نے رکھا۔ نام "نقوش" کس نے رکھا۔ جنّت میں بیٹھا محمدؐ کا طفیلیا جانے۔ محمدؐ کے ساتھ طفیل کا نام لگا کہ پیغمبرِ خدا کا طفیلیا کس نے بنایا پھر "نقوش" رسالہ نکالنے کا خیال کیوں آیا۔ ہاتھ میں اُس وقت رقم کتنی تھی! ارادے نے اتنی بڑی چھلانگ کیسے لگائی۔ کشتی سمندر میں اُتری تو چپو کس کے ہاتھ میں تھے! "نقوش" گرداب میں کتنی بار پھنسا۔ کہاں کہاں سے قرض لیا، خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے والا وقت بھی آیا ہوگا۔

میں نے ایک روز طفیل صاحب کو لکھا فرصت نکال کر کبھی ایک خاکہ "نقوش" پر بھی لکھ ڈالیے۔ پڑھنے کو بڑی مزے دار باتیں ملیں گی۔ سادگی، شوخی، سلاست اور مٹھاس کا ان کی تحریر میں قوام تھا۔ خاص روشنی کی چمک بین السطور ہوتی۔ میری اکساہٹ اگر کام کر جاتی تو میں اُن سے ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھوا لیتا جس میں "نقوش" جاری ہونے کی داستانِ دلپذیر ہوتی جس سے ان کا کوئی مثنیٰ آنے والے دور میں اُن کے جنون و آشفتگی کی داستانِ عشق سے فائدہ اٹھا سکتا۔

مجھے یہ خیال اس طرح آیا کہ ایک مُنا سا رسالہ "داستان گو" اشفاق احمد نے جاری کیا تھا۔ اِس رسالہ کا دفتر کیا تھا مال روڈ پر "آفاق" اخبار کے دفتر کی سیڑھیوں کی بغل میں سر چھپانے کو بس مُٹّی سی جگہ تھی جس کا جغرافیہ معلوم کرنا خود کو الجھن میں ڈالنا تھا، ایک تن تنہا صعت پڑچھتی پہ بچھی تھی۔

غریب خانے کے دیکھو تکلفات آکر
کہ فرشِ خاک ہے اور بوریا بھی ہے

"داستان گو" میں اشفاق احمد نے ایک مزے کا مضمون لکھا جس میں رسالہ کے جاری ہونے کی داستان تھی جس کا ظاہر و باطن پڑچھتی پر بچھی ہوئی صعت پر نازل ہوا۔ یہ داستان پڑھنے کے بعد مجھے مجید لاہوری کے ہفتہ وار "نمکدان" کراچی کا دفتر یاد آ گیا تھا جس کا طول و عرض نمکدان جتنا ہی تھا۔ جتنا نمک نمکدان میں ہوتا ہے بس اتنے نمک جتنی اُس ڈربے میں

چاندنی بچھی ہوتی تھی جس میں تن و توش مجید لاہوری کا اِس طرح پھیل جاتا کہ مہمان آئے تو دہلیز پر ہی بیٹھے۔ مجید لاہوری خود بڑے پھیلاردار وجود کے آدمی تھے۔

"نقوش" کے دورِ جلالت کو دیکھتا تو جی میں آتا یقیناً اِس رسالہ کے جاری ہونے کی بھی کوئی داستان ہو گی۔ منصۂ شہود پر آجائے تو خوب ہو۔

ایبک روڈ پر ایک دفتر "ادارہ فروغِ اردو" کا۔ اردو بازار میں دوسرا "نقوش" کا۔ "نقوش" کا اپنا پریس۔ اپنی طباعت کے ساتھ ساتھ سکولوں کی نصابی کتابوں کی طباعت۔ کس بھاگوان ساعت اور نیک گھڑی میں "ادارہ فروغ اردو" اور "نقوش" کے نام رکھے گئے تھے اور کس نیک بخت نے رکھے تھے۔ اگر کہیں ہم حُسنِ نیت۔ تو نیت تو سب کی ٹھیک اور نیک ہوتی ہے۔ "داستان گو" کی بھی۔ مجید لاہوری کے "نمکدان" کی بھی، اور بہت پیچھے کی بات کریں تو چراغ حسن حسرت کے "شیرازہ" کی بھی۔ یہ سب رسالے 'فرشِ خاک ہے اور بوریا بھی ہے' کی بے سروسامانی سے ظہور پذیر ہوئے تھے مگر صغرسنی میں ہلاک ہو گئے۔ شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" کو تقسیمِ ہند کا پالا مار گیا۔ "نقوش" جو مصائب کی منجدھار میں کئی دفعہ پھنسا، کئی بحران آئے اور سمندر کی تہ سے دُرِ شہوار لے کر اس طرح اُبھرا کہ ادب کے بحرِ بے کنار میں مینارۂ نور بن کر نصب ہو گیا یوں جیسے اُس پر کسی پیرِ فقیر کا ہاتھ ہو، خدا کی عطا ہو۔ زندگی آموز ادب کا یہ قدآور علمبردار پودا تناور درخت بن گیا جس کا سایہ روز بروز پھیلتا گیا۔ "نقوش" میں ادب نہ چھپتا خزینۂ ادب چھپتا۔ مُہریں ٹکسال کی ہوتیں۔ سونا پاسے کا۔ "نقوش" میں چھپ جانا مقامِ افتخار۔ "نقوش" میں چھپنا ادب کے محافظوں میں شامل ہو جانے کی سند۔ کوئی بھی کامیاب اخبار، رسالہ، ڈراما، فلم، ادبی ادارہ ہو اُس کے پیچھے ایک ڈائنے مک شخصیت ہوتی ہے۔ وہ آیا۔ اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ "نقوش" کے پیچھے محمد طفیل کی شخصیت تھی، اُس کی آہِ خانہ ساز "نقوش"۔ اندوہِ وفا "نقوش"۔ اُس کا کرب "نقوش"۔ اُس کا جنون "نقوش"۔

"نقوش" میں وہ صرف ایک آدھ صفحہ کا اداریہ لکھتا تھا مگر گہرے پانیوں سے خوب صورت کوڑیاں، سیپیاں اور گھونگھے اکٹھے کر لاتا۔ آنکھیں اُس کی تحریر کو پڑھتیں جو دل میں اُتر جاتی۔ خاکہ لکھتا۔ مسکراہٹ انگڑائیاں لیتی۔ اس کی زبان کی سادگی اس کی تحریر کی لذت۔

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم (حالی)

آپ باتیں کرتے جایئے۔ وہ کبھی کبھی بس مسکرائے۔ آپ زمین آسمان کے قلابے ملائیے چلی وہاں صرف محض تبسم خفی۔ مسکراہٹ کا بس ایک سُوت برابر ڈورا لب کے کونوں میں کہیں بنتا اور تحلیل ہو جاتا۔ یہی وہ لمحۂ خورشید ہوتا جب بات کا وہ پورا مزہ لیتے۔

رسولؐ نمبر میں بے طرح جُتے ہوئے تھے۔ اُن کی صبح و شام کی مصروفیت کا مجھے علم تھا۔ میں نے افسانہ بھیجا اور

لکھا دسواں نمبر کے بعد جب "نقوش" کا فضول نمبر نکلے تو اُس میں چھاپ دیجئے۔ میں نے یہ جان کر لکھا کہ مصروفیت کے مارے اس شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا کتان پھیل کر اُسے تھوڑی سی ریلیف دی جائے۔ آخر چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر ہی تو ہم جیتے ہیں۔

میں جب خط لکھتا، لکھتا طفیل صاحب۔ وہ جواب میں برادرم لکھتے۔ آپ ہی کہئے ——

وہ اس ادا سے جو آئے تو کیوں بھلا نہ لگے

کہانی لکھنے اور شعر کہنے والے کے پاس ہوتا کیا ہے، رسمِ عاشقاں، نامۂ شوق، عشقِ بُتاں، ایک محبت لاکھ خطائیں، زیست کا خریطہ، حرف وحقایق کا پشارہ جو اندر باہر سے کافر۔ کیا کیا ہم بیہودہ نویسیاں نہ اُن کو بھیجتے اور وُہ چُوم کر چھاپتے۔ مگر ہائے مولانا حالؔی اور حسرت موہانی۔ باہر سے اتنے متشرع، اتنی دین داریاں، مصلّے وضو نمازیں پاکدایاں اور اندر سے عشقِ بُتاں میں سوختہ گداز رندِ جہاں کہ:

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم (حالؔی)

یہ واردات بھی تو دل پر گزرتی ہے کہ سب کچھ کہنے پر کچھ رازداں سے پھر بھی چھپا لیا جاتا ہے۔ اپنی طبیعت کی اس کج ادائی پر ہزار لعنت کہ طفیل صاحب سے ہم

ہزار بار ملے پھر بھی آشنا نہ لگے

یوں ایک دوسرے کو ملتے جیسے اپنی اپنی اقلیم کے ولی۔ دونوں اندر سے جانتے۔ تو بھی ہے میں بھی ہوں۔ راجہ پورس سکندر اعظم کی طرف دیکھے یا سکندر پورس کی طرف۔ جیتا کون اور ہارا کون۔ سوال یہ نہیں۔

وہ جس پر خاکہ لکھتے یوں جیسے نواب مرزا داغؔ دہلوی معشوق کے پاؤں گدگداتے۔

گدگداؤں تو کہوں پاؤں دبالوں تو کہوں

اور کہتے تو سب کچھ کہہ ڈالتے۔ رازداں سے کھُل کر باتیں کر جاتے۔ انہوں نے دھم دھما کے خاکے لکھے اور چوٹی کے لکھے۔ اُن کا آخری خاکہ مجھ روسیاہ پر تھا۔ ایسا کہ

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی
وُہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے (ضیاؔ)

جیسے شمس تبریزی نے مولانا روم کے ہاتھ سے کتاب چھین کر پانی میں پھینک دی۔ کون ولی، میں کہ تُو۔ قدرت کی کیا بھُول بھلیاں ہوتی ہیں۔

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

رومی نے جونہی شمس کا پیچھا کیا شمس غائب۔ جب خط کے جواب میں ہم نے انہیں برادرم لکھنا شروع کیا تو برادر دوسرے

دلیس چل بسا۔

پچھلے برس اعجاز بٹالوی کے بیٹے سلمان کی شادی پر میں پاکستان گیا تو ولیمہ کے استقبالیہ پر طفیل صاحب بغلگیر ہوکر ملے۔

"ملے بغیر نہ جائیے گا۔"

میں نے کہا:

"کیسے ہو سکتا ہے!"

اردو بازار میں اُتر کر کُوبہ کُو، گلی در گلی بھول بھلیوں سے ہوتا آستانۂ "نقوش" پر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر چہرے پر وہی سُوت برابر ڈورا مسکراہٹ کا نمودار ہوا۔ میں ساری بھول بھلیاں بھول گیا۔

صاف ستھری میز پر بیٹھے ہیں، میز پر ایک کاغذ نہیں۔ سوچنے لگا یہ "نقوش" کے اڈیٹر کی میز ہے۔ "ادبی دنیا" کے اڈیٹر مولانا صلاح الدین کی میز تو کاغذوں سے اَٹی پڑی ہوتی تھی۔ دائیں بائیں کاغذ مسودے لپٹے بکھرے سمٹے سامنے بس اتنی جگہ ہوتی کہ لکھ سکیں۔ چائے کی پیالی کی جگہ کاغذوں کو سمیٹ کر نکالتے "ہمایوں" کے اڈیٹر حامد علی خاں کی میز بھی اس قدر بے کاغذ نہ ہوتی۔ کاغذ کے پرزے کہیں تو اڑیں۔ آپ پانسات سو صفحے کے "نقوش" کی کتابت دیکھیں جیسے ایک ہی کاتب نے کی ہو۔ میں نے سوچا پُوچھوں یہ ایک جیسی لکھائی والے کاتب کس تہ خانے میں بیٹھے نگینے توڑ رہے ہیں۔ مگر باتوں کا رُخ کسی اور طرف کو مُڑ گیا۔

لاہور کا ذکر ہونے لگا تو میں نے کہا، راولپنڈی میں لکھنؤ کے ایک گھرانے میں میرا آنا جانا تھا۔ وہاں اہلِ زبان کے علاوہ کچھ پنجابی افسر بھی آتے جاتے۔ میری لکھنؤ والوں کے ساتھ ہم تم جو انہوں نے سنی تو سمجھے میں بھی اُدھر ہی کا ہُوں۔ ایک روز لکھنؤ والوں کے ہاں دعوت تھی۔ ایک کرنل نے کہا:

"آغا صاحب! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

میں نے کہا:

"لاہور کا۔"

بولے: "واقعی! مگر لگتے نہیں۔"

ایک کونے میں جاکر اپنی بیوی سے کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ مسکراتے ہُوئے میری طرف آئے "اچھا ایک چیز پوچھتا ہُوں اگر آپ نے بتادی تو آپ لاہور کے ہوں گے۔"

سب میری طرف یوں متوجہ ہُوئے کہ اب غالب کے اُڑیں گے پُرزے۔ وہ بولے:

"آپ یہ بتائیں کہ نَون چ۔"

حرفِ 'چ' ابھی ان کے مُنہ سے ادا نہ ہو پایا تھا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا: "نَونچڑے۔"

کھسیانے ہوکر مسکراتے۔

ایک صاحب نے پوچھا :

" وہ کیا ہوتا ہے !"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے گول دائرہ بنایا اور کہا " ایک گول تھال توہے کا جتنا بھی مَیلا سمجھ لیا جاتے۔ ایک دسترخوان میں جیسے دسترخوان کہنا غلط ہوگا بلکہ مَیلے سے چیتھڑے میں دس بارہ کلچے لپیٹے ہوئے اور تھال میں ایک طرف لونچڑے۔ بغل میں ڈگڈگی۔ تھال کو یوں کندھے پر اٹھانے گلی گلی محلے محلے چھلاوے بھنبھیری کی طرح گھوم جائے اور صدا لگائے " لونچڑے "۔

صاحب خانہ کی بیٹی نے پُوچھا :

" لونچڑے چیز کیا ہوئی !"

میں نے کہا " ابھی چائے کے ساتھ ہم نے پکوڑے کھائے ہیں۔ بس لونچڑوں کو تم پکوڑوں کا کزن سمجھ لو۔ ہر ملک میں ایک نہ ایک ناشتہ (POOR MAN'S BREAKFAST) ہوتا ہے۔ بس یہ لاہور کا صدیوں پرانا روایتی ناشتہ سمجھ لو۔ اگر یہ باسی ہو جائے تو بِک نہیں سکتا۔ اس لیے بیچنے والا ایک گلی سے جھٹ دوسری میں پہنچتا ہے۔ کسی نے روکا، جھٹ اس نے ڈگڈگی پہ تھال رکھا۔ ایک کلچہ اور اس پر دو تین لونچڑے۔ یہ جاوہ جا۔ کسی زمانہ میں کلچہ ایک پیسے کا تھا۔ ساتھ لونچڑے مفت۔ پھر دو پیسے کا ہوا، پھر ایک آنے کا۔ اب شاید کرنل صاحب کو معلوم ہو کہ کیا قیمت ہے اس کی !"

وہ مسکرا کر بولے " آپ یقیناً لاہور کے ہیں۔"

میں نے کہا : " یہ لفظ جو لاہور کے روایتی ناشتے کے لیے استعمال ہوتا تھا اب اردو زبان کا حصّہ بن چکا ہے۔ کوئی کہے کہ رات بڑی دھوم کا مشاعرہ ہُوا۔ جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مراد آبادی، حفیظؔ جالندھری نے بڑا اچھا مشاعرہ پڑھا۔ جگر صاحب کو بہت داد ملی۔ کوئی پُوچھے یہ ٹولی کی ٹولی مصرع اٹھانے والے کون تھے؟ تو جواب ملے گا شاعر اپنے اپنے لونچڑے ساتھ لے کر آئے تھے۔"

طفیل صاحب کے ہونٹوں پہ باریک سا کتان نمودار ہوا، بولے " آپ کی تحریر میں مشاہدے کی جزئیات دیکھ کر آدمی سوچتا ہے اِن سب جزئیات سے یہ صاحب بہادر شخص کس طرح آگاہ ہوگا !"

ان کی راست مہین ریشمی مسکراہٹ کے سامنے اب میرے کج ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ یقین تھا میری بھونڈی مسکراہٹ ان کے مقابلہ میں مونج یا بان کی رتی ہوگی۔

میں نے کہا : " طفیل صاحب ! آدمی کے اندر بڑا کچھ ہوتا ہے۔ اچھی مشرقیت پر اچھی مغربیت کا جزدان چڑھ جائے تو کیا ہرج ہے ! "

چشم زدن کو اُن کی مسکراہٹ کے ریشم پر شرارہ سا لپکا جیسے کسی فکر نے اجالا کر دیا۔

میری اَدھیڑی مُونچھ اور بان کی رسّی نے ایک بل کھایا " اگر میں کوئی ڈراما اسٹیج کروں اور اپنے کردار سے کہوں دیکھو یُوں مسکراؤ جیسے محمد طفیل اڈیٹر نقوش ' مسکراتا ہے۔ مہین مہین باریک باریک فکر مندی کے ساتھ۔ تو وُہ مجھ سے اگر یہ کہے آپ پہلے مجھے ذرا ویسے مسکرا کر دکھائیں تو کوشش کے باوجود میں اُسے نہ بتا پاؤں گا۔"

طفیل صاحب کی اداؤں میں سے ایک یہ بھی تھی، اپنے خط میں صرف مضمون موصول ہونے کی اطلاع دیتے۔ آپ کی تحریر ملی، پسند آئی۔ جیسے مرزا داغ کو ان کی چہیتی طوائف لکھے کہ آپ کی بھیجی ہُوئی کشمیری شال ملی، پسند آئی۔

پسند آئی میں محبت کی تمام منزلیں طے ہو جاتیں۔

سِول سروس کے افسروں کے حلقے میں انگریز کی جو پُرانی تربیت آئی ہے اُس میں یہ بھی ہے کہ کبھی کسی سے کومٹ مت کرو۔ واللہ اعلم یہ سبق طفیل صاحب نے کہاں سے لیا۔ سب چھپے گا، کس پرچے میں چھپے گا، چھپے گا بھی کہ نہیں۔ یہ کومٹ نہ کرتے۔ میں نے ایک ڈراما " آخرِ شب عرف میرا جی کی موت"، بھیجا۔ جواب میں لکھتے ہیں؛

میرے بھائی!

میرے بھائی!

آپ کے ایک دو خطوط ملے۔ میں نے آپ کو یاد نہ کیا۔ یہ میری کاہلی ہے جسے معاف نہیں کرنا چاہیے مگر معاف کر دیجئے!

آپ نے چار جرابوں کے جوڑے بھجوائے تھے۔ جنہیں پہن رہا ہُوں۔ ہر روز یاد کرتا ہُوں مگر خط نہیں لکھتا۔ نالائقی اور کسے کہتے ہیں؟

آپ نے میرا جی پر ڈراما بھجوایا۔ عجیب و غریب شخص پر عجیب و غریب ڈراما۔ بہر حال مجھے تو اچھا لگا۔ آپ نے اسے اس سے پہلے کیوں نہ چھپوایا؟

اپنی قلمی تحریریں اِدھر برابر بھجواتے رہیں تاکہ قلم کو مزید زندگی ملتی رہے۔ ہم نے تو اِدھر، اُدھر اپنے قلم ہی سے تو زندہ رہنا ہے۔ غلط کہا؟

آپ کا اپنا
محمد طفیل

۴-۱-۸۶

مرنے سے دو مہینے پہلے اُن کا آخری خط جو نیویارک میں موصول ہُوا اُس میں انہوں نے پہلی مرتبہ یہ لکھا کہ آپ کا افسانہ کتابت کے لیے دے دیا گیا اور ڈراما کتابت ہو چکا۔

برادرم، سلام مسنون!

آپ لاہور آئے۔ جو تھوڑا وقت اکٹھا گزرا۔ وہ نہ بھولے گا۔ لونچڑے کلچوں کے ساتھ ہی نہیں ہوتے انسانوں کے ساتھ بھی لگے ہیں۔ پھر ادب میں تو لونچڑے بازی بہت ہے۔

میں نے 'نسوانی آواز' افسانہ بھی پڑھ لیا تھا۔ اپنے ڈھب کا اچھا افسانہ ہے۔ طویل تحریر بھی مختصر لگی۔

آپ کہتے ہیں دونوں چیزیں ایک ساتھ چھپیں۔ اس پہ بھی غور کئے لیتا ہوں۔ بہر حال افسانہ کتابت کے لیے دے دیا۔ میرا جی پر جو ڈراما ہے وہ تو کتابت ہو چکا۔ وہ ۲۹ صفحات میں براجمان ہے۔

آپ کی تصویریں بھی مل گئیں۔ اچھا ہوا کہ یہ بھی مہیا کر دی گئیں۔ اگر آپ کو پرچہ نہیں ملا تو ہوائی ڈاک سے بھجواتا ہوں۔

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

محمد طفیل

۱۰-۵-۸۶

لکھنے والوں کو طفیل صاحب رسالہ مفت بھیجتے۔ اُن کی اِس وضعداری اور محبّت کا نقش صیغۂ واحد سے صیغۂ جمع بن کر دل پر نقوش بنتا جاتا اور گردن اِس اعزاز پر شرم سے جُھک جاتی۔ دوسرے رسالہ کو تحریر بھیجتے وقت تھوڑا سوچتے اگلا افسانہ طفیل صاحب کو بھیجا جائے گا۔ نئے رسالوں کے اڈیٹر تقاضا کرتے تو میں لکھتا جس طرح اپنی کار کا مستری، اپنا درزی اور اپنا ڈاکٹر نہیں بدلا جا سکتا اسی طرح اپنا رسالہ بھی نہیں بدلا جا سکتا۔

طفیل صاحب رسالہ میں چھپے ہوئے مضمون کی ایک طباعت شدہ کاپی رسالہ کے ساتھ لکھنے والے کو بھجواتے جو لکھنے والا محفوظ کر لیتا، "نقوش" کا تیا پانچا نہ کرنا پڑتا اور "نقوش" کی مجلّد کاپی نک سک سے درست محفوظ رہتی۔ ان کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ "نقوش" کے اندر قینچی یا چُھری ماری جائے۔ اتنی نفیس اداؤں والا یہ کب چاہے گا کہ آپریشن کی چُھری ہاتھ میں دے کر اپنے دل کا تیا پانچا کرا لے۔ دلِ بیمار کے ساتھ جئے جاؤ جتنا جیا جائے۔ کھاتے جاؤ تیر بجاتے جاؤ مُرلی۔ اُن کے سینۂ بریاں کا حال مجھے کیسے معلوم ہوتا! مجھے تو اپنے بھانجے ڈاکٹر مبشر سے معلوم ہوا کہ طفیل صاحب بعارضۂ دل اُن کے زیرِ علاج ہیں۔

کہتے ہیں علامہ اقبال شعر کی داد کم ہی دیا کرتے تھے۔ بس ایک نگاہ اٹھا کر شاعر کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد دکن میں اُن کے اعزاز میں بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہوا۔ شاعر آتے اور پڑھ کر چلے جاتے۔ ایک صاحب مسعود علی محوی حیدرآبادی تشریف لائے۔ انہوں نے فارسی میں غزل پڑھی۔ جب یہ شعر آیا:

درد دادی و باندازۂ درماں دادی
آخر ایں درد باندازۂ درماں تا کے؟

تو علامہ اقبال نے ایک نگاہ اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔ شاعر خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ اُٹھ کر آداب بجا لایا۔ شعر کا مطلب تھا تُو نے درد دیا اور اُس کے اندازے کے مطابق درماں بھی دیا۔ مگر درد اور درماں کی کشمکش میں درد جیتے گا۔ درماں کب تک ساتھ دے سکے گا۔ طفیل صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

پچاسی سے اُوپر ہو چکے تھے فراق گورکھپوری جب اُن کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں بہت بڑے جلسے کا اہتمام ہوا۔ اُن کے گلے میں بہت سارے ہار ڈالے گئے۔ جب جلسہ کے صدر نے جو حکومت کی کابینہ کا وزیر تھا اُن کے گلے میں ہار ڈالا تو فراق صاحب نے مُسکرا کر کہا:

"اچھا آپ بھی آن پہنچے مجھے بیوقوف بنانے کو۔"

پھر انہوں نے تقریروں کے جواب میں جو تقریر کی اُس میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے:

روگ پیدا کرے کوئی زندگی کے واسطے
صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں

ACQUIRE A DISEASE, TAKE CARE OF IT AND LIVE A HAPPY LIFE.

دل کا روگ طفیل صاحب نے بھی سینہ کے ساتھ لگا رکھا تھا اور زندگی خوش و خرم بسر کر رہے تھے مگر:

آخر ایں درد باندازۂ درماں تا کے؟

باہر سے دکھائی دیتا ہے آدمی ہنستا مسکراتا، اندر سے سوختہ جاں گداختہ دل۔ عرفی نے کتنا صحیح کہا تھا کہ میں باہر سے تو سرسبز دکھائی دیتا ہوں مگر اندر سے تمام کا تمام خون۔ میری فطرت کا یہ راز برگِ حنا کو کس نے جا بتایا۔

بیروں ہمہ سرسبز درونش ہمہ خوں
از فطرتِ من برگِ حنا را کہ خبر کرد

کسی ادبی جلسہ میں بانو قدسیہ نے کہا تھا:

ادیب بڑی کمینی ذات ہے جتنا بڑا ادیب اُتنا بڑا کمینہ۔

اس بات پر بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بات کچھ ٹھیک بھی لگتی ہے۔ ادیب آپس میں لڑ مر کیوں رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے مرنے کا انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ جھگڑا اس بات پہ۔ نہ زر، نہ زن، نہ زمین۔ صرف یہ کہ مجھے گرو مانو۔ مگر سب باون گزے طفیل صاحب کے پنجرے میں بند۔ یہ بھی اُن کا کمال تھا۔ با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام۔

مجھ پر جو خاکہ لکھا اُس میں طفیل صاحب لکھتے ہیں:

"آغا صاحب پیروں فقیروں کے بڑے خلاف ہیں۔ تعویذ گنڈوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ سب ضعیف الاعتقادی کا چکر بتاتے ہیں۔ مگر آپ کو قدرے راز کی بات بتاتا ہوں جب انہیں خود کوئی مشکل پیش آتی ہے یہ سیدھے پیروں فقیروں کے پاس پہنچتے ہیں۔"

طفیل صاحب ایک مرتبہ میں نے ایک پیر صاحب سے کہا:

"میں نے پیروں کے خلاف بہت لکھا ہے۔"

بولے:

"اپنی سب تحریریں مجھے دیں میں انہیں کتاب کی صورت میں شائع کروں گا۔"

بات مزیدار کہی۔ یعنی آپ لکھتے رہیے لوگ باز آنے والے نہیں۔ پیر کو معلوم ہے پانی کہاں مرتا ہے۔ عوام کی سائیکی سے پیر خوب واقف ہے۔ میں پیر اور عوام دونوں کی سائیکی پر نگاہ رکھتا ہوں۔ میرے جذبۂ تجسس پسندی اور تماشا بینی کی حس متکبر پیر کے حجرے میں بھی جھانکتی ہے اور مرید کی ضعیف الاعتقادی کی کٹیا میں بھی۔

سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

تماشا بینی اور تجسس پسندی کا یہ جذبۂ خانہ خراب مجھے بہت جگہوں پر لے کر گیا۔ نہ کسی پیر کے دانہ و دام میں پھنسا نہ کسی طوائف کی زلفِ دوتا میں دل اٹکا۔

اِس آہوِ رم خوردہ کا جال میں آنا مشکل تھا
سحر کیا اعجاز کیا جس نے بھی ہم کو رام کیا (میر تقی میرؔ)

پیر کو طوائف کے ساتھ یوں باندھ رہا ہوں کہ دونوں کا مرض اور علامات ایک سی ہیں۔ اِن دونوں کا مطالبہ ایک سا ہے۔ میرے جال میں پھنسے رہو۔ دونوں اپنے سحر اور اعجاز سے اپنے مریدوں اور عاشقوں کو اپنے قابو میں تھامے رکھتے ہیں۔ پیر کی کمائی ہوئی ڈاڑھی اور طوائف کا کمایا ہوا بدن دونوں ایک لیول پر ہیں۔ مکڑی کی جبلّت اُس کے بدن میں لیس دار مادہ پیدا کرتی ہے کہ جال بُن سکے۔ یہ لیسدار مادہ پیر مذہب کی اونچ نیچ سے حاصل کرتا ہے اور طوائف ادا و دلبری سے۔

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے (غالبؔ)

میرا شوقِ تماشا بینی ابھی تک آنکھیں کھولے بیدار ہے۔ جستجو اور تلاش تھک کر بیٹھ نہیں گئی۔ سات سمندر پار بھی رو بہ عمل ہے۔ اُس کی رُو بہ عملی کا اختصار یہ ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر سلیم میر ایک طرح سے نیویارک کی دائی ہیں۔ جہاں کہیں بھی اپنی تہذیب اور کلچر کے تولّد کا سراغ پاتے ہیں مجھے لے پہنچتے ہیں۔ آگے اُن کے ایک اور مخبر حیدر آباد دکن کے ظہیر یوزائی ہیں جو اُن کو اِس امر سے باخبر رکھتے ہیں کہ غالبؔ کے پرزے کب

اور کہاں اڑیں گے۔ اڑیں یا نہ اڑیں تماشا دیکھنے کو ہم ضرور پہنچ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر میر کے تجسس نے نیویارک میں ترکیہ کے سلسلۂ جرّاحیہ کے ایک ترک پیر کا کھوج نکال لیا۔ ہم پہنچے تو طوسن بابا انگریزی میں بڑی دلچسپ تقریر کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ہنساتے بھی جاتے۔ عشا کی نماز کے بعد حاضرین فرش پر دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ دائیں طرف منہ موڑ کر لَا اِلٰہ اور بائیں طرف منہ پھیر کر اِلَّا اللّٰہ کی ضرب دل پر لگاتے۔ پھر دائرے کی صورت میں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دف کی تال پر پاؤں کی خاص نرت اور بھاؤ سے رقص کرنے لگے۔ یہ رقص سلسلۂ مولویہ (مولانا جلال الدین رومی) کے رقصِ درویش سے مختلف تھا۔ رقص کے بائیس چکروں کے بعد جب سر چکرایا تو یہ لوگ رک گئے۔ پیشانیوں پر پسینہ چمک رہا تھا آنکھوں میں سرخی کا ڈورا تھا۔ ایک ہیجانی کیفیت کے زیرِ اثر بڑے وگر طریقہ سے کمر کو آگے پیچھے حرکت دیتے اور زبان سے یا حیُّ یا حیُّ پکارتے۔ حیُّ حیُّ کی آواز نعرۂ تلذذ کی جھلک لیے ہوئے ہائے ہائے کی آواز بنی ہوئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر میر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا: "روح کی یہ چیر پھاڑ اور جرّاحی میرے کافرانہ فہم میں SEX - SUBLIMATION سے آگے کچھ نہیں۔ رقصِ درویش ہو یا رقصِ جرّاحیہ، کتھک ہو یا بھارت ناتیم جنس کے اڑائے ہوئے جوہر ہیں۔ جنس کا ترفع ہے۔ جذبۂ جنس کو پاکیزہ بنانے کی عذرداریاں ہیں۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے (غالب)

ترکی کی تاریخ میں مرقوم ہے کہ خلفائے ترکیہ کے دربار میں سفید اور حرم میں سیاہ رنگ ہیجڑے مامور تھے۔ ان سیاہ اور سفید ہیجڑوں کے بڑے بڑے فساد اور جھگڑے ہوتے رہتے۔ ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کے زنان خانہ میں خواجہ سراؤں کو کیا دخل حاصل تھا جو سلاطینِ ترکی کے عہد میں کالے اور گورے ہیجڑوں کو حاصل تھا۔ مجھے اِس موقع پر مولانا عبدالمجید سالک یاد آ رہے ہیں کیا باغ و بہار طبیعت تھی اُن کی۔ تقسیمِ ہند کے وقت ایک محفل میں کہنے لگے، یارو! غضب خدا کا ہم نے کبھی اپنے ہیجڑوں کی طرف دھیان نہیں کیا پلے ہوئے سانڈ، یہ بڑی گردن، بُو تھاڑ پر الٹے استرے کی کونٹھی، پھاڑی کوے کی آواز۔ مگر اُدھر سے جو خوش اندام ہیجڑے ریشمی غرارے پہنے ہوئے آئے ہیں، کیا کہنے ہیں ان کے۔ صراحی دار گردن، چھوٹا دہن، بلبل کی سی آواز۔ خدا کرے ان کے روزگار اور بحالیات کا وسیلہ نکل آئے ورنہ سلطان ترکی کے کالے گورے ہیجڑوں کی طرح لڑائی جھگڑے کھڑے ہو جائیں گے۔"

طفیل صاحب! میں اب آپ کو قدرے راز کی بات بتاؤں۔ میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد تعویذ دھاگے کا کام کروں گا۔ آپ کو یقین نہیں آتا۔ کئی ادیب ہومیوپیتھ کے ڈبے میں سے پڑیاں بنا بنا کر نہیں دیتے۔ میں تعویذوں والی صندوقچی سامنے رکھتا۔ کچھ دم کیا ہُوا پانی ہوتا۔ پھونکی ہوئی نمک کی ڈلیاں اور مِکریں ہوتیں۔ اپنی کوٹھی کے ایک کمرے میں تخت پر غالیچہ بچھاتا، گاؤ تکیہ رکھتا۔ صبح سات بجے سے دس بجے تک تعویذ دھاگے کا کام کرتا۔ مگر دانے دانے

پر مہر ہوتی ہے۔ میرا آب و دانہ امریکہ کا ہو چکا تھا ورنہ یہ کام تو پیروں سے میں نے سیکھ بھی لیا تھا اور اِس میں ذرا سا ڈرامے کا ایلمنٹ بھی طے کر رکھا تھا۔ دو نازک اندام خوب صورت ہیجڑے ملازم رکھتا، ایک آنے والوں کو عزت سے بٹھاتا دوسرا میری حاضری میں رہتا جو سائل کو پیش کرتا۔ چند دنوں میں میرا نام ہیجڑوں والا پیر پڑ جاتا پھر رفتہ رفتہ پیر آف ہیجڑہ شریف ہو جاتا۔

آپ کو جنت میں کبھی شیخ سعدی ملیں تو ان سے پُوچھیے گا وُہ واقعہ کیا تھا جب بارش والی طوفانی رات ایک دہقان کی ڈیوڑھی میں انہیں بسر کرنی پڑی تھی اور ان کا گدھا بارش اور سردی سے تنگ آ کر دروازے پہ سر مارتا تھا۔ انہوں نے اُسے بھی اندر باندھ لیا۔ پھر دہقان نے آدھی رات کو انہیں آ جگایا کہ اس کی بیوی بچہ جننے کی تکلیف میں مبتلا ہے کوئی تعویذ دو۔

کچھ جاگے کچھ سوئے سعدی نے کاغذ کے پُرزے پر اتنا لکھ دیا: "مرا جا شد خرم را نیز جا شد، زنِ دہقان زاید نہ زاید" (دہقان نے مجھے جگہ دی پھر میرے گدھے کو بھی جگہ دی، بیوی اس کی بچہ جنے نہ جنے مجھے کیا)

شیخ سعدی کو یہ بتا دیں کہ میرے پاس جو تعویذوں کی کتابوں کا مجموعہ ہے اُس میں ان کا یہ تعویذ تعویذاتِ مجرب کے باب میں سرِفہرست ہے۔ وہ متقی اور دانا شاعر ہنس کر کہے گا "طفیل صاحب! اثر تو سارا کاغذ کے پرزے میں چُھپا ہوتا ہے جس پہ لفظ لکھا جاتا ہے اور قلم کی ساری قوت اُس لفظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔"

بات تو ٹھیک ہے کئی الہامی کتابوں میں خدا کو حرف کہا گیا ہے۔ جس طرح خدا کو ثبات ہے اسی طرح حرف کو ثبات ہے۔ میں پُوچھتا ہوں کس پُراسرار طاقت نے آپ سے یہ آخری اداریہ لکھوایا جس میں آپ نے لکھا:

> "جب وہ وقت آیا کہ میری کاوشوں کی پذیرائی ہونے لگی۔ حاکمِ وقت کو بھی یہ خیال گزرا کہ یہ شخص جو سر نیہوڑائے ۳۵ برس سے ادبی جہاد میں مصروف ہے اس کے بارے میں یہ تو سوچ لیا جائے یہ تو دیکھ لیا جائے کہ وہ کس حال میں ہے!
>
> چنانچہ حکومت کا ایک اہم کارندہ میرے پاس پہنچا اور یہ مژدہ سنایا کہ اب کے حکومت آپ کی خدمات کا اعتراف کرے گی اور آپ کو اعزاز سے نوازے گی۔
>
> میں نے جواب میں کہا جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں وہاں چند سال اور گزر جانے دیجئے۔ ہم تو انعام اپنے مولا سے لیں گے۔ وہ سابقہ حکومتوں کی عدمِ توجہی پہ حیران ہوا اور یہ کہا اب کے مجھے بہ طورِ خاص بھیجا گیا ہے کہ میں آپ سے اِس امر کی اجازت لُوں کہ اگر انعام دیا جائے تو آپ اسے قبول کریں گے۔
>
> میں چُپ رہا۔
>
> اُدھر یہ خواہش کہ ہاں کر دی جائے۔

Accession Number: 200714
Date 12-12-200

وُہ دن آیا کہ مجھے اعزاز کے لیے اسلام آباد طلب کیا گیا۔

میں پہنچا، ہرچند کہ میری کارگزاریاں متعدد تھیں۔ اس کے باوجود یہ خیال آیا کہ یہ انعام ہے، یہ میرا حق نہیں ہے۔ جب انعام اور حق کے درمیان فیصلے کا وقت آیا تو میری ماں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا دل مطمئن ہونے لگا۔ انعام کے لیے میرا نام پکارا جا رہا تھا اور میں والدین کے ایصالِ ثواب کی خاطر سورہ فاتحہ پڑھ رہا تھا، بار بار پڑھ رہا تھا۔

اور جب یہ کہا گیا: محمد طفیل کو ان کی ادبی کارگزاریوں کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز کا اعزاز دیا جا رہا ہے۔ صدرِ مملکت میرے گلے میں ستارۂ امتیاز کا ہار ڈال رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا

اے ماں! تیری دُعائیں قبول ہوگئیں، تیری دُعائیں قبول ہوگئیں۔

میں بھی رو دیا۔

والدہ بھی رو دیں۔"

طفیل صاحب! کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے، یہ آپ کو اس وقت معلوم ہوگا جب آپ کا نام آپ کی ماں کے ساتھ پکارا گیا اور فرشتوں نے سرگوشی کی: یہ وہ شخص ہے جس چیز کے لیے اس کا دل تڑپا اسے ملی پر یہ شخص دنیا میں سو عاجزوں کا ایک عاجز بنا رہا۔ اپنے کام پر جس نے کبھی گھمنڈ کیا نہ شیخی بگھاری۔ اُس وقت آپ نے اپنے ہاتھوں میں مقصودِ کائنات کی سیرتِ گرامی کا خریطۂ حیات تھام رکھا ہوگا۔ یہی نامۂ دلدار آپ کی مغفرت کا سبب بنے گا۔

یہ بھی سچ ہے دنیا میں آتے وقت آدمی ایک معاہدہ لے کر آتا ہے۔ معاہدہ ختم ہونے پر وہی ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ ہُوا، یوُں جیسے آپ سے کارپردازانِ قدرت نے رسولؐ نمبر کا معاہدہ طے کر رکھا تھا جس کے خاتمہ پہ آپ نے وہی کیا جو مصحفی نے دو سو سال پہلے کہا تھا کہ

اے جان اب نکل کہ مصحفی کا
اسباب سب لدا کھڑا ہے

سات بادشاہیاں امیر خسرو نے دیکھی تھیں۔ ہم نے سات سے کتنی ہی اُوپر دیکھ لیں۔ ہم اُس بادشاہی کا ذکر کرنے والے ہیں جس میں مولانا صلاح الدین اڈیٹر "ادبی دنیا" کی ادبی خدمات کا اعتراف اُن کی موت کے بعد کیا گیا تھا۔ سعدی لکھتا ہے:

یہ بادشاہ لوگ بھی عجیب قوم ہوتی ہے۔ گاہے بہ سلامے برنجند، گاہے بہ دشنامے خلعت دہند (کبھی سلام سے ناراض کبھی گالی سے خوش)

اُس دَور کا حاکمِ وقت مولانا صلاح الدین سے ناراض اس لیے رہا کہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں اُنھوں نے دو معروضات پیش کی تھیں، اوّل یہ کہ پاکستانی فوج کے مجاہدوں اور غازیوں کے ہاتھوں سے ساغر و مینا

لے لیے جائیں اور انہیں سے نوشتی کے شغل سے روکا جائے۔ دوسرا یہ کہ نئے آئین میں جمہوریہ پاکستان سے پہلے 'اسلامی' کا لفظ شامل کیا جائے۔ حاکمِ وقت نے اُٹھ کر اپنی تقریر میں کہا،

"یہ کتابیں بیچنے والے ہمیں مشورہ دینے کو آجاتے ہیں۔"

انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ مشورہ دینے والا کتابیں نہیں بیچتا تھا۔ فروغِ علم بانٹتا تھا۔ حرف و بیان کا سرچشمہ تھا۔ علم و ادب کا خزانہ تھا۔

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مولانا مر چکے تو انہیں بعد از مرگ صدارتی اعزاز سے نوازا گیا۔

یہ بڑے شکر کا مقام ہے کہ آج کی حکومت نے طفیل صاحب کی زندگی میں اُن کی ادبی خدمات کی پذیرائی کر دی۔ مجاہدانہ زندگی کا کچھ تو صلہ ملا۔ سیرتِ رسولِ پاکؐ کا مجموعہ مرتّب کرنے کی لگن نے اُن کے لیے ایک نئی دنیا پیدا کر دی تھی عشق ایک نئی دنیا پیدا کر دیا کرتا ہے۔

یک نعرۂ مستانہ ز جائی نہ شنیدم
ویراں شود آں شہری کہ میخانہ ندارد (نظیریؔ)

(میں نے کسی جگہ سے ایک بھی نعرۂ مستانہ کی آواز نہیں سُنی، جس شہر میں میخانہ نہ ہوگا وہ شہر واقعی ویران ہے)

اگر میں کہوں کہ جس شان اور تکریم کے ساتھ پیغمبرِ اسلام کا سیرتی ادب محمد نقوش نے پیش کیا ہے وہ کسی نعرۂ مستانہ سے کم نہیں ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اِسے بھی مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ "نقوش" کے دفتر میں بیٹھ کر انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو مل کر مجرے والوں سے نہ ہو سکا نہ ہوگا۔ اُن کی محنت دن رات کی کاوش اور کنج کاوی کو بار آور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ حکومتِ وقت اِن مجموعوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانے کا بندوبست کرے تاکہ دنیائے مغرب کی انگلش ریڈرشپ اِس اعلیٰ معیار کے سیرتی ادب سے آگاہ و مستفیض ہو سکے۔ اگر ایسا ہو جائے تو خیال فرمائیے سیرتِ رسولؐ کا شات کے اس سرمایۂ عظمیٰ کی افادیت کا پھیلاؤ کتنا وسیع تر ہو جائے گا۔

احیاءِ اسلام کے لیے صدرِ پاکستان نے جہاں کئی نئے محکمے کھول رکھے ہیں وہاں ایک محکمہ ایسا بھی تشکیل دیا جا سکتا ہے جو سیرتِ پاک سے متعلق اِن مجموعوں کا ترجمہ ایسے باشعور اصحاب سے کرائے جو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے اہل ہیں۔ ایسے اصحاب کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ سینئر لوگوں میں پروفیسر احمد علی، صفدر میر، الطاف گوہر، ڈاکٹر افضل اقبال، زیڈ اے سلہری، محمد شفیع، مولوی محمد سعید، احمد حسن، حاجی جہانگیر، اے ایس بی جعفری جیسے اصحاب موجود ہیں جن کو انگریزی لکھنے میں مہارتِ تامہ حاصل ہے اور وہ اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ جونیئرز میں بھی سجے جبار اور خالد حسن کی طرح کچھ سربرآوردہ اصحاب ہوں گے۔

خبر رسانی کے سرکاری غیر سرکاری ذرائع ہمیشہ سے برسرِ عمل رہے ہیں۔ شاہانِ مغلیہ کے دور میں شام تک کوتوالِ شہر کو علم ہو جاتا تھا کہ اس کے شہر میں آج کیا کیا ہوا۔ اِس عمل کو پرچہ لگنا کہتے تھے جو بادشاہ تک لگتا تھا۔ کوئی بعید نہیں میری مندرجہ بالا سطور کا پرچہ بھی حاکمِ وقت تک لگ جائے۔

۷ جولائی ۱۹۸۶ء کی شام کو ہم کیا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سلیم میر، ظہیر بوزائی کو ساتھ لے آئے تھے اور ہم ترک پیر کی طرف جا رہے تھے۔ میں ظہیر بوزائی کے مزاج کے عناصر سے اتنا آگاہ نہ تھا جتنا ڈاکٹر میر کی طبیعت سے آشنا تھا۔ میں نے چار و ناچار بوزائی سے پُوچھا:

"آپ ہمارے ساتھ کیوں ہو لئے، آپ کو کیا ملے گا، ہم تو بھٹکے ہُوئے ہیں"۔

ظہیر بوزائی نے بڑے بھولپن سے کہا:

"میں بھی بھٹکا ہوا ہوں"۔

جتنی خاموشی سلیم پر طاری تھی اتنی ہی تیز کار ان کی طرف چل رہی تھی۔ میں نے اُن کو اپنی گفتگو میں شامل کرنے کو کہا:

خاطر غزنوی کی یہ غزل:

ہم تو سمجھے تھے کہ برسات میں برسے گی شراب
آئی برسات تو برسات نے دل توڑ دیا

بیگم اختر نے اتنی عمدہ گائی ہے کہ دل ہل جاتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو میں اور آپ نیو یارک سے لکھنؤ کی ٹکٹ کٹواتے۔ اُن سے جا کر کہتے ہم یہ غزل سُننے کو آئے ہیں۔ وُہ غزل سناتیں اور ہم اجازت لے کر اُلٹے پاؤں اُسی جہاز سے نیو یارک واپس آ جاتے"۔

مجھے یہ آواز ظہیر بوزائی کی قطعاً نہ لگی۔ کسی کم سن بچّے کا بھولا بھولا لہجہ تھا، بولے:

"میں بھی آپ کے ساتھ جاتا"۔

میں نے مسکرا کر سلیم میر کی طرف دیکھا، وُہ نہ مسکرائے نہ بولے۔ چُپ۔ اب میں نے براہِ راست مخاطب ہو کر کہا:

"آپ نے اِن کو بتا دیا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں ناچنا بھی پڑتا ہے"۔

"جی ہاں"، کہہ کر وہ پھر خاموش۔

اب میں نے اُن پر بم پھینکا: "میر صاحب! بہت ناچ لیا، آج کہیں لذتِ گریہ کے لیے چلیں، کہیں چل کر روئیں"۔

میری بات پھر رائیگاں ہُوئی۔

جب ہم ترک طوسن بابا کے گھر سے واپس آ رہے تھے تو ڈاکٹر میر سے نہ رہا گیا: "کبھی کی ایک خبر میں نے ہونٹوں میں دبا رکھی ہے آپ کے مُوڈ کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آج کی خبر ہے کہ مدیر 'نقوش' محمد طفیل کا انتقال ہو گیا"۔

رنج کا تیر دل کو لگا۔
چُپ اب مجھے لگ گئی۔ وہ گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش میں۔ مگر میں گم۔ سوچا طفیل کو اچھا بھلا چھوڑ کر آیا تھا۔
اچھا بھلا چھوڑ کر آنا کوئی گارنٹی تو نہیں۔

اجل کا وقت مقرر!
جس وقت آئے!
جس جگہ آئے!

جہاں بھی آئے اجل کو تو پھونک مار کر بتی کو بجھانا ہے۔ جس کا شعلہ ذرا سا لپکتا ہے۔ لپکنے کا یہ لمحہ لمحۂ بیدار رہے یا خفتہ! کیا اِس لمحہ میں کسی نئی صبح کا کوئی در کھلتا ہے۔ کسی سحر کا سفیدہ نمودار ہوتا ہے یا شب کی گھور ظلمت، سیاہی، اندھیرا!

اس شعلے کے بُجھ جانے سے سات آسمانوں کے کسی سبزہ زار میں کوئی پھول تو ضرور کھل جاتا ہوگا۔ خدا ہم سے اتنا تو مایوس نہیں ہُوا کہ ایسا نہ ہوتا ہوگا۔ آخر مرنے والا کون سی مرنے کی بات سُنتا ہے کہ تبسّم کی پنکھڑی اس کے چہرے پر کھل اُٹھتی ہے۔ متبسم چہرہ مرنے والے کا خالق کو اچھا لگتا ہے؟ کیا اِس مسکراہٹ میں اُس کو اپنی نعمتوں کی شکرگزاری کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ میرے سناریو میں مُردہ انسان لیٹا ہُوا دکھائی دے رہا تھا جس کے بجھے بجھے چہرے پر جو کبھی ہوتا تھا اب موت کی زردی چھائی ہُوئی تھی اور اِس زردی میں اُس کے لب کے گوشوں میں سے نکل کر تبسّم کی ایک باریک لکیر وہیں ٹھٹھر گئی تھی۔

طفیل صاحب! آپ کے مُردہ چہرے پہ ٹھٹھری ہُوئی یہ لطیف مسکراہٹ کیا اس کی دی ہُوئی نعمتوں کی شکرگزاری کا نشان ہے!

کیا مرتے وقت آپ نے کچھ سنا؟
کوئی نغمہ؟
کوئی خوشبو؟
کوئی کافر مورت؟
کوئی امید
کوئی آس
کوئی مسلغ صورت
کوئی غم
کوئی کسک

کوئی شک
کوئی یقیں
کوئی نہیں
آج شب دل کے قریں؛
کوئی نہیں!

چپ کی چادر

صادق حسین

برسوں پہلے اس شخص سے میری ملاقات داتا کی نگری میں ہوئی تھی۔ وہ دن بہت خوب صورت تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہار کا موسم تھا۔ موسم تو انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ وہ ساعتیں بڑی حسین تھیں۔ اس لیے نہیں کہ اس محفل میں وہ لوگ تشریف فرما تھے جن کی باتوں سے خوشبو آتی تھی۔ وہ دن، وہ ساعتیں اس لیے جمیل تھیں کہ محفل برخاست ہوئی تو شرمیلے میزبان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔“

اس شخص سے میری ایک ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔ دھوپ کا سونا چمک رہا تھا۔ بحیرہ عرب کی دودھیا لہریں دوڑتی ہوئی ساحل کی طرف آتیں اور پھر کچھ سوچ کر واپس چلی جاتیں۔ اس شخص نے کہا: ”سمندر کے کنارے میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں آزاد ہوں۔“

چپ کی ملاقاتیں، لمحات کے قافلوں کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرتی گئیں۔

”جس نے چپ اختیار کی۔ اس نے نجات پائی۔“ اس حدیث نبوی کی برکت سے اس شخص نے اس دنیا میں اپنی نجات کی راہ تلاش کر لی تھی۔ وہ چپ کی حد تک کم گو تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ”بولو کہ پہچانے جاؤ۔“ جب وہ شخص بولتا، تو پہچانا جاتا۔

”یہ محمد طفیل ہے۔“

محمد طفیل فرشتہ نہیں تھا۔ وہ ایک انسان تھا۔ اس میں کمزوریاں بھی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری تو یہ تھی کہ وہ نفی میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اثبات کی سرپرستی میں اس نے گُھتی مار کھائی۔ مگر اُف نہ کی۔ وہ مسکراتا رہا۔ مسکراہٹ سے اس کی دوستی تھی۔ یہ دوستی مرتے دم تک قائم رہی۔

محمد طفیل اپنے ذاتی معاملات سے لے کر نقوش کے نازک مسائل تک، اکثر و بیشتر، مجھے اپنے اعتماد میں لے لیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اچانک بولا: ”میرے ایک صاحبزادے نے کہا ہے۔ ابا جی۔ آپ نے ہمارے لیے کیا ہی کیا ہے؟ چھاپہ خانہ کی آمدنی تو نقوش پر صرف ہو جاتی ہے۔ نقوش ہم سے لیتا بہت ہے۔ مگر دیتا کچھ نہیں۔“ یہ بات محمد طفیل نے ہنس کر بتائی۔ اس کی مسکراہٹ فی البدیہہ ہوتی۔ مگر اس کی ہنسی، سیاق و سباق کے اعتبار سے ایک مخصوص معنی کی حامل ہوتی۔ اس وقت اگر وہ قہقہہ لگاتا، تو مجھے حیرت ہوتی۔ جذبات کے اس بیباک اسلوب اظہار سے اس کا زیادہ میل جول نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ محفل میں قہقہہ لگانا تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہیں۔ اگر وہ صاحبزادے کی بات پر ناراض ہوتا، تو اس سے دو تین دن بات نہ کرتا۔ یہ روش اس کی ناپسندیدگی کی علامت تھی جو گھٹا کی طرح ماحول پر چھا جاتی اور پھر آپ سے آپ منتشر ہو جاتی۔ اس حقیقت کی گواہ اس کی شریک حیات ہے۔ جس نے ہر دکھ درد میں اس کا ساتھ دیا اور ایک نیک بیوی کی طرح ہوا کی اس جنبش کو بھی اپنی سوکن سمجھا جو محمد طفیل کو چھو کر گزرتی۔ ایک دن نقوش نے بیگم

طفیل سے قربانی مانگی، تو اس نے اپنی دونوں کلائیاں ہوا میں پھیلا دیں۔ اُن کلائیوں میں طلائی چوڑیاں تھیں۔ یہ چوڑیاں فروخت کر کے نقوش کی ہنگامی ضرورت پوری کی گئی۔ ایک عرصے تک محمد طفیل نئی چوڑیاں بنوا کر نہ دے سکا۔

میں اکثر محمد طفیل سے کہا کرتا تھا۔ "یہ نقوش کا دفتر نہیں، محمد طفیل کا تکیہ ہے۔" وہاں کا ماحول کچھ اسی انداز کا ہوتا تھا۔ محمد طفیل احباب اور ملاقاتیوں کے حلقے میں چُپ کی چادر اوڑھے بیٹھا رہتا۔ آنے والوں کا استقبال۔ رخصت کرنے کی وضعداری۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ ساتھ ساتھ چائے پانی کا دَور چلتا رہتا۔ اُدھر چھاپہ خانہ میں نئی اور پرانی مشینیں دھمال مچائے رکھتیں۔ محنت کش بالکے آتے اور چپکے سے ہدایات لے کر چلے جاتے۔ ریڑھی والا بلا روک ٹوک اندر آتا اور موسم کے پھل کمرے کے مخصوص کونے میں رکھ کر چلا جاتا۔ محمد طفیل بڑا جی دار سامع تھا۔ صبح سے شام تک مختلف لہجوں میں آوازوں کی گہما گہمی رہتی۔ محمد طفیل انسان کے مُنہ سے نکلے الفاظ کا احترام کرتا اور اچھی اچھی، خوبصورت باتیں چادر کے گوشے میں محفوظ کر لیتا۔

سدا بہار۔ کچنار۔ موتیا۔

پھولوں کی یہ تین اقسام محمد طفیل کی یاد سے وابستہ ہیں۔ محمد طفیل سدا بہار کے سفید پھول نہار مُنہ کھانا پسند کرتا تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ یہ پھول ذیابیطس کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی فرمائش پر لاہور کے ایک طبیب ان پھولوں کا عرق کشید کر کے ادویہ کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نے سدا بہار کا ایک سفید پھول مجھے کھلایا تھا۔ پھول کا ذائقہ کڑوا تھا۔ تلخی نے زبان اور حلق کو پکڑا، مگر اس کی تاثیر اس لیے شیریں تھی کہ وہ پھول محمد طفیل نے خود اپنے ہاتھ سے مجھے کھلایا تھا۔

کچنار کی مُنہ بند کلیوں کا سالن، محمد طفیل مزے سے لے کر کھاتا۔ یُوں تو کھانا کوئی بھی ہو، وہ اس میں لذّت کا پہلو نکال لیتا۔ خورد و نوش کے دوران میں اکثر کہتا: "لطف آگیا ہے"۔

محمد طفیل موتیا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے بھاٹی گیٹ کے زندہ دل لوگوں میں آنکھ کھولی تھی وہاں، جہاں کسرتی پٹھے سرسوں کے تیل سے مالش کر کے ڈنڈ پیلتے۔ پہلوان اکھاڑے میں کشتیاں لڑتے۔ وہاں، جہاں سردیوں میں پھیری والے کی صدا آتی "خستہ گجک۔ کڑک ریوڑیاں" گرمیوں میں موتیا کے پھولوں کے ہار اور گجرے بکتے۔ اس جیتے جاگتے ماحول سے اُٹھ کر محمد طفیل نے قلم سنبھالا اور ادب کے میدان میں فتوحات پر فتوحات حاصل کرتا چلا گیا۔

نقوش کے نمبر اُردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ "رسولؐ نمبر" محمد طفیل کی دلی تمنّاؤں کا منتہائے کمال تھا۔ اس دیرینہ خواب کی محترم تعبیر پر وہ اپنی ماں کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گیا۔ خوشی ہو یا غمی، ہر دو صورتوں میں وہ اپنی ماں کی قبر پہ جاتا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دل ہی دل میں باتیں کرتا۔ یہ باتیں صرف وہ جانتا تھا یا اس کا خدا اور خدا اس پہ بڑا مہربان تھا۔

محمد طفیل نے بڑی ریاضت کی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہ جانا۔ ایک زمانے میں بے خوابی کا مرض لاحق ہو گیا۔ ان دنوں وہ اکثر کہتا کہ یہ نمبر مکمل ہو جائے، تو پھر آرام کروں گا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہُوا۔ آرزوؤں کا قافلہ رواں دواں رہا۔ ایک منزل طے ہوتی تو دوسری سامنے آجاتی۔ "رسولؐ نمبر" کی اشاعت کے بعد اس کی تمنا تھی کہ اسی سلسلے میں ایک ضخیم نمبر بین الاقوامی سطح پر نکالا جائے۔ اس

ضمن میں دنیا کے اسلامی ممالک سے خط و کتابت کا کام میرے سپرد تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ دنیا کے مسلمان سربراہان مملکت سے درخواست کی جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر خود اپنی زبان میں لکھ بھیجیں۔ تاکہ اصل اور ترجمہ دونوں نقوش کے اس خاص نمبر کی زینت بن سکیں۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً اسلام آباد میں اسلامی ممالک کے سفارت خانوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ محمد طفیل نے مجھے بتایا تھا کہ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے وعدہ کیا ہے کہ محمد طفیل جب جائیں گے وہ اسلامی ممالک کے سفیروں کی ایک خصوصی میٹنگ کا انتظام کریں گے انہیں اس منصوبے سے متعارف کرائیں گے اور اس کام کی تکمیل کے لیے ان سے تعاون کی درخواست کریں گے۔ لیکن اب یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اس کے لیے محمد طفیل کا حوصلہ درکار ہے۔ اس کے لیے وہ شخص چاہیے جو صاحبِ جنوں ہو۔ وہ صاحب جنوں جس کا نام محمد طفیل ہے، چپ ہو گیا۔ جیتے جی بھی وہ چپ رہتا تھا۔ مگر اس چپ اور اس چپ میں کتنا فرق ہے۔

مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے اور پاکستان سے نقوش۔ محمد طفیل نے نقوش کے اداریہ کا عنوان "طلوع" منتخب کیا۔ طلوع نہایت مختصر ہوتا۔ مختصر لکھنا بہت مشکل ہے۔ طلوع کے چھوٹے چھوٹے فقرے ایک شہرِ معنی آباد کر دیتے۔ محمد طفیل لفظوں کے استعمال میں احتیاط برتتا۔ عبارت کی نوک پلک سنوارتا اور پھر پوری ذمہ داری کے ساتھ، حرف و صوت کی ایک شائستہ انجمن، قارئین کی سمع کے حوالے کر دیتا۔ صوت اس لیے کہ "طلوع" کا حرف حرف آج بھی بولتا ہے۔ ہر لفظ کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ محمد طفیل ان شخصیتوں کا احترام کرتا تھا۔

ایک مرتبہ محمد طفیل نے راجندر سنگھ بیدی کو خط میں لکھا: "آپ کے اس افسانے کا فلاں پیراگراف اگر نہ ہوتا تو یہ افسانہ زیادہ خوبصورت ہوتا۔ راجندر سنگھ بیدی نے محمد طفیل کی رائے سے اتفاق کیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا: "اس پیراگراف پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔"

میں جب لاہور میں سکونت پذیر تھا، تو میرا ایک افسانہ ایک رسالے میں چھپ کر ابھی زندگی کا پہلا سانس لے رہا تھا کہ محمد طفیل نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا۔

"لفظ 'سجانا' خوب صورت ہے مگر آپ کے اس افسانے میں یہ لفظ اوپری معلوم ہوتا ہے۔" میں نے وہ لفظ افسانے میں استعمال نہیں کیا تھا۔ رسالہ کھول کر طبع شدہ افسانہ پڑھا۔ اس لفظ کا بوجھ رسالے کا مدیر اپنی مرضی سے اپنے شانوں پر اٹھائے، چوراہے کے بیچ کھڑا تھا۔

محمد طفیل اپنے دل کے استعمال میں احتیاط برتنے کا قائل نہ تھا۔ "نقوش" ایسا دل لگا کر مرتب کرتا کہ نڈھال ہو جاتا۔ دوستوں کا غم، اپنا غم سمجھ کر دل لہو لہو کر لیتا۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر اتنا خوش ہوتا کہ دل پھڑک جاتا۔ پاک بھارت جنگوں میں تو اس نے اپنے دل کو سولی پر چڑھائے رکھا۔ جواں سال نرگس کی میت طرابلس سے اسلام آباد پہنچی، تو وہ دھاڑیں مار مار کر رویا۔ اختر جمال کی بیٹی کی اچانک موت پر اس کا دل پاش پاش ہو گیا۔ اس دل کو انسان دوستی کے جذبے نے مسلسل بے قرار رکھا۔ زندگی کی کہانی کا یہ مرکزی نقطہ ایک دن ڈگمگانے لگا، تو محمد طفیل کو سمن آباد میں واقع ڈاکٹر حیدر کے اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ ڈاکٹر حیدر اور محمد طفیل میں کم گوئی کی قدرِ مشترک نے ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ پھلانگ کر دوستی کی بنا ڈالی۔ ڈاکٹر حیدر لندن میں

جا بسے، تو محمد طفیل انہیں ملنے وہاں گیا۔ واپسی پر عمرہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ محمد طفیل اکثر کہا کرتا:

”رسولؐ نمبر نکالنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص عنایت ہے۔“

محمد طفیل اور بیگم طفیل اسلام آباد آتے، تو جب ان کا جی چاہتا میرے غریب خانہ پر قیام فرماتے۔ وہ زیادہ تر اختر جمال کے گھر ٹھہرتے۔ وہ خاتون محمد طفیل کی منہ بولی بہن تھیں۔ محمد طفیل اکثر کہتا: ”اختر جمال اور احسن علی خاں اداس رہتے ہیں۔ بیٹی مر گئی۔ بیٹا امریکہ چلا گیا۔ میں اُن کے پاس ہوتا ہوں، تو اُن کی ڈھارس بندھی رہتی ہے۔“

۵ جولائی ۱۹۸۶ء صبح سویرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی نے ریسیور اٹھایا۔ اس نے کہا منشا یاد کا فون ہے۔ منشا یاد کی آواز میں زندگی اور زندگی کا عزم ہوتا ہے۔ اس دن منشا یاد کی آواز میں زندگی تھی نہ عزم۔ اس نے کہا: محمد طفیل اختر جمال کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو سوئے اور پھر نہ اُٹھے۔“ اتنے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا فون آ گیا۔ آج ان کی آواز میں وہ گھن گرج نہ تھی۔ اس آواز میں دکھ تھا اور وہ دکھ ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔

سوگوار دوست، احباب اختر جمال کے گھر جمع ہو گئے۔ اس مرتبہ محمد طفیل تنہا اسلام آباد آیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں، پلنگ پر چپ چاپ پڑا تھا۔ یوں جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ چہرہ پُرسکون تھا۔ زندگی کی کہانی کا مرکزی نقطہ خاموش ہو چکا تھا محبتوں کی سوغاتیں بانٹنے والا خالی ہاتھ تھا۔ احسن علی خان اور اختر جمال میّت کے پاس کھڑے تھے۔ میرے کانوں میں محمد طفیل کی آواز گونج رہی تھی: ”میں ان کے پاس ہوتا ہوں، تو ان کی ڈھارس بندھی رہتی ہے۔“

جاوید طفیل لاہور سے اُڑ کر اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہزار پکارنے پر ابا جی نہ بولے۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبی ویگن نما گاڑی داتا کی نگری کی طرف چل پڑی، اس گاڑی میں محمد طفیل بدستور سو رہا تھا۔ احسن علی خان، اختر جمال، میری بیگم اور میں محمد طفیل کی موٹر کار میں سفر کر رہے تھے۔ گذشتہ شب سونے سے پہلے محمد طفیل نے دو کام کیے تھے۔ پہلا یہ کہ اپنی موٹر کار کی ٹینکی پٹرول سے بھرا لی۔ دوسرا یہ کہ رسولؐ نمبر کا پورا سیٹ اختر جمال کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ امانت صادق حسین کو پہنچا دیں۔ میں، منہ اندھیرے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔“

منہ اندھیرے تو وہ لاہور روانہ نہ ہو سکا۔ اب تو سورج نکل آیا تھا۔ روپہلی کرنیں اس راستے سے کھیلنے لگیں جن پر کل محمد طفیل کے قدم پڑے تھے۔ ان قدموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ زندگی سے ان کا رشتہ اچانک ٹوٹ جاتا ہے۔ ”اچانک“ کہنا شاید درست نہ ہو۔ اس لیے کہ اس شکست کے پیچھے ایک لمبی داستان ہوتی ہے۔

میّت، ایک باوقار رفتار سے دریائے سواں کے پُل پر سے گزری۔ پوٹھوہار کی سرزمین کو ایک دوست کا آخری سلام پہنچا، تو سڑک کے دونوں طرف کھڑے ٹیلے ٹبوں پر اُداسی چھا گئی۔ محمد طفیل، پوٹھوہار کے کنوؤں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پسند کرتا تھا۔

میّت جہلم کے پُل پر سے گزری۔ لہروں نے چپ سادھ رکھی تھی۔ رچنا کا سفر طے ہوا۔ چناب پیچھے رہ گیا۔ اپنی دھرتی کے ان ناتوں سے ایک محبِّ وطن بچھڑ رہا تھا۔ دریائے راوی پار کر کے

داتا کی نگری آگئی۔ محمد طفیل، داتا کے دربار میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس شہر کے راستے، اندرُون شہر کی تنگ گلیاں اور تاریخی دروازے، سب محمد طفیل کے بچپن کے دوست تھے۔ اس نگری کے دوست وفادار ہوتے ہیں۔ موت اُن کی دوستی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

اُسی شام، محمد طفیل کو سُپردِ خاک کر دیا گیا۔

محمد طفیل کے چھوٹے بھائی اکرم نے کہا: ”مَیں تو آج یتیم ہُوا ہُوں۔“

بیگم طفیل نے کہا: ”مجھے اس بات کا صدمہ ہے کہ میں اس مرتبہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسلام آباد نہ جا سکی۔ خدا جانے ان کا کس حال میں دم نکلا ہو گا۔ انہیں پیاس لگتی، تو مَیں پانی پلاتی۔ شاید وہ کوئی آخری بات کرتے۔“

محمد طفیل اپنی پیاس بجھا چکا تھا۔ وہ آخری باتیں کر چکا تھا۔ اُس کا پُرسکون چہرہ گواہی دے رہا تھا۔ ”میں زندہ ہوں اور موت اُتنی ہی خوب صُورت ہے جتنی کہ زندگی۔“

یادِ یارِ مہرباں

منظور الٰہی

زندگانی را بقا از مدعاست　　　کاروانش را درا از مدعاست　　　اقبالؔ

نقوش کا پہلا صفحہ "طلوع" کے لئے مختص ہوتا تھا۔ نپے تلے الفاظ میں، دلنشیں پیرائے میں انوکھی بات کہنا طفیل صاحب کا انداز تھا ان کا اپنا انداز کسے خبر تھی کہ مصروفیتوں میں گھرے ہوئے اس شخص کے لئے اذنِ غروب اتنا قریب ہے اور سوگواروں کی طویل صف میں نقوش کے عام اور خاص نمبر بھی ہوں گے تہ در تہ ہزاروں صفحوں پر محیط ادب پر اس کی انمٹ چھاپ کے شاہد۔

غریب الوطنی میں رودکی کو بخارا کی یاد نے ستایا تھا اور اس کا ایک مصرع۔

ع یادِ یارِ مہرباں آید ہمے

زبان زد عام ہوا، اس تذکار کا عنوان بھی یادِ یارِ مہرباں ہے کہ ایسی محبت اور ملائمت لوحِ جہاں پر بار بار رقم نہیں ہوتی بخارا کی رعنائیاں یاد دلانے کے لئے رودکی نے کہا تھا۔

شاہ سرو است و بخارا بوستان　　　سرو سوئے بوستان آید ہمے

اور رختِ سفر باندھے بغیر شاہ نے اسپِ تازی کو ایڑ دی تھی اور گھوڑا بخارا کی جانب سرپٹ بھاگنے لگا تھا، نقوش کے لاہور نمبر کا خالق لاہور کے خمیر سے اٹھا تھا، یہاں کے ادبی حلقوں میں اس کا سکہ رواں تھا، سروِ سہی کو سوئے بوستان ہی لوٹنا تھا اور بوستانِ لاہور کی نمناک آنکھیں اپنے نامور فرزند کی راہ تک رہی تھیں۔

طفیل کے ناگہانی انتقال کی خبر سن کر ہم سب سکتے میں آگئے ابھی کل تک تو وہ ہماری زندگی کا جزو تھے، فون، ملاقاتیں، دعوتیں، ادبی محفلیں، ہنسی مذاق اور لطیفے، اور آج محض یادِ یاراں مہرباں!

گزری ہوئی صحبتیں آنکھوں میں پھر گئیں برسوں اور دہائیوں کو محیط دوستی کے تار جھنجھنا اٹھے۔ دوست بھی کیسا؛ غمگسار، یارِ صادق الولا، ہماری خوشیوں میں خوش، دکھ درد میں برابر کا شریک، اب یارِ آشنا ہوگا نہ سخن آشنا، دوست داری کی تہمت ہوگی نہ دلداری کے تقاضے اس کے جانے سے ایک عہد ختم ہوگیا۔ ایک بساط الٹ گئی۔

ع قربتیں مٹ جائیں گی اور دوریاں رہ جائیں گی۔

ایک شخص کے اٹھ جانے سے دنیا کتنی بدل گئی! اس کا ملنا ایک حادثہ تھا یا قدرت کا گرانقدر عطیہ؟ میں انتظامیہ کی ابتدائی تربیت کے دوران انگلستان میں ایک جذباتی تجربے سے گزرا تھا واپسی پر میں نے اسے الفاظ میں ڈھال کر نیم افسانوی رنگ دے دیا اور ایک مختصر خط کے ساتھ مضمون مدیرِ نقوش کو بھیج دیا۔ آٹھ آنے کے ٹکٹ ملفوف کر دیئے تا کہ ناپسند

ہونے کی صورت میں مضمون واپس کر دیں۔" ڈیڑھ دو ماہ کے بعد طفیل صاحب کا خط ملا" پتا دیکھ کر میں نے آپ کا مضمون ایک طرف رکھ دیا تھا کیونکہ آپ ڈپٹی کمشنر تھے! ملاقات ہوئی تو میں نے بتلایا کہ اس وقت کیمبل پور ایک چھوٹا سا شہر تھا، چند سرکاری مکانات تھے، کسی سڑک کا نام بھی نہیں تھا بہرکیف خط کا باقی حصہ امید افزا تھا" مجموعی طور پر مجھے آپ کی تحریر پسند آئی، یہ مضمون نقوش کے اگلے شمارے میں شامل ہوگا اگر آپ تکنیک کا خیال رکھیں تو ایک کامیاب مضمون نگار بن سکتے ہیں" حق تو یہ ہے کہ اُن کی مسلسل ہمت افزائی سے ہی میں کچھ لکھنے کے قابل ہوا۔

میں ملتان میں تعینات ہوا تو ایک چھوٹی سی بات سے خوش ہو کر طفیل صاحب نے مجھے لکھا "جب تک نقوش طبع ہوگا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا" وہ دن اور آج کا دن غیر حاضر کبھی نہیں ہوا، مجلہ نقوش کی لمبی قطاریں شاہد ہیں کہ طفیل کتنا سچا اور کھرا آدمی تھا، اتنی دریا دلی، اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے عمل میں آئے، جو اس وقت، بلکہ بعد میں بھی "تادیر" آسودہ زندگی کی راحتوں سے نا آشنا تھا، ملازمت کے دوران نشیب و فراز بھی آئے مگر نہ کبھی حسن سلوک اور گرمجوشی میں فرق آیا نہ نقوش کی ترسیل میں۔

طفیل صاحب سے پہلی ملاقات ایک مشترک دوست کی وساطت سے ہوئی تھی اسے تیس بتیس برس ہونے کو آئے، اُن دنوں ایک روز وہ مجھے ملنے کے لئے آئے، پرانا سائیکل، سفید قمیص اور پائجامہ ہاف کوٹ، ایک شرمیلا سا شخص آغاز سرما کی دلنواز سہ پہر تھی ہم باغیچے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ طفیل صاحب کے ایک فقرے سے میں چونک اُٹھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میں مر جاؤں مگر نہ مروں۔"

"جی؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔"

"بس اتنا کام کر جاؤں" طفیل صاحب نے میری بوکھلاہٹ دیکھ کر کہا "کہ اُردو ادب کی کسی صنف میں تحقیق کا کام نقوش کے خاص نمبر دیکھے بغیر مکمل نہ ہو۔"

میں کچھ حیران سا ہوا، کیا معلوم تھا کہ ایک منحنی سا شخص یہ سب اور بہت کچھ کر گزرے گا افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر، ادب عالیہ نمبر، ادبی معرکے نمبر ——— اور بالآخر تیرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل رسول نمبر۔

ع ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

عزم و ہمت اور استقلال سے اُس نے سب کچھ کر دکھایا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بڑا آدمی بن گیا، بہت بڑا آدمی، ایک محفل میں ممتاز مفتی نے شوخی سے کہا تھا۔

"طفیل! ہم نے تمہارا نام انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔"

"یہ نام کبھی وہاں تھا بھی؟" طفیل صاحب نے پوچھا۔

مفتی صاحب نے کہا "تم انسان نہیں جن ہو، جتنا کام تم نے کر ڈالا وہ کسی انسان کے بس کا نہیں۔" کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ اس ستائش پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

محنت، محنت اور مسلسل محنت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اُنہوں نے کام کو عبادت جانا ہمارے دیکھتے دیکھتے بچے بڑے ہو جاتے ہیں، نازک پودے تناور درخت بن جاتے ہیں، ——— پتلی پتلی کونپلیں سرسبز پتوں کی چھتری تان لیتی ہیں، یہ تخلیق کا معجزہ ہے، مگر محض ماہ و سال کے شمار سے انسان بڑا آدمی نہیں بن سکتا، اس کے لئے اس کے سوا کچھ اور درکار ہے

ایک دفعہ طفیل صاحب نے کہا تھا "جب زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آتا ہے تو عمر ختم ہونے کو آتی ہے"۔ یہ درست ہے، کہ زندگی کی غایت سمجھتے، اک عمر بیت جاتی ہے کبھی کج فہمی آڑے آتی ہے تو کبھی پستی فطرت اور بہت سی حسرتیں سینے میں دبی رہ جاتی ہیں مگر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ شاید طفیل نے اوائل شباب میں ہی سیکھ لیا تھا وہ طے کردہ اسلوب پر سختی سے کاربند نہ ہوتے تو اتنا کام کیسے کر پاتے،

طفیل سنجیدہ طبع اور کم گو تھے حالانکہ ہر طور وہ انگریزی اصطلاح کے مصداق MAN IN HURRY تھے، ایسا شخص جسے کام سمیٹنے کی جلدی ہو، دھن کا پکا شخص جو گرم روی میں منزل پہ منزل مارتا چلا جائے ایسے سیماب صفت لوگ نچلے کہاں بیٹھتے ہیں مگر طفیل کی متوازن، طبع بردباری اور خاموشی سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اُنکے سینے میں کیسے عزائم موجزن ہیں، قدم قدم پر رکاوٹ تھی اور ذرائع محدود، مگر شوق کی بلندی ہر مشکل پر غالب آ کر رہی، ان گنت ممکنات کو شہ پاروں میں ڈھالنا دل گردے کا کام تھا مگر منزل کیا تھی؟ شرر سے ستارہ، ستارے سے آفتاب،

ع سرمنزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

غالبؔ کے ہاں سعی لا حاصل میں بھی لذت تھی مگر یہاں ایک چوٹی پر جھنڈا گاڑنے کے بعد دوسری چوٹی سر کرنے کا عزم طویل المیعاد منصوبے اور ایک منضبط لائحہ عمل کے تحت ان کی تکمیل نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، آئینہ کردار، خوش گفتار مگر سنگین چٹان کی طرح مضبوط،

؎ درعشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح   درکار زندگی صفت سنگِ خارا ایم   اقبالؔ

طفیل صاحب نے اس شعر کی تقیض کر دی۔

؎ کار دنیا کسے تمام نہ کرد   ہر چہ گیرید مختصر گیرید   مظہرؔ

اہل عزم و ہمت کی آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں مگر اُن کی گرفت مختصر کبھی نہیں تھی، بہت سے منصوبے ادھورے ضرور رہ گئے مگر ادب کی تاریخ رقم کرنے والا ہر شخص یہ دیکھ کر حیران ہو گا کہ معاونین کی فوج ظفر موج تھی، نہ تحقیق کے لئے تربیت یافتہ عملہ، تن تنہا ایک شخص اتنا کام کر گیا جو متعدد ادارے مل کے نہ کر سکے، نقوش کا طویل دور بلاشبہ جرائد کا موسم گل تھا، ایک عظیم آدرش کی اپنی شکتی ہے، اس کی لَو ذہن کو جلا دیتی ہے، ایمرسن نے کہا تھا:۔

"شہد کی مکھی کی طرح ایک فن کار کو فن پہ قربان ہو جانا چاہیئے"۔ اگر ثبوت کی ضرورت تھی تو طفیل نے فراہم کر دیا۔

"تخلیق پارے کی پرکھ میں اُن کی رائے بے لاگ ہوتی، شاید لاشعوری طور پر وہ اپنے آپ کو ادبی روایت کا امین سمجھتے تھے جس میں کم عیاری سے چشم پوشی امانت میں خیانت ہوتی مضمون میں ذرا سا، جھول بھی انہیں کھٹک جاتا، مشورہ اس انداز

سے دیتے کہ دل آزادی نہ ہو یا خفت نہ اٹھانی پڑے، ایک دفعہ میں نے فون پر کہا کہ کتابت کے لئے جو مضمون دیا تھا اس میں فلاں لفظ کی بجائے یوں ہو جائے تو کیسا رہے گا، کہنے لگے۔

"یہ ہوئی نا بات، لکھنے والے کو چاہئے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے، اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسی دھن میں لگا رہے" ایک دفعہ کہنے لگے۔

"ایک مضمون تین بار لکھنا چاہئے، یہ ہے تو جان جوکھوں کا کام مگر از خود تصحیح بھی یوں ہی ہوتی ہے اور تحریر منقح ہو جاتی ہے"

نقوش ایوارڈ کے سلسلے میں بھی وہی دیدہ ریزی کارفرما ہوئی نقوش کے روایتی معیار سے متاثر ہو کر جناب صدر مملکت نے اعلان کیا تھا کہ ہر سال نقوش میں چھپنے والی بہترین تحریریں انعام کی مستحق ٹھہریں گی وقت مقررہ پر مصنفین جمع ہوتے دوسرے شہروں میں رہنے والے اپنی رائے بالتفصیل لکھ بھیجتے، بحث و تمحیص کے بعد فیصلے طے پاتے حاضرین کے دستخط لے کر طفیل صاحب جملہ ریکارڈ محفوظ کر لیتے۔

نقوش پریس میں وارفتگان ادب کا ہجوم رہتا، دفتر میں ہر طرح کے لوگ آتے جاتے، دوست احباب، ادیب اور شاعر، مصور، اور خوشنویس، چھوٹی موٹی غرض والے صلاح مشورہ کرنے والے، گرد و پیش تراشے، مسودے، اخبار اور رسائل بکھرے ہوتے اور کونوں میں کاغذات کے بے ترتیب انبار مگر شخصیت ایسی پائی تھی کہ اس کے باوجود ماحول پُرسکون ہوتا، سب سے بات بھی کر لیتے، یکسوئی سے کام بھی کئے جاتے، طبیعت میں ٹھہراؤ تھا، فون کی گھنٹی بار بار بجتی، فون اُٹھا کر اطمینان کے ساتھ جی کہتے جیسے فارغ بیٹھے ہوں، دوسرے کی بات تحمل سے سُن کر جواب دیتے۔

طفیل صاحب کے لئے نقوش وزیٹنگ کارڈ ہی نہیں، پاسپورٹ اور زرِمبادلہ سب ہی کچھ تھا، جس بوٹے کو اُنہوں نے خونِ جگر سے پالا تھا وہ ایسا بار آور ہوا کہ اس کی جڑیں پاتال سے چار دانگ میں پھیل گئیں۔ جہاں جہاں اُردو بولنے اور سمجھنے والے موجود تھے نقوش اور طفیل جانے پہچانے نام تھے، فراق گورکھپوری اور مالک رام سے کئی بار گورکھپور اور دہلی جا کر ملے، بلونت سنگھ کے ہوٹل میں الٰہ آباد جا پہنچے، اختر اورنیوی کو پٹنہ میں جا لیا، سعودی عرب میں سرکاری مہمان تھے مگر ایک شیدائی نے اپنے ہاں سے اُٹھنے نہیں دیا، آرام دہ مہمان کمرہ، جدہ ہو یا لندن میزبان کا اصرار ہوتا کہ زادِ راہ کے لئے کچھ لے جائیں "آپ یہاں اجنبی ہیں چیک بھنوانے کے لئے کہاں مارے مارے پھریں گے برسوں سے آپ نقوش تحفتہً بھجوا رہے ہیں، کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں" جانے کتنے لوگوں کو نقوش کا ہر شمارہ بلا معاوضہ پہنچتا رہا۔

مہمان نوازی میں بھی وہی فیاضی نظر آتی، ادبی دنیا سے کوئی ذی مرتبہ مہمان آتا تو اُسے مدعو کرنے میں پہل کرتے دعوتوں کا سلسلہ گڑھی شاہو والے مکان سے شروع ہوا اور اردو بازار سے ہو کر نیو مسلم ٹاؤن پر ختم ہوا، ہر طرح کے لوگوں سے تعلقات رکھنے میں اُن کی وسیع المشربی کو دخل تھا، کبھی مولانا عبدالماجد دریا بادی کے لئے دسترخوان بچھ رہا ہے اور وہ علم و فضل کے موتی بکھیر رہے ہیں، کبھی جوش صاحب کمر سیدھی کئے آلتی پالتی مار کر تخت پوش پر بیٹھے ہیں اور سرخوشی کے عالم میں گوہر افشاں ہیں، کبھی کھانے کے دوران اطالوی دانشور پروفیسر بوسانی غالب کے طنز و مزاح پر گفتگو کر رہے ہیں، اُردو بازار کے عشائیہ میں تو سب ہی سے

ملاقات ہو جاتی، فیض صاحب اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ہم سے بچھڑ گئے اُن کی شائستگی اور منکسر المزاجی دل پر نقش ہے، فراق گورکھپوری، پروفیسر آلِ احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، غرض کس کس کا ذکر کیا جائے، عربی کے جیّد عالم پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کانفرنس میں شرکت کے لئے علی گڑھ سے اردن جاتے واپسی پر طفیل صاحب کی محبت انہیں لاہور کھینچ لاتی رات گئے تک محفل جمی رہتی، مختار الدین احمد خود ایثار اور انکساری کی تصویر ہیں، علی گڑھ میں خبر سن کر جانے اُن کے دل پر کیا گزری ہوگی،

وضعداری اور تعلقات نبھانے میں طفیل صاحب یکتا تھے، ایک دفعہ میری بیمار پُرسی کے لئے اسلام آباد آئے اور ہمارے ہاں مہمان ہوئے، دوسرے روز ہی اختر جمال اور احسان علی خان کے ہاں جانے کے لئے اصرار کرنے لگے۔

"آپ کہیں تو سارا وقت آپ کے ساتھ گزاروں گا مگر اب مجھے جانے دیجئے میرا قیام ہمیشہ اُن کے ہاں ہوتا ہے۔"

ایک زمانے میں، میں محکمہ بحالیات کا سربراہ تھا پی۔ ٹی۔ ڈی حاصل کرنے کے لئے سو جتن کرنے پڑتے تھے، کارپردازوں کے ہاتھ میں یہ آخری حربہ ہوتا تھا سونے کی چڑیا ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو کب ہاتھ آتی ہے، طفیل صاحب محکمے کے چکر لگاتے رہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ میری نظر نہ پڑ جائے، ایسی حیا، ایسی مروّت، مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے شکوہ کیا۔

"آپ نے کمال کیا، مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"بس میں نے سوچا نچلی سطح پر ہی کام ہو جائے، آپ کو کیوں تکلیف دوں"

طفیل صاحب نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی، "سلسلۂ روز و شب" کی غیر رسمی تعارفی تقریب کا اہتمام ہم نے گھر پر کیا تھا عشائیہ سے پہلے تین چار احباب کو کتاب پر تبصرہ کرنا تھا مگر بوجوہ، ایک کے سوا باقی حضرات شمولیت نہ کر سکے، اس دوست نے بڑا جاندار تبصرہ کیا مگر خلاء کے باعث پروگرام متاثر ہوا، محفل رنگ پر نہ آ سکی، وقتی طور پر طبیعت مکدّر ہوئی مگر اس وقت اور بعد میں جتنا ملال طفیل صاحب کو تھا وہ شاید ہمیں بھی نہیں تھا محض اس لئے کہ ایک دوست نے چاؤ سے تقریب رچائی تھی اس کا حق ادا نہ ہوا۔

عید کارڈ ہو یا بیٹے کی دعوتِ ولیمہ انوکھی بات کہنا اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا، دو میٹھے بول، اپنائیت کی مہک میں بسے ہوئے چند الفاظ، ہر پیغام کی اپنی حلاوت ہوتی جیسے یقین دلا رہے ہوں کہ اُن کی نظر میں آپ کی شخصیت کتنی مقدّم ہے

"ہر آہٹ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کہیں آس پاس ہوں۔"

میرا حافظہ بُجھا ہوا ہے مگر وہ آپ کو کبھی بھی نہیں بُھولا!"

اب وہ ہم میں موجود نہیں اور ان عید کارڈوں کی قدر و قیمت اور ہے مگر زندگی میں بھی ایسے محبّت نامے کون تلف کر سکتا تھا، بچے ہنس دیتے، طفیل انکل لفافے پر بھی آپ کے نام کے ساتھ "برادرم" لکھتے ہیں، انہیں کون سمجھاتا کہ۔

عمر رنگِ مئے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بُود

وہ جبر و اکراہ سے متنفر اور عدل و خیر کے متلاشی تھے ایک عزیز دوست کے بیٹے پر ایک سیاسی پارٹی سے منسلک ہونے کا الزام لگ گیا حالانکہ داماد متعلق تھا اور وہی مطلوب تھا، وہ نہ ملا تو بیٹا دھر لیا گیا، طفیل صاحب کی پریشانی دیدنی تھی جہاں تک رسائی تھی اس کی بریت کے لئے سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔

انہیں ہر طور دوستوں کی دلداری مقصود تھی، پھر بھی سب کو خوش رکھنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی چند ماہ ہوئے کہنے لگے "میں نے اپنے احباب کو رسولؐ نمبر ہدیۃً بھجوائے مگر بہت سے جاننے والے شاکی ہیں کہ انہیں اس فہرست میں شامل نہیں کیا، اتنا امیر کبیر تو میں ہوں نہیں، تیرہ جلدوں پر ڈیڑھ ہزار روپے لاگت آئی ہے" پھر ایک اور صاحب کا ذکر کرنے لگے جو چند موقر حضرات کو رسولؐ نمبر ہدیۃً پیش کر کے یہ تاثر دیتے تھے گویا یہ اُن کی کاوش کا ثمر ہے۔ جب انہیں کہلوایا گیا کہ یہ کیا حرکت ہے تو اُنہوں نے معصومیت سے جواب دیا "میرا کچھ فائدہ ہو جاتا ہے، اس میں طفیل صاحب کا کیا نقصان ہے؟"

مردم شناسی طفیل صاحب کا جوہر تھا، وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکتے تھے، دو مرتبہ میں نے اُن کی پرکھ سے اختلاف کیا اور خمیازہ بھگتنا پڑا، ایک شخص کے متعلق اُن کی رائے تھی کہ کاروبار کے متعلق اس کی شہرت اچھی نہیں مگر میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا، رقم لے کر وہ ایک عرصے تک نہیں ملا بلکہ فون پر آنے سے بھی گریز کرتا رہا، ڈیڑھ دو برس کے بعد جب ملا تو اس اخلاق کے ساتھ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، شرم کے مارے میں نے کبھی اس کا ذکر طفیل صاحب سے نہیں کیا دوسرا تجربہ زیادہ تکلیف دہ تھا، اُنہوں نے کہا بھی کہ فلاں صاحب نے بڑی عجیب طبیعت پائی ہے، اُس سے بچ کے رہیے مگر میں نے اسے کسی ذاتی رنجش پر محمول کیا، نتیجہ وہی نکلا،

؎ نیچاں دی آشنائی کولوں، فیض کسے نہ پایا
ککر تے انگور چڑھایا، ہر گچھا زخمایا

حضرت میاں محمد بخشؒ

اس طویل شناسائی کے دوران میں نے کبھی کنایۃً بھی اُن کی زبان سے ابتذال کا کلمہ نہیں سنا، اُن کی متانت اور نفاست مسع ہلکی بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی انتقال سے دو برس پہلے وہ جرمنی گئے تھے، ہائیڈل برگ کے ایک پارک کا ذکر کرنے لگے۔

"خزاں کی آمد آمد تھی مگر اس روز موسم خوشگوار تھا، ہلکی سی دھوپ بھلی معلوم ہو رہی تھی مگر جا بجا محبت کرنے والے جوڑے، جو راز و نیاز تھے، ایامِ جوانی میں خدا جانے کیا ردعمل ہوتا مگر اب کی بار تو آنکھیں بند کئے استغفار پڑھتا ہوا گذر گیا۔"

حیا کا یہ عالم تھا کہ ایک خاتون کی دریدہ دہنی اُن کے لئے سوہانِ روح تھی اُس کی باتیں سن کر چہرہ سرخ ہو جاتا، کہا کرتے تھے کہ ایسی باتوں میں موصوفہ، مردوں کو مات کرتی ہے کسی کو اپنی عزت کا پاس ہو تو کنی کترا کے نکل جائے۔

مودت کا یہ رشتہ مدیر اور مضمون نگار کے مابین نہ تھا بلکہ شروع دن سے دونوں کے درمیان ایک تعلق تھا جو امتدادِ وقت کے ساتھ مستحکم ہوتا گیا ایک قلبی لگاؤ، ایک تعلقِ خاطر، طفیل صاحب دروں بین یا INTROVERT سمجھے جاتے تھے مگر محدود محفل میں وہ اس کے برعکس تھے ایسے موقع پر وہ کھل اُٹھتے، کبھی فقرہ چست کر دیتے دوسروں کو محظوظ کرنے کے لئے اپنی کسی حماقت کا ذکر کر دیتے، کبھی ہفتوں ملاقات نہ ہوتی دنیا کے بکھیڑے بے مصرف مصروفیتیں، خرابیِ موسم کا عذر یا محض تساہل مگر جب ملتے بشرے سے مسرت کی کرنیں پھوٹنے لگتیں۔ ہمیں اس دوستی پر بڑا ناز تھا، ایک دوسرے کی صحبت میں سکون ملتا تھا، فرحت محسوس ہوتی

تھی، جیسے ایک سہارا ہو، ایک رفیق جس سے دل کی بات کہہ سکیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں، کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا، کوئی قصہ گھوڑے ہاتھی کا، کسی مہربان کا تلطف، کسی زمانہ ساز کی بے اعتنائی، ہمارے ہاں کھانے کے دوران میں اُنہوں نے کہا کہ قربت کا یہ احساس اُن کے لئے ہمیشہ باعثِ طمانیت رہا، بہرحال ایسا احساس یکطرفہ تو نہیں ہوتا اسی شام بیگم طفیل کی موجودگی میں تبلایا تھا کہ ایک دفعہ کاروبار میں سرمائے کی کمی ہوگئی، بیگم کو پتہ چلا تو اُنہوں نے بخوشی زیورات گروی رکھ کر ضرورت پوری کردی، بیگم خفیف سی مسکراہٹ لئے خاموش رہیں اور میں سوچتا رہا خاطر تواضع اور مہمانوں کی آؤ بھگت میں اُن کا کتنا ہاتھ تھا، طرح طرح کی نعمتیں دسترخوان پر موجود ہوتیں، پہلے بیٹے کھانا کھلاتے تھے، پھر ننھی ننھی پوتیاں سرو کرنے لگیں، طفیل صاحب دیکھتے اور خوش ہوتے۔

طفیل ایک بے بدل مدیر، خاکہ نگار اور ناشر تھے وہ ادبی محفلوں میں محترم تھے، بااثر حلقوں میں اُن کی پذیرائی ہونے لگی تھی، اپنی جگہ پر یہ باتیں اہم تھیں مگر ہمیں تو ایک شخص سے اُنس تھا جس کا نام محمد طفیل تھا، یہ سب کچھ نہ ہوتا تب بھی وہ طفیل ہوتے۔

اُن کی آخری علالت کے بعد میں مزاج پرسی کے لئے گیا، پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے یوسفی صاحب کی بات شروع ہوگئی، میں نے کہا یوسفی صاحب نے ذکر کیا تھا کہ اُن کے بیٹے شاکی ہیں ابا نے اُن کے لئے کچھ نہیں کیا، سب سے اُن کے تعلقات تھے وہ کیا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ طفیل صاحب نے بیٹیوں کی طرفداری کی اور کہا یوسفی صاحب کا استغنا قابلِ ستائش ہے مگر دنیا داری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں

طفیل صاحب کا حسن سلوک دیکھ کر وہ مصرع یاد آتا تھا جسے شہنشاہ، ایران بار بار دہراتے تھے۔

؎ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

یہ اور بات ہے کہ شہنشاہ کے لئے خدا کی وسیع زمین تنگ ہوگئی تھی، اگر انورالسادات اپنے ہاں آنے کی دعوت نہ دیتا تو جانے دوگز زمین بھی کہاں نصیب ہوتی مگر طفیل کی سادگی اور انکسار نے اپنا صلہ اس دنیا میں پایا، والدہ کے پہلو میں درخت کی گھنی چھاؤں تلے اشکبار آنکھوں نے انہیں وہاں سپردِ خاک کیا جہاں جانے کی آرزو انہیں زندگی میں رہی۔

ماواں ٹھنڈی چھاواں.......
زندگی میں بھی اور بعد از مرگ بھی،

آخری ملاقات بھی عجیب تھی، یونیورسٹی سینیٹ کی میٹنگ سے اُٹھ کر اُردو بازار کا ہفتخواں طے کرتا ہوا میں نقوش پریس پہنچا، پہلے دفتر کی طرف بڑھنے لگا تو بیٹے نے مسکرا کر کہا "طفیل صاحب کا دفتر اب دوسری منزل پر ہے"۔ کمرے میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی سینئر ایگزیکٹو کا دفتر ہو، طفیل صاحب گھومنے والی چرمی کرسی پر بیٹھے انہماک کے ساتھ کچھ لکھ رہے تھے، گلڈ کے آفس سیکرٹری اور پنجابی کے شاعر ڈاکٹر رشید انور اسی انہماک سے انہیں تک رہے تھے، میں دو تین منٹ کھڑا رہا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی سر اُٹھایا تو مسکرا کر پوچھا "آپ کب آئے؟" ساتھ ہی ملازم کو کہا کہ عمدہ سی چائے تیار کرے۔ خط گلڈ کی گرانٹ موصول نہ ہونے کے متعلق تھا۔

"مگر اب تو گلڈ کے کرتا دھرتا کوئی اور صاحب ہیں"۔ میں نے کہا۔

جواب تھا "کوئی کام اٹک جائے تو سب ہی مجھے کہتے ہیں کہ تم کرو"

ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ ضروری کام کے لئے اسلام آباد جانا پڑے تو پہلے دو روز آرام کریں، وہاں پہنچ کر مصروفیت سے

ہیے یہ دو روز آرام کریں مگر جو شخص عمر بھر مصروف رہا ہو ایسی عیاشی کا متحمل کیسے ہوتا، لاہور سے پشاور، پشاور سے اسلام آباد ہمہ وقتی مصروفیت، اپنے میزبان سے کہا مجھے صبح چار بجے جگا دیجئے تاکہ بروقت لاہور پہنچ سکوں، مگر رات کے کسی حصے میں کاروانِ شوق کا پیش آہنگ، جادۂ ہستی کا انتھک مسافر حیات و ممات کی سرحد پار کر چکا تھا،

چلا کارواں اپنے ماضی سے دور

؎

نہ سکھ ساتھ کی چاندنی رات یاد نہ کوئی بھری بزم کی بات یاد
نہ وہ دن رہے اب، نہ وہ دلولے چلے خشک پتے چلے (ضیا جالندھری)

رخشِ عمر رو میں رہا، زندگی کی مسرتیں اپنے دامن میں لیے دہائیاں برق رفتاری سے گزر گئیں اب اکائیاں ایک ایک کر کے بیت رہی ہیں کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ محفل یونہی جمی رہتی، مگر چاہے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، آخر کو یہ میلہ بچھڑنا ہی تھا،

سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ راجے راج کرینے سدا نہ سنگت یاراں (میاں محمد بخش)

ایک روز وادیِ امکان کا غبار چھٹ جائے گا کثافتیں دھل جائیں گی اس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ایک اور رنگ میں تجدیدِ ملاقات کی نوید ملے کہ وہ ذاتِ اقدس رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی،

قدسی نے کہا تھا،

روزِ قیامت ہر کسے در دست دارد نامۂ من نیز حاضر می شوم تصویرِ جاناں در بغل

حضور رسالت مآب میں رسول نمبر پیش کر کے طفیل عرض کریں گے۔

خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را (اقبال)

محمد طفیل —— انمٹ "نقوش"

احمد سعید

بہتے ہوئے پانی کو دیکھیے۔ آپ کے سامنے سے گزرنے والا اس کا حصہ حال ہے، گزرا ہوا ماضی اور آنے والا مستقبل! وقت کا یہ دریا اک بے پایاں سمندر میں جا گرتا ہے لیکن یادوں کے دھارے سیر بین کے مشمولہ رنگین ٹکڑوں کی مانند ذرا سے گھمانے پر مختلف رنگین پیٹرن بناتے ہیں اور تھوڑا سا چھیڑنے پر سرکار راما کی طرح ذہن کے سکرین پر زندہ سائے، زندہ تصویریں بن کر جھپاک سے گزر جاتے ہیں۔ بعض یادیں جاپانی یا راجپوتی، مغلیہ طرز کی سحر انگیز تصاویر کی طرح اپنے رنگوں کا اس قدر لطیف امتزاج ہوتی ہیں کہ ان کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے پر اِن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کا بغور مشاہدہ اور تجربہ کرنے پر ہی ہر ایک کی انفرادیت کا احساس و ادراک ہوتا ہے۔ لیکن مطبوعہ لفظ دل و دماغ پر کیسے کیسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے جس کا شعور اسے پڑھنے اور اس کے مصنف کو یاد کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے —— نقش —— نقوش! —— محمد طفیل (مرحوم) کی طرح ہو جو اپنے بے شمار مداحوں اور دوستوں کے دل و دماغ کا حصہ بن گئے ہیں۔ رسالہ "نقوش" کا نام، اس کا لقب، اس کا متبادل نام بن کر دائمی نقش چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی زمانے کا ستم ہے کہ جس شخص نے نقوش کے بے شمار اور "یادگار" معرکۃ الآرا' شخصیات نمبر نکالے ان پر اب خصوصی نمبر شائع ہو رہا ہے۔ بہرصورت ہم محمد طفیل کا الگ الگ اور نقوش سے لازم و ملزوم حیثیت میں بھی مطالعہ کریں گے کیونکہ وہ اب اردو ادب کی تاریخ کا حصہ اور چھوٹے بڑے ادیبوں اور قارئین کی یادوں کا حصہ بن گئے ہیں۔

میری طفیل صاحب سے پہلی ملاقات خود کو نقوش میں بحیثیت افسانہ نگار آزمانے کے لیے ہوئی۔ یہ تاریخی پس منظر مجبوراً فراہم کر رہا ہوں اس لیے کہ مجھے اپنی ادبی زندگی کا راستہ ایک مخصوص میدان میں بوجوہ ناکامی کے باعث اختیار کرنے میں غیر معمولی مدد ملی۔ اس کی ابتدا کچھ عرصہ پہلے ہوئی جب میں نے اپنا پہلا اردو میں براہِ راست لکھا افسانہ "آخری غسل" اور اس سے قبل "سونے کا دانت" (ترجمہ) 'ساقی' کو بھیجے تھے جس میں شائع ہونے پر وہ خاصے کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ ان دنوں رسالہ ہذا کو شاہد احمد دہلوی (مرحوم) ایڈٹ کرتے تھے۔ موصوف اور 'ساقی' محتاجِ تعارف نہیں۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کو مرحوم ہی کی دریافت کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ انہوں نے ہی ان کے فن کو جلا بخشی اور بلندیوں پر پہنچایا۔ لیکن دہلی سے کراچی منتقلی کے بعد ساقی اپنی شہرت قائم نہ رکھ سکا اس نے کئی نئے اور پرانے ادیبوں کی پذیرائی جاری رکھی۔

خیر، اب زمانہ بدل چکا تھا۔ نقوش یکدم طلوع ہو گیا تھا لیکن ۱۹۴۸ء میں اس پر چھ ماہ کے لیے پابندی عائد کر دی گئی۔ ان دنوں یہ سید وقار عظیم کی زیرِ ادارت تھا۔ ۱۹۵۱ء میں محمد طفیل نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور

قطب الدین ایبک کے مقبرہ کے برابر، ایبک روڈ پر، اپنے ادبی نشر و اشاعت کے ادارے، ادارہ فروغِ اردو سے نکالنا شروع کیا۔

چلتی سڑک کے تقریباً کنارے کرسی میز بچھا کر کام کرنا جس کے لیے بڑے انہماک کی ضرورت تھی، ظاہر ہے بڑا مشکل کام تھا۔ جس شخص سے میری مذکورہ افسانے کے سلسلے میں ملاقات ہوئی ان کا نام محمد طفیل تھا — کوٹ پتلون میں ملبوس کرسی پر بیٹھے، وہ میز پر رکھے کسی کاغذ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ موصوف نے شائستگی سے مسکرا کر قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور آنے کا مقصد پوچھا — "فرمائیے"۔ میں نے ان کے چہرے مہرے اور طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا۔ بال پیچھے کی طرف کنگھی کیے ہوئے، گھٹا ہوا ماتھا، صاف ستھرا، شیو بنایا چہرہ۔ صاف دانت، پشت اور شانوں میں قدرے قدرتی جھکاوٹ جو جسمانی ہونے کے علاوہ سوچنے اور غور کرنے کی غمازی کرتی دکھائی دی۔ جسم اکہرا اور دبلا، ہاتھ نرم اور قدرے لمبے جو مصافحہ کرتے وقت جسم کی طرح ڈھیلے محسوس ہوتے۔ ابتدائی تعارف کے بعد میں نے اپنا طبعزاد افسانہ انہیں نقوش میں شائع کرنے کے لیے دیکھنے کی خاطر پیش کیا۔ یہ نقوش میں شائع ہوا۔ مجھ جیسے نئے لکھنے والے کی یہ خاصی حوصلہ افزائی تھی ظاہر ہے محمد طفیل نے اسے پسند کیا تھا، اور کئی مدیران کے برعکس نئے آدمی کی تحریر سمجھ کر اسے یونہی مسترد نہیں کر دیا تھا۔

اس کے بعد نقوش کے ہر خاص و عام شمارے میں میرا افسانہ ضرور چھپتا اور میرے طفیل صاحب سے رسمی سے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ نقوش کے خصوصی نمبروں کا ذکر کرنے سے پہلے طفیل صاحب کے اس خاکے کو مکمل کرنے کے لیے بعض باتیں بتانا ضروری ہیں کیونکہ یہ موصوف کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

طفیل صاحب کی ایک امتیازی خصوصیت تمام تر توجہ اور ضبط سے کام کرنا، کام ہی کی باتیں کرنا، مخاطب کا احترام کرنا، اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا تھا۔ وہ مہمان کی مشروب سے باقاعدہ تواضع کرتے۔ ادارہ فروغِ اردو میں واقع نقوش میں تو ان سے بہت کم اتفاق ہوتا کیونکہ رسالہ جلد ہی اردو بازار کے دفتر میں منتقل ہو گیا تھا۔ بہر صورت ایبک روڈ سے گزرتے ہوئے ادارہ میں نئی کتابیں دیکھنے اور پسند آنے پر خود خریدنے یا اسے کالج لائبریری میں بھجوانے کی چیٹک پوری کرنے کے لیے ضرور وہاں کچھ دیر رک جاتا۔ ان دنوں دو اڑھائی روپے میں بھی نہ صرف اردو بلکہ انگریزی کی کتاب بھی مل جاتی تھی "غریب" قاری بھی اس ذوق کی تسکین کر سکتا تھا — اب تو قیمت کاٹ کر دس روپے کے بیس روپے کرنا معمول کی بات ہے اور کتابیں خریدنا — خوبصورت، قیمتی تو ہر ایک سے، اکثر و بیشتر نو پڑھے امیروں کا ڈرائنگ روم سجانے یا دوسروں کو مرعوب کرنے وغیرہ کا ایک ذریعہ ہے — لیکن ادارہ فروغِ اردو تو ان دنوں شوکت تھانوی کی تصنیفات سے بھرا پڑا تھا۔ دیگران مصنفین کی ہی کتابیں دکھائی دیتیں جو یا تو بہت ہی مقبول تھے یا یہ ادارہ کی مطبوعات تھیں — بہت کم — شوکت تھانوی کی تصانیف کی بھرمار محمد طفیل کی بحیثیت کتب فروش، ناشر کے علاوہ، رائج الوقت سکہ کا ذخیرہ کرنا تھا کہ جس مصنف کی مانگ ہو اسے ہی چھاپا جائے تاکہ اس کی تصنیف جلد از جلد بک جائے۔ محمد طفیل کا

یہ خالصتاً کاروباری پہلو تھا۔

یہاں اس زمانے میں مصنفین — منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت وغیرہ جیسے سربرآوردہ افسانہ نگاروں کا پبلشر کے ہاتھوں استحصال کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی اور نامناسب نہ ہوگا۔ بقول آنجہانی بیدی، ان کے پبلشر تو "گنڈیریوں" کے عوض ان سے مسودات خریدتے تھے جن کے ذریعے وہ چاندی کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کتاب کا پہلا ایڈیشن ہی ختم نہ ہوتا تعداد کبھی ہزار یا گیارہ سو سے تجاوز نہ کرتی خواہ یہ دگنی یا تگنی ہوتی — تاہم محمد طفیل کا ادارہ فروغ اردو ایسا ادارہ نہ تھا۔

منٹو کی وفات کے بعد مرحوم کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ایک، بھائی ابوسعید قریشی نے اس پر لکھی ایک کتاب "منٹو" کا مسودہ طفیل صاحب کو برائے اشاعت سونپنے کے لیے دیا۔ کیونکہ ان کا لاہور ریڈیو سٹیشن سے کراچی تبادلہ ہو گیا تھا۔ منٹو کی بحیثیت پاکستانی افسانہ نگار ادبی حیثیت پہلے کی بہ نسبت اور بھی زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ اس کے افسانے لامحالہ نقوش میں بھی چھپتے تھے۔ اس ضمن میں مجھے طفیل صاحب نے بتایا کہ انہوں نے مرحوم کے بعض افسانے کم معیاری ہونے کے باعث کوئی بہتر لکھنے کے لیے کہہ کر اسے واپس کر دئے تھے۔ اس کے باوجود منٹو نے اس کا برا نہیں منایا تھا۔ بھائی ابوسعید نے منٹو کی زندگی اور فن پر محیط جو کتاب لکھی وہ اس پر ایک نوحہ بھی تھا۔ اب محمد طفیل کی شخصیت میں پُراسراریت (میں اسے یہی نام دُوں گا) کا عنصر سامنے آیا کیونکہ مجھے جس جگہ مسودہ ہذا ان کے حوالے کرنا تھا وہ موجودہ 'چینیز' ریسٹورنٹ اور سابق انڈیا کافی ہاؤس کے نیچے واقع، زیرِ زمین سٹوری (BASEMENT) میں نقوش کے قائم کردہ دفتر میں تھا! یہ غالباً ۱۹۵۶ء کی سردیوں کے دن تھے۔

ہر دو ریسٹورنٹس کی مخصوص فضا تھی، بالخصوص انڈیا کافی ہاؤس کی، جو دانشوروں، ادیبوں، وکلاء، فلم میں کام کرنے کے شوقین نوجوانوں وغیرہ کی آماجگاہ تھا۔ ہماری یوسف خان پر یہیں نگاہ پڑی تھی جس کا اسلم پرویز کو معیار پر پُورا نہ اُترنے کے باعث بعد ازاں انتخاب کیا تھا۔ ان میں بعض کا تو روزمرہ کا معمول ہی کافی ہاؤس کھلنے کے تقریباً ساتھ ہی وہاں آ کر براجمان ہو جانا تھا اور اس کے بند ہونے تک دوسروں کی جیب سے کافی وغیرہ پینا تھا جس کی ابتدا ان کی اپنی خرید کردہ سے ہوتی۔ چونکہ دوپہر کا کھانا — لنچ — (کباب اور توس پر مشتمل) کا بندوبست بھی آرڈر دینے پر ہو جاتا، نہ صرف اس وقت بلکہ شام کو بھی یہاں تِل دھرنے کے لیے جگہ نہ ہوتی۔ ادب سے لے کر سیاست اور سنسنی خیز زیرِ سماعت مقدمات عدالتی فیصلوں وغیرہ پر گرما گرم بحث ہوتی۔ سگریٹوں کے دُھوئیں، باتوں، قہقہوں، آوازوں کے شور میں محمد طفیل وہاں ادبی کام پہ کیسے توجہ دے سکتے تھے۔ اس لیے نہ جانے انہوں نے بیسمنٹ والے دفتر کو کب اردو بازار منتقل کر دیا تھا۔ بہر حال منٹو پہ مذکورہ کتاب جلد ہی شائع ہو گئی اور اب تک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

اردو بازار میں واقع نقوش کا دفتر شروع میں ایک خستہ حال کمرے پر مشتمل تھا جس تک ایک گیراج میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا (اس بلڈنگ کے یہ ہر دو حصے اب نقوش کی جائیداد ہیں) اس کے داخلی دروازے کے سامنے

ایک بڑی دفتری میز رکھی ہوتی جس کی ایک طرف دائیں ہاتھ ۵۳۵۲۵ کے نمبر کا EXTENSION والا فون پڑا ہوتا جگہ میز کے سامنے، دیوار سے قدرے ہٹ کر، مدیر ناشر محمد طفیل "نقوش" کی کرسی رکھی ہوتی ــــ عام دفتری کرسی ــــ میز پر بے شمار کاغذات، وصول کردہ رسائل وغیرہ کا انبار لگا ہوتا۔ اس کی باقاعدہ جھاڑ پونچھ کی باری زیادہ نہ آتی۔ لیکن میز کے خالی حصے کی صفائی اُڑتے جھاڑن سے کر دی جاتی ہے۔ ابھی ابھی میں نے محمد طفیل "نقوش" کا نام لیا ہے۔ "نقوش" کا لاحقہ یا لقب موصوف کو بابائے اردو عبدالحق نے ان کی اردو ادب کے حیرت انگیز ضخیم نمبر چھاپ کر اس کی خدمات سرانجام دینے پر دیا تھا جس کے نتیجے میں مرحوم اسی نام سے یاد کئے جاتے۔

طفیل صاحب اپنے جسم اور لباس کی صفائی کی طرح رائٹنگ پیڈ اور نِب لگے ہولڈر کا بڑا خیال رکھتے۔ نِب لگے ہولڈر سے لکھنا ان کے سابقہ پیشے اور احتیاط و نفاست کی دلالت تھا۔ موصوف کسی زمانے میں پیشہ ور کاتب رہے تھے، نہایت عمدہ کاتب۔ ہمارے ہاں ان کی ایک کتابت شدہ کتاب بھی تھی جو خوشنویسی کا نمونہ تھی۔ یہ تقریباً آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے۔ ان کی طبیعت میں انکساری، حلیمی اور عاجزی نے "نقوش" کو ادبی خلائی سیارہ بنا دیا جس کے لیے انہوں نے مختلف منصوبے بنا کر انہیں عملی جامہ پہنایا ــــ محمد طفیل بلا کا طویل المیعاد منصوبہ ساز اور اندازہ گیر تھا ــــ اس کے نتیجہ میں انہوں نے نقوش کے عام شماروں کے وقفہ وقفہ بعد خاص نمبر مرتب کر کے شائع کرنے کا پروگرام طے کیا اور اسے نہایت خاموشی سے اس پر ایسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا جیسے کوئی سائنس دان کسی ایجاد میں مصروف ہو۔

ادبی رسالے نکالنے کا کاروبار کوئی زیادہ منفعت بخش نظر نہیں آتا۔ کئی بار تو یہ گھاٹے کا سودا ہوتا ہے خواہ یہ کتنی ادبی خدمت کا حامل اور نتیجتاً شہرت کا باعث ہو بقول شخصے، آدھے پرچے تو ادیبوں اور مخصوص قارئین کو اعزازاً بھیج دئے جاتے ہیں۔ البتہ میری رائے میں خاص نمبر اتنے ضرور بک جاتے ہیں کہ یہ اپنی قیمت نکال لیتے ہیں۔ قارئین کو نقوش کے متعدد نمبروں کا علم تو ضرور ہوگا۔ چنانچہ میں ماسوائے چند کی بات ضروری سمجھ کر ہی کروں گا۔

اولاً طفیل کسی مجوزہ نمبر کے بارے میں دوست احباب سے مشورہ کر لیا کرتے۔ ان کے تحقیقی مشیر اور پس پردہ معاون کافی عرصہ عبداللہ قریشی تھے جو تاریخ اور اقبالیات سے معنوی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً اول الذکر میدان میں انہوں نے لاہور نمبر کے لیے محمد دین فوق کا لاہور اور کشمیر (؟) پر غیر مطبوعہ، ٹھوس مواد فراہم کیا اور مؤخر الذکر اور اقبال نمبروں کے لیے بھی نایاب مواد جمع کیا اور خود بھی اپنا اقبال پر مخصوص تحقیقی کام شمارے میں شامل کیا۔ طفیل ان کے ذریعے مطلوبہ مواد جمع کرواتے لیکن ان میں سے انتخاب وغیرہ خود ہی کرتے۔ وہ "جے" ہی کی نِب سے پاک بھارت کے طول عرض میں پھیلے ہوئے ادیبوں سے خط و کتابت کرتے جو مختلف فرمائشوں پر اور ذاتی قسم کی بھی ہوتی۔ ان کی آہستہ آہستہ لکھنے کی رفتار حیران کن تھی اس لیے کہ وہ اِس طرح کتنے لوگوں سے رابطہ پیدا یا قائم رکھ سکتے تھے۔ ایسی ہی خوبصورت اور محتاط لکھائی ان کی دیگر تحریروں میں ملتی ہے۔ ان کے دو نمونے پیش کرتا ہوں ــــ ایک اقتباس تو "صاحب" کے پیش لفظ

”اعترافِ جرم“ سے نقل ہے، دوسرا بعد از وفات شائع کردہ نقوش کے سالنامہ ۱۹۸۶ء کے ’طلوع‘ میں سے۔

اول الذکر اقتباس :

> ”چونکہ فطرتاً ہنگامہ کار نہیں ہُوں۔ اس لیے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ پہلے گھر والوں سے لڑنے جھگڑنے کا سلسلہ چلا۔ جب اِس مشغلے سے طبیعت سیر ہو گئی تو یہ مضامین لکھنے شروع کر دئے جو اِن شاء اللہ آئندہ جھگڑوں کا موجب بنیں گے۔“

اس مختصر ٹکڑے میں مصنف کا لطیف طنز و مزاح ملاحظہ ہو کہ چند فقروں میں کیسے نہایت شگفتہ انداز میں نجی نوک جھونک اور جھگڑوں کی حقیقت پر چوٹ کرتے ہوئے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نہایت جامع لیکن سادہ الفاظ‘ جو اس کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے، بڑی سے بڑی اور تلخ بات کہہ جاتا ہے۔

دوسرا مذکورہ اقتباس :

> ”جب وُہ وقت آیا کہ میری کاوشوں کی پذیرائی ہونے لگی، حاکمِ وقت کو بھی خیال گزرا کہ یہ شخص جو سر نیہوڑائے ۳۵ برس سے ادبی جہاد میں مصروف ہے اس کے بارے میں یہ تو سوچ لیا جائے، یہ تو دیکھ لیا جائے کہ وہ کس حال میں ہے!“

یہاں سرکاری ناقدری اور اپنی قربانیوں‘ ادب کی ۳۵ سالہ خدمت کی طرف دلکش لیکن چونکا دینے والے پیرائے میں اشارہ کرتے ہوتے اپنا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ اب حکومت موصوف کی خدمات کا اعتراف کرے اور اسے اعزاز سے نوازے۔ یہ تمنّا، یہ خواہش دیرینہ معلوم ہوتی ہے اور اس لحاظ سے معنی خیز مصلحت اندیشی پر مبنی ہے۔ جب ’نقوش‘ کے رسولؐ نمبر کی کئی جلدیں منظرِ عام پر آ گئی تھیں اور حکومتِ وقت سے مطلوبہ سرپرستی حاصل کرنے کا یہ مناسب وقت اور موقع نکلا تھا۔ محمد طفیل ’نقوش‘ کی خدمات کا اعتراف انہیں سرکاری طور پر اعزاز دینے کے علاوہ مجموعی طور پر کہیں زیادہ اور مستقلاً ٹھوس تھا۔ یہ اس حکم پر مشتمل تھا کہ نقوش کے تمام مذکورہ آئندہ شائع ہونے والے رسولؐ نمبر کے شمارے ہر سرکاری لائبریری خریدے۔

یہاں یہ بتانا باعثِ حیرانی ہوگا کہ طفیل صاحب نے ۱۹۶۶-۷ء میں رسولؐ نمبر نکالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس ضمن میں ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا‘ جسے سن کر میں اس لیے حیران ہُوا تھا کیونکہ یہ مذہبی میدان میں انقلابی قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ جاوید طفیل، فرزندِ موصوف نے مذکورہ بالا شمارہ نقوش (سالنامہ میں مطبوعہ اپنے تعزیتی` مضمون بہ عنوان ”میرا والد، میرا دوست“ میں اس ضمن میں لکھا ہے: ”ایک روز موڈ میں تھے تو فرمایا کہ میں نے دنیا کی شخصیات پر بہت کچھ چھاپا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس دنیا کی سب سے بڑی شخصیت —— رسول مقبولؐ —— پر اپنی زندگی کا ایک حاصل نمبر چھاپوں۔“

اس نمبر کے بارے میں جو معلومات بعد ازاں ملیں ان کا آخر میں ذکر کرنے سے پہلے نقوش کے چند نمبروں کے

متعلق محمد طفیل کی شخصیت کے حوالے سے چند باتیں ہو جائیں۔

خصوصی نمبر برسوں پہلے نیرنگِ خیال، شاہکار وغیرہ نے بھی نکالے ـــ روسی نمبر، فرانسیسی نمبر جو منٹو (جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے) کی طبعزاد افسانہ نگار بننے سے پہلے بحیثیت مترجم ابتدا تھی۔ ویسے کارواں کے غالباً دو خصوصی شمارے، جو سالناموں کی صورت میں شائع ہوئے اردو ادب میں اب تک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کارنامے پطرس، تاثیر اور چغتائی وغیرہ نے مل کر سر کئے تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے سالہا سال کے ادب پر محیط نمبروں کے بعد نقوش نے خصوصی نمبروں کی ابتدا طنز و مزاح نمبر سے کی۔

محمد طفیل خصوصی نمبروں کے لیے مواد حاصل کرنے کے لیے چپکے سے پاکستان سے غائب ہو جایا کرتے اور دہلی، لکھنؤ، علیگڑھ، الٰہ آباد اور پٹنہ تک کے نہ صرف کتب خانوں کا چکر لگاتے بلکہ مشہور و معروف ادبی شخصیتوں کو بھی مل آتے۔ ان سے ملاقاتوں پر بعض خاکوں کو "یادوں" اور کئی خاکوں پر مشتمل کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس سے قبل ان میں سے کئی 'نقوش' میں بھی چھپے۔

رسولؐ نمبر کے سلسلے میں انہوں نے ۱۹۸۲ء میں سعودی عرب کا خصوصی سفر کیا، حج سے ایک برس بعد۔

طفیل صاحب نے کبھی عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ان کی تعلیم سکول تک محدود تھی لیکن ان کی ادبی، تنقیدی اور مدیرانہ حس قابلِ قدر تھی۔ افسانہ نمبر (۱۹۵۵) اس کا ایک عظیم نمونہ ہے۔ یہ ڈیڑھ سو برس ۱۹۵۴ء تک کے داستانی اور افسانوی ادوار میں تقسیم ہے۔ مجموعی طور پر اس سے بہتر انتخاب اب تک مرتب اور شائع نہیں ہوا۔ اس لیے برصغیر کا چھوٹا بڑا افسانہ نگار نقوش میں چھپنا ایک اعزاز سمجھتا تھا اور 'نقوش' کے لیے بھی نئی دریافت کرنا اور پائے کے افسانے شائع کرنا باعثِ فخر ہوتا۔ نقوش کا اس اعتبار سے ایک طرۂ امتیاز 'کہانی پن' سے خالی، تجریدی قسم کے افسانوی معمے چھاپنے سے اصولاً سخت گریز کرنا تھا جس کے نتیجے میں اس کے علمبردار افسانہ نگاروں اور 'نقوش' میں دائمی خلیج پیدا ہو گئی جو اب تک قائم ہے اور وقت اس موقف کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔

افسانہ نگاری کے سلسلے میں انہوں نے ایک روز کہا "افسانہ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس کے لیے وقت چاہیے۔ موصوف نے یہ صلاحیت ایک پائے کا خاکہ نگار بننے سے ثابت کر دی۔ اس کے برعکس انہوں نے شعری انتخاب کی عمدگی کے بارے میں کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا اور انہوں نے اس کا برملا اعتراف کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہ کی۔

نقوش کے سیکڑوں صفحات، بالخصوص خاص نمبروں کے لیے مواد کو پڑھنا، ان میں سے انتخاب کرنا، ان کی کتابت کروانا خاصا کٹھن اور توجہ طلب کام تھا۔ غالباً ان ہی دنوں گھنٹوں کرسی میں بیٹھ بیٹھ کر اور زیادہ چائے پینے اور کھانے میں بے قاعدگی سے موصوف بیمار پڑ گئے ـــ پیچش کا اتنا شدید عارضہ لاحق ہوا کہ بغرضِ علاج ڈاکٹر کے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ان دنوں ادارۂ فروغِ اردو نے میرا دوسرا ناول "کرنوں کے شکاری"

شائع کرنا تھا جس میں موصوف کی بیماری کے باعث بڑی اڑچن آپڑی۔ اول تو محمد طفیل کے معیار کا کاتب دستیاب نہ ہونے کے باعث کتابت کروانے کا نزلہ مجھ پر آپڑا کہ میں ہی عمدہ کاتب ڈھونڈ کر یہ کام کرواؤں۔

کاتب کی تلاش میں مجھے شہر کے انجانے بازاروں اور گلی کوچوں میں سے گزرنا پڑا جن کی خاکستر عمارات سے آزادی کی ہولناک تباہ کاریاں مترشح تھیں۔ ان کے ہنگاموں کی بازگشت اب بھی سنائی دی۔ میں چوک متی میں واقع کاتبوں کی بیٹھک پہنچا اور اپنے تئیں ایک موزوں کاتب منتخب کر کے مسودہ ہذا کے خاصے صفحات اس کے حوالے کئے اور اُسے بتا دیا کہ یہ کس شخص کا کام ہے — محمد طفیل اور اس کے ادارہ فروغِ اردو کے لیے — اسے کتنا معاوضہ ادا کرنا تھا یہ بھی طے کر لیا۔ اس معاملے میں بھی، اس کا تعلق خواہ دوستوں کے مالی طور پر کام آتا ہوتا یا کاروبار میں ادائیگی کرنا ہوتی، موصوف کا رویہ بہت صاف ہوتا۔ خیر، جب ناول کی پانچ چھ کتابت شدہ کاپیاں میں نے انہیں دکھائیں تو ان میں غلطیوں کی بھرمار ہونے کے علاوہ کتابت کے لحاظ سے یہ معیار سے کہیں کم نکلیں۔ اس کے نتیجہ میں طفیل صاحب نے کل کتابت شدہ مواد اور کاتب، دونوں مسترد کر دئے۔ (کاپیاں ضائع کر دیں) اس کے کاتب کو چپکے سے مقررہ معاوضہ ادا کر کے مجھے کسی مناسب کاتب ملنے کا انتظار کرنے کو کہا۔

مشہور کاتب محمد شریف عباسی دستیاب ہونے پر مسودہ اسے دیا گیا۔ گو اس نے قدرے زیادہ وقت لیا لیکن موتی پرو کر رکھ دئے۔ طبیعت خوش ہو گئی لیکن پلیٹیں بننے اور سنگسازی کا کام بھی اتنی دیر سے ہوا کہ مجھے مجبوراً کوئی اور پبلشر ڈھونڈنا پڑا جو فوراً مل گیا — اب تو کتاب کا چھاپنے کا کام ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس دوران طفیل صاحب نے اپنا پریس ملحقہ جگہ خالی ہونے پر اس میں نصب کر لیا تھا۔ بالائی منزل کا کچھ حصہ چھوڑ کر باقی سب حصہ جس کے ایک حصے میں سنگسازی کا کام ہوتا تھا، جہاں تک مجھے یاد ہے دوسرا موصوف بطور رہائش استعمال کرتے۔

طفیل صاحب کی شخصیت کا ایک بہت نمایاں اور قابلِ قدر پہلو بزنس اور عمومی تعلقات میں بھی انتہائی تحمل مزاجی برقرار رکھنا تھا۔ میں نے انہیں فقط ایک مرتبہ دفتر میں کسی پر گرم ہوتے دیکھا۔ اس میں ایک مُنہ بھرویں پنجابی گالی شامل تھی۔

ہر انسان میں اپنی مخصوص خوبیوں کے ساتھ چند کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ بندہ بشر میں کوئی پہلے پیدا یا نمایاں ہو جاتی ہیں، کوئی بعد میں۔ اس کا انحصار تو اس کے ذاتی تجربات اور ماحول کے ردِ عمل وغیرہ پر ہوتا ہے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ اُبھرنے لگیں۔ مرحوم کی شخصیت کو حتی الامکان سمجھنے کے لیے رائٹرز گلڈ کے قیام اور اس میں بحیثیت صوبائی سیکرٹری بعد ازاں جنرل سیکرٹری انہوں نے نہایت اہم تاریخی و تعمیری کردار ادا کیا حتیٰ کہ وقت کی قلت اور دوسروں کو کام کرنے کا موقع دینے کے سبب وہ اس سے الگ ہو گئے۔ نقوش، پریس اور ادارے میں بے پناہ مصروفیات کے باوجود وہ گلڈ کے عام اور خاص میٹنگیں اور اجلاس منعقد کرتے، سرکاری نوعیت کے مسائل طے کرتے، گلڈ کے صوبائی اور کل ملکی انتخابات کے لیے ووٹ حاصل کرنے کے لیے تقریباً ہر امیدافزا، بالخصوص اپنے حلقہ کے ووٹروں کے گھر گھر امیدوار کے ہمراہ جایا کرتے۔ اس مقصد کے لیے وہ دو ایک مرتبہ سید وقار عظیم مرحوم کے ساتھ راقم کے ہاں آئے۔ ایسا شخص جو بظاہر سست رفتار

ڈھیلے ڈھالے اندازِ گفتگو میں بھاٹی دروازے کا ساکن لگتا تھا، لیکن حاضر جواب، نپے تلے جواب دینے والا، اس کا تنوع اور بے شمار کام کرنا اور کامیابی سے کرنا حیران کن تھے۔ اس لیے بھی اس کے سابق شریکِ کار گمنام کونے میں جا چکے تھے۔ بہرحال جیسے وقت نے ثابت کیا، گلڈ کی خدمت بے ثمر ثابت نہ ہوئی۔ مرحوم کی کاوشوں کے نتیجہ میں اس نے کافی سرکاری مالی امداد حاصل کی، اس کے تحت مختلف قومی زبانوں میں سالانہ شائع شدہ نئی تصانیف پر انعام کا اجرا ہوا، ممبران کو رہائشی پلاٹ خصوصی شرائط و مراعات پر دینے کا سلسلہ شروع ہوا ——— ظاہر ہے کئی عہدے داروں نے گلڈ کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔

طفیل صاحب نے نقوش پریس کو مستقل اور منفعت بخش ذریعۂ آمدنی بنانے پر بتدریج توجہ دی۔ لیکن ذریعہ معاش اور گھر بنانے وغیرہ کے مسائل الگ تھے ——— دنیاوی مسائل! ——— جاوید طفیل (فرزند) نے چند برس پہلے ایم اے کامرس ہونے کی حیثیت سے حساب لگایا تھا کہ پرچے کو ہر سال ۳۰ ہزار روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔ اس کے والد مرحوم نے اس کی پروا نہ کی کیونکہ نقوش تو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور خلائی سیارہ بھی! اس کے لیے مواد حاصل کرنا یاد آیا کہ کیسی کیسی مہم پر نکلتے۔ جس جگہ اور جس شخص کا اس ضمن میں سراغ ملتا وہاں پہنچ جاتے۔

مرحوم کی طویل جدوجہد تقریباً ۴۵ برس پر محیط تھی۔ ان کا ہمیشہ ڈھیلے ہاتھ سے مصافحہ کرنا، قلبی گرمی کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں ایک نمایاں عنصر ظاہر کرتا تھا۔ یہ ظاہری بے نیازی، پیہم جدوجہد اور پیدا شدہ ذہنی تناؤ کی غمازی تھی جو کب سے ان کے دل کے روگ میں بدل گیا اور ایک دن جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ ایک روز اسلام آباد میں ایک دوست کے گھر سوتے میں صبح کے وقت چل بسے۔

ڈگریاں

احمد شریف

میرا خیال ہے محمد طفیل کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔

آپ کو یاد ہوگا احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور سیدہ وقار عظیم کے بعد محمد طفیل نے نقوش کا سارا کاروبار خود سنبھال لیا تھا۔ پنڈی کے حلقوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ محمد طفیل کی شخصیت کئی دنوں تک زیرِ بحث رہی تھی اور ہر آدمی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈی کے بڑے لکھنے والوں نے برملا کہا تھا:

"ان پڑھ ہے ان پڑھوں کو چھاپے گا۔"

ان کے پیشِ نظر دو خدشات تھے: اوّل یہ کہ اپنے سے کم پڑھے لکھے آدمی کی ادارت میں چھپنا ان کے لیے سبکی کی بات تھی۔ دوسرے انہیں یقین تھا کہ نقوش کا مستقبل سراسر مخدوش تھا۔

مجھے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میری افسانہ نگاری کی عمر محمد طفیل کی ادارت سے بہت چھوٹی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب محمد طفیل کی طرف سے انہیں نقوش میں شمولیت کا خط نہ ملا تو وہ اپنی جگہ چیں بہ جبیں ہوتے رہے۔

ایک زمانے میں ہر ادیب کے نام کے ساتھ ایک ڈگری چسپاں ہوا کرتی تھی۔ جیسے کرشن چندر ایم اے، میرزا ادیب بی اے (آنرز)، شبلی بی کام، احسان بی اے' وغیرہ۔

سعادت حسن منٹو کے پاس بھی کوئی بڑی ڈگری نہیں تھی حالانکہ اس کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ایک روز وہ کرشن چندر کے گھر گیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی:

"کرشن چندر ایم اے۔ کرشن چندر ایم اے۔"

کرشن چندر باہر آیا اور برافروختہ ہو کر کہا:

"اوئے ایم اے، ایم اے کی کیا رٹ لگا رہا ہے۔ سیدھا کرشن چندر کیوں نہیں کہتا!"

منٹو معصومیت سے بولا:

"تو سیدھا کرشن چندر کیوں نہیں لکھتا۔"

کرشن چندر نے ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

اس کے بعد کرشن چندر نے ایم اے کی ڈگری اپنے نام سے اتار کر علیحدہ رکھ دی۔ ڈگری اتارنے کے باوجود اس کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوئی البتہ ڈگری کی اہمیت روز بہ روز کم ہوتی گئی۔

محمد طفیل نے ادارت سنبھالنے کے بعد نقوش کے پے در پے کئی ناقابلِ فراموش نمبر نکالے اور ثابت کر دیا کہ تخلیقی ادب کے میدان میں ڈگری کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

محمد طفیل بہت سادہ آدمی تھا اور پرکاری اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ میرا تعلق چونکہ افسانے سے ہے اس لیے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ افسانے کے بارے میں اس کی رائے بہت اہم ہوتی تھی۔

ایک دفعہ میں لاہور گیا۔ نقوش کا ایک ضخیم نمبر زیرِ ترتیب تھا۔ ہر لکھنے والے کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ میری کوئی تحریر اس نمبر میں شامل ہو۔ میں ایک افسانہ اور ایک ناولٹ ساتھ لے کر گیا تھا۔ میں نے دونوں چیزیں محمد طفیل کے حوالے کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا،

"میں کل صبح واپس جاؤں گا، آپ کو دونوں میں سے جو چیز پسند آئے رکھ لیں۔"

اگلے روز میں صبح ہی صبح نقوش پریس گیا۔ محمد طفیل پہلے سے دفتر میں موجود تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، گھگی سی چھڑی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ ڈر رہا تھا کہ اس نے کوئی چیز پڑھی بھی تھی یا نہیں۔ اگر پڑھی تھی تو نہ جانے اس کی کیا رائے تھی۔ اس نے مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"تمہارا ناولٹ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ ناشتے پر افسانہ پڑھا۔ دونوں اچھے ہیں۔"

پتا نہیں خوشی کی انتہا تھی یا موسم ہی ایک دم منجمد ہو گیا تھا۔ میں دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر کرسی پر سکڑتا چلا گیا۔ اس نے میری حالت غیر ہوتی دیکھ کر گھبرا کر پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

میں نے کہا:

"کچھ پیسے دو، سویٹر خریدوں گا۔"

اس نے مجھے سو روپے دے دیے۔ ان دنوں ایسا آدمی جس کی جیب میں سو روپے ہوں انارکلی میں بآسانی خریداری کر سکتا تھا۔ میں نے دس روپے کے اندر اندر ایک سوتی پاجامہ اور بنیان خریدے اور دکان کے پچھلے حصے میں جا کر زیبِ تن کر کے نقوش پریس لوٹ آیا۔ محمد طفیل میری واپسی پر چونکا۔ میں نے نوّے روپے نکال کر چپکے سے میز پر رکھ دیے۔ اس نے ایک نظر نوٹوں پر ڈال کر بغور میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"تو کیسا افسانہ نگار ہے!"

پتا نہیں اس کا واسطہ کیسے کیسے افسانہ نگاروں سے پڑتا تھا۔ میں نے کہا،

"جیسا بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔"

اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر چلا آیا۔

پنڈی آ کر میں نے اسے دس روپے منی آرڈر کر دیے۔ کچھ دنوں بعد منی آرڈر واپس آ گیا۔ اس کے ایک کونے پر

محمد طفیل کی تحریر میں لکھا تھا: بِفِطّے منہ۔

مجھے افسانہ نگار بنانے والا محمد طفیل تھا۔

ان دنوں لاہور ادبی پرچوں کا گہوارہ تھا۔ ان پرچوں کے مدیران گرمیوں میں اکثر کوہ مری جاتے ہُوئے پنڈی میں ایک رات کسی نہ کسی بڑے لکھنے والے کے ہاں گزارتے تھے۔ اس ایک رات کی محفل میں شریک ہونے والوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے ایسی محفلوں کی اطلاع عموماً ان محفلوں کے گزر جانے کے بعد ہوا کرتی تھی۔ سچی بات ہے اس ناقدری کی وجہ سے کئی دنوں تک اندر ہی اندر کھرچن سی لگی رہتی تھی۔

اتفاق سے محمد طفیل کو اس بات کی سن گن ہوگئی۔

ایک روز میں دفتر سے گھر آیا تو گھر میں بڑی رونق تھی۔ بچّے صحن میں دھماچوکڑی مچا رہے تھے۔ محمد طفیل بیوی بچوں سمیت آیا ہُوا تھا۔ میں کبھی اپنے گھر کو اور کبھی محمد طفیل کو دیکھتا تھا۔

اس رات میرے گھر میں کوئی محفل نہ جمی۔ محمد طفیل نے اپنے آنے کی کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ ہم دونوں رات بھر بیٹھے نقوش کی باتیں کرتے رہے۔ اسے نقوش سے بے پناہ محبت تھی۔

ایک کرسچین لڑکی ہر شام بنک روڈ سے گزرتی تھی۔ اس کے وجود میں بجلیاں سی کوندتی تھیں۔ جب وُہ گزرتی تو بنک روڈ ڈگمگا سی جاتی۔ بنک روڈ کے سارے لوگ اس کے گرویدہ تھے۔

وہ ایک خراب عورت تھی پھر بھی اس کے اردگرد ایک خوبصورت کہانی بکھری ہُوئی تھی اسے قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ خراب عورت کے اندر ایک معصوم سی عورت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زندہ تھی۔

میں نے اس کی کہانی لکھی اور محمد طفیل کو نقوش کے لیے بھیج دی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے وہ کہانی کس عنوان سے بھیجی تھی جب وُہ کہانی چھپ کر آئی تو اس کا عنوان "اترن" تھا۔

محمد طفیل کا ایک دوست ہے صادق حسین۔ صادق حسین ان دنوں بہت اچھے افسانے لکھتا تھا۔ وہ لاہور میں تھا اور اپنی زیرِ تحریر کہانیوں پر محمد طفیل سے تبادلۂ خیال کرتا تھا، اترن کے نام سے ایک افسانہ اس کے بھی زیرِ غور تھا۔

محمد طفیل نے میری کہانی اترن کے نام سے چھاپ دی کیونکہ وہ عنوان اس کہانی کے لیے نگینے کی طرح تھا۔ بعد ازاں محمد طفیل اور صادق حسین کے مابین کیا گزری، یہ ایک الگ داستان ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ محمد طفیل کو جنون کی حد تک تکمیل کا شوق تھا۔

ہمارے ملک میں ایسے ادیب اور شاعر بھی ہیں جن کی ادبی زندگی کا انحصار ان ادبی پرچوں پر تھا جن سے وہ وابستہ تھے۔ اگر کبھی علیحدہ ہوئے تو گمنامی کے اندھیرے میں ڈُوب گئے۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ان ادبی پرچوں کو زندہ رکھنے کے لیے کیسا کیسا ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگایا ہوگا۔ اس پر بھی زمانہ شاہد ہے کہ سب کے دیکھتے دیکھتے سویرا' ادب لطیف، داستان گو اور لیل و نہار جیسے بلند پایہ ادبی پرچے کچھ عرصہ سسک سسک کر جینے کے بعد دم توڑ گئے۔ ان پرچوں

کے پیچھے ڈگریوں کی ایک لمبی قطار انہیں حیاتِ جاودانی بخشنے سے قاصر رہی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے محمد طفیل کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی پھر بھی نقوش کی شکل میں اس نے ہمارے لیے عظیم ڈگریاں چھوڑی ہیں ایسی ڈگریاں جو کسی یونیورسٹی سے نہیں ملتیں جن کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو گی۔

میں سوچتا ہوں محمد طفیل کے جانے کے بعد نقوش پر کیا گزرے گی!

محمد نقوش

مجتبیٰ حسین

محمد طفیل ــــــ نام لیجئے تو اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی قیمتی چیز اچانک کھو گئی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے جُون میں اُن کا خط ملا کہ انیسؔ نمبر کے لیے کوئی مضمون لکھ دیجئے کہ " واہ ، وا " ہو جائے۔ میں نے جواب دیا کہ میں" واہ، وا " کا دریائے شور پار کر چکا ہوں۔ بہرحال تعمیلِ ارشاد واجب ہے۔ مضمون مرحوم جلد از جلد چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے انیسؔ پر ایک طویل مضمون لکھ کر اُن کے پاس بھیج دیا۔ جواب ملا کہ دونوں طرف سے کچھ غلط فہمی ہوئی۔ دراصل انیسؔ نمبر پر مضمون درکار تھا۔ ساتھ ہی مرحوم نے مضمون کی تعریف کرتے ہُوئے لکھا تھا کہ وُہ اِسے انیسؔ نمبر پر مضامین کے ساتھ ہی شائع کر دیں گے۔

ایک اور عجیب بات انہوں نے کی ، خط کے ساتھ ہی مضمون کی فوٹو کاپی بھی بھیج دی۔ اب سوچتا ہُوں کہ اُنہوں نے ایسا کیوں کیا ــــ کیا انہیں پہلے ہی سے کچھ ــــــ مگر اس طرح سوچنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

میں نے فوٹو کاپی کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی انیسؔ نمبر پر ایک مختصر تبصرہ بھی بھیج دیا۔

پھر اُن کا جواب نہیں آیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ یہ غالباً جون کی آخری تاریخ تھی۔ پھر ۶ جولائی کے اخبار میں پڑھا کہ اسلام آباد میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

چلئے، چھُٹی ہُوئی۔ اردو رسائل کا ایک نہایت روشن باب ختم ہوا ـــ اور ختم بھی کس پر ہُوا ، رسولؐ نمبر پر ـــ

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

طفیل صاحب سے میری ملاقات اتفاقی اور گاہے گاہے کی تھی۔ جب وُہ پہلے پہل نقوش کا شخصیت نمبر نکال رہے تھے تو اُن کا پہلا خط ملا جس میں فراقؔ صاحب پر مضمون لکھنے کی فرمائش ہی نہیں وعدہ بھی 'لیا' گیا تھا۔ رگلڈ کے قیام کے بعد بھی اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ گلڈ کے سرگرم کارکن تھے اور بعد میں اُس کے سیکرٹری جنرل بھی بن گئے۔ مجھ سے اُن کی ملاقات یا خط و کتابت کا سبب صرف ایک ہی تھا ، وہ تھا نقوش !

جب میں کوئٹے آ گیا تو دو بار اُن سے خاصی طویل گفتگو رہی ۔ وُہ پہلی بار قلم قبیلے کے مذاکرے میں پانچ چھ برس قبل ایک مضمون پڑھنے آئے تھے ۔ دُوسری بار رگلڈ کے یا کسی اور کام سے آئے تھے۔ اس بار ان سے طویل گفتگو رہی ـــ یہی ادب اور اس کی رفتار پر۔ بات مجھ سے تھی اور وُہ بار بار دریافت کرتے تھے کہ میں اِس قدر کم لکھ رہا ہُوں ۔ گفتگو چونکہ میرے بارے میں تھی اس لیے چھوڑتا ہُوں۔ البتہ جو کچھ ادب کی موجودہ صورتِ حال پر

بات ہوئی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ طفیل مرحوم نئے پرانے ادیبوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی نہیں وہ ان کی تحریروں پہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں۔ مدیر کی حیثیت سے وہ محتاط گفتگو کر رہے تھے۔ مگر ہر شخص کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی اور یہ رائے مدیرانہ ہی نہیں ادیبانہ اور ناقدانہ بھی تھی۔ ادب کی صورتِ حال سے وہ پوری طرح باخبر تھے اور ادیبوں کو جگانے، اُن کو لکھنے پر مائل کرنے، لکھنے والوں کو معیاری تخلیقات پیش کرنے پر حوصلہ افزائی کے لیے وہ ہمہ وقت مستعد اور بے چین رہتے تھے۔ اچھے ادب اور اچھے ادیبوں کو اکٹھا کرنے کی ان میں بڑی لگن تھی۔

من آنم، صاحب او رجناب اور مرحوم کی دوسری تحریریں پڑھ کر یہ بات واضح ہو سکے گی کہ محمد طفیل کس دم خم کے آدمی تھے اور ادب سے انھیں کتنا لگاؤ تھا۔ وہ اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کے عہد کے تمام بڑے چھوٹے ادیبوں اور شاعروں کا انھیں تعاون حاصل تھا۔ خود محمد طفیل کا اندازِ تحریر شگفتہ اور نکتہ رس تھا۔

ادیبوں سے ان کی شناسائی گہری تھی اور یہی چیز اُن کے ادبی خاکوں میں دلپذیر انداز میں اُبھرتی ہے۔ اُن کے ملنے جلنے کا ہنس مکھ انداز اُن کی تحریروں میں بھی۔

اُن کے چہرے سے کئی کیفیتیں نمودار ہوتی تھیں۔ سنجیدگی اور شگفتگی، قربت اور دُوری بیک وقت اُن سے ملنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی۔ لمبا قد — (دُور سے دیکھ کر مجھے جنرل ڈیگال یاد آتے تھے)۔ متجسس اور سخن سنج آنکھیں، پیشانی پر کبھی کبھی ہلکی ہلکی شکنیں، اور ہونٹ جو دوسروں کی بات سُنتے ہوئے بھی خاموشی سے ہمہ وقت اپنی ہی بات کہتے ہوئے —— کچھ اس قسم کا چہرہ میری نظر میں اُن کا اُبھرتا ہے —— یہ چہرہ بھی اب اُس گیلری میں آویزاں ہو چکا ہے جہاں اردو ادب کے بڑے مدیر جگمگا رہے ہیں۔

اردو ادب نے کتنے بڑے مدیر دئیے ہیں اِس پر ابھی کوئی کام نہیں ہُوا ہے۔ اگر معلومات بہم ہو سکیں تو یہ نہایت اہم کام ہوگا جس سے ادب کی نہایت مبسوط تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ مدیرانِ گرامی 'ادب دوست، ادب شناس، ادب نواز اور اسی کے ساتھ ادیب، شاعر، افسانہ نویس، ناول نگار اور ناقد کیا کچھ نہیں تھے! اودھ پنچ کے منشی سجاد حسین، صلائے عام کے ناصر علی اور مخزن کے شیخ عبدالقادر، زمانہ کے دیا نرائن نگم، نگار کے نیاز فتحپوری، ساقی کے شاہد احمد دہلوی ہیرے کی طرح درخشاں ہیں۔ اور اب ان میں ایک اور ہیرا بھی شامل ہو گیا ہے۔

لوگوں نے محمد طفیل کو محمد نقوش کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ نقوش کا جو نمبر بھی ہے اُسے کوئی اور مرتب نہیں کر سکتا تھا۔ ہر نمبر ادب کی ایک تاریخ اور مستند حوالہ ہے۔ کسی بھی خصوصی نمبر کو اٹھا لیجیے اس میں ایک کتاب نہیں کئی کتابیں بند ہیں۔

ذرا وقت گزر جائے اور ادبی تاریخ کچھ اور آگے بڑھ جائے —— پھر ہمیں اندازہ ہوگا کہ محمد طفیل کیا تھے اور کیا ہیں —— نقوش کا ہر نمبر ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتا جائے گا —— اور ہم ادب کی جس راہ جس موڑ پر بھی جائیں گے وہاں محمد طفیل باوقار انداز میں کھڑے ہُوئے خوش آمدید کہتے نظر آئیں گے۔

والدہ

والد

محمدؐ طفیل اور اُن کی زندگی کے مختلف ادوار

محمد طفیل اور لطیف فاروقی

محمد طفیل اور ان کے بھائی

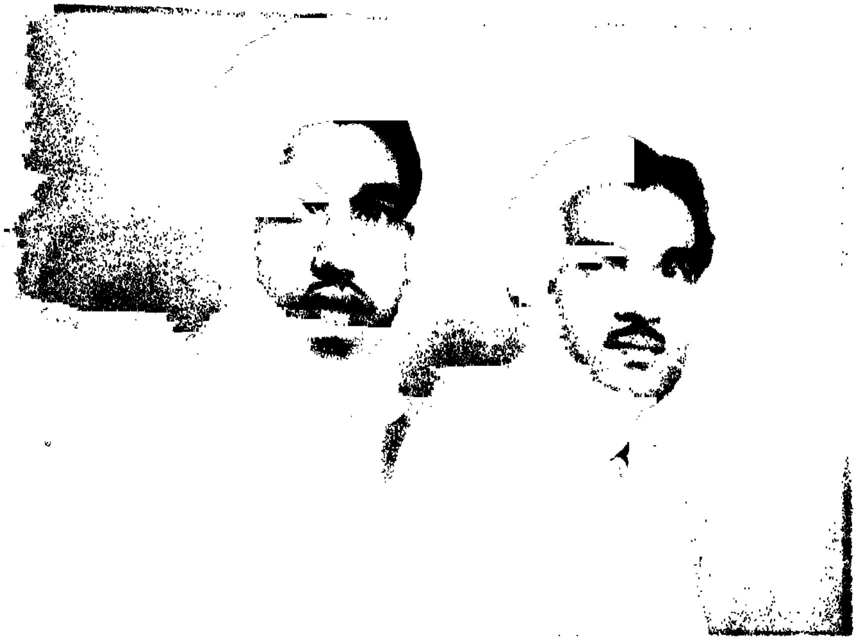

محمود عالم قریشی کے ساتھ

اپنے بھائیوں کے ساتھ

اپنی اہلیہ کے ہمراہ

ادبی معرکے نمبر کی تقریب کے موقع پر

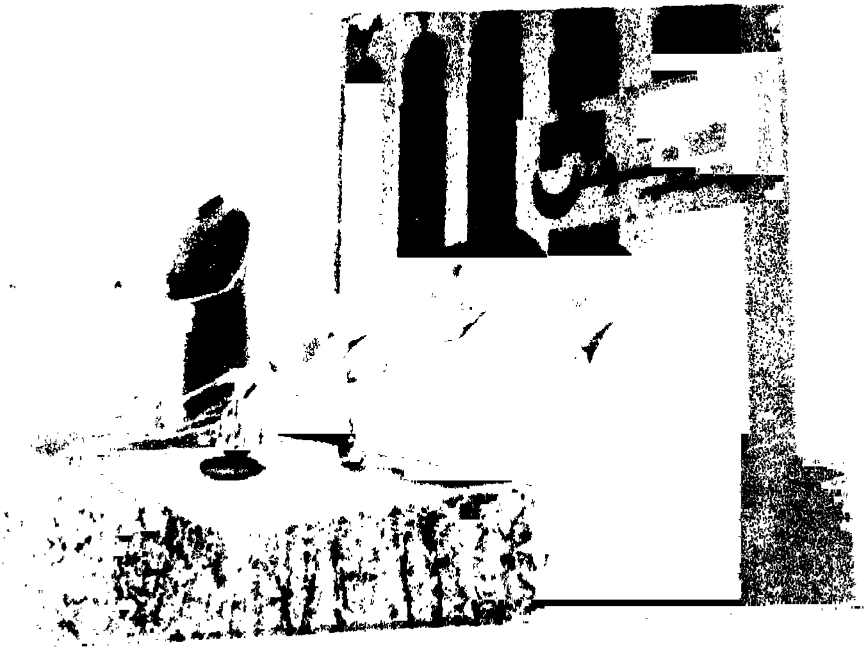

جنرل محمد ضیاء الحق کو رسول نمبر پیش کرتے ہوئے۔

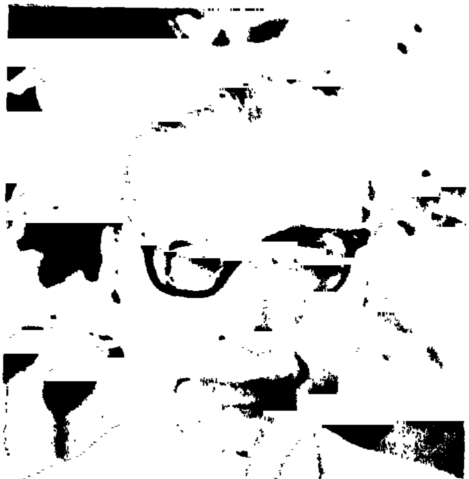

بیوی اور بچوں کے ساتھ

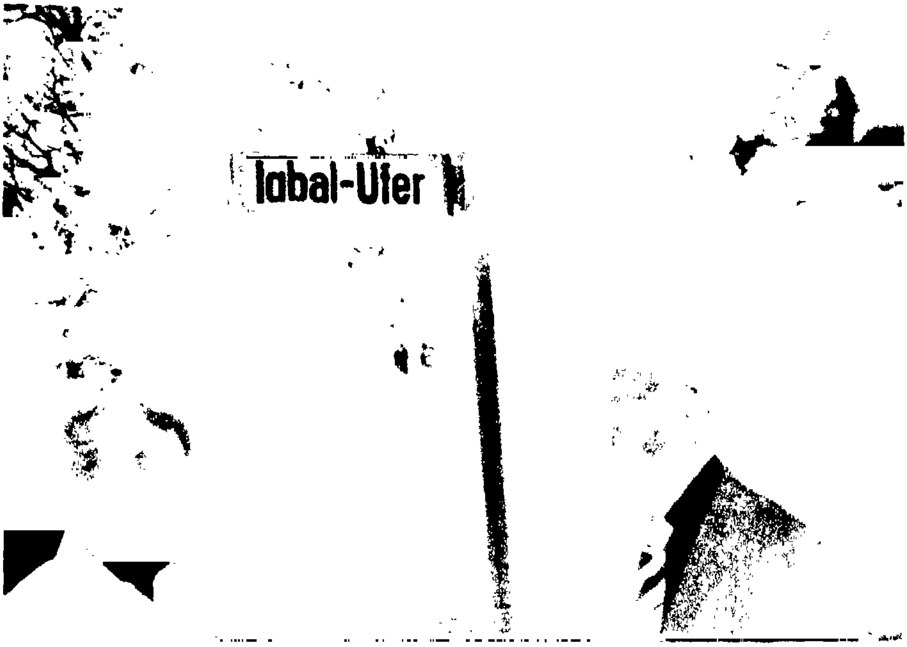

ہائیڈل برگ میں فتح محمد ملک کے ساتھ

حج کے موقع پر

جنیوا میں

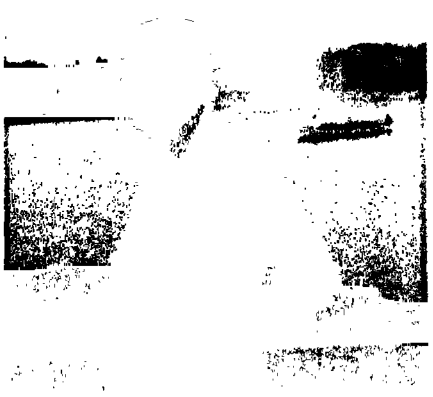

گرم دمِ جستجو!

ڈاکٹر سلیم اختر

میں طبعاً ان لوگوں میں سے ہوں جو کثیر الاحباب نہیں ہوتے۔ میرے خالص دوستوں کو اوّل تو ایک ورنہ زیادہ سے زیادہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گِنا جا سکتا ہے۔ میں کہ سوشل نہیں تو سوشل انیمیل کیسے بن سکتا ہوں۔ جو چند دوست وقت اور خلوص کے امتحان میں کامیاب رہے۔ ان کے لیے میں جی جان سے حاضر ہوں اور اسی لیے میں اپنے دوستوں کو چینی کے گلدانوں کی طرح سنبھال سنبھال رکھتا ہوں۔ ان کی دلجوئی کرتا ہوں کہ ——

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

یہی وجہ ہے کہ کسی دوست کا انتقال میرے لیے قلبی سانحہ سے کم نہیں ہوتا۔ اسی لیے مرحوم دوست کے بارے میں تعزیتی مضمون رقم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ ہر سطر اس کی یاد کے نشتر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دوسرے اس لیے بھی کہ مضمون کی صورت میں گویا یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اب دوست واقعی رخصت ہو چکا ہے اور کتاب زلیست میں سے اس کی محبت کا عنوان بننے والا باب ختم ہو گیا ہے۔

طفیل صاحب سے محبت کا جو رشتہ استوار تھا شاید ماہ و سال کی پیمائش کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ طویل نہ محسوس ہو۔ ویسے ہمارے صورت آشنا اور غرض مند ادبی معاشرہ میں ادیبوں کی دوستیاں کوئی بہت زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں، لیکن میری مانند خود طفیل صاحب بھی کثیر الاحباب نہ تھے اس لیے وہ جنھیں دوست سمجھتے تھے ان کی ہر ممکن طور پر خاطر داری کرتے تھے۔ "نقوش" جیسے پرچہ کا بلند معیار برقرار رکھنا اور ادیب دوستوں کو بھی خوش رکھنا۔ یہ مشکل کام صرف وہی کر سکتے تھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر دوست اور "نقوش" میں سے انتخاب کا مرحلہ آیا تو وہ بلا جھجک "نقوش" کے طرفدار ثابت ہوئے اور اس لیے محض چھپنے چھپانے کو دوستی کا معیار قرار دینے والے "دوست" ان کے ناخوش ہی پائے گئے۔

میں اگرچہ ملتان کے قیام کے دوران میں ان سے مل چکا تھا اور وہ مجھے نقوش میں شائع کر چکے تھے) وہ پہلی مرتبہ بھی اس اپنائیت سے ملے کہ محسوس ہوا کہ گویا مدت دیرینہ سے ہم دم چلے آ رہے تھے اور پھر ہمدمی کے اس احساس میں وقت کے گہرے رنگ بھرتا گیا جب ۱۹۷۰ء میں ملتان سے تبدیل ہو کر لاہور آ گیا تو صحیح معنوں میں طفیل صاحب کے قریب ہوا۔ انہیں سمجھا، ان کی محبت کا مزا چکھا اور ان کے خوابوں میں شریک ہوا۔

طفیل صاحب بھی میری مانند باطنی نہیں (INTROVERT) تھے، وہ بھی طبعاً مجمع ناپسند کرتے تھے اور ہجوم منافقاں سے گھبرا کر خالص دوستی کو محبت بھری رفاقت کے متلاشی رہتے تھے، لیکن ادیبوں میں خالص دوست کہاں؟ ہر باطن بین کی مانند طفیل صاحب بھی خواب دیکھنے والے تھے لیکن ان میں اور ہم جیسے خواب دیکھنے والوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم صرف خواب

دیکھتے ہیں اور بس خواب ہی دیکھتے ہیں اور اسی لیے ہماری کھلی آنکھ کے خواب زندگی کی تلخیوں سے فرار کا ذریعہ ہوتے ہیں مگر طفیل صاحب خواب دیکھنے میں بھی آنکھیں کھول کر چلتے تھے اس لیے وہ راستہ کی مشکلات نشیب و فراز اور گڑھوں کھائیوں سے باخبر ہوتے تھے۔ وہ جو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!

تو طفیل صاحب اسی مصرع کی زندہ تصویر نظر آتے تھے۔ طفیل صاحب دیکھنے میں بہت ڈھیلے ڈھالے بلکہ پولے پولے نظر آتے تھے۔ چلتے تو یوں لگتا جیسے تھکے تھکے سے ہیں۔ گفتگو میں بھی تیزی اور طراری نہ تھی، بے حد نرم لہجہ میں بات چیت کرتے، اسی طرح مصافحہ بھی نرم نرم تھا اور مصافحہ کے وقت ہتھیلیوں کا دباؤ بھی نرم اور پولا پولا ——— البتہ آنکھوں سے ذہانت اور مسکراہٹ سے شرارت کا احساس ہوتا تھا، لیکن یہ پولا پولا اور بھولا بھالا نظر آنے والا طفیل عمل میں سیرتِ فولاد اور خارا شگافی کے تیور رکھتا تھا۔ انھوں نے تمام عمر محنت میں بسر کی اور اپنے واحد خواب یعنی نقوش کے لیے جس عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا، وہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ انھوں نے اپنی ذات اور خواب کو یوں ہم آہنگ کیا کہ محمد طفیل "محمد نقوش" بن گیا۔!

طفیل صاحب اُن لوگوں میں شامل کیے جا سکتے ہیں جو یک رُخے ذہن یعنی (SiNGLE TRACK OF MiWD) کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے وہ عمر بھر ایک ہی راستہ پر چلتے رہے اور وہ راستہ تھا "نقوش"! اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ طفیل صاحب کے لیے اگر کوئی صراطِ مستقیم تھی تو وہ نقوش تھا کہ یہی ان کے خوابوں کا مرکز، ان کی جدوجہد کا محور، ان کی شخصیت کا مدار اور مخالفین کے مقابلہ میں معیار تھا۔ لہٰذا مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نقوش بھی طفیل صاحب کا ایک بیٹا ہی تھا، باقی چار بیٹے ماں کے دودھ پر پلے تھے، لیکن یہ بیٹا طفیل صاحب کے خونِ جگر سے پروان چڑھا تھا اب جب کہ باپ نہیں رہا تو بیٹوں سے بجا طور پر یہ توقع بندھتی ہے کہ وہ اس یتیم بھائی سے برادرانِ یوسف جیسا سلوک نہ کریں گے۔

اس صدی کے آغاز سے شیخ عبدالقادر نے "مخزن" کا اجرا کر کے جدید اُردو ادب کے فروغ اور فکرِ نو کی ترویج میں پنجاب کی قیادت کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ "مخزن" کے بعد لاہور سے نیرنگِ خیال، ادبی دنیا، ہمایوں، عالمگیر، رومان، ادبِ لطیف، سویرا، فنون اور ماہِ نو جیسے جرائد طلوع ہوئے اور ان کے ذریعہ سے متعدد اہلِ قلم معروف ہوئے لیکن 'نقوش' کے اجرا سے طفیل صاحب نے جرائد کی دنیا میں جو انقلاب برپا کیا وہ برصغیر پاک و ہند میں اپنی مثال آپ ہے۔ نقوش کی صورت میں طفیل صاحب نے اُردو ادب کو جو کچھ دیا جن نامور شخصیتوں کی تحریروں سے نقوش کے صفحات مزین کیے اور متنوع موضوعات پر جو گرانقدر خاص نمبر شائع کیے ان کا احاطہ کسی ایک آدھ مضمون میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو باقاعدہ تھیسس کی ضرورت ہے۔

نقوش کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کے لیے کس قدر اہتمام ہوتا تھا، اس کی گواہی مصنفین کے ساتھ ساتھ کاتب اور مشین مین تک دے سکتے ہیں مصنفین میں سے پہلی گواہی میری!

میری بدخطی نے میری تحریروں سے بھی زیادہ شہرت حاصل کر رکھی ہے اس لیے مجھے پردہ پوشی کی ضرورت نہیں ہے، میرا مسودہ طفیل صاحب کے لیے اچھی خاصی سردرد ثابت ہوتا تھا اور یہ انھوں نے مجھے خود بتایا کہ میرے مضامین وہ خود فیئر کر کے

کاتب کو دیتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ نقوش میں چھپنے والی ہر تحریر بالکل صحیح چھپے اور اس معاملہ میں وہ اتنے تکمیل پسند تھے کہ انہیں تحریر میں زیر زبر اور لفظ کی غلطی بھی ناگوار گزرتی تھی، چنانچہ میرے ہی مسودہ کی بات ہے کہ انھیں کچھ الفاظ سمجھ نہ آئے تو مسودہ اُٹھا کر خود کالج چلے آئے۔ اسی طرح کسی لفظ کے سلسلے میں مجھے فون کیا۔ سردی کا موسم تھا اور میں لحاف میں گرم تھا۔ میں نے کہا طفیل صاحب کل آکر یہ لفظ دیکھ لوں گا بولے، نہیں ابھی آؤ! میں نے پھر ٹالا، پوچھا آتے کیوں نہیں؟ میں نے سچ بولا، کہ اس ٹھنڈ میں رضائی سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت ہنسے، مگر تھے دھن کے پکے۔ اس مرتبہ مجھے دانہ ڈالا، آجاؤ تو ایک خاص دکان کا حلوہ کھلاؤں گا ——— اور پنچھی نے دانہ چگ لیا۔!

میں نے اپنے لکھنے کی پچیس سالہ عمر میں طرح طرح کے ایڈیٹر دیکھے ہیں اور ایڈیٹر جنھیں کام نہیں، بلکہ نام سے غرض ہوتی ہے اور وہ بھی جو مضامین میں اپنے بلند پایہ مقالات کے اقتباسات خود بھی جوڑ دیتے ہیں وہ بھی جو مضامین میں اپنے دوستوں کی فہرست اسماء شامل کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور وہ بھی جو ہر قسم کی تحریر بغیر پڑھے چھاپ دیتے ہیں، لیکن بہت کم مدیر ایسے ملے جو عنوان یا موضوع دے کر کام کراتے ہوں اور طفیل صاحب ایسے ہی مدیر تھے اور پھر یہ نہیں کہ موضوع دے کر خاموش بیٹھ رہے۔ ایسی بات نہیں تھی لہٰذا مضمون مکمل ہو جانے تک پیچھا کرتے تھے (ایسے ہی دو اور سخت گیر مدیر ہیں، احمد ندیم قاسمی اور کشور ناہید) اگرچہ طفیل صاحب کا پیچھا کرنا بالعموم فون کی حد تک ہوتا تھا، لیکن اس ضمن میں بعض اوقات وہ جو ڈیڑھ سطری خطوط لکھتے تھے ان کا مزا جداگانہ ہوتا تھا۔ تخلیقات میں حسن معنی کی تلاش اور پیشکش میں خوب سے خوب تر کی جستجو کے باعث نقوش معیاری تخلیقات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ کتابت کی بدمزا کرنے والی اغلاط اور طباعت کی بدزیبی سے پاک ہوتا تھا۔

یہ ناممکن ہے کہ طفیل صاحب کا ذکر ہو اور نقوش کے خاص نمبروں کا تذکرہ نہ ہو۔ خاص نمبروں کی ترتیب اور اشاعت سے پہلے ان کی منصوبہ بندی کی جاتی تھی، جو بعض اوقات کئی کئی برس پر محیط ہوتی تھی۔ مثلاً جس رسولؐ نمبر کا اتنا چرچا ہوا، وہ ان کی کم از کم پندرہ برس کی منصوبہ بندی کا ثمر ہے۔ یہی حال باقی نمبروں کا ہے۔ غالبؔ، اقبالؔ، میرؔ اور انیسؔ پر انھوں نے جو خصوصی اشاعتیں مرتب کیں، ان کے لیے بھی تحقیقی زادِ راہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کتنے دروازوں پر دستک دی، کتنے محققین کو خطوط لکھے، کتنی لائبریریاں کھنگالیں اور کتنی راتیں جاگ کر دیدہ ریزی کی۔!

طفیل صاحب بالعموم اپنے نام کے بارے میں اخفا سے کام لیتے تھے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو کام سے پہلے اور کام کے دوران ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں، طفیل صاحب ان کے برعکس خاموشی سے کام کیے جاتے اور مشورہ صرف ان احباب سے کرتے تھے جن سے مفید رائے کی توقع ہو سکتی تھی اور اس میں بھی یہ التزام رکھا جاتا کہ جو جس شعبہ کے بارے میں رائے دے سکتا ہو صرف اسی کے بارے میں اس سے گفتگو کی جائے مثلاً ادبی نمبروں، تقریبات یا مذاکروں کے بارے میں انھوں نے رسولؐ نمبر کے بارے میں مجھ سے کبھی بھی مشورہ نہ لیا کہ جانتے تھے کہ میں محض سُنّی مسلمان ہوں جب کہ اس نمبر کے لیے برِصغیر پاک و ہند کے علاوہ دنیائے اسلام کی اہم شخصیات، محققین اور علماء، فضلاء کو خطوط لکھے اور ان سے رابطہ قائم کیا۔

جہاں تک منصوبوں کا تعلق ہے تو طفیل صاحب کے ذہن میں اتنے نمبروں کے منصوبے تھے کہ یہ صدی بیت جاتی مگر ان نمبروں

کا سلسلہ نہ ختم ہوتا۔ مثلاً آج سے کئی برس پیشتر انھوں نے "نقوش" کے گزشتہ خاص نمبروں پر مشتمل ایک خاص نمبر نکالنے کا ارادہ کیا۔ یہ بہت منفرد نمبر ہوتا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف ناقدین سے مختلف نمبروں کے بارے میں مقالات کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ خود میں نے بھی ان کی فرمائش پر "نقوش" کے تمام افسانہ نمبروں اور منٹو نمبر پر دو مقالات لکھے تھے۔ انھوں نے اصناف ادب کے بارے میں معتبر ناقدین سے مذاکرات قلم بند کرا رکھے تھے۔ ان میں سے دو تین اصناف پر مذاکرات وہ عصری ادب نمبر میں شائع کر چکے تھے، بقیہ وہ تنقید نمبر میں شائع کرتے۔ یہ تنقید نمبر بھی نقوش کا ایک بے حد اہم نمبر ثابت ہوتا۔ اس نمبر کے لیے انھیں میں نے ترغیب دی تھی۔ اس سلسلہ میں بھی انھوں نے منصوبہ کا آغاز کر رکھا تھا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ معروف اہلِ قلم کی TRANSRARENGIES بنانی چاہئیں چنانچہ ایک فوٹوگرافر کو مامور کیا گیا کہ وہ ادیبوں کی خوبصورت سی تصاویر بنائے۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ تو ادیبوں کی اچھی خاصی البم تیار ہو رہی ہے، کہنے لگے۔ ہاں ان تصاویر پر مشتمل ایک البم ہی چھاپ لوں گا۔ ادیب کی تصویر کے ساتھ ساتھ اس کا کوائف نامہ بھی ہوگا۔

ایک مرتبہ انھوں نے "نقوش" کے ایک ماہنامہ ایڈیشن کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اسی یا سو صفحات پر مشتمل یہ "نقوش" صحیح معنوں میں ماہنامہ ہوتا۔ وہ اسے نئے انداز پر خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے تاکہ "نقوش" کے ضخیم نمبروں کے پہلو بہ پہلو تازہ تخلیقات کا حامل ایک دیدہ زیب "نقوش" بھی شائع ہو سکے۔

طفیل صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا لازم ہے کہ وہ صاحبِ اسلوب خاکہ نگار بھی تھے جس کا منہ بولتا ثبوت نصف درجن کتابیں ہیں، مگر میں اس ضمن میں مزید نہیں لکھتا کہ ان کی خاکہ نگاری پر تنقیدی مقالہ "قد آور بونا" لکھ چکا ہوں جو "محمد نقوش" (مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) میں شامل ہے۔ اسی طرح پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ایک الگ داستان ہے۔

مجھے ان سے اپنی آخری ملاقات کبھی نہ بھولے گی۔ یکم رمضان تھی۔ کالج کی کنٹین بند تھی لہٰذا چائے تو کیا پانی بھی نایاب تھا، ادھر میرا یہ حال ہے کہ اگر گیارہ بجے تک مجھے چائے نہ ملے تو نشہ ٹوٹنے کی تمام علامات مجھ میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بس ایسے میں ایک ہی مردِ شریف تھا جس سے میں بلا کھٹکے چائے پی سکتا تھا۔ اتفاق سے طفیل صاحب اکیلے بیٹھے تھے۔ بہت خوش ہوئے، کہنے لگے میں تمھیں یاد کر رہا تھا اور میرے استفسار پر میز کی دراز میں سے ناموں کی ایک فہرست نکال کر میرے آگے رکھ دی، اوپر کے چند ناموں کو کاٹا گیا تھا اور اس کے بعد میرا نام اور پھر کچھ اور ادیبوں کے نام تھے۔ میں نے پوچھا یہ کاہے کی فہرست ہے۔ کہنے لگے یہ جو نام کاٹے گئے ہیں، ان کے خاکے لکھ چکا ہوں۔ اب اس کے بعد تمھارے خاکے کی باری ہے۔ اس کے بعد چائے کا قصہ شروع ہوا۔ انھوں نے اپنے ملازم کو بلایا اور پوچھا! تمھارا روزہ ہے۔

"جی ہاں" اس نے جواب دیا۔

اسے کہنے لگے: دیکھو میری تو صحت خراب ہے اور اس شخص کا دماغ خراب ہے، اس لیے ہم دونوں کے لیے فرسٹ کلاس چائے بنا لاؤ۔"

یہ سُن کر وُہ ہنسا اور چائے بنا کر لے آیا۔ یوں کام لینے کا ڈھنگ صرف طفیل صاحب ہی کو آتا تھا اور یہ بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔

طفیل صاحب کا ذہن مستقبل کے منصوبوں کے لحاظ سے "ذرا نم ہو" والی خاصیت رکھتا تھا اور ان میں "ذرا نم" کی کمی نہ تھی کہ "مٹی" بھی خود تھے اور "نم" بھی۔ الغرض ان کے عزائم جوان تھے اور نگاہیں مستقبل میں دُور تک دیکھ رہی تھیں۔

لیکن افسوس!

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

'نقوش' کے منصوبے تو ان کے تھے مگر مقدّر کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا، جس کی تکمیل اسلام آباد کی ایک رات کے پچھلے پہر میں ہو گئی۔ وُہ شخص جو عمر بھر خاموشی سے جیا تھا، خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ ادب اور دوستوں کی جی بھر کے خدمت کی مگر استغنا کا یہ عالم کہ بیوی اور بیٹیوں کو بھی خدمت کا موقع نہ دیا، آدمی وضع دار تو تھا مگر کیا مہمان تھا کہ میزبان کو الوداع کہے بغیر خاموشی سے چل دیا۔

میں علامہ اقبالؒ ٹاؤن کے جہاں زیب بلاک سے گزر رہا تھا کہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا، زیرِ تعمیر گلڈ لائبریری کے نامکمل ستون سُوکھے تنوں کی مانند سوگوار محسوس ہو رہے تھے، شاید "نقوش" کے ناتمام رہ جانے والے نمبروں کی مانند اب یہ لائبریری بھی نامکمل ہی رہے گی۔ یہ نامکمل ستون اُٹھی اُنگلیوں کی مانند آسمان سے یہ سوال کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

اب ہم محمد طفیل عُرف محمد نقوش کو کہاں سے لائیں گے؟

* * *

طفیل صاحب کی یاد میں

فتح محمد ملک

آج سے رُبع صدی پہلے طفیل صاحب کا پہلا خط پا کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی مشکل سے 'ادب لطیف'، 'اوراق' اور 'فنون' میں میرا ایک ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایسے میں 'نقوش' کے مخصوص لفافہ پر اپنا نام دیکھ کر میں اس غرور میں مبتلا ہوا کہ طفیل صاحب نے 'نقوش' میں اشاعت کے لیے مضمون کی فرمائش کی ہے مگر خط پڑھ کر اس غرور کو تھوڑی سی ٹھیس لگی۔ طفیل صاحب نے اطلاع دی تھی کہ ممتاز مفتی صاحب نے میرا ایک مضمون "نقوش" کو بھیجا ہے جسے پڑھ کر طفیل صاحب کو بہت مزہ آیا مگر مضمون "بحیثیت مضمون" انھیں پسند نہیں اس کے باوجود وہ اسے چھاپ رہے ہیں۔ اُداس بھی ہوا اور حیران بھی۔ مفتی صاحب قبلہ نے مضمون بھیجا ہی کیوں اور پھر بحیثیت مضمون، پسند نہ آنے کے باوجود طفیل صاحب اسے چھاپ کیوں رہے ہیں؟

مضمون کا عنوان تھا: "قدرت اللہ شہاب: افسانہ نگاری سے خطابت تک" — اور شہاب صاحب مرحوم و مغفور اُس زمانے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے سیکرٹری تھے۔ میں شہاب صاحب کی افسانہ نگاری کا مداح تھا مگر اُن کی سیاست کا نکتہ چین تھا — شہاب صاحب اس زمانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ میرے ہیرو جسٹس کیانی کی مذمت میں مشغول تھے۔ اٹک کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبۂ صدارت پیش کرتے وقت بھی مرحوم نے جسٹس کیانی کی مذمت اور ایوب خان کی وکالت کا حق ادا کیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے شہاب صاحب پر تنقید شروع کر دی۔ شفقت تنویر مرزا نے شہاب صاحب کا دفاع کرنا شروع کیا۔ ہم دونوں کی بحث اٹک سے راولپنڈی تک جاری رہی۔ منّو بھائی اور عابد علی سید ہم دونوں کا مذاق اڑاتے آئے اور بالآخر انہوں نے شفقت کو شفقت اللہ شہاب اور مجھے فتح محمد کیانی کہنا شروع کر دیا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ انہی دنوں راولپنڈی پریس کلب میں شہاب صاحب کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا اور مجھے شہاب صاحب کی افسانہ نگاری پر مضمون پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ افسانوں کی قوت اور خطبات کی کمزوری پر میری کچی پکی باتیں سن کر ایک افسر کو بہت غصہ آیا اور وہ بولے کہ خطبات کا افسانوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ میں نے عرض کیا کہ افسانہ نگار کے ساتھ تو ہے! پیشتر اس کے کہ میں افسرانہ غیظ و غضب کی زد میں آتا شہاب صاحب نے بہت مبالغے کے ساتھ میرے مضمون کی تعریف شروع کر دی۔ اس پر افسران خاموش ہو گئے۔ دوسرے روز ممتاز مفتی صاحب نے بتایا کہ مضمون شہاب صاحب کو واقعتاً پسند آیا ہے اس لیے مضمون کی ایک نقل دے دو۔ میں نے فوراً مضمون پیش کر دیا اور ممتاز مفتی صاحب نے فقط اپنی محبت میں طفیل صاحب کو بھیج دیا۔ اب جو طفیل صاحب نے بتایا کہ مضمون بحیثیت مضمون انھیں پسند نہیں تو میں کہ اُن دنوں فتح محمد کیانی ہوا کرتا تھا فوراً تاؤ میں آ گیا۔ میں نے طفیل صاحب کو بتایا کہ "نقوش" میں چھپنا میرے لیے ایک اعزاز ہے اور مفتی صاحب

مجھے بتائے بغیر مضمون بھیج کر مجھ پر احسان کیا ہے مگر مضمون کے 'خطبات' والے حصے سے ایک لفظ بھی کاٹنا مقصود ہو تو مضمون نہ چھاپیں۔ جواب میں طفیل صاحب نے لکھا کہ انھیں میری تحریر کا یہی حصہ تو پسند ہے اور اسی حصے کی بدولت تو وہ یہ مضمون چھاپ ے ہیں۔ یہ جان کر پھر سے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ایک مدت کے بعد کھلا کہ اس سوال و جواب نے ہمیں محبت کے اٹوٹ رشتے باندھ دیا تھا۔

طفیل صاحب کی محبت کا انداز ماؤں جیسا تھا —— عمیق اور فیاض! جذبات کی نمائش تو درکنار وہ زبان سے اظہار ہی نہیں تے تھے۔ مجھے اس خاموش محبت کا اندازہ اُس وقت ہوا جب میرا تبادلہ 'لاہور' ہوا اور انھوں نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ ہم نے گھر کے رد کو سراپا مسرت پایا۔ گھر آئے تو ذکیہ اُن تمام تحائف کو لے کر بیٹھ گئیں جن سے اُسے اور بچوں کو لاد دیا گیا تھا اور مجھ سے بار پوچھنے لگیں کہ جب میں بار بار انکار کر رہی تھی تو تم خاموش کیوں تھے اور پھر یہ کیوں کہنے لگے تھے کہ لے لو، لے لو، کوئی بات نہیں ن بات کیوں نہیں؟ یہ کونسا موقع تھا اتنے تحائف وصول کرنے کا، میں کل ہی جاؤں گی اور بھابی کی منت سماجت کر کے کچھ چیزیں دوں گی، کچھ رکھ لوں گی۔ ذرا سوچو تو، وقت آنے پر ہم کہاں سے دیں گے؟ میں نے خاموشی توڑی: کچھ واپس نہیں کرنا، اتنی محبت سے دی ہوئی چیزیں واپس نہیں ہو سکتیں، تم بھی پریشان نہ ہو، تمہارا مسئلہ بھی حل کر لیا ہے اور وہ یوں کہ اب ہم نہ خود طفیل صاحب کے گھر جائیں گے نہ انھیں اپنے ہاں بلائیں گے، —— اور اپنے قیام لاہور کے دوران میں نے خود کو اور طفیل صاحب کو ن حسنِ سلوک کی یہی سزا دی۔ ایک موقع پر اُن کے ہاں گئے بھی تو جاوید کی شادی کے پُرہجوم موقع پر اور وہ بھی اُن کی سی شان یاضی کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے شیوۂ کنجوسی پر قائم رہتے ہوئے۔

میرا پہلا مجموعۂ مضامین 'تعصبات' شائع ہوا تو کشور ناہید نے کہا کہ کچھ لوگوں کو کتاب پسند ہے اور کچھ کو ناپسند۔ کیوں نہ ث ہو جائے۔ بحث ہوئی اور دو ایک دوستوں نے ازراہِ کرم مجھے میرے 'مقام' سے آشنا کیا۔ محفل ختم ہوئی تو طفیل صاحب نے ے پکڑا، ندیم صاحب کو ساتھ لیا اور ریستوران میں جا بٹھایا۔ میں پہلے ہی اُن کا موڈ دیکھ کر سہم گیا تھا۔ کہنے لگے اور بہت لھ کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ تُو نے کیا کیا؟ ایسی ہوتی ہیں، تقریبیں؟ نہ مجھے بتایا نہ ندیم صاحب سے ذکر کیا۔ بہت ظلم ہوا، بہت انصافی کی باتیں ہوئیں، میری برداشت سے باہر ہیں، اب ہم اس شہر میں 'تعصبات' کی تقریب رونمائی کریں گے —— میں نے بڑے ادب کے ساتھ انھیں بتایا کہ جو کچھ ہوا میری اور کشور ناہید کی مرضی سے ہوا۔ تقریب رونمائی کی بجائے مضامین پر بحث مقصود تی وہ خوب ہوئی، کسی کو میرے ساتھ ذاتی عناد نہیں، ادبی اختلافات ہیں لیکن طفیل صاحب کا غصہ دُور نہ ہوا، کہنے لگے اچھا، جس طرح تم نے ہمیں بے خبر رکھا، ہم تم سے پوچھے بغیر ہی تقریب کریں گے۔ دوسرے روز میں نے ندیم بھائی کی خدمت میں درخواست کی طفیل صاحب سے آپ اگر کہہ دیں گے کہ تقریب کی کوئی ضرورت نہیں تو وہ مان جائیں گے۔ طفیل صاحب کا ردِعمل کچھ ایسا تھا جیسے میری تنقیدی خامیوں کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بلکہ خود اُن کی ذات پر حملہ کیا گیا ہے اور میری شہ پر کیا گیا ہے۔ مجھے بہت رنج ہوا میری وجہ سے وہ اس قدر رنجیدہ ہو گئے ہیں۔ اپنے جرم کے اس احساس نے مجھے مہینوں پریشان بھی رکھا اور حیران بھی۔

نعمان ندیم کی شادی پر ہم لوگ لاہور گئے تو طفیل صاحب نے اصرار کیا کہ ہم اُن کے ہاں کچھ روز قیام کریں۔ جب میں نے بتایا کہ

علی الصبح واپسی ضروری ہے اور ہم ظہیر بابر صاحب کے ہاں اس لیے ٹھہرے ہیں کہ وہ خدیجہ بہن کی وفات کے صدمہ سے نڈھال ہیں تو مان گئے مگر اس شرط کے ساتھ کہ صبح ہم ناشتا اُن کے ساتھ کریں۔ صبح سویرے آ کے لے گئے، اپنی نئی تعمیر شدہ وسیع و عریض اور حسین و جمیل کوٹھی کا ایک ایک حصہ دکھایا، اپنے کمرے میں ذرا سے رُکے اور چاروں طرف سلیقے سے سجی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ بس رسولؐ نمبر کی مصروفیت تمام ہو جائے تو پھر میں کاروبار بچوں پر چھوڑ کر خود بس پڑھوں لکھوں گا۔ ساتھ کے کمرے کو کھول کر دکھایا اور پوچھا کہ کیسا لگا؟ میں نے کہا بہت خوب صورت ہے، کہنے لگے کہ یہ تمھارا کمرہ ہے، اب جب بھی تم لوگ لاہور آؤ، سیدھے اپنے گھر اپنے کمرے میں آ جانا اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں، گاڑی ہے سب کی طرف آ جا سکتے ہیں۔

راولپنڈی آتے تو اختر جمال اور احسن علی خاں کے ہاں قیام کرتے۔ اس کا تو گلہ نہ تھا کہ اختر بہن سے اُن کے بہت دیرینہ خواہرانہ مراسم تھے مگر اس کی شکایت ضرور پیدا ہوئی کہ دو ایک بار اُن کی آمد کی خبر اُن کی لاہور واپسی کی خبر سے ہوئی چنانچہ ایک بار آئے تو فون پہ پوچھا کہ کل یونیورسٹی سے کس وقت فارغ ہو سکو گے؟ میں نے بتایا کہ اگر آپ اختر بہن کے ہاں سے بول رہے ہیں تو میں کل یونیورسٹی نہیں جا رہا۔ علی الصبح صادق حسین صاحب کے ساتھ آئے اور یہ کہہ کر ساتھ لے لیا کہ تمہارے ساتھ ضروری بات کرنی ہے۔ سارا دن دفتروں کے چکر لگتے رہے واپسی پہ میں نے پوچھا کہ وہ ضروری بات ہے کہنے لگے اب تم گھر جاؤ تھوڑی دیر میں میں اور میری بیوی، بہن سے ملنے تمہارے ہاں آ جائیں گے۔ آئے اور وضاحت پیش کی کہ تمہارے ہاں اس لیے نہیں ٹھہرا کہ تمہارے ہاں "آرام آسائش" نہیں ہے، اختر کا گھر اسلام آباد میں ہے، بہت سے کام وہیں سے متعلق ہیں، پھر کار میں آ جا سکتا ہوں۔ جب کام ختم ہوں گے تو پھر آ کے رہا کروں گا۔ میں نے کہا: درست، مگر وہ ضروری کام تو بتائیں۔ کہنے لگے کہ ضروری کام یہی تھا کہ ساتھ ساتھ رہیں سو دن بھر خوب باتیں رہیں۔

باتیں کرنے کا موقع تو ہمیں ہائیڈل برگ میں میسر آیا۔ طفیل صاحب عمر بھر محنت کے نشّے میں سرشار رہے۔ ہر وقت اُن کے ارد گرد کاموں کا میلا سا لگا رہتا تھا۔ ادارۂ فروغِ اُردو، نقوش اور نقوش پریس نے انھیں ہمیشہ عدیم الفرصت ہی رکھا۔ نتیجہ یہ کہ اب تک ہر ملاقات سرسری ہی رہی تھی۔ گرمجوشی کے باوجود وہ ہمیشہ کچھ غیر حاضر سے لگتے تھے۔ پھر میری لاہور آمد و رفت اتنی ہی رہتی تھی جتنا اُن کا پنڈی اسلام آباد آنا جانا، یعنی فقط ایک آدھ روز کے لیے۔ اس بھاگم بھاگ کی ملاقات کے چند لمحات میں بھی میرے ذہن پر واپسی کا سفر سوار رہتا تو اُن کا دماغ زیرِ تکمیل کاموں میں غرق رہتا۔ چنانچہ دلجمعی کے ساتھ بات کرتے کا کبھی موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایسے میں طفیل صاحب کے سفرِ یورپ کی نوید پا کر بہت خوش ہوا مگر طفیل صاحب نے سارا وقت تو دوسرے ممالک میں گزار دیا۔ ہائیڈل برگ آئے بھی تو فقط چند روز کے لیے۔ جاوید صاحب ڈسل ڈورف اور دیگر دور دراز شہروں میں کاروباری سیریں کرتے رہے اور طفیل صاحب میرے ہاں یوں قیام فرما رہے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جرمنی آ کر مجھ سے ملنے نہیں آئے بلکہ مجھے ملنے کے لئے جرمنی آئے ہیں۔

ہم نے وادی و کہسار اور شہر و بازار کی خوب سیر کی۔ بے فکری کے اس عالم میں بھی طفیل صاحب کے ذہن کو دو فکریں

بار بار چھو کر گزرا کرتیں۔ اوّل یہ کہ جاوید ابھی تک واپس کیوں نہیں پہنچا یا پھر اس کا فون کیوں نہیں آیا؟ اور دوم یہ کہ میں کہیں دو ٹکے خرچ نہ کر بیٹھیں۔ پہلے روز میں انھیں بہانے بہانے ایک پاکستانی ریستوران میں لے گیا۔ انہوں نے ہفتوں سے پاکستانی کھانا نہ کھایا تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے دال چاول کے علاوہ کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ جب ہم صوفیوں کی طرح صرف کھانا چکھ کے باہر نکلے تو طفیل صاحب کو اس کا بڑا قلق رہا کہ میں نے انھیں بل کیوں ادا نہیں کرنے دیا۔ میں نے احتجاج کیا کہ دال چاول کھانے کے بعد بھی وہ میری "فضول خرچی" پر اتنے ملول کیوں ہیں تو بڑی بے ساختگی کے ساتھ کہنے لگے کہ بھائی، اتنے سو روپے کے تو ہم نے دال چاول کھائے ہیں!۔ دوسری صبح جب انھیں پتا چلا کہ اسی ریستوران میں میرے ایک دوست اور محسن رشید صاحب کام کرتے ہیں اور وہ گھر آ کر میرے لیے کھانا تیار کر جاتے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: گاڑی ضرور لانا، مرسڈیز لانا۔ میں نے کہا کہ چلائے گا کون؟ مجھے تو پیدل چلنا بھی نہیں آتا۔ کہنے لگے: بیٹے چلائیں گے، گھر میں پیسے تو بھجواتے ہو گے؟ مجھے بتا دو کتنے بھجواتے ہو، میں ہر ماہ بہن کو بھجوا دیا کروں گا، مرسڈیز کے علاوہ اور کوئی گاڑی مت لانا۔

طفیل صاحب کو ہائیڈل برگ میں سب سے زیادہ شوق اُن مقامات کے دیکھنے کا تھا جن پر علامہ اقبال کی یاد متحجر ہو کر رہ گئی ہے اور جو پاکستان سے آنے والے اہلِ عزم و ہمت کی محبوب زیارت گاہیں بن چلے ہیں۔ ہم اُس مکان کے سامنے دیر تک کھڑے رہے جہاں آج سے اسّی برس پہلے اقبالؔ نے قیام فرمایا تھا۔ متعدد تصویریں بنانے کے بعد طفیل صاحب نے تجویز کیا کہ آؤ اس خوب صورت اور پُرسکون فضا میں ذرا سا ٹہلیں اور ہم فٹ پاتھ سے ساحلِ دریا پر اُتر آئے۔ دریائے نیکر کے کنارے دُور تک پھیلی ہوئی سرسبز و شاداب روشوں پر ٹہلتے ہوئے طفیل صاحب نے کہا کہ اقبال یہاں اکثر گھومتے ہوں گے اور پھر فرطِ عقیدت سے خاموش ہو گئے۔ جب ہم اقبالؔ کے مکان سے لے کر قدیم پل تک پہنچ گئے تو پل پر سے پرانے شہر اور شہر کے اوپر جگمگاتے ہوئے شاہی کھنڈر (جسے یہ لوگ آج بھی محل اور قلعہ کہتے ہیں) اور اس سے اوپر آسمان سے ہمکلام کوہسار کو دیکھتے ہوئے طفیل صاحب نے اپنی خاموشی توڑی: ندیم صاحب کو یہاں ضرور بلائیں۔ اس تمنا کا اظہار وہ ہر روز کم از کم ایک بار ضرور کیا کرتے تھے۔ "ساحلِ اقبال" کے بارونق مگر پُرسکوت پارک میں بیٹھے بیٹھے یکبارگی یہ جملہ اُن کی زبان پر آ گیا تھا: ندیم صاحب کو یہاں چند ماہ ضرور قیام کرنا چاہیے۔ فلسفیوں کی پگڈنڈی پر تھک ہار کر بیٹھے تو بھی طفیل صاحب نے فرازِ کوہ سے وادی کے نشیب میں بہتے ہوئے دریا تک زینہ بہ زینہ اُترتے ہوئے شہر کے خواب ناک سحر میں آ کر مجھ سے یہی تقاضا کیا تھا: ندیم صاحب کو یہاں ضرور بلائیں میں نے طفیل صاحب سے احمد ندیم قاسمی کی محبت میں یہی ایک جملہ سنا ہے، یہاں آ کر انہوں نے ندیم صاحب کے علاوہ اور کسی دوست کو یوں یاد نہیں کیا۔ وہ جن لوگوں سے محبت کرتے تھے اُن کے بارے میں لمبی چوڑی حکایات نہیں سناتے تھے اور نہ ہی باہمی تعلقات کے طول طویل تذکرے کرتے تھے۔ بس یکبارگی اُن کا نام لے اٹھتے تھے۔ جب طارق احسن ایک اندھیر گردی میں پکڑے گئے۔ اور کوئی بھی کسی کام نہ آ سکا تو اختر جمال اور احسن علی خان بخیال صبر و شکر کے ساتھ اِس عذابِ الیم کو سہنے میں مصروف ہو گئے۔ اُس زمانے میں طفیل صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی طفیل صاحب نے چاند سے زیادہ بے داغ جوانی اور فرشتوں سے زیادہ معصوم دل کے مالک طارق کو اسی ادا سے یاد کیا۔ اُن کے

ایک آدھ بے اختیار فقرے سے مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ طفیل صاحب کا دل اُسی کال کوٹھڑی میں دھڑک رہا ہے جہاں طارق بند ہے۔

واپس لاہور پہنچتے ہی لکھا کہ:

"ہائیڈل برگ میں آپ کا ساتھ خوشیوں کی آماجگاہ تھا۔ وہ دن یاد آتے ہیں" ——— خط کا اختصار اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ "نقوش" کی تزئین و تعمیر کے ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہو چکے ہیں جو انھیں ہائیڈل برگ کی فرصت میں بھی ذہنی طور پر مصروف رکھتے تھے۔ یہاں سے لندن روانگی سے قبل میں نے بار بار تاکید کی کہ لندن میں مکمل طبی معائنہ ضرور کرائیں اور اس کے نتائج سے مجھے آگاہ کرتے جائیں مگر طویل انتظار کے بعد ایک مختصر خط ملا بھی تو صحت کے بارے میں مکمل سکوت سے پریشانی ہوئی۔ میں نے فوراً لکھا کہ "مفصل خط پھر لکھوں گا۔" کے وعدے کو بے شک وعدۂ فردا ہی رہنے دیں مگر اپنی صحت سے متعلق چند سطریں آج ہی لکھ دیں۔ اس خط کا جواب ٹھیک ایک سال بعد پایا:

جدہ
سعودی عرب

۸۵-۹-۱۰ برادرم ملک صاحب

سلام مسنون!

میری نالائقی میں شبہ پہلے بھی نہ تھا۔ مگر اس کا ثبوت مہیا نہ ہوتا تھا۔ اب کے میں نے بجائے آپ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے مسلسل خاموشی اختیار کئے رکھی۔ بے مروتی کی حد کر دی! قصور اتنا بڑا ہے کہ درگزر کی درخواست بھی نہیں کر سکتا۔ قصہ یہ ہے کہ میں رسولؐ نمبر کے لیا یا کام میں اتنا منہمک رہا کہ ہوش نہ رہا۔ موضوع مشکل تھا۔ گرہ میں کچھ نہ تھا۔ اس لئے مسلسل پریشان رہا۔ مگر قدرت نے لاج رکھ لی۔ ۱۳ جلدیں چھپ چکی ہیں۔

ایک عام شمارہ چھاپا تھا۔ بھجوایا تھا۔ ملا ہوگا یا جلد مل جائے گا۔ اس میں آپ کا ایک قیمتی مضمون بھی ہے۔ جو کہ آپ نے مجھے جرمنی میں عنایت فرمایا تھا۔

اس سال ہم دونوں میاں بیوی نے حج کی سعادت حاصل کی۔ ایک رسم ادا ہوئی۔ گنہگار ہیں۔ برکات سے بہرہ ور کیا ہوں گے۔ خدائے قدوس کی رحمتوں کی آس ضرور ہے!

ان شاء اللہ ۱۲ ستمبر کو پاکستان کے لئے روانہ ہوں گے۔ ہم نے آپ کو مکہ اور مدینہ میں بھی دعاؤں میں یاد رکھا۔

والسلام
آپ کا محمد طفیل
(نقوش)

سچ کہوں سال بھر کی خاموشی سے مجھے یہ گمان گزرا تھا کہ طفیل صاحب بس اب ہمیں بھول بھال بیٹھے ہیں۔ اس خط سے یہ جان کر کہ انہوں نے تو ہمیں مکہ مدینہ میں بھی یاد رکھا۔ اپنی بدگمانی پر بڑی ندامت ہوئی۔ نقوش میں اُن کا ہوشربا انہماک کوئی نئی خبر نہیں تھی

میرے "احسانات" کا تذکرہ واقعتاً ایک نئی خبر تھی۔ میں نے بہت سوچا مگر مجھے "احسان" سے بہت دور کی مشابہت رکھنے والا کوئی عمل بھی یاد نہ آیا۔ شرمسار ہوا کہ اور تو اور میں تو اُن کے محبوب نقوش کے ساتھ قلمی تعاون کا حق بھی ادا نہ کر پایا تھا۔

نقوش میں میرے صرف تین مضامین شائع ہوئے تھے۔ ایک مضمون ممتاز مفتی صاحب نے بھجوا دیا تھا اور باقی کے دو مضامین کی طفیل صاحب نے دو مختلف مواقع پر فرمائش کی تھی۔ اور میں نے فخر و مسرت کے ساتھ پیش کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ تو میں اِس لافانی ادبی جریدہ کی تحسین میں طفیل صاحب کو کوئی خط تک نہ لکھ پایا تھا۔ میں اپنے اس طرزِ عمل پر دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا کہ اچانک جاوید صاحب کا فون آیا کہ میں جرمنی میں ہوں اور کل کسی وقت ہائیڈل برگ پہنچ جاؤں گا ——— میں نے اُن کی آمد کو یقینی بنانے کے لیے کہا کہ ہم اُس وقت تک دوپہر کا کھانا نہیں کھائیں گے جب تک آپ نہیں پہنچیں گے۔ کھانے کی میز پر جب جاوید صاحب نے ایک سے زیادہ مرتبہ گھڑی دیکھی تو ہم نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے پینتیس منٹ بعد مجھے واپس ڈسل ڈورف روانہ ہو جانا چاہئے۔ میں بہت حیران ہوا اور ذکیہ یہ سمجھی کہ بچہ ہے شرما رہا ہے۔ سو اُس نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ نہیں چند روز آپ یہاں ضرور رہیں گے۔ جب بات بنتی نظر نہ آئی تو اُس نے رعایت کی کہ اچھا چند گھنٹے سہی۔ ذرا بازار جائیں گے پھر آپ کو سٹیشن چھوڑ دیں گے۔ اس پر جاوید نے بتایا کہ انھیں ڈسل ڈورف سے لندن کا جہاز پکڑنا ہے اور یہ گاڑی چھوٹ گئی تو بہت نقصان ہوگا۔ میں نے انتہا درجے کی نرمی کے ساتھ بڑی بے مروتی کی بات کی، تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ جاوید صاحب نے جواب میں اپنی مخصوص ہنسی پر اکتفا کیا تو میں نے مزید وضاحت کی کہ صبح سویرے آپ وہاں سے چلے ہیں، یہاں پہنچے تو سیدھے کھانے کی میز پر، ابھی کھانا ختم نہیں ہوا اور روانگی کا وقت آگیا ہے۔ فون پر بات ہو گئی تھی، ایک مرتبہ اور ہو جاتی۔ آئندہ ایسا تکلف ہرگز نہ کریں۔ جاوید صاحب نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہم چپ ہو گئے تو جاوید صاحب نے بتایا کہ چلتے وقت اباجی نے ہدایت کی تھی کہ ملک صاحب کو ملے بغیر واپس نہ آنا۔ میں نے کہا درست، جرمنی میں اور کوئی ضروری کام؟ اباجی نے کہا کہ میرا یہی ضروری کام ہے، اشد ضروری!

مجھے اپنے ساتھ طفیل صاحب کے غیر معمولی طور پر شفیقانہ برتاؤ کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے اور ہمیشہ ہی میں نے اِسے طفیل صاحب کی فیاضی سے تعبیر کیا ہے۔ اب جو اُن کی بے پناہ محبت کا انکشاف ہوا تو میں نے اپنے جی میں عہد کر لیا کہ اس باب میں اپنی گزشتہ غفلت کی ممکن حد تک تلافی کروں گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

اِس کمرے میں دریچے کے سامنے جو کرسی رکھی ہے وہ طفیل صاحب کی پسندیدہ نشست گاہ تھی۔ یہاں بیٹھ کر وہ ہائیڈل برگ کے، سورج کے سفر کے ساتھ ساتھ ہر آن رنگ بدلتے، مناظر سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ایک روز میں اس کرسی پر بیٹھا تھا کہ وہ آئے اور بیٹھنے کی بجائے کمرے میں چکر لگانے لگے۔ میں اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ گیا تو وہ بھی آ کر اِس کرسی میں جم گئے۔ تب مجھ پر کھلا کہ وہ اٹھ کر جاتے وقت کتاب یا عینک میز کی بجائے کرسی میں کیوں رکھ جاتے ہیں؟ —— طفیل صاحب کے انتقال کے بعد میں جب اِس کرسی کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہوں اور کتاب یا عینک رکھنا بھول گئے ہوں۔ سو، میں اِس کرسی پر نہیں بیٹھتا فقط اِسے دیکھا کرتا ہوں اور دیکھتے ہوئے اکثر مجھے لاہور کی ایک دوپہر یاد آتی ہے۔

فون آیا کہ ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آرہا ہوں۔ میں نے کہا اگر کام ہے تو آپ اپنے دفتر ہی میں رہیں، میں خود حاضر ہوتا ہوں۔ کہنے لگے اس وقت میں "گردش" میں ہوں اور تمہارے دفتر کے قریب ہی سے بول رہا ہوں، تم وہیں رہو میں پہنچتا ہوں۔ پتا چلا کہ طفیل صاحب کے ایک کاروباری حریف نے اُن کے خلاف چال چلی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کے ساتھ اسلام آباد جاؤں۔ میں خاموش۔ بالآخر کہنے لگے: میرا دل کہتا ہے کہ تم اس شخص سے کہہ دو تو وہ ایک منٹ میں مسئلہ حل کر دے گا، میں رات کے جہاز سے واپس آ جاؤں گا تم بے شک اطمینان سے لوٹنا۔ میرا تامل دیکھ کر مزید کہا، ضابطہ کے رُو سے کام غلط ہے مگر اخلاقی طور پر بالکل جائز ہے، تمہارا دل نہیں مانتا تو بھاڑ میں جائے کام۔ نہیں جاتے۔ اس پر میں نے بتایا کہ ہم جائیں گے ضرور مگر آپ یہ بتائیں کہ میرے لیے یہ ٹکٹ آپ نے کیوں خریدا؟ بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ دو گھنٹے بعد تو جہاز روانہ ہو رہا ہے تمہارے پاس وقت کہاں ہے ٹکٹ خریدنے کا؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِس کرسی سے آخری مرتبہ اٹھتے وقت طفیل صاحب کی جیب میں اپنے سفرِ آخرت کا ٹکٹ موجود تھا اور وہ ہم سے چھپاتے پھرتے تھے تاکہ "رسولؐ نمبر" کا بقیہ کام جلدی جلدی مکمل کر لیں۔ اِسی وجہ سے وہ اپنی صحت کے بارے میں ہر سوال کا جواب بڑے اہتمام سے بھول جایا کرتے تھے۔ سوچتا ہوں کہ طفیل صاحب کا یہ طرزِ عمل ضابطہ کے اعتبار سے چاہے درست ہی کیوں نہ ہو جذباتی طور پر ناجائز ہے۔ طفیل صاحب! سخت ناجائز!

دھیما آدمی

صدیق سالک

اللہ تعالیٰ نے میری کم علمی کا یہ علاج کیا کہ مجھے کمسنی میں ہی بڑی عمر اور بڑی عقل والے دوست عطا فرمائے سب سے پہلے سیّد ضمیر جعفری الاٹ ہوئے جن کے طفیل کرنل محمد خان، بریگیڈیئر گلزار احمد اور میجر جنرل شفیق الرحمٰن نصیب ہوئے۔ ادبی دنیا میں ذرا آگے بڑھا تو حکیم یوسف حسن، صہبا لکھنوی، محمد طفیل، احسان دانش اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے کہنہ مشق اور سال خوردہ ادیب اور مدیر ودیعت ہوئے۔ ان سب کی عمریں مجھ سے دُگنی نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور ہوں گی۔ میں ہر لحاظ سے ان کے سامنے طفلِ مکتب تھا اگر پھر بھی وہ مجھے اپنے برابر بٹھا لیتے تھے تو یہ ان کی تونگری اور فیاضی تھی۔

کوئی بیس برس قبل میں سیّد ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کی معیّت میں طفیل صاحب سے اُن کے دفتر میں پہلی مرتبہ ملا۔ مجھے اُنہوں نے قطعاً متاثر نہ کیا۔ ان کی شخصیت میں کوئی ایسی چنگاری نہ تھی جو مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی نہ تو وہ قہقہہ لگا کر مجھ سے بغلگیر ہوئے نہ مصافحے میں تین چار بار میرا ہاتھ جھنجھوڑا، نہ میری ادبی کاوشوں کی تعریف کی۔ بھلا ایسے شخص سے کیا ملنا جو آنے والے کو اہمیت نہ دے، خاص کر ایک اجنبی نوجوان کو فوراً اپنا اسیرِ محبت بنانے کے لئے دنیاوی ٹوٹکے نہ آزمائے۔ وہ اپنی دھیمی سی شخصیت کو مٹی کے کھلونے کی طرح سنبھالے بیٹھے رہے اور سیّد ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کی باتوں کا دھیمے لہجے میں جواب دیتے رہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُنہوں نے ہماری کوئی خاص تواضع بھی نہ کی نہ تو چیخ کر چھوٹے کو پکارا کہ "اٹھو، بھاگو، ٹھنڈا لاؤ، گرم لاؤ، یہ لاؤ وہ لاؤ، بڑے ادیب، بڑے افسر آئے ہیں۔ ذرا خاص چائے، دودھ ملائی والی، برتن صاف، ذرا دھیان سے اور ہاں جلدی" — ایسا کوئی جملہ اُن کی زبان سے نہ نکلا۔ ایک پھیکی سی مٹیالی سی، ٹھنڈی سی چائے کی پیالی ملی جو میں نے مروتاً اپنے اندر انڈیل لی۔

میں نے سوچا عجیب گوتم بدھ سا شخص ہے، اسے رسمِ زمانہ کا خیال ہے نہ اپنے گرد و پیش کا۔ ان کا دفتر بھی اُن کی طرح دھیما اور غیر چمکیلا تھا نیم تاریک سا کمرہ چھت سے لٹکتا ہوا مدھم سا بلب، میز پر پڑا ہوا پرانا ٹیبل لیمپ، ایک کمٹارا سا کالا ٹیلیفون جو ان کی طرح کم ہی بولتا تھا۔ میز پر مسودے اور ارد گرد "نقوش" کے پرانے پرچے کچھ تیلے خالی کاغذوں میں لپٹے ہوئے، اور کچھ گرد کی موٹی تہہ میں چھپے ہوئے۔ طفیل صاحب کی طرح اُن کے دفتر نے بھی مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔

ہلکی سی چائے کی ایک پیالی اور مُردنی سی گفتگو کے چند گھونٹ پی کر اُٹھنے لگے، تو اُنہوں نے نقوش کا تازہ "مکاتیب نمبر" جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل تھا ہمیں تحفتہً دیا۔ میرے ساتھی تو خیر علم و ادب کی اس بلندی پر تھے کہ اعزازی پرچہ پیش کرنا کسی بھی مدیر کے لئے اعزاز تھا لیکن میں تو بالکل مبتدی تھا، طفیل صاحب نے غالباً میرا نام بھی پوری طرح نہیں سنا تھا لیکن مروتاً تینوں جلدیں تھما دیں۔ پھر پتا نہیں گوتم بدھ کی طرح انہیں کیسے پتا چل گیا کہ میرے دل میں "نقوش" کے دیگر نمبر پڑھنے

کی حسرت ہے لیکن انہیں خریدنے کی ہمت نہیں۔ انہوں نے گرد آلود انبار میں سے چند یادگار نمبر اور نکالے اور مجھے عنایت فرمائے مجھے محسوس ہوا میں ایک ادبی آستانے پر خالی ہاتھ آیا تھا اپنا دامن بھر کر جا رہا ہوں۔ مجھے ان کی خاموش میزبانی نے پہلی مرتبہ تھوڑا سا متاثر کیا

میں نے ان کے مرتب کردہ "نقوش" کے خصوصی نمبر پڑھنے شروع کئے تو قدم بہ قدم گہری گھاٹیوں میں اترتا گیا۔ طفیل صاحب کے حسن انتخاب، مدیرانہ ذوق اور شوق طباعت نے متاثر کیا۔ مجھے بھی شوقیہ ادبی پرچے نکالنے کا کچھ تجربہ ہے، سو صفحے بھرنا مشکل ہو جاتے ہیں، ایک مرتبہ احباب کچھ عنایت کر دیں تو کام چل جاتا ہے لیکن اگلے شمارے کے لالے پڑ جاتے ہیں اور چند ماہ بعد انتخاب پرچہ بند کرنے یا غیر معیاری چیزیں شائع کرنے کے درمیان رہ جاتا ہے اس دھیمے سے شخص نے کتنی محنت سے اتنے ادب پارے اکھٹے کئے ہوں گے ان کے انتخاب اور ترتیب میں کتنی عرق ریزی کی ہوگی، پھر ان کی اشاعت ــــ اور قابل رشک اشاعت کے لئے کتنے دن اور کتنی راتیں صرف کی ہوں گی اور پھر ایک پرچہ یا ایک نمبر نہیں، پرچے پر پرچہ اور نمبر پر نمبر ایک سے ایک بڑھ کر۔

اب مجھے پتا چلا کہ طفیل صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو دوسروں کو اپنے کام سے متاثر کرتے ہیں سماجی آداب یا مجلسی گرمجوشی سے نہیں، اس کے ساتھ ہی مجھے بہت سے مشہور ادیب، نقاد اور دانشور بھی یاد آنے لگے جن کی شہرت مجلس آرائی، گپ شپ باہمی توافق اور باہمی توصیف پر مبنی ہوتی ہے چھپا ہوا لفظ ان کی شہادت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

پھر میں نے ان کے لکھے ہوئے خاکے پڑھے تو ان کی شخصیت کا ایک اور رخ سامنے آیا۔ یہاں بھی ان کے اسلوب میں کوئی گھن گرج دکھائی نہ دی، میٹھا بہتا ہوا شائل، تسنیم و کوثر کی طرح جو پڑھنے والے کو مٹھاس بھی دیتا ہے اور سیراب بھی کرتا ہے، لیکن ان خاکوں میں انہوں نے نہ اپنے کو اتنا اٹھایا کہ تعلی کی تہمت لگ سکے اور نہ اپنے موضوع یا ممدوح کو اتنا گرایا کہ اس کی خاک اڑنے لگے، ـــ وہی بین بین، مدہم مدہم لہجہ گھن گرج اور گڑگڑاہٹ سے پاک، میٹھی پھوار کی مانند، الفاظ پانی کے قطروں کی طرح، جملے بارش کی دھار جیسے! کتنے لکھنے والے ہیں جنہیں دل میں اتر جانے والا یہ اسلوب نصیب ہے۔

طفیل صاحب چپ چپیتے بڑے بڑے کاموں میں ہاتھ ڈال لیتے تھے، یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں، مناسب سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے بعد لیکن ان منصوبوں کا قبل از وقت ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے، ایک چیونٹی کی طرح خاموش قدموں کے ساتھ ایک بلند و بالا پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ چڑھتے رہتے تھے۔ صبح و شام، بے تھکان، بے آرام، بے وقت، ہر وقت حتیٰ کہ ان کے سفر کی بلندی کے ساتھ ساتھ ان کا قد بڑھنے لگتا اور پہاڑ کا حجم گھٹنے لگتا اور لوگوں کو اس وقت معلوم ہوتا جب وہ پہاڑ کی چوٹی سر کر بیٹھتے۔ اس وقت اہل نظر کو یہ سست رفتار چیونٹی شاہین سے کم نہ لگتی جو اونچے سے اونچے پہاڑ کو اپنے پروں کے نیچے لے آتا۔

طفیل صاحب کے مخالفین کہتے تھے کہ وہ سکالر نہیں ہیں، یقیناً کالج کی سندوں اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے لحاظ سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے، وہ روائتی قسم کے دانشور بھی نہ تھے جو چہرے پر خشخشی ڈاڑھی سجا کر اور منہ میں پائپ لگا کر دانشورانہ گفتگو کرتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں تخلیقی، تحقیقی اور تالیفی نوعیت کا اتنا کام کر دکھایا کہ بڑے بڑے دانشور بھی

نہ کرسکے۔ اگر سندوں کے لحاظ سے ہی دیکھا جائے تو حفیظ جالندھری، احسان دانش، جوش ملیح آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد (ادبی دُنیا) کے پاس کتنی سندیں اور ڈگریاں تھیں لیکن علم وادب کے میدان میں ان کا کہا اور لکھا سند مانا جاتا تھا اور مانا جاتا ہے

طفیل صاحب کے زیادہ تر مخالفین ان کی ادبی سیاست کے پیدا کردہ تھے، وہ جس طرح رائٹرز گلڈ کی ٹریڈ یونین میں آئے، ایک طویل داستان ہے لیکن جب اُنہوں نے اس کے سیکرٹری جنرل کے عہدے کا انتخاب لڑا تو کئی ادیب اُن کے خلاف ہوگئے پھر جب دوسرے ادیب اس عہدے کے اُمیدوار ٹھہرے اور حمایت کے لئے ان کے پاس آئے تو مدد نہ پانے والے ان کے خلاف باتیں کرنے لگے میں سیاست، انتخابات اور جمہوریت کا قائل ہوں لیکن اسے ادبی، علمی اور تحقیقی شعبے سے دور دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ جب تحقیقی اور علمی کام کرنے والے اس کام میں پڑ جائیں تو نہ صرف پوری یکسوئی سے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے بلکہ بعض لوگ انہیں خواہ مخواہ انہیں کانٹوں میں گھسیٹنے لگتے ہیں، بدقسمتی سے ہم اتنے بالغ نظر نہیں ہیں کہ سیاسی رقابتوں اور مخالفتوں کے باوجود کسی کے کام یا کردار کا کھلے عام اعتراف کرسکیں۔

مجموعی طور پر طفیل صاحب کی شخصیت کا جو تاثر میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ ایک محنتی اور خاموش کوہکن کا ہے جو نہ شیریں شیریں پکارتا ہے اور نہ تیشے کی صدا بلند ہونے دیتا ہے لیکن دودھ کی نہریں بہا کر دکھا دیتا ہے۔ دودھ کی یہ نہر 'نقوش' کی شکل میں آج بھی جاری ہے اور اللہ کرے جاری رہے!

میرا بھائی — میرا دوست

ارشد میر

کیا دولت نایاب لٹی موت کے ہاتھوں
یہ قافلہ سالار تو غیرت کا بھرم تھا!

محمد طفیل سے میرا کوئی بچپن کا یارانہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان سے کوئی قرابت داری یا آشنائی تھی۔ بس لے دے کے میں ایک عرصہ سے نقوش کے حوالہ سے ان کا غائبانہ مداح اور وہ کہ میرے نام سے بھی ناواقف اور یوں مدتوں تعلقات کی یک طرفہ ٹریفک چلتی رہی۔ حتیٰ کہ آج سے تقریباً بیس پچیس برس قبل جب پاکستان رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہوئے۔ تو مجھے ان کا ایک دستی رقعہ ملا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اور میرے پینل کو اپنے احباب کے ووٹ دلائیں۔ اور ہو سکے تو کسی وقت لاہور آنے پر مجھے ملیں کہ آپ سے مل بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ رقعہ پڑھا۔ جو بظاہر چند سطروں پر مشتمل تھا لیکن ہر لفظ اجنبیت سے کوسوں دور، محبتوں کے دیپ فروزاں کئے ہوئے تھا۔ میں ان سے ملاقات کا موقع تلاش کرتا رہا۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جب نقوش پریس پہنچا۔ تو دیکھا ایک شخص کرسی پر سر جھکائے سامنے میز پر کاغذوں کے بے ترتیب پلندوں کے درمیان دنیا و مافیہا سے بے خبر لکھنے میں ہمہ تن محو ہے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام محبت کا نذرانہ پیش کیا۔ جس پر سر اٹھایا۔ تو میں نے اپنے سامنے عجب بھولی بھالی اور مسحور کُن شخصیت کو پایا۔ تعارف کرایا اور پھر کرسی پر بیٹھنے لگا تو کہنے لگے۔ اس طرح سے نہیں خود کرسی چھوڑ کر اٹھے۔ بغل گیر ہوئے۔ پھر بازار سے گاجر کا حلوہ منگوایا۔ جس پر میں نے کہا آپ کو میری اس کمزوری کا کیسے علم ہے۔ کہنے لگے۔ اسے قدر مشترک ہی سمجھئے۔ نصف گھنٹہ کی اس نشست کے بعد جب میں ان سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آیا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس شخص سے تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔

فطرتاً کم گو تھے۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے ہر فقرہ بولنے سے پہلے تولتے ہیں۔ میں نے گوجرانوالہ آنے کی دعوت دی۔ تو کہا بھائی تقریبات سے دل گھبراتا ہے۔ اب تو انسانوں کے کئی روپ دیکھ کر ان سے ملنے سے بھی کتراتا ہوں۔ تنہائی کا خوگر ہوں یا پھر کتابوں سے جی بہلاتا ہوں۔

اس دن سے لے کر آخری ملاقات تک جو ان کی وفات حسرت آیات سے ایک روز قبل ہوئی۔ جب بھی لاہور جاتا۔ حتی المقدور ان کے ہاں جوگی والا پھیرا ضرور لگتا۔ اور ہر بار یہی محسوس ہوا۔ کہ یہ شخص جہاں دھن کا پکا ہے قول کا بھی سچا ہے۔ ان سے جب قدرے بے تکلفی ہو گئی (ان سے بے تکلف ہونا بھی کوئی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا) تو میں نے ایک مرتبہ کہا۔ کہ ایک طرف جب رسالہ نقوش کی ترتیب و تدوین کے بانکپن کو دیکھتا ہوں آپ کے لباس اور گفتگو کا تصور کرتا ہوں اور دوسری جانب آپ کے کمرے کی حالت زار پر نظر دوڑاتا ہوں۔ تو مجھے آپ فرقہ ملامتیہ سے متعلق دکھائی دیتے ہیں جس پر انہوں نے اپنی مخصوص لطیف مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میں نے علامہ اقبال کا یہ شعر برملا پڑھ دیا کہ :

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

تو کھلکھلا اُٹھے۔

طفیل صاحب تمام عمر ادب کے ادنیٰ اور سچے طالب علم رہے۔ انہوں نے کبھی اپنے تبحرِ علمی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ کبھی جعلی عکس ڈال کر دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انجمنِ ستائش باہمی کے تو وہ سرے سے قائل ہی نہیں تھے۔ البتہ انھیں ادیبوں اور شاعروں سے والہانہ لگاؤ اور بے پایاں اُنس تھا۔ اور پھر اُن دانش وروں کو جن میں خداداد صلاحیتیں ہوتی تھیں۔ انھیں بڑی فراخ دلی سے ادبی سطح پر متعارف کرانے میں کوشاں رہتے تھے یہی نہیں بلکہ میرے ذاتی علم میں ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ نادار اور مستحق ادیبوں کی ذاتی گرہ سے مالی معاونت کی۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں انھیں احساسِ کمتری نہ ہو ہمیشہ یہی کہا کہ گلڈ اپنے محدود وسائل سے آپ کی علمی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر یہ حقیر نذرانہ پیش کر رہا ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ سے ان کی ذہنی و قلبی وابستگی کے پس منظر میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ گلڈ کی موجودہ عمارت کو گرا کر جدید طرز پر گلڈ پلازہ بنایا جائے۔ جس سے نہ صرف ادیب برادری مالی نقطۂ نظر سے خود کفیل ہو جائے گی بلکہ گلڈ بھی بین الاقوامی سطح پر متعارف ہو جائے گا۔ اور علمی و فکری سطح پر بھی کئی ایسے کارنامے سر انجام دیئے جا سکیں گے جو عام حالات میں سرکاری گرانٹ پر چلنے والے ادارے نہیں کر سکتے۔

انہوں نے علامہ اقبال ٹاؤن میں ادیبوں کو پلاٹ اور ریواز گارڈن میں فلیٹ دلانے میں بھرپور کوشش کی۔ بلکہ اب جو لائبریری کی وسیع بلڈنگ زیرِ تعمیر ہے۔ اس میں بھی ان کی ذاتی جدوجہد کا خاصہ حصہ ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اپنے لیے نہ میں نے کوئی پلاٹ اور نہ میں کوئی فلیٹ لیا ہے۔ اگر میرے دوست مجھے زیادہ مجبور کریں گے تو میں پھر یہی عرض کروں گا کہ مرنے کے بعد مجھے دو گز زمین دے دیں جہاں میری قبر بنائی جا سکے۔ جب وہ یہ الفاظ بڑی دردمندی اور سوز میں ادا کر رہے تھے۔ تو میں نے دیکھا اکثر احباب کی آنکھیں اشکوں سے بھر آئی تھیں۔

طفیل صاحب مختصر عرصہ تک پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری رہے اس دوران انہوں نے نہ صرف اس کی گرانٹ بڑھائی۔ علاقائی اور قومی زبان کی کتب پر انعامات میں معتدبہ اضافہ کرایا۔ بلکہ گلڈ کی بچی کھچی جائیداد کی حفاظت کو بھی مقصدِ حیات بنا لیا۔ احباب کی دلی خواہش تھی کہ وہ دوبارہ گلڈ کے جنرل سیکرٹری بن جائیں لیکن وہ نہ مانے ورنہ آج گلڈ اس انداز میں مالی اور انتظامی بحران کا شکار نہ ہوتا۔

لائبریری کا جو تاریخی کام انہوں نے شروع کیا تھا۔ اس کی تعمیر جاری ہے ان شاء اللہ اس کی تکمیل اس سال کے آخر تک ہو جائے گی۔ جس کا جملہ کریڈٹ ظاہر ہے انھیں ہی پہنچے گا۔

نقوش سے ان کی جو جذباتی وابستگی تھی۔ وہ کسی سے مخفی نہیں بلکہ میں تو اسے طفیل کا پہلوٹھی کا فرزندِ دلبند کہوں گا۔ نقوش کے بارے میں انھیں اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ بلکہ سفر و حضر میں بھی فکر دامنگیر رہتی تھی ہر نیا پرچہ نئی آب و تاب سے منظرِ شہود

پڑتا۔ لیکن جس زمانے میں وہ گلڈ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ تو نقوش کی اشاعت میں وہ تسلسل نہ رہ سکا۔ بلکہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں گلڈ کو ایک فعال اور باوقار ادارہ بنانے میں صرف کر دیں کہ ادیبوں کے اس واحد جمہوری ادارے کا وجود قائم رہ سکے۔

جناب طفیل ذاتی نام و نمود کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اگر نقوش کے سلسلہ میں کوئی خلوص دل اور نیک نیتی سے زبانی یا تحریری طور پر توصیفی کلمات کا اظہار کرتا تو خاصے مسرور ہوتے۔ نقوش کے ضمن میں دو واقعات خاصے دلچسپ ہیں۔ جو یہاں بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ کوئی شخص ان سے نقوش کی بیس کاپیاں لینے کے لیے آیا اور مقررہ کمیشن جو ایجنٹوں کو دی جاتی ہے کا مطالبہ بھی کیا۔ جس پر طفیل صاحب نے استفسار کیا کہ آپ ہمارے لاہور کے مقررہ ایجنٹ تو نہیں۔ آپ انھیں کہاں فروخت کریں گے

جس پر اس نے مسکراتے ہوئے کہا میں انھیں فٹ پاتھ پر بیچتا ہوں جس پر طفیل صاحب آگ بگولا ہو گئے اور کہا آپ کے ہوش و حواس قائم ہیں۔ نقوش اور فٹ پاتھ میری زندگی میں شاید یہ ممکن نہ ہو۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ جس پر اس شخص نے کہا حضور غصہ تھوک دیجئے اور ٹھنڈے دل سے میری عرض داشت سنیں۔ میں یہ رسالے فی الحال گھر لے جا کر اپنے سٹاک میں رکھ دوں گا جب آپ کا موجودہ شمارہ بازار میں فروخت ہو جائے گا۔ تو پھر انھیں فٹ پاتھ پر لا کر دوگنی اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ قیمت وصول کر دوں گا۔ کہنے لگے۔ جب اصل صورت حال کا علم ہوا۔ تو میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو تیرنے لگے کہ نقوش کی قدر دانی اس انداز سے بھی ہو رہی ہے طفیل صاحب نے بیان کیا کہ :۔

اسی طرح کراچی کے کسی بک سٹال پر پاکستان کے ایک نامور سیاست دان آئے اور انہوں نے رسالہ نقوش مانگا۔ انھیں بتایا گیا کہ دو چار روز کے بعد نقوش مل سکے گا ——— جس پر وہ آپے سے باہر ہو گئے اور کہا میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ نقوش شائع ہو گیا ہے۔ میں بیرون ملک جا رہا ہوں۔ آپ کراچی والے جان بوجھ کر لاہور کے رسائل نہیں منگواتے۔ جس پر کاؤنٹر پر کھڑے صاحب نے کہا لیجئے صاحب اگر ہم پر اعتبار نہیں تو مدیر نقوش سے آپ کو ملا دیتے ہیں۔ میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جس گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ طفیل صاحب کہنے لگے اسکی حرارت ابھی تک محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر وہ کہنے لگے۔ نقوش نے پاکستانی ادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں جو ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

ایک مرتبہ میں نے طفیل صاحب سے استفسار کیا کہ یہ کتابت کرتے کرتے آپ کو ادب چھاپنے، مدیر بننے اور پھر صاحب طرز ادیب بننے کی کیسے اور کیونکر سوجھی۔ فرمانے لگے۔ جس زمانے میں کتابت کیا کرتا تھا۔ بڑے بڑے نامور اور ممتاز اہل قلم کے مسودات میں الفاظ بلکہ بعض اوقات فقرات کو بھی تبدیل کر دیتا تو کسی نے کبھی میری سرزنش نہ کی۔ چند ایک نے تو بڑی فراخ دلی سے اسے سراہا۔ بلکہ اس حد تک کہا کہ یار ہمیں تو تمہارے اندر ایک بہت بڑا ادیب چھپا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھو تو ہمت بجا کر اسے نکال دیں۔ جس سے میرا حوصلہ لاشعوری طور پر بڑھتا گیا۔ پھر نقوش کے مدیر جب سید وقار عظیم مقرر ہوئے تو انھیں ایک بار اچانک کراچی جانا پڑا۔ تو جاتی دفعہ رسالے کے لئے نصف ایڈیٹوریل لکھ کر مجھے دے گئے اور کہا کہ بقایا نصف میں کراچی جا کر بذریعہ ڈاک بھجوا دوں گا۔ میں نے ان کے جانے کے بعد اللہ کا نام لے کر دوسرا حصہ خود لکھا۔

تو اسے خاصہ پسند کیا گیا۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی وقار صاحب کے ایک پرائیویٹ ادبی رسالے کی ایڈیٹری پر معترض تھی۔ انہوں نے اجازت نہ دی اس کے بعد ورنہ . . . . . کہہ کر وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے فقرے کو اس طرح مکمل کیا کہ ورنہ آپ انھیں اجازت دے دیتے۔ جس پر ہنس کر کہنے لگے۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بہر کیف آپ کو بھی بر وقت خوب سوجھتی ہے۔

اب اللہ کی شان دیکھیں کہ طفیل صاحب نے نقوش کا پہلا پرچہ بطور مدیر مرتب کیا۔ تو اس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ رسالہ تین مرتبہ شائع ہوا۔ طفیل صاحب کہتے تھے کہ میری چھٹی حِس کہتی تھی کہ یہ دوبارہ کم از کم ضرور چھپے گا۔ اس لیے میں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس کی پلیٹیں خرید کر رکھ لیں۔ اس زمانے میں نقوش لیتھو پر چھپا کرتا تھا۔

طفیل صاحب ذاتی سطح پر بہت کم ادیبوں اور شاعروں سے متاثر تھے لیکن جن کی تبحرِ علمی اور اندازِ نگارش کے گرویدہ تھے۔ ان میں رشید احمد صدیقی صاحب کا ذکر اکثر و بیشتر کیا کرتے تھے۔ صدیقی صاحب نے ایک دفعہ خوب صورت سا ایڈیٹوریل لکھ کر انھیں بھیجا کہ وہ اپنے نام سے اسے نقوش میں شائع کر دیں جس کے جواب میں طفیل صاحب نے لکھا کہ آپ کا اندازِ تحریر تو سو پردوں سے بھی جھانکتا دکھائی دیتا ہے ایک شمارے کے لیے تو آپ نے لکھ دیا۔ لیکن ایسا شہ پارہ پھر کہاں سے لکھواؤں گا پھر کہنے لگے۔ وہ ایڈیٹوریل کہیں میرے کاغذوں میں محفوظ ہوگا اگر خدا نے کبھی رشید احمد صدیقی نمبر نکالنے کی ہمت دی۔ تو اسے بھی چھاپ دوں گا۔ پہلی بار ہندوستان گئے۔ تو بطورِ خاص صدیقی صاحب کو ملنے کے لیے ان کے درِ دولت پر گئے اس زمانے میں وہ خاصے علیل تھے اور ڈاکٹروں نے ملاقات پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ سلمیٰ صدیقی نے صورت حال سے آگاہ کیا۔ جس پر طفیل صاحب نے کہا کہ میری حاضری لگوا دیں۔ کل دوبارہ آؤں گا۔ جب دوسرے روز گئے۔ تو صدیقی صاحب نے کہا کہ آپ کی آمد اور پھر بغیر ملے چلے جانے کا علم ہوا۔ تو ذہنی کوفت ہوئی۔ جس پر میں نے بیٹی سلمیٰ سے کہا کہ اگر اس شخص سے گفتگو کے دوران جاں بحق بھی ہو جاؤں تو بھی یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ جب طفیل صاحب اجازت لیکر اٹھنے لگے تو صدیقی صاحب نے کہا۔ طفیل صاحب جاتی دفعہ تاج محل ضرور دیکھ کر جائیں۔ جس پر طفیل صاحب نے کہا کہ میں اردو ادب کا تاج محل جو دیکھ رہا ہوں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم والی بات ہے۔ تاج محل دیکھنے پر اصرار کیا۔ تو طفیل صاحب نے کہا کہ میرا تو آگرے کا ویزہ ہی نہیں ہے۔ جس پر انہوں نے کہا کہ اگر اچھے کام کرنے اور خوب صورت چیزیں دیکھنے سے پابند سلاسل بھی ہونا پڑے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تاج محل کے ضمن میں ایک اور واقعہ یاد آ گیا کہ جب میں نے ان کا تعارف استاد محترم سید حسن جعفری ایڈووکیٹ سپریم کورٹ (برادرِ کلاں سید محمد جعفری مرحوم) سے کرایا کہ جو نکتہ آفرینی، حاضر جوابی اور ذہانت و فطانت میں اپنی مثال آپ ہیں تو انہوں نے ملاقات کے بعد کہا کہ میں طفیل صاحب کی خاموش انداز میں اعلیٰ و ارفع ادبی خدمات کا تو ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ لیکن آج انھیں ملنے کے بعد یوں لگا ہے۔ کہ جس طرح تاج محل آگرہ میں عظمت ہے لیکن ہیبت نہیں۔ بلکہ محبوبیت ہے دلکشی و رعنائی ہے۔ وگرنہ اتنی عظیم عمارات میں عظمت ہو تو پھر ہیبت بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح طفیل صاحب میں عظمت ہے عظیم کام کرتے ہیں۔

چہرے پہ معصومیت اور محبوبیت ہے ہیبت نہیں۔

جعفری صاحب اور طفیل صاحب دو چار بار ملے۔ تو میں جب بھی لاہور جاتا تو وہ ہمیشہ استاد محترم کے متعلق پوچھا کرتے۔ اسی دوران انہوں نے اپنا دفتر پچھلی منزل سے اوپر منتقل کیا۔ تو میں نے جعفری صاحب کو بتایا کہ اب طفیل صاحب کے بچوں نے انہیں بڑا خوبصورت دفتر بنا دیا ہے۔ جہاں ہر شے قرینے اور سلیقے سے پڑی ہوئی ہے۔ یہ کمرہ واقعی نقوش کی شایانِ شان دکھائی دیتا ہے۔ جس پر انہوں نے کہا یہ سب کچھ خوب سہی لیکن میں تو اب سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکوں گا دوسرے الفاظ میں۔

دستِ من کوتاہ و خرما بر نخیل

عجیب بات ہے کہ جب طفیل صاحب کا انتقال ہوا۔ تو جعفری صاحب جدہ میں تھے۔ ان کے بچوں کے ہاں ہی طفیل صاحب نے دورانِ حج قیام کیا تھا۔ وہاں سے انہوں نے مجھے خط لکھا۔ وہ اتنا رقت آمیز تھا کہ اسے پڑھ کر میری آنکھیں دوبارہ اشکبار ہو گئیں۔ خط کا اختتام میر انیس کے اس شعر پر تھا۔ جو میں سمجھتا ہوں مرحوم کی پوری زندگی پر محیط ہے ؎

بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح
انیس یوں ہوا حالِ جوانی و پیری

ان کی شخصیت کے حوالے سے یہاں مجھے مشہور انگریز دانشور لانگ فیلو یاد آ گئے ہیں کہ جنہوں نے کہیں لکھا ہے کہ:

THE TALENT OF SUCCESS IS NOTHING MORE THAN DOING WHAT YOU CAN DO WELL AND DOING WELL WHATEVER YOU DO, WITHOUT THOUGHT OF A FAME.

کامیابی کی صلاحیت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس کام کا ذمہ بھی لو اسے اچھی طرح کرو اور جو کچھ بہ طریقِ احسن کرو اس میں ذاتی شہرت کا خیال مضمر نہ ہو۔

یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ الفاظ طفیل صاحب کے بارے میں کہے گئے ہیں۔ بلند نگاہی، جواں عزم، متانت، سنجیدگی، ثابت قدمی اور اولوالعزمی انکی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی ذات میں جو لطیف حسِ مزاح تھی۔ وہ اپنی مثال آپ تھی۔ خاص طور پر بلا تکلف احباب میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت برمحل فقرات سے خوب سماں باندھتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم چند دوست ان کے ہمراہ لاہور سے پشاور انعامی کتب کے منصفین کی حیثیت سے بذریعہ فوکر جہاز گئے۔ جہاز کافی پرانا اور بوسیدہ سا تھا۔ میں نے پوچھا آپ پہلے بھی جاتے رہے ہیں۔ یہ جہاز کتنے بجے پشاور پہنچے گا۔ جس پر بڑی بے نیازی سے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ کیا جہاز چل پڑا ہے؟

ایک دن اپنے بارے کہا کہ اللہ میاں نے مجھے اچھی سزا دی ہے کہ وہ مسودے جو دیمک زدہ ہوں اور کئی نسلوں سے تہ در تہ مٹی سے اٹے ہوں انہیں میں پڑھوں۔

۱۹۸۴ء میں بھی طبیعت خاصی خراب ہوئی۔ بیرونی ممالک کا چکر لگا کر واپس آئے تو میں ملنے کے لئے گیا اور شکوہ

کیا کہ آپ نے جانے سے پہلے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔ جس پہ کہا کہ مجھے خود گھر والوں نے علم نہیں ہونے دیا۔ مجھے لاہور سے یوں نکالا گیا جیسے حضرت آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔

خاکہ نگاری میں انہوں نے جو منفرد مقام حاصل کیا۔ اس سے ادب کا ہر قاری بخوبی واقف ہے اور پھر کمال یہ کہ طویل اور مختصر ترین خاکوں میں بھی اپنے معیار کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن بعض اوقات موڈ میں ہوتے۔ تو ایک دو فقروں میں ہی دوسرے کی شخصیت کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے۔ چنانچہ ایک شخص کا ذکر خیر چلا تو انہوں نے کہا چھوڑو یار کس کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اس سے تو نفرت کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اس طرح جب ایک شخص نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ پہلے سبھی لوگ اسے بُرا کہتے تھے۔ میں کہتا تھا نہیں آپ کی بھول ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ اب خواہ ساری دنیا سے اچھا کہے میں اسے بُرا ہی کہوں گا۔

سیلف میڈ تھے۔ لیکن اس نوع کے عام اشخاص کی طرح ان میں تنگ نظری، چھچھورا پن یا خود اعتمادی کا فقدان نہیں تھا۔ بلکہ ان میں بلا کی خود اعتمادی اور غیر متزلزل ایقان تھا۔ جس نے ان کے تمام قوائے فکر و عمل کی شیرازہ بندی کی اور انھیں مقصدِ حیات کے تعین میں سازگار فضا مہیا کی تھی۔ دوستوں کے لئے ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ بے پایاں تھا۔ اور اپنے محسنوں کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ متعدد بار ایک ہی میز پہ ان کے ہمراہ کھانا کھایا۔ وہ اکثر سالن کی ایک ڈش پر ہی اکتفا کرتے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا تو کہنے لگے اپنی غربت کا دور یاد آ جاتا ہے ایک اور خوبی جو ان کے کردار میں نظر آئی کہ وہ اصولوں کے لئے مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور خواہ مخاطب کا دنیوی مقام و منصب کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ اور اپنے موقف سے سرمو انحراف کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔

مردم شناسی کا یہ عالم تھا کہ جس کام کے لیے جو شخص موزوں ہوتا اس سے وہ کام لینے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ اور پھر جس سے تعلقات استوار ہو گئے ان کے معیار پر پورا اترا۔ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ دوست نوازی میں بھی انہوں نے ہمیشہ دریا دلی ہی دکھائی۔ بلکہ دو چار بار جب انھیں ان کی علمی و ادبی خدمات کے لیے اعزاز دیا جانے لگا۔ تو انہوں نے اپنی بجائے کسی دیگر دوست کا نام پیش کر دیا۔

نقوش کا ایڈیٹوریل "طلوع" مجھے بے حد پسند تھا۔ بلکہ مجھے ان کے معنی خیز مختصر جملے تو پڑھتے ہی ازبر ہو جاتے تھے۔ میں نے ان ابتدائی کلمات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے خاموش رہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے۔ "آپ میرے دوست اور چھوٹے بھائی ہیں۔ اگر آپ نے مرتب کر کے چھاپے تو یہی سمجھا جائے گا کہ طفیل نے خود یہ کام کروایا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ یہ کام میرے مرنے کے بعد ہو"۔ عجیب الہامی فقرہ تھا کہ اب یہ تمام طلوع ان کے خصوصی نمبر میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کی تفتیش کی پوری دنیا میں دھوم ہے۔ ان کی بے مثل سراغ رسانی کے آگے کسی اور کا چراغ فروزاں نہیں ہو سکا۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت محمد طفیل سے منسوب کی جا سکتی ہے کہ اس نے ادب کی سراغ رسانی میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام

دیئے۔ جس کی کوئی دوسری مثال دکھائی نہیں دیتی اسے خدا جانے ہر نمبر پر کوئی کشف ہوتا تھا یا کہیں سے کوئی منتر ہاتھ آگیا تھا کہ دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں سے بھی ادبی جواہر ریزے اس کے قبضہ میں کچے دھاگے سے کھچے چلے آتے تھے۔ پھر اس نے گنجہائے گراں مایہ کا ایک ایسا انمول اور نادر ذخیرہ دیکھتے ہی دیکھتے جمع کر لیا۔ کہ ہر بار جب نقوش کا خاص شمارہ آتا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ کام کیسے مردِ تنہا سر انجام دے لیتا ہے کہ جو عام حالات میں ادارے بھی نہیں کر پاتے۔ بقول جعفری صاحب ایسا ادبی کوہکن" دوبارہ اردو ادب کو نصیب نہیں ہو سکے گا۔

طفیل صاحب نے ادبی معرکے نمبر" شائع کیا تو اس تقریب کی صدارت کے لیے میر علی احمد تالپور وزیرِ جنگ تشریف لائے (جس میں انہوں نے کہا تھا وزیرِ جنگ نہیں وزیرِ دفاع) تقریب کے مہمانِ خصوصی جسٹس عطاء اللہ سجاد صاحب تھے۔ میں فلیٹیز ہوٹل پہنچا تو طفیل صاحب کہنے لگے کہ نظامت کے فرائض آپ کو سر انجام دینے ہوں گے۔ پھر بتایا کہ شاید صدرِ مملکت بھی اس تقریب ہی تشریف لے آئیں۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ اس یادگار نشست میں نہ صرف قابلِ ذکر سبھی ممتاز اہلِ قلم شامل تھے۔ بلکہ گورنر پنجاب اور ان کی کیبنٹ موجود تھی۔ اس تقریب میں صدر صاحب نے نقوش ایوارڈ کا اعلان کیا ادبی کتابوں سے بین (BAN) اٹھایا۔ اور سب سے زیادہ طفیل صاحب کے آئندہ منصوبے رسول نمبر کے لئے انہیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔ چنانچہ طفیل صاحب نے ان کی اشاعت سے پہلے عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ اس روز طفیل صاحب خاصے خوش و خرم نظر آئے۔ میری حوصلہ افزائی کی کہ آپ کے اندازِ تخاطب کا بھی تقریب کی کامیابی میں خاصہ عمل دخل ہے۔ اسی طرح بعد میں جب رسول نمبر کی تیرہ جلدیں چھپ گئیں۔ تو ڈاکٹر محمد افضل وزیرِ تعلیم نے اسی جگہ صدارت کی اور مہمانِ خصوصی مشہورِ زمانہ مفکر اور عالمِ بے بدل مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے۔ اس تقریب میں بھی سٹیج سیکرٹری مجھے ہی منتخب کیا گیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوستوں کو متعارف کرانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ اور موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور ظاہر ہے۔ کہ یہ خوبی فی زمانہ ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔

زندگی کے آخری دنوں میں طفیل صاحب سے ایک ماہ میں کوئی آٹھ دس مرتبہ ملا کافی بجھے بجھے سے نظر آئے۔ کہنے لگے "دل کا معمولی سا عارضہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں مکمل آرام کرو۔ لیکن میں صبح ہلکی سی ورزش کر لیتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "میری رائے میں نہیں کرنی چاہیئے۔" کہنے لگے "خون کی گردش کے لیے ضروری ہے۔" جس پہ میں نے کہا کہ کرکٹ اور ہومیوپیتھی آپ کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ ایلوپیتھی پر آپ کا یقین نہیں۔ کوئی لاکھ کہے آپ کرکٹ کا میچ دیکھنے سے باز نہیں آسکتے اور ایلوپیتھی دوائیوں کے ساتھ ہومیوپیتھی طریقِ علاج کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر کہیں آپ نے ہومیوپیتھی میں اس ورزش کے بارے پڑھ لیا ہے تو خدارا چند دنوں بعد یہ سلسلہ جاری کریں۔

آخری ملاقاتوں میں ایک دن طفیل صاحب نے کہا: "مجھے آجکل غبار نے تنگ کیا ہوا ہے۔ اکثر جسم کے اندر اٹھتا سا نظر آتا ہے۔" جس پر میں نے کہا "حضورِ انور! یہ غبار نہیں غبارے ہیں بیرونی دنیا میں "رسول نمبروں" کا شہرہ ہے۔ ہر جگہ اس غیر معمولی بے مثل اور وقیع کام کی دھوم ہے۔ نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اندرونی سطح پر بھی جملہ اعضا آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے غبارے اڑا رہے ہیں۔ چونکہ یہ کام پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ اس لیے آپ سہم سے

گئے ہیں۔ ذرا بصیرت کی آنکھ اور گوشِ ہوش نیوش سے سنو۔ میری کہی بات سو فی صد درست ثابت ہوئی جس پہ زیرِ لب مسکرا دیئے۔

محمد طفیل آج ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ ان کا نام اور کام افقِ ادب پر کہکشاں کی مانند چمکتا اور دمکتا رہے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ ہم جیسے دوست ان صحبتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو حاصلِ زیست تھیں۔ شاید ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو کر فانیؔ بدایونی نے کہا تھا ؎

زندگی ہے نام لطفِ صحبتِ احباب کا
یہ نہیں فانی تو جینا کوئی جینا ہی نہیں

فضول آدمی کا دوست

ستار طاہر

اب مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ طفیل صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی! بقول اے حمید مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ ان دنوں موسم کیسا تھا! پتّے درختوں پر نمودار ہو رہے تھے یا زرد ہو کر گر رہے تھے۔

ویسے ان سے ملاقات 'نقوش' کے حوالے سے بہت پہلے سے تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کی ملاقات 'نقوش' اور 'محمد نقوش' سے ہوئی ہے۔ وہ انہیں کبھی دل سے نہیں نکال سکیں گے۔ آنے والی نسلیں بھی 'نقوش اور محمد نقوش' کے حوالے سے محمد طفیل سے بھرپور ملاقات کرتی رہیں گی۔

'نقوش' کے علاوہ بھی ان کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا ان کے خاکے بھی دلچسپی سے پڑھتا تھا دو باتیں ان کے بارے میں اکثر احباب سے سننے میں آتی تھیں۔

وہ بہت محنتی ہیں۔ بڑی لگن سے چوری چوری بڑا کام کرتے رہتے ہیں کسی کو بھنک نہیں پڑتی کہ وہ نقوش کا کون سا خاص نمبر نکال رہے ہیں۔

دوسروں کی تعریف مشکل سے ہی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے بڑے 'بخیل' ہیں۔ بہرحال کسی موسم میں کسی دن ان سے پہلی ملاقات ہوگئی ہوگی۔ پہلی ملاقات کی بھی کوئی تفصیل ذہن میں موجود نہیں۔

اسی زمانے میں میں جس پرچے کی ادارت سنبھالے ہوئے تھا اسی کا افسانہ نمبر شائع کیا۔ یہ افسانہ نمبر طفیل صاحب کو بھی بھجوایا گیا۔ ان کی طرف سے کوئی رسید نہیں ملی۔

چند دنوں کے بعد میرزا ادیب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے،

"طفیل صاحب افسانہ نمبر کی بہت تعریف کر رہے تھے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا میرزا صاحب خود ہی کہنے لگے،

"کسی کی تعریف کرنے میں وہ بڑا کنجوس ہے۔ لیکن آپ کی بہت تعریف ہو رہی تھی۔"

اپنا مسئلہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ 'من آنم کہ من دانم' کبھی اپنے کسی کام کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔ چونکہ وہ افسانہ نمبر واقعی بہت اچھا تھا۔ اس پر بہت محنت ہوئی تھی اس لیے طفیل صاحب کی تعریف سن کر خوشی ہوئی کہ جن کے بارے میں سنا تھا وہ کسی کی تعریف نہیں کرتے وہ بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس "افسانہ نمبر" کی اشاعت کے بعد میں نے 'نقوش' خریدنا بند کر دیا کیونکہ اب مجھے "نقوش" طفیل صاحب

خود بھجوانے لگے تھے۔ ان کی کوئی کتاب شائع ہوتی تو ضرور بھجواتے۔

انہی دنوں یُوں ہُوا کہ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ شائع ہُوا، جس پر نیاز فتحپوری کا فلیپ درج تھا۔ نیاز فتح پوری‘ —— رومانی تھے اور رومانی بڑے دریا دل واقع ہوتے ہیں۔ اس فلیپ میں نیاز فتحپوری نے طفیل صاحب کے ہاں چیسٹرٹن ، سوئفٹ، شا وغیرہ کی ساری صفات دریافت کر لی تھیں۔ مَیں نے اس فلیپ کے حوالے سے ایک تبصرہ لکھا۔ وہ تبصرہ طفیل صاحب تک بھی پہنچا۔ مجھے شدید ردِ عمل کا اندیشہ تھا مگر طفیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس کا ذکر تک نہ آیا۔ حسبِ معمول کچھ بات چیت رہی اور پھر اس تبصرے کے بعد بھی ’نقوش‘ مجھے ملتا رہا۔

میرے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا کہ ایک مدیر نے جب اپنی ایک کتاب پر میرے تبصرے کو پسند نہ کیا تو میرے نام پرچہ بند کر دیا تھا......

اب میں سوچتا ہُوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ مَیں بہت فضول آدمی ہوں اور طفیل صاحب بہت بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا "آپ میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ہیں۔" میرے لیے یہ "انکشاف" بہت حیران کن تھا۔ میری ان کی بہت کم ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کبھی کوئی طویل ملاقات نہ ہُوئی تھی۔ کسی حوالے سے بھی میری ان کی بے تکلفی نہ تھی۔ قربت کا بھی کبھی احساس نہ ہُوا تھا۔ لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے آپ کو میرا دوست سمجھتے ہیں.....

گلڈ کے حوالے سے ان کا ایک خط ’نوائے وقت‘ میں شائع ہُوا۔ اِس میں انہوں نے بھٹو دور کے حوالے سے چند جملے لکھے تھے جو مجھے اچھے نہیں لگے اور میں سمجھتا تھا کہ طفیل صاحب کو مارشل لا کے دَور میں ایسے جُملے نہیں لکھنے چاہئیں تھے۔ میں نے ان جملوں کا خاصا سخت نوٹس لیا۔ طفیل صاحب نے مجھے کبھی نہ جتایا کہ مَیں نے یہ سب کچھ لکھا تھا۔

’نقوش‘ باقاعدگی سے مجھے ملتا رہا اور جب بھی ان سے ملاقات ہُوئی وہ شفقت اور دوستی کا اظہار کرتے رہے۔

پھر ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کی تکمیل ہُوئی۔ انہوں نے اپنا بہت بڑا کارنامہ "رسولؐ نمبر" کی صورت میں انجام دیا۔ ان سے ملنے گیا تو خلافِ معمول اُنہوں نے مجھے کافی دیر بٹھائے رکھا۔ جب ایک صاحب جو پہلے سے وہاں موجود تھے اٹھ کر چلے گئے تو انہوں نے مجھے "رسولؐ نمبر" دیا اور کہنے لگے:

"آپ کو اس لیے دیر تک بٹھانا پڑا کہ اُن صاحب کے سامنے میں "رسولؐ نمبر" دینا نہیں چاہتا تھا وہ بھی مانگ لیتے اور میرے نزدیک وہ اس کے اہل نہ تھے۔"

میں فضول آدمی ہُوں، اس لیے بڑا خوش ہُوا کہ طفیل صاحب نے مجھے ایک صاحب پر فوقیت دی۔ نقوش کے ’رسولؐ نمبر‘ کی پہلی جلدوں کے بارے میں مَیں نے انہیں بتایا کہ ان میں پروف ریڈنگ کی خاصی غلطیاں ہوئیں۔ انہوں

نے بڑی خندہ پیشانی سے یہ اعتراض تسلیم کر لیا۔

’رسولؐ نمبر‘ کے ایک ادارئے پر مجھے اعتراض ہُوا۔ اس حوالے سے میں نے لکھا کہ اس تذکرے کی ضرورت نہیں تھی فضول آدمی ہُوں فضول بات کہہ گیا۔

جب رسولؐ نمبر کی باقی جلدیں آئیں تو طفیل صاحب نے حسبِ سابق مجھے نوازا۔ ذکر تک نہ کیا کہ مَیں نے ان کے ادارئے پر چوٹ کی تھی۔ جب انہیں ’رسولؐ نمبر‘ کے حوالے سے ایک لاکھ روپے کا انعام ملا تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اُنہوں نے اپنے صاحبزادے جاوید طفیل کو اشارہ کیا۔ انہوں نے میرے سامنے لڈّوؤں کا ڈبہ رکھ دیا۔ میں نے لڈّو کھایا، مبارک دی اور چلا آیا۔

واپسی میں مَیں نے سوچا مَیں واقعی بہت فضول آدمی ہُوں۔ طفیل صاحب ہر بار پہلے کی طرح شفقت سے ملتے ہیں اور مجھے جب موقع ملتا ہے ان پر تنقید کرتا ہُوں۔ ان کا دل بہت بڑا ہے۔ ایک بار بھی انہوں نے شکوہ تو کجا اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

عالمی پنجابی کانفرنس کے مندوبین کو گلڈ کی طرف سے دوپہر کا کھانا دیا گیا تھا وہیں طفیل صاحب سے آخری ملاقات ہوئی، کہنے لگے، ”بہت دنوں سے آپ نہیں آئے۔“ میں نے وعدہ کیا کہ جلد حاضری دُوں گا۔ لیکن یہ موقع نہ مل سکا۔

”نقوش“ کے خاص نمبروں میں ’رسولؐ نمبر‘ کو دیکھتا ہُوں اپنے وہ تنقیدی نوٹ یاد آتے ہیں اور پھر طفیل صاحب کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ”میں آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہُوں۔“

مجھے بڑی شدّت سے ان کی عظمت، وسیع القلبی کا احساس ہوتا ہے اور اتنی ہی شدّت سے اپنے فضول آدمی ہونے کا!!

محمد نقوش : نقشِ جاوداں

رضوان اللہ آروی

پانچ جولائی ۱۹۸۶ء کا دن علمی دنیا کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گیا جب محمد طفیل ایک عمر کی طویل جد و جہد کے بعد بالآخر عدم کو سدھارے اور یوں : ع

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

محمد طفیل (جنہیں مرحوم لکھنے کو دل کسی قیمت پر تیار نہیں) ایک شخصیت نہیں، ایک ایسی تحریک کا نام تھا جس نے ایک پوری نسل کو متاثر بھی کیا اور اس کی علمی و ادبی تہذیب بھی کی۔ "فرد" سے "تحریک" بننے تک کا یہ انقلابی سفر ابتلا د مصائب سے پُر تھا، تاہم علم و ادب کے اس "فرزانہ صورت" دیوانے کے پاس عزم مصمم، یقین محکم اور عمل پیہم کا وہ گراں بہا سرمایہ تھا جس کے سامنے تمام پریشانیاں سرنگوں ہو کر رہیں —— محمد طفیل کی عظمت کا راز پانا ہو تو تقریباً نصف صدی پر محیط ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے جو جہد مسلسل اور عمل پیہم کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ بقول سجاد میر:

> "انھوں نے ایک معمولی حیثیت سے اپنے کام کی ابتدا کی اور آہستہ آہستہ اس منزل پر جا پہنچے جو کسی بھی شخص کے لیے قابلِ فخر بات ہے۔ ایک کاتب نے خود کو ایک مدیر کے طور پر منوایا پھر ایک ادیب کی حیثیت سے اُبھرا اور آخر میں سیرتِ نبوی پر وہ کام کر گیا جو بڑے بڑے محققین اور عاشقانِ رسولؐ کے بس کا بھی نہیں۔"

محمد طفیل اگست ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ "نقوش" کے "ادب عالیہ نمبر" (اپریل ۱۹۶۰ء) میں "مدیر نقوش محمد طفیل" کے زیرِ عنوان خود اپنا سوانحی خاکہ لکھتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

> "میں انھیں (محمد طفیل کو) ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں ..... وہ جوں جوں بڑھتے گئے والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جوان ہوتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا جب دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیچارے کی تعلیم ادھوری رہی۔ انھیں ہائی اسکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے مگر ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں ہے ..... جب یہ سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اُٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کما کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی دال روٹی کی بھی فکر دامنگیر تھی۔ اتنی سی جان اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن راہ۔ ۶ ، ۷ برس انھوں نے خوش نویسی کے کام پر

ضائع کئے مگر اس میں سے کچھ پس انداز بھی کیا۔ اس رقم سے ایک دوست کے اشتراک سے پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ اول تو آج کل کی دوستیاں بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں، اس پر اشتراک! ان کے بھی حسین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی جو عموماً متوقع ہوتی ہے۔ اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بیزاری اور بیکاری میں جب کئی مہینے گزر گئے تو ۱۹۴۴ء میں انہوں نے ادارۂ فروغِ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداءً جو کچھ گزری اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ بس یوں جانئے' پریشانیوں اور دشواریوں کا یہ اکیلی جان برسوں مقابلہ کرتی رہی...... ان کے سر سے والد کا سایہ اس وقت اٹھا جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (یکم فروری ۱۹۴۳ء) اور والدہ کا سایہ اس وقت اُٹھا (۵ جولائی ۱۹۵۸ء) جب یہ اس دنیا میں آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے..... والدہ کے انتقال سے طفیل صاحب بجھ کے رہ گئے کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا ...... یار دوستوں سے ملنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں، بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس وقت نہیں، بیوی سے ہنسنا بولنا ان کے مقدر میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر۔ کس لیے؟ صرف ایک فقرے کے لیے:

"اگر میں عین جوانی میں مر گیا جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور میرے بچے اس فقرے کو جاپا کریں گے،

"ہمارے ابا نے بڑے بڑے اچھے نمبر نکالے تھے۔"

بہرحال ان کے بعد جو کچھ بھی ہو، اُنھوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔"

جی ہاں! محمد طفیل نے اپنی زندگی اسی فقرے کے لیے ضائع نہیں بلکہ وقف کر دی اور مستقل ۴۳ برسوں تک اپنے علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی کاموں کو بقولِ خود "عبادت" سمجھ کر ادا کرتے رہے اور ان برسوں میں وہ اردو ادب کو اتنا کچھ دے گئے کہ پھر اسے تنگیِ داماں کی شکایت نہ رہی۔

رسالہ نقوش اور بالخصوص اس کے خاص نمبروں کے حوالے سے علمی و ادبی دنیا میں وہ زندہ رہیں گے اور واقعۃً ان کی شخصیت کا اصل شناس نامہ ہے بھی یہی! تاہم یہ بات اب تک کم معروف ہے کہ وُہ صرف ایک مدیر ہی نہیں' ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھے۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ حسین رُخ ان کی تصنیفات میں جلوہ گر ہُوا۔ انھوں نے اصنافِ ادب میں سے اس صنف کو اپنایا جسے عموماً ثانوی حیثیت دی جاتی تھی — خاکہ نگاری، محمد طفیل کی مخصوص ذہنی ساخت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے ہم آہنگ ثابت ہُوئی۔ انہوں نے اس صنف کو نہ صرف اپنایا اور نہ صرف رسمی طور پر برتا بلکہ اسے فن کی اس بلند سطح پر لے گئے جہاں یہ کسی بھی صنفِ ادب سے آنکھیں ملا کر بات کر سکتی تھی۔ ایک ادیب نے محمد طفیل کی اسکیچ نگاری پر تبصرہ کرتے ہُوئے صحیح لکھا ہے کہ:

> ”دوسرے اسکیچ نگاروں نے اس صنفِ ادب کو ہمیشہ ثانوی حیثیت دی۔ مگر طفیل صاحب نے جو کچھ بھی لکھا اسی صنف میں لکھا۔ اس صنفِ ادب سے ان کا خلوص واضح ہے۔ شخصیت نگاری کے سلسلے میں انہوں نے کچھ تجربے بھی کئے ہیں جو پسندیدہ ٹھہرے۔ نقادانِ فن نے بھی دل کھول کر داد دی۔“

اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے بھی بڑی وقیع ہے:

> ”محمد طفیل صرف مدیر ہی نہیں، وہ ایک چونکا دینے والے مصنف بھی ہیں۔ ان کے شخصی مضامین کے مجموعوں کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں اس نوع کی ادبی تحریریں پہلے نہیں تھیں، مگر اب تک کسی نے اس اہتمام اور درد کے ساتھ اسے اپنا فن نہیں بنایا تھا۔“

اور سلمان بٹ لکھتے ہیں:

> ”ان کے خاکوں کے مجموعے ’صاحب‘، ’جناب‘، ’آپ‘، ’محترم‘، ’مکرم‘، ’محبی‘ اردو خاکہ نگاری کی روایت میں بڑا ہی خوبصورت اور انوکھا اضافہ ہیں...... یہ مجموعے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جس میں متعلقہ اشخاص کو اپنی شخصیت کے وہ خم اور گوشے بھی نظر آجائیں گے جن پر خود ان کی نظر بھی نہیں گئی ہوگی۔“

محمد طفیل کے سحر طراز قلم کا یہ اعجاز ہے جس نے ان کے خاکوں کے مجموعوں میں شامل شخصیتوں کو متحرک صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی بات کہنے کا فن سیکھنا ہو تو طفیل صاحب کے یہ خاکے دیکھیے۔

تاہم، جیسا کہ عرض کیا گیا ان کی شخصیت کا اصل شناس نامہ نقوش کے وہ معرکۃ الآرا نمبر ہیں جو اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک اردو زبان باقی ہے۔ ان میں غزل نمبر، افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، ادب عالیہ نمبر، منٹو نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، میر انیس نمبر، عصری ادب نمبر، ادبی معرکے نمبر وغیرہ اور اس کے علاوہ متعدد عام نمبر جو پطرس بخاری کے الفاظ میں —— ”وہ خاص خاص موقعوں پر شائع کرتے تھے“ کے ذکر کے بغیر کیا ہماری ادبی تاریخ مکمل ہو سکتی ہے؟ خاص نمبروں پر تو ان کی خاص توجہ ہوتی ہی تھی، عام شمارہ کی ترتیب و تدوین اور نوک پلک سنوارنے میں بھی وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نقوش کا عام شمارہ بھی خصوصی شمارے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ محمد طفیل خود فرماتے ہیں:

> ”میں نے عام شماروں کو بھی خاص نمبر بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ عام شماروں میں بھی ٹھکانے کی تحقیقات ملیں گی۔“

یہ بات میں ہی نہیں اردو ادب کا سخت احتساب کرنے والے بھی کہتے ہیں کہ محمد طفیل نے جو بھی نمبر نکالا اس کا حق ادا کر دیا۔
اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> ”اگر میرا بس چلے تو طفیل صاحب سے پوچھوں کہ تم یہ نمبر کس طرح نکالتے ہو؟ اور لوگ بھی نمبر نکالتے ہیں لیکن ان کے نمبروں میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو نقوش کے نمبروں میں ہوتا ہے۔“

حفیظ جالندھری کہتے ہیں :

> "میں نے انگریزی لٹریچر بھی پڑھا ہے، فارسی بھی پڑھی ہے، ہندی بھی پڑھی ہے، عربی سے بھی واقف ہوں۔ اردو کو بھی کھنگالا ہے۔ اس لیے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دُنیا میں اور نہ میرے تصوّر میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقّاد آیا جس نے طفیل صاحب جتنی مشقت اختیار کی ہے۔"

نقوش کے ان خاص نمبروں کے اداریے دیکھئے تو ان کی علمی بصیرت اور مخصوص ادبی نظریات کے ساتھ ان کا منفرد اور رچا ہوا اسلوب بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے حسین، سادہ اور چھوٹے سے جملے میں معنویت کی ایک دنیا بسی ہوتی ہے۔ نقوش کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ بہ یک وقت محمد طفیل اور محمد نقوش کے نام سے اداریے لکھا کرتے تھے۔ پہلے اداریے کا عنوان ہوتا تھا "طلوع" اور دوسرے کا "اس شمارے میں"۔ "محمد طفیل" کو "محمد نقوش" بنانے والے بابائے اردو مولوی عبدالحق ہیں۔ اُنھوں نے شخصیات نمبر شائع کرنے پر محمد طفیل کو اس لقب سے نوازا تھا اور اب تو یہ دونوں نقش باہم ایک دوسرے کا ایسا عکس بن گئے ہیں کہ ہم نقوش کو طفیل سے یا طفیل کو نقوش سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے۔

عام طور پر وہ "طلوع" کے تحت دلآویز اسلوب میں اپنے نازک جذبات و احساسات کو الفاظ کا رُوپ دیتے تھے جبکہ دوسرے اداریے میں مختصراً وہ اس کے مشمولات کا تعارف پیش کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا کوئی بھی اداریہ ایک صفحے سے زیادہ کا نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود کوئی کمی یا تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ اختصار اور جامعیت کا ایسا حسین امتزاج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثالاً ان کے چند ایک اداریوں کے اقتباسات پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ ان کے ادبی فکر کا منظر نامہ بھی ہے اور ان کے انداز پیشکش کا شناس نامہ بھی !

نقوش کے افسانہ نمبر میں وہ اردو افسانے کی کہانی یُوں سناتے ہیں :

> "کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچّہ پیدا ہُوا جو بے حد ذہین، موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر اتر آتا تو چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اُکھڑی اُکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب یاد آتی ہیں . . . . . مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچّے کو اپنی ماں کا دُودھ نصیب نہ ہُوا۔ جب یہ کچھ بڑا ہُوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدّن اور اپنی معاشرت سے بعید انسیت پیدا ہوگئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یاوہ گوئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا، اور ایک نقطۂ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔
>
> اس بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دور، مغرب کے بچّوں سے یارانہ گانٹھا کیونکہ وہ اس سے

> زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اس نے اُنھیں اپنا ذہنی امام تصوّر کرلیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دُہرا کر بہت کچھ سیکھا۔ مغربی بچّوں کی دیکھا دیکھی جب اس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا تو اپنی چال بھی بھول گیا، نہ اُن بچّوں والی کوئی بات پیدا ہوسکی اور نہ اپنی انفرادیت ہی باقی رہی۔ یہی وجہ ہُوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اس کی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔ تذبذب کی یہ کیفیت اس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وُہ بچّے جن سے وُہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا، ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمّت پیدا ہُوئی اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔
>
> آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ وُہ بچّہ جو بعد میں بالغ ہو کر جوان بھی ہوا آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے ——— یہ کہانی اردو افسانے کی تھی۔‟

اردو افسانہ نگاروں میں وُہ منٹو کی بیباکی اور اس کی حقیقت بیانی کے بیحد معترف تھے۔ منٹو پر نقادانِ فن کے خیالات آپ کی نگاہوں سے گزرتے رہے ہوں گے۔ محمد طفیل کا یہ منفرد انداز بھی دیکھئے؛

> ”وہ نڈر تھا، بیباک تھا مگر میرا دوست تھا.....
>
> اس میں ایک دو کمزوریاں بھی تھیں مگر وُہ دل کا اتنا اچھا تھا کہ مجھے اس کی کوتاہیوں سے غرض نہ تھی ...... یونہی دن گزرتے رہے۔ پھر وہ دن آگیا جب وُہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگیا۔ وُہ عجب آدمی تھا۔
>
> اس نے انگریز کو ”نیا قانون“ پڑھوایا۔ اس نے تقسیمِ ملک پر ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ جیسی یادداشت چھوڑی۔ اس نے فسادات کے المیہ پر ”کھول دو“ ایسے انکشافات کیے۔ اس نے دریاؤں کا پانی بند ہونے پر ”یزید“ کو یاد کیا۔
>
> میرا دل کہتا ہے اگر وُہ زندہ ہوتا تو وہ خاموش نہ رہتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس نسل کے ادیب کو بے ضمیری کے طعنہ سے ضرور بچا لیتا۔“

وہ ادب کا معاملہ ہو یا کسی تحریک کا، ہر مسئلہ پر محمد طفیل دو اور دو چار کی طرح واضح اور دو ٹوک رائے رکھتے تھے حتیٰ کہ خاکہ نگاری میں بھی انہوں نے کسی مصلحت کو راہ نہیں دی اور جاننے والوں کے متعلق وہی بات لکھی جو اُن کے نزدیک حق تھا۔ بقول وقار عظیم؛

> ”وہ انسان کو فرشتہ سمجھ کر ذلیل نہیں کرنا چاہتا اور اس لیے بڑی صاف گوئی اور بڑی بے خوفی سے بزرگی کا لحاظ کئے بغیر جاننے والوں کے متعلق سچی باتیں کہتا ہے۔“

قیامِ پاکستان کے بعد وہاں اردو زبان کو لے کر جو تحریک چلی اور پھر، اس تحریک کے نتیجے میں مشرقی پاکستان

(موجودہ بنگلہ دیش) کا جو المیہ پیش آیا اس سے کون واقف نہیں! اس تلخ تجربے نے ہر باشعور اور حساس شخص کی آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اس مسئلہ کا جائزہ لے رہے تھے یا لینے پر مجبور تھے ——— محمد طفیل شروع ہی سے اس مسئلہ کی بابت ایک متوازن نظریہ رکھتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اُنھوں نے حسبِ دستور ایک صفحہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ "طلوع" کے تحت ان کا یہ اداریہ خاص طور پر پاکستان کے جغرافیہ ساخت کے تناظر میں بیحد اہمیت کا حامل ہے جس کا آغاز وہ اس معنیٰ خیز جملے سے کرتے ہیں کہ:

"آپ بھی دل میں کشادگی پیدا کرلیں تاکہ کہا سُنا بُرا نہ لگے۔"

اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مکمل اداریہ پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو بھی کیا اچھی زبان ہے۔ اردو ہی پر کیا منحصر، دُنیا کی ساری بڑی زبانیں اپنے اندر دوسری بڑی زبانوں بلکہ مقامی بولیوں تک کے الفاظ اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ زبان کیا ترقی کرے گی جو اپنے اندر چھوت چھات رکھتی ہو۔
>
> ایک زمانہ تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ آج جبکہ اردو کا مسکن مغربی پاکستان ہے تو پھر سوچیے کہ پاکستان میں آئندہ چل کر اردو کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس میں بسنے والے سرحدی ہیں، پنجابی ہیں، سندھی ہیں، بلوچی ہیں۔ اگر آج ہم نے اس اردو کو رواج دینے کی کوشش کی جو اردوئے معلّٰی کہلاتی تھی تو بات نہ بنے گی۔ مستقبل کی اردو کے خط و خال کچھ اور ہی ہوں گے جس میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی کے الفاظ کو بھی جگہ دینی ہوگی۔ آج اردو کو اہلِ پنجاب کے مزاج کا ساتھ دینا ہوگا۔ نہ صرف اہلِ پنجاب کا بلکہ اہلِ سرحد کا، اہلِ سندھ کا اور اہلِ بلوچستان کا بھی! ان سارے خطوں کے خمیر سے جو اردو بنے گی وُہی مستقبل کی اُردو ہوگی۔ لہٰذا بادشاہو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ...... مرکز بدلنے سے زبانیں بھی بدل جایا کرتی ہیں اور اس فطری امر کو خوش فہمیوں کی آغوش میں رہ کر بدلا نہ جا سکے گا۔
>
> اردو جو لال قلعہ کی زبان ہے اُسے آج مغربی پاکستان کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہوگا ورنہ ——— ورنہ اس ڈولی کا بوجھ ہمارے کندھے سہار نہ سکیں گے۔
>
> آج میری باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اردو جیسی پیاری اور نستعلیقی زبان کے معاملے میں سوتیلی ماں کا سا رول ادا کرنے نکلا ہُوں۔ یہ تہمت تسلیم، مگر میں نہیں چاہتا کہ سگی ماں کے سے بے جا چونچلوں سے اس غریب کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ "سگی ماں" نے جو کچھ مشرقی پاکستان میں اردو کے ساتھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ میں اردو دشمن بن کر جی لوں گا، مگر میں یہ چاہتا ہُوں، بصد خلوص چاہتا ہُوں کہ ——— اردو کی مانگ کا سیندور نہ لُٹے۔"

اردو ادب کا نثری سرمایہ ہو یا شعری سرمایہ، محمد طفیل نے جدھر بھی نظر کی، دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے ہیں۔ نقوش کے غزل نمبر میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم ہے ہی، علاوہ ازیں اُنھوں نے اسی نمبر میں شعروں کا جو انتخاب پیش کیا ہے اس سے وُہ، غالب کی طرح، رسوا نہیں ہُوئے بلکہ ان کا ستھرا شعری ذوق نمایاں ہوتا ہے۔ غزل نمبر کے "طلوع" میں وُہ لکھتے ہیں:

"شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ راہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت ہُوئی۔ جب مولانا نیاز فتحپوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بہ خلوص تمام ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں گے کلیم الدین احمد نے تو اس صنف ہی کو نیم وحشی قرار دے دیا —— ہم ایسے تمام جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو نقادوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ ان میں بیشتر لکیر کے فقیر بننے میں پُوری سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہُوا کہ جو بعض اچھا کہنے والے مر گئے تو بس مر ہی گئے حالانکہ ژرف نگاہ نقاد کے پاس مسیحائی کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں وُہ اگر چاہے تو مرے ہُوئے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے۔ ہم میں سے بعضوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ یہ غزل:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا غم سے سینہ فگار ہے

ظفر کی نہیں بلکہ ایک اُمّی شاعر حسامی کی ہے۔ ہم میرؔ، غالب کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ بعض شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں:

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے (آصفؔ)

میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو
پھُول جو دستِ باغباں سے گرا" (میر خلیقؔ)

انتخابِ اشعار کی بات چل رہی ہے تو یگانہؔ اور مجازؔ کے اشعار سے بھی محمد طفیل کا انتخاب دیکھتے چلئے ——

نقوش (مارچ ۱۹۵۶ء) میں وُہ یگانہ پر ایک مختصر سا خاکہ لکھتے ہُوئے فرماتے ہیں:

"اکہرا بدن، چپٹی ناک، کالا رنگ، کلین شیو، بھونڈی شکل و صورت والے کا ایک خوبصورت شعر

یہ بھی ہے: ؎

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں تھے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا"

اور اسی شمارے میں مجازؔ کے بارے میں ان کے رشحاتِ قلم کا انداز کچھ یوں ہوتا ہے:

"لمبے قد، کلین شیو، سانولے رنگ، لمبے بال، قدرے خوب صورت خدو خال والے مجازؔ ہی کا تو شعر ہے: ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے"

اشعار کے علاوہ شعرا کے انتخاب میں بھی محمد طفیل کا اپنا ہی ایک نظریہ تھا۔ نقوش، میر انیسؔ نمبر کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

"ایک دن سوچا، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد چوتھا بڑا شاعر کون ہے! ذہن نے جھٹ فیصلہ کر دیا ——— میر انیسؔ۔"

بات اگر یہیں ختم ہو جاتی تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بڑی بات اُن کا اگلا جملہ ہے جو ان کی ادبی بصیرت کی یُوں عکاسی کرتا ہے:

"اگر موضوع کی پاکیزگی اور بلندی کو دھیان میں رکھیں تو میرؔ اور غالبؔ بھی کٹ جاتے ہیں، اقبالؔ اور انیسؔ میدان میں رہ جاتے ہیں۔"

اور یہی وہ میر انیس نمبر ہے جس کے صفحات پہ پہلی مرتبہ یہ تاریخ ساز اعلان کیا گیا:

"۱۹۸۲ء ادارۂ نقوش کا سال سیرت ہوگا۔ موجودہ نمبر کے بعد ہمارا سارا دھیان رسولؐ نمبر کی اشاعت پر مرکوز ہوگا۔ خواہش اور کوشش ہوگی کہ ۱۹۸۲ء کا سال رسولؐ نمبر کی اشاعت کے لیے وقف ہو اور ہر تیسرے مہینے ½، سو صفحات کی جلد پیش ہوتی رہے۔ یہ نمبر صدیوں تک قابلِ ذکر رہے گا۔ یہ نمبر کم و بیش دس ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا۔"

اور اس اعلان کا آخری ٹکڑا یہ تھا:

"میری زندگی کا حاصل' رسولؐ نمبر! محمد طفیل"

اس اعلان کے بعد ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ رسولؐ نمبر کی دس ضخیم جلدیں چھپ کر اہلِ دانش و بینش سے خراجِ تحسین وصول کر رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ نقوش کے اس لازوال نمبر پہ گفتگو کی جائے، محمد طفیل کا وہ "ابتدائیہ" پڑھنا چاہیے جو انہوں نے رسولؐ نمبر کی اشاعت کے بعد تحریر فرمایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے جب بھی کوئی نمبر پیش کیا، بڑی محنت سے پیش کیا۔ موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

> ..... اور میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہُوا۔ ایسا خیال صرف میرا نہیں، سبھی کا ہے، علماء کا بھی، دانشوروں کا بھی، ادباء کا بھی، شعراء کا بھی اور قارئین کا بھی!
>
> رسولؐ نمبر کا قصہ یہ ہے کہ یہ موضوع میرے دل کی گہرائیوں کا موضوع تھا اور ہے۔ اس نمبر پر میں نے اپنے تمام نمبروں سے زیادہ محنت کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے جملہ نمبروں پر اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ اس پاک موضوع پر، تو یہ دعوٰی غلط نہ ہوگا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میرا خدا تو جانتا ہے، وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔
>
> جن نمبروں پر میں نے کم محنت کی ان کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتا ہوں کہ حق ادا ہوا۔ یہ نمبر جس پر میں نے جملہ نمبروں سے زیادہ محنت کی اس کی بابت تکمیل کار کا دعوٰی نہیں کر سکتا۔ جو یہ کہے کہ وہ اس موضوع کا حق ادا کر سکتا ہے وہ شخص عالم تو ہو سکتا ہے، وہ شخص سچا نہیں ہو سکتا۔"

بعد ازاں، حکومتِ پاکستان نے بھی اس کام کی اہمیت کو محسوس کیا اور محمد طفیل کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءُ الحق نے اُنھیں ایک لاکھ روپے کے گرانقدر انعام سے نوازا۔ لیکن اس انعام سے بڑا انعام مَیں صدرِ مملکت کے اس بیان کو سمجھتا ہُوں جس میں اُنھوں نے محمد طفیل کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہُوئے فرمایا تھا:

> "جس طرح سر سید احمد خاں نے کہا تھا: اگر خدا نے مُجھ سے پُوچھا کہ دُنیا سے کیا لائے ہو؟ تو میں جواب دُوں گا، مولانا حالی سے مسدس لکھوائی۔" اسی طرح اگر مجھ سے سوال ہُوا تو میں کہوں گا رسولؐ نمبر لایا ہُوں۔ گو یہ کام طفیل صاحب نے کیا ہے مگر اس میں کچھ میرا بھی حصہ ہے۔"

ایک حلقے کے لیے یہ بات باعثِ تعجب تھی کہ خالص ادبیات کا ایک شخص مذہبیات کی طرف کیسے مُڑ گیا۔ اوروں کو تو جانے دیجئے، نعیم صدیقی (جو خود بھی ایک تسلیم شدہ سیرت نگار ہیں) کو جب طفیل صاحب کا یہ ارادہ معلوم ہُوا تو وہ بھی اس پر اظہارِ حیرت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ نوائے وقت فورم کے زیرِ اہتمام رسولؐ نمبر پر منعقد ہونے والے ایک مذاکرے میں انھوں نے کہا تھا:

> "طفیل صاحب کی طرف سے بات چھڑی کہ ان کا ارادہ رسولؐ نمبر شائع کرنے کا ہے، مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہُوئی کہ کام کی ایک مخصوص لائن پر مصروف شخص نے اچانک ایک نیا مشن شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

روزنامہ نوائے وقت لاہور کے لیے انٹرویو کرتے ہُوئے اسد اللہ غالب نے محمد طفیل سے کچھ ایسا سوال کیا:

"آپ کو رسولؐ نمبر کی اشاعت کا خیال کیسے آیا؟"
اور محمد طفیل کے جواب سے ہمیں اس عقدہ کا سرا ہاتھ آجاتا ہے کہ کام کی ایک مخصوص لائن پہ مصروف شخص نے اچانک ایک نیا مشن شروع کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا؟ انھوں نے کہا:

> "شاعر اور ادیبوں کا تو یہ ہے کہ وہ خیال کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اگر مجھے بھی چھوٹا سا ادیب سمجھ لیں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندہ رہنے کی ایک تدبیر سوچی تھی۔ ایسی تدبیر، جس میں میرے لیے راحتیں ہی راحتیں تھیں، سکون ہی سکون تھا۔ مثلاً میں نے سوچا افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر مجھے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ جواب ملا: دس بیس برس! اسی طرح مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر، شخصیات نمبر تیس چالیس برس، غرض اقبال نمبر، غالب نمبر اور میر نمبر میں سے کسی نمبر نے بھی مجھے چالیس پچاس برس سے زیادہ زندہ رہنے کی نوید نہ سنائی۔ مگر میں چالیس برس کی عمر میں فوت ہونا نہیں چاہتا تھا میں تو لمبی عمر چاہتا تھا..... مگر کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سوچ سوچ کر بوڑھا ہو گیا۔ بالآخر روشنی ملی، قدرت نے میری مدد کی، منزل کی نشان دہی کر دی — "رسولؐ نمبر چھاپو، صدیوں زندہ رہو گے۔"

اس انٹرویو میں ایک اہم اور بنیادی سوال یہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ سیرت کی اتنی کتابوں کی موجودگی میں اس نمبر کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے جواب میں محمد طفیل نے جو کچھ کہا ہے، یہاں اس کا نقل کرنا غیر مفید نہ ہوگا کہ اس سے اجمالی طور پر رسولؐ نمبر کے موضوعات کے ساتھ خود محمد طفیل کا اندازِ فکر بھی واضح تر صورت میں سامنے آگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "میرے نزدیک آپ کا یہ سوال: بنیادی سوال ہے کہ اتنی سیرت کی کتابوں کی موجودگی میں آخر اس نمبر کی ضرورت کیا تھی؟ میرے نزدیک ضرورت یہ تھی اور ہے کہ میرے ملک کا معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ اسے سیرت النبیؐ کی روشنی میں سنوارنے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک کی خدمت کا بامعنیٰ منصوبہ ہے۔ ..... چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ میں نے جو عنوانات سوچے وہ میری سوچوں کی ترجمانی کریں گے۔ مثلاً ایک عنوان ہے: "اصلاحِ معاشرہ اور سیرتِ نبوی" دوسرا "عظمتِ انسانی کا نقیب ہمارے رسول"۔ تیسرا "فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام" چوتھا "اخلاقی اصلاح اور ہمارے رسولؐ"۔ پھر جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے "علومِ انسانی کے فروغ پہ ہمارے رسول کا اثر"، "علم و تہذیب کی ترقی میں معارفِ محمدی کا حصہ"، "رسالتِ محمدی کا عقلی ثبوت" ایسے عنوانات سیرتؐ کی کتابوں میں یا تو موجود نہیں یا برائے نام ہیں۔ ان پر سیر حاصل مواد موجود نہیں۔ ہم نے ایسے عنوانات پر آٹھ آٹھ، دس دس مضامین لکھوائے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور وقت کے تقاضے پورے ہوں..... ہم نے سیرت کے ایسے پہلو ڈھونڈے اور انہیں موضوع بنایا جن پر سیرت کی

> سابقہ کتابیں چُپ ہیں.... مناسب ہوگا پہلے ہم سیرت کی اہم کتابوں کو ذہن میں رکھ لیں۔ مثلاً "سیرۃ النبی" اور "رحمۃ للعالمین" کو۔
>
> ان میں سے کسی کتاب میں اصحابِ صُفّہ پر مواد ملے گا؟ یہ وُہ لوگ تھے جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ جنتی ہیں۔ اس عنوان کے تحت بیشک چند سطریں، چند صفحے ملیں گے مگر نام بنام تذکرہ نہ ملے گا۔ ہم نے ۸۹ اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ کاتبانِ وحی پر چند سطریں ملیں گی مگر نام بنام تذکرہ نہ ملے گا۔ ہم نے ۴۸ اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ ہجرت' سیرت کا بنیادی موضوع ہے مگر اس پر چند صفحات ملیں گے زیادہ تفصیل نہ ملے گی۔ ہم نے اسباب و محرکات پر گفتگو کی۔ راہیں، قیام اور منزلوں کا ذکر کیا۔ پھر اس کی عالمگیر اہمیت پر گفتگو کی۔ ہم نے اس موضوع پر ۱۴۷ صفحات مختص کیے۔ یہ بھی عرض کر دوں ہمارے پاس بنیادی کتاب "سیرتِ ابنِ ہشام" ہے۔ اس میں خدمتِ اقدس میں پہنچنے والے جتنے وفود کا ذکر کیا ہے ہم نے بعد تحقیق اس میں اضافہ کیا۔ ہمارے ہاں ۱۷ وفود کا ذکر ملے گا۔ یہ ہے وُہ تھوڑی سی تفصیل جس سے ہمارا کام سیرت کی دوسری کتابوں سے الگ نظر آئے گا۔ یہاں ایک بات کی صراحت کر دُوں، وُہ یہ کہ میرے اس سب بیان کر دینے سے سیرت کی متذکرہ کتابوں کی اہمیت نہ کم ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی۔ یہ تو سیرت کے موضوع پر مینارۂ نور ہیں اور میں بات نئے موضوعات کی کر رہا ہُوں۔ غرض رسولؐ نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں میرے ذہن میں صرف یہی باتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ یہ نمبر سیرت کی کتابوں کے مختلف نہج پر ترتیب دیا جائے۔ دوسرے حضور کی زبان سے جو کچھ نکلا ہو یا جو کچھ کیا ہو اسے یکجا کر دیا جائے اور یہ کہ سیرت کے نئے موضوعات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ معاشرہ کو سیرت رسول کی روشنی میں سنوارا جائے۔"

رسول نمبر کی ترتیب و تہذیب کے دوران اُنھیں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کی زورق امید آزمائشوں کے کتنے بھنور میں پھنسی، "سبکسارانِ ساحل" اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگی کے معمولات بھی بدلنے پڑے۔ یہ کہانی انھیں کی زبانی:

> "میں نے زندگی کے معمولات بدل ڈالے۔ جن تقریبات کو چھوڑ سکتا تھا وہ چھوڑیں۔ جن رشتہ داروں کی شادیوں میں عدمِ شرکت سے گزارہ ہو سکتا تھا، وہ وقت بچایا۔ بلکہ یہاں تک کہ اس عرصہ میں جو مجھے چھوٹے موٹے عارضے لاحق ہوئے ان پر بھی میں نے خدا سے کہا: مجھے رسولؐ نمبر چھاپنے کی مہلت دیجئے، اس کے بعد تیری رضا۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت کون ہو گا کہ جس کی آرزو اس کی زندگی میں پُوری ہو گئی، وہ بھی سب سے بڑی آرزو!"

اتنی قربانیوں کے بعد بلاشبہ رسول نمبر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ سچ کہا پروفیسر مرزا محمد منور (صدر شعبۂ اقبالیات، جامعہ پنجاب، لاہور) نے کہ:

”حضور نبی اکرمؐ کی شان ہی کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس لاثانی شان کو لاثانی انداز میں پیش کرنے کے لیے طفیل صاحب کو لاثانی کوشش کرنی پڑی۔“

رسول نمبر کی ابتدائی دس جلدوں کے صوری و معنوی محاسن کو دیکھ کر جو فوری تاثر مجھ پر قایم ہوا تھا وہ ایک خط کی صورت میں قلم بند کر کے میں نے اسی زمانے میں محمد طفیل کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ یہ رسول نمبر اور اس کے حوالے سے ذاتِ رسول سے وابستگی کا ایک اظہار تھا اور بس! لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رسول نمبر کی تیرھویں اور آخری جلد میں دوسرے ماہرینِ علم و ادب کے ساتھ انھوں نے مجھ جیسے مبتدی کو بھی شریکِ اشاعت کر لیا۔

FIRST IMPRESSION IS THE LAST IMPRESSION کہتے ہیں تو صاحبو! رسول نمبر پر وہ میرا پہلا تاثر بھی ہے اور آخری بھی۔ اس پر مزید کوئی رائے دینے کی بجائے وہی سطور آپ کی خدمت میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا:

”نقوش کے ذریعہ دلوں پر مہر و خلوص کا نقش ثبت کرنے والے، محمد طفیل صاحب!

ہدیۂ سلام و خلوص

محسنِ انسانیت کی سوانح مبارکہ پر دس ضخیم جلدیں پیش کر کے آپ نے ملتِ اسلامیہ پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، یقیناً وہ اپنے آخری سفر تک اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ کیا مضائقہ ہے اگر میں آپ کو ”محسنِ ملتِ اسلامیہ“ کا خطاب دوں کہ نقوش کے رسول نمبر کے بعد آپ اس خطاب کا استحقاق حاصل کر چکے ہیں۔

آپ نے اب تک نقوش کے مختلف نمبر پیش کیے ہیں۔ میر نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، میر انیس نمبر اور جانے کون کون سے نمبر۔ لیکن میں سوچتا ہوں وہ ساعت جس قدر پر سعادت و مبارک ہوگی جب آپ نے ”بریدہ از ہمہ سو بستہ ام بسوئے رسول“ کے مصداق ہر دو عالم سے رشتۂ امید منقطع کر کے، باعثِ ایجادِ دو عالم سے اپنی آس کی ڈوری باندھی تھی۔ خفیف سے تصرف کے ساتھ حافظ کا یہ شعر آپ کو مخاطب کر کے پڑھا جا سکتا ہے ؎

چہ مبارک سحری بود و فرخندہ شبی
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتت دادند

اور پھر، معاً مجھے یہ خیال آیا کہ رسول نمبر کی دس جلدیں اور عشرۂ مبشرہ کی دس ہی کی تعداد۔ اگر قرونِ اُولیٰ میں دس خوش نصیب صحابیوں کو آنحضورؐ نے اپنی زبان مبارک سے جنت کی لفظی

بشارت عطا کی تھی تو آج رسولؐ نمبر کی دس جلدیں آنحضرتؐ کی معنوی بشارت کا ثبوت ہیں عشرۂ مبشرہ کی تعداد سے رسولؐ نمبر کی تعداد کی یہ حسین مماثلت عنداللہ و عندالرسول اس کی مقبولیت کا پتا دے رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سیرت پر مختلف زبانوں میں قابلِ قدر کوششیں کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں۔ دیگر زبانوں سے قطعِ نظر اردو زبان کا بھی "سیرتی ادب" مالامال ہے۔ ان میں علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی کی مشترکہ کاوش "سیرۃ النبی" کی کئی ضخیم جلدیں خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بعد کا آنے والا کوئی بھی سیرت نگار اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا اور یقیناً رسولؐ نمبر کو ترتیب دیتے وقت آپ کے پیشِ نظر بھی یہ کتاب رہی ہوگی۔ لیکن ان سب اعترافات کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ سیرت کی ان ساری کتابوں کے درمیان آپ کی کاوش منفرد بھی ہے اور عظیم بھی۔ بلاشبہ نقوش کا رسولؐ نمبر آنحضرتؐ کی سوانح حیات پر ایک دائرۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ آنحضرتؐ کی بے مثل شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے اور یہ دریا جتنا امنڈے گا تشنگی اتنی ہی بڑھے گی تاہم اس حقیقت کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ نقوش کے رسولؐ نمبر کے بعد سیرتی ادب پر مستقبلِ قریب میں مزید اضافے کا کوئی امکان نہیں!

آپ کا اپنا
رضوان اللہ آروی"

یہ میرے اور محمد طفیل کے مابین "مراسلانہ تعلق" کا نقطۂ آغاز تھا۔ طفیل صاحب سے میری یہ نصف ملاقات آخر وقت تک قائم رہی۔ کہتے ہیں کہ مکاتیب، مکتوب نگار کے اندرون کے عکاس ہُوا کرتے ہیں۔ اس کلیہ کی بنیاد پر میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ محمد طفیل انسانیت اور اخلاق کے بلند منصب پر فائز تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں نے جب بھی انھیں خط لکھا انھوں نے بغیر کسی تاخیر کے انتہائی محبت اور شفقت کے ساتھ جواب مرحمت فرمایا۔ یہ بڑی بات تھی کہ انھوں نے لکھنے والوں کو "بڑے" اور "چھوٹے" کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ ان کے نزدیک قدر کا معیار فن ہوتا تھا نہ کہ فن کار! علمی کاموں سے وہ جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور نہایت فراخ دلی سے ایسے کاموں کی تعریف و توصیف کرتے تھے خواہ اس کا کرنے والا کوئی بھی ہو۔ چنانچہ مجھے یاد ہے "فن اور شخصیت" (بمبئی) کے مدیر صابر دت نے ساحر لدھیانوی نمبر نکالا تو محمد طفیل نے ان کی کاوش کو ان الفاظ میں سراہا کہ:

"بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں سلام کرنے کو جی چاہتا ہے ادب کے رشتے سے۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔"

ایسی سطریں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ معاصرانہ چشمک نام کی کوئی چیز نہیں تھی اُن کے ہاں۔ یہ بڑے

ظرف کی بات ہے جو ہر کسی کے حصّے میں نہیں آتی!

سلمان بٹ نے محمد طفیل پر خاکہ لکھتے ہُوئے ان کی شخصی شرافت پر یُوں روشنی ڈالی ہے:

"محمد طفیل بڑی آہستہ روی سے کسی کے قریب آتے ہیں لیکن قریب آنے کے بعد دور نہیں جاتے۔ تعلق نبھانا خُوب جانتے ہیں۔ ماہ و سال کی گردش ان کے رویوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں لیکن ان کی محبت کا رکھ رکھاؤ وہی رہتا ہے۔"

اور کچھ ایسی بات صدرِ پاکستان کے نمائندے بریگیڈیر صدیق سالک نے محمد طفیل کے جنازہ سے قبل ایک انٹرویو کے دوران کہی:

"پندرہ بیس سال قبل مرحوم کے ساتھ پہلا تعارف نقوش کے ذریعے ہُوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نقوش پیچھے رہ گیا اور دوستی آگے بڑھ گئی۔ میں نے محمد طفیل کی شخصیت کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ نقوش عظیم ہے تو محمد طفیل عظیم تر ہیں۔"

شخصیت کا ذکر آ گیا ہے تو ان کی ذات کے کچھ اور اہم گوشوں پر بھی نظر ڈالتے چلیے۔ قریبی حلقوں میں وُہ اپنی کم آمیزی اور کم سخنی کے لیے مشہور تھے۔ سلمان بٹ لکھتے ہیں:

"محمد طفیل عرف محمد نقوش کام زیادہ کرتے ہیں، بولتے کم ہیں اور وُہ بھی نرم اور آہستہ لہجے میں۔ بعض اوقات ان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔"

اس سلسلے میں مجاز سے ان کی پہلی ملاقات کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے جس میں خود انھوں نے لکھا ہے کہ آدھ گھنٹہ گزر گیا اور گفتگو "ہُوں، ہاں" سے آگے نہ بڑھی۔ بالآخر تیسرے آدمی نے مداخلت کی اور تب، انہی کے الفاظ میں، اُنھیں اس بے بسی سے نجات ملی اور یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ اُنھوں نے جس خاموشی کے ساتھ زندگی گزاری، اسی خاموشی کے ساتھ موت کو بھی گلے لگایا۔ ذرا سوچیے تو، اسلام آباد میں وُہ اپنے ایک دوست کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ سوتے وقت وُہ اپنے میزبان کو صبح جلد اٹھانے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ کسی تاخیر کے بغیر وُہ لاہور پہنچ سکیں۔ دوسری صبح میزبان جب انھیں جگانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ دلخراش انکشاف ہوتا ہے کہ محمد طفیل ایک رات کی نیند نہیں بلکہ ہمیشہ کی نیند سو چکے ہیں ؎

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان کی کم گوئی اور کم آمیزی، مردم بیزاری کا نتیجہ تھی۔ وہ دوستوں کی بے تکلف محفل بھی آراستہ کرتے تھے لیکن کام کے بعد۔ بقول سلمان بٹ:

"ان کے ہاں کام کا نمبر پہلے آتا ہے طعام و کلام کا بعد میں اور آخر میں سلام کا۔"

اس میں کوئی دو رائیں نہیں کہ اُنہوں نے کام کو ہر چیز پر مقدم رکھا بلکہ محمد طفیل کے اپنے الفاظ استعمال کیے جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کا وجود ہی عمل سے قایم تھا باتوں سے نہیں۔ نقوش سے ان کی وابستگی جنون کی کس سطح پر پہنچ چکی تھی، اس کا اندازہ کرنا ہو تو یہ واقعہ پڑھیے — رات کے بارہ بج چکے ہیں، محمد طفیل اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ بیگم آنکھیں ملتی ہُوئی دروازہ کھولتی ہیں اور پھر، ان کے لیے کچن کھانا لینے چلی جاتی ہیں۔ واپس آتی ہیں تو محمد طفیل پروف ریڈنگ میں گم نظر آتے ہیں۔ پروف الگ کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں؛ پہلے آپ کھانا تو کھا لیجئے۔

"بیگم! پرچہ لیٹ ہوجائے گا" محمد طفیل بڑی رسانیت سے کہتے ہیں

"تم ایسا کرو، نوالہ بنا بنا کر میرے منہ میں دیتی چلی جاؤ، ادھر میں پروف دیکھتا جاتا ہوں۔ اس طرح تمہارا بھی کام ہوجائے گا اور میرا بھی"

بالآخر یہی ہوا — یہ تھے محمد طفیل اور یہ تھا نقوش سے ان کا والہانہ لگاؤ!

تحریر کی طرح تقریر میں بھی وہ منفرد رنگ و آہنگ کے مالک تھے۔ ان کی تقریر کا لب ولہجہ بے حد سادہ لیکن بے حد پُر معنیٰ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ڈرامائی اور ذُو معنیٰ جملوں سے پہلے سامعین کو چونکاتے تھے اور پھر اس کی کوئی خوبصورت سی توجیہہ پیش کر کے تسکین کا سامان بھی فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ ادارۂ نقوش کے زیرِ اہتمام ہونے والی ایک ادبی تقریب میں (جس میں وزراء سفراء کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی) جب محمد طفیل کو دعوتِ تقریر دی گئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا؛

"کوئی وزیر ہے تو مجھے کیا، کوئی سفیر ہے تو مجھے کیا"

رپورٹ نگار لکھتا ہے کہ یہ جملے سُن کر وزیر و سفیر سنبھل کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور سامعین چونک کر ایک دُوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ اور محمد طفیل ان سب سے بے نیاز فرما رہے تھے؛

"میں تو انسانیت کی قدر کرتا ہُوں اور اسی لیے ان کی بھی قدر کرتا ہُوں کہ یہ انسانیت کے بلند اقدار و روایات کے وارث بھی ہیں اور امین بھی"

غالب کے خطوط کی طرح محمد طفیل کے خطوط کی بھی اپنی ایک الگ بہار ہوتی تھی۔ مکتوب نگاری میں بھی ان کا وہی انوکھا اور دلکش پیرایۂ بیان جاری و ساری ہے جو ان کے خاکوں اور ان کے اداریوں کا خاصہ رہا ہے۔ اُن کے بظاہر چھوٹے اور سادہ سے جملوں میں بے پناہ جذب و اثر ہوتا تھا۔ نقوش سے وابستہ حضرات کو یہ بات معلوم ہوگی کہ رسولؐ نمبر کی طرح وہ قرآن نمبر بھی شائع کر رہے تھے۔ رسولؐ نمبر کی بارھویں جلد میں اس کا ذکر یُوں ملتا ہے؛

"ہاں، مجھے قرآن کے بارے میں بھی تو کچھ کرنا ہے۔ یہ منصوبہ میرا اوّل دن سے ہے جسے میں نے رسولؐ نمبر کے ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ سیرت ایک امتحان تھا قرآن دُوسرا ہوگا۔ میں تو یہ جانتا ہُوں کہ چیونٹی کے بدن پر پہاڑ کا وزن پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے"

اس نمبر کے لیے میں نے انھیں ایک مضمون بھیجنے کی پیش کش کی۔ انہوں نے رجسٹرڈ پوسٹ سے فوراً جواب لکھا:

> "آپ کا گرامی نامہ نیکی اور پوچھ پوچھ والا معاملہ ہے۔ اچھے کام تو پوچھنے کی بجائے کر گزرنے والے ہوتے ہیں۔ ضرور مضمون لکھیے اور بھجوائیے ..... یہ کام سب کا ہے۔ دعا بھی کیجئے کہ یہ کوشش بھی قابلِ تحسین ٹھہرے۔"

ان کی حوصلہ افزائی پر میں نے خدابخش لائبریری میں محفوظ، قرآن کریم کے قلمی نسخوں کے تعارف پر مشتمل ایک مضمون اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ مضمون موصول ہونے کے بعد انہوں نے اس کی رسید لکھی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا:

> "آپ کا مضمون "قرآن کریم کے چند نادر قلمی نسخے" مل گیا۔ اچھا مضمون ہے۔ اہلِ علم شوق سے پڑھیں گے۔"

اس نمبر کی ترتیب میں وُہ کس قدر عرق ریزی اور احتیاط سے کام لے رہے تھے، اس کا اندازہ ان چند جملوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے ایک خط میں تحریر کیے ہیں وہ رقمطراز ہیں:

> "دھیرے دھیرے قرآن نمبر کا کام ہو رہا ہے۔ میں اپنی روایتی برق رفتاری سے کام نہیں لے سکتا۔ اس میں کرنے کا کام کم اور سوچنے کا زیادہ ہے مگر جب کرنے کا کام بھی زیادہ کرنا ہو تو مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

پچھلے سال وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ زیارتِ حرمین سے واپسی کے بعد میں نے ان کی مزاج پرسی کے ساتھ انھیں مبارکباد کا خط لکھا۔ اس خط کا جواب آیا تو جذبات کے اس طوفان کا ہلکا سا اندازہ ہوا جو قرآن نمبر کے لیے ان کے دل میں موجیں مار رہا تھا۔ وُہ لکھتے ہیں:

> "میری خیریت قرآن نمبر کی اشاعت پر منحصر ہے۔ قابلِ ذکر کام ہوگیا تو بہ خیریت ورنہ کیا خیریت!"

اور ان کے آخری خط (جو ان کے انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے مجھے موصول ہوا تھا) کی آخری سطر یہ تھی:

> "پچھلے دنوں ۱۰۴ بخار کوئی ہفتہ بھر رہا۔ بے حال کو اور بے حال کر گیا۔"

"بے حال کو اور بے حال کر گیا"، یہ ٹکڑا پڑھ کر دل کی گہرائیوں سے ان کی صحت یابی کے لیے دُعا نکلی تھی، لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ان کی رحلت کی خبر آ گئی۔ افسوس! وقت کا یہ کیسا المیہ ہے کہ نقوش کو "نقشِ دوام" بخشنے والا خود عدم کی گود میں جا سویا۔ خداوند قدوس ان کے مراتب بلند فرمائے۔ کیا اچھے لوگ تھے اور کیسی اچھی گزار گئے! ؎

اللہ! ان پہ بارشِ رحمت ہو دم بدم
ان کے لیے کھلیں ترے رحم و کرم کے باب

محمد طفیل

حفیظ صدیقی

عرصہ ہوا میں نے کسی کو عید کارڈ نہیں بھیجا ــــــ دوسرے بہت سے اسباب میں سے ایک اہم سبب میرا یہ احساس بھی تھا کہ جب لوگوں کی اکثریت منافقت کا شکار رہے تو ایسے ماحول میں عید کارڈ وصول کر کے کیا خوشی ہوتی ہے جو عید کارڈ بھیج کر ہوگی ــــــ میں آئے ہوئے عید کارڈوں کو بے دلی سے رکھ چھوڑا کرتا تھا، اور انھیں وصول کر کے قطعاً کوئی خوشی کا احساس نہ ہوتا تھا ــــــ مگر یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا ــــــ کہ لوگوں نے بھی مجھے عید کارڈ بھیجنے بند کر دیئے ــــــ اب اکا دکا عید کارڈ آتے تھے اور انھیں ضرور دیکھتا تھا کہ ان کے بھیجنے والے زمانے سے مختلف لوگ تھے۔ ــــــ اور ان میں سے بھی جس عید کارڈ کا انتظار رہتا تھا، وہ واحد محمد طفیل صاحب کا ہوتا تھا کہ اس میں رسمی عید کارڈ والی کوئی بات نہ ہوتی تھی ــــــ کوئی جملہ ہوتا تھا جو ان کے دلی جذبات کی ترجمانی بھی کرتا تھا اور اس کے گہرے معانی بھی ہوتے تھے ــــــ اس میں ایک دعوتِ فکر بھی ہوتی تھی اور سوچ کا اچھا خاصا مواد بھی ہوتا تھا ــــــ مجھے اُن کے عید کارڈ سے واقعی مسرت ہوتی۔ مگر اب کے اُن کا عید کارڈ ملا تو میں دل گرفتہ ہو کر رہ گیا ــــــ عبارت کے اندر خداوندِ کریم کا شکر ادا کیا تھا کہ اُس ذاتِ پاک نے دوستوں سے مخاطب ہونے کا ایک موقع فراہم کر دیا ــــــ الفاظ کے اندر سے صدا آ رہی تھی کہ یہ ان کا آخری عید کارڈ ہے ــــــ جانے انھوں نے کیسے یہ الفاظ ادا کیے مگر صاف لگتے تھے کہ ایسے شخص کے الفاظ ہیں جسے علم ہے کہ یہ اس کا آخری عید کارڈ ہے ــــــ میں بہت پریشان ہوا ــــــ انھیں ملا ــــــ وہ ٹھیک ٹھاک تھے مگر کہتے تھے کہ اب میں تھک گیا ہوں ــــــ یوں لگتا ہے جیسے میں نے جو کچھ کرنا تھا، کر لیا ہے ــــــ اور یہ الفاظ ہی ان کے دل کی صدا لگتے تھے اور انھوں نے جس گہری سنجیدگی سے ادا کیے تھے، اتنی گہری خاموشی خاصی دیر تک طاری رہی ــــــ میں مزید اُداس ہو گیا ــــــ اس اداسی کا تاثر میں اب بھی نہیں بھلا سکا ــــــ میرے سامنے ان کا اُداس اُداس سنجیدہ چہرہ ہے جو کہہ رہا ہے کہ میں تھک گیا ہوں۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا ہے ــــــ ــــــ کچھ روز بعد میں اُن سے ملا تو وہ بدستور اُداس اُداس اور تھکے سے تھے معمول سے زیادہ سنجیدہ ــــــ سنجیدگی سے کہنے لگے ــــــ کبھی کبھی ملتے رہا کریں ــــــ زیادہ دنوں کی غیر حاضری بھی اچھی نہیں ــــــ میں اُداس ہو جاتا ہوں ــــــ ان کا انداز معمول سے زیادہ سنجیدہ اور محبت سے لبریز تھا ــــــ میں نے ان سے کہا کہ اپنا تفصیلی انٹرویو دیجئے، میں شائع کر دوں ــــــ اس سے پہلے بھی کہہ چکا تھا ــــــ متعدد بار یاددہانی کرا چکا تھا ــــــ مگر نتیجہ وہی ــــــ ہر بار یہی کہتے "کہ کیا فائدہ ؟" اس میں میری ذات کے حوالے سے باتیں آئیں گی اور ان کاموں کی تفصیل بھی ہوگی جو میں نے ساری عمر کیے ہیں، جب کہ لوگ یہ جان کر خوش نہیں ہوتے ــــــ اب بھی

یہی بات آڑے آئی —— میں نے دوسری خواہش کا اظہار کیا کہ اپنی سوانح عمری ہی لکھ دیجیے، نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگی —— کہنے لگے —— کیا فائدہ؟ —— لوگ میرے کارناموں کی فہرست دیکھ کر خوش نہیں ہوئے، باتیں بنائیں گے۔ —— میں نے کہا —— خوش ہونے والے بھی نہیں، ان کے لیے لکھیے —— اور —— پھر خوش نہ ہونے والے آپ کے ہم عصروں اور ہم عمروں میں سے ہوں گے، جن کے ساتھ آپ کی معاصرانہ چشمک ہوگی، نوجوان نسل کو اس سے کوئی غرض نہیں —— وہ شوق سے پڑھے گی اور رہنمائی اور زندہ رہنے کا حوصلہ حاصل کرے گی —— اُن کے لیے لکھیے —— کہنے لگے کہ —— بات تو ٹھیک ہے پر کیا فائدہ —— میں اپنے کام کے بارے میں لکھوں، تو بے فائدہ ہے —— کام گنواؤں تو لوگ کہیں گے اپنے کارنامے گنواتا ہے اور ان پر اتراتا ہے —— بہرحال وہ قائل نہ ہوئے —— یا —— میں ہی انھیں قائل نہ کر سکا —— ایک ملاقات میں مَیں نے ان سے کسی کام کے سلسلے میں ساتھ چلنے کے لیے کہا جو سراسر جائز تھا مگر فضا ایسی بن چکی ہے کہ جائز کام بھی سفارش چاہتے ہیں —— انھوں نے کہا میں ضرور چلوں گا —— چار دن کے لیے مصروف ہوں —— اسلام آباد سے واپسی پر آپ کے ساتھ چلوں گا —— مگر احتیاطاً فلاں صاحب سے بھی بات کریں —— مجھے ان کا یہ انداز بھی معمول سے مختلف لگا —— اور —— مَیں سوچنے لگا کہ طفیل صاحب نے یہ کیا کہہ دیا ہے —— اُنھوں نے پہلے تو کبھی ایسی بات نہیں کی —— وہ یا تو صاف "ہاں" کہتے ہیں یا صاف "نہ" —— احتیاطاً والی بات کیوں ——،

—— چوتھے روز ہی ملاقات طے تھی —— کہ صبح ہی صبح فون پر اطلاع ملی کہ طفیل صاحب وفات پا گئے ہیں —— اسلام آباد سے میت آئے گی تو شام کو جنازہ ہوگا —— میں ششدر رہ گیا —— الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ —— کئی ماہ سے جو اداسی کی کیفیت طاری تھی اور جو معمول سے ہٹ کر باتیں تھیں، ان کا CLIMAX گیا تھا —— وہ اسی دن پہنچ گئے، جس دن ہماری ملاقات طے تھی مگر ایسے انداز میں کہ سوچا ہی نہ تھا، البتہ احتیاطاً کے معنی سمجھ میں آ گئے —— جانے کیسے یہ الفاظ ان کی زبان سے نکل گئے اور کیسے ان کے عید کارڈ پر ایسے لفظ رقم ہو گئے کہ ان کے آخری وقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے —— ان کے چہرے پر تازگی تھی —— یوں لگتا تھا جیسے اطمینان سے سو رہے ہیں —— بے ساختہ دل میں خیال آیا کہ جیسے وہ بڑے بڑے معرکے مار کر لوگوں کو چونکایا کرتے تھے، انھوں نے مر کر بھی لوگوں کو چونکا دیا ہے —— پھر خیال آیا —— کہ انھوں نے زندگی میں کسی کو تکلیف نہیں دی، مرتے سمے بھی کسی کو تکلیف نہیں دی، چپکے سے چل دیے۔

—— پھر خیال آیا کہ اس شخص کی زندگی بھی مثالی ہے اور موت بھی مثالی —— اور —— پھر اچانک دل میں یہ احساس جاگا کہ اس شخص کا سیرت کے حوالے سے کیا ہوا کام مقبول ہو گیا ہے اور اسی قبولیت کے باعث اس کے چہرے پر طمانیت ہے —— اور —— آخری بار چہرہ دیکھنے والوں کا ہجوم ہے ——،

اب وہ نہیں ہیں تو سوچتا ہوں کہ میں ان سے پہلے کب ملا —— بالکل پہلی ملاقات کا تعین تو مشکل ہے مگر ایسی پہلی ملاقات جس میں کچھ باتیں بھی ہوئی ہوں —— وہ انجمن مدیرانِ جرائد کا ایک اجلاس تھا —— پھر میرے اور ان کے درمیان کچھ غلط فہمی

پیدا ہوئی جس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میری کوتاہی تھی —— میں نے کبھی زندگی میں کسی سے معافی نہیں مانگی، سوائے ربِّ کریم کی ذاتِ پاک کے —— انسانوں کی حد تک میں غلطی کے اعتراف ہی کو معذرت یا معافی کے مترادف سمجھتا ہوں، اس لیے نہ اس سے آگے جاتا ہوں، اور نہ کسی سے توقع کرتا ہوں —— بلکہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو معافی مانگنے والے کے سامنے میں شرمندہ ہو جاتا ہوں اور اسے احساس دلاتا ہوں کہ اعتراف ہی معذرت کا عملی مظاہرہ ہے، بلکہ معافیاں خداوندِ کریم ہی سے مانگنی چاہئیں —— انسانوں میں سے جس نے آپ کو معاف نہیں کرنا اس نے معاف نہیں کرنا —— جس نے کرنا ہے وہ اعتراف کو معافی ہی کے مترادف سمجھے گا —— میں نے غلطی کا اعتراف کر لیا —— ہماری غلط فہمی دُور نہیں ہوئی —— دوستی بھی پکّی ہو گئی —— وہ خاصے انا پرست انسان تھے مگر غلطی کا اعتراف کرنے سے چُوکتے نہیں تھے —— بلا وجہ اپنی بات پر اڑتے نہیں تھے اور حق بجانب ہوں تو دلائل سے قائل ہونے کی طرف میلان بھی ظاہر نہیں کرتے تھے

رائٹرز گلڈ کے انتخابات کے دن تھے —— انتخابات پینل کی صورت میں لڑے جاتے تھے —— ہمارا پہلا تجربہ تھا —— وہ اس میدان کے پُرانے شہسوار تھے —— ہمارا کوئی پینل نہ تھا —— نہ ہی یہ علم تھا کہ پینل کے بغیر الیکشن لڑنا بے معنی ہے —— مجھے ان کا پیغام ملا کہ ملیں —— میں انھیں ملا —— انھوں نے اپنے پینل میں شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا —— مجھے بہت خوشی ہوئی —— یہ پہلی ملاقات تھی جس میں کُھل کر باتیں ہوئیں —— اگرچہ ان کا رکھ رکھاؤ کا مخصوص انداز یہاں بھی ان کے ساتھ ہی تھا مگر اسے برقرار رکھتے ہوئے خاصی کھل کر باتیں ہوئیں اور پھر قریب قریب روز کا ملنا شروع ہو گیا اور مجھے انھیں سمجھنے کے لیے خاصی سہولت میسر آ گئی —— انھی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا —— میں الیکشن مہم کے سلسلے میں راولپنڈی، اسلام آباد جا رہا تھا —— میرے ایک کرم فرما میرے ساتھ تھے —— راستے میں انھوں نے اس انداز میں "انکشاف" کیا کہ میں نے اسے سچ سمجھ لیا —— "انکشاف" یہ تھا کہ میں تو طفیل صاحب کے پینل میں شامل نہیں —— یہ سُن لینے کے بعد اور مسلسل ان کے اصرار کے بعد میں نے الیکشن مہم کا اِرادہ ترک کر دیا اور لاہور واپس آ گیا۔ راولپنڈی کے مختصر قیام کے دوران جن دوستوں سے ملاقات ہوئی، ان سے بھی الیکشن کے موضوع پر بات نہ کی —— میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے یہ بات کس نسبت سے کی مگر میں ایک بار تو طفیل صاحب کی شخصیت کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہو گیا —— میں چند دن تک ان سے نہ ملا —— انھوں نے پیغام بھیج کر بلایا —— اور —— شکایت کی کہ الیکشن قریب آ رہا ہے کہ ملاقاتیں ہوتی رہیں —— میں نے انھیں یہ واقعہ سنایا —— وہ چپ ہو گئے —— کچھ وقت تک خاموش رہے —— بالکل خاموش —— پھر اشاعت کے لیے تیار خط دکھایا جو ڈاک میں سب ارکانِ گلڈ تک جانا تھا —— اس میں پینل کی تفصیل تھی، جو بالکل وہی تھی جو ابتدائی ملاقاتوں میں طے ہوئی تھی —— مجھے اپنی سادگی کے حوالے سے خود پر غصہ آیا اور پھر غلطی کے احساس سے ندامت ہوئی کہ یک طرفہ طور پر الگ ہو جانے کی بجائے مجھے آتے ہی ان سے پوچھ لینا چاہیے تھا —— اس غلطی کے باعث خاصا

وقت ضائع ہوا —— اور —— مجھے نئے سرے سے احباب سے میل ملاپ کا سلسلہ شروع کرنا پڑا جو میں بند کر چکا تھا —— تاہم اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ طفیل صاحب بات کے پکے ہیں —— اور —— بقول سلیم کاشر

جو بول زبانوں نکل گیا
وہ تیر کمانوں نکل گیا،

اور —— پھر میں نے ہمیشہ انھیں اسی معیار پر پورا اُترتے دیکھا —— جو کہہ دیا —— وہ اٹل —— جس معاملے میں "ہاں" کہہ دی وہ مستقل "ہاں" اور —— جہاں نہ کہہ دی وہاں مستقل "نہ" —— جو کسی کے لیے کرنا چاہتے ہیں وہ کر گزرتے، جو نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے، اُس کے لیے صاف جواب —— کوئی ناراض ہو یا خوش —— اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے —— وہ برائے مصلحت لارا لپا لانے کے قائل ہرگز نہیں تھے ——،

ایک بار مجھے "تحریریں" کے سلسلے میں نہایت اہم کام تھا اور فوری نوعیت کا —— اگر اپنی عام رفتار سے ہوتا تو مہینے لیتے —— کام جائز تھا، ہونا ضرور —— مگر دیر لگتی —— میں فوری طور پر چاہتا تھا کہ ہو جائے کہ اس کے بھی کچھ اسباب تھے جن کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا —— میں نے بات کی —— کہنے لگے —— کب چلیں —— میں نے کہا کہ میں تو فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرانا چاہتا ہوں —— خاموش رہے —— چائے پی —— اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی —— اچانک اپنے ہی آدمی کو بُلایا کہ تانگہ منگاؤ —— تانگہ آ گیا —— کہنے لگے —— چلیں، ابھی چلیں —— اسی وقت ساتھ گئے —— کام کرا کے واپس آئے —— میں جانتا ہوں کہ کام کا جلد ہونا اور بات ہے، اتنا فوری طور پر ہونا ممکن ہی نہ تھا، یہ صرف اُن کی شخصیت کا احترام تھا کہ جہاں گئے وہاں اُن کی بات کو احترام سے سُنا گیا اور فوری طور پر اُس کے لیے جو کچھ درکار تھا، کر دیا گیا —— میں نے شکریہ ادا کرنا چاہا تو فقرہ میری زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھے —— "نہیں یار یہ کوئی کام ہے؟" وہ دوسروں کے کام آتے تھے، خاموشی سے، تحمل سے —— اور پھر کبھی احسان نہیں جتلاتے تھے —— اور —— خود بھی یہی پسند کرتے تھے کہ اگر کوئی دوست ان کے کسی کام آئے تو جتلائے نہیں، اس سے بہت چڑتے تھے —— یہ الگ بات ہے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور اپنے رویے سے واضح کرتے تھے کہ انھیں دوسرے کے تعاون کا دل سے احساس اور اس کی سچی قدر ہے ——

جب گلڈ کے سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہونے لگا —— تو —— مسئلہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے ارکان سے ملنے کون جائے —— طفیل صاحب اُمیدوار تھے —— بلکہ —— اُنھیں اُمیدوار بنایا گیا تھا —— ان کا سارا ہی پینل متفقہ طور پر انھیں سیکرٹری جنرل دیکھنا چاہتا تھا —— یہ کام میں نے اپنے ذمے لیا —— اور —— جب ذمے لے لیا تو بے ساختہ ان سے اجازت چاہی —— اور —— سرحد کے لیے چل دیا —— جب واپس آیا اور وہاں سے حاصل ہونے والے تعاون کی تفاصیل بتائیں تو خوش بھی ہوئے اور حیران بھی —— حیران اس بات پر کہ ان سے خرچ کے حوالے سے اور سفر اور قیام کی کسی بھی سہولت کا ذکر کیے بغیر میں بے ساختہ ایک مہم پر چل نکلا۔ جس میں وقت بھی لگے اور پیسہ بھی،

ان کے لیے عجیب تھا —— مگر میرے مزاج کے عین مطابق جس کا انھیں پورا ادراک اس سے پہلے نہیں تھا —— میرا معاملہ "حساب دوستاں در دل" والا رہا ہے اور میرے دوستوں کا (جو تھوڑے ہیں) کا معاملہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی رہا ہے اور حساب کا یہ معاملہ میرے اور طفیل صاحب کے درمیان یونہی چلتا رہا۔ اور اس نے ہمارے تعلقات کو مستحکم کیا —— اور —— یقیناً اس رویے سے انسانی تعلقات مستحکم ہوتے ہی ہیں —— زیادہ حساب کتاب کرنے والوں کی دوستی پختہ نہیں ہو پاتی اس میں کسر رہ جاتی ہے جس کے ڈانڈے خود غرضی سے جا ملتے ہیں۔

گلڈ کے سیکرٹری جنرل کے انتخابات کراچی میں ہونے تھے —— ہم ہوٹل میں مقیم تھے —— ہمارے کمروں میں گہری خاموشی تھی، جب کہ دوسرے کمروں سے اونچی اونچی آوازیں سنائی دیتی تھیں، قہقہے، لطیفے اور پتا نہیں کیا کیا باتیں —— مگر —— ایک ہنگا کا سا منظر تھا —— انتخابات ہوئے —— طفیل صاحب منتخب ہو گئے —— اب بھی ہمارے کمرے کا عالم وہی تھا —— وہی خاموشی —— وہی گہری سنجیدگی —— بالکل طفیل صاحب کے مزاج کی سی —— یوں لگتا تھا کہ ہم لوگ ہارے ہوئے ہیں —— جیتنے والے تو شور مچاتے ہیں —— خوشی سے قہقہے لگاتے ہیں —— مگر —— یہاں تو چپ تھی، گہری چپ —— جو حوصلہ مند لوگوں کا خاصا ہوتی ہے —— کہ خوشی کے موقع پر بھی آپے سے باہر نہ ہوں اور غم کے موقعہ پر بھی حوصلہ ہار کر نہ بیٹھ جائیں —— طفیل صاحب نے جس تحمل سے اور جس عاجزی سے اس جیت کو قبول کیا تھا یہ اسی کا پرتو تھا کہ ان کے سارے ساتھیوں نے بھی کوئی خوشی کا عامیانہ مظاہرہ نہ کیا —— اور —— خوشی اور غم کو قبول کرنے کا یہ رویہ طفیل صاحب نے زندگی بھر اپنائے رکھا —— انھوں نے بڑے بڑے کارنامے کیے —— بڑے بڑے نمبر شائع کیے —— بڑی بڑی کتابیں شائع کیں —— بڑی بڑی کتابیں لکھیں —— بڑے بڑے معرکے سر کیے —— مگر —— کبھی غیر معمولی خوشی کا مظاہرہ نہیں کیا —— کبھی کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں کیا —— کبھی کوئی بڑ نہیں ہانکی ——،

ان کے کام کے انداز ایسے تھے کہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں —— اچانک بڑا سا نمبر شائع ہوتا —— چہرے پر وہی عجز ہوتا، اور اس نمبر کے حوالے سے تعریفی کلمہ کہا جاتا (جو اس کی قدر و قیمت کا کسی طور احاطہ نہ کر پاتا) تو بات کو آگے نہ چلاتے اور یہ کہہ کر بات کو ختم کر دیتے کہ —— یار، سوچا تھا اس موضوع پر بھی کچھ کام ہو جاتے —— وہ اس طرح سے یہ سادا سا جملہ ادا کر دیتے جیسے جتنا بڑا کام ہوتا ہے، وہ ان کے نزدیک صرف "کچھ" کی حیثیت رکھتا ہے —— اسی عجز اور اسی تحمل نے ان سے سارے کارہائے نمایاں انجام دلائے —— ورنہ اگر وہ روائتی انداز میں خوش ہونے والے اور اپنے کام سے مطمئن ہو کر اترانے والے ہوتے تو ایسے کارنامے یقیناً ان سے سرزد نہ ہوتے ——،

وہ بڑے وسیع تعلقات والے انسان تھے —— ہر حلقے کے لوگ، ہر مکتبہ فکر کے لوگ، ان کے ملنے والے تھے۔ وہ دوست نہ تو ہر کسی کو کہتے تھے اور نہ ہی سمجھتے تھے مگر ان کا رویہ ہر ایک کے ساتھ یکساں خوش اخلاقی کا ہوتا تھا ——

اسی عیاں خوش اخلاقی نے جس میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ غالب ہوتے تھے، ان کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پیدا کیں —— لوگ کہتے —— وہ کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں —— وہ دفتر میں موجود لوگوں کا ایک دوسرے سے تعارف نہیں کراتے، —— وہ کسی کے لیے خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتے —— بس ایک ہی کیفیت، ہر لمحہ، ہر اک کے لیے —— میرا تاثر اس ساری صورتِ حال میں یہ ہوتا تھا کہ وہ کھل کر قہقہے لگانے والے اور گپ بازی کرنے والے انسان ہی نہیں، آپے سے باہر ہونے والے ہیں ہی نہیں، تو ان سے زیادہ گرمجوشی کے ظاہری مظاہرہ کی توقع ہی عبث ہے —— وہ ٹھنڈے لگتے تھے اور لوگ کہتے بھی تھے کہ بہت ٹھنڈے آدمی ہیں —— مگر —— صرف اُوپر سے —— اندر سے ٹھنڈے آدمی نہیں تھے —— اندر کا جذبہ گہرا تھا اور اس کے اندر ہی ساری گرم جوشی نہاں تھی جس کا پتا اس وقت چلتا تھا جب کوئی دوست کسی مشکل میں پھنسا ہوا ہو ——،

بدقسمتی سے میں غلط فہمیوں کے باعث کئی مقدمات میں اُلجھ گیا۔ مجھے نہ تو دفاع میں دلچسپی تھی، نہ ہی فیصلوں میں کوئی دلچسپی تھی، جو ہونا ہے ہو جائے —— مگر —— یہ خواہش ضرور تھی کہ چونکہ میں حق پر ہوں، میرا موقف صحیح ہے، اس کی صداقت ریکارڈ پر آنی چاہیے۔ طفیل صاحب سے بات ہوئی تفصیل سے نہیں صرف اشاروں میں، مبہم اشاروں میں —— مبہم اشاروں میں کہی ہوئی بات کا جواب واضح لفظوں میں تھا —— صداقت صداقت ہی ہوتی ہے، چاہے فیصلہ صداقت کے برعکس ہو —— اس سلسلے میں سب سے پہلے میں صداقت کی شہادت دوں گا —— جس طرح کا ماحول عدالتوں میں ہوتا ہے کہ جس طرح سارا سارا دن وہاں برباد ہوتا ہے جس طرح شہادت دینے والوں کے ساتھ سلوک روا رکھا جاتا ہے ایسے میں اُن کی طرف سے برملا پیشکش بظاہر عجیب تھی مگر میں اُن کے مزاج سے واقف تھا، ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی —— ان کی وجہ سے اور بھی کئی اہم شخصیتوں نے عدالت میں میری صداقت کی شہادت دی —— اور —— اسی کا نتیجہ تھا کہ مقدمات کے فیصلوں کی نوبت ہی نہ آئی —— مصالحت ہو گئی —— میں سمجھتا ہوں مصالحت کے لیے فضا ہموار ہی نہ ہوتی، اگر ان جیسی شخصیت صداقت کی شہادت کے لیے موجود نہ ہوتی —— انہی ایام میں عدالت کی طرف سے باہمی مذاکرات کے لیے موقع دیا گیا جس کے لیے ہمیں باہر کہیں ملنا تھا اور کچھ طے کرنا تھا —— میں بے اعتمادی کی فضا کے باعث خوفزدہ تھا کہ ہمارے ہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے، میں تنہا کیسے ان لوگوں کے پاس جاؤں —— یہ طفیل صاحب تھے جنھوں نے کہا تھا —— کہ تنہا کیوں، پہلے میں جاؤں گا پھر آپ جائیں گے —— اور اس موقع پر ان کی موجودگی کے باعث کوئی ناگوار صورتِ حال پیدا نہ ہوئی —— جو بالآخر مصالحت پر منتج ہوئی، اب ایسا دردِ دل رکھنے والا شخص ظاہری گرم جوشی کا مظاہرہ بھی نہ کرے تو کیا فرق پڑتا ہے، ظاہری گرم جوشی کے مظاہر تو روز ہوتے ہیں، ہر جگہ، ہر مجلس میں —— مگر —— ان ظاہری گرم جوش لوگوں میں مخلص کتنے ہیں —— پتا بعد میں چلتا ہے اور سخت تکلیف کا باعث بنتا ہے —— آدمی ظاہری گرم جوشی سے دامِ فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور منافقوں کی زد میں آ جاتا ہے ——،

جہاں تک ایک دوسرے کا تعارف نہ کرانے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو شاید بہتر ہوتا مگر یہ بھی نہیں

کہا جا سکتا کہ انھوں نے کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا ہوگا —— مجلس میں موجود سب لوگوں کے ساتھ ایک سا سلوک —— ایک جیسی سنجیدگی آمیز عجز سب کے لیے —— ایک جیسا رویہ ہر ایک کے لیے ——،

گرم جوش وہ اپنے ملازموں کے حوالے سے بھی نہیں تھے —— ہر ایک کے ساتھ چپ کا رویّہ —— کم گوئی کا انداز مگر —— میں دیکھتا کہ ایک کارکن آتا ہے، اشارتاً کوئی بات کہتا ہے اور طفیل صاحب چپکے سے اُسے کچھ رقم دے دیتے —— ان کے کارکن بھی ان کے کنبے کے افراد کی طرح تھے —— ان کے ہر مشکل مرحلے کو سر کرنا طفیل نے اپنے ذمے لے رکھا تھا —— ہر ایک کی اعانت کرنا انھوں نے اپنی ذمہ داری بنا رکھی تھی —— یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کارکن آتے بہت، جاتے نہیں تھے، جو آگیا سو آگیا —— اور اگر کوئی گیا بھی تو واپس آیا یا واپس آنے کی حسرت دل میں پالتا رہا ——،

وہ اپنے کسی بھی کام کے حوالے سے پیشگی بات نہیں کرتے تھے (بات تو وہ بعد میں بھی نہیں کرتے تھے کہ وہ تفاخر کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے) —— مگر صرف ایک دفعہ اُنھوں نے اظہار کیا کہ —— یارب اب ایک نمبر حضورؐ کے حوالے سے بھی ہو جائے رسولؐ نمبر —— اور پھر بس —— ان کا "اور پھر بس" کہنا اور اس کے بعد سنجیدہ ہو کر خلا میں گھورنا بتاتا تھا کہ وہ اس نمبر کے حوالے سے کتنے آرزومند ہیں —— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے عقیدت مند ہیں، —— اور ادب کی خدمت کے بعد رسولؐ نمبر کو اپنی زندگی کا آخری نمبر سمجھتے ہیں۔ جانے کیسے انھوں نے "اور بس کہہ دیا —— (اور یہ بات انھوں نے اور بھی کئی احباب سے کی) —— کہ رسولؐ نمبر کے بعد ان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش کے واضح پرتو نظر نہیں آتے تھے —— سنجیدگی، متانت اور خاموشی اور بھی گہری ہو گئی تھی —— اور —— اپنی کم گوئی کے باوجود بعض جملے ایسے کہہ جاتے تھے جیسے یہ شخص اب اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکا ہے ——،

اور واقعی انھوں نے محنت، ذہانت اور خلوص اور لگن کے ساتھ اپنا مشن پورا کر لیا تھا اور جس طرح چپکے سے ایک خاص نمبر داغ کر سب کو حیرت میں مبتلا کر دیتے تھے داعیٔ اجل کو اسی انداز سے لبیک کہہ کر سب کو حیران کر گئے۔ ان کا جینا بھی مثالی رہا تو مرنا بھی مثالی۔ خدا ان جیسا جینا اور ان جیسا مرنا سب کو نصیب کرے کہ انسان جیئے تو زندگی کا حق ادا کرے اور مرے تو چپکے سے خداوندکریم کے بلاوے پر چل دے —— نہ جینے کی شکایت نہ مرنے کا خوف ——

ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

خداوندکریم انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آنے والی نسلوں کو ان کی زندگی اور کارہائے نمایاں سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق دے۔

○○

طفیل صاحب — کچھ یادیں

نور الحسن جعفری

طفیل صاحب سے پہلے میری ملاقات ان کے خطوط سے ہوئی۔

اپنی بیوی سے میرا تعارف اس کی شاعری کے ذریعہ سے ہوا تھا۔ اس نے اپنی پہلی کتاب کا مسودہ شادی سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ۱۹۵۰ء میں پاکستان میں آئی۔ پاکستان آنے کے بعد اس نے شاعری تقریباً ترک کر دی تھی۔ اس معاملہ میں میرا تقاضا بھی ناگوار گزرا اور میں نے اس کی شاعری کی بات کرنا چھوڑ دیا۔

اس کے پاس رسالوں کے مدیروں کے فرمائشی خطوط آتے رہے اور پاکستان کے ادبی پرچے بھی اعزازی طور پر ملتے رہے لیکن وہ خطوط کے جواب کبھی نہیں دیتی۔ ہاں اگر اتفاقاً کوئی تازہ غزل یا نظم ہوتی تو بہت مختصر جواب کے ساتھ یہ اپنی یہ چیز کسی مدیر کو بھیج دیتی۔ جب اس نے شاعری ترک کر دی اور خطوں کا جواب بھی نہیں دیا تو رفتہ رفتہ رسالے آنا بند ہو گئے اور مدیروں نے بھی صبر کر لیا اور فرمائش کرنا چھوڑ دیا۔ صرف طفیل صاحب کے فرمائشی خطوط آتے رہے اور ان کا رسالہ بھی باقاعدگی سے ملتا رہا۔

میں دفتری مزاج کا آدمی ہوں اور خط کا جواب نہ دیا جائے تو مجھے الجھن ہوتی ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جواب نہ دے کر مکتوب الیہ نے میری توہین کی، میں نے ادا سے کئی بار کہا کہ کم از کم طفیل صاحب کو ایک شکریے کا خط لکھ دو کہ رسالہ مل رہا ہے۔ میں نے شاعری ترک کر دی ہے اور آپ برائے مہربانی خط لکھنے کی زحمت نہ کیا کریں لیکن خط لکھنے پر وہ قطعی رضامند نہیں ہوئی۔ تخلیقی ادب والے لوگ اپنے کو عام انسانوں سے کچھ الگ سمجھتے ہیں۔ سماجی پابندیوں کا انہیں کوئی خاص پاس نہیں ہوتا اور ایک عام آدمی کی طرح وعدے کے پاس اور وقت کی پابندی وغیرہ سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ بس یہ حساس لوگ ہوتے ہیں اپنی انا کے گنبد میں مقید۔ میں نے سوچا کہ طفیل صاحب بھی اور مدیروں سے کچھ الگ چیز ہیں۔ وضعداری سے رسالہ بھیجتے ہیں اور ادا کی خاموشی کے باوجود خط لکھنے سے بھی باز نہیں آتے کچھ دھن کے پکے آدمی ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی طرف سے انہیں شکریے کا خط لکھ دوں کیونکہ آخر رسالہ تو میں بھی پڑھتا تھا اور ادا کی طرف سے خط کے جواب نہ دینے کی معذرت کر دوں کہ فی الحال شاعری ترک کر دی ہے اور اگر کبھی کوئی چیز ہو گی تو انہی کو بھیجی جائے گی اتنا حق مجھے حاصل ہے۔ یہ طفیل صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔

ہم لوگ ۱۹۵۱ء کے آخر میں راولپنڈی سے تبادلہ ہو کر لاہور آ گئے اور چھاؤنی میں رہنے لگے۔ ادبی ملاقاتیں

نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اگر کوئی عام مشاعرہ ہوا تو ہم لوگ چلے جاتے تھے لیکن عموماً ادبی محفلوں میں حاضری سے گریز کرتے تھے کیونکہ ادا مشاعروں میں تو پڑھتی ہی نہیں تھی اس کو سنانے کا شوق کبھی نہیں رہا اس لیے ان محفلوں میں جانا کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا تھا۔ لوگ اگر پہچان لیتے تو فرمائش کرتے۔ کوئی تازہ چیز اس کے پاس ہوتی نہیں تھی اور اصرار اور انکار سے بدمزگی کا اندیشہ تھا اور عافیت اسی میں معلوم ہوتی کہ اپنے گھر بیٹھا جائے اور ادبی ملاقاتوں سے اجتناب کیا جائے۔

ایک شام نوکر نے آ کر کہا کہ کوئی طفیل صاحب آئے ہیں۔ اس نام کا ہمارا کوئی اور دوست نہیں تھا اور ہم دونوں سمجھ گئے کہ یہ مدیر نقوش تشریف لاتے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا :

"جی، مجھے طفیل کہتے ہیں۔"

جب تک ادا آئے میں ان کے رسالے کی تعریف کرتا رہا اور وہ قطعی چُپ بیٹھے رہے۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صرف یہ معلوم ہوتا کہ وہ میری بات سُن رہے ہیں۔ بس بیچ بیچ میں 'جی مہربانی'، 'جی عنایت' کے علاوہ کچھ نہیں بولے۔ گرمی کا زمانہ تھا اور غالباً وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھے۔ معمولی چہرہ مُہرہ جس سے جذبات کچھ زیادہ عیاں نہیں ہوتے تھے ہاتھ بھی کسی گرم جوشی سے نہیں ملایا۔ ادا کے آنے کے بعد بھی گفتگو کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ بس انہوں نے یہ کہا،

"جی آپ لکھیں نا!"

لہجے میں خجالت، انکسار اور لکھنے کے لیے اصرار۔ گویا بغیر ادا کی تخلیق کے نقوش کچھ مکمل معلوم نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے ان کو شرمندگی ہوتی ہے! اصرار کا یہ انداز انوکھا تھا۔ مجموعی تاثر بہت اخلاص کا دیا لیکن کچھ کچھ کاروباری۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھے لیکن اس تمام وقت میں وہ مشکل سے پانچ منٹ بولے ہوں گے اور ان کا کوئی جملہ دس پندرہ الفاظ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ چلتے وقت انہوں نے ہم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

ان کے جانے کے بعد ہم میاں بیوی دیر تک ان کی بابت گفتگو کرتے رہے کہ اتنا کم گو آدمی کسی رسالے کا مدیر کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کی ذات میں کچھ تضاد بھی نظر آتے۔ وضعداری اور خلوص لیکن گرمجوشی کا فقدان، گفتگو میں ایک ٹھہراؤ۔ ہم چار سال لاہور میں رہے اور طفیل صاحب سے کچھ سماجی تعلقات قائم ہو گئے۔ سال میں ایک دو بار ان کے یہاں ہم لوگ کھانے پر مدعو ہوئے۔ بھابی سے ملاقات ہوئی، سادہ اور ہنس مکھ۔ وہ طفیل صاحب کے مقابلہ میں ہم لوگوں سے زیادہ بے تکلف ہو گئیں۔ وہ طفیل صاحب کے ادبی مقام سے قطعی واقف نہیں معلوم ہوتی تھیں، وہ ان کے شوہر تھے اور ان کے بچوں کے باپ، روزی کے لیے کچھ پریس وغیرہ کا کاروبار۔ ان کے کھانوں پر ادیب وغیرہ ضرور ہوتے تھے لیکن گفتگو عموماً گھریلو ہوتی تھی۔

اول تو طفیل صاحب کم گو پھر وہ مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگے ہوتے۔ اس وقت وہ ادب اور اس کے معیار اور رسالوں کی مشکلات کے سلسلے میں قطعی گفتگو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کبھی یہ موضوع زیر بحث آیا بھی

تو وہ وہاں 'ہوں' سے آگے نہیں بڑھے۔ ان ملاقاتوں میں مجھ کو طفیل صاحب کے انکسار نے متاثر کیا۔ رسالوں کے مدیر تو عام آدمیوں کی سطح سے کچھ بلند ہی ہوتے ہیں لیکن نقوش کا مدیر اور مالک تو کچھ اتنا سمٹا سمٹا یا گردن جھکائے اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ کسی پیر کی گدّی پر قابض ہو گیا ہے جس کے لیے وہ معافی چاہتا ہے بس وُہ صرف آپ کو یہ یقین دلائے جا رہا ہے کہ وُہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے اور آپ تھوڑا صبر کریں اور اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کریں وہ آپ کے معیار پر پُورا اُترے گا، وُہ اپنی ساکھ کا اعتبار قائم کرنا چاہتے لیکن ذرا جذبات سے عاری لہجے کا مظاہرہ کرتے۔

طفیل صاحب کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ ان سے بے تکلف ہونے کی کوئی سبیل کم از کم مجھے نہیں دکھائی دیتی۔ میں خود بھی کم آمیز ہوں لیکن اگر کوئی مجھے پسند آجائے تو پھر میں اس سے بہت جلدی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہوں لیکن یہاں مجھے کامیابی کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے تھے۔ خلیق، متواضع، مکمل بردباری اور تحمل کا نمونہ، لیکن وہ تو کھل کر اونچی آواز سے ہنستے بھی نہیں تھے۔ جُھکی ہُوئی گردن، ہلکی سی مسکراہٹ، شاذ و نادر دھیمی دھیمی آواز میں ہنسی۔ ہمارا لاہور سے کراچی تبادلہ ہو گیا۔ طفیل صاحب سے خلوص تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن ابھی ہم بے تکلفی یا دوستی کی منزل سے بہت دُور تھے۔ تین سال ہم کراچی رہے اور پھر ۱۹۵۸ء کے آخر میں راولپنڈی چلے گئے۔ اس عرصے میں طفیل صاحب سے ملاقات نہیں ہُوئی۔ ان کے سال میں ایک دو خط اداؔ کے نام آئے جن کا وُہ حسبِ عادت جواب نہ دیتی۔ رسالہ ملتا رہا جس کو ہم دونوں بڑے شوق سے پڑھتے۔

۱۹۶۱ء میں ہم پھر لاہور پہنچ گئے اور ۱۹۶۵ء تک مقیم رہے۔ میری ترقی بھی ہو گئی تھی اور ہم گلبرگ میں تھے ایک بڑا آرام دہ مکان مل گیا تھا جس کے باغ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دفتر والوں کی تھی اور یہ خاصا خوب صورت تھا۔ طفیل صاحب کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ انہوں نے باغ میں بہت دلچسپی ظاہر کی اور ایک بار ان کے لہجہ میں کچھ جذبات کی جھلک دکھائی دی۔

روابط بس ایک سطح پر آکر ٹھہر گئے تھے۔ ایک دو ماہ میں فون پر رابطہ، سال میں دو تین بار ان کے گھر پر دعوت، ایک دو بار کھانے پر سال میں وہ ہمارے یہاں آتے۔ چونکہ اداؔ کے نہ لکھنے کی مجبوری حائل تھی اس لیے ہمارے گھر پر طفیل صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ طفیل صاحب کے یہاں ضرور پاکستان اور بیرون پاکستان کے ادیبوں سے ملاقات ہوتی۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں طفیل صاحب کی ایک اور خصوصیت معلوم ہوئی۔ بات تو کم کرتے تھے لیکن اگر کسی معاملہ میں کوئی نظریہ قائم کر لیں تو پھر اس پر کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو اس پر سے ہٹا سکے۔ تھوڑی سی بحث بھی کر لیتے لیکن نپے تلے الفاظ میں جذبات سے عاری، لیکن ان جذبات سے عاری چہرے کی پشت پر ایک یقین محکم رکھنے والا دل تھا۔ یہ بات تو اب دنیا کو معلوم ہو چکی ہے کہ محمد طفیل ارادے کے بہت پکے تھے اور کام کے علاوہ انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ سماجی ملاقاتوں کے وہ قطعی رسیا نہیں تھے لیکن اس سے بیزار

بھی نہیں تھے۔ دعوتیں کرتے بھی تھے اور شریک بھی ہوتے لیکن اس کی لت نہیں تھی۔ میں نے ان کی دعوتوں میں کبھی پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہیں دیکھے تاکہ مہمان اطمینان سے گفتگو کر سکیں اور وہ فرداً فرداً ہر مہمان کی خاطر کر سکیں اور ہر ایک کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ سکیں۔ لوگوں کے کھانوں کی پسند ناپسند ان کو یاد رہتیں۔ ان کو یہ یاد تھا کہ میں تلی ہوئی چیزیں اور تیز مرچ نہیں کھاتا اگر پوریاں ہیں تو میرے لیے الگ روٹی ہوتی اور ان ڈشوں کی نشان دہی کر دیتے جن میں مرچ کم ہوتی۔ یہ معمولی معمولی باتیں ہیں جن سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فطرت میں مروت اور محبت کا کتنا غائر جذبہ تھا۔

جب ہم نے ۱۹۶۵ء میں لاہور چھوڑا تو معلوم ہوا کہ ہم طفیل صاحب سے کچھ زیادہ قریب آ چکے ہیں لیکن ابھی تک بے تکلفی والا درجہ حاصل نہیں تھا ایک خاص فاصلہ ایک رکھ رکھاؤ موجود تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہم لوگ اسلام آباد آ گئے اب ادا نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔

ہم لوگ تقریباً گیارہ سال اسلام آباد میں رہے۔ طفیل صاحب اسلام آباد آتے رہتے، اختر جمال کے یہاں ٹھہرتے اور ان کے ساتھ ہمارے یہاں آتے۔ اب ملاقاتیں نسبتاً طویل ہوتیں۔ کھانے کی باقاعدہ دعوت تو نہیں ہوتی لیکن ان کے دورانِ قیام ایک آدھ وقت تو کھانا ضرور ہوتا۔ اب چونکہ ادا نے لکھنا شروع کر دیا تھا تو کچھ ادب اور شاعری کی بات بھی ہو جاتی۔ ایک دن کچھ موڈ میں تھے تو کہنے لگے کہ معیار کی بات تو یہ ہے کہ جس کی تحریر نقوش میں شائع ہو جائے وہ مستند ادیب اور شاعر مانا جاتا ہے۔

ایک دو بار یہ بھی ہوا کہ وہ 'سلسلہ' کی محفل میں شریک ہوئے۔ افسانہ یا غزل بہت غور سے سنتے لیکن میں نے انھیں کبھی بھی واہ وا کرتے نہیں سنا۔ وہ قطعی خاموش رہتے یہاں تک کہ گردن کو جنبش بھی نہیں دیتے۔ داد کے سلسلے میں وہ اپنی مدیر ہونے کی حیثیت کو غالباً نہیں بھولتے۔ مضمون یا شعری تخلیق کو پرکھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی طبیعت کی احتیاط کا ایک مظاہرہ تھا لیکن وہ محفل میں بہت شوق سے شریک ہوتے۔

محفلوں میں حسبِ عادت وہ بہت کم بولتے، ہاں جب صرف اختر بہن اور احسن علی خاں کے ساتھ ان کو ملا کر صرف پانچ آدمیوں کی محفل ہوتی تو وہ نسبتاً زیادہ بولتے اور کچھ بے تکلفی کا مظاہرہ بھی ہوتا اور میں نے ان کو قہقہہ لگاتے بھی سنا۔

طفیل صاحب جو اپنی ذات کے معاملہ میں اتنے محتاط تھے کپڑوں کے معاملہ میں قطعی بے نیاز تھے۔ جو آدمی رسالہ کی طباعت کا اتنا بلند معیار قائم کر سکتا تھا اس کا مذاق یقیناً نہایت نفیس ہوگا لیکن کپڑے وہ قطعی معمولی پہنتے تھے۔ گرمیوں میں ایک ڈھیلا ڈھالا بُش شرٹ اور تقریباً بغیر کریز کے پتلون۔ جاڑوں میں سوٹ لیکن نہایت معمولی نکٹائی ضرور باندھتے تھے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ اس کا رنگ سوٹ سے میچ کر رہا ہو۔ بے ہنگم ناٹ۔ ان کی ذاتی سج دھج خوش پوشی کی ضد تھی۔ کپڑوں کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی بس طفیل صاحب اپنی ذات کو اپنے

یک محدود رکھنا چاہتے تھے وہ عام نہیں ہو سکتی تھی۔ اب ہماری ملاقات کو بیس پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں میری بیٹی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے وہ خاص طور سے اسلام آباد آئے اور ہمیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہ بہت اپنائیت اور خلوص کا مظاہرہ تھا۔ اس کے باوجود ان کے رکھ رکھاؤ کا ایک خاص طریقہ ہمیشہ کی طرح قائم رہا۔ یہ حفظِ مراتب کا معاملہ نہیں تھا۔ ۱۹۷۶ء میں ہم ایک بار پھر لاہور تبادلہ پر آ گئے اور میں مال روڈ پر اسٹاف کالج میں متعین تھا۔ اس زمانہ میں طفیل صاحب اپنا نیا مکان بنا رہے تھے اور اپنے مکان کی نگرانی کے لیے آتے جاتے، ہمارے یہاں بھی آ جاتے اور کچھ دیر گپ شپ رہتی اب وہ ملنے میں زیادہ بے تکلف ہو گئے تھے۔ اسٹاف کالج کا باغ بہت اچھا ہے اور انہوں نے پودوں کی فرمائش کی۔ یہ میرے لیے ایک قطعی انوکھا تجربہ تھا۔ طفیل صاحب سے ملاقات کے دوران میں بہت ساری اہم جگہوں پر تعینات رہا اور ادا کے واسطے سے بہت سارے احباب نے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے کہا۔ ہمارے معاشرے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن طفیل صاحب نے مجھ کسی کام کے لیے نہیں کہا نہ اپنے نہ دوسرے کے لیے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس لوگ یقیناً سفارش کرنے آ ہوں گے لیکن کسی اور کے لیے بھی درخواست کرنا ان کے مسلک میں نہیں تھا۔ انہوں نے سب کچھ اپنی محنت اور لگن سے حاصل کیا تھا پھر کسی کے لیے یا اپنے لیے وہ دستِ سوال کیوں دراز کریں۔ پودوں کی اور بات تھی یہ ان کے باغ میں بڑے ہوں گے، تناور درخت بنیں گے اور ہماری دوستی کی یاد دلائیں گے۔ ہم دونوں نے بہت خوشی اور فخر کے ساتھ ان کی فرمائش پوری کی۔ اس ضمن میں ایک دو بار بھابی بھی ساتھ تھیں۔ ان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ بچ اور شوہر، اور اب اپنا مکان۔ وہ ان دنوں بہت مسرور اور مطمئن دکھائی دیتیں۔ طفیل صاحب بھی اب ن زیادہ آسودہ طبیعت دکھائی دیتے، کام میں مصروفیت تو الگ چیز ہے۔

۱۹۷۶ء کے ستمبر میں ادا ایک ضرورت سے امریکہ گئی اور میں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اکیلا رہ گیا اس کو بہت سخت یرقان ہو گیا اور میں پریشان تھا۔ ایک دن طفیل صاحب آئے اور مجھ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے عامر کا حال بتایا انہوں نے بہت تسلی دی کہ یرقان کوئی خطرناک بیماری نہیں ہ صرف آرام کی ضرورت ہے اور میں ادا کو ہرگز مطلع نہ کروں۔ اس کے بعد وہ تقریباً آٹھ دس دن متواتر خیر دریافت کرنے آئے ایک دو گھنٹے میرا دل بہلانے کے لیے مستقل گفتگو کرتے۔ میرے ہاں ہوں سے مطمئن نہیں ہ اور حتی الامکان یہ کوشش کرتے کہ میں بھی گفتگو کروں۔ اب معلوم ہوا کہ طفیل صاحب خوب باتیں کر سکتے ہیں لی جب اس کی ضرورت محسوس کریں۔ میری پریشانی کے علاج کے لیے وہ بہت ساری باتیں کرتے عام سطح کی گفتگو ان کے لیے ضروری بن گئی۔

مئی ۱۹۸۶ء میں ادا بچوں سے ملنے واشنگٹن جانے کے لیے تیاری کرنے لگیں اور انہوں نے طفیل کو خط لکھ کر پروگرام سے مطلع کیا۔ اس مرتبہ ان کا طویل خط آیا کہ آپ ہی تو میری بہن ہیں دیکھیے عید پر مجھے ضرو

رکھے گا اور بچوں کو بہت ساری دعائیں لکھیں۔ ادا نے جاتے وقت مجھ سے تاکید کی کہ طفیل صاحب کو عید کارڈ ضرور بھیجیں۔ میں نے ایک خط بھی لکھا اور عید کارڈ بھی بھیجا۔ یہ ان کے نام میرا آخری خط تھا۔

میں تین جون کو لندن کے لیے روانہ ہوا اور یکم جولائی کو واشنگٹن پہنچا۔ میرے داماد کے دفتر میں ڈان آتا ہے لیکن تاریخ کا تعین نہیں ہوتا۔ چار پانچ دن کے اخبار ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایک دن دوپہر میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ طفیل صاحب کے اسلام آباد میں انتقال کی خبر اور تفصیل پڑھی۔ میں نے اس خبر کو تین چار بار پڑھا کیونکہ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بہرحال ایک حقیقت تھی۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں ادا کو یہ خبر سنائی اس نے تفصیل پوچھی میں نے اخبار پڑھا دیا۔ کچھ دنوں بعد 'نوائے وقت' اور 'جنگ' کے ادبی ایڈیشنوں میں تعزیتی جلسوں کا حال پڑھا۔ حقیقتوں سے فرار ممکن نہیں لیکن دل چاہتا تھا کہ یہ سب خواب ہو اور جب آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ ہم تو صرف پریشان خواب دیکھ رہے تھے۔ وقت ظالم بھی ہے اور مرہم بھی، اور زخموں کی طرح یہ زخم بھی مندمل ہو جائے گا۔ لیکن نہ تو نقوش مر سکتا ہے نہ طفیل صاحب کا ادبی کارنامہ! جو کام ادارے نہیں کر سکے وہ ایک قلندر نے انجام دیے۔ اردو زبان کے ساتھ ان کا نام زندہ رہے گا۔

میری ان کی ملاقات زیادہ تر محفلی ہے۔ مجھے ان کی خلوت کا حال نہیں معلوم۔ وہ انسان تھے غصہ بھی آتا ہوگا۔ شکایت بھی کرتے ہوں گے۔ کدورتیں بھی ہوں گی لیکن حتی الامکان انھوں نے اس کو غالباً اپنی ذات تک یا بہت قریبی احباب تک محدود رکھا۔ گلڈ سے منسلک ہونے کے بعد میں نے ان کی شکایتیں بھی سنیں، ان کی سیاست کا تذکرہ بھی لوگوں کی زبان پہ برسرِ عام آیا۔ میں نے بے تکلفی سے اس کی بابت ان سے استفسار بھی کیا لیکن وہ ہنس کر ٹال گئے اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ کہنے لگے، جعفری صاحب! یہ سب تو ہوتا رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ کام بھی ہونا چاہیے کام کو ان کی زندگی میں غالباً عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ جن طفیل صاحب کو میں جانتا تھا ان کی خصوصیات تو مروت، وضعداری، ہلکی سی مسکراہٹ اور دھیما لہجہ تھیں۔ ان کے اور رُخ بھی ہوں گے لیکن میں ان سے واقف نہیں ہوں اور میں اسی رُخ سے خوش ہوں۔

'رفعنا لک ذکرک' کو انہوں نے اپنے دل میں اس طرح بٹھا لیا تھا کہ جس طرح ہم کو اپنے خون کی گردش کا احساس نہیں ہوتا لیکن اسی کی وجہ سے ہم زندہ رہتے ہیں اسی طرح حضورؐ کی محبت ان کی زندگی کا جزو تھی۔ اللہ تعالٰے ان کے مراتب بلند کرے اور ان کو شفیعؐ المذنبین کی رفاقت عطا کرے۔ آمین

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

محمد طفیل — ادب کی تیسری دنیا کے بُت گر

رشید نثار

جن شخصیات کے پاس زندگی کا ایک مثالی تصور ہوتا ہے وُہ اپنے گرد کشش کا ایک ہالہ بناتے رکھتے ہیں جیسے خارجی طور پر اُن کے کردار کی خوب صورت تصویروں اور مخصوص ہیجان کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس تناظر کو ایک کسوٹی بھی بنایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ فطری ہیجان اور کردار کی پختگی کے پس منظر میں محمد طفیل کو بھی بخوبی پرکھا جا سکتا ہے جن کی زندگی کا کُل ایک انفرادی تحریک کا جزو تھا۔ وُہ اپنی لگن کے اسیر اور انا کی آگ میں جلنے والے فولادی انسان تھے۔

محمد طفیل باضابطہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے کیونکہ وُہ اپنی ذات کو کسی تحریک کا ایک حصہ اور اپنے مثالی تصور یعنی نقوش کو ایک تحریک سمجھتے تھے۔ انہوں نے ادب کے مشترک انداز ہائے فکر کو اپنا کر کسی عنصر سے بغاوت نہیں کی تھی۔ البتہ اُنہوں نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا جسے ذاتی انتخاب ہی کہا جا سکتا ہے تاہم انہوں نے ادبی سماج کے ایک پہلو کو نئی راہیں دکھانے کے لیے نیا راستہ اختیار کیا تھا۔ مثلاً انہوں نے نقوش کو ایک ایسی تحریک بنایا جس کے بطون سے "ضخامت" کا حُسنِ تخیل اُبھر کر سامنے آیا۔ چنانچہ نقوش ادب کا ایک طلسم اور طفیل اس کے عناں گر تھے۔

نقوش جس عہد میں منصۂ شہود پر آیا اُس وقت ادب کا جوش ٹھنڈا پڑ رہا تھا البتہ 'سویرا' ادبی شدتِ احساس کو رہنما بنا کر ادبی سماج کے مختلف عناصر سے بغاوت کر رہا تھا مگر نقوش اس عہد میں بھی ادب میں حُسن اور نئے بت تراش بنا رہا تھا۔ لہذا یہ بُت آج بھی قایم و دایم ہیں اور کوئی ادبی سُورج ان بُتوں کی پُوجا کیے بغیر بت شکن نہیں بن سکے گا۔ کہتے ہیں ہر عہد اپنے عہد میں کوئی نہ کوئی بت شکن پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ "مقصدیت" کو اور شعوری میلان کو تاریخی منزل عطا کرنا اگر بت شکنی کے دائرے میں آتا ہے تو محمد طفیل ابہام، داخلیت اور بے مقصد تحریکات کے برعکس زندہ اور توانا تحریک تھے جنہوں نے حقایق کے ذریعے، تحقیق کی روشنی میں نوعیت کے اعتبار کو تبدیل کر کے بیدار اور تنومند عناصر کو اپنے ساتھ وابستہ کیے رکھا جس سے ادب کی ایک تیسری دنیا تشکیل ہُوئی۔ (اس کا سہرا محمد طفیل کے سر پہ سجتا ہے)

پاکستان میں ادب کی تیسری دنیا کی تشکیل غیر سیاسی اور غیر انفرادی تھی۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک اور ارباب ذوق کے مابین رہ کر ایک پُل بنا کر زندہ رہنا محمد طفیل کا آدرش تھا۔ لہذا طفیل نے اس اعتبار سے ادب میں تیسری دنیا کو پیدا کیا' جو آج بھی تیسری دنیا ہی کے تصور سے قایم ہے۔

ادب کی تیسری دنیا کائنات میں غیر آسُودگی، ظلم، تشدّد اور غیر صحت مند تخلیقات کے تناظر میں پہچانی

جاتی ہے۔ محمد طفیل نے پاکستان میں اس دنیا کو تشکیل دے کر اُسے تصورات کی حد تک ایک تحریک بنائے رکھا۔ لیکن اسے کسی بین الاقوامی تحریک کے ساتھ منسلک نہ کیا۔ کیونکہ بین الاقوامی "تیسری دنیا" انحراف، بغاوت، وارفتہ مزاجی، طوق و سلاسل کی اسیری اور شگفتگی سے تعلق رکھتی تھی جبکہ محمد طفیل تیسری دنیا کے فرد ہو کر بھی انفرادی خواہشات کے انسان تھے اُن کا مزاج ٹھنڈا، اجتماعی تصور وسیع، سماجی شعور گہرا لیکن سادگی اور خلوص کا انداز روایتی تھا اور وہ ایک خاص حلقے میں پہچانے بھی جاتے تھے۔

پاکستان کی تخلیق کے بعد نقوش کا اجرا نئی زندگی کا تصور لے کر طلوع ہوا تھا۔ چنانچہ نئی زندگی پاکستانی ادیبوں کے لیے بذاتِ خود ایک آدرش تھی اور اس آدرش کو فروغ دینے میں محمد طفیل کی صلاحیتوں نے بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ انہوں نے نقوش کو ایک بلند سطح عطا کی۔ طباعت کے انوکھے تجربے کیے۔ مدیران کی ذہنیت کو بدلا۔ سخت آزمائشوں سے ادب کو گزارا اور اس کے انعام کے طور پر بڑی عزت پائی۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ ادب میں بے چینی، کرب ناکی، خود فریبی اور بے سمت بغاوتوں میں کسی قدر کمی آ گئی تھی تو اس میں بھی نقوش کے وسیع اخلاقی تصور اور متوازن پالیسی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

محمد طفیل کسی بنے بنائے راستے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ ان روایات کے متلاشی تھے جنہیں اس وقت کے ادیب اور مدیر مختلف نظریات کی عینکیں پہن کر روا رکھتے تھے۔ بلکہ محمد طفیل نے نئی روایات کو جنم دیا، نئے ادیب متعارف کرائے، ادب کو نئی سطحوں سے آشنا کیا، تاریخ کو ادبی تناظر بخشا اور ادب کو اپنے عہد کی تاریخ بنا دیا۔

نقوش کے تاریخی سفر کا جائزہ لیا جائے تو اُس کے پس منظر میں ایک خاص رنگ سے جلوہ گر ہونے کی تمنا کروٹیں لیتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ اُس عہد میں کسی ادبی پرچے کا حُسن اس کا نظریاتی لگاؤ ہوا کرتا تھا۔ مگر محمد طفیل نے نظریاتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ حسرتوں میں کھو جانے کا احساس بھی پیدا کیا۔ انہوں نے ادبی سماج کو اپنے بازوؤں کی طاقت سے معاشرے کے جسم و جاں کے ساتھ باندھے رکھا اور اُسے بے پناہ قوت کے ساتھ کھینچ کھینچ کر ساحلِ مراد تک آنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب کچھ اُن کے پختہ شعور ہی کا مرہونِ منت تھا۔ ورنہ ادیب تو کرب، الجھن، جذبات اور خیالی جنتوں میں کھوئے ہوتے تھے لیکن محمد طفیل کے پختہ شعور کی کائنات کو دیکھ کر واقعی بڑی حیرت ہوتی ہے۔

"نقوش" جب بالغ ہو گیا اور اُس نے ادبی ایڈیشنوں کے انبار لگا کر ایک دھوم مچا دی تو ادب کی یہ تیسری دنیا ادب ہی کی کائنات بن کر رقص کرتی رہی اور ایک ایسی روشنی پیدا کرتی رہی جس نے آگے چل کر زندگی کے لامحدود تجربات کو راہ دکھائی اور ادبی صحافت کی ایک سمت بھی متعین کی۔

نقوش کے ادبی سفر کو تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اس کے پس منظر میں مقصد کی لگن اور فنی پختگی کا پختہ تجربہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ نقوش ہی وہ واحد جریدہ ہے جس نے برصغیر میں نئی آب و تاب اور مزاج کی پاکیزگی کا اعلیٰ معیار قائم کیا اور آج تک اس کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا۔

وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ

جاوید طفیل

○ یہ صفحات میری بے ربط یادداشتوں پہ مبنی ہیں۔ میری پیدائش سے قبل کے واقعات کے راوی میرے نانا ہیں جنہوں نے والدِ محترم کو بہت قریب سے دیکھا۔

○ ان یادداشتوں میں آپ کو والدِ محترم، میری اور نقوش کی ایک ایسی کہانی نظر آئے گی جو کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں تھی۔ یہ سب باتوں سے الگ تھلگ ایک ایسی واردات ہے جس کا میں بھی ایک کردار رہا۔

محمد طفیل ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء کو جوگی محلہ، بازار حکیماں، اندرون بھاٹی گیٹ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میاں عمر الدین اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ ان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی غربت ان کے گھر پہ نثار تھی۔ اپنی ہمشیرہ سے چھوٹے اور تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ابتدائی تعلیم ایم سی ہائی سکول نور محلہ اندرون بھاٹی گیٹ میں حاصل کی۔ طالب علمی کے ابتدائی دور سے ہی اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پہ اساتذہ کے منظورِ نظر تھے۔ عبدالحفیظ کاردار جو بعد میں پاکستان کرکٹ کے کپتان بھی رہے ان کے قابلِ ذکر کلاس فیلو حضرات میں سے ایک ہیں۔ پرائمری کے بعد اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور کے طالبعلم بھی رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کے والدِ محترم کے بیمار پڑنے سے گھر کے اخراجات چلانا بھی مشکل ہو گئے تو پڑھائی جیسے ثانوی مسئلہ کو کون اہمیت دیتا۔ والد کی بیماری کی بنا پر جب اخراجات بچاؤ مہم چلی تو یہ اس کے پہلے نشانہ تھے۔ اس طرح سکول میں آنا جانا چھوٹ گیا۔ اساتذہ نے جب ایک ہونہار شاگرد کو غائب پایا تو انھیں بلا بھیجا اور سکول سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے بتایا کہ آمدنی اتنی قلیل ہے کہ گھر کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں مجھے پڑھانے کی "عیاشی" کا یہ گھرانہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ سکول کی فیس سے اس ہونہار طالب علم کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اور یہ پھر پڑھنے لگے۔ انہی دنوں میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کا تمام بوجھ ان کے ناتواں کندھوں پہ آ پڑا۔ اس طرح تمام کنبے کے پیٹ بھرنے کی ذمہ داری نے سکول چھڑا دیا۔

ان کی والدہ مرحومہ انہیں ایک مشہور خوش نویس تاج الدین زریں رقم کے پاس لے کر پہنچیں اور ان سے انہیں اپنا شاگرد بنانے کے لیے کہا۔ انہوں نے جواب دیا، بہن! اس بچے کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں اس پہ ظلم مت کرو۔ لیکن جب گھر کی حالت اور دوسری مشکلات کا ماجرا سنا تو ان کو اپنی شاگردی میں لینے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

یہ دن رات محنت کر کے تین ماہ میں اس قابل ہو گئے کہ کتابت کے ذریعے کچھ رقم کمانے لگے۔ جلد ہی ہونہار شاگرد نے اپنے کام کے ذریعے استاد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ ان سے فنِ کتابت اور اس کی باریکیوں پر گفتگو کرنے لگے اور ایسے اہم کام ان کے ذمے کر دیا کرتے تھے جن پر وہ خود توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے استاد نے عید میلاد النبی کا ایک بڑا پوسٹر لکھا مکمل ہونے پر انہیں دکھایا اور گاہک کی موجودگی میں پوچھا، کہو کیسا لگا؟ انہوں نے جواب دیا کہ فلاں لفظ درست لکھا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ استاد نے سوچا کہ شاگرد نے بے عزتی کر دی ہے۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر کہا: 'اچھا' یہ لفظ تم لکھ کر لاؤ یہ لفظ لکھ کر مطلوبہ جگہ چسپاں کر کے لائے۔ استاد نے شاگرد رشید کو گلے لگا لیا اور اپنی دستی گھڑی فیور لیوبا ان کو اتار کر انعام میں دی۔

اردو بک سٹال اُن دنوں لاہور کا ایک معروف پبلشنگ ہاؤس تھا جو شوکت تھانوی کی کتابیں بھی شائع کرتا تھا شوکت تھانوی ظہیر صاحب سے ہمیشہ اصرار کرتے تھے کہ ان کی کتاب طفیل صاحب سے لکھوائی جائے۔ کیونکہ ان کی کتابت میں اغلاط نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں بلکہ یہ اُن الفاظ کی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے جو کسی وجہ سے مسودہ میں درست ہونے سے رہ جاتے تھے۔ لاہور میں سب سے پہلی آفسٹ مشین عطر چند کپور پریس میں لگی اور اس طرح فنِ کتابت میں ایک انقلاب آیا یعنی بٹر پیپر پر سیاہ روشنائی سے لکھنے کا آغاز ہوا۔ چونکہ یہ یکسر مختلف نوعیت کا کام تھا اس لیے لاہور کے سب اہم خطاطوں نے اس کام کو کرنے کی کوشش کی۔ وہ مسٹر اُتم چند کی باریک بین نظروں سے تنگ تھے جو اس پریس میں شعبۂ کتابت کے انچارج اور خود بھی ایک بہت قابلِ ذکر کاتب تھے۔ وہ اِن کے کام اور رفتار سے اتنے مطمئن تھے کہ دوسروں کو ان کی مثال دیا کرتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں جناب لطیف فاروقی کے اشتراک سے "مکتبۂ شعر و ادب" کے نام سے کام شروع کیا۔ بعد میں جب یہ اشتراک مسٹر فاروقی کی شادی میں رکاوٹ بنا تو یہ اس کاروبار سے الگ ہو گئے۔

۱۹۴۲ء میں ان کی شادی ہُوئی۔ ان کے سسرال میں سے خواتین کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ بارات کے ساتھ "سوہنی" کا باجا بھی ہو گا جو اُن دنوں کا ایک معروف بینڈ تھا۔ بارات سے چند روز قبل جب ان کے کان میں یہ شرط پڑی کہ بارات اِس انداز میں جائے گی تو یہ پہلے سے "سوہنی بینڈ" والوں کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ شادی ملتوی ہو گئی ہے اور جب ان کی ضرورت ہو گی انہیں اطلاع بھجوا دی جائے گی۔ بینڈ والوں نے اِس شرط کے ساتھ نہ آنا قبول کر لیا کہ وہ پیشگی واپس نہیں کریں گے اور جب بھی دوبارہ ان سے کہا جائے گا تو وہ اپنی پوری فیس لیں گے۔ انہوں نے کہا: بے شک اس وقت آپ کو پوری فیس ہی ادا کی جائے گی۔ مقررہ دن بارات کے وقت پر سب مہمان پہنچ چکے تھے لیکن باجا غائب تھا۔ دیر ہونے لگی تو کسی کو ان کے آفس بھجوایا گیا تو وہاں سے اُن کو یہ جواب ملا کہ دُولھا تو خود آ کر بتا گئے ہیں کہ شادی ملتوی ہو گئی ہے اس لیے بینڈ تو کسی دُوسری بارات کے ساتھ جا چکا ہے۔ وقت مقررہ سے کافی دیر بعد تک جب بارات نہیں پہنچی تو دُلھن کے گھر سے پیغام آیا کہ بارات بغیر باجے کے ہی لے آئیں۔ اس طرح

یہ بات طے ہوگئی کہ بارات بغیر باجے کے ہی جائے گی تو ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، وہ یہ کہ انہوں نے گھوڑی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اِس موقع پر ان کے ایک چچا نے سمجھا بجھا کر ان کو گھوڑی پر بٹھایا اور بارات چار گھنٹے تاخیر سے دلھن کے گھر پہنچی۔

۱۹۴۴ء میں 'ادارہ فروغِ اردو' نام کی ایک شخصی فرم کا آغاز اپنے استاد تاج الدین زرّیں رقم کی بیٹھک سے کیا اور ایک چھوٹا سا کمرہ اِس ادارے کی کُل کائنات تھی۔ سب سے پہلی کتاب "سنی سنائی" کے نام سے چھپی جس کے مصنف شوکت تھانوی تھے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے وقت ایبک روڈ جہاں پر ادارہ فروغِ اردو ہے ان کے ایک ہندو دوست کتابوں کی دکان کرتے تھے۔ جب لاہور میں حالات بگڑنے لگے تو انہوں نے یہ دکان ان کے ذمہ اس شرط سے کر دی کہ اگر میں واپس آ گیا تو تم مجھے یہ دکان لوٹا دو گے ورنہ یہ دکان تمہاری ہوئی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ دکان بڑی برکت والی ہے اس کو کسی قیمت پر بھی کبھی نہ چھوڑنا۔

۱۹۴۸ء میں لاہور سے 'نقوش' کا اجرا کیا، ادارت احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کے ذمے تھی اور یہ اس رسالہ کے پبلشر تھے۔

۱۹۴۹ء کے اوائل میں شدید بیمار ہوئے، بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ مالی حالات پہلے ہی زیادہ اچھے نہیں تھے۔ بیماری نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ ان کا علاج کرانے کے لیے سسرال والوں نے کچھ رقم بھجوائی۔ جب ان کے علم میں یہ بات آئی تو نوٹ ہاتھ میں لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور کہنے لگے کہ اس رقم سے اچھا ہونے کی بجائے بہتر ہے کہ میں بیمار ہی رہوں۔ ان کی بیماری کا علم جب احمد ندیم قاسمی کو ہوا تو وہ ننگے پاؤں ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور ڈاکٹر کو ساتھ لا کر انہیں دکھایا۔ 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق ان کی صحت بہتر ہونے کی بجائے گرنے لگی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سب کو یہ احساس ہونے لگا کہ شاید یہ اب نہیں بچ سکیں گے کہ ایک صبح اپنی بیگم سے فرمائش کی کہ مجھے پتلا سا حلوا بنا کر دو۔ ڈاکٹر نے اِس قسم کی غذا سے متعلق سخت تنبیہ کر رکھی تھی کیونکہ ان کی انتڑیاں خراب ہو چکی تھیں۔ ان کی آخری خواہش سمجھتے ہوئے انہوں نے ان کی فرمائش پوری کر دی۔ یوں چند روز بعد یہ صحت یاب ہونے لگے۔ حلوا کھانے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ خواب میں انہیں کسی بزرگ نے حلوا کھانے کی تلقین کی تھی۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں 'روحِ ادب' کے نام سے بھی ایک رسالہ کراچی سے شروع کیا جو ان کی اور خدیجہ مستور کی زیرِ ادارت چھپنا شروع ہوا۔ 'روحِ ادب' مشہورِ زمانہ ریڈرز ڈائجسٹ (READER'S DIGEST) کے انداز میں ترتیب دیا جاتا تھا۔

ان کی والدہ مرحومہ نے جب اپنے بیٹے کے یہ طور طریقے دیکھے کہ کتابت سے جو کچھ کمایا تھا سب ان رسالوں

کی نذر ہو رہا ہے اور اُس گھر میں جہاں زندہ لوگوں کے لیے جگہ تنگ تھی نہ بکنے والے رسالے اپنا دائرہ اثر وسیع کرتے جا رہے ہیں تو انہوں نے ایک دن ان کے سسر کو بلایا اور ان دونوں نے سمجھایا کہ میاں! اپنے حالات دیکھو اور اپنی حرکات بھی! یہ بزرگ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ دونوں رسائل بند کرنے سے ہی گھر کے حالات میں کچھ بہتری پیدا ہو سکتی ہے۔ انہوں نے منّت سماجت کر کے مفاہمت کی یہ راہ نکالی کہ ' روحِ ادب ' کو تو بند کر دیتے ہیں لیکن نقوش کو چلنے دیتے ہیں۔

مارچ ۱۹۵۱ء تک اگرچہ ' نقوش ' بلند پایہ ادبی جرائد میں شمار ہونے لگا تھا لیکن اسے ابتدائی تین سالوں میں کئی صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور الگ ہوئے اور نقوش میں سعادت حسن منٹو کے افسانہ " کھول دو " کو چھاپنے کی بنا پر حکومت نے اس پر چھ ماہ کے لیے پابندی عائد کر دی۔ بعد میں سید وقار عظیم بھی الگ ہو گئے۔ اس طرح اُس وقت انہیں اور نقوش کو ایک اہم چیلنج درپیش تھا جس کو انہوں نے عالی حوصلگی سے قبول کیا۔

مارچ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک ان پر کیا گزری! مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن ہم پر جو گزری اس کی ہلکی سی پرچھائیں آنکھوں کے سامنے ہے۔ ذہن کی سکرین پر جو سب سے پہلا واقعہ محفوظ ہے وہ میرے سکول جانے کی ابتدا ہے۔ یہ بات ۱۹۵۵ء کی ہے۔ والدہ کو والدِ محترم یقین دلا چکے تھے کہ مجھے سکول میں داخل کرانے کا کام ان کے ذمّہ ہے۔ جب وُہ مرحلہ آیا جس کے لیے انہیں بہت پہلے سے تیار کر رکھا تھا تو انہوں نے فرمایا: میں تو فلاں پرچے کی تیاری میں مصروف ہُوں، وقت میرے پاس بالکل نہیں ہے۔ میری والدہ سے کہنے لگے: اپنے بھائی کو بلا لو وہ اس کو سکول میں داخل کرا دے گا۔ بعد میں انکشاف ہُوا کہ وہ منٹو نمبر کی تیاری میں مصروف تھے، اپنے اس دوست کے لیے جو اس وقت دنیا میں نہیں تھا، وہ اپنے زندہ عزیزوں کو بھلائے ہوئے تھے۔ یہ وہی دَور تھا جب ہم بھاٹی گیٹ کے اپنے آبائی گھر سے مزنگ میں ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہُوئے۔ ہمارے ایک ماموں چند روز بعد ہمارے نئے گھر آئے اور فرمایا: " اچھا ہُوا کہ آپ اُس گھر کو چھوڑ آئے وہ تو قید خانہ تھا۔ "

اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں جب شوکت تھانوی کراچی منتقل ہُوئے تو وہ گڑھی شاہو میں اپنا کرائے کا مکان ہمارے حوالے کر گئے۔ چند روز بعد ہمارے وہی ماموں اُس گھر میں آئے اور گھر دیکھ کر فرمایا: " اچھا ہُوا کہ آپ اُس گھر کو چھوڑ آئے وہ تو قید خانہ تھا۔ " انہوں نے یہ فقرہ سُنا تو ایک دم چونک پڑے۔ ۱۹۷۱ء میں جب ہم اردو بازار منتقل ہُوئے تو ایک روز کہنے لگے: تمہارے فلاں ماموں ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے پوچھا: ان کا انتظار کیوں ہے؟ کہنے لگے کہ مکان کی تبدیلی پر وُہ ایک فقرہ کہا کرتے ہیں کئی سالوں سے یہ بات ان کے مُنہ سے نہیں سُنی۔ اور پھر فرمایا: جس وقت بھی وہ آئیں گے یہ ضرور کہیں گے " اچھا ہُوا کہ آپ وہ گھر چھوڑ آئے وہ تو قید خانہ تھا " ایک آدھ روز بعد ماموں ہمارے نئے گھر میں آئے اور آتے ہی انہوں نے وہی فقرہ دُہرایا۔ یہ سُن کر بہت

محظوظ ہُوئے اور کہنے لگے، یار تمہاری یہی بات سُننے کے لیے تو ہم بار بار گھر بدلتے ہیں۔ ہمارے ماموں نے بھی اپنی روایت برقرار رکھی۔ جب ہم اپنے نئے گھر نیو مسلم ٹاؤن منتقل ہُوئے تو انہوں نے اپنا مشہورِ زمانہ فقرہ دُہرایا۔ اِنہوں نے سُن کر زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: دیکھو میاں! ہم سے بڑا بیوقوف اور کون ہوگا جو تمہارا صرف ایک فقرہ سننے کے لیے اتنے پیسے خرچ کر دے!

۱۹۵۶ء میں شخصیات نمبر کی تکمیل کے بعد بھارت گئے وہاں قیام کے دوران پنڈت نہرو سے بھی ملنے کی کوشش کی۔ انہیں معلوم ہوا کہ پنڈت صاحب سے ملاقات ان کے بھارت کے قیام کے دوران ممکن ہی نہیں۔ طریقۂ کار یہ تھا کہ متعلقہ صاحب ملنے کے خواہشمند حضرات کی فہرست پنڈت صاحب کو روزانہ دکھاتے تھے اور جن ناموں کے آگے وہ نشان لگا دیتے تھے اُن کو ملاقات کا وقت دے دیا جاتا تھا۔ یہ بھی اپنا نام اُس لسٹ میں لکھوا آئے۔ یہ بات اُسی وقت اِن کے گوش گزار کر دی گئی کہ اگر پنڈت صاحب نے ملاقات کی اجازت دے بھی دی تو اِن کی باری اڑھائی ماہ بعد ہی آئے گی۔ یہ مایوس ہو کر اُسی دن آگرہ چلے گئے۔ وہاں پیغام پہنچا کہ فوراً واپس آجائیے۔ یہ دہلی واپس پہنچے تو علم ہُوا کہ کل پنڈت نہرو سے آپ کی ملاقات کا فلاں وقت طے ہے۔ یہ حیران تھے کہ اچانک کایا کس طرح پلٹ گئی۔ ملاقات سے قبل ضروری آداب اِن کے گوش گزار کرائے گئے اور یہ بھی بتایا گیا کہ پنڈت صاحب سے ملاقات کا وقت صرف پانچ منٹ ہے۔ جب پانچ منٹ گزر جائیں تو آپ ازخود اجازت لے کر آجائیے کیونکہ پنڈت صاحب اس بات کا اظہار اپنی بات سے نہیں کرتے۔ مقررہ وقت پر ملاقات ہُوئی، اِنہوں نے شخصیات نمبر پیش کیا۔ وُہ پرچہ دیکھتے رہے اور پانچ منٹ گزر گئے۔ یہ اُٹھ کر آنے لگے تو پنڈت صاحب نے پُوچھا کہ آپ جانے کی اجازت کیوں لے رہے ہیں؟ تو انہوں نے پورا ماجرا سنایا۔ پنڈت صاحب نے کہا آپ تشریف رکھیں یہ پابندی آپ کے لیے نہیں۔ اور کہنے لگے، میں تو اُس وقت سے سوچ رہا تھا کہ کیا بھارت میں بھی کوئی اِس پایہ کا رسالہ نکلتا ہے! کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ کوئی نہیں، اگر آپ بھارت آجائیں تو ہم آپ کی ہر خدمت اپنے لیے اعزاز سمجھ کر کریں گے۔ بھارت میں قیام کے دوران پنڈت نہرو جس تقریب میں بھی شرکت کرتے اِن کو بھی اس میں مدعو کیا جاتا۔ اِن کو آتا دیکھ کر پنڈت صاحب آگے بڑھ کر اِن کا استقبال کرتے۔ یہ اِس کرم پر حیران ہوتے بالآخر ایک روز اِنھوں نے اِس کی وجہ خود ہی پُوچھی۔ پنڈت صاحب کا جواب تھا کہ بھارت میں صرف ایک ہی شخصیت ایسی ہے جس کو میں خود ملنے جاتا ہُوں اور وُہ ہیں مولانا آزاد! ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں اُن سے ملنے گیا، مولانا کے نوکر نے مجھے دیکھ کر مولانا کو اطلاع دی کہ پنڈت صاحب آتے ہیں۔ یہ سُن کر مولانا نے اونچی آواز میں کہا کہ انہیں کہہ دو میں مصروف ہُوں۔ مولانا کے اِس فقرے کی تکمیل کے دوران میں پنڈت صاحب بھی کمرے میں پہنچ چکے تھے جہاں مولانا بیٹھے ایک رسالہ پڑھ رہے تھے، پنڈت صاحب نے پُوچھا کہ آپ کو کون سی ایسی مصروفیت ہے کہ آپ مجھ سے مل بھی نہیں سکتے۔

انھوں نے فرمایا کہ آج ہی 'نقوش' آیا ہے جب تک اسے پڑھ نہیں لُوں گا میری کوئی دوسری مصروفیت نہیں ہوگی۔ پنڈت صاحب کہنے لگے کہ جس رسالہ کو مولانا آزاد اتنی اہمیت دیتے ہوں اُس کا ایڈیٹر میرے لیے ایک بہت ہی محترم ہستی کیوں نہ ہو!

۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ سکول میں کھیل کے دوران ایک بچے کی شرارت سے میرا بازو ٹوٹ گیا۔ رات جب انہوں نے مجھے اِس حالت میں دیکھا تو پریشان اور شدید غصّے کی حالت میں تھے، کہنے لگے صبح تمہارا بازو پہلوان کو دوبارہ دکھا کر پرنسپل سے ملنے جاؤں گا اور اس حرکت سے مطلع کروں گا جو میرے بچے کا بازو ٹوٹنے کا باعث بنی۔ پہلوان کو دکھایا تو انہوں نے فرمایا کہ اِس عمر میں بچوں کی شرارت کے باعث اس قسم کے حادثات سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلوان کا یہ کہنا تھا کہ ایسے مطمئن ہوئے کہ دو ماہ بعد مکاتیب نمبر چھاپ کر پوچھا کہ برخوردار! کیا حال ہے؟ البتہ اس کے بعد کسی نئے پرچے کی تیاری میں مصروف ہونے تک باقاعدہ علاج کے لیے مجھے خود لے جاتے رہے۔

اِسی دور میں ہی اِنہوں نے پریس لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہُوا یُوں کہ جس پریس میں نقوش چھپا کرتا تھا ان کے ساتھ یہ طے تھا کہ پیسے آپ اپنی مرضی کے لیں لیکن شرط یہ ہے کہ چھپائی میری مرضی کی ہوگی۔ یعنی جو پہلا کاغذ مشین سے نکلے گا اگر یہ اُس کو پاس کیا کریں گے تو وُہ چھپے گا ورنہ نہیں۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مقررہ تاریخ ہوگی چھپائی کا آغاز اُس دن سے ہر حالت میں ہو جایا کرے گا۔ ایک روز یہ حسبِ وعدہ پریس میں پرچہ چھپوانے کے لیے پہنچے تو اِن کے علم میں یہ بات آئی کہ آج پریس میں نقوش نہیں چھپے گا بلکہ کوئی دوسرا کام ہو رہا ہے۔ یہ پریس کے مالک کے پاس پہنچے اور اُن کو اس ضمن میں اُن کا وعدہ یاد دلایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں کہ جیسے یہ پریس آپ کا اپنا ہو۔ یہ سُن کر اِنہوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ رسالہ اب آپ کے پریس سے نہیں چھپوانا، میں اپنا پریس لگا کر ہی اس کو چھاپوں گا۔ اِس طرح ایک ماہ کے قلیل عرصے میں پریس لگا کر پرچے کو چھاپا اور مارکیٹ میں لائے۔

۱۹۶۰ء میں میری زندگی کا ایک اہم موڑ آیا مجھے چھٹی میں داخل ہونے کے لیے سکول بدلنا تھا۔ جس سکول میں مَیں پڑھ رہا تھا وہاں لڑکوں کے لیے گنجائش پانچویں جماعت تک ہی تھی۔ میں نے لاہور کے سب سے اچھے سکول میں داخلے کا امتحان دیا اتنے لائق تو تھے نہیں کہ از خود داخل ہو جاتے۔ امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی معلوم تھا لیکن حوصلہ صرف یہ تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب والدِ محترم کے شناساؤں میں سے ہیں اس لیے سکول میں داخل ضرور ہو جاؤں گا۔ نتیجہ حسبِ توقع ہی تھا۔ چند روز گزارنے کے بعد میں نے والدِ محترم سے کہا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہہ کر مجھے سکول میں داخل کرا دیجئے۔ میری والدہ نے بھی کہا سُنا۔ ایک روز مُوڈ میں آ کر کہا کہ قلم لاؤ میں ہیڈ ماسٹر کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں یہ تم خود لے کر جاؤ۔

چٹھی کا مضمون کچھ یوں تھا:

محترم!
اپنے بیٹے کو بھجوا رہا ہوں۔ نالائق تھا، امتحان پاس نہیں کر سکا ورنہ خود ہی سکول میں داخل ہو جاتا۔
کرم کیجئے۔

میں خوشی خوشی رقعہ لے کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا انہوں نے رقعہ پڑھ کر پوچھا: کیا تم طفیل صاحب کے بیٹے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں! ہیڈ ماسٹر صاحب فرمانے لگے: داخل تو میں تم کو کر لوں گا لیکن اس کے لیے میری ایک چھوٹی سی شرط ہے، اپنے ابا سے کہیں کہ وہ کسی روز میرے ساتھ آ کر چائے کا ایک کپ پئیں۔ میں اس بے ضرر سی شرط پر بہت خوش تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اُس امتحان سے بھی بڑا امتحان ہے جس میں میں پہلے ہی فیل ہو چکا تھا۔

موصوف چونکہ اُن دنوں 'ادب عالیہ نمبر' کی تیاری میں مصروف تھے اور پرچے کی تیاری کے دنوں میں ان پر جنون کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی بہت ممکن تھا کہ میں اُس کا شکار ہو جاتا کہ والدہ صاحبہ مدد کو پہنچیں اور بہ مشکل تمام انہیں سکول جانے پر آمادہ کیا اور یوں یہ چائے کا ایک کپ پینے کے لیے تقریباً دس روز بعد سکول پہنچے اور مجھے داخلہ مل گیا۔ اُس وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ہو نہ ہو ہم ان کی سوتیلی اولاد ہیں!

۱۹۶۰ء کے اوائل ہی کی بات ہے کہ سید وقار عظیم اور کچھ دوسرے احباب کے ساتھ طفیل صاحب دفتر میں گپ شپ لگا رہے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا کہ اچانک باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ سر چائے کی پیالی سے جا ٹکرایا۔ ہر ایک نے حیرانی اور پریشانی کے ساتھ دیکھا۔ چند لمحات کے بعد ہوش میں آئے تو پسینے سے شرابور تھے، احباب طبیعت کا پوچھنے لگے تو الٹا ان سے سوال کیا کہ "مجھے کیا ہوا تھا"۔ دوستوں نے حال بتایا۔ کچھ دیر بعد ہوش و حواس قائم ہوئے تو وقار عظیم مرحوم نے ڈاکٹر کو دکھانے پر اصرار کیا تو کہا کہ معمولی تکلیف تھی اب ٹھیک ہوں، کسی کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سید وقار عظیم کے اصرار پر کہ ڈاکٹر حیدر میرے دوست اور پڑوسی ہیں اور بہت اچھے ملنسار انسان بھی، تو جانے کی ہامی بھر لی۔ اُن کے پاس پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہسپتال میں داخل ہو جائیے۔ گھر میں پیغام پہنچا اور ساتھ ہی اس احتیاط کے بارے میں ہدایات بھی کہ رات کو شیخ اسماعیل پانی پتی اور ڈاکٹر وحید قریشی کو کھانے پر بلا رکھا ہے اُن کو کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دیں اور نہ ہی کھانا کھلانے سے پہلے میری حالت کے بارے میں انہیں بتائیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ اسماعیل پانی پتی وقت مقررہ پر آئے۔ طفیل صاحب کے بارے میں استفسار کیا۔ گھر والوں نے انھیں بہلانے کی کوشش کی لیکن یہ ان دونوں صاحبان کو قائل نہ کر سکے کہ طفیل صاحب کسی کام سے گئے ہیں اور آپ کے کھانا تناول فرمانے پر واپس آ جائیں گے۔ کیونکہ وہ اپنے دوست کے مزاج سے خوب واقف تھے۔

ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق دل کی حالت خاصی ابتر تھی۔ طبیعت خاصی خراب رہنے لگی۔ اُسی دوران ایک روز یہ احساس ہوا کہ شاید ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور

ساتھ ہی یہ شکایت بھی ان کے لبوں پر آئی کہ "اے اللہ! تو اپنی حکمت کو بہتر جانتا ہے لیکن اس بندۂ ناچیز کو کچھ مہلت دیتا تو یہ گنہ گار تیرے بندوں کی خدمت کے پُرعزم ارادے رکھتا تھا۔" پھر اس تاثر کے ساتھ صحت یاب ہوئے کہ اللہ کی طرف سے مُہلت مشروط طور پر ملی ہے۔

۱۹۶۲ء میں 'لاہور نمبر' کی تیاری میں مَیں نے جنوں کا مشاہدہ بھی کیا۔ یہی وہ دستاویز ہے جو لاہور کے بارے میں سب سے مستند قرار پائی اور جسے حکومتِ وقت نے مستقبل کے مورخ کی رہنمائی کے لیے خاص اہتمام کرکے اُس دور کے سکوں اور 'نقوش' کے لاہور نمبر کو مسجدِ شہدأ کی بنیاد میں رکھا۔

۱۹۶۴ء کا وہ لمحہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا جب ایک روز میں سکول سے واپس آیا تو نقوش اور پریس کے دفتر سے متعلق تمام اہم ملازمین ان کے آفس میں جمع تھے۔ زیرِبحث معاملہ یہ تھا کہ 'آپ بیتی نمبر' پر کتنا نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے صرف ایک بات طے تھی وُہ یہ کہ ۱۹۶۴ صفحات کے اس نمبر کی قیمت تیس۳۰ روپے سے زائد نہیں ہونی چاہیے اس سے زاید قیمت لوگوں کی قوتِ خرید سے باہر ہوگی۔ قیمت تو اس پرچے کی پہلے سے طے شدہ ہی رکھی لیکن اِس قیمت پر تیس ہزار روپے کا نقصان ہُوا۔ بات یہیں پہ رہتی تو پھر بھی ٹھیک تھا اس پرچے کی تقریبِ رونمائی پر بھی کثیر اخراجات اُٹھے جن کا مجھے علم نہیں ہوسکا۔ اس تقریب کے حوالے سے ایک واقعہ یاد رہ گیا ہے حضرت جوشؔ بھی اس تقریب میں موجود تھے والدِ محترم نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جب میں کہوں تم جوشؔ صاحب کو فلاں کمرے میں پہنچا آنا۔ تقریب ابھی جاری ہی تھی کہ حضرتِ جوشؔ نے جو والدِ مرحوم کے قریب بیٹھے ہُوئے تھے کہا، میاں! میں تو باوضو ہوں۔ جواباً والد صاحب نے فرمایا کہ باجماعت نماز کا انتظام ہے۔ پھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ حضرتِ جوشؔ کو مقررہ جگہ پہنچا دو۔ میں جوشؔ صاحب کو لے کر مقررہ جگہ پہنچا تو کچھ صاحبان نے حضرت جوشؔ کو جھپٹ لیا اور مجھ سے کہا کہ برخوردار! تم جاؤ تمہارا کام ختم ہوگیا ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاید جوشؔ ہی وُہ پہلے شاعر ہیں جو سب سے زیادہ اہمیت نماز کو دیتے ہیں۔ اللہ کا کیسا نیک بندہ ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ عُقدہ اس وقت کھُلا جب حضرتِ جوشؔ ہمارے گھر مدعو تھے اور مجھے سوڈا لانے کے فرائض سونپے گئے اور پھر مَیں نے اپنی آنکھوں سے حضرتِ جوشؔ کو نماز ادا کرتے ہُوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنے تھیلے سے بوتل نکالی اور اپنا پیگ بھی' تین چار پیگ پینے کے بعد انہوں نے فرمایا تھا، میاں طفیل! اب دوبارہ حاضرین سے تعارف کراؤ کیونکہ اب مجھے آدمی آدمی نظر آرہا ہے۔

زندگی میں نقوش کے علاوہ صرف چند مشاغل ہی ایسے تھے جن میں انہوں نے تھوڑے عرصہ کے لیے دلچسپی لی۔ کبھی کبھار کیرم بورڈ اور تاش کی محفل جمتی تھی جس میں اکثر مَیں اور میرے نانا ساتھی ہوتے، اور والدِ محترم اور پرویز۔ بعض اوقات تو پوری پوری رات اِن مشاغل میں گزر جاتی تھی۔ اُس دَور میں ہم کو پتنگ بازی کا بھی جنون تھا۔ بسنت کے موقع پر پیسے جمع کرکے ڈور اور پتنگوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا کیا جاتا تھا اور بسنت کے روز یہ سب کچھ بے دردی کے ساتھ اڑا دیتے تھے۔ والد مرحوم ہمیں ہماری ان حرکات سے منع کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بسنت کے روز جبکہ شکیلہ اختر

پٹنہ سے ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں، سردیوں کے دن تھے یہ چھت پر دُھوپ تاپنے کے لیے آئے، دیکھا کہ ہم دھڑا دھڑ پتنگیں کٹوا رہے ہیں تو والد مرحوم مجھ سے کہنے لگے، ڈور اور پتنگ لے کر آؤ۔ میں نے ایک پتنگ اڑا کر ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ سارا دن اسی ایک پتنگ سے نکل گیا' اور دوسرے لوگوں کی جو پتنگیں انہوں نے کاٹیں اس کا سکور ۵۸ تھا۔ رات کے وقت پتنگ کو اتارا اور والد مرحوم نے کہا کہ جاوید اس کو ہار پہنا کر لٹکا دو یہ آج کی چیمپئن ہے۔

کرکٹ وہ واحد گیم ہے جس کے ساتھ ان کی دلچسپی تا دمِ آخر قائم رہی۔ میچ دیکھنے کے لیے پاکستان سے باہر بھی جاتے رہے۔ جب ٹیلی ویژن پر میچ آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو دفتر میں یا گھر میں بیٹھ کر میچ سے محظوظ ہوتے تھے۔ ۱۹۶۴ - ۶۵ء میں ہمارے گھر کی بھی ایک کرکٹ ٹیم تھی جس کے یہ کپتان تھے۔ دوسری ٹیم ہمارے ماموں حضرات کی تھی، ہر اتوار کو میچ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ریلوے سٹیڈیم گڑھی شاہو میں اور اگلی اتوار کو منٹو پارک میں۔ کبھی ہم جیتتے تھے کبھی دوسری ٹیم۔ جب کافی میچ ہو چکے ایک دن زوردار میچ کے لیے دُوسری ٹیم کو چیلنج کیا گیا۔ ہماری ٹیم کا سب سے مؤثر ہتھیار ہمارے چچا تھے جو انتہائی تیز باؤلنگ کراتے تھے۔ وہ غنیم کے کیمپوں میں اندھے باؤلر کے نام سے مشہور تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی باؤلنگ انتہائی تیز ہوتی تھی لیکن گیند کی سمت اور اس کا مؤثر ہونا کوئی ضروری نہیں تھا۔ ان کی گیند عین وکٹوں میں بھی آسکتی تھی، وکٹوں سے دوچار گز اِدھر اُدھر سے نکل جانا بھی معمول تھا اور کبھی کبھار بیٹسمین کے بھی لگ جاتی تھی۔ غرضیکہ وُہ ایک بے رحم باؤلر تھے۔ ان کی گیند کے سامنے جو بھی آتا تھا سہم جاتا تھا۔

میچ کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ ہمارے گھر کے جتنے ممبران ہیں وہ اور ایک آدھ آدمی باہر سے ملا کر ٹیم بنائی جاتی تھی جو بالعموم چھ سات کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اِس دفعہ چونکہ چیلنج میچ تھا ہم نے اپنے محلّے کے ایک بہت ہی عمدہ کھلاڑی کو کھلانے کا فیصلہ کیا اِس سے والدِ محترم اور دُوسری ٹیم کو مطلع کر دیا۔ غنیم کیمپ میں بھی پریشانی کے آثار بہت نمایاں نظر آئے۔ ہم بہت خوش تھے۔ ہمیں اُدھر سے اطلاع بھجوائی گئی کہ اس میچ میں وہ ہمارے ایک ماموں تاج الدین جو گونگے ہیں کو کھلایا جائے گا۔ یہ خبر سن کر ہم تو خوش تھے کہ ایک وکٹ مفت ہاتھ آئے گی۔ میچ شروع ہونے سے ایک روز پہلے گھر میں کانفرنس ہُوئی۔ والد مرحوم نے کہا کہ ایک ایک کھلاڑی کم کر دیتے ہیں۔ اس طرح تاج الدین نہیں کھیل سکے گا۔ ہم نے پوچھا کہ تاج الدین سے آپ ہراساں کیوں ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ کمبخت گُلّی ڈنڈے کا بہت ظالم پلیئر ہے اور اگر ہم اس کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمارا بہت بُرا حشر کرے گا۔ ہم نے ان کی تجویز پر کوئی غور نہ کیا۔ دوسرے روز جب میچ شروع ہُوا تو ہم نے مخالف ٹیم کے تمام کھلاڑی آؤٹ کر لیے لیکن تاج الدین نے ہماری وہ دھنائی کی کہ اللہ کی پناہ! موصوف نے اکیلے ہی دو سو کے قریب سکور کر لیا۔ اس طرح وہ میچ ہم بُری طرح سے ہارے۔ میچ ہارنے کے بعد والد مرحوم نے کہا کہ آج تم لوگوں نے ناک کٹوا دی ہے۔

اُس دَور میں ہم بھی جوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ ان کے پاس تو وقت تھا ہی نہیں۔ ہم نے بھی سوچ لیا تھا کہ ہر وہ کام کریں گے جو ان کی خواہش کے اُلٹ ہو۔ چند دوست بھی ایسے مل گئے تھے جن کے بارے میں یہ گارنٹی تھی

کہ یہ لوگ بُرے آدمی کو بھی مزید بُرا بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پھر کیا تھا ایک ضد باپ بیٹے کے درمیان شروع ہو گئی ہم نے کہا نہیں پڑھیں گے۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پڑھا کر چھوڑوں گا۔ پھر اپنی پلاننگ کے ذریعے ایسا زیر کیا کہ مجبوراً پڑھتے ہی بنی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کشمکش کے دور میں شاید ہی کوئی دوسری معروفیت انہیں رہی ہو لیکن ان کی کوششوں نے یہ یقین ضرور دلا دیا کہ یہ اپنی دُھن کے پکے ہیں۔

اِس دَور میں اِن کے دو بالکل الگ اور نئے انداز میرے سامنے آئے، پہلی بات جو قابلِ ذکر ہے وُہ یہ تھی کہ جب بھی گھر میں یہ قدم رکھتے تھے گھر کے تمام افراد ان کو دیکھ کر خاموش اور سیریس ہو جاتے تھے اور یہ خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ شاید انہوں نے اِس بات کو محسوس کیا اور ایک دن فرمایا تم میرے آنے پر بالکل خاموش کیوں ہو جاتے ہو آپ لوگوں کو اس بات کی اہمیت کا علم نہیں ہے کہ ہنسنا صحت کے لیے کتنا مفید ہے اور پھر حکم دیا کہ جب میں گھر میں داخل ہُوا کروں تو بغیر کسی وجہ کے آپ سب لوگ قہقہے لگایا کریں تاکہ پھیپھڑوں کی ورزش بھی ہو، پھر کیا تھا جب یہ گھر آتے تو کوئی نہ کوئی ہنسنا شروع کر دیتا اور اس طرح آدھ گھنٹہ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ وقت ایک دوسرے کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے قہقہے لگاتے۔ اس دوران میں ہماری حالت جو بھی دیکھتا اُس کا پہلا تاثر یہی ہوتا تھا کہ میں پاگلوں میں گھُس آیا ہُوں۔ میری یادداشت کے مطابق صرف محمود عالم قریشی ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے ہمیں اِس حالت میں دیکھا۔

دُوسرا عجیب وغریب پہلو ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران دیکھا سب لوگوں کی فکریں تقریباً یکساں ہی تھیں لیکن اِن کی پریشانی سب سے منفرد اور انوکھی تھی۔ یہ بات مَیں دعوٰی سے کہہ سکتا ہُوں ہر آدمی کو پاکستان اور اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ ان کو پاکستان کی فکر تو تھی ہی، لیکن سب سے نمایاں پریشانی اُن خطوط کے بارے میں تھی جو ۱۹۶۸ء میں خطوط نمبر کی صورت میں آپ لوگوں کے سامنے آئے، میں نے اِن کو اپنی جان اور اپنی اولاد کے بارے میں اتنا فکرمند نہیں دیکھا جتنے یہ اُن خطوط کے لیے تھے۔

۱۹۶۵ء میں مَیں نے میٹرک پاس کیا۔ نمبر تھے تو اچھے مگر اتنے بھی نہیں کہ کسی بہت اچھے کالج میں داخلہ میرٹ پر مل جاتا۔ ہمارے ارادے پڑھنے کے تو تھے ہی نہیں مَیں نے اِس کا حل یہ نکالا کہ اِن سے صاف کہہ دیا کہ اگر فلاں کالج میں داخل کرائیں گے تو پڑھوں گا ورنہ نہیں۔ غصّے سے میری طرف دیکھ کر فرمایا، تمہیں پڑھانے کے لیے میں تمہاری ہر شرط پُوری کروں گا۔ اُسی وقت پرنسپل صاحب کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور مجھے کہا کہ یہ خط پرنسپل صاحب کے پاس خود لے کر جاؤ۔ اِس خط کا مضمون بھی کم وبیش وہی تھا جو آج سے پانچ سال پہلے مجھے سکول کے ہیڈ ماسٹر کے نام دے چکے تھے۔ یعنی

محترم!

اپنے بیٹے کو بھجوا رہا ہُوں، نالائق ہے ورنہ میرٹ لسٹ پر اس کا نام ہوتا۔ کرم کیجیے۔

پرنسپل صاحب کبھی خط پڑھتے اور پھر مجھے دیکھتے۔ کئی دفعہ انہوں نے خط کو اور مجھے دیکھا۔ نہ جانے اُن کو کیا خیال آیا کہ مجھے کالج میں داخل کرنے کے احکامات جاری کر دئے اور یوں میرا نہ پڑھنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔

۱۹۶۷ء کے دوران میں مَیں نے انٹر پاس کیا۔ ایک دن اِن سے مستقبل کے موضوع پر بات ہُوئی۔ مجھ سے پُوچھنے لگے کہ میاں! کیا ارادے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میں تو ایم اے اردو کروں گا اور نقوش کو دیکھا کروں گا۔ بہت حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر فرمایا کہ میاں تم کامرس پڑھو، نقوش کو ایک مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے۔ اگر تم یہ مہیا کر سکو تو یہ نقوش کی بالواسطہ خدمت ہوگی اور اس طرح یہ اپنے مضبوط مالی ڈھانچے کی بنیاد پر قائم رہ سکے گا۔

۱۹۶۹ء سے متعلق ان کی زندگی کے دو اہم واقعات ہیں جن میں سے ایک بیاضِ غالب کا چھپنا اور دوسرا لندن یاترا ہے۔ بیاضِ غالب کا اس طرح چھپنا ایک چونکا دینے والی بات تھی اس پرچے کی چھپائی میں جس رازداری سے کام لیا گیا وہ انھی کا حصّہ تھا دوسرا کوئی شخص اتنی اہم دستاویز کو اپنے پاس رکھتے ہوئے یوں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں پُورے وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ بیاضِ غالب کی تقریبِ رُونمائی جو کہ راولپنڈی میں ہُوئی اس سے دو روز قبل تک یہ بات کسی کے بھی علم میں نہیں تھی کہ آج کل یہ کیا کر رہے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے کئی دفعہ حسرت سے اس بیاض کا ذکر اِن سے کیا لیکن تقریبِ رُونمائی سے چند گھنٹے قبل ہی ان کو بتایا کہ آپ نے اُسی بیاض پر اس تقریب میں کچھ کہنا ہے۔ یہ سن کر مولانا غلام رسول مہر پر جو گزری وہ بیان سے باہر ہے۔

۱۹۷۰ء میں سانحۂ مشرقی پاکستان پر بُری طرح ٹُوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اِن کو مشرقی پاکستان سے متعلق اپنی وہ پیشگوئی یاد تھی جو انہوں نے ۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے دَورے کے دوران کی تھی جس سے متاثر ہو کر ان کے ایک دوست جناب حبیب انصاری مشرقی پاکستان سے اپنا تمام کاروبار سمیٹ کر کراچی آ گئے تھے۔ اس سانحہ کے کچھ عرصہ بعد ان کی پُوری فیملی ہمارے ہاں آئی اور ہم کو اُس تمام رُوداد سے آگاہ کیا کہ کس طرح طفیل صاحب نے آنے والے وقت کو تاڑتے ہوئے ہمیں منتقل ہونے کا مشورہ دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان تمام تکلیف دہ واقعات سے دور رہے جو وہاں قیام کی صورت میں ہمیں پیش آتے۔

۱۹۷۱ء تک میں نے ایم کام کر لیا تھا پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے جز وقتی سے کل وقتی طور پر کام سنبھالا تو سب سے پہلے میں نے اپنے ادارے کے کمزور ترین پہلو پر توجہ دی اور اِس ضمن میں جس پہلو نے مجھے متوجہ کیا وہ نقوش تھا۔ میں نے ایک سال کا مکمل گوشوارہ بنایا اور انھیں دکھایا کہ نقوش میں سالانہ کتنا نقصان ہو رہا ہے، اور یہ پرچہ ہمیں اور اِس ادارے کو کس طرح کھا رہا ہے! میری بات کو انہوں نے بہت توجہ سے سُنا اور فرمایا: میں نے تمہیں کامرس اس لیے نہیں پڑھائی تھی کہ تم نقوش سے ہی اپنی طبع آزمائی کا آغاز کرو۔ اُس دن نقوش کے رقیبوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ میں کوئی نہ کوئی ایسی تجویز پیش کرتا رہتا تھا جس میں رقابت کا جذبہ نمایاں ہوتا۔

والد صاحب میری تجاویز سُن کر ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے اور کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ کر دیتے تھے۔ میں اندر ہی اندر کھولتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ انہوں نے تو اپنے آپ کو نقوش کے ذریعے خراب کیا ہی ہے اب یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی محنت اور اُس کے صلے کو ہر سال نقوش کی بھینٹ چڑھا دیا کریں۔ اِس طرح چند سال گزر گئے۔ ۱۹۷۴ء کے آغاز میں سوچا کہ نقوش کی مزید ناز برداری ہمارے لیے تباہ کن ہو گی میں نے اِن سے بات کی۔ دلائل اور حقائق پر ان کی توجہ دلائی، جو جواب مجھے ملا آپ کے لیے بھی دلچسپ ہو گا، فرمانے لگے، میاں! تم سمجھ لو کہ یہ ایک علت ہے جو آپ کے والد میں موجود ہے اور یہ علت زندگی کے ساتھ چلے گی۔ جب میں نے اپنے تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو اِن سے کہا کہ کچھ اِس طرح کیجئے کہ نقوش کا سالانہ نقصان ۲۰ ہزار روپے تک کم ہو جائے۔ اُس دور کے پرچوں میں جو تسلسل نظر نہیں آتا اُس کی وجہ میری نقصان بچاؤ مہم اور سانحۂ مشرقی پاکستان تھا۔ جس نے اِن کو مایوسی کے گہرے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

اِن کے چہرے سے دو مواقع پر بے پناہ مسکراہٹ برستی تھی۔ ایک تو نقوش کے کسی قابلِ ذکر نمبر کے چھپنے پر یا پھر پاکستان کی کرکٹ ٹیم یا ہاکی ٹیم کے میچ جیتنے پر کبھی کبھار محمد علی کلے کے جیتنے پر بھی بہت خوش ہُوا کرتے تھے۔ لیکن محمد علی کلے سے اِن کو ایک شکایت تھی وہ یہ کہ لالچ کی بنا پر موصوف اپنے آپ کو خراب کر رہے ہیں۔ اور کہا کرتے تھے کہ پیسے کا لالچ اس بڑے شخص کی شہرت کو بُری طرح داغدار کرے گا۔ کرکٹ ہو یا ہاکی میچ، یہ کھیل کے دوران اپنی ٹیم کی کوتاہیوں پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور ان کوتاہیوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے، اس پر جو بھی چاہے ان سے بحث کر سکتا تھا جب اپنی ان کوتاہیوں کی بنا پر ہماری کوئی ٹیم ہار جاتی تھی تو ٹیم کی شان میں ایسی میٹھی میٹھی صلواتیں سناتے کہ سننے والا حیران رہ جاتا تھا کہ کیا یہ وہی محمد طفیل ہیں جو ہمیشہ خاموش رہنے کی قسم کھائے رہتے ہیں۔

نقوش سے متعلق اِن کے اپنے معیار تھے لیکن بعض دوسرے معاملات میں بھی اِن کی مہارت اور علم لاجواب تھا، یعنی یہ کہ لاہور میں فالودہ سب سے اچھا کس دُکان سے ملتا ہے! مچھلی، حلوہ پُوری، نہاری، کھیر اور آم اور اس طرح کی بہت سی دیگر اشیائے خوردونوش کے بارے میں اِن کی معلومات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا اور یہ اپنی انہی معلومات کی بنا پر اپنے احباب کی دعوتیں کرتے اور خوش ہوتے تھے۔ میں اِن کے بہت سے ملنے والوں کو جانتا ہُوں جن کی پسند تو الگ الگ تھی لیکن اس بات پر سبھی متفق تھے کہ اس سے اچھی چیز طفیل صاحب کے علاوہ اور کہیں پر بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ ایک دَور ایسا بھی تھا جب یہ بہت بڑے آم دشمن مشہور تھے یعنی درجنوں آم ایک ہی نشست میں کھا جانا ان کے لئے معمولی بات تھی۔

اِن کی شخصیت کا ایک پہلو کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آیا وہ ان کا اپنے مخالفین سے رویّہ ہے۔ ان کے مخالفین کی دو اقسام تھیں، ایک وُہ جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے تھے لیکن ان کی تخلیقات نقوش میں جگہ نہ پا سکیں۔ اور دوسرے وُہ جو رائٹرز گلڈ کے حوالے سے اِن کے حریف تھے۔ اول الذکر لوگوں کی تو یہ بالکل پروا ہی نہیں کرتے تھے لیکن دوسری قسم کے

لوگوں کی بات سُن لیا کرتے تھے۔ اِن میں سے وہ بھی تھے جن کو ضرورت مند سمجھ کر یہ کچھ رقم دے دیا کرتے تھے۔ ایک شخصیت ایسی تھی جس پر مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ وُہ صاحب اِن کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور وہ جب اِن سے ملتے تھے تو یہ کبھی بھی اس پہلو پر بات نہیں کرتے تھے کہ تم میری مخالفت کیوں کرتے ہو! الٹا اس کی ضرورتوں کا اِن کو بہت احساس رہتا تھا۔ میں یہ احوال دیکھ کر جلتا بھُنتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے اور پرویز نے یہ پروگرام بنایا کہ موصوف اب جس روز بھی آئیں گے ان کو باہر روک کر ان کی اچھی طرح مزاج پرسی کی جائے۔ پرویز کے ذمہ ان کو پریس کے باہر روکنا اور میری ڈیوٹی ان کی مرمت کرنا تھی۔ ایک دن میں پریس پہنچا تو موصوف والدِ محترم کے ساتھ دفتر میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ میں پرویز پر برس پڑا کہ تم نے ان کو اندر کیوں جانے دیا۔ پرویز نے بتایا کہ اباجی باہر آ رہے تھے کہ اِن سے اُن کا آمنا سامنا ہو گیا اور والدِ محترم ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے اپنے ساتھ لیتے ہُوئے دفتر میں داخل ہو گئے۔ میں تو برہم تھا ہی، جیسے ہی موصوف باہر نکلے میں اباجی سے ملتجی ہُوا کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اِس کو نہیں جانتا! میں نے حیرانی سے کہا، جب آپ اسے جانتے ہیں تو پھر اس پر اتنی نوازش کیوں؟ کہنے لگے کہ وہ اپنا کام کر رہا ہے اور خوش ہے، مجھے میرا کام کرنے دو۔ اور مزید کہا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس سے نفرت کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

۱۹۷۴ء میں ہمارے نئے گھر کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ گھر کے بارے میں اِن کے منصوبے بھی نقوش سے ملتے جلتے تھے۔ میں اس کام کے آغاز سے ہی حزبِ اختلاف میں تھا۔ میرا اندازِ فکر یہ تھا کہ ہمیں کسی ایسے کام میں رقم نہیں لگانی چاہیے جس سے منافع کی کوئی صورت وابستہ نہ ہو۔ اِن کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ تمام عمر مشقت میں گزری ہے۔ اب ہم زندگی کے اس موڑ پر ہیں کہ پُوری فیملی کے لیے ایک اچھا اور صاف ستھرا گھر ہونا چاہیے۔ اور یہ ضرورت کاروبار سے زیادہ مقدم ہے۔ بہرحال میرے علاوہ گھر کے تمام طاقتور ووٹ اِس معاملہ میں اِن کے ساتھ تھے۔ زمین خریدی گئی اور گھر کی ضروریات کے مطابق نقشہ بنوایا گیا انہوں نے ابتدا میں ہی صرف ایک استفسار کیا وہ یہ کہ مہمان خانہ کس جگہ ہوگا، اس کی پیمائش کیا ہے اور مہمان خانے کے بعض ضروری لوازمات کا بھی خیال رکھا جا رہا ہے یا نہیں۔ جب گھر کی تعمیر کا مرحلہ آیا یہ باقاعدگی کے ساتھ اس کا معائنہ کرنے شام کے وقت جایا کرتے تھے۔ کُل وقتی ذمہ داری والدہ صاحبہ کی تھی۔ جو بھی حصہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق نظر نہ آتا تھا اس کو گرا دیا جاتا اور دوبارہ اُس حصے کی تعمیر ان کی خواہش کے مطابق شروع کر دی جاتی۔ اس طرح توڑ پھوڑ اور بنانے کا عمل آٹھ سال تک جاری رہا۔ اس لیے ہمارا گھر اُس علاقے میں "توڑ پھوڑ والی کوٹھی" کے نام سے مشہور تھا۔ مختلف مراحل کی تکمیل کے بعد جب ہم اپنی نئی رہائش گاہ میں منتقل ہُوئے ہمارے گھر میں جو سب سے پہلے مہمان ٹھہرے وہ ہماری پھوپھی جیلانی بانو اور اُن کی فیملی تھی۔ اس کے بعد اس مہمان خانے کے نصیب ایسے جاگے کہ جس روز ہمارے ہاں کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو بچے حیرانی کے ساتھ والدِ محترم سے پوچھا کرتے تھے کہ ڈیڈی! مہمان کب آ رہے ہیں!

بھارت سے جب بھی کوئی قابلِ ذکر ادیب آتا یہ لاہور کے تمام اہم ادیبوں کو اپنے ہاں اکٹھا کرتے اور ان سے ملاقات کراتے۔ اور اِس طرح لاہور میں قیام پذیر ادبا اور شعرا اکثر ہمارے گھر کو رونق بخشتے۔ اسی دوران انہوں نے گھر پر

مختلف موضوعات پر مذاکرے کرانے کا اہتمام بھی کیا۔ کسی مخصوص موضوع پر مذاکرہ ہوتا۔ اِن مذاکرات میں سے بعض تو نقوش میں چھپ بھی چکے ہیں اور بہت سے مذاکرات ابھی چھپنا باقی ہیں غالباً مختلف موضوعات پر مذاکرات کرانا تنقید نمبر کی تیاری کا ایک حصہ تھا۔

اِن کی زندگی کا سب سے متاثر کن پہلو اِن کی اپنی والدہ سے محبت تھی۔ یہ اپنی زندگی کی تمام کامیابیوں کو اللہ کی رحمت اور اپنی والدہ مرحومہ کی دعاؤں کا ثمر کہتے تھے۔ مجھے اپنی زندگی میں کوئی بھی اہم خوشی یا غمی کا موقع یاد نہیں، جب انہوں نے اپنی والدہ مرحومہ کی قبر پہ حاضری نہ دی ہو۔ اگر بچوں کی شادی کی تو اس کی تقریبات کے آغاز سے قبل ہی اپنی ماں کی قبر پہ پہنچے۔ کسی نئے کام کا آغاز کرنے سے پیشتر اپنی والدہ مرحومہ کی قبرِ انور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اِن کا معمول تھا۔ انہوں نے زندگی میں متعدد مرتبہ یہ فرمایا کہ جب بھی مجھے کوئی دنیاوی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو میں اپنی والدہ مرحومہ کی قبر مبارک پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں اور میری مشکلات اِس احسن طریق پر حل ہو جاتی ہیں جس کا کوئی تصور بھی میرے ذہن میں نہیں

ستمبر ۱۹۸۱ء میں ادبی معرکے نمبر کی رسمِ اجرا پر صدرِ پاکستان جناب محمد ضیاء الحق ایک عام آدمی کی طرح تقریب میں شرکت کے لیے آئے اور سامعین کے درمیان بیٹھے۔ اِن کے اِس اچانک کرم کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ بہرحال ایک دلچسپ مرحلہ تھا جو ذہن میں تو محفوظ ہے لیکن اظہار ممکن نہیں۔ اسی موقع پر انہوں نے "نقوش ایوارڈ" کا اعلان کیا اور ادبی پرچوں سے سنسر اٹھانے کا اظہار بھی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب کچھ لمحات کے لیے 'نقوش' کو حسد کی بجائے رشک سے دیکھا گیا۔

پانچ برس تک والد مرحوم سنسر بورڈ کے رُکن بھی رہے۔ ایک ایسا آدمی جس نے اپنی زندگی میں بہت ہی کم فلمیں دیکھی ہوں اگر اس کو ہفتہ میں ایک یا دو پاکستانی اردو، پنجابی فلمیں مجبوراً دیکھنا پڑ جائیں تو اس شخص کی جو حالت ہو گی وہ حال ان کا بھی تھا۔ میرے خیال میں حکومت نے اِن کے اخلاق کو سنوارنے اور اِن کے علم کو بڑھانے کے لیے خصوص ریفریشر کورس انہیں کرایا تھا تاکہ اِن کے اپنی عاقبت سنوارنے کے منصوبوں میں کچھ رخنہ نہ پڑے۔

اب اِن کی زندگی کے سب سے اہم اور نمایاں کام یعنی رسولؐ نمبر کا ذکر بھی ہو جائے۔ اِس کے لیے ایک بار پھر مجھے اپنی روداد کا آغاز ۱۹۶۰ء سے کرنا ہوگا۔ جب دل کی شدید تکلیف کی بنا پر اِن پر یہ تاثر غالب تھا کہ شای اِن کی زندگی کے دن پُورے ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی زبان پر آ کہ اے اللہ! تُو اپنی حکمت کو بہتر جانتا ہے لیکن اِس بندۂ ناچیز کو اگر کچھ مہلت دیتا تو یہ گناہگار تیرے بندوں خدمت کے پُرعزم ارادے رکھتا تھا۔ پھر اسی تاثر کے ساتھ صحت یاب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مہلت مشروط طور پر ملی ہے۔ اندازِ فکر میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی، ہر وقت یہ سوچتے کہ میرے موجودہ کام میرے مرنے کے ب شاید ۲۵، ۵۰ سال مجھے زندہ رکھیں گے، کوئی کام ایسا کر جاؤں کہ ایک لمبی زندگی پاؤں۔

۱۹۶۲-۶۳ء کی بات ہے کہ ایک رات والد مرحوم نے خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ نکالی کہ کوئی ایسا کا

کر دوں جس سے لوگ فیضیاب ہوتے رہیں۔ سوچ کے گھوڑے دوڑاتے اور اس نتیجے پہ پہنچے کہ سیرتِ طیبہ پر کام کیا جائے ایک ایسا کام جو اِن کو ہمیشہ کے لیے امر کر دے۔ اس طرح سیرتِ رسولؐ پر کام کا آغاز ذہنی طور پہ ہوا۔

۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ ایک روز میں خلافِ توقع وقت سے پہلے پریس پہنچا، میں نے دیکھا کہ یہ ٹہل رہے ہیں اپنی سوچ میں ایسے محو کہ اردگرد کی کوئی خبر نہیں۔ میں کچھ دیر تک کھڑا دیکھتا رہا، بالآخر میری طرف متوجہ ہو کر مخاطب ہوئے، آج اتنی جلدی کس طرح آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں تو کالج کی فیس لینے آیا ہوں۔ یہ سن کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ بھی ہاتھ میں آیا بغیر دیکھے مجھے تھما دیا۔ جب میں نے پیسوں پر نظر ڈالی تو وہ رقم فیس کے علاوہ بھی اتنی زیادہ تھی کہ میں تین ماہ تک کا خرچ بآسانی چلا سکتا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار اِن کی نظرِ کرم سے پریشان تھا اور یہ اپنی سوچوں میں محو ٹہل رہے تھے۔ میں کافی دیر تک کھڑا رہا، اچانک مجھے اُسی جگہ پا کر پُوچھنے لگے: تم ابھی تک موجود ہو کالج نہیں گئے! نہ جانے کیوں مَیں نے ہمت کر کے پوچھ لیا: آج آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کافی دیر تک خاموش ٹہلتے رہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں ایک ایسا نمبر چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہُوں جس کو میں اپنا سب کچھ بیچ کر بھی چھاپوں گا اور لوگ اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے خریدیں گے۔ میں نے یہ سُن کر بلند آواز سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور پُوچھا: "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ تو یقین ہے کہ آپ اپنا سب کچھ بیچ کر یہ نمبر ضرور چھاپ دیں گے لیکن لوگ اپنی حوائج و ضروریات کو پسِ پُشت ڈال کر اسے خریدیں گے مجھے اس کا یقین نہیں۔ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے اِس نمبر کے موضوع کے بارے میں پُوچھا تو کچھ دیر سوچ کر فرمایا: وہ نمبر اس دنیا کی سب سے بڑی شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہوگا۔ یہ اِس کام کے بارے میں غالباً ان کا سب سے پہلا اظہار تھا۔

۱۹۷۲ء میں اِس نمبر کی کتابت کا آغاز ہوا۔[1] ۱۹۸۱ء میں ایک روز قاضی مختار احمد نے جنہوں نے رسول نمبرؐ کی کتابت کا آغاز ۱۹۷۲ء میں کیا تھا طفیل صاحب مرحوم سے کہا کہ میں چاہتا ہُوں کہ یہ نمبر میری زندگی میں ہی چھپ جائے۔ اِنہوں نے اِس فکر کی وجہ پُوچھی تو اُنہوں نے فرمایا کہ پچھلے دس سال سے میں اِس نمبر کی کتابت کر رہا ہُوں لیکن آپ اس نمبر کو چھاپنے کی طرف آ ہی نہیں رہے۔ اس مرحلہ پر اِن کو احساس ہُوا کہ وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے اور اگر اِس کام کا آغاز نہ کیا تو اس موضوع کی وسعت اتنی ہے کہ یہ کام مکمل نہیں ہو سکے گا۔ ۱۹۸۱ء میں اس نمبر کی طباعت کے لیے خاکہ بنانا شروع کیا۔ ستمبر ۱۹۸۱ء میں اِس نمبر کی اشاعت کا اعلان کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی اِس موضوع کی برکتوں اور رحمتوں کا اظہار اِن پہ ہونے لگا۔ یہ تحریر ان کی رحلت کے بعد مجھے ان کے کاغذات سے ملی:

"رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہر دم میرے پاس تھے، مگر میں اُن کے پاس نہیں تھا۔ آج وُہ مرحلہ بھی طے ہُوا، مَیں اُن کے قدموں میں موجود تھا۔

خواب میں کوئی نورانی صورت مجھے اُڑائے لے جا رہی تھی۔ پہلے وُہ مجھے خانہ کعبہ لے گئی۔

---

[1] اِن کے علاوہ محمد شریف گل، بشیر علی پوری اور صادق علی نے بھی کتابت کی۔

وہاں کے سب آثار دکھائے۔ چاروں طرف گھمایا۔

اس کے بعد وہ ہستی مجھے مسجد نبوی لے گئی۔ مسجد نبویؐ میں گھمایا۔ معاً ایک اور ہستی نمودار ہوئیں۔ انھوں نے بتایا:

آپ کے ساتھ رسولِ عربیؐ ہیں!

دھیان میں آیا مجھ سے مخاطب حضرت علیؓ ہیں۔

اس کے بعد جاگ اُٹھا، میرا جسم کانپ رہا تھا، پلنگ ہل رہا تھا، خوف تھا مگر سکون آمیز خوف!

مجھے زندگی بھر سچے خواب آتے رہے۔ میری زندگی میں خوابوں کو بڑا عمل دخل ہے۔ مگر یہ کیسے یقین کر لوں کہ جو کچھ دکھایا اور بتایا گیا وہ سچ تھا!

زندگی میں پہلی بار اپنے خواب کے سچ ہونے پر متذبذب ہوں — اِس لیے کہ میں تو گنہگار انسان ہوں — اِتنا گنہگار کہ رُوئے زمین پر اور کوئی نہ ہوگا!

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہر دم میرے ساتھ تھے، مگر میں اُن کے پاس نہ تھا۔ آج وہ مرحلہ بھی طے ہوا۔

میں اُن کے قدموں میں موجود ہوں۔"

جون ۱۹۸۲ء میں عمرہ کے لیے گئے۔ واپسی پر مجھ سے جو اظہار کیا وہ یہ تھا کہ "رسولؐ نمبر کے لیے جو ترتیب میرے ذہن میں تھی، مسجد نبوی میں وہ ترتیب ذہن سے محو ہو گئی، نئی ترتیب مجھے سجھائی گئی جس کے ساتھ رسولؐ نمبر چھپا۔ اب جب میں اپنی پہلی ترتیب کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب بہت زیادہ جامع اور موضوع کی مناسبت سے اہم اور بہتر ہے۔"

دُوسرا اظہار اسلم کمال سے کیا۔ دیارِ حرم سے واپسی پہ کہا: "اسلم کمال! میں نے جو جو مقامات دیکھے اور جہاں جہاں بھی گیا ہوں ہر ہر لمحہ اور ایک ایک ساعت میرا گمان نہ تھا بلکہ یقین تھا کہ یہ سفر مجھ پر دُہرایا گیا ہے، میرے قلب و رُوح پر تازہ کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ میرے آقا و مولا کی رحمت مجھ پر اس قدر ہے ———" اور پھر محمد طفیل کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اگست ۱۹۸۲ء کا ذکر ہے کہ میں نے ان کو ایک روز پریس کے صحن میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ جب کسی اہم مسئلے پر سوچ بچار کر رہے ہوں تو سوچنے کا تمام عمل ٹہلنے کے دوران میں مکمل ہوتا ہے۔ میں نے استفسار کیا کہ آج کون سے مسئلے پر سوچ بچار ہو رہی ہے۔ کہنے لگے کہ رسولؐ نمبر کی پہلی دو جلدیں جو میں نے آپ لوگوں کو چھاپنے کے لیے دی ہیں وہ خالصتاً ریسرچ سے متعلق ہیں۔ وہ عام قارئین جن کو اِس موضوع سے محبت ہے،

اُن کے لیے پہلی دو جلدوں میں کچھ نہیں ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلی چار جلدیں بیک وقت مارکیٹ میں آئیں ورنہ لوگوں کو یہ احساس ہوگا کہ رسولؐ نمبر عام لوگوں کے فہم سے بالاتر صرف سکالر حضرات کے لیے ہے۔ میں نے کہا آپ چار جلدیں چھاپ لیں۔ فرمانے لگے کہ پیسے اتنے نہیں ہیں کہ بقیہ دو جلدوں کے اخراجات پُورے ہو سکیں۔ اور پھر حسرت سے کہا کہ کمبخت کوئی مشین بِک جاتی تو یہ الجھن نہ ہوتی۔ یہ سن کر میں نے کہا، آپ چار جلدیں ہی چھاپیں۔ حیرانی اور مسرت سے میری جانب دیکھ کر کہا: کیا تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کہنے لگے: اگرچہ باپ کو بیٹے سے قرض نہیں لینا چاہیے لیکن اس کام کے لیے یہ بھی سہی۔ اِس طرح چاروں جلدیں چھپنا شروع ہوئیں ان کی تکمیل سے پہلے ہی ایک مشین بِک گئی اور انھوں نے قرض کی رقم مجھے واپس کر دی۔

اگست ۱۹۸۲ء میں انہوں نے رسولؐ نمبر کی طباعت کا کام ہمارے سپرد کرنا شروع کیا، اِن کی عادت تھی کہ فہرست اور ابتدائی صفحات سب سے بعد میں طبع کراتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن انہوں نے پہلی چار جلدوں کے ابتدائی صفحات ہمیں دیے تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا والد ایک عام انسان نہیں ہے بلکہ یہ اُن میں سے ہیں جن پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ رسولؐ نمبر کی پہلی جلد کا 'طلوع' پڑھ کر میں اپنے آپ میں نہ رہا اور بے اختیار دل سے دُعائیں نکلیں۔

پہلی چار جلدوں کی جو پذیرائی ہُوئی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص تھی ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ اسلام آباد سے فون آیا ہے حکومت اِس کام پر مجھے انعام دینا چاہتی ہے تمہارا کیا خیال ہے، مجھے ان سے کیا کہنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا: آپ اسلام آباد ضرور جائیں، اگر انعام واقعی قابلِ ذکر ہو تو ضرور لیجئے ورنہ انعام کی رقم وہیں کسی رفاہی کام کے لیے دے آئیں۔ میری اس بات کو انہوں نے بہت پسند کیا اور اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

اگلے برس رسولؐ نمبر کی مزید چھ جلدیں چھپیں اور اہلِ نظر نے اس کام کو سیرتِ طیبہ پر سب سے بڑا اور اہم ذخیرہ قرار دیا۔ جولائی ۱۹۸۴ء میں اِن کو کام سے دُور رکھنے کے لیے ایک 'سازش' کے تحت چند ماہ یورپ میں ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔

اس سفر کی رُوداد چونکہ اِس نمبر کا حصہ ہے اس لیے مجھ پر جو سفر کے دوران گزری اسے کسی اور وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہُوں، میں صرف چند ایسی باتوں کا ذکر کروں گا جو میرے خیال میں اہم ہیں۔ ایک روز رسولؐ نمبر کی آخری تین جلدیں زیرِ بحث آئیں میں نے ان کی ترتیب کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی۔ میری طرف حیرت اور مسرت سے دیکھا اور کہا تم ہی میرے بچّوں میں سے ایسے ہو جو میرے اِس کام کو کر سکتے ہو، لیکن تم ہی اتنے نالائق ہو کہ تمہاری توجہ اس طرف ہے ہی نہیں۔ میرے لیے یہ بات ایک انکشاف تھا۔ اُس لمحے میرے ذہن میں یہ آیا کہ نقوش کا عاشق نقوش کے مستقبل کو اس کے وِلن کے ہاتھوں میں محفوظ تصوّر کرتا ہے ان کی اس سادگی پہ حیرانی ہُوئی اور اس تصور سے پریشانی بھی کہ میرے بارے میں یہ کس قدر خوش فہمی میں مبتلا ہیں!

فروری ۱۹۸۵ء تک سیرتِ رسولؐ کی بقیہ تین جلدیں جب تیار ہوئیں تو میرے لیے حیرت کا پہلو یہی تھا کہ ان تین جلدوں میں میری تجویز کردہ تبدیلی کو انہوں نے قبول کر لیا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک روز نوائے وقت لاہور کے ایک پورے صفحے پر نقوش رسولؐ نمبر کے بارے میں تبصرہ میری نظر سے گزرا، میں جب پریس پہنچا تو یہ پریس کے صحن میں ٹہل رہے تھے میں نے انہیں بتایا کہ آج کے نوائے وقت میں ان کی اِس کاوش کو کس طرح سراہا گیا ہے! میں نے کہا کہ ایک ایسا کام اللہ تعالیٰ نے آپ سے کرایا ہے جس کے بارے میں کسی کو بھی احساس نہیں تھا کہ یہ کام آپ کے ہاتھوں اس شان سے ہوگا۔ میری بات سُن کر چند لمحے خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ سیرتِ رسولؐ ایک ایسا موضوع ہے جس کا کوئی انسان بھی حق ادا نہیں کر سکتا، جس نے بھی اِس موضوع پر قابلِ ذکر کام کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی شرم رکھنے کے لیے اُسے دنیا میں زیادہ دیر تک رہنے کی مہلت نہیں دی۔

اگر آپ رسولؐ نمبر کی تکمیل کے بعد ان کی تحریروں کا جائزہ لیں تو یہ تاثر آپ کو ان سے ملے گا کہ جس کام کے لیے زندگی کی مہلت ملی تھی وہ مہلت ختم ہو گئی ہے۔

۶ جنوری کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے جو کئی احباب کو لکھی:

> "میں نے جتنا کام کرنا تھا، جو کچھ کرنا تھا وہ سب کر لیا۔ اب مجھے کچھ نہیں کرنا۔ اب مجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے انسانی توفیق جتنی کچھ ہو سکتی تھی وُہ اتنی کچھ ہو سکتی تھی!
>
> زندگی کی اِس منزل پر میری خواہش ہے کہ اہلِ علم میرے جُملہ کاموں کا جائزہ لیں کیا آپ میرے لیے میرے پیش کردہ نمبروں میں سے کسی نمبر پہ ایک تفصیلی مضمون عنایت فرما سکتے ہیں؟ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ اِس کام کے سلسلہ میں زیادہ منّت خوشامد بھی نہ کروں گا۔ کیونکہ میں یہ جان لُوں گا کہ میری ۳۵ سالہ ریاضتوں میں زیادہ خلوص نہ تھا، ناحق مرتا رہا۔
>
> میں ادب سے ریٹائر نہیں ہو رہا۔ بس کہنا یہ تھا کہ تھک گیا ہُوں۔ دُوسرے غیبی آواز کو بھی بروقت سُن لینا چاہیے۔"

عیدالفطر کے موقع پر لکھا:

> "اللہ کے احسانات میں سے ایک اور احسان کہ جس نے مجھے مہلت دی کہ میں آپ کو دیکھ سکوں اور آپ سے گفتگو کر سکوں، میں بھی کتنا خوش قسمت ہُوں۔"

یکم جولائی ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ مجھے اپنے آفس میں بُلایا اور کہا کہ میں پشاور فلاں کام سے جا رہا ہُوں۔ میں نے کہا کہ آپ کی طبیعت چند روز پہلے بھی ناساز رہی ہے آپ نہ جائیں اور اگر جانا ہی ہے تو ہوائی جہاز سے جائیں۔ کہنے لگے کہ گاڑی کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر اپنی گاڑی ہو تو بہتر ہے میں ایک روز جاتی دفعہ اسلام آباد

ٹھہر جاؤں گا۔ اور ایک روز واپسی پر اُس موقع پر دُنیا جہان کی باتیں اِن سے ہوئیں۔ آخری بات جو اِن سے ہوئی وُہ یہ تھی کہ گھر جاتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: یار! تم پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے جواب دیا: مجھ پر کون سی ذمہ داریاں ہیں جس طرح آپ فرماتے ہیں ہم عمل کرتے ہیں۔ کہنے لگے "تم نہیں سمجھتے، لیکن تم پہ بہت ذمہ داریاں ہیں"۔ یہ ہیں وہ آخری الفاظ جو مجھے احساس دلاتے ہیں کہ وُہ اپنی تمام ذمہ داریاں میری طرف منتقل کر گئے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے ہر دم دُعا کرتا ہوں کہ اللہ اِن کے کہے کی لاج رکھنا!

غیرمطبوعہ تحریریں

یادداشتیں

ناچیز

محمد طفیل

ناچیز

میں حاسد ہوں۔ چاہتا ہوں ہر اچھا کام میرے علاوہ کوئی نہ کرے۔

میں کم علم ہوں، میرا سارا وقت اپنے علمی تشخّص کو برقرار رکھنے میں خرچ ہو جاتا ہے

میں حُسن پرست ہوں، مگر یہ بات میں نے بہت ہی کم لوگوں کو بتائی ہے

میں وقت سے پہلے کوئی کام نہیں کرتا۔ وقت کے وقت "تھرتھلی" پڑتی ہے۔

میں صفائی کو پسند کرتا ہوں، مگر میرے اردگرد کاغذوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔

میں زیادہ تر سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔ عمل کم تر ہو پاتا ہے۔

میں کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے کی مکمل اور عملی تفسیر ہوں۔

میں خود کاہل ہوں، مگر دوسروں کی کاہلی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔

میں ایسا مدیر ہوں، جس کی پہلی نظر، ہر مضمون پہ تعصب کے ساتھ پڑتی ہے۔

میں اکثر گھاٹے کے سودے کرتا ہوں اور پھر ان پہ اتراتا ہوں۔

میں ایسا بے وقوف ہوں جس کی نظر میں عقلمندی کا مفہوم وہ نہیں جو دوسروں کی نظر میں ہے۔

میں ایسا گنہ گار ہوں کہ وہی عیوب جب دوسروں میں دیکھتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں

مَیں

پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء

مَیں لاہور کا رہنے والا ہُوں۔ آبا و اجداد کا بھی جہاں تک سراغ مِلا ہے وہ بھی لاہور ہی کے تھے۔ جب ہوش نے آنکھیں کھولیں، تو بندہ نے اپنے آپ کو محلہ جوگیاں، اندرون بھاٹی گیٹ میں پایا۔ وہ بھاٹی گیٹ جسے حکیم احمد شجاع مرحوم نے "لاہور کا چیلسی" کہا۔ چیلسی لندن کا وہ بازار ہے، جس میں بڑے بڑے مصوّر، موسیقار اور ادیب پیدا ہوئے۔

تعلیم محض اس وجہ سے ادھوری رہی کہ گھر میں راج غریبی کا تھا۔ والدین میرے لیے بہت کچھ کرنے کے ارمان رکھتے تھے۔ مگر وہ حالات کے ہاتھوں بے بس تھے۔ میری تعلیم نے جب والدین کی بے بسی کو آزردگی کی سرحد تک پہنچا دیا، تو مَیں نے خود بھی تعلیم کو جاری رکھنا پسند نہ کیا۔ گھر والوں کے لیے دال روٹی کے چکر میں پڑ گیا۔ مَیں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا ضرور رہا ہوں، لیکن میرے پاس میٹرک کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔

مَیں الرائی برادری سے تعلق رکھتا ہُوں، جس میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے۔ اس برادری کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ذہانت اور فطانت میں کسی سے کم نہیں، مگر سادہ اتنے ہوتے ہیں کہ جس کا بھی جی چاہے کہنی مار کے آگے نکل جائے۔ مات دینے کی نہیں مات کھانے کی اہلیت رکھتے ہیں

والدین

میرے والدِ گرامی کا نام میاں عمرالدین ہے، والد صاحب بے حد وجیہ اور خوبصورت تھے۔ مگر عینِ جوانی میں دمہ کا مرض لاحق ہو گیا، جس کے باعث جوانی کو گھن نے کھا لیا۔ جتنا جمع جتھا تھا، وہ سب بیماری کی نذر ہوا۔ ایک چھوٹا سا مکان، مرض نے باقی چھوڑا، آخر آخر میں، وہ بہت لاغر ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن کہا: ایک وقت وہ تھا کہ جدھر سے گزرتا تھا، لوگ مجھے دیکھتے تھے۔ ایک یہ وقت ہے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ بالآخر فروری ۱۹۴۳ء میں انتقال ہو گیا۔ ایک سہارا تھا، وہ بھی چھن گیا۔

میری والدہ کا نام امام بی بی ہے، وہ عجیب ہستی تھیں۔ خاندان بھر میں اُن کی حیثیت مرکزی تھی۔ ہر مشورہ ان سے ہوتا تھا۔ ہر فیصلہ اُن کا ہوتا تھا۔ وہ سب سے محبت کرتی تھیں۔ سب ان سے محبت کرتے تھے۔ چونکہ والد اپنی بیماری کی الجھن کی وجہ سے عاجز تھے، اس لیے ہماری پرورش اور نگہداشت زیادہ تر والدہ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ عبادت گزار تھیں۔ اس لیے ان کی دعاؤں میں بھی اثر تھا۔ میں آج اپنے آپ کو جس جگہ پر دیکھ رہا ہوں، وہ زیادہ تر والدہ کی تربیت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے، ورنہ مجھ ایسا بے نوا اور بے یار و مددگار، اپنے وجود کی نشان دہی تک نہیں کرا سکتا تھا۔ نہ بڑے خاندان کا سپوت، نہ امارت، غرض کوئی وصف بھی تو نہ تھا۔ والدہ کا انتقال ۵ جولائی ۱۹۵۸ء کو ہوا۔ گویا سب کچھ چھن گیا۔

بہن بھائی

ہم تین بھائی ہیں اور ایک بہن تھی۔ بہن سب سے بڑی تھی۔ اس کی خوبصورتی کے آج بھی خاندان بھر میں چرچے ہیں۔ اس کی کم گوئی اور سُوجھ بوجھ کے آج بھی سب معترف ہیں۔ مگر وہ عین جوانی میں ہم سے روٹھ کر چلی گئیں۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے سے وہ مجھے سرزنش بھی کیا کرتی تھیں۔ کسی ایسے ہی موقع پر جو مجھے غصّہ آیا تو میرے ہاتھ میں جو قینچی تھی، اس سے اُس کے ہاتھ لہولہان کر دیے۔ وہ میرے واروں کو اپنے ہاتھوں پر روکتی رہیں اور زبان سے صرف اتنا کہتی رہیں "شرم کرو، شرم کرو"۔ آج جو ہم میں وہ موجُود نہیں، تو میں اپنے ہاتھوں کو نہیں، دل کو لہولہان پاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی خاتون مجھے بھائی کہہ کر پکارتی ہے، تو مَیں اس کا احسان مند ہوتا ہوں۔

میرا ایک بھائی محمد اکبر ہے، جو اپنی زندگی میں پنپ نہ سکا۔ اُس نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا قسمت نے سلجھنے نہ دیا۔ پھر وہ آج سے بیس سال پہلے ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ آج ٹی بی کوئی خطرناک بیماری نہیں رہی۔ مگر اُن دنوں تھی۔ میں نے زندگی میں اگر کوئی اچھا کام کیا، تو یہی کہ اس کی بیماری پر اندھا دھند روپیہ خرچ کیا اور اسے موت کے مُنہ سے چھین لیا۔

دوسرا بھائی محمد اکرم ہے۔ اُسے مَیں نے بھائی کم، بیٹا زیادہ سمجھا۔ کیونکہ جب ہمارے والد کا انتقال ہُوا تو یہ پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کی شادی ہوئے اٹھارہ برس ہو گئے ہیں، لیکن مَیں نے اُسے اپنے سے جدا نہیں کیا۔ وہ اللہ کے فضل سے آسودہ ہے۔ مگر مَیں چاہتا ہُوں کہ ہر دم میری نظروں کے سامنے رہے۔

میری شادی

جب میری شادی ہوئی (۳۱ ردسمبر ۱۹۴۰ء) اس وقت مَیں لڑکپن ہی کی سرحد میں تھا۔ چنانچہ مَیں نے بہت چاہا کہ ابھی میری شادی نہ ہو مگر میری کوئی پیش نہ گئی۔ والد صاحب نے اپنی بیماری کا حوالہ دیا "میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں شادی ہو جائے"

جب میں نے والدہ صاحبہ سے بات کی، تو انہوں نے فرمایا: "یہ رشتہ کسی دوسرے خاندان میں نہیں ہو رہا کہ جواب دے دوں! ——— بھائی ناراض ہو جائے گا۔"

میں نے والدہ سے کہا: "ناراضی وقتی ہوگی۔ کسی بھی طرح اس مسئلے کو ابھی روکیں۔"

"بھائی نہیں مانتا۔"

"بھائی کی ضد پر مجھے قربان نہ کریں۔ کیونکہ مَیں ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤں گا۔"

"بھائی کوئی بات نہیں سنتا۔ اگر تو بھی اپنی بات پر اڑ گیا، تو بھائی چھوٹ جائے گا۔"

جب مَیں نے والدہ کو بھی بھائی کا طرف دار پایا، تو مَیں خاموش ہو گیا۔ میں اپنی شادی میں، بہ طور مجبوری شریک ہوا۔ اگر بینڈ باجے والوں سے گھر والوں نے معاملہ طے کر لیا تھا۔ تو مَیں خود شادی سے دو دن پہلے جا کر کہہ آیا تھا "آنے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا "ہم بیعانہ واپس نہ کریں گے۔" مَیں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں۔"

خود سے اپنی شادی کا بھی کسی دوست سے نہ کہا۔ چنانچہ جب میرے ایک ہندو دوست ادم پرکاش کو علم ہوا، تو وہ از خود چلا آیا۔ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لایا۔ دلہن کے لیے کپڑے بھی لایا، حتیٰ کہ سہرا بھی لکھ کر لایا۔ اس نے مجھ سے کہا: طفیل صاحب! تم نے تو مجھے بلایا ہی نہیں۔ لیکن میں خود ہی چلا آیا ہوں۔

بیوی

میری بیوی کا نام عنایت خانم ہے۔ پہلے دن جو والدہ نے بیگم کا استقبال کیا، تو بسم اللہ کے لفظ سے۔ اس دن سے والدہ نے میری بیوی کو بسم اللہ کے نام ہی سے پکارا۔ یہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی ہیں مگر مَیں

انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا ہوں کہ مجھ سے دو سال بڑی ہیں۔ ہمارے چونچلے خاندان بھر میں مشہور ہیں۔

غریبی تیں جیسا ساتھ انہوں نے دیا۔ کم کسی نے دیا ہوگا۔ صبر و قناعت کا مجسمہ ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری شادی ہوئی، تو انہیں دو روپے ماہوار جیب خرچ کے طور پر ملا کرتے تھے۔ بعد میں وہ بھی ہاتھ کی تنگی کے باعث بند ہو گئے تھے۔ ان کی زبان پر جیسا کلمۂ شکر پہلے تھا۔ ویسا ہی آج بھی ہے۔ ایک وقت صبر کا تھا۔ ایک وقت شکر کا ہے۔

رشتہ خاندان ہی میں ہوا۔ یہ میرے ماموں کی بیٹی ہیں۔ وہ ماموں جنہیں ہم نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنا سب کچھ جانا۔ یہ ہمارے سرپرست بھی ہیں۔ دوست بھی ہیں۔ سرپرست اس لیے کہ والد کی جگہ ہیں۔ دوست اس طرح کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر تاش بھی کھیل لیتے ہیں۔

میری بیوی بڑی دبنگ قسم کی خاتون ہیں۔ اپنے سے چھوٹوں پہ خوب رعب جما رکھا ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ سب رعب کھاتے ہیں اور چوں نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بھی چوں نہیں کرتا۔ ورنہ اس کا بڑا امکان تھا کہ رسّی تڑا کے بھاگ جاتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ؎

گو رسیاں تڑا دُوں رہائی محال ہے۔
دہری کمند ہو کے وہ زلفِ دوتا لگی

میرے بہت سے ارمان تو میرے سینے میں اس لیے بھی گھٹ کے رہ گئے کہ میں بزرگوں کو چھوڑ کر اپنے خاندان میں سب سے بڑا ہوں۔ سب کے لیے نمونہ بننا چاہتا ہوں۔ ورنہ شیطان سے یارانہ اپنا بھی رہا ہے۔ اس نے بھی مجھے وہ وہ بہکایا اور میں نے بھی اسے وہ وہ بہلایا کہ اس کھیل میں نہ وہ تھکا اور نہ میں ہارا۔

اولاد

میرے چار بیٹے ہیں۔ ایک بیٹی، جو سب سے بڑی تھی۔ اس کا دو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ بڑی پیاری تھی۔ خوب صورت اور موہنی۔ سب اس سے پیار کرتے تھے۔ مگر وہ کسی سے پیار کرنے کے لیے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہی۔ وہ ماں سے زیادہ مجھے چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا، تو وہ اس وقت میری گود میں تھی مجھے آج بھی وہ سماں یاد ہے کہ جب اس کا ہم سے جدا ہونے کا وقت آیا، تو اس نے مجھے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے کہا تھا کہ مجھے "اٹھا لو" اور "بچا لو"۔ میں اس کی آرزو کے ایک حصے پر عمل کر سکتا تھا۔ دوسرے حصے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔

میرا بڑا لڑکا فاروق احمد ہے۔ (تاریخ پیدائش ۲۹ر نومبر ۱۹۴۵ء) جس کا نام برادرم احمد ندیم قاسمی نے

رکھا تھا۔ یہ بچپن ہی میں چند ایک بیماریوں میں ایسا گھرا کہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ یہ آج کل ادارہ فروغ اُردو کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ۲۶ رمئی ۱۹۷۳ء کو اس کی شادی کر دی۔ نیک اور سعادت مند ہے۔ خاموش اور سنجیدہ ہے۔

دوسرا بیٹا جاوید اقبال ہے (تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۴۹ء) اس کا نام جاوید اقبال اس لیے رکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے بیٹے کا یہی نام رکھا تھا۔ انہوں نے اس سال (۱۹۷۳ء) ایم کام کا امتحان دیا ہے۔ یہ سب بچوں میں ذہین ہے۔ موج کا آدمی ہے۔ اپنی عمر کی طرح اس کے حوصلے بھی جوان ہیں۔ آج کل نقوش پریس کی نگرانی میں دلچسپی لے رہا ہے۔

تیسرا بیٹا پرویز احمد ہے (تاریخ پیدائش ۱۷ رفروری ۱۹۵۱ء)، میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں اپنے سارے بچوں کے نام بڑے ادیبوں کے بچوں کے نام پر رکھوں گا۔ مگر پرویز کا نام، میری بیوی کی ایک سہیلی نے رکھ کر اصرار کیا کہ یہی نام رہے گا۔ لہٰذا یہی رکھنا پڑا۔ یہ ان دنوں تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا ہے۔ فیشن کا دلدادہ ہے۔ مگر ہر بات پر بلیک کہنے والا!

چوتھا بیٹا اخلاق احمد ہے۔ (تاریخ پیدائش ۲۵ رمئی ۱۹۵۳ء) جو ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ یہ بھی بڑا سیدھا سادا ہے۔ غصہ میں تیز ہے۔ سب سے بڑا بچہ اور سب سے چھوٹا بچہ، چونکہ غریبانہ طبیعتوں کے مالک ہیں۔ اس لیے میں انہیں اپنا بیٹا کہتا ہوں۔ چونکہ جاوید اور پرویز خاصے ہوشیار ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ تو اپنی ماں کے بیٹے ہیں۔

بیٹے کی شادی

میرے بڑے بیٹے فاروق احمد کی شادی، ۲۶ رمئی ۱۹۷۳ء کو ہوئی۔ میری زندگی کا یہ اس نوع کا پہلا مرحلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھبرایا ہوا تھا۔ مگر قدرت کو میری نیک نامی اور عزت مطلوب تھی۔ شادی کا چرچا خوب ہوا۔ اپنے اور غیر سبھی خوش ہوئے۔ بڑے بڑوں نے یہ کہا کہ پڑھے لکھوں کا اتنا بڑا اجتماع، پہلے نہیں دیکھا۔ شادی میں نہ صرف لاہور کے احباب شریک ہوئے بلکہ دیگر شہروں سے بھی کرمفرما پہنچے۔ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان آمدورفت کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا، تو ہندوستان کے بھی دوست شریک ہوتے۔

شادی میں تقریباً تمام ادیب اور شاعر موجود تھے۔ ان کے علاوہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے سیکرٹری، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج بھی موجود تھے۔ حد درجہ اپنائیت کی فضا تھی۔ ہر طرف خوشیوں کا راج تھا۔ اس تقریب کے لیے ابوالاثر حفیظ جالندھری نے مندرجہ ذیل دعائیہ کلمات کہے:

خانہ آبادی کا دن

بہ تقریبِ شادی فاروق احمد سلّمہٗ فرزند طفیل نقوش

اے مرے نورِ نظر فاروق فرزند طفیل
ہو مبارک تجھ کو تیری خانہ آبادی کا دن
مَیں دُعا کرتا ہوں دولہا اور دُلہن خوش بخت ہوں
شادمانی کو بڑھائے اور اس شادی کا دن

○

دیکھ اے فاروق تیرے عقد میں آئی ہے آج
اک رفاقت جس کا دامن ہے پناہِ زندگی
اس رفاقت کو نبھانا ہے تجھے مردانہ وار
اے بھتیجے، ہے یہی تو رسم و راہِ زندگی

○

اِس رفاقت ہی سے ہے گلزارِ عالم میں بہار
اِس رفاقت ہی سے ہے شامِ غریباں صبحِ عید
اِس رفاقت پر روایاتِ کہن کا ہے مدار
اِس رفاقت ہی سے ہے تازہ اُمیدوں کی نوید

○

گُل میں خوشبو اور جیسے ساز میں آہنگ ہے
ربطِ باہم سے تمہیں رہنا ہے اے دُولہا دُلہن
ہو تمہاری زندگی سے زندگی کی آبرو!
اور شادی سے ہو شاداب ملّت کا چمن

وقتِ سعد

خوشی اس بات کی ہے کہ یہ دن بیٹے کی شادی کا ہے۔ مقامِ مسرت یوں بھی ہے کہ آج میرے احباب اور عزیز و اقارب، میرے روبرو ہیں۔ یعنی قادرِ مطلق نے مجھے دوہری دوہری خوشیوں سے نوازا۔

کبھی ہم بھی بچے تھے۔ بعد ازاں جوان ہوئے۔ "ایں ازاں" بوڑھے ہوگئے۔ قدرت کا یہ نظام 'قاعدے اور سلیقے سے' ایک زمانے سے اس زمانے تک رُو بہ عمل رہا ہے۔

ایک نسل نے اپنی ذمہ داریاں، جب بھی نئی نسل کے سپرد کیں، تو اس نے وسوسوں اور اندیشوں کا اظہار کیا۔ علامہ اقبال بھی اپنے لختِ جگر کے بارے میں اس وقت فکرمند تھے۔ جب بیٹے نے قدرے محدود دنیا سے وسیع تر دنیا میں قدم رکھا تھا ؎

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

آج میں بھی، اس وقتِ سعد پر اپنے بیٹے کے لیے علامہ اقبال ہی کے جذبات مستعار لایا ہوں ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

یہ عجیب بات ہے کہ بیٹا کسی شاہ کا ہو یا مجھ ایسے احقر کا، جذبات و خیالات سبھی والدین کے یکساں ہوتے ہیں اور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ (محمد طفیل)

شادی کا جو دعوت نامہ تھا، اس کا مضمون بھی احباب نے پسند کیا۔ بقولِ احباب، کارڈ کے مضمون میں ندرت تھی۔ مضمون یہ تھا:

پروگرام

دعوتِ طعام	مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۷۳ء، ۸ بجے شب
بمقام	گورنمنٹ سلیم ماڈل ہائی سکول (لوئر مال)

جواب سے ممنون فرمائیں بذریعہ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

اگر آپ وقت پر تشریف لائیں گے، تو میری خوشیوں میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ کا
مجھ عاجز پہ اپنا انعام و اکرام ہے
اس کی بدولت
آج میں بھی اس قابل ہوا کہ اپنے بیٹے
فاروق احمد سلمہٗ
کی شادی میں آپ سے شرکت کے لیے
درخواست کر سکوں!
براہِ کرم! مجھے ہمیشہ کی طرح ممنون فرمایا
جائے
ناچیز
محمد طفیل
مُدیر نقوش، لاہور

اِدارہ فروغِ اُردو

میں نے ادارہ فروغِ اردو کی بنیاد ۱۹۴۴ء میں ڈالی۔ میرے اس ادارہ کا نام اُردو کے مشہور نقاد سید احتشام حسین نے تجویز کیا تھا۔ وہ یُوں کہ میں نے اس وقت کے اپنے تمام جاننے والے ادیبوں کو یہ ”مژدہ“ سُنایا تھا کہ مَیں بھی نشر و اشاعت کی دنیا میں قدم رکھ رہا ہوں، لہٰذا کوئی نام تجویز کریں۔ اور دوستوں نے بھی نام بتلائے مگر مجھے سید احتشام حسین صاحب ہی کا تجویز کردہ نام بھلا معلوم ہُوا —— جہاں تک نشر و اشاعت کا تعلق ہے۔ اس کی ابتدا تو ۱۹۴۴ء سے بھی پہلے ہوئی تھی۔ وہ یوں کہ میرے ایک دوست لطیف فاروقی (مرحوم) تھے۔ اُن کے اشتراک سے مَیں نے ”مکتبۂ شعر و ادب“ کے نام سے پبلشنگ ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بعد میں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہو رہی ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے ادارے کے تنہا مالک نہیں بلکہ حصہ دار ہیں، تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ الگ ہو جاؤں۔ چنانچہ میری اس قربانی سے ان کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ادارہ فروغِ اردو سے جو سب سے پہلی کتاب چھپی، وہ شوکت تھانوی مرحوم کی ”سُنی سنائی“ تھی۔ جو اُن کے ریڈیو ڈراموں پر مشتمل تھی اور اُن دنوں ادارہ فروغِ اُردو کا دفتر اندرونِ لوہاری دروازہ تھا۔

چونکہ ان دنوں دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ اس لیے سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والا حساب ہو گیا۔ یعنی ہم کتابیں چھاپنا چاہتے ہیں، مگر بازار میں کاغذ نایاب ہے۔ پرمٹ سسٹم تھا، جو بڑے بڑے دکانداروں کو بھی عاجز بنائے ہوئے تھا۔ ان دنوں ریاست بہاولپور میں کنٹرول نہ تھا۔ چنانچہ مَیں نے عزیز المطابع بہاولپور سے جا جا کر کتابیں چھپوائی تھیں اور خوب تجمل ہُوا تھا۔

نقوش کی ابتدا

جب ہاجرہ مسرور ہندوستان سے وارد پاکستان ہوئیں، تو میری رفاقت میں "نقوش" کا ڈول ڈالا گیا۔ منصوبہ احمد ندیم قاسمی نے بنایا۔ چنانچہ اپنے اپنے حصے کا کام تینوں نے بانٹ لیا۔ نقوش کے ابتدائی شمارے بڑے اچھے نکلے۔ اُٹھان مرعوب کن تھی۔ پھر ایکا ایکی "نقوش" اپنی ادبی ڈگر سے ہٹ کر سیاست کا موڑ مڑ گیا۔ میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔ اُدھر دو ووٹ تھے۔ ادھر اکیلا، بالآخر ندیم صاحب نے فرمایا۔ ہم اپنی روش کو ترک نہیں کر سکتے۔ جب خیالات میں ہم آہنگی نہ رہی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ نقوش کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا۔ بعد میں ندیم صاحب ہی کے مشورے سے نقوش کا پھر اجرا ہوا، تو وہ سید وقار عظیم کی ادارت میں۔ وہ بھی صرف ایک ہی سال تک ساتھ دے سکے۔ وہ موڑ ایسا تھا کہ نقوش اگر ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا، تو بھی کچھ عجب نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے مالی خسارے اتنے تھے کہ جو ایک چھوٹے سے ادارہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔

یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو نقوش کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔ یکم مئی ۱۹۵۱ء کو میں نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس وقت میں نے طے یہ کیا تھا کہ کشتیوں کو آگ لگا دوں تاکہ واپسی کی گنجائش نہ رہے۔ یعنی میں نے اپنا سارا سرمایہ اور اپنی ساری توانائیاں داؤں پہ لگا دیں۔ اپنے پاس سرمایہ ہی کیا تھا کہ جس پہ ناز ہوتا۔ لے دے کے ایک جذبہ ہی تھا جس کی بدولت ادب کے سمندر میں کود گیا تھا۔ اس وقت سب یہی کہتے تھے کہ میرا قدم خودکشی کے مترادف ہے، لیکن میں یہ سوچتا تھا کہ اگر خودکشی ہی میرے خوابوں کا مقدر ہے، تو مجھے خودکشی بھی کر کے دیکھنا چاہیے۔

نقوش

نقوش میرے لیے کیا کچھ ہے، یا اس کے لیے میں نے کیا کچھ کیا۔ اس کی تفصیل خوش کن نہیں، تکلیف دہ ہے۔ وہ رسالہ جس کی پاک و ہند میں دھوم ہے۔ جس کا کوئی مثیل نہیں۔ میرے لیے دو روٹیوں کا بھی بندوبست نہ کر سکا۔ اس کے باوجود میں نے اس کی رفاقت سے مُنہ نہ موڑا۔ جوانی اس کی نذر کر دی۔ صندلیں بدنوں میں بھی ترغیب تھی۔ مگر میں نے نظر اٹھا کے دیکھنے کو بھی، اپنے مقصد سے دوری جانا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی دھن میں بہت کچھ کر ڈالا۔ اگر کوئی میری کاوشوں کو "بہت کچھ" نہیں کہہ سکتا، تو پھر وہ بہت کچھ کر کے دکھلا دے۔ زبانی ڈینگیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پھر بات یہ بھی نہیں کہ میں اس کلے کو کسی غرور کے ماتحت لکھ رہا ہوں۔ غرور کا زور تو اسی دن

ٹوٹ گیا تھا جس دن میں نے نقوش سے یارانہ گانٹھا تھا۔

جس دن سے میں ادارتی کرسی پہ "جلوہ افروز" ہوا ہوں۔ اس دن سے لے کر آج کے دن تک، میرے لیے یہ مسئلہ ادب کی پُل صراط سے گزرنے کے مترادف رہا ہے۔ نہ تن کا ہوش نہ من کا اور نہ ہی دھن کا۔

جس دن میں نے اس کام کے لیے قلم اُٹھایا تھا۔ اس دن میرے ذہن میں اس کام کا ایک خاکہ بھی تھا۔ جس میں میں بعد کے برسوں میں رنگ بھرتا رہا۔ میں نے ابھی اپنی ادبی مسافت کا پورا سفر طے نہیں کیا۔ لیکن منزل کی جانب رواں دواں ضرور ہوں۔ پھر یہ بھی کہ جس جوش و خروش کے ساتھ میرا پہلا قدم اٹھا تھا۔ اسی ولولے کے ساتھ آج بھی سرگرم سفر ہوں۔ وسائل نے قدم پکڑے ہوں، تو پکڑے ہوں، جذبہ نے ہار نہیں مانی۔

جو کام اب تک ہو چکے ہیں، اُن پہ خوش تو ہوں، لیکن ان پہ فخر نہیں۔ فخر تو اس امر پہ ہوگا کہ زندگی کا آخری لمحہ بھی نقوش کی گود میں گزرے۔

بہرحال میری ادبی کارگزاریوں اور اس کی افادیت کا اندازہ آج نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا تعین تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔

ہسپتال

میں ۱۹۶۰ء میں ایک حادثہ کے تحت ہسپتال پہنچ گیا۔ حادثہ بہرطور بُرا ہی ہوتا ہے، مگر اس حادثے کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرے لیے بُرا تھا یا اچھا۔ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے پُرسکون شب و روز میں کھلبلی سی مچ گئی۔ زندگی کی شاہراہ پر ایکدم ٹھہر جانا پڑا۔ سابقہ سوچیں بکھرتی نظر آئیں۔ ان سوچوں کو پھر سے یکجا کرکے منزل کی طرف بڑھنا دشوار نظر آیا۔

ہم چند دوست بیٹھے تھے کہ اُن میں سے سید وقار عظیم نے کہا "بھوک لگی ہے۔ چائے منگوائیے۔ اور اس کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی" اس "مروت زدہ" انسان کو عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔

چائے کے چند گھونٹ ہی پیے ہوں گے کہ دل میٹھا محسوس ہوا۔ پھر تو یہ محسوس ہُوا کہ چلائیں، کچھ ہوش نہ رہا محسوسات کی دنیا میں جا پہنچا۔ یُوں محسوس کہ اُڑا چلا جا رہا ہوں۔ آسمان کی طرف، اور اوپر، اور اوپر، ایک طوفانی مگر سُرخ رنگ کی آندھی میں، اس عالم میں بھی، مجھ پہ کوئی گھبراہٹ طاری نہ تھی۔ ایک عجیب قسم کی سرشاری کی کیفیت تھی۔

جب مجھے ہوش آیا، تو میں کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا اور چلائے متعدد کاغذات کو خراب کرتے ہوئے تقریباً پوری میز پر پھیلی ہوئی تھی۔ نقاہت کا عالم یہ تھا کہ اس وقت میں خود اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے سہارا دے کر کرسی پر سے اٹھایا گیا اور چارپائی پہ لٹا دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چند منٹوں میں پُورا خون نچڑ گیا ہو۔

اس وقت ہر شخص مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا "کیا ہُوا؟ کیا ہوا؟ مجھ میں نہ بولنے کی ہمت تھی اور نہ سوال سُننے اور سمجھنے کا یارا، عجیب بے بسی کی سی کیفیت طاری تھی۔ جُوں جُوں میرے حواس بجا ہو رہے تھے۔ میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ مَیں جو پریشانیوں اور دشواریوں کے سامنے ہمیشہ ہی سینہ تان دیا کرتا تھا۔ اس وقت بُری طرح پریشان تھا۔

وقار عظیم صاحب نے پوچھا "اب طبیعت کیسی ہے؟"

'اس وقت، جو میری حالت ہے۔ اس کی موجودگی میں بہتر یہ ہوگا کہ مجھے کسی ہسپتال میں پہنچا دیا جائے۔"

چنانچہ وقار صاحب کی وساطت سے سمن آباد کے لاہور کلینک میں پہنچا۔ تقریباً دس روز ہسپتال میں رہا۔ وہاں ڈاکٹر حیدر، اور ان کی بیگم عذرا سے ملاقات ہوئی۔

ڈاکٹر حیدر

مَیں ڈاکٹر حیدر کے پاس بہ طورِ مریض پہنچا تھا۔ لیکن اس کے خلوص نے مجھے اپنا ہی لیا۔ وہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود مریض نکلا۔ یعنی خود کو نمایاں تر کرنے کا مرض! اسی جدوجہد میں وہ جب سے اب تک سرگرداں ہے۔ اسی مرض نے اس سے پاکستان چھڑا دیا

میں ان کی کئی خوبیوں کا معترف ہُوں۔ سچّا اور کھرا آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کے سچ کی تاب نہیں لا سکتے۔ وہ اپنے بارے میں بھی بڑا سفاک ہے۔ اس نے اپنی کئی غلطیوں کی اپنے آپ کو بھی سزا دی۔ اگر وہ اپنے آپ کو سزا دینے کا عادی نہ ہوتا، تو پاکستان کبھی نہ چھوڑتا۔

مجھے حیدر کی رفاقت پر ناز ہے۔ پیارا دوست ہے۔ کوئی دوستی نبھانے پر آمادہ ہو تو یہ اپنا بھی سب کچھ نچھاور کر دے گا۔ اور اگر کوئی اس سے زیادتی کرے، تو پھر یہ کسی کے بھی سامنے اپنا دوسرا گال پیش نہ کرے گا۔

حیدر جب پاکستان چھوڑ کر انگلستان جانے لگا، تو اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چھ ماہ کے بعد لوٹ آؤں گا مگر وہ کئی برس تک نہ آیا۔ جب میں نے واپسی کے لیے ضد کی تو اس نے کہا۔ یہاں آ جاؤ پھر جیسا کہو گے کروں گا۔ میں اس کے لیے لندن تک گیا۔ مگر وہ واپس نہ آیا۔ اس کے خدشے اور اٹکنے کے بہانے، بعد میں سب حقیقت کا رُوپ دھار گئے۔

اب وہ مجھے پھر لندن بُلا رہا ہے۔ پہلے میں ان سے یہ کہنے گیا تھا۔ واپس چلو۔ اب میں اُسے یہ کہنے جاؤں گا واپس آ کر کیا کرو گے۔؟

لندن

میں نے ۱۸؍ اگست ۱۹۷۰ء کو یہاں سے لندن کے لیے پرواز کی تھی۔ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو واپس آ گیا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو سیر و تفریح کے مشتاق ہوتے ہیں۔ مَیں ان لوگوں میں سے نہیں بلکہ مجھے جب بھی شوق چرایا، تو میں نقوش ہی کے صفحات میں لمبے سفر کو نکل گیا۔

جس دن میں لندن پہنچا، تو حیدر اور عذرا ہوائی اڈّے پر موجود تھے۔ میں تو گیا ہی ان کے لیے تھا، ورنہ نیلی آنکھیں دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہ تھا۔

وہاں پہنچ کر مَیں نے محسوس کیا کہ باہر بھی نکلنا چاہیے۔ وہ دنیا ہماری دنیا سے بالکل مختلف نکلی۔ جو کچھ وہاں دیکھا، اس کے بالکل اُلٹ اپنے ہاں ہے۔ جو لوگ آج بھی یہ کہتے ہیں "جو سکھ اپنے چبارے نہ بلخ نہ بخارے" وہ غلط

کہتے ہیں۔ کیونکہ باہر لوگ اپنے آپ کو بنا رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ وہاں کوئی غیر بھی اُن پہ ظلم نہیں کر سکتا۔ یہاں اپنے اپنوں پہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔

حیدر نے خوب سیر کرائی۔ اچھے اور بُرے سبھی رُخوں سے آشنا کرایا۔ رہی سہی کسر سلیمان یوسف نے پوری کر دی۔ میں کوئی اوتار نہ تھا کہ آنکھیں بند رکھتا یا اپنے دل کو قابو میں رکھ سکتا۔ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق میں بھی ہر مرحلے سے گزرا۔

بی بی سی سے تقریریں بھی کیں۔ برمنگھم سے ٹیلی ویژن والوں نے بھی یاد کیا۔ لیکن ڈاکٹر حیدر معاوضے کی رقم پر اَڑ گئے۔ وہ کہتے تھے جتنی رقم ہم دلیپ کمار کو دیتے ہیں (التقابل ملاحظہ ہو) اتنی رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ کہتے تھے دلیپ کمار کون ہوتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے کہا تھا۔ پیرس ضرور آنا۔ میں نے تاریخ کا تعین بھی کر دیا تھا۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرہ بھی بُک کرایا، مگر میں وہاں پہنچنے کی بجائے اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کے کئی لوگ یاد آتے ہیں کہ جنہوں نے میری خدمت کی۔ ڈاکٹر حیدر اور سلیمان یوسف کے علاوہ، محمود ہاشمی، مسٹر داؤد، مسز اطہر علی، فہمیدہ ریاض، سحاب قزلباش اور مسز بیدر کور !

خواب

خواب امیر بھی دیکھتے ہیں۔ خواب غریب بھی دیکھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ غریبوں کے خواب شان دار ہوتے ہیں۔ امیروں کے خواب پریشان کُن! — آج جو میں آپ سے عرض کرنے والا ہوں۔ وہ صرف اتنا کہ اللہ تعالیٰ کی مجھ پر خاص مہربانی ہے کہ اُس نے مجھے زندگی کے بیشتر معاملات میں قبل از وقت آگاہی بخشی۔ وہ یُوں کہ خواب میں سب کچھ بتا دیا گیا کہ یوں ہوگا حتیٰ کہ تاریخ اور وقت کا تعین بھی۔

میں آپ کو اپنے وہ خواب سُناتا ہوں جن کے سنانے میں قباحت نہ ہو، ورنہ فسادِ خلق کا خطرہ بھی ہے۔ وہ ایسے کہ ایک دن مَیں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ تمہاری جو فُلاں سہیلی ہے۔ اس کا کل رات شوہر سے جھگڑا ہو گیا۔ تُو تُو مَیں مَیں کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ شوہر نے اس کے بائیں گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

بیوی نے پوچھا "کس نے بتایا؟"

مَیں نے کہا: "ابھی یہ قصہ رات ہی کا تو ہے، اور مَیں ابھی تک گھر سے بھی نہیں نکلا۔"

بیوی نے سمجھ لیا کہ خواب آیا ہوگا۔ اُسے میری خوابوں کی صداقت پر بھروسا ہے۔ اس دن میں گھر سے نو بجے کے قریب نکلا ہوں گا۔ اتفاق کہ کوئی دس بجے کے قریب وہی صاحبہ ہمارے ہاں آن نکلیں۔ بیوی نے رات کے جھگڑے کا ذکر کیا۔ وہ صاف مکر گئیں۔ جب بیوی نے یہ کہا کہ بھائی صاحب نے آپ کو تھپڑ بھی مارا تھا، تو وہ ایک دم رونے لگ گئیں۔ محترمہ نے یہ سمجھا کہ ایک تو شوہرِ نامدار نے مارا، دوسرے راز فاش کر دیا۔ چنانچہ وہ صاحبہ چند منٹ بہ اکراہ بیٹھ کر سیدھے شوہر کے دفتر پہنچیں۔ ادھم مچا دیا۔ اب اُن کے شوہر بہ منت چُپ کرا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میری تو طفیل سے مُلاقات ہوئے عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر وہ محترمہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں یقین کرتیں تو کیسے کرتیں بالآخر مجھے ٹیلی فون کیا گیا۔ میں نے بھی محترمہ سے عرض کیا۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔ مجھے خود معلوم ہُوا۔ محترمہ کا طنزیہ اور بہت زیادہ کھینچ کر جواب یہ تھا۔ "بڑا الہام ہوتا ہے!"

مَیں آپ کو اپنے خوابوں کی تفصیل بتانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ایسی باتوں کو ظاہر کرنا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں سمجھتا۔ بہرحال ایک دو قصے اور سن لیجئے۔

ایک دن میرے پاس گورنمنٹ کالج نوشہرہ کے پرنسپل صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا کہ کالج کی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے کالج کی ایک تقریب کی، آپ صدارت کریں۔ مَیں نے انکار کیا، تو انہوں نے میرے ایک

نہایت ہی پیارے دوست کی چٹھی آگے بڑھا دی۔ چنانچہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ چلا گیا۔

تقریب ختم ہوگئی، تو نوشہرہ کے ایک مجسٹریٹ غلام مصطفےٰ صاحب ہمیں اپنے ہاں لے گئے تاکہ رات بسر کر کے صبح کو کوچ کر سکیں۔ رات کو سوئے۔ صبح اٹھے، تو میرے وہ ساتھی[1] جو لاہور سے میرے ساتھ گئے تھے۔ ترنگ میں آ گئے انہوں نے غلام مصطفےٰ صاحب کے ہاں ایک الماری میں رکھی ہوئیں درجنوں بندوقوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت مصطفےٰ صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: خوب اچھی طرح سے دیکھیں سب بندوقیں خالی ہیں۔ کسی میں گولی نہیں۔

یکے بعد دیگرے انہوں نے کئی بندوقیں دیکھیں شست باندھ باندھ کر ٹرگر دباتے رہے۔ ٹھاہ ٹھاہ کی آواز دل سے خوش ہوتے رہے۔ اتفاق کہ میں ان کے بالکل سامنے کھڑا تھا

جب یوں وہ چھ سات بندوقوں کو دیکھ چکے، تو انہوں نے ایک اور تھری ناٹ تھری کی بندوق اٹھائی۔ معاً مجھے رات کی خواب یاد آ گئی۔ میں اس جگہ سے جہاں کہ کھڑا تھا۔ ایک طرف کو ہٹ گیا، اور بندوق سے گولی نکل کر سامنے کی دیوار کو پھاڑ گئی۔

جہاں میں پہلے کھڑا تھا۔ اگر وہیں کھڑا رہتا، تو گولی میرے سینے میں لگتی۔ اگر اس وقت مجھے خواب یاد نہ آ جاتا، تو میں وہیں کھڑا رہتا اور ڈھیر ہو جاتا۔ کیونکہ میں اسی جگہ دیر سے کھڑا تھا۔

خواب میں میں نے یہ دیکھا تھا کہ ایک شیر مجھ پہ حملہ آور ہوا اور میں ایک طرف کو ہٹ گیا، تو شیر سیدھا نکل گیا۔ جس بندوق سے گولی نکلی تھی۔ عین اس وقت مجھے خواب یاد آیا اور میں ایک طرف کو ہٹ گیا اور گولی میرے پاس سے نکل گئی۔ جب مجھے خواب یاد آیا، تو مجھے اس کے سچ ہونے پر بھی یقین تھا۔ اسی لیے میں اپنی جگہ سے ہٹا تھا

ابھی تک، آپ کے ذہن میں، میری خوابوں کا تجزیہ کن انداز اور اُن کا صحیح صحیح نقشہ جما نہ ہو گا۔ لیجئے ایک اور واقعہ سنیئے، میرے ایک دوست تھے وہ ایک لڑکی پہ عاشق تھے۔ اتفاق کہ وہ لڑکی لاہور سے چلی گئی۔ یہ اِدھر پریشان ہو گئے۔ خط پہ خط لکھے مگر اُن کا کوئی جواب نہ آیا۔ چونکہ میں اُن کا دوست تھا۔ انہوں نے مجھ سے بھی ذکر کیا اور میں نے اُن کی اس حالتِ زار پہ افسوس کیا۔ یوں میرے دوست نے، اُن دنوں، میرے سامنے کئی بار ہی اپنا دکھڑا رو دیا۔

ایک دن میں نے انہیں کہا: "آپ کو "محترمہ" کا خط منگل کے روز ایک بجے مل جائے گا۔

وہ کیسے؟

آپ کو اس سے کیا غرض!

---

[1] مشہور آرٹسٹ اسلم کمال

اس دن منگل کے روز میں تین دن باقی تھے اور وہ مجھ سے ہر روز کہیں’ اب دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ اب ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ جس دن منگل کا روز آیا۔ وہ میرے پاس صبح سویرے ہی آ گیا۔ اُس نے کہا۔ آج منگل کا روز ہے۔ اِس وقت ۸ بجے ہیں۔ پھر وہ لمحہ بہ لمحہ شمار کرتا رہا۔ ایڈریس اس نے اپنا نہیں دیا ہُوا تھا۔ اپنے کسی دوست کا دیا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بارہ بجے کے قریب اُدھر چل دیا۔

اس کا بیان ہے کہ ٹھیک ایک بجے ڈاکیہ آیا، وہ بہت سے خط لایا۔ اُن میں ایک خط میرا بھی تھا اور وہ انہی محترمہ کا تھا۔"

اگر میں اپنے خواب ہی بیان کرنے لگوں’ تو یہ داستان طویل ہو جائے گی۔ درجنوں ہی قصے سُنانے پڑیں گے۔ پھر سوانح کا مطلب صرف خواب ہی تو نہیں کہ صرف انہی سے کتاب بھر دوں!

بَدحواسی

بھولنا بالکل ایسے ہی ہے’ جیسے کسی کو یاد رکھنا’ ایک کوشش اختیاری ہے۔ دوسری غیر اختیاری’ بہرحال بھلکڑ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی عجیب سے مرحلے سامنے آتے ہیں۔

ایک ہمارے دوست تھے۔ مدّتوں کے یار’ اگر ہفتے میں ایک بار نہیں’ تو مہینے میں دو تین بار تو ملاقات ہوتی ہوگی۔ اکٹھے سفر بھی کیے۔ اکٹھے شرارتیں بھی کیں۔

جن دنوں میری کتاب معظم چھپی’ تو میں نے وہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے کہا۔ ایسے نہیں’ میرا نام لکھ کر دیں’ چنانچہ میں نے قلم پکڑ لیا اور ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ مَیں نے باتوں کا سہارا لیا کہ اس دوران یاد آ جائے گا۔ پھر بھی یاد نہ آیا۔ چنانچہ میں نے وقت کو ٹالنے کے لیے کہا "یار کتابوں پر نام تو وہ لوگ لکھواتے ہیں جن کی ملاقاتیں رسمی ہوتی ہیں۔ ہماری تو اتنی یاری ہے’ لہٰذا اس تکلّف کی ضرورت نہیں"

میرا یہ پینترا خالی گیا۔ انہوں نے کہا "نہیں صاحب میرا تو نام لکھ ہی دیجئے۔ مجبوراً میں اپنی کرسی سے اٹھا دوسرے کمرے میں جا کر’ اپنے بیٹے سے پوچھا۔ بیٹا یہ بتاؤ کہ یہ جو صاحب بیٹھے ہیں’ ان کا نام کیا ہے۔؟

کہنے لگے’ وہ جو آپ کی کرسی کے سامنے بیٹھے ہیں؟

مَیں نے کہا۔ ہاں!

بیٹے نے دوبارہ حیرت سے پُوچھا: وہ جو اکثر آتے ہیں۔ آپ کے دوست ہیں’ اور جو آپ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہیں۔

’ہاں بیٹا۔ انہی کا نام پوچھ رہا ہوں۔"

بیٹے نے مجھے نام بتلانے کی بجائے بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ صاحب جن کا مَیں نام بھولا ہُوا تھا ہنسی کی آواز سُن کر باہر نکل آئے۔ پوچھنے لگے بھئی بتاؤ، تو سہی کس بات پر ہنس رہے ہو؟

اس پر ہم باپ بیٹا وہ ہنسے' وہ ہنسے کہ وہ دوست بھی ہماری ہنسی میں شریک ہو گئے۔ جن کا کہ ہم نام بھولے ہُوئے تھے۔

اپنے بھلکڑ پن کی ایک اور بات بتا دیں۔ ہم عموماً چابی رکھ کر بھول جاتے ہیں کہ کہاں رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے تالے کی دو دو تین تین چابیاں بنا رکھی ہیں۔ لیکن ہوتے ہواتے یہ تک ہوتا ہے کہ دونوں تینوں چابیاں کھو بیٹھتے ہیں۔

صاحب ایک دفعہ جو چابی کھوئی' تو سارے دفتر کو سر پر اُٹھا لیا کہ چابی نہیں مل رہی۔ یہیں تھی۔ مگر کوئی بھی نہ بتا سکا کہ کہاں ہے۔ اُدھر یاد آیا کہ میز کی دراز میں آج ہی دو ہزار کی رقم رکھی ہے۔ اگر چابی نہ ملی تو جس کو چابی مل گئی۔ وہ رقم لے اُڑے گا۔

چنانچہ اِدھر دیکھ اُدھر دیکھ، چابی کا نہ ملنا تھا۔ نہ وہ ملی۔ بہر حال ہماری سرزنش اور شور پُورے دفتر پہ حاوی تھا۔ سب آ آ کر اِدھر دیکھیں اُدھر دیکھیں مگر چابی کا نہ ملنا تھا۔ نہ وہ ملی۔

میرا منجھلا بیٹا بھی اس "حادثے" پہ خاصا پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ اباجی آپ اچھی طرح سے اپنے کوٹ کی جیبیں دیکھیں۔

مَیں نے کہا بیٹا دیکھی ہیں۔ چنانچہ اُس کے سامنے جیبوں کو ٹٹولا۔ بلکہ سارے کاغذات اور چِٹیں نکال کر اُسے دکھائیں کہ لو دیکھ لو نہیں ہیں۔

اس نے کہا۔ اندر کی جیب دیکھیں۔

مَیں نے کہا۔ بیٹا اس میں تو صرف نوٹ رکھتا ہوں۔ مگر دیکھے لیتا ہوں۔

چنانچہ میں نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا، وہاں اُس چابی کا تالا پڑا ہُوا تھا۔ جس کی کہ چابی ڈھونڈ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ یار جیب میں تالا تو پڑا ہے مگر چابی نہیں ہے۔

سخت سردیوں کے دن تھے۔ ان دنوں ہم گڑھی شاہو میں رہتے تھے اور دفتر ہمارا اردو بازار میں تھا۔ چنانچہ ہم تینوں باپ بیٹا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر سے روانہ دفتر ہوئے۔ سردی اتنی تھی کہ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ ناک کا ایسا تھا کہ معلوم ہوتی تھی کہ جیسے ہو ہی نہیں۔

مَیں اگلی سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ دونوں بیٹے پچھلی سیٹ پر تھا۔ بیٹھے بیٹھے یاد آیا کہ عینک گھر بھول آیا ہوں چنانچہ مَیں نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ تم لوگوں نے یاد ہی نہیں دلایا اور عینک گھر بھول آیا ہوں۔

ایک بیٹے نے کہا" فکر نہ کریں۔ دفتر سے جا کر کسی صاحب کو بھیجیں گے۔ لے آئے گا۔

اب ہمیں یاد آ رہا ہے۔ عینک تو رہ گئی گھر میں، اور ہمیں فوری طور پر یہ یہ کام کرنے تھے۔ مثلاً آج جمعہ ہے۔ بنک ½۱۰ بجے بند ہو جائے گا۔ اگر پیسے نہ نکلوائے، تو فلاں فلاں کام رہ جائے گا۔ پھر یاد آیا کہ فلاں نوٹس آیا ہوا ہے۔ اس کا جواب بھی آج ۱۲ بجے سے پہلے پہلے دینا ہے اور فلاں کام ——

غرض ہم خیالوں میں گم چلے آ رہے ہیں۔ گھر سے دفتر کا فاصلہ ½۲ میل کے قریب ہوگا۔ یعنی ہم جب دو میل کا سفر طے کر چکے ہوں گے اور شاہ عالمی دروازے کے قریب پہنچے، تو میں نے بیٹوں سے کہا۔ بھئی تم لوگوں نے بتایا ہی نہیں۔

"وہ پوچھنے لگے۔ کیا نہیں بتایا؟

میں نے کہا عینک کا، کہ وہ تو ناک پہ رکھی اور آنکھوں پہ لگی ہوئی ہے۔

شعر دشمن

مجھے عموماً شعر دشمن سمجھا جاتا ہے بلکہ شاعر دشمن تک، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی، تو مجھے بعض شعراء سے والہانہ محبت نہ ہوتی۔ جگر مراد آبادی سے مجھے اس لیے محبت تھی کہ وہ مکمل انسان تھے۔ مکمل انسان ان معنوں میں کہ ان میں زیادہ سے زیادہ انسانی صفات تھیں۔ اختر شیرانی بھی ایسے ہی انسان تھے۔ مگر وہ شراب میں ڈوب کر اپنے آپ میں نہ تھے۔ نواب جعفر علی خاں کا بھی میں گرویدہ تھا۔ ان سے اگر کوئی شکایت تھی، تو صرف اتنی کہ اپنے شعر زیادہ سناتے تھے۔

زندہ شعرا کا بھی میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ جوش ملیح آبادی کا میں اس لیے قائل ہوں کہ وہ استادانہ شان رکھتے ہیں۔ اپنے طرزِ سخن میں بھی یکتا۔ فیض احمد فیض ایک با اصول شاعر ہیں۔ اس لیے مجھے پسند، فراق گورکھپوری کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ ان کا اپنا اسلوبِ شعر ہے۔ حفیظ جالندھری کی قدر اس لیے کرتا ہوں کہ وہ جدت طراز شاعر ہیں

اصل میں قصہ یہ ہے کہ نثر نویس اتنے بگڑے ہوئے نہیں ہیں جتنے کہ شعر گو، شعرا عموماً ہر اخلاقی قدر کی دھجیاں بکھیرنے میں ہی اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ذہنی طور پر ذرا دور ہوں۔ میرے نزدیک اچھا انسان ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اچھا شاعر ہونا۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے میری اس خواہش کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا۔

اگر میں شعر دشمن ہوتا، تو غزل نمبر کبھی نہ چھاپتا۔ بچپن ہی سے، اگر مجھے کسی صنف سے لگاؤ رہا ہے، تو وہ یہی صنف ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میری کاپی کے پہلے صفحے پر غالب کا یہ شعر درج تھا ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

آج جب کہ میں اپنے سوانحی حالات کا خاکہ بنا رہا ہوں، تو بجا بجا آپ کو شعر ملیں گے، کیا یہ بات شعر دشمنی کی علامت ہے ؟

میرے اُستاد

یُوں تو میرے کئی استاد ہیں۔ جب کبھی وہ سامنے آجاتے ہیں، تو جُھک کے سلام کرتا ہوں، لیکن سیّد اختر علی میرے وہ اُستاد ہیں جنہوں نے اپنا تعلق میرے زمانۂ طالب علمی سے لے کر اب تک قائم رکھا۔ یہ اپنے زمانے میں چھوٹے ماسٹر کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایک ان کے بڑے بھائی تھے۔ نام ان کا سیّد محفوظ علی تھا۔ مگر وہ موٹے ماسٹر کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اس لیے کہ ان کا جسم فربہ تھا۔

اِن دونوں بھائیوں کا محلّہ سیّاں اندرون بھاٹی گیٹ میں، ایک ٹیوشن سنٹر تھا۔ دُور دُور سے لڑکے بالے پڑھنے کو آتے تھے۔ چونکہ قریب ہی محلّہ جوگیاں میں ہم رہتے تھے۔ اس لیے یہ اسکول قریب پڑتا تھا۔

سید محفوظ علی ابتدائی جماعتوں کو پڑھاتے تھے اور سید اختر علی مڈل اور انٹرنس کے طلبہ کو، بعد میں سیّد محفوظ علی تو بمبئی چلے گئے۔ سُنا کہ ان کا کاروبار وہاں خوب چمکا۔ داڑھی رکھ لی تھی۔ اور ٹونے ٹوٹکے اور گنڈے تعویذ پہ گزارہ تھا۔ بعد میں اللہ کو پیارے ہو گئے

سید اختر علی بہ فضلِ تعالےٰ زندہ ہیں اور لاہور ہی میں ہیں۔ بڑے وجیہ تھے اور اچھے کھلاڑی، فٹ بال ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ پڑھانے بھی خُوب تھے۔ مارنے بھی خوب تھے۔ اب تو وہ بالکل مُرمُرا ہو گئے ہیں۔ نہ صحت رہی نہ وجاہت۔ عرصہ پندرہ سولہ سال سے فالج کے مریض ہیں۔ بایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔

جب اسکول ماسٹری چھوڑی، تو مرحوم آسٹریلشیا بینک میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس کے دعوتی سامان کرایہ پہ دینے والی ایک فرم میں ملازم ہو گئے۔ فالج گرا تو بے کار ہو گئے۔ دماغ پر بھی اثر پڑا۔ بہکی بہکی باتیں کہتے رہتے ہیں۔ چونکہ انگریزی اچھی جانتے ہیں۔ ٹائپ بھی خود کر لیتے ہیں۔ اس لیے صدرِ مملکت، وزیر اعظم، اور وزرا اعلیٰ وغیرہ کو چٹھیاں لکھتے رہتے ہیں۔ مدعا سب چٹھیوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ میری سُنو، مَیں اہم آدمی ہوں۔

کبھی گیروے رنگ کے کپڑے پہن لیتے ہیں اور کبھی سبز رنگ کے اور ننگے پاؤں پھرتے رہتے ہیں۔ ایک دن ایک مسجد میں چلے گئے اور وہاں جا کر اعلان کر دیا کہ مَیں اللہ کا بھیجا ہُوا نبی ہوں اور آپ سب کو میری اطاعت کرنا ہوگی۔ نمازیوں نے پہلے تو چُپ کرانا چاہا۔ جب نہ مانے، تو خُوب مارا۔ لہولہان کر دیا۔ مار کھانے کے بعد میرے پاس آئے۔ ہیئت دیکھ کر میرے اوسان اُڑ گئے۔ کہنے لگے۔ دیکھا اس یزیدی قوم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ؟

پچھلے دنوں تشریف لائے، تو دیکھا ایک بازو پر پٹیاں بندھی ہیں، میں نے پوچھا۔ جناب! یہ کیا ہوا۔ کہنے لگے پولیس نے مجھے پاگل خانہ پہنچا دیا تھا۔ وہاں ایک پاگل نے بازو توڑ دیا۔

میں نے سوال کیا۔ آخر آپ یہ اپنی گت کیوں بنواتے ہیں؟

کہنے لگے، میں نبی وغیرہ نہیں ہوں۔ جس طرح سورج ہوتا ہے۔ چاند ہوتا ہے۔ تارا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں ہوں۔ سورج، وہ تو ہوا خدا، چاند، وہ ہوئے رسول اللہؐ، وہ جو چاند کے ساتھ تارا ہوتا ہے۔ وہ میں ہوں!

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا
یہ تماشا حباب میں دیکھا

پریس

۱۹۵۲ء سے پہلے ہمارا پریس نہ تھا۔ ایک تو وسائل نہ تھے۔ دوسرے میں اِس کام کو دردِ سری سمجھتا تھا۔ کیونکہ پڑھے لکھوں سے واسطہ نہیں ہوتا۔ ان پڑھوں سے نبھانی پڑتی ہے۔

نقوش پہلے کبھی کسی پریس میں چھپتا، کبھی کسی پریس میں۔ بعد میں نقوش "اشرف پریس" میں چھپنا شروع ہوا۔ میں پریس کو وقت پر ادائیگی کیا کرتا تھا۔ پھر ادارہ اور نقوش کا کام ملا کر اچھا خاصا کام چھپوایا کرتا تھا۔ جب منٹو نمبر چھپ رہا تھا۔ ان دنوں کارکنانِ پریس نے کچھ دیر کردی۔ میں نے جب مالک سے شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: "آپ تو ہمیں اس طرح آرڈر کر رہے ہیں، جیسے پریس آپ کا ہو۔"

میرے مُنہ سے نکل گیا: "کیا پریس لگانا کوئی بہت بڑی بات ہے؟"

"لگا کر دیکھ لیجیے۔"

"اگر یہ بات ہے، تو میں اپنا آئندہ شمارہ اپنے پریس ہی میں چھاپوں گا۔"

یہ بات تو میں نے کہہ دی مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اگر روپیہ ہو، تو بھی یہ کام دشواریوں کے پہاڑ کاٹنے سے کم نہیں ہوتا۔ جگہ کا ڈھونڈنا۔ بجلی کا کنکشن لینا۔ مشین کا مہیا ہونا۔ یہ سب باتیں کارِ محال ہیں، پھر ان دنوں اپنے ہاں روپے کا بھی انتظام نہ تھا۔ شاید کُل سات ہزار رُوپیہ پاس تھا اور سر میں سودا یہ سوار، آئندہ پرچہ اپنے پریس میں چھپنا چاہیے۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ آئندہ پرچہ نقوش پریس ہی میں چھپا اور اس کا افتتاح عبدالمجید سالک مرحوم کے ہاتھوں ہُوا۔ مَیں نے دشواریوں پہ کیسے قابُو پایا۔ وہ میرا خدا جانتا ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے تھے۔

جب افتتاح کے موقع پر احباب کے درمیان، کارکُنانِ اشرف پریس بھی موجود تھے، تو میں اپنی تمام کلفتوں کو بھول گیا۔

پبلشر

چور! ——— آج چور اور پبلشر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جب مَیں نے نشر و اشاعت کا کام سنبھالا، تو بڑا

مطمئن تھا۔ اس خیال سے کہ یہ کام پڑھے لکھے لوگوں کا ہے۔ واسطہ بھی پڑے گا، تو پڑھے لکھوں سے، وہ مصنف ہوں یا قاری!

مگر میں جیسے جیسے اس کام میں دھنستا چلا گیا۔ اس طبقے کے بارے میں چور چور کی آوازیں کچھ زیادہ ہی بلند ہوتی گئیں۔ میں پریشان رہنے لگا۔ سوچنے لگا کہ الٰہی تُو نے بھی اس ناچیز کو کہاں جا اٹکایا۔

چور کا یہ "معزز خطاب" ہمارے ادیب بھائیوں نے پبلشروں کو بخشا ہے۔ اس لیے کہ ان کے ہاتھ میں قلم ہے، وہ جو چاہیں لکھ دیں اور پبلشر ایسے بیوقوف کہ ادیبوں کی ایسی تحریروں کو بھی اپنے خرچ پر چھاپ کر عام کرتے رہتے ہیں۔

ہاں صاحب! جب میں نیا نیا پبلشر بنا تھا، تو ایک بڑے ہی مشہور مصنف سے کتاب کا معاہدہ ہُوا۔ انہوں نے میری نیاز مندی سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ کتاب دیے بغیر معاوضہ لے لیا۔ یہ بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ مجھے آٹھ دن کے اندر اندر کتاب کا مسودہ دے دیں گے۔ جب میں وقت مقررہ پر ان کے گھر پہنچا، تو معلوم ہوا کہ مصنف کو لاہور چھوڑے پانچ دن ہو چکے ہیں، اور اب وہ لاہور واپس نہ آئیں گے۔ بلکہ مستقل طور پر "مصنف آباد" میں رہیں گے یعنی لکھنؤ!

چونکہ میں ادیبوں اور شاعروں کی عزت کرتا تھا۔ اُن کے پاس وقت گزارنا اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ اس لیے جذبات کو ٹھیس بھی لگی۔ ذہنی دیوتا بوسنے نظر آنے لگے۔

بڑے تو بے شک پبلشر ہیں، ویسے یہ الگ بات ہے کہ مجھے اکثر، ادیبوں کی میت پر کھڑے ہو کر یہ کہنا پڑا، "میں نے جو کچھ ان سے لینا ہے۔ معاف کیا!"

مُصنّف

بہرحال میں اپنے ادیب دوستوں کا ان معنوں میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے بہ حیثیت پبلشر اس پیشے سے نفرت دلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس لیے میں نے بھی لاشعوری طور پر یہ سوچا کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہونے کے قابل بنوں۔ جن سے کہ قارئین ذہنی پیار کرتے ہیں۔

پھر جب میں نے نقوش کے چند پرچے مرتب کیے، تو یاروں نے یہ کہنا شروع کر دیا۔ پرچے کو مرتب کرنے کے یہ معنی تو نہیں کہ جناب ادیب بھی ہو گئے۔ حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مدیری کا پیشہ اختیار کرنا، ادیب بننے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ادیب کو اپنے موضوع پر عبور ہونا چاہیے۔ مدیر کو جملہ اصناف پر حاوی ہونا چاہیے ورنہ وہ ادارت کا حق ادا نہ کر سکے گا۔

چنانچہ صاحب! ہمیں سوجھی کہ ادیب بھی بن کے دکھا دیا جائے۔ چنانچہ ایک مضمون لکھا۔ دو مضمون لکھے۔ حتیٰ کہ ایک کتاب چھپ گئی۔ یاروں کا رویّہ اس وقت تک "میں نہ مانوں" والا تھا۔ چنانچہ میں نے کئی کتابیں لکھیں۔ آج چھ تو چھپ چکی ہیں۔ خطرہ چند ایک اور کتابوں کا بھی ہے

اپنی تحریروں کے بارے میں، میں تو یہی کہوں گا: "بس گزارہ ہے" لیکن مفتیانِ ادب نے میری تحریروں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ "اپنی طرز کا موجد ہوں" اور یہ بھی کہ "صاحب! اب تو ہم بھی قائل ہو گئے"۔ میں خاکہ نگار ہوں۔ یہ صنف میں نے اس لیے اختیار کی ہے کہ اسے میں سب سے مشکل صنف سمجھتا ہوں میں نے سوچا تھا کہ اگر "امتحان" دینا ہی ہے، تو سب سے مشکل پرچہ حل کیا جائے۔ بحمداللہ آج میں اپنی تحریری کارگزاریوں پہ بھی خوش ہوں۔ گو ابھی مطمئن نہیں، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

نقوش کے ۲۵ سال

نقوش کے ۱۱۸ ویں شمارے پر، اس کی اشاعت کے پچیس سال پورے ہو گئے۔ اس دوران اسے کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس وقت اس کا اظہار مقصود نہیں، غرض صرف آشنا کرنا ہے کہ ادبی رسائل کی زندگی میں پچیس برس کا عرصہ بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ اس لیے جو کوئی رسالہ اس حد کو بھی پار کر جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا ہی سخت جان ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر مالی دشواریاں چھکے چھڑا دیتی ہیں۔ کچھ اسی قسم کی باتوں کو ذہن میں رکھ کر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، لاہور کے اخبار "مشرق" میں لکھتے ہیں۔

"نقوش کے تازہ شمارے میں، آخری صفحہ پر اس کے مدیر جناب محمد طفیل لکھتے ہیں۔

سجدۂ شکر

"قدرت کی فیاضیوں میں ایک فیاضی میرے حال پر یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے پچیس سال تک اردو ادب کی خدمت کا موقع دیا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی زندگی کو دوسروں کیلئے بھی مفید بنا سکوں۔" نقوش ۱۹۴۸ء میں نکلا۔ اب ۱۹۷۳ء ہے، گویا اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال مکمل کر لیے ہیں۔ اس خوبصورت اور دنیا کے ضخیم ترین علمی اور ادبی مجلے نے پچھلے پچیس سال میں ادب کی جو خدمت سرانجام دی ہے۔ وہ اُن بڑے بڑے علمی اداروں کی خدمات پر بھاری ہے جو سرکاری امداد سے چل رہے ہیں۔ ہم مدیر نقوش کی خدمت میں سلور جوبلی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ملک کی ادبی انجمنیں اس موقع پر خصوصی مجالس منعقد کریں گی۔"

۱۲ اگست ۱۹۷۳ء

ے صاحب، جناب، آپ، محترم، مکرم، معظم

سیلاب

تا دمِ تحریر (۱۲ر اگست ۱۹۷۳ء) پنجاب کے دریاؤں میں زبردست سیلاب آیا ہوا ہے۔ اُدھر چناب نے جھنگ، گجرات اور وزیر آباد کو تہس نہس کر دیا ہے۔ ادھر راوی نے شاہدرہ اور شرق پور کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ ہزاروں افراد اس حادثے کی نذر ہو رہے ہیں۔ اخبارات میں لکھا جا رہا ہے کہ حکومت بے توجہی کا ثبوت دے رہی ہے۔

آج صبح صبح معلوم ہُوا کہ راوی کا پانی، لاہور میں داخل ہونے والا ہے۔ اس خبر پر اہلِ لاہور کے چہرے فق ہو گئے۔ پانی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا ہے۔ ہمارے عزیز شاد باغ کی طرف رہتے ہیں۔ مَیں ان کی خیریت معلوم کرنے چلا گیا۔ کیونکہ وہ آبادی راوی کے قریب ہے۔ جب جانے لگا، تو گھر والوں نے کہا "وہاں بیٹھنا نہیں، جلدی لوٹ آنا۔ پانی کسی کا لحاظ نہیں کرتا" بعد میں معلوم ہُوا۔ لاہور کو اب کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ شاہدرہ کے پاس سے بند توڑ دیا گیا ہے۔ پانی کا رُخ دوسری طرف کو ہو گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ باشندگانِ لاہور اس سیلابِ بلا سے محفوظ ہو گئے، مگر جو لوگ تباہ ہو رہے ہیں یا مر رہے ہیں، وہ بھی اپنے بھائی ہیں۔

اتنا زبردست سیلاب اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ لوگوں کا سامان دریاؤں میں بہتا چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ انسانی لاشیں بھی بہتی ہوئی آ رہی ہیں، جو لوگ تیر سکتے تھے۔ وہ تھوڑے بہت تیرے بھی، مگر انہیں سانپوں نے ڈس کر ختم کر دیا۔ راوی سے زیادہ چناب بپھرا ہُوا ہے۔ اس کا اصل پاٹ ایک میل سے بھی کم ہے۔ مگر ان دنوں اس کا پھیلاؤ بیس میل سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ جہاں تہاں قیامتِ صغریٰ کا منظر ہے بچے بوڑھے اذانیں دے دے کر، خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرا رہے ہیں۔ مگر صورت یہ ہے ؎

جب مَیں کہتا ہُوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

بہرحال خدا کی بے نیازی کا ذکر سنا تھا۔ اب کے دیکھ بھی لیا۔ قوم پہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ خدا بھی اس کی نہیں سُنتا۔

قلندری کی رمق

جب خطوط نمبر چھپا، تو اس کی تقریب بھی منائی گئی۔ خواجہ شہاب الدین مرکزی وزیر اطلاعات کو بہ طور صدر زحمت دی گئی۔ اُس وقت کے دو تین وزیر اور بھی موجود تھے۔ جن میں ملک خدا بخش بُچہ اور احمد سعید کرمانی، ایک دو سفیر بھی تھے۔ ان کی موجودگی میں، میں نے گزارش کی تھی کہ "کوئی وزیر ہو، تو کیا، کوئی سفیر ہو تو کیا، اس لیے کہ مجھے ان میں سے کسی سے کچھ لینا نہیں ہے۔"

ایک دفعہ مجھ سے ایک صوبائی وزیر (یاسین وٹو) نے فرمایا: "میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔ اگر اجازت ہو، تو حاضری دوں۔" میرا جواب یہ تھا: جب آپ وزیر نہیں رہیں گے۔ اس وقت اگر آپ تشریف لائیں گے، تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔

جن دنوں مَیں نے آپ بیتی نمبر چھاپا تھا، اُن دنوں مجھے وزارتِ اطلاعات سے یہ پیغام پہنچا تھا۔ "اگر آپ اس نمبر کو خود صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کریں گے، تو آپ کو ایک خطیر رقم بھی بہ طور انعام مل جائیگی، دوسرے صدر صاحب بھی خوش ہو جائیں گے (کیونکہ اس نمبر میں صدر محمد ایوب خاں صاحب کی آپ بیتی بھی شامل تھی) اس پر مَیں نے عرض کیا تھا: "میں خود حاضر ہو کر نمبر پیش نہیں کر سکتا۔"

ابھی پچھلے دنوں ایک جلسہ مرکزی وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کی کتاب "زرِ گل" کے سلسلے میں منعقد ہُوا تھا۔ مولانا جب وزیر نہیں تھے۔ ان دنوں اُن سے خوب یاری تھی۔ مگر جب وہ وزیر ہو گئے، تو وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر سابقہ دوستی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جب مجھ سے مضمون پڑھنے کے لیے کہا گیا، تو مَیں نے منتظمین سے صاف کہہ دیا تھا کہ مَیں وزیر مولانا کوثر نیازی سے واقف نہیں ہوں۔ لہٰذا مجھ سے مضمون نہ پڑھوائیں۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا۔ آپ جس کوثر نیازی سے واقف ہیں۔ انھی کے متعلق مضمون پڑھیں۔ چنانچہ میرا جو مضمون تھا، وہ مولانا کے حق میں نہ تھا۔ دیگر نامور ادیبوں اور شاعروں نے وزیر موصوف کی خوب خوب خوشامدیں کیں، ان میں میری ہی صدا سب سے مختلف تھی۔

صدارتی انعام

میرے کئی دوستوں کو صدارتی انعام ملے۔ انہیں بھی ملے، جو اس کے حق دار تھے۔ انہیں بھی ملے، جو اس کے حق دار

نہ تھے۔ کئی مرتبہ مجھ سے دوستوں نے کہا، "انعام آپ کا حق ہے مگر حکومت توجہ نہیں دے رہی" مگر میں نے اس اعزاز کو کبھی بھی اپنے لیے باعثِ عزت نہ جانا۔ کیونکہ اصل انعام تو وہ ہے، جو اہلِ علم کے دلوں میں ہو نہ کہ وہ جو حکومت کے ایوانوں سے حاصل ہو۔

ایک موقعہ ایسا آیا تھا کہ جب مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ یوں کہ مرکز کے سیکرٹری تعلیمات میرے دوست تھے۔ انہوں نے از خود میرے لیے سوچا اور تحریک کر دی۔ اس وقت کے وزیر تعلیم شمس الحق صاحب سے بھی تجویز پر صاد کرا لیا۔ معاملہ تقریباً پکا تھا۔ ریکارڈ آج بھی موجود ہو گا۔

انہی دنوں میں بھی کسی کام سے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ سیکرٹری تعلیمات کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ڈاکٹر عبد السلام، جو صدر کے مشیر بھی ہیں اور مشہور سائنسدان بھی، سیکرٹری صاحب سے ملنے آئے۔ انہوں نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اب کے صدارتی انعام شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کو ملنا چاہیے:

جب ڈاکٹر عبد السّلام چلے گئے، تو سیکرٹری صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ "مجھے انعام کی خواہش نہیں ہے۔ شیخ صاحب ضعیف اور ناتواں ہیں۔ اس لیے میری بھی سفارش ان کے لیے ہے"

اس پر سیکرٹری صاحب نے فرمایا تھا کہ "میری موجودگی میں اگر آپ کو آپ کا حق مل گیا" تو مل گیا۔ ورنہ بعد میں نہ ملے گا۔

میرا جواب یہ تھا

اب میں ہوں جو دنیا میں تو پرساں نہیں کوئی
جب میں نہ رہوں گا، تو میری یاد رہے گی

پچاسواں برس

اس وقت رات کے بارہ بجنے والے ہیں، چند لمحوں بعد گھڑی کی سوئی بارہ بج کر ایک منٹ پر چلی جائے گی۔ اس وقت میں اپنی زندگی کی پچاسویں منزل پہ پہنچ چکا ہوں گا۔ یہ مجھ پہ اللہ تعالےٰ کا اتنا بڑا کرم ہے کہ میں اس کا حق ادا کر ہی نہیں سکتا

نہ تھا میں جن کے لائق تو نے وہ وہ نعمتیں بخشیں
علم دستِ کرم تیرا سرِ تسلیم خم میرا

ان پچاس برسوں میں مجھ پہ ایسے دن بھی آئے کہ دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے اور وہ وقت بھی آیا کہ خود سینکڑوں ہی کو نہیں ہزاروں کو کھلا سکتا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ میرا غمگسار کوئی نہ تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ دمسازوں کی کثیر تعداد میری رفیقِ قدم تھی۔

ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں لوگوں کو سلام کرتا تھا اور کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ لوگ میرے اشارۂ ابرو کا بھی خیال رکھنے لگے۔

ایک وقت وہ بھی آیا کہ لوگوں کو مجھ میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ لوگوں نے کہا ؎

مرتبہ دنیا میں اس سے بھی سوا ہو آپ کا
یاد رکھیے گا کہ میں بھی ہوں دعاگو آپ کا

میں اللہ کا شکر اس وقت بھی ادا کرتا تھا۔ جب دنیا مجھ سے دامن کشاں تھی۔ میں اللہ کا شکر آج بھی ادا ہوں جب دنیا مجھے اپنے التفات سے نواز رہی ہے۔

مُحبّت

جب مجھے ایک بار دل کا دورہ پڑا، تو ایک خاتون نے یہ فقرہ بھی کسا تھا "ہمیں آج معلوم ہوا کہ آپ بھی سینے میں دل ہے۔ ایسا کیوں سوچا جاتا تھا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بندہ ہر جگہ اٹکنے کا قائل نہ تھا۔

میں جوشؔ ملیح آبادی بھی نہیں ہوں کہ اپنے (جھوٹے سچے) اٹھارہ عشقوں کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑوں اور اتنا بزدل بھی نہیں ہوں کہ اس باب میں چپ رہوں۔

حُسن ایک ایسی خوشبو ہے، جو محسوس کی جا سکتی ہے، دکھائی نہیں جا سکتی۔ یا یہ کہ یہ ایسا جادو ہے، جو پاؤں چڑھتا ہے، اور آہٹ تک نہیں ہوتی اور ہوش اس وقت آتا ہے، جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے — میں جو پاؤں کی آہٹوں کا شناسا تھا، وہ بھی اس راہ میں لُٹ لُٹ گیا۔ مگر اس کا کوئی مداوا نہ کر سکا۔ مداوا کرتا بھی کیوں؟

یہ ٹھیک ہے کہ ادب ہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مجھ سے گیسوئے اُردو ہی نہیں سنور رہے تھے۔ ایسے م بُتِ طنّاز کے گیسوؤں کو کیسے سنوارتا؟ لیکن اگر کوئی متوجہ کر کے یہ کہے "اِدھر دیکھو!" تو میں بھی کیسے متوجہ نہ ہوتا؟ مز تو اس دن آیا تھا جب مجھ سے کہا گیا: "یہ شعر تو آپ کے غزل نمبر میں بھی نہیں ہے۔

حاضر ہوا کروں گا، اکثر حضور میں
آج اچھی طرح سے مجھے پہچان لیجیے

وہ ہستیاں جو میرے دل کا چور بنیں۔ ان کے راز طشت از بام کرنا، میرے لیے ایسے ہی ہے، جیسے میں نے اپنے ہی سینے میں خنجر گھونپ لیا۔ وہ لوگ جو دل کے رشتوں کی تشہیر کرتے ہیں۔ وہ بوالہوس ہیں، حسن دوست نہیں۔ میں نے ہمیشہ ہی ایسے رازوں کو دوسروں کی امانت جانا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ سے ایک بار ممتاز مفتی نے کہا تھا "یار کبھی تو کھل کے بات کرو!" قصہ مختصر ؎

سمجھے وہی اس کو جو ہو دیوانہ کسی کا
اکبرؔ یہ غزل میری ہے، افسانہ کسی کا

رائٹرز گلڈ

رائٹرز گلڈ ایک ایسا ادارہ ہے، جس سے ادیبوں کی قطعاً کوئی بھلائی نہ ہوئی۔ صرف چند اشخاص کا ٹولہ ہے جنھوں نے اسے کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، جو غیر ممالک کی سیریں بھی کرتے ہیں، اور اپنے حالی موالیوں کو انعام بھی دلواتے ہیں۔ یہ لوگ جو گلڈ کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ ادب میں ان کی اپنی حیثیت بھی مشتبہ ہے۔ اس پر بھی ادیبوں کے چودھری بنے ہوئے ہیں، اس لیے کہ باتیں اچھی کر لیتے ہیں۔ غرض ایک "یار کمیٹی" کا نام رائٹرز گلڈ ہے۔

میں نے کبھی بھی اس ادارے کا رکن بننا اپنے لیے ضروری نہ جانا، بلکہ خوشی اس امر پہ ہوتی تھی کہ میں اس ادارہ کا رکن نہیں ہوں مگر چند برس پہلے اس پلیٹ فارم سے، میرے خلاف ہلچل شروع ہوئی۔ اس وقت میں نے ضروری جانا کہ میں بھی اس ادارہ کا رکن بنوں۔ تاکہ ان کی شرارتوں سے نپٹا جا سکے۔

جب میری رکنیت کا سوال اس ٹولے کے سامنے آیا، تو وہ سیخ پا ہو گئے۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ ممبران یہ کہتے تھے، "ممبر نہیں بنے گا"۔ کچھ خوفِ خدا رکھنے والے کہتے تھے "ممبر ضرور بنے گا" وہ تماشا کیا تھا؟ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ ادارہ کن "صالح بنیادوں" پر قائم ہے۔ جب "بنے گا اور نہیں بنے گا" کی خوب مشق ہو چکی، تو اس نشست کے صدر قدرت اللہ شہاب نے فرمایا: "ووٹ لیے لیتے ہیں۔ تاکہ ہنگامہ ختم ہو۔" جب ووٹنگ ہوئی، تو نتیجہ میرے حق میں نکلا اور مجھے کثرتِ رائے سے ممبر بنا لیا گیا۔ ایسا تماشا نہ تو اس سے پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ ہی ہوگا۔

اس کے بعد مجلسِ عاملہ کے رکن کی حیثیت سے، جب بھی چناؤ کا وقت آیا، تو ادیبوں نے مجھے ہمیشہ ہی نوازا اور میرے ووٹ سب سے زیادہ نکلے۔ چونکہ انہیں خطرہ ہے کہ اگر یہ شخص بہ حیثیت سیکرٹری بھی کامیاب ہو گیا، تو الجھنیں بڑھ جائیں گی۔ اس لیے ایسے مواقع پر یہ سب سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سیکرٹری اپنے ڈھب کے آدمی کو بنا لیتے ہیں یوں جو کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں۔ انہیں کچھ کرنے نہیں دیتے۔ ہم لوگ چاہیں، تو اس ادارہ کا تاروپود چند دنوں میں بکھیر کے رکھ دیں۔ سوچتے صرف اتنا ہیں۔ شاید کبھی کوئی ڈھنگ کا آدمی سامنے آ ہی جائے۔

برہمی مزاج کا قصہ

جب میری پہلی کتاب "صاحب" چھپی، تو جناب حامد علی خاں صاحب نے لاہور ریڈیو سے تبصرہ کیا۔ بڑے ہی حوصلہ افزا کلمات میں سراہا۔ نوید یہ بھی سُنائی کہ کتاب اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس کا مصنف مستقبل میں مزید اپنے جوہر دکھائے گا۔ وغیرہ وغیرہ!

جب حامد علی خاں صاحب تبصرہ کر کے باہر آئے، تو مڈبھیڑ شوکت تھانوی صاحب سے ہوئی۔ حامد علی خاں صاحب نے شوکت صاحب سے پوچھا: "جو تبصرہ مَیں نے آپ کے دوست کی کتاب پر کیا ہے۔ کیا وُہ آپ نے سُنا"؟

اس پر شوکت تھانوی صاحب نے ایکٹنگ فرمائی: "بندہ کس قابل ہے!"

گویا تاثر یہ دیا کہ کتاب تو میری لکھی ہوئی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر حامد علی خاں صاحب نے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی سے کیا۔ شیخ صاحب نے اس واقعہ کا ذکر مجھ سے کیا۔ مَیں تو کھَول گیا۔ ایک دن اتفاق سے شیخ صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ شوکت تھانوی بھی آن دھمکے۔ میرے خون میں مزید حدّت پیدا ہو گئی۔ مَیں نے شوکت صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا: "کیا آپ نے حامد علی خاں صاحب سے کہا ہے کہ یہ کتاب (صاحب) مَیں نے لکھی ہے؟"

"بالکل نہیں!"

مجھے یقین تھا کہ نہ تو حامد علی خاں صاحب جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، شرارت کے طور پر یہ قصہ شوکت صاحب نے ہی چلایا ہو گا۔ اسی لیے مَیں نے بھی کہا: "اگر آپ نے ایسا ہی تاثر دیا ہو، تو پھر مجھے خوش بھی ہونا چاہیے، اس لیے کہ آپ کو لکھتے ہوئے تیس برس ہو گئے اور یہ کتاب میری پہلی کتاب ہے۔ گویا مَیں ایک دم آپ کے معیار تک پہنچ گیا۔"

اس پر شوکت صاحب بھی بھنّائے۔ انھوں نے فرمایا: "وہ نُطفۂ ناتحقیق ہو جس نے یہ بات کہی ہو۔"

پارہ میرا بھی گرم تھا۔ میں نے بھی کہہ دیا: "اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ کتاب، آپ کے معیار کے مطابق ہو گی، تو میں مسودہ کو آگ دکھا دیتا۔ مگر کتاب نہ چھاپتا۔"

انجمن ادبی رسائل

مجھے مولانا رازق الخیری نے لکھا کہ ہم نے یہاں ایک انجمن ادبی رسائل کی بنائی ہے۔ چاہتا ہوں کہ لاہور میں بھی اس انجمن کے ممبر بنائے جائیں، بلکہ اس کا پہلا جلسہ بھی لاہور ہی میں ہو!

مَیں نے خط کا جواب نہ دیا۔

بعد میں شاہد احمد دہلوی نے خط لکھا۔ مدعا وہی بیان کیا، جو کہ مولانا رازق نے تحریر فرمایا تھا۔ غرض ان دونوں بزرگوں نے یہ لکھا تھا کہ مَیں نے اگر دلچسپی نہ لی، تو یہ انجمن اپنے ابتدائی مراحل ہی میں دم توڑ دے گی۔ چونکہ پنجابی پھونک

بہت لیتے ہیں۔ اس لیے میں اس مہم پہ نکلا۔ کچھ ممبر بنائے، کچھ روپیہ اکٹھا کیا۔

لاہور میں خوب دھوم دھام سے انجمن کا پہلا جلسہ ہوا۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خان نون نے جلسے کی صدارت کرائی۔ انہوں نے پانچ ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا۔

انجمن کی رکنیت کے سلسلے میں، میں مولانا صلاح الدین مرحوم مدیر ادبی دنیا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اُن سے ممبر بننے کی درخواست کی!

انہوں نے پوچھا ”اگر میں ممبر بن جاؤں گا، تو پھر کیا ہو گا؟“

میں نے بتایا کہ کراچی والے کہتے ہیں ممبران کے لیے حکومت سے کاغذ کا کوٹا حاصل کیا جائے گا اشتہارات حاصل کیے جائیں گے۔ یوں ادبی رسائل کو سہولتیں میسر آئیں گی۔

اس پر مولانا نے دو ٹوک فرمایا ”میں آپ کی انجمن کا ممبر نہیں بن سکتا“

”کیوں؟“

”اگر مجھے یہ سہولتیں میسر آگئیں، تو پھر مجھے پرچہ بھی چھاپنا پڑے گا، پرچہ چھاپوں گا، تو نقصان بھی ہو گا، لہٰذا انجمن میری خیر خواہ نہیں بدخواہ ہے“

بہرحال میں اس انجمن کا کبھی سیکرٹری رہا ہوں اور کبھی نائب صدر! کبھی اس انجمن کے جلسے لاہور ہوئے، کبھی کراچی اور کبھی ڈھاکہ، کیونکہ یہ انجمن آلِ پاکستان کی بنیاد پہ وجود میں آئی تھی۔

کن کن ادیبوں سے ملا؟

صرف نام کی حد تک عرض ہے۔ وہ بھی مرحومین کی حد تک! میں ان سب کا ماتم گسار ہوں

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام نیازی، مولانا بیخود دہلوی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا حسرت موہانی، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، شوکت تھانوی، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری، مرتضیٰ احمد خاں میکش، سید احتشام حسین، عبدالباری آسی، مرزا محمد حسن عسکری، نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، شاہد احمد دہلوی، حکیم حبیب اشعر، علی عباس حسینی، خواجہ حسن نظامی، خواجہ غلام السیدین، صلاح الدین احمد، سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، مولانا علم الدین سالک، حکیم احمد شجاع، عابد علی عابد، ممتاز شیریں، عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، وحید قیصر ندوی، غلام احمد فرقت، شاد عارفی، ممتاز صدیقی، راجہ مہدی علی خاں، حفیظ ہوشیارپوری، مصطفیٰ زیدی، شکیب جلالی، نریش کمار شاد، ناصر کاظمی، اختر شیرانی، مجاز لکھنوی، مولانا ظفر علی خاں، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر ذاکر حسین، محی الدین زور، یگانہ چنگیزی، حامد حسن قادری، ڈاکٹر سید محمود، شیخ محمد اکرم، رئیس احمد جعفری، راز یزدانی، روش صدیقی، میاں محمد شفیع، اثر صہبائی، یوسف ظفر،

اور زندہ ادیبوں کی حد تک، کہ میں ان کا مداح ہوں۔

کرشن چندر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فراق گورکھپوری، سید وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ایس اے رحمٰن۔

فسادات

۱۹۴۷ء میں جب اِدھر اُدھر انسانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا، تو مَیں لاہور سے دِلّی کی طرف چل دیا تھا۔ اِس لیے کہ مَیں تھوڑی پونجی کا آدمی تھا اور میری خاصی رقم دِلّی کے ایک دکان دار کے ہاں پھنسی ہوئی تھی۔ مَیں نے سوچا تھا کہ فسادات کی وجہ سے کاروبار بند ہیں۔ اپنی ایک ڈوبی ہوئی رقم ہی لے آؤں۔ مگر یہ نہ سوچا تھا کہ جاؤں گا کیسے، اور آؤں گا کیسے؟ چونکہ تھُڑلو پنجیا تھا۔ ایسا سوچا بھی ہو گا، تو جان سے زیادہ رقم عزیز ہو گی۔

چنانچہ صاحب! مَیں دلّی تو ٹھیک ٹھاک طریقے سے پہنچ گیا۔ مگر جب وہاں پہنچا، تو فسادات زوروں پر شروع ہو گئے۔ مہاجرین کی ٹرینیں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے لگیں۔ مکانات کو نذرِ آتش کیا جانے لگا۔ خبروں میں سُنتا آج فلاں اسٹیشن پہ (ٹرین کو ٹھہرا کر) مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور آج فلاں فلاں اسٹیشن پر، کبھی یہ آج لوہاری دروازہ جل رہا ہے اور کبھی بھاٹی دروازہ، لوہاری دروازے میں میرا دفتر تھا اور بھاٹی دروازے گھر!

ایسے میں میرے ایک دوست عبدالصبوح قاسمی بھی دِلّی پہنچ گئے۔ مَیں انہیں دیکھ کر ذرا حوصلے میں ہوا۔ جب انہوں نے یہ بتایا کہ ریاست ٹونک جانا ہے اور وصیت کے مطابق حافظ محمود شیرانی مرحوم کی کتابیں لائبریری کے لیے لے جانا ہیں، تو مَیں پھر پریشان ہو گیا۔

انہوں نے تجویز پیش کی، "حالات خراب ہیں۔ اکٹھا رہنا چاہیے!" چنانچہ طے ہوا کہ مَیں بھی ان کے ساتھ ٹونک چلوں۔ کتابیں بُک کرا کے اکٹھے ہی واپس لاہور چلیں گے۔ چنانچہ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں اختر شیرانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مگر خبریں یہی سُن رہے تھے۔ آج وہ شہر جل رہا ہے، آج وہ شہر۔ اور آج وہاں ٹرین کاٹ دی گئی، اور آج وہاں!

ٹونک سے واپس ہوئے، تو راستے میں، ایک جگہ ٹرین بدلنی تھی۔ سوچا اسٹیشن پہ زیادہ خطرہ ہو گا۔ اِس لیے شہر کی طرف چلو اور اس محاورے پہ غور نہ کیا کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے، تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ چنانچہ چلے شہر کی طرف، وہاں پہنچ کر پوچھا، "یہاں کوئی مُسلمان ہے"؟ بتایا گیا۔ اس جگہ سب کے سب ہندو ہیں۔ جو چند مسلمان تھے بھی، وہ چلے گئے ہیں، اب لے دے کے صرف ایک عطر فروش، مسلمان کی دکان باقی ہے، چنانچہ ہم اس عطر فروش تک پہنچے۔ وہ تو ہمیں دیکھ کر مزید پریشان ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ آپ لوگوں کو ضرور کوئی قتل

کر دے گا۔ لہٰذا فوراً بھاگ جاؤ اور جس راستے سے آئے ہو اس سے واپس نہ جانا۔ چنانچہ بچتے بچاتے شہر سے نکلے گاڑی پہ سوار ہو گئے۔ ہم نے کوئی ٹرین ہی غلط پکڑ لی تھی کہ ہمیں ایک بار پھر جے پور جا کر ٹرین بدلنی پڑی۔ جس ٹرین پر دوبارہ سوار ہونا تھا، وہ کوئی چار گھنٹے کے بعد آئی تھی۔ چنانچہ ہم لوگ پھر بجائے اسٹیشن ٹھہرنے کے شہر کو چلے، وہ جگہ بڑی خوبصورت تھی۔ مکانات کا رنگ ایک، نقشہ ایک! شہر کے بیچوں بیچ اونچے اونچے دروازے، جیسے ہمارے ہاں دلّی دروازہ، بھاٹی دروازہ! خوب سبزہ، خوب باغات! — اور ایک برات تھی جو ہاتھیوں پہ جا رہی تھی۔

غرض ہم جے پور سے بھی بخیریت نکلے اور کسی نہ کسی طرح لاہور تک بھی بخیریت ہی پہنچ گئے۔ جب لاہور پہنچے، تو کوئی سواری موجود نہ تھی۔ اسٹیشن پہ ہُو کا عالم تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ٹانگے والے کو راضی کیا۔ وہ کہتا تھا۔ سواریوں کے ساتھ تانگے والے بھی مارے جا رہے ہیں۔ اس نے مجھ سے اسٹیشن سے بھاٹی دروازے کے دس روپے لیے جو کہ میں نے دیے۔ جب گھر پہنچا، تو (خوش ہونے کی بجائے) مجھے دیکھ کر سب رونے لگ گئے۔ اس لیے کہ وہ مجھے اپنے دھیانوں مرحوم سمجھ چکے تھے۔ لیکن۔

لکھے کی کیا خبر تھی یہ کون جانتا تھا

چکی کے پاٹ

مہنگائی

یہ زمانہ، جس میں کہ میں سانس لے رہا ہوں، کال کا زمانہ ہے

ایک زمانہ وہ تھا کہ پوسٹر لگا کرتے تھے کہ ہرکولیس سائیکل ۲۹ روپے میں مل سکتی ہے اور وہ بھی اقساط پہ، پھر دودھ دو آنے سیر تھا۔ گوشت پانچ آنے سیر، گھی روپے کا ایک سیر تھا اور گیہوں دو روپے من! چینی جو آج ڈھائی روپے سیر بھی نہیں ملتی۔ ان دنوں چھ آنے سیر تھی۔

لیکن آج:

ہرکولیس سائیکل آٹھ سو روپے میں بھی نہیں ملتی۔ دودھ دو روپے سیر ہو گیا ہے۔ گوشت سات روپے سیر ہے گھی سولہ روپے سیر اور گیہوں ۳۵ روپے من!

زمانہ جس حساب سے مہنگائی کی طرف جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی بیس برس بعد چیزیں اس سے بھی کئی گنا مہنگی ہوں گی۔

آج کل ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ہے۔ یہ عوامی حکومت ہے جس نے وعدہ کیا تھا کہ روٹی، کپڑا اور

مکان دے گی۔

پچھلے دنوں اخبارات میں ایک لطیفہ چھپا تھا کہ:

چینی ڈیڑھ روپے سیر   ایوب مُردہ باد
چینی دو روپے سیر   یحییٰ مُردہ باد
چینی تین روپے سیر   بھٹو زندہ باد

بھٹو صاحب سے پہلے محمد ایوب خاں اور محمد یحییٰ خاں اس مملکتِ پاکستان کے صدر تھے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مہنگائی کا میری ذات سے کیا تعلق! لیکن مہنگائی کا تعلق تو میری ذات سے ہے۔ آج جب کہ لاکھوں انسان بھوک کے مر رہے ہیں، تو پھر میرا کیسے مہنگائی سے تعلق نہ ہو۔ ہائے یہ بھی کیا دَور ہے کہ اس میں چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں اور انسان سستا ہو گیا ہے۔

میرے خلاف ہنگامے

میرا تعلق ادب سے ہے۔ کسی سیاسی دھڑے بندی سے نہیں۔ حتیٰ کہ میں ادب میں بھی گروہی تشخص کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے جتنا بھی کام کیا۔ اسی نقطۂ نظر سے کیا۔ میرے نزدیک نہ تو کسی کا اہلِ زبان ہونا کوئی بڑائی ہے اور نہ ہی اہلِ زبان نہ ہونا کوئی کوتاہی، 'ادب' ادب ہے خواہ وہ کسی کے قلم سے نکلے۔

جب نقوش کے چند ایک نمبر نکلے تو پڑھے لکھے طبقے کو اندازہ ہُوا کہ ان نمبروں کی تو حیثیت دائمی ہو گی۔ لہٰذا جو لوگ نقوش کے صفحات میں راہ نہیں پا سکے تھے۔ وہ میرے خلاف قلمی بندوقیں لے کر میدان میں آ گئے۔

مَیں جو کچھ پیش کرتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی بددیانتی پر مبنی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے میں چپ چاپ اپنے ہی کام میں گمن رہا۔ مَیں نے کسی کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ پلٹ کے بھی نہ دیکھا کہ میرے خلاف کیا ہو رہا ہے۔

لیکن جب ہمارا افسانہ نمبر چھپا، تو وہ لاوا ایکدم پھوٹ نکلا۔

قصّہ یہ تھا کہ میں نے اُردو افسانہ کی تاریخ مرتب کرتے وقت، ترقی پسند تحریک کے اُن رجحانات کی بھی نشاندہی کی تھی جو کہ مذہب سے بیزاری اور مذہب سے تمسخر کا درس دے رہے تھے اور مَیں نے یہ لکھا بھی تھا کہ مَیں اس حصے کو شامل نہ کرتا مگر مجبوری کے تحت شامل کر رہا ہوں کہ "اُردو افسانہ کے ارتقاء میں اس باب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

یہی وہ بنیاد جس پر اخبارات نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ایڈیٹوریل لکھے۔ مسجدوں میں میرے خلاف خطبے دیے گئے۔ بازاروں میں ڈگڈگی پٹی (جو مَیں نے خود بھی سُنی) کہ ایک ملعون اور نابکار شخص نے مذہب کے

خلاف زہر چکانی کی ہے' لہٰذا اس سے انتقام لیا جائے۔ فضا ایسی مکدر کر دی گئی کہ موت ایک قدم کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔

میرا رشتہ ادب سے تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ چپ رہ سکتا تھا۔ سو رہا ۔ حکومت کو اخبارات نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے ایڈیٹر کو قید اور جرمانے کی سزا ہونی چاہیے۔ جب فائل کھلی' تو نیچے سے تجویز یہ چلی کہ اس کے ایڈیٹر کو جرمانہ کیا جائے یا سزا دی جائے۔ جب فائیل اوپر تک پہنچی' تو ایک سینیئر افسر نے مدد کی (اللہ کے بندے بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں) اور چیف سیکرٹری کو بتایا کہ اس رسالے نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے اور یہ قضیہ سراسر نامناسب ہے۔ تب میری جان چھوٹی۔

ایک دن جگر مراد آبادی نے ایک صاحب سے تعارف کرایا کہ "یہ نواب اسمٰعیل خان کے صاحبزادے افتخار احمد عدنی ہیں۔" پھر جگر صاحب نے میری طرف ہو کر کہا: "یہ طفیل صاحب ہیں۔" اس پر عدنی صاحب نے فرمایا تھا: "میں آپ کا غائبانہ نیاز مند ہوں۔ جس کا ثبوت دے بھی چکا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

جن دنوں آپ کے خلاف ہنگامہ تھا۔ ان دنوں آپ کی فائیل . . . . .

(میرے دوست)

منظور الٰہی

شیخ منظور الٰہی سے تعارف یُوں ہُوا کہ آج سے کوئی بیس سال پہلے، انہوں نے مجھے اپنا ایک مضمون بھیجا۔ پتا کی جگہ درج تھا۔ ڈپٹی کمشنر ملتان! چونکہ میرا خیال یہ ہے کہ عموماً بڑے افسر بڑے آدمی نہیں ہوتے۔ اس لیے میں نے نہ ان کے خط کا جواب دیا، نہ ہی مضمون کے بارے میں اپنی رائے بھیجی۔

اِس واقعہ کے کوئی تین ماہ بعد، مجھے ان کا خط ملا کہ مَیں فلاں تاریخ کو آؤں گا، ہو سکے، تو مجھے شیزان میں ملیں۔ پہلے تو میں حسبِ عادت تلملایا۔ افسر ہے نا، حاضری کا حکم دے رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں یوں نہ جاؤں گا۔ مگر اس دن جس دن کہ انہوں نے لاہور پہنچنا تھا۔ اُن کا ٹیلی فون بھی آیا: "مَیں آج شیزان میں انتظار کروں گا۔"

ٹیلی فون نے میرے کئی وہموں کو مسمار کر دیا۔ چنانچہ پہنچا۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ انداز یہ تھا کہ جیسے مَیں ڈپٹی کمشنر ہوں اور یہ کوئی "ایں وے" سے آدمی! ہم کوئی گھنٹہ بھر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے نہ انہوں نے اپنے مضمون کی بات کی اور نہ ہی مَیں نے ان کی ڈپٹی کمشنری کا رعب کھایا۔ بلکہ محسوس یہ ہوا کہ یہ ڈپٹی کمشنر ہیں ہی نہیں!

یوں ہوتے ہوتے انہوں نے مجھ ایسے بے ڈھب آدمی کو بھی اپنا مطیع کر لیا۔ اَب میں انہیں بھول ہی نہیں سکتا۔ جیسے یہ میری زندگی کا ناگزیر حصّہ ہوں۔ اب ہم آپس میں، دکھ درد بھی بانٹ لیتے ہیں۔ جب بھی انہیں کوئی پریشانی ہوتی ہے۔ تو وہ مجھے اپنی پریشانی لگتی ہے۔ اس طرح جب مَیں بھی پریشان ہُوا ہوں، تو اُدھر یہ بھی آزردہ ہو گئے۔

با اصول اتنے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے ماتحت افسر سے یہ کہا: "یہ جو فلاں صاحب آپ کے پاس آ رہے ہیں میرے رشتے دار ہیں۔ مگر ان کا کام ناجائز ہے۔ کسی طرح سے ٹال دیں تاکہ—

ایک صاحب کی یہ ٹیلی فون پر سفارش کر رہے تھے۔ "ایک میرے دوست ہیں، ان کا اس پوسٹ کے لیے حق نہیں بنتا۔ کیا کیا جائے؟" ظاہر ہے کہ وہ صاحب بھی ان کی ایسی سفارش کا یہی جواب دیں گے کہ "حق نہیں بنتا تو چھوڑیں۔" اِدھر سے ان کا جواب یہ ہوتا ہے: "ہاں یہی مناسب ہے۔"

یہ اتنے با اخلاق ہیں کہ ہر کسی سے تپاک سے ملیں گے۔ چھوٹے بڑے یا اپنے غیر کا، ان کے ہاں الگ

الگ کھاتہ نہیں ہے۔ یہ اتنے اصول پرست ہیں کہ کبھی کبھی خود بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ پھر پکے مسلمان ہیں۔ سینما ہاؤس میں بھی مصلا بچھا لیتے ہیں۔

انہوں نے تین ایم اے کر رکھے ہیں۔ ایک فارسی میں، دوسرا تاریخ میں، تیسرا انسانیت میں!

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی میرے دوست تھے۔ بے حد پیارے! میری اُن سے ملاقات ۱۹۴۱ء میں ہوئی ہوگی اور ۱۹۶۳ء تک اُن سے خوب ہی یارانہ رہا۔ کیونکہ مئی ۱۹۶۳ء کو تو ان کا انتقال ہی ہو گیا تھا۔

مرحوم سے میری بیسیوں ہی مرتبہ لڑائی ہوئی ہوگی اور سینکڑوں ہی مرتبہ لوگوں نے ہمیں گلے ملتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ انہیں نہ میرے بغیر چین تھا اور نہ مجھے ان کے بغیر!

وہ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے۔ وہ اس محفل کی جان ہوتے تھے۔ بذلہ سنجی اُن پہ ختم تھی۔ ایک بار وہ ہمارے پریس میں تشریف لائے۔ فرمانے لگے: "آپ کے پریس میں کتنی مشینیں ہیں؟" میں نے کہا "چار!" فرمانے لگے "پانچویں مشین میں نے خود دیکھی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"آؤ میرے ساتھ!" چنانچہ انہوں نے مجھے کارکنانِ پریس میں سے، ایک بہت ہی موٹے آدمی کے سر پر جا کر کھڑا کر دیا اور کہا "یہ! — یہ!!"

ان کے ہاں سبھی قسم کے لطیفے چلتے تھے۔ شائستہ بھی، سُبک بھی، غرض خلقِ خدا کو خوشیاں بانٹنا، ان کے فریضے میں شامل تھا۔ رنگ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ذہن میں رکھئے کہ لاہور اور کراچی کے درمیان، بہاولپور تقریباً وسط میں پڑتا ہے۔ ایک خاتون نے، جو سیاسی کاموں میں بہت پیش پیش تھیں اور اپنی رعنائیوں کے اعتبار سے بھی قابلِ ذکر تھیں۔ انہوں نے ان سے کہا: "میں آج کل بڑی مصروف ہوں۔ میری ایک ٹانگ کراچی میں ہوتی ہے، تو دوسری لاہور میں!"

اس پر شوکت صاحب نے کہا "پھر بہاولپور والے تو بڑے مزے میں ہوں گے۔"

مجھے ان سے پیار ہی تھا کہ جو مَیں نے ان پر نقوش کا ایک پورا نمبر نکالا۔ میں نے اپنے ایسے ہی جذبات کا اظہار اس کے ابتدائیہ میں بھی کیا ہے۔

لیجیے، وہ صاحب بھی مر گئے۔ جو مجسّم زندگی تھے۔

شوکت صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ انہیں دیکھ کر اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ زندگی کی ساعتیں طویل تر ہو جائیں۔

گھر کی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ، تو اس کا بھی ہفتوں قلق رہتا تھا۔ پھر یہ تو شوکت تھانوی تھے۔ ایک ایسی بھرپور ہستی جسے میں اس دکھی دنیا کے لیے خدا کی طرف سے عطیہ سمجھتا رہا۔ انھوں نے ہزاروں کو زندگی سے پیار کرنے کا درس دیا۔ مگر جب ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد بڑھی، تو یہ چپکے سے موت کی انگلی پکڑے دُور نکل گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شوکت صاحب صرف میرے دوست تھے۔ نہ ہی یہ دعویٰ کروں گا کہ انھیں جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی اور واقف نہ تھا۔" اتنی بے تعلقی" پر بھی میرا اُن سے جتنا بھی ربط ضبط رہا۔ اس کی بنا پر مجھ سے، اداس ہونے کا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

بیماری کے دنوں میں، شوکت صاحب اپنے دوستوں کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان یوں ٹپ ٹپ آنسو بہائے اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر انسانی زندگی پر شوکت صاحب کا یہ خاموش طنز بھی بھولنے والی بات نہیں۔

ہم سب کتنے عاجز ہیں کہ زندگی رونے کی آواز سے شروع ہو کر، درد کی آواز پر ختم ہو جاتی ہے۔ شوکت صاحب کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر ان کی زیادہ ہوتی ہے، جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں سوچیں، جو دفن ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔

ترقی پسندی

جب ہم نے نقوش کا اجرا کیا تھا، تو اُسے خالص ادبی پرچے کے رُوپ میں نکالنے کا تہیہ کیا تھا۔ مگر احمد ندیم اور ہاجرہ مسرور کی وجہ سے یہ پرچہ ترقی پسند تحریک کا آرگن بن گیا۔ چنانچہ "امن نمبر" تک نکلا جو بوڈاپسٹ کانفرنس کی روداد پر مشتمل تھا۔ اس کایا پلٹ سے مجھے ذہنی دھچکا لگا۔ کیونکہ میں خالص ادبی پرچے کے حق میں تھا۔

ترقی پسند ادیبوں کا سالانہ اجلاس لاہور میں، بمقام اوپن ایئر تھیٹر منعقد ہوا۔ اس میں بڑی دھواں دھار قسم کی تقریریں ہوئیں۔ مقالات پڑھے گئے۔ مفہوم یہ تھا کہ جو غیر ترقی پسند ہیں۔ ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ غیر ترقی پسند جنھیں گردانا گیا۔ اُن میں سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، شفیق الرحمٰن، ممتاز مفتی، ڈاکٹر تاثیر، عابد علی عابد، حفیظ جالندھری، ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ہی نمایاں ادیب!

اس مسئلے پر جب میری رائے پوچھی گئی، تو مَیں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ اِن اور ایسے ادیبوں کو خارج کر کے ہم ادب میں توازن برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ سیاسی میدان میں جسے چاہیں قبول کریں، جسے چاہیں رد کر دیں، مگر ادب کے میدان میں لکیر نہ کھینچیں۔

سب نے کہہ دیا۔ "اب تو یوں ہی ہوگا"

میری نحیف آواز کو سننے والا کوئی نہ تھا۔ اپنے بھائی (احمد ندیم قاسمی) نے اعلان کر دیا کہ میں تو تحریک کے احکام کا پابند ہوں۔ دوستی اپنی جگہ۔ میں تو وہی کچھ کروں گا جو ترقی پسند تحریک کہے گی۔

آج بھی اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ میں ترقی پسند تحریک کے مخالفین میں سے تھا تو مجھے دکھ ہوگا۔ کیونکہ میں تو اس تحریک کو ادب میں "تازہ ہوا کا جھونکا" سمجھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں تو ادب کی نمائندہ نگارشات کا تصور کرشن چندر، بیدی، عصمت، فیض اور ندیم کے بغیر کر ہی نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے منٹو اور قرۃ العین کی تخلیقات کو خارج کر کے!

وہ بات جو میری ۱۹۵۰ء میں بری لگی تھی۔ اب اسی روش کو اپنانے پر سبھی مجبور ہو گئے۔ یعنی میری سوچ بیکار نہ نکلی۔ جب وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، تو سچائی کے دروازے کھل ہی جایا کرتے ہیں۔ ادب میں میرا تیرا کیسا، ادب تو سب کا ہے اور سچا ادیب بھی سب کا!

ہوٹل بازی

۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کے دن بھی خوب تھے۔ فراغت زیادہ تھی۔ مل بیٹھنے کے مواقع زیادہ تھے۔ احمد ندیم روٹھ کر الگ بیٹھ گئے تھے۔ ترقی پسندوں و غیر ترقی پسندوں کا چکر جو چل گیا تھا۔ چنانچہ کچھ دوستوں نے ادھر کا بھی رخ اختیار کیا

چنانچہ ایک چھوٹی سی ٹولی سرِ شام ریسٹوران میں جا بیٹھتی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، حکیم حبیب اشعر، ناصر کاظمی، انتظار حسین، نو بجنوری اور قیوم نظر، یوں دو تین گھنٹے، ادیبوں کا احوال جاننے، غیبت کرنے اور اپنی بڑائیوں کے اظہار میں گزر جاتے۔

رفتہ رفتہ یہ عقدہ کھلا کہ یہاں پہ مختلف گروپ ہیں جو ایک گروپ میں بیٹھ گیا۔ دوسرا گروپ دشمن بن گیا۔ چنانچہ یہ فلاں گروپ کا آدمی ہے اور یہ فلاں گروپ کا، اس قباحت نے مجھے خاصا پریشان کیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ یاروں نے ہمارا گروپ بھی تصنیف کر ڈالا۔

ہم جو سب ادیب اپنے ہیں کے تصور میں مبتلا ہیں۔ یہ تصور باطل ہونے لگا۔ کھلم کھلا طرف داریاں ہونے لگیں۔ ایک ادیب اچھا اس لیے سمجھا جانے لگا کہ وہ ہمارے گروپ کا ہے، دوسرا ادیب برا اس لیے تھا کہ وہ مخالف گروپ کا ہے۔ چنانچہ اس ہوٹلیانہ سیاست نے خاصا پریشان رکھا۔

ادھر میں جو اپنے منصب اور افتادِ طبع کے اعتبار سے سب سے تعلقات کا قائل تھا ٹوٹ کے رہ گیا۔ ماحول ایسا تھا کہ سب اپنی سنانے کے قائل تھے۔ کسی کی سننے کے روادار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسی

ہوٹل نشینی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ اب میرا اُدھر کا رُخ ہوتا ہی نہیں۔ اپنے اس فیصلے پر کاربند ہوئے مجھے کوئی بیس برس تو ہو چکے۔

نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جو ایک بار ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ وہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ یا اس وقت تک اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جب تک کہ ہوٹل کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا۔

وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جو ادیب پہلے چلا جاتا ہے، بعد میں رُکنے والے ادیب اس کی بُرائیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا کوئی کسی کو اس "عبادت" کا موقع دینا نہیں چاہتا۔

سیکرٹری جنرل

رائٹرز گلڈ کے بارے میں، اپنے تاثرات پہلے بھی بیان کر چکا ہوں صحیح اور سچے جذبات، گلڈ ایک بیکار تنظیم ہو چکی تھی۔ چند لوگ اس پہ چھائے ہوئے تھے، اور وہ ہر طریقے سے چھائے رہنا چاہتے تھے۔ چونکہ سنجیدگی کے ساتھ، میں نے پہلے کبھی بھی گلڈ کے معاملات کو یوں نہ دیکھا تھا۔ اس لیے اسے بچانے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ پھر تو پورا حصّہ لینے کا پروگرام بنایا۔ پہلے پنجاب کے الیکشن پر توجہ دی۔ برسرِاقتدار پارٹی نے پورا زور لگایا کہ وہ قائم و دائم رہے مرکز بھی ان کی اعانت کے لیے تیار، ہر معاملے میں ان کی طرف داری، ہر معاملے میں ہماری حق تلفی، اس ماحول میں بھی جو نتیجہ نکلا وہ یوں تھا کہ ۹ نشستوں میں سے سات نشستیں ہمیں ملیں۔ دو مخالف فریق کو!

میرا ارادہ صرف پنجاب کی حد تک ہی الیکشن لڑنے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ مخالف فریق مرکز میں سیکرٹری جنرل کا الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے باعثِ تشویش تھی۔ اس لیے کہ یوں ہم پنجاب میں بھی کام نہ کر سکتے۔ بادلِ نخواستہ مرکز کا الیکشن لڑنے کا ارادہ کیا۔ بادلِ نخواستہ اس لیے کہا کہ وہ تنظیم جسے ذاتی اغراض کی بنا پر کھوکھلا کر دیا گیا تھا، جو اپنوں اور غیروں میں توقیر کھو چکی تھی۔ اس کی سربراہی کی ہامی بھرنا جرأتِ رندانہ والی بات تھی۔

جب الیکشن کے دن قریب آئے، تو مخالف فریق اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آیا۔ جعلی دستاویزات بنائی گئیں اور انہیں مشتہر کیا گیا۔ وقت پر الیکشن نہ کرانے کے لیے رٹ درخواستیں گزاری گئیں۔ اقلیتی صوبوں اور اکثریتی صوبوں کا سوال اُٹھایا گیا۔ غرض دیوانہ بکارِ خویش ہشیار بن کر نہیں بلکہ ہشیار بکارِ خویش ہشیار بن کر سارے ہی حربے آزما دیکھے۔ چونکہ ادیبوں کی اکثریت ان کے لچھنوں سے واقف تھی، اس لیے ان کی ہر تدبیر اُلٹی پڑی۔

میدان میں تین گروپ تھے۔ دو پنجاب سے اور ایک سندھ سے۔ چونکہ سندھ کے الیکشن میں، ہم نے جن دوستوں کا ساتھ دیا تھا۔ یا جو ذہنی طور پر ہمارے ہمنوا تھے۔ بالآخر انہوں نے مرکزی الیکشن میں بھی میرا ساتھ دیا۔ ان دوستوں میں نمایاں عبید اللہ علیم، نسیم دُرّانی اور جمیل اختر خان تھے۔ چنانچہ جب نتیجے کا اعلان ہوا، تو ۱۹ ووٹ مجھے

سے اور ۱۳ مخالف فریق کو، کل ووٹ ۳۶ تھے۔ (ہر صوبے کے ۹/۹ ووٹ) چار ووٹروں نے حصّہ نہ لیا۔

چنانچہ سیکرٹری جنرل کا عہدہ، چاروں صوبوں کی اکثریت سے ہمارے حصے میں آیا۔ اب اس تنظیم کے بچانے کی سعی جاری ہے۔ جب کہ اس تنظیم کو ختم کرانے کی کوشش دوسری طرف سے جاری!

یاں وہ لے دے مچی آکر کہ الٰہی توبہ
ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا

دُوسرے بیٹے کی شادی

۱۹۷۵ء میں دوسرے بیٹے جاوید اقبال کی شادی ہوئی۔ مَیں اپنی نصف ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہُوا یعنی دو بچوں کی شادی ہو گئی۔ دو بچوں کی شادی باقی! اس فرض سے بھی چند ایک برس میں سبکدوش ہو جاؤں گا مَیں چاہتا ہوں کہ اپنی ذمّہ داریوں سے جلد فراغت ملے۔ ادھُورے کام باقی نہ رہیں۔ زیادہ مہلت ملنے کی اُمید نہیں اس کی گواہی دل دے رہا ہَے۔ ویسے قدرت کی فیاضی کی بات الگ ہَے۔

جاوید کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا، مگر مجھے علامہ اقبال سے جو عقیدت تھی۔ اُسی بنا پر مَیں نے اپنے لختِ جگر کا نام جاوید رکھا تھا۔ نیت یہ بھی کہ مَیں اپنے بچوں کے نام، بڑے ادیبوں کے بچوں کے نام پر رکھوں۔ پھر یہ سوچ کر ارادہ ترک کیا کہ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

جاوید اقبال نے ایم کام وغیرہ کے امتحان دیے۔ خوب ذہین و فطین ہے۔ مُہذّب اور ہر دلعزیز، جو ملتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ مَیں چاہتا تھا کہ اس کا رشتہ کسی اچھے گھرانے میں کروں۔ اچھے گھرانے سے مُراد یہ کہ جو سرکار دربار میں اونچی کرسی پہ بیٹھے ہوں۔ وہ توقع کچھ غلط نہ تھی۔ اچھے اچھے رشتے آئے مگر ہمیں مجبُوراً رد کرنے پڑے۔

جاوید میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر بے جا ضد بھی موجود ہے۔ چونکہ ضد (جسے لاڈ بھی کہہ سکتے ہیں) والدین ہی کے ساتھ کی جا سکتی ہَے۔ اس لیے وہ ہتھیار ہم پہ بھی آزمایا گیا۔ جہاں ہم شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہاں اس نے انکار کر دیا اور اپنی پسند کا رشتہ بتلا دیا۔ ہم نے اپنی پسند پہ، جاوید کی پسند کو ترجیح دی۔ والدین کی خواہش اگر پُوری نہ ہو، تو کوئی بات نہیں۔ بچوں کی خواہش کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے۔ یہ امتحان ہوتا، تو کڑا ہے مگر اس امتحان میں پُورا ضرور اُترنا چاہیے۔ بچوں کو مخمصوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

اب جبکہ یہ رشتہ ہو گیا ہے۔ ہم میاں بیوی بے حد خوش ہیں۔ گھر میں بہو نہیں آئی۔ بیٹی آئی ہے اور ہمارا اسی رشتے سے بے حساب!

پروگرام

وقت : ۷ بجے شام ، ٹھیک ۷ بجے شام
مقام : گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لوئر مال، لاہور

تاریخ : ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء ولیمہ
شوقِ دید کا بھی مسئلہ ہے — اور — فرض کی ادائیگی کا بھی مرحلہ ہے
یعنی
میرے بیٹے جاوید اقبال کی شادی پر
آپ کی تشریف آوری
میرے شوق کی تسکین — اور — آپ کے فرض کی ادائیگی کا موجب ہو گی

محمد طفیل
ایڈیٹر نقوش : لاہور

فراغت کے دن فراغت کی راتیں

کبھی اتنی فراغت تھی کہ ہم لکھنؤ جا رہے ہیں، تاکہ جی بھر کے آم کھائیں اور بہانے بہانے سے شوکت تھانوی سے کتاب بھی لکھوائیں۔ چنانچہ مہینہ مہینہ دو دو مہینے بیٹھے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں۔ کتاب لکھوا رہے۔ اہلِ زبان

ایک پنتھ دو کاج اسی کو تو کہتے ہیں، اسی طرح میں کوئی پانچ چھ مرتبہ لکھنؤ گیا ہوں گا۔ وہ لکھنؤ، جو مجھے لاہور ہی کی طرح پسند ہے۔

اسی طرح جی میں آیا، تو دلی کی طرف نکل گیا۔ وہاں پڑے ہیں۔ کیا ہے؟ بستا رہے ہیں صاحب! یوں میں دلی کوئی دس بارہ دفعہ گیا ہوں گا۔ دلی کی اچھائیاں اور برائیاں بالکل لاہور جیسی ہیں۔ ویسی ہی گلیاں، ویسے ہی بازار، ویسا ہی موسم، فرق ہے، تو لباس کا، یا زبان کا! آہ وہ بھی کیا دن تھے۔

اب لباس اور زبان کا بھی فرق مٹ چکا ہے۔ آہ یہ بھی کیا دن ہیں۔ اس لیے کہ لباس اور زبان کے فرق کو مٹانے کے لیے صرف ہزاروں عصمتیں لٹیں۔ صرف ہزاروں قتل ہوئے۔

اب یہ ہے کہ فرصت نام کی چیز عنقا ہے۔ اب کبھی مجھے کسی جگہ ضروری کام سے بھی جانا ہوتا ہے تو جا نہیں پاتا۔ مثال کے طور پر اگر مجھے اسلام آباد جانا ہو، تو صرف پروگرام بنتا رہتا ہے۔ آج اس کام نے گھیر لیا۔ کل اس کام نے گھیر لیا۔ اب اگر میں کسی دوست کو ٹیلی فون پر یہ بتاتا ہوں کہ اسی ہفتے میں حاضر ہو رہا ہوں تو وہ جواب میں کہتا ہے، تو پھر ایک ماہ تک امید رکھیں۔

لکھنا چاہتا ہوں مگر لکھ نہیں پاتا۔ میرا دفتر صاحب بہادر کا دفتر تو ہے نہیں کہ دروازہ پر بیٹھا چپڑاسی ملنے والوں کو ٹرخاتا چلا جائے کہ صاحب ضروری میٹنگ میں بیٹھے ہیں۔ چاہے ایجنڈا اکلوتی جان کے چائے پینے کا ہو۔

میں فراغت کی گھڑی دیکھ کر قلم اٹھاتا ہوں۔ ابھی دو چار جملے ہی لکھتا ہوں کہ ایک صاحب تشریف لاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ میری غزل چھپے گی یا نہیں، اب میں مروت کا مارا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جناب ان کی نہ تو کوئی ردیف اور نہ قافیہ، یہ اس لیے نہیں کہتا۔ جواب میں وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ کیا نثری شاعری آپ تک نہیں پہنچی۔

پھر اللہ رکھے میرے دوستوں کی تعداد بھی اتنی ہے کہ اتنی کرسیاں نہیں ہوتیں۔ پھر غیبت جو کہ ہمارا قومی مزاج ہے۔ اس سے بھی واسطہ رہتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا ہے کہ میں اس فن میں طاق نہیں۔ ویسے اتنا اقرار ضروری ہے کہ صاحب بڑا بڑا پڑا ہے۔ یقین کیجیے اس ماحول میں کھانے تک کا وقت نکل جاتا ہے اور میں بیٹھا رہ جاتا ہوں۔ خالی پیٹ اور خالی قلم۔

عصمت چغتائی

میں نے عصمت چغتائی کو لاہور بلایا۔ کیونکہ وہ (ہندوستان سے) کراچی اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے آئی

تھیں۔ میں نے عصمت سے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ بے شک ہمارا آپ سے خون کا رشتہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ باقی کونسا رشتہ نہیں ہے؟ اس پر عصمت بہت خوش ہوئیں۔ کہا تو پھر بھجواؤ ٹکٹ!

جب ان کا جہاز لاہور پہنچا، تو میں کسٹم کے حکام سے اجازت لے کر، ان کے قریب جا پہنچا تھا۔ لاہور میں عصمت کا سب سے پہلے میں نے استقبال کیا، جبکہ باہر عصمت کے بہت سے مداح اور رشتہ دار موجود تھے میری بیوی بھی عصمت کی بے مداح ہیں۔ حالانکہ عورتیں ایک دوسرے کی مداح کہاں ہوتی ہیں؟ بہرحال میری بیوی کا اصرار یہ بھی تھا کہ عصمت کی سب سے پہلے دعوت ہم کریں گے۔

چنانچہ عصمت سب سے پہلے ہمارے ہی ہاں تشریف لائیں۔ میں نے صرف چند احباب کو بلایا تھا تاکہ کھل کر باتیں ہو سکیں۔ عصمت تو پہلے ہی کھل کر باتیں کرتی ہیں۔ اُدھر ہم نے بھی ایسا ہی التزام کر لیا۔ کیا بتائیں کہ سرشاری کے وہ لمحے کتنے عزیز تھے اور کتنے لذیذ تھے۔

اُن میں سے ایک بے ضرر سی بات عرض کرتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ عصمت سگریٹ پیتی ہیں۔ اس لیے میں نے ان کی طرف سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا: "سگریٹ پی لیجیے۔ یہاں سب اپنے ہیں"

عصمت کا جواب یہ تھا سوسائٹی جس کام کو برا کہتی ہو، وہ کام غیروں کی موجودگی میں ہی کرنے چاہئیں۔

میں نے تو صرف چند احباب کو اپنے ہاں بلایا تھا، کیونکہ ہمارا پروگرام وسیع پیمانے پر عصمت کا استقبال کرنے کا تھا۔ ادارہ نقوش کی طرف سے بھی، رائٹرز گلڈ کی طرف سے بھی، بہرحال ہمارے ہاں جو احباب موجود تھے۔ ان میں سید وقار عظیم (مرحوم)، جناب امتیاز علی، خدیجہ مستور، شیخ منظور الٰہی، عبدالرحیم چغتائی (عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی)، سائرہ ہاشمی اور کئی دوسرے احباب۔

عصمت عبدالرحیم چغتائی سے مل کر بڑی خوش ہوئیں، کیونکہ مرحوم (عبدالرحمٰن چغتائی) اپنی وفات سے پہلے ہی نقش اقبال کا ایک نسخہ اپنے دستخطوں کے ساتھ عصمت کے لیے دے گئے تھے۔ جناب امتیاز علی سے بھی مل کر بڑی خوش ہوئیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے سے سینئر افسانہ نگار کو بڑی مدت کے بعد دیکھا تھا۔

ادارہ نقوش اور رائٹرز گلڈ نے بڑے وسیع پیمانے پر ان کے استقبال کا پروگرام بنایا تھا لاہور کے سارے ہی ادیبوں نے ان تقریبات میں شرکت کی۔ ایسا والہانہ استقبال اور کسی ادیب کا میں نے نہیں دیکھا کہ آنکھیں بھی ان کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں اور دل بھی!

روزنامچہ

میری نظروں میں اتنے نظارے بھرے ہیں کہ ان کا اظہار قدرت کی فیاضیوں کو آوازدینے کے مترادف ہو گا۔

جو میرے بس میں نہیں!

جو لکھنا میرے بس میں ہے اُس کا لکھنا، اُس کا چھپنا ہمارے ملک کے باسیوں کو راس نہ آئے گا۔ لہٰذا صرف اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اپنا روزنامچہ لکھ رہا ہوں، سفر نامہ نہیں لکھا جا سکتا، یا پھر دوسرے سفر نامہ نگاروں کی طرح جھُوٹ کو اپنا ایمان بناؤں!

نہ وہ ممکن، نہ یہ ممکن!!

○

محمد طفیل

۲۱ جولائی

صبح سیر کے لیے اٹھا۔ نہر کے کنارے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور پروفیسر محمد صدیق ملے۔ خورشید صاحب نے پوچھا، یورپ جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے گزارش کی، آج شب۔ انہوں نے فرمایا: یہاں بھی اچھے اچھے ڈاکٹر اور حکیم ہیں! ان سے رجوع کیا ہوتا۔ میں نے جواب میں کہا: تین سال سے تختۂ مشق بنا ہُوا ہوں۔

پروفیسر محمد صدیق نے ڈاکٹر عبدالسلام سے رخصت لے لی اور میرے ساتھ چل دئے۔ راستے میں ایک جگہ بہت سے کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ معلوم ہُوا ایک کوّا مرا پڑا ہے اور یہ اس کے سوگ میں شور مچا رہے ہیں۔ میں نے کہا، سیکڑوں کوّے جمع ہیں۔ یہ ادیبوں سے اچھے ہیں، اس لیے کہ اختر شیرانی مرحوم کے جنازے میں صرف بارہ تیرہ افراد شریک تھے۔

دفتر اس لیے گیا تھا کہ کچھ ایڈریس نوٹ کر لُوں، کچھ کو خطوط لکھ دُوں کہ آ رہا ہُوں۔ مگر اس کی مہلت نہ ملی۔ ایک تو تین گھنٹے کے لیے بجلی غائب ہو گئی۔ پھر دوستوں کا آنا جانا رہا جن میں اسلم کمال، کسریٰ منہاس، قاضی مختار احمد اور محمد عالم مختارِ حق شامل تھے۔

۵ بجے ہوائی اڈے پہنچا۔ وہاں میرزا ادیب، موجد صاحب اور حنیف صاحب کو اپنا منتظر پایا۔ ان دوستوں اور گھر کے افراد سے رخصت ہو کر میں اندر جانے لگا تو میری پوتی عصمت نے کہا: ڈیڈی! میری طرف سے یہ پھول قبول کیجیے۔

کراچی پہنچا تو ہوائی اڈے پر جاوید اور انعام الحق کو اپنا منتظر پایا۔ انعام صاحب کے گھر گئے۔ رات ۱۲ بجے مجید علی خاں صاحب ہمیں ہوائی اڈے پہنچانے کے لیے آئے وہ رخصت ہوئے تو

۲۲ جولائی [لوزان، سوئٹزرلینڈ]

شروع ہو چکی تھی۔ رات دو بجے سوئز جہاز پر بیٹھے کیونکہ ہمیں پہلے سوئٹزرلینڈ جانا تھا۔ جہاز کا عملہ بڑا سلجھا ہوا اور مہمان نواز تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانے پینے کے لیے پُوچھتا رہا۔ پھر اُنھوں نے ایک فلم دکھائی جو ایک موسیقار کے بارے میں تھی۔ موسیقار پر ایک لڑکی لٹو ہو گئی، جو ہر طرح سے لٹو تھی۔ جلوت میں خلوت میں' میرے ساتھ میرا بیٹا بھی

سفر کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے والہانہ سپردگیاں اچھی نہ لگیں۔ پھر فلم میں موسیقار کا دوست وارد ہُوا۔ وہ بھی رقص و سرود کی محفلوں میں لڑکی کا ساتھی بنا۔ دونوں متمتع ہوتے رہے۔ مگر ہمیں اس پر حیرت اپنے معاشرے کی وجہ سے تھی مگر یہ اُن لوگوں کی زندگی کا عام چلن تھا کہ جن کے ملک کی طرف جا رہے تھے۔

زیورچ کے ہوائی اڈہ پر ہم صبح کے سات بجے پہنچے۔ ہمیں جنیوا جانے کے لیے گیارہ بجے کا جہاز پکڑنا تھا، اس لیے ہم ہوائی اڈہ پر ہی رہے۔ ہوائی اڈہ بڑا ٹھاٹھ کا تھا۔ ہر طرف ہدایات درج، پُوچھے بغیر مسافر کی رہنمائی کے لیے سب معلومات حاضر۔ ہم اڈے پر گھومتے رہے۔ طرح طرح کے لوگ دیکھتے رہے۔ انہی طرح طرح کے لوگوں میں ہمیں ایک سردار صاحب بھی ملے۔ وہ ہمارے پاس آئے اور پنجابی میں پُوچھا:

چُپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں، آئیے باتیں کریں۔

معلوم ہُوا سردار صاحب ہانگ کانگ سے آتے ہیں اور لندن میں کاروبار جمائے بیٹھے ہیں۔ سردار صاحب اچھے مزاج کے آدمی نکلے۔ ہم باپ بیٹا بیٹھے رہے اور وہ مسلسل کھڑے رہے۔ ہم نے کئی بار کہا بھی: بیٹھ جائیے۔ مگر وہ نہ بیٹھے۔ کہتے تھے: بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہُوں اب کھڑا رہنا ہی میرے لیے ضروری ہے۔

ہم نے پُوچھا، سردار صاحب! خالصتان کی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ خیال یہی ہے کہ خالصتان بن گیا۔ البتہ اس کی تاریخ سنہ ابھی طے نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ ہمیں اچھے لیڈر میسر نہیں ورنہ وہ دن زیادہ دور نہ ہوتا۔ ہم نے ۱۹۴۷ء میں بھی سیاسی غلطی کی تھی ورنہ ہم بزدل ہندوؤں کے ہاتھوں اتنا نہ پٹتے۔ کہنے لگے: ہم جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے اتنے مداح نہ تھے بلکہ اس کے مخالف ہی تھے مگر اس نے سکھ دھرم کو بچانے کے لیے جس جواں مردی کا ثبوت دیا وہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ وہ سکھ قوم کا نجات دہندہ ثابت ہوگا کیونکہ اس نے ہمیں ایک راستہ دکھایا ہے۔ مرتے جائیں گے مگر منزل کی طرف بڑھتے جائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم جنیوا جانے کے لیے متعلقہ پلیٹ فارم پر پہنچے۔ آدھ گھنٹہ میں جنیوا پہنچ گئے۔ جنیوا کہ جو کبھی دُنیا کی سیاست کا اہم مرکز تھا۔ جنیوا سے ہمیں لوزان پہنچنا تھا کہ وہاں میرے بیٹے جاوید کو ایک فرم سے کام تھا۔ رہنمائی کے لیے میرے دوست ایوب علی خاں کے بیٹے اشرف علی خاں جنیوا کے ہوائی اڈہ پر ہی مل گئے تھے۔ جنیوا سے لوزان پہنچے تو اشرف علی خاں نے ہمارے لیے ریجنا ہوٹل میں کمرہ بُک کرا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے اشرف علی خاں سے یہ طے ہوا کہ وہ کل صبح ۹ بجے آ جائے تاکہ متعلقہ فرم چلیں۔

۲۳ جولائی

میری آنکھ صبح پانچ بجے کُھل گئی، بستر پر لیٹے لیٹے گھر کا ایک ایک فرد یاد آنے لگا، بیگم، بچے سب ایک ایک کر کے۔ پھر پوتے پوتیاں باہم گڈمڈ، ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے، شکایتیں

کرتے ہوئے۔ البتہ مجھے ہوائی اڈے پر عصمت کا پھول دینا بھی یاد آیا۔ فرخندہ بھی یاد آئی۔ اس کا لڑنا جھگڑنا بھی یاد آیا۔ وہ کہتی تھی کہ میری سالگرہ آئی تو ڈیڈی (سب بچے مجھے ڈیڈی کہتے ہیں اور اپنے والد کو ابّو) باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے کہا: میں سالگرہ کے کیک کے لیے پیسے دے جاؤں گا۔ کہنے لگی: کیک تو آجائے گا مگر آپ وہ کیک کھانے کے لیے یہاں تو نہ ہوں گے۔

میں نے ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے چھت پر کبوتر بیٹھے دیکھے جو ہمارے ملک کی طرح غٹر غوں غٹر غوں کر رہے تھے۔ مجھے اپنے ملک کی اس یکسانیت پر خوشی ہوئی۔ ورنہ یہ ملک تو ہمارے کئی معاملات میں ضد کا مقام رکھتا تھا۔

ہم حسبِ پروگرام متعلقہ فرم کے منیجر سے ملنے گئے ان کی سیکریٹری نے لبھانے والے انداز میں چائے، کافی یا ٹھنڈے کے لیے پوچھا۔ ہم کچھ بھی پینا نہ چاہتے تھے۔ مگر سب کچھ پیا۔ سب کچھ میں وہ چیز شامل نہیں جسے اُمّ الخبائث کہتے ہیں۔

منیجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھلے آدمی تھے۔ مگر اپنے تحریری معاملات سے منحرف ہو گئے۔ کہنے لگے اب ہم اپنی لکھی تحریروں پر عمل نہ کر سکیں گے۔ یہ عجیب دنیا ہے ہم لوگ زبانی وعدوں پر بچّوں کے رشتے پکّے کر ڈالتے ہیں یہ پکّی تحریروں کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے۔

جب ہوٹل واپس آئے تو طبیعت پر بوجھ تھا کہ ہم اتنی دُور سے ان صاحب کے پاس آئے اور معاملہ یُوں ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے اشرف علی خاں سے کہا: اس شہر کی سیر ہی کرا دیں۔ کہنے لگے: یہاں ایک میوزیم ہے اور ایک جھیل۔ ہم نے جھیل کی طرف چلنے کو کہا۔ زمین دوز ریل میں بیٹھ کر جھیل کی طرف نکلے۔ اس جگہ کو اُنھوں نے اچھی طرح ڈیویلپ (DEVELOP) کیا ہوا تھا۔ اچّھا تفریحی خطّہ تھا۔ خوش نما چھوٹا سا باغ، جس میں چھوٹی سی ریل چل رہی تھی (باغ کے چاروں طرف)۔ باغ میں متعدد جوڑے بیٹھے تھے اور مناسب کاموں میں دل چسپی لے رہے تھے۔ پہلے تو میں مُنہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ مگر دوسری طرف بھی ایسا ہی منظر ہوتا اس لیے جو نظر آتا، دیکھنے پر آمادہ ہو گیا۔

یہاں سے فرانس بالکل قریب ہے۔ اس لیے دیکھا کہ وسیع جھیل میں، جو چھوٹے سے سمندر کے مشابہ تھی۔ ایک جہاز فرانس کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ جہاز سے مسافر اُترے اور رونق میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ہم مشرقیوں کی آنکھیں بہت گنہ گار ہوئیں۔

جھیل کے کنارے باغ میں ایک گھڑی دیکھی جو گھاس کے اُوپر رکھی چل رہی ہے مگر اس کی مشینری نظر نہیں آتی۔ مشینری زمین کے اندر ہو گی۔ وہ گھڑی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ خوب بڑی سی گھڑی تھی جس کی سُوئیاں کئی کئی گز لمبی تھیں۔

یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ سرسبز و شاداب ہے۔ چودہ ہزار فٹ تک اُونچے پہاڑ، مگر ہماری مری پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ مگر وہ ہمیں عزیز ہے۔

لوگ فرانسیسی یا جرمن زبان بولتے ہیں کیونکہ اطراف سے دونوں ملک اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہوٹل کے منیجر فرانسیسی بولتے ہیں۔ ایک کی شکل نبی بخش بلوچ سے ملتی ہے دوسرے کی فارغ بخاری سے۔ یہ دونوں ادیب ہوٹل کے منیجروں کی شباہت سے یاد آئے۔

آبادی کم ہے۔

۲۴ جولائی

آج میں نے ایک خط اپنی اہلیہ کو لکھا جو کہ لکھنا ضروری تھا تاکہ وہ بے اطمینانی میں بھی اطمینان سے رہے۔ دوسرا اپنے بیٹے پرویز کو۔ کیونکہ جلدی میں کئی باتیں بتانا بھول گیا تھا۔ جیتے جی سُود و زیاں کی پخ لگی رہتی ہے۔

میری آنکھ تقریباً ۵ بجے کھل جاتی ہے کیونکہ اِدھر برابر کئی گھنٹوں کے بجنے کی آواز آتی ہے۔ جاوید خراٹوں سمیت سویا رہتا ہے۔ میں اُٹھ کر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتا ہوں۔ میرے سامنے دو تین گرجے نظر آتے ہیں۔ انہی سے گھنٹہ بجنے کی آواز آتی ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد پیدل چلنے والوں کی آواز آتی ہے۔ کھٹ کھٹ لوگ دفتروں کو جانے کے لیے نکلتے ہیں ٹپ ٹپ۔ رنگین مزاج لوگ رنگین لباسوں میں باہر نکلتے ہیں۔ بعض رنگین مزاج پُورے لباس کا تکلّف نہیں کرتے۔ بعض خواتین اپنے خوبصورت جسم کو دکھانے کے لیے کم سے کم لباس پہننا پسند کرتی ہیں۔ وہ اس معاملے میں بخیل نہیں۔ وُہ کہتی ہیں کہ خوبصورت جسم کو صرف اپنی ذات کی حد تک یا صرف ایک مرد کی حد تک کیوں محدود رکھا جائے۔ یہ عجیب جمہوریت پسند فلسفہ ہے۔

میں نے کل جھیل کے کنارے کچھ معمر لوگوں کو بڑی کسمپرسی کی حالت میں دیکھا تھا۔ ایک صاحب مچھلی پکڑنے والی چھڑی کو بار بار چھیڑتے تھے۔ کبھی اس کی ایک کمانی کو اوپر کرتا تھا، کبھی نیچے کر دیتا تھا۔ یُوں وُہ دو گھنٹے تک ایسا ہی کرتا رہا۔ جیسے اسی طرح وقت گزارنا ضروری ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ صبح سے ہی ایسا کرتا رہا ہوگا۔ اسی طرح میں نے متعدد بوڑھوں کو بنچوں پر بیٹھا ساکت حالت میں دیکھا۔ میں وہاں پہنچا بھی، چلا بھی آیا۔ مگر وہ جُوں کے توں بیٹھے تھے۔

میں یہ سطریں لکھ رہا تھا کہ باہر بادل گرجا، یہاں بھی بادل ہمارے ہی ملک کی طرح گرجتا ہے۔ اس کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لوگ بارش سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایسی بھی نہیں میں یہ سب اپنے ہوٹل کی کھڑکی سے دیکھ رہا ہُوں۔ نوجوان لڑکے تو بارش تھمنے کا انتظار کر رہے ہیں مگر نوجوان لڑکیاں اپنی جوانی کو بارش کے حوالے کر رہی ہیں۔

آج زیادہ تر دوسرے ملکوں کو ٹیلیفون کرتے گزری، جرمنی، اٹلی وغیرہ۔ وہاں کے ٹیلی فون کمپیوٹر سسٹم کے

تحت اتنی جلدی ملتے رہے۔ جیسے ہم لوکل کال کرتے ہیں۔

سہ پہر کو باہر نکلے۔ گرینڈ پوئنٹ (GRAND POINT) ایک ایسی جگہ ہے جہاں سڑکیں اور فٹ پاتھ لوگوں کے مکانوں کی چھتوں پر سے گزرتے ہیں۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے بازاروں کی اونچائی نیچائی بہت ہے۔ یہی وجہ ہے بازار اوپر ہے اور دو منزلہ نیچائی پر دکانیں ہیں۔ ایسا شاید دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ یہ منظر نیا اور محیر العقول ہونے کی وجہ سے دل کشی کا باعث ہے۔ میں نے دو تین جگہ دیکھا کہ باغوں میں' پارکوں میں، زمین پر بڑی سی شطرنج بنائی گئی ہے اور اس کے بڑے بڑے مُہرے رکھے ہیں اور لوگ کھیل رہے ہیں۔ عموماً پارٹنروں میں ایک عورت اور ایک مرد دیکھا جو اس کھیل کی ہار جیت سے، دوسرے منصوبے بناتے ہوں گے۔ آپ اتنی آزادی کو کتنا ہی بُرا کہیں مگر وُہ لوگ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی خواہشوں کے مطابق گزارتے ہیں اور وُہ ہر گزرتے لمحے کو حاصلِ زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی اپنی سوچ ہے۔ ان کے نزدیک زندگی جنسی لذتوں کا نام ہے اور ہماری روحانی اقدار ہیں جو ہمیں عزیز ہیں۔ وہ زندگی میں حُوریں حاصل کرنے کے قائل ہیں اور ہم دوسری زندگی میں۔ ہماری زندگی نیکیاں جمع کرنے کی زندگی ہے۔ اُن کی سراسر حیوانی، ہم سَتر اور ستّر (۷۰) کے قائل ہیں، وہ نمائش اور پیہم سپردگی کے۔

یہاں پھول اور سبزہ بہت ہے۔ بارشیں ہوتی رہتی ہیں، اس لیے درخت دُھلے رہتے ہیں۔ پارک سلیقے سے بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ رہتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بیٹھنے کا بھی بہت رواج ہے اور یہاں ریسٹورنٹ سڑکوں کے کنارے بنے ہُوئے ہیں' جہاں سے نظارہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں اور ہم جیسے مسافر بھی۔ وہ لوگ جم کر ریسٹورانوں میں بیٹھتے ہیں۔

یہاں بچوں میں بے حد خود اعتمادی ہے وہ والدین سے کچھ نہیں پُوچھتے، اپنی مرضی سے بھاگتے دوڑتے رہتے ہیں۔ اپنی مرضی سے ہر بات میں دل چسپی لیتے ہیں۔ ہمارے بچے سہمے سہمے رہتے ہیں۔ چُپ چاپ رہتے ہیں اور یہی ان کے شائستہ ہونے کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے۔

یہاں سورج صبح ۵ بجے طلوع ہوتا ہے اور رات دس بجے غروب ہوتا ہے۔ یہاں کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔ میں جتنے دن لوزان میں رہا میں نے گھڑی کو پیچھے نہیں کیا۔ میں نے سوچا پاکستان جس معاملے میں آگے ہے آگے رہے مَیں اُسے خود کیوں پیچھے کروں!

۲۵ جولائی

آج ہم فرانس کی ایمبیسی میں پیرس کے ویزے کے لیے گئے۔ ہم ایک بڑی فرم سے خط لے کر گئے تھے۔ اس میں ہمارا تعارف تھا۔ مگر ایمبیسی والوں نے کہا: اگر یہ بزنس ٹور ہے تو ہمارے ٹریڈ کونسلر کی سفارش ہی سے ویزا مل سکتا ہے۔ چنانچہ پیرس جانے کے لیے ویزا نہ ملا۔

اس کے بعد ہم نے سوچا جنیوا چلیں تاکہ تھوڑی سی سیر ہی ہو جائے۔ چنانچہ ہم بذریعہ ٹرین لوژان سے جنیوا پہنچے۔ اسٹیشن سے سیدھا جھیل کی طرف گئے۔ چونکہ واقفیت نہ تھی اس لیے جھیل کے کنارے پہنچے۔ لوژان کی جھیل کی طرح یہ مقام اتنا پُرفضا نہ تھا۔ باغ نہ تھا۔ البتہ پھُولوں کی کمی نہ تھی۔

وہاں جھیل کے کنارے ایک جگہ بہت دُور تک جھیل کے اندر جاتی تھی۔ اندر جانے کے لیے ٹکٹ تھا۔ ہم نے ٹکٹ لیے۔ ہم تھوڑی دُور گئے ہوں گے تو معلوم ہُوا کہ یہاں مرد و زن تقریباً برہنہ حالت میں لیٹے ہوئے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں، چند ایک نہیں، سینکڑوں کی تعداد میں! میرا بیٹا جاوید رک گیا۔ میں بھی ذرا سی دیر کے لیے رُکا۔ آگے جانے کے لیے باپ بیٹا دونوں تذبذب میں تھے۔ چنانچہ جاوید کے دوست اشرف نے کہا: جب ٹکٹ خریدا ہے، یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو پھر رکنا کیا معنی! چنانچہ چلتے گئے۔

یہاں کے لوگ عجیب ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں تو معقول لباس پہنتی ہیں۔ اپنے آپ کو ڈھکتی ہیں۔ مگر نوجوان خواتین اور لڑکیاں اپنے جسم کا ہر حصہ دکھانا چاہتی ہیں۔

میں نے یہ سوچ کر کہ سفرنامہ لکھوں، اپنے آپ کو بڑی مشکل میں ڈال لیا ہے۔ یہاں کھُلے بندوں صرف یہی نظارے ہیں اپنے آپ کو اِن حالات و واقعات کو اپنے سے دُور رکھوں تو کیسے رکھوں؟ ابھی صبح (۵ بجے) کی بات ہے کہ میں نے اپنے ہوٹل میں، ایک لڑکی کے رونے کی آواز سُنی، میں نے کھڑکی میں سے گلی میں جھانکا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی رو رہی تھی مگر لڑکا اس کی رضامندی سے اسے پے بہ پے چوُمے جا رہا تھا۔ بالآخر بٹن کھلنے لگے تو مارے شرم کے میں پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اس کے بعد مجھے لڑکی کے رونے کی آواز نہ آئی، سِسکنے کی آواز آتی رہی۔

لوژان سے جنیوا جاتے ہوئے میں نے کھیتوں پر نظر ڈالی تو بڑا لُطف آیا۔ کھیتوں میں جتنے درخت لگے ہیں وہ ایک قطار میں لگے ہیں۔ جتنے پھُول اُگے ہیں وہ ایک تناسب میں اُگے ہیں۔ جتنے پودے لگے ہیں وہ ایک زاویہ سے لگے ہیں۔ پھر بارشوں کی وجہ سے پودوں اور درختوں کے مُنہ دُھلے ہوئے ہیں۔

یہاں کے لوگ بڑے حُسن پرست ہیں۔ ہر بات میں سلیقہ، دُکانوں کے بورڈ بڑے خوب صورت، سڑکیں بڑی صاف ہیں۔ دکانیں قرینے سے سجی ہیں۔

لوگ خوشحال ہیں۔ کلرک کو بھی چار ہزار فرانک کے قریب مل جاتے ہیں (فرانک برابر ہے ہمارے چار روپے کے) اس لیے ہوٹلوں میں بھی بڑی گہما گہمی ہے۔

ٹیکسیاں مرد بھی چلاتے ہیں اور لڑکیاں بھی۔ ہم جب پہلے جنیوا سے لوژان پہنچے تھے تو ایک لڑکی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ ہمیں ہوٹل تک لائی۔ جتنا کرایہ بنتا تھا اُس نے ہم سے اُس سے زیادہ لیا اور یہ سب کچھ ہنستے ہنساتے میں ہُوا۔

یہاں کا پانی پینے کے لیے قدرے خراب ہے اس لیے میں نے ہوٹل کا پانی پینے سے قدرے احتراز کیا

تو اسٹور سے بند بوتل میں پانی خرید کے لائے۔ چنانچہ میں جی بھر کے پانی پی رہا ہوں اور خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

یہاں کے کھانے کی چیزوں کی بھی پریشانی ہے۔ سؤر اور سور کی چربی سے بنی ہوئی چیزیں عام ہیں۔ اس لیے میں نے ڈبل روٹی اور دودھ سے گزارہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ آج پھل خرید کے لائے ہیں کہ یہی کھا کر پیٹ بھرا کریں گے۔ پھل کھانا اچھا لگتا ہے مگر پیٹ بھرنے کے لیے کھانا اچھا نہیں لگ رہا۔

ابھی ہم نے ہوٹل کے منیجر سے کہہ دیا ہے کہ صبح سات بجے چلے جائیں گے، اس لیے بل وغیرہ تیار کر دے۔

۲۶ جولائی [میلان، اٹلی]

گزشتہ شب یہ طے ہوا تھا کہ موسم گرم ہے لہذا پینٹ بُش شرٹ میں میلان کی طرف چلیں گے مگر صبح اُٹھے تو موسم میں خنکی تھی۔ رات کی رات میں موسم فریبی ہو گیا لہذا گرم کپڑے پہننے پڑے۔ اپنے کمرے سے سامان لے کر نیچے پہنچے۔ منیجر سے کہا، ٹیکسی منگوا دیجئے۔ خیال تھا کہ ٹیکسی کے آتے آتے ناشتا کر لیں گے کیونکہ ناشتا بھی کمرے کے کرایہ میں شامل تھا مگر ٹیکسی اتنی جلدی آ گئی کہ ناشتا کئے بغیر نکلنا پڑا۔ ہر چند کہ ابھی جہاز کے چلنے میں خاصا وقت درمیان میں تھا مگر ہم نکل پڑے کیونکہ ہم کوئی رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔ قبل از وقت پہنچنا چاہتے تھے۔

ہوائی اڈے پر دو گھنٹے قبل پہنچ گئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے ہم جہازوں کے آنے جانے میں بارش کا نظارہ کرتے رہے۔ وقت مقررہ پر جہاز اٹلی کے شہر میلان کی طرف اڑا۔ کیونکہ ہم میلان جا رہے تھے جو کہ اٹلی کا صنعتی شہر ہے۔ جہاز میں بتایا گیا کہ اس وقت نیچے سوئٹزرلینڈ کے سب سے اونچے پہاڑ کا نظارہ دیکھئے۔ وہ پہاڑ مونٹ بلانک تھا جو غالباً یورپ کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ بے حد خوب صورت نظارہ تھا۔ سوئٹزرلینڈ صرف اپنے پہاڑوں کی دلفریبیوں کی وجہ سے دنیا کا سب سے خوب صورت خطہ مانا گیا ہے۔

اب ہم میلان کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل کولمبیا ٹیلیفون کر کے کمرہ بک کرایا گیا۔ لوزان میں ہمارے کمرے کا نمبر ۴۶ تھا۔ یہاں ۴۲ نمبر کا کمرہ ملا۔ میں نے کہا اگر یہاں بھی کمرے کا نمبر ۴۶ ہی ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ مطابقتیں مسافروں کے لیے بے معنی باتیں ہیں۔ مسافروں کے لیے تو یہی بہت کچھ ہے کہ رخنے نہ پڑیں۔

جاوید نے ایک دو جگہ ٹیلیفون کر کے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ پیپر پلاسٹ (PAPER PLAST) والوں نے کہا، ہم ڈرائیور کو ہوٹل میں بھجواتے ہیں اس کے ساتھ آ جائیے۔ فیکٹری ہوٹل سے کوئی بیس میل دور تھی بیچ میں تھوڑا سا وقت تھا۔ ہم نے سوچا کھانا کھا لیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ہوٹل میں کھانا نہ کھایا کہ مہنگا پڑے گا۔ ہوٹل کے قریب کھانے کے لیے ایک دوسرے ہوٹل وینڈی ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ مختصر سا کھانا منگوایا۔ اس پر بھی ایک ہزار لیرا دینا پڑا۔

کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہمیں لینے کے لیے فرم کا آدمی آن پہنچا۔ کوئی آدھ پون گھنٹے میں ہم فیکٹری پہنچے۔ ہمیں ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ پہلے ایک خاتون آئی، اس نے پوچھا: کیا پئیں گے؟ ہم نے کہا: چائے۔ وہ مسکرائی اور چائے آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد فیکٹری کی سیلز منیجر آ گئیں مس للیانا کا زنیکا جو بے حد خوبصورت تھیں۔ حسن کے معاملے میں خدا اٹلی والوں پہ ویسے ہی مہربان ہے۔ مگر یہ خاتون حسن کا بھی شاہکار تھیں۔ ہم فیکٹری میں تیار ہونے والی مشینوں کے بارے میں پوچھتے رہے جو خاتون ٹیکنیکل ایڈوائزر کی وساطت سے معلومات بہم پہنچاتی رہیں۔ ہمارے سوالات کو نوٹ کرتی رہیں۔ یہ تکلمانہ خوشگوار سماں کوئی دو گھنٹے جاری رہا۔ پھر فیکٹری کے بند ہونے کا وقت آ گیا۔ مگر ہم نے خواہش ظاہر کی فیکٹری دکھائی جائے جو بخوشی منظور کر لی گئی۔ ہم ٹیکنیکل ایڈوائزر کے ساتھ فیکٹری دیکھنے چلے گئے اور مس للیانا کا زنیکا رخصت لے کر اور ہاتھ ملا کر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی فیکٹری نامکمل ہو گئی۔

میں نے کولمبیا ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۲ سے باہر جھانکا۔ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ اس طرح وہاں کے لوگوں کا رہن سہن اور معاشرت کی گُن سُن ملتی ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ہوٹل جنیوا کے نیچے خوب صورت سا قطعہ ہے جو کھڑکی میں سے کولمبیا ہوٹل کی بھی شوبھا بڑھا رہا ہے۔ اس قطعہ کے ساتھ ہی ایک دو چھوٹے چھوٹے سے گھر ہیں۔ اُن میں سے ایک گھر کی خاتون کُتے سے کھیل رہی ہے۔ پھر اس نے کُتے کو پکڑ کر اس کے بال دیکھنے شروع کر دئے۔ ایک ایک بال کو دیکھا، جیسے ہمارے ہاں مائیں بچّوں کے سر سے جُوئیں دیکھتی ہیں بالکل اُسی انداز میں اس نے کتے کے بال بال کو دیکھا۔

لوزان میں مَیں نے یہ دیکھا کہ انسانوں کی قسم تو ایک ہی ہے مگر کُتوں کی قسمیں بہت سی ہیں۔ ہر کُتا ایک دوسرے سے جُدا نسل کا۔ عجیب و غریب حُلیے۔ زیادہ تر کُتے عورتوں کے ہاتھوں میں دیکھے۔ میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ بڑے قیمتی کُتے ہوتے ہیں، لاکھوں لاکھوں کے کُتے۔ بہرحال یہاں اٹلی میں لوزان سے کُتے کم ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی نسبتاً مہذب ہیں۔ وُہ سی آوارگی یہاں نہیں یا وُہ سی زندگی یہاں نہیں جو کہ لوزان میں دیکھنے میں آئی۔

سہ پہر کو ہم چائے پینے کے لیے باہر نکلنے لگے تو معلوم ہُوا کہ ہمارا ایک پچاس ہزار لیرے کا نوٹ کہیں کھو گیا ہے۔ جاوید پریشان تھا۔ پردیس میں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حادثہ نہیں ہونا چاہیئے تھا میں نے اُسے کہا: قطعاً پریشانی کی بات نہیں۔ روپیہ ہاتھ کی میل ہوتا ہے۔ کہنے لگا: اپنے ملک میں، یہاں تو ہاتھ کا سونا ہوتا ہے۔

رات کو ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف گئے۔ بڑا قدیم ریلوے اسٹیشن معلوم ہُوا۔ ایسا جیسے باوا آدم نے پہلا ریلوے اسٹیشن میلان ہی کا بنایا ہو۔ تفریح کے لیے یا وقت گزاری کے لیے یہاں کا ریلوے اسٹیشن ہم جیسے مسافروں کے لیے بڑا سہارا ہے۔ ہر ملک کے لوگ موجود۔

ہمارے لیے جو یہاں سب سے بڑی دشواری ہے وہ کھانے پینے کی ہے۔ کیا کھائیں کیا نہ کھائیں کیونکہ یہاں سؤر کا گوشت عام ہے۔ وہ کھاجا ہے۔ ہم کیا کریں۔ لہٰذا پُوچھنا پڑتا ہے یہ وہ چیز تو نہیں۔ غرض لے دے کے ہمیں ڈبل روٹی، مکھن، پھل اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی کھانے کا لطف غائب ہے۔ یعنی زبان کا چسکہ قطعاً ختم ہے صرف آنکھوں کا چسکہ باقی ہے۔ اب مجھ جیسے آدمی کو آنکھوں کا چسکہ بھلا نہیں لگتا۔ ادھیڑ عمر، سیرتِ رسولؐ کا چھاپنے والا۔ جیسے میں ۱۹۷۰ء میں انگلستان آیا تھا۔ ان دنوں یہ سارے مناظر ضروری تھے۔ چودہ سال کے بعد، نہ وہ سوچیں رہیں نہ احساسات، پھر برخوردار کا ساتھ۔ مجھے تو اپنی بزرگی کا بھرم قایم رکھنا دشوار ہو گیا۔

۲۷ جولائی

آج سلیٹر مشین کی سیاٹ (SIAT) فیکٹری دیکھنے گئے۔ اُن کا ایک آدمی ہمیں ہوٹل سے لینے آ گیا۔ فیکٹری کافی دُور تھی، میلان سے کوئی ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر۔ وہاں پہنچے تو استقبالیہ میں جس لڑکی نے استقبال کیا اُسی نے میٹنگ روم میں پہنچ کر پُوچھا: کافی یا چائے؟ ہم نے چائے کو ترجیح دی۔ اتنے میں ایک خاتون جو سیلز مینجر تھیں تشریف لائیں۔ مشین کے بارے میں گفتگو ہُوئی۔ انہوں نے اپنے ٹیکنیکل ایڈوائزر کو بلایا اس نے کہا، بہتر ہو گا فیکٹری میں جا کر مشین ملاحظہ کی جائے۔ وہاں جو سوالات اُٹھیں اُن کا جواب دیا جائے۔

واپسی کے لیے وہ لوگ ہمیں ریلوے اسٹیشن چھوڑ آئے کہ یہ گاڑی میلان اسٹیشن جائے گی۔ گاڑی بیشک میلان اسٹیشن آئی مگر میلان کے شمالی حصّہ پر۔ ہمیں میلان کے سنٹرل اسٹیشن پہنچنے کے لیے ٹیکسی کرانا پڑی جس نے ہم سے میلان ہی کے دُوسرے اسٹیشن پر پہنچانے کے لیے سات ہزار لیرے لے لیے۔ یہاں کا عجیب دستور ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور اصل کرایہ سے ایک ہزار لیرے زیادہ لیتے ہیں اور یہ سرکاری طور پر جُرم کے ذیل میں نہیں آتا۔

اس کے بعد ہم ایک اور فیکٹری میں جانا چاہتے تھے مگر معلوم ہوا وہ یہاں سے چار سو کلومیٹر دور ہے، اس لیے پروگرام بنایا نہ جا سکا۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ایک نئی کار آ کر ہمارے نیچے باغیچے میں رُکی۔ ایک صاحب اس میں سے نکلے۔ انہوں نے اپنی قمیص اتاری، پھر اپنی کار کی ڈگی سے بُوٹ نکال کر پہنے۔ دوسری قمیص پہنی۔ پھر گاڑی سے کچھ اوزار نکالے اور وہ باغیچے کی کیاریوں کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ سُوکھے پتّے اکٹھے کیے۔ گوڈی کی۔ پھر باغیچے میں پانی کے پھوار نما نلکے کھلے چھوڑ کر اپنی کار کی طرف آیا۔ پھر وُہی اتاری ہُوئی قمیص اور جُوتے پہن کر کار میں بیٹھا اور چل دیا۔ یہ حال یہاں کے مالیوں کا ہے۔ ہمارے ہاں کے مالیوں نے اب جا کر سائیکلیں خریدی ہیں تاکہ وہ ایک سے زیادہ گھروں کا کام کر سکیں۔ بہرحال ان کے معیارِ زندگی اور ہمارے معیارِ زندگی میں خاصا فرق ہے۔

طرزِ معاشرت میں زمین آسمان کا فرق !

یہاں بڑے خوشنما پیکٹوں میں کھانے پینے کی چیزیں ملتی ہیں۔ مگر وہ ہم کھا نہیں سکتے۔ اس لیے آج ایک بیکری ڈھونڈی، اس میں جا کر بسکٹ نما چیزیں خریدیں۔ دو کوکا کولا لیے۔ جاوید نے بازار میں کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے کہا: بازار میں؟ کہنے لگا: یہاں ایسا کرنا غیر مہذبانہ بات نہیں، سبھی بازاروں میں کھاتے پیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا ثبوت دیا، بازار میں کھایا بھی پیا بھی!

آج اور کوئی کام نہ تھا۔ ہوٹل میں لیٹنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ چنانچہ باہر نکلے۔ ایک نشانی ذہن میں رکھ کر چل دیے۔ بازار کھُلے تھے۔ جس بازار میں ہم نکلے وُہ کافی رونق والا تھا۔ اچھی دُکانیں اور خُوب گہما گہمی۔ لوگ ہر چیز کو دیکھتے زیادہ ہیں خریداری کم کرتے ہیں۔ شوکیسوں میں رکھی ہُوئی چیزیں دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ جب قیمتیں پڑھتے ہیں تو دل ملول ہو جا میں نے چند صفحات کی ایک معمولی سی کاپی اور ایک بال پوائنٹ خریدا، پندرہ روپے دینا پڑے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں درمیانے درجے کا ہوٹل ہے۔ کرایہ پوچھا تو معلوم ہُوا ۶۵ ہزار لیرے یومیہ (تقریباً چھ سو روپے روزانہ) ہم یہاں سے بھاگ نکلتے، مگر ایک پیپر مل میں جانا ہے جس سے پیر کے روز کا طے ہے۔ آج جمعہ ہے ہفتہ اتوار یہاں چھٹی ہوتی ہے اس لیے دو دن انگڑائیاں لینے میں گزریں گے۔

میں پاکستان میں تھا تو اپنی خوراک پر توجّہ دیتا تھا۔ یہاں ہوں تو خوراک پر توجہ دینا تو درکنار، یہاں اس ریسٹر میں وقت گزرتا ہے کچھ کھاؤں مگر اس میں سؤر کے گوشت اور چربی کی آمیزش نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ چھ سات دنوں میں بھی اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا ہُوں۔

میرے پاکستان میں اس وقت رات کے پونے گیارہ بجے ہیں، سب سو رہے ہوں گے مگر یہاں پونے سات بجے ہیں۔ خاصا دن باقی ہے۔ کیونکہ یہاں تو رات کے تقریباً دس بجے سورج غروب ہوتا ہے۔

۲۸ جولائی

میلان میں آج تیسرا دن تھا۔ ہفتہ کا روز، جو چھُٹی کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے سوچا اٹلی کا متوجہ کرنے والا شہ وینس دیکھا جائے۔ لہٰذا واپسی کا ٹکٹ لے کر وینس پہنچے۔ ہم سوا نو بجے والی ٹرین سے جانا چاہتے تھے مگر وہ صرف فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے تھی۔ ہمارے پاس سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ چونکہ کولمبیا ہوٹل اسٹیشن کے پاس تھا اس لیے ہوٹل واپس آ گئے۔ دو گھنٹے آرام کے بعد پھر اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی پلیٹ فارم نمبر ۹ سے جانا تھی۔ مسافر اس پلیٹ فارم پر اکٹھا تھے۔ پھر وہ پلیٹ فارم نمبر ۸ پر کھڑی گاڑی میں جانے لگے (وقت ۱۲½)۔ ہم نے پُوچھا تو معلو ہوا کہ اب یہی گاڑی وینس جائے گی۔ ہم جو یہ سوچا کرتے تھے باہر کے ملک ہر کام میں باقاعدگی اور وقت کی پابندی کرتے ہیں وُہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔ بے وقت گاڑیوں کا چلنا اور چھپے ہُوئے پروگراموں میں ردوبدل ہونا عام ہے

بات ہے۔ بہرحال ہم میلان سے وینس چار گھنٹے میں پہنچے۔ گاڑی میں رش زیادہ تھا اس لیے ہمیں ڈبے میں بیٹھنے کی سیٹ نہ ملی، بلکہ گاڑی میں جو گزرگاہ ہوتی ہے اس میں بھی سیٹیں ہوتی ہیں۔ اُس سیٹ کو گاڑی کے ڈبے کے ساتھ فولڈ کیا ہوتا ہے اُسے چٹخنی ہٹا کر سیٹ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُسی سیٹ پر جگہ ملی۔ ہر آتا جاتا مسافر پاس سے گزرتا تھا۔ گھسٹتے ہوئے پاس سے۔ ایک دو اسٹیشنوں کے بعد رش کم ہُوا تو ڈبے میں سیٹ مل گئی اور بہ اطمینان بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ جو آرام باقاعدہ سیٹ میں تھا وہ اس بے قاعدہ سیٹ میں نہ تھا۔ ہرچند کہ ڈبے میں نشستیں آرام دہ تھیں پھر بھی چار گھنٹوں کے سفر نے تھکا دیا تھا۔ ۲½ بجے وینس پہنچے تھے۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا مگر بھوک کا وقت بڑھ رہا تھا چنانچہ پہلے ہم نے پھل اور ٹھنڈا مشروب خریدا۔

وینس عجیب و غریب شہر ہے، دنیا میں سب سے الگ، جو پانیوں میں آباد ہے۔ ہر طرف کشتیاں رواں دواں یعنی مکانوں کی دیواریں پانی میں ہیں اور کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ہمارے ملک میں پانی کی نالی لیک کرے تو سارے مکان میں دراڑیں آ جاتی ہیں اور وہ گرنے کے قریب آ جاتا ہے۔ یہ تو سارا شہر پانی میں آباد ہے۔ مسافر اپنے گھروں میں جانے کے لیے کشتیوں میں سوار ہو کر جاتے ہیں۔

جب ہم ایک کشتی میں سوار ہو کر شہر کے نظارے کے لیے نکلے تو دیکھا ہوٹل پانی میں موجود، دفاتر پانی میں موجود، گرجے پانی میں موجود، عام رہائشی مکانات پانی میں موجود۔ لوگوں نے ایک محلّے سے دوسرے محلے میں جانے کے لئے چھوٹے چھوٹے پُل بنا رکھے ہیں۔ وہ اِدھر سے اُدھر اس پُل کے ذریعے جاتے ہیں کیونکہ گلیوں میں بھی پانی موجود ہے۔ اس کے باوجود ہوٹلوں میں لوگ موجود، دفاتر میں لوگ موجود، یعنی جس طرح ہم خشکی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور اپنے کام کاج کرتے ہیں یہ لوگ پانی میں اُسی طرح بذریعہ کشتیاں اِدھر اُدھر جاتے اور کام کرتے ہیں۔

ایک ٹاور پر چڑھ کہ دیکھا جائے تو اس سے پُورا وینس نظر آتا ہے جو پانی میں آباد اور دلکش نظاروں سے لدا پھندا ہے۔

سیّاحوں کے لیے ایک بازار خشکی پر بھی موجود ہے جس کی طرف ہم نکلے۔ بے حد خوبصورت بازار۔ پُل پار کر کے بھی ایک بازار تھا۔ شیشے کے کام کی جتنی اعلیٰ چیزیں یہاں ہوتی ہیں شاید دنیا میں ایسی کہیں نہ ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر بڑی بڑی چیزوں تک۔ مگر قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی۔ یہ شہر (بلکہ مملک) مہنگائی کے اعتبار سے دنیا کے مہنگے شہروں میں ہوگا۔ ایک ایش ٹرے دیکھی، قیمت ۲۵ ہزار روپے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بازار میں بھیڑ بڑی تھی مگر خریداری برائے نام تھی۔

دنیا کے ہر ملک کا آدمی یہاں موجود۔ جو سیّاح یہاں نہیں پہنچا وُہ اپنے آپ کو سیّاح نہیں کہہ سکتا۔ یہ دیکھا کہ مردوں سے زیادہ عورتیں موجود تھیں۔ یہاں کی طرزِ معاشرت میں عورت کو اتنی آزادی اور تحفّظ حاصل ہے کہ وُہ گھر سے اکیلی نکل پڑتی ہے، یا دو دو کی ٹولیوں میں۔ ایسا تو بہت دیکھا کہ دو دو لڑکیاں ایک ساتھ گھوم رہی ہیں

یا لڑکیوں کے گروہ کے گروہ گھوم رہے ہیں۔ مردوں میں ایسی اپنائیت کم دیکھی۔ یا پھر جدھر دیکھو ایک لڑکی کے ساتھ ایک لڑکا چپکا ہوا۔

یہ لوگ اطالوی زبان بولتے ہیں۔ بولنے میں بڑے فراخ دل ہیں۔ بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ واپسی پر ہمارے ڈبے میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا موجود تھے۔ انہوں نے وینس کے اسٹیشن سے بولنا شروع کیا تو میلان کے اسٹیشن تک مسلسل بولتے رہے۔ چونکہ ہمیں یہاں اُترنا تھا اس لیے اُتر گئے۔ وہ تو مسلسل بول رہے ہوں گے۔

یہ لوگ ایک منٹ میں دوستی کر لیتے ہیں۔ جب لڑکا ہمارے ڈبے میں آیا تو وہ لڑکیوں کا واقف نہ تھا۔ اس نے پہلے اطالوی زبان میں ایک دو فقرے پھینکے۔ لڑکیوں نے زیادہ نوٹس نہ لیا۔ طویل فقروں کا ایک آدھ لفظ میں جواب دیا۔ پھر تو وہ ایسے رواں ہوئے کہ تبسم کی مار کے ساتھ قہقہوں میں سارا وقت گزار دیا۔ یعنی مسلسل چار گھنٹے بولتے رہے، ہنستے رہے، قہقہے لگاتے رہے۔

ہمارے ڈبے میں ایک صاحب آئے اور پوچھنے لگے، آپ کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے کہا: پاکستان سے۔ اس نے بتایا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، شملہ میں رہتا ہوں، ڈاکٹر ہوں، اسکالرشپ پر اسکاٹ لینڈ آیا ہوں۔ چونکہ اسکالرشپ کی مدت ختم ہونے والی ہے اس لیے تفریح کی غرض سے نکلا ہوں۔ پھر اس نے یہ بتایا کہ میں نے آپ کو بڑی دُور سے دیکھا تھا۔ اس لیے اِدھر آیا ہوں کہ یہ لوگ اپنے خطّے کے معلوم ہوتے ہیں۔

ہم نے اُسے کہا: ہم تو پاکستانی ہیں۔

کہنے لگا: پاکستانی ہوں یا ہندوستانی، باہر نکل کر ہم ایک ہوتے ہیں۔ ہماری زبان ایک ہوتی ہے، طرزِ معاشرت ایک ہوتی ہے۔ باقی معاملہ ہمارے لیڈروں کا ہے۔ ساری دُنیا جانتی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اتفاق سے رہنے میں فائدہ ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کر رہے یا ہمیں ایسا نہیں کرنے دیا جاتا۔

ہم نے کہا: ہم تو دوستی کا یا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر معاہدہ نہیں ہو پاتا۔ بلکہ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ جب دونوں طرف کے لوگ جنگ نہیں کرنا چاہتے، اِسی میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں تو جنگ کے بادل کیوں منڈلا رہے ہیں؟

یہ بات نہ ہمیں شملے کا ڈاکٹر سمجھا سکا اور نہ ہم اُسے سمجھا سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے ویرونا اُترنا تھا۔ اس نے زور لگایا کہ ایک دن اس کے ساتھ گزارا جائے مگر ہم آمادہ نہ ہوئے۔ ویرونا ہمیں بھی پہنچنا تھا مگر پروگرام کے مطابق دو روز بعد، اس لیے ہم نے ان سے معذرت چاہی۔ پھر انہوں نے ہمیں شملے کی دعوت دی۔ ہم نے اس کی بھی ہامی نہ بھری۔ کیونکہ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ جب نیتوں کی ٹیڑھ درست ہوگی تو پھر رسمی دعوتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے نہ اُن کا نام پوچھا اور نہ ایڈریس۔ ہر چند کہ وہ سب کچھ بتاتے رہے مگر ہم وُہ سب کچھ نوٹ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یا تو بھائی چارے میں

سارے ہندوستان کے لوگ اپنے لگیں ورنہ ہم اکیلے شملے کے ڈاکٹر کو کیا کرتے ! یا اکیلے جگن ناتھ آزاد کو کیا کریں ! جگن ناتھ آزاد یہاں اسس لیے یاد آگئے کہ وُہ بھی جب پاکستان پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں : رُوح میری پاکستان میں رہتی ہے جسم میرا ہندوستان میں ۔ اس پر ایک بار میں نے کہہ دیا : یار ! اپنی رُوح کو بھی ہندوستان ہی میں رکھو۔

ہم وینس سے میلان اپنے ہوٹل میں پہنچے تو کچن بند ہو چکا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جاوید نے کہا : آج فاقہ کرتے ہیں ۔ میں نے کہا : آج روزہ رکھتے ہیں ۔ جاوید نے کہا : فاقہ کا لفظ کیوں ٹھیک نہیں ! میں نے کہا : وُہ اس لیے کہ اگر ہم محاورۃً بھی کہتے ہیں کہ روزہ رکھے لیتے ہیں تو ہمارا ذہن اپنے مذہب کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس لیے نیت کے ثواب سے تو محروم نہ ہوں !

بہرحال اسس ملک کی ایک قدیم تاریخ ہے جس پر مسافر اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ہی کچھ لکھے گا۔ ابھی تو کام صرف اتنا ہے۔ یہ دیکھا ، وُہ کیا !

آج ۲۸ جولائی کو فرخندہ کی سالگرہ ہے ۔ پیارے بچے جمع ہوں گے مگر ہم ان سے دُور ہیں ۔

۲۹ جولائی

چونکہ ہم رات وینس سے بارہ بجے واپس میلان پہنچے تھے۔ بھُوکے تھے۔ تھکے ہُوئے تھے۔ اس لیے نیند خوب آئی ۔ صبح گیارہ بجے تک سوتے رہے ۔ دوسرے جتنی بھُوک سوئٹزرلینڈ میں لگتی تھی اتنی بھوک اٹلی میں نہیں لگتی۔ اٹلی رکھ رکھاؤ اور شائستگی میں سوئٹزرلینڈ سے خاصا بہتر ہے ۔ اتنی آزاد تہذیب یہاں نہیں پہنچی جتنی کہ سوئٹزرلینڈ میں پہنچ چکی ہے ۔ ویسے یہ بھی نہیں کہ یہ ملک نرا معصوم ہو !

آج فلورنس جانے کا ارادہ تھا کہ اٹلی کا وہ شہر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ چونکہ کل کے تھکے ہوئے تھے اس لیے جلدی نہ اُٹھنے کی وجہ سے دیر ہوگئی ۔ لہٰذا ارادہ ملتوی کیا۔ ناشتا کیا تو بارہ بج چکے تھے ۔ اسٹیشن پر جا کر ایک سو ڈالر کے بدلے اطالوی کرنسی لائے۔ کیونکہ ہمارے پاس ٹریولر چیک تھے ہم پاکستان سے یہی چیک کرنسی کی صورت میں لائے تھے۔

یہاں ہوٹلوں میں پانی نہیں ملتا ۔ میں نے جاوید سے کہا ، واپس اپنے ہوٹل چلیں تاکہ جی بھر کے پانی پئیں ۔ اللہ تعالیٰ کی وُہ نعمت جو کہ بڑی نعمت ہے اور بڑی ارزاں ہے ۔ وُہ یورپ کے لوگوں کے نصیب میں نہیں ۔ چنانچہ اپنے ہوٹل واپس آکر دو تین گلاس غٹاغٹ پیئے اور اللہ کا شکر ادا کیا ۔

بازاروں میں رونق کم ہے ۔ لوگ دو چھٹیوں کی وجہ سے ادھر ادھر گئے ہوئے ہیں ۔ ہمارے ہوٹل کے نیچے والی وہ بڑھیا بھی آج گھر میں نہیں کہ جو روز کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی ۔ کبھی اپنے صوفے کو برش سے صاف کرتی تھی۔ کبھی پھل پتوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ کبھی کُتوں کی خوش فعلیاں دیکھ کر خوش ہُوا کرتی تھی۔

یہاں صفائی اتنی ہے کہ کپڑے بھی کم میلے ہوتے ہیں۔ اگر معاملہ اپنے ہاں والا ہوتا تو روز کپڑے بدلنے پڑتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پردیس میں یہ مسئلہ بڑا مسئلہ ہوتا کیونکہ گھر سے کپڑوں کا زیادہ بوجھ تو اٹھا نہیں لا سکتے تھے۔

باہر سے آتے جاتے نیچے استقبالیہ میں رکھے ٹیلی وژن پر پروگرام بھی دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ ہم ان کی زبان تو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ مگر یہ تو دیکھ سکتے تھے۔ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن تھوڑی دیر کے لیے بیٹھے تو اولمپک کھیلوں کے بارے میں پروگرام ہو رہا تھا۔ دُوسرے دن دیکھا تو انٹرویو ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ ملک کی اہم شخصیات ہی ہوں گی۔ وہ پروگرام کچھ ویسا ہی تھا جیسے ہمارے ملک کی کسی ایک شخصیت پر مختلف حضرات سوالات کرتے ہیں۔ رو برو جیسا پروگرام ایک دن دیکھا تو موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے ہاں کی موسیقی کا کچھ علم نہیں ہوتا کہ استاد نے کیا کمال کر دکھایا۔ ان کے ہاں کی موسیقی کا خاک علم ہوتا۔ بہرحال وقت گزاری کے لیے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ زبان کو سمجھنے والے بہت سے لوگ ٹیلی وژن کے گرد جمع تھے مگر ہم اکتا رہے تھے۔ جاوید نے کہا: اُٹھیں، ہماری سمجھ میں تو کچھ آ نہیں رہا۔ میں نے جاوید سے کہا: بیٹھو یہ اس پروگرام کا آخری حصّہ ہے۔ جاوید نے پُوچھا: آپ کو کیا معلوم؟ میں نے کہا: یہ محترمہ جو گانے کے لیے آئی ہیں یہ ہمارے ملک کی نور جہاں ہیں۔ جاوید نے دوبارہ سوال کیا: ہم ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ میں نے جواب میں کہا، وُہ اس لیے کہ اس عورت نے نہایت قیمتی لباس پہن رکھا ہے۔ زبردست میک اَپ کیا ہوا ہے۔ ویسی ہی موٹی اور تر و تازہ ہے۔ انداز بھی مٹھتے والے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا۔ وہ پروگرام کی آخری آئٹم ہی تھی۔

۳۰ جولائی

آج ہم نے دیرونا جانا تھا کہ وہاں کاغذ کی ایک مِل تھی جو فینسی کاغذ بنانے میں شہرت رکھتی تھی۔ اس کے منیجر سے جمعرات کے روز طے ہُوا تھا کہ ہم لوگ پیر کے روز آئیں گے۔ پروگرام طے تھا۔ آج جانے سے پہلے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ موصوف چُھٹی پر ہیں۔ اس لیے کہ اُن کی بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ اتنی دُور سے آئے ہُوئے مسافروں کو بغیر ملاقات کیے وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس لیے کہ جانے کب تک اُن کی بیگم کی طبیعت خراب رہتی۔

ہم نے ہوٹل کے منیجر سے پوچھا: ایک ڈالر کے کتنے لیرے دیں گے؟

اسس نے کہا: ڈیڑھ سو۔

جو بہت کم تھے۔ ایکسچینج پر ایک سو اسّی ملتے تھے۔ اس لیے ہم اسٹیشن گئے کہ کرنسی تبدیل کرالائیں۔ کل بھی ہم نے کرنسی تبدیل کرائی تھی۔ اس نے پاسپورٹ کا نہ پُوچھا تھا۔ آج ایک لمبی لائن میں کھڑے ہونے کے بعد جب متعلقہ صاحب تک پہنچے تو اس نے کہا: پاسپورٹ لائیے۔ میں نے کہا: کل پاسپورٹ کے بغیر کرنسی دی تھی۔ کہنے لگا: آج کی بات کیجئے۔ مطلب یہ کہ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ہم نے سوچا کیا تردّد کریں! ہوٹل والے کم پیسے دیتے ہیں تو وہی لے لیتے ہیں۔ جب ہوٹل کے منیجر نے ہوٹل کا بل وصول کیا تو ایک سو ستّر لیرے فی ڈالر کے حساب سے۔ ابھی

آدھ پون گھنٹہ پہلے کہہ رہا تھا ۱۵۰ لیرے۔ اگر ۱۰۰ ہی لیرے دینا تھے تو کاہے کو ایک لمبی لائن میں کھڑا کرایا۔ اس کے باوجود بے نیل مرام لوٹے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ لوگ موج کے آدمی ہیں۔ ایک دن میں کئی بار اپنے فیصلے بدلتے ہیں۔

۱۰ بجے ہم ہوٹل سے اپنا حساب چکا کر ہوائی اڈے پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ جہاز ۳ بجے جائے گا۔ ٹائم ٹیبل نے دھوکا دیا یا ہم نے پڑھنے میں دھوکا کھایا۔ بہر حال ہوائی اڈے پر بیٹھے ہیں۔ مخلوق خدا کو دیکھ رہے ہیں۔

جس ٹیکسی پر ہم ہوٹل سے آئے تھے اُسے ہم نے زیادہ ٹپ دیا تھا اس لیے کہ ہمارے پاس فالتو کرنسی تھی جو کسی دوسرے ملک میں نہیں چلنی تھی۔ اس وقت بھی ہمارے پاس تیس ہزار لیرے زیادہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی چیز خرید لیں یا کسی کو ایسے ہی دے دیں۔ ایسے ہی دینے والوں میں وہ لڑکی یاد آئی جو میلان کے ریلوے اسٹیشن پر مانگ رہی تھی۔ قبول صورت تھی۔ مگر اب فالتو کرنسی کی وجہ سے ہوائی اڈے سے ریلوے اسٹیشن جانے سے تو رہے۔

ہم میلان کے ہوائی اڈے کی اس جگہ بیٹھے ہیں جہاں سے سفر کرنے والے مسافر داخل ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے دوسری صاحبہ کے والہانہ بوسے لیے۔ اس کے بعد اس کے کُتّے کے بوسے لیے۔ چونکہ لمبی لائن کی وجہ سے ابھی وقت باقی تھا۔ اس لیے اس نے دوبارہ محترمہ کے بوسے لینے شروع کر دئے۔ یُوں کُتّے اور عورت کے بوسوں کا سلسلہ پندرہ منٹ تک جاری رہا۔

یہ لوگ انسانی سہولتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر میرے سامنے ہوائی جہازوں پر سوار ہونے والے لوگوں کی ایک لمبی قطار موجود ہے۔ دو ڈھائی سو آدمی ہوں گے۔ ہر ایک کے پاسپورٹ چیک ہو رہے ہیں۔ جو شخص لائن میں کھڑا ہے اس کی باری ایک گھنٹہ سے پہلے نہ آئے گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ایک جگہ سے داخل ہونے کی بجائے دو تین جگہ انتظام ہونا چاہیے۔ یہ قاعدے اپنے اپنے ملک کے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ والوں نے تو پاسپورٹ کو بھی بے تکلف ہی دیکھا تھا۔ آئیے اور جائیے والا قصہ تھا۔ یہاں آئیے اور کیوں جائیے گا تو قصہ!

میں نے کل سے چند خطوط رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے میلان ریلوے اسٹیشن پر انہیں پوسٹ کرنے کے بارے میں جدّ و جہد کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آج یہاں ہوائی اڈے پر کوشش کی، کوئی صورت نہ نکلی۔ گھر والی سوچتی ہوگی میموں کے شہر جا کر گھر خط بھی نہ لکھا۔ ادھر یہ حال ہے کہ لکھا ہے تو بھیجیں کیسے! ڈاک خانہ تک پہنچیں تو ٹکٹ لے کر بھجوائیں۔

۳۱ جولائی [جرمنی]

آج جرمنی کے شہر ہاگن پہنچے۔ ۱۹۷۰ء میں بھی لندن جاتے ہوئے میرے قدموں نے ہاگن کے ایئرپورٹ کو چھوا تھا۔ آج تو باقاعدہ اس شہر میں اُترے۔ ہاگن زیادہ ٹھہرے نہیں کیونکہ ہم کالون جانا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہاں جاوید نے کسی سے ملنا تھا۔ چنانچہ ہم نے کالون بذریعہ ریل جانا پسند کیا تاکہ

یہاں کے دیہاتی ماحول کا بھی نظارہ ہو۔ یہاں دیہاتوں میں بھی مکان قرینے سے بنے ہوئے ہیں مناسب فاصلے سے، بہت صاف ستھرے ہیں۔ بہت صاف ستھرے لوگ ہیں، صحت مند اشخاص۔ معلوم ہوتا ہے ہم کسی زندہ معاشرے میں گھوم رہے ہیں۔ جرمن بہادر قوم تھی اور ہے۔ ان کے چہرے مہرے اور ڈیل ڈول سے فراست اور جوانمردی ٹپکتی ہے۔ پھر یہ معاشرہ جنسی طور پر اتنا بیمار بھی نہیں جتنا کہ سوئٹزر لینڈ اور اٹلی کو دیکھا۔

ہاگن سے تقریباً تین گھنٹوں میں کالون پہنچ گئے۔ ہم نے جو ٹکٹ خریدا تھا وہ عام کلاس کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ راستے میں چیکر نے کہا: یہ اسپیشل ٹرین ہے اس لیے اس کا زائد ٹکٹ ہے۔ لہذا فی ٹکٹ چار ڈش مارک دیجیے۔ جو کہ ندامت کے ساتھ دیئے۔ ناواقفیت بھی کتنی بڑی سزا ہے۔

ہاگن کے ہم بوتیمی ہوٹل کے یونین کمرہ نمبر ۳۰۲ میں ٹھہرے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر ڈرائیور خاتون کو ہوٹل کا ایڈریس بتا دیا تھا جسے پڑھ کر وہ سیدھی ہوٹل پہنچی۔ کرایہ کا بل بتایا جو ہم نے دیا۔ ہم اس ہوٹل میں اس لئے ٹھہرے کہ یہاں وہ مقامات یا شہر قریب ہیں جہاں کہ ہمیں جانا تھا۔ یعنی یوں یہ جگہ ہمارے لیے مرکزی جگہ ٹھہری۔ دوسرے جاوید کے دوست اشرف نے بھی یہیں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ اشرف چونکہ اس شہر میں ٹریننگ کے لیے آیا ہے اس لیے اس کی رہبری میں مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ اشرف نے یہاں ۳۱ جولائی کو پہنچنا تھا مگر نہیں پہنچا۔ قدرے تھکاوٹ تھی۔ تھوڑا سا ہوائی جہاز کا سفر، تھوڑا سا ریل کا سفر۔ کافی آرام دہ سفر ہونے کے باوجود سفر، سفر ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی رات ہو رہی تھی لہذا انٹل غفیل ہو گئے۔

یکم اگست

صبح اُٹھے۔ رات ہوٹل کے منیجر نے پوچھ لیا تھا: ناشتا کتنے بجے کیجئے گا؟ ہم نے بتا دیا تھا: نو بجے۔ لہذا نو بجے اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں کہ بریک فاسٹ کا انتظام ہوتا ہے۔ بریک فاسٹ بھی چونکہ ہوٹل کے کرایہ میں شامل ہے لہذا اس سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا ورنہ یہاں تو کھانا پینا ایک مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کئی دفعہ کھانے کو کچھ نہ ملا تو ہم نے صبر شکر کیا۔

جس وقت ہاگن کے یونین ہوٹل میں پہنچے تھے تو ہمیں کمرہ نمبر ۳۰۲ دیا گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے خود ہمارے دو بکس اٹھائے، کمرے کا دروازہ کھولا۔ اتنا کچھ ہمارے ہاں کوئی نہیں کرتا۔ یہاں ہر شخص ایک دوسرے کا کام کرتا ہے خواہ و اس کا کام ہو یا نہ ہو۔

ہمیں کالون جانا تھا۔ ہاگن سے کالون جانے کے لیے ریل پر بیٹھے۔ کالون یہاں کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ وہاں اپنے کاروبار کے لیے ہمیں ایک فرم میں جانا تھا۔ ٹیکسی والا ایڈریس دیکھ کر وہاں پہنچا آیا۔ فرم کا درواز بند تھا۔ ہم نے گھنٹی بجائی۔ ایک صاحب نے پوچھا: کون ہیں؟ ہم نے اپنا جغرافیہ بتایا۔ اس نے کہا: اُوپ

تشریف لے آیئے۔ دروازہ کُھل گیا اور ہم اُوپر پہنچے۔ وُہ دفتر ان کے گھر میں تھا۔ کئی آدمی اور خواتین کام کرتے تھے۔

ہم نے اپنے مطلب کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس موضوع پر اتنا ڈھیر سارا مواد مہیا کیا کہ انتخاب کرنا مشکل ہوگیا۔ یعنی ہم پُورے نو گھنٹے وہ سب کچھ دیکھتے رہے اور وہ سب کچھ دکھاتے رہے۔ دفتر کا ٹائم بھی ختم ہوگیا۔ مگر اُنھوں نے یہ سمجھ کر کہ دوسرے ملک سے آئے ہیں اس لیے ہمارے لیے مقررہ ٹائم کا کچھ خیال نہ تھا۔ دفتر تو بند ہوگیا مگر مالک کا فرزند ارجمند اور منیجر وہ سب کچھ دکھاتے رہے۔

راستے میں ایک بڑا دریا نظر آیا۔ اس لیے بڑی کشتیاں اور چھوٹے جہاز چلتے ہیں۔ اس دریا نے اس شہر کی خوب صورتی میں اور اضافہ کر رکھا ہے۔ یہ علاقہ بھی قدرے پہاڑی ہے۔ مگر یہ پہاڑ پتھروں سے اٹے ہُوئے نہیں بلکہ گھنے جنگلوں سے پٹے پڑے ہیں۔ جس سے شہر کی خوب صورتی میں اضافہ ہُوا۔ راستے میں کئی لمبی لمبی سرنگیں پڑیں۔ جس کی ہوا میں قدرے خنکی تھی۔ ان دنوں یہاں نہ گرمی ہے نہ سردی، ویسے ایسے موسم کو قدرے گرم ہی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ کوٹ پہنا نہیں جا سکتا۔

۲ اگست [بدھ]

نو بج رہے ہیں۔ جاوید سو رہا ہے۔ ناشتے کا وقت ہوگیا ہے۔ مجھے رات نیند نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں! میرے مسوڑھوں سے خون لاہور میں ہی نکلتا تھا مگر مجھے وہاں ڈاکٹر کو دکھانے کی فرصت نہ تھی اس لئے وہ مرض ساتھ لایا تھا۔ یہاں پہنچ کر وہ مرض کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا اس لیے میں قدرے پریشان ہُوں۔ اپنی ہومیوپیتھی چلاتی مگر آرام نہیں آیا۔ چند دوائیں ساتھ ہیں۔ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اس مرض کا کیا بنے گا! آج صبح شیو کرتے ہوئے کٹ لگ گیا تھا۔ خُون نکلا۔ میں نے کہا: پہلے خون نکلنے میں کون سی کمی تھی جو یہ کٹ بھی لگا۔ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا ہُوں اس لیے کہ مسلسل کئی ماہ سے خون نکل رہا ہے۔ جسم میں خون کا کوئی سمندر تو نہیں کہ کچھ فرق نہ پڑے۔ کمزور اور نحیف انسان کو ایسا تھوڑا سا جھٹکا بھی پریشان کر سکتا ہے۔ پاکستان میں مَیں نے اپنی صحت کی طرف سے ایسی لاپروائی برتی ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اسے خود تباہ کیا۔ اتنا صحت مند آدمی، اب اتنا لاغر کہ چلنے میں بھی لڑکھڑاہٹ تک نوبت، نظامِ قدرت کی طرف سے اس حد تک بے دھیان ہونا، رنگ کیسے نہ لاتا!

آج ہم اشرف ہی کا انتظار کرتے رہے۔ اسے سوئٹزرلینڈ میں چھوڑ کے آئے تھے۔ وعدہ کے مطابق اُسے دو دن پہلے پہنچنا چاہیے تھا، اس لیے کوئی پروگرام بنایا نہ جا سکا۔ اُسے ساتھ لے کر ہی اِدھر اُدھر جا سکتے تھے۔

ادھر زیادہ ہوٹلوں میں ناشتا کے علاوہ کھانا وانا نہیں ملتا اس لیے وہ انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔ ہر چیز سؤر کے گوشت یا اس کی چربی سے بنی ہوئی ملتی ہے، جسے ہم کھا نہیں سکتے۔ لہذا دوسرے شہروں

کی طرح جرمنی میں بھی اُسی چکر کی لپیٹ میں ہیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ ہوٹل کے قریب ترک ہوٹل ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچے۔ بڑے بڑے ترکی روٹ (روٹیاں) پڑے ہوئے تھے۔ یہاں پھل بھی تھے۔ یہاں پھل خریدنے کو ترجیح دی۔ ایک ایک کلو کر کے آڑو، ناشپاتی، خوبانی اور کیلے خریدے۔ ہوٹل کی مالک ترکی کے علاوہ کوئی زبان نہ جانتی تھی، تھوڑی سی جرمن زبان جانتی تھی۔

ہم نے ڈبل روٹی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، یہ کیسے کھائیں؟ اس کے ساتھ کیا لازمہ ہے؟ وُہ کچھ نہ سمجھ پائیں۔ ہم نے کہا: بٹر ہے؟

وہ بولی: بوتر!

اس کے باوجود مسئلہ حل نہ ہُوا۔ تھوڑی دیر بعد وُہ بٹر کا ڈبہ اٹھا لائیں۔ ہم نے کہا: "لیس!" اس کے بعد ہم نے پوچھا: ملک اور شوگر ہے۔

اس نے سر ہلا دیا کہ نہیں ہے۔ اس کے بعد پوچھا: "ٹی ہے؟"

کہنے لگی: "تی۔ یی۔"

پھر وہ جا کر چائے کا ڈبہ اٹھا لائی۔ ڈبہ کو کھول کر دکھایا۔ تی۔ یی۔ ہم نے کہا: "لیس"! مگر ہم بغیر دودھ اور چینی کے صرف چائے کو کیا کرتے! یا صرف روٹی کو بغیر کسی سالن ٹائپ کی چیز کے کیا کرتے!

۴ اگست (جمعرات)

آج میں صبح ۵ بجے جاگ گیا تھا۔ اُٹھ کر پھر لیٹ گیا کہ اتنی جلدی اُٹھ کر کیا کروں گا! پھر جاگا تو ۹½ بج رہے تھے ہوٹل والوں سے نو بجے ناشتے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ وہ لوگ جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں اس لیے دیر سے آنے والوں سے وہ خوش نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ آج ہم نے میزبان خاتون سے کہا، ہم دیر سے آتے ہیں آپ ناراض تو نہیں ہوتیں؟ وہ کہنے لگیں: ایک فیملی آپ سے بھی دیر میں آتی ہے۔

یہاں چائے ایک کیتلی میں ملتی ہے جس کے نیچے والے برتن میں بڑے لائٹر نما سی چیز جلتی رہتی ہے اس سے چائے گرم رہتی ہے۔ چائے اچھی ہو تو لطف بھی آتا ہے، لہٰذا لطف آتا رہا۔

آج پھر اشرف کا انتظار تھا جو نہیں آیا۔ اس لیے ہم نے ٹیلکس کے ذریعہ اطلاع دی کہ کہاں گُم ہو، اپنے پروگرام سے مطلع کرو۔ اب ٹیلکس کے جواب کا انتظار رہے دیکھیے کب آتا ہے!

فراغت تھی اس لیے گھر ٹیلیفون ملایا۔ ٹیلیفون کل بھی گھر کیا تھا مگر سوائے اخلاق اور بچّوں کے کوئی بڑا گھر میں نہ تھا معلوم ہوا میری پوتی تابندہ کی طبیعت خراب ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج پریس میں پرویز کو ٹیلیفون کیا۔ کام کاج کے بارے میں صورتِ حال کا علم ہُوا۔

وہاں اتفاق سے ڈاکٹر حسن اختر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چونکہ علامہ اقبال ٹاؤن میں جو لائبریری رائٹرز گلڈ والے بنا رہے ہیں اس کمیٹی کے صدر ہیں۔ چنانچہ میں نے اُن سے کہا کہ گورنر صاحب نے کمال مہربانی سے ہماری ضرورتوں کے مطابق نقشہ منظور کر دیا ہے اور تعمیر کے لیے دو سال کی مدت بھی منظور کر لی ہے۔ رقم بھی کچھ بینک میں موجود ہے اس لیے تعمیر کا کام شروع کرا دینا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے کی کچھ اور باتوں کی وضاحت چاہی وہ بھی بتا دی۔ مثلاً ٹھیکیدار صاحب سے کس طرح رابطہ پیدا کیا جائے وغیرہ وغیرہ!

میں نے پریس میں ٹیلیفون تو اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر کیا تھا۔ اپنی باتیں تو کم ہوئیں۔ کم بخت گلڈ کے کاموں کی وضاحت میں زیادہ وقت صرف ہو گیا۔ اس لیے میں نے مزید کوئی اپنی بات کرنے کے بغیر ٹیلیفون بند کر دیا۔

میں نے گلڈ سے اپنی وابستگی کو کم سے کم کر دیا ہے۔ پھر بھی کچھ وابستگی اس لیے رکھی ہے کہ میری ذات سے گلڈ کو فائدہ ہو۔ اب لائبریری کی تعمیر کا انتظامی طور پر میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مگر گورنر صاحب کی حاضری میں جا جا کر ضابطہ میں رعایتیں حاصل کر کے نقشہ منظور کرایا۔ تعمیر کے لیے چار لاکھ کی رقم دلوائی۔ تعمیری مدت گزر جانے کی وجہ سے مزید دو سال کی مدت حاصل کر کے دی۔ ایسا سب کچھ اپنے اطمینان کے لیے کر رہا ہوں۔

ٹیلیفون سے یاد آیا۔ کل فتح محمد ملک کو ہائیڈل برگ میں ٹیلیفون کیا تھا۔ وہ ٹیلیفون پر مل گئے تھے۔ انہیں مخاطب پا کر بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے بتایا۔ آپ نے یہاں پہنچنے میں بڑی دیر کر دی۔ ہم نے بڑے پروگرام بنا رکھے تھے اساتذہ اور طلبہ کو آپ کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے ایک تقریب کا ہونا طے پا چکا تھا مگر اب تو چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ میں نے کہا: یہ سب اچھا ہوا۔ میں جلسے جلوسوں والا آدمی نہیں ہوں۔

میں نے پوچھا: ملک صاحب! یہاں تو قدرے فراغت ہو گی۔ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے کہ نہیں؟ کہنے لگے: شروع میں تو دل نہ لگا۔ دوست اور گھر والے یاد آتے رہے۔ اب قدرے اپنے آپ کو سنبھالا ہے، لکھنا شروع کیا ہے اب۔

ملک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا، آپ تو علاج کی غرض سے نکلے ہیں۔ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا؟ میں نے کہا، علاج کا یہ ہے کہ لندن پہنچوں گا تو اپنے دوست کو زحمت دوں گا کہ وہ ٹیسٹ ویسٹ کرا کے دوائیں تجویز کریں ابھی تو میرا اللہ ہی معالج ہے۔

میں جب گھر سے نکلا تھا تو جاوید کی رفاقت کے علاوہ میرے دو مقاصد تھے: ایک مقصد علاج کا، دوسرے حج کا۔ چونکہ پاکستان میں جب کھلا ٹکٹ خریدا تھا تو ٹکٹ میں سعودی عرب جانے کا بھی اندراج تھا۔ عین ایک دن پہلے ٹریولنگ ایجنسی نے ٹیلیفون کیا، حج کے دنوں میں سعودی عرب جانے کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے پابندی ہے لہٰذا ٹکٹ واپس بھجوائیے تاکہ اندراج حذف کیا جائے۔

میرا تو آدھا مقصد پاکستان میں بیٹھے ہی فوت ہو گیا۔ سخت پریشان تھا مگر جاوید نے کہا: اس کا انتظام ہو جائے گا

گھر سے تو نکلیے۔

آج میں نے اس سے پُوچھا: حج کے بارے میں بھی کچھ سوچا؟ اس نے کہا: لندن جاکر کوشش کی جائے گی۔
اب میں اسے کہتا ہوں، جلد لندن چلو۔ مگر وہ کہتا ہے مجھے اپنے دوست کا انتظار کرلینے دو، وہ آجائے گا تو آئندہ کا پروگرام بنائیں گے۔

میں نے پرسں ٹیلیفون کیا تو پرویز سے باتیں ہُوئیں۔ گھر ٹیلیفون کیا تو اخلاق سے باتیں ہوئیں۔ بیگم صاحبہ سے کوئی بات نہ ہُوئی۔ وہ کھول رہی ہوں گی، کہہ رہی ہوں گی کہ وُہ مجھ سے بھاگ کر تو لندن گیا ہے، مجھ سے کیوں بات کرتا وغیرہ وغیرہ۔ غرض میری خواہش ہے کہ کسی طرح بیگم صاحبہ سے بھی بات ہو۔ مگر اس کے لیے دو تین دن کا وقفہ دوں گا کیونکہ پردیس میں اتنی وافر رقم تو نہیں ہوتی کہ روز ٹیلیفون کیا جا سکے۔

آج میں نے اور جاوید نے اپنے کاروبار کے مستقبل کے بارے میں باتیں کیں۔ وہ کہتا ہے: یہ کام کیا جائے۔ میں نے کہا: یہ کام ہمارے وسائل سے بڑا ہے۔ اس نے ایک اور خاکہ سامنے رکھا۔ میں نے کہا: اس کام کے لیے بھی بڑا سرمایہ درکار ہوگا۔ بہرحال ہم اب وسائل کے مطابق اپنے کاروبار کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بڑھاپا سر پر آن پہنچا ہے۔ اور بچے، اپنے بچّوں کے مستقبل سے پریشان ہیں۔

یہاں کا موسم بڑا عجیب ہے۔ ابھی دُھوپ نکلی ہُوئی ہے موسم میں حدت ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں دھوپ غائب۔ بارش نے رنگ جما دیا۔ گرم کپڑے اوڑھنے پڑ گئے۔ لوگ چھتریاں لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہُوئے۔ چھتری بڑے کے پاس بھی ہے اور چھوٹے کے پاس بھی۔ میں نے ابھی کھڑکی سے جھانکا تو نظر آیا ایک عورت اپنے ننھے بچے کو بچہ گاڑی میں لیے جا رہی ہے اور بچہ گاڑی کے اُوپر چھتری لگی ہُوئی ہے۔ اس عورت کے ساتھ چار بچے ہیں۔ چاروں کے ہاتھ میں چھتریاں ہیں اور خود عورت کے ہاتھ میں چھتری، یعنی ننھّے بچّے سے لے کر عورت تک، ہر سائز کے افراد جاتے ہوئے بڑے اچھے لگے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض گھروں میں ایسی تپائیاں ہوتی ہیں کہ بڑی تپائی سے چھوٹی تپائی نکل آتی ہے اور اس طرح چھ سات تپائیاں نکل آتی ہیں۔ بالکل مجھے وہی صورت لگی۔

۴ اگست (جمعہ)

میں نے محسوس کیا کہ یہاں عورتیں زیادہ گاڑیاں چلاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہُوں کہ ہر عورت کے پاس شوہر ہو یا نہ ہو گاڑی ضرور ہے۔ مجھے ہمیشہ سے عورتوں کا گاڑی چلانا مردوں سے زیادہ اچھا لگا۔

یہاں تربوز بڑا دلچسپی سے کھایا جاتا ہے۔ تربوز کی وضع قطع تو ہمارے جیسی ہے مگر وہ بظاہر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ان پر ہلکے سبز رنگ کے ساتھ گہری سبز دھاریاں ہیں۔ اندر سے تو میں نے جتنے کٹے ہوئے تربوز دیکھے خوب سُرخ دیکھے۔ ایک صاحب نے تو اپنی گاڑی کے پچھلے حصّے پر مصنوعی کٹے ہوئے تربوز کا مٹّی کا ماڈل لگا رکھا تھا

جو بھلا لگا۔

ہمارے ہاں کی طرح یہ نہیں کہ پوسٹر دیواروں پر چسپاں ہوں، ہر دیوار پر چسپاں۔ یہاں یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے، سڑکوں پر تقریباً ۵ فٹ لمبے اور ۴ فٹ چوڑے گھیر کے پلر ایستادہ ہیں۔ اُن پر پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر فلمی پوسٹر۔ ہمارے ہاں تو ہر مسئلے پر پوسٹر لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں رسول اللہ کانفرنس اور یا رسول اللہ کانفرنس پر بہت بورڈ لگے دیکھے۔ قدرت بھی ان کے داعیان پر خوب حیران ہوتی ہوگی۔ ہم لوگ اختلافی مسائل کو سلجھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ثواب اس میں سمجھتے ہیں کہ اپنا نقطۂ نظر ٹھونسا جائے۔

[یہ تاثراتی ٹکڑے جگہ جگہ پھیلائے جا سکتے ہیں]

آج تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلے۔ ہوا تیز تھی اور ہلکی سرد۔ یہی وجہ ہے کہ میں کوٹ پہن کر باہر نکلا۔ مگر بازار میں دیکھا کہ لوگ ہلکی بنیانوں کے ساتھ چل پھر رہے ہیں، خاص طور سے عورتیں۔ میرا خیال ہے کہ عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت کم سردی لگتی ہے۔ وجہ کوئی ہوگی جو مجھے معلوم نہیں۔ ہم نکلے اس ارادے سے تھے کہ ترکی اسٹور سے ترکی روٹی لے آئیں۔ معلوم ہوا کہ ختم ہوگئی ہیں۔ لہٰذا حسبِ سابق کھانے کا پروگرام کرکرا ہی رہا۔ اسٹور والوں نے کل بتایا تھا کہ ان کے پاس جو گوشت ہے وہ حلال ہے، لہٰذا ہمارا گوشت روٹی کھانے کا منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

آج مجھے پھر نقوش یاد آگیا۔ لہٰذا میں نے پاکستان ٹیلیفون ملایا، پُوچھا: سیرت ابنِ اسحاق کا ترجمہ نور الٰہی صاحب کر رہے تھے، بقایا مسودہ پہنچا کہ نہیں؟ بتایا گیا: نہیں پہنچا۔ پھر میں نے پُوچھا: ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صاحب کا سیرت پر مضمون پہنچا کہ نہیں؟ بتایا گیا: نہیں پہنچا۔ ان دونوں اطلاعوں سے مجھے پریشانی ہُوئی۔

پھر مجھے اپنا عام شمارہ یاد آگیا جو کہ مجھے انہی دنوں چھاپنا ہے۔ پُوچھا: فلاں فلاں دوست کا افسانہ ملا کہ نہیں؟ جواب وہ بھی نفی میں ملا۔ میرے اِدھر آنے کا پروگرام صرف چند ہی دوستوں کو معلوم تھا۔ کیونکہ میں سستی تشہیر کا قائل نہیں ہُوں، ورنہ خبریں چھپوا کر ادھر آتا۔ مگر جو دوستوں نے اپنے افسانے اور مضامین نہیں بھجوائے تھے اس سے تو معلوم ہُوا کہ میری عدم موجودگی کا سب کو علم ہے۔

آج فرخندہ نے بتایا کہ میری سالگرہ بڑی اچھی ہوئی تھی۔ مجھے بڑے تحفے ملے ہیں، بہت خوش ہوں۔ اس پر میں نے فرخندہ سے کہا: تمام بچوں کو میری طرف سے پانچ پانچ روپے مٹھائی کے لیے۔ فرخندہ نے کہا: آپ تو باہر ہیں۔ میں نے جواب دیا: میں تمہارے چچا کو کہہ دیتا ہُوں، وہ سب کو پانچ پانچ روپے دے دیں گے۔ اس پر عصمت نے ٹیلیفون پکڑ کر کہا: ڈیڈی! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں نے کہا: اگر روپے نہ دیتا تو اچھا نہ ہوتا؟ اس نے جواب دیا: آپ پھر بھی اچھے ہوتے!

باہر بارش ہو رہی ہے۔ باہر نکلنا نہ ہوگا۔ ہمارا ہوٹل سڑک پر ہے، گاڑیوں کا شور رہتا ہے۔ جب کوئی گاڑی نہ گزر رہی ہو تو سناٹا ہوتا ہے۔ مگر سناٹا کم ہوتا ہے۔ رات دن گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہر سائز کی

اور ٹرک بھی ہر سائز کے، جن کے پیچھے دو دو تین تین ڈبے ہوتے ہیں۔

سڑک عبور کرنا یہاں ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگ راہ چلتے لوگوں کو گاڑی روک کر راستہ دے دیتے ہیں۔ ہم نے ایک دو بار اپنی بھلمنساہٹ میں گاڑی کو گزارنے کا اشارہ کیا مگر انہوں نے گاڑی روکی تاکہ پہلے ہم گزر جائیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ یہ ذکر ان گزرگاہوں کا ہے جہاں ٹریفک کی بتیاں نہیں ہوتیں!

آج ہم ہوٹل میں لیٹے لیٹے نڈھال ہو گئے ہیں۔ زیادہ لیٹنا بھی اکساہٹ کا باعث ہوتا ہے مگر جاوید خوب سوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس سے سوال کیا: آپ اب تک زیادہ سے زیادہ کتنے دن سوئے ہوں گے؟ اس نے جواب دیا: تین دن تک!

آج میں نے ٹیلیفون پر یہ بھی پوچھا تھا کہ محمد عالم مختار حق صاحب اور قاضی مختار احمد صاحب کے بارے میں حج کی کوئی اطلاع پہنچی؟ اس نے بتایا: جی ہاں کل پہنچی تھی۔

اس مسئلے سے مجھے اس لیے دلچسپی تھی کہ جب میں نے رسولؐ نمبر کی چار جلدیں صدرِ مملکت (محمد ضیاء الحق) کو پیش کی تھیں تو اس موقع پر مجھے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا گیا تھا۔ جب میں نے بقایا چھ جلدیں پیش کیں تو صدر صاحب بیحد خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: آپ تو پھر انعام کے مستحق ہو گئے۔ اس پر میں نے گزارش کی تھی کہ اگر اس کارگزاری کا مجھے انعام ملتا ہے تو وہ یوں دیجئے کہ میرے ایک خوشنویس اور ایک پروف ریڈر کو سرکاری خرچ پر حج کرا دیجئے۔ جسے موصوف نے منظور کر لیا تھا، اس لیے مجھے اس باب میں دلچسپی تھی۔ غرض مجھے اس اطلاع سے بے حد خوشی ہوئی تھی، جیسے مجھے ایک لاکھ سے بھی زیادہ انعام مل گیا ہو۔

اسی طرح جب صدرِ مملکت ہمارے 'ادبی معرکے نمبر' کے جلسے میں اچانک آ نکلے تھے (بغیر طے شدہ پروگرام کے)، تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا: "میں آپ کو کچھ رقم دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے ادبی منصوبے بہ آسانی تکمیل پذیر ہوں۔" یہ بھی صدر صاحب نے فرمایا تھا: "اور وہ رقم معقول ہوگی۔" اس پر میں نے جواب دیا تھا: اللہ کے فضل سے کام چل ہی رہا ہے۔ اس لیے اگر آپ نے کچھ دینا ہے تو وہ میرے اہلِ قلم بھائیوں کو دیجئے۔ چنانچہ صدرِ محترم نے اسی جلسے میں یہ اعلان کیا تھا کہ آئندہ ہر سال نقوش میں چھپنے والی نمایاں تخلیقات پر پچاس ہزار کا انعام دیا جایا کرے گا، جو دو سال سے دیا جا رہا ہے۔

آج صبح نہاتے وقت مجھے اپنے جسم پر وہ نشان نظر آیا جو لاہور میں نہر کے کنارے سیر کرتے وقت ایک کتے کے جھپٹنے سے پڑا تھا۔ روز جب میں اُدھر سے گزرتا وہ روز عین اُسی جگہ جھپٹتا۔ نہ جانے اُس کتے کی اُس جگہ سے کیا یاد وابستہ ہے جو وہ ایسا کرتا ہے۔ صرف یہ سلوک مجھی سے نہیں اور لوگ بھی اس سے دوچار ہوتے ہیں۔

مجھے نہر کے کنارے صبح کی سیر یاد آتی ہے جو مجھے یہاں میسر نہیں۔ وہ لمحات بھی زندگی کے کتنے قیمتی لمحات ہوتے تھے۔

اگست (ہفتہ)

کل کھویا ہوا اشرف مل گیا تھا۔ کھویا ہوا اس لیے کہ اسے پروگرام کے مطابق گزشتہ پیر کو ہیگن کے یونین ہوٹل پہنچنا چاہیئے تھا، مگر وہ نہیں پہنچا تھا۔ آج اس کا فرینکفرٹ سے ٹیلیفون آیا کہ وہ بارہ بجے کے قریب پہنچ رہا ہے۔ ان میں جان آئی۔ کیونکہ وہ یہاں کچھ عرصہ پہلے سے موجود ہے۔ اس کی رہنمائی میں بہت سے کام جلد سدھر سکتے ہیں۔ سرے وہ ہمارے کاروبار سے متعلق یعنی پریس کی مشینری سے متعلق ہم سے زیادہ معلومات رکھتا ہے۔

ابھی فتح محمد ملک صاحب کا ہائیڈل برگ سے ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے خیر خیریت پوچھی۔ میں نے جواب میں کہا: و تین روز تک آپ کے پاس پہنچوں گا۔ وہ کہتے ہیں: میں تو کب سے منتظر ہوں۔

میں خط لکھنے کا چور ہوں۔ کم خطوط لکھتا ہوں۔ مگر یہاں قدرے فراغت ہے۔ خطوط لکھ سکتا ہوں۔ مگر یہاں مسئلہ خط لکھنے کے بعد اسے پوسٹ کرنے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھے خطوط کئی کئی دن پڑے رہتے ہیں۔ پہلے میں نے جو خطوط سوئٹزرلینڈ میں لکھے تھے وہ پوسٹ اٹلی سے ہوتے تھے۔ یعنی ہمیں کیا معلوم کہ ڈاک خانہ کدھر ہے!

آج ہم بازار نکلے۔ ترکی ہوٹل سے ایک روٹ (بڑی روٹی) اور دہی لائے۔ یقین کیجیے جب سے اِدھر پہنچے تھے آج پیٹ بھر کر روٹی کھائی تھی یہ سمجھ کر کہ جو کچھ کھا رہے ہیں وہ ہمارے نقطۂ نظر سے خالص ہے۔ یہ روٹی بھی کلچہ نما تھی۔ دہی اور کلچہ مجھے بچپن سے پسند ہے۔

مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میری عمر چھ سات سال کی ہوگی کہ میرے اصرار پر والد محترم مجھے کلیر شریف کے عرس پر لے گئے تھے۔ مگر ابھی میں گاڑی میں تھا، منزل پر پہنچے نہ تھے کہ میں نے والد صاحب سے کہا: میں واپس گھر جانا چاہتا ہوں۔ وہ حیران ہوئے، پریشان بھی ہوئے کہ ابھی تو یہ کلیر شریف تک پہنچ بھی نہیں پایا کہ اسے گھر جانے کی فکر پڑ گئی۔ لہذا ہفتہ دس دن تک کیسے مطمئن رہے گا! اس لیے انہوں نے پوچھا تھا: تم کیوں واپس جانا چاہتے ہو! میں نے جواب میں کہا تھا: امی مجھے روز صبح کو دہی کلچہ کھلاتی ہیں آپ نہیں کھلائیں گے۔ اس پر والد محترم نے کہا تھا: آپ فکر نہ کریں، ہم اس سے زیادہ کھلائیں گے اور دن میں دو مرتبہ کھلائیں گے۔

یہاں کا موسم بڑا دھوکا دیتا ہے، بغیر بادل کے برستا رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ ابھی بارش کے کوئی آثار نہیں ہوتے مگر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے بارش کا ترنم بڑا اچھا لگتا ہے۔ بارش ہو رہی ہو تو مجھے نیند بڑی فرحت بخش آتی ہے۔

گزشتہ شام کا ذکر ہے اچانک بارش شروع ہو گئی۔ بادل بھی گرجنے لگے۔ بارش بھی اتنی زور کی ہوئی کہ لوگ بھاگنے لگے۔ ورنہ یہاں ہلکی بارش میں لوگ پھرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے سامنے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی جا رہی ہے۔ تھوڑی دور آگے ایک صاحب چھتری لیے جا رہے تھے جب اس نے

عورت کو بارش سے پریشان دیکھا تو اپنی چھتری تلے عورت کو لے آیا اور خود بھیگنے لگا۔

مگر مجھے یہاں ۱۹۷۰ء کی لندن کی ایک رات کا واقعہ یاد آگیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ہم "رودرم" سے لیورپول گئے تھے۔ وہاں کوئی میلہ تھا۔ ڈاکٹر حیدر، ان کی بیگم اور بچی ساتھ تھے۔ میلہ خوب تھا۔ بڑی رونق تھی۔ ہزاروں افراد شریک تھے۔ بڑی روشنی تھی۔ بڑے بڑے آرائشی مجسمے حرکت میں تھے۔ میرے لیے یہ سماں نیا تھا اسی لیے بڑا لطف اندوز ہوا تھا۔ واپسی پر رات کے ۱۲ بج چکے تھے۔ لیورپول سے واپس رودرم پہنچنا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر حیدر کی مرسیڈیز کار پر واپس آئے۔ راستے میں شدید بارش شروع ہوگئی۔ کار بڑی تیزی سے منزل کی طرف رواں دواں تھی سڑکوں پر اندھیرا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی کہ اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی بے قابو ہوگئی۔ عین ممکن تھا کہ اللہ میاں سے ملاقات کرنے کے لیے پہنچ جاتے، کہ ڈاکٹر صاحب نے حواس پر قابو رکھا اور المناک حادثے سے بچ گئے۔ وہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے تو تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔

انھی دنوں کا ایک اور واقعہ نہیں بھولتا۔ وہ یہ ہے کہ شاید مانچسٹر میں ایک نمائش لگی ہوئی تھی۔ وہاں ایک جھولا بھی تھا، جو اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر، دائیں سے بائیں گھومتا تھا[1]۔ مگر اس کا ہمیں علم نہ تھا۔ میں اور ڈاکٹر محض تفریح کی خاطر ٹکٹ خرید کر جھولے میں سوار ہو گئے۔ جب جھولا چلا تو ہمارے حواس خطا ہو گئے۔ وہ ایک دم بہت تیزی سے چلا۔ پھر وہ دائیں بائیں کے علاوہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر چلنے لگا۔ ہماری چیخیں نکل گئیں نیچے ڈاکٹر حیدر اور ان کی بچی ہماری حالت دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ موت دیارِ غیر میں آئی۔ کوئی آٹھ دس منٹ کے بعد وہ جھولا رکا۔ یہ جان کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہم زندہ تھے۔ ڈاکٹر حیدر کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ چنانچہ ہم کوئی آدھ گھنٹہ تک اپنے حواس پر قابو نہ پا سکے۔ یقیناً وہاں سے ہماری نئی زندگی شروع ہوئی۔

یہاں عورت اور مرد کے رشتے میں بڑا توازن ہے۔ سرِعام بیہودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ ایک صحت مند معاشرے کی علامت ہے۔

آج میں نے پھر گھر ٹیلیفون کیا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ تابندہ میری پوتی کی طبیعت خراب تھی۔ ٹیلیفون تابندہ نے اٹھایا۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ٹھیک ہے۔ مجھے اپنے بیٹوں کے بچوں سے بے حد محبت ہے کیونکہ یہ ابھی معصوم ہیں دکھ نہیں دیتے۔ ان کی ننھی ننھی خواہشیں ہیں۔ اُن سے بےحد پیار کرتے ہیں جو ان کا خیال رکھے چنانچہ وہ میری آواز سن کر بے حد خوش ہوئی۔ بیگم صاحبہ کا معلوم کیا تو علم ہوا کہ وہ ہمارے ایک رشتہ دار کے ہاں گئی ہیں کیونکہ وہاں ایک عورت بیمار ہے، اس کی عیادت کے لیے۔ میں نے کہا: بیگم صاحبہ آئیں تو ان سے

---

[1] جیسے کٹورے میں ڈال کر جامنوں کو ہلایا جاتا ہے۔

کہہ دینا کہ میں نے دُوسری بار ٹیلیفون کیا مگر وُہ نہیں ملیں۔ اب میں جلد ٹیلیفون نہ کرسکوں گا کیونکہ پردیس میں ہوں۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں۔ ایک بہو، جاوید کی بیگم کراچی میں تھیں۔ فاروق اور پرویز کی دُلہنوں سے سلام دُعا ہُوئی۔ میری بہوئیں اتنی پیاری اور سلیقہ مند ہیں کہ ہم میاں بیوی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

یہاں انگریزی اخبار نہیں ملتے، جرمن زبان کے اخبار ملتے ہیں۔ اس لیے میں جب سے پاکستان سے نکلا ہوں پاکستان کی کوئی خبر نہیں ہُوئی۔ کبھی انگریزی اخبار ہاتھ لگا بھی، سوئٹزرلینڈ یا اٹلی میں، تو ان میں بھی پاکستان کی کوئی خبر نہ ملی۔ آج انڈیا کے حوالے سے ایک خبر سُنی، جو بی بی سی کے حوالے، یہاں کے ایک اسٹیشن سے انگریزی میں خبریں ہوتی ہیں۔ وُہ خبر یہ تھی کہ سری لنکا سے ایک جہاز مدراس پہنچا۔ اس کا سامان جب کلیئرنگ کے لیے پہنچا تو سامان میں ایک بم پھٹا جس سے ۳۲ افراد مر گئے، ۲۳ زخمی ہو گئے۔ خود ہندوستان میں اور ہندوستان کے ہمسایہ ممالک سے اس کے تعلقات اچھے نہیں۔ کیونکہ انڈیا چاہتا ہے کہ آس پاس کے سارے ممالک اس کے مطیع ہوں۔ ہمارا بنگلہ دیش بھی اسی چکر میں گیا۔ آسام اور سری لنکا سے بھی انڈیا کے تعلقات انہی وجوہات کی بنا پر خراب ہیں۔

تھوڑے دن پہلے ایک خبر یہ سُنی تھی کہ فرانس کا ایک جہاز اغوا ہوگیا۔ وُہ پہلے بیروت اترا، پھر ایران۔ اغوا کے دو دن بعد، ایران کے ہوائی اڈے پر مسافروں کو رہائی ملی تھی۔ تخریب کاروں کا مقصد کیا تھا۔ وہ مسافری میں معلوم نہ ہوسکا۔ ابھی ہمارے پاکستان سے چلنے سے پہلے ایک جہاز سری نگر سے چند سکھ اغوا کر کے لاہور کے ہوائی اڈے پہلے آئے تھے، جو ہمارے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ تو پنجاب گورنمنٹ (اور خود گورنر صاحب) کی ذاتی دلچسپی اور دانشمندی سے معاملہ سُلجھ گیا تھا، ورنہ انڈیا گورنمنٹ کا رویّہ ایسا تھا کہ جہاز اغوا کرنے والے جہاز کے مسافروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو ختم کر دیں۔ یہ رویہ عجیب تھا۔

ہندوستان کی گورنمنٹ دنیا کی دوسری بڑی جمہوریت ہے بلکہ آبادی کے لحاظ سے پہلی بڑی جمہوریت۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کو جو ووٹوں کی اکثریت سے وزیر اعظم تھا اسے غیر جمہوری انداز میں معطل کر دیا تھا۔ اور فاروق عبداللہ نے یہ بیان دیا تھا کہ جہاز کا اغوا خود ہندوستان کا شاخسانہ ہے تاکہ کشمیر کے مسلمانوں کو اسی بہانے کچلا جا سکے۔

یہ ہوٹل (ہوٹل یونین)، جس میں ٹھہرے ہیں، اچھا ہوٹل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک ہی خاندان کے افراد چلا رہے ہیں۔ باہر کا کوئی آدمی ملازم نہیں۔ تین چار لڑکیاں ہیں، وہی پردھان ہیں۔ اپنے اپنے کام سنبھالے ہوئے ہیں، وُہ بھی بڑی خوش اطواری سے۔ جب خوب صورت لوگ خوش اطوار بھی ہوں تو قدرت کے فیصلے پہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔

آج مجھے بیٹھے بیٹھے یُونہی خیال آگیا کہ آج میں جس جگہ پہنچا ہُوں اس میں میری بیوی کے ایثار کو بڑا دخل حاصل ہے۔ پہلی بات یہ کہ اچھے بُرے حالات میں ساتھ دیا۔ بلکہ زیادہ تر بُرے حالات میں ساتھ دیا۔ زیور جو عورتوں کو بہت عزیز ہوتے ہیں وہ نقوش کی خاطر بیچے پھر وُہ کبھی نہ بنے۔ مجھے وہ سونے کے کڑے (کنگن)

یاد آتے ہیں، جو بہت ٹھوس تھے اور میں کہا کرتا تھا کہ یہ بوقتِ ضرورت ہتھیار کا کام بھی دے سکتے ہیں۔

بُرے حالات میں بھی میری طبیعت کا میلان عجیب تھا۔ ایک بار فاروق بیمار رہا تو میرے خُسر صاحب نے یہ جان کر کہ حالات اچھے نہیں، پچاس روپے کا نوٹ دیا تھا تاکہ علاج میں کام آئے۔ یہ بات ۱۹۴۲ء کی ہو گی کہ میں نے وہ نوٹ لے کر اس کے کئی ٹکڑے کر دئے تھے۔ بتانا یہ تھا کہ حالات بے شک اچھے نہیں مگر میری غیرت ایسی بخشش کو پسند نہیں کرتی۔ بیشک وُہ بچگانہ بات تھی مگر ایک غریبانہ انا مجھ میں اس وقت بھی تھی۔

۶ اگست (اتوار)

جرمن جتنے ہیگن میں شریف نظر آتے ہیں اُتنے ہیں نہیں۔ اس لیے اسے جرمنی کا پسماندہ (بیک وَرڈ) علاقہ سمجھا جاتا ہے، جہاں ابھی پرانا رکھ رکھاؤ ہے، شائستگی ہے۔ ورنہ فرینکفرٹ اور ڈسل ڈروف وغیرہ علاقے ترقی یافتہ ہیں۔ یعنی تمام بیہودگیوں کی آماجگاہ۔

یہاں میں نے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز نہیں سنی تھی۔ ایک دن اچانک سُنی تو استفسار کیا: یہ کیا بات ہُوئی ! بتایا گیا، یہاں شادی کی طرز کی کوئی شے اہم مسئلہ نہیں ہے۔ مگر جب باقاعدہ شادی ہوتی ہے تو وہ بات اہم مسئلہ ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی خوشی کا اظہار ہارن بجا کر کرتے ہیں۔ یہ جو اب ہارن بج رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ برات جا رہی ہے۔

ان دنوں اولمپک گیمیں ہو رہی ہیں۔ یہاں کا وقت چونکہ امریکہ سے نو گھنٹے پیچھے ہے اس لیے گیمز رات کو شروع ہو کر صبح تک جاری رہتی ہیں (ٹیلیویژن پر) رات ہم نے کئی گھنٹے یہ گیمز دیکھیں۔ ایک جرمن پہلوان ہارنے پر زار و قطار روتا دکھایا گیا۔ یہ عجیب لگا۔ اسی طرح ایک امریکہ کا ہیوی ویٹ لفٹر بھی روتا دکھایا گیا۔ مگر یہ خوشی سے رو رہا تھا۔ اس لیے کہ وُہ کچھ عرصہ پہلے کینسر کا مریض تھا۔ اور وہ سب اپنے ڈاکٹروں، اپنے دوستوں اور ہمدردوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ کینسر کا مریض آج ہیوی ویٹ لفٹنگ کا چیمپئن بن گیا تھا۔ رونے کی یہ متضاد کیفیتیں سامنے آئیں۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانکا تو ایک آدمی نکلا۔ وُہ سامنے لگے ہوئے اس بکس کی طرف گیا جو کہ ضروری چیزوں کے لیے جگہ جگہ لگے ہیں۔ اس نے اس میں سکے ڈالے۔ اس میں سے سگریٹ کی ڈبیہ نکلی۔ اس نے ڈبیہ میں سے ایک سگریٹ نکالا تو لبوں میں اٹکا لیا۔ اس کے پاس ماچس نہ تھی۔ اس لیے وہ اسے سلگا نہ سکا۔ مگر اپنی تسکین کے لیے اور اپنی اکڑ کے لیے اس نے لبوں میں سگریٹ اٹکائے رکھا تھا۔

رات پھر اولمپک گیمز دیکھیں۔ لڑکیاں ہاکی کا میچ کھیل رہی تھیں۔ انہوں نے بھی اس معاملے میں خاصی ترقی کی ہے معلوم نہیں ہوتا کہ کھلاڑنیں اناڑی ہیں۔ خوب خوب لطف آیا۔ کشتی رانی کے بھی مظاہرے دیکھے۔ اس کے بعد لڑکیوں کا والی بال کا میچ، یہ مقابلہ بھی بڑا سخت ہوا۔ لڑکیاں ہر میدان میں ترقی کر رہی ہیں۔ کسی دن مرد کی فوقیت ہر شعبہ میں

یہ لڑکیاں ختم کر دیں گی۔ یہاں باکسنگ کا مقابلہ بھی دیکھا۔ محمد علی یاد آیا۔ یہ لوگ محمد علی کے اسٹائل کی نقل تو کر رہے ہیں مگر محمد علی کا بھرپور فن کہاں سے لائیں گے!

آج اتوار تھا، چھٹی کا دن، اس لیے کھانے پینے کی چیزوں کے لیے جدّوجہد کرنی پڑتی ہے۔ پھر اپنے ڈھب کی چیزیں ڈھونڈنے میں اور دقت ہوتی ہے۔ لہذا اس مہم پہ نکلے۔ یہ دُکان بند، وہ دکان بند، غرض ایک جگہ سے کھانے کو کچھ ملا۔

ابھی تک وُہ کھانا نصیب نہیں ہُوا۔ وہ ذائقے والا کھانا نصیب نہیں ہوا کہ جو ہم ہر روز اپنے ملک میں کھاتے تھے۔ اِدھر پھیکا بے نمک کھانا ملتا ہے مگر سجی سجائی چیزوں میں۔ ان لوگوں نے نمائشی سجاوٹ میں بڑا اضافہ کیا ہوا ہے جو مرعوب کرتا ہے۔

ہم لوگ کیمرہ ساتھ لائے تھے جو جاوید صاحب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مگر اس سے تصویریں کم اتارتے ہیں۔ یہ جاوید کے مُوڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنی عادت کے مطابق کہنا نہیں ہے کہ تصویر اتارو۔ ہم لوگ اب تیسرے ملک کی یاترا کر رہے ہیں۔ ابھی تک جو زیادہ سے زیادہ تصویریں اُتری ہوں گی وہ بھی تین چار ہوں گی۔

یہاں پہ ہمارے کافی دن صَرف ہو گئے، وُہ بھی بے مصرف اور بیکار پڑے رہنے سے طبیعت پر بوجھ ہے۔ ہوٹل کا کرایہ الگ، کیونکہ کچھ دن اشرف گم رہا۔ اب وُہ ملا تو ہفتہ اتوار کی چھٹیاں آ دھمکیں۔

۷ اگست (پیر)

ہاگن پہاڑی علاقہ ہے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر، تھوڑی دُور پہاڑ نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے گھنے اور سرسبز ہیں کہ آنکھوں میں تراوت آ جاتی ہے۔ اور کچھ بھی کرنے یا دیکھنے کو نہ ہو تو صرف اُدھر دیکھ لیا جائے۔ غزل کہنے کا مُوڈ بن جاتا ہے۔

علاقہ صاف سُتھرا ہے۔ بلکہ یہ سارے علاقے صاف سُتھرے ہیں۔ گرد نام کی کوئی چیز نہ دیکھی۔ یہی وجہ ہے کہ کپڑے بھی مَیلے کم ہوتے ہیں۔ ورنہ میں لاہور میں تو ہر روز کپڑے بدلتا تھا۔ یہاں کئی کئی دن کپڑے بدلے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ہمارے لیے کپڑے دھونا بھی تو ایک مسئلہ ہوتا۔ کیونکہ ساتھ تو چند ہی جوڑے لا سکتے تھے۔ اس لیے کہ مسافری میں سامان خود اٹھانا پڑتا ہے۔

یہاں ابھی دُھوپ نکلی ہوتی ہے ابھی بارش ہو جاتی ہے۔ بادل نظر نہیں آتے مگر بارش ہو رہی ہے۔ ابھی موسم گرم ہے ابھی ٹھنڈا ہو گیا۔ یوں ٹھنڈا اور گرم موسم ایک ہی آن میں کئی بار دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ لوگ دھوپ کو بڑا پسند کرتے ہیں، حظ اٹھاتے ہیں۔ ہوٹل کے سامنے ایک گھر میں چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ دھوپ نکلتی ہے تو ایک صاحب بنچ کو باغیچہ میں ڈال دیتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ دُھوپ جانے لگتی ہے تو وُہ بنچ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ایسا روز ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ خاصا تردد والا ہے۔ مگر وہ ایسا تردد روز کرتے ہیں۔

اس کے بعد آج ہم کاغذ پر گوند لگانے والی مشین دیکھنے گئے۔ ہاگن سے ایک گھنٹہ گاڑی کے ذریعہ سفر کیا۔ ریلوے اسٹیشن پر جاکر فرم میں ٹیلیفون کیا۔ ان کا سیلز مینجر ہمیں اسٹیشن پر لینے آگیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد اس نے ہمیں پہلے ایک ہوٹل میں جا بٹھایا۔ وہاں کا بڑا ہوٹل ہوگا۔ مینجر نے کہا: یہاں آپ کو دنیا کی ہر چیز کھانے کو ملے گی۔ ہم نے کہا: ہم کھانے کے سلسلے میں کافی ڈرپوک واقع ہوئے ہیں۔ گائے کے گوشت اور کوکا کولا پر گزارہ کرنے والے لوگ ہیں۔ اس پر اس نے کہا، ہم یہ کچھ لے آتے ہیں۔ میں نے کہا، مجھے کوکا کولا کی بجائے سیب کا رس دیا جائے، جس کی رنگت شراب جیسی تھی مگر وہ رس بڑے مزے کا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیں اپنی فیکٹری لے گئے "کیمپٹ"۔ یہ لوگ بڑی بڑی مشینیں بناتے ہیں۔ پیکنگ کی انہوں نے ایک مشین دکھائی جو ۹۰ ملین ڈالر کی تھی۔ رقم کا آپ حساب لگا لیں کافی لمبا حساب ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں سلیٹر مشینیں دکھائیں جو کاغذ کی ملوں میں کام آتی ہیں۔ کافی بڑی مشینیں، جو کاغذ کاٹنے کے کام آتی ہیں۔

ہم نے بھی اپنی گلو کرنے والی مشین دیکھی۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ہم قدرے مطمئن تھے۔ سیلز مینجر بڑے خلیق تھے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی مشینیں دکھاتے رہے۔ ان کا انداز یہ تھا ہم اتنے بڑے بڑے کام کرتے ہیں ہمیں داد دو۔ ہمارا دل آفریں کہہ رہا تھا۔ زبان سے بھی ہم اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے۔

اب ہم نے انہیں کہا کہ آپ ہمیں ریلوے اسٹیشن چھوڑ آئیں تاکہ ہم اپنی عارضی سکونت ہاگن پہنچ جائیں۔ انہوں نے کہا، میں آپ کو آپ کے ہوٹل ہاگن ہی چھوڑ آتا ہوں۔ یہ بڑی قربانی اور ایثار والی بات تھی۔ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل واپس چھوڑ گئے۔ ہم ان کے اخلاق سے بڑے متاثر ہوئے۔

جو سیلز مینجر ہمیں واپس چھوڑ گئے یا جو ہمیں اسٹیشن لینے آئے تھے انہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے ایک استاد سید اختر علی یاد آگئے، اُن کی شکل میرے استاد سے بڑی ملتی جلتی تھی۔ باتیں کرنے کا بھی وہی انداز تھا۔ اپنے کاروبار کے بارے میں ان کی معلومات بھی اچھی خاصی تھیں۔

۸ اگست (منگل)

آج ہم اردو ٹائپ بنانے والے ادارہ لیٹرفوٹ گئے۔ انہوں نے دنیا کی زبانوں میں کمپیوٹر ٹائپ بنائے ہیں۔ جو کافی مقبول ہیں۔ اردو ٹائپ بنانے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ مسٹر بلاک جو ہاگن میں اس شعبہ کے انچارج تھے، وہ ہم سے اردو ٹائپ کی دشواریوں پر بات چیت کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جملہ دشواریوں پر قابو پالیں گے۔ مگر ہماری بنیادی رہنمائی کی جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہالینڈ میں ہماری ٹیم ان مسائل پر غور کر رہی ہے۔ کام میں پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ مگر زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے کافی زبانوں میں کمپیوٹر پر

زبانیں منتقل کر دی ہیں۔ مگر جتنی دُشواری مجھے اردو کے سلسلے میں پیش آ رہی ہے وہ کسی دوسری زبان کے بنانے میں پیش نہیں آئی۔

ہم نے کہا: اگر آپ ادھر توجہ دیں اور کم قیمت کی مشین ہو تو کافی مشینیں پاکستان جا سکیں گی۔ انہوں نے کہا، ہم توجہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ہماری زیادہ مشینیں بکیں۔ مگر ہم تو یہ کام ایک مشن کے طور پر کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

پھر انہوں نے ہمیں ایک کیمرہ دکھایا جو پرنٹنگ پراسس میں نیگیٹو پازیٹو بنانے کا کام دیتا ہے - یہ بھی کمپیوٹرائیزڈ آٹومیٹک تھا۔ اس کیمرے سے ہم خاصے متاثر ہوئے کیونکہ وہ کم قیمت پر خاصا کارآمد کیمرہ تھا۔

اس کے بعد انہوں نے سرخیاں بنانے والی کمپیوٹرائیزڈ مشین دکھائی جو عنوانات کو متعدد شکلوں میں لکھ سکتی تھی مثلاً آپ نے انگریزی میں ایک عنوان بنانا ہے۔ آپ اُسے بیسیوں انداز سے کمپوز کر سکتے تھے۔ عنوان وہی ایک، شکلیں ان کی متعدد۔ یہ بھی ایک نئی چیز تھی جو دیکھنے میں آئی۔

اس کے منیجر مسٹر بلاک بھی بڑے اچھے آدمی نکلے۔ تقریباً سارا دن اُردو ٹائپ کے سلسلے میں معلومات مہیا کرتے رہے، معلومات حاصل کرتے رہے۔ انہیں اپنے کام سے عشق تھا۔ اگر اردو ٹائپ مشین مکمل ہو گئی تو انہیں ہم سے زیادہ خوشی ہو گی۔

ان کا دفتر اسی شہر ہاگن میں تھا۔ مگر جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ڈسل ڈوف جانا چاہتے ہیں تو وہ ہمیں ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ آئے۔ مگر مسٹر بلاک کو اندازہ تھا کہ گاڑی چھوٹ گئی (وقت کم ہونے کی وجہ سے) تو وہ اسٹیشن پر موجود رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیں اسٹیشن پر ہی مل گئے۔ چنانچہ انہوں نے نئی آنے والی گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے دیں۔ گاڑی کا وقت بتایا۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ اب ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ تب وہ اسٹیشن سے لوٹے۔ یہ بھی کہتے رہے کہ کھانے کا وقت ہے وہ ہو جائے۔ مگر ہم ان کی آتنی مہربانیوں کے احسان تلے دبے ہوئے تھے کہ باوجود بھوک کے ہم نے تھینک یو کہہ دیا۔

اس کے بعد ہم ایک گاؤں میں گئے جہاں ایک دوسری مشین ہمیں دیکھنا تھی۔ وہ چھوٹی سی مشین تھی جو ہمارے کام کی نہ تھی۔ مگر اس پریس کے مالک نے بھی اسٹیشن پر اپنے آدمی کو بھیج دیا تھا جو پھر ہمیں واپس اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔ یہ جرمنی کے گاؤں کا ایک حصہ تھا جو سبزے اور پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو بنانا اور سنوارنا چاہیں وہیں بن سنور سکتے ہیں۔

ہم نے راستے میں موصوف سے پوچھا، ہٹلر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: اس نے ہمیں تباہ کر دیا۔ آج ہم غلام ہو گئے۔ پہلے ایسا نہ تھا۔ پھر بڑی تباہی ہوئی۔ سارے صنعتی شہر تباہ ہو گئے۔ آدھی آبادی روس کے قبضے میں چلی گئی۔ اُدھر کے لوگ کافی پریشان ہیں۔ اس نظام کی جو زیادتیاں ہیں وہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

یہ سب کچھ ہٹلر کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہُوا۔

جب ہم ہاگن سے ڈسل ڈوف جانے لگے، اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں اِمیگریشن کے دو سپاہی گھوم رہے تھے۔ اس وقت جاوید، اشرف اور میں اسٹیشن پر موجود تھے۔ سپاہی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب جاوید اور اشرف ٹیلیفون کرنے کے لیے گئے تو سپاہیوں نے ان سے کہا: براہِ کرم پاسپورٹ دکھائیے۔ میں ذرا فاصلے پر کھڑا تھا مجھ سے اُنھوں نے نہ پُوچھا۔ میری طرف دیکھا اس کے باوجود نہ پُوچھا۔ پلیٹ فارم پر گئے۔ ہم تینوں کھڑے تھے۔ ایک جرمن عورت آئی، اس نے مجھ سے جرمن زبان میں معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ ظاہر ہے کہ میں کیا جواب دیتا، سر ہلا دیا، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس پر میں نے بچّوں سے سوال کیا: امیگریشن کے سپاہیوں نے مجھ سے پاسپورٹ کا نہ پُوچھا۔ یہ جرمن عورت مجھ سے استفسار کر رہی ہے، یہ کیا ماجرا ہے؟ اشرف نے کہا: ان لوگوں کے اندازے کے مطابق آپ جرمن کے رہنے والے ہیں، اس لیے ایسا ہو رہا ہے۔

۹ اگست ۱۹۸۴ء (بدھ)

آج ہم دوبارہ ڈسل ڈوف گئے۔ ایک تو ہم ٹیپ کے نیچے جو گتّے کے چھوٹے چھوٹے گولے بنے ہوتے ہیں وہ مشین دیکھنے گئے۔ ہم نے اسٹیشن پر پہنچ کر، متعلقہ فرم میں ٹیلیفون کیا۔ ایک محترمہ ہمیں اسٹیشن سے لینے کے لیے آگئیں۔ فیکٹری دیکھی۔ معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد ہم نے متعلقہ لوگوں سے کہا: ہمیں ٹیکسی منگوا دیں۔ انہوں نے کہا: ہم ہی چھوڑ آتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک پرنٹنگ مشین دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ اس فرم میں گئے، جہاں ہم نے ہاگن سے جانے سے پہلے ٹیلیفون کر دیا تھا۔

جب ہم نے متعلقہ فرم میں جا کر استقبالیہ میں بتایا تو انہوں نے جنرل منیجر کو ٹیلیفون کیا۔ وہ خود ہمیں لینے کے لیے اوپر والی منزل سے نیچے آئے، جو بڑی بات تھی۔ اس سے ہم لوگوں کو کچھ سیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں کمیٹی روم میں جا بٹھایا اور کہا: آپ میرے پاس اتنی دُور سے آئے ہیں اس عزّت افزائی کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہُوں۔

مجھے پریس کی مشینری کے بارے میں قطعاً کوئی معلومات نہیں، اس لیے جاوید نے سوالات کا آغاز کیا۔ وہ اچھے اور میٹھے لہجے میں ہر بات کا جواب دیتے رہے، تسلّی کرتے رہے۔ انہوں نے مشین میں وہ ممکن سہولتیں بہم پہنچا رکھی ہیں جو گاہک کی مرضی کے مطابق اضافہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ بڑی خوبی والی بات تھی۔ ہم جو بات پوچھتے تھے وہ بلیک بورڈ کی طرف جاتے، اس پر تصویر بنا کر اور لکھ کر بات کو سمجھاتے تھے۔ یُوں وُہ بات زیادہ صاف ہو کر ذہن نشین ہو جاتی تھی۔

وہ چار رنگ بیک وقت چھاپنے والی مشین تھی۔ ہم نے ان سے پوچھا: اس کی رفتار کیا ہے؟ انہوں نے

بتایا: آپ کم از کم اس پر فی گھنٹہ ۲،۰۰۰ کاغذ چھاپیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ۴۵۰۰۰ تک چھپ سکتا ہے۔ ہم مشین کی برق رفتاری کا سُن کر پریشان ہو گئے۔ ہم اپنے ملک میں اتنا کچھ کیا چھاپیں گے۔ مشین پسند آگئی تھی مگر ہماری طباعتی ضرورتیں اتنی نہ تھیں۔ ہم سوچ میں پڑ گئے۔ اگر وُہ لوگ مشین کی رفتار اس سے خاصی کم بتاتے تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔

چنانچہ ہم تینوں اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس مشین پر چھاپا کیا جا سکے گا! بہت سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ بچوں کے لئے خوب صورت کاپیاں چھاپنے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ خیالات کی اڑانوں کا امتحان ہونے لگا۔ یہ کیا جا سکتا ہے، وُہ کیا جا سکتا ہے۔ غرض خوب خیالی پلاؤ پکائے گئے۔ جاوید نے کہا: ہم یہ مشین لینا چاہتے ہیں بشرطیکہ وُہ دینا چاہیں۔

میں نے کہا: یہ تو وہ معاملہ ہُوا کہ کسی نے سوال کیا تھا: شادی کا کیا ہُوا؟ لڑکے نے جواب دیا تھا: پچاس فی صدی معاملہ طے ہے۔ یعنی میں تیار ہوں۔ لڑکی والوں کا پتا نہیں! چنانچہ ہم لوگ ہنستے رہے، سوچتے رہے۔

اس فرم کی ایجنسی اشرف علی خاں کے پاس تھی۔ ہم ان سے کہتے رہے کہ مشین دینا آپ کا کام ہے، لینا ہمارا کام۔ اشرف کہتا تھا: مشین رقم سے ملے گی، آپ دینے کے لیے تیار ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہے! اس پر جاوید نے کہا: رقم وہ مانگیے جو ہم دے سکیں۔

ابھی ہم نے مشین دیکھی ہے خریدی نہیں۔ مگر بازار گئے تو سات آٹھ سو روپوں کی مختلف فرموں کی کاپیاں خرید لائے۔ ہماری کاپی ایسی بنے گی، ایسی بنے گی وغیرہ وغیرہ۔ یعنی ہم نے یہ بحث دن کے ۲½ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک جاری رکھی۔ بحث بارہ بجے کے بعد بھی جاری تھی مگر میں سو گیا تھا۔

جنرل مینجر صاحب نے بتایا تھا کہ وُہ بذریعہ ٹیلکس ہمیں مشین کی قیمت بتا دیں گے۔ ہم نے اصرار کیا: ابھی بتائیے! مگر انھوں نے نہ بتائی۔ وُہ سوچتے ہوں گے: اتنی دُور سے یہ لوگ آئے ہیں، قیمت سُن کر بے ہوش نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ہمیں قیمت کا بے چینی سے انتظار تھا جو دوسرے دن پہنچنے والی تھی۔

۱۰ اگست (جمعرات)

آج بذریعہ ٹیلکس مشین کی قیمت پہنچ گئی۔ واقعی ہوش اُڑا دینے والی قیمت ہے۔ ہم نے اتنی بڑی جمع کا سوال تو کبھی اسکول کے زمانہ میں بھی حل نہ کیا تھا، اب کیا حل کرتے! بہرحال مشین کی خوبیوں پہ دن بھر گفتگو ہوتی رہی اور وہ سارے خیالی پلاؤ جو ہم نے ایک دو دن پکائے تھے، وہ سب غارت ہوئے۔

سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ فرم کے مینجر کو ٹیلیفون کر کے پُوچھا جائے کہ اگر ہم اس مشین کو ۲ دو حصّوں

میں کرکے دو بار منگوالیں تو کیا فرم کو اعتراض تو نہ ہوگا؟ انہوں نے کہا: ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض نہیں اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ باقی مشین تو ہم لازماً منگوائیں گے ورنہ پہلا حصہ بیکار ہو جائے گا۔ ان کی تو مشین کا آدھا حصہ ہم نہ لیں گے تو وہ کسی دوسری مشین میں فٹ کر دیں گے۔

آج ہم دوبارہ لیٹر فوٹ گئے۔ اس لیے ٹیلکس کا جواب وہاں پہنچنا تھا۔ جب ٹیلکس حاصل کی تو ان کی مصنوعات کو دوبارہ جانچا، کیمرہ کو دوبارہ دیکھا۔ بڑی بڑی جزئیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پروسیسر کو دیکھا جو آٹومیٹک کام کرتا تھا۔ اور یہ چیز پاکستان میں کسی کے پاس نہ تھی۔

اسٹیشنوں پر بڑا اچھا انتظام ہے کہ سامان رکھنے کے لیے اسٹیشنوں پر ہی کرایہ پہ رکھے بکس مل جاتے ہیں۔ رقم ادا کیجئے۔ یعنی رقم ڈبے میں ڈال دیجئے بکس کھل جائے گا۔ چابی مل جائے گی۔ سامان رکھئے اور گھومئے۔ واپسی پر سامان لیجئے اور زندگی کے سفر پر بھاگ گئے۔

اشرف کو آج ہوٹل کے منیجر نے وہ پینٹ دی جو کہ اشرف دو ماہ پہلے ہوٹل میں بھول گیا تھا۔ اشرف کو پینٹ کی دوبارہ واپسی پر خوشی ہوئی۔

آج ہم پھر ڈسل ڈوف گئے۔ آٹومشن کے منیجر کو ٹیلی فون کر دیا۔ جو رقم ہمارے پاس ہو سکتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو آپ کی مشین کی ہے۔ لہٰذا ہم پاکستان میں اپنے ملک سے قرضہ کی بات کرکے آپ سے فیصلہ کریں گے۔ انہوں نے کہا: آل رائٹ۔ ادھر ہمارا ذہن لیفٹ رائٹ ہو گیا۔

ہم نے ترکی کے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ پہلے بھی کھایا تھا، لطف آیا تھا۔ وہ ہمارے ہاں کے آلوؤں کی روٹی کی طرح کی روٹی تھی۔ اس کے ساتھ لسّی کا ایک گلاس لیا، واہ وا، وہ جو ہم ڈرتے سہمتے کھانا کھایا کرتے تھے وہ ڈر سہم نہ تھا۔

ڈسل ڈوف کے ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل ہے، ایک خاتون نے اپنے کُتّے کو وہاں رکھی کرسی کے ساتھ باندھ دیا تاکہ کُتّا بھاگے نہیں۔ غالباً خاتون اسٹیشن کے اندر گاڑی وغیرہ کے ٹائم کا پتا کرنے گئی ہوں گی یا کسی اور ضروری کام سے گئی ہوں گی کہ کُتّا اپنی جگہ سے ہلا اور وہ کُرسی سمیت دوڑنے لگا۔ کرسی لڑھکی جا رہی ہے، کُتّا بھاگا جا رہا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچّے اس منظر پہ ٹھٹھے مار کر ہنس رہے ہیں، مگر کوئی کُتّے کو پکڑ نہیں رہا۔

آج ہم دوبارہ کاون چلے گئے۔ ایک مشین کو دیکھنا تھا۔ وہاں پہنچے۔ جس پریس میں مشین چل رہی تھی مالک وہاں لے گئے۔ مشین اچھا کام کر رہی تھی۔ مگر ہمارا اندازہ یہ تھا کہ وہ مشین زیادہ عرصہ تک اچھا کام نہ کر سکے گی۔

مالک کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ ہم مشین نہ خریدیں گے۔ مگر انہوں نے آدابِ دربار کو نہ چھوڑا۔ وہ

ہمیں واپس اسٹیشن چھوڑ گئے جہاں سے کہ لے کے گئے تھے۔ ہوٹل میں بٹھا کر کافی وغیرہ پلائی۔

یہاں سے ابھی فتح محمد ملک صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ کل ہم ہائیڈل برگ پہنچ رہے ہیں۔ انھوں نے وقت پوچھا۔ ہم نے کہا: ہم خود پہنچ جائیں گے۔ اس کے باوجود ان کا اصرار تھا کہ میں اسٹیشن آپ کو لینے کے لیے پہنچوں گا۔ ہر چند کہ ہم ستانا نہیں چاہتا مگر انھوں نے گاڑی کا وقت پوچھ کر ہی چھوڑا۔

میں جتنے شہروں میں گھوما، پوچھتا رہا: یہاں کوئی مسجد ہے؟ جواب یہی ملتا رہا: نہیں ہے۔ ہر چند کہ میں اپنے ملک میں زیادہ پابندی سے نماز پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ اگر یہاں کوئی مسجد ہو، قریب بھی ہو تو میں وہاں جا کر نماز پڑھوں۔ میں نے سُنا ہے کہ میونخ میں ایک بڑی عظیم الشان مسجد موجود ہے جو پہلے ترکوں نے بنانی شروع کی تھی، جب رقم ختم ہو گئی تو بقایا مسجد کی تعمیر کے لیے شاہ فیصل نے کروڑوں ریال دیئے تھے۔ شاہ فیصل بھی مسلمانوں کے درمیان ایک دردمند شخصیت تھی، جو موجود نہ رہی۔

مجھے یہاں پہنچ کر جو سب سے زیادہ پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں مجھے پاکستان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ یہاں کے اخبار جرمن زبان میں چھپتے ہیں جو ادھر اُدھر کا اخبار انگریزی میں بھی ملتا ہے اس میں بھی پاکستان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ یہ بات مجھے ہر دم پریشان رکھتی ہے۔ کبھی کبھی گھر ٹیلیفون کرتا ہوں، گھر والوں کی خیریت پوچھتا ہوں، ملکی حالات کے بارے میں دریافت کرتا ہوں، یعنی میں اتنا بڑا پاکستانی نہ تھا یا مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں اتنا بڑا ملک پرست ہوں، جتنا کہ باہر نکل کے معلوم ہوا۔

رات اولمپک گیمز دیکھتا رہا۔ کیونکہ ہوٹل میں کھانا پینا اور سونا بنیادی کام ہوتے ہیں۔ اُن میں ہم نے ٹیلیویژن دیکھنے کا اضافہ کر رکھا ہے۔

رات ہم نے دیکھا کہ ہوٹل میں سے کئی افراد جگمگٹوں کی صورت میں نکل رہے ہیں۔ پُوچھنے پر معلوم ہوا کہ فیملیز ہیں، جو اکٹھے ہو کر کہیں ایک جگہ بیٹھ کر گپ شپ کریں گی۔ یہ دن جمعہ کی رات کا تھا۔ معلوم ہوا کہ یورپ جو خاندانی طور اطوار کو خیرباد کہہ چکا ہے، باپ بیٹے کو نہیں ملتا، بیٹا باپ کو نہیں ملتا۔ مگر ابھی یورپ کے کونے کھدروں میں ماضی کی روایات زندہ ہیں۔

جرمن بھی یورپ کی دیکھا دیکھی کافی "مہذّب" بن چکا ہے۔ مگر تہذیب کی وبا زیادہ بڑے شہروں میں ہے، فرینکفرٹ، میونخ اور بون وغیرہ میں!

رات ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا تھا، اب تو سامان اٹھانا اور سُوئے فرینکفرٹ چل دینا ہے۔ مگر جانے سے پہلے ہم مسٹر بلاک سے ملنا چاہتے ہیں جو اُردو ٹائپ کے سلسلے میں کوشاں ہیں۔ یہاں پہنچنے کا مقصد بھی تو یہی تھا!

۱۱ اگست (جمعہ)

ہم ہاگن سے ہائیڈل برگ کے لیے چلے۔ راستے میں رائن دریا ریلوے لائن کی پٹڑی کے ساتھ کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ چلا ہوگا۔ خوب دریا ہے۔ کشتیاں چل رہی ہیں۔ بڑے بڑے سامان بردار جہاز چل رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس دریا کے ذریعہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی سے بڑا بھاری سامان اسی دریا کے ذریعے آتا جاتا ہے۔

یہ دریا اور اس کا منظر بڑا حسین ہے، پیچھے سرسبز پہاڑ ہیں۔ حد درجہ ہریالی کے ساتھ، اونچے نیچے پہاڑوں کے ساتھ، جب ریل چلتی جاتی ہے تو وہ منظر حد درجہ دلکش ہوتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ راستے میں جا بجا پہاڑوں پر قلعے بنے ہوئے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ سو سوا سو سال پہلے یہاں کے لینڈ لارڈ ان قلعوں میں رہتے تھے اور وہ آتے جاتے جہازوں سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور اپنی سرحد میں ان جہازوں کا تحفظ ان کے ذمہ ہوتا۔ وہ قلعے آج بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں کوئی نہیں رہتا۔ البتہ سیّاح آتے جاتے رہتے ہیں۔

ابھی میں ان علاقوں کی خوبصورتی میں ہی غلطاں تھا کہ مجھے خیال آیا کہ یہ مناظر اتنے حسین ہیں کہ آدمی ان میں کھو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ میاں بھی کہیں ادھر ہی رہتے ہوں۔

یہ سوچ رہا تھا کہ ہائیڈل برگ کا اسٹیشن آگیا۔ اسٹیشن پر فتح محمد ملک موجود تھے۔ دیکھ کر خوش ہوئے۔ ٹیکسی میں ان کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں دریائے نیکر آیا جو ہمارے راستے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ وہی دریائے نیکر ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے' جو بانگِ درا میں موجود ہے۔

ملک صاحب کے گھر پہنچے تو وہ یہاں کی بہترین آبادی میں تھا۔ سامنے سرسبز پہاڑ تھے۔ ذرا سے موڑ کے بعد دریائے نیکر تھا۔ ذرا سی بلکہ خاصی چڑھائی پر گھر تھا۔ خوبصورت ماحول میں خوبصورت بنگلہ۔

گھر پہنچے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ صاحب پیپلز پارٹی کے زمانے میں پنجاب کے وزیر زراعت تھے نام ان کا محمد خاں خاکوانی تھا' جو ایم کے خاکوانی لکھتے تھے۔ ملتان کے بڑے زمیندار تھے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھی، جو باسلیقہ تھیں، جو خاکوانی صاحب سے خاصی کم عمر تھیں۔ شاید یہ خاکوانی صاحب کی دوسری تیسری شادی کی علامت تھیں۔

اس دن کھانا خاکوانی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے مل کر پکایا تھا جو بےحد لذیذ تھا۔ ایک زمانہ کے بعد (۲۱، ۲۲ دنوں کا وقفہ زمانہ لگا) اپنا پاکستانی کھانا کھایا تھا گو ہم ہر روز کچھ نہ کچھ کھاتے تھے۔ اس کے باوجود احساس ہوا کہ ہم ۲۲ دنوں سے فاقہ کر رہے تھے کھانا آج ہی کھایا۔

خاکوانی صاحب سے ایک بار بلکہ چند دن پہلے ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے ہاگن سے ملک صاحب کو ٹیلیفون کیا تھا تو خاکوانی صاحب نے اٹھایا تھا اور مجھے خاکوانی صاحب نے بتایا تھا کہ ملک صاحب آج دیر سے

گھر آئیں گے کیونکہ وُہ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے، اگر طفیل صاحب کا ٹیلیفون آئے تو ان کو یہ بتا دیجئے گا۔ میں نے پوچھا تھا آپ کا نام؟ تو انہوں نے کہا تھا' میں ملک صاحب کا دوست ہوں اور ان کے پاس ٹھہرا ہوا ہُوں۔

کھانا کھایا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی جا رہے ہیں، غالباً وہ ہماری آمد کی وجہ سے چلے گئے۔ میں نے کہا بھی کہ نہ جائیے۔ مگر اتنے میں ان کی بیٹی خاکوانی کو لینے آ گئی۔ معلوم ہوا کہ خاکوانی صاحب نے جرمن میں بھی شادی کی تھی جس سے یہ لڑکی ہے جو ترک لڑکے کے ساتھ رہی ہے۔ نام اس کا مسلمانوں والا ہے، غالباً شاہین خاکوانی!

ان کے جانے کے بعد ہم ایسی شادیوں اور اپنے معاشرے کے مطابق' ان کی پریشانیوں پر تبصرہ کرتے رہے۔ یعنی غیرت مند پاکستانی اس وقت بحد پریشان ہو جاتا ہے۔ جب ان کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے قانون کے مطابق ۱۵ سال کے بعد لڑکی اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہے۔ وہ جس کے ساتھ چاہے گھومے پھرے اور رہے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے وقت میں یہاں کے نہ رہنے والوں کی غیرت جاگتی ہے اور وہ بے بس ہوتے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم آج ان کی لڑکی کس کے ساتھ تھی کل کس کے ساتھ ہو گی! یہاں کی اکثریت بغیر شادیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہی ہے۔ چونکہ ایسے حالات میں بچہ ایک پرابلم ہو سکتا ہے، اس لیے سب کچھ ہو رہا ہے بغیر بچے کے! اور ان حالات میں پاکستانی اور ہندوستانی کُڑھ رہے ہیں۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے لوگ نوکریوں کی غرض سے ادھر آتے ہیں وُہ اپنے لیے سہولت اس میں جانتے ہیں کہ کسی ملکی لڑکی سے شادی کر کے یہیں بس جائیں۔ خاندانی اور اچھی لڑکیاں تو ساتھ دیتی نہیں اس لئے جیسی مل گئی شادی کر لی۔

یہاں آ کے مجھے معلوم ہُوا کہ کاغذی شادی بھی ہوتی ہے۔ وُہ یہ کہ کسی ملکی عورت سے یہ معاہدہ کر لیا کہ ہمارا رشتہ میاں بیوی والا نہ ہو گا بلکہ حکومت کو بتلانے کے لیے شادی ہو گی۔ ہم بے شک اکٹھا رہیں گے مگر جسمانی طور پر دُور دُور رہیں گے۔ اس کے عوض اس خاتون کو مقررہ رقم ہر ماہ دی جاتی ہے جو مرد بے چُون و چرا ادا کرتا ہے۔ ورنہ وُہ خاتون اس کی کاغذی بیوی نہ رہے گی اور مرد پھر رہائشی سہولتوں سے محروم ہو جائے گا۔ سُنا ہے کہ ایسی ہزاروں شادیاں ہوتی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد ملک صاحب نے چائے بنائی جو ہم نے بڑے شوق سے پی۔ اس کے بعد بازار کی طرف نکلے۔ جیسے ہمارے ہاں انارکلی بازار ہے۔ کچھ ویسے ہی بازار میں گھومتے رہے۔ جوڑے ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے ہیں۔ مناسب خوش فعلیاں بھی کر رہے ہیں۔ خوب رونق تھی۔ سب کے سب تفریحاً گھوم رہے تھے اور خوش تھے۔

اسی بازار کے ساتھ بغل میں پُرانی یُونیورسٹی ہے، نئی یونیورسٹی تو شہر کے باہر ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی یونیورسٹی کی طرح "انارکلی" کی بغل میں ہے۔ یونیورسٹی لائبریری بھی وہیں ہے جو بہت بڑی ہے۔ کافی رقبہ

مِن ہے، تین منزلہ ہے۔ لاکھوں کتابیں ہوں گی، ضرور ہوں گی۔ یونی ورسٹی میں طلبہ کی تعداد بھی کافی ہے، سترہ ہزار کے قریب !

دریائے نیکر کے کنارے اور سبز سبز پہاڑوں کے دامن میں ملک صاحب نے وہ گھر بھی دکھایا جہاں ڈاکٹر اقبال ۱۹۰۰ء میں آکر رہے تھے۔ جہاں ان کے نام کی تختی لگی ہے۔ میں اس مکان کو دیر تک دیکھتا رہا۔ کیونکہ دریائے نیکر اور اس گھر کا سراغ علامہ کی شاعری اور نثر میں بھی ملتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب علامہ کے خیالات جوان تھے۔ وُہ خود بھی جوان تھے (تحریروں سے)۔ واپس ملک صاحب کے ہاں آکر، میں نے علامہ کی ان یادوں سے وابستہ نظم پڑھی (نظم) اور نثر بھی دیکھی (نثر) اور مجھے علامہ اقبال بہت اچھے لگے۔

راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ ہمارے تین ہاتھوں میں چھتری ایک تھی۔ دو آدمی تو کسی طرح اس سے استفادہ کر سکتے تھے مگر ایک چھتری تین آدمیوں کو تو پناہ نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا ملک صاحب نے چھتری باپ بیٹے کو دے دی اور خود بھیگتے رہے۔ ہم کہتے رہے ہم باری باری بھیگنا چاہتے ہیں مگر ملک صاحب نے ایک نہ سُنی۔

ہم پاکستان سے باہر تھے، مگر دل و دماغ پاکستان میں تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں علم ہو کہ پاکستان ہاکی کے فائنل میں پہنچا کہ نہیں۔ کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ہاگن میں اشرف کو معلوم ہُوا کہ میچ آج رات ۱۰½ بجے کے قریب ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہاگن سے ہائیڈل برگ محض یہ بتانے کے لیے ٹیلیفون کیا کہ میچ آج ہو رہا ہے۔

اتفاق سے ملک صاحب کا ٹیلی ویژن خراب تھا۔ ہم مایوس ہوئے مگر ملک صاحب نے کہا ؛ آپ فکر نہ کریں میچ دیکھیں گے۔ ملک صاحب نے انتظام کیا یا ہماری شدید خواہش کی کرامت کہ باہر گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ حسن صاحب ٹیلی ویژن لے کر آگئے ہیں جو ٹھیک ہوگیا ہے۔ اس وقت ہم اتنے خوش ہوئے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ملک صاحب نے دس بجے کھانا لگا دیا۔ کہنے لگے ؛ پہلے کھانا کھالیں تاکہ اس کے بعد اطمینان سے میچ دیکھا جا سکے۔ معقول تجویز تھی اس پر عمل کیا گیا۔ میچ شروع ہوا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اب گیند گراؤنڈ میں نہیں چل رہا۔ ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اگر گیند ہماری ٹیم کے خلاف خراب مرحلے میں چلا گیا تو ہم پریشان، اگر وہ اچھی پوزیشن میں آگیا تو ہم خوش۔ غرض اس گیند نے ہمیں تقریباً دو گھنٹے اپنے بس میں رکھا۔ پہلا گول مغربی جرمنی کی ٹیم نے کر دیا۔ ہماری پریشانی بڑھی۔ مگر ہماری ٹیم نے زیادہ انتظار نہ کرایا، گول برابر کر دیا۔ جان میں جان آئی۔ ہاف ٹائم ہوگیا۔ ایک ایک گول بورڈ پر لکھا تھا۔

ہاف ٹائم کے بعد، یہاں کے ٹیلی ویژن نے ایک دوسرے میچ کو دکھانا شروع کر دیا جو ہینڈ بال کا میچ تھا وہ جرمنی اور چیکوسلوواکیہ کے درمیان تھا۔ ہمیں اس میچ سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر وہ میچ دکھایا جا رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ پاکستان ٹیلی فون کر کے پُوچھیں کہ پاکستان کیسا جا رہا ہے۔ مگر ہم ایسا نہ کر سکے۔ جب ہینڈ بال

میچ کا ہاف ٹائم ہُوا تو وہ دوبارہ میچ دکھایا گیا۔ مگر آخری وقت تک دونوں ٹیموں کا ایک ایک گول تھا۔ اب ضابطے کے مطابق فیصلہ کن گول کے لیے مزید پندرہ منٹ کا وقت دیا جانا تھا ——— کہ ٹیلیویژن پر دوبارہ ہینڈ بال کا میچ دکھایا جانے لگا۔ جیسے تیسے وہ میچ ختم ہوا، دیکھا تو بورڈ پر اب بھی وہی ایک ایک گول ہے۔ گو میچ شروع تھا مگر ہم دوسرے میچ کی وجہ سے ہاکی کا میچ نہیں دیکھ پائے تھے اس لیے بڑے متردّد تھے۔ جب بورڈ پر ایک ایک گول کا پڑھا تو ڈھارس بندھی۔ مگر اس کے تھوڑی دیر بعد پاکستان نے دوسرا گول کر دیا۔ لطف آگیا، خون بڑھ گیا۔ اس وقت میچ ختم ہونے میں سات آٹھ منٹ باقی تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ وقفہ سات آٹھ منٹ سے بھی پہلے ختم ہو جائے۔ مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ وقت نے تو وقت پر ہی ختم ہونا تھا۔ غرض پاکستان نے میچ جیت لیا۔ دس بارہ سال کے بعد دوبارہ پاکستان چیمپئن بنا۔ بے اندازہ خوشی ہُوئی۔ چونکہ ہم جرمنی میں تھے جرمنی میچ ہار گیا تھا۔ اس لیے ارادہ کر لیا جب آج بازار سے گزریں گے تو ذرا تن کے چلیں گے!

آج جب ہم بازار گئے تھے، خوب چلنے کا ارادہ تھا، خوب دیکھنے کا ارادہ تھا۔ اس پر عمل ہو رہا تھا۔ راستے میں ملک صاحب نے کہا: تازہ دم ہونے کے لیے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں۔ چائے یُوں بھی میرے لیے شوق کا مرحلہ ہے۔ جب تھکاوٹ ہو' اس وقت چائے ملے تو کیا کہنے! چائے نے بے حد مسرور کیا۔ بے حد تر و تازہ کیا۔ معلوم ہُوا ہم جس ہوٹل میں چائے پی رہے ہیں وہ حسن صاحب کا ہے۔ وہ حسن صاحب جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹیلی ویژن دے کے گئے تھے۔ اس وقت ان کے بھائی وہاں موجود تھے، انھوں نے بڑی محبت سے خود چائے بنائی۔

اس وقت وہاں ایک صاحب ملے جو کلکتہ کے رہنے والے تھے، مسٹر چکرورتی، جو ۲۵ سال سے جرمنی میں رہ رہے تھے، خاصے بڑے بزنس مین تھے۔ ٹیلی ویژن کی کئی فرموں کے وُہ ایجنٹ تھے وہ یہاں انجنیرنگ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ فارغ ہو کر واپس ہندوستان پہنچے تو کام کی نوکری نہ ملی، واپس جرمنی آ گئے' جب سے یہاں ٹکے ہُوئے تھے۔ وہ یہاں رہنا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً رہ رہے تھے۔ کہتے تھے اپنے ملک جانا چاہتا ہُوں مگر وہاں رہ کر بھُوکا مرنا نہیں چاہتا۔

ہندوستان کی سیاست پر بات ہوتی رہی، پاکستان کی سیاست پر بات ہوتی رہی، امریکہ کی سیاست پر بات ہوتی رہی۔ مسٹر چکپورتی نے کہا: اپنے ملک کو جمہوری عمل میں ڈالو۔ ہم نے کہا: آپ کا ملک جمہوری ہے مگر وہاں کیا ہو رہا ہے، پنجاب میں کیا ہُوا؟ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ ووٹوں کی اکثریت سے بننے والا وزیر اعلیٰ برطرف کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ جمہوریت ہے تو ہم اس وقت غیر جمہوری دور میں بھی مطمئن ہیں۔ اس لیے جمہوریت کے نام پر ڈکٹیٹر شپ قبول نہیں۔

ملک صاحب نے بتایا مجھے لندن سے بلاوا آیا ہے کہ "پاکستان کا مستقبل کیا؟" کے عنوان سے ایک مضمون

پڑھوں ، مگر آپ کے آنے کی وجہ سے میں نہ جاؤں گا۔ مضمون بھیج دیا ہے کہ کوئی دوسرا پڑھ دے۔ میں نے کہا : ان لوگوں کو پاکستان کی فکر کیا ، اور کیوں ہے؟ یہ برطانیہ کے مستقبل پر مضمون کیوں نہیں پڑھواتے؟ یہ ہندوستان کے مستقبل پر کیوں مضمون نہیں پڑھواتے؟ غرض مجھے غصہ آگیا۔ مگر اس میں قصور اپنوں کا ہے غیروں کا نہیں ، اس لیے کہ ہمارے ہی بھائی باہر جا کر پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اپنی سیاست اپنے ملک میں نہیں لڑتے باہر کے ملکوں میں بیٹھ کر سیاست کھیلتے ہیں۔ مانا کہ یہاں (پاکستان میں) مارشل لاء ہے۔ مگر مقبول سیاست دان مارشل لاء کو ختم بھی کر سکتے ہیں۔ ایوب خاں کے زمانے میں مارشل لاء تھا ، بھٹو نے ختم کر دیا۔ بھٹو کے زمانے میں مارشل لاء لگا ، یا دفعہ ۱۴۴ لگی تو عوام نے اسے ختم کر دیا۔ اب وہاں کے لوگ کیوں وہاں بیٹھ کر ایسا نہیں کر سکتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا اس لیے نہیں کر سکتے کہ کسی لیڈر نے عوام کے لیے آج تک کچھ نہیں کیا۔ لوگ پرانے سیاستدانوں سے مایوس ہیں۔ ان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔ ورنہ کون مارشل لاء کو اتنے سالوں تک برداشت کرتا !

ان حالات میں میں نے ملک صاحب کو کہا : آپ کو خود لندن جا کر خود مضمون پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارے بدخواہ پاکستان کو بدنام کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی طرح راضی ہوئے۔ چونکہ وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے تھے۔ لہٰذا طے پایا کہ وہ لندن جائیں گے مگر ملک صاحب کا ہم سے مطالبہ یہ کہ آپ میرے واپس آنے تک یہیں رہیں گے ، چابی دے جائیں گے ، کھانا پکا پکایا ان کا ایک پاکستانی باورچی بنا کر دے جایا کرے گا۔ لینڈ لارڈ لیڈی گھر کی صفائی کا بندوبست کرے گی۔ غرض ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

ہم نے کہا : آپ اطمینان سے جائیں ہمیں اسٹوٹ گارٹ کام ہے جو ہائیڈل برگ سے ایک سو میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ جب ہو جائے گا تو ہم لندن پہنچیں گے وہیں آپ سے ملاقات ہو گی۔ بس ہمیں لندن کا ایڈریس دے جائیے !

۱۲ اگست (ہفتہ)

ملک صاحب کا بنگلہ بڑا بہار آفریں ہے۔ سامنے سبزے سے لدے پہاڑ نظر آرہے ہیں۔ میں صبح پانچ بجے کا اٹھا ہوا ہوں۔ کھڑکی سے مجھے یہ سارے مناظر نظر آرہے ہیں اور میں قدرت کی تمام فیاضیوں کا صرف اِدھر والوں کا حق سمجھ کر پریشان ہو رہا ہوں۔ اگر حالات ایسے ہوتے یا ہو سکتے کہ اِدھر رہا جا سکتا تو میرا حسن پرستی کا ذوق مجھے ادھر سے ہلنے نہ دیتا۔ مگر مجھے اپنے ہاں کی کڑکتی دھوپ اور گندا مندا ماحول سب قبول ہے۔ سب عزیز ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کو بھی بہت کچھ کرنا چاہیے۔ مگر اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے میں ، ملک کو بہتر بنانے میں جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ کچھ بھی تو نہیں کر رہے۔

دن کافی ہو گیا ہے۔ یعنی آٹھ بجنے والے ہیں ، جاوید بھی خراٹے لے رہا ہے اور ملک صاحب بھی دوسرے

کمرے میں یہی کام کر رہے ہیں۔

جاوید نے کہا، میں اپنے دوست کو ملنے فرینکفرٹ جاتا ہوں۔ میں نے کہا، جائیے، میں تو یہاں ملک صاحب کے ساتھ رہوں گا۔ ناشتا کے بعد جاوید فرینکفرٹ چلا گیا۔ ہم باہر نکلے۔ ملک صاحب گھڑی دیکھ کر گھر سے باہر نکلتے ہیں، کیونکہ یہاں ریلیں اور بسیں وقت پر چلتی ہیں۔ ایک آدھ منٹ کا اِدھر اُدھر ہو تو زیادہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہم جتنی بار بھی باہر نکلے گھڑی دیکھ کر نکلے۔ مگر وہ بسیں اور ٹرینیں ہمیں نہ مل سکیں، بقول ملک صاحب ہم تو گھر سے وقت دیکھ کر نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے پہنچنے سے پہلے ٹرینیں اور بسیں چلی جاتی ہیں۔ ہم جس بس پر سوار ہونے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں اُسے ہم جاتا ہوا تو دیکھتے رہے مگر سوار ہونے کا موقع نہ ملتا رہا۔ بقول ملک صاحب، لو جی بس تو وہ جا رہی ہے۔

آج ہم مقررہ بس کے بعد والی بس پر بیٹھ کر اقبال اوفے (اقبال روڈ) پہنچے۔ اقبال اوفے اس سڑک کا نام ہے، جو نیکر کے کنارے کنارے چل رہی ہے۔ جہاں ایک خوب صورت پارک ہے۔ ہم پارک میں اس طرف سے گئے جو پارک کا شمالی حصہ ہے۔ اونچی سطح پر گھاس کا ایک قطعہ ہے۔ جو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرف سے ہم اقبال اوفے کی طرف چلے۔ راستے میں ایک پرانا درخت ملا جو بڑا خوب صورت تھا۔ اس درخت کی شاخیں سات سات آٹھ آٹھ گز لمبی تھیں جو زمین کی جانب لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے ملک صاحب سے کہا، اس درخت کو بھی اقبال کی آنکھوں نے دیکھا ہوگا۔ درخت کا تنا کافی مضبوط اور گھیر میں بھی زیادہ تھا۔ اس لیے گمان تھا کہ یہ درخت اس وقت بھی موجود ہوگا۔

آگے جا کر ایک بڑے سے پتھر پر علامہ اقبال کی نظم نیکر کے کنارے ایک شام کا جرمن زبان میں ترجمہ ایک بڑے سے پتھر پر کندہ تھا، جو انہوں نے اس پارک میں سجا رکھی تھی۔ وہاں پارک میں بنچیں پڑی ہوئی تھیں، جہاں پتھر لگا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں پارک تھا۔ میں نے پارک کے دائیں بائیں دونوں حصوں میں نظر ڈالی۔ وہ اس خیال سے نظر ڈالی کہ زیادہ دلفریب حصہ کون سا ہے۔ کیونکہ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اقبال نے اس پارک کے کس گوشے پر بیٹھ کر نظم کہی ہوگی۔ مجھے بایاں حصہ زیادہ خوب صورت لگا۔ کیونکہ اس حصے میں دریائے نیکر میں ذرا سا حصہ خشکی کا بھی ہے اور اس خشکی کے حصے میں درخت لگے ہیں جن کا عکس دریا میں نظر آتا ہے۔ ہُوبہو وہ درخت پانی میں بھی نظر آتے ہیں۔ آگے جا کر دریا کا پاٹ پھر ایک ہو جاتا ہے مگر وہ حصہ وہ منظر بڑا اچھا لگا۔

اقبال جرمنی میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۵ء تک رہے۔ ہائیڈل برگ میں دو ماہ کے قریب، اور یہاں پر دو یادگاریں اقبال کی موجود ہیں۔ یہ جرمنی کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہمارے ملی مفکر کو یوں بھی اعزاز بخشا۔ ہم تو اپنے ملک میں جہاں جہاں اقبال رہے اُن یادگاروں کو محفوظ نہ کر سکے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم نہیں وہ بھاٹی دروازے میں کہاں رہے؟ وہ انارکلی میں کہاں رہے۔

میں نے راستے میں ملک صاحب سے پوچھا، انا میری شمل بھی یہاں ہے۔ اس سے آپ ملے؟ کہنے لگے،

میں نے یہاں پہنچ کر انہیں خط لکھا تھا کہ میں یہاں ہوں۔ کسی وقت آپ سے ملنے آؤں گا۔ بہت دنوں کے بعد جواب آیا: میں جرمنی میں موجود نہ تھی اس لیے جلد جواب نہ دے سکی۔ آپ مجھے بہ طورِ خاص ملنے نہ آئیں البتہ آپ کا جب کبھی بون (جرمنی کا دار الحکومت) آنا ہو تو مجھے پاکستانی سفارت خانہ سے ٹیلی فون کیجئے گا، تب ملاقات ہو سکے گی۔

میں نے پُوچھا: اس نے ایسا کیوں لکھا؟

ملک صاحب نے کہا: اس نے سوچا ہو گا کہ میں جب بھی ادھر جاؤں گا مجھے اپنے سفارت خانے میں کوئی کام ہو گا تو جاؤں گا۔ لہٰذا اس نے لکھا کہ سفارت خانے سے ٹیلیفون کیجئے گا۔

ہاگن سے ہائیڈل برگ آتے ہوئے راستے میں بون کا اسٹیشن پڑا۔ ہم اس کے اندر تو داخل نہ ہوئے مگر چلتی گاڑی سے دیکھتے رہے کہ بلڈنگوں پر بڑے بڑے تجارتی بورڈ لگے ہیں جو اس شہر کی مرکزیت کو ظاہر کرتے تھے۔

آج تین بجے ملک صاحب کی ایک شاگردہ نے (جو اسلام آباد میں ان کی طالب علم تھی) آنا تھا، جس کی اس نے ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی اس لیے ہم گھر کی طرف پلٹے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگئیں۔ اُن کے ساتھ ان کا بھائی اور جرمن بیوی بھی تھی۔ کافی پی گئی۔ باتیں ہوتی رہیں۔ شاگردہ کا نام شاہدہ تھا، بھائی کا نام شاہد، جرمن بیوی تو جرمن تھی۔

جرمنی بیوی سے ایک دو سال کی بچی تھی۔ میاں بیوی پاکستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

بیوی پریشان تھی، وہ کہتی تھی: میں بچی کے لیے کون کون سی دوائیں لے کر جاؤں، وہاں کیا بیماریاں عام ہوتی ہیں! میں کن کن سے انجکشن لگوا کے جاؤں کہ مجھے وہاں پریشانی نہ ہو۔ پھر وہ اس بات سے بھی پریشان تھی۔ اللہ جانے وہاں کوئی اچھا ڈاکٹر ملے گا یا نہیں! غرض وہ ہمارے ملک کو انتہائی پسماندہ اور نہایت جاہلوں کا ملک سمجھ کر جا رہی تھی۔

ہم نے اسے بتایا: بے دھڑک ہو کر جائیے، وہ ملک بے شک ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، ابھی اس نے یورپ کے مقابلے میں قدم نہیں رکھا، مگر وہ اپنے اندر بڑی بڑی قابل ہستیوں کو جنم دیتا ہے، جو باہر کے ملکوں کے مقابلے میں ہیٹے نہیں۔ مگر وسائل کی کمی کی وجہ سے ہم ابھی پیچھے ہیں۔ مگر ہم دن بہ دن ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہیں۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر بھی ملیں گے، بڑے بڑے انجینئر بھی، بڑے بڑے فلاسفر بھی!

رات میں نے ٹیلیفون کر کے پاکستان میں اپنے بچوں کی خیریت دریافت کی۔ اِدھر سے ٹیلیفون اتنی جلدی مل جاتا ہے جیسے ہم نے پاکستان میں کہیں ٹیلیفون کیا ہو۔ مگر اُدھر سے باہر کے ملکوں میں ٹیلی فون کرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے گھنٹوں میں بھی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ کیا جرمن ماں اپنی بچی کے بارے میں صحیح طور پر مشوش تھی؟ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں حق ادا نہیں کر رہے۔ ہم ملک کو بنانے کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی نہیں لگا رہے!

آج ہمارے پاس وقت تھا اس لیے ملک صاحب نے کہا: آج ہم جرمنی کا دیہاتی حصّہ دیکھتے ہیں، جو ان کے گھر سے تھوڑی دُور جا کر شروع ہو جاتا ہے۔ شہر بھی دیکھنے والے ہیں۔ دیہات بھی خوب ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مکان، نیچے بھی مکان، چڑھائیوں پر بھی مکان، غرض دُور سے دیکھنے میں ایک تصویر سے لگتے تھے۔ بڑی بڑی سڑکیں۔ انہوں نے تو پہاڑوں پر بھی سڑکیں پہنچا دیں۔ جبھی پہاڑ سکونتی طور پر بھی آرام دہ بن گئے۔ پہاڑوں پر کھیتی باڑی بھی ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطعات سے بھی انہوں نے کام لیا اور گُل و گلزار بنا دیا۔ گل و گلزار کا لفظ میں نے صحیح استعمال کیا ہے، ہر طرف پھُول، ہر طرف سبزہ، ہر طرف دلکش نظارے، بس دیکھتے جائیے!

بہت دنوں سے دال بھات کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ ہر چند کہ میں دُوسروں سے فرمائشیں کرنے کا بہت کم عادی ہُوں اس کے باوجود میں نے ملک صاحب سے یہ بات کہہ ہی دی۔ وہ مجھے لے کر ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں گئے۔ جرمن خاتون آرڈر لینے کے لیے آئیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ہوٹل ایک پاکستانی کا ہے اور یہ خاتون ان کی بیگم ہیں۔ باوقار خاتون تھیں۔

ہم نے آرڈر دے دیا۔ پہلے ایک دوسری جرمن خاتون آئیں وُہ میز پر چمچے اور کانٹے رکھ گئیں۔ پھر ایک صاحب آئے وہ مشروبات لائے۔ دوبارہ وہ خاتون تشریف لائیں جو پہلے چمچے اور کانٹے رکھ گئی تھیں۔ اب ان کے ہاتھ میں پلیٹیں تھیں جو انہوں نے ٹشو پیپر سے پکڑ رکھی تھیں، انہوں نے اپنی زبان میں کہا: پلیٹیں گرم ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے گا!

ہم لوگ تو پلیٹوں کو ادھر اُدھر سرکانے کے عادی ہیں۔ کیونکہ پنجابیوں کے ہاتھ چلتے رہتے ہیں۔ اس لیے بے دھیانی میں میں نے پلیٹ کو سرکانے کے لیے ہاتھ لگا دیا، پلیٹ تو انگارہ بنی ہوئی تھی، انگلیاں جل گئیں، بُری طرح جلیں۔ مگر اس میں کسی دوسرے کا قصور نہ تھا۔ ہوٹل والے پلیٹیں اس لیے اتنی گرم کرتے ہیں کہ ایک تو کھانا ٹھنڈا نہ ہو، دوسرے جراثیم وغیرہ کا تدارک ہو۔ دو آدمیوں نے دال چاول کھائے تھے۔ بِل ۱۵ روپے ادا کیا تھا۔ اگر ہم چپاتی کھاتے تو فی چپاتی دس روپے ادا کرتے۔ باہر کی دنیا بہت مہنگی ہے، بہت مہنگی ہے۔ ہوٹل میں یومیہ رہائش کے ۵۰۰ روپوں سے بھی زیادہ ادا کرنے ہوتے ہیں۔

جب ہوٹل سے کھانا کھا کر واپس آ رہے تھے تو اولڈ یونیورسٹی کے پاس جو کھُلی جگہ ہے اس میں موسیقار گانا سنا رہے تھے۔ جب ہم پہنچے تو وُہ اپنا پہلا گانا ختم کر کے دوسرے کی تیاری کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دُھنیں چھیڑیں۔ سو سوا سو آدمی گانا سُننے کے لیے کھڑے ہُوئے تھے، کچھ جیالے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب گانا شروع ہُوا تو زمین پر بیٹھی ہُوئی ایک لڑکی اٹھی، وہ ساز کی دُھنوں پر تھرکنے لگی۔ یورپ میں ڈانس کا ایک خاص انداز ہے۔ لہٰذا وہ لڑکی پُوری طرح سازوں کا ساتھ دیتی رہی۔ خوب گانے ہوئے، خوب ڈانس ہُوئے۔ وہ لڑکی جو سازوں کی دُھنوں پر ڈانس کر رہی تھی وہ سُوٹا لگائے ہوئے تھی، اپنے آپ میں نہ تھی۔ لہٰذا وہ منٹو کا

کردار بن گئی۔ فحش حرکتوں کے ساتھ ڈانس کرتی رہی۔ تماش بینوں کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ مغربی تہذیب ان میں غرق ہوتی رہی۔

۱۳ اگست (اتوار)

فتح محمد ملک صاحب کا گھر کافی اونچائی پر ہے۔ اس شہر کا حُسن اونچائیوں اور اترائیوں میں ہے۔ پہلے دن جب ان کے ہاں پہنچا تو جو میرا حال تھا وہ کسی کا نہ ہو۔ ملک صاحب اس اونچائی کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ گھما گھم چلتے رہے۔ میں بھی تیزی سے چڑھنے لگا، مگر وہ اونچائی کئی سو گز کی تھی جس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ لہذا کوئی دو منزلہ چڑھائی چڑھنے کے بعد میرا سانس پھُولنے لگا۔ عین اس وقت جب سانس اکھڑنے کا مرحلہ درپیش تھا، میں نے بمشکل تمام یہ الفاظ ادا کیے: ملک صاحب آہستہ چلیئے۔

ملک صاحب نے بتایا: میں بچپن سے تیز چلنے کا عادی ہُوں۔ اسکول گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا صبح اسکول جاتے ہوئے اس لیے تیز چلتا کہ اسکول سے دیر نہ ہو جائے، واپسی پر اس لیے تیز چلتا تھا کہ بھوک لگی ہوتی تھی۔

بہرحال اب میں اس چڑھائی پر چڑھ اور اُتر جاتا ہُوں اور زیادہ حالت خراب نہیں ہوتی کیونکہ آہستہ آہستہ چلتا ہُوں اور اونچائی کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ نسخہ کارگر ثابت ہُوا۔ ورنہ میرا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ اس چڑھائی سے یہ بہتر ہو گا کہ کسی ہوٹل کا رُخ کیا جائے۔

ہم نے ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کی دونوں یادگار جگہیں دیکھ لی تھیں۔ مگر آج خیال آیا کہ ان جگہوں کے، اپنی موجودگی کے ساتھ فوٹو لیے جائیں۔ چنانچہ کیمرہ لے کر گھر سے نکلے۔ پہلے ہم ایک ہوٹل گئے۔ کیونکہ ملک صاحب کہتے تھے کہ یہاں عبدالرشید نام کا ایک باورچی ہے جو مجھے چھٹی کے دن ہفتہ بھر کے لیے کھانے تیار کر دیتا ہے۔ آج اس کی چھٹی ہے لہذا اسے لے کر گھر چلتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں خرید لیں تاکہ باورچی پکا دے۔ اس کے بعد فوٹوگرافی ہوگی۔ یُوں بعد فراغت عبدالرشید ہماری فوٹو لیتا رہے گا۔

عبدالرشید نے چائے کا پُوچھا۔ ہم نے کہا: بس ہمارے ساتھ چلیے۔ پہلے خورد و نوش کا سامان خریدا، پھر گھر کی طرف چلے تاکہ چند ایک کھانے تیار ہو جائیں۔ ملک صاحب کو فکر یہ تھا کہ میں تو مضمون پڑھنے کے لیے لندن جا رہا ہُوں، گھر میں پکا پکایا موجود ہو گا تو ہم کچھ کھا لیا کریں گے۔ غرض باورچی نے دو گھنٹے میں کئی سالن بنا کے رکھ دیئے۔ چنانچہ ہم دوپہر کا کھانا کھا کے باہر نکلے تاکہ کیمرے کی آنکھ میں علامہ کی یادگاروں کو محفوظ کر لیا جائے۔ دونوں جگہوں کی تصویریں اتاری گئیں۔ یہ دونوں یادگاریں دریائے نیکر کے ذرا سے فاصلے پر آمنے سامنے ہیں لہذا پہلی تصویر اتارنے کے بعد دُوسری کے لیے دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ آج دھوپ نکلی ہُوئی تھی

ورنہ بادل چھائے رہے۔ بارشیں ہوتی رہیں۔ اس لیے یہاں کے لوگ اداس اور پریشان تھے۔ چنانچہ وُہ آج دریائے نیکر کے کنارے پہنچے ہُوئے تھے۔ ہم لوگ غصّے میں ہوں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ دھوپ نکلے تو یورپ کے لوگ جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا متعدد جوڑے اسی حالت میں دریا کے کنارے پڑے ہوتے تھے۔ جب علّامہ اِدھر آئے ہوں گے، آج سے تقریباً اسّی سال پہلے، اُن دنوں نظارے کیا کچھ ہوں گے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

وہاں سے نکلے تو میں نے ملک صاحب سے کہا: کاسل دیکھ لیا جائے تو مزا آ جائے۔ انہوں نے کہا: یہ کیا مشکل ہے! ٹیکسی پکڑی، وہاں پہنچ گئے۔ ہر ملک کے سیّاح وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ہزاروں آدمی، سبھی کے ہاتھوں میں کیمرے۔ کسی زمانے میں وُہ قلعہ بڑا مضبوط ہوگا۔ طرح طرح سے محفوظ رہنے کے حیلے سوچ کر قلعہ بنایا گیا تھا۔ مثلاً ایک دروازے میں اوپر کی طرف بڑے بڑے نوکیلے لوہے کے گارڈر موجود تھے جو دشمن سے بچنے کے لیے لگائے ہوں گے کہ دشمن پہنچے تو کسی پھرکی کے ساتھ نیچے کر دیئے جائیں تاکہ وہ دروازہ عبور نہ کر سکیں۔ کہیں قلعہ کے اردگرد گہری کھائیاں تھیں تاکہ حملہ آور بادشاہ سلامت تک نہ پہنچ سکیں۔ کہیں سُرنگیں تھیں کہ دشمن کسی طرح قلعہ کے اندر گھس آئے تو باہر سرنگوں کے ذریعہ بھاگا جا سکے۔

قلعہ کئی جگہوں سے مسمار ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں فرانسیسیوں نے جب حملہ کیا تھا تو اس وقت قلعہ کے یہ حصّے مسمار ہو گئے تھے جنہیں جُوں کا تُوں رکھا ہُوا ہے۔ سامنے کے حصّے پر کئی بادشاہوں اور جرنیلوں کی تصویریں بنی ہُوئی ہیں جو سولھویں سترھویں صدی میں بنائی گئی ہوں گی۔ وہ تصویریں پتھر کاٹ کاٹ کے بنائی ہوئی ہیں اور بہترین سنگ تراشی کی مظہر ہیں۔ آدمی دیکھے تو گھنٹوں دیکھتا رہ جائے۔ پچھلے حصّے پر شیروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ہم نے گنیں تو وہ نو شیروں کی تصویریں تھیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آرائشی طور پر بنائی ہوئی ہیں۔ مگر ان نو شیروں کی تصویروں میں کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔ غرض اس ٹوٹے پھوٹے قلعے کی دھڑا دھڑ تصویریں کھنچ رہی تھیں۔ جو حصہ محفوظ رہا وہ آج بھی طرزِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

اس قلعہ میں ذرا نیچے جا کر ایک بڑا سا لکڑی کا مٹکا رکھا ہوا ہے، کوئی کمرے برابر مٹکا، جو پرانے وقت کی یادگار ہے۔ کہتے ہیں کہ خراج جو کچھ وصول ہوتا ہوگا، وہ ہوتا ہوگا۔ اس مٹکے کو اس لیے بنایا گیا تھا کہ خراج کے طور پر جو شراب حاصل ہوتی تھی اسے اس مٹکے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

میں اس قلعہ کو نہ دیکھتا تو مجھے افسوس ہوتا۔ میں دریائے نیکر پر بنا ہُوا وُہ پل نہ دیکھتا جہاں سے فرانسیسیوں نے قلعہ پر گولہ باری کی تھی تو بھی مجھے افسوس ہوتا۔ صدیوں پرانی بات ہے۔ مگر جرمنوں نے اس واقعہ کو یاد کے طور پر آج بھی زندہ رکھا ہے۔ وہ یُوں کہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کی شام کو موجودہ پُل پر آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، جو دُور دُور سے دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ رسم ایک عرصہ سے چلی آ رہی ہے جو جاری رہے گی اور سیاحوں کی

دلچسپی کا باعث رہے گی۔

قلعہ پہاڑ پر بنا ہوا ہے جو کافی اونچائی پر ہے۔ واپسی کا مرحلہ سامنے آیا تو ٹیکسی کا ملنا محال تھا۔ چنانچہ طے ہوا کہ قلعہ کے ساتھ سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں جو ہمیں نیچے پہنچا دیں گی۔ یہ معاملہ چونکہ اترائی کا تھا اس لیے سب سیڑھیوں کے راستے نیچے اترنے پر راضی ہو گئے۔ اس کے باوجود تھکاوٹ کافی ہو گئی۔ نیچے اترے تو ساتھ میونسپل کمیٹی کے سامنے میدان میں مختلف ہوٹلوں نے بڑی چھتریوں کے نیچے میزیں سجا رکھی تھیں۔ سفید رنگ کی چھتریاں تھیں۔ براؤن رنگ کی چھتریاں تھیں۔ پیلے رنگ کی چھتریاں تھیں۔ معلوم ہوا کہ میونسپلٹی نے بجائے اس کے کہ کسی ایک ہوٹل کے مالک کو ٹھیکہ دیا جاتا انہوں نے مختلف ہوٹلوں کو ٹھیکہ دیا۔ چھتریوں کے یہ مختلف سائز مختلف ہوٹلوں کی پہچان کا کام دیتے ہیں۔

بے حد تھکے ہوئے تھے جب ملک صاحب نے کہا: یہاں بیٹھتے ہیں، کافی پیتے ہیں تاکہ تھکاوٹ اترے۔ یہ کلمے ملک صاحب کی زبان سے نکلے تو ملک صاحب پہلے سے بھی زیادہ پیارے لگنے لگے۔ جب ہم ان چھتریوں کی طرف بڑھ رہے تھے تو ایک ہپی ٹائپ کا آدمی ہماری طرف آیا۔ اس نے اردو میں کہا: پاکستان سے آیا؟ ہم نے جواب میں کہا: ہاں! پھر اس کا سوال تھا: سیر کرنے آیا؟ ملک صاحب نے کہا: نوکری کرنے آیا۔ پھر ہماری طرف اشارہ کر کے کہا: یہ لوگ سیر کی غرض سے آئے ہیں۔ اس نے پھر پوچھا: لاہور سے آیا؟ ملک صاحب نے کہا: میں راولپنڈی سے آیا ہوں۔ پھر اس نے راولپنڈی سے متعلق اپنی یادوں کو تازہ کیا۔ وہ ہمارے علاقوں میں گھوما پھرا تھا، اردو ٹھیک ٹھاک بول لیتا تھا۔ ملک صاحب نے پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟ جواب میں اس نے کہا: فرانس کا۔ پھر وہ گویا ہوا: ہم ملنگ ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مرید ہیں، دمادم مست قلندر!!

ملک صاحب نے بتایا کہ جرمن زبان بھی اردو زبان کی طرح ہے۔ جب مارٹن لوتھر نے بائبل کا ترجمہ کرنا چاہا تو اس نے سوچا کہ مجھے آس پاس کی زبانوں کی روشنی میں اور آسان زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ سب کی سمجھ میں آ جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی زمانے میں ایسی کوشش قرآن مجید کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نے کی۔ زمانہ بھی کم و بیش ایک ہی ہے۔ یہ دو زبانیں مقدس کتابوں کو عام فہم زبان میں لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں وجود میں آئیں۔

میں نے کہا: ملک صاحب! آج ہمیں پھر ایک مجدد الف ثانیؒ کی ضرورت ہے جو شہنشاہِ اکبر کی طرح ہمارے حکمرانوں کو بھی متنبہ کر سکے۔ میں نے یہ بھی کہا: اگر مجدد الف ثانی کے خطوط، جو انہوں نے بادشاہوں کے نام لکھے تھے ضروری حواشی کے ساتھ چھاپ دیے جائیں تو ہمارے سربراہوں کے حق میں بھی مفید ہو گا اور ملک کے لیے بھی۔ ملک صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا اور انہوں نے بتایا: میں بھی اس موضوع پر یہ کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ یوں میرا اور ملک صاحب کا مکالمہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ انہوں نے دوسرے دن صبح لندن

جانا تھا۔ میرے لیے سو جانا ضروری تھا کیونکہ ملک صاحب نے تھکا دیا تھا۔

۱۴ اگست (پیر)

آج چودہ اگست ہے، میرا یومِ پیدائش۔ آج میں اکسٹھ سال کا ہو گیا۔ میری زندگی نے سارے دَور دیکھے، مفلوک الحالی کے بھی فارغ البالی کے بھی۔ مجھے قدرت نے وہ عزّت دی کہ میں اس کے قابل نہ تھا۔

میں آج سے چودہ برس پہلے بھی اُدھر گیا تھا۔ وہ عمر ایسی تھی کہ وہاں کے لڑکے لڑکیوں کی حرکتیں دیکھ کر "ونس مور" کہنے کو جی چاہتا تھا۔ اب جس عمر میں گیا، وہاں ویسی ہی حرکتوں کو دیکھ کر ابکائیاں آنے لگیں۔ یہ فرق اُن کی کارکردگی کا نہیں، میری عمر کا ہو سکتا ہے۔

جب سے میں نے سیرت پر کام شروع کیا ہے میں بدل گیا۔ جوان دل کے اندر ایک بوڑھا آدمی آ کے بیٹھ گیا ہے۔

یہاں پہ میں نے درختوں کی بے شمار قسمیں دیکھیں، اسی طرح پھولوں کی۔ چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لے کر بہت بڑے بڑے پھولوں تک، ہر درخت جُدا، ہر پھول جُدا، پھر درخت تو سبز رنگ کے ہوتے ہی ہیں۔ مگر میں نے سبز رنگوں میں بھی متعدد سبز رنگ دیکھے۔ سبز، گہرے سبز، ہلکے سبز، دُھلے دھلائے پتّے، اتنے دُھلے ہُوئے کہ گمان ہوتا تھا پتّوں پر پالش کی گئی ہو۔ قدرت کی ان فیاضیوں پر جی بھر کے خوش ہونے کو جی چاہتا ہے۔ پھر یہاں کے لوگوں کو بھی حُسن و جمال بخشا ہے۔ اُنھوں نے جگہ جگہ پھول لگا رکھے ہیں، سڑکوں کے کنارے، مکانوں کی بالکونیوں اور کھڑکیوں میں، گھروں کے باغیچوں میں، خوب صورت درختوں کی جلو میں، خوب صورت پھول دیکھیے اور دیکھتے رہ جائیے!

صبح پرندوں کی آوازیں یہاں بھی سُنائی دیتی ہیں، وہی مدھر آوازیں جو اپنے ملک میں سنائی دیتی ہیں۔ مگر علی الصبح چڑیوں کے غولوں کے غولوں کی آوازیں یہاں سنائی نہ دیں۔ شاید مجھے اس کا موقع نہ ملا، یا یہاں آدمیوں کی طرح چڑیاں بھی کم ہیں۔ آدمیوں کی کم آبادی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں متعدد جوڑے بغیر شادی کیے رہ رہے ہیں۔ یوں وہ بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتے۔ آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ابتدائی نوجوانی کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لڑکیاں آٹھ آٹھ دس دس لڑکوں سے بیک وقت اپنے دن اور راتیں گزارتی ہیں۔ اسی طرح لڑکے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ لڑکی متعدد دوستوں میں سے شادی کے لیے کسی ایک دوست کا انتخاب کر سکے۔ اسی طرح لڑکے متعدد لڑکیوں کے ساتھ گھوم پھر اور سو سلا کے دیکھ سکے کہ کون سی لڑکی مناسب ہوگی! یوں پرچول پرکھ میں آدھی سے زیادہ زندگی بتا دی جاتی ہے۔

کل ہم ہائیڈل برگ یونیورسٹی دیکھنے گئے تھے جو نئی تعمیر شدہ ہے، خاصے وسیع رقبے پر ہے۔ نئے طرزِ تعمیر

کی عکاسی کرتی ہے۔ مختلف ڈیپارٹمنٹوں کے الگ الگ بلاک ہیں۔ ملک صاحب کے ڈیپارٹمنٹ کا نمبر ۲۳۰ ہے۔ ہر ڈیپارٹمنٹ کو نمبر الاٹ ہیں۔ ہم ان کے کمرے میں پہنچے، تھوڑی دیر بیٹھے۔ ہر ڈیپارٹمنٹ کی الگ الگ لائبریری ہے، جو اسی بلاک میں ہوتی ہے۔ یوں موضوعاتی کتابوں کا ملنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں اخبار، رسالے اور کتابیں سبھی کچھ ہوتا ہے۔ وہیں میزیں اور کرسیاں رکھی ہیں۔ کتاب لیجئے، مطالعہ کیجئے اور کتاب پھر اپنے شعبہ میں واپس کر دیجئے۔ اسی بلاک میں مشینیں رکھی ہیں، جن میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہیں۔ پیسے ڈالیے اپنے مطلب کی چیز نکالئے، کھائیے پیجئے۔ پھر وہیں چیزیں گرم کرنے کے لیے چولھے رکھے ہیں جو چیز گرم کرنا ہو گرم کر لیجئے۔ خود کوئی چیز بنانا ہو وہ بنا لیجئے۔ غرض انہوں نے جملہ بنیادی سہولتیں بہم پہنچا رکھی ہیں۔ کھائیے، پیجئے اور پڑھئے۔

میں نے دیکھا وہاں دو تین عورتوں کے ساتھ بچے بھی تھے۔ میں نے ملک صاحب سے پُوچھا: یہ ننھے ننھے سے بچے کہاں، کیوں؟ بتایا گیا: یہ اُن ماؤں کے بچے ہیں جو یہاں پڑھنے آتی ہیں۔ مائیں پڑھتی رہتی ہیں۔ بچے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ بچے روتے ہیں تو مائیں کلاس روم سے بچے کو لے کر باہر چلی جاتی ہیں۔ بچوں کو کلاس میں لانا ضابطے کے خلاف نہیں ہے، اس کی اجازت ہے۔ غرض جو پڑھنا چاہے اس کی راہ میں کسی مجبوری کو حائل نہیں ہونے دیا جاتا۔

یہاں اردو ڈیپارٹمنٹ میں جامعہ ملیہ دہلی کے زیدی صاحب ہیں۔ وہ دو بار جرمن بیوی کے ساتھ میرے دفتر میں آئے تھے۔ اس لیے میں نے کہا: انھیں بھی سلام کر لوں۔ ملک صاحب کا کمرہ اوپر ہے زیدی صاحب کا نیچے۔ جب ہم زیدی صاحب کے کمرے تک پہنچے تو اسے بند پایا کیونکہ آج کل یونیورسٹی میں چھٹیاں ہیں۔ اساتذہ لکھنے پڑھنے یا اپنی ڈاک دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس خیال سے ہم زیدی صاحب کے کمرے تک گئے تھے۔

جب زیدی صاحب لاہور گئے تھے تو وہ نقوش کے موجودہ تمام نمبر یونیورسٹی کے لیے خرید لائے تھے۔ ملک صاحب نے کہا: اُن رسالوں پر دستخط کر دیجئے تاکہ وہ اس حوالے سے بھی کہ مدیر نے ہائیڈل برگ پہنچ کر دستخط کیے تھے یادگار رہیں۔

زیدی صاحب نے اپنی جرمن بیوی کو خاصی اردو سکھا رکھی تھی وہ ٹھیک ٹھاک انداز میں بول لیتی تھیں، پڑھ لیتی تھیں۔ لاہور ہی میں زیدی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی بیوی اردو کے نمائندہ افسانوں کا جرمن زبان میں ترجمہ کرنا چاہتی ہیں۔ وہ مجھے ملتیں یا ملتے تو میں پُوچھتا: اس منصوبے کا کیا ہوا؟

کل ہم پرنٹنگ مشین بنانے والی مشہور فرم ملر گئے جو یہاں سے ۱½ گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ یعنی سو کلومیٹر کے اندر۔ اسٹیشن پہنچ کر سیلز منیجر کو ٹیلیفون کیا تھا وہ ہمیں اسٹیشن لینے آ گئے۔ کارخانہ دیکھا، جو بہت بڑا تھا، بیک وقت پچاس ساٹھ مشینوں کے پُرزے بن رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ ان کے کارخانے دیگر شہروں میں بھی ہیں۔ ہر کارخانے میں مخصوص پُرزے بنتے ہیں۔ جو پُرزے یہاں بن رہے ہیں وہ دوسرے کارخانے

میں نہیں بن رہے۔ اس طرح کام بانٹا ہُوا ہے۔ بہرحال جو کچھ اس کارخانے میں بن رہا تھا عقل دنگ تھی۔ ہر کام مشین کر رہی ہے۔ مشین نے خود ہی ایک کے بعد (مقررہ وقت پر) دوسرا کام شروع کر دینا ہے۔

اس فرم کی کارکردگی کا یُوں اندازہ کیجئے کہ ہر سال سوا سو سے زاید مشینیں بناتی ہے۔ کم سے کم قیمت والی مشین نو لاکھ کی ہے اور زیادہ سے زیادہ قیمت والی مشین ۳۲ لاکھ کی۔ فرم کا دھیان نو لاکھ والی مشین کی طرف کم سے کم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ۲۰ لاکھ، ۳۰ لاکھ کی مشینوں کی طرف ہے۔ کیونکہ مانگ ان کی ہے۔ بیک وقت ۴، ۵ رنگ چھاپ دیتی ہیں۔

وہاں سے واپس ٹھکانا پہ پہنچے تو پروگرام کے مطابق ملک صاحب لندن جا چکے تھے۔ اب ہمیں ہاگن سے اشرف کا انتظار تھا جس نے آج رات نو بجے کے قریب پہنچنا تھا۔ یہاں نو بجے کے ساتھ رات کا لفظ مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ رات دس بجے سے شروع ہوتی ہے اس لیے ہم نو بجے شام کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ اشرف مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔ ملک صاحب ایک پاکستانی باورچی سے کئی دن کا کھانا پکوا گئے تھے جسے ہم نے فریج سے نکال کر گرم کیا اور کھایا۔ چونکہ یہاں سب کو اپنا کام ختم کرنا پڑتا ہے اس لیے آج میں نے چائے کی پیالیاں وغیرہ خود دھوئیں اور اپنی جگہ پر رکھیں۔ زندگی میں یہ کام دوسری بار کیا۔ پہلے ایک بار پاکستان میں مذاق کے طور پر برتن مانجھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ یُوں کہ مجھے معلوم ہُوا کہ میری ساس اور سُسر آ رہے ہیں تو میں بیگم کے ساتھ برتن دھونے لگ گیا تھا۔ میرے سُسر نے دیکھا تو وہ حیران ہُوئے۔ پوچھا؛ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے جواب میں کہا تھا؛ آپ نے مجھے برتن دھوتے آج دیکھا ہے میں تو یہ کام اکثر کرتا ہُوں۔ جس پر میرے سُسر سنجیدہ ہو کر میری بیوی پر برس پڑے تھے اور ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

یہاں لوگوں کی صحتیں اچھی ہیں، عمریں بھی بڑی بڑی ہیں۔ اکثر اسّی نوّے سال کے بُوڑھے عام دیکھے گئے۔ جو زندگی میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ صرف نوجوان جوڑوں کا راج ہے بلکہ بوڑھے جوڑے بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے نکلتے ہیں۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی خوب بن سنور کے نکلتی ہیں بلکہ بُوڑھی عورتیں زیادہ بن سنور کے نکلتی ہیں۔ زیادہ ٹھکانے کا لباس پہنتی ہیں۔

آدمی جدھر نکل جائے سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ میدانوں کی طرح پہاڑوں پر بھی کھیتیاں اُگا رکھی ہیں۔ غرض چپہ چپہ زمین اور چپہ چپہ پہاڑ سے کھیتی باڑی کا کام لیا جا رہا ہے۔ پھر یہ کام بغیر کسی سلیقہ کے نہیں ہوتا، ایک منصوبہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر درخت اُگے ہیں تو ایک ترتیب کے ساتھ، بیلیں اُگی ہیں تو ایک ترتیب کے ساتھ، قطار اندر قطار، وہ ایسا دانستہ کرتے ہیں کیونکہ انھیں مشین کے ذریعہ کھیتوں کو پانی دینا ہوتا ہے اور وہ مشینیں سیدھی چلتی ہُوئی دائیں بائیں پانی پھینکتی ہیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ ہماری طرح نہیں ہے کہ بارش ہو گئی تو کھیتیاں ہری بھری ورنہ قحط، یہاں انہوں نے خود سارے انتظام کر رکھے ہیں۔

بے شک یہاں سردی پڑنے کی وجہ سے لکڑی کا استعمال بھی زیادہ ہے۔ چھتوں پر نیچے فرشوں کے اوپر لکڑی کی چھت ڈالی ہوئی ہے تاکہ وہ براہِ راست سردی کو روکے۔ مگر یہاں لکڑی بھی وافر مقدار میں نظر آتی ہے۔ شہروں سے باہر نکلیے تو جنگلوں کے جنگل آباد، اتنی لکڑی اتنی لکڑی کہ جیسے اتنی لکڑی کی ضرورت نہ ہو۔

ہاگن سے ہائیڈل برگ آتے ہوئے راستے میں ایک قبرستان نظر پڑا تھا۔ وہ ایسا قبرستان تھا کہ ہمارے ہاں کے گلستان بھی ایسے نہ ہوں گے۔ ہر طرف پھول ہی پھول، بیچ میں قبریں، قبریں بھی ایک نظام کے تحت بنی ہوئیں ہر طرف اور ہر جگہ قبر نہیں بنی ہوتی تھی بلکہ ایک خاص فاصلہ پر لائنوں میں، درمیانی جگہوں پر پھول، غرض ان لوگوں کو موت بھی زیادہ خوفناک نہ لگتی ہوگی۔

۱۵ اگست (منگل)

آج اشرف میونخ چلا گیا ہے وہ ہمیں بھی کھینچ رہا تھا۔ مگر ہم نہ گئے۔ کیونکہ ہائیڈل برگ سے اس کا فاصلہ ریل سے ۴ گھنٹے کا تھا۔ چونکہ آج ہی ہائیڈل برگ واپس پہنچنا تھا اس لیے ایک دن میں آٹھ گھنٹے ریل میں گزارنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ میں نے کہا بھی کہ ایک رات ہوٹل میں ٹھہر لیں گے۔ بتایا گیا ان دنوں ہوٹلوں میں جگہ نہیں ملتی۔ اگست ستمبر میں خلقِ خدا میونخ پہنچتی ہے۔ کیونکہ وہاں قدرے گرمی ہوتی ہے اور یہ لوگ گرمی سے محفوظ ہونے کے لیے وہاں پہنچتے ہیں

(ندیم صاحب کی نظم مشرق و مغرب)

اس وقت صبح کے ۶ بجے ہیں۔ دیکھیے کیا پروگرام بنتا ہے۔ ہمارے پاس جو وقت تھا یا جو ہمارا اندازہ تھا اس کے مطابق جرمنی میں زیادہ دن لگ گئے۔ ابھی چند دن اور لگیں گے۔ لندن کے چند ایک دوستوں کو لکھا تھا کہ ۱۰ اگست کے لگ بھگ پہنچ جائیں گے۔ آج ۱۶ تاریخ ہوگئی اور ابھی یہیں اٹکے ہوئے ہیں۔

ہم نے جن سے ملنا تھا انہیں ٹیلیفون کئے۔ کسی کو دفتر میں موجود نہ پایا۔ ایک صاحب اسٹوٹ گارٹ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دوسرے کچھ دیر پہلے دفتر سے نکلے تھے۔ انہیں شام تک لوٹنا تھا۔ دن بھر لیٹے رہے، آرام کی ضرورت بھی تھی۔ شام کے قریب جاوید نے کہا، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ اس نے سویٹر پہنا، پھر بھی سردیٔ احساس، لہذا وہ لیٹ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی انگریزی دوا کھائی مگر افاقہ نہ ہوا۔ بخار تیز ہوتا گیا۔ رات بھر یہی کیفیت رہی۔ میں دانستہ رات ایک بجے تک لکھنے کا بہانہ کر کے بیٹھا رہا۔ پھر سو گیا۔ صبح اُٹھا میں نے جاوید کے جسم کو ہاتھ لگایا تو بے حد گرم پایا۔ میں گھبرا گیا، سوچا پردیس میں تو سر درد بھی نہیں چاہیئے چہ جائیکہ اتنا تیز بخار ہو۔ وسوسے بڑھنے لگے۔ ملک صاحب لندن میں تھے۔ یہاں جان پہچان کا کوئی آدمی نہ تھا۔ چنانچہ میں خاصا گھبرایا۔

جاوید نے بھی جب اپنی طبیعت کو نڈھال پایا تو اس نے دریافت کیا، کیا آپ کے پاس بخار کے لیے ہومیوپیتھ

کی کوئی دوا نہیں ہے؟ میں نے کہا: ہے، ابھی دیتا ہوں۔ یہ بات میں نے اس کی تسلّی کے لیے پورے یقین کے ساتھ کہی تھی۔ چنانچہ میں سوچنے لگا، میرے پاس جو دوائیاں ہیں اُن میں سے کون سی کارگر ہوگی! طے پایا دو داؤں کو ایک ساتھ کھلا دیا جائے۔ کیونکہ اطمینان سے علاج کرنے کا وقت نہ تھا اور نہ حالات۔ ۲۰ تاریخ کو ہمارا جرمنی کا ویزا ختم ہو رہا تھا، لہٰذا تردّد بڑھتا گیا۔

دوائی کھانے کے آدھ گھنٹہ بعد جاوید نے بتایا: طبیعت سنبھل رہی ہے، بخار بھی کم معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں نے دانستہ جسم کو ہاتھ نہ لگایا۔ ڈرتا تھا جسم اس بات کے خلاف گواہی نہ دے کہ جو جاوید کہہ رہا ہے۔

۱۶ اگست (بدھ)

آج ہم نے صبح اسٹوٹ گارٹ جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جاوید کی طبیعت بحال ہو رہی تھی مگر سفر مناسب معلوم نہ ہوا۔ لہٰذا دیر تک لیٹے رہے۔ اس کے بعد میں نے جاوید کو چائے بنا کر دی۔ انڈا بوائل کر کے دیا۔ مگر اس کی طبیعت کھانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اب بھی وُہ لیٹا ہوا ہے اور میں بیٹھا اس کی صحت کے لیے دُعا مانگ رہا ہُوں۔

ابھی تھوڑی دیر بعد اسے دوسری خوراک دُوں گا۔ طبیعت بحال ہُوئی، ہمّت بھی ہُوئی تو اپنے صبح کے وعدے کو سہ پہر پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ پہلی شرط صحت کی بحالی کی ہے۔

جب سے اِدھر آئے تھے اردو پڑھنے کو ترس گئے تھے۔ یہاں انگریزی تک کے اخبار کا ملنا دشوار ہے، اردو کا پڑھنا کیا معنی! مگر جب سے ہائیڈل برگ آئے ہیں، ملک صاحب کے پاس پڑھنے کو خاصا کچھ ہے، ملک صاحب پاکستان سے دو ٹرنک بھر کر کتابوں کے لائے تھے۔

میں نے سجّاد ظہیر کی کتاب ”روشنائی“ اٹھائی اور پڑھنی شروع کی۔ یہ اہم کتاب تھی مگر مجھے اس کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہ ملا تھا۔

سجّاد ظہیر کی کتاب سے مجھے ان سے دو ملاقاتوں کی یاد آئی۔ وہ ملاقاتیں لکھنؤ میں ہُوئی تھیں۔ میں ان سے ملنے وزیر منزل گیا تھا۔ کوئی چار بجے کا وقت ہوگا، میں نے گھنٹی بجائی۔ رضیہ سجاد ظہیر باہر آئیں۔ میں نے اپنا نام بتایا، حاضری کا مدعا بتایا۔ کہنے لگیں: وُہ تو سو رہے ہیں مگر میں آپ کی خاطر انہیں جگاتی ہُوں۔

تھوڑی دیر میں سجاد ظہیر مسکراتے ہُوئے تشریف لائے۔ کہنے لگے: جب مجھے رضیہ نے بتایا کہ لاہور سے طفیل صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، تو مجھ پر دہشت طاری ہوگئی، اتنی دہشت اُس وقت بھی نہیں ہُوئی تھی جب کہ مجھے لاہور میں بغاوت کیس کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔

میں نے جواب میں کہا: میں کل واپس جا رہا تھا آج ہی کا وقت تھا کہ آپ سے ملاقات ہو سکتی۔ ورنہ ورنہ میں آپ کو سوتے سے نہ اٹھانے کو کہتا۔ کہنے لگے: اگر آپ اس وجہ سے ملے بغیر چلے جاتے تو مجھے

دکھ ہوتا۔

سجاد ظہیر سے اس سے پہلے میری ملاقات نہ تھی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ البتہ ایک خط ان کا لاہور جیل سے ملا تھ جس میں لکھا تھا میں نقوش پڑھنا چاہتا ہوں، موجودہ حالات میں چندہ ادا نہیں کر سکتا، بعد رہائی آپ کو چند ل جائے گا۔ چنانچہ میں نے رسالہ بھجوانا شروع کر دیا تھا اس کے بعد ان کی رہائی ایک قیدی کے بدلے ہوئی یہ قید ہندوستان چلا گیا۔ وہ قیدی لاہور آ گیا۔ غالباً ان کی رہائی حیدر آباد کے قاسم رضوی کے بدلے ہوئی تھی، وہ ہندوستہ کی قید میں تھے یہ پاکستان کی قید میں!

سجاد ظہیر سے ملنے کے بعد، میں سید مسعود رضوی صاحب سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ بڑے عالم ہونے کے سا بڑے ملنسار بھی تھے۔ انہوں نے کہا: اب آپ رات کا کھانا کھا کر جائیں گے اور کھانے پر دوسرے ادیبوں کو بھ بلاتا ہوں۔ گو وقت کم ہے مگر آپ کی خاطر لوگ جمع ہو جائیں گے۔ چنانچہ اور کرم فرماؤں کے ساتھ اُس وقت سجاد ظہی بھی موجود تھے۔ بڑی موہنی شخصیت کے مالک، بڑا مطالعہ کرنے والے، اس دعوت میں سید احتشام حسین بھی تھے آل احمد سرور بھی تھے۔ شوکت تھانوی بھی تھے۔ قدیر لکھنوی بھی تھے۔ وُہ دو ڈھائی گھنٹے کی محفل مجھے آج بھی یاد ہے وہ محفل کیا تھی، ایک دوسرے پر نچھاور ہونے کی ایک رسم تھی۔

آج جب میں نے "روشنائی" اٹھائی تو میرا خیال تھا کہ وہ مینی فسٹو ٹائپ کی چیز ہوگی اور اس کی تشریح اتنے صفحات سے واسطہ پڑے گا۔ مگر وُہ کتاب اتنی دلچسپ اور اتنی معلوماتی نکلی کہ سطر سطر میں لطف آتا رہا اور افسوس ہُوا کہ میں نے اس کتاب کو اس سے پہلے کیوں نہ پڑھا۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنی مصروفیت کی وجہ سے پڑھنے کم موقع ملتا ہے۔ بس وہی پڑھنا پڑتا ہے جو موضوع کے اعتبار سے رسالے کے لیے ضروری ہو۔ جہاں تک پڑھائی سوال ہے میری زندگی آدھے سے زیادہ پڑھنے میں گزری ہوگی، چوتھائی پیشکش میں اور چوتھائی میں دنیا جہا جملہ کام، جس میں کھانا پینا، ملنا ملانا اور سونا سلانا آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی احیاء کے سلسلے میں سجاد ظہیر نے جتنی جدوجہد کی وہ ایک بڑے کھاتے پیتے گھرانے کے فر کے لیے، حد درجہ قربانی کے مترادف ہے، جو آسُودہ حال ہے۔ مگر تحریک کے سلسلے میں دوسروں کا محتاج ہی ہو وہ منصوبے بناتا ہے۔ وہ ان کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ قدم قدم پر رُکاوٹیں ہیں مگر اس کے پایۂ استق میں لغزش نہیں آتی۔ حکومت بھی خلاف ہے۔ وہ اس تحریک کو کچلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اپنے منصوبوں کے۔ بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔ میں ان کے دماغ کی زرخیزی کی داد دیتا ہُوں۔ اُنہوں نے ہر اس تدبیر سے کام جس سے تحریک کو نشوونما میں مدد ملی۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے پہلے جلسے کی صدارت پریم چند سے جو اپنے فن کے اعتبار سے بھی عروج پر تھا اور اپنے اخلاق کی وجہ سے بھی ہر دلعزیز تھا۔ اس کے بعد مولوی عبد مولانا حسرت موہانی، پنڈت جواہر لعل نہرو، غرض اِدھر اُدھر سب کو رام کیا اور تحریک کو عوامی سطح پر استوار ک

سجاد ظہیر تو علامہ اقبال کے پاس بھی اسی غرض سے پہنچے تھے۔ ایک ملاقات ہوئی تھی، دو تین اور ملاقاتوں کی ضرورت تھی، جس کا موقع نہ ملا۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ بھی اس تحریک سے ہمدردی رکھتے۔

"روشنائی" میں رشید جہاں کا تذکرہ جا بجا ہے، جسے سجاد ظہیر نے دلنواز شخصیت کا نام دیا۔ یہ شخصیت جہاں تہاں مؤثر انداز میں موجود نظر آتی ہے۔ سجاد ظہیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم مولوی عبدالحق کو انجمن کی میٹنگ کی صدارت کے لیے ہموار کر رہے تھے اور وہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔ مگر جب رشید جہاں نے مولوی صاحب سے کہا تو وہ راضی ہو گئے۔ کیونکہ مولوی صاحب کسی خوب صورت خاتون کا کہا نہیں ٹال سکتے تھے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں، ان کے نامور فنکاروں کی تخلیقات کی تشہیر کے سلسلے میں جتنا مؤثر اور حکمت آمیز کردار نقوش نے ادا کیا وہ کسی دوسرے رسالے نے ادا نہیں کیا، بے شک تحریک کے علمبردار پراپیگنڈے کو بھی ادب ہی کا حصہ قرار دیتے تھے۔ مگر میں اسے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سلسلے میں میری کرشن چندر سے بحثیں ہوئیں۔ میں نے کہا: اچھا بھلا افسانہ لکھا۔ مگر آخر میں جا کر ایک آدھ پیرا اس کی مقصدیت پر بڑھا دیا، جس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کرشن چندر جواب میں کہتے تھے: آپ ٹھیک کہتے ہیں ہم بھی ایسا کرنے پر فنی اعتبار سے خوش نہیں۔ مگر تحریک کے احیا کے لیے براہِ راست تخاطب ضروری ہو گیا ہے۔

اب میں پھر "روشنائی" کو اٹھاتا ہوں، دوپہر کے کھانے سے پہلے تک اسے پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

مجھے اس کتاب کے ذریعہ یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ پریم چند جیسا بڑا فنکار بھی کس مپرسی کی حالت میں مرا سجاد ظہیر لکھتے ہیں: جہاں پریم چند لیٹے ہوئے تھے وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس کے بیچ میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پریم چند جی لیٹے ہوئے تھے اب جو میں نے ان کے جسم اور چہرے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ ان کے گالوں کی اوپر کی ہڈیاں ویسے بھی ابھری ہوئی تھیں اب وہ اور بھی نمایاں ہو گئیں۔ غرض مفلوک الحالی اور بے سروسامانی کی فضا جیسے وہاں چھائی ہوئی تھی اس سے دل میں بار بار یہ اندوہناک خیال اٹھتا تھا کہ پریم چند کی ساری بیماری کی بنیاد در اصل ان کی تنگ دستی ہے۔

بات لمبی ہو رہی ہے۔ یہاں انجمن کی روئدادوں سے بحث بھی منظور نہیں۔ بس اس کتاب کو دیکھ کر ایک لہر سی اٹھی۔ چند باتیں اس موضوع پر بھی ہو گئیں۔ اصل میں میں جو ایک دو باتیں کرنا چاہتا تھا وہ سجاد ظہیر ہی کے بارے میں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں تو مجھ سے پہلی ہی ملاقات میں سجاد ظہیر نے پوچھا تھا آپ کے افسانہ نمبر کے خلاف میں نے اخباروں میں پڑھا تھا، وہ کیا قصہ تھا؟ میں نے بتایا وہ نمبر افسانہ کی دور بہ دور تاریخ سے متعلق تھا۔ مثلاً ہم نے اُسے داستانوں کے دور سے شروع کیا تھا۔ پھر تراجم کا دور آیا۔ اس کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد ترقی تحریک پسند کے ابتدائی آتشیں دور کا ذکر تھا۔ مثال "انگارے" کے افسانوں سے دی گئی تھی۔ میرے خیال میں اردو افسانے

کی تاریخ کے ذیل میں اس کتاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ڈرتے سہمتے اس میں سے چند افسانے منتخب کیے تھے جو کم تند و تیز تھے۔ پھر اُن میں سے بھی میں نے کئی تیز جملے اور فقرے نکال دئے تھے۔ اس پر بھی ہنگامہ ہوگیا اور مجھے معافی مانگنی پڑی۔

یہ ماجرا سن کر سجاد ظہیر ہنسے۔ جب آپ نے معافی ہی مانگنی تھی تو وہ سب کچھ جُوں کا تُوں چھاپ دیتے۔

سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ جب انجمن کا پہلا ہندوستان گیر جلسہ ہُوا تو ہماری جیب میں صرف سَو روپے تھے۔ یہ صحیح ہے روپے پیسے کی فراوانی سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مقصد جب بھی حاصل ہوا، جذبہ کی فراوانی سے، نازونعم میں پلا ہُوا سجاد ظہیر جب پریشانیوں اور نارسائیوں کی تلاطم میں کھڑا نظر آتا ہے اور ثابت قدم کھڑا نظر آتا ہے تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی جس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی ہوں وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا، وہ کوئی سجاد ظہیر ہی ہو سکتا ہے۔ اگر ترقی پسند تحریک مذہب کے سلسلے میں اپنا رویہ معتدل رکھتی تو اس تحریک سے بدکنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ میں ترقی پسند تحریک سے دلی انس رکھنے کے باوجود، اس کھٹک کو اپنے دل سے نہ نکال سکا، کبھی بھی نہ نکال سکا۔ مذہب میری کمزوری نہیں میری شان ہے۔

۱۷ اگست (جمعرات)

جاوید کو بخار ہوگیا تھا، بخار تو اُتر گیا مگر وُہ ایک ہی دن اپنے آپ کو خاصا کمزور محسوس کرنے لگا۔ مناسب یہی جانا کہ آج باہر نہ نکلا جائے۔ پھر میں پاس کی بیکری پہنچا۔ ملک صاحب لندن میں تھے۔ اُن کی عدم موجودگی میں گھر میں پڑی تقریباً تمام چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا وہ اگر اُس وقت یہاں پہنچے جب دکانیں بند ہوئیں تو انہیں کھانے کے لیے کچھ بھی نہ ملے گا۔ دوسرے میں ملک صاحب سے کہا کرتا تھا کہ چینی کی بجائے شہد استعمال کیا کریں۔ گھر سے مکھن اور شہد کے لینے نکلا۔ چونکہ طبیعت میں ابھی تک چٹورپن ہے۔ اس لیے میں نے بہت سی چیزیں خریدیں۔ تھوڑی بہت ہم باقی چھوڑ آئے تاکہ وقتی طور پر ملک صاحب کو پریشانی نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے ملک صاحب نے میری اس حرکت کو پسند نہ کیا ہوگا۔ مگر میں بھی کیا کرتا۔ کچھ تو مجھے بھی کھانا تھا اور پہلی بہت سی چیزیں خورد و نوش کی اشیاء ختم ہو چکی تھیں۔ بیکار آدمی کھائے بھی نہ تو کیا کرے!

دورانِ قیامِ جرمنی میں نے دیکھا کہ لوگوں کے ہاتھ زخمی ہیں، پیر زخمی ہیں، پلاسٹر چڑھے ہوئے ہیں۔ مگر زندگی کی دوڑ میں شریک ہیں۔ معذور افراد کو بھی دیکھا وہ بھی وِیل چیئرز لیے بھیڑ میں شامل ہیں۔ مگر وہ گھر پہ بیٹھے ہُوئے ہیں۔ انہوں نے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو زندہ ثابت کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو یہ قوم دوسری جنگِ عظیم کے بعد ختم ہو چکی تھی اس لیے کہ جرمنی کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ تمام بلڈنگیں تمام کارخانے ختم، کھنڈروں کے ڈھیر میں یہ قوم پھر کیسے اُبھری! یہ اچنبھے کی بات ہے۔ مگر اس زندہ قوم

کے لیے یہ چیلنج کوئی معنی نہ رکھتا ہوگا۔ جبھی تو یہ لوگ جُوں کے تُوں قایم ودایم ہیں۔ ہر آدمی کچھ نہ کچھ کر رہا ہے۔ دفتر کے اوقات کے بعد بھی، کسی صلے کے بغیر کام کر رہا ہے۔ ضرورت پڑی تو چھُٹیوں کے ایّام میں بھی کام کر رہا ہے۔ ایسی قوم کیسے مر سکتی ہے! حتیٰ کہ میں نے ایک کبوتر کو دیکھا، وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ وہ بھی یعنی چرند پرند بھی معذوریوں سے ہار نہ مانیں تو اور کیا زندگی کا ثبوت ہوگا!

آج ہم نے جرمنی کو خیرباد کہنے کے لیے ٹیکسی منگوائی۔ سامان رکھا۔ ہائیڈل برگ سے فرینکفرٹ کے لیے چل دئے. جب ہم اپنا سامان لے کر اسٹیشن پر اُترے اور وہاں سے ہمیں ایئرپورٹ بذریعہ ریل ہی جانا تھا۔ اِدھر اُدھر گھومتے آدھ گھنٹہ گزر گیا ہوگا کہ یاد آیا کہ ایک بیگ تو ٹیکسی میں رہ گیا۔ پریشان ہُوئے کیونکہ اس میں خاصی اہم چیزیں تھیں مگر جاوید کو میں نے کہا: اس میں کوئی خاص چیز نہ تھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ مگر مجھے بے حد فکر لاحق تھی۔ مگر جاوید کو سوجھی اشرف کو بھجوایا۔ باہر جا کر دیکھو، ابھی ٹیکسی کھڑی ہوگی۔ کیونکہ اُن کی باری نمبر سے آتی ہے جس میں وقت لگتا ہے۔ اتفاق کی بات کہ وہ ڈرائیور ابھی باہر کھڑا تھا اور بیگ ہمیں مل گیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہم ہائیڈل برگ سے دیہاتوں کی سیر کے لیے نکلے تھے تو آخری شاپ پر جا کر ہم اتر گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد، ڈرائیور نے ہمیں زور سے پکارا اور ہاتھ میں پکڑے ہُوئے تھیلے کے بارے میں کہا: یہ آپ کا ہے تو لے جاؤ، مگر وہ ہمارا نہ تھا۔ ہم نے دُور سے ہاتھ ہلا کر بتایا ہمارا نہیں ہے۔ اس پر ملک صاحب نے بتایا تھا: یہ تھیلا، اب ٹیکسی اپنے ہیڈ آفس جا کر جمع کرا دے گا، جس کا ہوگا وہ یہاں سے آ کر لے جائے گا۔ یُوں گمشدہ چیزیں عموماً مالکان کو مل جاتی ہیں۔

۱۸ اگست (لندن)

ہم فرینکفرٹ کے ہوائی اڈہ پہنچ گئے، کوئی ایک بجے کے قریب۔ لندن کے لیے ہوائی جہاز نے چار بجے کے قریب اڑنا تھا۔ چنانچہ ہم وہاں بیٹھے رہے۔ سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور جرمنی کے لیے ویزا لے کر پاکستان سے چلے تھے، انگلینڈ کا ویزا نہ تھا کیونکہ وہ ہوائی اڈے پر ملتا ہے۔ امیگریشن والوں کی اگر تسلی نہ ہو تو مسافر کو ہوائی اڈہ ہی سے واپس کر دیتے ہیں۔ ہر چند کہ میں ۱۹۷۰ء میں لندن کا ایک چکر لگا گیا تھا، اس کے باوجود فکر تھی۔ جب فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر جاوید نے کہا کہ ہمیں سُوٹ کیس فرداً فرداً دینے چاہئیں تاکہ وہ اگر کسی مسافر کو ویزا نہ دیں تو اس کا سامان بھی اس کے ساتھ ہو۔ اس بات نے بھی پریشان کیا۔ مگر ہم یُوں سوچ ضرور رہے تھے تاہم میں قدرے مطمئن تھا. اس لیے کہ نوجوانوں کے بارے میں زیادہ پُوچھ گچھ کرتے ہیں ہم جیسے بوڑھے کو کیا کہنا۔ نوجوانوں کا یہ ہے کہ یہ اگر یہاں ٹِک جائیں گے تو بے روزگاری بڑھے گی لہٰذا ان کے سلسلے میں دھڑکا زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ جاوید پہلے بھی آ چکا تھا اس لیے قدرے اطمینان بھی تھا۔ بہر حال لندن اُترے۔ امیگریشن والوں نے زیادہ سوالات نہ کئے، ویزا چھ ماہ کے لیے دے دیا کیونکہ برمنگھم میں پرنٹنگ مشینوں کی نمائش ہونے والی تھی، ہم نے کہا: ہم نمائش

دیکھنے آئے ہیں۔

اطلاع کے مطابق ہوائی اڈّے پر محمد یونس بھٹی صاحب موجود تھے۔ بھٹی صاحب برطانوی شہری ہیں۔ عرصہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں۔ مخلص اور باغ و بہار قسم کے مالک، ان کے پاس بیٹھ کر اُن کی باتیں سُن کر، ان کے خلوص کا پرتو دیکھ کر طبیعت بے حد محظوظ ہوتی ہے۔

میں نے اشفاق مرزا صاحب کی وساطت سے خطوط منگوائے تھے۔ کیونکہ میں نے مرزا صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ لندن آؤں گا تو آپ کے پاس ٹھہروں گا۔ چنانچہ میں نے انہیں ٹیلی فون کیا۔ انہوں نے بتایا: آپ کے خطوط بھی آئے ہوئے ہیں، متعدد ٹیلی فون بھی آئے جو میں نے نوٹ کر رکھے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: کل کس وقت آؤں تاکہ انہیں دیکھ سکوں۔ چنانچہ ان سے کل حاضری کا وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد میں نے سلیمان یوسف زبیری کو ٹیلی فون کیا۔ یہ میرے پرانے دوست ہیں۔ جب پہلے یہاں آیا تو ان کے ہاں بھی کچھ دن قیام کیا تھا۔ پھر یہ خط لکھ لکھ کر بھی بلایا کرتے تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا: میرے پاس سیدھا کیوں نہیں آئے! اطلاع دیتے تو ہوائی اڈّے پر پہنچ جاتا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: ابھی آ رہا ہوں، سامان تیار رکھو۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟ میں نے کہا: یہ مجھے معلوم نہیں، فون بھٹی صاحب کو دیتا ہوں اُن سے آپ طے کر لیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ بھٹی صاحب سے زبیری نے کیا کہا! بھٹی صاحب یہ کہہ رہے تھے، طفیل صاحب سفر سے تھکے ہوئے آئے ہیں انہیں ہمارے ہاں آرام کرنے دیں۔ کھانے کا یہ ہے کہ میرے اور آپ کے گھر کا فاصلہ ۴۰ میل کے قریب ہے۔ وہ آپ کے گھر کھانا کھانے کے لیے آئیں، یہ کیا تُک ہے! کھانا ہم نے بھی کھانا ہے وہ یہاں کھا لیں گے۔ غرض بھٹی صاحب کا مُوڈ جارحانہ تھا تاکہ میں اُن کے ہاں سے نہ جا سکوں۔ ٹیلیفون رکھ کر مجھے بھٹی صاحب نے بتایا: وہ بڑا گرم تھا اب وہ اتوار کی صبح کو آئے گا۔

اس کے بعد میں نے مانچسٹر ڈاکٹر حیدر کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے کہا: میں کئی دن سے آپ کا منتظر ہوں۔ آپ نے لکھا تھا کہ ۱۰ اگست کے قریب آؤں گا، اب تو مجھے فکر بھی شروع ہو گئی تھی، بتاؤ کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کسی دن ٹیلیفون کر کے پروگرام بناؤں گا۔ کہنے لگے، میں نے صرف آپ کے لیے ۱۸ تاریخ سے ۱۵ دن کی چھٹی لی ہے تاکہ آپ کو ادھر ادھر گھما سکوں ورنہ میری مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ جواب میں میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو پیر کے روز آپ کو ٹیلیفون کر دوں گا اور پروگرام طے ہو گا۔

اس کے بعد بولٹن اپنی بھتیجی روبینہ کو ٹیلیفون کیا، کیونکہ میرے پاکستان سے چلنے سے بھی پہلے سے اُسے معلوم تھا کہ ہم باپ بیٹا پہنچنے والے ہیں لہٰذا وہ منتظر تھی۔ اس نے کہا: ہم آ کر آپ کو لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا: میں خود آپ کو مطلع کروں گا کہ کب پہنچ رہا ہوں! اس نے کہا: یہ نہ ہو کہ آپ آئیں اور جلدی سے چلے جائیں، آپ کو میرے ہاں کچھ دن قیام کرنا ہو گا۔ میں نے کہا: بہت اچھا، بہت اچھا!

رات کو بھٹی صاحب نے کھانے پر بڑا تکلف کیا۔ جب سے گھر سے نکلا تھا' پہلی بار چپاتی کی شکل دیکھی تھی، کھانا خوب پیٹ بھر کے کھایا' ورنہ میں جب سے آیا تھا صرف زندہ رہنے کے لیے کھا رہا تھا، اب کھانے کی خاطر کھانا کھایا پھر اُن کی نادر تشبیہات، لچھے دار گفتگو مزے ہی مزے والی بات تھی۔

۱۹ اگست

پروگرام کے مطابق میں اشفاق مرزا صاحب کے پاس پہنچا۔ ایک دو خط گھر سے آئے تھے۔ بی' بی' سی سے اطہر علی صاحب کا فون نمبر نوٹ تھا۔ ڈاکٹر حیدر اور زبیری صاحب کے ٹیلیفون نمبر نوٹ تھے کہ ان صاحبوں نے ٹیلیفون پر آپ کی آمد کا پُوچھا تھا اور کئی بار پُوچھا۔

اس کے بعد ہم وُہ پارک دیکھنے گئے جو پارک روڈ پر تھا۔ پارک میں جھیل بھی تھی جس میں کشتیاں چل رہی تھیں اچھا خاصا پارک تھا، چُھٹی کی وجہ سے پارک میں رونق بھی تھی۔ عام لوگ اور بچے بھی موجود تھے اور وہ جوڑے بھی تھے جو ہر وقت اور ہر جگہ بیقرار رہتے ہیں۔

وہاں سے نکلے تو ساتھ ہی مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد ۱۴۶ پارک روڈ پر بنوا رکھی ہے۔ مسجد کچھ ہی عرصہ پہلے تیار ہُوئی تھی۔ جدید طرزِ تعمیر کا اچھا نمونہ تھی۔ معلوم ہوا شاہ فیصل نے اس کے لیے رقم مہیا کی تھی۔ شاہ فیصل کئی اچھے کام کر گئے۔ مسجدیں تو وہ کئی ملکوں میں بنوا گئے۔ جرمنی میں بمقام میونخ بھی ایک شاندار مسجد بنوا گئے۔ اسلام آباد میں بھی بن رہی ہے۔ شاہ فیصل ایک ایسا دین دار فرمانروا تھا کہ جس نے مسلمانوں کی بہبود کے لیے بڑا کچھ کیا۔

ہم تھک چکے تھے، لہٰذا چائے کی طلب ہُوئی۔ ہوٹل جھانکے گئے۔ چنانچہ کافی تگ و دَو کے بعد ایک ایسا ہوٹل ملا جس میں قدرے عافیت تھی۔

تھوڑی سی سُوجھ بُوجھ ہو تو یہاں کا ریلوے کا نظام بڑا اچھا ہے۔ لہٰذا لندن کے لمبے فاصلوں کو یہ ٹرینیں ہی سہارا دیتی ہیں۔ لہٰذا وہاں سے بذریعہ ریل اپنے ٹھکانے کی طرف پلٹے۔ لاہور میں مجھے پیدل چلنے کا کم موقع ملتا تھا یہاں پیدل چلنا پڑتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ گو میں تھک جاتا ہُوں مگر ناخوش نہیں ہوتا۔

ٹھکانے پر پہنچے تو بھٹی صاحب نے اپنے دوست فاروقی صاحب کو بُلایا۔ وہ صاحب عرصہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں، سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ مگر اس عرصہ میں سیالکوٹ واپس نہیں گئے۔ یہ صاحب ہر فن پر ماہرانہ رائے رکھتے ہیں۔ وسیع مطالعہ کے مالک ہیں۔ بھلی طبیعت کے آدمی ہیں۔ ان سے مل کر طبیعت فرحاں ہُوئی۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ دیارِ غیر میں اپنی طرف کے کسی آدمی سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔

اسی طرح انہوں نے ایک شاعر سے ملاقات کرائی۔ مزاحیہ لکھتے ہیں۔ تخلص بلبل ہے۔ میرا ان سے ڈھنگ سے تعارف نہیں ہوا، ورنہ ایک شاعر مجھے ضرور کچھ اہمیت دیتا۔ مگر یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ بھی یہاں کافی عرصے

سے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے ان کے نزدیک ہمارے رسالے کی زیادہ اہمیت نہ ہو۔

آج جب میں اشفاق مرزا کے پاس گیا تو اُن سے پُوچھا، حج کے کتنے دنوں کے بعد عمرہ کے لیے ویزا مل سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: اندازاً پندرہ دن کے بعد۔ یہ سُن کر خوشی ہُوئی۔ میں واپسی پر حج کرنا چاہتا تھا مگر جدہ کے ٹکٹ پر یہ لکھ دیا گیا تھا کہ حج سے پہلے جدہ کے لیے سفر نہیں کیا جا سکتا' جیسے حوالوں سے جا سکتا تھا۔ مثلاً ٹوٹ بدل کر ٹکٹ نیا بنوایا جاتا مگر میں نے سوچا حج کے لیے جانا ہے اس لیے غلط بیانی یا حیلہ جوئی مناسب نہیں۔ اس لیے میں جلد عمرہ کے لیے جانے کی اطلاع پر خوش ہو گیا۔ مگر ابھی یہ بات پکّی نہ تھی۔ وہ پُوچھ کر مجھے اطلاع دیں گے کہ کب جا سکوں گا۔ کیونکہ میں گھر سے یہ طے کر کے چلا تھا کہ حج یا عمرہ کر کے واپس آؤں گا۔ خدا کرے کہ میری خواہش پوری ہو۔

جرمنی کی ایک دکان پر پاکستانی قالینوں کا ایک دکان پر پڑھ کر جی خوش ہوا تھا۔ یا آج بھٹی صاحب نے ایک چھوٹا سا ریڈیو لگا کر کہا، لیجیے پاکستان کا ریڈیو سُنیے۔ وہ اسٹیشن اسلام آباد کا تھا، بچّوں کا پروگرام تھا۔ اپنے وطن سے دور، اپنے وطن کا ذکر کتنا سکون دیتا ہے۔ اس کا حال صرف وہی جان سکتا ہے جسے اپنا ملک اچھا لگتا ہو۔

۲۰ اگست

میں تو محمد یونس بھٹی صاحب کے پاس ٹھہرا ہُوا تھا، جاوید اور اشرف ایک ہوٹل میں۔ آج صبح سے لے کر ایک بجے تک ٹیلیفون نہ آیا تو فکر لاحق ہُوئی۔ ہوٹل ٹیلیفون کر کے معلوم کیا تو پتا چلا وہ ہوٹل ہی میں ہیں باہر نہیں نکلے۔ دو بجے کے قریب ملے تو پُوچھا تو انہوں نے بتایا کپڑے گندے ہو رہے تھے سارے دھو ڈالے۔ بعد میں ان کے سُوکھنے کا انتظار کرتے رہے، یوں اس سے پہلے رابطہ نہ ہو سکا۔ ہم لوگ جو اتنے تن آسان تھے کہ چاہا کرتے تھے کہ کھانا بھی کوئی دوسرا ہی کھلا دے۔ باہر نکلے تو زیادہ کپڑے لے کر نہیں نکل سکتے تھے۔ سُوٹ کیس بھاری ہوتا تو باہر خود اٹھانا پڑتا۔ دو دو تین تین منزل سیڑھیاں چڑھنی اور اترنی پڑتیں۔

ڈاکٹر حیدر سے طے تھا کہ وُہ مجھے مانچسٹر سے لندن آ کر اپنے ہاں لے جائیں گے، ساتھ ہی وہ مجھے لندن دکھا دیں گے۔ ہر چند کہ یہ کام وُہ پہلے بھی ۱۹۷۰ء میں کر چکے تھے۔ مگر میں وہ یادیں پھر تازہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب پروگرام میں نے یہ بنایا کہ خود مانچسٹر پہنچ جانا ہے، ڈاکٹر صاحب مجھے اسٹیشن سے لے لیں گے۔ ہر چند کہ ڈاکٹر صاحب پروگرام کی تبدیلی سے خوش نہ ہُوئے مگر انہوں نے کہا: جیسے آپ کی مرضی!

آج میں نے گھر خط لکھا، چار خط لکھے، سبھی گھر والوں کے نام۔ چار خط یُوں کہ میں نے بچّوں تک کو الگ خط لکھا اس لیے کہ وُہ بھی میرے نزدیک اپنی ایک الگ دنیا رکھتے ہیں، جو بڑوں سے مختلف ضرور ہوتی ہے۔ مگر ان میں ایک دلکشی ہے۔ خط پا کر جتنی خوشی بچّوں کو ہوتی تھی اتنی کسی بڑے کو نہیں ہوتی تھی، انہوں نے اس خط کا ذکر زندگی بھر کرنا تھا کہ لندن سے ڈیڈی نے ہمیں خط لکھا تھا۔

آج یوسف زبیری اور اقبال زبیری اور یوسف زبیری کی بیوی دیلری مع اپنے دو بچوں کے مجھے ملنے آئے۔ ن دیر گپ شپ رہی۔ یوسف زبیری کی چھوٹی بچی جو دو سال کی ہوگی وہ بھٹی صاحب کے ہاں کی بلّی سے کھیلتی رہی۔ عد خوش تھی۔ سارے یورپ میں کُتّے اور بلّیاں رکھنے کا شوق لندن میں جس طرح بے روزگار افراد کو حکومت کی طرف وظیفہ ملتا ہے اُسی طرح کُتّے اور بلّیاں رکھنے والے افراد کو بھی، ان کی تعداد کے حساب سے ماہانہ الاؤنس ملتا ہے۔ س ملک کی انفرادیت ہے۔ اکثر ممالک اپنے بے روزگار افراد کو کچھ نہیں دیتے چہ جائیکہ وہ جانوروں تک کے ؤنس دیتے ہوں۔

میں نے اٹلی میں سُنا تھا کہ ایک بار ہالی ڈیز کے موقع پر، تمام لوگوں نے اپنے ہاں کے کُتّے اور بلّیوں کو ڑکوں پر چھوڑ دیا تھا محض ہالی ڈیز منانے کے لیے۔ چنانچہ میونسپلٹی کے لیے ایک مسئلہ پیدا ہوگیا۔ ہزاروں کُتّے بلّیاں سڑکوں پر پھر رہی تھیں۔ پھر وہ بڑی بڑی قیمت کے بلّیاں کُتّے تھے۔ مگر ان لوگوں نے اس لیے ایسا کیا پندرہ سولہ روز تک بغیر کھائے یہ زندہ نہ رہیں گی اس لیے چھوڑ دینا چاہیے۔

اس پر میں نے کہا: ہمارے ہاں ایسا ہوتا تو میونسپلٹی والے سب کو مار دیتے۔ اس پر مجھے بتایا گیا: کُتّوں بلّیوں یہ لوگ بڑی رقم خرچ کرتے ہیں۔ خاص ڈبوں میں بند ان کے لیے کھانا ہوتا ہے۔ وہ انہیں دیا جاتا ہے۔ ان کی ورنس کرائی جاتی ہے۔ اگر میونسپلٹی مار دیتی تو اُسے ہزاروں لاکھوں پونڈ بطور ہرجانہ دینے پڑتے، کیوں کر بِ یورپ کتّوں کو بطور اہلِ خاندان کے فرد کے پالتے ہیں۔ چنانچہ ایسے کہیں سننے میں نہیں آیا کہ یہ کتّا تو ہمارے ندان کا فرد تھا، اپنے بچوں کی طرح عزیز!

یہ بات ضرور صحیح ہوگی کہ دس بارہ برس ہوئے کہ میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ ایک بڑھیا نے وصیت کی تھی کہ رے بعد میری تمام دولت میرے کُتّے کے لیے ہے جو ملین ڈالر میں تھی۔

زبیری نے بتایا کہ یہ قوم بھی خراب ہو رہی ہے، ڈاکے پڑتے ہیں، راستے میں لُوٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ن کی بھی چوری ہوئی اس کی برسوں کی کمائی جاتی رہی۔ دکان کی انشورنس کرائی ہوئی تھی۔ مگر میرا مطالبہ ایک نیکل بنیاد پر خارج کر دیا گیا۔ وہ یہ کہ میری دکان کا الارم خراب تھا۔ الارم کی بات یہ ہے کہ مالک دکان اگر دکان کھولے گا ہ الارم ایک ٹیکنیکل بنیاد پر نہ بجے گا۔ اگر کوئی غیر شخص گھسے گا تو الارم دُہائی مچا دے گا۔ یوں پولیس چور کو پکڑ لے گی۔

آج بھٹی صاحب سے یعقوب صاحب ملنے کے لیے آئے۔ وہ وہ مضمون پڑھنے کے لیے آئے تھے جس میں ی حاصل کی۔ اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ وہ کہتے تھے کہ جتنا ہم نے علم حاصل کیا ہے ہم چاہتے ہیں ہ اس کا فائدہ پاکستان کو پہنچے۔ مگر وہاں ہماری کوئی قدر نہیں۔ جائیں گے تو نوکری نہ ملے گی۔ حکومت اپنی نمایاں زیشن رکھنے والے افراد کو پوچھتی نہیں، اس لیے بددل ہو کر دوسرے ملکوں میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی تے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آدمی اس

معاملے میں مطمئن ہو کر اپنے وطن جانا چاہتا ہے مگر وہاں کوئی پوچھتا نہیں۔ اس لیے مجبوراً ادھر پڑے رہتے ہیں۔ ادھر جائدادیں بناتے ہیں، ادھر شادیاں کرتے ہیں۔ اگر حکومت ایک ایسا محکمہ بنا دے جو اپنے ملک کے ذہین اور نامور لوگوں کو سنبھالا دے تو آدھے سے زیادہ لوگ اپنے ملک چلے جائیں۔ ملک و قوم کی خدمت کریں۔

خود بھٹی صاحب جو انجنیئرنگ میں ڈپلوما حاصل کئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی کہتے تھے کہ میں اپنے ملک جا کر اپنے علم سے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کوشش بھی کی کہ مجھے وہاں کوئی چھوٹی موٹی نوکری دے دی جائے۔ کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ پھر میں نے کہا، حکومت مناسب نرخوں پر مجھے کوئی زمین دے دے۔ کسی نے نوٹس نہ لیا۔ ہمارے سفیر نے بھی حکومت کو لکھا۔ کسی نے نہیں پُوچھا۔ لہٰذا میں بلاوجہ یہاں ٹِکا ہُوا ہُوں۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ یہاں کی دنیا نے جو بڑے بڑے تجربے کئے ہیں اُن سے فائدہ اٹھاؤں اور وہ سب کچھ وہاں کروں۔ مثلاً اتنے بڑے اور رسیلے آڑو ہوتے ہیں ان کے بیج وہاں لے جاؤں۔ ان کے ہاں لہسن آدھ آدھ اور پاؤ پاؤ بھر کے ہوتے ہیں وہ وہاں جا کے اگاؤں۔ ان کے خربوزے جو سپین سے آتے ہیں وہ اتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ ان میں مٹھاس ہی نہیں شیرینی ہوتی ہے' وُہ وہاں بوئے جائیں۔ بغرض ان کے برسوں کے تجربات سے ہم فائدہ اٹھائیں۔ یعنی ہم تجربوں میں وقت ضائع نہ کریں، بلکہ تجربات سے فائدہ اٹھائیں، مگر افسوس کہ کوئی سُنتا نہیں۔

بھٹی صاحب مع بیگم صاحبہ کے باہر گئے ہیں۔ میں اکیلا ہُوں مگر وُہ مجھے حضرت موسیٰؑ کے بارے میں وی سی آر پر فلم لگا کر دے گئے ہیں تاکہ میرا وقت اچھا کٹے۔ چائے کی بھری ہُوئی چینک سامنے رکھ گئے ہیں۔ تمام چیزیں رکھ گئے ہیں تاکہ دل لگا رہے۔ کہانی وہی جو کتابوں میں پڑھی، مگر اتنے دلکش انداز میں فلمائی گئی کہ بہت کم انگریزی فلمیں بھی ایسی ہوں گی۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب یونس بھٹی صاحب کو ٹیلی فون آیا کہ گوجرانوالہ کی ڈاکٹر رشیدہ جو کہ اپنے بچوں کے علاج کے سلسلے میں لندن مع اپنے بہنوئی کے آئی ہُوئی ہیں پریشان تھیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ ان کا بہنوئی دروازہ نہیں کھول رہا جب کہ ہم دیر سے کھٹکھٹا رہے ہیں۔ وہ ایک الگ کمرے میں رہتے ہیں۔ ملک صاحب نے کہا بھی۔ پھر وہ کمرے کے اندر نہ ہوں گے۔ ورنہ دروازہ کھولتے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، ہم باہر جاتے ہیں تو اکٹھا جاتے ہیں۔ وہ ہمیں بتائے بغیر باہر نہیں جا سکتے تھے اور اب رات کے ۱۱ بج رہے ہیں اتنی دیر تک اُن کے باہر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک وہ پردیس میں تھیں، بچہ ان کا بیمار تھا۔ اس پر بہنوئی کا اتا پتا نہ ملنا' ہر درجہ پریشان کن سوال تھا۔ وہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے، جن کا عام آدمیوں سے زیادہ حوصلہ ہوتا ہے وُہ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے تقریباً رو رہی تھیں۔ یہ صورتِ حال بھٹی صاحب نے مجھے بتائی تو میں بھی پریشان ہو گیا۔ چنانچہ میں اور بھٹی صاحب ڈاکٹر رشیدہ کی طرف چلے جو کہ میرے قیام سے ۱۵ میل کی مسافت پر رہتی تھیں۔ ہم راستہ بھر پریشان رہے۔ خیریت کی دُعا مانگتے ہُوئے پہنچے۔ گھنٹی بجائی تو انہی صاحب نے دروازہ کھولا جو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک گم تھے

معلوم ہُوا وُہ اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے تھے جو کہ تھوڑے فاصلے پر رہتا تھا مگر اس نے اُٹھنے نہ دیا۔ تب ہماری بھی جان میں جان آئی۔ ورنہ ہم راستے بھر سوچتے آئے تھے کہ موصوف کا بند کمرے میں ہارٹ فیل ہوگیا ہے، جبھی دروازہ نہیں کھولتے۔ جب موصوف نے دروازہ کھولا تو بھٹی صاحب نے بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ وگرنہ میں نے تو تمہاری لاش کو پاکستان پہنچانے کے سلسلے میں ذہن ہی ذہن میں سارے انتظامات کر لیے تھے۔ اس فقرے پر ماحول میں جو پریشانی کا سکوت تھا وہ ٹوٹ گیا۔

۲۱ اگست

پروگرام کے مطابق، بذریعہ ریل مجھے ڈاکٹر حیدر کے پاس مانچسٹر جانا تھا۔ کل اقبال زبیری جو ملنے آئے تھے وہ میری تصویر بھی مانگتے تھے جو کہ میں نے جاوید سے لے کر صبح اخبار وطن کے دفتر میں پہنچانا تھی۔

بھٹی صاحب نے گاڑی نکالی۔ پہلے جاوید اور اشرف کو ان کے ہوٹل سے لیا۔ اس کے بعد وطن کے دفتر پہنچے۔ تصویر انہیں ویسے بھی مل سکتی تھی مگر میں ان کا دفتر (اخبار کا) دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس پروگرام پر صاد کیا تھا کہ اسٹیشن جاتے ہُوئے راستے میں وطن کے دفتر چلیں گے۔ ہم دس بجے دفتر پہنچے۔ دفتر بند تھا۔ عموماً اخباروں کے دفتر دس بجے کے بعد ہی کھلتے ہیں کیونکہ رات ایک ایک دو دو بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔

ہم واپس ہونے ہی والے تھے کہ زبیری صاحب آتے دکھائی دئے۔ ان کے ساتھ کرمانی صاحب تھے جبکہ مجھے میری پہلی آمد (۱۹۷۰ء) پر بھی اخبار مشرق (لندن) کے دفتر میں مل چکے تھے۔ ان دنوں محمود ہاشمی صاحب نکالتے تھے جو ایک معروف ادیب تھے مگر اب تو انہوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ بہرحال میں وطن اخبار کے دفتر گیا۔ زبیری صاحب نے پُورے کمرے دکھائے جب کہ پُورے ملازمین ابھی پہنچے نہ تھے۔ بہرحال یہ دیکھ کر خوشی ہُوئی کہ لوگ بے سروسامانی میں نہیں بلکہ سارے سامان کے ساتھ میدان میں اترے ہیں۔ بلڈنگ اخبار کی اپنی تھی۔ وطن اخبار پہلے تو ہفت روزہ تھا اب روزانہ سات آٹھ ماہ سے چھپ رہا تھا۔

بچے ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ لے کر چھوڑ آئے تھے، وہ ابھی لندن میں رہنا چاہتے تھے مگر مجھے مانچسٹر ڈاکٹر حیدر کے پاس پہنچنا تھا۔ ایک نئے مسافر کے لیے اِدھر سفر کرنا آسان نہیں۔ ہوائی اڈے اور اسٹیشن کئی منزلیں اُوپر نیچے ہوتے ہیں۔ وہ اسٹیشن اور ہوائی اڈے کیا ہوتے ہیں، شہر کے شہر آباد ہوتے ہیں۔ اس لیے نئے مسافر کا ادھر آ کر بوکھلا جانا کوئی عجیب بات نہیں ہوتی۔ بہرحال لکھے پروگرام کے مطابق مجھے پلیٹ فارم ۴ سے جانا تھا۔ سامان لے کر اندر پہنچا، کیونکہ اندر اس اسٹیشن پر کوئی دوسرا بغیر ٹکٹ نہیں جا سکتا تھا۔ اندر گیا تو پلیٹ فارم ۴ پر بھی گاڑی کھڑی تھی اور نمبر ۵ پر بھی۔ میرے لیے مسئلہ یہ پیدا ہوگیا کہ مجھے اس گاڑی پر سوار ہونا ہے جو نمبر ۴ سے جاتی ہے یا نمبر ۵ سے۔ کیونکہ لوگ پلیٹ فارم ۵ پر سے سوار ہو رہے تھے چنانچہ

میں نے ایک میم سے پوچھا: کیا یہ گاڑی مانچسٹر جائے گی؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے دوسری خاتون سے پوچھا، وہ اس لیے کہ ہمارے ہاں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔ اس خاتون نے بھی کہا: یہی گاڑی مانچسٹر جا رہی ہے۔ تب اطمینان ہوا۔ بچوں نے ڈاکٹر حیدر کو ٹیلی فون کر دیا کہ بندۂ ناچیز کو گاڑی پر سوار کرا دیا ہے۔ گاڑی اتنے بجے چلے گی اور اتنے بجے مانچسٹر پہنچے گی۔ لہٰذا انہیں اسٹیشن سے لے لینا۔ جب تک آپ انہیں نہ ملیں گے وہ پلیٹ فارم پر کھڑے رہیں گے۔

گاڑی وقت مقررہ پر پہنچ گئی۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ مسافر باہر جانے لگے حتیٰ کہ پلیٹ فارم خالی ہو گیا تب میں نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھایا، باہر نکلنے کی سوچی۔ یہ بھی سوچا، ٹیکسی پر بیٹھ کر پہنچ جاؤں گا۔ جیسے ہی پلیٹ فارم ختم ہوا، جنگلے کے باہر کھڑے ڈاکٹر صاحب نظر پڑے۔ جان میں جان آئی۔ معلوم ہوا بعض گاڑیوں پر صرف وہی مسافر اندر جا سکتے ہیں جن کے پاس ٹکٹ ہوتا ہے ورنہ باہر ہی رکنا پڑتا ہے۔

سامان گاڑی میں رکھا، ڈاکٹر صاحب نے بتایا: یہاں کافی تعداد میں پاکستانی ہیں۔ چنانچہ ایک دکان سے انہوں نے مٹھائی خریدی، تب گھر کی طرف چلے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اچھا مکان خریدا ہوا ہے۔ دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس میں کافی بڑی جگہ باغبانی کے لیے موجود تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے باغ کو بڑی محنت سے بنا رکھا تھا۔ مثلاً اگر گلاب کے پھول تھے تو اس کی بے شمار قسمیں لگی ہوئی تھیں۔ نایاب پودے طرح طرح کے پھولوں سے سجے نظر آئے۔ ترکاریاں بھی تقریباً موجود، پھل بھی بہت سے موجود، یہ قطعہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ انگلستان جیسی جگہ پر اتنا اہتمام کوئی معنی رکھتا ہے۔ سنا ہے کہ لوگ دور دور سے باغ کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کی دل چسپی کی وجہ سے تھا۔ وہ ہسپتال سے آتے ہیں کپڑے بدل، کھرپا یا درانتی لے کر پھول پتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اپنی لیبارٹری بنا رکھی ہے۔ پودوں کی نئی قسموں کی ایجاد پر سوچتے رہتے ہیں۔ تجربے کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کئی تجربے کئے تو متعدد میں کامیابی بھی ہوئی۔ ایک نئی چیز وجود میں آ گئی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔ مگر وہ باغبانی پر اتنی توجہ دے رہے ہوں گے، یہ معلوم نہ تھا۔

میں نے آج سہ پہر کو اسی باغ میں بیٹھ کر چائے پینے کو ترجیح دی، چائے پیتا جاتا تھا' باغ کی خوب صورتی اور طرح طرح کے پھولوں سے لدے پھندے باغ کو دیکھتا جاتا تھا۔ جب تک رات نہ ہو گئی میں وہیں بیٹھا رہا۔

رات کو ایک انگریزی فلم ٹیلی ویژن پر دیکھی جو اپنے ہاں کے یعنی یورپ کے تمام لوازمات سمیت اچھی فلم تھی۔

۲۲ اگست

آج ہم لیک ڈسٹرکٹ گئے، وہاں آس پاس دس میل کے اندر پانچ جھیلیں ہیں جو مصنوعی نہیں قدرتی ہیں۔ جو سب سے بڑی جھیل ہے پہلے اس پر پہنچے۔ اتنی کاریں اتنی کاریں کہ کہیں گاڑی پارک کرنے کو جگہ نہ ملے۔ تین چار

گئے، جو صرف کاریں پارک کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں کسی میں جگہ نہ تھی۔ اتفاق سے ایک گاڑی نکلی تو اس جگہ کار ڑی کردی۔ مطلب یہ کہ سیاح اور مقامی لوگ اتنی تعداد میں وہاں پہنچتے ہیں کہ ایک میلہ سا لگا ہوتا ہے۔

سیر کے لیے چھوٹی بڑی کئی کشتیاں برابر برابر چل رہی تھیں۔ اس کے باوجود ذرا انتظار ہی سے کشتی میں جگہ ملتی تھی۔ منزلہ کشتیاں تھیں، بھر بھر کے نکلتی تھیں۔ یہ نہیں ہے کہ جب کشتی بھرے گی تو چلے گی بلکہ ان کا وقت مقرر ہے اور وہ ت مقررہ سے پہلے ہی بھر جاتی تھیں۔

ہم بھی کشتی پر سیر کے لیے بیٹھے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ بچوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے، کی اپنی خواہشیں ہوتی ہیں، اس لیے بڑوں اور بچوں کا ایک متوازن حلقہ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ جھیل کوئی دس میل ہی ہوگی۔ چھوٹی بڑی درجنوں کشتیاں رواں ہوں گی، رنگ برنگے بادبانوں کے ساتھ۔ عجیب دلکش نظارہ تھا۔ یہ قوم طور تمام تر راحتوں کے ساتھ جینا جانتی ہے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لوگ پہلی بار ادھر ئے ہوں گے بلکہ بیسیوں مرتبہ آچکے ہوں گے۔ اور جب موقع ملے گا اِدھر بھی آئیں گے۔ غرض انھیں جب بھی موقع لے گا گھر سے نکلیں گے، ہفتہ اتوار تو ہر حال میں!

یہ لوگ دورانِ گفتگو تفریحی باتیں کرتے ہیں، خوب زور سے ہنستے ہیں۔ ایسا زیادہ عورتیں کرتی ہیں۔ مگر وُہ سی محض زیبِ داستان کے لیے ہوگی، حقیقی نہ ہوگی، باتیں کرتے جائیں گے، ہنستے جائیں گے، خوب زور سے، نچی آواز میں۔ بے پناہ اور بے اختیار ہنسی کے انداز میں، مگر اچانک چُپ ہوکر، بات کو آگے بڑھائیں گے۔ پھر توڑی دیر بعد ہنسی کا فوارہ، اس کے بعد قصہ رواں، پھر ہنسی، ہم جیسے لوگوں کے انداز کی بے اختیار ہنسی نہ ہوگی۔ رو کے نہ رُکے گی۔ یہ تو خوش ہونے کے لیے ہنستے ہیں، ہنسی کی بے ساختگی کے طور پر نہیں۔

اِدھر جھیل میں جو کشتیاں چل رہی تھیں کچھ موٹر کے ساتھ چل رہی تھیں، کچھ بادبانوں کے ساتھ۔ ہوا بڑی تیز تھی۔ لشتی رانوں سے بادبان سنبھل نہ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بادبان جھیلوں میں گر رہے تھے۔ کشتی ران پورے زور کے ساتھ سنبھالنا چاہتے تھے۔ کبھی اسی کشمکش میں بادبان بھی جھیل میں، کشتی ران بھی جھیل میں، اس پر تماشائیوں کے بلند ہقہے! چھوٹے بھی ہنس رہے ہیں، بڑے بھی!

ہماری کشتی چل رہی تھی۔ راستے میں ایسے ٹکڑے بھی ملے جہاں خشکی تھی۔ وہاں درخت ایستادہ تھے۔ گھنے رخت، چاروں طرف پانی بیچ میں درخت، پھر پانی پھر ایسا قطعہ، اور دُور دُور درخت ہی درخت، یہ سماں میلوں پھلا ہوگا۔ میں نے یہ جانا یہ گھڑیاں میری زندگی اور اس کی مسرتوں کی انمول گھڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر حیدر نے، جو میرے لیے بھائیوں کی طرح ہیں، کم لوگوں کو دوست بناتے ہیں، جن کے یہ دوست ہوتے ہیں اس پر جان نچھاور کرنے کی حد تک ساتھ دینے والے ہیں۔ اب میری آمد پر انھوں نے پندرہ دنوں کی چھٹی لے لی، اس لیے کہ یہ بے حد مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ بہت کم وقت ملتا ہے۔ علاج معالجے کے علاوہ، لیکچر دینا، دُوسرے

شہروں میں سیمناروں پر جانا، زندگی کا چلن بن چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیوی سے پوچھا: یہاں سے کہاں چلیں، چونکہ وہ اس خطہ سے بلکہ اسی ملک کی باشندہ ہیں۔ اس لیے انہیں یہاں کے بارے میں زیادہ واقفیت ہے۔ واقفیت تو اب ڈاکٹر صاحب کو بھی ہو گی کیونکہ وہ عرصہ بیس سال سے یہاں ہیں۔ مگر وہ بیوی سے اس لیے مشورہ کرتے ہوں گے کہ پروگرام کے بارے میں، ان کی بھی رائے کو دخل ہو۔

چنانچہ گاڑی ایک دوسری جھیل کی طرف دوڑی۔ پہلے ہم نے سب سے بڑی جھیل دیکھی تھی اب اس جھیل کی طرف چل رہے تھے جو سب سے زیادہ بلندی پر تھی۔ اب موٹر اونچائیوں کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے، گھنے اور سرسبز درخت، یہ سماں بھی رُوح کی بالیدگی کے لیے سہانا تھا۔ یعنی ہماری گاڑی کافی دیر تک پہاڑوں کے درمیان چلتی رہی۔ جہاں درخت ختم ہوگئے وہاں پہاڑوں کا نظارہ قابلِ دید تھا۔ قابلِ دید ہی نہیں بلکہ دلفریب بھی، ان لوگوں کی دنیا خاصی دلکش تھی۔ ڈاکٹر حیدر نے کہا بھی: قدرت نے ہمیں لق و دق صحرا دئے۔ ان لوگوں کو سب کچھ دے دیا۔ نظارے بھی، دلفریبی بھی!

ہماری موٹر چھوٹی سی سڑک پر بھاگتی ہوئی، منزل کی طرف یعنی جھیل کی طرف بڑھ رہی تھی، میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا، سڑک چھوٹی ہے کہیں کہیں یہ خطرناک بن جاتی ہے کیونکہ دونوں طرف پہاڑ ہیں۔ موڑ کاٹتے ہوئے خطرات ہیں۔ کہنے لگے، ان کا یہی حسن ہے۔ ان سڑکوں کو سیر کی سڑکیں کہتے ہیں، بڑی سڑکوں کو کاروباری سڑکیں۔ بس اتنا ہے یہاں تیز گاڑی نہیں چلائی جا سکتی۔ ذرا چوکنّا رہنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بس ان امور کا خیال رکھا جائے تو پھر یہ سب کچھ بڑا لطف دیتا ہے۔

غرض اونچائیاں سر کرتے ہوئے سب سے اونچی جھیل پر جا پہنچے۔ دن کے تین بج رہے ہوں گے۔ بیگم حیدر نے پکنک کا سماں پیدا کر دیا۔ ایک جگہ بڑی سی چادر پھیلا دی، اس کے اوپر دسترخوان قسم کا کپڑا، اس پر بے شمار چیزیں (کھانے پینے کی) سجا دیں۔ وہ اپنے دو تھیلوں سے بے شمار خور و نوش کی چیزیں نکالتی چلی گئیں۔ جب وہ سب کچھ دسترخوان پر آ گیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی زیادہ چیزیں ان دو تھیلوں میں تھیں۔ اِدھر والوں کو تھوڑی سی جگہ سے زیادہ سے زیادہ کام لینا آتا ہے۔ گھر میں الماریاں بنائیں گے تو ان کے اندر بے شمار خانے، باورچی خانہ ہوگا تو پورا ایک اسٹور کا سامان اس میں سما جائے۔ یہی قرینہ بیگم حیدر نے بھی اختیار کیا ہوگا۔ بے شک بھوک لگی ہوئی تھی مگر ہم آمدہ خوراک کا تیسرا حصہ بھی نہ کھا سکے ہوں گے۔

ہماری چادر جھیل کے کنارے بچھی ہوئی تھی۔ لوگ حسبِ قاعدہ کپڑے پہنے، ذرا سے کپڑے پہنے لیٹے تھے، بیٹھے تھے۔ اس معاملے میں بھی یہ لوگ کمال حاصل کرتے جا رہے ہیں کہ کم سے کم کپڑے پہن کر گزارہ کیا جائے۔ کم سے کم سے میری مراد، کم تعداد میں کپڑے پہننا نہیں ہے بلکہ مقدار سے ہے۔

بے شک یہ جھیل چھوٹی تھی، مگر بے حد دلکش نظاروں سے مالا مال تھی۔ مجھے تو اس جھیل کے ماحول اور راستے نے پہلی بڑی جھیل سے بھی زیادہ نوازا، اُدھر لوگ تھے اِدھر قدرت مہربان تھی۔ پہلے ننگے جسم اور بوس و کنار میں میرے لئے حیرت انگیز دلکشی تھی مگر تواتر کے ساتھ۔ اس سب کچھ میں کوئی دلکشی نہ رہی۔ گو میں اِدھر کئی برس پہلے بھی آیا۔ اس وقت لاہور کے دیہاتی کے لیے یہ سب کچھ عجیب تھا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پُوچھا: یہ جھیل قدرتی ہے یا مصنوعی؟ انہوں نے بتایا: کہتے ہیں کہ ڈھائی تین صدیاں پہلے یہاں برف ہی برف تھی۔ جب وہ برف پگھلی تو اس نے پانی کی صورت اختیار کر لی۔ یوں یہاں کے لوگوں نے سیر کے لیے زیادہ سے زیادہ بہتر بنایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جگہیں سیرگاہ بن گئیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر حیدر نے پھر بیوی سے مشورہ کیا: اب کدھر چلیں! چنانچہ دونوں نے فیصلہ کیا اب وہاں چلیں جہاں سمندر کا ایک کنارہ لگتا ہے اور سیّاحوں کی دلکشی کا سامان بھی ہے۔ کیونکہ بلیک پول کی طرح یہاں روشنیوں کا بھی انتظام تھا چلتے چلاتے یا موٹراتے یہاں تک پہنچے۔ تو یہاں لوگوں کی یلغار نہ تھی۔ بے حد سکون کا ماحول تھا۔ سمندر کے کنارے کے سامنے ہوٹل ہی ہوٹل تھے، جہاں سے سمندر کا نظارہ ارزاں ہے۔ لوگ وہاں کا سارا حُسن، سارا نظارہ اپنے ہوٹلوں سے بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے اُس روش پر بھیڑ نہ تھی، جو کہ بطورِ خاص ہم جیسے لوگوں کے لیے سمندر کے کنارے بنائی گئی تھی۔

میں نے دیکھا اس جگہ نوجوانوں کی یلغار نہ تھی بلکہ سنجیدہ طبقہ اور معمر طبقہ کا راج تھا۔ بتایا گیا: یہاں وُہ لوگ آتے ہیں جو پُرسکون ماحول کے متمنی ہوتے ہیں۔ کمر میں ہاتھ ڈال کے چلنے والے کم تھے۔ گو معمر لوگ بھی اس کمر گیری کو معیوب نہیں سمجھتے۔ اس کے باوجود یہاں یہ سب کچھ کم سے کم تھا۔

اُس وقت ۸ بجے ہوں گے جب ہم نے معلوم کیا کہ روشنیاں کس وقت ہوں گی، تو معلوم ہُوا نو بجے۔ چنانچہ وہاں چھوٹی سی نمائش بھی لگی ہُوئی تھی، جو لگی ہی رہتی ہے۔ مستقل نمائش کا تصوّر بھی یہاں پایا۔ زیادہ تر بچوں کی تفریح کا سامان تھا۔ سیر کی روشوں پر معمر جوڑے ہی دیکھے۔ یہاں زیادہ تر بچّے، تھوڑے سے فاصلے پر، بلکہ آمنے سامنے عجیب تفاوت تھا۔

نمائش سے باہر نکلے تو روشنیاں ہو چکی تھیں۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں بلبوں کا جلنا بہت بھلا ہوگا۔ پھر روشنی ہی نہ تھی بلکہ رنگ برنگی روشنی تھی۔ پھر اس روشنی سے متعدد چیزیں بنا کر روشنی کا بندوبست کیا گیا تھا۔ روشنی کے پھُول، گملوں میں سجے تھے۔ موسیقی کے اوزار، روشنی کے ذریعہ نمایاں، مختلف کھیلوں کے انداز، روشنیوں کے ذریعہ، غرض فنونِ لطیفہ اور زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی روشنی ہی کی روشنی میں آراستہ کیا ہوا تھا بے شک وہ ماحول، وہ سماں خوب تھا!

میں صبح اٹھتا ہُوں تو بچّے دس بجے (دن کے) کے قریب ٹیلی ویژن لگا دیتے ہیں تا کہ میرا وقت اچھا

گزرے۔ ٹیلی ویژن پر ہر طرح کے پروگرام ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ سیاسی پروگرام بھی ہوتے ہیں، فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ مصنوعات کے اشتہار بھی بڑے دلکش انداز میں دکھائے جاتے ہیں۔ غرض متنوع پروگراموں کا سلسلہ بھی خوب ہے۔

آج کل امریکہ کی صدارتی مہم کا زور ہے۔ ان معرکوں کو دن میں کئی بار دکھایا جا رہا ہے۔ موجودہ صدر بھی خطاب کر رہے ہیں، مدِمقابل صدر بھی مخاطب ہیں۔ بات سننے والے، حمایتی دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ زور شور سب کا دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے امریکیوں کی زندگی کا مقصد صرف الیکشن لڑنا ہی ہے۔

ڈاکٹر بڑے سلیقے کے آدمی ہیں۔ زندگی کی ہر آسائش مہیا کر رکھی ہے۔ گھر لیا ہے تو وہ بھی ٹھاٹھ کا۔ جب میں پہلے آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ اُن کے پاس اردو کے تمام قابلِ ذکر گویوں کے ٹیپ موجود ہیں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹیپ۔ پھر ان کا ایک کاپی میں ایک قاعدہ کے ساتھ ریکارڈ موجود[1]۔ ایک منٹ میں اپنی مرضی کا ریکارڈ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بچی کے لیے الگ کمرہ، بچے کے لیے الگ کمرہ، اپنے لیے الگ کمرے، ایک میں اپنی تیاری کی تمام کتابیں، لکھنے پڑھنے کا ماحول، ایک میں تفریحی ساز و سامان، ٹیپ ریکارڈر، بیگم کے بننے سنورنے کا الگ کمرہ۔ غرض سب کی ضرورتوں سمیت کمرے۔ جو کمرے ڈاکٹر صاحب کے لیے ہیں ان میں بچے داخل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک کمرے میں بٹھایا تاکہ لکھنا ہو تو لکھتا رہوں، پڑھنا ہو تو پڑھتا رہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: میرے پاس "غالب کی کہانی غالب کی زبانی" کا ٹیپ ہے وہ نہ سُنا ہو تو سن لو۔ میں نے کہا، زہے نصیب! چنانچہ خطوطِ غالب میں سے چند ٹکڑے لے کر، مختلف لوگوں کی زبانی، اسی ماحول اور تاثر پر مبنی غزلیں سُنیں۔ یقین جانیے بےحد لطف آیا۔ دیارِ غیر میں اس نعمت کا اندازہ ہر کوئی نہ لگا سکے گا۔

اس کے بعد انہوں نے دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی کئی ٹیپیں منتخب کیں۔ کہنے لگے: جب مُوڈ ہو یہ سُن لینا۔ انہوں نے پُوچھا: کلاسیکل گانوں سے دلچسپی ہے؟ میں نے کہا، بالکل نہیں۔ اس کے بعد ہلکے پھلکے گانے سننے میں

---

[1] سہگل، کانن دیوی، کے سی ڈی مکیش، خورشید بانو، لتا، مہدی حسن، نورجہاں، طلعت، رفیع، بیگم اختر، ارونا لیلیٰ، سلمیٰ آغا، ثریا، فریدہ خانم، نازیہ حسن، کشور، غلام علی، ملکہ پکھراج، نزاکت علی سلامت علی، حبیب ولی محمد، عنایت حسین بھٹی، چترا، جگجیت سنگھ، مُنّی بیگم، بڑے غلام علی، عبدالکریم خاں، (مرثیوں کے ٹیپ) مجالس رشید ترابی، شامِ غریباں، گیت بھجن، غزلیں، مرثیے، مجالس۔ نغمے، بانسری، طبلہ، پیانو وغیرہ۔ غرض کافی بڑا ذخیرہ! اس نعمت کو وہ لوگ داد دیں گے جو ادھر اردو کا لفظ تک نہیں سُنتے۔

آتے رہے۔ میں گھر اور ملک سے دُور تھا، مگر میں اس ماحول میں پہنچتا رہا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی تھی جو چاہوں دیکھوں، جو چاہوں ان کی چیزوں سے سلوک کروں چنانچہ میں نے ایک کاپی اٹھائی جو ان کی بیگم کی تھی۔ مگر اس میں ڈاکٹر صاحب کی ان تمام سرگرمیوں کے تراشے چسپاں تھے جو ان کے شعبہ سے متعلق، مع ان کی تصاویر کے تھے۔ معلوم ہوا یہاں کے اخبارات میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کافی زیرِ بحث رہتی ہے۔ اس کاپی میں ۱۹۸۰ء تک کی سرگرمیوں کا حال درج تھا۔ اس کے بعد کا نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی بیگم سے کہا: یہ ریکارڈ مکمل ہونا چاہیے، کبھی جا کر بڑے کام آئے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے مقالے، یہاں کے بڑے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں جو ایک ایشیائی ڈاکٹر کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ یہ عام ڈاکٹر نہیں ہیں بلکہ بچوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی رائے آخری ہوتی ہے، کوئی ان کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا، نہ ڈاکٹر، نہ ملک کی وزیرِ اعظم، نہ ملکہ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قدر دانی دیکھ کر ڈاکٹر صاحب یہیں کے ہو رہے!

کل ہم جھیل بہ جھیل بھاگتے دوڑتے رہے۔ یہ عمل بارہ بجے سے رات کے دس بجے تک جاری رہا تھا۔ پھر ایک گھنٹہ کی گاڑی کی مسافت پر جانا اور پھر ایک گھنٹہ کی مسافت سے واپس آنا۔ اس سے ذرا تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے کہا: کل آرام کر لینا، پرسوں پھر گھر سے نکلیں گے۔ میں نے جواب میں کہا: مناسب یہی رہے گا۔

یہاں سبھی گاڑی تیز چلاتے ہیں، جو یہاں کا ضابطہ ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب گاڑی خاصی تیز چلاتے ہیں، جس سے میرا دل گھبراتا ہے۔ کہا بھی آہستہ چلائیے۔ کہنے لگے: آہستہ چلاؤں گا تو خطرہ بڑھ جائے گا۔ رات میں نے دیکھا کہ ساری گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ جو گاڑی ان سے آگے نکلنا چاہتی تھی انہوں نے راستہ دیا۔ مگر وہ لمبی دوڑ میں ان سے آگے کیسے نکل سکتا تھا! تھوڑی دیر میں یہ پھر ان سے آگے۔ کسی ایسے موقع پر میں نے کہا: آہستہ چلائیے۔ تو جواب ملا تھا: دیکھ لو خطرہ بڑھ جائے گا!

یہ میرے چودہ سال پہلے کا مشاہدہ ہے کہ ہم ڈاکٹر سمیت بلیک پول سے آ رہے تھے بلیک پول سے اپنے مسکن کی طرف، راستے میں بارش ہو گئی۔ چھاجوں بارش والا محاورہ سچا تھا۔ رات بھی اندھیری، پھر راستہ بھی دوسرے شہر کا۔ گاڑی ویسی ہی تیز چل رہی تھی، جیسی کہ چلاتے ہیں۔ راستہ پھسلواں تھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی تقریباً اُلٹ سی گئی تھی، یعنی ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی حاضر دماغی اور گاڑی پر کنٹرول کے باعث حادثے سے بال بال بچ گئے تھے۔ گاڑی بڑی مرسیڈیز تھی۔ کہنے لگے: یہ گاڑی کا کمال ہے کہ اس نے میری ڈرائیونگ میں ساتھ دیا۔

میں بیٹھا ہوں اور گانے چل رہے ہیں۔ ماحول میں موسیقیت ہے، در و دیوار پر آرٹسٹک ٹچ، میں جو یہاں علاج کی غرض سے یا آرام کی غرض سے آیا ہوں۔ اس کا پورا پورا انتظام ہے۔ جب تک ڈاکٹر صاحب پاکستان میں رہے اُن دنوں بھی دن رات حسین تھے۔ جب خلوص بھرا دل تعاقب میں ہو تو پھر بھلا زندگی میں کمی کس بات کی ہو سکتی تھی۔

عذاب وہ دیارِ غیر کو اپنا دیار بنا کے بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب بھی ایک دو ہفتے کے لیے پاکستان آن نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم بھی ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ یُوں خوشی کے لمحات لوٹ آتے ہیں۔ مگر عرصہ تھوڑا ہوتا ہے، کیا کیا جائے!

ڈاکٹر صاحب میں پاکستان کی خدمت کرنے کا جذبہ ابھی جوان ہے۔ کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے پاکستان کے مشیرِ صحت مسٹر جذبی ادھر آئے تھے۔ انہوں نے ہم پاکستانیوں کو خطاب کیا تھا۔ تان انہوں نے یہ توڑی تھی کہ آپ ایسے تجربہ کار ڈاکٹروں کو پاکستان کی بھی خدمت کرنی چاہیے۔ حیدر نے کہا تھا: مناسب انتظام کر دیجئے، ہم حاضر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ کافی مہینوں کے بعد، وزارت کی طرف سے ایک سوال نامہ ملا تھا جو پُر کر کے بھیج دیا تھا پھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد پھر ایک ویسا ہی سوال نامہ آ گیا۔ ہم سوچتے یہ کیا ہو رہا ہے!

میں نے پُوچھا: آخر نتیجہ کیا نکلا؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا: میں نے لکھا تھا ہمیں نوکری کا تحفظ دیا جائے ہم پہنچ جائیں گے۔ جواب یہ ملا تھا کہ سال میں جو ڈیڑھ ماہ کی چھٹیاں ہوتی ہیں اُن میں آتے رہیئے۔ یعنی مطلب یہ ہُوا کہ ہم آپ کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں!

اسی طرح مجھے ایگریکلچر کے ماہر نے لندن میں کہا تھا: ہم نے جو زندگی میں تجربے کئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اس کا فائدہ پاکستان کو پہنچے۔ پاکستانی ناخداؤں تک اپنے دل کی بات پہنچائی مگر کسی نے کچھ انتظام نہ کیا۔

میں گانے سُن رہا ہُوں تو مجھے اپنا فلم سنسر بورڈ کا ممبر ہونا یاد آیا۔ لوگ فلم اس لیے دیکھتے ہیں کہ خوش ہوں۔ ہم پریشانی کے عالم میں دیکھتے ہیں کیونکہ ہم فلمیں ہی ایسی بناتے ہیں۔ ایک کہانی، مار دھاڑ سب میں برابر کی، انمل بے جوڑ واقعات، بے مقصد اُچھل کُود، پھر شور شغب اتنا بلند کہ جب ہم فلم دیکھ کر اپنے آپ کو زندہ پاتے تھے تو خوش ہوتے تھے۔ خوب سزا ملتی تھی۔ مگر جب ہم بورڈ والوں سے کہتے تھے کہ اب کے ہمیں معاف کر دیں، تو جواب میں وُہ کہتے تھے کہ یہ تو خدمت کا معاملہ ہے۔ انکار نہ کریں۔ تب ہماری آئے دن کی خدمت کاری، ہمیں بار بار بدمزگیوں میں دھکیل دیتی تھی۔

مجھے یہاں قدرے فرصت ملی تو اپنے بارے میں بھی سوچ رہا ہُوں۔ وہاں تو یہ تھا کہ صبح اُٹھے، کام میں جُت گئے۔ یہ کام کیا، وہ کام کیا۔ رات آئی تو وہ دن سے زیادہ مصروفیت میں گزر گئی۔ کاغذ، قلم، دوات اور کتابیں، بس یہی رفیق، اس لگن میں زندگی کے ۴۴ سال گزار دیئے۔ زندگی کی تمام دلکشیوں سے کنارہ کش ہو کر، زندگی کا مقصد صرف اتنا ہی جانا، اس دھن میں نہ گھر والوں کا حق ادا کیا نہ رشتہ داروں کا، نہ دوستوں کا۔ زندگی کولھو کے بیل کی طرح ۴۲ سال تک گزار دی۔ اُفوہ! میری جانکنیوں اور اذیتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا!

مسرتوں کا نام بھی زندگی ہے، یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا، اس کے چھوٹے موٹے مواقع ملتے بھی تو بھی ان سے پہلو تہی کی۔ کام کا حرج ہوگا۔ مثال کے طور پر دوست اکٹھے ہو رہے ہیں، کھائیں گے، پئیں گے، دو چار گھنٹے اچھے گزریں گے۔ مگر کام کی خاطر، اپنے دفتر یا گھر میں اٹکے ہوتے ہیں۔ اِدھر یورپ میں یہ دیکھا کہ زندگی خوش رہنے کا

نام ہے۔ زندگی کو کام پر ترجیح نہ دو۔ اُدھر میرا یہ منصوبہ کام کو زندگی پر ترجیح دو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کو تباہ کر ڈالا — قابلِ رشک صحت کو لاغر بنا دیا۔

اُدھر قدردانوں کا یہ حال ہے، کچھ کیجیے گا تو حاسد پیدا کیجیے گا۔ آپ بڑے حالوں رہیں تو پبلک آپ کو اچھا کہے گی۔ کچھ کیجیے گا تو نگاہوں میں کھٹک پیدا کیجیے گا۔ یہ وطیرہ ہمارا کیوں ہے، اس کی کچھ سمجھ نہ آئی۔

اتنا کام کرنے کے بعد، اتنی صحت کو قربان کرنے کے بعد، یہ سوچا ہے کہ زندگی میں توازن پیدا کرنا چاہیے، ورنہ جن کے لیے مر رہا ہوں وہ مرنے پر دو آنسو بھی نہ بہائیں گے۔ رہی یہ بات کہ مستقبل کا قاری، ہماری کارگزاریوں پر ممنون ہوگا تو یہ کچھ کون دیکھنے آئے گا؟ سوال یہ ہے کہ لوگ زندگی میں کیوں بڑھاوے نہیں دیتے۔ آج بھی وہی خوش ہو رہے ہیں جو آنکھ اوجھل ہیں، جو آمنے سامنے ہیں۔ وہ کیوں ایسا محسوس کرتے ہیں کہ میں اُن کا حق چھین رہا ہوں، اُن کی شہرت چھین رہا ہوں، اُن کی دولت چھین رہا ہوں۔ یہ رویّہ جب تک میرے ملک کا رہے گا اس وقت تک خدا واسطے کے دشمن پیدا ہوتے رہیں گے۔ کوئی کسی کا حق ادا نہ کرے گا۔ یہ بات صرف اپنی ذات کی حد تک نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ بات اپنے جیسے سارے جنون رکھنے والوں کے سلسلے میں کہہ رہا ہوں۔

بہرحال میرے اوپر کام کرنے، صرف کام کرنے کی جو ہوست طاری ہو چکی ہے اُسے چھانٹنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کروں گا۔ ہر وقت جو دماغ میں یہ کیڑا سرسراتا ہے اِس پہاڑ کو عبور کر دو اُس پربت کو بھی سر کرو۔ اس رویہ کو اگر کم نہ کیا تو میں اس دنیا سے جلد رخصت ہو جاؤں گا۔ جس کا ہم عصروں کو کوئی غم نہ ہوگا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تیل دیکھا ہے تیل کی دھار بھی دیکھی ہے۔

اپنے دَور میں مولانا ظفر علی، مولانا غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، نیاز فتحپوری، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو کو آج کون یاد کر رہا ہے۔ ان کی یاد آج اگر قدرے ہے تو صرف اس لیے کہ بندہ ان کا خوشہ چین رہا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: زندگی کا ایک دن معین ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! نظامِ قدرت بھی ایک چیز ہے۔ اس سے آنکھیں چرانے والا نظامِ قدرت کو بدل نہیں سکتا۔ باقی باتیں اللہ والوں کی ہیں، ہم جیسے گنہ گاروں کو اس سے کیا مطلب!

سطورِ بالا میں، میں نے جو کچھ لکھا، شاید وہ ماحول کا اثر ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے مگر ان لوگوں نے تو مناسب اور نامناسب کی تفریق مٹا دی۔ میں اس حد تک بندۂ آزاد نہیں بن سکتا۔ فطرت کو بدلنے کے لیے سرنگیں لگائی جا سکتی ہیں مگر وہ زیادہ دُور تک نہیں جا سکیں گی۔ عافیت بھی اسی حد تک ہے۔ اگر اوپر میں کوئی بات ایسی کہہ گیا ہوں جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی تو دوست مجھے معاف کریں! اللہ تو معاف کرنے والا ہے ہی!

ڈاکٹر حیدر کا گھر لکھنے پڑھنے کے لیے مثالی ہے۔ میں اس وقت ان کے باغ میں بیٹھا ہوں۔ میرے

سامنے گلاب کے پھولوں کے اتنے پودے ہیں کہ کیا ان کا بیان ہو۔ میرے بائیں ہاتھ گلاب کا ایک پودا ہے۔ اس کے پھول اتنے خوب صورت ہیں کہ میں کل سے دیکھ رہا ہُوں اور طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ میں نے سیاہ گلاب کا نام سنا ہوا تھا وہ میں نے یہاں دیکھا۔ سو فیصد کالا تو نہیں مگر نوّے فیصد کی حد تک کالا ہے۔ غرض سُرخ، گلابی اور پیلے رنگ کے، رنگ کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

پھر سیبوں اور ناشپاتیوں کے درخت بھی یہاں موجود ہیں۔ سیب بھی سیکڑوں کے اعتبار سے لگے ہیں اور ناشپاتیاں بھی۔ گلاب کے پھولوں کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دوسرے پھُول بھی موجود ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی قسم کے۔ چھوٹے اتنے کہ چنے کے دانے کے برابر، بڑے اتنے کہ دو ہاتھوں میں ایک پھول آتے۔

یہاں آ کے دیکھا کہ پتّے بھی پھُول نما ہوتے ہیں۔ ان کی دلکشی پھولوں سے کم نہیں ہوتی۔ وہ پتّے نما پھُول بھی یہاں بہت ہیں۔ جدھر دیکھا جائے، دیکھا ہی جائے۔

اسی باغ میں بچّوں کے لیے جھُولا، وہ بھی موجود ہے جسے اپنے ہاں گھیسی کہا جاتا ہے۔ البتہ باغ میں ایک جگہ مٹی ڈالی گئی ہے کیونکہ یہاں والوں کا خیال ہے کہ مٹی جسم کی نشوونما میں مدد دیتی ہے۔ ایسا میں نے صرف ڈاکٹر حیدر کے ہاں نہ دیکھا بلکہ سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے پارکوں میں بھی دیکھا کہ مٹی کے لیے اہتمام کیا گیا ہے تاکہ بچّے اس میں لوٹ پوٹ ہوں۔

ڈاکٹر کے اندر جو جنون ہے وہ اسے کسی طرف بھی لے جائے، وہ اسے بے چین اور بے قرار رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہسپتال سے لیکچر دے کے واپس آئیں گے۔ کوٹ پتلون اتاریں گے۔ میلے سے باغ میں کام کرنے والے کپڑے پہنیں گے۔ پنڈلیوں تک پہنچنے والے بڑے سے ربڑ کے بُوٹ پہنیں گے اور باغ کی دیکھ بھال شروع کر دیں گے۔ میں انہیں اس حالت میں دیکھ دیکھ کے تھک جاتا ہُوں مگر وہ نہیں تھکتے کہ اُکڑوں چل رہے ہیں۔ اِس پودے کو اکھاڑ رہے ہیں، اُس پودے کو پانی دے رہے ہیں۔ جو خودرو گھاس پھُونس اُگ آتی ہے اسے نکال رہے ہیں، زمین میں بیج ڈال رہے ہیں، پودوں کی شاخیں کاٹ رہے ہیں۔

انہوں نے اسی باغ میں تجربے کرنے کے لیے، پانچ شیشے کے گھر بنا رکھے ہیں، جہاں پودے اُگے ہُوئے ہیں۔ تجربات ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تجربات کو پھلتا پھُولتا دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ شیشہ کے گھروں کے علاوہ ایک اسٹور ہے جہاں بیج پڑے ہُوئے ہیں۔ اپنے اپنے موسم میں وُہ سب کچھ لگے گا، اور ایک تجرباتی لیبارٹری الگ ہے، جہاں پودے کی نسل اور تبدیلیٔ جنس کے لیے ریسرچ ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے وہ کرے کسی سائنس دان کے ہوں۔

ابھی ابھی ڈاکٹر حیدر کی بیگم چائے لے کر اُسی سمت گئی ہے جہاں کہ ڈاکٹر صاحب پودوں کی دیکھ بھال میں مگن ہیں۔ شاید بیگم کو معلوم ہے کہ وہ اس وقت یعنی چائے کے وقت چائے بھی نہ پئیں گے، جب تک کہ

چائے کو خود اُن تک نہ پہنچایا جاتے۔

ہاں یہ بتانا تو بھول گیا، جب سے آیا ہُوں ان کے باغ کی سبزیاں کھا رہا ہُوں۔ آلو موجود، بینگن موجود، ساگ موجود، مٹر موجود، بھنڈی توری موجود، گھیا موجود، شلجم موجود، مولی موجود، ٹماٹر موجود، گاجر موجود، کھیرا موجود، دھنیا موجود۔ پھر ان کی کئی قسمیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں یہاں کچھ دن رہ سکا تو صحت بحال ہو جائے گی۔ پھر تازہ دم ہو جاؤں گا۔ وہ جو صحت میں نڈھالی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ کم ہو جائے گی۔

میں یہ یادداشتیں اپنے لیے لکھ رہا ہُوں، انھیں کبھی کبھی پڑھ کر، خود کو تازہ دم رکھ سکوں گا، ورنہ ان کے لکھنے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ پچھلی بار بھی میں نے یادداشتیں لکھی تھیں۔ مگر وُہ چھپوائی نہ تھیں کیونکہ اس غرض سے لکھی ہی نہ تھیں۔

پھر میں نے دیکھا تھا کہ سفرناموں کے لیے یاروں نے جھُوٹ لکھنا ضروری سمجھ رکھا ہے۔ مثلاً ہر قدم پر لڑکیاں اُن پر عاشق ہوتی ہیں۔ ایسا کوئی قصہ نہیں۔ کیونکہ وُہ لوگ تو کالی چمڑی والوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتے۔ ریل کے سفر کے دوران اگر کوئی کالی چمڑی والا پہلے سے بیٹھا ہو تو وہ لوگ باہر کھڑا رہنا پسند کریں گے۔ مگر خالی سیٹوں پر، محض کالے آدمی کی وجہ سے بیٹھنا پسند نہ کریں گے۔ ہاں اگر آپ کی جیب میں پیسے ہیں تو جسم بیچنے والی لڑکیاں خاصی تعداد میں مل جائیں گی۔

ہمارے سفرنامہ نگاروں نے ایسی ہی لڑکیوں کو اپنے اوپر لٹو بنا کر پیش کیا ہے۔ طریقہ ان کا یہ ہے کہ ہوٹلوں میں ایک میز پر جا کر بیٹھ جائیں گی۔ اُن کے شوقین اُن کے پاس یہ پُوچھ کر بیٹھ جائیں گے، کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟ اس کے بعد کھائیں پئیں گے، پیسے طے کریں گے اور کہیں جا کر جھک ماریں گے۔ یہ ان کا روز کا وطیرہ ہے۔ ہاں بازار کے چوکوں میں بھی ایسی وقتی دوستی ہوتی ہے جسے بڑھا چڑھا کر، افسانہ نویسوں اور کالم نگاروں نے اور بھی افسانہ بنا دیا۔ لکھنے والوں نے تو اپنی اندرونی خواہشوں کے زیر اثر جھوٹ موٹ لکھا، مگر پڑھنے والوں کی بلا وجہ رال ٹپکے جا رہی ہے۔

اب رات کا وقت قریب آ رہا ہے۔ شام رخصت ہو رہی ہے۔ مگر غروبِ آفتاب کے وقت، کل سمندر کے کنارے سُورج کا ڈوبنا کبھی نہ بھُولے گا۔ پانیوں کے اوپر، سورج کبھی اتنا خوب صُورت نہیں لگا، جتنا کہ کل لگا۔ لوگ بھی زیادہ تر اسی سمے کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر رہے تھے۔ اُدھر سمندر کے کنارے ٹھہرے ہوئے مسافر بھی اپنی دُوربینوں کو لگائے وہی سماں دیکھ رہے تھے۔

جرمنی میں بھی جہاں کہ ہم ٹھہرے تھے ایک گھرانے کا ہوٹل تھا، لوگ گھر کے چند کمرے اپنے پاس رکھ کر باقی کمروں کو کرایہ پر دے دیتے ہیں، خود سروس کرتے ہیں، اچھی اچھی چیزیں پکاتے ہیں، خود بھی کھاتے ہیں مسافروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ اس کام کے لیے لڑکیاں بھی مامور ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہی مسافروں کی سہولتوں کے لیے کام کاج کر رہی ہیں، کھلا پلا رہی ہیں، گھر کا سا ماحول ہوتا ہے۔

یہاں بھی کل سمندر کے کنارے ایسے ہی ہوٹل دیکھے جہاں کپڑے لٹک رہے تھے، بچے کھیل رہے تھے۔

اکثر گھرانوں کا اسی انداز کا کاروبار ہے۔ جو وہ لوگ بڑی شائستگی سے ادا کر رہے ہیں، خدمت بھی کاروبار بھی، یہ کام چھوٹے موٹے لوگ نہیں کر رہے بلکہ آسودہ حال لوگ ایسا کر رہے ہیں، جنہوں نے لاکھوں کے سرمائے سے اس کام کو اپنایا۔

میں جس دن یہاں پہنچا تھا اس دن میں نے سُوٹ کیس کھولنا چاہا تو وہ مجھ سے نہ کھُلا کیونکہ چابیوں کے علاوہ وہ نمبروں کے تعین پر کھُلتا تھا۔ یہاں پہنچا تو صبح تھی۔ مگر اس کے کھولنے کی ضرورت رات کے ۱۲½ بجے پڑی، جب کہ سونے کے کپڑے نکالنا تھے۔ میں نے لاکھ کوشش کی وہ سوٹ کیس مجھ سے نہ کھُلا۔ آدھ گھنٹہ تک میں نے اپنی ساری عقل اور سُوجھ بُوجھ ختم کر ڈالی۔ ناچار ڈاکٹر صاحب کو آواز دی، اپنی مشکل بتائی۔ انہوں نے کہا: یہ کام صبح کریں گے اس وقت میں آپ کو کپڑے دیتا ہُوں وُہ پہن لیں۔

میں اپنی زندگی میں عجیب گڑبڑ گھوٹالا ہُوں۔ کسی کام کو سلیقے سے نہیں کر سکتا۔ بی بی سی لگانا ہو تو وہ مجھ سے نہیں لگتا۔ ٹیلی ویژن کے رنگوں کو متوازن بنانا ہو، وہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈر کے سلسلے میں بھی میری ایسی ہی پریشانیاں ہیں۔ بھگڑ تو اس قسم کا ہُوں کہ دُنیا جتنا بھی ہنسے وہ کم ہوگا۔ اس باب میں مثالیں دینے لگا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ (ایک آدھ)

چنانچہ دوسری صبح ڈاکٹر صاحب نے سوٹ کیس کو چند منٹوں میں کھول دیا۔ اس سے پہلے میں نے سُوٹ کیس اس لیے نہ کھولا تھا کہ جاوید ساتھ تھا وہی سب ایسے کام کر دیتا تھا۔ وُہ پہلا دن تھا کہ اکیلا ہُوا تھا۔

۲۳ اگست

گھر سے پرویز کے خطوط آ رہے ہیں، یہاں کی کوئی فکر نہ کریں بلکہ صحت کے لیے آپ کا وہاں ٹِکنا ضروری ہے۔ لیجئے ہمیں ہر دم گھر کی فکر، بچّوں کی فکر، پوتے پوتیوں کی فکر، مگر وہی لوگ کہہ رہے ہیں ہماری فکر نہ کیجئے۔ بچّوں نے کبھی والد یا والدین کے رُوپ کو اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ محسوس نہیں کیا۔ بے شک جوان ہوں، عقلمند ہوں، پڑھے لکھے ہوں۔ اس کے باوجود والدین بچّوں کے لیے طرح طرح کے وسوسے اپنے دلوں میں رکھنے پر مجبور ہیں، جیسے اولاد محسوس نہیں کر سکتی بلکہ اگر اس قسم کا اظہار ان کے سامنے کر دیا جائے تو وہ ماں باپ کی ایسی سوچوں پر حظ اٹھاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پرویز لکھ رہا تھا: ہماری فکر نہ کیجئے گا!

باہر کی دنیا کا سفر، ایک آدھ ماہ ہی کے لیے اچھا لگتا ہے ورنہ ماحول کی اجنبیت واپس گھر میں جانے پر مجبور کرتی ہے۔ مگر میں گھر سے دو تین کام ذہن میں رکھ کر نکلا تھا۔ ایک تو مشین دیکھنا تھی۔ اس کام کے لیے میرا باہر نکلنا ضروری نہ تھا۔ گھر بیٹھے ایجنٹوں کے ذریعہ یہ کام ہو سکتا تھا۔ ایک مسئلہ تو آرام اور علاج کا تھا۔ دوسرا کام حج یا عمرہ کرنے کا۔ حج والا معاملہ تو لاہور ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ کیونکہ بعد میں ٹریولنگ ایجنٹ نے ٹکٹ پر لکھ دیا تھا

کہ جدّہ کا سفر، حج کے بعد کیا جا سکے گا۔ اب بات عُمرہ کی رہ گئی ہے۔ اگر عُمرہ کی اجازت حج کے پندرہ بیس دن بعد دی جا سکی تو ضرور عمرہ کروں گا' ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ ہوٹلوں کا بڑا خرچ ہے۔ دوستوں کو بھی زیادہ زحمت سے دوچار نہیں کرنا چاہیے۔ آج گھر سے نکلے، ایک ماہ سے زاید عرصہ گزر چکا ہے۔ میں پہلے بھی پونے دو ماہ تک لندن میں رہا تھا اب کے بھی زیادہ سے زیادہ یہی عرصہ ذہن میں ہے۔ گو اب کے میں پہلے سے زیادہ پریشان ہو رہا ہوں ہر چند کہ دوستوں کی دوستی میں کمی نہیں آئی۔

دیکھ لیجئے میں ساری باتیں کرتا ہُوں مگر اصل بات بھُول جاتا ہوں۔ یہاں مجھے یہ کہنا تھا کہ میں "لیٹر پوٹ" (جو کہ نستعلیق اردو ٹائپ بنا رہے ہیں) والوں کی ترغیب پر یہاں آیا تھا۔ جرمنی کے شہر ہاگن میں ان کا دفتر ہے۔ یہ لوگ جو مشین بنا رہے ہیں وہ قیمت میں کافی کم ہو گی۔ اگر میری تھوڑی سی توجّہ سے کمپیوٹرائزڈ مشین مکمل ہو گئی تو میں سمجھوں گا یہ مجھ سے ایک بڑا کام ہُوا۔

گھر والوں کے لیے ایک خط لندن میں لکھا تھا، بیگم صاحبہ کے نام، گھر والوں کے نام، مطلب یہ کہ بڑوں کے نام اور چھوٹے بچّوں کے بھی نام، یعنی وُہ ایک خط نہ تھا، چار پانچ خطوط تھے۔ وُہ خط پوسٹ نہ ہو رہا تھا۔ بالآخر اس کا اہتمام کیا گیا، ڈاک خانے جانا پڑا اور وُہ خط پوسٹ ہُوا۔

میں جب سے اِدھر آیا تھا' خوب سوتا تھا۔ جیسے گھوڑے بیچ کے سویا جاتا ہے۔ مگر آج رات، پہلی مرتبہ جب سے گھر سے نکلے ہیں' پہلی مرتبہ کوئی بارہ بجے کے قریب لیٹا ہُوں گا۔ ۲ بجے نیند اُچٹ گئی۔ پھر بڑی کوشش کی کہ نیند آئے، مگر وُہ نہ آئی۔ رات چھٹتی گئی۔ صبح ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ روشنی پھیل گئی۔ پھر اس نیند نہ آنے کے طرح طرح کے وسوسے، یہ تو میں مانتا ہُوں کہ دُور ہوتے ہُوئے بھی ایک ربط اپنوں سے قائم رہتا ہے۔ اُسی بنیاد پہ خیال آتا رہا' خدا خیر کرے، سب کی خیریت کی دعائیں مانگیں۔

آج کا دن گھر پر رہے۔ باہر نہ نکلے، اس لیے کہ زیادہ بھاگم دوڑ میں بیمار پڑنے کا خطرہ ہے۔ میں اب توانا تو ہُوں نہیں جیسا کہ کبھی تھا۔ اس لیے کھانے پینے میں احتیاط کرتا ہُوں۔ سیر تفریح میں بھی توازن کا خیال رکھتا ہُوں۔ رکھتا کیا ہوں، رکھنا پڑتا ہے۔

۲۴ اگست

آج ہم لیورپول میں انٹرنیشنل گارڈن فیسٹیول دیکھنے گئے جو یہاں سے پچاس ساٹھ کلومیٹر پہ ہو گا۔ گاڑی پہ مسافت آدھ گھنٹہ کے لگ بھگ ہو گی۔ سُنا ہے کہ یہ نمائش چار ماہ سے لگی ہُوئی ہے اور دو ماہ اور لگی رہے گی۔ مگر رش بے پناہ تھا، ہر چند کہ چھٹّی کا دن تھا باہر گاڑیاں اتنی کھڑی تھیں کہ ہزاروں کی تعداد میں گنا جا سکتا تھا۔

جس علاقہ میں نمائش لگی ہوئی تھی اُس علاقے کو ٹاکس ٹپ کہتے ہیں۔ کوئی دو سال ہوئے یہاں کالے اور گوروں کے درمیان فساد ہوا تھا۔ یہاں پہ نیگرو لوگوں کی اکثریت آباد ہے۔ ہم اُدھر اخباروں میں پڑھتے تھے تو بے حد پریشان ہوتے تھے۔ جیسے تمام کالوں کو ہلاک کر دیا گیا ہو۔ اُن کالوں میں ہم اپنے ہاں کے لوگوں کو بھی شمار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بے حد پریشان ہو کر ڈاکٹر صاحب کی خیریت پوچھی تھی اور وہاں کے حالات کی تفصیل پوچھی تھی۔ چنانچہ اُن دنوں بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا: کوئی خاص بات گھبرانے کی نہیں ہے۔ ایک علاقہ میں ذرا گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایک کالا اور دو گورے مر گئے ہیں۔ کیونکہ پولیس کو گولی چلانے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لیے ہمیشہ زیادہ تر گورے مارے جائیں گے۔

بہرحال وہ علاقہ اب میرے زیرِ قدم تھا، نمائش میں وُہ ذرا سا ایک حصّہ جوں کا توں باقی رکھا گیا تھا جیسا کہ وہ نمائش سے پہلے تھا۔ بے شک وُہ ایک بڑا سا قطعہ خالی ہوگا مگر وہ گوڑا کرکٹ سے اٹا پڑا تھا۔ مگر اب وہ گلستان کے رُوپ میں ہمارے سامنے تھا۔

یہ انٹرنیشنل نمائش تھی، اس لیے تقریباً ساری دُنیا نے اس میں حصّہ لیا تھا۔ پھول تو پھول اسکاٹ لینڈ والے اپنے ہاں کے پتھر تک اٹھا لائے تھے، بھاری بھاری پتھر، جن کا وزن منوں میں ٹنوں میں ہوگا۔ یہ پتھر آرائش کے لیے، اپنے ہاں کا ماحول بنانے کے لیے رکھے گئے تھے۔ غرض پھولوں کے ساتھ اپنے ہاں کی نمائندہ آرائشی اشیاء کی بھی ایک طرح کی نمائش تھی، ماحول کی نمائندگی کی خاطر۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ چین کا گارڈن ہے، یہ جاپان کا، یہ امریکہ کا۔

یہ لوگ ہر معاملہ میں بچوں کی تفریح کا بڑا سامان کرتے ہیں۔ اس نمائش میں بھی جگہ جگہ یہ اہتمام تھا۔ ہر دو تین سو گز کے فاصلے پر، کچھ نہ کچھ بچوں کا سامان موجود تھا۔ بچے اِدھر بھاگے لپکے جا رہے ہیں۔ یہاں یہ نہیں ہے کہ بچے ہر معاملہ میں والدین کی رہنمائی کے محتاج ہوں۔ بچے خود اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ وہ والدین کو اپنے من کی کارروائیوں کا موقع دیتے ہیں۔ اس کے بعد بچے والدین کو خود ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میں نے اتنی بڑی نمائش میں یہ اعلان نہیں سُنا کہ فلاں بچہ والدین سے بچھڑ گیا ہے اُسے انفارمیشن کاؤنٹر سے حاصل کیا جائے۔

خور و نوش کے لیے بھی بڑے بڑے ہوٹل موجود، متعدد ہوٹل، جن میں بیک وقت سیکڑوں افراد کھا پی سکیں۔ اپنے ملک میں ابھی وُہ رواج نہیں ہُوا۔ باہر گتے کی تھالیاں، پیالیاں، گلاس، چمچے اور کانٹے ملتے ہیں جو کھانے کے بعد وہیں پھینک دئے جاتے ہیں، جس کے لیے پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈرم نما برتن پڑے ہیں ان میں یہ سب کچھ بعد استعمال ڈال دیا جاتا ہے۔

جو چیز آپ خریدیں گے اس کے لیے آپ کو جو پلاسٹک کا بیگ دیا جائے گا اس پر انٹرنیشنل گارڈن فیسٹیول چھپا ہوا ہوگا۔ جس ہوٹل میں آپ نے کھانا کھایا اُن کے برتنوں پر بھی انٹرنیشنل گارڈن فیسٹیول لیورپول لکھا ہوگا۔

یعنی آپ چاہیں تو اس یادکویوں کو بھی محفوظ رکھ سکیں گے۔ حتیٰ کہ اس موقع کے لیے گورنمنٹ نے ٹکٹ بھی جاری کیے۔

یہ نمائش اتنی بڑی ہے کہ اس کے لیے اندر ہی اندر کئی ٹرینیں چلتی ہیں جو آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں۔ پہلے جب میں نے انھیں سیٹی بجاتے اور چھک چھک کرتے گزرتے دیکھا تو میں سمجھا یہ محض بچوں کو بہلانے کا سامان ہے۔ مگر جب ہم چلتے چلتے تھک تھک کے چُور ہوئے تو ضرورت محسوس کی کہ اب دوسری جگہ گاڑی میں بیٹھ کر پہنچا جائے۔ گاڑی میں بھی جگہ آسانی سے نہیں ملتی۔ ایک لمبی قطار لگی ہوتی ہے۔ کم از کم آدھ گھنٹہ تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس حالت میں ہم نے گاڑی پہ بھی سفر کیا۔

میں اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنا تھکا نہ ہوں گا جتنا کہ اس نمائش میں تھکا۔ ٹانگیں چلنے سے انکار کر رہی ہیں مگر شوقِ دید اتنا شدید کہ ادھر لپکے ادھر لپکے والا سماں، کئی جگہ ستانے کے لیے بیٹھے بھی۔ چائے اور کافی سے اپنے آپ کو تازہ دم رکھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہاں تو پھولوں کی ایک دُنیا آباد تھی، جہاں تہاں یہ سب کچھ بکھرا پڑا تھا۔

میں نے ابھی تک آپ سے پھولوں کی بات نہیں کی، اُن کی خوشنمائی کی بات نہیں کی، ان کی قسموں کی بات نہیں کی، وہ میں کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا بیان مجھ سے ممکن ہی نہیں کیونکہ وہاں ایک جگہ لکھا تھا کہ صرف گھاس کی دس ہزار قسمیں ہیں۔ اُن میں سے کچھ یہاں پہ موجود ہیں۔ جب دس ہزار قسمیں گھاس کی ہوں گی تو پھولوں کی قسموں کا اندازہ آپ خود کریں۔ ہزاروں قسمیں تو گلاب کے پھولوں کی ہوں گی۔ ریسرچ برابر ہو رہی ہے۔ نئے پھولوں کی دریافت جاری ہے۔ "روز سوسائٹیاں" بنی ہوئی ہیں۔ آپ اس کے ممبر بن جائیں گے، تو وہ آپ کو اپنے تجربات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ یعنی پھولوں کی ایک اپنی الگ دُنیا ہے۔ اس سے دل چسپی رکھنے والوں کی بھی تعداد لاکھوں میں، جسے یہ دلآویز شوق پڑ گیا وہ تو پھر اس میں مگن ہو گیا۔ یہی دل چسپی اُس کی اُسے کسی اور دل چسپی کے لیے وقت نہیں دیتی۔

یورپ کے جو علاقے میں نے دیکھے، اُن میں اہلِ جرمنی کو پھولوں کا شوق سب سے زیادہ ہے۔ وہاں تو ہر گھر میں پھول سجے ہیں، مکان کے اندر بھی مکان کے باہر بھی، پھر ہر اس جگہ پر پھول کہ جو راستے میں خالی تھی۔

جو لوگ حسِ لطیف رکھتے ہیں وہی پھولوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ایسی ہی باتوں سے قوموں کے مزاج کا علم ہوتا ہے۔ زندگی سے دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جرمنی جو ایک وقت میں ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا، آج گل و گلزار بنا ہوا ہے۔

یہاں ایک سے ایک بڑھ کر ملکوں کے پھول تھے جو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ جو کہتے تھے ہمیں دیکھو اور اس کے بعد قدرت کو دیکھو۔ جو ہم سے بھی زیادہ حسین ہوگی۔ مگر جو ہمیں سب سے زیادہ باغ پسند آیا وہ ہالینڈ کا تھا۔ اتنے پھول اور اتنے خوشنما پھول کہ عقل دنگ رہ جائے۔ پھر کوالٹی بھی، ورائٹی بھی، پھر سجاوٹ کا اہتمام، مجھے تو ایسا لگا جیسے ہالینڈ والے اور کوئی کام نہ کرتے ہوں گے، صرف پھول اگاتے اور سجاتے ہوں گے۔

ہم نمائش میں صبح ساڑھے دس بجے داخل ہوئے تھے۔ رات جب گھر واپس پہنچے تو اس وقت بھی ساڑھے دس بجے تھے۔ گویا بارہ گھنٹے قدرت نے ہمیں اپنے حُسن سے نوازا۔ ہم بارہ گھنٹوں تک دنیاوی جنت میں رہے۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کو بھی پھُولوں سے حد درجہ کی دلچسپی ہے وُہ بھی اپنی مصروف زندگی میں سے پھولوں کے لئے چار پانچ گھنٹے روزانہ نکالتے ہیں۔ اپنے تجربات سے سوسائٹیوں کو آگاہ کرتے ہیں اور سوسائٹیاں انہیں اپنے تجربات سے مطلع کرتی رہتی ہیں۔ جب بھی میں نے کسی خوب صورت پھُول کی طرف اشارہ کیا، ڈاکٹر صاحب نے بتایا:

یہ پھُول ہمارے ہاں ہے۔

رات جو واپس آکر سوئے تو صبح دیر تک سوتے رہے۔ پھولوں کی خوشبوؤں نے تھپکیاں دے کے سلائے رکھا۔ جن آنکھوں نے یہ سماں دیکھا ہے وہ کتنی خوش قسمت ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تھک تھکا کے چکنا چور ہو گئے تھے اگر محض تھکاوٹ کی وجہ سے، نمائش کا کچھ حصّہ نہ دیکھ سکتے تو وہ صدمہ زندگی بھر کا ہوتا!

۲۴ اگست

آج ہم سب دیر سے اُٹھے، میں بھی، ڈاکٹر صاحب بھی، ان کے بیوی بچّے بھی! ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں آج قریب کے کسی سمندر کے کنارے چلیں گے۔ طے پایا کہ کھانا کھا کے چلیں گے۔ ابھی ابھی مجھے ڈاکٹر صاحب نے وُہ گتّے کی رکابی دی ہے جو ہمیں کل کھانے کے وقت نمائش میں دی گئی تھی۔ اس رکابی کی قیمت دس پندرہ پیسے ہوگی مگر اس پر لکھا ہے، انٹرنیشنل گارڈن فیسٹیول لیورپول ۱۹۸۴ء۔ ۲ مئی سے ۱۴ اکتوبر تک۔ یہ رکابی مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی، سنبھال کر رکھوں گا۔ اگر میرے سب سے چھوٹے پوتے عرفان نے اسے توڑ دیا، تو وُہ معاملہ دو پھولوں کا معاملہ ہوگا، بالادست پھول' زیرِ دست پھُول کو پامال کرتے ہی آئے ہیں۔

اپنے کام کاج کے سلسلے میں جاوید لندن میں ہے۔ کاش! وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتا اور پھولوں کی نمائش دیکھ سکتا۔ ملاقات پر اُسے کہوں گا کہ وقت نکالے اور نمائش کے لیے لیورپول جائے۔

مجھے جاوید کے ٹیلیفون کا انتظار ہے، کیونکہ مجھے عمرہ کے لیے معلومات درکار ہیں۔ میں اشفاق مرزا سے جو کویت ایئرویز لندن میں ملازم ہیں، کہہ آیا تھا کہ معلومات حاصل کر کے ہمیں بتایا جائے کہ حج کے کتنے دنوں بعد عمرہ کی اجازت ہوگی!

جاوید کو میں خود اس لیے ٹیلیفون نہیں کر سکتا کہ وُہ اپنی سہولت کی خاطر، اس ہوٹل کو چھوڑنا چاہتا تھا جو کہ میرے لندن چھوڑنے سے پہلے' اس کے پاس تھا۔ کیونکہ وہ لندن کے ایک سرے پر تھا۔ اصل لندن مسافت پر تھا۔ لندن شہر بھی تو ایک ملک ہے، ۴۰، ۴۵ میل کے رقبے میں پھیلا ہُوا۔

میں نے کل ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا کہ اگر یہاں سے زیادہ دُور نہ ہو تو میں شیکسپیئر کے اُس مکان کو

دوبارہ دیکھنا چاہتا ہُوں جہاں کہ وُہ رہتا تھا، اور وُہ ابھی تک اُسی حالت میں موجود ہے، وہ کمرے موجود ہیں، وہ سامان موجود ہے، وہ میز اور کرسی موجود ہے جہاں کہ وہ بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ اور میں نے اُن دنوں وہاں رکھی وزیٹر بک پر اپنے تاثرات کے ساتھ دستخط کئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: یہاں فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، چلیں گے۔

مجھے لندن کے قریب کیٹس کا وُہ مکان بھی یاد آ گیا جہاں کہ کیٹس کچھ دنوں رہا تھا اور اس کی زیرِ استعمال چیزوں کو جُوں کا تُوں محفوظ رکھا گیا تھا۔

مجھے وُہ لندن کا ہوٹل بھی یاد آیا جہاں کہ شرلک ہومز آ کر بیٹھا کرتا تھا' اور ان لوگوں نے اسے جُوں کا تُوں قائم رکھا ہُوا ہے۔

مجھے برونٹی سسٹرز کی وُہ دو قبریں بھی یاد آئیں جو کہ بریڈ فورڈ کے پاس ایک گاؤں میں جا کر دیکھی تھیں، لکھتی تو تین بہنیں تھیں مگر معروف دو ہوئیں۔

اگر موقع ملا تو یہ سب کچھ دوبارہ دیکھوں گا ورنہ پُرانی یادداشتوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ تازہ کروں گا۔

میں جب یہاں ۱۹۷۰ء میں آیا تھا تو میں نے اپنے سفر کی تمام روداد کو قلم بند کیا تھا۔ مگر میں نے اُن یادداشتوں کو اس لیے نہ چھپوایا تھا کہ ہر کوئی ایسا کرتا تھا۔ دُوسرے مجھے اُس سفر کے ایک کردار نے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ مجھے تو بندوں کی خوشنودی سے ہمیشہ غرض، رہی قلم کی خوشنودی، جذبات کی خوشنودی کوئی معنی نہیں رکھتی!

آج مجھے اپنے رسولؐ نمبر کی بقایا جلدوں کا بھی خیال آیا بلکہ کسی حد تک پریشان ہُوا، کیونکہ جو کام جاری تھے آخری اطلاعات تک' ان کے بقایا مسودے نہیں ملے تھے، بے شک دس جلدیں چھپ چکی تھیں۔ تین اور پیش کرنا چاہتا ہُوں اُن میں سے دو جلدوں کو جُزوی طور پر پریس کے حوالے کر آیا تھا۔ اگر وہ کام میرے ادھر آنے کی وجہ سے رُک گیا اور میں نومبر تک ان جلدوں کو پیش نہ کر سکا تو مجھے کافی عرصے تک صدمہ رہے گا۔ بہرحال واپس جاؤں گا تو یہ جو میں نے دو ماہ کے قریب سکون سے گزارے ہوں گے وُہ میرا کچومر نکال دیں گے!

ڈاکٹر صاحب کو فوٹوگرافی کا بھی شوق ہے۔ باہر نکلتے ہیں تو کیمرہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہ صرف انسانوں کی تصویریں نہیں لیتے بلکہ منظروں کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں ——— آثار کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں، ان کے ساتھ انسانی ہیولوں کو بھی کیمرہ کے ذریعہ محفوظ کرتے ہیں۔ جب میں پہلے آیا تھا اُن دنوں بھی اُنھوں نے میری درجنوں تصویریں لی تھیں جو سلائیڈوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اب پھر وہی کچھ ہو رہا ہے۔

تصویروں کا ذکر آیا، مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مقاماتِ مقدسہ کو دیکھنے کے لیے ۱۹۷۱ء میں سفر کیا تھا۔ میں نے پُوچھا: کیا آپ مکّہ اور مدینہ میں' تصویریں لینے میں کامیاب ہُوئے تھے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ہاں میں نے تصویریں اتار لی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آ رہا، کیونکہ وہاں تو تصویریں لینے کی ممانعت ہے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے وُہ اپنا پروجیکٹر اٹھا لائے۔ سکرین کھول کر سامنے سجا دی۔ اس کے بعد وہ سلائیڈوں سے بھرے ڈبے اٹھا لائے۔ کہا دیکھو، میں نے دیکھا کہ مسجد نبوی کی تصویریں موجود ہیں جو کہ میری پہلے سے دیکھی ہوئی نہ تھیں۔ ایک کے بعد دوسری تصویر، غرض کئی تصویریں۔ فوٹوگرافی کے نقطۂ نظر سے بھی اچھی تصویریں تھیں۔ میں متعجب اور خوش ہُوا۔

میں نے پُوچھا: یہ تصویریں لینے میں کیسے کامیاب ہُوئے؟

کہنے لگے: انسان اگر کسی کام کا تہیہ کر لے تو اس میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ جذبہ کے ساتھ تدبیر بھی کرنی چاہئے!

انہوں نے بتایا کہ میں نے کئی ماہ پہلے، جو روضہ مبارک کے سامنے ہوٹل ہے، اس کا کمرہ بک کرایا تھا اور میں نے ہوٹل والوں کو بتایا تھا کہ میں ہر وقت روضہ کو دیکھنا چاہتا ہُوں، اس لیے عین سامنے کا کمرہ بک کیا جائے۔ چنانچہ میں ہوٹل سے تصویریں لیتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب نے چند ایک تصویریں ایسی بھی دکھائیں جو اندرونی منظر سے علاقہ رکھتی تھیں۔ میں نے کہا: یہ کیسے بنائیں؟

کہنے لگے: میں جب روضہ مبارک کی طرف چلتا تھا تو کیمرہ میرے پاس ہوتا تھا اُسے کھول کر زمین پہ رکھ دیتا تھا، تصویر اُتر جاتی تھی۔ پھر واپس ہوٹل آ کر نئی تصویر اتارنے کے لیے تصویر کے نمبر کو بدلتا تھا۔ اس طرح کئی تصویریں لیں۔ بے شمار ضائع ہو گئیں۔ کچھ کو وہیں کے وہیں بدلا۔ یعنی کیمرے کو زمین پہ رکھے رکھے تصویر کا نمبر بدلا۔ یوں یہ کچھ تصویریں بن گئیں۔

دوسرے ڈاکٹر صاحب نے بتایا: میں نے اپنے ایک گائیڈ کو لالچ دیا، رقم جتنی چاہیے لے لو، مجھے تصویریں اتارنے میں مدد دو۔ چنانچہ میں اُسے متعدد مقامات پہ لیے پھرا۔ میں نے بچ بچا کر کئی نایاب تصویریں اتاریں۔

موقع ملا تو وہ مجھے تصویروں کی دوسری قسط بھی دکھائیں گے۔ ان کے پاس یہ ذخیرہ بھی اتنا بڑا ہے کہ مہینوں دیکھا جا سکتا ہے، جس پر انہوں نے ہزاروں نہیں لاکھوں روپے خرچ کیے ہوں گے۔ پھر یہ سب کچھ سلائیڈوں پر موجود ہے۔ سکرین لگا کر جب دیکھا جاتا ہے تو تصویر کی جزئیات لُطف دیتی ہیں۔

آج صبح میں نے باورچی خانے میں تقریباً گز بھر لمبا گھیا دیکھا، میں بیحد حیران ہُوا، کیونکہ فٹ سوا فٹ لمبے گھیے تو اپنے ہاں دیکھے تھے مگر اتنا بڑا اور لمبا گھیا نہ دیکھا تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی ریسرچ کا کمال تھا۔ ڈاکٹر صاحب سبزیوں پر بھی ریسرچ کرتے رہتے ہیں اور عرصہ سات سال سے اپنے ہاں کی خود کاشت کی ہُوئی سبزیاں کھا رہے ہیں سکتے ہیں، سبزیاں اور پھل ضائع بہت ہوتے ہیں، اس کا دکھ ہے۔

میں نے دیکھا کہ سیب درجنوں کے حساب سے اور ناشپاتیاں اس سے بھی زیادہ اپنی ٹہنیوں سے گر کر زمین پر پڑی ہیں اور انہیں کھانے والا کوئی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان پھلوں اور سبزیوں کو بازار بھجواؤں اور ان کے دام وصول کروں، اس سے میرے جذبے کی توہین ہوگی۔ میں نے پوچھا، پھر ڈھیروں پھلوں اور ترکاریوں کا کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا، وہ دیکھو بڑے بڑے ڈرم رکھے ہیں، ایک دن انھیں اٹھاتا ہوں اس ڈرم میں ڈال دیتا ہوں۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہ سب کچھ کھاد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ کھاد استعمال کرتا رہتا ہوں۔

اپنے کئی شوقوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کو بے حد مصروف بنا رکھا ہے۔ میں نے ان کے کُتّوں، بلّیوں، خرگوشوں اور مچھلیوں کا تو ذکر کیا ہی نہیں۔ بہرحال انھیں کُتّے بڑے پسند ہیں۔ جب یہ لاہور میں تھے تو انہوں نے وہاں بھی بڑی اچھی نسل کے دو کتّے پال رکھے تھے۔ جب وہ ایک دن کھو گئے تھے تو انہوں نے اس رات کھانا نہیں کھایا تھا، کہتے تھے، باوفا جانور کھو گئے اب بے وفا انسانوں سے واسطہ رہے گا۔

انھوں نے اپنے مکان میں مچھلیوں کے لیے تین شیشے کے گھر بنا رکھے ہیں، جن میں ہزاروں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہیں، کوئی ایک انچ سے بڑی نہیں۔ مگر ان کے رنگ متعدد ہیں۔ جب وہ ادھر ادھر گھومتی ہیں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر یہ جانا، اگر انسان اپنی دلچسپیوں کے لیے کچھ شوق پال لے تو وہ پھر ان میں مگن رہتا ہے۔ پھر اسے ایک دوسرے کے خلاف سوچنے، سرگرمِ عمل رہنے اور وہ خود کو پریشان رکھنے سے بچ جاتا ہے۔

میں نے اپنے دوستوں کی یادوں کو یہاں بھی تازہ رکھا۔ مثال کے طور پر مجھے اپنے دوستوں کی مشابہتوں کے بہت سے افراد دیکھنے کو ملے۔ میں نے پہلے ایک جگہ لکھا تھا کہ مجھے نبی بخش بلوچ اور فارغ بخاری کی مشابہت کے آدمی ملے۔ اب تو شاید ہی کوئی ایسا دوست اور خاتون ہو جس میں مجھے اپنے ہاں کی خواتین اور دوستوں کی مشابہت نہ ملی ہو۔ مثلاً فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید، ڈاکٹر سلیم اختر، گوپی چند نارنگ، ذوالفقار تابش وغیرہ۔

کل میں نے ایک خاتون کو دیکھا وہ بالکل قرۃ العین حیدر لگیں۔ دل چاہا ان سے پُوچھوں میرا یہ سوچنا صحیح ہے یا غلط! مگر ایک دم خیال آیا اگر یہ قرۃ العین ہیں تو آج سے بیس برس پہلے ایسی ہوں گی، آج کی قرۃ العین اس سے مختلف ہوگی۔

مجھے آج محمد عالم مختارِ حق اور قاضی مختار احمد کی بھی یاد آئی، وہ یُوں کہ میں نے صدرِ مملکت سے کہا تھا کہ یہ دونوں افراد ہمارے ادارے سے متعلق ہیں ایک پروف ریڈر ہیں، دوسرے خوشنویس، دین دار آدمی ہیں، مگر اتنے وسائل

نہیں رکھتے کہ حج کرسکیں۔ لہٰذا انہیں سرکاری خرچ پر حج کرا دیا جائے۔ جسے صدرِ مملکت نے منظور فرما لیا تھا۔ اس کے بعد جرمنی میں مجھے بذریعہ ٹیلیفون معلوم ہوگیا کہ صدرِ مملکت کی طرف سے انہیں خط مل گیا تھا کہ صدرِ محترم نے ان کا سرکاری خرچ پر حج کرنا منظور کرلیا ہے۔

آج یاد یُوں آئی کہ میں نے اُن سے کہا تھا کہ حج کے موقع پر میری آپ سے ملاقات ہوگی۔ میری خواہش تو پُوری نہ ہُوئی مگر حج کے لیے میں نے خود خواہش کی تھی وُہ پوری ہو رہی ہوگی۔ یہ لوگ وہاں پہنچے ہوں گے، جو میرے لیے صد درجہ خوشی کی بات ہے۔

انسان نارسائیوں کا پُتلا ہے۔ دوسرے اپنے ہاں کے دفتری انتظامات کی بے رُخی سے خیال یہ بھی ہے کہ اس مہم میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی ہو، کوئی الجھن نہ پڑ گئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی ہوگی تو برادرم صدیق سالک کی وجہ سے آسان ہو گئی ہوگی۔

میں پہلے سوئٹزرلینڈ اُترا، وہاں کی لڑکیوں کو بہت بے باک پایا، وہاں کے لڑکے بھی ویسے ہی چھٹے چلے جا رہے ہیں۔ پھر اٹلی گیا، صورتِ حال وہی تھی۔ مگر یہاں کی لڑکیاں باتیں زیادہ کرتی ہیں اس لیے کچھ وقت باتوں میں بھی گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد جرمنی گیا، وہاں بڑے شہروں میں تو لپٹنے لپٹانے کی رسم ہے مگر ذرا کم ہے۔ ایک طنطنہ اس قوم کے پاس ابھی باقی ہے۔ اس کے بعد لندن اُترا۔ سوئٹزرلینڈ کو دیکھوں تو لندن والے کافی اپنے آپ میں ہیں، مگر اپنے حسابوں نرے لُچے۔ یہ لُچا پن اب یورپ کا عام رویّہ ہے، جسے یہ لوگ صحت مند گردانتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہوگی کیونکہ پہلے پہل میں لوگوں کی چُوما چاٹی کو غور اور تحیّر سے دیکھتا رہا۔ مگر اب جو کچھ بھی ہو رہا ہو، ہوتا رہے، اپنی بلا سے، ہمیں تو اپنی وہی ایک سانولی سلونی بھلی لگے جو ہزاروں میل دُور ہے، جو بُری طرح یاد آتی ہے۔ کاش! وُہ بھی میرے اس سفر میں ساتھ ہوتی۔ معاملہ اپنی جیب کا بھی تھا جسے سُود و زیاں کی پرستار عورتیں اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتیں۔

میں جس پیڈ پر بیگم کو خط لکھا کرتا تھا اس کا یہ آخری ورق ہے۔ اگر جلد پیڈ مل گیا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا ورنہ پیڈ ملنے تک یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ مگر یہ بات بیگم مانے گی نہیں، رنگ رلیوں کا طعنہ دے گی۔ اوقاتِ تعیش کے تقسیم ہونے کا طعنہ دے گی۔

۲۵ اگست (جمعہ)

میں ۱۹۷۰ء میں بھی بلیک پول آیا تھا، آج دوبارہ آیا۔ یہ علاقہ مجھے پہلے سے زیادہ مائل بہ ترقی لگا۔ انگریز نے تو ہر بات میں کاروبار کی سوچی، پھر اسے ترقی دیتا چلا گیا۔ یہ بات اس شہر سے متعلق بھی ہوگی، جبھی تو اسے اچھا اور مزید اچھا بنانے کی فکر ہوگی۔

کاروبار سے یاد آیا کہ میں نے اُوپر جو کاروبار کے متعلق فقرہ لکھا ہے وہ ایسے ہی نہیں لکھ دیا ایک تاثر کے تحت لکھا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ انگریز کاروبار کرتا ہے اور صرف کاروبار۔ مگر کاروبار میں ایک سلیقہ رکھتا ہے۔ بظاہر وُہ کاروبار نہیں لگتا بلکہ عوام کے لیے تفریحِ طبع کا سامان لگتا ہے۔ مگر تفریحِ طبع کے بہانے کاروبار کو فروغ دینا مطلوب ہوتا ہے۔

یہ وُہ ملک ہے جہاں میں نے پانچ روپے میں پیشاب کیا۔ وُہ یوں کہ ایک جگہ ڈبلیو سی (W.C.) لکھا ہُوا تھا میں وہاں چلا گیا۔ معلوم ہُوا پانچ روپے کا سکہ مشین میں ڈالیے تب راستہ صاف ہوگا اور آپ فراغت حاصل کر سکیں گے۔ چنانچہ صاحب! ایسا کیا گیا۔

جگہ جگہ کُوڑا کرکٹ کے لیے ڈرم پڑے ہیں۔ آپ ہر فالتو چیز اس میں ڈالیں گے۔ گھروں کے باہر جو آپ کُوڑا کرکٹ جمع کرتے ہیں جسے میونسپلٹی والے اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ ان کا بھی قصہ یہ ہے کہ وُہ ایک بہت بڑے ہال میں یا متعدد ہالوں میں لے جایا جاتا ہے اُسے آگ لگا دی جاتی ہے۔ آگ سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے اُسے گھروں میں بطور تپش استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی انگریز نے اس ناکارہ چیز سے بھی فائدہ اٹھایا۔

پُورے انگلستان میں اب ٹرام صرف بلیک پول میں چلتی ہے کیونکہ یہ ٹرام سمندر کے کنارے کنارے چلتی ہے، جو سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ شاید اسی لیے اب تک پرانے سلسلے کو ترک نہیں کیا گیا۔

بیگم صاحبہ کے وعدے کے مطابق مجھے خط لکھنے کے لیے پیڈ کی ضرورت تھی جسے ہم نے بلیک پول میں تلاش کرنا چاہا۔ اس تلاش میں چلتے گئے، چلتے گئے، کوئی ایسی دکان ایک ڈیڑھ میل میں بھی راستے میں نہ پڑی کہ ہم خرید سکتے۔ کافی تلاش کے بعد مشکل حل ہُوئی۔ آپ پوچھیں گے: آخر وہاں تھا کیا کچھ؟ چونکہ یہ جگہ سیر و تفریح کے طور پر اہم ہے اس لیے زیادہ ہوٹل ہیں، جو صرف رات دو رات کے لیے ہی کرایہ پر اُٹھتے ہوں گے۔ لوگ آئے اور گئے، جوڑے آئے اور گئے۔ کیونکہ ان کا کرایہ زیادہ ہے۔ ہوٹل والوں کو بھی علم ہے کہ یہ لوگ دل کے مارے ہُوئے ہیں۔ جو چاہیں گے وصول کریں گے۔ پھر یہ زیادہ تر گرمیوں میں کرایہ پر چڑھتے ہیں۔ سردیوں میں ادھر زیادہ لوگ نہیں آتے۔

آج دھوپ نکلی ہُوئی تھی۔ سمندر کا کنارہ ہے۔ بلیک پول جو اپنی رات کی روشنیوں کی وجہ سے بڑا معروف ہے اس لیے رونق کیوں نہ ہوتی؟ سمندر کے کنارے نیم برہنہ حالت میں لوگ پڑے ہیں۔ یہ نظارہ کہیں کہیں نہ تھا، بلکہ ہر جا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے لوگوں کی اس حالت کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا ہر تفریحی مقام پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر کوئی دھیان نہیں دیتا، کوئی پروا نہیں کرتا۔ اس دنیاوی حمام میں سبھی ننگے تھے۔ ہم جیسے ندیدے دیکھیں یا پریشان ہوں تو ہوں!

اور جگہوں کی طرح یہاں بھی جُوئے خانے عام تھے۔ یہاں جُوا کھیلنے کا انداز ذرا انگریزانہ ہے۔ وہ یُوں کہ ہوٹلوں میں مشینیں پڑی ہیں، رقم ڈالتے جائیے، کھیلتے جائیے۔ اگر آپ کا نشانہ ٹھکانے پر لگا تو رقم بذریعہ مشین

باہر آجائے گی ورنہ مشین ہضم کرتی جائے گی۔ یہ شوق زیادہ تر بڈوں کو ہے۔ چنانچہ یہاں ایسے جوئے خانوں کی بھرمار ہے، جو بھرے ہوئے تھے۔ ایک ایک دکان میں ایسی سیکڑوں مشینیں لگی ہوئی ہیں جن پر قسمت آزمائیاں ہو رہی ہیں۔ جہاں یہ کچھ نہیں وہاں شراب خانے ہیں۔ کافی چائے کی دکانیں ہیں۔ ایسی جگہوں پر یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ ہم اگر خود غلط چیز ڈھونڈنے نکلیں تو قصور ہمارا تھا اُن کا نہ تھا۔

اِدھر والوں کو نہ بیویوں کا پتا کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ نہ شوہروں کا علم کہ وہ کیا گُل کھلا رہے ہیں۔ غرض جو جس کے جی میں آئے کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کا علم ہوتے ہوئے بھی زیادہ تعرض نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ فریقین ہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ ماحول یہ کہ نہ تم کچھ کہو نہ ہم کچھ کہیں گے۔ تم بھی خوش، ہم بھی خوش! ادھر ہماری بیگمات ہیں۔ وُہ وعدہ لے کر باہر جانے دیتی ہیں وہاں ذرا ہوش میں رہنا۔ جو کچھ کرو، جو کچھ دیکھو، وہ ذرا ذرا بتانا۔ ہمارا مزا بھی تو کرکرا اسی وجہ سے ہے اس لیے ہم زیادہ نہیں دیکھتے کہ لکھنا پڑے گا۔

یہ تو ماننا پڑے گا کہ لوگ زندہ دل ہیں۔ یہ زندگی کے ایک ایک لمحہ کو، خوشیوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ اس کے رُوپ کئی ہوتے ہیں۔ آج ایک صاحب کو دیکھا وہ دونوں ہاتھوں پر دو ننھے ننھے بندر بٹھائے پھر رہے تھے وہ بندر عام سے بندر نہ تھے بلکہ رنگ برنگے بندر تھے۔ لمبائی چوڑائی بھی نہایت مختصر، بلکہ نہ ہونے کے برابر، فٹ سوا فٹ، چوڑائی اتنی کہ مٹھی میں آجائیں۔ پہلے میں یہ سمجھا یہ کھلونے ہیں۔ مگر جب انہوں نے حرکت کی میں نے انہیں قریب سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ تو اصلی بندر ہیں جنہیں بہ طور شوق پالا جا رہا ہے۔

یہاں ایک بہت بڑا مجسمہ ہانگ کانگ کا ہے۔ ایک طرف وُہ چھوٹے سے بندر، دوسری طرف ہانگ کانگ کا بہت بڑا مجسمہ، جو کم از کم بھی دو منزلوں کے برابر بڑا ہوگا۔ لوگ اس کی تصویریں لے رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں۔ پھر اسے زمین پر نہیں اونچی جگہ رکھا گیا ہے بلکہ اٹکایا گیا ہے۔ اسے سنبھالنے کے لیے نہ جانے کتنے جتن کئے گئے ہوں گے کہ وہ تیز ہواؤں اور طوفانوں میں بھی برسوں سے جُوں کا تُوں دیکھنے کو مل رہا ہے۔

یہاں گاڑیاں چلانے کی رفتار بڑی تیز ہے۔ بلیک پُول میں اتنی تعداد میں گاڑیاں ہوتی ہیں کہ ایک مسئلہ ہوتا ہے چنانچہ لوگ اندازے کے ساتھ آمنے سامنے جانے پر مجبور رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو ایک اندازے سے بھاگ کر دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ میں نے ان کا ساتھ دینا چاہا تو ایک کار اپنی رفتار سے چلتی میرے بہت قریب آگئی۔ پہلے میں نے سڑک عبور کرنے کا ارادہ کیا، پھر کار کو سر پہ آتے دیکھا تو رُکا۔ ایسا دو بار کیا۔ تذبذب کی اس کیفیت میں وحدہٗ لاشریک بننے والا تھا کہ بچ گیا۔ وحدہٗ لاشریک ان معنوں میں کہ کوئی دُوسرا میری طرح کیوں مرتا!

ہم دن کے بارہ بجے کے قریب بلیک پول پہنچ گئے تھے۔ پہلے سمندر کے کنارے ڈیرے ڈالے۔ بچے بھاگتے دوڑتے رہے۔ یا بچوں کی ماں بچوں کو ایسا کرو، ایسا نہ کرو، اِدھر آؤ، اُدھر جاؤ کہتی رہیں۔ یہاں ماں باپ زیادہ تر کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ بچے جو کرنا چاہتے ہیں اس کی انھیں اجازت دیتے ہیں تاکہ ان میں خود اعتمادی

بڑھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کا ماحول یہاں قطعاً نہیں۔ اگر بچوں نے کہہ دیا جھولا جھولنا ہے تو پیسے لیجئے اور جھولیے۔ اگر بچوں نے یہ کہہ دیا کہ اس گیند گھر میں جانا ہے تو پیسے لیجئے اور جائیے۔ گیند گھر میں نے یہاں یہ دیکھا کہ ایک کمرے میں پلاسٹک کے گیند پڑے ہیں، بچے ٹکٹ لے کر، اس کمرے میں جاتے ہیں تو وہ اُن گیندوں میں دھنس جاتے ہیں۔ شوخ بچے ایک دُوسرے پر گیند پھینکتے ہیں۔ چونکہ وُہ پلاسٹک کے ہیں اس لیے چوٹ نہیں لگتی۔ اُن بچوں کی ایک عورت نے تصویر لینی چاہی۔ چنانچہ کمرے کے اندر سے اس عورت پر اتنے گیند پھینکے کہ وہ کیمرے کو سنبھالے کہ گیندوں کو روکے۔ اس منظر پر سیکڑوں لوگ ہنس رہے ہیں۔ غرض بچے گیند پھینکتے رہے، وہ تصویر لیتی رہی، جس میں کامیاب ہو گئی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اس دوران اس کی عینک بھی گیند لگنے سے گری۔ عینک گری وُہ تو گری، مگر یہ سب کچھ لوگوں کے قہقہوں کے دوران ہُوا۔ بچے بھی خوش، تصویر لینے والا بھی خوش، نظارہ کرنے والا بھی خوش!

تھوڑی دُور جا کر ایک ڈھلوان سیڑھی دیکھی جو کافی اونچی تھی، ہمارے ہاں کی چار منزلوں کے برابر، کوئی ساٹھ فٹ اونچی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ بچہ آخری اونچائی پر پہنچ کر ایک بوری نما چیز پیروں میں ڈالتا تھا اور اوپر سے پھسلتا تھا۔ راستے میں وہ اچھل اچھل جاتا تھا مگر وہ پاؤں میں پڑی چیز کو دونوں ہاتھوں سے تھامے لڑھک رہا ہے۔ اوپر سے نیچے آ رہا ہے۔ اس لڑھکنے میں کبھی کبھی بچے بے قابو ہو جاتے تھے۔ حفاظتی انتظام کے باوجود چوٹ لگتی تھی۔ مگر والدین کھڑے کہتے تھے، کوئی بات نہیں، پھر ویسا ہی کرو جیسا کہ دوسرے کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کے والدین ہوتے تو کہتے: اب ختم کرو کھیل کو، چوٹ لگ جائے گی۔ مگر وُہ الٹا کہہ رہے ہیں پھر اس کھیل میں شامل ہو جاؤ۔ آٹھ دس بچے بیک وقت اُوپر سے نیچے آتے تھے۔ کوئی آگے کوئی پیچھے، مگر نیچے آنے والے راستے میں، ہر ایک کی نیچے پہنچنے کی حد الگ تھی۔

آپ حیران ہوں گے ایک بہت ننھا سا بچہ بھی اس کھیل میں شریک تھا۔ اس کی عمر ڈھائی سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہ پاؤں میں ڈالنے والی بوری نما چیز بھی اٹھا کر سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا، جس کے لیے اسے آسانی مہیا کی جاتی تھی۔ آخری حد تک پہنچ کر، بچے کو وہ چیز پہنا دی جاتی تھی۔ وُہ بھی دوسرے بچوں کی طرح پھدکتا اچھلتا نیچے پہنچ جاتا۔ جس پر تمام حاضرین تالیاں بجا کر بچے کا دل بڑھاتے۔ وہ بار بار ایسا کرتا رہا۔ اس کھیل میں تین سال کے بچے بھی شریک تھے۔ چار پانچ چھ سات سال کے بچے بھی، ہمارے ہاں کے بچے مارے ہول کے پریشان ہوتے۔ ساٹھ فٹ اوپر سے نیچے پہنچنا جب کہ راستے میں چار پانچ بار اُچھلنا بھی ہوتا۔ پھر اتنی تیزی سے اس کا نیچے آنا، اچھی خاصی ہمت والی بات تھی۔ بچے بے قابو ہو کر اگر پریشان ہوتے تو والدین انھیں دوبارہ ویسا ہی کرنے پر اکساتے، حوصلہ بڑھاتے۔ وہ کہتے تھے بچے کی ورزش ہو رہی ہے۔ خطرات سے دوچار ہونے کا ڈر ختم ہو رہا ہے۔ لطف اندوزی کی لطف اندوزی!

ہمارے ہاں بھی ہاتھا پائی کی عادت عام ہے۔ بلکہ پنجابیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ

بہت چلتے ہیں۔ یہاں بھی میں نے ہاتھا پائی کی ایک شکل دیکھی۔ دو مردوں اور ایک عورت کی ہاتھا پائی۔ مگر یہ بہ طور لڑائی نہ تھی بلکہ بہ طور تفننِ طبع۔ دو مرد ایک عورت سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ عورت بھی مساوی جواب دے رہی تھی جب کسی کا ٹھکانے پر ہاتھ لگتا تو خوشی کا نعرہ بلند ہوتا۔ لوگ گزر رہے ہیں اور خوشی کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ گورے ہم جیسے کالوں کو اچھا نہیں سمجھتے، کوشش کرتے ہیں کہ پاس بھی نہ بیٹھیں۔ گاڑیوں میں کھڑے رہیں گے۔ مگر جس ڈبے میں کالے بیٹھے ہوں گے اس ڈبے میں آ کر نہ بیٹھیں گے۔ مگر ایسے مواقع بھی آئے کہ انہوں نے مجھ کالے کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ وجہ بتاتا ہوں، ڈاکٹر حیدر نے ایک خوب صورت سا کتا پال رکھا ہے اس کی زنجیر اگر کسی وقت میرے ہاتھ میں آئی تو وہاں کی لڑکیوں اور عورتوں نے کھڑے ہو کر کتے سے پیار کیا، پچکارا۔ پھر مجھے تحسین کی نظروں سے دیکھ کر مسکرائیں۔ تحسینی کلمات کہتیں۔ اگر کوئی کالا، گوریوں کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا ہے تو وہ ایک خوبصورت کتا پال لے۔

ڈاکٹر حیدر کا ذہن اجتہادی ہے۔ وہ خود سوچنے، خود فیصلہ کرنے کا عادی ہے۔ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ اس پر بہر صورت عمل کرے گا۔ مشکلات راستے میں حائل ہوں تو اسے قطعاً فکر نہ ہو گی۔ وہ محض کسی عمل کو اس لیے ترک نہیں کرتا کہ پریشانیاں درمیان میں آ گئی ہیں۔ وہ پریشانیوں کو پریشانیاں نہیں سمجھتا بلکہ وہ انھیں اجتہادی عمل کا ایک حصہ گردانے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ثابت قدمی سے چلا جائے گا۔

اگر وہ کوئی کام کرنا چاہے گا تو اسے اس بات کی قطعاً پروا نہ ہو گی کہ زمانہ کیا کہے گا! وہ من مانی کر کے رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ مگر مخالفت اس کی منزل کی راہ میں حائل نہ ہوا کرے۔

مثال کے طور پر وہ یہاں بچوں کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے۔ انہیں دو قسم کے مریضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک انگریز مریضوں سے، دوسرے پاکستانی ہندوستانی مریضوں سے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریز مریض سے جو کہہ دیا وہ اس پر عمل کرتا ہے مگر پاکستانی مریض پروا نہیں کرتے۔ مرض کو پالتے رہتے ہیں۔ معالج بڑا بدمزہ ہوتا ہے۔

کہنے لگے (بتانے لگے)، ایک پاکستانی مریضہ میرے پاس آئی، اُسے دوائی دی۔ تین چار ماہ تک علاج کرتا رہا، ایک دن اس نے بتایا کہ مرض بڑھ گیا ہے۔ کہنے لگے: میں تو سٹپٹا گیا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی ساتھی خاتون ڈاکٹر کو ان کے گھر بھیجا کہ وہ معلوم کرے وہ کون سی دوائی کھاتی رہی ہے۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ وہ دوائیں جو میں نے اُسے کھانے کے لیے دی تھیں اُن میں سے ایک دوا کی پانچ سو گولیاں پڑی تھیں دوسری کی چھ سو گولیاں، مطلب یہ کہ وہ دوا ان سے جاتی رہی۔ مگر گھر جا کر رکھ دی، استعمال نہ کی۔ اس کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی مریضوں کو روز کے روز دوا ملے گی، پہلے کی طرح دس پندرہ روز کی نہیں ملے گی۔ اس پر یہاں کے اخبارات میں شور اٹھا یہ زیادتی ہے۔ مگر میں نے مریضوں کی بھلائی کی خاطر یہ مخالفت بھی مول لی۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا: میں علاج میں' مریض کے والدین کو بھی شریک کرتا ہوں، انہیں لکھ دیتا ہوں تاکہ وہ مرض کی اونچ نیچ کو سمجھیں۔ اس سے بچنے کے لیے جدوجہد کریں۔ مگر میں نے دیکھا کہ انگریز تو عمل کر کے اس سے فائدہ اٹھانے لگے مگر پاکستانی مریضوں کا وہی حال۔ میں نے سوچا شاید زبان کے کم سمجھنے کی وجہ سے پاکستانیوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ اس پر میں نے سوچا کہ انگریزوں کو الگ دیکھا کروں پاکستانیوں کو الگ۔ تاکہ ان کو اپنی زبان میں سمجھا کر' زیادہ بہتر نتائج حاصل کر سکوں۔ ایسا میں نے ان کی بھلائی کے لیے سوچا، مگر اخباروں میں شور اٹھا۔ اس کو سیاسی مسئلہ بنا یا گیا۔ مطلب یہ کہ انگریز اپنے مریضوں میں اور غیر ملکی مریضوں سے مختلف سلوک کر رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جب کوئی ریسرچ کا مسئلہ اٹھا ہے تو اپنی ریسرچ کو کمیٹی کے سامنے رکھتے ہیں اس میں ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے اہم شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ہوتے ہیں۔ وہ اگر کسی ریسرچ یا کسی نئے فیصلے کو منظور کر لیں تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اپنے طور پر من مانی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ میں نے انگریز مریضوں اور پاکستانی مریضوں کو الگ الگ دیکھنے کی افادیت بتا کر منظوری حاصل کی تھی، اس لیے مخالفت ہوئی تو ہوتی رہے۔

میں نے ابھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا ذہن اجتہادی ہے۔ یہ بچپن میں مندروں میں بھی جاتے، گوردواروں میں بھی جاتے اور گرجا گھروں میں بھی جاتے تھے۔ والد صاحب چونکہ ان کے کٹر مذہبی تھے وہ ان سے کہتے تھے: یہ تو کیا کرتا ہے؟ یہ جواب دیتے، مجھے سب کی باتیں سُن کر خود کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔

والد صاحب کہتے: تیرا ذہن ابھی اس قابل نہیں کہ تُو کوئی صحیح فیصلہ کر سکے۔ ان کا جواب یہ ہوتا ابھی تو میں مطالعہ کروں گا۔ فیصلے کی عمر میں جا کر کوئی فیصلہ کروں گا۔ مگر جو فیصلہ کروں گا وہ میرا اپنا ہوگا۔ پیدائشی فیصلوں کو میرے نزدیک کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ مثلاً مسلمان کے گھر پیدا ہو گئے اس لیے مسلمان ہیں، یہ کیا بات ہوئی!

آج ناشتا خالصتاً پاکستانی ناشتا کیا۔ آلو کی بھجیا، پراٹھے، دہی وغیرہ۔ خوب پیٹ بھر کر یہ سب کچھ کھایا پیا۔ میں نے اعلان کیا اب رات ہی کو کچھ کھا سکیں گے۔ کہنے لگے: اٹھو اٹھو' باغ کی سیر کرو، پھولوں کی خوشبو سونگھو، باغ کی سیڑھیاں اُترو چڑھو، بھوک لگے گی۔ ناشتے پر ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ آج رات اپنے پاکستانی دوست کے ہاں خالصتاً پاکستانی کھانا کھائیں گے، کیونکہ انہوں نے دعوت دی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر انسان اپنے گھر کی باغبانی کو اپنا شعار بنا لے تو وُہ بڑا خوش اور صحت مند رہ سکتا ہے۔ اگر وقت نہیں ملتا تو تقسیم کار یوں کرنی چاہیے کہ اس شغل کے لیے بھی وقت ملے۔ میں جو ہر وقت کام کا جویا ہوں۔ یہ رویہ غلط ہے۔ یہ رویہ جلد نڈھال کر دے گا۔ من کی من میں رہ جائیں گی۔ زیادہ کام کرنا ہے تو اس کے لیے سوچنا ہوگا۔ اس کے لیے ماحول بنانا ہوگا، ورنہ جلد سب کچھ کرنے میں' زیادہ کچھ نہ ہو سکے گا۔

حیدر صاحب ڈاکٹر ہیں۔ بظاہر ایک سخت گیر پیشے سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ جدھر دیکھیں خوشنما پھول، خوش رنگ مچھلیاں، ہر بڑے فن کار کی موسیقی کے ٹیپ، فوٹوگرافی کا مہنگے سے مہنگا

سامان، بنگلہ سے دُور خوب صورت اور دلکش مناظر، خود اپنا باغ کہ دیکھو تو دیکھتے رہو۔ سیر کو نکلو تو ذہن کو بالیدگی کی توفیق ہو!

۲۶ اگست (ہفتہ)

آج صبح سے گانے سُن رہا ہُوں۔ تین گھنٹے کی ایک ٹیپ ختم ہو گئی، دُوسری لگ گئی ہے۔ اب وہ چل رہی ہے۔ مجھے گانوں سے کبھی کوئی دل چسپی نہیں رہی۔ بلکہ میں نے ایک مضمون میں لکھ دیا تھا اگر گانے والا خوش شکل نہیں تو وہ گانا قطعاً اچھا نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ روشن آرا بھی گائے تو وہ بھی دو کوڑی کا نہ ہوگا۔ اس پر کافی کانا پھوسی ہوئی تھی، ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا۔ مگر میری رائے کوئی فن شناس کی رائے نہ تھی میں نے تو اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا تھا جس پہ آج بھی قائم ہُوں۔ مگر یہ ماننے لگا ہُوں کہ موسیقی میں جادو ہوتا ہے۔

میری طبیعت میں خاصی سیمابیت ہے۔ زیادہ دیر میں آرام بھی نہیں کر سکتا۔ مگر اِدھر اکیلے پن کی وجہ سے گانے سُننے کا موقع ملا تو اس کی ساحری کا قائل ہو رہا ہُوں۔ کچھ بات موسیقی میں ہوتی ہے۔ کچھ شاعر کے خیالات میں، کچھ ماحول کی نرمی میں۔ یہ سب باتیں مل ملا کے آدمی کو بیقرار کر دیتی ہیں۔ زندگی کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی خود ساختہ جبر کے ماحول میں گزاری۔ مگر ان دنوں سوچا تو وہ سب پرہیزگاری کے واہمے تھے۔ اگر خود کو جبر کے ماحول میں مقید رکھا تو کیا ملا؟ کس نے ہمیں "امام الشرفا" مانا؟

آج اپنے کرم فرما شیخ منظور الٰہی یاد آئے، وُہ بھی امریکہ جانے والے تھے، اپنے بچّوں کے پاس۔ وہ کہتے تھے جانے سے پہلے کچھ کام آپ کے سپرد کر جاؤں گا، میری عدم موجُودگی میں کر ڈالنا۔ مگر میں آتے ہوئے ایسا گھن چکّر بنا ہُوا تھا کہ ان سے مل کر بھی نہ آ سکا۔ ایک دن انھیں دفتر میں ٹیلیفون کیا تھا تو آپریٹر نے کہا تھا: وہ دفتر سے چلے گئے ہیں، اب کل آئیں گے۔

اب مجھے معلوم نہیں وہ کیا کام تھے۔ اگر میرے بچّوں کے کرنے والے ہوئے تو وہ ہو گئے ہوں گے۔ آنے سے پہلے بیگم نے کہا: ندیم صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ میں نے ان کی رائے پر صاد کیا تھا مگر ان کے گھر جا کر معلوم ہوا کہ وہ ایک شادی کے سلسلے میں گاؤں گئے ہوئے ہیں۔

اشفاق احمد اور انتظار حسین کو افسانہ کے لیے کہہ آیا تھا۔ معلوم نہیں ان سُست نویسوں نے میری بات قبول کی ہوگی یا نہیں۔ میں خاص نمبروں کے ساتھ سال میں ایک عام نمبر (بلکہ خاص نمبر) چھاپنا چاہتا تھا۔ مگر میرا ادھر آنا میرے جذبات اور سوچوں کے خلاف عمل پیرا ہوگا۔

میں نے کئی دنوں سے گھر ٹیلیفون نہیں کیا۔ وہاں سے حالات معلوم نہ ہُوئے۔ پُوچھوں بھی تو بتا دیا جاتا ہے سب ٹھیک ہے فکر نہ کریں۔ مجھے رائٹرز گلڈ کی جائداد کا وہ نوٹس بھی پریشان رکھتا ہے جو میرے اِدھر آنے سے

دو تین دن پہلے دفتر میں موصول ہُوا تھا کہ ایک بہت بڑی رقم ادا کیجئے حالانکہ میں نے خاصی دوڑ دھوپ کے بعد ایک فیصلہ کرا لیا تھا اور متعلقہ محکمے نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اب کوئی رقم واجب نہیں۔ مگر بابو لوگوں سے ڈر ہی لگتا ہے وہ اپنے افسروں کے فیصلوں میں بھی رخنہ اندازی کرتے رہتے ہیں۔ بعض عقلمند کہتے ہیں کہ دوستی افسروں سے رکھنے کی بجائے کلرکوں سے رکھنی چاہیئے۔ کوئی کیا کرے کیا نہ کرے! اس کا کوئی مضبوط ڈھانچہ ابھی اپنے ہاں استوار نہیں ہوا۔ لیکن استوار ہوگا ایسا ڈھانچہ جو اصولوں اور قوانین کی آبرو ہوگا۔

آج رات ہم ڈاکٹر حیدر کے دوست ڈاکٹر بیگ کے ہاں کھانے کی دعوت پر گئے۔ ڈاکٹر بیگ عرصہ ۱۸ سال سے مانچسٹر میں تھے۔ سرجن ہیں۔ سرکاری ملازمت بھی ہے اور نجی پریکٹس بھی۔ بڑے مطمئن تھے۔ مگر یہ کہتے تھے: بڑھاپا آ کر رہے گا لہٰذا واپس پاکستان جانے کی فکر بھی ہے۔ وہ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ پاکستان کے ڈاکٹر مریض پر پُوری توجہ نہیں دیتے۔ کہتے تھے میری اپنی بچّی اسلام آباد میں بیمار ہو گئی۔ تکلیف اس کی بڑھتی رہی۔ بچّی نے پریشان ہو کر مجھے ٹیلیفون کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ علاج غلط ہو رہا ہے۔ اپنی ڈاکٹر کو بتائیں کہ میرے ابّا نے یہ کچھ تجویز کیا ہے۔ اگر وہ متفق نہ بھی ہوں تو بھی اُن سے درخواست کریں کہ چند دن یُوں بھی علاج کر کے دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں گی تو میں اُن سے ٹیلیفون پر تبادلۂ خیالات کر لوں گا۔ چنانچہ میرے کہنے پر عمل ہُوا تو تین چار روز میں افاقہ شروع ہُوا، بالآخر مکمل طور پہ آرام آ گیا۔

وُہ کہتے تھے کہ ہمارے ڈاکٹر یہاں سے جدید مشینیں تو لے گئے ہیں مگر اُن سے کس طرح کام لینا ہے، وہ انہیں نہیں معلوم۔ کیونکہ یہاں تو مشینوں کے نتائج کو پڑھنے والے ایکسپرٹ ہوتے ہیں، جو یہاں کا بھی ہر ڈاکٹر نہیں جان سکتا۔ چہ جائیکہ جن کے لیے مشینیں ہی نئی ہوں۔ پہلے وہاں مریض صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ اب مشینوں کے غلط اخذ کردہ نتائج سے پریشان ہوں گے۔ جب تک ہر کام کو ایک مشن کے طور پر نہیں کیا جائے گا اس وقت تک بہتر نتائج کی توقع فضول ہے۔

وُہ کہتے تھے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک مریض ڈاکٹر کی غلطی سے مر جائے تو اس کی تحقیقات ہوتی ہے۔ معاملہ شہروں کی سطح سے نکل کر مرکزی سطح تک جاتا ہے۔ اگر قصور ڈاکٹر کا نکل آئے تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مگر پاکستان میں سیکڑوں مریض ڈاکٹروں کی غلطیوں سے مر رہے ہیں۔

اس کے بعد کھانا کھایا، جو بڑا لذیذ تھا۔ اپنا پاکستانی کھانا۔ بیگ صاحب لاہور کے رہنے والے تھے۔ اس لیے اُن میں ایک سلیقہ تھا۔ وہاں سے طے ہُوا اگر وی سی آر پر فلم دیکھنی ہو تو میرے پاس ”نند اور آنند“ نام کی فلم موجود ہے جو دیوا نند اور ان کے لڑکے پر فلمائی گئی ہے۔ ڈاکٹر حیدر کو بھی فلم دیکھنے کا شوق ہے۔ اس لیے ایک ہندوستانی فلم دیکھنے سے مجھے بھی کہاں انکار ہو سکتا تھا! میں تو فلم سنسر بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے بھی ہندوستانی فلموں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری بہت آگے جا چکی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ ہالی وُوڈ کے انداز پر فلمیں

بنا رہے ہیں جن میں وُہ سب کچھ دکھا دیا جاتا ہے جو میاں بیوی رات کے اندھیروں میں دیکھتے ہیں۔

جب ڈاکٹر ملتے ہیں تو وہ ڈاکٹری پر، مصور ملتے ہیں تو مصوری پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر ادیب جب ملتے ہیں تو ادب کی بجائے، ادیبوں کی ذاتیات پر گفتگو کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! دیکھ لیجئے ادیبوں کو ادیبوں سے کتنی محبت ہے۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ ڈاکٹر بیگ اور ڈاکٹر حیدر امراض کی نئی ریسرچ پر گفتگو کرتے رہے۔ وُہ اپنا علم ان تک پہنچا رہے تھے یہ اپنا علم اُن تک پہنچا رہے تھے۔ کیونکہ ان کے شعبے مختلف تھے۔ ایک فزیشن تھے ایک سرجن!

چونکہ ڈاکٹر حیدر کی اچھی خاصی نرسری ہے پھُولوں، ترکاریوں اور درختوں کے پھلوں سے لدی پھندی۔ اس لیے یہ ڈاکٹر بیگ کے لیے بہت کچھ لے گئے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر حیدر رکھتے ہیں: اتنے پھُولوں، اتنی ترکاریوں اور اتنے پھلوں کو کیسے سنبھالوں۔ اس لیے یہ سب کچھ پرندوں کے کام آتا ہے۔ دوستوں کے لیے ہوتا ہے۔ پھر ہمارے لیے۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کو تو خاصی بچت ہو جاتی ہو گی۔ سب کچھ گھر کا ہے۔ کہنے لگے: جو میں نرسری کو وقت دیتا ہُوں اس کی بات نہیں کرتا۔ مگر یہ بتا دوں کہ یہ جو کچھ موجود ہے اس پر میرے لاکھوں روپے خرچ ہُوئے ہیں۔ ان میں کئی پودے ایسے ہیں جن پر بیس پاؤنڈ سے لے کر پچاس پاؤنڈ تک خرچ ہُوا۔ پھر دواؤں اور سپرے کا خرچ الگ، یہ شوق بڑا مہنگا ہے۔ بس اس کا انعام اور خوشی اتنی ہے کہ جب اپنے لگائے ہُوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے۔ بس وہ لمحہ ہمارے لیے سکون اور تسکین کا باعث ہوتا ہے، جو دنیاوی سکوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

۲۷ اگست (اتوار)

میں جب سے آیا ہُوں، ناشپاتیاں اور سیب خُوب کھا رہا ہوں۔ پہلے دن میں نے وہ سیب اور ناشپاتیاں زمین پر گری اٹھا کر کھائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو کہا: درختوں سے اتار کر کھایا کریں۔ جو مزا خود اتار کر کھانے میں ہے وُہ یُوں اٹھا کر کھانے میں نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا: یہ بھی سب کچھ بھلا چنگا ہے۔ ضائع ہو رہا ہے۔ کہنے لگے: یہ تو عرصے سے ضائع ہو رہا ہے ہونے دیجئے۔ اس کے بعد سے میں درختوں سے پھل اتار کر کھا رہا ہوں۔ ہر صبح یہی کرتا ہُوں۔ سیر بھی ہو جاتی ہے پھل بھی کھا رہا ہُوں۔

واقعی پھل درخت سے اتار کر کھانے میں لُطف ہی اور ہے۔ آدمی سوچتا ہے یہ دانہ زیادہ پکا ہوا ہے، وہ دانہ زیادہ اچھا ہے۔ یُوں یہ کھاؤں وہ کھاؤں میں خاصا پھل زیب شکم ہو جاتا ہے۔ ایک دن مجھے اپنے سوات کا وہ واقعہ یاد آ گیا کہ بچے چھوٹے تھے، وہ درختوں پر سیب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں اُن کے لیے بازار سے سیب خرید لاتا مگر وہ انہی سیبوں کا ذکر کرتے جو انہوں نے درختوں پر لگے دیکھے تھے۔ ایک دن میں انہیں سیبوں کے باغ میں لے گیا۔ باغ کے مالک سے طے کیا کہ جتنے روپے لینا ہیں لے لیں، اگر پھل ہم خود درخت سے

اتار کر کھائیں گے۔ مدت ہوئی مگر بچوں کو وہ واقعہ آج بھی یاد ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر میں گھڑیاں بے شمار ہیں۔ ہر کمرے میں تین تین چار چار۔ کمرے بھی آٹھ، اندازہ کیجئے ایک گھر میں کتنی گھڑیاں ہوئیں! کوئی گھڑی میوزک کے ساتھ وقت کا اعلان کرتی ہے، کوئی گھڑی تاریخ اور دن کے ساتھ وقت بتاتی ہے۔ ایک گھڑی باآوازِ بلند وقت کا اعلان کرتی ہے۔ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: اتنی گھڑیوں کی کیا ضرورت ہے؟ ایک بات تو یہ ہے کہ تنخواہ کافی ہے۔ نجی پریکٹس بھی ہے۔ روپیہ کہیں تو خرچ کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے گھڑیوں کی زیادتی کی بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ جہاں بیٹھا ہوں وہاں ہر طرف گھڑی ہو مڑ کر نہ دیکھنا پڑے۔ دوسرے جب گھڑی کی ٹن ٹن سنائی دیتی ہے تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت گزر رہا ہے۔ یہ احساس میرے لیے تازیانے کا کام کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ہر جدید چیز ضروری نہیں کہ پرانی سے اچھی ہو۔ ہم نے اپنے نئے پن سے کئی اچھی چیزیں ضائع کر دیں، ضائع کر رہے ہیں۔ میں تو کوشش اس بات کی بھی کرتا ہوں کہ سابقہ اچھی چیزوں کو بھی قائم و دائم رکھوں۔

کل ڈاکٹر صاحب نے بہاری ناشتا کرایا تھا۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ آج انگریزی ناشتا کرایا جو میری طبیعت سے علاقہ نہیں رکھتا تھا اس لیے آج برائے نام ناشتا کیا۔

پچھلی اتوار کو میں لندن میں تھا۔ اتوار کے اتوار کوئی نہ کوئی ہندوستانی فلم ٹیلیویژن پر دکھائی جاتی ہے، جس کے لیے ہم ادھر کے باسی منتظر رہتے ہیں۔ پچھلی اتوار ایک پرانی فلم "قسمت" لگی تھی۔ محمد یونس بھٹی صاحب نے کہا بھی: فلم دیکھئے گا۔ میں نے اپنے پاکستانی ہونے کے ناطے سے کہا: پاکستانی فلم دیکھیں گے۔ جس پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

آج اتوار تھی تو مجھے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا: آج ہندوستانی فلم مدھومتی لگے گی، دیکھیں گے۔ چنانچہ میں چپ ہو گیا۔ میں کیوں کسی کا دل خراب کروں، کھنڈت ڈالوں۔ وہ فلم اواگون کے مسئلہ پر تھی۔ وجنتی مالا اور دلیپ کمار کی فلم تھی۔ بہ حیثیت فن کار دونوں کو داد دینی پڑی۔ فلمانے والوں نے بھی کمالات دکھائے تھے، اچھا وقت کٹا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب نے چپکے بیٹھا دیکھا تو ٹیپ لگا گئے۔ جتنے گانے ان دنوں سنے اتنے میں نے پوری زندگی میں نہ سنے ہوں گے۔ سہگل کے گانے تو غور سے سنے۔ ان میں عجیب دل پر اثر انداز ہونے والی کیفیت ہے۔ دلیپ کمار پٹھان ہے۔ عجیب فن کار نکلا۔ سہگل پنجابی ہے، بڑا فن کار کہلایا۔ یہ خدا کی دین ہے۔

ابھی ڈاکٹر صاحب نے بتایا: کل شیکسپیئر کے گاؤں چلیں گے، وہاں سے آکسفورڈ اور کیمبرج۔ میں نے کہا: مجھے جاوید کے ٹیلیفون کا انتظار ہے وہ آ جائے تو ادھر ادھر نکلیں گے تاکہ آئندہ کا پروگرام بنایا جائے۔

دوسرے مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ حج کے بعد عمرہ کا ویزا، سعودی حکومت کب دیتی ہے۔ یہ ٹیلیفون کرکے معلوم کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، سعودی سفارت خانے ٹیلیفون پر ایسی اطلاعات نہ دیں گے۔ معلومات تو ان کے دفتر جا کر ہی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں اگر جلد اجازت ملتی ہو تو اس خوشی کو بھی حاصل کرکے پاکستان پہنچیں۔ اگر بات مہینوں کی ہو تو پھر پاکستان سے چلے جائیں گے۔ کیونکہ عمرہ کی خواہش میری بیگم کو بھی بہت ہے۔ وہ بھی اکٹھا جانے کی! دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے! کل پیر ہے۔ مگر بینک ہالی ڈے، چھٹی ہوگی۔ منگل کے روز معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا، اتوار کی رات، ٹیلیویژن پر معلوماتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ جو اہم ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں ضرور دیکھیں گے۔ اگر وہ نہ دیکھنا ہوتیں تو باہر نکلتے۔ دیر سے آتے یا سویرے، کوئی فکر نہ ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب گاڑی بے حد تیز چلاتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتا ہوں تو اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کے بیٹھتا ہوں۔ ہر گاڑی سے آگے۔ ہر گاڑی پیچھے۔ میں نے بلیک پول سے مانچسٹر آتے ہوئے ان گاڑیوں کو شمار کرنا شروع کر دیا جنہیں انہوں نے پیچھے چھوڑا۔ ۲۷ تک گننے کے بعد گنتی چھوڑ دی۔ مگر ایک گاڑی ایسی نہ دیکھی جو ان سے آگے نکلی ہو۔ اگر میں یہاں سے زندہ سلامت گیا تو ان کی سلامتی کی بھی دعا مانگ کے جاؤں گا۔

آج پہلا دن ہے کہ میں نے گھر واپسی کا سوچا، ورنہ پہلے یاد تو سب آتے رہے۔ مگر واپسی کا نہ سوچا۔ چلے جائیں گے۔ یہی سوچ تھی۔ معلوم نہیں گھر والوں نے شدت سے یاد کرنا شروع کر دیا ہے یا کیا معاملہ ہے کہ واپسی کے پروگرام پر سوچنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے دوستوں سے بھی وعدہ تھا کہ واپسی بذریعہ ہندوستان ہوگی۔ مگر اب میرا اس وعدے کو نبھانے کا ارادہ نہیں۔ پچھلی بار بھی ایسا ہوا تھا۔ اچھا بھلا کئی دن اور رکنے کا ارادہ تھا کہ اچانک سوٹ کیس اُٹھایا اور چل دیا تھا۔ اب کے تو یہ ہے کہ کئی دن پہلے سوچ رہا ہوں۔ پہلے اُسی دن سوچا تھا۔ اُسی دن چل دیا۔ معلوم نہیں بیگم صاحبہ! کیا جنتر منتر پڑھتی پڑھواتی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔

مدھومتی فلم دیکھنے کے دوران ایک اشتہار بار بار دیکھا۔ کم از کم تین بار کہ جو ہندوستان کے 'ملڈا چاول کے نام سے دکھایا گیا۔ پہلے ہمارا باسمتی چاول دُنیا بھر میں مشہور تھا۔ لمبا دانہ اور خوشبودار، مگر اب ہندوستان کی طرف سے 'ملڈا چاول کو' ہمارے چاول سے بڑھا چڑھا کر دکھایا جا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ اس میدان میں ہندوستان بازی لے جانا چاہتا ہے۔ جو اچھی بات ہے۔ مگر پاکستان والے اچھی باتوں کو کیوں زندہ نہیں رکھتے! خود بخود سب کچھ ہو جائے، اس پر ایمان کیوں ہے؟ دنیا بہت آگے جا رہی ہے۔ اب زندہ رہنا ہے تو زندہ قوموں کی طرح!

میں نے ابھی ہندوستان کا چکر لگانے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو دوستوں اور محبّوں سے ملاقات کا

چسکا تھا۔ دوسرے رسولؐ نمبر کی مقبولیت کے بعد احباب کا اصرار ہے کہ میں قرآن نمبر پیش کروں۔ یا اللہ! میں کہاں کا عالمِ دین ہوں، جو ایسی فرمائشیں مجھ سے ہوتی ہیں۔ چونکہ توفیق تو رسولؐ نمبر کی پیشکش کے وقت بھی نہ تھی، اللہ نے سارے کام سنوارے۔ عزت بخشی۔ مگر اب کے میں قرآن نمبر کے سلسلے میں ہندوستان کے علماء سے بھی مدد کی غرض سے ملنا چاہتا ہوں، دیوبند جانا چاہتا ہوں، اعظم گڑھ جانا چاہتا ہوں، لکھنؤ جانا چاہتا ہوں، کیونکہ یہاں مذہبی امور سے متعلق بڑے ادارے ہیں جو ایک طویل عرصے سے مذہب و ملت کی خدمت کر رہے ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں سے اپنے وطن جاؤں گا، وہاں سے جدہ اور جدہ سے واپسی ہندوستان سے!

آج جاوید کو لندن ٹیلیفون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ جمعہ کے روز سے ہوٹل چھوڑ گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا اپنی ماموں زاد بہن روبینہ کے پاس بولٹن آنے کا ارادہ تھا۔ وہاں ٹیلیفون کیا تو وہ مل گیا۔ مجھے یہاں دعوت پر ڈاکٹر اکرم بیگ نے کہا تھا عمرہ کے لئے ویزا حج کے دو ماہ بعد ملتا ہے۔ اس لیے میری پریشانی بڑھی۔ کیونکہ جو زرِ مبادلہ ملتا ہے اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ زیادہ دن ٹھہر سکیں۔ دوسرے مجھے رسولؐ نمبر کی بقایا جلدیں نومبر تک تیار کرنا ہیں، اس لیے میں نے جاوید سے کہا؛ ٹیلیفون کر کے پوچھیں کہ عمرہ کا کیا رہے گا، تاکہ اس کے مطابق وطن کو لوٹا جا سکے۔

۲۸ اگست (پیر)

آج ہم یارک شائر کی طرف نکل گئے۔ کوئی دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہاں پہنچے، کیونکہ وہاں عیسائیوں کا سب سے پرانا اور سب سے بڑا گرجا ہے جو ۱۲۲۰ء میں آرچ بشپ ڈی گرے نے بنوانا شروع کیا تھا اور جو ان کی موت کے بعد ۱۴۷۲ء میں مکمل ہوا۔ یعنی ڈھائی صدیاں اس کی تعمیر میں صرف ہوئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس شان کا بنا ہوگا! یہ بات دنیا کے ہر مذہب میں ہے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں پر بے پناہ روپیہ خرچ کر کے انہیں عالی شان بناتے ہیں۔

جب ہم یارک میں داخل ہوئے تو ہمیں پرانے شہر کا دروازہ نظر آیا۔ اس سے آگے پرانے شہر کو گھیرے ہوئے ایک فصیل، جیسے کبھی لاہور کی بھی یہی پوزیشن تھی۔ شہر دروازوں کے اندر تھا اور شہر کے گرد اگرد فصیل تھی۔

کچھ عرصہ پہلے گرجا کا ایک حصہ جل گیا تھا، جس کی ان دنوں مرمت ہو رہی ہے، جس پر حکومت کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا؛ کیسے جل گیا؛ جواب ملا؛ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ موجودہ بشپ پرانے عقاید کا قائل نہیں۔ وہ ترقی پسند ذہن رکھتا ہے جس کی مخالفت ہوئی تھی۔ چونکہ یہ گرجا انہی دنوں جلا تھا اس لیے لوگوں کو گمان گزرا کہ موجودہ بشپ نے یا ان کے حواریوں نے ایسا کیا ہوگا۔ مگر بعد میں اس کی تردید ہوئی کہ ایسا کوئی ثبوت نہ ملا تھا۔

عبادت گاہ ہونے کے ناطے سے اور قابلِ ذکر عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے گرجا کے اندر بھی گئے۔ دیکھا کہ

ہزاروں افراد موجود ہیں جو اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ درجنوں کیمرے کُھلے ہیں۔ کھٹا کھٹ تصویریں لے رہے ہیں۔ گرجا کے کئی حصے ہیں۔ شیشے اور لکڑی کا کام دیکھنے والا ہے۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میں نے پُوچھا: اس وقت ہزاروں لوگ گرجا کے اندر موجود ہیں۔ کیا عبادت کے وقت بھی اتنے آدمی ہوتے ہیں؟ جواب ملا: اس وقت اتنے آدمی نہیں ہوتے۔ اس وقت جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ دنیا بھر سے آئے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھے بغیر کسی عیسائی کو تسکین نہیں ہوتی۔

یہاں ایک میوزیم بھی ہے جسے یارک شائر میوزیم کہتے ہیں۔ اس کے اندر ۱۶۰۰ کروڑ سال پہلے کا ایک بڑا سا ڈھانچہ ہے جسے DINOSAUR کہتے ہیں۔ گھڑیال نما کوئی چیز، جس کی لمبائی چوڑائی ہاتھی سے بھی بڑی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جانور کا ڈھانچہ معدنیات اور ریت کے تہ در تہ ذخائر کے اندر سے ملا ہے۔ مکمل ڈھانچہ پھر بھی نہ ملا۔ اِدھر اُدھر سے اور ڈھانچے ملے تو اسے اس حالت تک مکمل کر لیا گیا ہے۔

میں نے پُوچھا: یہ کیسے معلوم ہُوا کہ کروڑوں سال پہلے کا ہے؟ بتایا گیا: سائنسی حساب ہے جس کی مدد سے یہ سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ ڈارون کی تھیوری کا بھی تو یہی حساب ہے۔

اس میوزیم کے تھوڑی دُور دریائے اُوز بہتا ہے جس میں کشتیاں چلتی ہیں۔ وہاں ایک مصوّر بیٹھا تھا، جو دو پونڈ لے کر ایک رنگ کی اور ۳½ پونڈ لے کر، آدمی کو سامنے بٹھا کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تصویر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر حیدر کے بیٹے حسین حیدر نے تصویر بنوائی جو اچھی خاصی تھی۔

ذرا شہر کی طرف نکلے تو وہاں چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔ مطلب یہ کہ زیادہ چوڑے نہ تھے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ خریداری بھی ہو رہی تھی۔ ذرا دُور ایک اونچی قلعہ نما عمارت نظر آئی، اُدھر گئے۔ معلوم ہوا کہ ۱۶ مارچ ۱۱۹۰ء میں یہاں ۱۵۰ کے قریب یہودیوں نے آ کر پناہ لی تھی۔ عیسائیوں نے انہیں مارنے کے لئے تعاقب کر رکھا تھا۔ رچرڈ میل بس عیسائیوں کو اکسا رہا تھا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ قبل اس کے کہ انہیں عیسائی مارتے انہوں نے خود اجتماعی طور پر خودکشی کر لی۔ مگر اپنا عقیدہ نہ چھوڑا۔ یہ قلعہ ان کی یادگار کے طور پر محفوظ ہے جو خاصی بلندی پر ہے۔ کم از کم ستّر اسّی سیڑھیاں چڑھ کر اس تک پہنچنا پڑتا ہے۔ آج مسلمانوں کو انہی یہودیوں سے واسطہ ہے جنہوں نے ہمارے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے رسولؐ نے بھی ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی تھی۔ جب تک ان جیسا شدید انتقامی جذبہ ہم میں پیدا نہ ہوگا اس وقت تک ان کا کچھ نہ بگڑے گا، ورنہ وہ تو مذہب کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔

سلویٰ، حیدر کمال کی سلیقہ مند عورت ہے۔ ہم جب بھی باہر نکلے تو وہ گھر سے کھانے پینے کا سامان، بیٹھنے کے لیے کپڑے، غرض وہ ساری چیزیں جو گھر میں میسر ہوتی ہیں وہ وہاں تک لے کر چلتی ہیں۔ یوں اچھی خاصی پکنک کا ماحول بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ یہاں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بعد میں ایک تربوز کاٹا گیا جو سپین کا تھا، بے حد میٹھا، بیج بھی نہ ہونے کے برابر۔ تربوز کا ہمارے ہاں جو دانہ چار پانچ روپے کا مل جاتا ہے وہ یہاں پچاس ساٹھ روپے کا ملتا ہے۔

اس کے بعد دریائے اُوز کی سیر کر کے واپس مانچسٹر کی طرف لوٹے۔ راستے میں گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا۔ گاڑی حسبِ سابق اُڑی جا رہی تھی کہ یہ واقعہ رُونما ہُوا۔ اتنی تیز گاڑی کا اچانک اٹکنا اور پھر گاڑی کا سنبھلے رہنا۔ یہ ساری باتیں خاصی مشکل تھیں۔ پھر یہ ڈر کہ پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کی زد میں بھی نہ آئیں۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے ہمیں کسی مصیبت سے دوچار ہونے سے بچا لیا۔ نیچے اتر کر دیکھا تو ٹائر کے پرخچے اڑے ہوئے تھے۔ وہاں یہ ہے کہ پولیس چکر لگاتی رہتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی ایسا حادثہ پیش آئے تو اس کی مدد کی جائے۔ پہیہ بدلنے میں آدھ پون گھنٹہ لگا ہوگا، اس دوران دو گاڑیاں وقفے وقفے سے آ کر ٹھہریں۔ مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔

رات ہم نے ٹیلی ویژن پر ایڈنبرا ٹیٹو شو دیکھا، جو بے نظیر تھا۔ اس موقع پر ادب، موسیقی، ڈانس اور فوجی مشقوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلے کلاسیکل ڈانس دکھایا گیا جو ہمارے لیے نیا تھا، مگر بے پناہ تھا۔ حد درجہ انہماک، چلت پھرت، بھاگنا دوڑنا، تھرکنا اور لڑھکنا سب کچھ حیران کن۔ اس کے بعد کئی کھیل دکھائے گئے۔ جمناسٹک اور دیگر کرتب! بینڈ بھی اپنے مظاہروں میں بے حد متاثر کر رہا تھا۔ غرض یہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا پروگرام بےحد معلوماتی اور بھرپور تھا، جو مجھے یاد رہے گا۔

پہلے ہمارا پروگرام یہی تھا کہ شیکسپیئر کے گاؤں چلیں گے۔ مگر ٹیٹو شو دیکھ کر خیال بدلا، اسکاٹ لینڈ چلتے ہیں۔ کیونکہ شیکسپیئر کے ہاں حاضری پہلے دے چکا تھا۔ برونٹی سسٹر کے گاؤں میں گیا تھا۔ کیٹس کے اس مکان میں بھی گیا تھا، جہاں کہ وہ کچھ عرصہ ٹھہرا تھا اور اس کی چیزیں پڑی ہُوئی تھیں۔ غرض وہ سب یا اُن میں سے اکثر باتیں یاد آ رہی تھیں اس لیے سوچا دوبارہ دیکھنے کی بجائے نئی جگہ چلا جائے۔ ان لوگوں کی یادوں کو کاغذ پر آج بھی اتارا جا سکے گا، اتنی تفصیل سے نہ سہی، کم تفصیل سے سہی۔

جب میں پچھلی بار ۱۹۷۰ء میں آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی شیکسپیئر کی بڑائی کو سلام کرنے کے لیے ان کے گاؤں گئے تھے۔ گاؤں میں ایک تھیٹر ہے جس میں شیکسپیئر ہی کے ڈرامے کئے جاتے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ٹکٹ مل جائے، مگر ٹکٹ نہیں ملا تھا۔ معلوم ہُوا کہ مہینوں پہلے بکنگ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس مکان میں گئے تھے جہاں کہ شیکسپیئر رہتا تھا۔ اس کا لکھنے کا کمرہ موجود تھا، میز کُرسی موجود تھی، اس کا سونے کا کمرہ موجود تھا، پلنگ وغیرہ موجود تھے۔ اس کے گھر کا سامان موجود تھا۔ مکان تو چھوٹا سا تھا مگر محفوظ تھا۔ اب تو ان کے گھر کے ساتھ بھی ایک چھوٹا سا پارک ہے جہاں تھیٹر قائم کیا گیا ہے۔ وہ تو بڑی جگہ ہے۔ دوسرے ملکوں سے تفریحی بسیں بھی پہنچی ہُوئی تھیں۔ تھیٹر کی جگہ کے ساتھ پارک بھی یاد آ رہا ہے۔ پھر شیکسپیئر کے گھر میں وزیٹر بک رکھی ہُوئی تھی جو کافی بڑی تھی۔ بڑی سے مراد ہزاروں صفحات پر مشتمل، جس میں لاکھوں دستخط موجود ہوں گے۔ ان میں ایک میرے بھی دستخط موجود ہیں جو میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔

انہی دنوں برونٹی سسٹرز کے گاؤں بھی گیا تھا جو کہ بریڈ فورڈ کے آس پاس تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں

کافی وقت ہوئی تھی۔ مگر پہنچ گئے تھے۔ دونوں بہنوں کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ کہتے ہیں کہ تیسری بہن بھی لکھتی تھی۔ پاس ہی ایک دکان تھی جہاں ان بہنوں کے بارے میں لٹریچر ملتا تھا، جہاں کہ ان کی قبریں تھیں۔ وُہ چھوٹی سی جگہ تھی جسے زیادہ اچھی طرح مینٹین نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنے مذہب کے مطابق، ان کی مغفرت کے لیے فاتحہ پڑھی۔ معلوم نہیں مجھے ایسا کرنا چاہئے تھا یا نہیں۔ مگر میرا دل چاہا تھا۔

کیٹس کا وہ مکان جہاں کہ میں گیا تھا' لندن کے قریب ہے۔ اگر موقع ملا تو ایک بار پھر جاؤں گا۔ وہاں بھی ان کے لکھنے کا سامان، ان کی لکھی ہوئی تحریریں، ان کے بیٹھنے اُٹھنے سے متعلق کمرے، وہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اُن لوگوں نے اُن سب یادداشتوں کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ یہ زندہ قوموں کی بات ہے۔

میں نے لندن کے اس ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کافی پی تھی جہاں کہ شرلک ہومز بیٹھا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کو بھی جوں کا توں قائم رکھا ہوا ہے۔ لوگ شوق سے آتے ہیں۔ شوق سے اپنے آپ کو آسودہ حال بناتے ہیں، یادیں تازہ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یُوں بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں نے شرلک ہومز کو یاد رکھا ہوگا۔ ہرچند کہ وہ جاسوسی ناولوں کا خالق تھا۔ مگر اپنے انداز کا ماسٹر تھا۔

شینڈی! شینڈا!

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ پودوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سردیوں کی راتوں میں طوفان آتے ہیں۔ زور کی بارشیں ہوتی ہیں اور گرین ہاؤسوں کے دروازے کُھل جاتے ہیں جس میں کہ پودے رکھے ہوتے ہیں تو میں اپنے گرم کمرے اور گرم بستر سے اٹھتا ہوں اور جا کر گرین ہاؤسوں کے دروازے بند کرتا ہُوں۔

ڈاکٹر صاحب کا کُتوں کا شوق پرانا ہے۔ جب یہ لاہور میں تھے تو اس وقت بھی ان کے پاس قیمتی کُتّے تھے یہاں بھی ان کے پاس ایک کُتا ہے جس کا نام شینڈی ہے۔ قد ایک فٹ کے قریب اونچا اور لمبائی میں دو فٹ کے قریب، بلکہ کچھ کم ہی، میں سوچتا تھا یہ ابھی بچہ ہے بڑا ہوگا تو قد کاٹھ نکالے گا۔ مگر مجھے ڈاکٹر صاحب نے بتایا: اس کی عمر دس سال ہے۔ ان کا سائز یہی ہوتا ہے۔ امریکہ میں ایسے کُتّے ہوتے ہیں ان کا نام چوواوا ہے جو خاصے خطرناک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ انسانوں سے زیادہ وفادار، قابلِ اعتماد اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور میں میرے پاس ایک کُتا تھا۔ اس میں بعد میں ایک بُری عادت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اپنے گھر کے علاوہ افراد کو' ادھر سے گزرنے نہیں دیتا تھا، اُن پر حملہ کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک دن میں اُسے شالامار باغ سے بھی دُور جا کر چھوڑ آیا۔ مگر وہ دوسرے دن واپس گھر پہنچ گیا تھا۔ چونکہ وہ ستانے لگ گیا۔ اڑوس پڑوس والوں کو شکایت تھی اس لیے میں نے اپنے بھائی جان سے کہا، آپ راولپنڈی جا رہے ہیں۔ اس کتے کو جہلم کے قریب جا کر چھوڑ دیجئے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب تک گاڑی نظر آتی رہی وہ گاڑی کی سمت میں بھاگتا رہا۔

کوئی ایک ماہ کے بعد وُہ کُتا دوبارہ لاہور واپس پہنچ گیا، مگر بڑی بُری حالت میں، بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ تین چار دن بعد مر گیا۔

یہ شینڈی جو ہے، بے حد پیارا ہے۔ ڈاکٹر حیدر اور ان کی بیٹی سکینہ سے اس کی زیادہ دوستی ہے۔ ہر وقت آگے پیچھے پھرتا رہے گا، پاؤں میں لوٹتا رہے گا۔ بیٹھیں گے تو پاس آ کے بیٹھ جائے گا۔ انگریزی زبان جانتا ہے۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ہم باہر جانے لگتے ہیں تو باہر آ کر بھاگتا دوڑتا رہے گا۔ ہر ایک کے پاس پہنچے گا۔ پھر دوڑے گا۔ اپنی خوشی کا اظہار کرے گا۔ جب ڈاکٹر صاحب کہیں گے واپس گھر جاؤ تو حکم نہیں ٹالتا، بادلِ نخواستہ گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں جب ڈاکٹر صاحب کو خیال آتا ہے کہ اسے بھی لے جاتے ہیں۔ وہ شینڈی کو بُلاتے ہیں۔ بھاگ کے باہر نکلتا ہے۔ پھر وہ دوسرے حکم کا منتظر ہوتا ہے۔ جب وُہ اسے کہتے ہیں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ تو وہ لپک کر گاڑی میں جا بیٹھتا ہے۔ جس دن اسے گھر چھوڑ جاتے تھے وہ بھوکا پیاسا بیٹھا رہتا۔ جب ہم گھر کا دروازہ کھولتے تھے تو وہ بھاگ کے باہر نکلتا، دوڑ لگاتا۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر ہمارے آس پاس۔ اس طرح ہماری آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا۔

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ اسے ہم کُھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اپنی مرضی سے باہر جا کر بھی گھومتا رہتا ہے مگر رات ہونے سے پہلے گھر آ جاتا ہے۔ ایک دن کیا ہُوا کہ گھر واپس نہ آیا۔ اڑوس پڑوس سے پُوچھا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہا: کہیں دُور چلا گیا ہوگا، واپس نہ آ سکا ہوگا۔ راستہ بھُول گیا ہوگا۔ میں کہتا تھا ایسا نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر پہاڑی پر واقع ہے۔ ایک طرف آبادی نہیں ہے بلکہ ڈھلوان اور گہری کھائیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو خیال گزرا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ادھر آیا ہو، پاؤں پھسل گیا ہو اور کھائی میں جا گرا ہو۔ انھوں نے اُدھر جا کر آواز دی:

شینڈی!

کُتے نے بھونک کر اپنی موجودگی کا اظہار کیا۔

مجھے کہتے تھے میرے ساتھ بکھیڑے ہیں۔ ڈاکٹرانہ مصروفیت، پھر نرسری کا پھیلا ہُوا کام، ورنہ میں مختلف نسلوں کے چھ سات کُتے رکھتا۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ میں اُن پر زیادہ توجہ نہ دے سکوں گا، اس لئے وہ شوق پُورا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تم لاہور جا کر کُتے رکھنا، یہ بھرپور محبت دیں گے، ضرورت پڑے تو جان دے کر بھی کام آئیں گے!

ڈاکٹر صاحب کو جانور پالنے کا شوق ہے، مگر وہ کُڑھتے رہتے ہیں کہ مصروفیت کچھ نہیں کرنے دیتی۔ کُتے، مچھلیاں، ان کے ساتھ دو کچھوے بھی پال رکھے ہیں، خوبصورت کچھوے، شیشے کے ایک گھر میں قیام، خوراک ان کی

اُبلے ہُوئے انڈے، خود ناشتا کرنے بیٹھیں گے تو پہلے انہیں خوراک دیں گے۔ مچھلیوں کے لیے آکسیجن چیک کریں گے۔ خوراک کا خیال رکھیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کی تعداد بڑی کم ہے۔ ملنے ملانے میں پہلوتہی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس قسم کے انسان اس دنیا میں بستے ہیں ان سے دُور کی صاحب سلامت اچھی۔ یہ بھی کہتے ہیں ایسا میں اپنی خیریت اور اپنی خوشیوں کو اپنے سے دور نہ کرنے کے سلسلے میں کرتا ہُوں۔ ڈاکٹر صاحب کی اپنی دنیا ہے اور اپنے خیالات!

۲۹ اگست (منگل)

آج منگل وار ہے۔ لوگ منگل کو اچھا دن نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی وجہ ہو۔ میری پیدائش منگل کی ہے۔ مجھے تو یہ دن بڑا بھاگوان لگتا ہے۔ میں تو ہر کام منگل کے روز بے دھڑک شروع کرتا ہُوں۔ نتائج بہتر نکلتے ہیں۔ البتہ مجھے وہم ہے کہ جمعرات کا دن نئے کام کے لیے اچھا نہیں۔ اتفاق کی بات کہ تجربات ایسے ہُوئے۔ متعدد تجربات، اس لیے اس دن سے دہلا رہتا ہُوں۔ مگر جب مجھے ڈپٹی کمشنر لاہور نے "نقوش" کے ڈیکلریشن کے لیے بلایا تو ۱۹۴۸ء کا کوئی جمعرات کا دن تھا۔ چنانچہ صاحب کی خدمت میں حاضری سے پہلے بڑی دُعائیں مانگی تھیں، الٰہی! خیریت رکھنا۔ جب تین ماہ کے بعد منٹو کے افسانے "کھول دو" پر رسالہ ۶ ماہ کے لئے بند ہو گیا تھا تو میں نے اس بات کو بھی جمعرات کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ جب میں نے شروع کے دنوں میں یہ دیکھا کہ پرچہ مالی اعتبار سے ڈوب رہا ہے تو اسے بھی میں نے جمعرات کے کھاتے میں ڈالا تھا۔ پھر جب رسالہ کسی وجہ سے شائع ہونا بند ہو گیا تھا تو اسے بھی میں نے جمعرات کے کھاتے میں ڈالا تھا۔

تب میں نے خود اس پرچے کو ایڈٹ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ندیم صاحب سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے پہنچا تو وہ دن میری شعوری کوشش کی وجہ سے منگل کا دن تھا۔ ان دنوں وُہ ڈوبتی ناؤ تھی۔ مگر کسے معلوم تھا کہ وہ ڈوبتی ناؤ منزل تک پہنچنے کی سکت رکھے گی۔

"نقوش" کی یاد آئی تو یہ بھی بتا دوں، اپنی سکت کے مطابق میں نے بڑے کام کئے۔ مگر میں ابھی بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں، میرے بڑے منصوبے ہیں، میں نے بڑا سوچا ہے مگر صحت جواب دے رہی ہے۔ اس میں قصور میری صحت کا نہیں ہے، میں نے اچھی صحت کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ دھاگے کو زیادہ کھینچا جائے گا تو وہ ضرور ٹوٹ جائے گا۔ مگر قدرت مجھے مہلت پہ مہلت دئے جا رہی ہے شاید اُسے مجھ سے کوئی اور کام بھی لینا ہو۔

غالب کو اپنی بیوی سے شکایتیں تھیں، وہ کہتی تھی شراب نہ پیو۔ وہ پیتا تھا، وہ نماز روزے کی پابند تھی۔ یہ مذاق اڑاتا تھا۔ جب ایک بار غالب کو مکان بدلنے کی ضرورت پڑی تو کسی نے ان سے کہا: اس مکان میں بھُوت ہے۔ غالب کا جواب یہ تھا: میری بیوی سے بڑھ کر وُہ بھُوت کیا ہوگا!

بیگم! میں غالب نہیں کہ بلا وجہ سو سو عیب نکالوں۔ میں آپ کا شکر گزار کئی وجوہ سے ہوں۔ میرا تنگ دستی میں ساتھ دیا۔ جب حالات قدرے سنبھلے تو بھی آپ نے اپنی آسائشوں کا نہ سوچا، مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ میں آپ کو وہ کنگن بھی نہ بنا کے دے سکا، جو نقوش کی خاطر بیچنے پڑے تھے۔ آج یہ جو نقوش کے گلے میں گہنا پڑا ہے وہ آپ ہی کا تو ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پہلے دن مجھ سے پوچھا تھا، وقت گزارنے کے لیے گانے سنیں گے؟ اس پر میں نے کہا تھا، ذرا ہلکے پھلکے گانے لگائیے گا۔

سہگل کو سنو گے؟

میں نے جواب دیا، یہ بڑا گویا ہے، مجھے کوئی سُدھ بُدھ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ موصوف کی رُوح تلملا اُٹھے۔

مگر آج ڈاکٹر صاحب نے کہا، آپ نے ہلکی پھلکی موسیقی بہت سُنی، آج سہگل کے گانے سنو۔ میں نے بڑی کوشش کر کے سہگل کے تقریباً تمام گانے اکٹھے کئے ہیں۔ اس کے ابتدائی گانے بھی، جب وہ زیادہ اچھا نہیں گاتا تھا۔

میں نے کہا، بس وہیں سے شروع کیجئے گا، مشکل سبق بعد میں!

پہلا گانا لگا: ؎

آتا ہے نظر انجام کہ ساقی! رات گزرنے والی ہے
باقی ہے خدا کا نام کہ ساقی! رات گزرنے والی ہے

آج باہر زور زور سے ہوا چل رہی ہے اس لیے کمرے میں بیٹھ کر گانے سُننا ہی اچھا۔ یہاں کے بھی موسم ہماری ہی طرح بدل رہے ہیں۔ گرمی بڑھ رہی ہے۔ میں جب ۱۹۷۰ء کے جولائی میں آیا تھا تو دن میں خنک موسم سے پالا پڑا تھا۔ رات کو بحد سردی ہوتی تھی۔ ہیٹر جلا کے سونا پڑتا تھا، پھر بھی سردی کی سُوں سُوں ختم نہ ہوتی تھی۔ اب یہ ہے کہ اپنے خیالوں سے جو کپڑے لائے تھے وُہ پہن کے نکلتا ہُوں تو گرمی لگتی ہے۔ رات کو بغیر کپڑا اوڑھے سونا چاہیں تو موسم کچھ نہ کہے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ سوچتا ہُوں ٹیپ ریکارڈر بند کر دُوں، باہر باغ کی طرف نکلوں، پھُولوں کو دیکھوں، قدرت کی عنایتوں کا شکر بجا لاؤں۔ میرا یہاں آنا، پھُولوں کا لگا ہونا، وہ بھی اتنے پھُولوں کا، یہ قدرت کی فیاضیوں میں شامل نہیں تو اور کیا ہے! یہ میرے حال پہ عنایت نہیں تو اور کیا ہے!

سوچتا ہُوں باہر نکلوں تو چاقو بھی ساتھ لیتا چلوں، جو سیب سب سے اچھا لگے اُسے توڑوں اور کھاؤں۔ جو ناشپاتی پکی ہُوئی معلوم ہو، اس کا رس چُوسوں۔ یہاں کے پھلوں میں عجیب بات دیکھی ان میں رس زیادہ ہوتا ہے۔ ناشپاتی کھاؤں گا تو اس کا رس زمین پر بھی گرے گا۔

اگر فرصت ہوتی اور میں زیادہ دنوں اِدھر رہ سکتا تو صحت پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا۔ اتنا سب کچھ ہونے پر بھی، یعنی خوشنما مناظر، تاریخی عمارتیں۔ رس بھرے پھل، رنگ برنگے پھول، اس کے باوجود مجھے میرا وطن پکار رہا ہے۔ حاضر ہو رہا ہوں! حاضر ہو رہا ہوں۔ میری شناخت اس سے ہے۔ خدا کرے وطن کی شناخت میں بھی میرا حصّہ ہو!

انسان کچھ سوچتا ہے، ہوتا کچھ ہے۔ میرا ارادہ حج کا تھا۔ ٹکٹ پر لکھ دیا گیا جدّہ حج کے دنوں کے بعد جا سکیں گے۔ عمرہ کا ارادہ ہے۔ مگر بتایا گیا کہ حج کے دو ماہ بعد جانا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ حاضری اُدھر سے منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یعنی میرے وُہ ساتھی جو حج کی استطاعت نہ رکھتے تھے میری سفارش پر بغیر کسی خرچے کے حج پر چلے گئے۔ یعنی وُہ شخص جو استطاعت رکھتا ہے دوسروں کو بھجوا سکتا ہے وہ خود نہیں جا سکتا۔ اسے حکمِ ربّی نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے! اس میں کیا مصلحت ہے، میرا خدا جانتا ہے ورنہ آج تک جو کچھ میں نے چاہا، وہی میرے خدا نے چاہا۔ کیا میرے دل میں کھوٹ تو نہیں پیدا ہو گئی؟ کیا میرے اعمال خدا کے نزدیک پہلے جیسے سچے نہیں رہے؟ کیا میں زیادہ گنہ گار ہو گیا ہُوں۔ ضرور کوئی بات ہے۔ میرے مولا! میرا امتحان نہ لینا، میں اس قابل نہیں ہُوں، میں اتنی سکت نہیں رکھتا۔

میں حاضری اس لیے دینا چاہتا تھا کہ رسولؐ نمبر کے بعد قرآن نمبر کی اجازت حاصل کروں۔ کہیں میرے مولا! تُو نے یہ تو نہیں سوچا ابھی میرے محبوبؐ کا حق ادا نہ ہُوا کہ یہ شخص کچھ اور سوچنے لگ گیا ہے۔ میرے مولا! تُو یہ جانتا ہے کہ میں تین چار جلدیں رسولؐ نمبر کی اور چھاپنا چاہتا ہُوں، اس کے بعد بھی اس ہستی کا حق کہاں ادا ہو گا؟ یہ کام تو سدا نامکمل رہے گا۔ بہرحال میرے مولا! میری رہبری فرمانا، میں تیری نافرمانی نہ کروں گا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے گھر سے دُور نیچے بَیری شہر کو دیکھا کرتا تھا۔ رات کے وقت وہ بہت بھلا لگتا تھا۔ دُور چھوٹے چھوٹے جگنو چمک رہے تھے اور میں پہروں دیکھتا رہتا۔ آج اس شہر میں جانے کا بھی اتفاق ہُوا۔ وُہ نسبتاً جدید شہر ہے۔ غالباً مانچسٹر ہی کا حصّہ، مگر اسے الگ درجہ دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اسی شہر کے ہسپتال کے انچارج ہیں۔ اُن کے ہسپتال کو تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ ڈاکٹر بچّوں کے علاج میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کئے ہُوئے ہیں۔ میرے نزدیک بچوں کا علاج سب سے مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ زبان سے کچھ نہیں بتا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقۂ علاج یہ ہے کہ وہ بچّوں کے ساتھ ان کی ماؤں کو بھی شریکِ علاج رکھتے ہیں۔ کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں کچھ مریض کی ماں کو آئندہ بیماری سے بچاؤ کے طریقے سمجھاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صاحب علاج تو بچّوں کے والدین کرتے ہیں، میں تو صرف انہیں گائیڈ کرتا ہُوں۔

میں نے وارڈوں میں پڑے اتنے چھوٹے بچّے دیکھے جیسے وہ مُنّے مُنّے سے کھلونے ہوں، اصل بچّے

نہ ہوں۔ مگر جب وہ ملتے تھے تو سوچنا پڑتا تھا یہ بچے ہی ہیں، جو اللہ کی مدد اور ڈاکٹروں کی محنت سے بڑے ہوں گے۔ موت سے زندگی کی طرف لوٹیں گے!

ڈاکٹر صاحب اس ہسپتال کے علاوہ مانچسٹر کے دو اور ہسپتالوں کے بھی ڈاکٹر ہیں۔ مگر وُہ ذمہ داری جُزوی ہے۔ اصل کارنامہ ننھے مُنّے فرشتوں سے متعلق ہے۔

ہسپتال سے نکلے تو ایک پاکستانی سٹور پر گئے۔ کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہاں پہنچے تو اندر کچھ لوگ پنجابی بول رہے تھے کچھ پنجابیوں کو اکٹھے دیکھا تو خوشی ہُوئی۔ ویسے انگریزوں سے زیادہ خوشی اس وقت بھی ہوتی تھی جب کوئی اُدھر ہندوستان کا بھی شہری ملتا تھا۔ زبان کی ایکتا بڑی بات ہوتی ہے۔

واپس گھر پہنچا تو ٹیلی ویژن لگا کر سری لنکا اور ایم سی سی کی ٹیم کا کرکٹ کا میچ دیکھا۔ ایم سی سی کی ٹیم کے چھولے بِک چکے ہیں۔ وُہ بری طرح ناکام رہی۔ حالانکہ سری لنکا کی ٹیم کوئی بڑی ٹیم نہ تھی۔ مَین آف دی میچ بھی سری لنکا ہی کا ایک کھلاڑی ٹھہرا۔ آج میچ کا آخری دن تھا۔ جو ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا تھا۔ میں یہ میچ پہلے بھی دیکھ سکتا تھا۔ مگر نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ میزبان ملک کی حالت اچھی نہ تھی۔ اخلاق بھی آخر کوئی چیز ہوتا ہے۔

میں نے آج ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا ہے کہ جمعہ تک مجھے بولٹن چھوڑ آئیں کیونکہ وہاں میری بھتیجی رہتی ہے۔ جاوید بھی وہاں ہے۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب کی چھٹیاں بھی ختم ہو رہی ہیں، اس لیے وہ چاہیں نہ چاہیں انہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ مگر اس سے پہلے وہ مجھے اسکاٹ لینڈ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ علاقہ ضرور دیکھو۔ یہاں کے لوگوں میں اور اُن لوگوں میں فرق ہے۔ وہ یہاں کے باشندوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اتنا بُعد ہے جتنا کہ سرحد کے لوگوں کا پنجابیوں سے! چونکہ میں پنجابی ہُوں، اس لیے سرحد کے لوگوں کو دیکھنے پہ راضی ہوگیا۔ اگر وہ لوگ سرحد کے باسیوں جیسے ہوئے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی، کیونکہ اہلِ سرحد کے خلوص نے مجھے جیت رکھا ہے۔

۳۰ اگست (بدھ)

اسکاٹ لینڈ جانا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے میری نیت بھانپ لی اور اسٹرا فورڈ اپون ایون (STRAFORD UPON AVON) کی طرف ولیم شیکسپیئر کی یادگاروں کو دیکھنے نکل گئے۔ یہاں ولیم کی بیوی کا بھی مکان ہے، بیٹی کا بھی اور خود ولیم شیکسپیئر کا، جہاں کہ وُہ پیدا ہوا تھا۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کو یہاں مستقل طور پر کھیلا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ مگر کھیل دیکھنے کے لیے وقت کے وقت ٹکٹ نہیں مل سکتا، ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے بُک کرانا پڑتا ہے۔ شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی اس کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کے ڈراموں میں کام کرنے والے ایکٹروں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ان میں سے کئی کو "سر" کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا۔

ان ڈراموں میں حصہ لینے والے ایکٹروں کے اسٹیچو بنے ہوئے ہیں۔ اُسی زمانے کے لباس اور اُسی زمانے کے تخیلاتی ہیولوں کو مجسم صورت میں بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ مجسمہ کاری شاہکار کا درجہ رکھتی ہے کہ دیکھا کئے۔ اصل انسان معلوم ہوتے ہیں۔

شیکسپیئر کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی اور وفات ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء میں۔ ولیم اپنی زندگی میں بڑا ڈرامانگار مان لیا گیا تھا۔ اس کی زندگی میں اس کی اپنی چھپی ہوئی کتابیں وہاں موجود ہیں۔ وہاں وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن سے شیکسپیئر نے استفادہ کرکے ڈرامے لکھے۔ مثلاً "ایز یُو لائیک اِٹ"۔ وہاں جو شیکسپیئر کی کتابیں رکھی ہیں ان میں سے ایک ۱۵۹۴ء میں چھپی، دوسری ۱۶۰۲ء میں۔ بعد میں تو خیر چھپتی ہی رہیں۔ ان سب یادگاروں کو "دی شیکسپیئر برتھ پلیس ٹرسٹ" کے اہتمام میں محفوظ رکھا ہُوا ہے۔

جو مکان شیکسپیئر کی بیٹی کا ہے۔ اس میں اب لائبریری ہے، جس میں خاصی اہمیت والی کتابیں موجود ہیں جو سب کی سب شیکسپیئر پر نہیں۔

شیکسپیئر خود بھی ڈراموں میں بہ حیثیت اداکار کام کرتا رہا۔ وہ ڈرامانویس بھی تھا اور ڈراموں کا سردار بھی۔ شیکسپیئر کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے باپ کی علاقے میں سماجی حیثیت بھی خاصی تھی۔

ہم نے وہ اسکول بھی دیکھا جس میں ولیم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، جو اس کے گھر سے قریب تھا۔ اس زمانے میں بھی ڈیسک ہوتے تھے اور کُرسیاں، جن پر بیٹھ کر طلبہ پڑھا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ ڈیسک اور کرسیاں اُس زمانے کی نہ ہوں۔ مگر اس دور کے اسکول کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ڈیسکوں پر چاقو سے کھود کھود کے مختلف نام اور حروف لکھے ہُوئے ہیں۔ (نام کندہ)

اب ہم ولیم کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلا کمرہ استقبالیہ سا معلوم ہوتا ہے۔ چند کُرسیاں رکھی ہیں (پرانی طرز کی)۔ الماری ہے۔ لکڑیاں رکھی ہیں جنہیں جلا کر گرمی حاصل کی جاتی ہو گی۔ اس کے اوپر ایک ڈول لٹک رہا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر لکڑیاں جلیں تو چائے یا کافی ہر وقت تیار بھی رہے اور گرم بھی رہے۔ ڈول کے اوپر خلا ہے، جیسے وہ چمنی کا کام دیتا ہو۔ یا اس ڈول میں سُوپ تیار رہتا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے کی خوراک سُوپ اور ڈبل روٹی قسم کی چیز ہی تھی جس کے بارے میں ایک گائیڈ یہ سب کچھ بتا رہا ہے۔

اس گھر میں پانچ بیڈ روم ہیں۔ ایک کمرے میں جہاں کہ ولیم کی پیدائش بتائی جاتی ہے وہاں ایک پرانے انداز کا پنگھوڑا ہے۔ شاید ولیم کی ماں اسے لٹاتی ہو۔ ایک کمرے میں ایک ایسا واکر رکھا گیا ہے جسے ولیم چلا کر چلنا سیکھتا ہوگا۔ اس کمرے میں گائیڈ کرنے والی ایک نوجوان خاتون تھی۔ ایک کمرے میں اس زمانے کی چابیاں رکھی ہُوئی ہیں۔

پہلے جب میں ۱۹۷۰ء میں آیا تھا تو ایک کمرے میں وزیٹر بک رکھی ہُوئی تھی، جو اس بار نہیں دیکھی جس پر

میں نے بھی اپنے تاثرات لکھے اور دستخط کئے تھے۔ اس میں لاکھوں دستخط موجود تھے، بادشاہوں کے بھی تھے اور مجھ ایسے فقیروں کے بھی!

ہاں ولیم کے مکان کی چھتیں اور لکڑیاں جو اُن کمروں میں لگی ہیں، خاصی پُرانی ہیں۔ ان کا رنگ بدل کر کالا ہو چکا ہے مگر لکڑیوں کے علاوہ جوائنٹوں والا حصہ ہوگا اس جگہ اب سفید مصالحہ بھر دیا گیا تھا۔ غرض دیواروں پر سفید مصالحے کے ساتھ (جو بعد میں بھرا گیا ہے) اُسی زمانے کی پرانی لکڑی دیواروں میں چُنی ہُوئی ہے۔ چھت تو جوں کی توں معلوم ہوتی ہے۔ مرمت ہوتی ہوگی۔ غرض انہوں نے اسی ماحول میں پہنچا رکھا ہے کہ جس ماحول میں شیکسپیئر گھر میں رہتا ہوگا۔ یقیناً کچھ چیزیں وہی ہوں گی جو ولیم کے استعمال میں آتی ہوں گی۔ مگر سب کی سب اصلی نہ ہوں گی۔

تھوڑے فاصلے پر دریائے ایون بہ رہا ہے۔ اس میں کشتیاں چل رہی ہیں۔ پارک بھی بنا دیا گیا ہے جس میں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھتے ہیں، خوش گپیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ باغ کے وسط میں ولیم کا اسٹیچو بنا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ کرداروں کا بھی، غرض ولیم کے ڈرامائی ماحول میں پہنچانے کی بھی پوری سعی کی گئی ہے۔

وہاں میں نے سوچا یہاں ایک ڈراما نگار کی زندگی کو ہر رنگ میں محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں علامہ اقبال اور قائداعظم کے بارے میں اسی طرح کی جملہ معلومات بہم پہنچنی چاہئیں، لٹریچر بھی، پیغام بھی۔ ہمارے ہاں یہ سب کام ہوں گے۔ مگر شاید اس میں وقت لگے۔ اس قوم نے بھی سب کچھ آناً فاناً نہ کر لیا ہوگا۔ مگر ہمیں آزاد ہُوئے کافی عرصہ گزر چکا۔

جب ہم مانچسٹر سے برمنگھم پہنچے۔ اس سے ذرا آگے کار پارک اسٹیشن ہے۔ وہاں لمبے سفر پر روانہ ہونے والے افراد کے لیے ستانے کے لئے تازہ دم ہونے کے لیے اہتمام کیا گیا ہے۔ جملہ ضروری اشیا مہیا، ہوٹل وغیرہ۔ ایسا نظام پُورے انگلستان میں ہے، جو ضروری ہے۔ وہاں کھڑے کھڑے ہم نے چارلس ڈکسن کی باتیں شروع کر دیں کہ وہ بچوں کا نمائندہ ادیب تھا۔ اس نے بچوں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کی۔ ان سے جو طرح طرح کے کام لیے جاتے تھے ان کے خلاف احتجاج کیا۔ جو یہاں کا آزاد معاشرہ تھا۔ اس میں بچوں کی پیدائش پر انہیں حرامی سمجھا جاتا تھا۔ ڈکسن نے کہا: یہ قصور والدین کا ہے، پیدا ہونے والے بچے کا نہیں۔ اس لیے اسے معاشرے میں باعزت مقام دیا جائے۔ ڈکسن کی کوششوں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب حرامی بچے کا لفظ متروک ہوا۔

رات ہم جی، ایچ، ویلز کی فلم دیکھ رہے تھے۔ اس کا موضوع ہے کہ وہ ہماری ابتدائی زندگی کا ترجمان ہے، اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس کھوج میں گزار دیا کہ انسان نے کیسے کیسے عہد بہ عہد ترقی کی۔ اس موضوع پر فاسٹر کے ناول بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ فلموں کے ذریعہ اس موضوع سے عام لوگوں اور آئندہ نسلوں کو بھی روشناس کرایا جا رہا ہے۔

ولیم کے شہر کو چھوڑ کر رات ہم آکسفورڈ آ گئے، تاکہ اس تعلیمی شہر کی عظمتوں کو بھی سلام کیا جائے کیمبرج

کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ علاوہ تعلیمی شہر ہونے کے اس کی ہمارے نزدیک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ علامہ اقبال کا تعلیمی شہر ہے، جہاں سے علامہ نے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ آکسفورڈ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ مگر ہم نے رات ہوٹل میں کھانا نہ کھایا۔ باہر نکلے۔ چینی ریسٹوران کی تلاش میں، پہلے خود ڈھونڈا، نہ ملا تو ایک سپاہی کی مدد حاصل کی، جس نے مشکل آسان کی۔ ایک ہمارے ہاں کی پولیس ہے کہ ان کی کرتوتوں سے خوف آتا ہے۔ دیر سویر ہم بھی بدلیں گے یہاں تو پولیس والے ہر مشکل کی دوا ہیں۔ ہوٹل کے نیچے رات کے گیارہ بجے کے قریب لڑکے لڑکیوں کا غل غپاڑہ جاری رہا۔ ہا ہا ہو ہو !!

۳۱ اگست (جمعرات) [آکسفورڈ]

صبح نو بجے ناشتا کے لیے SISI ہوٹل کے کمرہ میں پہنچ گئے۔ کیونکہ ناشتا ان کے ذمہ تھا یا ہوٹل کے اخراجات میں شامل تھا۔ یورپ کے متعدد ہوٹلوں میں ناشتا کرایہ میں شامل ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ نئے ماحول میں آئے ہیں۔ رات نیند ڈھنگ ست نہ آسکے گی۔ مگر سوئے تو صبح بیدار ہوئے۔ مسلسل نیند کے جھولے میں جھولتا رہا۔

ناشتا کرنے کے بعد سامان موٹر میں رکھا تاکہ آکسفورڈ میں گھوم گھام کے گھر واپسی کا سوچا جائے۔ باہر نکلے تو بارش تو نہ تھی مگر پھوار میں بھی جان تھی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا کہ پھوار رُکے۔ اس کے بعد نکلے۔

کالجوں کے اس شہر میں ۳۲ کالج ہیں، جہاں قطار در قطار کالج ہیں۔ عظیم الشان کالج۔ بھیڑ اس شہر میں بھی خاصی ہے۔ مگر یہاں اکثریت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ مطلب یہ کہ جو باہر سے آتے ہیں وہ اسکالر ٹائپ کے لوگ یا علمی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ جیسے بلیک پول میں تھا کہ ہر شخص منہ اٹھائے چلا آرہا ہے کیونکہ وہ تفریحی علاقہ ہے۔

ہم جس کالج میں گئے، وہاں بورڈ پہ لکھا پایا: وزیٹرز کے لیے داخلہ بند ہے۔ دو تین کالجوں کے ہاں ایسا ہی بورڈ لگا پایا۔ ایک کالج میں لکھا تھا کہ داخلہ ۲ سے ۵ بجے۔ اور بھاگے دوڑے تو ایک کالج میں لکھا تھا: داخلہ وزیٹرز کے لیے کھلا ہے۔ ایسا غالباً دانستہ کیا گیا ہے تاکہ وزیٹرز ہر کالج میں داخل ہو کر تعلیم میں حارج نہ ہوں۔ جس کالج میں ہم داخل ہوسکے اس کا نام BRASENOSE COLLEGE تھا۔ وہاں پہ ایک خاتون گائیڈ تھیں جو ہم ایسے سوسوا سو زائرین کو کالج کے متعلق سب کچھ بتا رہی تھیں۔ یہ آرٹس کا کمرہ ہے۔ یہ علم سے متعلق درس کا کمرہ ہے۔ یہ وہ کمرہ ہے یہ وہ کمرہ ہے۔

ایک کمرے میں BRASS RUBBING کا شعبہ تھا۔ یعنی لوگوں کی دلچسپی کے لیے ایک کمرہ میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ آپ ایک خاص نوع کی تصویریں خود بنا سکیں گے۔ تفصیل عرض کرتا ہوں۔ عبدالرحمٰن چغتائی

ایچنگ کے نام سے تصویریں بنایا کرتے تھے۔ وہ تو بلیک اینڈ وائٹ ہوتی تھیں مگر یہاں اب مختلف رنگوں میں بھی وہ کام ہو رہا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ پیتل کی پلیٹ پر چاقو سے تیز اوزار سے پلیٹ پر کندہ کر کے تصویر بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک خاص قسم کے کاغذ پر ایک خاص ربڑ سے رگڑا جاتا ہے۔ تصویر کاغذ پر اُبھر آتی ہے جسے وہاں ہر آنے جانے والا بنا رہا تھا۔ مگر پلیٹ پر جس نے تصویر بنائی ہوگی وہ کوئی بڑا آرٹسٹ ہوگا۔

ہمیں وُہ گائیڈ خاتون کالج کے لائبریری روم میں بھی لے گئیں جہاں کہ نایاب کتابیں موجود تھیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے سوچا اس جگہ زیادہ دیر ٹھہرنا چاہیے۔ لہٰذا گائیڈ کی رہبری کو بادلِ نخواستہ چھوڑنا پڑا۔ اس لائبریری میں صدیوں پرانے قلمی نسخے تھے۔ کوئی ساتویں صدی کا، کوئی آٹھویں صدی کا، کوئی اس کے بعد کا، کچھ بعد کی نایاب چھپی ہوئی کتابیں بھی، موضوعات مختلف اور متعدد تھے۔ اہمیت یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر کتاب تھی نایاب کتاب تھی۔ نہ صرف یہ کہ ساری کتابیں انگریزی میں تھیں۔ بلکہ متعدد زبانوں میں، عربی میں بھی متعدد قلمی نسخے تھے۔ یعنی یہ شعبہ وُہ تھا جس سے کالج کی اہمیت بنتی ہے، تاکہ اسکالر دور دور سے آئیں اور استفادہ کریں۔ وہ کتابیں کھُلی شیشے کے ریکوں میں رکھی ہوئی تھیں تاکہ دیکھا اور پڑھا جا سکے (ان صفحات کو جو کھُلے تھے) شیشے کی الماریوں کے اوپر کپڑا اڈالا ہوا تھا۔ ہر کوئی پہلے وہ کپڑا اٹھاتا تھا، پھر دیکھتا تھا کہ نیچے کون سی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ یہ اہتمام اس لیے تھا کہ نیچے رکھی ہوئی کتاب پر کمرے کے اندر چھنتی ہُوئی دھوپ بھی نہ پڑے تاکہ کتاب متاثر نہ ہو۔ اس کے علاوہ کتابوں کو محفوظ رکھنے کے طریق اختیار کئے ہوں گے، وہ تو الگ ہوں گے۔ حتیٰ کہ اس لائبریری میں براؤن اور شیلے کے خطوط بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک اپنا ملک ہے کہ جہاں ایسی نایاب چیزوں کو سنبھالنے کی ابھی کوئی سعی نہیں۔ میرے پاس ہزاروں نایاب خطوط ہیں، غالب کے بھی، جن کا کاغذ بوسیدہ ہو کر خراب ہو رہا ہے۔ مگر انہیں محفوظ رکھنے کا کسی بھی شعبے کی طرف سے اہتمام نہیں ہو رہا۔ یوں ہزاروں نایاب چیزیں ہمیشہ کے لیے رُوٹھ جائیں گی۔

یہ کالج قدیم طرزِ تعمیر کا امین تھا۔ چھوٹا چھوٹا کام، جیسے سُنار کا کام ہوتا ہے۔ بس وہی نقشہ تعمیر میں تھا پرانی ساری عمارتیں ایسے اہتمام سے بنائی گئی ہیں کہ یہ سارا کام لکڑی کا ہے۔ اسی طرح شیشے پر نقش و نگاری، بھی دل موہ لیتی ہے کہ دیکھئے اور دیکھتے ہی رہ جائیے۔ یہ اہتمام یورپ میں ہے۔ امریکیوں کے ہاں یہ سب کچھ نہیں۔ وُہ تو سیدھے سادے سپاٹ قسم کے طرزِ تعمیر کے موجد ہیں۔ دیکھئے اور دیکھتے ہی رہ جائیے۔ قسم قسم کے کام کا اہتمام ان کے ہاں نہ ملے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرے اس سفر کے دوران کیمرے کو چالو حالت میں رکھا۔ جس جگہ پہنچے وہاں اُسے کیمرے کے ذریعے بھی محفوظ کر دیا۔ ہم ایک گھاس کے قطعہ پر کھڑے ہو کر تصویر اتروا رہے تھے کہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے کہا: براہِ کرم گھاس پر کھڑے نہ ہوں۔ جو لوگ گھاس جیسی معمولی چیز کو بھی برباد ہوتا نہ دیکھ

سکیں، وہ اپنے کلچر اور اپنی یادگاروں کو کیوں نہ محفوظ رکھیں گے!

جہاں ہمیں گھاس پر کھڑا ہونے سے منع کیا گیا تھا وہ گھاس کا ایک بڑا قطعہ تھا۔ اس کے وسط میں ایک تالاب تھا جس میں کنول کے پھول مع اپنے بڑے بڑے پتوں کے کھلے ہوئے تھے۔ اتنے زیادہ تعداد میں کنول کہیں کھلے نہ دیکھے تھے، سفید رنگ کے بھی سرخ رنگ کے بھی، جو بےحد بھلے لگے۔

یہاں ہر کالج میں ایک چرچ بھی ہے، بہت بڑا، بڑا خوب صورت، جہاں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی ہے پھر اپنے اپنے عقاید کے مطابق تعلیم کا اہتمام ہے، زبردستی عقیدے نہیں ٹھونسے جاتے۔

غرض آکسفورڈ پہنچ کر وہاں کا سراسر تعلیمی ماحول دیکھ کر، لوگوں کا انہماک دیکھ کر بےحد خوشی ہوئی۔ پروفیسر لیکچر دے رہے ہیں تو پورے اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ، جیسے اگر کوئی ان سے استفادہ نہ کرسکا تو یہ قصور پروفیسر کا ہوگا!

آکسفورڈ سے نکلے تو مانچسٹر کے راستے میں ایک چڑیا گھر COTS WOLD WILD LIFE PARK ملا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے چڑیا گھر سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر بچوں کو اور بعض خاص طبیعت کے بڑوں کو بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے بڑوں میں ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی ہیں۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اسے دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتے۔ لہٰذا گاڑی رکی۔ پہلے پکنک منائی گئی۔ یعنی کھانا وغیرہ کھایا گیا۔ اس کے بعد چڑیا گھر کی طرف گئے۔ یہ چڑیا گھر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کھلا تھا۔ یعنی گینڈے بھی کھلے پھر رہے ہیں اور دوسرے کئی خطرناک جانور بھی۔ مطلب یہ کہ ایک حد ان کی مقرر تھی وہاں لوہے کی جالی لگا دی گئی تھی مگر وہ اپنے طور کافی حد تک آزاد تھے۔ یہاں یورپ میں ایسے اور بھی کئی چڑیا گھر ہیں جہاں جانوروں کو بھی آزادی دی گئی ہے۔ اور ایسا شعوری طور پر کیا گیا ہے۔ ایک تحریک کے تحت کیا گیا ہے کہ جنہیں قدرت نے آزاد جنا ہے انہیں قید کرنا ناانصافی ہے۔ ایک قصہ مجھے ڈاکٹر صاحب نے سنایا کہ ایک ڈاکٹر تھے، جو شکار کے رسیا تھے۔ شکار میں انہوں نے ایک شیرنی کو مار دیا۔ وہاں شیرنی کے چار چھوٹے چھوٹے بچے پہنچ گئے جن کو ڈاکٹر صاحب اپنے گھر لے آئے چار بچوں کو وہ خود بہ آسانی نہیں پال سکتے تھے۔ اس لیے تین انہوں نے مختلف چڑیا گھروں کو دے دیے، ایک خود پالا۔ جب وہ بڑا ہوا تو قانون کے مطابق وہ انہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ حکومت نے زور لگایا کہ بچہ کسی چڑیا گھر کو دیا جائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب تو قدرت نے جنہیں آزاد جنا ہے انھیں قید نہیں کرنا چاہیے کے اصول کے آدمی تھے۔ اس بچے کو لے کر واپس جنگل میں چھوڑ آئے تھے۔ اس پر فلم بھی بنی ہوئی ہے کہ جب وہ بچے کو چھوڑ کر واپس آ رہے تھے تو انہیں پھر ایک شیرنی کے ساتھ چار بچے نظر آئے۔ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ بالکل سچا ہے۔

آج میں نے اپنی بھتیجی کو ٹیلیفون کر دیا ہے کہ چار بجے کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ بےحد خوشی ہوئی۔ گھر واپس پاکستان بھی پہنچنا ہے اور ابھی نمائش میں برمنگھم جانا ہے، لندن میں دوستوں سے بھی ملنا ہے۔

میں نے ابھی بائیں جانب دیکھا۔ جدھر کہ ابھی ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ وہاں ایک میز پر وہ تصویر رکھ گئے ہیں جو کہ ان کے صاحبزادے کی ہے، جسے دریا کے کنارے ایک آرٹسٹ نے بنایا تھا، جس کی اجرت میں نے ادا کی تھی۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔ مگر بات تو ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی نرسری میں ایک بہت سُرخ، بڑا سا اور پکا ہُوا سیب لگا ہُوا تھا۔ مگر وُہ بہت اُونچا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرا دل للچایا کرتا تھا، حالانکہ ویسے ہی متعدد سیب میں نے کم اونچائی والے توڑ توڑ کے کھائے تھے۔ مگر اس کا ذکر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کر دیا تھا۔ وُہ سیب کھانے کو دل چاہتا ہے۔ آج جب کہ طے ہو گیا ہے کہ میں آج چلا جاؤں گا تو ڈاکٹر صاحب وُہ سیب توڑ کر اور پلیٹ میں رکھ کر لے آئے۔ بات انہوں نے بھی کوئی نہیں کی۔ بات میں نے بھی کوئی نہیں کی۔ مگر اس خاموش گفتگو میں بات تو دُور جا پہنچی۔

آج دو بجے اس گھر سے رخصت ہونا ہے۔ مگر دل بے چین ہے۔ ایسا خلوص ایسی اپنائیت کم دیکھنے میں آئے گی۔ سماجی طور پر اتنا بڑا آدمی اور وُہ میرے لیے انتہائی شفیق، میرا جھوٹا بھی کھا لے، میرے گندے برتن بھی دھوئے، کوئی کم حوصلے کی بات نہیں!

آج دوپہر کا کھانا بڑا عجیب کھایا۔ اطالوی کھانا، جس طرح ہم روٹی کھاتے ہیں۔ وُہ ہمارے ہاں سویوں نما چیز کھاتے ہیں مگر وہ موٹی ہوتی ہیں۔ پھر وُہ کانٹے پر لپیٹ کر کھاتے ہیں۔ جب مجھے اس کے کھانے کا طریقہ بتایا گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے اردو میں کہا، اے اللہ! مجھے اس امتحان میں کامیاب کرنا۔ تو ہم دونوں کھلکھلا کر ہنسے تھے۔ ڈاکٹر حیدر کی بیوی سلوی پُوچھ رہی ہے، کس بات پر ہنس رہے ہو؟

اس کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب بولٹن، میری بھتیجی روبینہ کے پاس چھوڑ آئے اور وہ رفاقت مجھے اپنے دوست کے پاس ۱۲ دن تک حاصل رہی۔ وہ وقتی طور پر ختم ہو گئی۔ ان بارہ دنوں میں ہم نے مختلف جگہوں کا سفر کیا۔ اور ۲۷۰۰ کلومیٹر کا سفر کیا۔ اِدھر نکلے، اُدھر نکلے والا قصہ تھا۔ آنے سے پہلے مجھے محمود ہاشمی صاحب نے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ میں نے متعدد بار ٹیلیفون کیا اور آپ مجھے کسی وقت نہ ملے۔ میں نے صبح ٹیلیفون کیا، تو آپ نہ ملے۔ دوپہر ٹیلیفون کیا تو نہ ملے۔ رات ٹیلیفون کیا تو نہ ملے۔ میں نے جواب میں کہا، آپ نے ضرور ایسا کیا ہوگا، کیونکہ ہم گھر سے صبح نو بجے نکل جاتے تھے اور رات گیارہ بارہ بجے تک واپس پہنچتے تھے۔ ہاشمی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میں اس وقت رالف رسل کے گھر سے ٹیلیفون کر رہا ہُوں اور وُہ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا، میرا بھی سلام کہیئے اور یہ بھی بتائیے کہ ملے بغیر پاکستان نہ جاؤں گا۔ بعد ازاں میں نے اور ہاشمی صاحب نے برمنگھم میں ملنے کا وعدہ کر کے ٹیلیفون بند کر دیا۔

۱ ستمبر
[بولٹن]

بھتیجی کی شادی ہوئے ۹ سال ہو چکے تھے اور وُہ جب سے انگلستان میں ہے چار سال پہلے وُہ

پاکستان گئی تھی پھر جانا نہ ہوا۔ سب کی لاڈلی بچی ہے۔ جاوید کچھ دن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ میں بھی پہنچ گیا۔ گھر کی باتیں شروع ہوئیں جو دیر تک جاری رہیں۔ ہمارے داماد جمیل احمد صاحب محبت کرنے والے اور پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ہماری دلداری میں لگ گئے۔ کھلانے پلانے کے علاوہ "مسیج" نامی فلم لگا دی۔ اس لیے کہ پاکستان میں اس فلم پر پابندی ہے۔ میرے خیال میں اگر اس فلم پر پابندی نہ ہوتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اس لیے کہ اسے دیکھ کر تو ایمان تازہ ہوتا ہے۔ جامعہ ازہر کے علماء نے بھی اس کے اسکرپٹ کو پاس کیا ہوا تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فلم میں دکھایا نہ گیا تھا، صرف ان کے پیغام کو مختلف انداز میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بہر حال یہ حکومت کا فیصلہ تھا، چون چرا کی گنجائش نہ تھی۔

رمضان المبارک میں قصص القرآن پر مبنی، پاکستان ٹیلی ویژن پہ ایک پروگرام دکھایا گیا تھا۔ اس کی ایک دو قسطیں چلی ہوں گی تو کئی علماء نے اخباروں میں کہا کہ اسے بند کرنا چاہیے۔ مگر حکومت نے اس معاملے پر غور نہ کیا۔ وہ فلم مصر نے بنائی تھی۔ بڑی محنت سے بنائی گئی تھی۔ یوں اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات کا علم ہوتا تھا۔ اگر اسی جرأت کے ساتھ پاکستان ٹیلیویژن میسیج کو بھی دکھائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اچھے نتائج کی حامل ہوگی۔ اسلام کی خدمت کے سلسلے میں جو بھی طریق اپنایا جائے اس کی اجازت دینی چاہیے۔

روبینہ کا گھر صاف ستھرا اور تمام جدید سہولتوں سے آراستہ دیکھ کر خوشی ہی نہ ہوئی بلکہ سکون بھی ہوا۔ وہ جو ہم اسے اور اس کے میاں کو کہا کرتے تھے پاکستان واپس آؤ۔ اس پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ وہ یوں کہ جیسا وہ مناسب سمجھیں۔ میں نے دیکھا کہ ہر پاکستانی کے دل میں وطن جانے کی تڑپ ہے۔ مگر وہ وہاں جا کر اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر سکیں گے۔ ہم اپنے ملک کو جنت نشان بنا سکتے ہیں مگر ابھی پاکستانیوں نے اس کے لیے کمرِ ہمت نہیں باندھی۔

آج ہم نے گھر (پاکستان) ٹیلیفون کیا۔ سب کی خیر خیریت پوچھی۔ وہ بھی یہ سن کر خوش ہوئے کہ ہم روبینہ کے پاس ہیں۔ دور دیس میں اپنی زبان میں بات کرنے والا مل جائے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ہمارے اور ہندوستان کے درمیان جو بُعد ہے اس کے باوجود ایک ہندوستانی باشندے سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ کوئی پاکستانی مل جائے تو سبحان اللہ! اگر کوئی رشتہ دار مل جائے تو نورٌ علیٰ نور!

ہم جو باہر نکل کر اپنے کھانوں کو ترس جاتے ہیں اس کی یہاں تلافی ہوگی۔ یقین جانیئے، زیادہ تر ہم نے پھلوں، کچی ترکاریوں پر گزارہ کیا۔ ہم لوگ شاید ساری دنیا میں سب سے زیادہ چسکے دار کھانے کھاتے ہیں جو باہر نہیں کھائے جاتے۔

یہاں پہنچ کر کچھ اردو کے اخبارات بھی دیکھے۔ سیاسی حالات کا بھی علم ہوا۔ افغانستان کی سرحد پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا حال بھی معلوم ہوا۔ ہندوستان کی سرحد پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں بھی پڑھا۔ پاکستان اس جدوجہد میں لگا ہوا ہے کہ پڑوسیوں سے تصادم کی صورت نہ نکلے۔ مگر جب تک پڑوسی بھی ایسا

نہ چاہیں گے اس وقت تک امن کی کوششیں بار آور نہ ہوں گی۔

ہمارے بعد وہاں ایک اور ہوائی جہاز کو اغوا کیا گیا۔ ہندوستان والے اس کی ذمہ داری پاکستان پر ڈال رہے ہیں۔ یعنی ایسا کرتے ہندوستانی ہیں مگر الزام دھرا جاتا ہے پاکستان پر۔ یہ وہ منطق ہے جسے ہندوستانی منطق کہنا چاہیے۔

۲ ستمبر (اتوار)

یہاں اردو کے اخبارات دیکھنے کو مل جاتے تھے، جو پاکستان سے متعلق خبریں چھاپتے ہیں۔ بلکہ وُہ پاکستانی اخبار ہی ہیں جو یہاں سے نکلتے ہیں۔ یہاں سے انگریزی اخبار میں پاکستان کے بارے میں خبریں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ مگر یہاں کے اخباروں میں یہ دیکھا کہ پاکستان میں ان اخباروں کی پالیسی کچھ ہے اور انہی اخباروں کی یہاں پر کچھ۔ جیسا دیس ویسا بھیس والا قصہ ہے!

آج اتوار ہے اس لیے آج اردو اخباروں کی چُھٹّی ہے۔ ہمارے ہاں تو عید بقرعید چھٹی ہوتی ہے۔ یہاں اردو اخباروں کی ہر ہفتہ چھٹی۔ آج اپنے ملک کی خبریں نہ پڑھ سکنے پر، طبیعت بدمزہ ہُوئی۔ جیسے ایک اہم کمی واقع ہو گئی ہو۔

آج میں نے لندن میں اشفاق مرزا کو ٹیلیفون کیا۔ خیر خیریت پُوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کے کچھ خطوط آئے ہُوئے ہیں۔ بی بی سی سے اور اردو مرکز والوں کے بھی ٹیلیفون آتے رہتے ہیں۔ وُہ مجھ سے پُوچھتے ہیں کہ طفیل صاحب کا پروگرام کیا ہے؟ خود مجھے کچھ معلوم نہیں ہوتا، اس لیے میں انہیں کیا بتاؤں! پھر اشفاق صاحب نے یہ بھی بتایا کہ آپ جو مجھے مانچسٹر کا ٹیلیفون نمبر دے گئے تھے وہ غلط ہے۔ میں نے اس نمبر پر دو مرتبہ ٹیلیفون کیا، مجھے بتایا گیا نمبر غلط ہے۔ اس پر اشفاق صاحب نے پُوچھا: آیندہ کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا ۵ ستمبر کو برمنگھم جاؤں گا۔ وہاں سے آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا۔ تب یہ بتا سکوں گا کہ لندن کن تاریخوں میں پہنچوں گا۔ اس پر اشفاق صاحب نے پوچھا: اندازاً ہی بتائیے۔ اس پر میں نے کہا، غالباً ۱۲ ستمبر کے بعد! غرض احوال پوچھنے احوال بتانے کے بعد ٹیلیفون بند کر دیا۔ اس کے بعد خیال آیا کہ اصل بات تو پُوچھی ہی نہیں۔ یعنی عمرہ پر جا سکنے کی تاریخ کا! یہ میرا زندگی بھر کا وطیرہ ہے کہ کسی کو کسی ضروری کام کے لیے ٹیلیفون کروں گا تو باقی سب باتوں کے اصل بات ہی نہ کروں گا۔ جب ٹیلیفون بند کر دُوں گا تو یاد آئے گا کہ اصل بات تو پُوچھی ہی نہیں۔ یہ میرا روز مرہ کا معاملہ ہے۔ ضروری کام کی غرض سے گھنٹی بجا کر کسی کو بلاؤں گا۔ جب کوئی گھنٹی سُن کر میرے کمرے میں آئے گا اور کام پُوچھے گا تو میں اس کام کو بھُول چکا ہوں گا۔ تب بھی میں اپنی خفت مٹانے کے لیے کہہ دُوں گا، پانی پلا دو۔ اور یہ 'پانی پلا دو' کا سلسلہ دن میں کئی بار دُہرایا جائے گا۔ کبھی کبھی زیادہ ہی بھُول جاتا ہُوں، تو چپڑاسی دفتر میں جا کر کہے گا آج بابُو جی زیادہ ہی پانی پی رہے ہیں۔ یعنی آج زیادہ بھلکڑ بنے ہُوئے ہیں۔

چنانچہ جب اشفاق مرزا کو ٹیلیفون کر چُکا تو یاد آیا کہ ان سے تو یہ پُوچھنا تھا کہ حج کے کتنے دنوں کے بعد

سعودی عرب جانے کی اجازت ملے گی! چنانچہ دوبارہ لندن ٹیلیفون کیا اور پوچھا، بھئی اصل بات تو بھول ہی گیا تھا یہ بتایئے کہ عمرہ کے لیے کب جا سکوں گا؟ انہوں نے بتایا: حج کے تین ہفتہ بعد!

لہٰذا آج باقی تمام پروگراموں پر نظرِ ثانی کی جائے گی۔ جاوید نے فوراً کہہ دیا: یوں ہمیں گھر سے نکلے دیر ہو جائے گی۔ میں نے اس پر اپنی کوئی رائے نہ دی!

میں جمعہ کے روز بولٹن پہنچا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نکلا نہیں۔ یوں کمرہ بند رہنے پر اچھا نہیں لگ رہا۔ آج میں اہلِ خانہ سے کہوں گا۔ ذرا ہمیں "دھوپ لگائی جائے"۔ قبل اس کے کہ میں یہ بات کہتا، ٹیلیفون آیا کہ بیگم جاوید کی سہیلی شکیلہ شیفیلڈ میں رہتی ہے وہ ہمیں ملنے کے لیے مع تمام اہل و عیال کے لیے آ رہی ہے اس لیے شاید ہمیں دھوپ نہ لگ سکے۔

بھتیجی کا اصرار ہے کہ میں یہاں زیادہ دن ٹھہروں۔ مگر اُسے کیا معلوم کہ ہماری عدم موجودگی وہاں کیا گُل کھلا رہی ہوگی۔ کام کتنا متاثر ہو رہا ہوگا۔ کام سے مراد آمد و خرچ کی میزان نہیں بلکہ کام سے مراد 'رسولؐ نمبر' کی بقایا جلدوں کی تکمیل ہے۔ کچھ مسودات پہنچنے تھے، کچھ کتابت ہونی تھی، کچھ طباعت ہونی تھی۔ اس نمبر کی جملہ جلدوں کو اسی سال مکمل کرنے کا جو منصوبہ بنا ہُوا تھا وہ متاثر ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔

ہمارا دل بہلانے کے لیے اس گھر میں سارا دن فلمیں چلائی جا رہی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری لگا دی جاتی ہے۔ چونکہ مجھے زیادہ شوق نہیں اس لیے کبھی لیٹ گیا، کبھی بیٹھ گیا، کبھی ٹہل لیا، کبھی نہا لیا، میں وقت گزارنے کی کوشش کرتا ہوں، یا اپنے دوستوں کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ دوستوں کو شکایت کا موقع نہ دینے کے لیے ہی تو اتنے دن گزر گئے کر دنوں کے پروگرام مہینوں تک جا پہنچے۔ چونکہ لندن میں میرے خاصے دوست ہیں اس لیے میں نے لندن میں رہنے کا پروگرام بعد میں رکھا تھا۔ اگر دوستوں سے ملنے کی اتنی شدید خواہش نہ ہوتی تو گھر لوٹ جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ صحت کی بحالی میں، میرے لیے صرف آرام کرنا، سیر کرنا اور کچی سبزیاں کھانا ضروری ہے یا ایک آدھ ٹانک لکھ دی، بس!

ابھی ابھی گھنٹی بجی ہے، میری بہو کی سہیلی شکیلہ، بچے اور ان کے میاں غیاث صاحب آتے ہیں جو الیکٹریکل انجنیئر ہیں۔ خاصے باخبر ہیں، قومیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے مگر پیروں، فقیروں اور غلط قسم کے مُلاؤں کے سخت خلاف ہیں۔

غیاث محمد خاں کا اصرار تھا کہ ہم عید ان کے گھر کریں۔ ادھر ہم اخباروں میں پڑھ رہے تھے کہ عید بدھ کو ہوگی، کوئی کہتا جمعرات کو، کوئی کہتا جمعہ کو۔ اس پر ہم نے کہا: پہلے یہ طے ہو کہ عید ہوگی کس دن! اس کے بعد حاضری کا بھی سوچا جائے۔ انہوں نے کہا، یہ تو خیر طے ہو جائے گا۔ اس پر میں نے کہا، کیا عید کا یہاں کوئی بڑا اجتماع ہوتا ہے؟ اس نے کہا: یہ نہ پوچھیں، بلکہ یہ پوچھیں کہ نماز کس مسجد میں پڑھیں گے۔ یہاں میرپور والوں کی مسجد ہے، یہاں

پٹھانوں کی مسجد ہے، یہاں جالندھریوں کی مسجد ہے، یہاں وہابیوں کی مسجد ہے، یہاں بریلویوں کی مسجد ہے۔ آپ نے فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کس کی مسجد میں نماز پڑھنا ہے!

میں نے کہا: میں تو اللہ کی مسجد میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ کسی خاص نظریہ اور کسی علاقے والوں کی مسجد میں نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس پر انہوں نے کہا: تو پھر آپ نے نماز پڑھ لی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں مولوی حضرات نے ایسا غضب ڈھا رکھا ہے کہ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں، دنگا فساد کرتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ پولیس کو مداخلت کرنا پڑتی ہے جو باعثِ شرم بات ہے۔

میں نے پوچھا: ایسا کیوں ہوتا ہے؟

انہوں نے بتایا: مولوی حضرات نے مذہب کو بھی کاروبار بنا لیا ہے، اگر ان میں اتفاق ہو تو دکان داری کیسے چلے! یہاں ایک ایک مولوی کے کئی کئی مکان ہیں، لاکھوں کے مالک ہیں۔ انہیں مذہب اور خدا سے کوئی واسطہ نہیں صرف پاؤنڈز سے یارانہ ہے۔ ہم لوگ تسبیح ہاتھ میں لے کر درود شریف پڑھتے ہیں یہ لوگ تسبیح ہاتھ میں لے کر اس پر پاؤنڈز کی گنتی کرتے ہیں۔ جب کتنے تھے، اب کتنے ہیں!

دو دن سے گھر سے نکلے تھے۔ مانچسٹر میں گھر میں بیٹھے نہ تھے اس لیے میں نے سب سے کہا: گھر سے نکلو، قلعہ بند ہونے کی کیا ضرورت ہے!

چنانچہ بولٹن سے مانچسٹر چلے گئے، جو دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے میں نے اپنے لیے ایک دوائی خریدی۔ بچوں نے پارک جانے کی صدا لگائی جو منظور کر لی گئی۔

ہماری بھتیجی کے دو بچے ہیں، دونوں لڑکے، ایک وقاص، دوسرا شماز۔ شماز چھوٹا ہے دو سال کا ہوگا۔ بڑا چھ سال کا۔ مگر ہیں دونوں بڑے ذہین۔ مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں کے ماحول کا اثر ہے کہ بچے خود اعتمادی کے مالک اور نڈر ہیں۔ وہ بات ان میں بھی ہے۔

۲ ستمبر (پیر) [برمنگھم]

آج کا اخبار دیکھا، خبریں پڑھیں۔ مگر اس میں ایک کالم "پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟" پڑھا۔ یہ اسی تقریب کا ذکر تھا جس کے لیے فتح محمد ملک ہائیڈل برگ سے گئے تھے۔ ملک صاحب نے ضرور اپنا پاکستانی رول ادا کیا ہوگا۔ ملک صاحب کو جانے سے پہلے معلوم تھا کہ وہاں شرارتیں ہوں گی۔

مگر میں نے اس تقریب کا حال پڑھا تو وہ صرف شرارتیں نہ تھیں، بلکہ وہ تقریب تو تخریب پسند طبقوں کی سوچی سمجھی سکیم کا عملی مظہر تھی۔ سیمینار کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے جو کتابچہ تقسیم کیا گیا اس میں پاکستان کے مسائل کی چار بڑی وجوہ متعین کی گئی تھیں۔ مثلاً:

۱۔ پاکستان کی تخلیق جس قانون کے تحت کی گئی اس کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔

۲۔ مسلم لیگ کا رویہ پوری تحریک کے دوران غلامانہ تھا اور اس نے قانونی جواز کو مسلم عوام کی قوت سے زیادہ اہم سمجھا۔

۳۔ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ جو اس وقت کے ماحول کے مطابق قابلِ قبول نظریہ نہیں تھا۔ اس لیے اسلام کے نام پر ایک ریاست کی تخلیق بے اصول اور غیر ضروری بات معلوم ہوتی تھی۔

۴۔ پاکستان بڑی حد تک ہندوستانی سرزمین پر قایم کیا گیا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ہندوستان ۱۹۴۷ء کی تقسیم کو مستقلاً تسلیم کر لے۔

اخبار نے آگے جا کر لکھا: مقررین نے یکے بعد دیگرے بانیِ پاکستان پر رکیک حملے کئے۔ ایک صاحب نے برصغیر کے متعلق اپنی تاریخی بے خبری کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں ہندوستان کی تقسیم کا گنہ گار قرار دیا۔

دُوسرے نے کہا: شرعی اصطلاح میں ایسی ریاست کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ وہ ایک سنیکل (SNICAL) مملکت ہے۔ اس کی حیثیت ایک ناجائز ریاست کی ہے۔

اس پر پاکستان سے آئے ہوئے مندوبین نے احتجاج کیا۔ ایک نے کہا: آپ لوگ ہمیں ناجائز ریاست قرار دیتے ہیں۔ ہمارے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو آپ ہمارے مستقبل کے بارے میں پریشان کیوں ہیں!

غرض اس تقریب میں مقررین نے اعلیٰ زبان اور لہجے کی بجائے جو بین الاقوامی مذاکروں کا لازمی حصّہ ہوتا ہے، بہت تلخ اور نامناسب زبان استعمال کی۔

اس مذاکرے کا اہتمام لندن کے مسلم انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کلیم صدیقی نے بھی زہریلی گفتگو کی۔ گفتگو کا دائرہ وہی مندرجہ بالا چار وجوہ!

دیارِ غیر میں یہ سب کچھ پڑھ کر بے حد تکلیف ہُوئی۔ پاکستان کے خلاف ملک کے اندر اور باہر جو عناصر کام کر رہے ہیں اس کی بیخ کنی پر کسی کی توجہ نہیں۔ پاکستان کو ایسی تقریب میں شرکت ہی نہیں کرنی چاہیے تھی تاکہ وہ تقریب یک طرفہ ہذیان گوئی کے ذیل میں آ سکتی۔ یا پھر جب ایسی باتیں ہو رہی تھیں تو پاکستانی مندوبین کو اس تقریب سے واک آؤٹ کر جانا چاہئے تھا۔ بہرحال بدخُو جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو کر رہے ہیں، پاکستان کے خیر خواہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارے سفیر کیا کر رہے ہیں؟

آج سہ پہر ہمارا ارادہ برمنگھم جانے کا ہے۔ مگر ہماری بھتیجی نے ہمارا سامان بہ طور یرغمال رکھ لیا ہے کہ واپسی سے پہلے یہاں آئیے گا۔ سامان: یرغمال بنانے والے ہی ہمیں برمنگھم چھوڑ گئے تاکہ علم میں یہ بھی رہے کہ کہاں ٹھہرے ہیں!

برمنگھم جا رہے تھے، راستے میں بارش ہوتی رہی۔ یہ سماں مجھے ہمیشہ اچھا لگا۔ مگر کار ڈرائیو کرنے والے

اس موسم کو مناسب نہیں سمجھتے۔ پھسلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ سفر میرے نزدیک بڑا سہانا تھا۔

برمنگھم میں ہماری رہائش کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ ایک پورا مکان ہمارے لیے موجود تھا۔ ریڈیو ٹیلیویژن سمیت، کچن میں بھی جملہ سامان، چاہیں تو خود پکائیں، خود کھائیں۔ چونکہ جاوید کے ساتھ اشرف بھی تھا۔ لہٰذا تین آدمی تھے۔ خود پکا کر کھاتے تھے۔ خود برتن دھوتے تھے۔ یہ سب کچھ اچھا لگا۔ ہم لوگ بولٹن سے چار بجے کے قریب چلے تھے۔ چھ بجے کے قریب برمنگھم پہنچ گئے تھے۔ برمنگھم اچھا لگا۔ یہاں افراتفری کم ہے۔ پھر پاکستانی اور ہندوستانی یہاں بہت ہیں۔

۴ ستمبر

ضروری کاموں میں یہ کام بھی تھا کہ برمنگھم میں جو انٹرنیشنل پرنٹنگ مشینوں کی نمائش ہو رہی ہے، اُسے بھی دیکھوں۔ چنانچہ پورے چاؤ کے ساتھ اُٹھے، وہاں پہنچے، اشرف صاحب انٹرنیشنل پرنٹنگ ایجنسی کے پروپرائٹر ہیں اس لیے ان کے کام سوا تھے۔ ان کے متعدد فرموں سے تعلقات سوا تھے۔ لہٰذا ہم ان کی رہنمائی میں گھومتے رہے۔

کہتے ہیں کہ یہ نمائش اتنی بڑی نہیں جتنی کہ جرمنی میں لگتی ہے۔ یہ دونوں نمائشیں چار سال کے وقفے سے لگتی ہیں۔ مسلسل لگتی ہیں۔ مگر میں تو یہ کم بڑی نمائش دیکھ کر بھی حیران رہ گیا۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں چلتے چلتے ٹانگیں تھک گئیں مگر پوری نمائش نہ دیکھی گئی۔

آج کل بیک وقت پانچ پانچ رنگ چھاپنے والی مشینیں بن چکی ہیں جو فی گھنٹہ پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار چھاپ رہی تھیں۔ اس میدان میں اس انتہائی کارکردگی پر بے حد خوشی ہوئی۔

یہاں پہلی بار روبوٹ انسانوں کو دیکھا (مصنوعی انسان) جو بول رہے تھے، جو کام کر رہے تھے، جو معلومات بہم پہنچا رہے تھے۔ یعنی ایسے انسانوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ مگر آج اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا، جو پرنٹنگ سے متعلق مشین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ سائنس کے کمالات کا انسان کہاں تک قائل ہو!

اس نمائش میں پرنٹنگ کی مشینیں، پرنٹنگ سے متعلق مشینوں کی بھرمار ہے۔ چھوٹی مشینوں سے لے کر بڑی مشینوں تک، ایک لاکھ کی مشین سے لے کر پچاس لاکھ کی مشینوں تک۔ ان میں سے استی فیصد مشینیں ایسی تھیں جن کی پاکستان میں ضرورت نہ تھی، مطلب یہ کہ ہماری ضروریات سے زیادہ کی پروڈکشن کرنے والی۔

غرض مشینیں دیکھ دکھا کے، تھک تھکا کے واپس آ گئے۔ وہاں ہندوستان سے آئے ہوئے گاہک زیادہ تھے۔ پاکستان کا کوئی بیوپاری نہ ملا۔ میرا خیال ہے چونکہ ۷ ستمبر کو عید ہے اور یہ نمائش ۱۲ ستمبر تک چلے گی۔ اس لیے پاکستان سے جو لوگ آئیں گے وہ، ۷ ستمبر کے بعد ہی آئیں گے۔ یا جو ہماری طرح کے رُکے رکائے ہوں گے وہی آج نمائش میں موجود ہوں گے۔

آج نمائش میں مشینوں کا طائرانہ جائزہ لیا۔ کل بنانے والوں سے تبادلۂ خیالات کریں گے۔ پھر شاید ہمارے پلّے کچھ پڑے۔ آج تو جو کچھ ملا اُسے حیرانی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

مشینیں دھڑا دھڑ چھاپ رہی تھیں۔ ناظرین کے لیے یہ اجازت تھی کہ وُہ ہر چھپی ہُوئی چیز اٹھا لیں۔ چنانچہ دھڑا دھڑ چھپی ہُوئی چیزیں اٹھائی جا رہی تھیں، زیادہ تر تصویریں۔ جاوید نے کہا: جو تصویر یا کاغذ ضروری سمجھیں وہی اٹھائیں ورنہ وزن کی وجہ سے سب کچھ یہیں چھوڑ کے جانا پڑے گا۔ اس لیے ہم نے پرنٹنگ کے نایاب نمونوں کو بھی نہ اٹھایا سوائے چند ایک کے۔

نمائش میں بے شمار لوگ تھے۔ کہتے ہیں کہ چالیس پچاس ہزار تک لوگ، دُنیا کے ہر حصّے سے آ کر اس نمائش کو دیکھا کرتے ہیں۔ ضرور دیکھتے ہوں گے۔ اس شعبہ میں یہ نمائش کمالات کا درجہ رکھتی ہے۔

واپسی پر کھانے کا کچھ سامان خریدا، گھر آ کر پکایا گیا۔ جسے شوق سے کھایا گیا۔ اب رات کے گیارہ بجے ہیں اشرف اور جاوید مشینوں کی کارکردگی پر بحث کر رہے ہیں۔ اور میں "میں تو مسافر ہوں" کے مصداق سُن رہا ہُوں۔

میں نے محسوس کیا کہ اس شعبہ میں برطانوی مشینوں کی نمائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ جرمنی بازی لے گیا۔ جاپان بازی لے گیا۔ برطانیہ کا سورج گہنا رہا ہے۔ برطانوی افراد کے جو لچھن ہیں وہ انہیں اور پیچھے لے جائیں گے۔ یہ سارا قصور رفاہی مملکت کا ہے۔ کیونکہ یہاں بے کاری کا اتنا زیادہ الاؤنس دیا جاتا ہے کہ لوگ کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ اگر کام کریں تو وہ الاؤنس کے لگ بھگ ہی ہوتا ہے اس لیے کام کیوں کیا جائے۔ جو قوم کام نہ کرے گی وُہ دنیا کی محنتی قوموں کے زمرہ میں نہ آ سکے گی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کو جتنی سہولتیں یہاں حاصل ہیں وُہ دنیا کے کسی ملک کے باشندے کو حاصل نہیں۔ امریکہ برطانیہ سے امیر ملک ہے، مگر وہاں بھی اتنی سہولتیں نہیں۔ باقی ممالک کا خیال ہے کہ زیادہ مراعات سے قوموں کو سُلا دینا مناسب نہیں۔

اِدھر مشینیں، آدمیوں کی ضرورت کو ختم کر رہی ہیں، ادھر انسان کام کرنا نہیں چاہتے۔ ایک وقت وُہ آئے گا کہ کوئی کام نہ کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ فیصد آدمی کام کریں گے، باقی سب سرکاری وظیفہ پر پھلتے پھُولتے رہیں گے۔

۵ ستمبر

صبح کی چائے سامنے آ گئی ہے۔ مگر مجھے اُس بُڑھیا کا خیال آ رہا ہے جو گھر سے ڈبل روٹی لینے نکلی تھی۔ مگر بڑھاپے اور نقاہت کی وجہ اس سے چلا نہیں جاتا تھا اور وہ آٹھ دس قدم چل کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس طرح وُہ کئی دفعہ بیٹھی اور کئی دفعہ چلی۔

اسی طرح اس بُوڑھے کا پائپ سلگانا یاد آ رہا ہے، جو بولٹن میں ہماری رہائش گاہ کے سامنے

سلگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ جلی ہوئی دیا سلائی کپکپاتے ہاتھوں سے پائپ کو سلگا نہیں پا رہی تھی۔ جلتے ہاتھ کیا کرتے! بڑھاپے کا شوق ہو یا جوانی کا، شوق تو شوق ہی ہوتا ہے۔

نمایش میں چالیس پچاس ہزار آدمی آئیں گے۔ وہ بات غلط نہیں۔ ہر طرف بھیڑ ہوتی ہے۔ ہر اسٹال پہ بھیڑ ہوتی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ متعلقین کی رہائش کا ہے۔ تمام ہوٹل بھرے ہوئے ہیں۔ رہنے کو جگہ نہیں۔ ہر آدمی پریشان ہے۔ آخر اتنے آدمی ہوٹلوں میں کیسے سمائیں؟ جس سے ملا وہ یہی کہتا ہے: رہائش کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ لہذا یہاں کوئی جگہ نہ ملنے کی وجہ سے لندن میں ٹھہرنے پر مجبور ہے۔ کوئی مانچسٹر میں، کوئی بولٹن میں۔ غرض سَو دو سو میل کے اندر جو جہاں ٹھہر سکتا تھا، ٹھہرا ہوا ہے تاکہ نمائش میں شرکت کر سکے۔

وہ تو اللہ محمد یونس بھٹی کا بھلا کرے کہ اُنہوں نے ہمیں یہاں برمنگھم ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ بھی تو اتنی کم قیمت پر کہ کوئی یقین نہیں کرتا۔ کوئی یقین کرے نہ کرے ہم تو مزے میں ہیں۔ ریڈیو موجود، ٹیلی ویژن موجود، کچن موجود، جیسے ہم اس گھر کے مالک ہوں۔

نمائش میں ہر اسٹال پہ، استقبالیہ پر اتنی خوبرو لڑکی بٹھا رکھی ہے کہ مشینوں کو دیکھنے سے پہلے اس کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یورپ کی تمام خوب صورت لڑکیاں یہاں پہنچ گئی ہوں۔ آپ اسٹال پہ رکیں گے تو وہ آپ سے پُوچھے گی۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ اس کے بعد آپ اپنا مدعا بیان کریں گے تو وہ اس کی رعایت سے متعلقہ آدمی سے رابطہ پیدا کرا دیں گی۔

کہیں کہیں ایسا بھی دیکھا کہ انتہائی خوب صورت لڑکیاں اپنی مصنوعات کے بارے میں تقاریر کر رہی ہیں وہ لوگوں کو بتا رہی ہیں کہ ہماری مصنوعات کی خُوبی کیا ہے! چونکہ وہ بھلی صورت کی ہوتی ہیں، تقریر کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے، اس لیے اُن اسٹالوں پر ہجوم زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ محترمائیں ایسے لب و لہجہ میں بات کر رہی ہیں کہ وہاں اٹکنا پڑتا ہے۔

کراچی سے ہمارے دوست مجید علی خان آ گئے ہیں جو یہاں کئی موجود فرموں کے ایجنٹ ہیں اس لئے اب ہماری معلومات میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ہماری جیبوں میں رقم ہے تو وہ ہمیں یہاں سے سستی مشینری دلوا سکتے ہیں۔ کیونکہ جو فرمیں مشینیں لے آئی ہیں وہ یہاں بیچ کر جانے میں زیادہ فائدہ سمجھیں گی۔ کیونکہ واپس لے جانے میں خرچہ اور کام بڑھے گا۔ لہذا وہ واپسی خرچ کی رقم کو ذہن میں رکھ کر اُتنی رعایت دے دیں گی۔

۶ ستمبر

آج یہاں عید ہے۔ ہمارے ہاں غالباً، ۷ ستمبر کو ہوگی۔ مگر ہم پاکستان سے دُور بیٹھے ہیں۔ میں یقیناً

واپس پہنچ جاتا۔ حج نصیب میں نہ تھا، جس کی کوشش کی۔ حج کے بعد عمرہ کا ذہن میں ہے۔ اگر جلد ویزا مل گیا تو یہ سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہاں رکا ہوا ہوں۔

ہماری بھتیجی روبینہ نے کہا تھا، عید کے دن یہاں آجانا، اکٹھی عید منائیں گے۔ چونکہ عید گھر میں نہیں منا رہے تو ہم نے اس پیشکش کو بھی قبول نہیں کیا۔ یوں گھر والے زیادہ یاد آئیں گے۔ ہماری پریشانی بڑھے گی۔ اب تو یہ ہے کہ گھر سے دور ہیں تو ہیں۔

مجھے عید کے موقع پر وہ چند افراد یاد آ رہے ہیں جو مجھے سلام کرنے آتے تھے اور میں چپ چاپ انھیں کچھ دے دیتا تھا، کیونکہ وہ اچھے حالوں میں نہ تھے۔ چونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں۔ اس لیے وہ پہنچے اور میں موجود نہ ہوا تو وہ مایوس لوٹیں گے۔ رہ رہ کر مجھے یہی بات پریشان کر رہی ہے۔ گھر ٹیلیفون کر کے یہ سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ مگر ان کی سفید پوشی کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔ شاید ان کی غیرت اس بات کو پسند بھی نہ کرے!

یہاں اس شہر میں پاکستانی اور ہندوستانی بہت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اکا دکا اردو میں بھی سائن بورڈ مل جاتا ہے۔ جلسے اور جلوسوں کے اردو میں چسپاں پوسٹر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ سڑکوں پر بھی اردو بولتے افراد گزرتے ملیں گے۔ بریڈ فورڈ، مانچسٹر اور برمنگھم میں خاصی تعداد میں اردو اور پنجابی بولنے والے ملیں گے۔ مگر ایک دوسرے کو دیکھ کر سلام دعا نہیں کرتے، جیسے گریزاں ہوں!

آج ہم نے نمائش میں لگے وہ تمام اسٹال دیکھ لیے جو کہ یہاں لگائے گئے تھے۔ یعنی تین دن مسلسل گھومتے رہے۔ تب جا کر اس قابل ہوئے کہ نمائش پر طائرانہ نظر ڈال سکیں۔ جہاں کوئی دلچسپی کی چیز نظر آئی وہاں تھوڑی دیر رکے۔ اس کے بعد آگے چل دیے۔ تب یہ حال ہوا۔ جب واپس اپنی رہائش گاہ پہنچے تھے تو تھک کر چور ہو چکے ہوتے۔

آج نمائش میں نوائے وقت کے شعیب نظامی مل گئے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا؛ نمائش کیسی لگی! کہنے لگے؛ جیب میں پیسے ہوں تو نمائش اچھی ہے۔ جاوید نے کہا؛ یہ نمائش ان کے لیے اچھی ہے جو جو کچھ خریدنا چاہیں خرید سکتے ہوں، یا جو کچھ نہ خریدنے کے ارادے سے یہاں آئے ہوں ان کے لیے اچھی ہے۔

ہم نمائش دیکھ کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں بدرالدین بٹ صاحب مل گئے وہ بٹ صاحب جنہوں نے ہمارے لیے یہاں رہائش کا انتظام کیا تھا۔ انہوں نے کہا؛ آئیے گھر چھوڑ آؤں۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ ایک میم صاحب نے اپنی گاڑی ہماری گاڑی میں دے ماری، جس سے بٹ صاحب کی گاڑی کو نقصان پہنچا۔ بٹ صاحب نے چھوٹتے ہی میم صاحبہ سے پوچھا؛ "کیا تم نے پی رکھی ہے؟" نہیں تو۔ تو پھر گاڑی کیوں ماری! کہنے لگیں؛ غلطی تمہاری ہے۔

بٹ صاحب میم صاحبہ سے کہتے تھے کہ گاڑی کی انشورنس کا نمبر دے دو اور جاؤ۔ مگر وہ نمبر دینے پر راضی

نہ تھی۔ آناً فاناً وہاں پہ بہت سے پاکستانی اکٹھا ہو گئے، بٹ صاحب کی وجہ سے یا ایک کالے کی ہمدردی میں تمام میم صاحبہ کے پیچھے پڑ گئے۔ مگر میم صاحبہ بھی کائیاں تھیں۔ سب سے زبان لڑاتی رہیں۔ کافی دیر جھگم جھگا رہی۔ ہم گاڑی سے نکل کر کھڑے ہو گئے۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ ہم جانا چاہتے تھے مگر اخلاق روکے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بٹ صاحب نے ہمیں خود بھی جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی بھی آ گئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بٹ صاحب سے ملیں گے تو پوچھیں گے۔ چونکہ غلطی میم صاحبہ کی تھی اس لیے ضرور بٹ صاحب کے نقصان کا ازالہ کیا جائے گا۔

۷ ستمبر

آج جب میری آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا اس وقت پاکستان میں دس بجے ہوں گے۔ لوگ عید کی نماز پڑھ کے واپس آ گئے ہوں گے قربانی دی جا رہی ہوگی، قصابوں کو ڈھونڈا جا رہا ہوگا۔

عید سے کچھ دن پہلے ہی بچے بڑوں سے طے کرتے رہتے تھے اب کے عید پر ہم اتنے روپے لیں گے، اس سے کم نہ لیں گے۔ بڑے کہتے ہیں، نہیں نہیں، اتنے زیادہ روپے کیا کرو گے، جب ہم چھوٹے تھے تو ہمیں صرف اتنے روپے ملتے تھے۔ بچوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس وقت کم روپوں میں بھی بہت کچھ مل جاتا تھا۔ بہرحال وہ جواب میں کہتے ہمیں نہیں معلوم آپ کو کیا ملتا تھا! ہم تو اتنے روپے ہی لیں گے۔ یہ مکالمے مجھے ہر عید پر سننے پڑتے تھے اور یہ مطالبے بڑے اچھے لگتے تھے۔ آج جب ہم گھر پر نہیں تو بچے بُری طرح یاد آ رہے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے مطالبے یاد آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بچوں کا ہماری عدم موجودگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جا رہا ہوگا۔ مگر ہماری یہ دُوری کی کوتاہی پریشان کیسے ہوئے ہے۔ آج گھر کا ایک ایک فرد یاد آ رہا ہے، گھر کا بھی ایک ایک فرد ہمیں یاد کر رہا ہوگا، حتیٰ کہ ننھا گڈو بھی جو دو سوا دو سال کا ہے، فرح بھی، سعدون بھی، عصمت بھی، فرخندہ بھی اور تابندہ بھی۔ یہ سب میرے پوتے پوتیوں کے نام ہیں۔ بے شک بڑے بھی یاد کرتے ہوں گے!

مجھے آج اپنے وہ دوست بھی یاد آ رہے ہیں جو عید کے موقع پر تشریف لایا کرتے تھے۔ مجھے وہ دوست بھی یاد آ رہے ہیں جن کے ہاں میں عید پر جایا کرتا تھا۔ غرض وہ سارا نقشہ دیکھ رہا ہوں۔ اس طرح میں تو نامحسوس طور پر اپنے گھر میں عید منا رہا ہوں۔ میرے نزدیک فرق یہ پڑا ہے کہ میں جو اپنے دوستوں کو عید کارڈ بھیجا کرتا تھا اب کے وہ نہ بھجوا سکا۔ بہرحال ہم جتنا بھی خیالی دُنیا میں رہنے کے عادی ہوں واقعہ تو اپنی جگہ واقعہ ہوتا ہے۔

یہاں عید کا یہ رہا، کسی نے ۵ ستمبر کو عید منائی، کسی نے ۶ کو اور کسی نے ۷ کو۔ اِدھر ہمارے ہاں سے زیادہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ والا معاملہ ہے۔ ہم نے لوگوں سے پروگرام بنا رکھا تھا کہ عید کی نماز پڑھیں گے۔ جب

صورت یہ دیکھی تو اللہ سے معافی مانگ لی، اور اپنے وطن کو بہت یاد کیا۔

جی چاہ رہا ہے کہ کہیں سے گھر ٹیلیفون کریں۔ مگر جہاں ہم ٹھہرے ہیں یہاں ٹیلیفون تو ہے مگر خراب ہے۔ باہر نکلیں گے تو ایک بار پھر کوشش کریں گے۔ مگر کامیابی مشکل نظر آتی ہے۔ ہم نے کل بولٹن ٹیلیفون کرنا تھا تو نمائش میں لگے ٹیلیفون بوتھ کام نہیں کر رہے تھے۔

یہاں پر ہمارے ہاں کے کالے اتنی تعداد میں ہیں کہ گورے اقلیت معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں بغرضِ تجارت آئی تھی، پھر وہ وہاں پر قابض ہو گئی تھی۔ اُسی طرح کے ارادے پاک و ہند کے لوگوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ ادھر تجارت پر ہمارے ہاں کے لوگ چھائے ہُوئے ہیں۔ بینک بھی گوروں کی بہ نسبت کالوں سے کاروبار زیادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہے کہ گورے تو اس دُنیا میں عیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور ہمارے ہاں کے لوگ صرف کام کرنے کے لیے، گورے چھ چھ ماہ اسٹرائیک کرتے ہیں۔ کالے دن رات کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک کام کے لیے کالے اور گورے کے درمیان قرضے کی ضرورت ہو تو بینک گورے پر کالے کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ بینکوں کو تو اپنے منافع سے دلچسپی ہے۔

ہمارے ہاں بینکوں سے قرضہ لینا ایک دردِ سر ہے۔ مگر یہاں کے بینک زبردستی قرضہ دیتے ہیں۔ سَو سَو ترکیبات سے کام لیں گے تاکہ آپ قرضہ لیں۔ یہاں کا کوئی مسئلہ ایسا نہ ہوگا جو سرمایہ کے بغیر حل ہونے سے رہ جائے۔

ادھر سُن رہے ہیں کہ کانوں میں کام کرنے والے چھ ماہ سے ہڑتال پر ہیں۔ ڈاکٹر ہڑتال کر رہے ہیں، ٹرانسپورٹ اور ریلوے والے بھی ایسا سوچ رہے ہیں۔ رفاہی مملکت ہونے کے ناطے یہ ملک لاکھوں کروڑوں بے روزگار لوگوں کی کفالت کر رہا ہے۔ اِدھر کفالت کا بوجھ، اُدھر کام نہ کرنے کا لپکا۔ نتائج صاف ظاہر ہیں۔

لندن کے بازار، گلی کُوچے اتنے صاف سُتھرے نہیں ہیں کہ رشک ہو۔ ہاں یورپ کے دوسرے ممالک میں ایسا ہے۔ مگر یہاں لاابالی پن زیادہ ہے۔ یہ قوم ناکارہ ہو رہی ہے، کام کرنا نہیں چاہتی اور صرف مطالبے ہی مطالبے کرتی ہے۔ قومی شعور اور قومی مفاد کا احساس دن بہ دن گھٹ رہا ہے۔ اگر انگلستانی اپنے اس رویّہ کو ترک نہ کر سکے تو یہ قوم کچھ عرصہ کے بعد دنیا کے نقشے پر نظر نہ آئے گی۔

ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں کے گلی کُوچے اور بازار صاف سُتھرے نہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ چھوٹے شہروں کا تو یہ حال ہے ہی، لندن کا بھی اس اعتبار سے زیادہ اچھا حال نہیں۔

نمائش میں خوب گہما گہمی ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی مصنوعات کی فلمیں بنائی ہُوئی ہیں۔ مشینیں بھی موجود ہیں۔ ٹیکنیکل امور کی وضاحت کے لیے افراد بھی موجود ہیں۔ فلم کے ذریعہ ٹیلی ویژن پر بھی سب کچھ بتایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹال اور مائیکروفون خوب صورت لڑکیوں نے سنبھالے ہُوئے ہیں۔ وُہ سب کچھ اپنی شیریں زبان میں، دلربا انداز میں جملہ معلومات بہم پہنچا رہی ہیں۔ اور ایسی لڑکیوں کی تعداد خاصی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ

اپنی مصنوعات کے لیے نہیں، مقابلۂ حُسن کے لیے آئی ہوں۔

انگریز زیادہ بااخلاق ہیں یا نہیں، مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ میں نے تو انہیں آدم بیزار ہی پایا۔ مگر یہاں ہر اسٹال پہ ہر طرح کی چیز پینے کا اہتمام ہے۔ اہتمام ہی نہیں اس پہ اصرار بھی کیا جاتا ہے۔ اس نمائش میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگریزوں اور یورپی ممالک سے بڑھ کر کوئی مہمان نواز ہے ہی نہیں۔

۸ ستمبر (ہفتہ)

یہاں چوری چکاری بھی عام ہوتی جا رہی ہے۔ کالے بھی چوریاں کرتے ہیں، گورے بھی۔ کالے زیادہ تر نیگرو ٹائپ کے ہیں۔ وہ تو زبردستی بھی رقم چھین لیتے ہیں۔ گورے وُہ جنہوں نے مغلیہ سلطنت کا تختہ الٹ کر ہندوستان پہ حکومت کی تھی۔ اگر چوری ہو جائے تو پھر یہاں کے چور کو بڑی رعایتیں حاصل ہیں۔ وہ پکڑا نہیں جاتا۔ دُوسرے اگر چوری کرنے کے ارادے سے چور آئے ہوں، ہمسایہ دیکھ بھی رہا ہو تو وہ نہ چور سے کچھ کہے گا اور نہ اس سے، جس کی چوری ہو رہی ہو گی۔ اُسے چور کے متعلق کچھ نہ بتائے گا۔ دیکھ لیجئے گا۔ اس معاملے میں یہ ملک اپنے موجودہ لچھنوں کی موجودگی میں، چوری چکاری میں دُنیا کی امامت کرے گا۔ کام کرنا نہیں، چور کو کچھ کہنا نہیں، پھر بنے گا کیا؟

بچّے مجھے رات کو کہتے ہیں، ابّا جی! ہمیں صبح سات بجے جگا دیجئے گا۔ جب میں جگاتا ہُوں تو اچھا جی اچھا جی کرتے ہیں مگر اُٹھتے نہیں۔ پھر جب دیر ہو جاتی ہے تو جلدی جلدی شیو کرتے ہیں، نہاتے دھوتے ہیں، ناشتا بناتے ہیں۔ افراتفری میں کھاتے پیتے ہیں۔ یہ سب کریں گے مگر وقت پر نہ اُٹھیں گے۔

اصل میں ہمیں نمائش میں جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ جتنی گرہ میں رقم ہے اس کا بھی بھرم کُھل گیا۔ کیونکہ قیمتیں سُن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں۔ مگر یہاں ٹکے ہُوئے ہیں تاکہ میلہ دیکھا جائے۔ شاید نمائش کے آخری دنوں تک ٹھہرا جائے۔ اگر عُمرہ کے ویزے میں اتنی تاخیر نہ ہوتی تو کب کے جا چکے ہوتے!

آج ٹیلی ویژن پہ ایک دیو ہیکل آدمی کو دیکھا، خصوصیت اس کی یہ تھی کہ اس نے دائیں بائیں سے داڑھی کے بال سر کے بالوں سے ملا دئے تھے۔ بیچ میں سے دو انچ کے قریب بال مونڈ دئے تھے۔ یعنی وہ حلیہ الگ سا تھا۔ اس پہ صدر ریگن اور مسز ریگن فریفتہ ہو گئے اور انہیں اپنے ہاں مدعو کیا (کیونکہ اس حلیہ کے ساتھ انہوں نے بچوں کے پروگرام میں قابلِ ذکر کام کیا تھا۔ اسے اور انعام سے نوازا۔

آج ٹیلی ویژن پہ ہی کُتّوں کے ایک پروگرام میں ایک شاعر صاحب کو بھی دیکھا۔ اس شاعر نے کُتّوں سے متعلق ۱۲۶ نظمیں کہہ رکھی ہیں اور وُہ اپنی کتاب چھپوا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب یہ کتاب چھپے گی تو اس کتاب کا زیادہ تعداد میں بکنے والی کتابوں میں شمار ہو گا۔ کاش! ان دنوں ادھر کوئی آدمیوں کو آدمی بنانے والا شاعر بھی ہوتا!

ٹیلی ویژن سے زیادہ تر پروگرام مزاحیہ ہوتے ہیں۔ اناؤنسر بھی منہ بنا بنا کر مضحک انداز اختیار کرتے ہیں اور دیگر کردار بھی۔ اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے ناظرین کو مسرور ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے صرف دو کام رہ گئے ہیں: ہنسنا ہنسانا یا اسٹرائیک کرنا۔ سنجیدہ پروگرام نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

آج جب نمائش سے واپس آئے تو ہمیں گھر پہنچنے سے پہلے ہیرو مل گئے۔ یہاں پہنچتے ہی ہیرو کے بارے میں بہت سی باتیں سُنی تھیں کہ معظم علی کام کا آدمی ہے۔ وہ ہر وقت دُوسرے کی خدمت کے لیے مستعد رہتا ہے۔ ضرورتمند لوگ اسے ڈھونڈتے رہتے ہیں، وہ ضرورتمندوں کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ہر ایک کے کام کر کے خوش ہوتا ہے۔ مگر خود کوئی کام نہیں کرتا۔ مطلب یہ کہ نہ کہیں ملازم ہے اور نہ کہیں دکان ہے۔ مگر وہ یہاں برسوں سے رہتا ہے، شاید ۲۶ سال سے۔

معظم علی جب ہمیں ملے تو کہنے لگے: گھر کا دروازہ مت کھولیے، میرے ساتھ میرے غریب خانے پر چلیے۔ میں آپ کو لینے آیا ہُوں۔ ہم نے کہا: صبح کے نکلے ہُوئے ہیں۔ منہ ہاتھ دھونے کی مہلت دیجئے۔ انہوں نے جواب دیا: میرا گھر بھی آپ کا اپنا گھر ہے وہاں جا کر منہ دھو لیجئے گا! کیونکہ آپ یہاں پانچ دن سے آئے ہُوئے ہیں اور میں آپ سے ملا نہ تھا اس لیے میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہُوں۔ ہم نے جواب دیا: آپ کے ساتھ چلتے ہیں، مگر پہلے یہاں چائے پیتے ہیں۔ کہنے لگے، اگر ہم نے یہاں چائے پی لی تو وہاں جا کر کیا کریں گے؟ کھانے کا انتظام آج نہیں، وہ کل ہوگا، چائے آج ہوگی۔ غرض خلوص سے بھرپور انسان ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ معلوم ہُوا وہ کئی رفاہی اداروں کا ممبر ہے۔ بس اس کا کام ہی یہ ہے کہ خدمت کرا لو!

جب وُہ گھر لے گئے تو وہاں تلی ہُوئی پُھلکیاں پائیں۔ پُھلکیاں لکھنؤ میں پکوڑوں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ جب پہلی بار مجھے لکھنؤ میں خدیجہ بہن نے یہ کہا تھا:

پُھلکیاں کھائیے گا!

تو میں یہ نام سُن کر بڑا خوش ہُوا۔ مگر جب پُھلکیاں پہنچیں تو پکوڑے نکلے تھے۔ وہاں بھی پکوڑے کھا کر لُطف آیا تھا، یہاں بھی۔ کیونکہ دوپہر کھانا کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ خوب بھُوک لگی تھی، لہٰذا کھاتے چلے گئے۔ اتنے پکوڑے کھائے کہ تین چار آدمیوں نے ایک بھرا ہوا ٹرے کھا لیا۔ پکوڑے دو قسم کے تھے، ایک میں دھنیا پودینہ مِلا ہُوا تھا، دُوسرے میں پیاز۔ تھے بے حد لذیذ۔ ہم نے معظم علی سے کہا، ہم تو اتنا کھا رہے ہیں کہ جیسے کئی دنوں کے بھُوکے ہوں۔

انہوں نے جواب دیا:

خُوب کھائیے، ان دو ٹریوں کے علاوہ اور بھی موجود ہیں۔

جھٹ اُنھوں نے اُٹھ کر ایک ٹرے اٹھا کر اور بہت سے پکوڑوں کی نشان دہی کر دی۔ مگر ہم کتنا کھا سکتے تھے، جتنے کھائے وہ بھی بہت تھے۔ مگر معظم علی کا اصرار تھا کہ اور کھانا پڑیں گے۔ ہم نے کہا: آخر اتنے بنائے کیوں! کہنے لگے:

جو کام کرتا ہوں، دل لگا کر کرتا ہوں۔ جو پکایا جاتا ہے زیادہ مقدار میں پکایا جاتا ہے۔ اب میں اپنے انگریز پڑوسیوں کو دوں گا۔ اُن سالوں کو بھی میں نے نمک مرچ پر لگا دیا ہے۔

جب ہم واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچے، کپڑے بدلے، ٹیلی ویژن لگایا، بستر میں گھسے تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اشرف علی نے جا کر دروازہ کھولا اور مجھے اوپر آ کر بتایا کہ محمود ہاشمی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ جاوید نے کہا:

انھیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم یہاں ٹھہرے ہیں؟

ہاشمی صاحب وہی ہیں جنہوں نے "کشمیر اداس ہے" لکھی، اور لندن کے "مشرق" اخبار کے ایڈیٹر و مالک تھے۔ میرے ان سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں بھلے آدمی ہیں، جب میں ۱۹۷۰ء میں لندن آیا تھا تو میں نے وطن واپس جاتے ہوئے کہا تھا:

زندگی میں شاید دوبارہ اِدھر آنے کا موقع نہ ملے۔

اس پر ہاشمی صاحب نے کہا تھا:

ایسا نہ سوچیے۔ جو اِدھر ایک بار آیا وہ دوبارہ بھی آیا، بلکہ بار بار آیا۔

ہاشمی صاحب نے کہا:

یہ میرا دوسرا چکر ہے، پہلے میں چھ بجے آیا تھا مگر آپ موجود نہ تھے۔ یہ میرے دوست ہیں (اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا) یہاں کے، ایچ، خورشید کی پارٹی کے برمنگھم میں صدر ہیں۔ میں اس وقت آپ کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھوں گا، کل ملوں گا۔

میں نے دریافت کیا: آخر آپ کو میرا یہاں کا ایڈریس کس نے بتایا؟ کہنے لگے: آپ کا پروگرام یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر ملے جانا چاہتے تھے مگر میں نے آپ کے ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ پہلے میں نے مانچسٹر ڈاکٹر حیدر کے ہاں آپ کو ڈھونڈا۔ اُنہوں نے بولٹن کا ٹیلیفون نمبر دیا۔ وہاں ٹیلی فون کیا جمیل صاحب نے بتایا کہ "میں انہیں برمنگھم چھوڑ کر آیا تھا، ایڈریس مجھے معلوم نہیں۔ لیڈی پول روڈ پر ڈاک خانے کے سامنے ایک کیفے ہے اُن سے ایڈریس معلوم کیا جا سکتا ہے۔" لہٰذا کھوجیوں کی طرح آپ کے نقشِ پا پر چلتے چلتے یہاں پہنچا ہوں۔

میں نے کہا: آپ تو شرلک ہومز معلوم ہوتے ہیں!

کہنے لگے: معلوم کیا ہوتا ہوں بلکہ ہوں!

ان دنوں ہاشمی صاحب برمنگھم میں ہیں۔ لہٰذا اُنھوں نے کہا: میں کل پھر آؤں گا، آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔ جہاں میں سوتا ہوں وہاں آپ بھی سو جائیے گا!

میں نے جواب دیا: کل آئیے گا تو دیکھا جائے گا۔ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیجیے، میں آپ کی تجویز پر غور کر لوں گا۔

آج رات نیند کم آئی، کیونکہ ہیرو نے پکوڑے زیادہ کھلا دئیے تھے کیونکہ انہوں نے زیادہ پکوائے تھے لہٰذا زیادہ نہ کھلاتے تو کیا کرتے! دوسرے انہوں نے رات کے وقت بہ اصرار ڈھائی کپ چائے کے پلا دئیے تھے۔ میں عموماً جب رات کو چائے پیتا ہوں تو مجھے زیادہ دیر جاگنا پڑتا ہے۔ پھر میں ہوتا ہوں اور مسائلِ تصوف!

۹ ستمبر ۱۹۸۴ء (اتوار)

اس وقت صبح کے چھ بجے ہیں۔ آج میں خوش ہوں کیونکہ معظم علی ہمارے ساتھ نمائش میں جائیں گے تاکہ ہم وقت پر کھانے پر پہنچ سکیں۔ وہ ہمیں کھانا کھلانے کی وجہ سے ہماری سارا دن نگرانی کریں گے۔ ان کے ساتھ ضرور اچھا وقت گزرے گا۔ اِدھر میں نے ہاشمی صاحب سے کہا تھا کہ شام کو آپ کے ساتھ چلوں گا۔ ان کے ساتھ بھی پرانی یاد اللہ ہے اور اچھی یاد اللہ ہے۔ اب پروگرام کیا بنے گا۔ کچھ معلوم نہیں۔ مجھے جاوید نے کہا: ایک طرف ہم ہیرو کے ہاں کھانے پہ جا رہے ہیں۔ دوسرے آدمی نے ہاشمی صاحب سے وعدہ کر لیا۔ یہ دونوں کام ایک وقت میں کیسے ہوں گے!

یہ میری پرانی عادت ہے، پروگرام پہ پروگرام بناتا رہتا ہوں۔ یعنی ہر وقت یہ بھولا رہتا ہوں کہ کوئی پروگرام پہلے بن بھی چکا ہے۔ ایسا ایک بار نہیں ہوا، زندگی بھر ہوا۔ بھولنے کی بات ایک اور بتاؤں؟ ایک بار میری بیوی نے ٹیلی فون کیا اور کہا:

گھر میں مہمان آ کر بیٹھے ہیں اور آپ موجود نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طفیل صاحب نے ہماری کھانے کی دعوت کر رکھی ہے۔

یاد آیا مہمان ٹھیک کہتے ہیں ابھی پہنچتا ہوں، فکر نہ کرو۔

فکر کیسے نہ کروں؛ اتنی جلدی کیا ہوگا؟

میں نے کہا، تم کپڑے پہنو، آج ہم چینی ریستوران میں چلے جائیں گے۔

نمائش سے واپسی پر معظم صاحب نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ ہمارے علاقے کے کونسلر ہیں، بے حد قابل، بے حد پڑھے لکھے اور بے حد شریف انسان ہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نارمل آدمی نہیں لگے۔ اُن کے ہاتھ میں کُتّے کی زنجیر تھی۔ چونکہ ہم دُور تھے، اس لیے میں نے پُوچھا:

یہ صاحب چلتے کیسے ہیں؟

معظم نے بتایا: یہ صاحب نابینا ہیں، کُتّا ان کا گائیڈ ہے۔ یہ کُتّے کی رہنمائی میں اپنی جملہ مساعی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سفر بھی انہوں نے کُتّے کی رہنمائی میں کیا۔ انہوں نے کُتّے سے کہا ہوگا اسٹیشن چلو۔ یہ انھیں اسٹیشن لے آیا۔ اسٹیشن پر اُنہوں نے کُتّے سے کہا ہوگا ٹکٹ لینا ہے۔ اس نے انھیں اُس لائن میں

کھڑا کر دیا ہوگا جہاں ٹکٹ ملتا ہے۔ پلیٹ فارم پر بھی یہی لے گیا ہوگا۔ غرض سارے کام انہوں نے کُتے کی رہنمائی میں انجام دئے ہوں گے۔ تھوڑی بہت بھُول چوک ہم سے بھی ہوتی ہے تھوڑی بہت بھُول چُوک کے ساتھ کُتے نے بھلا جملہ کام انجام دئے ہوں گے۔ اب یہ کُتا کونسل صاحب کو گھر لے کر جا رہا ہے۔

کُتوں سے ہمارے ملک میں یہ کام نہیں لیا جاتا۔ مگر یہاں ایسا عام ہے۔ کُتے متعدد لوگوں کی آنکھوں کا کام دیتے ہیں، ساتھی کا کام دیتے ہیں، انگریزی خُوب سمجھتے ہیں۔ ایسے معذوروں کو قانونی طور پر اجازت حاصل ہے کہ وُہ کُتوں کو ہر جگہ لے جا سکتے ہیں۔

آج شام محمود ہاشمی صاحب سے طے تھا کہ وُہ سات بجے تشریف لائیں گے۔ لہٰذا میں ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ کہیں بیٹھ کے گپ شپ کریں گے، کھانا کھائیں گے، پھر انُھیں کے ہاں سو جاؤں گا۔ مگر اس بات کا علم معظم صاحب کو ہو گیا وہ تلملا ئے' ایسا نہیں ہو سکتا گھر میں کھانا تیار کرایا ہے، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ لہٰذا میں نے معظم صاحب سے کہا، میں ہاشمی صاحب سے کہوں گا کہ وہ آج مجھے حکم عدولی کی اجازت دے دیں۔ معظم نے کہا؛ ہاشمی صاحب ہمارے مہمان ہوں گے، انھیں بھی ساتھ لے آئیے گا۔ لہٰذا تھوڑی سی ردّ و کِد کے بعد ہاشمی صاحب مان گئے۔ تھوڑی دیر اکٹھے رہے، کھانا کھایا۔

آج صبح ٹیلی ویژن پر کمنیٹر اور فٹ بال کے ایک بڑے کھلاڑی کے درمیان مکالمہ ہو رہا تھا۔ خاتون کمنیٹر کھلاڑی سے کہہ رہی تھیں؛

آپ واپس میدان میں آئیں اور حسبِ سابق اپنے جوہر دکھائیں۔

وہ کہہ رہا تھا؛

میرا دل ٹوٹ گیا ہے، اب میں آئندہ نہ کھیلوں گا۔

مگر وُہ کھلاڑی نہ کھیلنے کی کوئی وجہ نہیں بتا رہا تھا۔ وُہ کہتا تھا؛

اپنا غم غلط کرنے کے لیے دن میں وِسکی کے سَو کپ تک پی جاتا ہُوں۔

خاتون کہہ رہی تھیں؛ اس طرح تو تم ضائع ہو جاؤ گے۔ کھلاڑی کہہ رہا تھا؛ میں بھی یہی چاہتا ہُوں، مگر واپس میدان میں نہ جاؤں گا۔

میں نے اس پر تبصرہ کیا، شاید یہ شخص محبّت کی چوٹ کھا گیا۔ اشرف علی نے کہا؛ انکل! یہ ضروری نہیں' ان لوگوں کی مرضی کے خلاف ذرا سی بات بھی ہو جائے تو اسے زندگی کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً

نمائش میں جانا اور اپنی دل پسند مشینری دیکھنے کا جو ہوکا تھا وُہ پُورا ہو چکا ہے۔ صبح دس بجے ہال میں پہنچے میں، تازہ دم ہوتے ہیں۔ شام ۵½ بجے واپس آتے ہیں نڈھال ہوتے ہیں۔ مسلسل ½، گھنٹے چلتے رہتے ہیں، کہیں کہیں رُکتے ہیں۔ پھر دُوسرے اسٹال پہ پہنچ جاتے ہیں۔ یُوں پُورا دن گزر جاتا ہے۔ چل چل کے

میرے پاؤں سُوج جاتے ہیں۔ واپسی پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا گزشتہ ۴ تاریخ سے ہو رہا ہے ۱۲ تاریخ تک ہوگا۔ یہاں ایسی ایسی مشینری دیکھی جو ہمارے ملک میں دس بارہ برس کے بعد بھی پہنچیں تو بڑی بات ہوگی۔ مطلب یہ کہ ان کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہمارے ملک میں ان کی ضرورت ہی نہیں۔ قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے پرنٹرز نے بینکوں ہی میں اتنی رقم دیکھی ہو تو دیکھی ہو (اسٹیٹ بنک میں) غرض حیرانیوں کا سامان بہت ہے (تفصیل)

یہاں لوگوں کو عجیب عجیب شوق ہیں۔ ایک صاحب کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا کہ اس نے ۲۰۰ تصویریں، سابقہ بڑے مصوروں کے نام سے، انہی کے رنگ رُوپ اور انداز میں بنائیں جو ہُوبہو انہی کی معلوم ہُوئیں اور ان کے نام سے معروف بھی ہُوئیں۔ یہ کام وہ گذشتہ ۱۵ سال سے کر رہے ہیں۔ یعنی اپنی صلاحیتوں کو دُوسروں کے نام سے اجاگر کیا۔ کمال یہ دکھایا کہ مختلف اندازوں کو ہُوبہو اپنایا۔ یہ کام کچھ کم آسان نہیں مگر یہ مشکل دُوسروں کے نام سے کرنا اور بھی دِل گُردے کا کام ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو دُوسروں کے کھاتے میں ڈال دینا! اس قسم کے کچھ واقعات اپنے ہاں اس طرح سے سُن رکھے تھے کہ فلاں استاد، اپنے شاگردوں کو غزلیں کہہ کے دیتے ہیں۔ کچھ کا یہ بھی سُنا کہ دیوان کے دیوان بیچ ڈالتے ہیں۔ ایک اسی طرح کا واقعہ میرے علم میں بھی آیا۔ ایک مجموعہ ہمارے ہاں چھپنے آیا مگر وہ مجموعہ تخلص کے بدل کے ساتھ پہلے چھپ چکا تھا۔ مگر دونوں شاعر یہ کہتے تھے، کلام میرا ہے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ فلاں شاعر نے اپنے اشعار دونوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ مجھے معلوم ہُوا کہ لندن میں میرے نام کے کچھ خطوط آئے ہوئے ہیں مگر انھیں حاصل کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ ہو سکتا ہے اُن میں کچھ ضروری باتیں ہوں۔ مگر کیا کروں؟ ہو سکتا ہے ان میں بیگم صاحبہ کا بھی کوئی ہدایت نامہ ہو!

۱۰ ستمبر

دو چار ’جنگ‘ اور ’وطن‘ اخبار کے پرچے دیکھے تھے۔ کیونکہ وُہ اپنے ہاں کے پرچے تھے، جن میں اپنے ہاں کی خبریں ملتی تھیں۔ اب پھر کافی عرصہ سے بے خبر ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ وطن کی خبریں ملتی رہیں۔ یہ مشکل کسی حد تک لندن جا کر حل ہوگی۔ اب کُوچ اِدھر ہی ہوگا۔ کافی ہو چکی۔ ۲۲ جولائی کے نکلے ہُوئے ہیں، کتنے دن ہو گئے! ہاں ۵۱ دن۔ یہ ۵۱ دن ۵۱ سال لگے!

آج نمائش کے ہال نمبر میں ’جنگ‘ کے مالک میر شکیل الرحمان مل گئے۔ آج کل حافظہ اتنا بجھا ہُوا ہے کہ میں انھیں دیکھ کر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی اپنے ہی ہیں کہ اُنھوں نے بڑھ کر کہا،

طفیل صاحب! السلام علیکم! آپ یہاں کب سے ہیں؟ نمائش کے لیے آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا، جی ہاں! دیگر ضروری کاموں میں یہ بھی ایک کام تھا۔ میر صاحب جنگ لندن کے لیے چار رنگ کی مشین خریدنا چاہتے تھے تاکہ لندن سے بھی ٹھاٹھ کا پرچہ نکالا جا سکے۔ ان دوستوں نے اخباری صنعت

میں جو انقلاب برپا کیا ہے وُہ انہی کا حصّہ ہے، انہی کا احسان ہے۔ خاص طور پر میر شکیل الرحمان بڑا اجتہاد پسند اور حوصلہ مند انسان ہے۔

آج پہلا دن ہے کہ سردی نے اپنا آپ دکھایا۔ جب کراچی سے سوئٹزرلینڈ پہنچا تھا تو سوئٹزرلینڈ میں کراچی سے زیادہ گرمی تھی۔ ہم جو کراچی سے احتیاطاً گرم کپڑے اوڑھ کے آئے تھے اُن سے اور زیادہ پسینہ میں شرابور تھے۔ مگر آج جو سردی سے پالا پڑا تو دانت بجنے لگے۔ رات بارش ہُوئی تھی، تیز ہوا چل رہی تھی، اس نے صبح رنگ دکھلایا۔ رات اسی لیے زیادہ سردی محسوس نہ ہُوئی کہ ان لوگوں نے مکانات اس ڈھب سے بنائے ہیں کہ ہوا مکانوں میں جب تک کھڑکی نہ کھولیں داخل ہو ہی نہیں سکتی۔

آج جب صبح گھر سے نکلے تو ہوا نے شرارتیں شروع کر دیں وُہ بدن میں گھُس کر بار بار بدن میں گھُستی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سردی کا ریلا آیا، وہ گزر گیا۔ پھر ریلا آیا، وُہ گزر گیا۔ مگر یہ ریلے اس تواتر سے آتے رہے کہ انہوں نے بھوبچکا بنا کے رکھ دیا۔ میری صحت جواب توانائیاں کھو رہی ہے وہ زیادہ متاثر ہُوئی۔ مگر میں یخ ہواؤں کو اپنی کارگزاری نہ دکھلانے سے کیسے روکتا!

نمائش میں چھپی ہُوئی خوب صُورت تصویریں عام ہیں، اس لیے کہ ہر مشین خوب صورت سینریاں اور خوبصورت تصویریں چھاپ رہی ہے اور وہ ہر ایک کے لیے ہے۔ جو کچھ چھپ رہا ہے اُسے اٹھانے کے لیے لوگ جھپٹ رہے ہیں۔ ہر روز ایسی چیزیں سو دو سو کی تعداد میں سمیٹ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر کوئی بُک بائینڈنگ کی مشین ہے تو وہ سفید کاغذ کی کاپیاں بنا رہی ہے اور لوگ دھڑا دھڑ کاپیاں اٹھا رہے ہیں۔ جتنی چاہیں اٹھا لیں۔ مجھے یہاں بلیک پول میں اپنی ایک کاپی خریدنا یاد آ گیا۔ اگر کوئی کٹنگ مشین موجود ہے تو وُہ گتّے کے بیگ بنا بنا کر دے رہی ہے، انھیں حاصل کرنے کے لیے البتہ ایک لائن لگی ہے۔ جو باری باری ملتے ہیں، کیونکہ اسی وقت بنیں گے اسی وقت ملیں گے۔ اگر کوئی بک بائینڈنگ کے کپڑے کا اسٹال ہے تو وہ ایک کیٹلاگ دے رہا ہے جس میں سیکڑوں نمونے ہیں اور اس ایک کاپی کی لاگت پچاس پونڈ سے کم کیا ہوگی! اسی طرح کاغذ مِل والے اپنے بنائے ہوئے کاغذ کے نمونے دے رہے ہیں جو پندرہ بیس پیڈوں کا کام دیں گے۔ یہ نمونے بھی پچاس ساٹھ پونڈ کی لاگت تک کے ہوں گے۔ پھر ہر اسٹال پر چائے، کافی، جوس، شراب اور بسکٹ عام ہیں جو ہر ایک کو پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے کچھ دن تو جب کسی نے چائے کافی کے لیے پُوچھا۔ ہم نے تو تھینک یُو کہہ دیا مگر بعد میں معروفیت زیادہ ہونے کی وجہ سے، اور یہ سب کچھ عام ہو جانے کی وجہ سے، ہم اپنا حصہ لیتے رہے۔ مطلب یہ کہ صبح ناشتا کر کے نکلیں تو دوپہر کے کھانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، حتی کہ جن فرموں سے ہمارا رابطہ رہا تھا، سلام دُعا تھی، ملنا جُلنا تھا، اُنہوں نے تو باقاعدہ سو سو پونڈ تک خرچ کر کے ہماری دعوتیں کیں۔ مطلب یہ کہ نمائش کے دوران برمنگھم میں کھانے کا خرچ برائے نام رہا۔ حتی کہ ایک اسٹال پہ ہر روز آئس کریم ملتی تھی، ایک صاحبہ اس کام پر مامور تھیں پہلے

دو تین دن تو اُسے بھی نو تھینک یُو کہہ دیا۔ مگر بعد میں روزانہ کھاتے رہے اس لیے کہ وُہ آئس کریم بڑی "اُونچی نسل" کی تھی۔

یہاں کی عورتیں خوش مزاج ہیں۔ وہ باتیں کرتی ہیں، کُھل کر باتیں کرتی ہیں۔ ہنستی ہیں تو کُھل کر ہنستی ہیں۔ بار بار مسکرانا تو ان کی عادتِ ثانیہ ہے۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں تو سب ایسی ہیں۔ البتہ نوجوان لڑکیوں کا مسکرانا ہنسنا بہ وقتِ ضرورت ہوتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں ٹرین میں یا ہوائی جہاز میں بیٹھیں گی تو وُہ کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دیں گی۔ جو کتاب نہیں پڑھیں گی وہ آدمیوں کو پڑھتی رہتی ہیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ ان کے بوائے فرینڈ ہوتے ہیں۔ یا پھر عورتیں نٹنگ شروع کر دیں گی۔ چونکہ آج کل سردی کی آمد آمد ہے اس لیے زبان کے ساتھ ہاتھ بھی چل رہے ہیں۔

یہاں ٹیلیفون سروس اچھی ہے۔ جگہ جگہ ٹیلی فون لگے ہیں۔ مطلوبہ سکے ڈالیے اور کہیں بھی ٹیلیفون کر لیجئے۔ دُنیا کے ہر حصہ سے براہِ راست رابطہ موجود ہے۔ البتہ بعض ٹیلی فون خراب ہوتے ہیں۔ وہ سکے ہضم کر جاتے ہیں اور ٹیلیفون نہیں ہوتا۔ لاکھوں روپے سالانہ ٹیلیفون کھا جاتے ہوں گے۔

آج رات ہمیں ملز کے سیلز منیجر مسٹر گریگے نے ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ کھانا مزے کا تھا۔ ہر چیز تو ہم کھا نہ سکتے تھے جو چیز کھانے کی تھی وہی کھا رہے تھے، جو چیز پینے کی تھی وہی پی رہے تھے۔ اور ہوٹلوں میں ہم جیسا احتیاط پسند خاصا پریشان ہوتا ہے۔ خیر کھانا تو مزے کا تھا مگر جب بِل آیا تو ہم نے دیکھا کہ پلیٹ بھر پونڈوں سے اس کی ادائیگی کی۔ کیونکہ وُہ پونڈ پہ پونڈ ڈالتے چلے جا رہے تھے اور ہوٹل کا بِل پُورا نہ ہو رہا تھا۔

ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ہیڈ بیرا نے تمام حاضرین کو رنگ برنگے کاغذوں کی بنی ہُوئی ٹوپیاں پہنانا شروع کر دیں، عورتوں کو تاج نما ٹوپیاں، مردوں کو پھندنے والی گول ٹوپیاں۔ غرض ہم سب ٹوپیاں پہنے کھانا کھاتے رہے۔ ایسا لاہور میں کرسمس کی راتوں کو بڑے ہوٹلوں میں ہوتا دیکھا تھا۔ اس ہوٹل میں تو روز کا دستور معلوم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ ہمارا ٹھکانا متذکرہ ہوٹل سے تھوڑی دُور تھا، واکنگ ڈسٹنٹ پر۔ مگر ٹھنڈی ہوا ایسی منہ زور تھی کہ ہمیں ٹیکسی منگوانی پڑی۔ ورنہ کھانے کا مزا کرکرا ہو جاتا۔ ہو سکتا تھا کہ قلفی جم جاتی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۸۴ء

بڑی مدت کے بعد آج ٹیلی ویژن پر لوریل اینڈ ہارڈی کی فلم دیکھی۔ یہ دنیا کے مانے ہُوئے مزاحیہ کردار ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات دیکھ کر ہنستے رہے۔ اتنا ہنسے کہ ایک گھنٹہ دیر ہو گئی۔ لہٰذا انہیں کیمرے پر ہنساتے چھوڑ کر نمائش کی طرف بھاگے۔ کیونکہ وہاں کئی دوستوں کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا۔ دیکھ لیجئے بڑا آرٹسٹ دنیا و مافیہا سے بے خبر کر ہی دیتا ہے۔

محمود ہاشمی صاحب، یہاں ۲۲ برس سے موجود ہیں۔ اپنے وطن کو بھولے ہُوئے ہیں۔ کہتے ہیں وہاں جانے

کے لیے دل بے قرار رہتا ہے۔ مگر جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر دل بیقرار ہو جاتا ہے کہ واپس چلیں۔ دل کی اس بیقراری نے وہاں کا چھوڑا نہ یہاں کا!

ہاشمی صاحب کی بیگم فرنگی کی بیٹی ہیں۔ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ یونیورسٹی میں پہنچ چکے ہیں۔ مگر یہ گھر کم پہنچتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ مگر بیگم کو ایک لاکھ پونڈ کا مکان خرید کے دیا ہوا ہے۔ ان سب کا بہت خیال رکھتے ہیں، مگر وہ سب ان کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔

ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ ہمارے ملک سے جو لوگ ادھر آئے تھے اُن کے بچے اب اردو نہیں جانتے۔ انگریزی ان کا روزمرہ بن چکا ہے۔ ہم نے شور مچا کر "مدر ٹنگ" کے طور پر اردو کو منوایا ہوا ہے۔ مگر ہمارے گھروں میں بچوں کے ساتھ چونکہ اردو نہیں بولی جاتی، اس لیے وُہ اردو کو ایک مقدس زبان تو سمجھتے ہیں مگر اپنی زبان نہیں سمجھتے۔

ہاشمی صاحب بڑی باغ و بہار قسم کی گفتگو کرتے ہیں۔ جاوید نے کہا: میں آپ کی تصویر لینا چاہتا ہُوں۔ تو انہوں نے کہا: ایسا نہ کیجئے، کیونکہ پچھلے دنوں میری ایک تصویر لی گئی تھی اُسے دیکھ کر میرے ایک دوست نے کہا: یہ تو کسی بُوڑھی میم کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

ہاشمی صاحب کو اُردو کی بڑی فکر ہے۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر جو پہلی ملازمت کی تھی وہ اسکول ماسٹری کی تھی پہلا کالا آدمی پڑھانے پر مامور ہُوا تھا۔ بقول ان کے اس نوکری پر گوروں نے کہا: ہم آپ کو اسکول ماسٹر بنا کر بڑا رسک لے رہے ہیں۔ یہ بھی کہا: اگر آپ معقول آدمی ثابت نہ ہُوئے تو آئندہ کسی کالے کو اسکول ماسٹر نہیں بنایا جائے گا۔

لیڈی پول روڈ پر ایک پرائمری اسکول ہے۔ ہم نے ان تمام بچّوں کو گراؤنڈ میں دیکھا۔ وہاں تو اسّی فیصد لڑکے ہمارے ہاں کے تھے۔ گورے ۲۰ فیصد سے بھی کم ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گورے پریشان ہیں۔ وہ تنگ کرنے لگ گئے ہیں۔ مگر جمیکا اور یوگنڈا کے کالوں کو یہ کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ وہ گوروں کی ٹھکائی کر دیتے ہیں۔ وہاں 'اخبارِ وطن' کے اسلم لون صاحب بھی بیٹھے تھے، وُہ کہتے تھے ہمیں منظم ہونے کی ضرورت ہے۔ ہم میں کچھ لوگ بطور والنٹیئر سامنے آئیں۔ جہاں اس قسم کا واقع ہو وہاں ہم ہاکیاں لے کر پہنچ جائیں۔ دو چار جگہ ان کی ٹھکائی ہوگی تو یہ پھر اپنی حرکتوں سے باز آئیں گے۔ پھر لون صاحب نے بتایا کہ ایک ہفتہ ہُوا اخبار میں چھپا تھا کہ لندن کے ایک گھر میں چار جوان لڑکیاں اور ایک ان کی بیوہ ماں رہتی ہے اُن کا گوروں نے بُرا حشر کر رکھا ہے، ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ آج اس واقعہ کو کافی دن گزر چکے ہیں مگر کسی اخبار میں بہ طور ردعمل کچھ نہیں ہُوا۔ کسی نے اس خبر کا نوٹس نہ لیا۔ اگر یہی بے حسی رہی تو ہمارا باہر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

ہاشمی صاحب بھولے آدمی تو نہیں ہیں۔ مگر نتیجہ وہی نکلتا رہا جو بھولے آدمیوں کے مقدر میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بڑا چالاک آدمی ہوں، مگر میری چالاکی سے مجھے ہمیشہ نقصان ہی پہنچا۔

ہاشمی صاحب نے آج ہماری کھانے کی دعوت کی ہُوئی تھی ۔ جب گپ شپ میں کافی دیر ہوگئی تو کہنے لگے، آج کل جلدی گھر پہنچ جانا چاہیے ۔ گورے کالوں کو تنگ کرتے ہیں، مارتے پیٹتے ہیں ۔ بے حال کر کے پھینک جاتے ہیں ۔ یہ اشارہ کافی تھا ۔ ہم نے کہا، آپ کی اس گفتگو کے بعد ہمیں چلنا چاہیے ۔ کیونکہ سیانے کہتے ہیں ؛ عقلمندوں کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے ۔

ہمیں دعوت پر ہاشمی صاحب کے ہاں لے جانے اور چھوڑنے کے لیے غلام نبی رجال صاحب آتے ۔ انھیں بھی میرپور سے نکلے ۳۰ سال سے اُوپر ہو چکے ہیں ۔ یہ بھی خاصے دلچسپ آدمی ہیں ۔ کہتے ہیں پیٹ کی ضرورت اور پاکستان کی محبت نے مار رکھا ہے ۔

ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ جب تک اُردو کی کتابیں انگریزی کتابوں کی طرح خوب صورت نہ ہوں گی بچے ان میں دل چسپی نہ لیں گے ۔ دوسرے بچوں کو کتابیں اُن کے ماحول کے مطابق ترتیب دے کر چھپوانا ہوں گی ۔ ورنہ بچے الٹا سیدھا سوچیں گے ۔ مثلاً پاکستان کی ایک ٹیکسٹ بک میں ہے کہ ہمارے رسولؐ اپنے کسی کام میں عار نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ اپنا جُوتا تک خود گانٹھ لیتے تھے ۔ یہ ایک لڑکے نے پڑھا ہوا تھا ۔ اس کے پیچھے جو فلسفہ ہے اس پر اس نے توجہ نہ دی تھی ۔ نہ استاد نے بتایا تھا ۔ میں نے ایک لڑکے سے پُوچھا ؛

"رسول اللہؐ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟"

ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا، میں نے اس سے پُوچھا تو اس نے بتایا ؛

HE WAS VERY POOR MAN. ، ہی واز ویری پُور مین ۔

(یعنی وہ بہت غریب آدمی تھا ۔)

اسی طرح چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معاملہ ہے ۔ یہاں کا بچہ تو اسے نہ مانے گا جب تک اسے اس کے پس منظر اور رسول اللہؐ کی اہمیت اور خدا سے ان کے تعلق کے بارے میں کچھ نہ بتائیں گے ! ہاشمی صاحب کا خیال تھا کہ یہاں کے ماحول کے مطابق کتابیں جب تک نہ چھپیں گی اردو کے سلسلے میں بات نہ بنے گی ۔

یہ ملک عجیب ہے ۔ طرح طرح کے ڈانس ہوتے ہیں ۔ رات ہم نے مُردوں کا ڈانس دیکھا ۔ صُورت یہ تھی کہ نہایت کریہہ المنظر افراد ناچ رہے تھے ۔ پھٹے پرانے کپڑے تھے ۔ انھیں دیکھ کر خوف آتا تھا ۔ مگر لوگ تھے کہ تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے ۔ آخری سین یہ تھا کہ اُن میں سے ایک آدمی تابوت میں بیٹھ گیا باقی چار افراد اس تابوت کو اٹھا کر لے گئے ۔ اس کے بعد پھر تالیوں کی گونج !

ہاشمی صاحب نے اپنے ہاں نقوش کے پرچے سجا رکھے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے پُوچھتے ہیں ؛ یہ کیا الماریاں بھر رکھی ہیں ؟ میں انہیں کہتا ہُوں ، اس میں علم بھرا ہوا ہے ۔ ہاشمی صاحب نے بتایا کہ یہاں اچھے خاصے شاعر ہیں ۔ البتہ نثر نگار تھوڑے ہیں ۔ ایک دن ہمارے دوست فضل دین صاحب تین چار شاعروں کو پکڑ لائے ۔ اُن میں

ایک شاعر نے اپنا بڑا اچھا کلام سنایا۔ جب وہ شعرا چلے گئے تو میں نے فضل دین صاحب سے کہا: فلاں شاعر نے تو اچھے شعر پڑھے۔ وہ چپکے سے اُٹھے۔ اندر جا کر نقوش کا غزل نمبر اُٹھا لائے۔ رسالے کو کھولا، اور وہ غزل جو شاعر صاحب سُنا گئے تھے رسالے میں کسی اور کے نام سے چھپی ہوئی دکھائی بلکہ وہ کسی بڑے استاد شاعر کی غزل تھی۔ مجھے استاد شاعر کا نام بھی معلوم ہے۔ جن صاحب نے پڑھی تھی اس کا نام بھی یاد ہے، مگر میں فسادِ خلق کی خاطر کسی کا نام نہ بتاؤں گا۔

ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ میرے پاس اردو کی کچھ ایسی کتابیں ہیں جو میں دوستوں کو دینا چاہتا ہوں، مگر کوئی لیتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں، ہمارے پاس رکھنے کے لیے جگہ نہیں، پڑھنے کے لیے وقت نہیں۔ البتہ رالف رسل صاحب کہتے ہیں کہ میں نقوش کے پرچے فلاں سوسائٹی کو دے دوں! میں سوچتا ہوں جب میں ان کی حفاظت نہ کر سکوں گا تو ایسا کر دوں گا۔

آج نمائش کا آخری دن ہے۔ رات اشرف صاحب نے سوتے ہوئے کہا تھا کل! صبح جلد اُٹھا دیجیے گا۔ جب میں انھیں اٹھاتا ہوں تو وقت پر اُٹھتے نہیں۔

۱۲ ستمبر

ہم نے حسبِ سابق گھر سے نکل کر بس کی ٹکٹ لی اور سوار ہو کر سٹی اسٹیشن پہنچے۔ وہاں سے گاڑی کا برمنگھم انٹرنیشنل کا ٹکٹ لیا۔ ان سارے راستوں پر میں نے اس طور نظر ڈالی کہ جانے کب ادھر کا پھیرا ہو۔ نمائش میں پہنچے تو پہلے دن سے آج نمائش کو دیکھنے کا انداز ہی اور تھا۔ وہ سب مشینیں کہہ رہی تھیں: آج اس نمائش کا آخری پھیرا ہے؛

مینڈر کڈ کی فرم، جو سیاہیوں کی بین الاقوامی فرم ہے، کے منیجر نے ہماری دعوت کی تھی۔ ہم دعوتوں سے گھبراتے ہیں اس لیے ہوٹلوں میں اپنی مرضی کا کھانا تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں ٹھیک ٹھاک کھانا مل گیا۔ بلکہ بے لطفی کی بجائے مزا آیا۔ ہم یہاں زیادہ تر زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھاتے رہے۔ ورنہ مزا آتا ہی نہ تھا۔ پھیکے کھانے، نہ جانے کس کس کا گوشت۔ اس میں سے موزوں کھانے کی تلاش ایک اچھا خاصا معمہ ہوتا تھا۔

نمائش میں ہم اِدھر سے اُدھر کوئی آٹھ دس میل روزانہ چلتے ہوں گے۔ چل چل کے چُور ہو جاتے تھے۔ پیدل چلنا میرے لیے فائدہ مند بھی تھا۔ جب سے موٹر کار خریدی ہے صحت تباہ ہو گئی۔ اب سوچتا ہوں کہ صحت کی خاطر یا تو موٹر کار بیچ دوں یا زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کا پروگرام بناؤں۔ اِن شاء اللہ اب کے گھر پہنچے تو یہ اہتمام کروں گا۔ جب سے ہم لوگوں نے رہنے سہنے کے مصنوعی طریقے اختیار کیے، سب کچھ تباہ ہو گیا، صحت، اخلاق اور ایمان!

آج نمائش میں تمام مصنوعات کے مالک، نمائش بینوں کو بہت کچھ تھما رہے تھے۔ یہ چیز لے جاؤ، وہ چیز لے جاؤ۔ سوائے مشینوں کے اُن کی لائی ہُوئی کئی چیزیں مل رہی تھیں۔ ہاتھ کی جاپانی خوشنما پنکھیاں، فونٹین پن، ہینڈ بیگ، کاپیاں، ماچسیں، چھپی ہُوئی بے شمار تصویریں، غرض پبلسٹی کی خاطر لائی ہُوئی تمام چیزیں دی جا رہی تھیں۔ مگر ہم لوگ وُہ سارا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ کہاں رکھیں گے؟ کیسے لے جائیں گے؟ ہم اپنے بچوں کی خاطر، محض اٹھانے ہی کی خاطر، زیادہ وزن ہوجانے کی خاطر کچھ نہیں خرید رہے تھے۔ ان چیزوں کو کیسے اٹھاتے!

آج نمائش میں اپنے تمام جان پہچان کے لوگوں کو بائی بائی کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ وُہ سب کچھ پھر دوبارہ ملنے کی آرزو کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا ہو رہے تھے۔ کیونکہ پرنٹنگ مشینوں کی نمائش ہر دو سال بعد لگتی ہے۔ دو سال کے بعد برمنگھم (برطانیہ) میں۔ دو سال کے بعد ڈسل ڈورف (جرمنی) میں۔ ان چیزوں سے دلچسپی رکھنے والے ساری دنیا سے اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنے کاموں کو نئے نہج پر استوار کرنے کے لیے سوچتے ہیں۔

ہم نے برمنگھم پہنچ کر، ایک ہندوستانی کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ وہ ہوٹل نہ تھا بلکہ گھر تھا۔ پُورا گھر ہمارے پاس تھا جس میں چار کمرے، علاوہ دیگر ضروریات کے تھے۔ جب ہم نے یہ جگہ کرایہ پر لی تو ہمیں تاثر کم کرایہ کا دیا گیا۔ ہم خوش ہُوئے۔ جب ادائیگی کا وقت آیا تو انہوں نے خاصی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا۔ بالآخر ہم نے بدر صاحب کو بلایا جنہوں نے وہ جگہ کرائے پر لے کر دی تھی۔ انہوں نے رقم کم کرائی۔ پھر بھی وُہ ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ وہ جو اسلام میں ہے کہ ”لین دین کے وقت لکھ لیا کرو“۔ یہ بات بڑی حکمت رکھتی ہے۔ گول مول بات ہونے سے معاملہ گول مول ہوجاتا ہے۔

یہاں جو ہمیں معظم صاحب ملے تھے وہ ہمیں الوداع کہنے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ وُہ باتیں اس انداز سے کرتے ہیں کہ معلوم ہو کہ مخاطب بڑا اہم آدمی ہے۔ ایک بات بلکہ ایک خُوبی اُن میں تھی کہ وُہ دوسرے کے کام آنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ صفت عنقا ہوتی جا رہی ہے جو ان میں موجود ہے!

یہ ملک ہڑتالوں میں سب سے بازی لے جا رہا ہے۔ ابھی مائینرز کی ہڑتال ختم نہ ہُوئی تھی کہ ڈاکٹروں نے ہڑتال کر دی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہُوئی۔ ہم نے برمنگھم سے بولٹن پہنچنا تھا۔ معلوم ہُوا کہ مانچسٹر میں ریلوے کے عملے نے ہڑتال کر دی ہے۔ بولٹن اور مانچسٹر ساتھ ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم بذریعہ ریل برمنگھم سے بولٹن نہیں پہنچ سکتے تھے لہذا ہم نے اپنی بھتیجی کو بولٹن ٹیلیفون کیا۔ ہم نمائش سے فارغ ہو گئے ہیں۔ مگر ریل کی ہڑتال ہے۔ لہذا کیا کیا جائے!

اس نے کہا: یہ کوئی مسئلہ نہیں، ہم آکر آپ کو لے جاتے ہیں۔

ہم نے پُوچھا: کس وقت پہنچو گے؟

بتایا گیا: ہم چار بجے یہاں سے چلیں گے۔

چنانچہ ہم نے جان لیا کہ وہ چھ بجے تک پہنچ جائیں گے مگر جب ۶½، بجے تک بھی نہ پہنچے۔ تو دوبارہ بولٹن ٹیلیفون کیا معلوم ہُوا کہ وہ چھ بجے سے پہلے یہاں سے نکل نہ سکے تھے۔ لہذا آٹھ بجے کے قریب پہنچ گئے۔ ہم نے سوٹ کیس اُٹھائے اور دس بجے

کے قریب بولٹن دوبارہ پہنچ گئے۔

تھکے ہُوئے تھے۔ لہٰذا کھانا کھایا اور سیدھے بستر پہ، نیند بھی جلد آگئی اور انشاً غفیل ہو گئے۔

۱۳ ستمبر (جمعرات)

آنکھ کُھلی تو اُس وقت ہمارے ملک کی طرح، مُرغا اذان دے رہا تھا۔ یہ مطابقت اپنے ملک کی طرح پائی، تو برطانوی مُرغا بھی اچھا لگا۔ اگر وُہ قریب ہوتا اور مَیں اُسے پکڑ سکتا تو اُسے ضرور پیار کرتا!

گھر ٹیلیفون کیے پندرہ روز سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس لیے گھر ٹیلیفون کیا۔ سب کی خیر خیریت معلوم کی اور یہ بتایا کہ اب واپسی کا ارادہ ہے۔ رُکنے اور اٹکنے والے سارے کام ختم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ اس بات کو نوید سمجھ کر خوش ہو گئے۔

آج یہاں اُردو کے اخبارات دیکھے کیونکہ ہماری بھتیجی روبینہ منگواتی ہے۔ اس دوران کے وہ اخبار جمع کرتی رہی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میں اپنے ہاں کی خبریں دیکھنا چاہتا ہُوں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نوابزادہ نصراللہ خاں ایم آر ڈی کے تحت، حکومت کے خلاف محاذ بنانا چاہتے ہیں۔ محاذ آرائی ان کا شیوہ ہے کہ نہیں۔ محاذ تو انہوں نے بنا دیا۔ پروفیسر عبدالغفور نے مشورہ دیا کہ بغیر جماعتی انتخاب میں نامور شخصیتیں حصّہ نہ لیں۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، شاید انہیں احساس ہو کہ نامور شخصیتیں تو بدنام ہو چکی ہیں۔ ممکن ہے اس کے علاوہ ان کا کوئی احساس ہو۔ بے نظیر بھٹو گلاسگو میں تقریر کرنے والی ہیں۔ کاش! گلاسگو اپنے کسی ملک کے کسی شہر کا نام ہوتا۔ جو بات اپنے ملک میں کہنے کا مزا ہے وہ کسی دوسرے ملک میں کہنے کا نہیں۔ ایک اخبار میں سابق گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر کا بیان پڑھا کہ پیپلز پارٹی سے غلطیاں سرزد ہُوئی ہیں۔ اگر بروقت غلطی کا احساس ہو جاتے تو بات سُلجھ جاتی ہے۔ بعد از وقت تو شہنشاہِ ایران کو بھی پُوری دنیا میں جائے پناہ ڈھونڈنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ بھی پڑھا کہ ہندوستان، الیکشن کے بعد ہی پاکستان سے کسی قسم کی بات چیت کرے گا۔ مطلب یہ کہ دو پیار کے بولوں کا بھی یہ وقت نہیں۔ یہ بھی لکھا پایا کہ ہندوستان پاکستان کے ایٹمی مراکز پر حملہ کر دے گا۔ یہ بات کسی بھی ہندوستان کے نیتا کی سمجھ میں نہ آئے گی کہ مضبوط پاکستان خود ہندوستان کے مفاد میں ہے۔ یہ بھی پڑھا کہ ہمارے بعد پاکستان میں نظامِ صلوٰۃ رائج ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے وہاں سے نکلنے سے پہلے قائم ہو چکا ہوتا تو ہم دو چار نمازیں زیادہ پڑھنے کی سعادت حاصل کر چکے ہوتے۔ یہ بھی پڑھا کہ مارشل حکام نے انتخابات کا پروگرام تیار کر لیا ہے۔ یہ سب سیاست کے اپنے اپنے ڈھب ہیں۔

آج پھر بلیک پول جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ میں نے کہا بھی: مَیں دو بار وہاں جا چکا ہُوں۔ مجھے بتایا گیا ایک جگہ سمندر کے اندر مختلف تہذیبوں کو دکھایا گیا ہے۔ یہ چیز میری دیکھی ہُوئی نہ تھی، اس لیے میں ایک بار پھر جانے پر راضی ہو گیا۔ ویسے یہ جگہ اپنی سندرتا اور یکتائی کی وجہ سے یورپ میں معروف ہے۔ اس لیے انکار کرنا

مذاقِ سلیم کے خلاف ہوتا۔

میری بھتیجی نے کہا، آپ بور ہو رہے ہیں، میں جا کر آپ کے دیکھنے کے لیے کوئی فلم لاتی ہوں۔ میں نے کہا: اس کی ضرورت نہیں۔ مگر جب وُہ گئی تو نہ جانے وہ دکان کیوں بند تھی۔ اسی لیے میری بوریت دُور کرنے کے لیے بلیک پُول کا پروگرام بن رہا ہے۔ یہاں کے لوگ سو دو سو میل اِدھر اُدھر ہونے کو کوئی مسئلہ نہیں گردانتے۔ بلیک پُول جانے سے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بات یہاں کی اور پاکستان کی پولیس کی ہونے لگی۔ یہاں کی پولیس کو یہاں والے فرشتۂ رحمت کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہاں کی پولیس کے بارے میں تاثر بالکل اُلٹ ہے۔ یہاں جن لوگوں کو سزا ہوتی ہے وُہ جیل میں کام کرتے ہیں تو اُن کو مزدوری بھی ملتی ہے۔ جب وُہ سزا کاٹ کر باہر نکلتے ہیں تو ان کے پاس اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ جو سنگین ٹائپ کے مجرم ہوتے ہیں اُن سے کوئی رعایت نہیں ہوتی۔ ورنہ عام مجرموں کو اچھے انداز میں رکھا جاتا ہے۔ سونے کے لیے الگ کمرے اور اچھے بستر، ریڈیو، اخبار اور ٹیلی ویژن تمام سہولتیں مہیا!

سات بجے کے قریب نکلے۔ اُس وقت بولٹن میں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مگر چل پڑے یہ سوچ کر کہ ضروری نہیں کہ بلیک پُول میں بھی بارش ہو رہی ہو، کیونکہ ایسا ہی ہوتا ہے کہیں بارش کہیں سُوکھا۔ جیسے جیسے بلیک پُول کی طرف بڑھتے رہے بارش تیز ہوتی جا رہی تھی، اتنی تیز کہ موٹر چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ جیسے تیسے وہاں پہنچے بارش ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہی۔ بلیک پُول کی رونق بھی مدھم تھی۔ روشنیاں تو ہو رہی تھیں مگر بارش کی وجہ سے روشنیاں دیکھنے والے کم تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں بارش کافی دیر پہلے سے ہو رہی ہو۔ ورنہ آناً فاناً ایسا سماں بلیک پُول میں ہونا ناممکن ہوتا۔ مقامی سارے لوگ اپنے گھروں میں گھُس چکے ہوں گے۔ جو تھوڑی بہت رونق تھی وہ ہم جیسوں سے ہو گی۔ جو اِدھر اُدھر گھُومنے پر مجبور تھے۔ لہٰذا ہم بھی بلیک پُول کا ایک چکّر لگا کر لوٹ آئے۔ روشنیوں کے دوران، انسانوں سے بھرا ہوا شہر آج قدرے اُداس تھا۔ واپسی پر بھی اُسی طوفانی بارش سے واسطہ پڑا۔

۱۴ ستمبر ۱۹۸۴ء (جمعہ)

رات یہ طے ہو رہا تھا کہ نوجوان صبح خریداری کے لیے نکلیں گے۔ بچّوں کے لیے ننھے منّے تحائف کے لیے۔ کیونکہ وُہ دو چار روپے کے کھلونے سے بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ بڑوں کے لیے کچھ خریدنے کا ارادہ نہ تھا کیونکہ وہ ہر تحفہ کو اس کی مالیت سے اہمیت دیتے ہیں۔ مسافروں کے پاس اتنی وافر رقم کہاں کہ وُہ بڑوں کے شایانِ شان تحفہ خرید سکیں۔ یہاں تو معاملہ یہ ہوتا ہے کہ گرہ میں واپس گھر پہنچنے تک کے اخراجات ہیں کہ نہیں!

پروگرام کے مطابق آج میں دیر تک سویا رہا۔ جب سے گھر سے نکلا تھا اتنی فیاضی کے ساتھ میں کبھی سویا نہ تھا۔ ہمیشہ ۶ بجے کے قریب اٹھتا رہا۔ آج جب بیدار ہوا تو ۱۲½ بج رہے تھے۔ صبح کا ناشتا ۱۲½ بجے کیا۔ ایسا انگلستان میں ہی ہوتا ہے۔

۱½ بجے کے قریب گھر والے بچوں کو بہلانے کے لیے، کچھ خریدنے کو نکلے ہیں۔ میں نے آج کا اخبار اٹھایا اس میں ایک یہ خبر چھپی تھی ؛

" بنگلہ دیش میں محاسبہ گروہ نے ۵ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھ کاٹ دیے۔ پولیس اور عدالتوں سے انصاف نہ ملنے پر ہم نے یہ کارروائی کی ہے۔ گروہ کا اعلان —— محاسبہ گروہ نے ۵ دیہاتیوں کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ اس کے سرغنہ ابھی تک روپوش ہیں۔ پولیس نے چھاپہ مار کر اُس گروہ کے تین افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر گروہ کے سرغنہ معین الحق جو شیرِ خدا کے نام سے مشہور ہیں، فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے سکول ٹیچر بیان کئے جاتے ہیں۔ جن افراد کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں وُہ چوری سے لے کر قتل تک کے جرائم میں ملوث تھے ان ۵ افراد کے ہاتھ کاٹ دیے گئے اور پھر ان کے کٹے ہُوئے ہاتھوں کو درختوں کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ ان کے ساتھ یہ انتباہ بھی لکھا گیا کہ تمام جرائم پیشہ افراد کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ ان افراد کو ان کے گھروں سے زبردستی نکال کر ان کے ہاتھ کاٹے گئے تھے۔ گروہ کے دوسرے کمانڈر جسیم الدین نے کہا کہ انہوں نے یہ کارروائی اس لیے کی ہے کہ لوگوں کو پولیس یا عدالتوں سے کبھی انصاف نہیں ملا۔"

مجھے اس خبر نے متاثر کیا۔ یہ جو کچھ ہُوا اسے اصول پسند آدمی اور قانون پسند آدمی کبھی نہ سراہے گا۔ لیکن جب معاشرہ اور اس کے کارندے اس حد تک ناکارہ ہو چکے ہوں تو اصلاح پسند ذہن یہ کچھ کرنے پر مجبور ہو گا۔ اگر محاسبہ گروہ میں خوفِ خدا رکھنے والے اور باعمل افراد ہوں تو پھر اصلاحِ معاشرہ کی آخری صُورت یہ بھی ہو گی۔

گھر کے افراد جب باہر گئے تو وُہ "گھرانا" نامی فلم لگا گئے تاکہ میں مکمل سناٹے سے گھبرا نہ جاؤں۔ آج کے نوجوان بڑوں سے کس حکمتِ عملی کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ وہ دیکھ لیجئے۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش والا معاملہ!

وقاص اور شمازی گھر واپس آ گئے ہیں۔ وقاص اسکول سے اور شمازی شاپنگ سنٹر سے۔ انھیں ان کے ابو لائے ہیں اور پھر اپنے کام سے چلے گئے ہیں۔ یہ گھر میں پورے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ہمارے بچوں کی طرح اصرار نہیں کیا کہ ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔ ورنہ ہمارے بچّے تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور گھر میں نہیں ٹکتے۔ یہ شاید اسی ماحول کا صحت مندردیہ ہے۔

آج کے اخبار میں ایک اور خبر پڑھی ؛

مجھے عصمت فروشی پر مجبور کیا گیا —— عریانی سے بھرپور فلم "ڈیپ تھروٹ" کی اداکارہ لنڈا لولیس نے کہا ہے کہ اس نے فلم میں اس لیے کام کیا تھا کہ اسے مارا پیٹا گیا تھا اور دھمکیاں دی گئی تھیں۔ وہ سینٹ کی عدلیہ سے متعلق سب کمیٹی کے سامنے جواب دے رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگ جب بھی وہ فلم دیکھتے ہیں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ میری آبرو ریزی ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جبر و تشدد اور پستول دکھا کر مجھے عصمت فروشی اور عریانی پر مجبور کیا گیا۔ اس فلم نے ۶۰ کروڑ ڈالر کمائے ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے اس فلم سے

زخموں کے نشانات کے سوا کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے سوال کیا کہ "بطور انسان میرے کیا حقوق ہیں؟"

یہ اُس آزاد معاشرہ کی بی بی بول رہی ہے۔ جہاں جو چاہیں کریں کا ماحول ہے۔ پھر اس بی بی نے پردۂ سکرین پرد کچھ کیا جو جنسی جرائم کا بھیانک روپ ہے۔ مگر اس کی رُوح زندہ ہے۔ وُہ کہتی ہے: ایسا مجھ سے جبر کے ماحول میں کرایا گیا، پھر وہ انسانی حقوق کے محافظوں سے سوال کر رہی ہے کہ بطور انسان میرے حقوق کیا ہیں؟

آج کے اخبار میں پروفیسر غفور احمد صاحب کا انٹرویو چھپا ہے۔ وُہ بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو سارے سیاستدان کہتے ہیں کہ:

"جو کچھ میں سوچ رہا ہُوں وہی حل' ملک کو بچانے کا ہے۔"

۱۵ستمبر ۱۹۸۴ء (ہفتہ)

آج کے اخبار میں پڑھا:

بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر اچانک مزید فوج بھیج دی —— کشمیر اور پنجاب میں سرحدوں پر فوج کے اجتماع کے ساتھ ہریانہ میں بھی فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا —— یہ کارروائی ہندوؤں کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کی گئی ہے۔

دوسری بڑی خبر یہ تھی، پاکستان کی سرحدوں پر خلاف ورزیوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا —— شمالی وزیرستان میں افغان طیاروں نے آٹھ بم گرائے۔

پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے روس بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ ہندوستان بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے۔ پاکستان صرف اپنے دفاع کی جدوجہد میں کوشاں ہے۔ وُہ نہ روس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہندوستان کا۔ ہاں اگر جنگ ہو جائے تو نقصان دونوں ملکوں کا ہو گا۔ اگر جنگ میں روس اور ہندوستان ایک طرف ہوں، تو نقصان صرف پاکستان کا ہو گا۔ ایسے حالات میں پاکستان کی طرف سے کسی بڑے ملک کو خطرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر پاکستان کی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنے کا کیا جواز ہے!

اگر ہندوستان نے اُن چند سکھوں کو گرفتار کرنے کے لیے اتنی بڑی فوج بھیجی ہے۔ تو یہ ہندوستانی فوج کے لیے باعثِ فخر بات نہیں ہو سکتی۔ اگر پاکستان پر دباؤ ڈالنے یا حملہ کرنے کا ارادہ ہے تو بھی ایک بڑے ملک کی فوج کے شایانِ شان نہیں۔ ایک طرف ہم ایک دوسرے کے قریب آنے کی باتیں کرتے ہیں، دُوسری طرف ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہوں۔ یہ بھی قرینے کی بات نہیں لگتی۔ چونکہ میرا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اس لیے میں اس معمے کا حل نہیں جانتا۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے' مَیں تو انسانیت کی بقا کے لیے جو بھی کوشش کی جائے گی اُسے سراہوں گا۔ اس کی حمایت کروں گا۔ خواہ ایسا روس کرے، ہندوستان کرے، یا

پاکستان کرے !

میں نے یہ بھی اخبار میں پڑھا کہ کوئی پاکستانی افسر روس بہ طور سیاح جانا چاہتا تھا، اسے اس کی اجازت نہ دی گئی۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ دشمن ملک کے کسی شخص کو ایسی سہولت نہیں دی جا سکتی۔ اس خبر سے مجھے دکھ ہوا۔ وہ یوں کہ روس ہمارا پڑوسی ملک ہے اور زبردست قوت کا حامل، اس ملک کا تصور یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستان ایک دشمن ملک ہے۔ اگر ایسے تاثر میں قصور پاکستان کا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس تاثر کو ختم کرائے۔ پاکستان کی روس سے دشمنی میں خود پاکستان کا نقصان ہے۔ روس کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ یارانہ رکھے، جو بڑائی کی بات ہے!

یہاں کے اخبارات میں زیادہ تر اشتہارات "ضرورتِ رشتہ" کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ ایسے چمکیلے ماحول میں ڈوب جاتے ہیں وہ پھر اُبھرتے نہیں۔ غلط کار لوگ یورپ کے حوالے سے بہت سے خاندانوں کو تباہ کر چکے ہیں۔ پاکستان میں ایسی بھی خبریں پڑھیں کہ لوگ یورپ میں اپنی ملازمت کے سہانے خواب دکھلا کر سادہ لوح لڑکیوں کو ورغلا کر اِدھر لے آتے ہیں اور پھر ان سے عصمت فروشی کراتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کاروبار یہی ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے پاکستان کے حوالے سے 'ضرورتِ رشتہ' کے اشتہار پڑھ کر وہ ساری کہانیاں یاد آنے لگی ہیں۔

مجھے ہائیڈل برگ کا وہ واقعہ بھی یاد آیا کہ بازار میں ہندوستانی جوڑے نے ہم سے پوچھا: آپ کی رہائش کا انتظام ہو گیا ہے؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہم اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ ہم آپ کی ہر ضرورت، ہر تفریح اور ہر دلچسپی کا انتظام کر سکتے ہیں اور اخراجات بھی زیادہ نہ ہوں گے۔"

آج ہمیں غیاث صاحب نے شیفیلڈ کھانے پر بلا رکھا ہے۔ یہاں سے شیفیلڈ کی سڑکیں ویسی ہی جیسی ہمارے ہاں کی۔ یہ بات ہمیں جانے سے پہلے بتلا دی گئی تاکہ اچانک صدمہ نہ پہنچے۔ حالانکہ یہ صدمے کی بات نہ تھی، خوشی کی بات تھی کہ اُس سڑک کے فوائد سے آشنا ہوں گے! مگر جب اس سڑک پر چلے تو وہ اچھی خاصی نکلی، مگر یہاں والوں کے معیار کے مطابق نہ تھی۔ چونکہ شیفیلڈ پہاڑی علاقہ ہے، اونچائی پر ہے، اردگرد پہاڑ ہیں۔ مجھے تو یہ راستہ ایسا لگا، جیسا اپنی مری کا راستہ ہو۔

ہمیں غیاث صاحب کے ہاں بارہ سے ایک بجے کے درمیان پہنچنا تھا، مگر ہم ۲½ بجے پہنچے۔ گھر سے بارہ بجے چلے تھے، مگر سڑک مرمت ہو رہی تھی۔ اس لیے راستہ چھوٹی سڑکوں سے بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سڑکوں پر میلوں کی لمبی لائنیں تھیں۔ ٹریفک جُوں کی مانند جاری تھی، تاخیر اسی باعث ہوئی۔

غیاث صاحب کے ہاں پہنچے تو ٹیلی ویژن لگا ہوا تھا۔ کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ آل راؤنڈر کون ہے؟ اس کا

فیصلہ ہونا تھا۔ کمنٹری عمران خان کر رہے تھے، شاید یہ لوگ اپنی سیاست بازیوں سے اسی قابل رہ گئے ہوں۔ بہر حال جس وقت ہم پہنچے بوتھم کھیل رہے تھے، مارشل باؤلنگ کر رہے تھے۔ اس کے بعد کپل دیو کھیلے۔ مگر آل راؤنڈر کون ہے؟ اُس کا فیصلہ انگلستان کے کھلاڑی رائس کے حق میں ہُوا ہوگا۔ کیونکہ اس کا سکور بھی سب سے زیادہ تھا، وکٹیں بھی اس نے سب سے زیادہ حاصل کی ہُوئی تھیں۔

اسی دوران ٹیلی ویژن پر دکھایا کہ پرنسس ڈیانا کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا ہے۔ ایسا اعلان کئی بار ہوا۔ یہ خبر سننے کے لیے ہسپتالوں کے باہر بھی سیکڑوں آدمی موجود تھے۔ غرض اس واقعہ کو بڑی اہمیت دی گئی۔

۱۶ ستمبر (اتوار)

میں یہ بات سُن کر حیران رہ گیا کہ یہاں عورتیں مردوں کو پیٹتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو معاملہ اُلٹ ہے۔ یہاں گھر میں سے جو نکلتا ہے یعنی جسے نکالا جاتا ہے وہ عورت نہیں مرد ہوتا ہے۔ یہاں یہ خبر سننے کو عام ملے گی کہ عورت نے اپنے شوہر کو مار مار کر گھر سے نکال دیا۔ جب تک بچہ نہ ہو مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ جب بچہ ہو جائے تو شوہر کے حقوق بیوی سے کم ہو جاتے ہیں۔ عورت شیرنی بن جاتی ہے۔

اتوار کو صبح اور سہ پہر کو اُردو کے پروگرام مختلف چینلوں سے ہوتے ہیں۔ صبح ہم نے دیر سے ٹیلی ویژن لگایا تو ناہید نیازی گا رہی تھیں۔ یہ گلوکارہ اپنے ہاں تھیں جو غائب ہو گئی تھیں۔ یہاں آکر پتا چلا کہ وہ یہاں سکونت پذیر ہیں ریڈیو اور ٹی وی میں سے کسی ایک محکمہ میں باقاعدہ ملازم ہیں۔ جب تک ہمارے ہاں تھیں اُس وقت تک یہ اچھا گا لیتی تھیں، اب اتنا لطف بھی نہ آیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میری فن سے بے خبری کا نتیجہ ہو۔ مگر میں نے محسوس ایسا ہی کیا۔

مجھے محمد جمیل صاحب نے بتایا کہ آج پونے تین بجے ہندوستان کی مشہور فلم مدر انڈیا ٹیلی ویژن پر دکھائی جائے گی۔ ہندوستان نے جو چند اچھی فلمیں بنائیں یہ اُن میں سے ایک ہے اس لیے دل آمادہ ہو گیا کہ اگر اس وقت تک کوئی اور پروگرام نہ بنا تو یہ فلم بھی دیکھ لی جائے۔

ہم شیفیلڈ گئے کہ میری بہو بشریٰ کی سہیلی نے بہت سا سامان تھما دیا کہ بشریٰ کو دے دیا جائے۔ ہم نے آج صبح اپنی ضرورت کی خریدی ہُوئی چیزوں کو بھی اس لیے پھینک دیا اور بچوں کو دے دیا کہ سامان زیادہ ہو گیا ہے کون اسے اٹھائے پھرے۔ نمائش سے جو چھپی ہُوئی چیزیں اور پمفلٹ ساتھ لائے تھے انہیں دو پیکٹوں میں بند کر کے بذریعہ بحری جہاز پاکستان بھجوا دیا تھا کیونکہ سردی کے خوف سے ہم دو تین سُوٹ ساتھ لے آئے تھے۔ چند قمیصیں، تھوڑا سا ضرورت کا سامان، وہی وزن خاصا تھا اور مزید کسی وزن کے اٹھانے یا لے جانے کی گنجائش نہ تھی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، کیا چھوڑ کر جاتے ہیں، کیا لے کر جاتے ہیں۔

جاوید یہی کام کر رہا ہے۔ کام کی چیزوں کو بھی پھینک رہا ہے۔ ایسی تمام چیزوں کا فاتحہ وہاں پاکستان

جا کر پڑھوں گا۔ ابھی تو یہ ہے کہ مقررہ وزن کے ساتھ پاکستان پہنچیں۔ جو عزیز رشتہ دار اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ لندن سے ہمارے لیے تحفہ آئے گا، وہ کتنی زیادتی کرتے ہیں۔

مدر انڈیا فلم دیکھی۔ جیسی سُنی تھی ویسی پائی۔ یہ فلم نیچرل اداکاری میں انتہائیوں کو چھو رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ سین بہ سین لُطف آتا رہا۔ میں عموماً گھر میں ٹیلی ویژن پر لگی فلمیں نہیں دیکھتا حتّٰی کہ امرتسر اسٹیشن سے جو انڈیا کی فلمیں دکھاتے ہیں وُہ بھی عموماً نہیں دیکھتا۔ مطلب یہ کہ اس شوق سے مجھے کم حصّہ ملا ہے۔ تاہم یہ فلم دیکھنا چاہتا تھا، مگر اس کا موقع آج ملا تھا۔

۱۷ ستمبر (پیر) [لندن]

یہ طے ہو چکا تھا لندن جانا ہے۔ بولٹن کو خیر باد کہنا ہے۔ لہٰذا سویرے اُٹھے، ناشتا کیا اور ریلوے اور نیشنل بس سروس اسٹیشن سے کرایہ پوچھا۔ ہم نے زیادہ تر سفر ریل میں کیا تھا۔ چونکہ پیسے ختم ہو رہے تھے اس لیے بس کا کرایہ بھی پُوچھا۔ آدھم آدھ فرق نکلا۔ لہٰذا اچھا خاصا یورپ گھُومنے کے بعد، آج پہلی بار بس میں سفر کا سوچا، اس لیے حادثات سے ڈر لگتا ہے۔

جس وقت ہم بولٹن سے چلے تو ہلکی ہلکی بُوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجھے بارش، بادل ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ میرے لیے بارش کی مترنّم آواز موسیقی کا درجہ رکھتی ہے۔ بہرحال ہم بادلوں اور بارش کے جلو میں نکلے۔ بارش ہوتی رہی، مجھے فرحت بخشتی رہی۔ بارش میں گاڑی خاصی احتیاط سے چلانی پڑتی ہے کیونکہ پھسلنے اور حادثات کا خطرہ ہوتا ہے۔ راستے میں ایک ایکسیڈنٹ دیکھا۔ طبیعت پر بڑا بوجھ پڑا۔ تھوڑی دُور آگے ایک اور ایکسیڈنٹ دیکھا، پریشانی ہُوئی۔ کیونکہ ایکسیڈنٹ کا میل آدھ میل پہلے ہی علم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ٹریفک رک جاتی ہے۔ اور سیکڑوں گاڑیاں بجائے چلنے کے رینگ رہی ہوتی ہیں۔ دو حادثات کے بعد ہم ایک سروس اسٹیشن پہ رُکے تاکہ لوگ باگ کچھ کھا سکیں، کچھ چھوڑ سکیں۔ اوروں کے ساتھ ہم بھی بس سے نکلے۔ خشک پھل اور بسکٹ لیے، جو بس میں بیٹھ کر کھائے۔ ہماری بس بولٹن سے آدھی خالی چلی تھی۔ یہاں پر بس میں اور لوگ بھی آکر بیٹھنے لگے۔ کچھ زخمی اور کچھ بدحواسی کے عالم میں، وہ مسافر اگلی سیٹوں پر بیٹھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ معلوم ہوا تھوڑی دیر پہلے بس کا حادثہ ہوا، جس کے یہ زخمی اور مسافر ہیں۔ یہ سب دیکھ کر طبیعت بڑی خراب ہُوئی۔ وہ جو پیسے بچانے کی خاطر بس پر سفر کیا تھا وُہ فیصلہ غلط نظر آیا۔ جب لندن پہنچے تو بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی، مگر شدت میں کمی آگئی تھی۔

بس اسٹیشن پر مجید علی خاں صاحب، احمد قرنی صاحب اور شوق حیدر آبادی ملے۔ تینوں شاعر۔ میں شاعروں سے ڈرتا ہُوں۔ اس لیے انھیں دیکھ کر بھی ڈرا۔ شاعر اس بات کی ایک منٹ میں ٹوہ لگا لیتا ہے کہ مخاطب شاعر ہے

کہ نہیں۔ وہ یُوں کہ بہانے بہانے سے اپنے شعر سنائے گا۔ مخاطب شاعر ہُوا تو وہ بھی شعر سنائے گا کہ اس موضوع کو میں نے بھی باندھا ہے۔ اگر مخاطب شعر کے مقابلے میں شعر نہیں سنائے گا تو شاعر فوراً کہے گا۔ آپ بھی شعر کہیے۔ یہی سوال قرنی صاحب نے مجھ سے پُوچھا۔

میں نے جواب میں کہا: اللہ کے جہاں مجھ پر اور بہت سے احسانات ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مجھے شعر گوئی سے بچایا۔

شوق حیدر آبادی صاحب نابینا ہیں! مگر یہاں اسی حالت میں سرگرم عمل ہیں۔ چھوٹا موٹا اخبار بھی نکالتے، بُرے بھلے شعر بھی کہتے ہوں گے۔ مگر اُن سے جلد ساتھ چھُوٹ گیا۔ کیونکہ اس وقت ہم ہوٹل کی تلاش میں تھے۔ وکٹوریہ اسٹیشن کے گرد و نواح میں بے شمار ہوٹل ہیں، زیادہ تر میں جگہ نہ تھی۔ جن میں جگہ تھی ان کے کرائے بہت تھے۔ ایک مسافر کے لیے بہت۔ مثلاً فی کس پندرہ سے بیس پونڈ روزانہ تک۔ کرائے تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر یہ حالت اُن ہوٹلوں کی ہے جو ہوٹل کم، ہوٹل کی تہمت زیادہ تھے۔

بہرحال ہم نے ایک جگہ ہوٹل میں سامان رکھا۔ ڈبل روم ۳۰ پونڈ روزانہ۔ کیا کرتے! شام کے وقت پہنچے تھے۔ بس حادثات کی وجہ سے بہت تاخیر سے پہنچی تھی۔ ان میں پہنچتے تو کسی دوست کے ہاں ٹک سکتے تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر قرنی صاحب، مجید علی خان صاحب، جاوید اور میں باہر نکلے۔ جب راستے میں دریائے ٹیمز پڑا تو رُک گئے۔ ورنہ چلتے جاتے، چلائی کا لطف آ رہا تھا۔

بے شک چلنے کا لطف آ رہا تھا، مگر تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ طے پایا کہ کسی جگہ بیٹھ کر چائے یا کافی پی جائے۔ راستے میں پیزا ہوٹل ملا، وہاں بیٹھ گئے۔ مینو ملا تو کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ جو آرڈر دیتا وہی بل بھی ادا کرتا۔ مینو مجید علی خاں صاحب نے اٹھایا۔ کہنے لگے، رات ہو رہی ہے اس لیے مناسب ہو گا چائے سے پہلے پیزا کھایا جائے۔ وہ نان نما چیز ہوتی ہے۔ جس پر پنیر، مٹر، مکھن اور اناناس اور نہ جانے کیا کیا رکھ کر تلا جائے تو وہ پیزا ہوتی ہے۔ پیزا لذیذ تھا۔ وہ ہوٹل بھی اس کے لیے مشہور تھا۔ جو آتا تھا اس کا آرڈر دیتا تھا۔ چنانچہ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ سوائے مجید علی خاں کے سب کو مزا آیا ہو گا۔ خاں صاحب کو مزا اس لیے نہ آیا ہو گا کہ بل انہوں نے ادا کیا تھا۔

وہاں سے اُٹھے تو واپس ہوٹل جانے کا ارادہ کیا۔ راستوں کا کھو جانا یہاں عام سی بات ہے یہاں کے رہنے والے بھی اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنا ہوٹل ڈھونڈتے ڈھونڈتے خاصا وقت گزر گیا۔ یہ تو ہمیں علم تھا کہ ہوٹل ہے یہیں کہیں۔ ہم اپنے ہوٹل کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔ مگر وہ نہیں مل رہا۔ چنانچہ پُوچھ پاچھ کر ہوٹل پہنچے۔ تھکے ہارے تھے۔ لہٰذا بستر پر پڑے اور سو گئے۔

۱۸ ستمبر (منگل)

چونکہ مجھے للک عمرہ کی تھی اس لیے سیدھے سعودی عرب کے دفتر پہنچے۔ ہوٹل سے متعدد ٹیلیفون کئے، مگر کوئی اٹھاتا نہ تھا۔ ٹیکسی پر وہاں پہنچے۔ قبل ازیں ہمیں بتایا گیا کہ حج کے دو ہفتے بعد عمرہ کے لیے ویزا ملے گا۔ جب دو ہفتے کے بعد معلوم کیا تو علم ہوا، تین ہفتے بعد ملے گا۔ لہٰذا اِدھر اُدھر وقت کاٹتے رہے۔ جیب ہلکی ہوتی چلی گئی۔ جب آج پہنچے ویزا لینے، تو بتا دیا گیا حج کے ایک ماہ بعد ویزا ملے گا۔ یہ سُن کر طبیعت پریشان اور بے چین ہو گئی۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ مزید پندرہ بیس دن رُکتے۔ میں تو کسی دوست کے پاس جا سکتا تھا کہ اب بھگتو۔ مگر میرا بیٹا کہتا تھا:

ابا جی! یہ مناسب نہیں کہ آپ کا کوئی دوست میرا بھی بوجھ اٹھاتے!

جاوید کا ارادہ ایک کام سے دوبارہ سوئٹزرلینڈ جانے کا تھا۔ مجید علی خاں صاحب نے عمرہ کے لیے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جب انہیں علم ہُوا کہ ویزا آج سے بھی پندرہ دن بعد ملے گا تو وُہ کہنے لگے:

میں تو اتنے دن مزید نہیں رک سکتا۔

لہٰذا ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا اور دل کو یہ سمجھایا کہ بیوی ساتھ حج کرنے کا کہتی رہتی ہیں، لہٰذا آئندہ سال حج کر لیں گے۔

اس کے بعد کویت ایئرویز پر اشفاق مرزا کے پاس پہنچے۔ کیونکہ لندن میں ڈاک کا ایڈریس یہی تھا۔ ہم نے انہیں بولٹن سے ٹیلیفون کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ آپ کی ڈاک آئی ہے، خطوط بھی ہیں، تاریں بھی ہیں، یاد کرنے والوں کے ٹیلیفون نمبرز بھی نوٹ کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا سعودی عرب کے سفارت خانے سے بیکر اسٹریٹ جا کر اپنی ڈاک حاصل کی۔ وہاں سے افتخار عارف صاحب کو ٹیلی فون کیا انہوں نے جواب میں کہا:

آپ نے بہت ستایا، پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔

میں نے کہا: ہم ستانے والوں میں نہیں بلکہ دُعائیں دینے والوں میں ہیں۔

انہوں نے پُوچھا: کب ملاقات ہوگی؟

میں نے کہا: کل!

انہوں نے کہا: میں وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ جاؤں گا، وہاں سے اپنے دفتر لے آؤں گا۔

میں نے کہا: بہت اچھا!

مگر مجھے برنی صاحب اور یوسفی صاحب کے ٹیلیفون نمبر بتائیں تاکہ مجرم اپنی آمد کی اطلاع دے سکے۔ انہوں نے نمبر دیے برنی صاحب کا معلوم ہُوا، طبیعت اچھی نہیں، آج نہیں آئے۔ یوسفی صاحب کا پُوچھا۔ بتایا گیا: دو بجے کے

بعد آئیں گے۔ لہذا اِدھر اُدھر گھوم کر، راستے سے پھل خرید کر ہوٹل پہنچ گئے۔

ہاں آج میڈم ٹوسا کے مجسمہ گھر گئے۔ ۱۹۷۰ء میں بھی گیا تھا۔ لندن کے عجائبات میں ایک یہ مرکز بھی ہے جہاں شاہی خاندان کے مجسموں سے لے کر، اس دور کی بھی تمام نمایاں ہستیوں کے مجسمے موجود ہیں۔ یہ مجسمے اتنے اصل کے قریب ہیں کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں موجود لوگوں اور مجسموں کو دیکھ کر، اصل کون؟ مجسمہ کون؟ کی تمیز جاتی رہتی ہے یقین جانیے، وہاں جو کچھ ہے یا تو وہ سب کا سب اصل تھا یا وہاں کے چلنے پھرنے والے لوگ بھی مجسمے تھے۔ جب مجسموں کے دل دھڑکنے کی سی کیفیت کو دکھلا دیا گیا ہو تو نقل کا کیا تصور باقی ہو!

پھل وغیرہ کھا کر ہوٹل سے باہر نکلے کہ بیٹھنے کا کیا فائدہ، چل پھر کر تماشا دیکھا جائے۔ صبح ٹھنڈی ہوا اتنی ٹھنڈی نہ تھی جتنی کہ پانچ بجے کے قریب، لہذا تھوڑی دُور جا کر واپس آ گئے کہ بلا وجہ بھی ریخ ہونے کا کیا فائدہ! جیسے یہاں کے لوگ ہیں ویسا یہاں کا موسم ہے۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ! یا یہ کہ ابھی کچھ، ابھی کچھ!

ہم نے لارڈز گراؤنڈ کو دیکھا۔ جہاں کہ کرکٹ میچ دیکھے تھے۔ یہ یاد بھی میرے لیے اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ مجھے اس شوق سے ایک خاص نسبت ہے، صرف دیکھنے دکھانے کی حد تک، کھیلنے کھلانے کی حد تک نہیں۔ اس لیے کہ میں اپنے کاموں میں ڈوب جانے کے بعد کسی طرح ابھرنا بھی چاہتا تھا۔ چنانچہ دنیا بھر کے کرکٹ میچوں سے مجھے دلچسپی رہی!

رات ہم گھومنے نکلے۔ بکنگھم پیلس کی طرف جا نکلے، جہاں ملکہ سلامت رہتی ہیں، ہائیڈ پارک دیکھتے رہے جہاں سب کچھ کہنے کی آزادی ہے۔ خُوب دُھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ اصل میں ہم کھانا کھانے نکلے تھے۔ کسی پاکستانی ریستوران کی تلاش تھی۔ اس لیے اِدھر نکلے اُدھر نکلے والی کیفیت تھی۔ مگر کوئی پاکستانی ریستوران نہ ملا۔ بالآخر ایک چینی ریستوران میں چلے گئے۔ وہاں سروس کرنے والی سب چینی خواتین تھیں۔ اُن میں صرف ایک انگریز خاتون تھی جس نے نہایت زرق برق لباس پہنا ہُوا تھا، جو متوجہ کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے گاہکوں سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھیں، اور یہ بتا رہی تھیں کہ آج میری ۲۹ویں سالگرہ ہے۔

۱۹ ستمبر (بدھ)

آج صبح ایک صاحب نے ٹیلیفون کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ مگر انہوں نے ایک بجے تک بھی ٹیلیفون نہ کیا۔ چنانچہ باہر نکلنے کا پروگرام غارت ہُوا۔ اب سوچ رہے ہیں کہ ۱½ بجے تک اُن کا انتظار کر کے باہر نکلیں گے۔ جن صاحب کا میں انتظار کر رہا ہُوں اُن کا نام میں نے نہیں لکھا، صرف اتنا بتاتا ہُوں وُہ شاعر ہیں۔

دوپہر کو پروگرام کے مطابق افتخار عارف صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ بتایا گیا۔ تشریف لائیے، وہ آنے ہی

والے ہیں۔ ہم پہنچے تو اس وقت تک عارف صاحب نہیں پہنچے تھے۔ وہاں احمد فراز اور ڈاکٹر شکیب صاحب بیٹھے تھے دنوں کے بعد احمد فراز صاحب کو دیکھا تھا اس لیے بے حد خوشی ہوئی۔ وُہ پاکستان کے بارے میں پُوچھتے رہے، مَیں اُن کے قیامِ انگلستان کے بارے میں۔ میں نے ان سے کہا:

آپ پاکستان کیوں نہیں آتے؟

کہنے لگے: مجھے سندھ میں پولیس کے ایک افسر نے ایک چٹھی پر دستخط کرائے۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ صوبہ سندھ کو ابھی چھوڑ دیں۔

اُس وقت میرا مُوڈ بگڑا۔ میں نے سوچا، شاید یہ میرا ملک نہیں۔ اگر ہوتا تو مُجھ سے ایسا کیوں کہا جاتا!

میں نے پُوچھا: شعر و شاعری کا کیا عالم ہے؟

ہو رہی ہے۔ پہلے بھی زیادہ کہنے والوں میں میرا شمار نہ تھا۔ اب بھی وہی رفتار ہے!

میں نے کہا: افتخار صاحب کہاں چلے گئے؟

کہنے لگے: ڈرائیونگ کے امتحان میں تیسری مرتبہ فیل ہو گئے ہیں۔

احمد فراز شعر بھی اچھا کہتے ہیں، گفتگو بھی اچھی کرتے ہیں۔ لہذا ان کے پاس بیٹھ کر اُکتا نے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کہنے لگے:

آپ نے بھی شاعری کی بات کی تھی میں آپ کو ایک شاعر کا قصّہ سناتا ہُوں۔ ایک مشاعرے میں شاعر نے بہ طورِ انکسار کہا:

"میں کوئی بڑا شاعر نہیں ہُوں، بلکہ ایک سیدھا سادا شاعر ہُوں۔"

حاضرین میں سے ایک صاحب اُٹھے، انہوں نے کہا:

"یہ شخص نہ سیدھا سادا ہے اور نہ شاعر ہے۔"

اتنے میں ایوب اولیا صاحب آ گئے۔ یہ ابھی ابھی پاکستان سے لَوٹے تھے۔ اُن کا پاکستان جانا ایک حادثہ کے ماتحت تھا۔ اُن کے بھائی کا کراچی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے بتایا اس حادثہ کے وقت اور اس موقعہ پر بھی مجھے بخشا نہ گیا۔ میری جیب سے ۳۰۰ پونڈ نکال لیے گئے۔ پہلے ایک موقع اُن سے ہمدردی کا تھا اب دوسرا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیلی ویژن کی آرٹسٹ روحی بانو آ گئیں۔ وُہ افتخار صاحب سے ملنے آئی تھیں۔ انہوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر چلی گئیں۔ مگر اس دوران میں ان سے پوچھا:

آپ پاکستان سے کب آئی ہیں؟

انہوں نے بتایا: ایک ماہ ہُوا۔

میرا دوسرا سوال تھا : یہاں رہنے کے ارادے سے آئی ہیں یا واپس جانے کے لیے؟

بتایا گیا : واپسی کے ارادے سے آئی ہوں۔

مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی پریشان ہیں۔ پریشانی کی کیا وجہ ہے؟ وہ میں پوچھ نہ سکا۔

احمد فراز صاحب نے بتایا کہ میرا ایک مجموعہ اِدھر چھپا ہے۔ انگریزی میں بھی میری ایک کتاب ترجمہ ہو کر چھپ رہی ہے۔

جو نیا مجموعہ انہوں نے دکھایا وہ خاصا خوب صورت چھپا تھا۔ میں نے کہا : لندن میں بیٹھ کر اردو مجموعے کا اتنی شان سے چھپنا خاصی بات ہے۔

وہ مجھے اپنی کتاب دستخط کر کے دینا چاہتے تھے، مگر میں نے کہہ دیا : کتاب بے شک دیجئے۔ مگر میری آپ کے کلام کے بارے میں رائے وہی ہے۔ اس پر وہ رکے اور کتاب دیتے دیتے رہ گئے۔

کلام کے بارے میں وہی رائے کا قصہ یہ ہے کہ میں نے ان کا کلام نقوش میں چھاپنا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے بھجوانا چھوڑ دیا تھا۔ اس واقعہ کے خاصی دیر بعد' ان کے ایک مدّاح نے مجھ سے پوچھا :

اگر آپ کو احمد فراز صاحب کا کلام بھجوایا جائے تو کیا آپ چھاپیں گے؟

میں نے جواب میں عرض کیا : کلام دیکھے بغیر میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

میں نے یہ فقرہ جان بوجھ کر کہا تھا، ان کو ستانے کے لیے نہیں، بلکہ یہ بتلانے کے لیے، اگر آپ کی کوئی قدر و قیمت ہے تو نقوش کی بھی ہے۔ بہرحال عرصہ تک ان دو اناؤں میں معاملہ گڑبڑ رہا۔ پہلے تو شخصی طور پر بھی بول چال نہ تھی آمنے سامنے سے بغیر سلام دعا کے گزر جاتے تھے۔ جب یہ اکیڈیمی آف لیٹرز کے ڈائریکٹر بنے تو انہوں نے مجھے ایک خط لکھا۔ چونکہ اُن دنوں مَیں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری جنرل تھا اس لیے میں نے ادیبوں کے مفاد میں' ان کے خط کو خاصی اہمیت دی اور لکھا : اس باب میں جو میرے لائق خدمت ہو اس کے لیے حاضر پائیے گا!

اس موقعہ پر پھر جو میرے منہ سے نکلا کہ کلام کے بارے میں رائے وہی ہے تو انہوں نے کتاب دینے کا فیصلہ کر کے کتاب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

جاوید میرے ساتھ تھے، انہوں نے کہا : احمد فراز صاحب! آپ جب ہندوستان گئے تھے تو وہاں جا کر آپ نے جو نظم پڑھی تھی وہ قابلِ اعتراض تھی۔

احمد فراز نے بتایا : وہ نظم میں نے ان دنوں نہیں لکھی تھی وہ ایوب خاں کے زمانے میں لکھی تھی اور وہ نظم میرے پہلے مجموعۂ کلام میں موجود ہے۔ سنہ اس پر موجود ہے۔ میں نے وہ نظم ان دنوں کہاں کہی تھی۔ چونکہ اخباروں نے میرے خلاف لکھنا تھا اس لیے وہ نظم اُس موقعہ پر میرے نام کے ساتھ چپکا دی۔ وہ مواد جو پاکستان میں میرے خلاف چھپا تھا' یہاں بھی چھپا' تو میں نے اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔

میرے جانے پر دفتر والوں نے چائے بنا کر دی۔ جو بقول احمد فراز: پہلی بار اچھی چائے ملی تھی۔ اس پر فراز نے کہا:

طفیل صاحب کے طفیل پہلی بار اچھی چائے ملی۔ مگر مجھے طفیلیوں میں شمار نہ کیا جائے۔

چونکہ افتخار عارف نے لوٹنے میں کافی دیر کر دی تھی اس لیے احمد فراز نے فاروق صاحب کو مخاطب کر کے کہا: مکرر پڑھیے تو سن رکھا ہے۔ آج مکرر پلوائیے کہتا ہوں۔ مگر چائے ویسی ہو جیسی طفیل صاحب کے لیے آئی تھی۔ ویسی نہ ہو جیسی احمد فراز کے لیے آتی رہی ہے۔

میں نے کہا: غصہ چھوڑیے، پاکستان آئیے۔

کہنے لگے: کوئی مجھے یہ کہے مَیں شرابی ہُوں، زانی ہوں، مجھے زیادہ دُکھ نہ ہو گا۔ مگر جب مجھے کوئی یہ کہے کہ پاکستانی نہیں ہُوں، تو وُہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

احمد فراز کی موجودگی میں ماحول پر قنوطیت کا سایہ نہیں پڑتا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پاس ایک مجسمہ ہے جو مجھے نیپال کے سفیر کی بیگم نے دیا ہے۔ وہ کوئی قیمتی شے ہے۔ مگر میں اُسے پاکستان نہیں بھجوا سکتا۔ آپ نے وہ تلوار والا قصہ سُنا ہے؟

میں نے کہا: میں نے تو نہیں سُنا۔

بتانے لگے کہ ہندوستان گیا تو ایک مدّاح سِکّھ نے مجھے ایک بڑی مرصّع ٹائپ کی تلوار بہ طورِ عقیدت پیش کی۔ وُہ میں نے پاکستانی سفارت خانہ کے ایک صاحب کے ہاتھ بھجوائی کہ میرے بھائی تک پہنچا دی جائے۔ وہ تلوار پاکستانی کسٹم حکام نے روک لی کہ اوزاروں کا لانا لے جانا ناجائز ہے۔ لہٰذا انہوں نے تلوار روک لی، رسید لے لی گئی۔ جب وہ صاحب ہندوستان واپس آئے رسید دکھا کر تلوار حاصل کی۔ پھر وہ تلوار ہندوستانی بارڈر پر روک لی گئی کہ پاکستان سے ہتھیاروں کا لانا ممنوع ہے۔ لہٰذا میری وُہ تلوار انڈیا کسٹم والوں کے پاس پڑی ہے۔

ڈاکٹر شکیب نے کہا: آج کل پُرانی چیزوں کی یہاں بڑی مانگ ہے۔ اگر کوئی دو ڈھائی سو سال کے کُرتے شلواریں بھی لے آئے گا تو وُہ اچھی خاصی قیمت پر بِک جائیں گے۔

اس پر احمد فراز نے کہا: افسوس کہ میری اتنی پرانی گرل فرینڈ ہے نہیں!

اس کے بعد افتخار عارف صاحب آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی کہا: چائے لائیے۔

چنانچہ تیسری بار چائے پی گئی۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ افتخار صاحب باتیں بڑے اچھے لب و لہجہ میں کرتے ہیں۔ یہ وصف ان کی کمائی کا سلسلہ بھی ہے۔ پہلے پاکستان ٹیلی ویژن پر دکھائی دیتے تھے اب لندن میں اُردو کا محاذ سنبھالے ہُوئے ہیں۔ جو ہم اردو کے خیر خواہوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عارف صاحب نے کہا: اب طے کیجئے کہ آپ کس تاریخ کو اردو مرکز میں تشریف لائیں گے تاکہ دعوتی

کارڈ چھاپے جائیں۔ آپ کے بہت سے مداح آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا: ہم نے لندن کے لیے دس دن کا مارجن رکھا ہوا تھا مگر جلد واپس جانا ضروری ہوگیا ہے کیونکہ پرچے کا کام رک گیا ہے۔ جو کچھ چھاپنے کے لیے دے آیا تھا وُہ چھپ چکا ہے۔ کچھ مضامین جو پہنچنے تھے وہ نہیں پہنچے۔ ۱۲ ربیع الاوّل تک پرچے کا مکمل ہونا ضروری ہے کیونکہ میں پہلے اسی مقدس دن تک اپنے نمبر پیش کرتا رہا ہوں۔

عارف صاحب نے کہا: بھابی زہرہ نگاہ نے مجھے کئی بار کہا، طفیل صاحب آئیں تو میری اُن سے بات کرائیے گا۔ چنانچہ عارف صاحب نے نمبر ملا دیا۔ اُدھر سے بھی اصرار کہ جلسہ ہوگا۔ اس کے بعد آپ جائیں گے۔ میں نے سوچا اِس وقت یہ بحث مناسب نہ ہوگی، کل بات کریں گے۔

ساقی فاروقی یہاں کے منہ زور ادیب ہیں۔ انھیں ادب کے علاوہ پینٹنگ کا بھی شوق ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنی تصویروں کی نمائش کی۔ پینٹنگ نے عرصہ دراز سے، اپنے اُونچے معیار مقرر کر رکھے ہیں اُن میں ساقی فاروقی صاحب کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افتخار عارف صاحب نے بتایا کہ فاروقی صاحب کی پینٹنگ کے بارے میں ایک صاحب نے تبصرہ یُوں کیا تھا کہ جہاں تصویریں لٹکی ہُوئی ہیں وہاں خود مصوّر کو لٹکانا چاہیے۔

ساقی فاروقی صاحب بے باکیِ اظہار کے سلسلے میں کافی بے باک واقع ہُوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جنہیں صرف وہی لکھ سکتے تھے میں نہیں لکھ سکتا۔ غرض ان کے دم سے بھی اِدھر خُوب رونق ہے۔ یہ میرے ایک عزیز دوست کے دوست ہیں اس لیے مجھے بھی عزیز ہیں۔

آج میں نے لندن کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ٹیوب اسٹیشنوں کی آٹومیٹک اُترتی چڑھتی دو دو تین تین منزلہ سیڑھیوں کو دیکھا۔ بھیڑ بھرے بازاروں کو دیکھا۔ بڑے بڑے شاپنگ سنٹروں میں جھانکا۔ نوجوانوں کو خوش فعلیاں کرتے دیکھا۔ لوگوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ قہقہے لگاتے دیکھا۔ بازاروں میں کھاتے دیکھا۔

عارف صاحب نے زہرہ نگاہ کے میاں ماجد علی کے قصّے سنانے شروع کر دیئے کہ بذلہ سنج ہیں۔ ایک قصّہ سنایا کہ ایک مشاعرے کی صدارت مولانا ماہر القادری کر رہے تھے۔ سامعین میں سے کسی کو شرارت سُوجھی، اس نے صدرِ مشاعرہ کو چِٹ بھجوائی کہ ماجد علی صاحب بھی شعر سنائیں گے۔ ماجد صاحب نے اُٹھ کر کہا کہ میں شعر نہیں کہتا اس لیے معذوری ہے۔ اس کے بعد دوسری چِٹ پہنچی کہ ماجد صاحب شعر کہتے ہیں۔ لہٰذا ان سے سُنا جائے۔ مولانا ماہر القادری نے وہ چِٹ پڑھی تو کہنے لگے، لوگ کہتے ہیں آپ شعر کہتے ہیں۔ اس پر ماجد صاحب نے برجستہ کہا: صاحبِ صدر! لوگ تو آپ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ شعر کہتے ہیں۔ غرض یُوں وُہ محفلِ لطیفہ دیر تک جمی رہی۔ میں نے اجازت چاہی تو محفل درہم برہم ہوگئی۔

رات کو زبیری صاحب نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم سات بجے ٹھکانے پر واپس آگئے تھے۔ اس کے بعد باہر نہ نکلے۔ صبح سات بجے اُٹھا تو دروازے میں زبیری صاحب کا رقعہ پڑے دیکھا، لکھا تھا میں نے رات

۹½ سے گیارہ بجے تک انتظار کیا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔ نہ جانے ایسا کیسے ہوا! ہوٹل والوں نے غلط اطلاع دی یا زبیری صاحب نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے ایسا کیا۔

۲۰ ستمبر (جمعرات)

کل مجھے مشتاق احمد یوسفی صاحب نے کہا تھا، دفتر آئیے، کھانے کے وقت آئیے۔ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا تو باہر موسلا دھار بارش، باہر نکلا نہ جائے۔ محلِ وقوع سے ناواقفیت کی وجہ سے پہنچنا دشوار ہوتا ہے اتنا کوئی نہیں سوچا کہ مسافر پہنچے گا کیسے؟ لہذا بارش میں کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہم ٹیکسی کے اڈے پر نہ تھے۔ سڑک پر کھڑے تھے۔ زیادہ شرابور نہ ہوتے تھے کہ اچانک ٹیکسی مل گئی۔ ساڑھے تین پونڈ میں یوسفی صاحب کے دفتر تک پہنچے۔ یوسفی صاحب نے محبت آمیز مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ جاوید ساتھ تھا۔ میں نے بتایا:

یہ میرا بیٹا ہے۔

کہنے لگے: آپ نے اپنے ادبی کاموں کو تو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھا، مگر بیٹے کو صیغۂ راز میں کیوں رکھا؟

میں نے ادبی کاموں کو پیش کرنے سے پہلے صیغۂ راز میں اس لیے رکھا کہ جانے کس کام کی بابت گفتگو کریں گے۔ وہ تکمیل کے مراحل تک پہنچے گا یا نہیں! اس لیے ڈینگیں مارنے کی عادت کو آپ نے صیغۂ راز کا نام دیا ہے۔

مجھے کہا آپ کا وزن کم ہو گیا ہے یہ اچھی علامت ہے۔ جو لوگ جتنے دُبلے ہوتے ہیں وہ اتنی ہی زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ اسّی نوّے سال عمر ہو گی۔ مگر وہ خود اسّی نوّے پونڈ سے کم ہوں گے۔

میں نے کہا: میں تو علیل رہا، اس لیے کمزور ہوں، بہ طور علامتِ صحت نہیں!

میں نے کہا: اِدھر آپ نے کچھ لکھا؟

کہنے لگے: کچھ لکھا ہے۔ شاید چھ سات ماہ تک کتاب مکمل ہو جائے۔

میں نے کہا: آپ بینکر ہیں، حساب دان ہیں۔ ماہ، دن اور گھنٹے بتائیے۔

کہنے لگے: بس سات ماہ، سات دن اور سات گھنٹے۔ اس کے بعد وہ نقوش کے آئندہ منصوبوں کی بات کرتے رہے۔

میں نے کہا: دیکھیے جو توفیق ہو۔

میں کل سے آئی ایچ برنی صاحب کو ڈھونڈ رہا تھا، ان کی صحت خراب تھی۔ وہ دفتر نہیں جا رہے تھے۔ دراصل یہ اور یوسفی صاحب حج کر کے ابھی لوٹے ہی تھے۔ برنی صاحب واپس پہنچتے ہی فلو میں پکڑے گئے۔

لہذا یوسفی صاحب کو بات کرنے کا موقع مل گیا؛ حج کرنے کے کتنے دن بعد آپ کو فلو ہوا؟

برنی صاحب زیادہ پختہ ایمان کے آدمی ہیں۔ وہ اس بات پر کڑھتے رہے کہ سعودی عرب والے، تاریخی آثار کو ختم کر رہے ہیں۔ فلاں آثار کو ختم کر دیا، فلاں آثار کو ختم کر دیا۔

میں نے بتایا کہ نقوش کے آیندہ نمبروں میں، میں سیرۃ ابن اسحاق کو تیرہ سو برس کے بعد پہلی بار اردو میں چھاپوں گا۔ وہ اس بات سے اتنے خوش تھے کہ سُنا آپ نے سیرۃ ابنِ اسحاق کا مخطوطہ بھی حاصل کر لیا ہے وُہ بھی چھپ رہا ہے۔

اس کے بعد برنی صاحب کو پاک و ہند کے ادیبوں کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ بیمار ہے، وہ بیمار ہے۔ ان کا علاج ہونا چاہیے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے ایک ادارہ اس غرض سے کراچی میں کھولا ہے، دُوسرا بمبئی میں کہ وُہ جانچے کہ کون کون بیمار ہے، کس کس کو مدد کی ضرورت ہے! بمبئی میں جو ادارہ قائم کیا ہے اس کی سیکرٹری جنرل قُرۃ العین حیدر ہے۔

وہاں سے دو چار اُن دوستوں کو ٹیلیفون کیا، جو کسی وجہ سے ادھر آئے ہُوئے ہیں، اُن میں سے ٹیلیفون پر ایک دو سے ملاقات ہو گئی، ایک دو سے نہ ہُوئی۔ خیر خیریت پُوچھی۔

آج ہم نے پاکستان جانے کے لیے واپسی کی نشستیں ریزرو کرائی ہیں۔ اِن شاءُ اللہ ہفتے کے روز یہاں سے چل دیں گے۔

زبیری صاحب آئے۔ سیر کرانے کی غرض سے لے گئے۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل جا پہنچے۔ دو کافی کے کپ منگوائے۔ دو پونڈ انتیس پنس بِل ادا کیا۔ اس سے پہلے وُہ ہم لوگوں میں بیٹھ کر ایران توران کی باتیں کرتے رہے۔

۲۱ ستمبر (جمعہ)

آج لندن میں ہمارا آخری دن ہے۔ کل صبح ہم واپس اپنے وطن کے لیے پرواز کریں گے۔ اردو مرکز کے جلسے کے لیے افتخار عارف صاحب نے بہت اصرار کیا۔ یوسفی صاحب نے کہا:

اگر آپ کے اعزاز میں جلسہ نہ ہُوا تو یہ ہمارے لیے کلنک کا ٹیکہ ہو گا۔

برنی صاحب نے کہا: چیک اَپ کرا کے جائیے، ایسا موقع روز روز نہیں ملتا۔

زہرہ نگاہ نے کہا: آپ ملے بغیر جا رہے ہیں یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جب تک یہاں ٹکے ہوئے تھے، ٹکے ہُوئے تھے۔ جب جانے کا فیصلہ کر لیا تو اپنے پیاروں سے معذرت کر لی۔

پھر ملنے کا وعدہ کر لیا اگر مجھے ۱۲ ربیع الاوّل کو رسولؐ نمبر کی مزید بقایا جلدیں چھاپنے کی عجلت نہ ہوتی تو ضرور ٹھہر جاتا، اس لیے کہ لندن میں بسنے والے دوستوں سے تو پُورے طور پر ملاقات ہی نہ ہُوئی تھی بلکہ کئی ایک کو

تو بذریعہ کان دیکھا یعنی ٹیلیفون پر آواز ہی سُنی۔

گھر والوں نے جو اَب کے مجھے زبردستی سیر پر، برضرورتِ صحت بھیجا تھا، وُہ بھی اب میری واپسی کے لیے اصرار کر رہے تھے جن کے کہے پر گیا تھا۔ اگر اُن کے کہے پر واپس نہ جاتا تو کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔

مجھے گھر کے چھوٹے بڑے سب یاد آرہے ہیں، بڑوں سے زیادہ چھوٹے۔ کیونکہ اُن کی مجھ سے محبت بے غرض ہے۔ اگر انہیں مجھ سے کوئی غرض ہے بھی تو صرف ایک ٹافی کی، ایک آئس کریم کی، ایک کھلونے کی! مگر ان کے بدلے جو ان کی آنکھوں سے بے پناہ اپنائیت ٹپکتی ہے اس کی قیمت تو کوئی دے ہی نہیں سکتا!

آج رخصتی کی اطلاع کے لیے چند دوستوں کو ٹیلیفون کرنا ہے۔ لندن میں بھی، لندن سے باہر بھی۔ اس کے بعد ننھے بچّوں کے لیے ایک آدھ چیز لے کر جانا ہے۔ وہ رقم ختم ہو چکی ہے جو بہ طور زرِ مبادلہ ملتی ہے۔ کسی سے اُدھار مانگ کر مزید چند دن کاٹنا اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے اب یہ ملک بڑا مہنگا ہو گیا ہے۔ غربت یہاں پر بھی ہے۔ ۲۰ ہزار سے زاید لوگ سردیوں کی راتوں کو بھی بنچوں پر بیٹھے یا کسی سائے کی آڑ میں سوتے ملیں گے۔ خوش پوشاک لوگ بھی آپ کو اسٹیشنوں پر ایک آدھ پاؤنڈ مانگتے ہوئے مل جائیں گے۔ زمین دوز ریلوے لائنوں میں فقیر، بہ شکل میوزیشن کے، گاتے بجاتے ملیں گے۔ اور لوگ انہی کے زمین پر پھیلائے کوٹوں پر سکے پھینکتے ملیں گے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۸۴ء (ہفتہ)

صبح ۶½ بجے جاگ گیا۔ وہ تو اللہ کا شکر کہ رات کو سو گیا تھا ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے۔ جس صبح مجھے سفر کرنا ہوتا میں رات کو سو نہ سکتا تھا۔ دو ماہ کے سفر کے دوران ایسا بہت کم ہُوا کہ رات کو نیند نہ آئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ صبح تازہ دم تھا۔ قدموں میں توانائی آگئی تھی۔ باتوں میں یقین پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ کرنے کا حوصلہ جوان ہو رہا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی تھی، جواب روزانہ ہو رہی تھی۔ موسم خاصا سرد تھا۔ ہوا زوروں پر تھی۔ اس کے باوجود میں نے نہانے کا عزم کیا۔ اپنے جسم کی غلاظتوں کو یہیں چھوڑ کے جانا چاہتا تھا۔ وُہ جو قدم قدم پر نگاہیں گنہ گار ہو رہی تھیں اُن کی دُھلائی بھی ضروری تھی۔

۹½ بجے گھر سے نکلے۔ ہیتھرو کے ہوائی اڈّے پر پہنچنا تھا۔ جو کہ خاصا دُور تھا۔ بس اسٹیشن تک پہنچے۔ جو ہمیں ہوائی اڈے لے گئی۔ جہاز نے سوا بجے اڑنا تھا۔ مگر ہم نے مناسب یہی جانا کہ قبل از وقت پہنچیں۔ پی آئی اے کا عملہ لوگوں سے زاید کرایہ طلب کر رہا تھا۔ کچھ لوگ دے رہے تھے کچھ جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہم دوسری ہوائی سروس سے چلے جائیں گے جو زیادہ سہولتیں دیتی ہے۔ ہم تو قومی سروس سمجھ کے ادھر آگئے تھے ایک من چلے نے کہا اپنے وطن پہنچو گے تو اس وقت دیکھنا کیا دُرگت بنتی ہے!

ہمارا سامان تُلا تو وہ اصل وزن سے بھی کم نکلا، اس لیے کہ اس خفت سے بچنے کے لیے ہم اپنی

ضرورت کی خریدی ہوئی چیزوں کو بھی پھینک کے آگئے تھے۔

جہاز سوئے وطن اڑا تو ہم بے حد مطمئن تھے۔ ۲۲ جولائی کو کراچی سے چلے تھے۔ ۲۲؍ ستمبر کو ارضِ انگلستان کو خیرباد کہہ دیا۔ من موجی تھا جو اہلِ یورپ کو دیکھنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

سفرنامہ

(بچّوں کے لئے)

یہ سفرنامہ میں نے اپنے بچّوں کے لیے لکھا، مگر اسے دوسرے بچے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ میرے بچّوں اور دوسرے بچّوں میں کوئی فرق نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے بچّوں کے لیے مراۃ العروس لکھی تھی، میں نے اپنے بچّوں کے لیے۔ سفرنامہ۔

بچّوں کے اس سفرنامے میں جتنے مقامات اور اشخاص کے نام آئیں گے ان کی وضاحتیں بھی ملیں گی۔

محمد طفیل

۱۳ اگست ۱۹۸۵ء (منگل)

میرے بیٹے پرویز نے کہا، اباجی! پی۔ آئی۔ اے والوں سے ٹکٹ کنفرم کرالیں۔

میں نے کہا، بیٹا! ٹکٹ پر "او، کے" لکھا ہوا ہے اس لیے پریشانی کی کیا بات ہے؟

احتیاطاً میں پی آئی اے کے دفتر چلا گیا۔

جب انہوں نے ٹکٹ دیکھا۔ کمپیوٹر میں اس کے نمبر ڈالے تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ کنفرم نہیں۔ ٹریولنگ ایجنسی نے اپنے پاس سے ٹکٹ پر "او، کے" لکھ دیا تھا۔

چنانچہ میں نے کہا، جب ٹکٹ پر کمپیوٹر نمبر کا حوالہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ کنفرم ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ ٹکٹ پر کمپیوٹر کا حوالہ ویٹنگ لسٹ کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

جب یہ صورتِ حال میرے سامنے آئی تو میں ایک لمحے کے لیے گھبرایا۔ کیونکہ جدہ ایئرپورٹ پر کئی دوست پہنچنے والے تھے، خود حکومت کے کارندے بھی وہاں ہوتے، اس لیے کہ وزارتِ حج کے سیکرٹری صاحب نے وزارتِ حج کے دفتر، جدہ کو بذریعہ ٹیلکس مطلع کیا ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے متعلقہ صاحب سے کہا، یہ غلطی ہماری نہیں، ٹریولنگ ایجنسی کی ہے۔ اس لیے میں تو جاؤں گا۔ آپ مجھے اپنے سے بڑے افسر کا نام بتائیں!

متعلقہ افسر نے کہا، اس کا نام بعد میں بتاؤں گا، پہلے میں تو کوشش کروں۔ کیونکہ میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ میرا نام محمد صدیق پروانہ ہے، میں ایک دفعہ آپ کے دفتر بھی جا چکا ہوں۔

قدرے تسلی ہوئی۔ مگر پسینے پھر بھی چھوٹے ہوئے تھے۔ ۱۴ اگست کو پروانہ صاحب نے بتایا آپ کے جانے کا تو بندوبست ہو گیا اب واپسی کا مسئلہ رہ گیا، اس کے لیے بھی کوشش کر رہا ہوں۔ ۱۵ اگست کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ واپسی کی سیٹ بھی کنفرم ہو گئی ہے۔

اس دوران کئی لمحات ایسے آئے کہ جو قطعاً مایوسی کے تھے۔ مگر خدا کو مسبب الاسباب یونہی تو نہیں کہا جاتا اس نے یہ بندوبست بھی کر دیا۔ کیونکہ حاضری بھی تو مسبب الاسباب کے ہاں تھی۔

۱۴ اگست (بدھ)

یہ دن میری سالگرہ کا دن ہے۔ اس دن اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ ہرچند کہ توپوں کی سلامی، یوم آزادی کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ مگر میں اسے اپنے ہی کھاتے میں ڈالتا ہوں۔ اس لیے کہ ہم نے آزادی کی قدر نہیں کی۔

مجھے میری پوتی عصمت نے سوتے سے جگایا: ڈیڈی! (بچے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں) آپکا اسلام آباد سے ٹیلیفون آیا ہے۔

میں نے ٹیلیفون سُنا، مجھے بتایا گیا کہ ثاقبہ رحیم الدین آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ آواز ان کے اے ڈی سی کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ثاقبہ کی آواز سنائی دی: میں نے آپ کو مبارک باد دینے کے لیے ٹیلیفون کیا ہے۔

میں نے پُوچھا: کس بات کی مبارک باد؟

حکومت نے آپ کی علمی وادبی خدمات کے صلے میں آپ کو ستارۂ امتیاز دیا ہے!

آپ کو کس نے بتایا؟

آج کے سارے اخباروں میں چھپا ہے۔

میں نے کہا: اتنی تاخیر سے نوازنے کی کیا ضرورت تھی؟ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار گورنر پنجاب نے بھی کیا۔

بیگم صاحبہ کا ٹیلیفون بند ہُوا تو میں اخبار کی طرف لپکا۔ ابھی خبر کو ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ گھنٹی کی آواز سنائی دی میں دروازہ کھولنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ عبدالعزیز خالد اور غلام رسول ازہر کھڑے ہیں:

آپ کو مبارک ہو! آپ کو مبارک ہو!

میں نے جواب میں کہا: خیر مبارک۔ مگر ابھی تک میں نے اخبار نہیں پڑھا۔

اخبار میں بھی چھپا، صبح کی خبروں میں ریڈیو پر بھی آیا۔ مگر آپ کو ابھی تک کچھ علم نہیں۔ بے نیازی کی حد ہو گئی۔

اس کے بعد سارا دن مبارک باد کے ٹیلیفون آتے رہے۔ دوستوں نے قدم رنجہ بھی فرمایا۔ مثلاً میں ممنون ہوا، شکرگزار ہُوا۔

چونکہ یہ دن میری سالگرہ کا تھا، اس لیے بچوں نے اصرار کر کے کیک منگوایا۔ جج پر جانے کی وجہ سے رشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ گھر میں خاصی رونق تھی۔ چنانچہ اس رونق میں، مَیں نے چپکے سے کیک کاٹ دیا۔ چنانچہ پاس کھڑے بچوں نے تو "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کہا۔ باقی لوگوں کو اُس آواز سے علم ہُوا کہ سالگرہ کا کیک تو

کٹ گیا۔ چنانچہ تالیوں کی گونج کیک کٹنے کے بعد سنائی دی۔ سالگرہ تو بچّوں کی ہوتی ہے، بڑوں کی سالگرہ نہیں جچتی!

۱۵ اگست (جمعرات)

گھر میں، دفتر میں عزیزوں اور دوستوں کا آنا جانا تھا کہ سیٹ کا بھی گھپلا چل رہا تھا کہ مجھے ٹیلیفون پر بتایا گیا کہ میرے ایک مہربان نثار حسین کا انتقال ہو گیا۔ چند دن پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ صحت مند تھے۔ اچانک ہارٹ فیل ہو گیا اور چل بسے۔ میں نے اپنے مسائل کو بیچ میں چھوڑا، ان کے گھر پہنچ گیا۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لیے واپس آنا پڑا۔ ملال رہے گا کہ کندھا نہ دے سکا۔

بجائے اس کے کہ ہم اپنے عزیزوں کے گھر گھر جاتے اور انھیں ملتے میری بیگم نے سب کے کھانے کی دعوت کر دی۔ گھر رشتہ داروں سے بھر گیا۔ میرے ماموں جو خاصے بیمار تھے (اور میں انھیں تین چار دن پہلے مل آیا تھا) وہ بھی تشریف لے آئے۔ اتنی تکلیف میں ان کا آنا، ان کی حد درجہ محبت کا غماز تھا۔

مجھے میری سالی نے کہا: وہاں جا کر دُعا مانگئے گا کہ میری آپ سے صلح ہو جائے۔ مگر میں نے مذاق میں کہا: یہ دُعا نہ مانگوں گا، کوئی اور بات کہو۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نے بھی "تحریکِ آزادی میں ادیبوں کا حصّہ" کے عنوان سے ایک مذاکرہ کر رکھا تھا۔ صدارت مجید نظامی نے کرنا تھی اور مہمانِ خصوصی شمیم حسین قادری تھے۔ مقررین میں میرزا ادیب، میرزا منوّر، ڈاکٹر یُوسف گورایا اور پروفیسر محمد عثمان تھے۔ اطلاع ملی کہ قادری صاحب اسلام آباد رک گئے ہیں اس لیے وُہ تشریف نہ لا سکیں گے۔ ان کی جگہ ہم نے جسٹس عطاء اللہ سجاد کو مہمانِ خصوصی بنا دیا۔ جلسہ خاصا کامیاب رہا۔ بہت سی کام کی باتیں ہُوئیں۔ اس سے آٹھ دن پہلے ادارۂ نقوش نے بھی نقوش کے سالنامے پر جلسہ کیا تھا۔ وفاقی وزیرِ تعلیم محمد یٰسین وٹو تشریف لاتے تھے۔ نقوش ایوارڈ کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ تھوڑے سے وقفے سے یہ دو اجلاس ہُوئے تھے مگر خاصے کامیاب رہے!

پروانہ صاحب نے اطلاع دے دی کہ واپسی کی بھی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔

۱۶ اگست (جمعہ)

اس دن ہمارا جہاز صبح ۶-۱۵ پر لاہور سے چلنا تھا۔ دو گھنٹے پہلے ہوائی اڈّے پر پہنچنا تھا۔ کئی رشتہ دار الوداع کہنے کے لیے رات ہی کو ہمارے ہاں ٹِک گئے۔ کچھ اپنے گھروں سے بھی آ گئے۔ ادھر مؤذن صبح کی اذان دے [illegible]

مبادا آنکھ لگ جائے اور جہاز اُڑ جائے!

وقت پہ ہوائی اڈہ پر پہنچے، کسٹم ہُوا۔ سیکورٹی والوں نے تلاشی لی۔ یہ طے ہو گیا کہ ہم دیارِ محبوب جا سکتے ہیں۔ یقین کیجئے اس سوچ نے بھی بڑی طمانیت بخشی۔ تھوڑی دیر بعد بیگم حمید نظامی اور نثار عزیز آ گئیں۔ وہ بھی حج پر جا رہی تھیں مزید ڈھارس بندھی۔ ایسے لمحات میں جان پہچان کے لوگوں کا مل جانا کچھ اہم بات نہیں ہوتی۔ خواہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں، کریں کچھ بھی نہیں!

جہاز وقت پر چلا۔ وقت پہ جدہ پہنچا۔ مگر جو گت ایئرپورٹ پر بنی وُہ بھولنے والی نہیں۔ ایک جگہ بٹھا دیے گئے ایک گھنٹہ گزرا، دو گھنٹے گزرے، حتّٰی کہ پانچ گھنٹے گزر گئے۔ کوئی پُوچھنے والا نہ تھا۔ بھوک کے مارے سب کا بُرا حال تھا۔ بڑے تو بڑے تھے چھوٹے بچّے زیادہ بے حال تھے۔

کسٹم پر ایک ایک چیز کو اُتھل پُتھل کر دیکھا گیا۔ یہ مرحلہ بھی خاصا پریشان کُن تھا، میرے لیے اس لیے اس سے بھی سوا کہ جس سے سُوٹ کیس کے تالے تک نہ کھُلتے ہوں۔

ہمیں یہ ڈر تھا کہ جن احباب کو ہم نے ہوائی اڈے پر پہنچنے کی تاکید کر رکھی تھی وُہ کیونکر اتنی دیر ٹھہر سکتے ہوں گے مگر اللہ کا شکر کہ باہر نکلتے ہی ہمیں عبدالرشید مل گئے۔ جو مجھے بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہیں۔ ان کے ساتھ سید حسن جعفری کے بیٹے اور داماد سے ملاقات ہُوئی۔ اس کے بعد وزارتِ حج کے انچارج ایئرپورٹ سے ملاقات ہوئی۔ پاسپورٹ ہمارے سعودی حکومت نے رکھ لیے تھے کہ داخلہ کے ۴۲۵ ریال فی کس جمع کرائیے اور اپنے پاسپورٹ لے لیجئے۔ یہ مرحلہ بھی تکلیف دہ تھا مگر وزارت کے لوگوں نے آسان کر دیا۔

اس کے بعد ہم سید عباس حسین جعفری کے گھر چلے گئے۔ لذیذ کھانا کھایا لذیذ نیند آئی کیونکہ ہم خاصے جاگے ہوئے تھے نڈھال تھے۔

۱۷ اگست (ہفتہ)

میرے ساتھ والے کمرے (نمبر ۲) بریگیڈیئر اعجاز مع اپنی بیگم کے آ کے ٹھہرے ہیں۔ آج لفٹ میں ان کی بیگم سے ملاقات ہُوئی تو انہوں نے بتایا کہ اعجاز صاحب کو بخار ہے اگر آرام نہ آیا تو وہ ہمارے ساتھ بیت اللہ شریف چلیں گی۔

مگر اللہ کا شکر کہ انہیں آرام آ گیا اور وہ ہمارے ساتھ بیت المکرم کی جانب چلے۔ معلوم ہُوا کہ اعجاز صاحب لندن میں فرسٹ سیکرٹری ہیں۔ تین سال گزار چکے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ مالی سہولتوں کے باوجود اپنے وطن میں تعینات ہوں۔ وطن کی محبت مادی سہاروں پر بھی غالب آ جاتی ہے۔

اعجاز صاحب وجیہ ہیں، لمبا قد، ناک نقشے سے مجھے جنرل سوار خاں کے بیٹے معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ میں کم بولنے وا

آدمی ہوں، اس لیے سوالوں کا جواب تو دیا کرتا ہوں، خود اپنی طرف سے کوئی سوال نہیں کیا کرتا۔ لہٰذا بقایا حدود اربعہ معلوم نہ ہُوا۔

اعجاز صاحب کی بیگم بڑی عبادت گزار ہیں۔ وُہ زیادہ سے زیادہ وقت حرم شریف میں گزارنا چاہتی ہیں۔ اعجاز صاحب کا بھی یہی عالم ہے۔ مگر ڈگری کا فرق ہے۔ نوجوان ہیں۔ اس لیے نوجوانوں میں جب اس قسم کی خُو بُو دیکھتا ہُوں تو دل خوش ہوتا ہے۔

آج ہم نے مغرب اور عشاء کی نماز حرم شریف میں پڑھنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان دنوں اتنی رونق ہے کہ راستہ ملنا دشوار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ساری خلقت ادھر آگئی ہو۔ اگر اس خلقت کے علاوہ اور خلقت بھی ہے تو اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

اسی خلقت میں جو مسلسل بڑھ رہی تھی اس میں بریگیڈیر صاحب نے طواف کرنے کا عزم باندھا۔ اگر عشاء کی نماز کے بعد، تھوڑا سا انتظار کر کے طواف کرتے تو خاصی خلقت نماز پڑھ کے جا چکی ہوتی۔ مگر بریگیڈیر صاحب کے جوان خون نے جوش مارا اور ہم خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہجوم میں داخل ہو گئے۔ اگر یہاں ایک دوسرے کی انگلی پکڑ کے نہ چلیں تو سب کے سب ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں۔ بریگیڈیر صاحب آگے تھے ان کی بیگم نے ان کی انگلی تھام لی۔ میری بیگم نے بریگیڈیر صاحب کی اہلیہ کی اور میں نے اپنی اہلیہ کی۔ یُوں ہم بھیڑ میں "پیسے" گئے۔ کہیں کہیں تو ایسے پیسے گئے جیسے بیلنے میں گنّا! مگر اللہ کی قدرت کہ طواف مکمل ہو گیا۔ مگر ہم اس خواہش کے ساتھ اس ہجوم میں داخل ہُوئے تھے کہ زندہ نہ بھی بچے تو نقصان کی بجائے فائدہ ہوگا۔ جان ایک اہم مقصد میں کام آئے گی۔

۱۸ اگست (اتوار)

میں نے اور میری اہلیہ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہر روز طواف کریں گے۔ چنانچہ ہم نے محسوس کیا کہ یا تو عصر کی نماز کے بعد ہجوم کم ہوتا ہے یا عشا کی نماز کے بعد۔ ویسے تو لاکھوں کی تعداد میں جاں نثارانِ توحید ہر وقت اور ہر لمحہ موجود ہوتے ہیں۔

اس ہجوم میں میں نے دیکھا کہ مولانا عبدالمالک کاندھلوی بھی، طواف کر رہے ہیں، ان کو دیکھ کر بڑی ہمت بندھی۔ میں انہیں سلام کرنا چاہتا تھا مگر اس ہجوم میں کون کسی کو دیکھے۔ وُہ بھی کعبہ کے گرد چکر لگا رہے تھے اور ہم بھی، وہ بھی بارگاہِ خداوندی میں حاضر تھے اور ہم بھی، درجوں کا حال تو خدا جانتا ہے۔

اسی دوران مجھے ایک صاحب نے سلام کیا۔ معلوم ہُوا کہ اخلاق صاحب کے سسرالی رشتہ دار چودھری نصیر صاحب ہیں۔ میں تو انہیں نہ پہچان سکتا مگر انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں تو انہیں اس لیے نہ پہچان سکتا کیونکہ وہاں جو بھی حاضر تھے وہ سب میرے رشتہ دار تھے۔ وہ سب میرے اپنے تھے۔

یہاں پاکستان ہاؤس میں کھانا اور ناشتا ہر روز ایک ہی طرح کا ملتا ہے۔ صبح انڈے توس، دوپہر کو مُرغ اور روٹی۔ اس لیے ہم نے کچن کے انچارج کو بتا دیا کہ شام کا کھانا یہاں نہ کھایا کریں گے۔ چنانچہ ہم بازار سے اپنی مرضی کی چیزیں لاتے اور کھاتے۔ میری اہلیہ "رَولا" ڈالتی کہ اتنا خرچ نہ کرو۔ میں جواب میں کہتا: ہم یہاں اللہ کی مرضی سے آئے ہیں، جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ کر رہے ہیں یہ توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے، ہم اسراف تو نہیں کر رہے مگر ہم دُودھ دہی کھانے کے عادی ہیں۔ یا میرا ایپل جوس پینے کا مشغلہ ہے۔ اس لیے کھانے کے ساتھ انھی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں، فضول خرچی تو نہیں کرتے۔

آج اہلیہ نے کہا: پلاؤ کھانے کو دل چاہتا ہے۔

میں نے کہا: دل کو قابو میں رکھو، اب مجھے کیا معلوم کہ پلاؤ کہاں ملے گا!

کہنے لگیں: واہ، آج صبح بازار جاتے ہُوئے ایک دُکان پر لکھا نہ دیکھا کہ ناشتا میں حلوہ پُوری ملے گی۔ دوپہر کو پلاؤ وغیرہ۔

چنانچہ میں نے بازار کا رُخ کیا۔ میں نے سوچا، ہم زندگی میں بیگمات کی بے شمار خواہشوں کو اپنی شوہرانہ شان میں پُورا نہیں کرتے۔ لہٰذا اس فرمائش کو رد نہیں کرنا چاہیے۔

سارے دن کے تھکے تھکائے ہوئے ہیں۔ رات نیند ایسی غضب کی آتی ہے کہ آہٹ بھی ہماری نیندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

۱۹ اگست (پیر)

مجھے لاہور میں سید حسن جعفری نے ٹیلی فون کر کے بتایا تھا کہ لندن سے ارشد میر صاحب کا ٹیلیفون آیا ہے کہ طفیل صاحب کو بتا دیا جائے کہ میں لندن سے فلاں فلائٹ کے ذریعے جدّہ پہنچ رہا ہُوں۔ چنانچہ میں نے یہ اطلاع جعفری صاحب کے داماد کو دے دی تھی۔ کیونکہ مجھے ۱۱ اگست کو مکّہ پہنچنا تھا۔ ابھی تک میر صاحب کی کوئی خیر خبریت معلوم نہیں ہُوئی، آتے ہوں گے یا آ چکے ہوں گے۔

میں نے بارہا سُنا کہ ہر سال ہجوم میں متعدد افراد کچلے جاتے ہیں، مگر خدا کی قدرت کہ عین اس ہجوم میں کہ جو طواف کر رہا تھا، ایک بلّی کا بچہ بھی موجود تھا، جو راہ کی تلاش میں تھا اور زندہ تھا، شاید ابُوہریرہؓ کی بلّیوں کے خاندان میں سے ہو جو اپنے عشق کا امتحان دے رہا ہو!

میں جب بیرونِ پاکستان جاتا ہُوں تو میرا قاعدہ ہے کہ میں گھر کے تمام افراد کو خط لکھتا ہُوں، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، یہی وجہ ہے کہ چھ پوتے پوتیوں، چار بیٹوں اور تین بہوؤں کو خطوط لکھے۔ خدا کرے کہ وہ پہنچ جائیں۔ بڑے تو درگزر کر لیں گے مگر چھوٹے بہت تنگ کریں گے۔

آج ہمیں مغرب کی نماز کے وقت حاجی معراج دین کی بیٹی ملیں۔ انہوں نے میری اہلیہ کو پہچان لیا۔ میری اہلیہ اس معاملے میں خاصی کوری ہیں کیونکہ بعض اوقات وُہ مجھے بھی نہیں پہچانتیں۔ انھوں نے گھر آنے کی دعوت دی۔ مگر اہلیہ نے کہا: ہم نہ پہنچ پائیں گے۔ کیونکہ ہم راستوں سے ناواقف ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان ہاؤس کے سامنے سے ایک سرنگ نکلتی ہے جو سیدھی صفا و مروہ کی جانب جا نکلتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں حرم شریف جانے میں قطعاً دقت نہیں ہوتی۔ راستہ بھی آٹھ سے دس منٹ کا ہے۔ بیچ میں صرف سرنگ ہے۔

میں سعودی حکومت کو خراج ادا کیے بغیر نہ رہ سکوں گا کہ انہوں نے زائرین کی سہولتوں کے لیے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ جا بجا سُرنگیں بنا دی ہیں۔ مسافتیں کم ہو گئیں۔ سواری کے لیے بسیں اور ٹیکسیاں، بجلی اور پانی کے خاطر خواہ انتظام کے ساتھ، کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی، پھر خانۂ خدا اور مسجد نبویؐ میں لاکھوں افراد کا ایک منظم انتظام، بے شک بظاہر یہ کرشمہ سعودی گورنمنٹ کا لگتا ہے۔ مگر پسِ پردہ کوئی اور طاقت بھی ممد و معاون ہے۔

۲۰ اگست (منگل)

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کعبہ شریف میں کھڑے ہو کر چاند کو دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ آسمان میں سفید چاند چمک رہا تھا۔ غالباً مجھے سیاہ آسمان اس لیے دکھائی دیتا ہو گا کہ حرم شریف میں روشنیوں کا نُور پھیلا ہوا تھا۔

حرم شریف دو منزلہ ہے۔ نیچے کی منزل میں سفید اور شنگرفی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ تمام محرابیں شنگرفی رنگ کی معلوم ہوتی ہیں۔ اُوپر کی منزل کے پتھر اودے رنگ کے لگے ہیں۔ نیچے والی منزل اور اوپر والی منزل کو بیک وقت دیکھتے ہیں تو وہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ یعنی اودے اور شنگرفی رنگ کی محرابوں میں عجیب دل کشی!

روشنیوں کا بھی ایسا انتظام کہ سُوئی گر جائے تو وہ بھی نظر آ جائے۔ یہ روشنیاں کسی دنیاوی اہتمام کا منظر پیش نہیں کرتیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نُور کو بکھیر دیا گیا ہو۔ بڑی فراخدلی سے بکھیر دیا گیا ہو۔ یہ اللہ کا گھر ہے، اللہ جتنا چاہے نُور بکھیرے!

زمزمؑ سے ہزاروں سال سے پانی نکل رہا ہے۔ ساری دنیا پی رہی ہے اور وہ ختم نہیں ہو رہا۔

مکّہ سے نکلیے۔ سیدھی سڑک مدینے کو جاتی ہے۔ بریک تک لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی!

مکّہ سے مدینہ جاتے ہوئے لق و دق صحرا ہے ——— راستے میں ایک آدھ ٹھکانا چائے پانی پینے کا ہے۔ مگر بجلی وہاں بھی پہنچی ہُوئی ہے۔

حُقّہ، بڑے منقش حُقّے، زیادہ تر عرب خواتین پیتی ہیں۔ جب آدمی کام سے باہر چلے جاتے ہیں تو عورتیں یا تو اپنی آرائش میں لگ جاتی ہیں یا پھر فالتو وقت گزارنے کے لیے حُقّہ کشی!

آج اخلاق صاحب کے رشتہ دار، حاجی معراج دین ٹھیکیدار آنکلے۔ حاجی صاحب کی سالی کا پاسپورٹ گُم ہو گیا تھا اور وہ ڈائریکٹر حج سے نیا پاسپورٹ بنوانے کی خاطر پہنچے تھے۔ چونکہ انہیں میرے یہاں کے قیام کا علم تھا۔ اس لیے وہ پہلے میرے کمرے میں آئے۔ ڈائرکٹر حج شاہد عزیز نے یہ قصہ سُنا تو وہ بھی میرے کمرے میں آگئے۔ وہیں دیوار کے ساتھ درخواست کو لگا کر حکم لکھ دیا کہ نیا پاسپورٹ بنا دیا جائے۔

عبدالرشید جو میرے بیٹے جاوید کا کلاس فیلو ہے۔ وہ اکثر آنکلتا ہے۔ روپے پیسوں کی بھی پیش کش کرتا ہے، ضرورت کی چیزیں بھی لا دیتا ہے اور بلا ضرورت کی چیزیں بھی لاتا رہتا ہے تاکہ ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پہلا طواف بھی ہم نے اسی کے ساتھ کیا تھا۔ بے شک عبدالرشید کا ماں باپ اور ہے مگر ہمارے نزدیک بھی اس کا درجہ بیٹے ہی کا ہے۔

میں یہاں ہومیوپیتھک کی دوائیں لایا ہوا ہوں۔ کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے تو میرا ڈاکٹری پن کام آجاتا ہے۔

مجھے اور میری اہلیہ کو ایک دو عارضے خاصے پریشان کن ہیں۔ مگر ہم اللہ کے بھروسے اور ادویات کی موجودگی میں خاصے مطمئن ہیں!

۲۱ اگست (بدھ)

آج ہم آٹھ بجے سے تیار بیٹھے ہیں کیونکہ ہمارے رشتہ داروں نے ہماری دعوت کر رکھی ہے۔ نو ساڑھے نو بجے کا وقت طے تھا۔ اس وقت دس بج چکے ہیں مگر وہ ہمیں لینے کے لیے نہیں آئے۔ کیونکہ حاجی صاحب کی بہو کی طبیعت خراب تھی۔ خدا خیر کرے! اصل میں ان کی بہو کو جسمانی عارضے کم ہیں اور ذہنی زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہ دو سال کے بچے کو پاکستان چھوڑ کر آئی ہیں۔ اس لیے ہر وقت اسی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اولاد بھی کیا چیز ہے! خانۂ خدا میں بھی اسی کی فکر، ساری دُعائیں بھی انہی کے لیے، جینا مرنا بھی انہی کے لیے!

پاکستان ہاؤس کا عملہ بڑا اچھا ہے۔ شبیر حسین صاحب جو یہاں کے انچارج ہیں، وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہر کمرے میں جاتے ہیں، کوئی خدمت؛ کا وِرد کرتے ہیں۔ تب انہیں اطمینان ہوتا ہے۔ کھانے کا بھی اچھا انتظام ہے، جو بارہ ریال میں ملتا ہے۔ ناشتا، چائے پانچ ریال میں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے کا کرایہ دو ہزار ریال ہے۔ مطلب یہ کہ بے شک خرچ تو یہاں بھی اپنا ہے۔ مگر آرام بہت ہے۔ یہ کفایت بھی ہے۔ ساتھ ہی ہمارا ہسپتال ہے جو پاکستانیوں کے علاج معالجے میں مدد دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ والے کمرے کے بریگیڈیر صاحب بیمار ہوئے تھے تو اسی ہسپتال سے دوائی لی تھی، شفا ہوئی تھی۔ شفا تو یہاں سب کو ہوتی ہے۔ چاہے کوئی پاکستانی ہسپتال سے دوائی لے یا نہ لے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کا

جملہ عملہ پاکستانیوں کی ہر پریشانی کا مداوا ڈھونڈنے میں مستعد ہے۔

ایئرپورٹ پر منیر احمد صاحب ہیں۔ وُہ بھاگ دوڑ میں کمی واقع نہیں ہونے دیتے۔ ڈائرکٹر جنرل کرنل محسن کے سیکرٹری چشتی صاحب ہیں۔ وہ بھی ٹیلیفون پر شریف آدمی لگے۔ ڈائرکٹر شاہد عزیز سے پہلے کی سلام دعا ہے۔ وہ بھی عرصے سے اچھے لگ رہے ہیں۔ میرے نزدیک دُوسرے تو سب اچھے ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے کبھی اپنی ذات کے بارے میں نہیں سوچا!

اب دن بہ دن حج کرنے والوں کا ہجوم بڑھ رہا ہے۔ آج جب ہم بیت اللہ شریف پہنچے تو نماز کے لیے جگہ ڈھونڈنی مشکل ہو گئی۔ میں حیران کھڑا تھا کہ ایک شخص نے میرے لیے جگہ بنانی چاہی مگر بات نہ بنی۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ڈٹا ہُوا تھا بالآخر اس نے اپنی جگہ خالی کر دی اور خود پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ سُنتیں پڑھو۔

بعد نماز میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ عربی بولتا تھا جو میری بات پُوری طرح نہ سمجھ سکا۔ اس نے جو کہا اور جو میں سمجھا وہ یہ تھا:

یہ خدا کا گھر ہے، جو سب کا ہے۔ اور میں عراق کا باشندہ ہُوں۔

پھر اس نے مجھ سے پُوچھا:

آپ کہاں سے آئے ہیں؟

میں نے کہا: پاکستان سے۔

اس نے جواب میں کہا: بھائی بھائی!

ہم صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے سے دُنیا کے ہر مسلمان کے بھائی بن جاتے ہیں۔ یہ اخوت و محبت کا پیغام ہے، جو اجنبیوں کو بھی اپنا بنا دیتا ہے۔ پھر یہ حج کا فلسفہ بھی اپنے اندر بڑی حکمتیں رکھتا ہے۔ کاش اس سے ہم خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے!

وہ حج ہی کا موقع تھا کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیا تھا، جو دنیا کا پہلا دستوری نظام تھا۔ پھر ملتِ اسلامیہ کے لیے جو جو اس میں ہدایتیں اور لائحہ عمل موجود ہے، وہ دنیوی اور ابدی۔

۲۲ اگست (جمعرات)

آج رسولِ کریمؐ کی جائے پیدائش دیکھی کہ جہاں آج کل لائبریری ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا چھپر تھا، جہاں ایک عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔

ساتھ ہی وہ محلہ دیکھا جہاں خاندانِ قریش رہتا تھا۔ حضرت علیؓ کا مکان بھی اسی محلے میں تھا۔

اور یہ محلہ لائبریری کے ساتھ ہی ہے۔ اس محلّے میں بھی عظیم الشان عمارتیں بن چکی ہیں۔

مکہ میں مسجدِ جن بھی دیکھی جہاں کہ حضورؐ پر قرآن کی سورۃ الجن نازل ہوتی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں، اس مسجد میں حضورؐ نے جنّات کو مخاطب کیا تھا اور راہِ ہدایت دکھائی تھی۔

پاس ہی پہاڑی کے اوپر حضرت بلال حبشی کی مسجد بھی دیکھی۔ بلال حبشی تھا۔ مگر اس کے درجات کتنے بلند تھے! لوگ بلال کی آواز سننے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔

میں آج پاکستان ہاؤس کے ساتھ ذرا فاصلے پر، ایک گلی میں جا نکلا۔ وہاں انڈونیشیا کے باشندوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ گلی میں انڈونیشیا کی عورتیں، فٹ پاتھ پر چھوٹی چھوٹی دکانیں سجائے بیٹھی تھیں۔ وہ حج کے ارادے سے بھی آئی ہیں۔ اور اپنی کمزور مالی حالت کو تھوڑا سا مستحکم کرنے کے لیے یہ کاروبار بھی کر رہی ہیں۔ تجارت حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا بھی ایک پہلو ہے۔

یہاں بازار کی دُکانوں میں دُنیا جہان کا مال بھرا ہُوا ہے۔ عورتیں اور مرد ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ خریدنے والا بھی خوش ہے، بیچنے والا بھی خوش ہے۔

آج میں نے چھ تصویریں خریدی ہیں۔ فی تصویر ایک ریال۔ اس میں خانہ کعبہ کی تصویر ہے۔ روضۂ رسولؐ کی تین تصویریں ہیں۔ صفا مروہ کی تصویر ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کی تصویر ہے۔

اس علاقے میں جہاں کہ ہم ٹھہرے ہیں پاکستانی کثیر تعداد میں ٹھہرتے ہیں۔ خاصے دُکان دار بھی اپنے علاقوں کے ہیں جو اردو پنجابی جانتے ہیں۔ مگر ان کی چیزوں کے دام زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود دکانوں پر خریداروں کا جمگھٹا ہے۔ سال کے سال حج کے موقع پر کروڑوں روپوں کا سامان خریدا اور بیچا جاتا ہوگا۔ بیچنے والا بھی خوش، خریدنے والا بھی خوش!

۲۳ اگست (جمعہ)

آج وزارتِ مذہبی امور کے وزیر جناب مقبول احمد نے میرے کمرے پر دستک دی۔ خیر خیریت پُوچھی۔ کسی خدمت کا پوچھا۔ ان کے ساتھ وزیر افرادی قوت حاجی محمد طیب بھی تھے۔ انہوں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ذکریا کامران صاحب (جو غالباً وزارتِ حج کے مشیر ہیں) تشریف لائے۔ وہ ڈھونڈ تو کسی اور کو رہے تھے مگر ملاقات مجھ سے ہو گئی۔

آج جمعۃ المبارک ہے۔ میری بیگم زور شور سے نماز کی تیاری کر رہی ہیں۔ کل رات ان کا پاؤں رپٹ گیا تھا۔ ٹخنے میں چوٹ آئی۔ ورم ہو گیا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ آیوڈکس لگائی گئی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح آج رات ہی چوٹ کو آرام آ جائے۔ کیونکہ کل صبح مناسکِ حج کے لیے منیٰ اور عرفات کی طرف نکلنا ہے۔

نمازِ جمعہ ۱۲½ بجے ہونا تھی۔ ہم لوگ ۱۱½ بجے گھر سے نکلے۔ مگر بھیڑ کے باعث خانہ کعبہ تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے اس سرنگ میں مصلے بچھا دئے جو کہ پاکستان ہاؤس سے صفا مروہ کی جانب نکلتی ہے۔ جو لوگ خانہ کعبہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے وہ بتاتے ہیں کہ زندگی ہی تھی جو بچ گئے، پسم پس ہو گئے!

جب ہم سرنگ میں نماز کی نیت سے بیٹھے تھے تو ایک کبوتر سرنگ میں آ نکلا، وہ اڑا اور لپکا جا رہا تھا، جیسے اسے راستہ نہ ملنے کا احساس ہو۔ بعض لوگ عجیب منچلے ہوتے ہیں، سرنگ میں نمازیوں نے جو راستہ چھوڑا ہوا تھا کہ لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو، اُس راستے میں ایک موٹر سائیکل سوار پھٹ پھٹ کرتا چلا آ رہا ہے۔ لوگوں نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مگر وہ شخص کتنا عجیب تھا!

کل میں نے ایک دُکاندار سے دس ریال کا سودا خریدا۔ مگر اُسے پانچسو ریال کا نوٹ دیا۔ وہ بقایا دینے کے لیے نوٹ گننے لگ گیا، میں اور چیزیں دیکھنے لگ گیا۔ پھر بقایا رقم لیے بغیر باہر نکل آیا۔ آج جو پونجی دیکھی اس میں خاصی رقم کم نکلی۔ کل کا سماں اور واقعہ یاد آ گیا۔ میں اس دکان دار کے پاس گیا اس نے انکار کر دیا کہ کل کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ ناچار خاموش واپس آ گیا۔ مفلسی میں آٹا گیلا ہو گیا۔ مکہ کے لوگ بڑے سنگدل ہیں۔ ایسا واقعہ مدینہ میں ہُوا ہوتا تو اس میں خاصے امکانات رقم کی واپسی کے ہوتے۔

کل ہم نے منیٰ، مزدلفہ اور عرفات وغیرہ کے لیے جانا ہے۔ مگر پاکستان ہاؤس کا عملہ غائب ہے اور ہم پریشان ہیں۔ ہم بھی شکایت کر رہے ہیں، دُوسرے بھی شاکی ہیں۔ خدا خیر کرے!

۲۴ اگست (ہفتہ)

میرے کمرے میں اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جب مؤذن نے صبح ۴ بجے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہا تو میں نیند سے بیدار ہوا۔ میری اہلیہ نے کہا:

کھڑکی سے باہر کا سماں تو دیکھو۔

میں نے کھڑکی سے جھانکا تو تاحدِ نگاہ لوگ احرام باندھے ہُوئے ملے۔ وہ منظر بڑا رُوح پرور تھا۔ کچھ لوگ بھاگے جا رہے ہیں، کچھ آہستہ آہستہ چل رہے ہیں، کچھ بسوں کے انتظار میں ہیں۔ ہم جس سرنگ سے خانہ کعبہ جاتے تھے اس کے بالمقابل جو سرنگ ہے وہ منیٰ کو جاتی ہے۔ لوگ پیدل ہی منیٰ کی طرف رواں دواں ہیں۔ مگر ہم سواری کے منتظر ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ بس گیارہ بجے پہنچے گی۔ حالانکہ وہاں پہنچ کر ظہر کی نماز پڑھنا ضروری ہے جس کے لیے وقت کم رہ جائے گا۔ یہاں کا ہر حاجی پریشان ہے۔ مگر منتظمین مطمئن ہیں۔ شاید ہمارا پریشان ہونا ضروری ہو اور اُن کا مطمئن ہونا!

بالآخر بس منیٰ کی جانب چلی۔ پیدل لوگ بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پیدل راستہ سایہ دار تھا۔ اُوپر

پکی چھت بنا دی گئی تھی، کافی دُور تک۔ جب منیٰ قریب آگیا تو ہر طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے۔ پہاڑوں پر بھی خیمے، زمین پر بھی خیمے، نزدیک بھی خیمے، دُور بھی خیمے! وہ اپنی نوعیت کا ایک الگ سا منظر تھا۔

جب دن کے بارہ ایک بجے تو گرمی ناقابلِ برداشت معلوم ہُوئی۔ بہرحال وہ تو فرائض کے معاملات تھے۔ تین راتیں تین دن اسی طرح کاٹنے تھے۔ ہر چند کہ ہمارے خیمے میں واٹر کُولر بھی تھا اور پنکھا بھی۔ مگر گرمی اُن دونوں سہولتوں کو پامال کرتی ہوئی اپنا رنگ جما رہی تھی۔

ہمارے خیمے میں کُل چار افراد تھے۔ میں اور میری اہلیہ، اور بریگیڈیر اعجاز احمد اور ان کی اہلیہ۔ بریگیڈیر صاحب نے سوچا، ماحول کی تمازت کو اپنی ٹھنڈی میٹھی باتوں سے خوشگوار بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کئی دلچسپ واقعات سنائے۔ انہوں نے ہمیں صرف ایسے ہی واقعات سنائے جو سنائے جا سکتے تھے حالانکہ ان کی تعیناتی کئی اہم جگہوں پر رہی۔ وُہ کچھ نادر واقعات سے بھی ہمیں نواز سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا مناسب نہ سمجھا۔ جب ہم نے دورانِ گفتگو کوئی آزمائشی سوال کر دیا تو انہوں نے جواب دیا، "ان کا جواب کچھ اِس قسم کا ہوتا تھا اس سوال کے جواب سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، مگر میرے فرائض کا تقاضا یہ ہے کہ جواب نہ دیا جائے!

۲۵ اگست (اتوار)

رات جیسے کیسے کٹی، مگر رات کے آخری پہر پورے آسمان پر ایک تارا نظر آیا۔ وُہ تارا بڑا بھلا معلوم ہُوا۔ وُہ تارا ہمیں پاکستان میں چمکنے والے تاروں کی طرح کا نہ لگا، بلکہ تارا مجھے وہ علامت معلوم ہُوا کہ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں حضورؐ کا ورود۔ میں اس تارے کی طرف دیر تک دیکھتا رہا شاید میرا جیسے اس سے جذباتی لگاؤ ہو!

فجر کی نماز پڑھ کے عرفات کی جانب چلے۔ واقعی وہ حشر کا میدان ہے۔ لوگ صبح ہی سے مسجد نمرہ میں پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ گرمی بھی ٹوٹ کے پڑ رہی تھی۔ جس نے ذرا دیر کی وُہ ہماری مسجد تک نہ پہنچ سکا۔ ویسے یہ سہولت ہے کہ نماز اپنی اپنی جگہوں پر بھی پڑھی جا سکتی ہے، اس لیے کہ پُوری دنیا کی خلقت ایک مسجد میں تو سما نہ سکتی تھی۔

اب نماز کا وقت ہو گیا۔ اس نماز کا یہ ہے کہ حضورؐ نے دو رکعت اس کی اور دو رکعت ظہر کی اکٹھی ادا کی تھیں ہمارے گروپ نے جو امام ڈھونڈا اُسے اسی طرح نماز پڑھانے کو کہا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: میں تو پہلے ظہر کی نماز پڑھاؤں گا۔ اس کے بعد اپنے وقت پر عصر کی۔ یوُں ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہم کہتے تھے، ہم تو رسولُ اللہ کی تقلید کریں گے۔

امام صاحب فرماتے تھے، مسجد نمرہ کے علاوہ جہاں نماز ہوگی وہ اسی طرح الگ الگ طریق سے پڑھی جائے گی۔

اس طرح کی گفت گو سُن کر ہمارے گروپ کے کچھ لوگ ذرا دُور ہٹ گئے۔ انہوں نے طریقِ رسولؐ کو اپنایا۔ ساتھ ہی ذرا فاصلے پر فرقہ جعفریہ والے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ غرض کوئی دو سو گز کے پلاٹ پر تین طریق سے نماز پڑھی گئی۔ جس قوم کی بے عملیوں کا یہ حال ہو وہ اس دنیا میں کیسے سُرخرو ہو!

پاکستان ہاؤس میں ٹھہرنے والے افراد نے بھی گروہ بنا رکھے تھے، ایک وزراء کا گروپ تھا، ایک جج صاحبان کا اور ایک ہم جیسے لوگوں کا، جو اپنی کسی کارگزاری کی بنا پر یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان تینوں ہی گروہوں کے اپنے اپنے ٹھاٹھ باٹھ تھے اور ہمارے تو کوئی ٹھاٹھ باٹھ تھے ہی نہیں صرف اہلِ کمال میں سے ہونا تو کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طہارت کو پسند کرتے تھے مگر یہاں ایسا ناقص انتظام تھا کہ نہ غسل خانے تھے اور نہ پانی بہ آسانی دستیاب تھا۔ اہلِ وفا پریشان ہو گئے۔ حکومت نے اس سال جیسا بہتر انتظام منیٰ میں کیا امید کرنی چاہیے آئندہ سال عرفات میں بھی ویسا انتظام ہو جائے گا۔

۲۶ اگست (پیر)

بریگیڈیر اعجاز بڑا افسر بھی ہے اور بڑا آدمی بھی۔ وُہ مجھے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاتا رہا، جیسے وہ میرا چھوٹا بھائی ہو اور اُسے بڑے بھائی کی خدمت کرنا ہی ہو۔

میری اہلیہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس نے کہا، کہیں سے جا کر مالٹے لائیں۔ اب میں اُن کے حکم کی تعمیل میں نکل گیا۔ بڑی بڑی گاڑیوں پر، اِکا دُکا کھانے پینے کی چیزیں مل رہی تھیں۔ مگر مجھے کہیں مالٹے نظر نہ آئے۔ مَیں دُور تک گیا مگر کامیابی نہ ہُوئی۔ اُدھر کیمپ میں پریشانی شروع ہوئی۔

بریگیڈیر صاحب نے کہا: طفیل صاحب راستہ بھُول گئے ہوں گے۔ اب ان کا ہم تک پہنچنا آسانی سے نہ ہو گا۔

پھر میری اہلیہ سے شکایت، بھابی! آپ نے کچھ منگوانا تھا تو مجھ سے کہا ہوتا!

اِدھر اہلیہ نے کان پکڑے، آئندہ کبھی میں انہیں کوئی کام نہ کہوں گی۔ پھر تبصرہ یہ بھی، میرا میاں بدھو سا ہے۔ مگر معلوم نہیں اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر لیتا ہے! اس پریشانی کے ماحول میں بھی جملہ خیر خواہان ہنسنے لگ گئے۔

بہرحال مجھے کسی جگہ بھی مالٹے نہ ملے۔ ایک صاحب بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ تین مالٹے بھی "بیٹھے" تھے۔ میں نے اُن صاحب سے کہا،

میری اہلیہ کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے مالٹوں کی فرمائش کی تھی۔ اگر آپ یہ تینوں مالٹے مجھے دے دیں تو جتنے پیسے کہیں نذر کر دُوں۔

وہ صاحب بولے : جاؤ صاحب جاؤ، یہ مالٹے ہم خود اپنے لیے لایا، بیچنے کے لیے نہیں لایا۔

چنانچہ میں نے دس ریال کا نوٹ نکال کر، ساری فقیرانہ اداؤں کے ساتھ، اس سے تین مالٹے مانگے۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ جب میں واپس ہونے لگا تو اس نے ایک مالٹا میری طرف لڑھکاتے ہوئے کہا : دس ریال کا نوٹ بھی جیب میں رکھو اور یہ مالٹا بھی جیب میں رکھو!

جب میں دو گھنٹے کے بعد وہ مالٹا لے کر واپس اپنے خیمے میں پہنچا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے : واہ صاحب واہ! اچھی کی آپ نے۔

بریگیڈیر صاحب : میں بھی آپ کو ڈھونڈ آیا۔

بیگم بریگیڈیر : میں بھی ڈھونڈ آئی، مگر آپ تھے کہاں؟

میں ایک صاحب سے مالٹا مانگ رہا تھا۔

عرفات سے مغرب کے بعد مزدلفہ چلے۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچے۔ بے پناہ رش تھا۔ یہاں بھی ضروری سہولتوں کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ نہ پانی کا معقول انتظام تھا، نہ ٹائلٹ کا۔ یہاں کھلے آسمان تلے سونا پڑا۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ فجر کی نماز پڑھ کے مزدلفہ سے نکلے۔ دوبارہ منیٰ آ گئے۔ جان میں جان آئی۔ میدانِ عرفات اور مُزدلفہ، اللہ کی پناہ! یہاں خُوب نیند آئی۔ صبح اٹھا تو پُورے آسمان پر وہی ایک تارا تھا۔

۲۷ اگست (منگل)

تین راتیں منیٰ میں گزارنی لازم ہیں تاکہ تین دن شیطانوں کو کنکریاں ماری جا سکیں اور قربانی دی جا سکے۔ قربانی کے لیے تو ہم نے بینک ووچر بنوا لیے تھے تاکہ قربانی کا وہ گوشت مستحق افراد تک پہنچے۔ پہلے ایسا گوشت بذریعہ ہوائی جہاز افغان مہاجرین، ایران اور بنگلہ دیش کو بھجوا دیا گیا تھا۔ جو مناسب اقدام تھا۔ ایسی قربانی کے لیے ہم میں طے یہ ہُوا کہ دو جج صاحبان، اس قربانی کی نگرانی کریں گے۔ بعد میں اس میں ذرا تبدیلی ہُوئی۔ چنانچہ سلاٹر روم کی طرف جج صاحب کا ایک بیٹا اور ایک ڈاکٹر صاحب چلے۔

جاتے ہُوئے یہ لوگ کہہ گئے تھے : ان شاء اللہ یہ کام ایک بجے تک ہو جائے گا۔ لہٰذا ایک بجے تمام متعلقین احرام کھول دیں۔ کچھ لوگوں نے احرام کھول دئے۔ کچھ نے کہا ہم تو جانے والوں کا انتظار کریں گے۔ مگر یہ انتظار بڑا طول پکڑ گیا۔ ایک بج گیا۔ کوئی واپس نہ آیا۔ دو بج گئے، کوئی واپس نہ آیا۔ تین بجے، تو ان میں سے ایک واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب قربان گاہ میں چلے گئے تھے مگر ابھی تک ان کی باری نہیں آئی۔ امکان ہے کہ پانچ بجے تک باری آئے گی۔ چنانچہ جو احرام کُھل گئے تھے، وہ دوبارہ بندھنے لگے۔

لوگ شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں۔ کئی من چلے غصّے میں آ کر جُوتے بھی مارتے ہیں، گالیاں بھی دیتے ہیں۔

جذباتی طور پر بھی ایسا کرنا مناسب نہیں۔ مذہباً قطعاً مکروہ فعل ہے۔

مغرب کے وقت منیٰ سے مکہ مکرمہ کے لیے نکلے۔ راستے میں موٹر گاڑیوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ آدھ گھنٹہ کا راستہ تین گھنٹے میں طے ہُوا۔ گاڑیاں چلتی نہ تھیں، رینگ رہی تھیں۔ میں نے پاکستان ہاؤس پہنچ کر، بیگم کے ہاتھ میں قینچی پکڑائی اور اس سے کہا:

بال کاٹ دو۔

اس نے بالوں کی ایک لٹ کاٹ دی۔

اس وقت میں لیٹ کر حج کے متعلق کتاب لے کر پڑھنے لگا۔ میں نے پڑھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جس نے سر کے بال منڈوا دیے، یا اللہ! اس کے سارے گناہ معاف کر دے!"

اُسی وقت میں نیچے اترا، حجام کی دُکان ڈھونڈی۔ ایک لمبی لائن لگی ہُوئی تھی۔ چنانچہ میں بھی "فارغ البال" ہو گیا۔ آج کل سر پر ہاتھ پھیرتا ہُوں تو عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر بچوں کو لکھ دیا کہ میں نے ٹنڈ کرالی ہے۔ اور تمہاری امی کا رنگ کالا ہو گیا ہے۔ احتیاطاً بچوں کو اس لیے لکھا تاکہ وُہ ہمیں اس حلیے میں دیکھ کر ایک دم بھونچکے نہ رہ جائیں۔

۲۸ اگست (بدھ)

میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی، تیز بخار۔ بیگم کی طبیعت بھی ڈانواں ڈول تھی۔ لہٰذا دونوں ہی نڈھال تھے۔ ابھی منیٰ کا ایک چکر اور لگانا، یعنی ایک رات اور بسر کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ بریگیڈیر اعجاز کی بیگم جج صاحبان کی بیگمات کے پاس پہنچیں۔ انہیں بتایا کہ محمد نقوش یہاں موجود ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ جس گاڑی میں وُہ جا سکتے ہیں وہ دیر سے چلے گی، مناسب سمجھیں تو انہیں ساتھ لے جائیں۔

ان میں سے متعدد جج صاحبان نے میرا نام سُنا ہوا تھا، میرے مدّاح بھی تھے۔ وہ لوگ بہ خوشی راضی ہو گئے۔ بغیر شخصی تعارف اور بغیر ملے خوش ہو گئے۔

محمد رفیق نے کہا: میں آپ کا بیحد مدّاح ہُوں، مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے۔

دوسرے جج نے کہا: ۱۹۵۰ء کے بعد تمام نقوش میرے پاس ہیں۔ میں آپ کا پرانا عقیدتمند ہُوں۔

چنانچہ جج صاحبان مجھے محبت کی ضو میں منیٰ لے گئے۔ بعد میں آ آ کر متواتر میرا حال پُوچھتے رہے۔ مگر میں تو "بخار کے خمار" کی وجہ سے اس قابل نہ تھا کہ حال احوال پُوچھ سکتا۔

جج صاحبان نے مجھے اپنا بیگ تک خود اٹھانے نہ دیا۔ بہ اصرار خود اٹھایا، اور اس میں خوشی محسوس کی۔

یہ سب صدقہ ہے محمدؐ عربی کا! جس کا میں ایک ادنیٰ سا نام لیوا ہوں۔

میں واپس بھی جج صاحبان کے ساتھ آیا۔ راستے میں جبلِ ثور پڑا۔ وُہ پہاڑ جو ہجرت کی غرض سے نکلنے کے بعد راستے میں پڑا تھا۔ میں نے دیکھا وہ پہاڑ تو بڑا اونچا تھا، حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم وہاں تک پہنچ گئے۔ مگر اور لوگ بہ آسانی نہیں پہنچ سکتے۔ جان کا خطرہ بھی تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ دشمن پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ابوبکر صدیق ایک بار پریشان ہُوئے تو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تحزن انّ اللہ معنا۔

(فکر نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے)

جس سڑک پر ہماری گاڑی دَوڑ رہی تھی وہ حضورؐ کا اختیار کردہ ہجرت کا راستہ تھا، جس راستے پر ہم جا رہے تھے اس راستے پر حضورؐ بھی چلے تھے۔ یہ تصور کتنا سکون بخش ہے!

مکہ پہنچنے پر ہم طوافِ زیارت کے لیے نکلے۔ صبح ہی کا وقت تھا۔ زیادہ رش نہ تھا۔ ویسے بھی یہ حج کا دُوسرا دن تھا اس میں رش کم ہوتا ہے۔

ہم جیسے عقیدت مند تو خانۂ خدا میں لگے ہُوئے پتھّروں کو بھی، اور دروازوں کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ کئی ضعیف الاعتقاد چُوم بھی لیتے ہیں۔ ایک ایسے ہی مرحلے پر ایک عربی آیا اُس نے دروازوں کے کُنڈوں کو چُومتی ہوئی ایک عورت کو ڈنڈا مارا اور غصّے سے کہا، حرام حرام! بعد میں اس اعرابی نے اس دروازے پر تھوک دیا۔

۲۹ اگست (جمعرات)

کل ہمارا نیا دوست بریگیڈیر اعجاز واپس چلا گیا۔ ایسا محسوس ہُوا ایک غمگسار چلا گیا۔ وُہ بازار سے جا کر کیمرہ لایا۔ اس نے ہماری کئی تصویریں بنائیں۔ ان کی تعیناتی لندن میں ہے۔ اس سال کے آخر تک شاید وطن پہنچیں گے۔ میں نے آج سے ان کا انتظار شروع کر دیا ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ اپنے اندر عجب کیفیتیں رکھتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے کچھ رُخ، دوسرے لمحے کچھ دوسرا رُخ!

پہلے میں علیل تھا۔ آج باقاعدہ بیمار ہو گیا۔ بخار اس شان سے آیا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اہلیہ پوچھتی، طبیعت زیادہ خراب تو نہیں؟

میں جواب دیتا: بالکل نہیں!

میں بعض اوقات جھُوٹ بولنے کو بھی سچ ہی کی طرح ضروری سمجھتا ہُوں۔

بالآخر اس نے برخوردار رشید سے تھرمامیٹر منگوایا۔ جب ٹمپریچر چیک کیا تو اس کے منہ سے نکل گیا: ہائے

میں مرگئی، ۱۰۴ بخار!

مگر میں نے اُسے تسلی دی، دوائی کھانے سے بخار اُتر جائے گا۔

آج سارا دن بستر پر لیٹ کر گزارا تاکہ صحت یابی میں چلنا پھرنا مزاحم نہ ہو۔ شام کو اہلیہ جاکر دودھ دہی اور روٹی لے آئی۔ کیونکہ پاکستان ہاؤس میں ہر روز مرغ کھا کھا کر تنگ آگئے تھے۔

جب شام کو اہلیہ نے دہی میں نمک ڈال کر قلچہ نما روٹی دی تو میں نے اسے ایک واقعہ سنایا:

آج سے ۶۰ سال قبل والد صاحب مجھے کلیر شریف کے عرس پر لے گئے۔ جب آدھے راستے پہنچے ہوں گے جالندھر کے قریب، تو میں نے اپنے والد سے کہا:

"میں واپس جاؤں گا۔"

والد صاحب نے گھبرا کر پُوچھا: "وہ کیوں؟"

میں نے جواب دیا: "والدہ مجھے ہر روز دہی اور قلچہ کھلاتی تھیں، آپ نہیں کھلائیں گے۔"

آج کی رات، میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سویا۔ سونا چاہتا تھا مگر نیند نہ آتی تھی۔ چنانچہ میں اٹھتا تھا اور کھڑکی میں سے جھانکتا تھا۔ ایک تو انسانوں کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ دنیا جہان کے انسان یہاں آگئے ہیں۔ دُوسرے گاڑیوں کو دیکھ کر سوچتا تھا کہ ساری گاڑیاں ادھر آگئی ہیں۔ رات بارہ بجے بھی بے پناہ رش! دو بجے بھی، تین بجے بھی۔ میں نے جس وقت بھی جھانکا، حیرت سے واسطہ پڑا۔

۳۰ اگست (جمعہ)

ہم نے ناشتا کرنے کے بعد، جمعہ کی نماز کے لیے سوچنا شروع کر دیا۔ وُہ یہ کہ آج حرم شریف میں جاکر نماز پڑھیں گے ہمارا سوچنا اس لیے سُود مند ثابت نہ ہُوا کہ ایسا ہی سب سوچتے ہیں۔ سب وہاں جلد سے جلد پہنچنا چاہتے ہیں۔ آپ یقین کریں نہ کریں لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے صبح نو دس بجے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک طویل انتظار کرتے ہیں۔ مگر سعادت سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔

اسی طرح فجر کی نماز پڑھنے کے لیے کئی لوگ رات کو گھر ہی نہیں جاتے۔ وہ تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ پھر اس کے کافی وقفے کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ لگن اور عشق کے یہ مراحل عجیب ہیں جنہیں سمجھا نہیں جا سکتا۔

بہر حال نماز جمعہ کے لیے ہم بھی گھر سے ۱۱ بجے نکلے۔ جو سرنگ صفا مروہ کی جانب نکلتی ہے۔ اس میں داخل ہُوئے۔ لوگوں نے سرنگوں میں بھی چھوٹی چھوٹی دُکانیں سجا ڈالیں۔ یعنی بڑے بیگ کھولے، رومال بچھایا، اس میں سے چیزیں نکال کر رکھ دیں۔ ضرورت مند کچھ نہ کچھ لے ہی لیتے ہیں۔

ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ پلاسٹک کے کیری بیگ ساتھ لے جاتے تھے جُوتے اس میں ڈال کر اندر لے جاتے تھے۔ چنانچہ میری بیوی نے یہ فیصلہ کیا کہ آج جُوتے اندر لے کر نہ جائیں گے، بے حُرمتی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے جُوتے پلاسٹک کے لفافے میں ڈالے اور ایک جگہ رکھ دیے۔

مسجد میں اس وقت بھی اتنی بھیڑ تھی کہ ہمیں خاصے تردّد کے بعد، سجدہ دینے کے لیے جگہ ملی۔ مگر لوگ ہیں کہ رَوندتے ہُوئے اِدھر بھی آتے ہیں اُدھر بھی جاتے ہیں۔ یعنی اِدھر اُدھر لگی رہتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ جب تک نماز کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔

ہم جب نماز پڑھ کے نکلے تو جُوتے لینے کے لیے ٹھکانے پہ پہنچے۔ ہمیں وہ پلاسٹک کا لفافہ مل گیا۔ مگر جب اُسے دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ اس میں جُوتے نہ تھے۔ اس میں ضروری کاغذات تھے، پاسپورٹ تھا، رقم تھی۔

میں نے اہلیہ سے کہا؛

ضرور کوئی دھوکے میں ہمارا تھیلا اٹھا کر لے گیا ہے اور اپنا تھیلا چھوڑ گیا ہے۔

مگر سوال یہ بھی ذہن میں آیا کہ آخر کسی نے اتنی اہم چیزیں یہاں چھوڑیں کیوں! بہرحال ہم نے وہ تھیلا وہیں رکھ دیا اور دُعا مانگی؛

یا اللہ! یہ جس کا ہے اس تک پہنچ جائے۔

چنانچہ ہم وہاں سے کسی اور کی قینچی چپلیں پہن کے گھر آئے۔ ساری رات اس بیگ کا خیال آتا رہا، جس کا ہے اس تک پہنچا کہ نہیں! ہم لوگ بھی لاپروائی کے بادشاہ ہوتے ہیں۔

شام کو بازار میں نکلے تو لوگ واپس جانے کے لیے بسوں پر اپنا سامان پھینک رہے ہیں۔ فٹ پاتھ پر بکسوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ چلنا مشکل ہو گیا۔

۳۱ اگست (ہفتہ)

آج پاکستان ہاؤس کے انچارج شبیر صاحب آئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک رسید تھما دی، جو ڈھائی ہزار ریال کی تھی، دو ہزار کرایہ کے اور پانچ سو ٹرانسپورٹ کے۔ میں نے اُن سے کہا؛ کسی نے بھی دو ہزار سے زاید ادائیگی نہیں کی۔ اس لیے مجھ سے ڈھائی ہزار کی کیوں؟

کہنے لگے، سب دیں گے۔

میں نے کہا، اگر نہ دیں تو مجھے یہ زاید رقم واپس کر دیجیے گا!

پاکستان ہاؤس تک پہنچنا بھی ایک مسئلہ بنا۔ جب ہم جدّہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو چٹھی یہاں پہنچی ہُوئی تھی کہ محمد طفیل نامی ایک شخص آ رہا ہے اس کی دیکھ بھال کی جائے اور اس کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے۔ یعنی

رہائش کا مسئلہ طے نہ تھا بلکہ طے تھا کہ اسے ٹھہرایا نہ جائے۔

مجھے غصہ نہیں آتا، مگر جب آتا ہے تو وہ معمولی واقعہ یا معمولی غصہ نہیں ہوتا۔ مجھے وزارت کی طرف سے جو صاحب جدہ ایئر پورٹ پر ملے، انہوں نے مجھے جملہ پوزیشن بتائی۔ میں نے ان سے کہا، اگر وزارت ٹھہرانے (ادائیگی کے ساتھ) کا بندوبست نہیں کر سکی، تو مجھے آپ کی کسی سہولت بہم پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ ساری دنیا کے کام ہوتے ہیں میرے بھی ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں جا کر اپنے دوست کے عزیز کے ہاں ٹھہر گیا۔ وہاں دوسرے دن بتایا گیا، انتظام ہو گیا ہے۔

آج میں نے خانہ کعبہ کا پھر طواف کیا۔ یہ طواف اس لیے ضروری تھا کہ میں نے پہلے ایک بار طواف رش کی وجہ سے مکمل نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ طواف میرے بس میں نہ تھا۔ جوان آدمیوں اور تن درست جسموں کا طواف تھا۔ جنہوں نے ہم ایسے کمزور لوگوں کے لیے مسئلہ بنا دیا تھا۔ مگر حضورؐ کا ارشاد تھا کہ طواف نامکمل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر اسے چھوڑا جائے تو اسے دوبارہ مکمل کیا جائے۔

یہاں گرمی بے اندازہ پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہوا بھی چلتی رہتی ہے جو گرمی کو ضعیف کر دیتی ہے۔ بڑی بھلی لگتی ہے۔ مگر خانہ کعبہ میں جو ہوا چلتی ہے وہ ہوا کے جھونکے ہوتے ہیں جو رحمتی جھروکے سے آتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے باہر کی ہوائیں، اور خانہ کعبہ کی اندر کی ہوائیں، محسوس کرنے والوں نے خاصا فرق محسوس کیا ہو گا۔

آج جب میں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اُٹھا اور گھر جانے کے لیے آٹھ دس قدم ہی اٹھائے ہوں گے تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی جس کا بظاہر کوئی سبب نہ تھا، دل میں کوئی بات نہ تھی، دماغ میں کوئی بات نہ تھی مگر میرے آنسو رواں ہو گئے جو خانہ کعبہ میں گرنے لگ گئے۔ میں چلتا گیا، آنسو گرتے رہے، حتیٰ کہ رقت طاری ہو گئی۔ میں نے اہلیہ کا ہاتھ پکڑا ہُوا تھا۔ مگر بھیڑ میں اُسے یہ کچھ محسوس نہ ہوا۔ باہر نکلنے کی بجائے میں نے اہلیہ سے کہا؛

آج اوپر والی منزل پر چلتے ہیں۔

وُہ باہر نکلنے کی فکر میں تھی۔ میں ذرا اور زیرِ سایہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کیفیت کے اور زیرِ اثر رہنا چاہتا تھا، جو بلا سبب نہ تھی۔ اوپر پہنچے تو طواف کرنے والوں پر نگاہ کی تو اور بہت کچھ مل گیا۔ پہلے میں اس نظارہ سے دوچار نہ ہُوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ یہ پہلا موقع ہمیشہ یاد رہے گا!

یکم ستمبر (اتوار)

اظہار الدین، ہمارے گڑھی شاہو کے پڑوسی تھے۔ وہ جدہ کی ایک کمپنی میں عرصے سے ملازم تھے۔ لاہور سے چلنے سے پہلے ان سے لاہور میں ملاقات ہُوئی تھی۔ اُنھوں نے بتایا کہ میں چھٹی گزار کے پہلی ستمبر تک ڈیوٹی

پر پہنچ جاؤں گا۔ ٹیلیفون نمبر دیا تھا کہ اس پر یاد کرنا۔

کل ہم نے سرکاری ٹیلیفون سے کال کرنے کے لیے سکے منگوا لیے تھے۔ پاکستان ہاؤس میں افسروں کے کمروں میں ٹیلیفون تھے مگر ہم جیسے عام لوگوں کے لیے کوئی ٹیلیفون نہ تھا۔ میں نے حالیہ واقف کار جج سے پوچھا، یہاں سے بھی کہیں ٹیلیفون کرنے کا بندوبست ہے؟ انہوں نے کہا، ڈائرکٹر حج کے دفتر سے ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے۔ شاہد عزیز میرے واقف تھے۔ مگر میں اس واقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں جج صاحب نے کہا، لیجئے موصوف کے اسسٹنٹ آ گئے۔

انہوں نے پوچھا: کیا پرابلم ہے؟

میں نے کہا: جدہ ایک ٹیلیفون کرنا ہے۔

اس پر انہوں نے فرمایا: آئیے میرے ساتھ۔

میں ان کے ساتھ گیا اور شاہد عزیز کا پوچھا۔ کہنے لگے: اگر وہ آپ کے واقف تھے تو پھر پریشانی کی کیا بات تھی؟

میں نے کہا: پریشانی کی کوئی بات نہ تھی، مناسب اور نامناسب کے درمیان جھگڑا تھا۔

چنانچہ میں نے اظہار الدین کو ٹیلیفون کیا۔ وہ مل گئے۔ انہوں نے کہا، آپ کوچ کی تیاری مکمل کر لیں میں آج رات آؤں گا اور آپ کو جدہ اپنے گھر لے آؤں گا۔

میں نے انہیں بہت کہا: دو تین دن اور خانہ کعبہ کے آس پاس گزار لینے دو۔ مگر وہ نہیں مانے۔ وہ اپنی طرف سے محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر وہ محبت مجھے قُربِ الٰہی سے دُور کر رہی تھی۔

طے ہوا کہ صفا مروہ کی اس جگہ ملیں گے جہاں کہ سبز بتی جلتی ہے اور لوگ دوڑ کر گزرتے ہیں، اس لیے کہ بی بی ہاجرہ بھی اپنے بچے کو پیاس سے تڑپتے دیکھ کر دوڑتی رہی تھی۔ ویسے میں نے اپنے واجب بل کی ادائیگیاں شروع کر دی ہیں۔ اپنے سفارت خانے سے پروانہ راہداری بھی لے لیا ہے۔ طوافِ وداع کا بھی ارادہ کر لیا ہے اس لیے کہ آخر ایک دن تو اپنے ارمانوں کو یہاں چھوڑ کر جانا ہوگا! انسان بڑا بے بس ہے!

اظہار الدین نے مجھے یہ خوشخبری بھی سُنائی کہ میرے بیٹے پرویز کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ اظہار الدین جدہ روانگی سے قبل ہمارے گھر گیا تھا۔ اس اطلاع سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آج میں ایک بار پھر خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کی تمنا کیے جاؤں گا۔ میری زندگی ایسی جھلملاہٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ پیغمبروں کو چھوڑ کر اگر میں یہ سوچوں کہ دُنیا کا سب سے خوش قسمت انسان کون ہے! تو میری نگاہ تو مجھی پر پڑے گی۔

۲ ستمبر (پیر)

پروگرام کے مطابق اظہار الدین پہلی ستمبر کی شام کو صفا و مروہ کی اُس جگہ مل گئے تھے جہاں کہ سبز بتیاں

جلتی ہیں اور لوگ دوڑ کر گزرتے ہیں۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچے۔ رشید احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں سے نکلے تو ایک لمبے چکر کے بعد پاکستان ہاؤس پہنچے۔ اظہار الدین نے کہہ دیا کہ میں آپ کو مدینہ جانے والی بس پر بٹھا دوں گا، وہاں سے آپ کے دوست لے لیں گے۔

مگر میں خوف زدہ ہُوا، بیوی سے کہا، اگر پاکستان ہاؤس میں رہے، ان پر یہ جملہ ذمہ داری ڈالی تو یہ ہمیں مدینہ لے جائیں گے وہاں سے جدہ پہنچا دیں گے۔ ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ برعکس اس کے اظہار الدین ہمیں راستے میں چھوڑ دے گا۔ کوئی مشکل پیش آئے گی تو دشواری ہو جائے گی۔

بقایا سفر کے مسئلے کو ہر طرح سے سوچا گیا۔ آخر طے پایا کہ چونکہ وُہ گاڑی لے کر آگیا ہے، ہماری خاطر آیا ہے۔ اس لیے اب اس کے ساتھ چلنا چاہیے۔ آخر لاکھوں انسان اللہ کے بھروسے پر سفر کرتے ہیں۔ ہم کیوں نہیں کر سکتے؛ چنانچہ اللہ پر بھروسے والا جملہ کام آیا۔ اور ہم پاکستان ہاؤس سے نکل کھڑے ہوئے۔

جدہ کو پہلے بھی دیکھا تھا ۱۹۸۲ء میں، مگر جدہ دن بدن بدل رہا ہے۔ یعنی اپنی دلفریبی اور روپیہ کے بے دریغ استعمال سے، بلڈنگیں پہلے بھی خوب صورت تھیں، اب تو اور نکھر آیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عربوں کے پاس اتنا تعمیراتی حُسن و جمال ہوگا۔ روپیہ لگانا اور بات ہے، سلیقے سے لگانا اور بات، میں تو عربوں کے حُسن و سلیقہ سے متاثر ہوا۔ روپیہ لُنڈھا ہوا نظر نہ آیا، سجا ہوا نظر آیا۔

اظہار الدین سرکاری نوکری بھی کرتے ہیں اور فراغت کے بعد جُز وقتی ایک پرائیویٹ فرم میں بھی۔ اظہار الدین کا خیال ہے کہ آدمی نوجوانی میں جو کچھ کر سکتا ہے وہ کر گزرے۔ پھر یہ دن ہاتھ نہ آئیں گے۔ چنانچہ وہ زندگی کے پھکڑے میں ہمہ وقت جُتا ہُوا ہے۔

اظہار الدین کی بیوی، بڑی زندہ دل ہے۔ وُہ بچے کو کسی بات پر دھول جما کر ڈانٹتی بھی ہے تو یہ کہتی ہے: باپ تمہارا دن رات نوکریاں کرتا ہے اور تم چیزوں کو اس طرح توڑتے پھوڑتے ہو جیسے مفت ہاتھ آئی ہوں۔ اس کے بعد دوسری دھول، پھر توڑو گے کوئی چیز!

شام کو باہر نکلے تاکہ عظیم الشان بلڈنگیں دیکھ کر اپنی حیرتوں میں اضافہ کر سکیں۔

آج میں نے طوافِ وداع کے بعد ایک وصیت لکھی جو افرادِ خانہ کے حوالے کر دُوں گا۔

۳ ستمبر (منگل)

آج مدینہ کی طرف "ہجرت" کرنا تھی۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ اس رات نیند نہ آنے کا تسلسل جیسے صدیوں سے آج بھی جاری ہو۔ ایک ہستی کو نیند اس لیے نہ آئی ہو گی کہ اُن کے سامنے اُمتِ مصطفیٰؐ تھی۔ ہم گنہ گار ہیں ہمیں نیند اس لیے نہ آئی کہ اس بھیڑ بھاڑ میں گم نہ ہو جائیں۔ زبان سے ناواقفیت نے پریشان رکھا۔

اظہار الدین ایئرکنڈیشنڈ بس میں سوار کرا کے اپنے دفتر چلے گئے۔ ہم سُوئے مدینہ روانہ ہُوئے۔ اسی راستے حضورؐ نے ہجرت کی تھی۔ جب کہیں بس رکتی تھی۔ چیکنگ ہوتی تھی تو ہم ڈرتے تھے۔ ہمارے کاغذات میں کوئی کمی نکل آئی تو مارے جائیں گے۔ چنانچہ سارا راستہ درود شریف پڑھتے رہے!

سیاہ چٹیل پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر، بنجر زمینوں کو روندتے ہُوئے۔ ہم مدینہ پہنچ گئے۔ بس کے اڈّے سے محمد اجمل اصلاحی صاحب کو ٹیلیفون کرنا چاہا۔ ٹیلی فون بیکار، سڑک پر پہنچ کر ٹیلی فون کرنا، وہ ٹیلی فون بھی بیکار، کیونکہ ایک صاحب ہم سے پہلے کوشش کر رہے تھے۔ وہ نڈھال ہو چکے تھے۔ مگر ٹیلیفون نہ ہُوا۔ میں نے انھیں اپنا نمبر دیا اور کہا، اس پر ٹیلی فون ملا دیجئے۔

وُہ صاحب بولے، ٹیلی فون ٹھیک ہوتا تو میرا نمبر نہ مل جاتا؟

میں نے کہا: یہ نمبر مل جائے گا۔

اس نے غیر یقینی حالت میں ٹیلی فون نمبر ملایا اور نمبر مل گیا۔ اصلاحی صاحب کی آواز سُنائی دی: السلام علیکم۔

"وعلیکم السلام کو بس کے اڈّے سے آکر لے جائیے۔"

بہت سے بہت دس بارہ منٹ میں پہنچتا ہُوں۔ یہ بھی بتایا: میرے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے آپ مجھے پہچان جائیں گے۔

ایک صاحب عربی لباس میں بس کے اڈّے پر پہنچے۔ اگر اُن کے ہاتھ رسولؐ نمبر کی جلد نہ ہوتی تو میں پہچان نہ سکتا۔ پہلی ملاقات، وہ بھی عربی لباس میں، غرض حیرتوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ کیونکہ میں بھی تو پرانا محمد طفیل نہ تھا۔ حاجی اور بے حج کئے آدمی کے حلیے میں کافی فرق ہوتا ہے۔

گھر آئے، کھانا کھایا، لیٹ گئے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز مسجد نبوی میں یا اس کے احاطے میں پڑھنا چاہیے تھی۔ دس بارہ منٹ میں وہاں تک پہنچ گئے۔ نماز ادا کی۔ پھر یہ سوچ کر رک گئے کہ عشاء کی نماز پڑھ کر واپس جائیں گے۔ اس عرصے میں ۱½ گھنٹے کا وقفہ ملا۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر ہم نے ۱½ گھنٹے تک قرآن کے موضوعات پر باتیں کیں کیونکہ نقوش کا اگلا مرحلہ قرآن نمبر چھاپنے کا ہے۔ میں بتاتا رہا یہ کیا ہے، یہ کیا ہے۔ وہ بتاتے رہے یہ کرنا چاہیے یہ کرنا چاہیے۔ اتنے میں مؤذن نے عشاءؒ کی نماز کے لیے بُلایا اور کہا: اللہ اکبر، اللہ اکبر!

۴ ستمبر (بدھ)

رات بیگم صاحبہ نماز کے لیے جب مسجد نبوی کی طرف جا رہی تھیں تو ان کا پھر پاؤں رپٹ گیا۔ موچ آگئی۔ پاؤں سُوج گیا۔ مگر وُہ ارادے کی پکی ہیں۔ اسی حالت میں مسجد نبوی میں گئیں۔ مغرب کی نماز، عشا کی نماز

پڑھی، واپس آئے تو گھر میں ڈاکٹر موجود تھے۔ لیبیا سے آئے ڈاکٹر صاحب، جو اجمل صاحب کی اہلیہ کے رشتہ دار تھے۔ انہوں نے دوائی لکھ کر دی، ایک لگانے والی، دوسری کھانے والی!

یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ دوائی کھائی اور لگائی جا رہی ہے۔ مگر وہ چلنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ابھی ایک دو روز اور نہ چل سکیں گی۔ وہ صبح کہہ رہی تھیں، میں تو حضور کی خدمت میں حاضر ہوں۔ وہی شفا کی سفارش بھی کریں گے۔

اجمل صاحب عربی لباس پہن کر جامعہ چلے گئے ہیں، گیارہ بجے تک لوٹ آئیں گے۔ اجمل صاحب بنیادی طور پر بے حد شریف آدمی ہیں۔ جب تک نہیں ملا تھا اس وقت تک بھی یہی خیال تھا۔ دیکھا اور پرکھا تو ویسا ہی پایا۔ ہماری پرکھنے کی کسوٹی ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ تر اصولوں کو تعلق نہیں ہوتا۔

اجمل صاحب مشرقی وضع کے آدمی ہیں حالانکہ انہوں نے مجھے بس اسٹینڈ کے اڈّے پر کہہ دیا تھا کہ میری شکل و صورت پر نہ جائیے گا' میں آپ کو قطعاً بور نہ کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے پیروں کی طرح جانا، مریدوں کی طرح خدمت کی۔ یہ کھائیے، وہ کھائیے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ مغرب کی اذان نہ ہو گئی۔

مغرب کی نماز مسجد نبوی کے باہر جو شیڈز پڑے ہیں اُن میں ادا کی۔ کیونکہ مسجد میں جگہ نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ صبح آتے ہیں عشا کی نماز پڑھ کر جاتے ہیں۔ ایسا اگر سب کے سب نہیں کرتے تو اکثریت ایسا کرتی ہے۔ بس کسی ضرورت کے تحت منٹوں کے لیے جاتے ہوں تو جاتے ہوں!

مغرب کی نماز کے بعد اصلاحی صاحب نے قرآن نمبر کی بات چھیڑ دی۔ موضوع کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہونا چاہئے تھا میں نے اپنے منصوبے کا کچھ حال بتایا۔ کچھ انہوں نے سوچ رکھی باتوں پر روشنی ڈالی۔ کیونکہ ہم قرآن نمبر کا اعلان کر چکے تھے۔ اصلاحی صاحب ہمارے اُن مخلصین میں سے تھے جنہوں نے ابتداً میں رسولؐ نمبر کے لیے خاصے اہم مضامین لکھے تھے۔ یہاں ہونے کی وجہ سے اصلاحی صاحب کی جدید عربی لٹریچر پر خاصی نظر ہے۔ اس لیے انہوں نے کئی کام کے موضوعات اور ان سے متعلق کتابوں کے نام بتائے۔ اس کے بعد عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھی اور لوٹ آئے۔

۵ ستمبر (جمعرات)

ہم جب بھی مسجد نبویؐ کی طرف گئے، خاصی رونق دیکھی، اتنی رونق کہ ڈھنگ کی جگہ کا ملنا محال ہو گیا۔ ایک تو عاشقانِ رسولؐ کا ہجوم ہوتا ہے کچھ ہماری سینہ زوریاں پریشان کرتی ہیں۔ قاعدہ تو یہ ہونا چاہیے کہ پہلے مسجد کو بھرا جائے، اس کے بعد مسجد سے باہر صفیں باندھی جائیں۔ دیکھنے میں یہ بھی آیا ہے کہ مصری باشندے یا شیعہ حضرات منڈلیوں کی صورت میں ایک جگہ دھرنا مار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ پولیس کے اٹھائے بھی نہیں اُٹھتے۔ اگر

انہوں نے مسجد کے باہر صفیں باندھ لیں تو مسجد کے اندر جانا مشکل ہو گیا۔ اگر عین دروازے میں ڈٹ گئے تو بھی باقی نمازیوں کا اُدھر سے جانا مشکل ہو گیا۔ اگر سلیقے اور قاعدے کے مطابق نماز پڑھی جائے یا دوسروں کو پڑھنے کا موقع دیا جاتے تو اتنی مشکلیں پیش نہ آئیں۔ نہ جانے کیوں ہم اللہ اور رسولؐ کے گھر جاتے ہُوئے بھی، اُس اسپرٹ میں رنگے نہیں جاتے، جو کہ حضورؐ کا منشا تھا۔

کچھ لوگ ہیں کہ وُہ پھلانگتے ہُوئے پہلی صفوں میں جانا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ پہلی صفوں میں نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے۔ مگر اُنہیں یہ یاد نہیں کہ پہلی صفوں میں نماز پڑھنے کے لیے پہلے مسجد میں جانا بھی چاہیے۔ ورنہ تو حضورؐ کا فرمان ہے کہ جہاں جگہ ملے وہیں نماز پڑھنی چاہیے۔

مغرب کی نماز کے بعد "باب الرحمت" کے باہر پاکستانی اور ہندوستانی طلبہ مل جاتے ہیں۔ اکثر باہر کے آنے والے لوگوں کی ایک دوسرے سے یہیں ملاقات ہوتی ہے۔ چنانچہ اصلاحی صاحب کے ساتھ میں بھی باب الرحمت کی طرف بڑھا کچھ طالب علم ملے ایک نے دوسرے سے باتیں کیں۔ مگر میں الگ کھڑا رہا۔ مجھے نہ اپنا کسی سے تعارف کرانا تھا اور نہ مجھے کسی سے ملنا تھا۔ مگر ایک دُوسرے کا وہاں ملنا مجھے اچھا لگا۔ ایک دُوسرے کا احوال پُوچھا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے ملا جا رہا ہے۔ پاکستانی پاکستانیوں سے مل رہے ہیں، ہندوستانی ہندوستانیوں سے!

میری اہلیہ کی طبیعت اچانک پھر خراب ہو گئی۔ چونکہ ڈاکٹر اطہر نعمانی لیبیا سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ اصلاحی صاحب کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اُن کی موجودگی کار آمد ثابت ہُوئی۔ وہ دوائیں تجویز بھی کر رہے ہیں، بازار سے دوائیں لا بھی رہے ہیں۔ بے حد مخلص انسان ہیں، دردمند دل رکھتے ہیں۔

انہوں نے لیبیا کا حال سُنایا، انقلاب کی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ لیبیا میں سماجی طور پہ کوئی شخص کسی سے بڑا نہیں۔ ہر شخص کو اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اُدھر ایک بڑے صاحب کی بیگم آ نکلیں۔ وہ اب اپنے کام خود کیسے کریں! کسی کے سامنے کرنے میں عار تھی۔ چنانچہ وہ ایک رات دو بجے اُٹھیں، گھر کا کوڑا کرکٹ اٹھایا اور آنکھ بچا کر وُہ کوڑا کرکٹ نیچے ڈسٹ بن میں پھینکنے کے لیے گئیں تو معلوم ہُوا کہ ایسی اور بھی بہت سی بیگمات ایسا کر رہی تھیں۔ بہر حال وہاں ضروریاتِ زندگی کی چیزیں عنقا ہیں۔ کبھی کوئی چیز آ گئی تو لمبی لائن میں کھڑے ہو کر حاصل کرنا پڑتی ہے۔ باہر کے لوگ خاصے بدمزا ہیں۔ پیسہ ہے مگر خریدنے کو کچھ نہیں۔

۶ ستمبر (جمعہ)

یہ طے ہو گیا تھا کہ آج مسجد نبوی میں تہجد کی نماز سے لے کر صبح کی نماز تک بیٹھا جائے گا۔ چنانچہ ۲ بجے کا الارم لگا دیا گیا۔ تین بجے اُٹھے۔ مسجد نبوی گئے۔ اُس وقت بھی خاصی دُنیا، اسی کام کی غرض سے مسجد نبوی کی طرف لپک رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ خانہ کعبہ میں اور مسجد نبوی میں، دن رات میں اتنی عبادت ہوتی ہے کہ اس اُمّت کے

سارے گناہ دُھل جاتے ہوں گے۔ پھر عبادت میں وُہ والہانہ پن، وہ کیفیت جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میں گنڈے دار نمازیں تو پڑھا کرتا تھا۔ شکرانے کی نمازیں بھی بہت پڑھیں، مگر کبھی نمازِ تہجد نہ پڑھی تھی۔ اب جو نمازِ تہجد پڑھنے کا موقع ملا، وہ بھی مسجدِ نبوی میں، تو میں آپ سے وہ کیفیت کیا بیان کروں! نمازی میرے آس پاس نہ تھے وہ سب فرشتے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت اتنے نمازی اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

آج ایک بڑی ویگن کا انتظام ہُوا تو متعدد افراد زیارتوں کے لیے تیار ہو گئے۔ مسجد قبا پہنچے۔ یہ وُہ پہلی مسجد ہے جو حضورؐ نے مکہ سے مدینے آنے پر بنائی تھی۔ اس مسجد کی بڑی فضیلت ہے۔ چنانچہ منبر کے پاس کھڑے ہو کر دو رکعت نماز نفل پڑھی۔ بڑا لطف آیا۔ بتایا گیا، یہاں سلمان فارسی کا کھجوروں کا باغ تھا۔ پچھلے دنوں یہ باغ جلا دیا گیا کیونکہ زائرین آتے تھے، کھجور کے درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کے نزدیک، اس باغ میں حضورؐ نے بھی کھجوروں کے پودے لگائے تھے۔ ایک مسقف چار دیواری بنی ہُوئی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حضورؐ نے قیام کیا۔

آج ہم دوبارہ ہمّت کر کے حضورؐ کے روضہ کی طرف گئے۔ ہجوم تھا کہ جیسے ساری خدائی ٹُوٹی ہوئی ہو۔ بہرحال دھکّے کھاتے، دھکّے دیتے روضۂ انور کے قریب سے گزرے۔ رقّت طاری ہو گئی۔ عاشقانِ رسولؐ کا بھی وہ حال جیسے وُہ اس خواہش کا ارمان رکھتے ہوں کہ اگر مرنا ہے تو یہیں اور اسی وقت مرا جائے۔

آج صبح اصلاحی صاحب ایک ایسے شخص سے ملے جن سے وہ کئی دن سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے امیر لیث صاحب تھے۔ میرا بھی ان سے تعارف کرایا گیا۔ انہوں نے فرمایا: یہ نام سُنا ہُوا ہے۔ بہرحال انہیں بتایا گیا کہ میں نے رسولؐ نمبر کے عنوان سے تیرہ جلدیں چھاپی ہیں، تو انہوں نے بتایا: جلدیں تو میں نے دیکھی نہیں البتہ ان پر ایک اچھا تبصرہ پڑھا تھا۔ لیجئے ہم اپنے جامے میں پھُولے نہیں سماتے تھے۔ مگر ابھی کئی قابلِ ذکر لوگوں نے اسے دیکھا تک نہیں!

آج صبح میں نے اپنے وزیرِ حج و اوقاف کو باب النسا میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہاں نہ کوئی وزیر ہے نہ بادشاہ! یہاں تو ہر معاملہ 'تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے' والا ہے!

۷ ستمبر

ریتلی زمین میں بچھُو بہت ہوتے ہیں۔ یہاں تقریباً ہر گھر کی پہلی منزل میں چھوٹے چھوٹے متعدد بچھّو ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تو بے شمار۔ آج ہم نے زنانے میں ہائے اُوئی کی ڈراؤنی آواز سُنی۔ مگر گھر والے لپک کے اندر گئے۔ معلوم ہُوا خاصا بڑا بچھُو موجود ہے جو رینگتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اطہر صاحب نے جُوتے سے جلدی سے مار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: میں نے زندگی میں اتنا بڑا بچھو نہیں دیکھا۔

پھر وہ ڈاکٹر ہونے کے ناطے اس کے علاج پر گفتگو کرنے لگے، جس کے بچھو کاٹ جائے اُسے خاصے

انجکشن لگانے پڑتے ہیں۔ پہلے تو جہاں کاٹے، اس جگہ کے اردگرد متعدد انجکشن لگانے پڑتے ہیں، پھر بازو وغیرہ میں۔ یہ بھی بتلایا: بعض اوقات انجکشن کا اُلٹا اثر ہوتا ہے اور آدمی مر جاتا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب اور اصلاحی میں مکالمہ شروع ہوا:

ڈاکٹر صاحب: اجمل! چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس گھر کو جلدی سے بدل دو۔

اجمل: سال بھر کا کرایہ پیشگی دینا پڑتا ہے، اس لیے فوری مکان بدلنے کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ پھر یہ ہے کہ اتنے بچھوؤں سے سابقہ پڑا ہے کہ اب تو ان سے خاصے مانوس ہو گئے۔

میں نے بیچ میں سے بات کاٹ دی: بلکہ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے بچھو اپنی برادری ہی میں سے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ شعر کہنے پر بھی قادر تھیں۔ جب انہیں پتا چلا کہ میرا ادب سے تعلق ہے تو وہ مجھے شعر سنانے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک بار وہ بیاض لے کر میرے کمرے میں بھی پہنچ گئیں۔ مگر اجمل صاحب نے میری جان چھڑائی۔ آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں ابھی آ کر اشعار سنتا ہوں۔

اُس دن تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں، مگر ایک دن جب کہ اصلاحی صاحب جامعہ گئے ہوئے تھے، میں پکڑا گیا۔ اُس وقت مجھے نیند آ رہی تھی اور بڑی بی بیاض کھول چکی تھیں۔ وہ اشعار پر اشعار سُنا رہی تھیں اور میں اُونگھنے میں داد دینے پر مجبور تھا۔

آخر جب وُہ خاصی نظمیں سُنا چکیں اور مُجھ سے پُوچھا:

کلام کیسا لگا؟

میں نے جلدی سے کہا: چونکہ مجھے نیند آ رہی تھی، اس لیے کلام کی پُورے طور سے تو داد نہیں دے سکتا تھا۔ مگر جتنے اشعار جاگتے میں سُنے وُہ اچھے لگے۔

اس پر بڑی بی نے کہا: اچھا، آپ سو رہے تھے جب میں اشعار سُنا رہی تھی۔

ہم جلد جدہ پہنچنا چاہتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ٹکٹ کنفرم کرائیں۔ دوسرے وطن کی طرف کُوچ ہو۔ مگر حکومت دو دن سے پہلے مدینے سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ اجمل صاحب نے ایک بات سمجھائی کہ آپ کے پاس حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک چِٹھی ہے۔ جس میں آپ کو وی، آئی، پی گردانا گیا ہے۔ اُسے دکھا کر سعودی حکومت سے اجازت لی جا سکتی ہے۔ طے پایا تو متعلقہ دفتر پہنچے۔ معلوم ہُوا دُوسری منزل پر ڈائرکٹر صاحب بیٹھتے ہیں اور ان سے ملنے والوں کی لمبی لائن ہے جو گراؤنڈ فلور تک پہنچی ہُوئی ہے۔ ہم بھی اسی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ تین گھنٹے کے بعد باری آئی۔ حکومتِ پاکستان کی چِٹھی دیکھ کر انہوں نے مجھے دو دن سے پہلے جانے کی اجازت دے دی۔

۸ ستمبر

آج ہمارا مدینہ سے جدہ جانے کا پروگرام طے تھا۔ ڈاکٹر اطہر بھی جدہ جا رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے مسجد نبویؐ میں

اپنی فجر کی نماز اور وظائف وغیرہ کو لمبا کر دیا، کیونکہ ہم دیارِ محبوبؐ چھوڑے جا رہے تھے۔ دل بیکل تھا، مگر ایک دن تو ہمیں یہاں سے جانا ہی تھا!

گھر آئے، ناشتا کیا، اور ایک چھوٹا سا قافلہ ڈاکٹر اطہر، بیگم اطہر اور والدہ اطہر کے علاوہ ہم دو میاں بیوی سمیت ٹیکسی پر سوار ہو کر جدہ کی طرف روانہ ہُوا۔ یعنی ہم نے پُوری ٹیکسی لی اور چل دئے۔ اجمل اصلاحی صاحب افسردہ تھے، اس لیے کہ انہیں ہماری وجہ سے خاصی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔

جس ٹیکسی پر ہم بیٹھے تھے اس کے ڈرائیور نے بتایا کہ وہ کل رات بھی ٹیکسی چلاتے رہے ہیں اس لیے وُہ بشاش نہ تھے۔ ڈاکٹر اطہر نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس نے مناسب سمجھا کہ ڈرائیور کو باتوں میں لگایا جائے مبادا سو جائے۔ چونکہ لبیا میں رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر اطہر عربی جانتے تھے اس لیے راستہ بھر باتیں جاری رکھیں۔ ایک دو بار ٹھنڈے پانی سے منہ بھی دھلوایا۔ یوں ہم جب بخیریت جدہ پہنچے تو اللہ کا شکر ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ملنے والوں کو ٹیلیفون کیا، وُہ مل گئے۔ میں نے اظہار الدین کو ٹیلیفون کیا۔ وُہ مل گئے۔ یُوں دونوں میزبان اپنی اپنی گاڑیاں لے کر پہنچ گئے۔

بیگم چاہتی تھیں کہ بچّوں کے لیے، بہوؤں کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جائیں۔ میں اس کے خلاف تھا۔ مگر جب مجھے معلوم ہُوا کہ بیگم نے اس غرض کے لیے ہمارے ایک عزیز سے کچھ روپیہ قرض لیا ہُوا ہے تو میں چُپ ہو گیا۔

جب ہم جدہ کے بازاروں میں گھُومے تو لطف آ گیا۔ یہ شہر دنیا کے خوب صورت شہروں میں ہوگا، بلڈنگیں ایک سے ایک بڑھ کر۔ مکّہ بھی دیکھا تھا، مدینہ بھی دیکھا تھا۔ مگر یہ شہر سب سے بڑھ کر تھا۔ کچھ خریدے بغیر اس میں گھُومنے کو جی چاہتا تھا۔ بالآخر ہم کپڑے کی دُکانوں کی طرف بڑھے۔ ایک بازار میں خاصی دکانیں اپنے ملک کے لوگوں کی تھیں، مگر وہ کھال ادھیڑنے میں کسی دوسرے سے کم نہ تھے۔ جس دکان میں گھُس جائیں ہر چیز اپنی طرف کھینچے، مگر جیب ہر چیز سے دُور رہنے کا مشورہ دیتی تھی۔ چنانچہ اسی قیل و قال میں متعدد اُن چیزوں کو نہ خریدا جو دل کو لبھا رہی تھیں۔

۹ ستمبر

میں جب سے یہاں آیا ہُوں نیند خُوب آ رہی ہے، شاید اس وجہ سے کہ وُہ مسائل سامنے نہیں جو اپنے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم مجھے سوتے چھوڑ کر، بیگم اظہار الدین کے ساتھ ننھے بچّوں کے فراکوں کے لیے نکل گئیں۔ واپس آئیں تو کہا: اب بھی ایک بچے کے لیے کچھ نہیں ملا، دوبارہ جانا پڑے گا۔

ہم حج میں تھکاوٹ کی وجہ سے خاصے کمزور سے لگ رہے تھے، اس لیے اظہار نے سوچا انہیں خُوب کھلانا پلانا چاہیئے۔ چنانچہ اچھّے سے اچھّے کھانے پکتے رہے مگر ہم چند لقموں سے زیادہ نہ کھاتے تو انہیں بے حد افسوس ہوتا۔

اظہار صبح ۸ بجے دفتر چلے جاتے، ۴ بجے واپس آتے۔ کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ پھر وُہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ۵ سے ۸ بجے تک کام کرتے۔ یُوں وہ دن رات جُتے رہتے۔ ان کا خیال ہے کہ جتنی محنت ہو سکے کر لینی چاہیے۔ بدلتے وقت کا کچھ ٹھیک نہیں۔

جب یہ رات ۸ بجے واپس آتے تو ہم بازار نکلتے۔ کسی دکان سے کوئی چیز پسند آ گئی تو خرید لی ورنہ دکان بہ دکان پھرنے کا شوق پُورا کیا جاتا۔ جس نوع کی بھی دکان میں گھُسا جاتا دُنیا جہان کا مال موجود پاتے۔ ہم نے خریدنے سے زیادہ دیکھنے میں دلچسپی لی کیونکہ ایک مختصر سی رقم زرِ مبادلہ کے طور پر ملتی ہے۔ پھر ہمارا ملک غریب ہے۔ اس کے وسائل سے جو ذاتی اغراض کے لیے تجاوز کرتا ہے وُہ ملک کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔

آج ہم ایک ایسے بازار میں گئے جہاں اُردو بولنے والے دُکان داروں کی خاصی تعداد تھی۔ اُن میں اردو و پنجابی بولنے والے کچھ دکانوں کے مالک تھے یا عرب دُکان داروں نے پنجابی اردو بولنے والے ملازم رکھے ہُوئے تھے۔ بازار سے گزرتے ہُوئے ہمیں چند پاکستانیوں نے کہا:

پولیس نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے لہٰذا بچ کے رہنا!

حالانکہ ان دنوں ایسا ہو نہیں سکتا، جب تک کہ سارے حاجی چلے نہ جائیں، وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر منچلوں نے ہمیں پاکستانی دیکھ کر محض چسکے کے لیے ایسے فقرے لُنڈھائے۔

چونکہ ہمارا زیادہ تر وقت گھر میں گزرتا ہے لہٰذا وی سی آر پر فلمیں دیکھتے رہتے ہیں تاکہ وقت کٹے، حالانکہ میں فلموں کا شوقین نہیں۔ رہی سہی کسر فلم سنسر بورڈ کے ممبر ہونے کی وجہ سے (زبردستی فلم دیکھنے کی وجہ سے) فلم بینی کا شوق رفوچکر ہو چکا ہے۔

۱۰ ستمبر

آج ہم نے اظہار کو اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹ دیے تاکہ وہ سیٹیں کنفرم کرا دیں۔ ضابطہ یہ ہے کہ او، کے ٹکٹ ہونے کے باوجود ٹکٹ کنفرم کرائے جاتے ہیں۔ مگر اظہار کو کامیابی نہ ہُوئی۔ ایک لمبی قطار میں کھڑے رہنے کے بعد کہہ دیا گیا:

چونکہ ۱۲ تاریخ کو سفر کرنا ہے لہٰذا ۲۴ گھنٹے پہلے آئیے تو یہ کچھ بتا سکیں گے۔

آج صبح بھی ایک فلم دیکھی۔ اب بھی بچّے فلم دیکھنے کے لیے وی سی آر کو سیٹ کر رہے ہیں۔ مگر مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک دو جو فلمیں دیکھنا تھیں دیکھ لیں۔ ہر وقت فلمیں دیکھنے والا بندہ نہیں ہُوں اس لیے میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مگر چھوٹے بچّے مجھے پھر گھسیٹ لائے۔

میں نے اُن سے کہا: فلم نہ دیکھیں گے وہ مچھلی کو پکڑنے والی گیم کھیلیں گے۔

چنانچہ اسی پر فیصلہ ہُوا۔ کھیل یہ تھا کہ ایک بکس میں ۲۴ کے قریب مچھلیاں ہیں، ہمارے ہاتھ میں کُنڈیاں ہیں۔ مچھلیاں مُنہ کھولتی ہیں۔ ہماری کُنڈی اگر مچھلی کے حلق میں پھنس جائے تو مچھلی کو کھینچ کر باہر نکالا جا سکتا ہے۔ یُوں ایک پوائنٹ مل جاتا ہے مگر تینوں چھوٹے بچّے ضابطے کے خلاف بے ایمانی پر اُتر آتے ہیں اس لیے مَیں ہار جاتا ہُوں۔ میری ہار پر تالی پٹتی ہے۔ لہٰذا بچے خوش اور میں پریشان۔ اس لیے کہ زندگی کی بازی نہ ہارنے والا شخص ہار رہا ہے۔ مگر وقت گزارنے کے لیے یہ نہ کروں تو کیا کروں!

اظہار کے بچّے مانوس ہو گئے ہیں۔ تین بچیّاں ہیں۔ بڑی بچّی جس کی عمر چھ سال کے قریب ہوگی، وہ تو سنجیدہ ہے مگر دونوں چھوٹی بچیّاں مجھ سے لاڈ پیار کرتی ہیں۔ کبھی چھُپ چھُپ کر چھیڑتی ہیں کبھی چھیڑ چھیڑ کر چھُپ جاتی ہیں۔ اب وہ دونوں بچیاں کہہ رہی ہیں؛

آپ ابھی کچھ دن اور یہاں رہیئے!

مگر انہیں کیا معلوم کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے، اس لیے ان کا دل رکھنے کے لیے کہتے ہیں؛

جب کہیں گی تب جائیں گے۔

وہ اتنی بات پر خوش ہو کر تالیاں پیٹ ڈالتی ہیں۔ وہ بھی خوش ہم بھی خوش!

شام کو جب گھُومنے نکلے تو اظہار اپنے دوست ارشاد احمد کے گھر لے گئے۔ سلیقے کے لوگ، سلیقے کا گھر، حد درجہ متواضع! مگر ہم تو جب سے ادھر آئے ہیں سَو نعمتیں سامنے رکھی ہیں۔ کھانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ گن کر صرف اتنے لقمے کھاتے ہیں جن سے جیا جا سکے۔ شاید یہ خوف دامن گیر ہے کہ بد پرہیزی ہو گئی تو بیمار ہو جائیں گے۔ پردیس میں بیماری کا خوف، خدا کی دی ہُوئی نعمتوں پر حاوی ہے۔ ہم جتنے لقمے کھاتے ہیں اتنے ہی لقموں پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

دن میں بھی اچھی عمارتیں مرعوب کرتی ہیں، شام کو سوا کرتی ہیں، اس لیے کہ ان کی خوبصورتیوں میں جگ مگ کرتی روشنی اضافہ کرتی ہے۔

۱۱ ستمبر

آج صبح اظہار صاحب دوبارہ ٹکٹ لے گئے تاکہ کنفرم کرائے جا سکیں۔ انہوں نے پاسپورٹ رکھ لیے اور ٹکٹ کے اُوپر ایک چِٹ لگا دی؛

جہاز کی روانگی سے چھ گھنٹے قبل آئیے۔

یہ عجیب تماشا ہے کہ چھ گھنٹے قبل بلائیں گے۔ یعنی مسافروں کی پریشانی کا قطعاً خیال نہیں۔ دُنیا میں ایسا مذاق کہیں نہیں ہوتا جیسا کہ یہاں ہوتا ہے۔

جدہ پر الوداعی نظر ڈالنے کے لیے رات کو نکلے۔ روشنیوں سے یہ شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں کی حکومت یہ چاہتی ہے کہ اس کے شہر یورپ کا مقابلہ کریں۔

جب شام ہوتی ہے تو آسمان کا رنگ ہلکا سُرخی مائل ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہوسکی، مگر ایسا ہوتا ہے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو اُن دنوں بھی کبھی کبھار آسمان کا رنگ سُرخ ہو جایا کرتا تھا۔ بڑے بوڑھے یہ کہا کرتے تھے، آسمان کا رنگ سُرخ ہوگیا ہے کہیں ضرور قتل ہُوا ہے۔

اُن دنوں قتل کبھی کبھار ہُوا کرتے تھے۔ اِن دنوں چونکہ قتل کرنا عام سی بات ہوگئی ہے اس لیے ہمارے ہاں آسمان نے سُرخ ہونا چھوڑ دیا ہے۔ مگر یہاں آسمان کا سُرخ ہونا قتل کا پیش خیمہ نہ ہوگا بلکہ کچھ جغرافیائی وجہ ہوگی' موسمیاتی وجہ ہوگی۔

اظہار نے اپنا کیمرہ نکالا، ایک دو تصویریں لیں۔ سر منڈوانے کی وجہ سے' واجبی سی شکل و صورت کے ساتھ کیا تصویر اُترے گی! اس لیے میں تصویر کھنچوانے پر آمادہ نہیں مگر تصویریں کھنچ رہی ہیں۔ ہاں ایک زمانہ تھا جب میری شکل بھی کیمرے کی تصویر کو خوب صورت بناتی تھی۔ مگر وُہ دن دُور چلے گئے، بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔ مگر ہم اس کے استقبال سے گھبراتے ہیں' سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ہمارے ایسا کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بڑھاپا تو خود اپنا آپ منوا لیتا ہے۔

میری اہلیہ نے بچّوں کے لیے کپڑے لتّے خریدے۔ ایک دو چیزیں اپنے لیے بھی خریدیں مگر میرے لیے کچھ نہ خریدا۔ کچھ مجھے بھی ٹھکانے کا شوق نہیں ہے کچھ بیگم صاحبہ کی بھی جیب خالی ہوگئی۔ لہٰذا میں ذاتی طور پر اس تہمت سے بچ گیا جو حاجیوں پر لگائی جاتی ہے کہ ادھر آتے ہیں تو اتنے طواف خانہ کعبہ کے نہیں کرتے جتنے کہ دُکانوں کے! دُکان دار بھی ایک کائیاں، عام حالات میں چیزیں سستی، حاجیوں کے لیے مہنگی۔ لُوٹ لو اور لُٹ جاؤ کا ایک چکّر!

بیگم اظہار نے کہا، میں بازار جا رہی ہُوں۔ مگر میری اہلیہ نے جواب دیا، کل سفر کرنا ہے اس لیے اب آرام کروں گی۔

مجھے معلوم ہے یہ آرام کس لیے ہوگا۔ جیب خالی ہے، دکانوں میں مال بھرا ہُوا ہے۔

۱۲ ستمبر

آج واپس وطن روانگی کا دن ہے۔ رات کو بھی ٹھیک سے نیند نہ آئی۔ ایسا اپنے وطن میں بھی ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے ہوتا ہے۔ کاموں کی بھیڑ میں نکلنا نیند اڑا دیتا ہے۔ مگر یہاں تو اپنے وطن جا رہے تھے۔ ایک عرصے کے بعد بچّوں کو دیکھیں گے۔ یہاں جو اس ملک کو چھوڑنے کا وسوسہ ہے وُہ یہ کہ یہاں آنے کی تو لوگ دُعائیں مانگتے ہیں۔ اللہ کا گھر، رسولؐ کا روضہ۔ مگر ہم ان شہروں سے دُور جا رہے ہیں

جو سکون کا گہوارہ ہیں، جو تمناؤں کی آماجگاہ ہیں۔ ایک حسرت وطن پہنچنے کی، ایک حسرت سرزمینِ حجاز چھوڑنے کی۔ گومگو کا عالم ہے۔ بالآخر اس سرزمین کو چھوڑنا پڑے گا جس پر پہنچنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ یہ داستانِ ہجر و وصال عجیب ہے۔

ہم نے طے کر لیا تھا کہ یہاں ہم یہ بھی خرید، وہ بھی خرید کے چکر میں نہ پڑیں گے۔ کیونکہ آدھی خلقت یہاں حج کرنے آتی ہے اور آدھی خریدنے!

یہ عجیب رواج ہے کہ جو لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں اُن کے رشتہ دار اُن سے توقع رکھتے ہیں کہ گئے ہیں تو تحفے تحائف لائیں گے۔ حالانکہ جو زرِ مبادلہ ملتا ہے وہ اتنا قلیل ہوتا ہے کہ آدمی عزت کے ساتھ واپس ہی چلا جائے تو غنیمت ہوتا ہے چہ جائیکہ وسیع پیمانے پر خریداری ہو!

ہمارا انٹرنیشنل پاسپورٹ تھا۔ مگر پی‘ آئی‘ اے والوں نے ہمیں پرواز سے چھ گھنٹے قبل بلایا، بڑی الجھن ہوئی۔ چھ گھنٹے قبل پہنچے، پانچ گھنٹے کی پرواز تھی۔ ایک گھنٹہ جہاز تاخیر سے اُڑا۔ یُوں بارہ گھنٹے سفر میں گزرے۔ پھر لاہور ایئرپورٹ پر کسٹم کا عملہ اپنی کارگزاریاں دکھا رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹے یہاں صرف ہُوئے، تقریباً نڈھال لاہور پہنچے۔

لاہور بہت سے رشتہ دار ہوائی اڈے پر پہنچے ہوئے تھے حالانکہ جہاز خاصا لیٹ تھا۔ بہرحال جب گھر پہنچے تو صبح کے چار بج چکے تھے جدہ سے ہم ایک بجے اپنے مستقر سے نکلے تھے۔

میں نے سامان گھر رکھا اور اپنے بیٹے سے کہا: چلو پہلے والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے آئیں۔ اس نے کہا: آپ تھکے ہُوئے ہیں آرام کر لیں، بعد میں چلے جانا۔ مگر میرا دل نہ مانا۔ اندھیرے اندھیرے ہم قبرستان پہنچ گئے۔ اس دن قبرستان جانے والے سب سے پہلے ہم ہی لوگ تھے۔ فاتحہ کا جو لطف آج آیا پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

نقوش کے خاص نمبر

جو بڑی تھوڑی تعداد میں دستیاب ہیں

(۱)	رسولؐ نمبر	(۱۳ جلدیں)	فی جلد	۱۲۵ روپے
(۲)	بیاضِ غالب (بخطِ غالب)		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۳)	غالب نمبر ۳		فی جلد	۵۰ روپے
(۴)	افسانہ نمبر	(دو جلدیں)	فی جلد	۷۵ روپے
(۵)	ادبی معرکے نمبر	(دو جلدیں)	فی جلد	۷۵ روپے
(۶)	خطوط نمبر	(تین جلدیں)	فی جلد	۵۰ روپے
(۷)	آپ بیتی نمبر	(جلد دوم)	فی جلد	۱۰۰ روپے
(۸)	میر نمبر ۱		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۹)	میر نمبر ۲		فی جلد	۹۰ روپے
(۱۰)	اقبال نمبر ۲		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۱)	انیس نمبر		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۱۲)	منٹو نمبر		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۳)	عصری ادب نمبر		فی جلد	۶۰ روپے
(۱۴)	سالنامہ ۱۹۷۷ء		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۵)	سالنامہ ۱۹۷۹ء		فی جلد	۵۰ روپے

نقوش کے عام شمارے

(۱۶) شمارہ نمبر ۵ فی جلد ۲۰ روپے (۱۷) شمارہ نمبر ۶ فی جلد ۲۰ روپے
(۱۸) شمارہ نمبر ۱۱ فی جلد ۲۰ روپے (۱۹) شمارہ نمبر ۱۳ فی جلد ۲۵ روپے
(۲۰) شمارہ نمبر ۱۴ فی جلد ۲۰ روپے (۲۱) شمارہ نمبر ۳ فی جلد ۳۰ روپے
(۲۲) شمارہ نمبر ۱۱۴ فی جلد ۲۵ روپے (۲۳) شمارہ نمبر ۱۱۵ فی جلد ۲۵ روپے

رسالہ 'نقوش' بیرا اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کا مقام

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ہم قومی سطح پر سوچیں یا بین الاقوامی سطح پر، جب مجلّاتی صحافت کی اصطلاح سامنے آتی ہے تو تصور کے پردے پر صرف ادبی رسائل نمودار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تمام عوام پسند ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ اور سہ ماہی رسائل بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں جو اگرچہ علم وادب کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن ایسا خیال افروز مواد بہت کم پیش کرتے ہیں جو اہلِ دانش اور اہلِ علم کے لیے بھرپور علمی غذا کا کام دے۔ بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجلّاتی صحافت میں عوام پسند رجحانات نے خالص علمی اور ادبی رسائل کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے رسائل دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اہلِ علم انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں لیکن اہلِ علم کی تعداد ہر معاشرے میں کم ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے رسائل کی اشاعت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا درست نہیں کہ اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔ چونکہ ان کے قارئین اہلِ علم اور اہلِ دانش ہوتے ہیں اور وہی معاشرے میں رہنمائی کا فرض سرانجام دیتے ہیں اس لیے محدود اشاعت کے باوجود ان رسائل کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کا مطالعہ عوام پسند رسائل کی روشنی میں نہیں، خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لیے دنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں ان رسائل کے لیے "کوالٹی میگزین" کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دنیا میں "کلچرل میگزین" کی۔ بعض مغربی ممالک میں انھیں HIGH BROW ہائی برو میگزین بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ رسالے جو بلند ذہنی سطح کے لوگ پڑھتے ہیں۔ اپنے ہاں رسمی طور پر ایسی تمیز کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ لیکن جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں اور کون سے خواص پسند۔ کون سے کم و بیش تفریحی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیا کرتے ہیں۔ پس اس مقالے میں مَیں صرف خیال افروز علمی و ادبی صحافت کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ "نقوش" کا مقام کیا ہے۔

برعظیم میں مجلّاتی صحافت کا آغاز خالص علمی رسائل سے ہُوا جو کم و بیش سوا سو سال پہلے اجنبی راج کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ برعظیم کے پڑھے لکھے لوگوں کو بتایا جائے کہ جس اجنبی طاقت کے زیرِ سایہ وہ زندگی گزار رہے ہیں وہ ایک علمی نشاۃِ ثانیہ کی نقیب ہے۔ ہمارا پہلا آزاد رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا جسے سرسید نے جاری کیا اور اس کے ذریعے سے نہ صرف اسلامی معاشرے میں علمی تجدّد کو فروغ دیا بلکہ اردو زبان میں ایک ایسے مقصدی ادب کی بنیاد رکھ دی

جس نے آگے چل کر اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اُسے جمود سے نجات دلا کر اس قابل کر دیا کہ وہ نئے خیالات اور نئے اسالیب کو اپنے آپ میں سموئے اور اس طرح معاشرے کی خدمت کا فرض سرانجام دے۔ "تہذیب الاخلاق" کی تقلید میں کئی رسالے نکلے اور انہوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

ہماری مجلاتی صحافت میں "مخزن" کو دوسرے سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ بھی محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا علمبردار تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کو نئی اصناف سے آشنا کیا جائے نثر اور شاعری میں نئے تجربے کیے جائیں اور مغربی ادب کے شہ پارے اردو میں منتقل کئے جائیں۔ اس دور میں کچھ اور رسائل بھی نکلے جن میں عبدالحلیم شرر کا "دلگداز" اکبر شاہ نجیب آبادی کا "عبرت" محمد دین فوق کا "کشمیری میگزین" اور مولانا ظفر علی خان کے دو رسالے "دکن ریویو" اور "پنجاب ریویو" نمایاں تھے۔

اس صدی کے آغاز میں جب سیاست منظرِ عام پر آئی تو چند ایسے رسائل نکلے جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے علمبردار تھے۔ ان میں حسرت موہانی کا "اردوئے معلّٰی" بدرالزماں بدر کا "شمسِ بنگالہ" ظفر الملک علوی کا "الناظر" دیا نرائن نگم کا "زمانہ" سید سلیمان ندوی کا "معارف" جامعہ ملیہ اسلامیہ کا "جامعہ" اور انجمن ترقیِ اردو کا "اردو" شامل ہیں مؤخر الذکر رسالہ سیاسیات سے خالی تھا لیکن باقی رسائل میں سے بعض میں سیاست نمایاں تھی اور بعض میں علم السیاست، تاریخ اور عمرانیات۔ ان رسالوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک تو نئی کتابوں پر ٹھوس تبصرے کیے جاتے تھے، دوسرے علمی اور تہذیبی خبریں بڑے سُلجھے ہوئے انداز میں پیش کی جاتی تھیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد عوام پسند ادبی رسائل کا دور دورہ ہُوا۔ ان میں "کہکشاں"، "ہزار داستان"، "خیالستان" "رومان" اور بعض دوسرے رسالے تو شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے، لیکن "نگار" "ساقی" "نیرنگِ خیال" "عالمگیر" "ہمایوں"، "ادبی دنیا" اور "ادبِ لطیف" نے طویل زندگی پائی اور ماشاءاللہ ان میں سے چند رسائل اب بھی زندہ ہیں، ان رسائل نے نئے ادیبوں کے فن کو نکھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی میں اتنا نمایاں کردار ادا کیا کہ نہ صرف مجلاتی صحافت کی تاریخ میں بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں بھی اُنھیں کبھی نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔ یہ رسالے صرف عوام پسند نہیں تھے خیال افروز بھی تھے اور یہ علم و ادب کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے تھے کہ اہلِ دانش اُنھیں قدر کی نظروں سے دیکھتے رہے۔

اِسی دَور میں یہ کوشش ہُوئی کہ رسالوں کے خاص نمبر نکالے جائیں جن میں کسی مخصوص موضوع پر بھرپور مواد پیش کیا جاتے "نیرنگِ خیال" سے سالناموں کا آغاز ہوا۔ جو اگر اُس زمانے کی پروڈکشن کے معیار کی روشنی میں دیکھے جائیں تو ایک عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی مخصوص موضوع پر خاص نمبر کا آغاز بھی "نیرنگِ خیال" سے ہُوا جس نے پہلی مرتبہ "بانگِ درا" کے سائز میں تین ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل 'اقبال نمبر' شائع کیا[1]۔ "زمانہ" نے ایک ضخیم 'پریم چند نمبر' چھاپا۔ "عالمگیر" نے 'روسی ادب نمبر' پیش کیا اور "ہمایوں" نے 'روسی ادب نمبر' اور 'فرانسیسی ادب نمبر' شائع کیے۔ اور لاہور سے

---

[1] یہ نمبر ۴۰۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ جو ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں چھپا اور جسے بعدازاں ادارہ نقوش نے اپنے روایتی انداز میں مزید اضافوں کے ساتھ نومبر ۱۹۷۷ء میں چھاپا۔ (ادارہ)

مجید الملکی مرحوم نے "نرگس" کا 'نظم نمبر' مرتب کر کے ایک اور طرح ڈال دی۔

میرے نزدیک "نقوش" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اِکا دُکا رسالہ کبھی کبھی اور نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا۔ وہ اس نے ایک بہت بڑے پیمانے پر، ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلو پیڈیائی رنگ بخش دیا۔ شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، لاہور نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، سعادت حسن منٹو نمبر اور اسی قسم کے دوسرے نمبر ایسے اہم اور نادر مواد پر مشتمل ہیں جو اکٹھا نہ ہوتا تو اردو ادب کا بہت بڑا ضیاع ہوتا۔ ان نمبروں کی ترتیب میں جس ریاض سے کام لیا گیا ہے مجلاتی صحافت میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ محققین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ کیونکہ انھیں جتنا مآخذی مواد "نقوش" کے خصوصی نمبروں میں ایک جگہ اور اچھی اور مستند صورت میں مل جاتا ہے۔ اتنا بے شمار کتابوں، دستاویزوں اور فائلوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ "نقوش" نے جن موضوعات پر خاص نمبر چھاپے ہیں اُن پر مزید تحقیق کا کام سہل ہو گیا ہے اور اس کے لیے محققین یقیناً "نقوش" کے احسان مند ہیں۔

یہ نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو ان کی جامعیت میں فرق آ جاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام "نقوش" نے کر دکھایا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتاب، انسائیکلو پیڈیا اور مجلے کو ایک جگہ سمو کر اور اُسے حُسن بخش کر "نقوش" نے مجلاتی صحافت کو چار چاند لگا دیے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو، تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے وہ فردِ واحد سرانجام دے سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں "نقوش" کے عام نمبر بھی خاص نمبر ہوتے ہیں اور وسیع ضخامت کی وجہ سے اس میں طویل مختصر افسانے، ناولٹ، طویل مقالے اور کلاسیکی شہ پارے بغیر کسی تکلف کے دئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لکھنے والے تنگ دامانی کی قید سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں اور اس طرح اپنے موضوع سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ رسم اب چل نکلی ہے۔ پہلے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے 'ادبی دنیا' کو یہی رنگ دیا اور اب "اوراق" اور "فنون" بھی اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔

"نقوش" کی ایک اور ادا جو مجھے بھاتی ہے، یہ ہے کہ یہ صرف ادب پیش نہیں کرتا۔ علم کے ہر شعبے پر سیر حاصل مواد پیش کرتا ہے۔ یہ ہماری مجلاتی صحافت کی کلاسیکی روایت ہے جسے بعد کے ادوار میں بہت سے رسالوں نے ترک کر رکھا تھا حالانکہ نصف صدی قبل کے مقابلے پر آج اس بات کی اور بھی ضرورت ہے کہ مجلاتی صحافت محض سکہ بند ادب کی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ آج کے زمانے کے اہلِ دانش کی دوسری ذہنی ضروریات کی تکمیل کا بھی سامان فراہم کرے۔

"نقوش" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ مجلہ کسی ایک دبستانِ ادب یا دبستانِ خیال سے وابستہ نہیں۔ ہر دبستانِ خیال کا ادیب اور شاعر اس کے صفحات پر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "نقوش" کو کلاسیکی روایات

عزیز ہیں لیکن یہ تجدد کا مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ کلاسیکی اور جدید روایات کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔

چونکہ ہمارے ہاں نئی باتیں عام طور پر مغربی ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اس لیے میں نے سوچا شاید "نقوش" نے جو رنگ لے رکھا ہے وہ بھی کسی دُوسرے ملک کی تقلید پر مبنی ہو۔ چنانچہ میں نے مقالہ لکھنے سے پہلے مختلف ممالک کی مجلاتی صحافت پر کتابیں اور مقالے پڑھے اور برطانیہ، امریکہ، سوویت یُونین، فرانس اور جرمنی کے بہت سے علمی اور ادبی رسالے دیکھے اور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنی جامعیت، اتنی خصوصیات کے حامل اور اتنی ضخامت کے رسائل دنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں ہیں اس لیے میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہُوں کہ "نقوش" دنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلّہ ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ میں نے اس مقالے میں دیدہ و دانستہ طفیل صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بہت شرمیلے ہیں اور تعریف سے اور بھی شرمائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب کسی کی تعریف کی جائے تو وہ "خلیفہ" بن جاتا ہے اور محض ماضی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ محمد طفیل "خلیفہ" نہ بنیں۔ تیسری وجہ یہ ہے خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کسی کی تعریف کی جائے لوگ تعریف کرنے والے سے محرکات وابستہ کرتے ہیں اور میری ذات سے پہلے ہی مختلف امور میں اتنے محرکات وابستہ کر دئے گئے ہیں کہ مزید محرکات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی یہ پرانی ریت ہے کہ ہم کسی شخصیت کی اُس کی زندگی میں تعریف نہیں کرتے، مبادا کہ ہماری عظمت میں فرق آ جائے پس ان حالات میں معذرت خواہ ہوں کہ جنابِ طفیل کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین ادا نہیں کر سکا۔

طفیلِ نقوش

سید ضمیر جعفری

"نقوش" اردو کے ان مجلوں میں سے ہے جو گھٹنوں چل چل کر جوان نہیں ہوئے بلکہ براہِ راست عالمِ شباب میں پیدا ہوئے اور غالباً اپنی عمر کے معاصرین میں تنہا مجلہ ہے کہ کچھ مدت ہسپتال میں رہنے کے باوجود اس کی صحت اور جوانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا بلکہ اس کی چھب اور پھبن میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا ـــــ طفیل اس کے روحِ رواں ہیں اور روحِ رواں کی طرح اندر ہی اندر کہیں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں ایک خاصی مدت تک "وہ مکتبہ فروغِ اردو" زیادہ، "نقوش" کم تھے! "نقوش" کا غلغلہ عام تھا مگر طفیل کا نام خواص تک ہی محدود تھا۔

طفیل کے کارناموں کی تو میرے دل میں بے حد قدر ہے لیکن اُن سے ذاتی ملاقاتوں کی پونجی بہت ہی قلیل ہے۔ گنتی کی دو تین ملاقاتیں۔ وہ بھی ایسی سُوکھتی دوڑتی ہُوتی کہ صورت نظر آ جاتے مگر صورتِ حالات نظر نہ آتے۔

میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہُوئی۔ ہم لوگ یعنی کرنل مسعود احمد، کیپٹن انعام اللہ قاضی اور میں اُن دنوں راولپنڈی سے "بادِ شمال" کے نام سے ایک روزنامہ نکالتے تھے جس کے قدم جنرل چودھری کی فوج کی طرح جمنے سے پیشتر اکھڑ چکے تھے۔ انعام قاضی ہمارے شعبۂ انتظامیہ کے "باس" تھے۔ طفیل، اُن کے چھوٹے بھائی عطاءُ اللہ قاضی کے ساتھ دیوار دبستان پر لام، الف لکھتے رہے تھے۔ سو ایک روز انہیں عطاءُ اللہ کے طفیل، طفیل صاحب ہمارے دفتر میں آ نکلے، مگر بس چھوٹے مشرقی بھائیوں کی طرح بڑے بھائیوں کے سامنے مراقبے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ انعام قاضی چونکہ ان سے زیادہ ان کے بزرگوں کو جانتے تھے۔ لہذا تعارف پر بزرگانہ شفقت کی دودھ ملائی چھڑکتے ہُوئے بولے،

"طفیل بہت ہی شریف لڑکا ہے....."

طفیل اس وقت واقعی ایک پتلا دُبلا، نوخیز، شرمیلا سا لڑکا ہی معلوم ہوتے تھے۔ طفیل گئے تو مسعود آ گئے۔ مسعود ہم دونوں کے "باس" تھے۔ اپنے اندر جھانک کر، اپنی کوتاہیوں کو ڈھونڈ کر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے عمل میں، خود اپنی ذات کا ان سے زیادہ سخت گیر دشمن کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اخبار کے معاملات میں ہماری تن آسانی اور بے تدبیری پر، وہ اپنے سمیت ہم تینوں کو اکثر لعنت ملامت کرتے رہتے تھے۔ اب اخبار کے "تین بڑوں" کی کانفرنس شروع ہوئی مگر انعام نے انتظامی امور کی تمہید بھی طفیل ہی کے نام سے اٹھائی۔ بقول شخصے:

موضوعِ گفتگو تو مری جاں کچھ اور تھا
دورانِ گفتگو میں تری بات آ گئی

کہنے لگے،

"ابھی ابھی طفیل اُٹھ کر گئے ہیں۔"

"اچھا، وُہ اپنے آرڈی ننس والے طفیل راجہ۔"

مسعود بولے،

"سنا ہے اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے ہیں۔"

"ارے بھئی! وُہ تمہارا طفیل نہیں، ہمارا طفیل۔" انعام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: "مکتبہ فروغ اردو والا طفیل بھئی! اس لڑکے نے کمال کر دیا۔ سوچتا ہُوں ہم بھی اخبار بند کر کے مکتبہ کھول لیں۔"

مسعود نے تجویز کو یک قلم رد کر دیا، بولے: "اخبار تو خود بخود بند ہو جائے گا لیکن ہم سے مکتبہ بھی نہیں چل سکتا۔ کوئی سا بھی کام ہو، اگر اس کے پیچھے بھرپور لگن نہ ہو، بے پناہ محبت نہ ہو، مکمل منصوبہ بندی نہ ہو تو کام آگے نہیں بڑھتا۔"

مسعود نے یہ بات طفیل کے حوالے سے نہیں کی تھی لیکن طفیل نے زندگی میں عزت و اہمیت کا جو مقام حاصل کیا ہے میں سمجھتا ہُوں یہ بڑی حد تک اُن کی اپنے کام میں سچی لگن، بے پناہ مشقت اور جامع منصوبہ بندی کا ثمرہ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد لگاتار اٹھارہ برس تک اُن سے کسی باقاعدہ ملاقات کا کوئی موقع نہ آیا۔ طفیل صاحب اس عرصے میں پیچھے ناشر کی مسند سے اُٹھ کر آگے ایڈیٹر کی کرسی پر درانہ آ بیٹھے تھے اور ترتیب کے علاوہ تخلیق کے مراحل میں بھی بڑی تیزی سے نقش آرائی کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ اس دھج اور دُھوم، شان اور شکوہ قامت اور جسامت کے خاص نمبر شائع کئے کہ بابائے اردو کے لیے نقوش کا خاص شمارہ "رسالہ کاہے کو تھا توپ خانہ تھا"۔ پطرس نمبر دیکھ کر، علامہ نیاز فتحپوری نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر طفیل میری موت پر اسی ڈیل ڈول کا نمبر شائع کرنے کا وعدہ کریں تو میں ابھی مرنے کو تیار ہُوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وُہ خاص شمارے نکالنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں جسامت ہی نہیں "نقوش" کی صحت بھی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ وہ محنت، ذہانت اور نفاست سے اپنے خاص شماروں کو علم و ادب کی تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ ادب و تہذیب کی حفاظت و سربلندی کے واسطے عظیم الشان قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ان کی شہ نشینوں اور شیش محلوں، درباروں اور دالانوں میں دُور دراز کی دشوار گزار کانوں سے ایسے ایسے موتی اور ہیرے کاٹ کر ڈھونڈ کر سجا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے نقوش کے ہر خاص نمبر پر حرفِ آخر نہ سہی، حدِ آخر کا گمان ضرور ہوتا ہے لیکن ادبیات کا یہ "کولمبس" ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا "براعظم" ڈھونڈ لاتا ہے۔ "نقوش" طفیل کی محبت کا سودا ہے۔ یہ الگ بات ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ محبت انھیں راس بھی آ گئی ہے۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہُوں اس عرصے میں میری ان سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ایک بے قاعدہ سی ملاقات مسلسل جاری رہی۔ میں جب کبھی لاہور جاتا ایبک روڈ پر چودھری عبدالحمید کے مکتبۂ کارواں پر عموماً ضرور جاتا۔ طفیل صاحب

کا مکتبہ ان کی بغل میں واقع تھا، سو، اس کوچے میں آتے جاتے ان کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ کبھی پروف پڑھ رہے ہیں، کبھی کتابیں بیچ رہے ہیں، کبھی ادیبوں کے سامنے چائے رکھ کر خود ان کی صورت تک رہے ہیں، کبھی لکھنے میں مصروف، کبھی کاغذوں سے گتھے ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھتے ہوں گے، اور جیسا کہ بعد میں خود اُنھیں سے معلوم ہوا واقعی دیکھتے تھے لیکن دونوں طرف سے بس وہی نگاہ استعمال ہو رہی تھی جو بظاہر نگہ سے بھی کم ہوتی ہے خدانخواستہ ہم میں کوئی کھچاؤ نہ تھا، البتہ ملاقات برائے ملاقات کے لیے بے دست و پا کر دینے والا کوئی ذاتی لگاؤ بھی موجود نہ تھا۔ نہ اِس طرف تمنا تھی نہ اُس طرف طلب۔ آخر میں جب بھید کھلا تو بیچ میں سے غالب کا مصرع نکلا:

وُہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

طفیل اس مغالطے میں تھے کہ میں ان کو پہچان نہیں رہا، میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وُہ مجھے نہیں پہچان رہے۔ واقعہ یہ تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی رانی خان ہو، خواہ مخواہ تعلقات پیدا کرنے کے شوق میں راستہ روک کر کسی سے ملاقات کرنے کے نہ وہ قائل تھے نہ میں۔ مجھے طفیل کی یہ ادا پسند آئی۔

مئی ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے نامور مدیر جناب الطاف حسن قریشی نے میرے مکرم دوست اور اردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی رونمائی کے لیے لاہور میں ایک تقریبِ خاص کا اہتمام کیا تو وہاں طفیل صاحب سے بھی ملاقات ہوگئی اور نہ معلوم کیوں انہوں نے کرنل محمد خان، کیپٹن صدیق سالک اور مجھے اگلی دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانے کی دعوت دے دی اور نہ معلوم کیوں ہم نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت میں جا کر محسوس ہُوا کہ اُنھوں نے دعوت کا تردّد غالباً یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ ہم لوگ کھانا کتنا کھاتے ہیں اور کس طرح کھاتے ہیں؛ وُہ کھانے میں تو شریک ہوئے لیکن گفتگو کا صرف ایک آدھ لقمہ ہی لیا یا دیا اِدھر کرنل محمد خان اور میں بھی ٹیبل ٹاک کے دھنی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا لمبا چوڑا کورس تیس چالیس منٹ میں ختم ہوگیا۔ ہوٹل سے آپ ہمیں اپنے ادارے میں لے گئے اور ازرہِ محبت نقوش کے تازہ تین منزلہ خطوط نمبر کے گرانڈیل مگر دلنواز پیکٹوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ ان سے رخصت ہوئے تو "خطوط نمبر" ہمارے ہاتھ میں تھا بلکہ ہم اس کے ہاتھ میں تھے۔ "نمبر" کیا تھا نمبروں کا بریگیڈ تھا جس کے ساتھ مسلسل کئی روز تک نبرد آزمائی جاری رہی۔ اب بھی ہمیں محاذ پر چھوڑ گئے ہیں ورنہ وُہ بدستور راستہ روکے کھڑا ہے۔ بعض اوقات خاموشی ہی خاموشی میں جو مسافت طے ہو جاتی ہے وہ گفتگو میں نہیں ہوتی۔ اب جو ملاقاتوں کا دروازہ کھلا تو دو تین ماہ بعد راولپنڈی میں ایک ہی دن میں، ان سے دو ملاقاتیں ہوگئیں، جن میں ہم نے اُن کے مُنہ سے چند ایسے چٹکتے ہوئے فقرے سُنے کہ بس لطف ہی آگیا۔ ؎

سنگ یُوں ترشا کہ رخسارِ بُتاں بننے لگا

محاورے کی رُو سے لوگ عموماً دوچار ملاقاتوں میں کھل جاتے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں فی الحال یہ اندازہ تو ہوگیا ہے کہ دوچار ملاقاتوں میں کھلنے نہیں پاتے۔ لیکن یہ اندازہ ابھی نہیں ہو سکا کہ کتنی ملاقاتوں میں کھل سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے

کہ بعض لوگوں سے وُہ پہلی ملاقات ہی میں کُھل جاتے ہوں اور بعضوں سے کُھلتے ہی نہ ہوں۔ یعنی ع

اُو بود من نہ بودم و من بودم او نہ بود

البتہ اِن ملاقاتوں میں یہ احساس ضرور ہُوا کہ آپ بولتے کم ہیں دیکھتے، سُنتے اور سمیٹتے زیادہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں سے زیادہ ان کے انکسار کا اقتضا بھی شامل ہے۔ پھر ان کی مسلسل اور گرانبار مصروفیت؟ ع

کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نقوش کا کوئی ایک خاص نمبر ہی پُوری زندگی کی مصروفیت کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اِس حالت میں ان جی مصروف شخص کے لیے ضروری ہے کہ وُہ بولنے پر لکھنے کو اور کام کرنے کو ترجیح دیں۔ شاندار اور دیرپا کارنامے سرانجا دینے والے افراد میں یہ خوبی عموماً موجود ہوتی ہے بہرحال یہ سب میرے ذاتی قیاسات ہیں جو قبل از وقت بھی ہو سکتے ہیں

ع نہیں زنجیر بھی محرم کہ دیوانوں پہ کیا گزری

طفیل صاحب کی ذات کو جب میں اِن کی تحریروں، اِن کے کارناموں اور ان کی زندگی کے آئینے میں دیکھتا ہے تو ایک ایسے شخص کا امیج (IMAGE) اُبھر کر سامنے آتا ہے جو کسی بلند، دشوار گزار پہاڑ کی تلہٹی میں پیدا ہوا ہو بے وسیلہ بے سروسامان، لیکن فیضانِ قدرت سے فیضیاب ہے۔ اس نے چوٹی کی طرف دیکھا اور پہاڑ کو سر کرنے اُمنگ اس کے دل میں پیدا ہو گئی۔ لوگ مسکرائے کہ میاں —— چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے! نہ تیشہ، رسّی، نہ آکسیجن۔ بعضوں نے بر ملا ٹوکا کہ پہلے اس پہاڑ کا جغرافیہ تو پڑھ لو، تم اس کے پیچ و خم سے ناواقف ہو۔ چوٹی ہوا میں تمہاری سانس رُک جائے گی۔ تمہارے لیے بس یہی کافی ہے کہ اُوپر جانے والے لوگوں کے لیے نیچے سے ترائی۔ راشن پانی سپلائی کرتے رہو۔ یہ اندیشے بے بنیاد بھی نہ تھے۔ مگر یہ شخص اپنی دُھن کا پکّا تھا۔ وہ سفر پر روانہ ہو گیا دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ کس طرح قدم قدم پر اپنے ہاتھوں سے پتھر اور چٹانوں کو تراشتا ہُوا چوٹی کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نقوش کے مختلف خاص شمارے، اس طویل کٹھن سفر کے مختلف مرحلوں پر طفیل کے آباد کردہ وسیع و شاداب کیمپ ہیں، وسیع سے وسیع تر، خُوب سے خُوب تر۔ کیمپ نہیں، قصبے اور شہر۔ وہ انجینئر ہی نہیں "آرکی ٹیکٹ" یعنی خلّاق بھی ہے۔ دُنیائے ادب کے ان شہروں میں اِس کے اپنے ذہن سے نکلے ہُوئے خیابانوں کا حُسن بھی دید ہوتا ہے۔ شخصیت نگاری میں اس کا شُبک، میٹھا، بے تکلف اور شگفتہ اسلوب اپنی ایک الگ چلبل اور کسک رکھتا طفیل، میرے نزدیک لگن، خلوص اور دریافت کے اِسی فاتح جذبے کا نام ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ طفیل پہاڑ کی چو کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس پہاڑ کی کوئی چوٹی نہیں ہوتی، اس کی چوٹی افق کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔

سلیوٹ

کرنل محمد خاں

طفیل صاحب سے بے شک میرا تعارف نہیں، لیکن نقوش سے میری پرانی واقفیت ہے۔ واقفیت ہی نہیں خاصا گہرا یارانہ ہے اور بالواسطہ طفیل صاحب سے بھی عقیدت ہے کہ نقوش اور طفیل میں کوئی فرق نہیں۔ نقوش طفیل کی شخصیت کا عملی مظہر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس شخصیت کا مظہر نقوش ہو وہ بہرحال غیر معمولی اور قابلِ محبت شخصیت ہوگی۔ جسے نقوش پسند ہے اُسے طفیل سے محبت کیے بغیر چارا نہیں۔ آپ نقوش پسندوں کا شمار کرلیں جو آپ کو طفیل پرستوں کا اندازہ ہوجائے گا۔ ایسی ہمہ گیر محبوبیت ہر کسی کا نصیب نہیں۔

بحیثیت سپاہی مجھے نقوش خاص طور پر عزیز ہے کہ اس کے چند واضح سپاہیانہ انداز ہیں۔ فوج میں سپاہی کی ٹرن آؤٹ (TURN OUT) یعنی یونیفارم کے بانکپن اور قدوقامت کی دلآویزی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مجھے نقوش کے ہر شمارے کی آن بان دیکھنے سے یہی احساس ہوتا ہے جیسے ہماری فوج کا کوئی جوانِ رعنا ایک بے عیب وردی میں پریڈ کے میدان میں انسپکشن کے لیے آکھڑا ہو اور کمپنی کمانڈر نے دیکھتے ہی کہہ دیا ہو: اے ون۔ کیری آن سارجنٹ میجر
(A. ONE. CARRY ON SEARGENT MAJOR)

رسالے اور بھی ہیں۔ اچھے بھی ہیں۔ لیکن ان میں وہ دوگونہ شانِ دلربائی نہیں جو نقوش سے مخصوص ہے۔ نقوش فقط جمال ہی نہیں جو تقریباً ہر رسالے نے کم از کم سرورق کی حد تک پیدا کرلیا ہے۔ نقوش کا ایک انداز جلال بھی ہے جو کسی دوسرے جریدے کو میسر نہیں۔ نقوش کے نئے شماروں اور خصوصاً خاص نمبروں کی دید سے جہاں جگرِ لالہ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے وہاں اُن کی ورق گردانی سے دریاؤں کے دل بھی دہلتے ہیں اور یہ سراسر مجاہدانہ شان ہے۔

مجھے بعض اوقات شبہ ہونے لگتا ہے کہ طفیل صاحب کہیں خفیہ طور پر ہمارے سٹاف کالج کوئٹہ کا کورس تو نہیں کر آئے کیونکہ ان کی تدوینِ نقوش کی پالیسی اسی جنگی سٹریٹجی (STRATEGY) سے بے حد مشابہ ہے جس کی تعلیم اس مشہور فوجی درس گاہ میں دی جاتی ہے۔ ماہرینِ حرب کے نزدیک جنگ کے آٹھ مسلّمہ اصول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کوئی جرنیل ان سے انحراف کرکے جنگ نہیں جیت سکتا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ طفیل صاحب نقوش کی ترتیب میں ان اصولوں کے، کئی جرنیلوں سے بھی زیادہ پابند اور دلدادہ نظر آتے ہیں۔

مثلاً پہلا اصولِ جنگ ہے: MAINTENANCE OF OBJECTIVE.

یعنی مقصد کے تعین کے بعد اپنی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز رکھنا اور کسی دوسرے کام میں نہ اُلجھنا۔ اقبال کی اصطلاح میں آپ اِسے جنون کہہ سکتے ہیں۔ میں گزشتہ کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ طفیل صاحب کے سامنے فقط ایک ہی مقصد ہے۔ یعنی نقوش کو خوب سے خوب تر بنانا۔ مجھے معلوم نہیں، انہیں اِس جنون میں کس قدر مالی نفع یا نقصان ہوا ہے —— اللہ کرے کچھ نفع ہی ہُوا ہو —— بہرحال اُن کی تگ و دَو میں یہ نفع و ضرر محض ضمنی سے حادثے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جس یکسوئی سے وہ تلاشِ خوب تر میں مصروف ہیں وہ اندیشۂ سُود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ہی ممکن ہے۔ اگر ان کا مقصد پیسہ کمانا بھی ہوتا تو نقوش کے ساتھ ساتھ شاید بناسپتی گھی کی ایجنسی بھی کھول لیتے۔ لیکن یہ سٹاف کالج کوئٹہ کی تعلیم کے سراسر منافی ہوتا کیونکہ پہلے اصولِ جنگ یعنی MAINTENANCE OF OBJECTIVE کے تحت آپ یا تو گھی بیچ سکتے ہیں یا نقوش جیسا رسالہ چلا سکتے ہیں، دونوں کام نہیں کر سکتے۔

فنِ حرب کا دوسرا اصول OFFENSIVE ACTION ہے یعنی جارحانہ کارروائی اور میرے تصوّر کے مطابق طفیل یقیناً گوشہ نشینی یا ستیہ گرہ کے قائل نہیں بلکہ وہ ہر لحظہ مائل بہ پیکار نظر آتے ہیں۔ تکمیلِ نقوش کے سلسلے میں جہاں کسی فتنے نے سر اُٹھایا یہ جُملہ اسلحہ سے لیس ہو کر اس کی سرکوبی کو جا پہنچے۔ میں نے ذاتی طور پر طفیل صاحب کو IN ACTION نہیں دیکھا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر نئے شمارے کی تیاری کی ابتداء وہ ایک نپے تلے منصوبے سے کرتے ہیں یعنی بالکل اسی طرح جیسے ایک جرنیل حملے سے پہلے ایک تفصیلی پلین (PLAN) تیار کرتا ہے جس طرح جرنیل اپنی مخالف افواج اور اُن کے کمانڈروں کا جائزہ لیتا ہے اور انہیں زیر کرنے کی تدابیر کا خاکہ بناتا ہے، اسی طرح طفیل صاحب بھی جملہ شاعروں اور ادیبوں کا احاطہ کر لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے ان کو حلقۂ کمند میں لاتے ہیں، بلکہ شاید طفیل صاحب کو اپنی خُوئے دلنوازی کے طفیل تلوار کو بے نیام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ یعنی محض اپنے حُسنِ طلب کے طفیل ہی بیک کفِ بُردنِ صد دل کا عمل کرتے ہیں۔ لیکن چند شاعر اور ادیب بلاشبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تسخیر مسلح افواج کی تسخیر سے بھی مشکل ہوتی ہے۔ ان حالات میں طفیل صاحب کی جارحانہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں اور وہ سنگین سے سنگین مہم بھی سر کر کے دم لیتے ہیں۔ نقوش کے صفحات ایسی کئی فتوحات کے گواہ ہیں۔

جنگ کے چند اصول اور بھی ہیں لیکن میں صرف ایک اور کا ذکر کروں گا جسے انگریزی میں SURPRISE کہتے ہیں یعنی ناگہانیت! ایک جرنیل کے لیے لازم ہے کہ دشمن کو بے خبری میں جا لے۔ جس کمانڈر کے منصوبے کا دشمن کو پیشگی علم ہو گیا، اس کی جرنیلی کچی ہے۔ طفیل صاحب بہت پکے جرنیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سرپرائز کا شکار صرف ان کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ ہم قارئین بھی ہیں۔ ہم ایک شمارے کے طلسم سے سنبھل نہیں پاتے کہ ایک بالکل نئے اور غیر متوقع موضوع پر ایک اور ضخیم نمبر تمکین و ہوش پر ڈاکہ ڈالنے آوارد ہوتا ہے۔ ان نمبروں میں سے کس کس کا ذکر کیا جائے، سب کے سب دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ لیکن ایک شمارہ جس نے دل میں مستقل گھر کر لیا، پطرس نمبر تھا اور اسے ہم نے آج تک حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ ایک اور شمارے کو جس میں ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا احاطہ

کیا گیا تھا ہم داستانِ دل سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نقوش آئندہ بھی اسی شانِ یکتائی کے ساتھ کتابِ دل کی تفسیریں پیش کرتا رہے گا اور اپنے جرنیل مدیر کی کمان میں قارئین کے دل و نگاہ کو مسخر کرتا رہے گا۔

نقوش — منزل بہ منزل[1]

تحسین فراقی

آدھی رات کے وقت دو نقاب پوش ڈاکو ملّا نصر الدین کے گھر میں آ دھمکے۔ آہٹ سُن کر ملّا تاڑ گئے اور اپنی جان بچانے کی خاطر ایک الماری میں جا چُھپے۔ ڈاکو کمرے میں داخل ہو کر سیدھے اس الماری تک جا پہنچے۔ پٹ کھولے تو ملّا صاحب وہاں سُکڑے، سمٹے اور سہمے ہوئے موجود۔ ایک بولا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تم بُوڑھے ہو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، چُھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ملّا نے جواب دیا: "جان بچانے کے لیے نہیں چھپا ہوں، میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے شرفا نے قدم رنجہ فرمایا، مجھے تو دُکھ ہے کہ گھر میں ویرانی ہی ویرانی ہے اسی لیے منہ چھپائے کھڑا ہُوں۔"

میں سوچتا ہُوں کہ اگر ایسا حادثہ جنابِ محمد طفیل کو پیش آجاتا تو انہیں ان نقاب پوشوں سے منہ چھپانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وُہ اور کچھ نہیں تو نقوش کے ڈیڑھ دو درجن خاص نمبر بڑے اعتماد سے انھیں کریڈٹ کارڈ کے طور پر پیش کر دیتے جنھیں بھنا کر ان "شرفا" کی ضرورتیں بہ احسن پُوری ہو جاتیں، اور اگر وہ آنکھ بچا کر سرحد پار کر کے ہمارے ہمسایہ ملک میں چلے جاتے تو ان نمبروں کو بڑی آسانی سے بلیک کر کے اپنی چاندی کر سکتے تھے۔ لیکن پھر معاً خیال آتا ہے کہ چور آتے تو نقوش کے خاص نمبر ہی کیوں لے جاتے، صاحبِ نقوش کی ٹیوٹا کار ہی کیوں نہ لے مرتے جو کچھ دنوں سے مجھے بھی بہت اچھی لگنے لگی ہے۔

نقوش کا ذکر آیا تو نہ معلوم کیوں مجھے امراؤالقیس یاد آنے لگا ہے۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ موصوف کی جو شامت آئی تو قبیلۂ طے کی ایک نہایت حسین عورت امِّ جندب سے شادی رچالی۔ اُمِّ جندب بڑے ٹھسّے کی عورت تھی سو خلوت کی پہلی رات امراؤالقیس کی کارکردگی کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ رہی۔ ابھی رات کا بڑا حصہ باقی تھا کہ وہ امراؤالقیس کو بیدار کر کے کہنے لگی:

"اے جوانِ رعنا! اب اُٹھ بیٹھ کہ صبح ہو گئی۔"

شاعر بیچارہ اٹھا، باہر نظر کی تو ابھی آدھی رات باقی تھی، اُمِّ جندب سے اس حرکت کا سبب پُوچھا تو ناچار اس بی بی کو کہنا پڑا:

لانك ثقيل الصدر، خفيف العجز، سريع الاراقة بطئ الافاقة۔

لیکن 'نقوش' کے باب میں ام جندب کے مکالمے کو یُوں بدلا جا سکتا ہے کہ لانك ثقيل الصدر، ثقيل العجز، سريع الاراقة، سريع الافاقة۔ یعنی یہ کہ نقوش ہر لحاظ سے بھاری ہے، اس کا نکاس جلد ہوتا ہے اور وُہ بحال بھی بہت جلد ہو جاتا ہے، تبھی تو تقریباً تیس بتیس سال سے نمبروں کا یہ تابڑ توڑ سلسلہ جاری ہے۔ رہا جلد نکاس کا مسئلہ، تو یہ مرد کی خامی ہے لیکن مجلّے کی خوبی ہے کہ ادھر سٹالوں پر آیا ادھر خرید لیا گیا۔

نقوش نے ادارت کے دو[2] مختصر دور دیکھے اور تیسرا دور بھی چل رہا ہے۔ یہ تینوں دَور خاصے متنوع ہیں اور خصوصاً پہلا

---

[1] یہ مضمون اُس وقت لکھا گیا تھا جب جنابِ محمد طفیل حیات تھے۔

دَور تو بعد کے دو ادوار سے خاصا مختلف اور متغایر ہے۔ نقوش کا پہلا دور تو وُہ ہے جب احمد ندیم قاسمی اور محترمہ ہاجرہ مسرور کی ادارت میں اس مجلّے نے مارچ ۱۹۴۸ء میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے پہلے شمارے کی پیشانی پر رقم تھا:

"زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ"

پیشانی کی یہ تحریر تو اب بھی نقوش کے ماتھے پر بدستور چمکتی ہے۔ لیکن وقار عظیم اور محمد طفیل کی ادارت میں شائع ہونے والے شماروں میں زندگی کا وہ سکہ بند اور محدود مفہوم ہرگز نہیں جو اس کے دورِ اوّل کے مدیران کے پیشِ نظر تھا۔ تیسرے شمارے کے "طلوع" میں احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا:

> "ہم یقیناً سرمایہ داری اور جاگیرداری کو جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم ملک کے تمام کارخانوں، زمینوں، اداروں، حتیٰ کہ پیرانِ عظام کے آستانوں کو بھی قومی ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم طبقاتی تقسیم کے دشمن ہیں۔ جدلیات نے ہم پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ نیرو، ہٹلر اور چنگیز اسی تقسیم نے پیدا کئے۔"

نقوش کے پہلے دس شمارے جو ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہوئے ایک اعتبار سے ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا آرگن بن گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے 'طلوع' میں وضاحتیں، احتجاج، طعن، کوسنے اور عجیب طرح کی تضاد بیانیاں ملتی ہیں۔ یہاں ارتقا کی فطری یلغار کے گُن بھی گائے گئے ہیں اور اپنی ٹکسال سے باہر کے سکّوں کو جعلی بھی قرار دیا گیا۔

نقوش کے دسویں شمارے میں ترقی پسندوں کے داخلی تضادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبادت بریلوی کے ایک مضمون کے باب میں عصمت چغتائی نے سخن گسترانہ لکھا تھا:

> "معاف کیجئے گا جناب کلمہ تو پڑھاتے ہیں پھر کہتے ہیں مسلمان نہ ہو۔ سب کچھ تو وہی کہا ہے جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ خود ہی تو کہتے ہیں کہ "میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں۔ مگر ان کو اشتراکیت کے بعض اصولوں سے اختلاف بھی ہے۔"

ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کے دورِ ادارت کے بیشتر شمارے تقسیمِ ملک کے بعد کی صورت حال کے عکاس تھے اور ترقی پسندی کے پُرجوش وکیل، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان شماروں میں بعض اہم موضوعات پر مستقل سلسلے بھی شائع ہوتے۔ مثلاً ہماری زبان، ہماری دنیا، ہماری فلم اور ہمارا سماج۔ علاوہ ازیں نقوش کے چوتھے شمارے میں اردو نثر، اردو نظم اور وطنی سیاست کے ایک ایک سال پر الگ الگ جائزے بھی لکھوائے گئے۔ غرض یہ کہ ان دس شماروں میں بیشتر جدلیاتی مادیت اور آزادیِ نسواں کی وکالت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی رہیں اور ندیم صاحب اعلان کرتے رہے: ؎

نہ زندگی سے فرار اچھا نہ موت کا انتظار اچھا
سوائے انساں کے لہو کے تمام قدریں ہیں اعتباری

ادھر محمد طفیل کے سے روایت پسند دوستوں کو یقین تھا کہ انسان کے لہو کے علاوہ بھی بہت سی قدریں اصلی' اعلیٰ اور مستقل ہوتی ہیں۔ سو انہوں نے محسوس کیا کہ سیخ، کباب کے اندر ٹوٹ گئی ہے اسے علٰحدہ کرنا عقل اور وجدان دونوں کا تقاضا ہے۔ سو اب نقوش کی زمامِ ادارت وقار عظیم کے ہاتھ میں تھی۔

گیارھویں شمارے کے "طلوع" میں وقار عظیم صاحب نے کچھ سوال اٹھائے تھے اور یہ سوال اہم تھے :

۱۔ نقوش کی آیندہ پالیسی کیا ہوگی ؟

۲۔ نقوش نئے ادب کا علمبردار ہوگا یا پُرانے ادب کا ؟

۳۔ نقوش ادب برائے ادب کا قائل ہے یا ادب برائے زندگی کا ؟

۴۔ کیا نقوش کسی جماعت یا گروہ کا نمائندہ ہوگا ؟

یہ سوال اٹھانے کے بعد وقار صاحب نے لکھا تھا کہ "ادب کے متعلق نقوش کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب کے سرچشمے زندگی ہی سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی سے بے تعلق ہو کر ادب بے معنی ہے۔ لیکن ادب کو زندگی کی مصوری اور ترجمانی کرتے وقت روایتی اور فنی لطافتوں سے بے نیاز نہ ہونا چاہیے۔ نقوش ہر اس جماعت کے ساتھ ہے جو ادب کو ادب سمجھ کر اسے ماضی کی روایتوں کا امین، حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا پیامی جان کر اسے اپنے سینے سے لگاتی ہے.... ادب میں جو کوئی روایتوں کے اس تسلسل کی اہمیت کو کم کرتا ہے وہ ادب کا دشمن ہے اور نئے اور پُرانے کا وہ امتیاز جو نئے کو پرانے سے الگ کوئی چیز جانتا ہے اپنے گرانقدر تہذیبی سرمایہ کی طرف سے غفلت کا مجرم ہے۔ 'نقوش' ماضی کے نقوش کا امین اور حال کے تقاضوں کا پاسبان ہے۔"

گویا اب اس دَور میں اور اس کے بعد نقوش میں اس قسم کی بیان بازی بند ہوگئی اور یہ ادب اور عوام دونوں کے حق میں اچھا ہوا :

> "یہ ایک خالص عوامی ادبی تحریک ہے جو اپنے ملک کے عوام کے علاوہ ساری دُنیا کے عوام کو سرمایہ،
> جاگیر اور طبقاتی تقسیم کے غیر فطری اور غیر انسانی چنگلوں سے بچانا چاہتی ہے..... ہمارے پاس
> سب سے بڑا اخلاقی معیار انسانوں کا اقتصادی توازن ہے۔" ——— ہاجرہ مسرور

اب شکاگو کے مزدور مقتولین کے ماتم میں نقوش کے صفحات کبھی سیہ پوش نہ ہوئے۔

گیارھویں شمارے سے لے کر پندرھویں شمارے تک وقار عظیم نے نقوش کی ادارت کی۔ یہ دورِ ادارت یکم مئی ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۵۱ء تک رہا۔ اس دَور میں نقوش کے مشمولات میں واضح طور پر کچھ تبدیلیاں نمایاں ہوئیں۔ اب اس میں ایسے ادیب بھی شائع ہونے لگے جنہیں ترقی پسندوں نے ادبی اچھوت قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ تیرھویں شمارے میں "ادب اور مفید ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ چھپا جو شاید پہلے دور کی انتہا پسندی کے ردِ عمل میں لکھا گیا تھا :

"دُنیا میں سب سے زیادہ بے مقصد اور بے مصرف چیز ہے تو وہ مقصدی ادب ہے۔ ایک افادی

ادب کو چھوڑ کر باقی ہر ادب افادی ہوتا ہے" ——— انتظار حسین

اپریل ۱۹۵۱ء سے نقوش کے اس دور کا آغاز ہوا جسے بلا مبالغہ نقوش کا "روشن ترین زمانہ" کہا جا سکتا ہے۔ محمد طفیل اس سے پہلے بھی ایک رسالے کے شریک مدیر رہ چکے تھے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب وہ نقوش کے تنہا مدیر بنے تو ایک پڑھی لکھی ترقی پسند بی بی کا ابتدائی ردِ عمل یہ تھا:

> "اطلاع ملی کہ موصوف اب خود ہی نقوش کے ایڈیٹر بن گئے ہیں۔ دوسروں کی بات نہیں کرتی اپنی بات کہتی ہوں کہ اس اطلاع نے مجھے سخت مایوس کیا۔ نقوش جس آن بان کے ساتھ سامنے آیا تھا اس کی اتنی ہی عبرت ناک موت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور ساتھ ہی بھائی طفیل کی صورت بھی۔"

ادھر محمد طفیل کے اعلانِ اعتراف میں اعتماد کا روشن منطقہ صاف دکھائی دے رہا تھا:

> "سمجھ میں قابلیت اور علمیت دونوں کا فقدان سہی لیکن میں پاکستان و ہند کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خلوص اور ان کے بھرپور تعاون پر اعتماد رکھتے ہوئے بڑے بول لکھ رہا ہوں کہ ان شاء اللہ نقوش کے ادبی معیار کو کبھی ضعف نہیں پہنچے گا۔"

انھوں نے نقوش کی آیندہ پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "میری یہ دلی خواہش ہو گی کہ نقوش ایک مخصوص قسم کے دائرے کے اندر گھٹ گھٹ کر نہ چلے بلکہ اس کی اڑان وسیع تر اور واضح ہو۔ اسے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کی تخلیقات پر بھی ناز ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اس حقیقت کو بھی نہ بھولے کہ عزیز احمد، ممتاز مفتی اور قرۃ العین کی نگارشات کو بھی اردو ادب میں ایک قابلِ فخر مقام حاصل ہے۔"

چنانچہ ۱۹۵۱ء سے اب تک نقوش اس پالیسی پر عامل رہا ہے اسے ہمیشہ بڑے لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا اور اردو کی چند بہترین تحریریں سب سے پہلے اسی عہد ساز شمارے کی زینت بنیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ محمد طفیل صحتِ کتابت کا خیال رکھتے تھے یا نہیں اور وہ حاسے حُطّی کو ہاتے دو چشمی لکھ کر اپنی حسرتِ دیدار کا ثبوت فراہم کرتے رہے یا نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ انھوں نے نقوش کے عمومی اور خصوصی شمارے شائع کر کے ایک دنیا کو دعوتِ دیدار دی ہے۔

> "نقوش میری آرزوؤں کا ماحصل آپ کے سامنے ہے ..... مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں نے ہمیشہ نقوش کے نمبر کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے کیونکہ شروع سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ اردو ادب میں معیار کے اعتبار سے نقوش بلند پایہ مقام پیدا کر لے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو۔"

اوپر کی سطور میں محمد طفیل صاحب نے پہلی دفعہ قارئینِ نقوش کو مخاطب کیا تھا۔ ان سطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوّل روز ہی سے صاحبِ نقوش نے اپنی منزل متعین کر لی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد طفیل کی ادارت

میں نقوش نے جتنی تیزی سے منزلیں ماریں وہ ادب اور صحافت کی دنیا میں یادگار رہیں گی۔ نقوش کو ادبی مجلوں کی برادری میں نہایت وقیع مقام دلانے میں محمد طفیل صاحب کی اَن تھک علمی لگن، جامع منصوبہ بندی، مہم جوئی، توازنِ فکری اور مشاہیر کے حیرت انگیز قلمی تعاون کو بڑا دخل ہے۔ نقوش کے عام اور خاص شماروں کو جن اکابرِ ادب کا تعاون حاصل رہا اور بیشتر صورتوں میں اب تک ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا بادی، اثر لکھنوی، آل احمد سرور، فراق، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالغفار، محی الدین زور، ڈاکٹر یوسف حسین، خواجہ احمد فاروقی، امتیاز علی عرشی، مالک رام، خورشید الاسلام، ڈاکٹر اکبر حیدری، جگن ناتھ آزاد، فیض، ندیم، جوش، عبدالرحمٰن چغتائی، حفیظ جالندھری، یوسف حسن، غلام رسول مہر، سید عبد اللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، محمد عبد اللّٰہ قریشی، میرزا ادیب، کسریٰ منہاس اور بیسیوں دوسرے لکھنے والے شامل ہیں۔

یوں تو اپنی اپنی بساط میں متعدد ادبی مجلوں نے اپنے اپنے خصوصی نمبر شائع کیے جن میں مخزن، نگار، ہمایوں، عالمگیر، نیرنگِ خیال، ساقی، ادبِ لطیف، ادبی دُنیا، فنون، اوراق، سیّارہ، افکار، الزبیر، سیپ کے بعض خاص نمبر حوالے کی چیز ہیں لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس باب میں نقوش کو جو اختصاص حاصل ہے وہ اب تک کسی پرچے کے حصے میں نہیں آیا۔ نقوش نے خاص نمبروں میں ایسا اور اتنا وقیع لوازمہ یکجا کر دیا ہے کہ کبھی کبھی تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

میر تقی میر نمبر کے طلوع میں محمد طفیل نے لکھا ہے:

> "میری سوچ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جو کام دوسرے کر سکتے ہوں اسے ادارۂ نقوش کیوں کرے وہ کیوں نہ کسی نئی مہم پر نکلے کیوں نہ وہ محنت دیدہ کا کوئی اور امتحان دے!"

ادارۂ نقوش جب بھی کسی نئی مہم پر نکلا وہ اس سنہری اون کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ حاتم بادگرد کی خبر لانا ہر ایک کے بس کا روگ کہاں ہوتا ہے! طفیل صاحب نے ۱۹۵۲ء سے لے کر ستمبر ۱۹۷۴ء تک نقوش کے چھ افسانہ نمبر نکالے، پنج سالہ نمبر نکالا، مئی ۱۹۵۴ء میں غزل نمبر نکالا جس کا دوسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تیسرا جنوری ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ دو شخصیات نمبر نکالے، تین خطوط نمبر نکالے، مکاتیب نمبر نکالا، دس سالہ نمبر نکالا، ادبِ عالیہ نمبر نکالا، لاہور نمبر نکالا، دو جلدوں میں آپ بیتی نمبر نکالا، تین غالب نمبر نکالے۔ طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، شوکت نمبر، منٹو نمبر، اقبال نمبر دو جلدیں، میر تقی میر نمبر تین جلدیں اور شیکسپیئر ادبی معرکے نمبر دو جلدیں اور انیس نمبر شائع کئے۔ ان میں سے ہر نمبر اپنی جگہ انسائیکلو پیڈیا ہے، قاموس ہے — ایک سمندر ہے جس کی نیلی پہنائیوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے ع

تجھے دیکھوں کہ تجھ میں ڈوب جاؤں

صرف افسانہ نمبروں ہی کو دیکھیے کہ ان میں کل ۳۰۵ افسانے، رپورتاژ اور ایک ناولٹ شائع ہوئے، اور مشمولات کے علاوہ پہلے افسانہ نمبر میں محمد حسن عسکری کا ایک اہم مضمون "نئے افسانے اور ہمارا مستقبل" بھی شامل تھا۔ علاوہ ازیں "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے عنوان سے ایک اہم مذاکرہ بھی شامل کیا گیا تھا جس میں وقار عظیم، منٹو، ہاجرہ، انتظار اور شوکت تھانوی جیسے اہم لکھنے والوں نے حصہ لیا تھا۔ پہلے افسانہ نمبر میں عسکری نے افسانے کے جمود کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا تھا:

> "نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی ہے وہاں سے آگے بڑھنے کی بجائے افسانہ پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے"۔

خود مدیرِ نقوش کو اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ افسانہ نمبر ۲ کے 'طلوع' میں اس کا اظہار یوں ہوا:

> "یوں تو پورا ادب ہی انحطاط پذیر ہے لیکن سب سے زیادہ زوال جس صنفِ ادب پر آیا وہ افسانہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے افسانوی ادب پر نظر دوڑائیے تو آپ کو آج کا افسانوی ادب بڑا بے جان اور بے رُوح نظر آئے گا۔ گو لکھنے والے آج بھی وہی ہیں لیکن ان سب کے قلم کچھ تھکے تھکے سے ہیں"۔

نقوش کے جن خاص نمبروں نے دنیائے ادب میں بالخصوص غلغلہ پیدا کیا ان میں غزل نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، لاہور نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر تقی میر نمبر اور حال میں شائع ہونے والے ادبی معرکے نمبر اور انیس نمبر قابلِ ذکر ہیں۔

غزل نمبر میں طفیل صاحب نے اردو غزل اور متغزلین کے بارے میں سولہ اہم نقادوں کے مضامین شامل کئے جو حالی، نیاز، سید عبداللہ، آل احمد سرور، سردار جعفری اور احتشام حسین وغیرہ کے لکھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں طفیل صاحب کی نظر عابد علی عابد اور رشید احمد صدیقی سے کیسے چُوک گئی جو غزل کے بہت اہم اور منفرد نقاد تھے۔ ان غزل نمبروں کی تدوین میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور محمد عبداللہ قریشی نے مدیرِ نقوش کا خاص طور پر ہاتھ بٹایا اور ۲۷۰ شعرا کے حالاتِ زندگی اور نہایت اجمالی فنی جائزے بھی مرتّب کیے۔

مکاتیب نمبر مرتّب کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تو اس سلسلے میں مدیرِ نقوش کو شدید دقّتوں کا سامنا رہا:

> "میں نے ان خطوط کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، شہر شہر گھُوما، گھر گھر صدا دی، کسی نے میرے شوق کو سینے سے لگایا، کسی نے بات بھی نہ پُوچھی۔ یوں اُمید و بیم کے دوراہے پر چلتا چلتا نیم جاں ہوگیا۔ مگر جنون میں کمی واقع نہ ہُوئی..... بچپنے میں چوری کی ہو تو کی ہو اس عمر میں تو نہیں کی تھی مگر اس کم بخت شوق میں یہ کام بھی کیا، بخدا اپنی خاطر نہیں آپ کی خاطر۔ اگر میں نے چوری اپنی ذات کے لیے کی ہو تو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو"۔

اس نمبر میں ۲۰۱۷ اہم لکھنے والوں کے ہزاروں خطوط بھی شامل ہیں اور صنفِ مکتوب نگاری اور اس کی اہمیت

پر اہم لکھنے والوں کے مضامین بھی۔ یہ خطوط اس لحاظ سے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان سے نہ صرف لکھنے والو کی اپنی شخصیت کی پرتیں کھلتی ہیں بلکہ سو سالہ علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح تین جلدوں میں خطوط نمبر مرتب ہوئے اور کم و بیش ڈھائی ہزار غیر مطبوعہ خطوط پہلی دفعہ ادبی دنیا کے سامنے لائے گئے۔ ۱۲۸ غیر مطبوعہ خطوط تو صرف سرسید کے تھے۔ علاوہ ازیں خطوط نمبر کی ایک بہت اہم چیز نہر اور گاندھی کے نام مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطوط تھے۔ ان خطوط کے حصول کا اشتیاقِ بے پایاں صاحبِ نقو کے دل میں یوں موجزن تھا:

"جمال میاں سے ملاقات ہوگئی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا — انہوں نے مجھے خطوط دکھائے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ معاً اداس ہوگیا۔ اگر انہوں نے یہ خطوط نہ دیے تو کیا ہوگا؟"

لاہور نمبر کی اشاعت نقوش کا ایک اور اہم سنگِ میل تھا۔ یہ نمبر لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا ایک نہا مفصل، جاندار اور دلچسپ مرقع ہے۔ اس نمبر میں گزشتہ و موجودہ لاہور کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ لاہور باغات، مزارات، مغلیہ عہد، خالصہ عہد، علمائے کرام، دینی مدرسے، مساجد، کتب خانے، دروازے، انگریز دور کی تعمیرات، مندر، گرجے، کالج، موسیقار، گویتے، ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے اور گانے والیاں، سارنگی نو طبلہ نواز، کلارنٹ نواز، پیانو نواز، نے نواز، سرود نواز، قوال، میوزک ڈائریکٹر، اکھاڑے، تکیے، میلے، ڈرا تھیٹر، فلم، اطبا، ادیب، مصنف، مورخ، خوشنویس، ادبی تحاریک، اردو صحافت اور لاہور کے فارسی گوشہ سب اس نمبر میں بولتے چالتے، گاتے گنگناتے، اچھلتے پچھاڑتے، پڑھتے پڑھاتے، لڑتے مارتے، کودتے پھاندتے، ہونکتے ہکتے اور لہکتے لہلہاتے دکھائی دے جاتے ہیں۔

نقوش کا سب سے لذیذ اور فرحت بخش نمبر تو طنز و مزاح نمبر تھا جس میں مقالے بھی تھے۔ دنیا بھر کے مزاحیہ طنزیہ ادب کا انتخاب بھی تھا۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے بھی تھے۔ اودھ پنچ، فتنہ، عطرِ فتنہ اور شیرازہ کے ادوار بھی شامل تھے اور طنزیہ و مزاحیہ ادب کے زریں دور سے بھی بحث کی گئی تھی۔ یوں یہ نمبر اردو ہی کا نہیں دنیا بھر اچھے مزاحیہ و طنزیہ ادب کا بھی اشاریہ بنتا نظر آتا ہے۔

نقوش کا آپ بیتی نمبر ایک اور کرشمہ ہے جو دامنِ دل و نگاہ کھینچتا ہے۔ یہ آپ بیتی نمبر نہ صرف اردو کی شخصیتوں بلکہ ان کے علاوہ بنگالی، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، ولندیزی، روسی، چینی، گجراتی اور کے ادیبوں کے بھی تعارف ناموں پر مشتمل تھا۔ اس نمبر میں ۲۸ ملکوں کے افراد کی نمائندہ تخلیقات شامل کی گئی تھیں۔

طفیل صاحب کا ایک بڑا کارنامہ بیاضِ غالب کی دریافت کا تھا۔ اب تک دیوانِ غالب کے مطبوعہ نسخو میں نسخۂ حمیدیہ ہی کو شہرت حاصل تھی۔ امروہہ میں غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قدیم ترین نسخہ جس شخص کے پاس

اس نے اس کی قیمت مبلغ پچیس روپے لگائی تھی اور کسی توفیق احمد امروہوی نے اسے گیارہ روپے میں خرید کر کم از کم چھ ہزار روپے اس کی قیمت مقرر کی۔ بعد میں عدالتی کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں کے چکر میں پڑ کر ہندوستان میں اس کی اشاعت ملتوی ہو گئی اور یہ ریزرو بنک آف انڈیا کے لاکر میں حبسِ دوام کی نذر ہو گیا۔ لیکن ادھر محمد طفیل نے اس کے فوٹو سٹیٹ نہ جانے کیسے حاصل کیے اور اسے غالب صدی کی ایک فخریہ پیشکش کے طور پر چھاپ ڈالا جس سے برِ صغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک تھرتھری پیدا ہو گئی۔ غالب کے متخصص مالک رام نے لکھا:

> ”بھائی! بتاؤ کہ آپ کا شائع کردہ دیوان (دیوانِ غالب بخطِ غالب) مجھے کیوں کر اور کب تک پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ یہاں کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے اس لیے ایک کام کے سلسلے میں اس کی اشد فوری ضرورت ہے۔“

اس نمبر میں غالب کی ۲۵ غزلیں اور ۱۴ رباعیاں غیر مطبوعہ اور ان کے علاوہ ۲۲۰ غیر مطبوعہ مفرد اشعار تھے۔ گیان چند جین نے اس کی اشاعت پر لکھا تھا کہ ”پاکستان کا تو ذکر کیا ہندوستان میں بھی ہر شخص محض نقوش ہی کے طفیل اس نسخے کا مطالعہ کر سکتا ہے۔“

غالب جیسے عظیم سخنور پر تین اہم نمبروں کے علاوہ میر تقی میر جیسے ”خدائے سخن“ پر بھی نقوش کی تین جلدیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ پہلی جلد اصل میر کے نسخۂ محمود آباد (۱۲۰۳ھ) پر مشتمل ہے جس کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے سر ہے۔ طفیل صاحب کو افسوس ہے کہ اگر ڈاکٹر اکبر حیدری اپنے وعدے پر قایم رہتے تو اس نایاب نسخے کو پہلی بار چھاپنے کا شرف ادارۂ نقوش ہی کو حاصل ہوتا تاہم اس نمبر میں بعض ایسی غزلیں بھی شاملِ اشاعت کی گئی ہیں جو ہندوستانی ایڈیشن کے متن میں نہیں تھیں۔ علاوہ ازیں میر کے پورے کلام کا ایک اچھا انتخاب بھی شاملِ اشاعت کر دیا گیا۔

اس نمبر میں میر کی پندرہ غزلیں، ایک مثنوی، دو قصائد، آٹھ رباعیات اور مختلف مخطوطات اور تذکروں سے حاصل کردہ ۲۹۷ شعر یعنی کل ۴۷۴ غیر مطبوعہ اشعار پاکستان میں پہلی دفعہ منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نئے متون کی دریافت سے میر شناسی کا ایک نیا رُخ متعین ہو گا۔

نقوش کے میر نمبر کی دوسری اور تیسری جلد بھی اپنے اندر تحقیق اور تنقید کا نہایت قابلِ قدر سرمایہ رکھتی ہے۔ دوسری جلد جہاں بیشتر میریات پر اہم مضامین کے فکر افروز انتخاب پر مشتمل ہے وہاں تیسری جلد میں پہلی دفعہ میر کے فارسی دیوان (نسخۂ رضوی) کا تعارف اور اس کا مستند متن شائع کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کو اپنی اردو شاعری پر تو فخر تھا ہی لیکن وہ اپنی فارسی گوئی پر بھی بجا طور پر مفتخر تھے۔ اب جب کہ میر کا فارسی دیوان پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ گیا ہے، بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ میر شناسی میں یہ تیسرا نمبر بالخصوص ایک اہم سنگِ میل ثابت ہو گا اور اس سے میر کے فکر و فرہنگ کے باب میں نئی راہیں کھلیں گی۔

نقوش کا تازہ ترکارنامہ ”ادبی معرکے نمبر“ ہے جس کی گونج ابھی تک لاہور کے ادبی حلقوں میں سنائی دے رہی ہے

اور جس پر تفصیل سے اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں۔

میں نے نقوش کے تمام اہم نمبروں کا بھی جائزہ نہیں لیا کہ یہ کام ایک مختصر سے جائزے میں نہیں سما سکتا۔

ایک اور بات جو نقوش کے لیے باعثِ فخر ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس نے تحقیق و تدقیق کے نئے راستے دریافت کیے بلکہ مسائل کی سطح پر بعض مباحث کو بھی جنم دیا۔ بعض سوال بھی اٹھائے۔ چنانچہ قارئینِ نقوش جانتے ہیں کہ نقوش میں ایک مدت تک اسلامی ادب کے سلسلے میں فراق گورکھپوری، آفتاب احمد، ابواللیث صدیقی، شوکت سبزواری اور نعیم صدیقی جیسے بزرگوں کے بعض اہم افکار کی گونج سُنائی دیتی رہی آج جب اسلامی ادب کے باب میں دوبارہ آواز اٹھائی جا رہی ہے تو یہ ایک سطح پر نقوش کے سلسلے سے مربوط ہو جاتی ہے جو تخلیقِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد رُونما ہُوا تھا۔

نقوش میں محمد طفیل کے لکھے ہُوئے شذرات بھی ادب کا ایک قابلِ قدر حصّہ ہیں۔ جامعیت اور نکتہ آفرینی ان کا خاصہ ہے۔ نقوش کے ارتقا میں اس نکتہ آفرینی اور تخلیقی جہت کا بھی حصّہ ہے۔ طفیل صاحب نے ایک موقع پر لکھا تھا:

> ”میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا اس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملتی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے گنہ گار ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف نقوش کی ادبی خدمات آنے والے زمانوں میں زندہ رہیں گی بلکہ سیرت سرورِ عالمؐ پر تحریروں کی جمع و تدوین کے سلسلے میں بھی اس کا کارنامہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

نقوش اسی عظیم موضوع پر تیرہ جلدیں پیش کر چکا ہے ان تیرہ جلدوں کے مشمولات کا مختصر جائزہ بھی ان صفحات میں ممکن نہیں ہے۔ ہاں محض مشمولات کی جانب اشارے کئے جا سکتے ہیں۔ ان جلدوں میں سیرت کی جامعیت کے بنیادی اصول، سیرت نگاری کی ذمہ داریاں، سیرت نبوی قرآنی، قرآن سے مظہرِ نبوت کی تشریح، قرآن کی روشنی میں نبی کریمؐ کا مقصدِ بعثت، حضرت عُروہ بن الزبیر —— پہلے سیرت نگار، ابنِ اسحاق اور سیرتِ رسول اللہؐ، ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام، تاریخ لیعقوبی، ابن عبدالبر، قاضی عیاض، ابنِ کثیر اور ابن الجوزی کی سیرت نگاری، سیرت نگاری کی اولیں کتابیں، سیرتِ نبویؐ کی توقیت، خطباتِ رسولؐ، مکاتیبِ نبویؐ، حقیقتِ توحید و وحی، مکّہ و مدینہ کی تاریخ قدیم، رحمۃ للعالمینؐ بحیثیت انسانِ کامل، سیاسی نظام پر حضورِ اکرمؐ کے اثرات، فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام، علومِ انسانی کے فروغ پر رسول اللہؐ کا اثر، حضورؐ بحیثیت سپہ سالار، رسول اللہؐ غیر مسلموں کی نظر میں، عہدِ نبویؐ میں ریاست کا نشو و ارتقا، عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت، فنِ حدیث کا جائزہ، اقوالِ رسولؐ، مکالماتِ رسولؐ، کاتبانِ وحی، عہدِ نبویؐ کے چند نامور سپہ سالار، بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے والے وفود، اصحابِ بدر، اصحابِ صُفّہ، ارشاداتِ نبویؐ، فصاحتِ نبویؐ، علم و تہذیب کے ارتقا میں معارفِ محمدی کا حصّہ،

رسالتِ محمدیؐ کے عقلی ثبوت اور آثار و متعلقاتِ سیرت پر بڑا قابلِ قدر لوازمہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ یہ لوازمہ ممتاز اور عالمی شہرت رکھنے والے علماؒ کی تحریروں اور تراجم پر مشتمل ہے۔ رسولؐ نمبر کی دسویں جلد میں نعتِ رسولِ مقبولؐ کے سلسلے میں نہ صرف عربی، فارسی اور اردو کے نعتیہ ادب کا انتخاب شامل کیا گیا ہے بلکہ صنفِ نعت پر نامور لکھنے والوں سے مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں۔ ان رسولؐ نمبروں میں گیارھویں جلد اس اعتبار سے نہایت قابلِ قدر ہے کہ اس کے ذریعے پہلی بار سیرتِ ابنِ اسحٰق کے کچھ اجزا (اردو ترجمے کی صورت میں) منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ یہ اجزا ممتاز عالمِ دین ڈاکٹر حمید اللہ نے دریافت کیے۔ بارھویں اور تیرھویں جلد میں ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور مصطفیٰ سباعی کے مضامین لائقِ توجہ ہیں جبکہ آخری جلد میں خلفائے راشدین کے احوال اور کارناموں کو خوبی سے سمیٹا گیا ہے۔ اردو میں سیرتی ادب کے اتنے عظیم مجموعے کی کوئی مثال نہیں ملتی اسی لیے اس اہم کارنامے کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں علمی دنیا نے بخل سے کام نہیں لیا۔ نقوش کے رسولؐ نمبر نے جن ممتاز اہلِ قلم سے خراج وصول کیا ہے ان میں خصوصیت کے ساتھ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، علامہ سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد مالک کاندھلوی، سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عبدالقدوس ہاشمی، غلام جیلانی برقؔ، نعیم صدیقی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، ممتاز مفتی، ابوسلمان شاہجہان پوری اور حکیم عبدالقوی دریابادی جیسے مستند لوگ شامل ہیں۔

اگر طفیل کے کچھ گناہ رہ بھی گئے ہیں تو رسولؐ نمبر کی مجلدات (۱۳ جلدیں) ان کے ان گناہوں کو ڈھانپ لیں گی۔ اردو ادب کی تاریخ میں نقوش کا ذکر ہمیشہ سنہری لفظوں میں کیا جائے گا۔ رہا اس سنہری اون میں کہیں کہیں کمزور اور گدلے سُوتی ریشوں کی موجودگی کا مسئلہ تو یہ عین تقاضائے بشریت ہے خالص سنہری اُون آج کہاں ملتی ہے!

رشید احمد صدیقی افسوس کیا کرتے تھے کہ "لوگ آج کل دُوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اُچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں مدیرِ نقوش نے اپنا نام ضرور اچھالا مگر مقامِ شکر ہے کہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالی۔"

دو نمبر (۲)

• ایک نمبر اقبال پر جو ان کی غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ہے ـــــ اور دوسرا نمبر غالب پر، جو ان کی غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں پر مشتمل ہے۔

• یہ دونوں نمبر کتابت شدہ صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پوری کوشش ہوگی کہ انھیں جلد منظرِ عام پر لایا جاسکے ـــــ

ہماری کتابیں جو دستیاب ہیں

(۱) نقوشی	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۲) محبتی	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۳) معظم	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۴) سلسلۂ روز و شب	منظور الٰہی	۴۵ روپے
(۵) درِ دلکشا	منظور الٰہی	۲۵ روپے
(۶) خیر البشرؐ کے حضور	ممتاز حسن	۱۸ روپے
(۷) سرکشیدہ	ادیبہ بزمی	۱۰ روپے
(۸) زمین	خدیجہ مستور	۳۰ روپے
(۹) مابدولت	شوکت تھانوی	۱۰ روپے
(۱۰) قاضی جی تین حصے	″	۳۰ روپے
(۱۱) وغیرہ وغیرہ	″	۱۰ روپے
(۱۲) مضامینِ شوکت	″	۱۰ روپے
(۱۳) من آنم	فراق گورکھپوری	۲۵ روپے
(۱۴) ندیم نامہ	مرتبہ محمد طفیل	۵۰ روپے
(۱۵) بادۂ شبانہ	اختر انصاری دہلوی	۱۵ روپے

ادارہ فروغِ اردو، ۱۱۔ ایبک روڈ۔ انارکلی لاہور

احمد ندیم قاسمی اور محمد طفیل

محمّد طفیل اپنے ہم عصر اہلِ قلم کے ساتھ

۱۹۵۲ء کی ایک یادگار تصویر

جگر مراد آبادی کے ہمراہ

کرشن چندر، ممتاز مرزا اور محمد طفیل

جوش ملیح آبادی ۔ مصطفےٰ زیدی۔ ابوالخیر مودودی، محمد طفیل اور دیگر احباب

مولانا رازق الخیری، حکیم یوسف حسن، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی دورہ مشرقی پاکستان کے دوران

چینی ادباء کے ساتھ

احسان دانش، محمد طفیل، فضل احمد کریم فضلی، امتیاز علی تاج، مولانا حامد علی خاں، مجنوں گورکھپوری

خواجہ شہاب الدین اور محمد طفیل خطوط نمبر کی تقریب کے موقع پر

جمیل نشتر، محمد طفیل، ابنِ انشاء، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی اور دوسرے احباب

ڈاکٹر بوسانی اور محمد طفیل

عصمت چغتائی، محمد طفیل، خدیجہ مستور، ناصر زیدی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید وقار عظیم

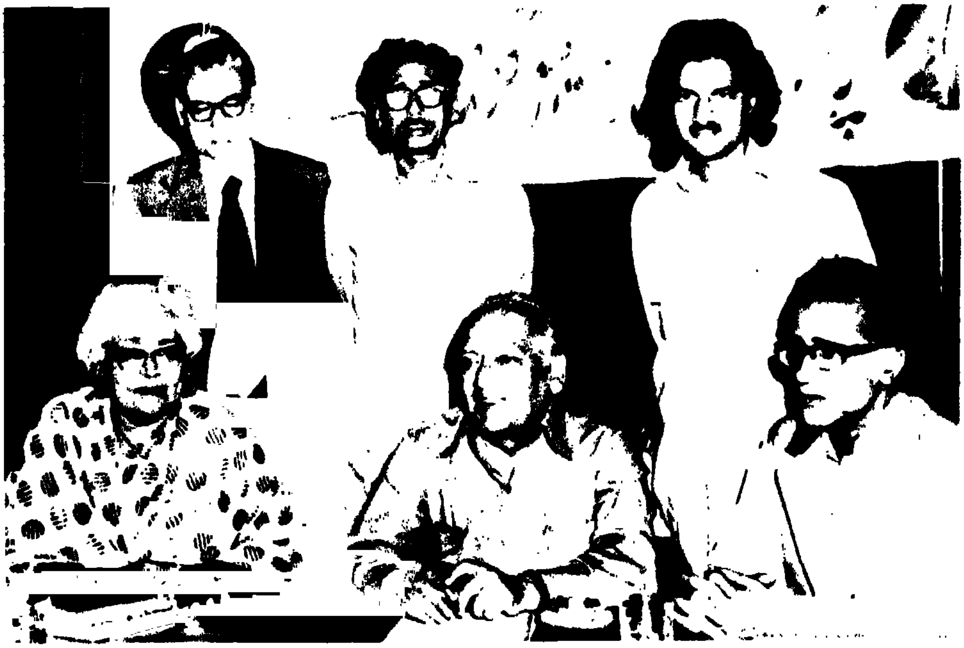

احمد ندیم قاسمی۔ ناصر زیدی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر رشید انور، محمد طفیل اور عصمت چغتائی

محمد طفیل اور اسلم کمال

جیلانی بانو اور محمد طفیل

جیلانی بانو کی پاکستان آمد پر ایک تقریب کا منظر

اہلِ قلم کانفرنس کے موقع پر محمد طفیل، صدیق سالک، مختار مسعود اور ڈاکٹر رشید انور

پاکستان رائٹرز گلڈ کے عہدہ داران اور دوسرے احباب کے ہمراہ

حفیظ جالندھری اور محمد طفیل

محمد طفیل - جیلانی کامران اور ڈاکٹر سلیم اختر

بھارت اور لاہور کے ادباء ایک تقریب کے دوران

جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور اور محمد طفیل

محمد طفیل اور محمود ہاشمی برمنگھم میں قیام کے دوران

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور محمد طفیل

صدر مملکت جناب محمد ضیا الحق، ادبی کارگزاریوں کے اعتراف میں جناب محمد طفیل کو ستارۂ امتیاز سے نواز رہے ہیں

اُردو افسانہ ـــ "نقوش" کے آئینہ میں

ڈاکٹر سلیم اختر

"نقوش" نے اپنے ۳۲ سالہ عرصۂ حیات میں کل ۱۷ خاص نمبر پیش کیے ہیں ان میں افسانہ نمبر صرف نصف درجن ہیں۔ لیکن دسمبر ۱۹۵۵ء کے مطبوعہ افسانہ نمبر کی دو جلدوں کے ۱۰۹۰ صفحات ہیں اردو افسانہ کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ سمٹ آتی ہے صرف اسی سے اس نمبر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ جنوری ۱۹۵۴ء ، نومبر ۱۹۶۰ء ، نومبر ۱۹۶۸ء ، مئی ۱۹۷۲ء اور ستمبر ۱۹۷۴ء میں بھی افسانہ نمبر طبع ہوئے ہیں جبکہ منٹو نمبر کی صورت میں بھی ایک نوع کا افسانہ نمبر ہی ملتا ہے۔

اگرچہ کسی خاص ادبی پرچہ کے حوالہ سے کسی بھی صنفِ ادب کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ کوئی پرچہ بھی ہمیشہ عہد آفریں تحریریں شائع کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن جب بات نقوش کی ہو اور محمد طفیل جیسا نک چڑھا مدیر ہو تو ایسا مطالعہ ممکن ہے۔ ہر مدیر بقدرِ ظرف اچھی تحریریں شائع کرنے کی کوشش کرتا ہے اب اس کوشش میں کون کتنا کامیاب رہتا ہے اس کا مقدر کے برعکس پرچہ کے وقار سے تعلق ہوتا ہے اور اسی سے "نقوش" اور "اوراق" جیسے پرچے میں امتیاز ممکن ہوتا ہے۔

محمد طفیل نے ادبی جرائد کو خوب صورت اور خوب سیرت بنانے میں جتنی محنت کی ہے اس کا اعتراف مدیر نقوش کے دشمن بھی کرنے پر مجبور رہیں تخلیقات کے بلند معیار اور پیشکش کے خوب صورت انداز کی بنا پر اچھے سے اچھے ادیب نقوش کو اپنی بہترین تخلیقات سے نوازتے رہے ہیں۔ چنانچہ راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار نے اس کا اعتراف محمد طفیل کے نام ایک مکتوب میں یوں کہا :

> "جی تو چاہتا ہے کہ کتابی صورت میں آنے سے پہلے میرا ناولٹ[1] "نقوش" میں چھپ جائے۔ کیونکہ جتنی احتیاط آپ کرتے ہیں کوئی دوسرا رسالہ نہیں کرتا ..... آپ جس محنت اور غور و پرداخت کے بعد کسی تخلیق کو نقوش میں چھاپتے ہیں اس کی ہمیشہ میں نے داد دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نقوش کو ترجیح دے رہا ہوں۔"

یہ ایک خط واحد مثال نہیں، نہ جانے ایسے اور کتنے خطوط محمد طفیل کے نام آئے ہوں گے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نقوش واقعی ایسا مجلہ ہے کہ اس کے افسانہ نمبروں کی بنا پر اردو افسانے کے اسالیب میں

---

[1] ایک چادر میلی سی۔

تنوع اور تجربات و اختراعات کا تنقیدی سطح پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس استدلال کو اس سمپوزیم سے بھی تقویت ملتی ہے جو "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے عنوان سے ۱۹۵۲ء کے افسانہ نمبر میں شائع کیا گیا اور جسے تنقیدی اہمیت کی بنا پر دسمبر ۱۹۵۵ء کے افسانہ نمبر میں دوبارہ شامل کیا گیا اس میں شرکائے بحث کے اسمائ یہ ہیں: سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت تھانوی، حمید اختر اور محمد طفیل ——— اس سمپوزیم کی برجستہ گفتگو میں جس بے تکلفانہ انداز سے معاصرین کے فن پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے اس کی بنا پر یہ خاصہ کی چیز بن جاتا ہے۔ آج اس سمپوزیم کو ریکارڈ کیے تین دہائیاں ہونے کو آئی ہیں۔ اس عرصہ میں افسانہ کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔ ترقی پسندی کے کلیشے ختم ہوئے جبکہ خارجی حقیقت نگاری نے اپنی منطقی انتہا تک پہنچ کر داخلی حقیقت نگاری، علامت نگاری اور تجریدیت کا فروغ دیکھا بلکہ اب تو خود یہ نیا رجحان بھی خاصہ پرانا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ ان حالات میں طفیل صاحب کو چاہیے کہ آج کے سرکردہ افسانہ نگاروں اور نقادوں کو جمع کر کے ایک نیا مذاکرہ کرائیں تاکہ اردو افسانہ کی بات جہاں ختم ہوتی تھی وہیں سے آغاز کر کے افسانہ کی تاریخ کو آج تک لا کر اپ ٹو ڈیٹ کر دیا جائے۔ اگرچہ محمد طفیل نے جو افسانہ نمبر نکالا اسے بذاتِ خود ایک کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن افسانے کے بدلتے اسالیب کی کہانی سننے کے لیے "نقوش" کا دسمبر ۱۹۵۵ء کا افسانہ نمبر ہی کافی ہے جس میں اردو کی معروف داستانوں (۱۸۰۱ء) سے آغاز کرتے ہوئے ۱۹۵۵ء تک کے اہم افسانہ نگاروں کی صورت میں اردو افسانہ کی داستان سے وابستہ بنیادی اور اہم کڑیاں جوڑ دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس نمبر کی فہرست دیکھتے ہی اردو فکشن کے ڈیڑھ سو سالہ نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں:

اردو کی پہلی کہانی ——— طویل مختصر داستانوں کا دور ——— ناولوں کا دور ——— ترجموں کا دور ——— افسانوی مضامین کا دور ——— اور اس کے بعد اردو افسانہ کے پانچ ادوار متعین کیے گئے ہیں جبکہ تاریخی اہمیت کی بنا پر "انگارے" کا ایک دور بنایا گیا ہے۔ الغرض ،، افسانہ نگاروں کے ۹، شاہکار افسانے[1] ——— اور بعض تو ایسے افسانے ہیں جو افسانوی ادب میں اب حوالہ کی چیز بن چکے ہیں۔ اگر محمد طفیل نے مزید افسانہ نمبر نہ بھی نکالے ہوتے تو بھی صرف یہی ایک افسانہ نمبر اردو افسانہ کے روشن چراغ اور سنگِ میل دکھانے کو کافی ہے۔ "خارستان و گلستان" (سجاد حیدر یلدرم) "کیوپڈ و سائیکی" (نیاز فتحپوری) "کفن" (پریم چند) "تین پیسے کی چھوکری" (قاضی عبد الغفار) "میلہ گھومنی" (علی عباس حسینی) "درونِ تیرگی" (میرزا ادیب) "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) "نیا قانون" (سعادت حسن منٹو) "گرہن" (راجندر سنگھ بیدی) "چوتھی کا جوڑا" (عصمت چغتائی) "ہماری گلی" (احمد علی) "آنندی" (غلام عباس) "پرمیشر سنگھ" (احمد ندیم قاسمی) "آپا" (ممتاز مفتی) "حرامجادی" (حسن عسکری) "زرّیں تاج" (عزیز احمد) "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری) "جگّا" (بلونت سنگھ) "جلاوطن"

---

[1] احمد علی اور رشید جہاں کے دو دو افسانے شامل ہیں۔

(قرۃ العین حیدر) "گڈریا" (اشفاق احمد) اور "اجودھیا" (انتظار حسین) —— یہ صرف چند بہت ہی نمایاں مثالیں ہیں، ورنہ ،، ، افسانہ نگاروں کے نمایندہ ۹، افسانوں پر مشتمل یہ افسانہ نمبر بذاتِ خود اردو افسانہ کی تاریخ قرار پاتا ہے۔

۲

داستانوں اور ناولوں کے اقتباسات سے قطعِ نظر جب افسانوں کے نقطۂ نظر سے اس نمبر کو دیکھیں تو سب سے پہلے ترجموں کا دَور آتا ہے جس میں ظفر علی خاں ("تولہ بھر ریڈیم") عنایت اللہ دہلوی ("نجم السحر") عبدالرزاق ملیح آبادی ("شاعر کی وصیت") خواجہ منظور حسین ("بپتا") منصور احمد ("کیڈور کا مصور") جلیل قدوائی ("بلی کے بچے") حامد علی خاں ("مصور کا راز") فضل حق قریشی ("دلہن کی پوشاک") تیرتھ رام شیراز پوری ("ہڈیوں کا پنجر") کے تراجم شامل ہیں۔

ہمارے ادب میں تراجم کی جو اہمیت رہی ہے وہ اتنی واضح ہے کہ اسے بطورِ خاص اُجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے تاہم اس امر پر یقیناً زور دیا جا سکتا ہے کہ جدید افسانہ کی رفیع الشان عمارت کی خشتِ اول یہ افسانوی تراجم ہی قرار پاتے ہیں۔ افسانہ انگریزی سے مستعار ہے اس لیے یہ ناممکن تھا کہ اس کے تراجم نہ ہوتے اور ان تراجم کی اہمیت کا اس وقت اور بھی احساس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری، صحافت اور قائدانہ حیثیت نے اتنا غلبہ حاصل کر لیا کہ کسی کو یہ یاد بھی نہ رہا کہ مولانا اپنے زمانہ کے اہم ترین مترجمین میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ انھوں نے "مشتریز آف لندن کورٹ" کے سلسلہ کے ناول ترجمہ کیے تھے۔ اس کے علاوہ رائیڈر ہیگرڈ کے مشہور ناول "PEOPLE OF THE MIST" (سیرِ ظلمات) اور ریڈیارڈ کپلنگ کا "THE JUNGLE BOOK" (جنگل میں منگل) بے حد معروف اور خوب صورت تراجم ہیں۔ ہرچند کہ آج بحیثیت مترجم صرف علامہ اقبال کے خطبہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے لیے مشہور رہیں۔

ان تراجم پر نگاہ ڈالتے ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ (یعنی دُوسری اور تیسری دہائی) میں ترجمہ کے لیے وہ افسانے یا ناول منتخب کیے جاتے تھے جن میں واقعات کے سسپینس سے تحیّر اور دلچسپی کی فضا قایم کی گئی ہو۔ بالفاظِ دیگر مہماتی، جاسوسی یا سائنس فکشن قسم کی چیزیں مرغوبِ خاطر تھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو عشقیہ اور رومانی کہانیاں بھی ملتی تھیں۔ لیکن ان سب میں "دلچسپی" اساسی اہمیت رکھتی تھی اور ظاہر ہے جہاں عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی دُھوم ہو تو وہاں بھلا اور کس نوع کا ترجمہ پنپ سکتا تھا اس لیے اس عہد کے معروف مترجمین نے بالعموم انگریزی کی مقبولِ عام کہانیوں یا ناولوں کو اردو کا جامہ پہنایا —— آج ان تراجم کی ادبی اہمیت نہ سہی، تاریخی سہی، لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان تراجم نے افسانہ کے رسیا قارئین کا ایک طبقہ ضرور پیدا کر دیا۔ ایسا طبقہ، جو طبعزاد افسانہ کی بارش کے پہلے قطرہ کے لیے پیاسی زمین ثابت ہوا۔

ترجموں کے سلسلہ میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے [illegible] منٹو نے ترجموں ہی سے آغاز کیا تھا۔ ترجمہ کے ضمن میں منٹو کی اہمیت اس بنا پر مبنی ہے کہ اس نے جاسوسی اور مہماتی افسانوں کے تراجم کے برعکس حقیقت نگاری پر مبنی روسی افسانوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان افسانوں کا ذائقہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ ان تراجم کی صورت میں خود منٹو کی اپنی تربیت بھی ہوگئی۔ چنانچہ جب اس نے خود افسانہ نگاری شروع کی تو یہ تربیت بے حد کام آئی اور ترگنیف اور چیخوف کی مانند اسے بھی کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کا سلیقہ آگیا ـــــ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ترجموں کے دَور میں منٹو کا ترجمہ شامل نہ کیا گیا حالانکہ جدید افسانہ کے تناظر کے لحاظ سے منٹو ان تمام مترجمین کے مقابلہ میں زیادہ اہم قرار پاتا ہے۔

اردو افسانے کے پہلے دور میں سجاد حیدر یلدرم ("خارستان وگلستان") سلطان حیدر جوش ("طوقِ آدم") نیاز فتح پوری ("کیوپڈ و سائیکی") مجنوں گورکھپوری ("سمن پوش") ـ ل۔ احمد ("بھینٹ") اور محمد علی ردولوی ("تیسری جنس") ملتے ہیں۔

یہ دَور وہ ہے جسے رومانیت کی تحریک قرار دیا جاتا ہے۔ اس دَور کے مطالعہ سے پیشتر رومانیت کی اصطلاح پر غور کر لینا بھی بہتر ہوگا، ہمارے ہاں انگریزی ناموں اور اصطلاحات کو بلا سوچے سمجھے استعمال کرنے کے جس رواج نے قبولِ عام حاصل کر لیا ہے وہ بعض اوقات ایسی عجیب وغریب صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں آغا حشر انڈین شیکسپیئر اور اختر شیرانی اردو کا کیٹس قرار دے دیے جاتے ہیں۔ یہی حال رومان، رومانی اور رومانیت جیسے الفاظ اور اصطلاحات کا ہے۔ رومان اور رومانی کو ہمارے ہاں عشق ومحبت کے مترادف استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ مفہوم ہے جس کا انگریزی ادب کی اصطلاح ROMANCE سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اردو ناقدین یلدرم اور نیاز کے اسلوب میں حسن کاری کے رجحان کی وضاحت کے لیے رومانیت کو استعمال کرتے ہیں جبکہ ان کی حسن کاری کا کولرج اور ورڈز ورتھ کے تصور ROMANTICISM سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ہم جسے رومانی تحریک یا رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری نے مفرس اسلوب میں داستانوں کی حسن کاری کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی اور بس!

جب سجاد حیدر یلدرم کے "خارستان اور گلستان" کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس افسانہ کی تدبیر کاری میں بھی داستانی عناصر کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً آغاز ہی داستان کی مانند ہے "آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے . . . ." پھر ناموں سے طلسم ہوشربا کی پریوں کے نام یاد آتے ہیں مثلاً نسرین نوش کی "سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام گل چکاں، زہرہ جبیں، ناز آفرین، موجِ نور بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ۔ بعضوں کے پرندوں کے اوپر مثلاً طاؤس خرام، کبک ادا وغیرہ تھے۔ اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔"

اسی طرح جزیرہ کی منظر کشی اور سامانِ تعیش کی جزئیات پر بھی داستانی اثرات نمایاں تر ہیں۔ البتہ یلدرم نے ایک کمال کیا کہ داستانی لے میں LIBIDO کے فرائڈین تصور کو ثابت کر دیا۔ اس افسانہ کی تھیم مرد اور عورت میں جنسی

بیداری کا نازک موضوع ہے ——— اسی لیے تو مرد اور عورت کا ایک دُوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے کے پرند چہچہا کر اُڑنے لگے، تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں، ایک گرد آہنگ و رنگ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کُل جزیرے کو گھیر لیا" ——— "خارستان و گلستان" کو بجا طور پر اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے[1]

یونانی اساطیر کا مطالعہ کرنے پر ان دیوی دیوتاؤں میں الوہی صفات ملیں یا نہ ملیں مگر جنس ان سب کی کمزوری ہے۔ بنانچہ یوس سے لے کر جنگلوں کے SATYRS تک بعض کی سب سے بڑی کمزوری جنس ثابت ہوتی ہے۔ ایسی کمزوری جو انھیں اپنی پرستش کرنے والوں کی سطح تک لے آتی ہے لیکن تمام جنس گزیدہ اولمپس میں صرف ایک سائیکی کا ایسا کردار ہے جو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت اور پھر اسے حاصل کرنے کے لیے بے پناہ عزم و استقامت کی بنا پر وفا کی دیوی ثابت ہوتی ہے اور نیاز فتح پوری نے اس کی متھ کو اپنے خوب صورت اسلوب سے اردو رُوپ پہنا دیا ہے۔

اگرچہ اسلوب میں حسن کاری کے لحاظ سے نیاز فتح پوری کو زیادہ شہرت حاصل ہے شاید اس لیے کہ زیادہ عرصہ تک جیے اور بہت کچھ لکھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دیگر امور سے قطع نظر بلحاظِ اسلوب تقابلی مطالعہ کرنے پر یلدرم کو نیاز پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ یلدرم نے اسلوب کے جمالیاتی عناصر کے ضمن میں نیاز کے مقابلہ میں کہیں بہتر آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ منظر نگاری کے سلسلہ میں بھی وہ زیادہ پُرتخیل ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح جذبات و احساسات کی تصویر کشی میں بھی یلدرم نے نیاز فتح پوری سے زیادہ نفسیاتی ژرف بینی کا ثبوت دیا ہے۔ یلدرم نے نسرین نوش اور نیاز فتحپوری نے سائکی کی جسمانی طلب کی جس انداز سے عکاسی کی ہے اس سے نسوانی جنسی تقاضوں کے بارے میں ان دونوں کے رویوں کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔

یلدرم نے ۱۸ سالہ نسرین نوش کی غیر معنی تمنا کی یُوں تصویر کشی کی ہے:

> "...... لیکن ایک صبح خلافِ معمول اس کے دل میں ایک جلن محسوس ہُوئی، اُٹھی، کاشانۂ بلور کے قریب جو نہر بہتی تھی اس تک گئی اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اس میں بے حس و حرکت پڑی رہی، پھر نکل کے اور بدن سُکھا کے سفید ریشمی بستر پہ جا لیٹی۔
>
> نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک کہ سُورج ڈھلا، سورج کی شعاعیں اس پر آ کر پڑیں اور وہ جاگی، اس وقت اس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسے جسیم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اس کے بازوؤں کو پکڑے، کمر کو سنبھالے، اس کے جسم کو اٹھا لے۔ ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ

---

[1] اس افسانہ کے مفصل مطالعہ کے لیے راقم کا مقالہ "اردو کا پہلا جنسی افسانہ" ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ("افسانہ، حقیقت سے علامت تک")

ایک ذات، ایک وجود آئے جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو۔

اس نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک سفید براق ہنس[1] پھر رہا ہے اسے ہی اس نے گود میں لے لیا اور اس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا اور اس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا اور اپنی تمام قوت سے اسے بھینچنا شروع کیا اور اس طرح پرند کے نرم پروں میں اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے کچھ بند کیے، بدن کو جھکائے دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی۔

اب پھولوں کا اس پر نثار ہونا اس کی روح کو مشغول نہ کرتا تھا ناچنے والیوں کے ناچ اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے تھے۔ سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا اسے آرام نہ دیتا تھا وہ ایک شے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہو گی کیا نہ ہو گی۔ ایک جسیم چیز چاہتی تھی جو اسے دُکھ دے، اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اسے مسل ڈالے۔ ایک ایسی پُر قوت، پُر جُرأت شے کہ باوجود اس کے حُسن و جمال کے، باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اس سے نہ دبے، اس کے رُعب میں نہ آئے بلکہ اُسے پکڑے، اُسے مارے، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے!"

—— نیاز فتح پوری نے سترہ سالہ سافی کے "حسیاتِ شباب" کو یوں اجاگر کیا ہے؛

"اس نے اپنے سارے مشاغل ترک کر دیے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیاتِ شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بے زار ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ اُنھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے۔ وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مُٹھی میں بھر کے آ جانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دکھائے اور دُکھائے جائے۔ وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرورِ حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی اور ہنس[2] کو بھی گردن اٹھائے، اُبھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی تو وہ چاہتی تھی کہ یہی باز و کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی نڈھال گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے۔"

اردو افسانہ میں حسن کاری کا رجحان ان دونوں کی صورت میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ اگرچہ اس

---

[1] یہاں فوراً ذہن LIDA AND THE SWAN کی طرف جاتا ہے۔ لیڈا سے مواصلت کے لیے زیوس راج ہنس کے روپ میں جاتا ہے۔

[2] کیا یلدرم نے نیاز کے مقابلہ میں ہنس کو زیادہ بہتر طور پر استعمال نہیں کیا؟

عہد میں اس شاعرانہ نثر کے مقلدین بھی تھے مگر یلدرم اور نیاز جیسا تخیل اور اسلوب کی سحر انگیزی اور کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

مجنوں گورکھپوری کو اس عہد کی "رومانیت" اور آنے والی حقیقت نگاری کے درمیان ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ ان کا مشہور افسانہ "سمن پوش" اپنے اندر حُسن کاری کے ساتھ ساتھ حقیقت کی جھلکیاں بھی لیے ہے۔ اگرچہ بات اتنی سی ہے کہ اپنی بیوی سے والہانہ محبت کرنے والا خاوند غلط فہمی کی بنا پر اسے قتل کر کے خود بھی خودکشی کر لیتا ہے اور مقتولہ ناہید کی بھٹکی رُوح مصنف کو اپنی کہانی سُنا کر سکون حاصل کر لیتی ہے لیکن مجنوں گورکھپوری نے بڑی کامیابی سے تحیّر کی فضا برقرار رکھی ہے اور اسی دلچسپی کے سہارے افسانہ قاری پر اپنی گرفت مضبوط کرتا جاتا ہے۔ سمن پوش میں جس انداز پر مافوق الفطرت کا استعمال کیا گیا ہے وہ اسے انگریزی ادبیات کے " ROMANCE " سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اور آج اسی میں اس کی اہمیت کا راز مضمر ہے ورنہ آج کا قاری اب ایسا افسانہ ہضم نہیں کر سکتا۔

مجنوں گورکھپوری کے ساتھ ساتھ سلطان حیدر جوش، ل۔ احمد اور دیگر حضرات کے افسانوں کا مطالعہ کرنے پر جہاں "رومانیت" میں انحطاط نظر آتا ہے وہاں آہستہ آہستہ حقیقت نگاری تقویت پاتی نظر آتی ہے حتیٰ کہ ہم چودھری محمد علی ردولوی کے عجیب و غریب افسانے "تیسری جنس" تک آ پہنچتے ہیں۔ "تیسری جنس" پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ ترقی پسندوں سے پہلے ثقہ بزرگوں کے دَور میں لکھا گیا ہے۔

اب تک جنس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسے شاعرانہ اسلوب کے لبادہ میں یوں لپیٹا گیا (مثال "خارستان و گلستان") کہ اصل بات تک ذہن پہنچ ہی نہ پائے یہ تو ترقی پسند افسانہ نگار تھے جن میں "سپیڈ" کو "سپیڈ" کہنے کی جرأت تھی لیکن جنس نگاری کے باوجود ہم جنس پرستی تقریباً ٹیبو ہی رہی ——— LESBIAN محبت تو دور کی بات HOMOSEXUALITY پر بھی لکھنے کی ہمت نہ تھی۔ عصمت چغتائی کا "لحاف" نسائی ہم جنسیت کا پہلا کامیاب مطالعہ تھا ——— جنس نگاری کے سلسلہ میں یہ ایک بہت بڑی جست تھی اور اسی لیے بہت بڑا دھماکہ بھی! لیکن محمد علی ردولوی کا "تیسری جنس" پڑھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس میں دونوں طرح کی ہم جنس پرستی ملتی ہے۔ مردانہ کا ضمنی ذکر ہے جبکہ زنانہ کا مفصّل ——— یُوں دیکھیں تو "تیسری جنس" میں "لحاف" کو ANTICIPATE کیا گیا ہے لیکن اس معذرت کے ساتھ:

> "اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں: عورت اور مرد ——— یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو، اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں، وہ جانیں اور ان کا کام۔ بنا برایں دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

——— یہ اندازِ نظر حقیقت پسندانہ ہے مگر آج بھی بیشتر اصحاب اس سے محروم ہیں۔ بقول مصنف :

"لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی، نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا' خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔ ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھتے ہیں اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔"

——— چودھری محمد علی ردولوی کو اگر جنس نگاری میں AVANT GUARD جیسی اہمیت حاصل نہ ہو سکی تو اس کی بنیادی وجہ کردار کی جنسی ساخت میں کار فرما لاشعوری محرکات سے عدم واقفیت بنتی ہے۔ جنس نگار کے لیے فرائڈ اور ہیولاک ایلس کا مطالعہ بیحد سود مند سہی لیکن کامیاب جنسی افسانہ کی تخلیق کے لیے محض کتابی مطالعہ پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو کرداروں کی لاشعوری کش مکش کی عکاسی کی صلاحیت اساسی شرط قرار پاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زبان پر ایسی قدرت جو ایمائی ابلاغ کی صلاحیت پیدا کر دے۔ لیکن اس کے باوجود محمد علی ردولوی کے افسانوں کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اور "تیسری جنس" اپنی احمدی خانم عرف مدی کی بنا پر ایک یادگار افسانہ ہے۔

۳

اگرچہ افسانہ کے ارتقائی مراحل کا مطالعہ کرتے وقت "رومانیت" کے بعد حقیقت نگاری کو گنتے ہیں لیکن یہ اندازِ نظر درست نہیں کیونکہ پریم چند کی صورت میں اردو افسانے نے اپنا آغاز حقیقت نگاری سے کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ پریم چند نے ہی پہلی مرتبہ وہ افسانے لکھے جن کے لیے بعد میں سماجی اور خارجی حقیقت نگاری جیسی اصطلاحات استعمال کی گئیں اسی طرح اردو افسانہ میں اگر مقصدیت کا مطالعہ کرنا ہو تو بھی پریم چند کی اولیت مسلّم ——— الغرض! جدید افسانے کی عظیم عمارت کی خشتِ اوّل پریم چند بنتے ہیں اور یہ خشت کیونکہ ٹیڑھی نہ تھی اس لیے "تا ثریا" دیوار کج نہ ہوئی۔

پریم چند نے اپنے پہلے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" (۱۹۰۷ء) سے اپنے لیے جس نصب العین کا انتخاب کیا وہ تمام عمر اس پر عمل پیرا رہے گاؤں کی مفلوک الحالی سے لے کر شہر میں سیاسی تحریکوں تک ان کی دلچسپیوں کا دائرہ بیحد وسیع تھا اتنا کہ زندگی ہزار رنگ سے ان کے افسانوں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

"کفن" عمر کے آخری سالوں میں لکھا گیا اس افسانہ کی صورت میں پریم چند کا فن اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بلا مبالغہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر پریم چند نے صرف "کفن" ہی لکھا ہوتا تو بھی وہ اردو کے زندہ افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے۔ گیسو اور مادھو کی صورت میں پریم چند نے وہ نہایت ہی پیچیدہ کردار بڑی فنی چابکدستی سے تخلیق کر ڈالے۔ پریم چند بعض اوقات بات سے بات کرنے میں بات کا سرا گنوا بیٹھتے ہیں اس لیے طولِ کلام ان کے افسانوں کی ایک

عمومی خرابی ہے لیکن کفایتِ لفظی کے لحاظ سے "کفن" ایک خوب صورت مثال ہے، نہ طولِ بیان نہ فالتو مکالمے۔ افسانہ کیا ہے ماہر فن کے ہاتھوں ترشا ہوا نگینہ ہے۔

پریم چند کے بعد آنے والوں میں سدرشن ("جاں نثار") عظیم بیگ چغتائی ("چینی کی انگوٹھی") اعظم کریوی ("پریم کی چوڑیاں") حکیم احمد شجاع ("اندھا دیوتا") کے افسانے اب تبرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی کی استثنائی مثال سے قطع نظر باقی تمام افسانہ نگار پریم چند کی روایت سے وابستہ تھے مگر اس روایت کو نئی جست نہ دے سکے۔

قاضی عبدالغفار نے شہرت تو "لیلیٰ کے خطوط" سے حاصل کی جو انشاپردازی کا خوبصورت نمونہ ہیں بلکہ جہاں تک انشائیہ کے ذریعہ اپنی ذات کی عکاسی کا تعلق ہے تو طوائف لیلیٰ کے بعض خطوط بے حد کامیاب انشائیہ کی مثال بھی قرار پاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کا افسانہ "تین پیسے کی چھوکری" میں تھیوڈورا کے حوالہ سے طوائف کی تاجرانہ انا کو خوب صورت انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا

"ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے، میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی۔"

"تم وہی ہو جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے۔" شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے

تھوڈورا نے کہا: "جی ہاں! میں وہی ہوں۔"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو۔" اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کی "ملاح کے پاس میں اس لیے جاتی ہوں کہ اس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وہ تین پیسے دے کر اپنا سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے جو کچھ ان کے پاس ہو سب ہی لے لیتی ہو۔"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری محبت ہے۔"

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو؟"

"آپ کا تاج و تخت، اے بازنطہ کے شہنشاہ!"

علی عباس حسینی کی "میلہ گھومنی" کے بارے میں "راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے، وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن، اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔" علی عباس حسینی کی اس "میلہ گھومنی" کو ذاتیں بدلنے کا کوئی شوق نہیں صرف مرد بدلنے کا چسکا ہے اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں، وہ بیل ہے اسی لیے ہر درخت کے مضبوط تنے سے لپٹ جاتی ہے۔ لیکن خود ایسا شجر کہ ہر مرد سایہ تلے تازہ دم ہونے کو تیار! تھیوڈورا کے برعکس یہ اپنے مرد سے اس کا سب کچھ لے لینے کا

دعویٰ بھی نہیں کرتی صرف اپنے مرد سے مردانگی چاہتی ہے اور اس کے عوض مکمل اور غیر مشروط خودسپردگی کا تحفہ پیش کرتی ہے اسی لیے تو مرتے ہوئے خاوند کو آخری لمحات میں اپنی عاقبت کی بجائے اسی کی فکر میں ہے:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا!"

علی عباس حسینی سے چل کر میرزا ادیب کے "درونِ تیرگی" تک آتے آتے افسانہ میں کئی نمایاں نام نظر آتے ہیں جو اپنے وقت کے مقبول افسانہ نگار رہوں گے۔ مگر اب ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے پر کسی نہ کسی لحاظ سے ایک آنچ کی کسر رہ جانے کا احساس ہوتا ہے البتہ میرزا ادیب کا "درونِ تیرگی" اور طرح کا افسانہ ہے جس میں استعاراتی انداز سے انسان میں خوب سے خوب تر کی جستجو اور بلند سے بلند تر فضا میں پرواز کی آرزو کی فن کارانہ عکاسی کی گئی ہے۔ تاریکی کی دبیز تہہ کے بوجھ تلے دبے بند کمرے میں مردوں کا ایک جہان آباد ہے۔ اسی تاریکی کے خوگر اور مردہ بن کر زندہ رہنے میں اپنی عافیت دیکھنے والے! ان ہی میں ایک باغی ہے جو روشنی کے سفر کی ہمت رکھتا ہے اور مشکلات کے باوجود پروانہ وار روشنی کی طرف بڑھتا جاتا ہے —— یہ افسانہ میرزا ادیب کے مخصوص اسلوب اور تکنیک سے ہٹ کر لکھا گیا ہے اور خوب ہے۔

ہر افسانہ نگار (اچھے یا بُرے کی تخصیص نہیں) اپنے موضوع کی تدبیر کاری اور کرداروں کے مخصوص تقاضوں سے عہدہ برائی کے لیے اسلوب میں تبدیلی کرتا ہے کہ یہ تقاضائے فن بھی ہے اور ارتقائے فن کا مظہر بھی۔ لیکن حجاب امتیاز علی کی صورت میں ایک ایسی افسانہ نگاری بھی ملتی ہے جس نے اپنے پہلے افسانہ "میری ناکام محبت" سے لے کر آج تک جو کچھ لکھا اسے پڑھ کر یُوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ گزشتہ چالیس برس سے ایک ہی طلسمی دائرہ میں مقید ہیں۔ وہی حبشی خانہ زاد، وہی گلابی شامیں اور وہی فرانسیسی دریچے، وہی مخصوص کردار جو ہمیشہ ایک ہی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور جن کی زندگیوں کا سب سے بڑا مسئلہ محبت ہے، مرد عورت کی پختہ محبت نہیں بلکہ ٹین ایجرز کی PSEUDO رومانیت —— واضح رہے کہ خود حجاب امتیاز علی کے بقول ان کا پہلا افسانہ "میری ناکام محبت" "ٹھیک گیارہ سال" کی عمر میں شائع ہوا تھا[1] بالفاظِ دیگر وُہ ابھی تک اپنی ٹین ایجرز فینٹسی سے آزاد نہیں ہو سکیں اور اسی لیے ۱۹۸۲ء میں ہیں مگر ۱۹۴۰ء میں سانس لیتی ہیں، ساٹھ برس کی ہیں مگر انیس سالہ دوشیزہ بن کر لکھتی ہیں۔

اُردو میں اگر کسی نے GOTHICS کی صحیح معنوں میں تخلیق کی تو وہ مسز عبد القادر ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ناول نگار ہیں مگر ان کا افسانہ "رسیلا" ان کے مخصوص انداز کا ترجمان ہے مافوق الفطرت سے تحیر کی فضا، دلچسپ واقعات کا تانا بانا اور مسلسل سسپنس —— یہ ہیں ان کی فکشن کی اساسی خصوصیات، اور یہ سب "رسیلا" میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ہمارے ہاں سائنسی فسانوں، بھوت کہانیوں، جاسوسی اور مہماتی داستانوں کو ادب نہیں

---

[1] "نگارِ پاکستان" سالنامہ ۱۹۸۱ء (افسانہ نمبر)

سمجھا جاتا حالانکہ یہ ہر عہد کے قارئین کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اگر اس نوع کی کہانیاں ادب میں شامل کی جاتیں تو آج مسز عبدالقادر اُردو کی بروم سٹوکر سمجھی جاتیں۔

۴

دسمبر ۱۹۳۲ء میں جب "انگارے" طبع ہوئی تو اس کے افسانوں پر ملک بھر میں شدید احتجاج کیا گیا۔ چنانچہ ۴ ماہ بعد کتاب ضبط کر لی گئی۔ نقوش نے اس کتاب کے چار افسانے شائع کئے ہیں "نیند نہیں آتی" (سجاد ظہیر) "مہاوٹوں کی ایک رات" (احمد علی) "دلی کی سیر" (رشید جہاں) اور "جوانمردی" (محمود الظفر) ——— ان چاروں ہی کے افسانوں پر یہ کتاب مشتمل تھی۔ بقول محمد طفیل:

> "ہم نے اس کی انگاریت کو قدرے ٹھنڈا کر کے پیش کیا ہے۔"

لیکن ان افسانوں کو "انگاریت" سمیت پڑھنے پر بھی کل کے انگارے آج محض چنگاریاں محسوس ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کے خلاف قوم نے جو شدید احتجاج کیا تو اب اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یبوست زدگی ہمارا ٹریڈ مارک بن چکا ہے۔ نئے خیال نئی سوچ سے ہم ہراساں ہو جاتے ہیں۔ لکیر کے فقیر تجربہ کے تحیر سے جنم لینے والے حسن کو کیا سمجھیں! اسی لیے ہم حبس اور گھٹن کے خوگر ہو چکے ہیں۔ نیند نہیں آتی یا مہاوٹوں کی رات کا مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرسٹریشن اور تنے اعصاب کی جھنجھلاہٹ کی تصویر کشی میں آج کا اردو افسانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور خود کلامی یا تلازم خیال کی تکنیک میں بھی فن کارانہ لطافتیں پیدا کی جا چکی ہیں۔ سو آج "انگارے" کے افسانوں کی زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت بنتی ہے۔ اور اگر یہ کتاب ضبط نہ کی جاتی تو آج یہ خود اپنی موت آپ مر چکی ہوتی لیکن ضبط ہو جانے کے باعث یہ کتاب ایک طرح کی YARD STICK بن گئی۔ آنے والے ناقدین "انگارے" کے غلغلہ سے اتنے مرعوب ہوئے کہ بغیر پڑھے ہی اس کا حوالہ دیتے گئے۔ یوں "انگارے" محض افسانوں کی ایک کتاب نہ رہی بلکہ اچھا خاصہ CULT بن گئی۔

افسانہ کی تاریخ کے حوالے سے اگر گفتگو کریں تو "انگارے" کی دوگونہ اہمیت بنتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اسے سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کی حُسن کاری کے خلاف سمجھا جا سکتا ہے یہ پُراسرار ماضی کے دُھندلکوں میں لپٹی شہزادیوں کی خوابناک کہانیاں نہیں بلکہ گرد و پیش پھیلی بدمزہ زندگی کی تلخیوں کا تیز طرار نثر میں اظہار ہے:

> "یا اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا، تو ارحم الراحمین ہے، میں تیرا ایک ناچیز گنہگار بندہ تیرے سامنے دست بدعا ہوں ... مگر کچھ بھی ہو ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میری بیوی پر

---

[1] آج کسی کو یہ یاد بھی نہیں کہ ۱۹۳۴ء میں احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ "شعلے" چھپا تھا۔

> گالیاں پڑنے لگیں، مگر میں کروں تو کیا کروں؛ بھوکا مروں؛ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اس پر ایک کھوپڑی، کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جا رہی ہے۔ اکبر صاحب آپ کے جسم کا گوشت کیا ہوا! آپ کا چمڑا کدھر گیا! جی میں بھوکا مر رہا ہوں۔ گوشت اپنا میں نے گدھوں کو کھلا دیا۔ چمڑے کے طبلے بنوا کر منی جان کو تحفہ دے دیئے کہیے کیا خوب سوجھی! آپ کو رشک آتا ہو تو بسم اللہ میری پیروی کیجئے، میں کسی کی پیروی نہیں کرتا، آزاد ہونے ہوا کی طرح سے، آزادی کی آج کل اچھی خاصی ہوا چلی ہے، پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ۔ آزادی کے چکر میں ہیں، موت یا آزادی، نہ مجھے موت پسند نہ آزادی، کوئی میرا پیٹ بھر دے۔" ("نیند نہیں آتی")

یہ طرزِ احساس، اندازِ نظر اور اسلوب "خارستان وگلستان" اور "کیوپڈ وسائکی" کے برعکس ہے، ہر لحاظ سے برعکس!

"انگارے" کی صورت میں اردو افسانہ تلخی کی سمت میں اپنا رُخ تبدیل کرتا نظر آتا ہے اگرچہ پریم چند عرصہ سے حقیقت نگاری کر رہے تھے لیکن ان کے ہاں اعصابی تناؤ کی جھنجلاہٹ اور فرسٹریشن کی پیدا کردہ تلخی نہ تھی۔ "انگارے" نے اپنے معاصرین کو غصہ میں آنا سکھایا۔ تلخ نوا ہونا سکھایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معاشرہ کو گالی دینے کی جرأت سکھائی۔

"انگارے" کی اشاعت کے چار برس بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے یوں دیکھیں تو یہ پریم چند کی معتدل مزاجی اور نرم خوئی اور ترقی پسند افسانہ کی بے باکی اور واقعیت نگاری کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے؛

> "۔ . . . کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے، اچھی حکمت ہے، کوئی جاڑے میں اینٹھیں لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں، اوڑھنے کو کپڑے تک نہ ہوں، سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں اور موت بھی نہ آئے۔ کوئی ہیں کہ لاکھوں والے ہیں یہ ستم کا سامان ہے کسی بات کی تکلیف نہیں اگر وہ تھوڑا سا ہم ہی کو دے دیں تو ان کا کیا جائے گا، غریبوں کی جانیں پل جائیں گی لیکن ان کو کیا پڑی، کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس، ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے، تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؛ کس لیے بنایا؟ یہ رنج سہنے اور مصیبت اٹھانے کے لیے؟ ارے کیا انصاف ہے' وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں نہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا . . . . . . ضرورت تو اب ہے، بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہو اور دوا دس برس بعد ملے گی۔ باز آئے ایسی عاقبت سے' جب کی جب بھگت لیتے اب تو کچھ ہو . . . . ." ("مہاوٹوں کی ایک رات")

۵

"اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی

> جس کی موت یقینی اور لازمی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ادب جدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پرستی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پسند طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک افلاس سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"[1]

یہ نئی آواز تھی اور نئی سوچ کا افتتاح تھا۔ ادیبوں نے پہلی مرتبہ ایک نئے زاویہ سے اپنے گرد و پیش پھیلی زندگی کے پُرتعفن گھناؤنے پن کو دیکھنے کی جرأت پیدا کی، اس تحریک نے پہلی مرتبہ معاصر زندگی کے تضادات اجاگر کرنے والا پیمانہ دیا اور یہ صرف اسی تحریک سے وابستہ قلم کاروں کی جرأت اظہار تھی جس نے شیشے کی دیوار کی صورت میں پھیلے طلسم توڑ ڈالے۔ جس کے نتیجہ میں تخیل کے پر لگا کر پُراسرار فضاؤں کی تحیر خیزیوں کی عکاسی کرنے والے ادیب کے پاؤں اپنی دھرتی کے کیچڑ سے آلودہ ہوئے اور یہ بھی ان ادیبوں ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے اسی کیچڑ سے کنول کھلائے ——— آج اگر اردو افسانہ کی تاریخ میں سے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی ——— صرف یہ پانچ نام نکال دیں تو افسانہ کی تاریخ کے خدّ و خال پہچاننے مشکل ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اب تک اگر اس تحریک کا بھرم قایم ہے تو وہ ان ہی کے باعث ہے۔

ان کے پہلو بہ پہلو وُہ افسانہ نگار بھی ملتے ہیں جو اگرچہ ترقی پسند تو نہیں لیکن بلحاظِ اہمیت وہ کسی سے بھی کم نہیں۔ اس ضمن میں عزیز احمد، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، اور انتظار حسین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اور اگر تحریک ایسے STALWARTS کا مقابلہ کر گئی تو یہ صرف تحریک کی داخلی توانائی کے باعث ممکن ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے عمل اور اس کے ردِّ عمل کی صورت میں جن افسانہ نگاروں اور افسانوں نے جنم لیا بلاشبہ وہ افسانہ کی تاریخ کا سرمایہ ہیں۔ چنانچہ گزشتہ ۴۵ برس میں ہمیں کم از کم اتنے ہی افسانہ نگاروں کے نام مل جاتے ہیں ایسے افسانہ نگار جن کے ایک سے زاید افسانے کسی نہ کسی صورت سے ادب میں زندہ رہیں گے اور ان سب کی عکاسی نقوش کے مختلف افسانہ نمبروں سے ہو جاتی ہے (جنوری ۱۹۵۴ء، دسمبر ۱۹۵۵ء، نومبر ۱۹۶۰ء، نومبر ۱۹۶۸ء، مئی ۱۹۷۲ء، ستمبر ۱۹۷۴ء) چنانچہ ان افسانہ نمبروں کی روشنی میں اگر اہم افسانہ نگاروں کے اہم افسانوں کی

---

[1] "ترقی پسند ادب کی تحریک کا منشور" (لکھنؤ، اپریل ۱۹۳۶ء)

فہرست مرتب کریں تو وہ کسی لحاظ سے بھی "کم عیار" نہ ثابت ہوگی۔

نقوش کے افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء، انتخاب) میں ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسند ادیبوں کے جو ۳۸ افسانے درج ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو اردو افسانہ کی تاریخ میں اب سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں اگرچہ سب کا تفصیلی مطالعہ تو ممکن نہیں تاہم ان کے نام لے دینے سے ہی اردو افسانہ کا زرخیز ترین عہد اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ زندہ ہوتا محسوس ہوتا ہے:

زندگی کے موڑ پر (کرشن چندر) نیا قانون (سعادت حسن منٹو) گرہن (راجندر سنگھ بیدی) چوتھی کا جوڑا (عصمت چغتائی) ہماری گلی (احمد علی) آنندی (غلام عباس) پرمیشر سنگھ (احمد ندیم قاسمی) آپا (ممتاز مفتی) زعفران کے پھول (خواجہ احمد عباس) مجھے جانے دو (اختر حسین رائے پوری) حجاموں کی یونین (ملک راج آنند) نئی مصیبتیں (رشید جہاں) حرامجادی (حسن عسکری) زریں تاج (عزیز احمد) آخری کوشش (حیات اللہ انصاری) بینگن کا پودا (اوپندر ناتھ اشک) لال دھرتی (دیوندر ستیارتھی) کلیاں اور کانٹے (اختر اورینوی) جگا (بلونت سنگھ) بھالو (ہاجرہ مسرور) خون (انور) جلاوطن (قرۃ العین حیدر) مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے (خدیجہ مستور) جیپنی (شفیق الرحمٰن) الاؤ (سہیل عظیم آبادی) آئینہ (ممتاز شیریں) زرد چہرے (ابراہیم جلیس) سردار جسونت سنگھ (قدرت اللہ شہاب) ٹوٹ گیا اک تارا (تسنیم سلیم چھتاری) سمندر اور تین کمرے (مدھوسدن) کلوا (سید رفیق حسین) سرگزشت (ابوالفضل صدیقی) جہاں میں رہتا ہوں (مہندر ناتھ) آبِ حیات (راما نند ساگر) باجی ولایت (آغا بابر) آنکھ مچولی (شکیلہ اختر) اب اور تب (ہنس راج راہبر) روپ چند (صدیقہ بیگم سیوہاروی) تجاوز (عبدالرحمٰن چغتائی)۔

یہ درست ہے کہ یہ تمام افسانے نقوش میں شائع نہیں ہوئے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اب نقوش کے متذکرہ نمبر کے علاوہ یہ اور کہیں یکجا دستیاب بھی نہیں ہیں۔

کرشن چندر نے ایک خاص نصب العین کے مطابق لکھا اور خوب لکھا اگرچہ عمر کے آخری برسوں میں تیزیٔ قلم کی بنا پر اس کے افسانوں میں وہ "رس" نہ رہا جس کے لیے کرشن چندر نے خصوصی شہرت حاصل کی تھی تاہم اس کے قلم کا اعجاز تھا کہ کہنے کو کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی وہ افسانہ میں دلچسپی پیدا کر لیتا تھا لیکن ایک بات طے ہے کہ افسانہ اچھا لکھا یا بُرا، لیکن انسان دوستی کے جس آدرش کو اپنایا تھا اس سے کبھی بھی انحراف نہ کیا۔ چنانچہ نقوش (افسانہ نمبر نومبر ۱۹۶۰ء) میں کرشن چندر کا افسانہ "تائی ایسری" بھی اس کے مخصوص اندازِ نظر کی ایک اچھی مثال ہے۔ تائی ایسری ایک ایسا تناور درخت ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہر کوئی   کر تازہ دم ہو سکتا ہے، خدمت کرنے والی محبت کرنے والی بھگت تائی، جس کے بارے میں کرشن چندر لکھتا ہے:

> "مجھے معلوم نہیں ہے آج تائی ایسری کہاں ہیں ؛ لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں تو وہ اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین
> پیڑھی پر بیٹھی اپنی پچھی سامنے کھول کر بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں
> چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی۔"

اگر آپ تصور کی آنکھ سے دیکھیں تو خود کرشن چندر کو بھی سر پر ہاتھ پھرواتے اور چونیاں لیتے دیوتاؤں کے پرے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اپنی وسیع محبت کے باعث خود کرشن چندر بھی اچھا خاصا دیوتا ہی تھا۔

اسی افسانہ نمبر میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "کالی کلی" شامل ہے۔ یہ افسانہ منٹو کے مخصوص اسلوب، کہانی کی ہیئت اور کردار نگاری کے معروف انداز سے یکسر ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ منٹو کے افسانے اپنے مزاج کی بنا پر جن امور میں دیگر افسانوں سے الگ نظر آتے ہیں ان سب کا اس افسانہ میں فقدان ہے۔ اگرچہ محمد طفیل نے افسانہ کا اختتام خود منٹو کی تحریر ہی میں شائع کیا ہے۔ اس کے باوجود اسے منٹو کا افسانہ تسلیم کرنے کو جی نہیں مانتا۔ منٹو کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو ہوا جبکہ افسانہ کے اختتام پر منٹو کے ہاتھ کی لکھی تاریخ ۴ جنوری ۱۹۵۶ء درج ہے ——— یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اگر فرض کر لیں کہ یہ افسانہ واقعی منٹو ہی کا ہے (اور یقیناً ہمیں محمد طفیل سے منٹو کے نام پر جعلی افسانہ شائع کرنے کی توقع بھی نہیں) اور وہ سہواً غلط سنہ لکھ گیا (زندگی کے آخری ایام میں منٹو کی جو ذہنی حالت تھی اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا) تو یہ افسانہ منٹو کے اصل فن کا نمائندہ بننے کے برعکس اس کے ذہنی انتشار کا غماز قرار پاتا ہے۔ منٹو معاشرہ اور اخلاق کا باغی ہو سکتا ہے لیکن وہ فنِ افسانہ کے اساسی اصولوں کا باغی نہ تھا۔ بظاہر سیدھے سبھاؤ میں کہانی کہنے کے باوجود افسانہ پر اس کی گرفت کبھی کمزور نہ ہوئی اور نہ ہی اس نے کبھی فالتو فقرات لکھے۔ جبکہ "کالی کلی" کسی مرتکز ذہن کے برعکس منتشر ذہن کی ضمنی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ پانچویں دہائی میں نہ تو تجریدی افسانے کا آغاز ہوا تھا اور نہ ہی خود منٹو نے اس نوع کے تجربات سے کسی طرح کی دلچسپی کا اظہار کیا، اگر یہ افسانہ آج لکھا گیا ہوتا تو اس پر تجریدی یا علامتی کا لیبل لگا کر بات ختم کی جا سکتی تھی لیکن منٹو وہ افسانہ نگار ہے جس کے فن کی تفہیم لیبل بازی سے ممکن نہیں اور نہ ہی اسے مخصوص سانچوں میں فٹ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے فن کا اگر کوئی لیبل ہے یا اس کے افسانوں کا اگر کوئی سانچہ بنتا ہے تو اس کے اصول و ضوابط اور حدود کا تعین خود اس کے اپنے فن کے مخصوص مزاج اور اس کے افسانوں کی مخصوص فضا سے ہوتا ہے جبکہ "کالی کلی" ان سے لگا نہیں کھاتا۔

نقوش (نومبر ۱۹۶۸ء) کے افسانہ نمبر میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "مِتھن" شامل ہے، اردو میں جنس نگاری کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہی اس میں سنسنی خیزی رہی ہے کیونکہ جتنی بھی سنسنی تھی وہ سب منٹو سمیٹ چکا ہے لیکن بیدی نے "مِتھن" (سنسکرت، جنسی مواصلت) کی صورت میں ایک ایسا افسانہ لکھا جو تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے اردو کے جنسی افسانوں میں ہمیشہ منفرد رہے گا۔ افسانہ کا موضوع عورت کی خود آگہی ہے یہ خود آگہی کیونکہ جسم کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اس لیے جنس اس میں بنیادی وسیلہ بنتی ہے یہی نہیں جنس کے ذریعہ سے حاصل کردہ

خود آگہی کیرتی کی مجسمہ سازی کو ایک نیا موڑ اور اس کی تکنیک کو ایک نئی جست عطا کرتی ہے وہ اچھوتی تھی تو مینیچر بناتی، مگر خود "مِتھن" کے تجربے سے گزرنے کے بعد وہ قدِآدم مجسمہ بناتی ہے۔ یوں "شلپ میں عورت تکمیل کو پہنچ رہی تھی جبکہ مرد خود رفتگی کے عالم میں اسے دونوں کندھوں سے پکڑے ہوئے تھا" اور اس مرد کو یوں بنایا گیا تھا کہ وہ "اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بیحد کثیف"۔ یہ نیچے سے کثیف اسی لیے تھا کہ اس میں انسان کی "حراریت" پر زور دیا گیا تھا۔

"مِتھن" کا موضوع بے حد نازک ہے اور بیدی اس میں جو فن کارانہ حُسن پیدا کرنے میں کامیاب رہا تو اس لیے کہ طویل تخلیقی زندگی کے بعد وہ الفاظ اور ان سے وابستہ تلازمات سے کام لینے پر پُوری طرح سے قادر ہے (مزید تفصیلات کے لیے "افسانہ: حقیقت سے علامت تک" میں راقم کا مقالہ "مِتھن کا تجزیاتی مطالعہ" ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)

اس افسانہ نمبر میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "آسیب" بھی خاصہ کی چیز ہے۔ بُوڑھے امجد حسین کی زندگی کی تمام یادیں بنگلہ پر پھیلے بڑ کے اس درخت سے وابستہ ہیں جو اس کے لیے ایک صحیفہ ہے اور اس کے پتے اس صحیفے کے ورق ہیں، اور جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "اگر یہ بڑ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ بھی جڑ سے کٹ جائے گا" ——— اور ایک دن ضدی بہو واقعی اس بڑ کو کاٹ دیتی ہے ——— مگر امجد حسین جس طرح "آسیب" بن کر بہو کے خوبصورت پھولوں کی پھلواری اُجاڑتا ہے اس نے اس افسانہ کو محض درخت کی محبت سے اونچا کر کے انسانی سرشت کا ایک کامیاب مطالعہ بنا دیا ہے۔ درختوں کو انسانوں کی مانند جیتا جاگتا سمجھ کر ان سے محبت کا سلوک کرنے والے لوگوں کو اس افسانہ سے بے حد تقویت حاصل ہوگی۔

نقوش کے (جنوری ۱۹۵۴ء) افسانہ نمبر میں عصمت چغتائی کا مشہور افسانہ "ننھی کی نانی" شامل ہے۔

"ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا، جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سُڑسُڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں پھر کچھ دن بعد "بشیرے کی بہو" کہلائیں، پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔"

یہ ننھی کی نانی کا آغاز ہے جبکہ اس کی بے معنی اور بے مصرف زندگی کا اختتام یُوں ہوا،

"مگر اس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی فانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں۔ زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی، کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

حشر کے دن ۔ ۔ ۔ ۔ صور پھونکا گیا۔ نانی ہڑبڑا کر کھنکارتی ہُوئی اُٹھیں جیسے لنگر کی بھنک کان میں پڑ گئی ہو.... فرشتوں کو صلواتیں سناتی لشتم پشتم پل صراط پر سے اکڑوں گھسٹتی ہوئی خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور میں لپکیں، انسانیت کی اتنی بڑی توہین دیکھ کر خدا کا سر شرم سے جھک گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ خون کے آنسو رونے لگا۔

اور خدا کے وُہ خون میں ڈوبے ہوئے آنسونانی کے کچے ڈھیر پر ٹپکے جہاں سرخ سرخ لالے کے پھول لہلہانے لگے"۔

دیکھا جائے تو افسانہ ان ابتدائی اور اختتامی سطروں سے ہی مکمل ہو جاتا ہے باقی جو کچھ درمیان میں آتا ہے اسے ایک طویل فٹ نوٹ سمجھنا چاہیے۔

اسی افسانہ نمبر میں غلام عباس کا ایک معروف افسانہ "بردہ فروش" بھی شامل ہے۔ یہ اس ریشماں کا افسانہ ہے جو بیوی بن کر جسم کا سودا کرتی ہے۔

"خیر اس سے تو خدا نے تمہارا پیچھا چھڑا دیا مگر یہ چودھری ہے بڑا نمازی، پرہیزگار، جب سے بیوی مری ہے گھر بسانے کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں۔"

"زیادہ بُوڑھا تو نہیں؟"

"نہیں ایسا بُوڑھا تو نہیں"۔

"کیا عمر ہو گی؟"

"یہی کوئی پچاس پچپن برس"۔

لیکن اس ریشماں سے بھی وہی ازلی حماقت سرزد ہو گئی جو ہر عورت سے ہوتی ہے کہ اسے بیوی بننے میں سچ مچ کا مزا آنے لگا اور یہ مزا ہی سارے فساد کی جڑ ہوا کرتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو اس قماش کی عورتوں کے ساتھ ہونا چاہیے یعنی دو سابق خاوندوں نے مل کر ایک نئے خاوند کے پاس اس کا سودا کر دیا۔

بلونت سنگھ نے پنجاب کے دیہات سے ایسے سکھ کردار چنے جن کے حوالہ سے وہ سختی، خشونت اور جرم کی تصویر کشی کرنے میں بےحد کامیاب رہا مذکورہ خاص نمبر میں بلونت سنگھ کا افسانہ "کالی تتری" بھی اسی مخصوص انداز اور اسلوب کا حامل ہے ہر چند کہ اس میں "جگا" کی مانند انسانی نفسیات کا گہرا ادراک نہیں ملتا۔ اور بقول مصنف:

"اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا سالم پنجاب ہے جس میں ہندو مسلم اور سکھ ڈاکو مل جل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانوں میں نقب لگایا کرتے تھے۔"

اور کیا نقب لگایا کرتے تھے! بلونت سنگھ نے جزئیات اور تفصیلات کے ذریعہ سے نقب کے عام سے معنوں کے بیان میں وہ کمال پیدا کر دیا کہ سسپنس سے مخصوص فضا کی تشکیل میں یہ افسانہ کسی امریکی منصوبہ جیسی دلچسپی اختیار کر لیتا ہے۔

"میلہ گھومنی" والے علی عباس حسینی کا افسانہ "ورثہ" (نقوش، افسانہ نمبر، نومبر ۱۹۶۰ء) اس لحاظ سے خاصہ میلوڈرامٹک ہے کہ شراب نوشی اپنا کر بیٹا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ اس باپ کے نقشِ قدم پر جس سے شراب نوشی کے باعث وہ خود عمر بھر متنفر رہا۔

۶

طوالت سے بچنے کے لیے کئی اہم اور معتبر نام کے حامل افسانہ نگاروں کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ وہ تذکرہ کے قابل نہ تھے۔ بھلا قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، ممتاز مفتی، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، رام لعل، اے حمید، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ڈاکٹر احسن فاروقی، واجدہ تبسم کے فن سے صرفِ نظر کیسے ممکن ہے؟

نقوش کے بعد کے افسانہ نمبروں کے مطالعہ سے افسانہ میں جدید رجحانات کی کونپل بھی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ افسانہ نگار جو ان نمبروں میں سینئر افسانہ نگاروں کی لمبی چوڑی فہرست کے نیچے دبے دبے سے تھے آج ان کا قد آور افسانہ نگار میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۴ء کے افسانہ نمبر (کل افسانہ نگار ۴۴) میں اشفاق احمد کا "گڈریا" بائیسویں نمبر پر ہے تو انتظار حسین کا "کچی بزلی" چھبیسویں نمبر پر۔ جبکہ ۱۹۶۰ء کے افسانہ نمبر (کل افسانہ نگار ۳۶) میں انور سجاد "نہ مرنے والا" اکتیسویں نمبر پر ہے۔ اسی طرح ۱۹۶۲ء کے افسانہ نمبر (کل افسانہ نگار ۳۸) میں مسعود اشعر "اپنی اپنی سچائیاں" چھتیسویں نمبر پر ہے۔ یہ تب کی بات تھی لیکن آج ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج جدید افسانہ کی فہرست آغاز ہی ان ناموں سے ہوگا۔

بالفاظِ دیگر محمد طفیل نے محض بڑے ناموں پر مشتمل ہی نمبر نہیں نکالے بلکہ جونیئر افسانہ نگاروں اور جدید رجحانات کو بھی مناسب نمائندگی دینے کی سعی کی ہے۔ یوں دیکھیں تو نقوش کے یہ افسانہ نمبر ایک ایسا پل بن جاتے ہیں جس کا ایک سرا بزرگوں کی تخلیقات پر استوار ہے تو دوسرا جدید رجحانات اور نئے میلانات کے جلو میں گم ——— اور ابھی تو مستقبل میں بہت کچھ ہونا ہے اور نقوش کو اس کا آئینہ بھی بننا ہے۔

اردو میں اگر "مخزن" سے جدید نوعیت کے ادبی جرائد کی تاریخ کا آغاز (۱۹۰۱ء) کریں تو نقوش تک آتے آتے اس کی عمر اس صدی جتنی قرار پاتی ہے۔ اس دور میں نیرنگِ خیال، ادبِ لطیف، ساقی، زمانہ، نگار، ہمایوں اور ادبی دنیا جیسے بڑے بڑے پرچے بھی ملتے ہیں پھر پاکستان میں فنون، سیپ، سویرا، نیا دور، افکار، تخلیقی ادب، معاصر، ماہِ نو غرضیکہ ہر رنگ اور مزاج کے پرچے ملتے ہیں لیکن نقوش نے اپنے خاص نمبروں سے جو امتیازی وصف حاصل کر لیا ہے اسے بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ نقوش کے خاص نمبر اب حوالہ اور سند کی چیز بن چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو وقت سے نقوش کو مل سکتا ہے۔

نقوش محمد طفیل کا اسلوبِ حیات بھی ہے اور اس کا "PERSONA" بھی ——— من تو شدی تو من شدی ——— کی بہتر اور مکمل ترین مثال اور کہاں سے مل سکتی ہے۔

نقوش کا غزل نمبر

خواجہ محمد زکریا

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ اُردو شاعری کا آغاز پنجاب میں ہوا، بنیاد دکن میں رکھی گئی، ارتقاء دلی اور لکھنؤ میں ہوا، اور ہنوز اِس صنفِ شعر میں انحطاط کے آثار دکھائی نہیں دیتے حالانکہ کئی دوسری شعری اصناف محض تذکروں اور دیوانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ غزل پر بھی پیغمبری وقت آیا تھا۔ مولانا حالی نے "مقدمہ" میں جب اس کی اصلاح کے مشورے دیئے تو بعض لوگوں نے اسے غزل کی مخالفت جانا، پھر عظمت اللہ خان آئے، وہ نظم نگار تھے اور نظم پر اِس طرح مفتوں ہوئے کہ غزل کو برداشت نہ کر سکے۔ اور نادرشاہی حکم نازل کیا کہ: اُردو شاعری کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف مار دی جائے۔ ترقی پسند تحریک کا دور آیا۔ اگرچہ اس تحریک نے غزل کی مخالفت من حیث الجماعت نہیں کی تاہم نظم ان کے لیے زیادہ کارآمد تھی اس لیے شعراء زیادہ تر نظمیں ہی لکھتے رہے کبھی کبھی جوش ملیح آبادی جیسا کوئی شاعر غزل پر وار بھی کر بیٹھتا تھا۔ بہرحال نظم نگاری کا رجحان غالب رہا۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے غزل کی مخالفت کو ایک فکری بُنیاد مہیا کی اور اُسے "نیم وحشی صنفِ سخن" قرار دیا۔ "نیم وحشی" کی اصطلاح کی وضاحت انھوں نے یُوں کی کہ دنیا کی ہر زبان میں جو اصناف لوک ادب کی سطح پر پیدا ہوتی ہیں وہ انتہائی غیر مربوط ہوتی ہیں (گویا انھیں "وحشی" کہنا چاہیے) غزل اس سے ایک قدم آگے ہے اس لیے نیم وحشی ہے اور نظم مربوط ہونے کی وجہ سے متمدن صنف ہے۔ غزل گوئی کے جواز یا عدمِ جواز پر بحث زور شور سے جاری تھی مگر غزل گوئی میں ضعف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بے شک نظمیں بڑی تعداد میں لکھی جا رہی تھیں مگر بیسویں صدی کے آغاز سے آج تک نظم گوئی کے متنوع رجحانات کے باوجود ہر دور میں ایسے شعراء بھی موجود رہے جنھوں نے غزل کی مقبولیت میں کمی نہیں آنے دی۔ البتہ بعض ناقدین نے غزل کی مخالفت کا طبل اتنے زور سے پیٹا کہ غزل پس منظر میں جاتی دکھائی دینے لگی۔ قیامِ پاکستان کے ذرا بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ "نقوش" کے غزل نمبر کی اشاعت کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

نقوش کے غزل نمبر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں تین سو اٹھارہ شعراء کی غزلیں شامل تھیں اور یہ ۴۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ نمبر بے حد مقبول ہوا اور جلد ہی اس کی تمام کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ معلوم ہوتا ہے مدیر نقوش کو خود بھی یہ توقع نہیں تھی کہ یہ نمبر اتنی مقبولیت حاصل کرے گا۔ محمد طفیل تیسرے ایڈیشن کے طلوع میں لکھتے ہیں:

بچپن عمر کی بات ہے کہ جب مجھے معاملاتِ حسن و عشق کا کچھ بھی پتا نہ تھا (پتا تو خیر اب بھی نہیں ہے) میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی خریدی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

> بعد کے صفحات میں وہ تمام اشعار لکھے تھے جو مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند آگئے تھے۔ بچپنے کی علت نے بڑھاپے میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور ۱۹۵۴ء میں میں نے غزل نمبر کے نام سے نقوش کا ایک نمبر شائع کر دیا جو خلافِ اُمید اتنا مقبول ہوا کہ میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہوا ابھی میری طرح کے صاحبانِ دل موجود ہیں ـــ جی بہت خوش ہوا۔"

طفیل نے نمبر تو اس خیال سے شائع کر دیا تھا کہ غزل اُردو کی ایک اہم صنفِ شعر ہے لیکن ادبی رسالوں کے اس شور و شغب نے کہ "یہ دورِ نظم کا ہے" خود انھیں بھی کچھ نہ کچھ متاثر کر رکھا ہوگا اور وہ دل ہی دل میں سمجھتے ہوں گے کہ اب غزل ماضی جیسی مقبول نہیں رہی۔ مگر یہ بات درست نہیں تھی۔ بے شمار لوگ غزل کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور خود صنفِ غزل میں ایسی خصوصیات موجود ہیں، کہ کوئی دوسری صنفِ شعر مقبولیت میں غزل کو نیچا نہیں دکھا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ نقوش کا نمبر مقبول ہوا، اور نقوش کے غزل نمبر ہی پر کیا منحصر ہے، اس کے بعد شائع ہونے والے "نیرنگِ خیال" اور "فنون" کے غزل نمبر بھی مقبولیت میں پیچھے نہیں رہے بلکہ غزل کے جو بھی انتخاب کتاب یا رسالے کی شکل میں شائع ہوئے ہیں ہمیشہ نسبتاً جلد فروخت ہو گئے ہیں۔ بہرحال اشاعتِ اوّل کی مقبولیت نے محمد طفیل کو احساس دلایا کہ صنفِ غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ اس لیے غزل نمبر کو اور زیادہ توجہ اور محنت سے ترتیب دے کر شائع کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری اشاعت (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں بہت سے شعراء کا کلام ایزاد کیا گیا۔ شعراء کی تعداد تین سو اٹھارہ سے بڑھ کر تین سو چھیاسٹھ ہو گئی۔ پھر شعراء کی تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ "نمبر" کو معتبر بنانے کے لئے بڑا کارآمد قسم کا نثر کا حصہ بھی شامل کر دیا گیا۔

پھر تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں نکلا۔ یہ شمارہ پہلی دونوں اشاعتوں سے زیادہ ضخیم تھا اور اس میں چار سو ستر شعراء کا کلام موجود تھا، گویا ایک سو سے زائد غزل گو شعراء کے کلام کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۵ء میں سفید کاغذ پر چوتھی اشاعت منظرِ عام پر آئی تو تیسرے ایڈیشن میں کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا تھا۔ صرف صفحات کی ازسرِ نو ترتیب لگانے کی وجہ سے صفحات کے نمبر تبدیل ہو گئے۔ اس کے علاوہ تیسرے اور چوتھے ایڈیشن میں کوئی فرق نہیں۔ یہ بات بظاہر بڑی حیران کن ہے کہ پچیس برسوں کے بعد شائع ہونے والا ایڈیشن ترمیم و اضافے سے قطعی محروم رہا، حالانکہ پچیس برسوں میں ایک نئی نسل جوان ہو جاتی ہے اور نوجوان شعراء پختہ کار ہو جاتے ہیں۔ اس کا احساس محمد طفیل کو بھی تھا۔ وہ چوتھے ایڈیشن کے طلوع میں رقمطراز ہیں :۔

> "اس نمبر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا۔ اس وقت جو شعراء اپنی شاعری کے ابتدائی مراحل میں تھے وہ آج بفضلِ خدا نمایاں شاعر ہیں۔ بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ آج کے حالات میں، آج کی تاریخوں میں نیا غزل نمبر ترتیب دیا جاتا، سو وہ کام بھی ہم نے کر رکھا ہے مگر اس کی ضخامت خاصی بڑھ گئی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ مجموعہ بھی صنفِ شاعری میں قابلِ ذکر مقام رکھے گا، مگر وہ نمبر موجودہ نمبر سے خاصہ مختلف ہوگا، ہونا بھی چاہیے،
>
> بس ذرا صبر!"

چوتھی اشاعت پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہو سکتا تھا جس کا شافی جواب محمد طفیل نے دے دیا۔ واقعی غزل نمبر میں اضافے کرتے رہنے سے بہتر یہ ہے کہ جدید غزل کا ایک الگ نمبر شائع ہو اور طفیل مرحوم نے یہی منصوبہ بنایا تھا مگر افسوس موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ یہ جدید غزل نمبر چھپ کر ہمارے ہاتھوں میں پہنچ جاتا۔ تاہم قارئینِ نقوش کی طرح میری بھی یہ خواہش ہے کہ موجودہ

جلد شائع ہو کر منظرِ عام تک آئے۔

نقوش کے غزل نمبر کی مختلف اشاعتوں پر الگ الگ اظہار کرنے کی بجائے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ اس کی چوتھی اشاعت ہی پر گفتگو کی جائے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اس کام کی تکمیلی صورت ہے اور اب اس میں اضافہ بھی نہیں ہوگا اس لیے غیر مکمل اشاعتوں سے قطع نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی یہی بہتر ہے کہ پہلی اشاعت سے چوتھی اشاعت تک غزل نمبر میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔

غزل نمبر کی ترتیب میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ بعض شعراء کی دس۲ غزلیں، چند ایک کی چھ، کچھ کی دو دو، بہت سے شعراء کی محض ایک غزل نمبر میں شامل کی گئی ہے، تاہم گنتی کے چند شعراء ایسے بھی ہیں جن کی کوئی مکمل غزل درج نہیں کی گئی بلکہ محض متفرق اشعار دیئے گئے ہیں۔ بعض جگہ یوں بھی ہے کہ دو یا تین غزلوں میں سے چھ یا سات منتخب اشعار درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعراء قدیم دور کے اساتذہ ہیں اور مکمل غزل درج نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قدیم تذکروں میں عموماً متفرق اشعار لکھ دیئے جاتے ہیں اور مکمل غزلیں دستیاب نہیں ہوتیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ذرا اور تلاش کی جائے تو ان میں سے بیشتر شعراء کی مکمل غزلیں مل سکتی ہیں اور جن کی مکمل غزلیں نہیں ملتیں وہ عموماً تیسرے درجے کے بالکل غیر معروف شعراء ہیں جن کو ضخیم تذکروں میں تو جگہ دی جا سکتی ہے مگر نقوش کے غزل نمبر میں ان کا نام نہ بھی درج ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دس، چھ اور دو ایک کی تعداد یہ ظاہر کرتی ہے کہ شعراء کی درجہ بندی میں کیا فرق ہے۔ ظاہر ہے جن شعراء کی دس۲ غزلیں مندرج ہیں وہ اہم اور رجحان ساز شعراء ہیں۔ انھیں ناقدین نے تسلیم کیا ہے اور قارئین نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ "ولیؔ" سے لے کر اثرؔ لکھنوی تک پینتیس شعراء کا کلام اس حصے میں درج ہے۔ میر، سودا، درد، غالب، مومن، ذوق، آتش، داغ، امیر، حالی، اکبر، اقبال، حسرت، اصغر، فانی، جگر، فراق، حفیظ جالندھری اور یگانہ جیسے شعراء کا کلام تو اس حصے میں ہونا ہی چاہیے کہ اس کو "اساتذہ غزل" کا عنوان دیا گیا ہے۔ مگر مصحفی اور میر حسن کا کلام ان دنوں غیر مطبوعہ تھا۔ انھیں اس حصے میں جگہ دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مدیر نقوش کی رسائی غیر مطبوعہ کلام تک بھی تھی۔ نظیر اکبر آبادی کو اس حصے میں شامل کرنا اور بھی زیادہ خود اعتمادی کا ثبوت ہے کہ نظیر غزل گو کے طور پر کم معروف ہے۔ امیر کے شاگردوں میں ریاض خیر آبادی کی خصوصی اہمیت ہے اور ان کا ایک منفرد رنگ ہے اس لیے انھیں اپنے استاد کے دوش بدوش پیش کرنا باعثِ حیرت نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ داغ کا کوئی باقاعدہ شاگرد اس حصے میں شمولیت کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ البتہ میرا خیال یہ ہے کہ جعفر علی اثر کی اس حصے میں شمولیت ضروری نہیں تھی۔

جہاں تک غزلیات کے معیارِ انتخاب کا تعلق ہے۔ اس میں بیک وقت دو احساس کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ منتخب غزلیں معیاری ہوں، دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مقبولِ عام غزلوں کو انتخاب میں ضرور جگہ دی جائے۔ چنانچہ میر کی غزل ؎

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب جام دو تو خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

یا غالب کی غزلیں ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

یا اقبال کی غزل ؎

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ان شعراء کی بہترین غزلیں نہیں ہیں، البتہ زبان زدِ عام ضرور ہیں۔

البتہ بعض شعراء کا انتخاب ہر اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ مثلاً سودا، درد، مومن، ظفر، شیفتہ، حالی، حسرت، اصغر، فراق وغیرہ ——— انشا، ناسخ اور اکبر کا انتخاب ان کے کلام کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔ ان کا رنگ انتخاب کلام میں پوری طرح جھلک نہیں دکھا سکا۔ علامہ اقبال کے انتخاب میں بالِ جبریل کی دو غزلیں دی گئی ہیں۔ حالانکہ اقبال کا صحیح رنگِ سخن اسی کتاب میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے میری دانست میں آدھے سے زیادہ کلام بالِ جبریل سے ہونا چاہیے تھا۔

دوسرے حصے کو "متغزلینِ جدید" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں چھبیس شعراء شامل کیے گئے ہیں اور ہر شاعر کی چھ چھ منتخب غزلیات درج کی گئی ہیں۔ اس حصے میں ان شعراء کو نمائندگی دی گئی ہے جو عہدِ اقبال کے بعد نمایاں ہوئے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حسرت، اصغر، فانی وغیرہ کے دور کے عروج کے بعد جن شعراء نے لکھنا شروع کیا جو قیامِ پاکستان سے پہلے معروف ہو چلے تھے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد افقِ شعر پر مہ و انجم بن کر چمکے۔ اس حصے کے بعض شعرا غزل کے ساتھ نظم میں بھی بلند مقام کے حامل ہیں۔ مثلاً فیض، اختر شیرانی، احسان دانش، شاد عارفی، مجاز، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، ابنِ انشا وغیرہ۔ چند شعراء نے غزل ہی میں تخصص حاصل کیا ہے۔ مثلاً ناصر کاظمی، قتیل شفائی، عدم، سیف، جذبی وغیرہ البتہ اس حصے میں بعض نام ایسے ہیں جو بہتر ہوتا کہ "غزلِ جدید" کے حصے میں شامل کیے جاتے، جو اس نمبر کا چوتھا حصہ ہے اور جس میں شامل شعراء کی دو دو غزلیں منتخب کی گئی ہیں۔ مثلاً ساغر نظامی، اختر انصاری وغیرہ۔

اس حصے کے انتخاب میں عدم اور قتیل کا بہت اچھا کلام شامل کیا گیا ہے۔ تاثیر، سالک (عبدالمجید) عابد علی عابد، چراغ حسن حسرت، مجاز، جذبی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی غزلیات بھی ان کے کلام کی مناسب نمائندگی کرتی ہیں۔ البتہ فیض، احسان دانش اور ناصر کاظمی کی غزلیات پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ آج سے تیس برس پہلے یہ انتخاب یقیناً اچھا تھا مگر چونکہ یہ شعراء بعد میں بھی اچھی غزل کہتے رہے اس لیے ان کی بھرپور نمائندگی نہیں ہو سکی۔

تیسرا حصہ "اساتذۂ غزل (۲)" کے زیرِ عنوان سٹرسٹھ شعرا کی دو دو غزلیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں سراج اورنگ آبادی سے لے کر تلوک چند محروم تک کی غزلیں شامل ہیں۔ اس حصے میں حاتم اور مظہر سے شروع ہو کر میر و سودا کے معاصر شعراء سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کے درجہ دوم کے شعراء کا کلام پیش کرتے ہوئے بیسویں صدی کے شعراء کا انتخاب کلام آ جاتا

ہے جس میں وہ تمام شعراء شامل ہیں، جن میں سے بعض داغ و امیر کے شاگرد ہیں، چند ایک بنیادی طور پر نظم نگار ہیں اور کچھ شعراء دہلی اور لکھنؤ کے مراکز سے دور کسی اور "مرکز ادب" کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً رضا علی وحشت، عندلیب شادانی، علی اختر حیدرآبادی، تلوک چند محروم بالترتیب کلکتہ، ڈھاکہ، حیدرآباد اور پنجاب کے دور افتادہ مغربی علاقے میں بیٹھ کر شعر کہتے رہے۔ بہر حال یہ حصہ مختلف اور متضاد انداز رکھنے والے ہر قسم کے غزل گو شعراء کی نمائندگی کرتا ہے۔ جہاں اس میں دہلی اور لکھنؤ کے خالص اُردو کے نمائندے موجود ہیں۔ وہیں اس میں ایسے شعراء کی بھی کمی نہیں جو اصلاً نظم نگار ہیں مگر کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے۔

چوتھا حصہ "متغزلین جدید — ۲" کے زیر عنوان ہے۔ اس میں وہ تمام شعراء ہیں جنھیں مرتب نے دوسرے حصے میں شمولیت کے قابل نہیں سمجھا یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دورِ حاضر کے وہ شعراء ہیں جو اس نمبر کے مرتب کے نزدیک دوسرے درجے میں شمولیت کے مستحق ہیں۔ اس میں جوش ملیسانی، عرش ملیسانی، آنند نرائن مُلا، جلال الدین اکبر جیسے شعراء بھی ہیں جو رنگ قدیم سے زیادہ قریب ہیں، سراج الدین ظفر، باقی صدیقی، شہرت بخاری وغیرہ بھی ہیں جو کلاسیکی غزل کی حدود میں کچھ وسعت پیدا کرنے میں کوشاں ہیں اور زیادہ تر دورِ حاضر کے مشہور نظم نگار شعراء ہیں، جنھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں، مثلاً میراجی، مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مجید امجد، ضیاء جالندھری، احمد ریاض، جعفر طاہر وغیرہ۔ اس حصے میں اکتالیس شعراء کی دو دو غزلیں منتخب کی گئی ہیں۔ اگرچہ اب تیس برس گذر چکے ہیں اور اس حصے میں بھی ردّ و بدل ضروری معلوم ہوتا ہے، مگر اس زمانے کا خیال کیجیے، تو بہت حد تک منتخب شعراء کے اسماء اور ان کا انتخاب درست معلوم ہوتا ہے۔

پانچواں حصہ "غزل قدیم" کے زیر عنوان ایک سو نو شعراء کی ایک ایک غزل کے انتخاب تک محدود ہے۔ کلاسیکی انداز میں لکھنے والے جو شعراء اس سے پہلے کے کسی حصے میں بار نہیں پا سکے وہ اس حصے میں موجود ہیں۔ مگر اس میں متعدد ایسے شعراء بھی شامل ہیں جن کی ایک ایک مکمل غزل مرتب کو دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے ان کے متفرق اشعار شامل کر کے کام چلایا گیا ہے، کسی شاعر کی غزلوں میں سے چار اشعار کسی کی تین غزلوں میں سے چھ یا سات اشعار اور کسی کے چھ یا سات اشعار الگ الگ غزلوں میں سے چُنے گئے ہیں؛ میرا خیال ہے کہ ان تذکروں کی مزید ورق گردانی کی جاتی تو ان میں سے متعدد شعراء کی ایک ایک مکمل غزل تلاش کی جا سکتی تھی۔ اس حصے میں شامل کیے جانے والے بیشتر شعراء "محض تبرک" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرتب نے غالباً یہ محسوس کیا ہے کہ جس شخص نے بھی کسی دور میں صنعت غزل کو اپنا خونِ جگر دیا ہے اُسے نظر انداز نہ کیا جائے۔

چھٹا حصہ "غزل جدید" کے عنوان سے ہے جس میں دورِ جدید کے وہ تمام شعراء شامل کر لیے گئے ہیں جو "متغزلین جدید-۲" والے حصے میں شامل نہیں کیے گئے۔ اس میں بائیس شعراء کی ایک ایک غزل شامل ہے۔ متعدد ناقدین جو کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ اس حصے میں خصوصی طور پر جلوہ افروز ہیں، جیسے وحید قریشی، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ یا وہ شعراء جن کی شاعری کا اُس زمانے میں آغاز تھا جب یہ نمبر مرتب کیا گیا اور اب ان میں سے بعض شعراء اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ شاید "متغزلین جدید" والے حصے میں شامل کیے جانے کے مستحق سمجھے جائیں جیسے احمد فراز۔

ساتواں حصہ "مینائے غزل" کے زیر عنوان ہے۔ اس میں ماضی و حال کی سترہ شاعرات کی ایک ایک غزل درج ہے۔

تیس سال بعد سب سے نامکمل حصّہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں بہت سی شاعرات نے نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

آٹھواں اور آخری حصہ "اختتامیہ" کے عنوان سے ہے اور اس میں ایک سو باون جدید و قدیم شعراء کی ایک ایک منتخب غزل دی گئی ہے۔ ان میں سے متعدد شعراء یقیناً اس قابل ہیں کہ انھیں بہتر مقام دیا جاتا مثلاً بے نظیر شاہ جن کا کلیات اب شائع ہو چکا ہے، جو اس وقت موجود نہیں تھا یا عزیز حامد مدنی جو نظم نگار رہے مگر ان کی غزلیں بھی اتنی کم نہیں ہیں کہ وہ اس حصے میں شامل کیے جاتے جو "غزل نمبر" کے ضمیمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض ناموں کی تکرار بھی ہو گئی ہے مثلاً قاضی محمد صادق اختر کی ایک غزل دو جگہ موجود ہے، غالباً محمد صادق اختر کو دو مختلف شاعر سمجھا گیا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی شخص ہے۔ اس حصے میں بھی بعض شعراء کی ایک ایک منتخب غزل کی بجائے چھ یا سات متفرق اشعار دیئے گئے ہیں۔

"غزل نمبر" کے مختلف حصوں کا ایک سرسری جائزہ قارئین کے سامنے آ چکا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا ترتیب میں کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں؟ متعدد قارئین یہ کہیں گے کہ اس نمبر میں نہ تو تاریخی ترتیب ہے جس سے اُردو غزل کا ارتقا ذہن نشین ہو جائے اور نہ ہی دور بندی ہے کہ غزل کے عہد بعہد تحولات بیک نظر سامنے آ جائیں مگر موجودہ ترتیب میں بھی ایک منطق موجود ہے جو اس کا کافی جواز مہیا کرتی ہے۔ اور وہ منطق یہ ہے کہ اس میں بڑے اور چھوٹے شعراء کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ جن شعراء کی دس دس غزلیں منتخب کی گئی ہیں وہ اُردو غزل کی تاریخ کے رجحان ساز شعراء ہیں یا کم از کم مرتب نے انھیں ایسا ہی سمجھا ہے۔ چھ چھ غزلیات ان شعراء کی ہیں جو عہد حاضر کے رجحان ساز شعراء ہیں۔ دو دو غزلیات سے اُردو غزل کی نمائندگی کرنے والے دوسرے درجے کے شعراء ہیں اور ایک ایک غزل والے تیسرے درجے کے شعراء سمجھے گئے ہیں۔ محمد طفیل نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے:

> "اس نمبر میں بعض شعراء کی دس دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی —— اس سے مقصود یہ نہیں کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعراء سے کمتر کہنے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں ایسی تھیں جن کی بناء پر ایسا کرنا پڑا —— ویسے ہماری کوشش یہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولی، میر، سودا درد ایسے درجہ اوّل کے شعراء کے ساتھ دورِ متاخرین کے درجہ اوّل کے شعراء اقبال، حسرت، حفیظ اور فراق تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے۔ اس طرح ہم نے درجہ دوم اور سوم کے مرتبے کے شعراء کو ایک ساتھ لانا چاہا۔"

اگرچہ محمد طفیل نے احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعراء سے کمتر نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ درجہ بندی اور غزلیات کی تعداد میں کمی بیشی اسی بات کو ملحوظ رکھ کر کی گئی ہے کہ شعراء اوّل، دوم اور سوم درجوں میں اپنے اپنے مقام کے مطابق تقسیم کر دیئے جائیں اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ البتہ اس حد تک اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے کہ کس شاعر کی کتنی غزلیں ہونی چاہئیں اور اسے کس درجے میں

شمار کیا جانا چاہیے۔ اسی امکان کو تسلیم کرتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعراء سے کمتر نہیں — لیکن اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہیں اور یہ تقسیم اور درجہ بندی بہت حد تک اطمینان بخش ہے۔ قدیم شعراء کی حد تک تو اس درجہ بندی سے بہت ہی کم اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دورِ حاضر کے شعراء کی درجہ بندی سے اختلاف ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں زندہ شعراء میں سے بعض کے مقام میں خاصی کمی بیشی ہو چکی ہے۔ مثلاً مجید امجد، انجم رومانی، منیر نیازی، احمد فراز وغیرہ اس وقت یقیناً اس قابل سمجھے جاتے ہیں کہ ان کی چھ چھ غزلیں شامل کی جائیں۔ اس نمبر میں بعض شعراء کی عدم موجودگی بھی میرے لیے قدرے تعجب کا باعث بنی ہے۔ ظفر اقبال، احمد مشتاق، حبیب جالب، مشفق خواجہ، علاء الدین کلیم، ضمیر جعفری، شکیب جلالی وغیرہ کا نام سرے سے موجود نہیں۔ ضمیر جعفری مزاحیہ شاعری کے علاوہ بڑی کامیاب غزل کہتے ہیں۔ ظفر اقبال، احمد مشتاق، شکیب جلالی اور مشفق خواجہ کا ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں شامل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ان کا موجود نہ ہونا یقیناً کوتاہی ہے۔ علاء الدین کلیم کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ تھا مگر ان کی بعض بڑی اچھی غزلیں "صحیفہ" میں عابد علی عابد کی زیرِ ادارت شائع ہو چکی تھیں۔ حبیب جالب کا مجموعہ برگِ آوارہ چھپ چکا تھا۔ اسے بھی یکسر نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

مجھے غزل نمبر کے متعلق جس بات سے زیادہ اختلاف ہے وہ تاریخی ارتقاء کی پوری طرح پابندی نہ کرنا ہے۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں کہ شعراء کو مختلف زمرات میں تقسیم کیا گیا ہے اور غزلوں کی تعداد ان کے شعری مقام کے مطابق دی گئی ہے مگر ہر زمرے میں شعراء کی ترتیب کسی منطق کی پابندی نہیں کرتی۔ یہ ترتیب نہ تو حروفِ تہجی کے مطابق ہے، نہ ہی سختی سے سنین کی پیروی کرتی ہے۔ یہ بے ترتیبی متغزلین جدید (۲)، غزل قدیم، غزل جدید، مینائے غزل اور اختتامیہ والے حصوں میں اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً متغزلین جدید (۲) میں پہلا نام آنند نرائن مُلا کا ہے جن کا سالِ ولادت ۱۹۰۱ء ہے۔ جب کہ جوش ملسیانی ان کے بعد آتے ہیں جو ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار بخاری (ولادت ۱۹۰۵ء) بعد میں درج ہیں جب کہ سراج الدین ظفر (ولادت: ۱۹۱۲ء) یوسف ظفر اور قیوم نظر (ولادت: ۱۹۱۴ء) پہلے آ گئے ہیں۔

"غزل قدیم" والے حصے میں شیر علی افسوس سے پہلے اسمٰعیل میرٹھی موجود ہیں۔ عارف الدین عاجز جو دکنی دور کے شاعر اور سراج اورنگ آبادی کے معاصر ہیں، سو سو سال بعد پیدا ہونے والے شعراء کے بعد درج کیے گئے ہیں۔ "مینائے غزل" میں زہرہ نگاہ کم از کم نصف صدی پہلے پیدا ہونے والی شاعرات سے پہلے آ گئی ہیں۔ "اختتامیہ" والا حصہ ترتیب سے بالکل آزاد معلوم ہوتا ہے۔

اس "غزل نمبر" کو اسی شکل میں بارِ دگر چھپوانا ہو تو میری یہ خواہش ہوگی کہ اس کے مختلف حصوں میں شامل کیے جانے والے شعراء کو سنینِ ولادت و وفات کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

غزل کے موجودہ ایڈیشن میں تقریباً دو سو صفحات کا حصۂ نثر شامل ہے۔ یہ حصۂ نثر چار ذیلی حصوں میں تقسیم ہے۔ حصۂ اول میں صنفِ غزل اور اس کے ارتقاء پر مختلف ناقدین کی آراء پیش کی گئی ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری کے ایک طویل اقتباس سے

یہ حصہ شروع ہوتا ہے۔ پھر "غزل" پر لکھنے والے مشہور ناقدین کی تحریروں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ ناقدین میں کچھ سکہ بند قسم کے لکھنے والوں مثلاً ڈاکٹر یوسف حسین، سید عبداللہ، اعجاز حسین، آلِ احمد سرور، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے دوش بدوش فیض اور علی سردار جعفری اور سید باقر حسین کی آراء بھی موجود ہیں۔ بظاہر غزل نمبر میں ان آراء کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، تاہم اگر یہ آراء ضروری تھیں تو حسرت موہانی، عندلیب شادانی، عابد علی عابد اور حمید احمد خاں کے خیالات کے بغیر یہ حصہ مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے حصے میں اساتذہ غزل کے بارے میں تذکرہ نگاروں کی آراء پیش کی گئی ہیں مناسب ہوتا اگر فارسی کے متن کا اُردو ترجمہ دیا جاتا۔

تیسرا حصہ غزل کے مستقبل پر ایک سمپوزیم ہے۔ جس میں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، ظہیر کاشمیری جیسے شعراء کے ساتھ ابواللیث صدیقی، وقار عظیم اور عبادت بریلوی جیسے سکہ بند نقاد بھی موجود ہیں۔ مگر زیادہ تر بحث کسی مرکزی خیال سے بے نیاز اِدھر اُدھر پھیلتی جاتی ہے۔

آخری حصہ غزل نمبر میں شامل کئے گئے شعراء کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بیشتر شعراء کے حالات محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تحریر کیے ہیں۔ بعض شعراء کے حالات محمد عبداللہ قریشی نے لکھے ہیں۔ حالات کی ترتیب میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ پوری طرح حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں اور نہ غزل نمبر کے مختلف حصوں کی ترتیب کے مطابق۔ ان میں حروف تہجی کی ایک ڈھیلی ڈھالی ترتیب ہے۔ جس کی وجہ سے کسی شاعر کے حالات کی تلاش آسان نہیں۔ بیشتر شعراء کے حالات اختصار سے لکھے گئے ہیں اور یہ بات نہایت مناسب ہے مگر بعض جگہ واقعات و سنین کی اغلاط بھی موجود ہیں۔

"غزل نمبر" کی کسی آئندہ اشاعت میں اگر ترتیب میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے جب بھی میری شدید خواہش ہوگی کہ کم از کم شعراء کے حالات والے حصے کی ترتیب مکمل طور پر حروفِ تہجی کے مطابق کر دی جائے تاکہ کسی شاعر کے حالات تلاش کرنے میں قاری کا زیادہ وقت صرف نہ ہو۔

مجھے "غزل نمبر" کی موجودہ ترتیب سے بہت حد تک اتفاق ہے۔ خصوصاً جو حصے بنائے گئے ہیں اور ان میں جن جن شعراء کو شامل کیا گیا ہے — ان سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ چار سو ستر قدیم و جدید شعراء کے کلام کا انتخاب اور ترتیب بڑا پیچیدہ اور دشوار کام ہے۔ ناممکن ہے کہ اتنے بڑے اور پھیلے ہوئے کام میں دو افراد بھی ایک دوسرے سے پوری طرح متفق ہو سکیں۔ اس لیے چند شعراء کی درجہ بندی سے اختلاف کرنا غزل نمبر کی اہمیت کو کسی طرح بھی کم نہیں کرتا۔ اس قسم کا انتخاب کوئی بھی کرتا — اُس سے اختلاف ضرور پیدا ہوتا۔ نقوش کے "غزل نمبر" کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس سے محض جزوی اختلاف کیا جا سکتا ہے، اتفاقِ رائے کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ اذواق میں اختلافات کا ہونا فطری سی بات ہے۔ لیکن یہ بات غزل نمبر کے مرتب محمد طفیل کے عمدہ ذوقِ شعر کی بہت بڑی شہادت ہے کہ بے شمار ناقدین اور قارئین بیشتر غزلوں کے انتخاب سے پوری طرح

معلق ہیں اور بہت کم اختلاف کی نوبت آئی ہے۔

'نقوش' کے غزل نمبر کی اشاعت کے زمانے میں غزل بے شک انحطاط کا شکار نہ تھی۔ حسرت، اصغر، فانی، یگانہ، فراق اور جگر جیسے غزل گو شعراء کا دور انھیں دنوں اپنے اختتام تک پہنچ رہا تھا۔ تازہ تر رجحانات کا آغاز ہو چکا تھا، تاہم نظم نگاری" نے غزل گوئی کو قدرے ماند کر رکھا تھا۔ اقبالؒ کا دور گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ان کی نظمیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ تحریکِ پاکستان اور اس کے بعد حصولِ پاکستان نے ان کی نظموں کو اتنی مقبولیت عطا کر دی تھی جو غزل کی مقبولیت کے کسی بڑے سے بڑے دور کی کامیاب حریف بن چکی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کی ہنگامی نظموں کی بازگشت ابھی فضا میں موجود تھی، جوش کی رومانی اور انقلابی نظمیں بہت سے لوگوں کو دیوانہ بنائے ہوئے تھیں۔ اختر شیرانی نے رومانیت کی بھٹی جوانوں کے دلوں میں اس طرح لگا دی تھی کہ ان کی نظمیں کالجوں میں ایک فیشن بن چکی تھیں۔ پھر فیض کا غلغلہ بلند ہوا۔ راولپنڈی سازش کیس نے ان کی نظموں کی مقبولیت میں اور اضافہ کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ سے ذرا پہلے جو عظیم اقتصادی بحران پیدا ہوا، اور پھر دوسری عالمی جنگ نے جس طرح دنیا کی تباہی کے خوف کو ذہنوں پر مسلط کر دیا اور اُس نے ایک خاص قسم کے پڑھے لکھے طبقے میں راشد اور میراجی کو مقبول بنایا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شعراء میں قیوم نظر، مختار صدیقی، اور ضیاء جالندھری اسلوب اور ہیئت کے مختلف تجربات سے نظم کی حدود میں افقی اور عمودی پھیلاؤ پیدا کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ غزل کبھی مری تو نہیں تاہم یہ تاثر تقریباً ہر ذہن میں پیدا ہونے لگا تھا کہ غزل کا دور ختم ہوا۔ اب مستقبل کی شاعری نظم ہی میں ہو گی خواہ آزاد نظم میں ہو یا پابند نظم میں۔ اُن دنوں "غزل نمبر" کی طرح ڈالنا اور اتنے بڑے منصوبے پر کام کرنا محمد طفیل ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام اکیلے نہیں کیا:

> "اگر اس نمبر کے سلسلے میں حبیب اشعر، ملک اسلم، مکین احسن کلیم، محمد عبد اللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھرپور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔"

میں نے چند دن پہلے ڈاکٹر وحید قریشی سے پوچھا تھا کہ انھوں نے نقوش کے غزل نمبر میں کس قسم کی اعانت کی تھی؟ ڈاکٹر صاحب نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا کہ میں نے صرف بعض شعراء کے حالات مرتب کر کے دیئے تھے۔ یقیناً محمد عبد اللہ قریشی نے بھی اسی قسم کی مدد فراہم کی ہو گی۔ حبیب اشعر اور مکین احسن کلیم نے بعض شعراء کے دواوین وغیرہ مہیا کیے ہوں گے۔ البتہ ملک اسلم نے کسی قسم کی مدد کی؟ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرائن یہی کہتے ہیں کہ غزل نمبر کی پوری ترتیب اور اس کا تقریباً تمام تر انتخاب محمد طفیل نے خود ہی کیا تھا اور وہ یقیناً اس کام کے اہل تھے۔ اگر وہ بقول خود کچی عمر میں غزل کے من پسند اشعار جمع کرنے کے لیے ایک خوبصورت بیاض خرید سکتے تھے۔ تو اس بات پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ انھیں عمر بھر غزل کے اشعار سے محبت رہی ہو گی۔ اس محبت کا عملی ثبوت نقوش کا غزل نمبر ہے۔ جس نے عام قاری کو دوبارہ غزل کی طرف مائل کیا اور خواص کو اس بات کا یقین دلایا کہ "غزل" کا دور گزرا نہیں ہے بلکہ غزل اُردو شاعری کی واحد صنف ہے۔ جو ہر دور میں مقبولیت کی معراج پر رہی اور آئندہ بھی رہے گی۔

نقوش، شخصیات نمبر

ڈاکٹر صدیق جاوید

ایک انگریزی کتاب اقوال کے دو مقامات، محمد طفیل مرحوم اور رسالہ نقوش کے حوالے سے بڑے موزوں اور برمحل نظر آتے ہیں عام طور پر اقوال، امثال اور محاورات دانائی اور حکمت کے مجرد استعارے دکھائی دیتے ہیں چونکہ دانش و بینش کے یہ استعارے ان گنت صدیوں کا سفر طے کرنے والی انسانی نسلوں کے عقلی و نقلی تجربات کا جوہر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر انہیں عام زندگی کی تفہیم کے لئے یا کسی خاص شخصیت کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ آئینہ معنی بن جاتے ہیں۔ اوپر جن دو اقوال کی طرف کیا گیا ہے، ان میں سے ایک قول کو اُردو کے کم و بیش مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

خدا کے پاس ہر ایک کے لئے کچھ کرنے کا کام ہے۔ یہ اسطوری حکایت" (امریکہ کے شہر) پیٹرز برگ میں برٹشیر ہوم پر کندہ ہے؛ کہیں ستاروں کے نیچے ایک کام منتظر ہے جو سوائے تمہارے دنیا میں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

اس قول کی عالمگیر صداقت کی تصدیق اور تائید صحائف، تواریخ و سوانح کی کتب سے لے کر تمام زبانوں کے ذخیرۂ محاورات اور امثال و رموز سے ہوتی ہے۔ مثلاً فارسی میں اسی مفہوم کے لئے زبان زد عام درج ذیل مصرع موجود ہے

؏ ہر کسے را بہر کارے ساختند

تاریخ عالم کے صفحات پر مختلف زمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر دوڑا کر دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں کارہائے نمایاں کسی فرد واحد کی ذات اور شخصیت کے حوالے ہی سے یادگار بنتے رہے ہیں۔ شعر و ادب میں قادر الکلامی اور مصوری میں اسلوب اسی طرح دوسرے فنون میں مہارت فن اور انفرادیت کی خصوصیات یا ایجاد و اختراع کی صلاحیتیں قدرت کا وہ انعام ہے جو مخصوص لوگوں کو عطا ہوتا ہے اس کی ایک مثال محمد طفیل مرحوم تھے جن کا مقسوم اور مقدر نقوش کا اجراء و شیوع اور اس رسالے کی ادارت تھا گویا خدا نے محمد طفیل کی تخلیق ہی نقوش کی ادارت اور نظارت کے لئے کی تھی۔ محمد طفیل کا محمد نقوش کے روپ میں ڈھل جانا محض مولوی عبدالحق کے قلم کی شوخی نہ تھی۔ مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ طفیل مرحوم نے متذکرہ رمز کو اپنے باطن کی گہرائی میں محسوس کرنے کے بعد ہی اس لقب کو قبول کیا تھا۔ کیونکہ وہ جذب و مستی، عشق معرفت اور احساس ذات کا استعارہ تھا۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ حق دار کو اس کا حق ضرور دیا جائے متذکرہ الفاظ سے بیشتر قارئین کو اُردو تنقید یا ادبی جائزوں میں حق تلفی اور ناانصافی کے مروج وطیرے کا خیال ضرور آئے گا۔ جس کے مطابق بعض مخصوص مفادات یا گروہی تعصبات کی بنا پر کی پگڑی کسی دوسرے کے سر باندھنے کا چلن عام ہو گیا ہے سوال پیدا ہوتا ہے کیا احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور نقوش کے بانی نہ تھے؟ بہرطور یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ قاسمی صاحب

ہاجرہ مسرور نے نقوش کی بنیاد قائم کی، یہ نقوش کا پہلا مرحلہ تھا۔ دوسرے مرحلے میں پروفیسر وقار عظیم نے ان بنیادوں پر کچھ ردے رکھ کر انہیں اور اونچا کیا اور تیسرے مرحلے میں محمد طفیل نے عمارت اساری جیسے بلند کرتے ہوئے اس نے اُسے رفیع الشان کر دیا۔ تعمیر کے مراحل میں ہر مرحلہ کی تکمیل ضروری اور لازمی ہے۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ بنیادیں کھدی کی کھدی رہ جاتی ہیں یا دیواروں کو چوکھٹے نصیب نہیں ہوتے یہ سب کچھ بھی ہو جائے تو دیواریں چھت کو ترستی رہ جاتی ہیں۔ منزلوں پر منزلیں استوار کرتے چلے جانا اور سکائی سکریپر بنانا، محنت کا، دولت کا اور ہمت کا، گویا دل گردے کا کام ہے۔ اُردو رسالوں کے محل اور حویلیاں تو کئی لوگوں نے تعمیر کیں مگر یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو رسالوں کے ناشروں اور مدیروں میں سب سے پہلا سکائی سکریپر محمد طفیل نے بنایا دوسرا اب بنتا ہے اور کون بناتا ہے؟ یہ تو آئندہ نسلوں کے دیکھنے کی بات ہے البتہ پہلے سکائی سکریپر کو برقرار اور بحال رکھنے کا کام قدرت نے جاوید طفیل کو تفویض کر دیا ہے

یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے کہ محمد طفیل کو ادبی شہرت اور یادگار مقام نقوش کی بدولت نصیب ہوا۔ اور نقوش کو ادبی مجلات کی تاریخ میں جو "شہرت عام اور بقائے دوام" حاصل ہوئی وہ نقوش کے تاریخی نمبروں کی مرہون منت ہے اور ان تاریخی نمبروں کی اشاعت اور حسن ترتیب کے پیچھے محمد طفیل مرحوم کی متحرک اور خیال پرور شخصیت کارفرما تھی۔ طفیل صاحب کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو نقوش کے تیسرے دور میں اس کی ادارت کا منصب سنبھالنے کے بعد عام رواج کے مطابق معمول ROUTINE کے پرچے زیادہ سے زیادہ سالنامے یا افسانہ نمبر وغیرہ شائع کرتا رہتا۔ یہاں پر انگریزی کا وہ دوسرا حکایت نما قول نقل کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کا اس مضمون کے آغاز میں ذکر ہوا تھا اس کے مطابق :۔

> ایک دن مائیکل اینجلو رافیل کے سٹوڈیو میں آیا اور رافیل کی ابتدائی ڈرائنگوں (ڈرائنگز) میں سے ایک پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے چاک کا ایک ٹکڑا لیا اور اس ڈرائنگ کے آرپار لکھ دیا۔ "ایمپلیس" (AMPLIUS) جس کا مطلب ہے "زیادہ بڑا"، "عظیم تر"۔ رافیل کا پلان بہت ہی سمٹا ہوا اور تنگ و محدود تھا)
>
> خدا ہمارے زندگی کے پلان پر نظر ڈالتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ آدمی کے اندر کیا (صلاحیت) ہے اس کے پلان پر لکھ دیتا ہے: "ایمپلیس" "زیادہ بڑا" "عظیم تر"۔

طفیل مرحوم نے نقوش کی ادارت سنبھالنے کے بعد معمول کے تین چار شمارے شائع کئے۔ معلوم ہوتا ہے اسی زمانے میں خود شناسی کے کسی وجدانی لمحے میں اس نے ایک غیبی آواز سنی ـــ ایمپلیس یعنی آئندہ 'نقوش' کے شمارے "ضخیم سے ضخیم تر" کوئی اہم موضوع، کوئی عظیم منصوبہ ـــ چنانچہ طفیل مرحوم اسی وجدانی کیفیت کے تحت تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد عظیم سے عظیم تر کی دھن پر خاص الخاص نمبر نکالتے چلے گئے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں معاصر اُردو افسانہ کی دستاویز، نقوش کا شمارہ ۲۵ - ۲۶ 'افسانہ نمبر' کے نام سے موسوم ہوا شمارہ ۲۹ - ۳۰ پنج سالہ نمبر قرار پایا شمارہ ۳۷ - ۳۸ بھی 'افسانہ نمبر' ـــ دراصل یہ زمانہ جدید اُردو افسانے کے عروج اور نئے افسانے کی تولید کا زمانہ ہے۔ طفیل مرحوم نے اُردو افسانے کے قاری کی ضیافت طبع اور اُردو افسانے کے مورخ کے لئے اس زمانے کے تازہ مگر یادگار اُردو افسانوں کو نقوش کے صفحات میں محفوظ کر دیا اس کے بعد شمارہ ۴۱ - ۴۲ غزل نمبر ٹھہرا غالب قیاس یہ ہے کہ غزل نمبر سے طفیل نے نقوش کے لئے عظیم تاریخی منصوبہ بندی کا آغاز کیا یعنی مرحوم نے فیصلہ کیا کہ نقوش کے نمبر یادگاری

نوعیت اور تاریخی اہمیت کے حامل ہوا کریں گے۔

بقول ڈاکٹر نثار احمد فاروقی :—

"نقوش کا شمارہ (۴۷ - ۴۸) ایک ایسا مہتم بالشّان کارنامہ تھا جو اُردو زبان میں پہلی بار کسی رسالے نے انجام دیا۔ پہلی کوشش عموماً ناقص اور خامیوں سے پُر ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ اس کے برعکس بڑی ہی جامع، منفرد اور عجیب و غریب تھی جس نے اچانک اُردو والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میری مُراد شخصیات نمبر سے ہے"۔ . . . .
یہ نمبر بے حد مقبول ہوا۔ اُس نے نقوش کو زندہ جاوید کر دیا اور اس کے مرتب محمد طفیل کو بھی"[1]

ڈاکٹر فاروقی کے علاوہ بھی بہت سے اصحاب علم نے شخصیات نمبر کو قابل قدر تصور کیا ہے اور اسے مرتب کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا ہے۔ ان اصحاب میں مولوی عبدالحق، مولانا غلام رسُول مہر، فتح محمد ملک اور عبدالسلام خورشید وغیرہ شامل ہیں۔ ایک آدھ صاحب کے نزدیک شاید شخصیات نمبر بس ایک نمبر تھا۔ غالباً انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ مثلاً ہمارے ایک دوست نے اپنے مضمون بعنوان "نقوش۔ منزل بہ منزل" میں نقوش کے ان خاص نمبروں کی فہرست تیار کی ہے جنہوں نے دنیائے ادب میں بالخصوص غلغلہ پیدا کیا"۔[2] مگر اس میں شخصیات نمبر کا نام شامل نہیں کیا گیا۔ بہر حال زیرِ بحث نمبر کو پسند یا ناپسند کرنے والوں نے بہ وجوہ اس پر کچھ زیادہ اظہار خیال نہیں کیا

گزشتہ پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ طفیل مرحوم نے غزل نمبر سے تاریخی اہمیت کے نمبر شائع کرنے کا ڈول ڈالا۔ راقم الحروف کا غالب احساس ہے کہ اس نمبر کی کامیابی کے ساتھ ہی مرحوم کو یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ غزل نمبر ایک جدید انتخاب ہی تو ہے اس لئے مدیر نقوش نے غور و فکر کے بعد آئندہ شماروں کے لئے ایسے موضوعات اور ان کی ترتیب و تدوین کے راہنما خطوط مرتب کئے جائیں، جن سے اُردو ادب کا وہ خلا پُر ہو جائے جو اُردو زبان و ادب کی ترقی اور بین الاقوامی سطح کی زبانوں سے برابری کے دعوے کے باوجود قائم ہے یہاں ہماری مراد انسائیکلو پیڈیائی ادب سے ہے۔ مدیر نقوش قابل صد ستائش ہے کہ اس نے تن تنہا نقوش کے خاص موضوعاتی نمبر شائع کئے جو دائرہ ہائے معارف علمیہ و ادبیہ کے قائم مقام قرار دیئے گئے۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔

"یہ نمبر اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو ان کی جامعیت میں فرق آ جاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں جو کام نقوش نے کر دکھایا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتاب، انسائیکلو پیڈیا اور مجلے کو ایک جگہ سمو کر اور اسے حُسن بخش کر "نقوش" نے مجلاتی صحافت کو چار چاند لگا دیے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو، تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر

---

[1] "نقوش کے خاص نمبر" مشمولہ محمد نقوش، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ کاروانِ ادب ملتان صدر۔ ۱۹۸۲ء ص ۱۶۹ — ۱۷۰

[2] حوالہ بالا کتاب ص ۲۱۴

سکے وہ فردِ واحد سرانجام دے سکتا ہے؟[1]

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں انسائیکلو پیڈیاز اور بیاگرافیکل ڈکشنریاں، عام معلومات تعلیم و تدریس اور تحقیق و تنقید کے لئے ایک بنیادی لوازمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا تو ذکر ہی کیا، اُردو تو ابھی مستند، جامع جدید لغات اور ادبی تاریخ کو ترستی ہے۔ اُردو ادیبوں کی بیاگرافیکل ڈکشنری کہاں سے آ جاتی۔ اندریں حالات نقوش کے دونوں شخصیات نمبر جدید اُردو ادب کے بیشتر شعرا و ادبا کے باب میں سوانحی لغات کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک بڑا علمی کارنامہ ہے بہر حال یہ تو افادیت کے لحاظ سے اس خاص نمبر کا زائد اور اضافی پہلو ہے اردو ادب اور بالخصوص نقوش کے عام قارئین نے یقیناً افادی نقطہ نظر سے شخصیات نمبر کی پذیرائی نہیں کی تھی انہیں تو جمالیاتی حظ اندوزی، دلچسپی اور ادبی چاشنی سے سروکار تھا۔ ان شخصیات نمبروں نے یہ وظیفہ بدرجہ اتم سرانجام دیا کیونکہ اس کے مرتب محمد طفیل تھے جنہیں اپنے قارئین کے ادبی ذوق اور ان کی ادبی خواہشات (LITERARY CRAVINGS) کا بخوبی علم تھا۔ اُردو کے ادبی مجلات کے مدیران میں شاید قارئین کا محمد طفیل سے بڑا مزاج دان اور رمز شناس پیدا نہیں ہوا۔ راقم الحروف کا یہ دعویٰ بغیر استدلال اور ثبوت کے نہیں ہے مگر اس کے لئے کسی قدر تامل کرنا پڑے گا۔ بہر طور یہ ثبوت شخصیات نمبر کی اشاعت کے محرکات کے آخری محرک کے ضمن میں پیش کیا جائے گا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر فکر و عمل کا ایک یا ایک سے زیادہ محرک ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ شخصیات نمبر کی اشاعت کے خیال یا منصوبے کا محرک یا محرکات کیا تھے؟ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ہر خیال جو بظاہر ایک فلیش یا ایک کوندے کی لپک کی صورت معلوم ہوتا ہے دراصل بہت سے شعوری غیر شعوری اور تحت الشعوری عوامل، گوناگوں تاثرات اور تسامحات کا جوہر ہوتا ہے اور کسی بھی لمحے کسی داخلی یا خارجی ردعمل سے متحرک ہو جاتا ہے طفیل صاحب کو شخصیات نمبر کا خیال کیوں کر سوجھا؟ اس کا حال تو خدا کو معلوم ہے اور ممکن ہے مرحوم نے کسی جگہ کسی پیرائے میں اس کا اظہار کیا ہو مگر وہ بھی تا حال پردۂ خفا میں ہے تاہم علمی تفتیش اور تحقیقی جستجو کے لئے اس طرح کے چند قیاسات کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ طفیل صاحب کی شخصیت اور خاکہ نگاری سے فطری رغبت۔

۲ اُردو میں ادیبوں کی ڈکشنری آف بیاگرافی کی ضرورت کا احساس۔

۳ دوران مطالعہ یا مکالمہ شخصیات نمبر کی تحریک۔

۴ منٹو کی کتاب گنجے فرشتے اور احمد بشیر کے مختلف قلمی خاکوں کا چرچا اور ان کا گہرا تاثر۔

۵ آذر زوبی کے بنائے ہوئے باری علیگ، صوفی تبسم، فیض اور ممتاز مفتی وغیرہ کے مجسمے۔

۶ نقوش افسانہ نمبر (شمارہ ۲۵-۲۶ ستمبر ۱۹۵۲ء) میں عصمت و شاہد، مرتبہ اخلاق احمد دہلوی اور بلونت سنگھ

---

[1] محولہ بالا ص ۱۵۰ - ۱۵۹

کا خاکہ از قلم ڈاکٹر عبادت بریلوی، شائع ہوئے تھے۔ بڑے افسانہ نگاروں کے بڑے افسانوں کی موجودگی میں اکثر قارئین نے متذکرہ خطوں اور خاکے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس اظہار سے یقیناً طفیل مرحوم کو یہ خیال ایک کشف کی طرح محسوس ہوا ہوگا کہ انسان کی فطرت میں بطل پرستی کا رجحان موجود ہے۔ جی اے راجرز مصنف "ورلڈز گریٹ مین آف کلر" نے دیباچہ میں اپنی اس کتاب کی وجہ جواز بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نامور سیاہ فاموں کے احوال کی تحقیق کے ایک خاص مرحلے پر مجھے ایک اہم دریافت کا پتا چلا۔ وہ یہ تھی کہ عظیم یا قابل قدر افریقیوں کے کارناموں کا تذکرہ انسانوں میں ایک جبلت کی حیثیت رکھتا ہے مجھے معلوم ہوا کہ تمام لوگوں۔ (انگریزوں، فرانسیسیوں، جرمنوں، اسپینیوں، اطالویوں، امریکیوں، چینیوں، یہودیوں اور مسلمانوں) کے پاس اپنے اپنے عظیم اور مشہور آدمیوں کی فہرست تھی...... دوسرا خیال جو میری تحقیق کے استمرار میں فیصلہ کن بنا...... وہ یہ تھا کہ نیک و بد (فعل) جو دوسروں نے کر رکھا ہے وہ زندگی کے بیاباں میں ہمارا واحد راہنما ہے..... ہماری ذات کے اندر جو بہترین (اور بسا اوقات بدترین بھی) ہے اُسے برآمد کرنے کے لئے تمام نسلوں، زمانوں اور سرزمینوں کے عظما کی زندگیوں کا مطالعہ ضروری ہے سوانح عمری ہمیشہ اعلیٰ ترین اور سب سے زیادہ تہذیب کرنے والی صنف ادب رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پلوٹارک ابھی تک یعنی دو ہزار سال بعد بھی بیسٹ سیلر (BEST SELLER) ہے۔

راجرز یا فن سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کے دوسرے مصنفین یا ناقدین کے فنی اصول و ضوابط اور حکیمانہ رموز و نکات اپنی جگہ بجا مگر نقوش کے شخصیات نمبر کو جو شاندار کامیابی نصیب ہوئی وہ طفیل مرحوم کو نبض شناسی یا رمز شناسی کا حاصل تھی یہاں بطور گریز، شخصیات نمبر کی مقبولیت کے ثبوت کے لئے نقوش کے اس دور کی کیفیت دیکھئے:-

سات سو صفحات پر مشتمل نقوش کا شخصیات نمبر (شمارہ ۴۷ - ۴۸) جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اس سے متصل دو تین ماہ کے اندر منٹو نمبر (شمارہ ۴۹ - ۵۰) عام شمارہ (نمبر ۵۱ - ۵۲) جولائی ۱۹۵۵ء میں، اور افسانہ نمبر (دو جلدیں) شمارہ (نمبر ۵۳ - ۵۴) دسمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ مارچ ۱۹۵۶ء اور جون ۱۹۵۶ء میں بالترتیب پرچہ نمبر ۵۵ - ۵۶ اور ۵۷ - ۵۸ عام شمارے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء ہی میں شمارہ نمبر ۵۹ - ۶۰ شخصیات نمبر حصہ دوم شائع ہوا جو ۱۶۱۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد مدیر نقوش شخصیات نمبر کی تیسری جلد شائع کرنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ اس ضمن میں حصہ دوم کے طلوع کی ابتدائی پانچ سطریں ملاحظہ فرمائیے، محمد طفیل لکھتے ہیں

> ۱۹۵۴ء[1] میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی، اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد، اس وقفے میں جتنے بھی دن گزرے، میں اُن میں اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے غافل نہیں رہا۔
>
> جس طرح پہلی جلد کے بعد، دوسری جلد کا اعلان کر کے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے، تاکہ میری جد و جہد کے باوجود، جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ سب آجائیں"

نیز یہ گریز برطرف، طفیل مرحوم کو اپنے ذاتی تجربے اور عام مشاہدے کی روشنی میں یہ آگاہی حاصل ہو گئی تھی کہ تقریباً

---

[1] اصل سالِ اشاعت ۱۹۵۵ء ہے۔ کاتب کی سہو یا طفیل مرحوم کی فروگذاشت سے ۱۹۵۴ء لکھا گیا اور پروف ریڈنگ کے دوران بھی نوٹس میں نہ آسکا۔

ہر قاری کی ایک عجیب نفسیاتی ضرورت ہے اس میں ہیرو ورشپ کا جذبہ تسکین کا طالب ہوتا ہے وہ اپنے پسندیدہ اور محبوب ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت سے بالخصوص، اور دوسرے ممتاز ادبا اور نامور شعراء سے بالعموم، واقفیت کا تمنائی اور تعارف کا شیدائی ہوتا ہے۔ اس تعارف کا شوق کچھ قارئین ادب سے ہی مخصوص نہیں ہے لوگ اپنے اپنے شوق اور دلچسپی کے ہر شعبہ کے ممتاز اور شہرت یافتہ افراد سے رومانی انداز میں وابستگی محسوس کرتے ہیں دیکھنے میں آیا ہے کہ ادیبوں، شاعروں، مصوروں، صوفیوں، مولویوں، دانشوروں، سیاست دانوں، کھلاڑیوں، مکہ بازوں، پہلوانوں، موسیقاروں، گلوکاروں اور فلمی ستاروں کے پروانے موقع بے موقع اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ممدحین کے عام انسانی اعمال و افعال میں بھی ایک سحر سا دکھائی دیتا ہے انہیں اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی نشست و برخاست، ان کے اوضاع و اطوار، روزمرہ کے معمولی اور حقیر باتوں میں بھی ادائے دلفریبی اور حسن و زیبائی نظر آتی ہے۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے انکار و اقرار نعمت سے اسے کون روک سکا ہے؟ بہر حال پرستاروں اور پروانوں کا یہ جذبۂ خودسپردگی ہی تو ہے کہ وہ کوئی خونی رشتہ اور کوئی نسلی تعلق نہ ہوتے ہوئے کبھی اپنے ہیروز کی تصویریں اپنی البم میں چسپاں کرتے ہیں تو کبھی اپنے سٹڈی روم اور ڈرائینگ روم کی دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں۔ اور یوں اگر دیکھا جائے تو دلدادگان ادب و فن کے رومانی جذبہ کی تسکین کے لئے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق رسائل و جرائد گوناگوں انداز میں طبع ہوتے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں لاکھوں سوانح عمریاں، آپ بیتیاں اور خطوط و مکاتیب کے مجموعے، (یورپی ملکوں میں ہر چوک میں ایستادہ مجسمے) کچھ شوق آئینہ داری کا کرشمہ ہیں اور کچھ اس بات کا ثبوت کہ بطل پرستی انسان کا جبلی اور فطری جذبہ ہے؟

نقوش کے شخصیات نمبر ۱ کی اہمیت کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو یہ ہے (غالباً پہلے بھی کہیں اوپر اس پہلو کی طرف اشارہ ہو چکا ہے) کہ اس نمبر کی اشاعت اور کامیابی نے محمد طفیل کو نئے نئے موضوعات پر ضخیم نمبر پیش کرنے کا حوصلہ بخشا۔ موضوع کی جدت اور عنوان کی تازگی و ندرت میں قاری کے لئے جو کشش ہوتی ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ نئے چہرے اور نئے نام میں جو دلکشی اور دلچسپی ہے وہ جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ ادھر اردو ادب کے قاری نقوش کے زیر بحث نمبر کے سحر و طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ اُدھر اس نمبر نے طفیل مرحوم کو ادب کی نئی سرزمینوں کی دریافت اور سیاحت پر آمادہ کیا اور علم و نظر کی چوٹیوں کو سر کرنے کا جنوں دیا۔ نقوش کا اسم اعظم طفیل کے ہاتھ میں تھا، سحرزدہ قاری طفیل کے قدم پر قدم رکھ کر چلنے لگا۔

اور اب آخر میں اُردو ادب کی تاریخ میں نقوش شخصیات نمبر کی لازوال علمی اہمیت کا ذکر ناگزیر اور ضروری معلوم ہوتا ہے اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں جنوری ۱۹۵۵ء کا مہینہ ناقابل فراموش ہے کہ اس میں نقوش کا شخصیات نمبر شائع ہوا یہ نمبر یقینی طور پر اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ کا سنگ میل ہے۔

بادی النظر ہی میں یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ کئی دوسری ادبی اصناف کی طرح اُردو میں خاکہ نگاری بھی ایک نئی صنف ہے اس کی تاریخ اور روایت زیادہ پرانی نہیں اس لئے اس کے متعلق قدیم و جدید کا کوئی جھگڑا یا اُلجھاؤ نہیں ہے اس باب میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کا مجمل بیان بہت جامع ہے وہ لکھتے ہیں:۔

" اردو میں خاکہ نگاری کا فن، باقاعدہ طور پر، بیسویں صدی کی پیداوار ہے یوں کوئی چاہے تو اسے کھینچ کر تذکرہ نگاری

کے دور اور خاص طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، اور انشا کے مزاحیوں تک لے جا سکتے ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بالمقصد خاکہ نگاری کی طرف توجہ بیسویں صدی میں بھی زیادہ نہیں رہی[1]"

اُردو خاکہ نگاری کا کل سرمایہ دسمبر ۱۹۵۴ء تک انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں کم و بیش مندرجہ ذیل نام ہی آئیں گے۔

نذیر احمد کی کہانی (فرحت اللہ بیگ) گنجہائے گرانمایہ (رشید احمد صدیقی) چند ہم عصر (مولوی عبدالحق) مردم دیدہ (چراغ حسن حسرت) یارانِ کہن (عبدالمجید سالک) گنجینۂ گوہر (شاہد احمد دہلوی) شیش محل (شوکت تھانوی)۔ خد و خال (فکر تونسوی) دلی کی چند عجیب ہستیاں (اشرف صبوحی) گنجے فرشتے (سعادت حسن منٹو) اس دور میں رسائل میں چھپنے والے اکا دکا مشہور خاکے یہ ہیں۔ دوزخی (عصمت چغتائی) سورما، بازی گر، (احمد بشیر) بلونت سنگھ (ڈاکٹر عبادت بریلوی)، عصمت و شاہد لطیف، اخلاق احمد دہلوی) وغیرہ

اُردو میں خاکہ نگاری کا یہی منظر و پیش منظر بس یہی کچھ تھا کہ محمد طفیل نے جنوری ۱۹۵۵ء میں نقوش کا شخصیات نمبر نکالا۔ اور اپنے ادارے (جس کا مستقل عنوان طلوع ہے) میں لکھا۔

"اس نمبر کی شانِ نزول، میعار اور افادیت کے ضمن میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اتنے اچھوتے موضوع پر اب تک جتنا کام ہوا ہے وہ دوسری اصناف ادب کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر گنے چنے اہلِ قلم بھی اس طرف توجہ نہ کرتے تو اس صنفِ ادب کا اللہ ہی حافظ تھا۔"

۱۹۵۵ء میں محمد طفیل نے اپنی پہلی کتاب کے ابتدائیے میں اپنی خاکہ نگاری کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا تھا۔

".... مجھے بھی جب شخصیت نگاری کا میدان قریب قریب سنسان نظر آیا تو میں نے شخصی مضامین لکھے..."

مندرجہ دونوں اقتباسات سے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جو صورت حال تھی وہ ہمارے سامنے آتی ہے سو اس حوالے سے شخصیات نمبر کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پبلک کی طرف سے اس شمارے کے پُرجوش خیر مقدم سے بیک وقت قارئین اور ادیبوں کو احساس ہوا بلکہ اُنہوں نے شعوری سطح پر محسوس کیا کہ اسکیچ یا خاکہ بھی ایک مؤثر صنف ادب ہے۔ جس کو کسی شخصیت کے حوالے سے مختلف خیالات اور تصورات کے اظہار و ابلاغ کے لئے بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تو خاکہ نگاری ایک ادبی فیشن اور تخلیقی رجحان بن گیا۔ اور جلد ہی خود طفیل نے اس نمبر سے انسپائر ہو کر اپنے خاکوں کے مجموعے پرچم کی طرح نمایاں کئے تو لوگ ساتھ آنا شروع ہو گئے اور کارواں بنتا چلا گیا۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ بعنوان "اردو ادب میں خاکہ نگاری" میں محمد طفیل پر "بہ حیثیت خاکہ نگار" جو باب[2] لکھا ہے۔ وہ اس میں محمد طفیل کے خاکوں کے پانچ مجموعوں کے تعارف کے دوران ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

"ان مجموعوں کے علاوہ بھی طفیل صاحب نے اپنے رسالے نقوش کا ایک خاص نمبر بھی اس صنف

---

[1] حوالہ بالا صہ ۲۴۔ [2] مرتب "محمد نقوش" نے یہ باب اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

> کے لئے مخصوص کیا جس میں کئی ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں پر خاکے اور سوانحی مضامین شامل ہیں۔ یہ ضخیم نمبر سات سو صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے اگر طفیل صاحب ان خاص نمبر کو مرتب کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اس نمبر میں ان کا جمع شدہ سرمایہ اتنا تھا جو ان کے نام کو اس صنف کے پروان چڑھانے والوں میں ممتاز حیثیت عطا کرنے کے لئے کافی تھا۔[ٹ]

ڈاکٹر صاحبہ نے متذکرہ اقتباس کی آخری سطور میں مرتب نقوش کی خاکہ نگاری کے باب میں بجا طور پر ان کی حیثیت اور خدمت کا ذکر کیا ہے مگر اس موقع پر ضرورت اس بات کی تھی کہ پورے اطمینان کے ساتھ خاکہ نگاری کی صنف کے فروغ اور ترقی میں نقوش کے اس نمبر اور مرتب نقوش نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا جائزہ لیا جاتا لیکن یہ سہل انداز میں اور سرسری طور پر کرنے کا کام نہیں ہے نقوش کے زیر بحث شمارے کے اثرات اور خدمات کا تعین جدید اردو ادب کی تاریخ کا ایک تشنہ اور نامکمل باب ہے جس کی تکمیل کا منصب 'اردو کی اصناف ادب کی مستند تاریخ قلم بند کرنے والا مورخ' ادا کرے گا اور اس مورخ کا، محنت، مشکل پسندی، ذہانت اور دیانت داری کے اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے بہر حال ایک بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارا موعودہ مورخ شواہد کی روشنی میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ نقوش کے شخصیات نمبروں نے اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو اتنا مستحکم کیا کہ اسے ایک باوقار اور معتبر صنف ادب ہونے کا داعی بنا دیا۔ بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ خاکہ نگاری (شخصیت نگاری) کو صنف کا پایہ نقوش شخصیات نمبر کے طفیل نصیب ہوا۔

زیر نظر مقالہ میں نقوش کے شخصیات نمبروں کے مشمولات و اندراجات کا فنی محاکمہ دائرہ بحث سے خارج رکھا گیا ہے کیونکہ ان تحریروں کی تنقید و تحسین کے لئے ایک الگ وقیع تنقیدی مقالہ کی ضرورت ہے تاہم اجمالاً جائزہ لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان شماروں میں شامل فنی طور پر ہموار اور یکساں معیار کے نہیں ہیں۔ اس کا مدیر نقوش کو بھی احساس تھا۔ وہ شخصیات نمبر ۱ کے طلوع میں لکھتے ہیں۔

> "اس نمبر میں زیادہ تر اسکیچ ہیں اور یہی ہمارا مقصد تھا صرف چند مضامین ایسے ہیں جو اسکیچ کی بجائے سوانحی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ چونکہ ایسے مضامین سے بھی شخصیت کے خد و خال اجاگر ہوتے ہیں اس لئے موضوع کی مطابقت کے پیش نظر انہیں بھی شریک اشاعت کر لیا گیا ہے۔"

متذکرہ سطور کی اشاعت کے کوئی پونے دو سال بعد شخصیات نمبر ۲ کے طلوع میں بھی لکھا۔

> "اس پرچے میں چند ایک مضمون اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو حتمی طور پر مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی۔"

بہر حال طلوع کی ان سطور کا اثر یہ ہوا کہ خاکہ نگاری کے فنی اصول و ضوابط کا لحاظ اور اس کی صنفی و ہیئتی شرائط

[ٹ] محولہ بالا ص ۳۲۲

کی پابندی کا خیال خاکہ نگاری کے دستور کی بنیادی شقیں قرار پائیں ان سطور نے تحریک پا کر ناقدین نے خاکہ نگاری کے فن پر غور و فکر کرتے ہوئے اپنے نتائجِ فکر پیش کئے اور خاکہ نگاروں نے فنی اصولوں کی پیروی کو اپنا مطمعِ نظر جانا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ خاکہ نگاری فنی جمود اور تقلید کا شکار ہو گئی۔ آج تک ادب و فن میں جدت طرازی پر کوئی فرد یا جماعت پہرہ نہیں بٹھا سکی کیونکہ اپج اور لذتِ ایجاد کوہستانی چشمہ کی طرف اپنا راستہ خود بنا لیتے ہیں مگر ایک بات ضرور ہے کہ روایت سے ہٹ کر اور بنیادی فنی تقاضوں سے بے نیاز رہ کر ادب و فن میں کوئی تجربہ کامیاب نہیں ہوتا روایت شکن انقلاب پسند اور جدت کوش بھی کسی نہ کسی دستور، قانون اور ضابطہ کی آغوش میں پروان چڑھے ہیں۔ روایت اور تجربے کا حسین امتزاج ضابطہ پسندی اور بغاوت کا معقول اہتمام ہی ترقی کا ضامن ہے۔ یہ ترقی کسی فرد کی ہو، کسی قوم کی ہو یا کسی صنفِ ادب کی ــــ بہرحال زندگی کو روایت اور تجربے کے تال میل سے ہی قوت نمو حاصل ہوتی ہے۔

محمد طفیل کے خاکوں میں جو زندگی اور توانائی ہے وہ اس معیار کی وجہ سے ہے جو اس نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ اُس نے نقوش کے شخصیت نگاروں کو بتا دیا کہ جنہوں نے یہ معیار پیش نظر نہیں رکھا۔ ان کے خاکے مضمون نگاری کے ذیل میں آتے ہیں۔

اب بہ طرزِ خاتمۂ کلام، نقوش کے شخصیات نمبروں کی آخری اور سب سے بڑی کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس کی اشاعت نے قاری اور ادیب میں دوری اور فاصلے کو کم کر کے دونوں کے درمیان قربت اور یگانگت پیدا کی۔ ان شماروں کے مندرجات سے قارئین کو نہ صرف زعما و علما کے طرزِ احساس کو سمجھنے اور ان کی انفرادی کاوشوں کو جاننے کا موقع ملا بلکہ انہیں مجموعی تاثر کے نتیجے میں مختلف ادبی رجحانات مختلف ادبی تحریکوں اور مختلف ادبی زمانوں سے واقفیت ہوئی۔ گویا ان شخصیات نمبروں کی بدولت نہ صرف عام قارئین بلکہ خود ادیبوں کو دوستانہ علمی و ادبی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔

منٹو ، نقوش اور ہم

ڈاکٹر سلیم اختر

۱۲ - جولائی ۱۹۸۱ء

حبس —— شدید حبس —— ایسا حبس کہ پسینہ جسم کے ساتھ بھیگی رُوئی بن کر چپک رہا ہے ، نہ سوچنے کی ہمت ، نہ بولنے کی تاب ، وزیرِ اطلاعات کے اس بیان کے بعد چرچے ہو رہے ہیں جس میں موصوف نے فرمایا "کہ ٹیلیویژن کے اشتہارات میں سے عورتیں خارج کر دی جائیں گی ۔ اسی طرح ریڈیو کے اشتہارات میں سے بھی عورتوں کی آوازیں جلاوطن کر دی جائیں گی" —— حبس ، شدید حبس ، ایسا حبس کہ لو کی دُعا مانگنے کو پسینے میں بھیگے ہاتھ بھی نہیں اُٹھتے —— کیا ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے ! اخبار میں ایک وزیر کی تقریر درج ہے ۔ ادیبوں کو ان کے فرائض سمجھائے گئے ہیں ، ادیب معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے ۔ اسے عوام کے مسائل کا شعور ہونا چاہیے ، اسے اپنی تحریروں سے عوام میں آگہی بیدار کرنی چاہیے —— حبس ، شدید حبس ، بوجھل ہوا جسم کے ساتھ تیل بن کر چپک رہی ہے ، حبس نادیدہ ہاتھ بن کر دل کو مسل رہا ہے ۔

میں آج سے ۲۵ برس قبل نقوش کا 'منٹو نمبر' کھولے بیٹھا ہوں ۔ اس حبس نے طبیعت ایسی بدمزہ کر رکھی ہے کہ لکھنے پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہتا ، چنانچہ بے دلی سے یُوں ہی منٹو نمبر کی ورق گردانی کر رہا ہوں ۔ کسی افسانہ کا عنوان دیکھ لیا ، کہیں سے کوئی سطر چکھ لی ، کوئی پیرا سُونگھ لیا ،

> "اس نے سُنا تھا سنکھیا کھانے والوں کے مُنہ سے جھاگ نکلتے ہیں ، تشنّج کے دورے پڑتے ہیں ، بڑا کرب ہوتا ہے مگر اسے کچھ بھی نہ ہوا ۔ ساری رات وہ موت کا انتظار کرتا رہا ، مگر وہ نہ آئی ۔ صبح اُٹھ کر وہ اس دُکاندار کے پاس گیا جس سے اس نے سنکھیا خریدی تھی اور اس سے پُوچھا ، "بھائی صاحب ! یہ آپ نے مجھے کیسی سنکھیا دی ہے کہ مَیں ابھی تک نہیں مرا ۔" دکاندار نے آہ بھر کر بڑے افسوسناک لہجے میں کہا : "کیا کہوں میرے بھائی ! آج کل ہر چیز نقلی ہوتی ہے ۔ یا اس میں ملاوٹ ہوتی ہے ۔" (افسانہ : ملاوٹ)

○

نعیمہ : انور ! میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے ۔ پیندے اور پتواروں کے بغیر اسے کئی برس منجدھار میں کھیتی رہی ہوں ، اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی —— انور —— کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی ؟

تم بولتے کیوں نہیں؟

انور : میں سُن رہا ہُوں۔

نعیمہ : میں اپنی اس ٹوٹی ہُوئی کشتی کے لیے اِدھر اُدھر سے چیتھڑے اکٹھے کرکے بادبان بناتی رہی، لیکن طوفانوں نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ دیا —— انور —— مجھے بتاؤ، یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟

انور : طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں، نعیمہ!

نعیمہ : تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں، صرف اس لیے کہ بی اے کا امتحان پاس کر لُوں اور خود کمانے کے قابل ہو جاؤں۔ لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمھارے سامنے ہے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں لیٹا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی ہے، انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے

نعیمہ : میں مر رہی ہُوں انور! —— اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا —— اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں اور یہ ساری کتابیں اٹھا کر میرے ساتھ دفن کر دینا —— ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی ملیں —— میں نے بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں —— اور دیکھو کسی کو میری موت کی خبر نہ ہو —— مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا —— میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔

انور نے دیکھا کہ اس پر حالتِ نزع طاری ہے اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ نعیمہ نے جس کی آنکھیں مُند رہی تھیں بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے میلے دوپٹے سے پُونچھے اور کہا "مجھے یاد آگیا ہے جو مجھے تم سے کہنا تھا۔"

انور : کیا کہنا تھا؟

نعیمہ مسکرائی "ایک بیوقوفی کی بات ہے اپنے ہونٹ میرے مُردہ ہونٹوں سے لگا دو۔"
انور نے اس کی تعمیل کی۔ نعیمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کی تاب نہ لا سکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔

(افسانہ: "نعیمہ")

◆

"بڑھیا رونے لگی" وہ تم سے ملتی تھی، تم غنڈے ہو، اس لیے ایک تھانیدار نے زبردستی اس کے ساتھ منہ کالا کیا۔" (افسانہ: "شیدا")

◆

میں پریشان ہو کر سوچتا ہوں اللہ! یہ کون سا منٹو ہے، یہ میں کیا پڑھ رہا ہُوں۔ ایک جنس گزیدہ افسانہ نگار اور

اس کے یہ تیور کہ ملاوٹ اور غربت کی بیچارگی جیسے موضوعات پر قلم اٹھا رہا ہے، لیکن پھر سوچتا ہوں یہ آخری عمر کی تحریریں ہیں اور اتنی جلدی میں لکھی ہیں گویا وہ موت کے قدموں کی چاپ سن رہا ہو اور موت سے دُور بھاگنے کی سعی میں یہ افسانے نقشِ پا کی صورت اختیار کرتے گئے پھر اچانک نظر ایک اور افسانہ کی اختتامی سطروں پر پڑتی ہیں تو میری جان میں جان آتی ہے:

> "آپ کو تو خدا سمجھائے گا۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔" (افسانہ "بدتمیزی")

افسانہ پڑھتا ہوں مگر کچھ بات نہیں بنتی، جیسے پھلجھڑی سیلی ہوگئی، ہوائی شرلی بن گئی ہو۔ یہ منٹو کو کیا ہوگیا تھا؟ یہ تو اس کا انداز نہ تھا۔ اس کے تو ایک ایک فقرے میں برقی رو دوڑتی تھی جبھی تو افسانہ پڑھ کر ۴۴۰ وولٹ کا جھٹکا لگتا تھا۔ ہر چند کہ اس کے افسانوں پر دو ہڈیوں اور کھوپڑی کی روایتی تصویر نہ بنائی جاتی تھی پھر بھی اخلاق کے آڑھتیوں کو اس کے افسانوں پر سُرخ روشنائی سے جلی حروف میں "خطرہ" لکھا نظر آتا تھا۔ مگر نقوش کے منٹو نمبر کے فی یوم فی افسانہ میں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی —— نہایت ہی بے ضرر افسانے —— ایسے بے ضرر کہ ٹین ایجر لڑکیوں کا بھی کچھ نہ بگڑے۔

۲

نقوش (منٹو نمبر) میں منٹو[1] کے خود منتخب کردہ جو افسانے شامل ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں:

ہتک، موذیل، ممی، بابو گوپی ناتھ، کالی شلوار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

اس مجموعہ میں (ڈرامہ) نیا قانون، شہید ساز (مضمون) اور سیاہ حاشیے —— اس میں اگر بو، نعرہ، خوشیا، پھندنے اور سڑک کے کنارے کو بھی شامل کرلیا جائے تو میرے نقطۂ نظر سے یہ فہرست تقریباً مکمل ہو جاتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ منٹو کے ہر قاری اور نقاد نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اپنے پسندیدہ افسانوں کی الگ الگ فہرستیں بنا رکھی ہیں لیکن مندرجہ بالا افسانے ایسے ہیں کہ ان کے بغیر منٹو کے فن اور اس کے فنی مقاصد کو سمجھنا آسان نہیں —— یہ افسانے خود منٹو ہی کے نہیں بلکہ اردو کے بھی بہترین افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ تکنیک، اسلوب، کردار اور ان سب کے مجموعی تاثر سے جنم لینے والی زندگی کی وژن کے لحاظ سے ان میں سے ہر افسانہ اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ MICROCOSMIC بھی قرار پاتا ہے۔

آیئے! منٹو سے پُوچھتے ہیں:

"منٹو، لیکن میں زندگی کو جیسا دیکھتا ہوں اُس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں

---

[1] جب میرے اور منٹو کے درمیان منٹو نمبر چھاپنے کی بات چیت ہوئی تھی تو میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی زور دیا تھا اس وقت انھوں نے جن جن کہانیوں کے نام بتائے وہی پیش کی جا رہی ہیں، سوائے "نیا قانون" "شہید ساز" اور "سیاہ حاشیے" کے چند لطیفوں کے۔ (محمد طفیل)

اس کا اظہار کرتا ہُوں ——— اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ میں نے اپنے افسانے "خوشیا" میں ایک بھڑوے کی کہانی لکھی۔ اشک نے کہا بھڑوا ایسا نہیں ہوتا، میں نے اسے جواب دیا کہ ممکن ہے ایسا نہ ہو لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد تم بھڑوے بن جاؤ ——— یہ بھی ممکن ہے کہ بھڑوا میں ہی ہُوں۔ افسانہ نگار کی بڑائی اس میں ہے کہ وُہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے اور وہ ہر کمی کو FILL-UP کرتا چلا جاتا ہے۔"[لہ]

سوال یہ ہے کہ منٹو کو معاشرہ اور اس کے حوالہ سے زندگی میں چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی جسے اس نے "خوشیا" یا اس نوع کے دیگر افسانے لکھ کر FILL-UP کرنے کی کوشش کی۔ اس سوال کا جواب ہمیں خود منٹو کی زبان سے مل سکتا ہے اور یہ وہ زبان ہے جو وہ اپنے کرداروں کے لیے استعمال کرتا ہے ——— جس زبان میں وہ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، محبت کرتے ہیں، نفرت کرتے ہیں، بیوپار کرتے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں اور دھوکہ کھاتے ہیں۔ ان کرداروں کی بعض اوقات لچر اور بالعموم بے باک لغویات سے وہ "موزیک" تیار ہو جاتی ہے جسے منٹو کے کلام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

> "جب وُہ بوہنی کرتی تھی تو دُور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھُوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی اس کی چھاتیاں کیونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی تھی محفوظ پڑے رہتے تھے البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پانے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ——— اس سالے کو تُو نے کب سے یار بنایا ہے؟ ——— یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ——— سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے، مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔ سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ——— سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں، تم چھوکریوں کی سب کمزوریاں جانتا ہُوں۔" ("ہتک")

○

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ

[لہ] اردو افسانے میں روایت اور تجربہ (سمپوزیم)۔ نقوش، افسانہ نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء

ملتی، برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی دوٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویر اس کو ناپسند تھے اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا، اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی، یہ حیا ویا کیا بکواس ہے۔ اگر تمھیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا۔ یا جس سے تمھاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔ تم سانتھ ہو۔ مجھے معلوم ہے تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمھاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمھارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہیے تمھیں، اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمھارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے۔" (موذیل")

○

"چڈّہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا، میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا:

"چلی گئی ——— صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا۔"

میں نے پوچھا:

"مگر کیوں؟"

چڈّے کے لہجے میں تلخی آگئی، حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں۔ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی، اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابلِ اعتراض تھیں اس لیے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کو ماں کہہ کر ایک دلّالہ کا کام لینا چاہتے تھے...... ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیرِ تفتیش تھا آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تڑی پار...... شہر بدر کر دیا ——— وہ اگر قحبہ تھی دلّالہ تھی ——— اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا ——— پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو ——— چڈّے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے منٹو! کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا ——— لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے ——— وہ

پونے سے چلی گئی۔ مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی ——— میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ——— زندہ باد ممی ——— زندہ باد ——— چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں ——— رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کرلی ہو گی ——— ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا نشانہ بہت کمزور ہوتا ہے ——— وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح بہہ رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔"
("ممی")

○

"پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلبی انسان ہیں، وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سُنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ ردّ نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہُوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں لیکن میں اُنھیں عقلمند سمجھتا ہُوں اس لیے کہ ان میں کم ازکم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا اُلّو سیدھا ہو سکتا ہے بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہُوں' مجھے ان سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے، میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہوجائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا ——— رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار ——— بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پُوچھا: "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا: "اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے، جو آدمی خود کو دینا چاہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔" ("بابو گوپی ناتھ")

○

"بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دُھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اس

لمبے اور کُھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں کبھی ادھر کبھی ادھر ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دُھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دُھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ——— نہ جانے کہاں ——— پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رُک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔“ (”کالی شلوار“)

◆

”جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا:

”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ ——— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

متعلقہ افسر ہنسا:

”پاکستان میں۔“

یہ سُن کر بشن سنگھ اُچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دُوسری طرف لے جانے لگے مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ”ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے“ ——— اور زور زور سے چلّانے لگا ”اوپر دی گڑگڑا ای اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔“

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی۔ تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ——— اِدھر اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وُہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا اوندھے مُنہ لیٹا ہے، اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ——— اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان ——— بیچ میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا“

(”ٹوبہ ٹیک سنگھ“)

○

”ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کر پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ!“

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی، منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہُوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

”وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ——— اب نیا قانون ہے میاں ——— نیا قانون!“

اور بیچارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے، راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون“، ”نیا قانون“ چلاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پرانا۔“ اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ (”نیا قانون“)

○

ان افسانوں کے انسان ہم آپ جیسے ہی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں خاصے مختلف اور اسی لیے کافی سے زیادہ

تحیر خیز بھی نظر آتے ہیں۔ آخر ایسی کیا بات ——— خوبی یا خامی ——— ان میں ہے کہ یہ ہمیں متاثر بھی کرتے ہیں اور متعجب بھی، یا منٹو کو عام مردوں اور عورتوں میں کس چیز کی کمی نظر آتی تھی جسے اپنے الفاظ کے بموجب وہ FILL-UP کرنے کی سعی کرتا رہا۔ افسانہ کے بعد افسانہ ——— مرد کے بعد مرد ——— عورت کے بعد عورت ——— کیا وہ اپنے ان کرداروں کی کمی کی تصویر کشی کے ذریعہ نارمل مرد اور عورتوں کو آئینہ دکھا رہا تھا یا علاج بالمثل کے اصول کے مطابق کمی سے کمی کے زہر کا تریاق فراہم کر رہا تھا۔ گندگی سے گندگی دور کر رہا تھا اور جنس سے جنس گزیدہ کا کیتھارسس کر رہا تھا۔

آئیے مندرجہ بالا افسانوں کی روشنی میں اس سوال کا جائزہ لیں۔ سوگندھی، ممی، بابو گوپی ناتھ، سلطانہ، موذیل، بشن سنگھ اور استاد منگو۔

سوگندھی اور سلطانہ جسم فروش ہیں جبکہ موذیل فری لانسر ہے۔ ممی دلّالہ ہے، بشن سنگھ پاگل ہے تو استاد منگو کوچوان اور ان سب سے الگ تھلگ بے حد امیر اور شریف بابو گوپی ناتھ ——— ان میں سے بابو گوپی ناتھ اور کسی حد تک استاد منگو کی استثنا سے قطع نظر باقی تمام کردار ان افراد پر مشتمل ہیں جنھیں معاشرہ نے مسترد کر دیا ہے لیکن منٹو ان ممنوعہ جزیروں کی طرف نکل جاتا ہے۔ کسی مہم جو سیاح کی مانند انھیں EXPLORE کرتا ہے اور پھر ہمیں وہاں کی تحیر افزا چیزیں دکھاتا ہے جو اگر SHOCKING ہیں تو صرف SHOCK TREATMENT کے طور پہ!

ہر معاشرہ اور پھر اس معاشرہ کے مختلف طبقات کی POCKETS کی اپنی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے۔ ایسی اخلاقیات جس کا تعلق کسی مابعد الطبیعی تصور سے نہیں ہوتا بلکہ یہ اسی پیشہ کے تقاضوں اور ان سے وابستہ نفع و نقصان کی میزان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس پیشہ سے متعلق فرد کی کامیابی اور تحفظ کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اقدار کے اسی نظام سے منسلک رہے جو اس پیشہ کی مخصوص نوعیت نے مرتب کر رکھا ہے۔ چور اگر انھیں اقدار کو چھوڑ کر چوکیدار کی اقدار پر عمل پیرا ہوگا تو بطور چور وہ زندگی بسر نہیں کر سکتا، لہذا اقدار کا مثبت یا منفی ہونا اضافی امر ہے۔ ہم چور کو برا کہتے ہیں اور چوری جرم بھی ہے۔ یہ سوچ ہمارے اندازِ زیست کی پیدا کردہ ہے۔ لیکن چور اگر بطور چور ہی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے چوری سے وابستہ تمام اقدار کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ اس عمومی مثال کو ذہن میں رکھیں تو منٹو کے منفی کرداروں میں مثبت کی جو زیریں رو ملتی ہے اسے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

سوگندھی کو صرف ایک جسم فروش ہونا چاہیے اس سے زیادہ کچھ نہیں، گاہکوں کو صرف گاہک ہی سمجھنا چاہیے جس طرح سودا مہنگا دے کر بھی ڈنڈی مارنا دکان داری کی اقدار میں سے ہے اسی طرح گاہک سے زیادہ سے زیادہ پیسے وصول کرنے کے بعد بھی اسے کم سے کم اپنا پیش کرنا جسم فروش کی اخلاقیات کا بنیادی اور مسلّمہ اصول ہے۔ ایک اور بنیادی اور مسلّمہ اصول یہ ہے کہ گاہک صرف گاہک ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہذا اس کے ساتھ ہر نوع کے جذباتی رشتوں کی استواری خطرناک ہے اور اسی لیے شجرِ ممنوعہ ——— جس طوائف نے اس شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا وہی خراب و خوار ہوئی۔ اور یہی خرابی سوگندھی میں بھی تھی کہ اسے بھی شجرِ ممنوعہ کے سایہ کی تمنا تھی۔" درحقیقت سوگندھی اتنی چالاک

نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی اس کے گاہک بہت کم تھے غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر اسے یاد تھے اس کے دماغ میں سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔ دُوسری خرابی نے بھی اس پہلی خرابی سے جنم لیا ہے۔ سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جُونہی کوئی نرم و نازک بات ——— کوئی کومل بول ——— اس کہتا تو جھٹ پھسل کر وہ اپنے جسم کے دُوسرے حصّوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بُری طرح قائل تھے"۔ بحیثیت جسم فروش غلط بات ہے۔ یہ اس کے پیشہ کے مخصوص تقاضوں کے منافی ہے اسے اپنے پاس آنے والوں سے جذباتی سطح پر کسی ط کا رابطہ نہ رکھنا چاہیے حتیٰ کہ ہم بستری کے وقت بھی ان سے جذباتی سطح پر منقطع رہنا چاہیے بلکہ اس وقت تو بطورِ خاص منقطع رہنا چاہیے کہ یہی لمحات خطرناک ترین ہوتے ہیں اور عورت صرف اسی وقت VULNER ABLF ہوتی ہے مگر سوگندھی۔ پیشے کی مسلمہ اقدار کی منحرف ہے اس لیے کہ "پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھ چاہنے اور چاہے جانے کی یہ خواہش ہی بس کی گانٹھ ہے اسی لیے تو وہ مادھو سے محبت کرتی ہے اور اس کی اصلیت سمجھتے ہوئے بھی جان بُوجھ کر دھوکے کھاتی جاتی ہے اور اس کے باوجود اسے "میرا مرد" بھی کہتی ہے۔ درحقیقت یہ جذ اور یہ میرا مرد ہی کے احساسات ہیں جنھوں نے اس کی خُودی بیدار کر دی اور یُوں وہ گاہک سے "اونہہ" سن کر ہتک محسو کرتی ہے مگر وہ دیگر جسم فروشوں سے اسی بنا پر ممتاز بھی ہو جاتی ہے کہ وہ عزّتِ نفس کے اِس احساس سے عاری ہ یُوں دیکھیں تو سوگندھی نے اپنے پیشے کے تقاضوں کی منافی اقدار اپنا کر اپنی ذات میں استحکام پیدا کر کے بحیثیت عور اپنی وقعت کا احساس پیدا کر لیا ——— جسم فروش کو تو "اونہہ" کہہ کر مسترد کیا جا سکتا ہے مگر عورت کو نہیں۔ ایسی عورت کا ایک مرد بھی ہے ان تمام احساسات کا محرک بننے والا مرد! اور اسی لیے آخر میں وہ ہتک کا غصہ" ا۔ مرد پر اتار کر اس کی بے عزّتی کرتی ہے۔

اسی انداز پر اگر دیگر کرداروں کا جائزہ لیں تو وہ سب کے سب اپنے پیشے کی اخلاقیات اور اپنی زندگی کے بنے سانچے سے انحراف کر کے اپنے لیے ایک طرح کی پناہ گاہ تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن یہی منفی طرزِ عمل ان کے اندر مثبت کی لہر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اب یہ دُوسری بات ہے کہ آخر میں انھیں اس کی خاصی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ موذیل جان دے جاتی ہے، سلطانہ بیوقوف بنتی ہے، بابو گوپی ناتھ نے خالی جیب کسی تکیہ میں جا دینی ہے، استاد منگو جیل پہنچتا ہے اور ممی شہر بدر کر دی جاتی ہے ——— حتیٰ کہ پاگل بشن سنگھ بھی آ گہی قیمت ادا کرتا ہے۔ منٹو کے بیشتر اہم کرداروں میں منفی سے اثبات کی طرف مراجعت کا یہی انداز کارفرما نظر آتا۔ اور میں سمجھتا ہُوں اسی میں منٹو کے کرداروں کی کشش کا راز پنہاں ہے۔

۳

محمد طفیل یک رُخے ذہن کا انسان ہے اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ محمد طفیل سے محمد نقوش بن کر رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس پر خوش بھی ہوتا ہے کبھی کبھی تو اس پر اس کی خوشی مجھے ایسی لگتی ہے جیسے برجٹ بارڈٹ صرف B B بن جانے پر خوش ہو۔

اب نقوش کی تیس سالہ زندگی درجنوں خاص نمبروں اور ہزاروں صفحات کی اشاعت کے بعد یہ کہنا کہ محمد طفیل نے ادب کی بہت خدمت کی ہے، اور نقوش کے نمبر اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ، ناقدین، محققین اور مورخین کے لیے ناگزیر حوالہ کی چیز بن چکے ہیں تو یہ محض واضح کو اُجاگر کرنے کے مترادف ہوگا اور پھر برصغیر میں اردو ادب کی ایسی کون سی قد آور شخصیت ہوگی جس نے محمد طفیل اور اس کے نقوش کو غیر مشروط طور پر سراہا نہ ہو۔ میں تو ابھی کوئی خاص قد آور بھی نہیں!

نقوش کے خاص نمبروں کی اگر درجہ بندی مقصود ہو تو انھیں شاعری، افسانہ اور تاریخ (جیسے شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ منٹو نمبر دراصل ایک طرح کا افسانہ نمبر ہی ہے کہ منٹو کی شخصیت اور فن کی صورت میں اردو افسانہ ایک خاص سمت میں تخلیقی جست لگاتا نظر آتا ہے۔ منٹو سے پہلے افسانہ کہاں تھا اور انتقال کے وقت اس نے افسانہ کو کس مقام پر چھوڑا، اس کی بطور خاص صراحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ ایک لحاظ سے ہم سب خود بھی افسانہ کی اس تخلیقی جست میں شامل ہیں۔

محمد طفیل کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نقوش کے منٹو نمبر کی صورت میں اس تخلیقی جست کی تصویر محفوظ کر لی ہے۔ اسی میں نقوش کی اہمیت مضمر ہے اور اسی میں محمد نقوش کی انفرادیت۔

۴

منٹو نمبر کے اداریہ کی اختتامی سطریں:

> "اگرچہ یہ واقعہ ایک برس پہلے کا ہے لیکن میں آج بھی یہ نمبر منٹو کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں اس لئے کہ منٹو کسی اور کے خیال میں مرا ہو تو مرا ہو، میرے نزدیک نہیں مرا۔"

——— اور مجھے بھی محمد طفیل سے اتفاق ہے!

میں منٹو نمبر پڑھنا شروع کرتا ہوں تو موذیل، سوگندھی، ممی، سلطانہ ان سب عجیب و غریب عورتوں سے ملاقات ہوتی ہے، ان کی جنس، عجیب و غریب باتیں، اوندھی منطق اور ان سب پر مستزاد منٹو کے اعصاب میں پچھے کرتے فقرات!

اچانک یوں محسوس ہوتا ہے گویا بند کھڑکی کھل گئی ہے اور اس میں سے تازہ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آ رہے ہیں۔ فضا پر سے حبس کے نم آلود ہاتھوں کی گرفت کم ہو رہی ہے، سینہ پر سے نادیدہ ہاتھ سرکتے جاتے ہیں ——— اب سانس لینے میں دشواری نہیں رہی۔

اچانک ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء ——— ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء نہیں رہتی، کھڑکی پوری طرح کھل چکی ہے!

نقوش، مکاتیب و خطوط نمبر

عبدالقوی دسنوی

یہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی خوش بختی تھی کہ انہیں شیو نرائن آرام جیسا مخلص اور ان کے مکاتیب کا قدر دان مل گیا، جس کی خطوط غالب کو جمع کر کے شائع کرنے کی آرزو جب پوری ہوئی۔ تو غالب کے "مکاتیب" "اردوئے معلّٰی" اور "عود ہندی" کے پیکر میں جلوہ افروز ہوئے اور ایسے مقبول کہ بار بار چھپتے رہے اور مختلف کتابوں کی صورت اختیار کرتے رہے اور مختلف کتابوں میں اپنے لیے جگہ بناتے رہے۔

ان خطوط کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف غالب کی شخصیت، عظمت، اہمیت اور مقبولیت سے آگاہ کیا بلکہ ان کے ماحول، معاشرہ، ان کے دور کے رسم و رواج مسائل اور تقاضے اور اچھائیوں، برائیوں سے واقف کرایا۔ ان کے دوستوں اور قدر دانوں سے ملاقات کرائی، ان کے عزیزوں سے متعارف کرایا۔ ان کے رنج و غم ان کی خوشیوں اور مسرتوں، ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں ان کی مصروفیتوں اور کوتاہیوں سے بھی باخبر کیا اور ان کی تڑپ میں شریک، ان کی مسرتوں سے مسرور کیا، ان کے ساتھ ہنسایا، ان کے دکھ درد میں رنجیدہ کیا۔ خطوط کی یہی خوبی اور خصوصیت، اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی خطوط مکتوب نگار کے دلوں کی دھڑکن ہمیں سناتے ہیں اور اس پر حادثات اور واقعات کے ردِ عمل سے آگاہ کرتے ہیں۔

غالباً خطوط غالب کی اشاعت کے بعد ہی سے اردو میں خطوط کو یکجا کرنے اور مرتب کر کے شائع کرنے کا رواج عام ہوا، چنانچہ بے شمار خطوط کے مجموعے منظرِ عام پر آئے اور آتے جا رہے ہیں، ان میں کہیں ایک ہی شخص کے خطوط ایک ہی شخص کے نام یکجا کر دیے گئے ہیں، کہیں ایک شخص کے خطوط کئی اشخاص کے نام جمع کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن مختلف اشخاص کے خطوط مختلف اشخاص کے نام پیش کئے گئے ہیں، جن کے مطالعہ سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے رشتہ کو سمجھنے میں نہ صرف مدد ہی ملی ہے۔ بلکہ خود ان دونوں کو جاننے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان کے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہی ہوتی ہے۔ علمی ادبی، سیاسی، سماجی تاریخ مرتب کرنے میں بھی مدد ملی ہے۔ بہت سی سچائیاں، جو ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی تھیں، ان سے باخبری ہوئی ہے۔ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ بہت سے شکوک رفع ہوئے ہیں، لیکن مختلف علمی، ادبی، سیاسی شخصیتوں کے خطوط کو یکجا کر کے رسائل کے نمبر نکالنے کا خیال غالباً اردو میں سب سے پہلے ماہنامہ "آج کل" کے مدیر جوش ملیح آبادی کو آیا، جنہوں نے سب سے پہلے اس ماہنامہ کا خطوط نمبر آج سے بتیس سال قبل اپریل ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

۶۴ صفحات پر مشتمل آج کل دہلی کا یہ مختصر خطوط نمبر اس لیے اہم ہے کہ اس کے سرورق پر گاندھی جی کا مولانا بریلوی کے نام ایک اردو خط کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ جس سے گاندھی جی اور مولانا بریلوی کے تعلق کے علاوہ ان کے اندازِ فکر سے آگاہی ہوتی ہے اور عام لوگوں کو اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ گاندھی جی اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور اس زبان میں اظہارِ خیال کرنے میں ہچکچاتے نہ تھے۔

اس نمبر کی ابتدا ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مختصر مضمون "اردو کے مکتوباتی ادب پر ایک نظر" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف

عنوانات کے تحت جانِ عالم واجد علی شاہ کے منظوم خطوط، غالب، مفتی صدرالدین آزردہ، قمر جان مشتری، سید سلیمان ندوی، اکبر حسین الہ آبادی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، جلیل مانک پوری، حامد حسن قادری، عبدالحلیم شرر، مولوی سجاد حسین، آل احمد سرور، تاجور نجیب آبادی، سہا مجددی کے خطوط شائع ہوئے ہیں۔

درمیان میں بارہ صفحات پر داغ دہلوی، فانی بدایونی، حکیم محمد علی خاں، جلال لکھنوی، نظم طباطبائی، سہا مجددی، امیر اللہ تسلیم، راجندر پرشاد، لالہ لاجپت رائے، آرزو لکھنوی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، جلیل مانکپوری، عبدالحلیم شرر، فضل حق آزاد، منشی دیا نرائن نگم، حامد حسن قادری، اور اختر شیرانی کے خطوط کے عکس پیش کیے گئے ہیں۔ سوائے ایک مختصر خط آل احمد سرور کے باقی تمام خطوط مرحومین کے ہیں۔

اس کے باوجود کہ یہ نمبر مختصر ہے، اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اُردو کی اہم شخصیتوں کے بعض ایسے خطوط محفوظ ہو گئے ہیں، جن سے ان شخصیتوں کے سمجھنے میں اور ان کے مخاطب کو جاننے میں مدد ملتی ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان سے متعلق بعض ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے، جن کا جاننا اُن شخصیتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔

لیکن اس نمبر کے بعد آجکل دہلی نے پھر کبھی خطوط نمبر کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہندوستان میں اُردو کے کسی دوسرے رسالہ کے مدیر کو ہی اس کا خیال آیا۔ خیال آیا، تو لاہور کے محمد طفیل کو جس کے زمانۂ ادارت میں اس وقت تک نقوش کے افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۵۲) پنج سالہ نمبر (فروری ۱۹۵۳) افسانہ نمبر (جنوری ۱۹۵۴)، غزل نمبر (مئی ۱۹۵۴) شخصیات نمبر حصہ اوّل (جنوری ۱۹۵۵) منٹو نمبر (۱۹۵۵)، افسانہ نمبر دو جلدیں (دسمبر ۱۹۵۵ء) شخصیات نمبر حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۵۶) جیسے وقیع اور ضخیم خصوصی نمبر شائع ہو چکے تھے اور اہلِ اردو میں مقبول ہو چکے تھے اور جنہوں نے نقوش کی اہمیت اور قدر و قیمت کو قارئین کے دلوں پر نقش کر دیا تھا اور جس کے محمد طفیل محمد نقوش کا درجہ پانے میں کامیاب ہونے لگے تھے۔ غالباً ان نمبروں کی کامیاب اشاعت کے تجربوں نے طفیل صاحب کے دل میں مکاتیب نمبر نکالنے کی خواہش پیدا کی بلکہ عملی میدان میں اُترنے کا انہیں حوصلہ دیا۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ جب محمد طفیل کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور عملی میدان میں اُتر جاتے ہیں، تو پھر اس کام کو انجام تک پہنچائے بغیر کسی اور کام کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ ساری دنیا سے کسی حد تک بے تعلق ہو کر اسی کام سے ذہنی اور عملی طور پر متعلق ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ایک دن اچانک وہ اپنے اس کام کو نقوش کے لباسِ فاخرہ میں ملبوس کر کے، اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر کے، سب کو حیران اور اپنا مداح بنا کر تماشائے اہلِ نظر دیکھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مکاتیب نمبر کا بھی یہی ہوا۔ وہ اس کام کو جسے عام حالات میں دس سال کی مدت میں کرنا چاہیے تھا۔ دو سال میں مکمل کر کے نومبر ۱۹۵۷ء میں اسے دو خوبصورت اور قیمتی حصوں میں پیش کرنے میں ایسے کامیاب ہوئے کہ اہلِ نظر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اور اہلِ ادب سوچتے کے سوچتے رہ گئے۔ کتابت، ترتیب، تزئین، سرورق، تصاویر، عکس خطوط سب کچھ اس انداز سے، اس حسن کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے کہ ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔

یہ دو حصے ایک ہزار اڑتالیس[1] صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جن کی ابتدا میں خطوط سے متعلق مشہور اہلِ قلم کے حسب ذیل تین

[1] اس نمبر کی ضخامت عکسی خطوط کے ساتھ ۱۰۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن اس نمبر کے آخری صفحہ پر ۱۰۴۸ تحریر ہے (دستوی)

مضامین ہیں۔

علم و ادب میں خطوط کا درجہ	غلام رسول مہر
اردو خط نگاری	ڈاکٹر سید عبداللہ
اردو کے منفرد مکتوب نگار	مالک رام

اور آخر میں محمد عبداللہ قریشی کا مقالہ مشاہیر ادب (سوانح) شامل ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے خط نگاری کے فن، خطوط کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہی ہوتی ہے۔ اردو ادب میں خط نگاری کی مختلف منزلوں کا علم ہوتا ہے۔ مختلف خط نگاروں کی خط نگاری کی خصوصیات اور خوبیوں سے واقفیت ہوتی ہے

مکتوب نگاروں کی مختصر سوانح حیات کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے اور ۲۱۷ اہلِ قلم کے خطوط کے بڑے ذخیرے سے ان کو سمجھنے اور جاننے پہچاننے اور ان کے عہد سے آگاہ ہونے میں مدد ملتی ہے

اس ضخیم نمبر کی ابتدا میں چالیس اہم مکتوب نگاروں کی تصاویر ہیں اور مضامین کے بعد ۵۷ صفحات پر مشاہیر کے ۵۵ خطوط کے عکس ہیں، جن کا مطالعہ ایک عجیب لطف دیتا ہے اور عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد ۸۳۸ صفحات پر اردو کے ۱۵۵ مشہور و معروف شعراء و ادباء کے ۱۳۱۲[1] قیمتی خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ حسن، خطوط کے مجموعہ کو ترتیب دینے میں عام حالات میں دس سال لگتے اسے محمد طفیل دو سال یعنی ۱۹۵۵ء میں شروع کر کے نومبر ۱۹۵۷ء میں حسین اور پرکشش نمبر کے لباس میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دس سال کی مدت کے کام کو دو سال کے مختصر وقت میں سمیٹنے کی ہمت اور محنت محمد طفیل ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اردو کے ادبی صحافیوں میں یہ محنت یہ سلیقہ اور شعور قدرت کی طرف سے محمد طفیل ہی لے کر آئے ہیں، ورنہ دس سال کو ہمارے یہاں آسانی سے پندرہ بیس سال تک کھینچنے کا رواج عام ہے۔ اکثر نمبروں کا اعلان کرتے کرتے اتنے تھک جاتے ہیں کہ پھر ان میں نمبر نکالنے کی سکت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اس نمبر کے سلسلے میں اس نمبر کی ابتدا میں محمد طفیل صاحب اس طرح "طلوع" ہوتے ہیں:

> "... میں نے یہ خطوط دن رات ایک کر کے جمع کیے ہیں۔ واضح رہے دن رات والا فقرہ میں نے بطور محاورہ استعمال نہیں کیا ہے۔"
>
> "میں نے ان خطوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ شہر شہر گھوما۔ گھر گھر صدا دی، کسی نے میرے شوق کو سینے لگایا، کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ یوں امید و بیم کے دوراہے پر چلتا چلتا نیم جان ہو گیا، مگر جنون میں کمی واقع نہ ہوئی۔
>
> پچھلے میں چوری کی ہو، تو کی ہو۔ اس عمر میں تو نہیں کی تھی۔ اس کم بخت شوق میں یہ کام بھی کیا۔"

---

[1] محمد نقوش، مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ ص ۱۷۲، دیکھیے۔

" ... ۔ مجھے یہ چھوٹا سا دعوےٰ کر لینے دیجئے کہ میری اس کاوش سے سو سالہ علمی و ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے یا مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔"

اور تصریحات " کے تحت اس نمبر کے خطوط سے متعلق لکھتے ہیں:

" اپنی دانست میں ہم نے تمام خطوط غیر مطبوعہ جمع کیے ہیں۔ لاعلمی میں چند ایک خطوط مطبوعہ بھی پیش ہو گئے ہوں، تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

" ہم نے اپنی طرف سے پوری چھان بین کی ہے کہ اس نمبر میں جتنے بھی خطوط چھپیں وہ اصل کے عین مطابق ہوں، جس کے بارے میں شبہ ہوا اسے ہم نے خارج ہی کر دیا۔"

" اس نمبر میں صرف مرحومین کے خطوط ہیں۔"

" ہم نے کوشش کی ہے کہ ایسے خط نہ چھپیں، جو کسی کی بھی دل آزاری کا موجب بنتے ہوں یا جو لکھے ہی اس غرض سے گئے ہوں کہ ذرا دیکھیں تو۔ یا ایسے خط جن میں دل کے کچھ نازک معاملات رقم ہوں۔ ہمیں اس امر کی بےحد خوشی ہے کہ ہم نے سنسنی خیز مکتوبات کی اشاعت سے پرہیز کیا ہے۔"

" بعض خطوط کو پڑھنا بے حد مشکل تھا، کوشش کے باوجود بعض الفاظ نہیں پڑھے جا سکے، وہاں ہم نے جگہ خالی چھوڑ دی۔"

" ان خطوط کو کسی حد تک زمانی اعتبار (بہ لحاظ مکتوب نگار) سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مندرج خطوں کو بھی تاریخ وار پیش کیا گیا ہے۔ جن خطوں پر تاریخ نہیں تھی وہ اس حصّہ کے آخر میں درج کر دیے گئے ہیں۔ البتہ عکسی خطوط کے سلسلے میں زمانی ترتیب قائم نہ رکھ سکے۔"

" ... ... چند مشاہیر کے خطوط کو ضرورتاً (REDUCE) کر کے پیش کیا گیا ہے۔"

اوپر محمد طفیل صاحب نے اگرچہ اعلان کیا ہے کہ " اس نمبر میں صرف مرحومین کے خطوط ہیں" وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

" ترتیب میں اس نمبر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔" ... .

نمبر ۲ میں صرف چند زندہ ادیبوں کا ایک ایک خط شامل کیا گیا ہے تاکہ یہ نمبر بھی اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔"

پھر یہ اعلان بھی کرتے ہیں۔

" پروگرام کے مطابق زندہ ادیبوں کے خطوط کا ایک الگ نمبر پیش کیا جائیگا۔ اس کے بعد پھر مرحومین کے خطوط کی تیسری جلد پیش کی جائے گی۔ چوتھی جلد تمام مکاتیبی سرمایہ کے انتخاب پر مشتمل ہوگی۔"

گویا اس طرح محمد طفیل نے مکاتیب نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی مزید تین خطوط نمبر پیش کرنے کا اعلان کر دیا تھا خطوط کے اس مجموعہ کا سب سے پرانا خط غالب کا ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے اور سب سے قریب تر زمانے کا خط بیخود دہلوی کا ۳۰ اپریل ۱۹۵۱ء کا ہے۔ اس طرح یہ خطوط تقریباً پچاسی سال کی مدت کے دوران میں لکھے گئے ہیں۔ البتہ

خطوط کی زمانی ترتیب میں کہیں کہیں بے ترتیبی محسوس ہوتی ہے۔

پھر مکاتیب نمبر کی اشاعت کے تقریباً دس سال بعد اپریل مئی ۱۹۶۸ء میں نقوش کی بیسویں سالگرہ پر طفیل صاحب نے حسبِ اعلان قارئینِ نقوش کو خطوط نمبر کا گرانقدر تحفہ ۲۲۵۳ غیر مطبوعہ خطوط پر مشتمل تین حصّوں میں پیش کیا۔

پہلا حِصّہ جس میں تصاویر کے علاوہ ۹۶ صفحات خطوط کے عکس کے لیے وقف ہیں اور ۴۹۲ صفحات پر ۶۹۴ خطوط چھپے ہُوئے ہیں۔ جس کے "طلوع" میں محمد طفیل اطلاع دیتے ہیں:

"جنگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

توپوں کی دھمک اور شعلوں کی لپک میں جب مَیں نے سوچا تھا کہ یہ خطوط کہیں ضائع نہ ہو جائیں تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مگر ان ہی دنوں جب یہ بات دھیان میں آئی تھی کہ میرے بچوں کا کیا ہو گا، تو مَیں بڑے حوصلے میں تھا۔

اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ وہ گھڑی نہ آنا تھی نہ آئی۔ آئی بلا ٹلی۔ یہ تو ملک کے بقا کی بات تھی اور سنہ تھا ۱۹۶۵ء جہاں تک خطوط کا معاملہ ہے، اس کے متعلق آج ۱۹۶۸ء میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کیسا انسان ہوں کہ جسے بچّوں سے زیادہ خطوط عزیز تھے۔ یہ سوچ کر کبھی غمگین ہو جاتا ہوں کبھی خوش!"

بات یہ نہ تھی کہ محمد طفیل محبِ وطن نہ تھے یا شفیق باپ نہ تھے بلکہ وہ وطن سے محبت کرنے اور اولاد سے شفقت برتنے کے ساتھ ساتھ نقوش سے کسی لمحہ کے لیے غافل نہیں رہ سکتے تھے۔ خطوط کی فکرمندی نقوش کی لیے فکرمندی تھی، اس لیے کہ وہ نقوش کے لیے سب کچھ تھے اور ہیں، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کے ہر صفحہ پر، اس کی ہر سطر پر اس کے ہر لفظ پر محمد طفیل کے ذہنی رو کے عکس ہیں تفکّر و تجسّس کے نقش ثبت ہیں اور قوّتِ عمل کے جوہر نمایاں ہیں۔

اس شمارے میں "لکھتے ہوئے محمد طفیل بتاتے ہیں۔

"یہ خطوط ان خطوط سے مختلف ہیں، جو پہلے مکاتیب نمبر میں چھاپ چکا ہُوں۔"

"قائدِ اعظم اور اقبال کے خطوط کے بعد پیچھے کی باقاعدہ ابتدا" قدیم خطوط اور عرضیوں" سے ہوتی ہے جو تقریباً سوا سو سال پرانی ہیں۔ پرانے ہیں مگر ہیں فارسی میں۔ ان کے پیش کرنے کی وجوہ دو ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ تاریخی نوعیت کے معلومات کا علم ہو جائے۔ دوسرے اس زمانے کی خطوط نویسی کا انداز معلوم ہو جائے۔"

"غالب پر اتنا کام ہُوا ہے کہ کوئی حد نہیں۔ اس کے باوجود ہم نے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط ڈھونڈ نکالے ہیں اُن کے ذریعہ غالب کا ایک نیا مکتوب الیہ ملا اور اسی طرح غالب کا ایک نیا مکتوب نگار۔"

"قاضی عبد الجلیل جنون بریلوی غالب کے شاگرد تھے۔ ایسے شاگرد جن کا کلام (غالباً) خود غالب نے اپنے قلم سے لکھنا پسند کیا۔ اصلاح بھی دی جنون کا کلام تذکروں میں بھی چند شعروں سے زیادہ نہیں ملتا۔ موجودہ شمارہ میں اچھا

خاصا محفوظ ہو گیا۔"

" علاؤ الدین علائی کے خطوط میں مرزا غالب کے بارے میں۔ کچھ نئی باتوں کا علم ہوتا ہے، اسی طرح خود علائی کے حالات سے بھی پردے اُٹھتے ہیں۔"

" ... ... سرسید کے ۱۲۸ غیر مطبوعہ خطوط پیش کر رہے ہیں۔ پھر اس غلط فہمی کا بھی ان خطوط سے ازالہ ہو گا جو ان دنوں پھیلائی جا رہی ہے کہ حیات جاوید، مولانا حالی کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ منشی سراج الدین کی لکھی ہوئی ہے۔"

" نواب وقار الملک کا کیا طنطنہ تھا ... ... مگر ان خطوط کے ذریعے یہ جان کر دکھ ہوا کہ ان کی گھریلو زندگی اذیت ناک تھی۔"

" مولانا عبدالحلیم شرر کو مؤرخ اسلام کہا جاتا ہے، مگر اس مؤرخ اسلام کو مالی آسودگی نہ ملی۔ وہ اپنے گھر والوں کو خط لکھتے ہیں، جیسے "بمشکل گزارہ کر رہا ہوں کچھ نہیں بھیج سکتا۔" یگانہ کے خطوط ہم سب کے "حُسنِ سلوک کا نوحہ ہیں۔"

" ... ... مرزا داغ دہلوی کے خود نوشت حالات کی جستجو کی تھی، جو نہیں ملے تھے۔ ایک خط میں ... ... وہ مشکل بھی حل ہوئی۔"

" شاہ دلگیر اور قمر زمانی کی خط و کتابت ایک تاریخی مذاق ہے ... ... قمر زمانی کے رُوپ میں نیاز فتح پوری تھے۔"

اس نمبر (پہلی جلد) کی ابتدا میں راجندر پرشاد اور قائد اعظمؒ کے انگریزی خطوط اور اُن کے ترجمے شائع کیے گئے ہیں۔ پھر اقبال کے ۵ خطوط ہیں اور صاحب طرز خط نگار غالب، شبلی، ابوالکلام آزاد، مہدی افادی اور محمد علی ردولوی کی ہاتھ سے بنائی تصویریں۔ ۹۶ صفحات پر پھیلے ہوئے غالب کے ۱۸ خطوط کے عکس، جنون شاگرد غالب کے کلام کے ۱۲ صفحات کے عکس، سرسید کے تین خط کے عکس اور حالی، شبلی، محمد علی، شوکت علی، محمد طیب عرب (عربی)، نواب وقار الملک، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری (انگریزی)، محسن الملک، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، عزیز لکھنوی، رام بابو سکسینہ، ریاض خیر آبادی، سلیمان ندوی، سر عبدالقادر، حبیب الرحمٰن شیروانی، مولوی عبدالحق، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی ممتاز علی، اکبر الٰہ بادی، احمد علی شوق۔ عبدالحلیم شرر، نصیر حسین خیال، حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، آرزو لکھنوی، غلام عباس، نواب بہادر یار جنگ، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، رضا علی وحشت، دل شاہجہانپوری، عبدالمجید سالک، عبیداللہ سندھی، اسلم جیراجپوری، محشر لکھنوی، قطعہ تاریخ وفات ذاکر حسین یاس، حامد حسن قادری، محمد شفیع، شوکت تھانوی، مرزا یگانہ، اثر لکھنوی، اختر شیرانی، شاہ دلگیر، قمر زمانی کے ایک ایک خط کے عکس ہیں۔ ان میں مصنفین کو اپنی تحریروں میں پڑھنے میں لطف آتا ہے اور انہیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

پھر صفحہ ۱۵ سے ۷۵ تک غالب کے ۱۶ خط اور غالب کے نام ۲ خط محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ جنون و غالب کے تحت غالب کی

ہاتھ کی تحریروں کا ایک مجموعہ صفحہ ۷۶ سے ۹۰ تک پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲۸ سرسید کے خطوط صفحہ ۹۱ سے ۱۵۰ تک پھیلے ہوئے ہیں، بنام سرسید ا خطوط ہیں۔ نواب وقار الملک کے ۴۶ خطوط ہیں۔ نواب علاء الدین علائی کے ۴ خطوط ہیں اور مولانا شبلی کے ۱۰، محسن الملک کے ۲۰، عبدالحلیم شرر کے ۱۵، مرزا یگانہ کے ۲۳، شاد دلگیر کے ۴۳، قمر زمانی کے ۱۵، عبیداللہ سندھی کا ایک خط درج ہیں۔ متفرق خطوط کے تحت حالی، داغ، محمد علی جوہر، اکبر الہ آبادی، عبدالحق، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، سید ممتاز علی، حسرت موہانی، وقار الملک، عبدالرحمٰن بجنوری، حبیب الرحمٰن شروانی، شیخ عبدالقادر، سر سالار جنگ وغیرہ کے خطوط ہیں۔ اسی جلد کے دوسرے حصے میں متفرق خطوط (عطیہ نادم سیتاپوری) صفحہ ۲۳۶ سے ۴۷۸ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، شوکت علی فانی، غالب، داغ، امیر مینائی، حالی، اب سراج الدین احمد خاں سائل، اقبال بنام حبیب النساء (انگریزی)، عبدالحق، رشید احمد صدیقی، امیر مینائی، رام بابو سکسینہ، شوق دوائی، برجموہن دتاتریہ کیفی، رضا علی وحشت، جگر، نیاز، اسلم جیراجپوری وغیرہ سلیم تمنائی کے دیے ہوئے متفرق خطوط ہیں۔ عطیہ خدا بخش ابریری پٹنہ میں بھی بہت سے اہم خطوط ہیں۔

خطوط نمبر حصہ دوم کی ضخامت ۵۹۹ صفحات ہے۔ طلوع میں محمد طفیل لکھتے ہیں۔

"محمد طفیل نے محمد نقوش سے کہا۔

ارے میاں! تو کیا کر رہا ہے؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے؟ کیوں اپنا اور اپنے بچوں کا دشمن بنا ہوا ہے؟

جب تو نے خطوط کی دو جلدیں پہلے چھاپی تھیں، تو کون سے قوم نے سرخاب کے پر لگا دیے تھے، جو تو اب پھر اکٹھی تین جلدیں پیش کر رہا ہے۔ یہ دس گیارہ برس جو تو نے خطوط اکٹھے کرنے پر صرف کیے ہیں۔ اس کی بجائے اگر تو "امپورٹ ایکسپورٹ" کا ہی کام کر لیتا، تو زیادہ فائدے میں رہتا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا، تو قوم کا لیڈر ہی بن جاتا۔

قوم کے لفظ سے یاد آیا۔ یوں دکھے ہے جیسے یہ قوم بہ ظاہر زندہ ہو بہ باطن مُردہ، یہ زندہ باد کے نعرے لگاتی ہے، مگر زندہ باد کا ماحول پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ہر ایک کی کارگزاری پر یہ فرمانے کی عادی ہے۔ کچھ نہیں!"

متاعِ ہنر کی قیمت کیا پڑی؟ دو کوڑی بھی نہیں، خون کے چراغ جلا کے بھی دیکھ لیے، اندھیرا جوں کا توں، یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے دلوں کا اندھیرا بصارت کو بھی نگل گیا ہو۔

ایسے عالم میں کوئی کیا کرے؟

ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی افیون کی گولی کھا کر بیٹھ رہے، دوسرے یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ خدمت کے شوق میں اپنی جان اور کی بازی لگائے۔

محمد نقوش سے محمد طفیل نے کہا،

راہیں دونوں کٹھن ہیں۔ ایک باضمیر کے لیے دوسری بے ضمیر کے لیے!

بلاشبہ اس تحریر کا ایک ایک لفظ سچائی کی تصویر ہے اور محمد طفیل کے دل کے سچے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ قوم کی حالت ویسی ہے جیسی انہوں نے بتائی ہے۔ اس میں رہ کر دیوانگی کے ساتھ کام کرنا محمد طفیل جیسے دیوانے ہی کا کام ہے۔ اسی لیے وہ تلخ سے تلخ تجربات کے باوجود قوم کے لیے نقوش کے خوب سے خوب تر نمبر نکالنے میں مصروف ہیں اور اپنی زندگی کی تلخیوں میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

• محمد نقوش "جو ٹھہرے۔

اس جلد کے" اس شمارے میں" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جمال میاں فرنگی محلی سے کس طرح مشرقی پاکستان بار بار سفر کر کے "خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی" جو اس جلد کے شروع میں مولانا غلام رسول مہر کے ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیے گئے ہیں، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "... ... خطوط کا مرکز و مرجع مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محلی کی ذاتِ گرامی تھی، جو دیرینہ خاندانی عظمت و تقدس کے وارث ہونے کے علاوہ خود بھی علم و فضل، زہد و تقوی اور درد ملت و حمیت اسلامیت کے اعتبار سے بہت سے ممتاز و نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ آپ ہی کے پاس مختلف دردمند اصحاب کے اضطراب دگر محوشی کے یہ نادر قلمی مظاہرے محفوظ رہ گئے، جو ہماری ملی سرگذشت کا ایک نہایت قیمتی مرقع ہیں۔"

ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطوط بنام موتی لال نہرو اور مسٹر گاندھی کے علاوہ خود ان کے نام حکیم اجمل خاں، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، موتی لال نہرو، مہاراجہ کرشن پرشاد، لالہ لاجپت رائے، سوامی شردھانند، مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر انصاری، شعیب قریشی، سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، بیگم حسرت موہانی، حسرت موہانی، شبلی نعمانی، آزاد سبحانی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، عبدالحق دہلوی، مولانا محمد علی مونگیری، ابوالاعلیٰ مودودی، غلام بھیک نیرنگ، نواب علی حسن خاں اور نواب چھتاری کے خطوط اہم ہیں۔ یہ خطوط ص ۹ سے ص ۲۷۷ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد خطوط نواب بہادر یار جنگ کا سلسلہ ص ۲۸۲ سے ص ۳۲۵ تک ہے۔ ان خطوط سے پہلے اختر جمال صاحبہ کا تعارفی نوٹ ہے۔ پھر عزیز لکھنوی، احمد علی شوق، جلیل مانک پوری، صفی لکھنوی، اثر لکھنوی، سید سلمان ندوی، عبدالحق، حسرت موہانی، عبدالمجید سالک، نوح ناروی، بیگم پکرس، شوکت تھانوی، شاد عارفی، میراجی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد دریابادی اور غلام رسول مہر وغیرہ کے خطوط ہیں ان خطوط کی تعداد آٹھ سو پینسٹھ ہے، جو ۴۸۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

خطوط نمبر حصّہ سوم میں خطوط کی تعداد ۶۸۴ ہے۔ جن میں عبدالستار صدیقی، امتیاز علی عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے اہم خطوط کے علاوہ بہت سے ایسے دوسروں کے بھی ہیں

جو ابھی ادب کے میدان میں بقول محمد طفیل "اتنے عمر رسیدہ نہیں"

"اس شمارے میں" کے مطالعہ سے ایک خوش خبری یہ بھی ملتی ہے کہ:

"قرۃ العین حیدر نے ہمیں بڑے قیمتی خطوط بھجوائے۔ مگر وہ بروقت نہ ملے۔ وہ خطوط سجاد حیدر یلدرم کے، نذر سجاد حیدر کے نام اور نذر سجاد کے خطوط یلدرم کے نام تھے ان کے علاوہ ان دونوں شخصیتوں کے نام دیگر مشاہیر ادب کے بھی متعدد خطوط ہیں جن سے سر سید احمد خان سے لے کر موجودہ دور تک کے ادبی، سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اب وہ سرمایہ مع تفصیل حواشی کے آئندہ پیش کریں گے۔"

اور اس کا اعتراف ملتا ہے۔

"کہیں زندوں میں مرحومین اور کہیں مرحومین میں زندہ لوگ آ گئے ہیں۔ اس سے کھلبلی تو مچی مگر میری جان قدرے عافیت میں رہی، ترتیب کی اس گڑبڑ کا سلجھاؤ بس میں اس لیے نہیں رہا کہ خطوط وقتاً فوقتاً ملے، جو بعد میں ملے انہیں ترتیب میں پہلے کیسے لاتا؟"

مجموعی حیثیت سے خطوط نمبر کی تعداد ۲۲۵۳ ہے، جو ۱۶۵۰ سے ۱۷۰۰ صفحات کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں

آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے خطوط کی اشاعت کے تقریباً سو سال بعد اردو ادیبوں کو محمد طفیل مل گئے، جنھوں نے بے شمار ادیبوں اور مشاہیر کی جیتی جاگتی زندگیوں کو، جو ان کے خطوط میں پوشیدہ تھیں۔ نقوش کے مکاتیب و خطوط نمبر میں نہ صرف محفوظ کر لیا، بلکہ اہلِ علم کو محققوں اور ناقدوں کو تحقیق و تلاش اور نقد و نظر کے لیے ایک میدان فراہم کر دیا ہے۔ اب ان خطوط کے ذریعہ مشاہیر، علما، فضلا، ادبا، سیاست دانوں، سماجی خدمت گذاروں کے بعض ان افکار و خیالات، حالات اور واقعات، آزمائشوں اور الجھنوں، ناکامیوں اور کامرانیوں سے آگاہی ہو گی، جن سے سب بے خبر تھے، یہ خطوط قہقہہ بر قرطاس بھی ہیں اور آنسوؤں سے نم بھی ہیں اور فکر انگیز بھی ہیں۔

ان میں شعراء کے کلام پر اصلاحات بھی ہیں، تخلیقات اور دوسرے ادبی کاموں پر تبصرے بھی ہیں، شعراء کے ایسے کلام بھی ہیں، جو اب آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ خطوط مختصر بھی ہیں، طویل بھی، بہت پرانے بھی ہیں، قریب تر زمانے کے بھی ہیں، شگفتہ اور تر و تازہ بھی ہیں، تلخ و ترش بھی ہیں۔

آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھ سے کیا کسی سے کوئی پوچھے کہ اردو کا سب سے باوزن، بھاری بھرکم ادبی رسالے کا نام کیا ہے، تو جواب ملے گا محمد طفیل کا "نقوش" ہے۔

آج اگر پوچھا جائے اور مستقبل میں ایک طویل مدت کے بعد بھی، کہ وہ کون سا ادبی رسالہ ہے جس کے عام شمارے بھی خاص نمبروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں تو جواب ملے گا محمد طفیل کا "نقوش" اگر دریافت کیا جائے کہ وہ کونسا ادبی رسالہ ہے جس کے خاص شمارے اور نمبر اتنے محترم اور معتبر ہیں کہ گذشتہ تیس بتیس سال سے برصغیر کے محققین کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ناقدین کو متاثر کر رہے ہیں۔ قلمکاروں کو آگے بڑھا رہے ہیں اور نئی سمتوں کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور نئی نئی جولانگاہیں فراہم کر رہے ہیں۔ مؤلفین

کی معاونت کر رہے ہیں، تحقیقی کام کرنے والوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں، قارئین کو دلچسپ، فکر انگیز، معلومات افزا مواد مطالعہ کے لیے پیش کر رہے ہیں، تو پھر جواب ملے گا۔ محمد طفیل کا ”نقوش“ اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اردو کے ادبی رسائل کے مدیروں میں زیادہ محترم، معتبر اور متحرک کون ہے، تو جواب ملے گا۔ نقوش لاہور کے ”محمد نقوش“ جنہوں نے افسانہ نمبر سے رسول نمبر تک معتبروں میں معتبر اور ضخیموں میں ضخیم قاموس نمبر پیش کرکے اردو ادب کا وزن بڑھایا اور اردو والوں کا مزاج بنایا ہے۔

لیکن ان سب سے زیادہ سچی بات تو یہ ہے کہ نقوش کی یہ عظمت، یہ اہمیت، یہ قدر و قیمت اس لیے ہے کہ اسے محمد طفیل مل گئے۔ اس کے اٹھارہ شمارے احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور سید وقار عظیم کی ادارت میں نکلے اور بہت خوب نکلے لیکن جب نقوش کو محمد طفیل کا مضبوط ہاتھ لگا، تو نقوش کے نقوش نمایاں ہو گئے۔ چمک اٹھے۔ شکل و صورت پُر وقار ہو گئی۔ سیرت اور خصوصیت لائق ستائش بن گئی اور اس کی افادیت کئی چند بڑھ گئی۔

کہتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں محمد طفیل بیمار پڑ گئے، تو انہوں نے خدا کے حضور میں دعا مانگی:

> ”اس دنیا میں جیسے آیا تھا، ویسا ہی چلا جا رہا ہوں، کسی کو بھی میری ذات سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ مہلت دے دیجئے۔“

دعا قبول ہوئی اور پھر:

> ”صحت یاب ہوا، تو میں نے سوچا۔ خدا سے بہت بڑا وعدہ کر چکا ہوں۔ مگر وسائل؟ صحن دل امنگوں سے معمور تھا۔ مگر حالات خندہ زن تھے۔ اس ماحول میں ذہن نے کئی پٹخنیاں کھائیں۔ غرض وسائل کی غریبی میں بھی ایک بات سوجھ گئی۔ وہ یہ ”اگر تو جھلسا دینے والی گرمیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا رہے گا، تو بھی اپنے خدا سے شرمسار نہ ہو گا۔“
>
> ”دل مطمئن ہو گیا۔“

اور — ”جب سے ادب کی کڑی دھوپ میں پیاسوں کو پانی پلا رہا ہوں۔“

ایسے پاکیزہ جذبوں کے ساتھ جو لوگ خدمت کے لیے آگے بڑھتے ہیں، وہ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر حال میں کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ محمد طفیل اردو کے کامیاب ترین ایڈیٹر بن گئے۔ ادب کے جس ویرانے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسے چمن زار بنا دیا، سرسبز و شاداب کر دیا۔ لیکن ان کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اتنا کچھ حاصل کرنے کے باوجود وہ یہ سوچتے ہیں۔

> ”میری کارگزاری کو سبھی نے سراہا، اس ضمن میں بڑے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں ہر وقت اس خوف سے لرزتا رہتا ہوں کہ اپنی مستعار زندگی کے بدلے میں نے جو اپنے خدا سے عہد کیا تھا وہ بھی پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟“

یہی محمد طفیل کی کامیابی کا راز ہے، جو دوسرے کو بھی ان کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور ہم جیسوں کو ان سے یہ کہنے کی جرأت پیدا کرتا ہے کہ ابھی خطوط کے نمبروں کا وعدہ پورا نہیں ہوا ہے۔ ابھی ہزارہا خطوط نقوش کی تحویل میں محفوظ ہیں، جو اگر منظر عام پر نمبروں کی صورت میں آ جائیں، تو اس صدی کے ادیبوں اور فنکاروں کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشے بے نقاب ہو جائیں اور بہت سی حقیقتیں محفوظ ہو جائیں اور ایک بار پھر تاریخ اور ادب کا دامن انمول خزانہ سے مالا مال ہو جائے۔ اور پھر ایک بار محمد طفیل اپنی مسکراہٹوں کے پیچھے سے شائقین ادب کو اپنی طرف متشکر نگاہوں سے حیرت زدہ دیکھیں۔

محمد طفیل کے نام

فکر تونسوی

مجھ پر آفت یُوں ٹوٹی (یہاں آفت کو معصیت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے) کہ محمد طفیل آف "نقوش" مجھے شاید غلط فہمی سے شرفاء میں شمار کرتے تھے، چونکہ وہ خود بھی شرفاء میں سے تھے۔ اس لیے مَیں نے ان کی غلط فہمی کو دُور کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ ادب میں خالص شرافت نفس کا ذکر لغاتِ فیروزی تک میں موجود نہیں ہے۔ مَیں اپنے اس دعوے کی تصدیق نوے فی صدی اُردو ادیبوں سے کروا سکتا ہُوں۔

ایک مرتبہ انہوں نے "نقوش" کا ضخیم و شحیم طنز و مزاح نمبر شائع کیا، تو مجھے بھی ارسال کر دیا۔ حالانکہ ہند و پاک دونوں باہمی جنگوں کے عادی ہو چکے تھے اور جنگیں شرافتِ نفس کا مذبح خانہ ہوتی ہیں، لیکن محمد طفیل کی شرافتِ نفس کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکیں اور طنز و مزاح نمبر مجھ تک پہنچ گیا۔

عشق اور خلوص شامل حال ہو، تو جنگیں دو شرفاؤں کے دلوں میں رخنہ نہیں ڈال سکتیں، چاہے دونوں فریقین کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن لاکھ چیختے چلاتے رہیں (تو کیا ہُوا، بلا سے چیختے چلاتے رہیں)

المیہ نمبر دو یہ ہوا کہ اس طنز و مزاح نمبر کی صرف دس بارہ مخصوص و محدود کاپیاں ہی لاہور سے دہلی پہنچیں۔ کیونکہ دونوں ممالک میں آزادیٔ فکر و نظر کو بھی محدود کر دیا گیا تھا۔ کیوں؟ کیونکہ ؏

راز شاہاں، شاہاں بدانند

نتیجہ یہ کہ اس وقت دہلی میں دس بارہ انسان ہی اپنے آپ کو شرفاء میں شمار کرتے تھے —— وُہ شرفاء میں تھے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ خود محمد طفیل کرتے تھے۔ بڑے دیدہ ور انسان تھے۔ سُنا ہے اس دیدہ وری میں ان کے کچھ آنسو بھی شامل تھے۔ شرفاء میں اگر دیدہ وری بھی شامل ہو اور کچھ دشواریاں بھی، تو اُن کا یہی حشر ہوتا ہے۔

بہرکیف وہ طنز و مزاح نمبر میری تحویل میں آیا، تو دہلی کے اہلِ فکر و نظر تاک میں تھے۔ دانش و بینش اُن کے نصیب میں تھی اور میرے متعلق وہ جانتے تھے کہ حسنِ سلوک اس شخص کے بھی نصیب میں ہے۔

چنانچہ ایک صبح وہ صاحب میرے پاس وارد ہوئے، جن کا مَیں نام نہیں لینا چاہتا اور سو فی صدی لجاجت سے بولے:

"فکر صاحب! سُنا ہے آپ کے پاس نقوش کا طنز و مزاح نمبر تشریف لایا ہے۔"

"لایا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن آپ چونکہ وہ نمبر طلب فرمائیں گے۔ اس لیے میرا جواب ہے کہ وہ تشریف نہیں لایا۔"

انہوں نے میرے اس جواب کو ایک مزاحیہ جملے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کم از کم اسے میرے حسنِ سلوک سے تعبیر نہیں کیا

تبسم بہ لب بولے: "میں سمجھتا ہوں، آپ دروغ بیانی سے کام لے رہے ہیں اور دروغ بیانی آپ کا مسلک کبھی نہیں رہا۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے لیے وہ نمبر مجھے عنایت کر دیجیے، لوٹا دوں گا۔

"میں نے کہا: لوٹانے کی خصلت ہماری تہذیب میں نہیں ہے"

"خدا قسم! اگر حسبِ وعدہ نہ لوٹایا، تو آپ جو چاہیں مجھے سزا دے دیجیے"

"سزا کی تجویز آپ کی اپنی طرف سے آنی چاہیے"

"آپ مجھے آدم و حوا کی طرح جنت سے نیچے زمین پر پھینک دیجیے گا۔ میرا مطلب ہے۔ سزا الٰہیاتی ہونی چاہیے۔

چنانچہ میں نے دانۂ گندم یعنی نقوش کا طنز و مزاح نمبر ان کے حوالے کر دیا۔

یہ صاحب صوبہ سندھ کے مہاجر تھے۔ خوش وضع، خوش پوش اور خوش مزاج تھے۔ میں یہ ساری صفات ان سے صرف اس لیے وابستہ کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ اُردو ادب کے قریب مجنونانہ حد تک دیوانے تھے اور المیہ نمبر تین یہ کہ اُردو ادب میری کمزوری تھی تقسیم ملک کے بعد جو بھی اُردو زبان کا اہلِ ذوق کہیں مجھے مل جاتا، تو میں سمجھتا ع

یہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

یہ صاحب فرماتے تھے کہ میں سندھ کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار تاجر کا فرزند ہوں۔ ایک تو سرمایہ، پھر تاجر۔ مجھے ان کے والد صاحب کچھ مشکوک نظر آئے۔ مگر فرزند مذکور کا ذوق علم و ادب ان کے مشکوک والد صاحب سے قدرے مختلف نظر آیا۔ لیکن "ماں پہ پوت، پتا پہ گھوڑا" کا محاورہ بھی میرے دل کی تہوں میں مجھے ڈراتا رہا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اُردو اس محاورے سے کہیں زیادہ قوت بخش ہے۔ سرمایہ اور تجارت دونوں کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔

بہر کیف ایک ہفتہ گزر گیا۔ لیکن فریق ثانی کی خاموشی جسے میں اپنے حسنِ سلوک کی بدولت برداشت کر گیا۔

دوسرا ہفتہ۔ خاموشی، مزید برداشت۔

تیسرا ہفتہ۔ ٹیلی فون پر ان کی بیوی بی، جو کسی سرکاری دفتر میں بہت بڑی افسر تھیں (ان دنوں بڑے افسروں میں جھوٹ بولنے کا رواج کم تھا)، بولیں:

"وہ ایک کلچرل پروگرام کے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتے تک لوٹیں گے

ایک ہفتے کے بعد مجھ سے ایک خواہ مخواہ کی تفتیش ہو گئی۔ ایک دوست سے پوچھ بیٹھا:

"یار! ہمارا وہ ایک دوست تھا نا؟"

"کونسا دوست ہے؟"

"وہی سندھی انٹلکچول، نام پھر چھپا لیا۔ حماقت کی حد ہے، ایک انگریزی روزنامہ کے ایڈیٹوریل سٹاف میں تھا، کئی ہفتوں سے نظر نہیں آیا۔ کوئی سدھ بدھ؟"

"ارے، اس بکشمی سالے کی بات کر رہے ہو۔ وہ ایک بیک وقت بالغ و نابالغ حسین لڑکی کے ساتھ بمبئی میں گھومتا پھرتا

تھا۔ مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"یار مجھ سے نقوش کا طنز و مزاح نمبر عاریتاً لے گیا تھا۔ ابھی تک لوٹایا نہیں۔"

وہ ہنس کر بولا "وہ اب اس وقت تک نہیں ملے گا، جب تک اس بیک وقت بالغ و نابالغ حسینہ اپنے سندھی یار کا مراقبہ نہیں کرتی۔ تمہارا پرچہ اسی دلنواز لڑکی کے پاس میں نے دیکھا تھا۔ بڑی اہل ذوق ہے ظالم!"

"مگر مجھے تو کسی نے بتایا تھا کہ لکشمی کسی کلچرل پروگرام کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔

وہی وہی۔ بات ایک ہی ہے، لہجہ ذرا مختلف ہے۔ اس کلچرل پروگرام کا وہی مطلب ہے۔ جو ہنی مون سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ اور مت بھولو! کہ وہ طنز و مزاح نمبر بھی سلسلۂ عشق کی ایک کڑی تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے، جیسے غزل میں مصرع طرح تھا۔"

"اور مقطع کب ہوگا؟"

"یہ اللہ کے اختیار میں ہے، ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

بہرکیف میں خوش ہوا کہ میرے نقوش کا وہ طنز و مزاح نمبر بہ سلسلۂ عشق بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اگرچہ میرے لیے یہ بہت بڑی قربانی تھی، لیکن جنگ ہو یا عشق، قربانی تو دینا پڑتی ہے اور سنا ہے قربانی کرنے والوں کی چتاؤں پہ ہر برس میلے لگتے ہیں۔

مگر مجھ میں اس جراتِ رندانہ کی کمی تھی کہ کامریڈ محمد طفیل کو خط لکھ دیتا کہ بہ سلسلہ قربانی مجھے طنز و مزاح نمبر کی ایک اور جلد بھجوا دو۔ ایک ہزار صفحات کا نمبر۔ اور وہ قربانی کوئی اتنی عالمگیر بھی نہیں تھی۔ ہر نتھو خیرا عشق کرتا ہے۔

بہرکیف میں خاموش ہوگیا۔ خاموشی ایک لازوال دولت ہے، جسے نصیب ہو جائے، وہ ولی ہو جاتا ہے۔

مگر پانچ چھ مہینے بعد اچانک ایک دن اسی سندھی لکشمی سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوگئی۔ ہر ناکام اور دنیا سے مایوس انسان کافی ہاؤس میں مل جاتا ہے۔ لکشمی کے چہرے پر کچھ اداسی تھی۔ سوچا! بیچارے ہنی مون سے پہلے کچھ بیت گیا ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ وہ مسکرایا۔ مسکراہٹ جھوٹ موٹ کی سی تھی۔ پوچھا: "پوزیشن!

"سوری! وہ طنز و مزاح نمبر بے حد دلکش تھا۔"

"تمہاری اس محبوبہ کی طرح؟"

جھوٹ موٹ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "دراصل تاخیر ہوگئی۔ میں نے وہ نمبر تو دیکھا ہی نہیں۔ وہی ستمگر مجھ سے چھین کر لے گئی تھی۔ میں نے بھی سوچا، یہ حسین لڑکی بھی اس نمبر کی طرح بڑی ستم گر ہے۔ اگر اس نمبر کے ذریعے میری مضطرب ضمیر کو کچھ تسکینِ قلب مل جائے۔ تو آپ سے معذرت طلب کر لوں گا۔ یہ نمبر وہ مجھ سے نہیں لے رہی، بلکہ ... ...

"... ... بلکہ عشقیہ غزل کا مصرع طرح کہہ گئی ہے۔ مگر یہ بتاؤ، مجھے اس نمبر کی چنتا نہیں۔ تاریخ میں کبھی کبھی ایسے خوبصورت واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں نے مل کر اس مصرع طرح پر غزل لکھ ڈالی؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "غزل ... غزل ... نہیں جناب! المیہ یہ ہوا کہ گذشتہ ہفتے ایک بہت بڑے لیڈر کے

بیٹے کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی۔ میں غریب تھا۔ وہ امیر یعنی خالص کلاس دار۔

"گویا غزل کا مقطع لکھ ڈالا گیا اور تمہارے بجائے کسی اور نے لکھا، لیکن میرے اس نمبر کا مقطع بھی کلاس دار کا شکار تو نہیں ہو گیا؟"

"نہیں، میں نے شادی سے ایک ہفتہ پہلے وہ نمبر اس سے واپس لے لیا تھا۔ کل آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا، حالانکہ وہ آخری دم تک مصر رہی۔ کہ یہ نمبر اس کے جہیز میں شامل کر لیا جائے۔ مگر میں نے کہا جہیز کا پرابلم تمہارے باپ کا ہے، فکر تونسوی کا نہیں اور وہ تو ویسے بھی جہیز کے خلاف ہے۔"

دوسرے دن اس نے مجھے وہ نمبر واپس کر دیا۔ مگر اس حالتِ ناگفتہ بہ میں کہ:

۱۔ کہ نمبر کا آرٹسٹک سہ رنگا سرورق بقول اس کے اس کی بے وفا محبوبہ نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ (نجانے محبوبہ پہ یہ اتہام تھا یا کیا تھا)

۲۔ اور اس نمبر میں عاشق محمد غوری کی دو دلفریب پیروڈیاں تھیں، وہ غائب تھیں۔ غالباً انہوں نے اپنے عشق اول و آخر کو عبرتناک بنانے کے لیے خود پھاڑ لی تھیں۔ اعتراف نہیں کرتے تھے۔ کون کرتا ہے؟"

اس میں سے ایک پیروڈی کے کچھ مصرعے یوں تھے:

او ڈیس سے آنے والے بتا

برسات میں دلدل بنتے ہیں سب کوچہ و بازار اب کے نہیں
کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں پیراہن اور شلوار اب کے نہیں
دو چار قدم جو چلتا ہے، گرتا ہے دس بار اب کے نہیں

او دیس سے آنے والے بتا

میں نے اسے خواہ مخواہ شماتتِ ہمسایہ کے ڈر سے یہ نہیں کہا کہ دراصل تمہارا اور اس بے وفا محبوبہ کا عشق اسی نمبر کی بدولت زندہ رہے گا۔ اس نے ٹائیٹل پیج چرا کر ہمارے آرٹسٹک نقوش اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں اور تم نے اس کے قمیص و شلوار کو لت پت کر کے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

ایک ڈائیلاگ

"جناب فکر تونسوی! کیا آپ کو معلوم ہے کہ نقوش لاہور نے ایک مرتبہ طنز و مزاح نمبر نکالا تھا۔"

"نکالا تھا" میری رال ٹپک پڑی۔ اس کی خبر اللہ کو ہو گی، کہ یہ رال طنز و مزاح نمبر کو مجھے اپنے قبضۂ اقتدار میں لینے پر ٹپکی تھی یا اس بظاہر کنواری دوشیزہ مگر بباطن دو مرتبہ کی بیوہ کے بدستور شکن پر نکلی تھی؟"

"دراصل میں اس نمبر کی تلاش میں بہت بھٹکی ہوں مگر آپ اس شہر کے واحد پہلے اور آخری سچے آدمی ہیں، جو اعتراف کریں گے کہ وہ نمبر آپ کی تحویل میں ہے۔"

"ہاں، تحویل میں ہے۔" (سچا بننے کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا)

"حقیقت یہ ہے کہ میں طنز و مزاح پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں، اور اس نمبر کے بغیر میرا تھیسس مکمل نہیں ہو سکتا۔

کیا آپ ... ... ؟"

"مگر دیکھیے۔ اس نمبر کی کچھ چیزیں مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہیں گی۔"

"آپ خدا پر یقین رکھتی ہیں؟" — "نہیں"

"تو پھر مجھ پر یقین رکھیے کہ میں آپ کو اس نمبر کی ایک ایک سلپ اپنی اوریجنل حالت میں لوٹا دوں گی۔

"کیا مطلب؟ کہ آپ اس نمبر کو سلپ سلپ کر کے پڑھیں گی، اور سلپوں کا وہ مجموعہ ... ..."

"نہیں نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ اس کا ایک بھی صفحہ ضائع نہیں کروں گی۔ اسے یوں سنبھال سنبھال کر رکھوں گی، جیسے...،

"جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ کو سنبھال کر رکھتا ہے۔"

اور اس پر ایک زیرلب تبسم! ہائے! نوجوان کنواری بیوہ کا زیرلب تبسم بھی کیا غضب ڈھاتا ہے (مجھ پر) اور پھر حسن مجسم اور مقصد تعلیم یعنی طنز و مزاح پر ڈاکٹریٹ کرنا۔ لہٰذا حماقت ناگزیر ہو جاتی ہے اور میں نے اس کافر ادا کو وہ نمبر یوں احترام سے پیش کر دیا، جیسے کوئی عقیدت مند دیومالائی دیوی کی مورتی کے چرنوں میں پھولوں کا گچھا پیش کرتا ہے۔ نو مہینے بعد اس سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ نو مہینے جب کسی بیوہ کے بھی بچہ پیدا ہو جاتا ہے (استثنائی طور پر) اس سے پہلے بھی وہ ملتی رہی، مگر زیر لب تبسم کی حد سے ہم دونوں آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن جس دن تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس دن وہ اتنی زیادہ خوش و خرم تھی کہ عضو عضو سے شباب پھوٹا پڑتا تھا، وہ غریب خانہ پر تشریف لائیں، نقوش کا وہ طنز و مزاح نمبر اس کے نرم و گرم ہاتھوں میں تھا مجھے دیوتا سمجھ کر اس نے وہ نمبر میری نذر کیا۔ میں نے پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"میں نے اسی نمبر کی بدولت ڈاکٹریٹ کر لی، البتہ قسم! اگر یہ نمبر میرے پاس نہ ہوتا تو ... ..."

"اس کے لیے کلمۂ خیر یعنی مبارک باد پیش کی جائے۔"

"مبارک باد دینے کے لیے تو حاضر ہوئی ہوں۔"

"غلط آدمی کے پاس آئی ہیں، آپ؟ طنز و مزاح کی یہ تاریخی دستاویز محمد طفیل نے مرتب کی ہے۔ مبارک باد اسے بھیجیے۔"

"میں ان سے ملاقات کی پیاسی ہوں۔"

"پیاس لیے پھرو مگر وہ درویش صفت شرفا میں سے ہے۔ کافر اداؤں سے نہیں ملا کرتے۔ ان کی مجنونانہ کیفیت میں خلل پڑتا ہے۔ بہر کیف ان کی اسی کیفیت کے طفیل آپ نے ڈاکٹریٹ کر لی، یہ ان کے جنون کی تکمیل اور فیض ہے۔ میں آپ کی مبارکباد ان تک پہنچا دوں گا۔ لائیے، وہ نمبر۔"

اور اس نے جب وہ طنز و مزاح نمبر مجھے دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے نمبر پہ گتے کی جلد چڑھا دی تھی۔ مگر میں نے اندر کے صفحات دیکھے، تو زار و قطار رو دیا۔ نمبر سلپ سلپ تو نہیں ہوا تھا، لیکن ہر صفحے پر ان محترمہ نے لکیریں، نشان، زاویے اور صفریں اور موڑ توڑ

ایسے کر دیے تھے، جیسے وہ نمبر ایک ایسی اُجڑی پُجڑی بیوہ ہو، جس کا خاوند زندہ ہو۔

ایک خط، کئی خط

ایک مشہور نقاد نے (کم از کم وہ اپنے آپ کو مشہور کہتا تھا۔ مجھے ایک خط لکھا:

"نقوش کا ضخیم و لحیم و شحیم طنز و مزاح نمبر میں آپ سے لے گیا تھا۔ شرافتِ نفس نے مجھے ترغیب دی، لہٰذا آپ کو لوٹا رہا ہوں۔ میں نے اچٹتی نگاہوں سے اس کا مطالعہ کیا۔ کیونکہ مجھ میں وہ تاب و تواں نہیں کہ اس کی نثر و نظم کے ہر مضمون کو عمیق گہرائیوں سے پڑھوں، یورپ اور امریکہ کے علم و ادب کو اس قدر زیادہ چاٹ چکا ہوں کہ بطور نقاد اب وہ تاب و تواں رہی نہ ضرورت کہ اردو ادب میں اب ڈوب ڈوب جاؤں۔ ڈوب جانا قارئین کا کام ہے، ہم نقادوں کا نہیں۔

اگرچہ بظاہر مجھے لگتا ہے، گو محمد طفیل بڑے بڑے نمبر نکالنے کی عادت اور صلاحیت اور خو بو بلکہ شوقِ بے پایاں کے خوگر بھی ہیں اور زیادہ تر آنے والی نسلوں کے مفاد کی خاطر شائع کرتے ہیں۔ اس لیے بظاہر مجھے لگتا ہے کہ آنے والی نسلوں کا مفاد کوئی خاص بڑا شغل نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس نمبر میں "پنچ" کے دَور کے پنڈت تربھون ناتھ ہجر کا ایک مضمون "نشے کی ترنگ" میں سے ایک دو صفحات غائب تھے۔ شاید کسی حاجت مند کی رضا ہوگی، اس نے کاٹ کر رکھ لیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت ہجر کی تحریر دورِ حاضر میں کس نالائق کو پسند آئی ہوگی۔ بہرکیف رضائے دیگراں سے مجھے کیا نسبت؟

معذرت خواہ ہوں، اس نمبر میں مجھے جس چیز نے زیادہ متاثر کیا، وہ بڑے بڑے جہازی سائز کے رائٹر کے کارٹون تھے۔ حُسنِ اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ میرے پوتے کو بھی پسند تھے۔ اس لیے بالی ہٹ کر کے اس نے اکبر الہ آبادی اور کنہیا لال کپور کے کارٹون اس نمبر میں سے نکال لیے۔ اسے ایسی قبیح حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے کی۔ بال ہٹ کا کیا علاج؟

مَیں اپنی اور پوتے کی طرف سے اُس آرٹسٹ کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیے:

ایک دوسرے نقاد نے مجھے ایک خط تحریر فرمایا:

"جناب فکر صاحب! نقوش کے طنز و مزاح نمبر کے عطیے کا شکریہ۔ شکریہ ہو یا طنز و مزاح کی صنعتِ سخن۔ اس کی نگارشات کو کائنات کے زیر و بم میں رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو انسان کی باطنی سرکشی اور لاابالی پن کی تشریحات کو ممکنات میں بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ناممکنات میں بھی۔ مَیں نے ارسطو اور افلاطون کے تبرکات کو سامنے رکھ کر جب اس نمبر کو جانچا تو میری نظر ان ماکولات پر جا پڑی، جن سے یہ دنیا عبارت ہے۔

اگرچہ آپ نے مجھے یہ نمبر مرے تبصرے کے لیے عنایت نہیں کیا تھا۔ لیکن اپنی خصلت (جس میں آپ صحیح الدماغ اور رسیدہ ذہن نقاد نظر آئے) کے ہاتھوں مجبور ہو کر مندرجہ بالا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ تبصرے پر بُرا ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ مَیں نے خود بُرا نہیں مانا۔

چونکہ ملک میں ابھی فوٹو سٹیٹ کا رواج نہیں پڑا۔ اس لیے مجھے مجید لاہوری، عبدالمجید سالک اور اے حمید کے ایک دو

مضامین نظم و نثر پسند آئے، لہٰذا کاٹ لیے اور یُوں بھی کوئی لیکچر یا مضمون مجھے پیش کرنا پڑا، تو اُن کے حوالے دے سکوں گا، کہ یہ بھی ایک خدمتِ علم و ادب ہے۔

میرا خیال ہے، محمد طفیل صاحب نے بھی خدمتِ علم و ادب کے لیے ہی یہ خاص نمبر نکالا ہے۔

ایک تیسرے نقّاد صاحب کا خط بھی ملاحظہ ہو:۔

"جنابِ فکر! — نقوش کا یہ طنز و مزاح نمبر؟ تھُو تھُو۔ اتنا قیمتی وقت کو رائگاں کرنے کی یہ ترکیب میرے پلّے تو نہیں پڑی۔ بھلا اس میں سوائے اس چالبازی کے اور رکھا ہی کیا ہے کہ پہلے سے ہی لکھی اور پڑھی جا چکی تحریروں کو ایک نمبر میں اکٹھا کر دیا گیا۔ مَیں اسے کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا۔

بلکہ بذاتِ خود طنز و مزاح کو تو مَیں ادب میں ہی شمار نہیں کرتا۔

میں نے ایک تنقیدی مضمون محمد طفیل صاحب کو ارسال کیا تھا۔ اگر وہ اس نمبر میں شامل ہوتا، تو البتہ کافی حد تک اس نمبر کا وقار بھی بڑھ جاتا۔ اور وقعت بھی بڑھ جاتی۔

آپ نے جو نمبر مجھے عطا کیا تھا۔ اس کا وقار اور وقعت اس حالت میں بھی شاید بڑھ جاتی مگر وہ بڑی ریختہ اور شکستہ حالت میں مجھے ملا کہ تنقیدی حصے کے صفحے کے صفحے غائب تھے۔ نجانے یہ کس ہوس کار کی کارستانی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ انہی غائب شدہ صفحات میں میرا وہ مضمون بھی شامل ہو۔

نظیر اکبر آبادی کا مکمل آدمی نامہ کی مجھے مدت سے جستجو تھی۔ کم بخت کہیں سے مِل ہی نہیں رہا تھا۔ اس نمبر میں "آدمی نامہ" پر نظر پڑ گئی۔ بے ساختہ اُسے اپنے قبضۂ اقتدار میں لے لیا۔ اس قبضۂ اقتدار کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔

اور اب ایک خط بلیک مارکیٹیے کا۔

محترم فکر تونسوی صاحب!

اس رات ایک دعوتِ نائو نوش میں آپ نے ماہنامہ "نقوش" کے طنز و مزاح نمبر کا ذکر کیا۔ نہ صرف ذکر بلکہ اس کی زیارت بھی کرا دی۔

لیکن اب خلیفہ آپ حیران اور پریشان بلکہ سرگرداں بھی ہوں گے، کہ وہ نمبر کہاں گیا؟ کون نُطفۂ حرام اُسے لے گیا۔

لیکن معاف کیجئے میں کہ ایک بلیک مارکیٹیا شمار ہوتا ہُوں (اور کافی حد تک ہوں بھی) اپنے آپ کو نطفۂ حرام ڈکلیر کر کے بڑے عجز و آداب اور صدق و صفا سے اعتراف کرتا ہوں کہ وہ نمبر میرے پاس ہے، آپ کی نظر چوکی اور مَیں نے مال غائب کر دیا۔

میری کمزوری — طنز و مزاح ہے اور پھر ہائے رسے ہائے! اتنا بھاری بھر کم طنز و مزاح نمبر کا مجموعہ! چراتا نہیں، تو اور کونسی جھک مارتا۔

پورے نمبر میں (جو پورا نہیں، جگہ جگہ سے جیسے کئی چوروں نے کچھ کچھ چرایا ہے) اگرچہ ہم بلیک مارکیٹروں پر طنز کیا گیا ہے۔ لیکن کس دلبرانہ اسلوب میں۔ میں تو اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ اس دنیائے دوں میں بلیک مارکیٹ بھی چلتی رہے اور طنز و

مزاح بھی۔ میرے اوپر جو قہقہہ لگائے ' وہ خالص ادب ہے۔ ہم نہ ہوتے ' تو شاید یہ خالص ادب بھی تخلیق نہ ہوتا۔ انسان میں مثبت و منفی دونوں کار فرما ہیں ۔

المختصر یہ کہ اب وہ نمبر میں آپ کو واپس نہیں دے رہا ۔

پچیس روپے کا ایک چیک حاضر خدمت ہے۔ یقیناً کیش ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم کالے دھن اور سفید دھن دونوں کے مالک ہیں ۔

پہلے سوچا تھا، چیک پچاس روپے کا بھیج دوں' لیکن نمبر کا نصف حصہ شاید آپ پہلے ہی کسی بلیک مارکیٹیے کو فروخت کر چکے ہیں۔ اس لیے بقیہ نصف کے لیے پچیس روپے ہی موزوں ہیں ۔

اگر آپ نہیں چاہتے کہ اس نمبر سے آپ کو قطعی محروم رکھا جائے ' تو پانچ دس روپے مزید بھیج دوں گا ، لالچ مت کیجئے گا کہ بڑی بلا ہے ۔

اور اگر آپ پھر بھی بضد رہے ' تو کرتے رہیے ضد۔ میں وہ نمبر قطعی واپس نہیں کروں گا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کے علاقے کا تھانیدار میرا بھتیجا ہے ۔

شہرت کی خاطر—

وہ ایک انٹلکچوئل تھا۔ میں اس سے نفرت کرتا تھا یا نہیں ؟ اس کے متعلق اس نے کبھی پوزیشن واضح نہیں کی تھی۔ بڑی بلاغت تھی اس میں ۔

وہ اتنا زود فہم تھا کہ اردو زبان و ادب کے متعلق اس نے فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد اب یہ زبان و ادب صرف استحصال کے اہل رہ گئی ہے ۔ جیسے یہ زبان منڈی کی ایک جنس ہو۔ جسے وہ اپنے بھاؤ تاؤ پر فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا ۔

اور اصحاب اقتدار صرف اسی لئے اس چرب زبان کا ساتھ دیتے تھے شاید میں اسی لیے اس سے نفرت کرتا تھا، لیکن شاید وہ جانتا تھا کہ فقط نفرت ' خالص نفرت کی دو کوڑی قیمت نہیں منڈی میں۔ بلاغت کی حد ہے۔

ارباب اقتدار کی وساطت یا کمزوری سے جہاں جہاں بھی اردو کو سیاسی اور معاشی اور مذہبی ادارے قائم کرنا پڑتے۔ اس انٹلکچول کو صف اول میں مقام دیتے ۔ تاریخ کی ٹریجڈی نے اسے یہ مقام دلا دیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک محفل میں اس سے ملاقات ہو گئی۔ میرے دونوں کندھوں پر اپنا پورا محبت بھرا ڈپلومیٹ بازو ڈال کر بولے: فکر صاحب ! واہ واہ، شکر ہے۔ آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔ ورنہ میں تو تین چار مہینوں سے آپ کی تلاش میں تھا۔ خیر، قصہ مختصر یہ کہ کیا آپ شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

میں نے کہا: "کیسی شہرت ؟ جیسے ہمارے گاؤں کے سدو چور کو تھی کہ گاؤں کی دوشیزائیں بھی اس کا نام لے کر ہی چکی چلانے کا آغاز کرتی تھیں۔

یہ سُن کر اُس کے بازو کی گرفت میرے کندھے پر زیادہ مُستحکم ہو گئی۔ بظاہر ٹھٹھا لگا کر بولے: واہ جی واہ! کیا نکتہ مارا ہے اگرچہ ستّو میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"نہیں آیا ہوگا، کیونکہ وہ چوپڑ تھا، آپ کی طرح انٹلکچول نہیں تھا، بہرکیف فرمائیے:

"کیا آپ گزشتہ ہفتے ہردوار کی یاترا پر گئے تھے؟"

"اور کیا کرتا؟ جب سے یہاں اُردو پر کرائسس آیا ہے۔ میں بڑا مضطرب رہتا تھا۔ اس لیے سوچا، گنگا جَل کے مقدس پانی میں غسل کر کے دیکھوں کہ شاید اس اضطراب اور کرائسس سے نجات ملے۔

"اوئے بھولے بادشاہو! اردو ادب اب بھی آپ کو نشانِ امتیاز عطا کر سکتا ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ کیا آپ کے پاس نقوش کا طنز و مزاح نمبر ہے؟"

"نہ ہوتا، تو آپ مجھ سے پوچھتے بھی نہیں۔"

تالی بجا کر بولے: "بس بس بس! آپ دو چار دنوں کے لیے وہ نمبر مجھے عنایت کر دیجئے۔ میں ٹیلی وژن پر آدھ گھنٹے کے لیے طنز و مزاح پر ایک پروگرام پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پروڈیوسر مجھے ہی سمجھئے۔ اور آپ اس پروگرام میں ایک اہم اور نمایاں شخصیت کے طور پر شامل ہوں گے۔ بس پھر شہرت ہی شہرت۔ ہندوستان بھر میں آپ کی شہرت کا ڈنکا بج جائے گا۔"

مَیں شہرت کا بھوکا تھا یا نسبی شرافت کا ازلی شکار، کہ ہاں کر بیٹھا۔ مگر اتنا ضرور کہہ دیا کہ آپ کی یا کسی کی بھی شہرت کا ڈنکا تو ضرور بجے گا، کیونکہ وہ نمبر ایک تاریخی دستاویز ہے۔ مگر معاف کیجئے ڈنکا پورا نہیں بج سکے گا، آدھا بجے گا، کیونکہ جس خستہ اور خجستہ حالت میں وہ نمبر میرے پاس موجود ہے، اسے آدھا ہی سمجھئے۔

مگر ان کا خیال مختلف تھا کہ ہم اس آدھے سے ہی پُورا پروگرام مُرتب کر لیں گے۔ کیونکہ اس پروگرام میں کچھ ہماری تخیلی قدر و قیمت کی آمیزش بھی تو ہو گی۔ بہرکیف وہ نمبر جب ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گیا۔ یعنی فکر تونسوی سے ستّو چوپڑ کے ہاتھ میں۔ تو میں نے اپنے سامنے ہی اس کی کتر و بیونت ہوتے دیکھی۔ یعنی ایک طرف چند طنز نگاروں کے پورے کارٹون اس نے کاٹ لیے کہ ان پر ٹیلی وژن کا کیمرہ مین اپنا کیمرہ چلائے گا۔ چند طنز نگاروں کے طناز فقرے قینچی سے کاٹ کر ٹیلی وژن کے ذریعے عوام تک پہنچائے۔ کئی ایک طنز نگاروں کی دو چار نظمیں، دوشیزہ موسیقاروں سے گوائیں۔ کئی ایک کی سطور کے نیچے لکیریں لگا کر اداکاروں سے کہا کہ انھیں یوں بول کر دکھاؤ۔ جیسے چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری یا میر تقی میر بولا کرتے تھے اور ان سب کا اجتماع ایک ڈرامائی فیچر کی شکل اختیار کر جائے۔

اور میری عالمگیر شہرت کے لیے دو چار فقرے رننگ کومینٹری کے لیے وہ فقرے بزعمِ خود مَیں نے یوں کہے۔ جیسے اگر میں نے محمد طفیل پر احسان کیا ہے۔ یاری دوستی والا احسان۔

بہرکیف وہ پروگرام اتنا زیادہ کامیاب ہُوا کہ جب وہ طنز و مزاح نمبر اپنی پُوری قطع و برید کے ساتھ مجھے واپس عطا کیا گیا، تو مَیں اسے اسی طرح نہیں پہچان سکا جیسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرنے کے بعد، کوئی انسان دوسرے انسان کو

نہیں پہچان سکتا تھا۔ چاہے وہ دونوں انسان ایک دوسرے کے ساتھ ہنی مُون تک منا چکے ہوں۔

مَیں نے اس انٹلکچول سے عرض کیا ”آپ یہ کونسی چیز میرے حوالے کر رہے ہیں۔“

”نقوش کا طنز و مزاح نمبر۔“

” . . . . .“

”خدا قسم! دھوم مچادی، اس پروگرام نے۔ اور صرف اسی نمبر کے طفیل۔“

مَیں نے کہا۔ ”اب آپ رکھیے اپنے پاس۔ آئندہ بھی شاید ایکسپلائٹیشن کے لیے آپ کے کام آئے۔ مَیں نے آپ کو ایک زندہ حقیقت دی تھی۔ لیکن اب آپ اُس کا مقبرہ میرے حوالے کر رہے ہیں۔

میرے فقرے میں تلخی تھی۔ مگر شاید وہ کسی بھی قسم کی تلخی سے آگاہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اس لیے خاموش رہے میرے لیے بس یہ شے اطمینان بخش تھی کہ مَیں اپنی نفسی شرافت سے محرُوم نہیں ہوا، اور اس انٹلکچول سے میری جو نفرت تھی، وہ اور بھی بڑھ گئی۔ وہ نمبر عظیم تھا۔ مگر میں اس سے بھی عظیم نکلا۔ سندر جور کی طرح عظیم، جس کا نام لے کر دوشیزائیں گیہوں کی چکی چلایا کرتی تھیں۔

محمد طفیل کے نام

طفیل بھائی! میں آپ کو یہ خط بڑی بے تکلفی سے لکھ رہا ہوں۔ بلکہ کہیں کہیں بے تکلفی کے ساتھ اس میں بے احتیاطی بھی شامل ہو گئی ہے۔ بے تکلفی کے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس میں اگر بے احتیاطی بھی شامل ہو جائے، تو وہ دوآتشہ ہو جاتی ہے۔ (میرے عقیدے سے تم اختلاف کر سکتے ہو،)

مَیں نے تمہیں خط لکھتے وقت طفیل بھائی سے مخاطب کیا۔ تم چاہو، تو طفیل بھائی کے ساتھ تم لفظ ”صاحب“ بھی جوڑ سکتے ہو۔ مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ البتہ ایک اعتراض ضرور ہوگا کہ اس سے تم اور زیادہ معزز بن جاؤ گے۔ جتنے معزز تم اب تک بن چکے ہو۔ وہ نہایت موزوں اور مناسب ہے اور زیادہ معزز بننا ضرر رساں ہوتا ہے بلکہ غیر ضروری ہوتا ہے، میرے اس اعتراض میں جو کرب ہے۔ اس پہ سنجیدگی سے غور کرو۔ سنجیدگی جو خداوند تعالیٰ کا ایک مخصوص عطیہ ہوتا ہے، جسے وہ معدودے چند محمد طفیلوں کو دیتا ہے۔

تم نے ”نقوش“ کے جتنے خاص نمبر نکالے، وہ بڑے کروفر سے نکالے۔ لفظ کروفر میں ایک شاہی مزاج پایا جاتا ہے اور مَیں شاہیت کے متواتر خلاف رہا ہوں، مگر یہ دیکھ کر شاید تمہیں بھی عجیب لگے کہ کروفر تم میں کبھی نہیں رہا کہ تم نے طبع درویشانہ پائی ہے، مگر ان نمبروں میں کروفر موجود ہے۔ اس سے مجھے نفسیاتی تسلی یُوں ہوئی کہ ایک فلسفی ارسطو تھا یا افلاطون (خیر ہوگا کوئی)، اس نے فرمایا تھا کہ سلطنت کے بادشاہ میں دو صفات از بسکہ موجود ہوں کہ ایک تو وہ نیک نیت ہو، اور دوسرے بہادر ہو۔

محمد طفیل ادبی سلطنت کا ایک ایسا ہی بادشاہ ہے کہ مزاج میں درویشی بھی ہے، اور شاہیت بھی۔!

اور جبھی مجھ پر یہ راز کھلا کہ تمہیں دنیا میں اللہ نے شاید بھیجا ہی اسی مقصد سے تھا کہ جاؤ اور اردو ادب کو فلاں فلاں خاص نمبروں سے آباد و شاداب کرو (اُردو ادب سے اللہ کو کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے)

اور اب جبکہ تم اپنے اِن خاص نمبروں کے رابطے سے ایک اور خاص نمبر شائع کر رہے ہو، تو مجھے یوں لگتا ہے تمہیں پھر کوئی وحی اتری ہے (میرے ایسے کفر بداماں کے مُنہ سے یہ فقرہ نکل آیا ......؟ مگر میں اسے واپس بھی تو لے سکتا ہوں) تم نے مجھے حکم دیا ہے کہ نقوش کے طنز و مزاح نمبر پر کچھ لکھ بھیجوں، تمہارے حکم میں التجا تھی یا التجا میں حکم تھا۔ تمہاری شخصیت نے دونوں میں فرق ہی مٹا دیا ہے۔ بہرکیف مجھے اس نمبر کی جو کاپی آپ نے بھیجی تھی۔ اس پر اتنی وارداتیں گزریں کہ آج اس نمبر کی قطع و برید کو دیکھ کر ہنستا بھی ہوں اور روتا بھی ہوں، اگر یہ نمبر ایک بے ساختہ جنوں کی پیداوار تھا اور وہ اتنا پُرکشش تھا کہ اہلِ جنوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس پر ٹوٹ پڑی۔ مگر ٹوٹ تو پڑی۔ میرے لیے یہی شادمانی کافی ہے۔

اور طفیل بھائی! تم تو شاید شادمانی کو اپنے اہل ہی نہ سمجھو کہ مزاج شاہانہ رکھتے ہو، مگر عمل درویشانہ!۔

نقوش کا لاہور نمبر

میرزا ادیب

صبح طلوع ہوئی ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ لاہور کے اُردو بازار کے سامنے سرکلر روڈ پر ایک چمکیلی کار آکر رک گئی، اس میں سے ایک دراز قد اور چھریرے جسم کا آدمی نکلا جو ایک ایسے انداز سے چیت روڈ کی طرف قدم اُٹھانے لگا جیسے جلد سے جلد ایک اہم فریضہ ادا کرنے کے لئے بیتاب ہے اس کے قیمتی سوٹ کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر افسرانہ شان کا وقار پرتو افگن ہو۔ وقار اس کے چہرے پر تو یقیناً تھا، پر یہ وقار اشرافیت، کی نشان دہی کی بجائے خود اعتمادی کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔

یہ شخص چیت روڈ پر پہنچ کر نقوش پریس کے بالمقابل ایک دو لمحوں کے لئے رُکا اور پھر پریس کے اندر داخل ہوگیا۔ محمد طفیل اپنے چھوٹے سے کمرے میں اپنی صدیوں پُرانی کرسی پر بیٹھے کسی مضمون کی نوک پلک درست کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

طفیل صاحب کے اس مختصر کمرے کی ہر ہر دیوار سے کہنگی برس رہی ہے۔ ایک صاحب نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ اگر یہ کمرہ مہاتما بدھ کے قریبی دور میں ہوتا تو اجنتا کے نقاش اسے پہاڑ کی کھوہ سمجھ کر اس کی دیواروں پر ضرور نقش آرائی کرتے۔ جہاں تک نقش آرائی کا تعلق ہے طفیل صاحب بھی اس کوشش سے باز نہیں آئے ہاں یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ اپنے غار کی دیواروں پر نہیں، کاغذوں پر حسین نقوش محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ ان نقوش کا تعلق کسی صنمیاتی شخصیت سے نہیں، زندگی کے موجودہ عمرانی، تہذیبی اور نفسیاتی کوائف سے ہوتا ہے اور ان کے نقاش برصغیر کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔

طفیل صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک وجیہہ اور خوبصورت شخص کو کھڑے پایا۔

"آیئے جناب!" طفیل صاحب مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔

"مجھے نقوش کا لاہور نمبر چاہیئے" آنے والے نے خیر خیریت دریافت کرنے یا اپنی خیر خیریت بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مل سکتا" طفیل صاحب نے حسب عادت مختصر جواب دیا۔

"مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔" طفیل صاحب مسکرانے لگے تھے۔

"دیکھئے صاحب! مجھے اتنی ضرورت ہے کہ اس کے لئے دو سو کی رقم بھی خرچ کر سکتا ہوں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ خرچ کر سکتے ہیں۔"

"چار سو۔"

"میں نے عرض کیا نا لاہور نمبر کی ایک کاپی بھی دفتر میں موجود نہیں ہے جو میں آپ کے یا کسی اور کے حوالے کر سکوں۔"

"پانچ سو۔ اور سنیئے طفیل صاحب! مجھے اس نمبر کی اپنے لئے نہیں، ایک قومی کام کے لئے ضرورت ہے۔"

"قومی کام کے لئے جان حاضر ہے۔" طفیل صاحب سوچنے لگے کہ ایسے موقع پر کوئی مناسب شعر سنا دیں۔ انہیں ایک شعر یاد آ گیا۔ شعر غالب کا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مگر اس سے پیشتر کہ وہ شعر اپنے ملاقاتی کو سنائیں وہ صاحب طفیل صاحب کو دو تین لمحے گھور کر دیکھنے کے بعد دفتر میں سے نکل گئے اور اتنی جلدی غائب ہو گئے کہ طفیل صاحب انہیں آواز بھی نہ دے سکے۔

یہ واقعہ ایک ایسے دن گزرا تھا جب سورج کو ضیا افروز ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں گذری تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا طفیل صاحب کے پاس نقوش کے لاہور نمبر کا کوئی نسخہ موجود تھا بھی۔ یا کوئی نسخہ موجود تھا تو وہ اسے جدا کرنے پر رضامند نہیں تھے۔

وہ صاحب اس نمبر کے لئے پانچ سو کی رقم بھی دینے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ فروری ۱۹۶۲ء میں جب یہ شائع ہوا تھا تو اس کی مقررہ قیمت صرف پندرہ روپے تھی علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ ان صاحب نے بالصراحت کہا تھا کہ مجھے اس نمبر کی اپنے لئے نہیں ایک قومی کام کے لئے ضرورت ہے اگر اُن کے پاس کوئی جلد تھی تو اس کی تین گنا کیا پانچ گنا قیمت وصول کر لیتے مگر طفیل صاحب نے تو پانچ سو کی رقم بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس ایک واقعہ سے ایک نہیں، کئی واقعات جنم لیتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر میں بعد میں کروں گا اس وقت مجھے نقوش کے لاہور نمبر کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اور یہ بھی میں بڑے اختصار کے ساتھ کہوں گا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ نقوش کے جتنے نمبر اب تک شائع ہو چکے ہیں انہیں الماریوں میں بند کر کے رکھوا دیا جائے تو ایک اچھی خاصی لائبریری بن سکتی ہے۔ یہ رائے کسی صورت میں بھی مبالغہ انگیز نہیں ہے۔ نقوش کے ضخیم نمبروں نے موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی سے واقعی ایک لائبریری کی صورت اختیار کر لی ہے اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ معلومات انگیز مجلدات ایک ایسا دائرہ معارف بھی ہیں جس کی جلدیں سو سے اوپر ہو چکی ہیں اور ان میں مستقلاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

> نقوش کا ہر شمارہ۔ قطع نظر اس امر کے کہ شخصیت یا ایک خاص موضوع سے متعلق ہے، یا کئی شخصیتوں اور مختلف موضوعات پر محیط ہے اور ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے، میں ان شماروں کی جائز اہمیت کم کئے بغیر نقوش کے لاہور نمبر کو محمد طفیل صاحب کا وقیع ترین کارنامہ سمجھتا ہوں، اس کی ایک جذباتی اور شخصی وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ میرا خمیر اسی لاہور کی خاک سے اُٹھایا گیا ہے اور ایک روز میں اسی خاک کے پردے میں چُھپ جاؤں گا۔ ذاتی وجہ کی بات اپنی جگہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، میں نقوش کے کم و بیش تمام شماروں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرتب

لاہور نمبر نے، اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں شب و روز مسلسل محنت کی ہے اور اس نمبر میں اس نے ایسے علمی، تحقیقی اور معلومات افزا نوادرات، جمع کر دیئے ہیں جن کی اہمیت کسی دور میں بھی کم نہیں ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں، کہ نئے علمی اکتشافات سے لاہور سے متعلق نسل انسانی کی معلومات میں متواتر اضافہ ہوتا رہے گا یا اُن میں ترامیم بروئے کار آتی رہیں گی تاہم جو مقالات، مضامین تصاویر لاہور نمبر میں فراہم کر دی گئی ہیں، اُن کی اپنی اپنی انفرادی افادیت کبھی مجروح نہیں ہوگی۔

لاہور نمبر کے ابتدائی حصے میں لاہور کی مختلف تاریخی عمارتوں کی درجنوں کے حساب سے تصویریں دی گئی ہیں۔ تصویروں کے بعد اس نمبر کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ "لاہور کی سیاسی، ثقافتی اور علمی و ادبی تاریخ۔" یہ گویا ایک اشاریہ ہے نقوش کے لاہور نمبر کا اس سے آگے چلیں، تو لاہور کی ترتیب سامنے آتی ہے جو تیرہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

ترتیب پر پہلی نظر ڈالتے ہی احساس ہو جاتا ہے کہ لاہور نمبر واقعتہً لاہور کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جب سے لاہور وجود پذیر ہوا اور اب تک کہ لاہور ان گنت صدیوں میں سے گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لاہور کی سرزمین پر جو کچھ ہوا، جو کچھ کیا گیا اور جس جس نے کیا۔ یہ ساری روداد کہیں مختصراً اور کئی متعلقہ جزیات کے ساتھ بارہ سو صفحات کے اس لاہور نمبر میں سمو دی گئی ہیں۔

اس سے پیشتر کہ میں لاہور نمبر کے بعض پہلوؤں کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں طفیل صاحب کے اداریے 'طلوع' کی چند سطریں درج کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جس شخص کی بے پناہ جدوجہد نے اس نمبر کو زندگی کی روشنی اور حرارت دی ہے وہ خود اپنے اس کارنامے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ طفیل صاحب اپنے روایتی منکسرانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

"اگر میں اس نمبر کے بارے میں کچھ سچی باتیں بھی کہوں گا تو ایسے فقرے ضرور راہ پا جائیں گے جن سے کچھ میری تعریف اور کچھ اس نمبر کی اہمیت کے پہلو نکلیں گے۔ ایسی صورت میں سب ہی یہ کہیں گے۔ بنتا ہے، اس لئے مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ خاکساری کا وہ انداز اختیار کروں جو سب ہی کو بھائے۔ سو بندہ پرور! اس ہیچ مدان کی طرف سے عرض ہے کہ اس عاجز، ناچیز اور حقیر انسان نے جو یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے اسے لمبے چوڑے دعووں کی زد میں لاکر آپ کو بدمزا کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

میری ادنیٰ اسی کوششیں یہ تھیں کہ یہ نمبر اپنے مواد کے اعتبار سے، لاہور پر موجود کتابوں سے زیادہ وقیع، زیادہ جامع اور زیادہ متنوع ہو۔ اب دیکھ لیجئے کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ تکمیل کا دعویٰ مجھ ایسے ادارتی گنہگاروں کو زیب نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا ہے نا کہ طفیل صاحب کا اپنا انداز بڑا منکسرانہ ہوتا ہے۔ وہ خالص سونا بھی پیش کریں جب بھی ان کے نوکِ قلم پر یہ الفاظ

جاری ہوں گے۔ میرے عزیز دوستو! خاک چھانتا رہا ہوں، کچھ ذرے ذرا روشن مل گئے ہیں یہی پیش خدمت ہیں۔

طفیل صاحب کی خاکساری کے علاوہ ایک اور خوبی بھی بہت متاثر کرتی ہے اور وہ ہے ان کی اپنائیت، پہلے تو آپ سے دور رہ کر گفتگو کریں گے پھر یکایک آپ محسوس کریں گے کہ اس خاکسار نے تو اپنی باہیں آپ کے گلے میں ڈال دی ہیں اور اس طرح آپ سے باتیں کئے جا رہا ہے جیسے آپ اور اس کے درمیان من و تو کا کوئی پردہ ہی نہیں ہے اپنے اس طلوع میں بندہ پرور کہہ کر انہوں نے اپنی اس پرانی عادت کا ثبوت دے دیا ہے یا یوں کہئے کہ آزمودہ نسخہ استعمال کیا ہے یہ عاجز، ناچیز اور پُرتقصیر انسان آگے چل کر لکھتا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا اس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے گنہگار ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں۔"

سر سید احمد خاں نے کہا تھا۔ جب خدا مجھ سے قیامت کے روز پوچھے گا کہ کیا لائے ہو تو میں کہوں گا۔ میں نے حالی سے مسدس لکھوائی تھی۔" میرا خیال ہے بروزِ حشر، جب نفسی نفسی کی پکار مچی ہوگی۔ اللہ محمد طفیل سے یہ استفسار کرے گا جب تم نے خود اپنے پُرتقصیر انسان ہونے کا اعتراف کر لیا ہے تو تمہیں کیوں نہ سزا دی جائے اس وقت یہ بندہ عاجز جو اپنے معاملات میں بڑا ہوشیار اور کائیاں ہے بے تکلفانہ کہہ دے گا اللہ میاں! آپ نے میرا پورا اداریہ نہیں پڑھا۔ میں نے آگے چل کر یہ بھی تو کہا ہے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے اب مجھے مزید سزا کیا دیں گے۔

ویسے اللہ اور اس کے بندے کے معاملے میں بولنے والا کون؟ مگر دل کہتا ہے جس طرح دنیا میں طفیل صاحب لوگوں کو متاثر کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں، اللہ میاں کا دل بھی موہ لیں گے۔

اداریے کی آخری دو سطریں ضرور نقل کروں گا۔

"یوں تو ہر شہر شہر ہی ہے۔ مگر بعض شہر اپنی آغوش میں رہنے بسنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں، لاہور بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے، نقوش نے لاہور کا تاریخی اور تہذیبی سرمایہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"نقوش" کے اس بے نظیر نمبر کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ لاہور اپنے بسنے والوں کی جس تہذیب و ثقافت کا امین ہے اس کا ہر ہر رُخ، ہر ہر پہلو اور ہر ہر گوشہ نقوش کے صفحات میں محفوظ ہو گیا ہے۔

فہرست مشتمل ہے کم و بیش پینتالیس ابواب پر اور ہر باب اپنی جگہ لاہور کی تہذیب کا پس منظر و پیش منظر کی مفصل روداد سنا رہا ہے میں صرف چند ابواب کے صرف عنوانات پیش کروں گا اور انتہائی اختصار کے ساتھ ان کے بارے میں کچھ کہوں گا۔

پہلا باب ہے "لاہور۔ تاریخ قدیم کی نظر میں" اس کے مصنف لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید ہیں۔ یہ وہی خواجہ عبدالرشید ہیں جنہوں نے پنجاب کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اور جن کے کتب خانے میں کچھ لمحے گزارے جائیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم قوس قزح کی دنیا

میں آ نکلے ہیں۔ مہدی حسن نے نازنینانِ حرم کے جس 'لباس حریر' کا مزے لے کر ذکر کیا ہے وہ لباس حریر خواجہ صاحب کی کتابوں کو بھی زینت بخش رہا ہے۔

خواجہ صاحب نے ماضی کے کثیف اندھیروں میں اتر کر پرانے لاہور کے خدوخال پہچاننے کی سعیٔ بلیغ کی ہے پھر بھی آخر میں عُرفی کا یہ شعر لکھ دیتے ہیں ؎

بر افگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگراں را می پرستند

بہت سے پردے تو خواجہ صاحب نے اُٹھا دیئے ہیں مگر انہیں احساس ہے کہ ابھی اور پردے بھی اٹھیں گے اُنہوں نے بالکل درست کہا ہے کوئی پردہ بھی آخری پردہ نہیں ہوتا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر نے لاہور کی تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں چوتھی صدی ہجری سے آغاز تحقیق کیا ہے اور بتدریج آگے بڑھتے چلے گئے ہیں۔

لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ۔ نقوش کے لاہور نمبر کا طویل ترین باب ہے۔ اس باب کا آغاز غزنوی دور سے ہوتا ہے اور اختتام ہوتا ہے لاہور کے حاکموں، ناظموں اور نائب السلطنت لوگوں کی فہرست پر۔

اس سات آٹھ سو سال کی مدت میں لاہور کی سیاسی فضا نے کیا کیا رنگ بدلے اور سیاسی اقتدار پر کن کن شخصیتوں نے قبضہ کیا۔ لاہور کے افق پر کیسے کیسے آفتاب چمکے اور پھر کس کس طرح یہ آفتاب گہنائے گئے۔ یہ ساری داستان ضروری جزیات کے ساتھ الگ الگ ذیلی سرخیوں اور عنوانات کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ یہ داستان واقعی داستان جیسا لطف دیتی ہے

دوسرا باب مآثر یعنی لاہور کے باغات و مزارات سے متعلق ہے۔ یہ اس باب کا پہلا حصہ ہے اس کے دوسرے حصے کا عنوان ہے، شباب لاہور عہد مغلیہ میں۔ اس باب کے دونوں حصوں میں مزارات اور باغات کے تفصیلی کوائف درج کیے گئے ہیں۔ (شاید ہی کوئی ایسا مزار کسی بزرگ کا) یا ایسا باغ ہوگا جو کبھی تھا اور اب بھی اس کے آثار مل جاتے ہیں جس کا ذکر نہیں کیا گیا یہ باب انہی دو حصوں میں اختتام پذیر نہیں ہوتا بلکہ اگلے دو ابواب میں بھی یہی ذکر چلتا ہے اس کے بعد جو باب آتا ہے اس میں لاہور کے علماء کرام اور دینی مدرسوں کو موضوع فکر بنایا گیا ہے۔ مساجد کا باب کافی طویل ہے اس باب میں لاہور کی کم و بیش ان تمام مسجدوں کے تعمیری کوائف دیئے گئے ہیں جو ماضی میں بنائی گئی تھیں۔ ان مسجدوں کا دائرہ اذکار عہد غزنوی سے شروع ہوتا ہے اور زمانہ حال تک جاری رہتا ہے۔

کتب خانے کے باب میں لاہور کے کتب خانوں۔ ذاتی اور پبلک کا مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔

شاہی قلعے کے لئے ایک الگ باب متعین کیا گیا ہے اسی طرح عجائب گھر کا بھی اپنا ایک الگ باب ہے عجائب گھر کا ذکر ہو اور چڑیا گھر کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ ممکن نہیں چنانچہ ایک باب چڑیا گھر کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے دروازے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک باب میں لاہور کے تیرہ دروازوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

ایک خاصا طویل باب لاہور کے اکھاڑوں پر محیط ہے۔ اس باب میں مرحوم سراج نظامی نے لاہور کے تمام معروف اکھاڑوں اور ان اکھاڑوں کے ساتھ جو نامی گرامی پہلوان وابستہ تھے ان سب کے حالات کو اپنی تحریر میں سمیٹ لیا ہے ہر اکھاڑے کی ایک زندہ روایت تھی اور اس مضمون میں یہ ساری روایتیں درج کر دی گئی ہیں۔

مجھے خدشہ ہے کہ اگر میں فرداً فرداً ابواب کا ذکر کرتا ہوں تو صفحات کے صفحات فہرست سازی ہی میں صرف ہو جائیں گے۔ مختصر طور پر بلکہ بہت مختصر طور پر یہ عرض کروں گا کہ طفیل صاحب نے لاہور کی اجتماعی زندگی کے کسی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ یہاں تکیوں کا بھی ذکر ہے، میلوں ٹھیلوں کا بھی، ڈرامے اور تھیٹر کا بھی اور اس کے ساتھ فلم کا بھی۔ اس کے بعد کے باب میں اُن تمام مشہور اطبا کا بھی ذکر ملتا ہے جو عہد مغلیہ سے لے کر موجودہ دور تک اپنی اپنی زندگی میں طب کی ترقی و فروغ میں کوشاں رہے تھے۔

سرزمین لاہور کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس کی گود میں فارسی کے کئی جلیل القدر شعرا نے پرورش پائی ہے۔ ایک باب میں ان تمام معروف فارسی گو شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ کلام دیا گیا ہے لیکن اس پر اکتفا نہیں کیا گیہ فارسی شاعری میں جہاں جہاں بھی لاہور کا ذکر آیا ہے اس کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ لاہور کے ادیبوں، صحافیوں اور مصنفوں کی فہرست بڑی طویل ہے اور ہونی بھی چاہیے لاہور کی خاک سے ایسے ایسے نامور ادبا اُٹھے ہیں، جنہوں نے اپنے تخلیقی کارناموں سے جریدہ عالم پر شہرت دوام حاصل کر لی ہے لاہور کو صرف یہی امتیاز حاصل نہیں کہ اس کی اپنی خاک خاصی مصنف خیز واقع ہوئی ہے بلکہ اسے جائز طور پر یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے باہر سے آنے والے اہل علم و ادب کو انتہائی خلوص کے ساتھ گلے سے لگایا ہے۔ لاہور کا یہ کردار ہر اعتبار سے قابل صد تحسین ہے آج کتنے اہل علم دفن ہیں جنہیں اپنے دیس میں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں آئے اور لاہور کی علم پرور اور ادب پرور فضاؤں نے انہیں پرواز عطا کر دیا۔

طفیل صاحب نے لاہور کے گانے والوں، گانے والیوں اور گانوں کی طرزیں بنانے والوں کو بھی اپنے رسالے میں جگہ دی ہے اس طرح کلارنٹ نوازوں، پیانو نوازوں، نے نوازوں اور سرود نوازوں کا بھی خیر مقدم کر کے انہیں اپنی محفل میں شامل کر لیا ہے یہاں قوالوں کا بھی ذکر ملتا ہے اور غالب کی ستم پیشہ ڈومنی کی بھانجیوں، بھتیجیوں، پوتیوں اور نواسیوں کا حال بھی سچی بات یہ ہے کہ طفیل صاحب نے نقوش کے لاہور نمبر میں جو وسیع و عریض گلستان سجایا ہے اس کا کوئی پیڑ، کوئی پودا اور کوئی پھول ایسا نہیں ہے جسے فالتو یا بے کار سمجھا جائے ہر پیڑ کی اپنی شان ہے ہر پودے کی اپنی بہار ہے اور ہر پھول کا اپنا رنگ اور اپنی بو ہے۔ اور پھر پہلی بات سے بھی زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہر ہر پیڑ، پودے اور پھول نے گلستان کے مجموعی حسن میں ایسا اضافہ کیا ہے کہ یہ گلستان رشک ارم بن گیا ہے۔

استاد ذوق کی طرح یہ بھی کہہ سکتا ہوں۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق! اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

نقوش کے اس دقیع شمارے کا تصویری حصہ بھی بڑا شاندار ہے۔ یہ سب کی سب تصویریں تاریخی عمارتوں کی ہیں۔ پہلی تصویر شاہی مسجد کی ہے اور آخری تصویر شاعر مشرق علامہ اقبال کے مزار کی۔ بقول عبدالرحمٰن چغتائی کے اقبال اورنگ زیب کی بنائی ہوئی مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے آج بھی سلطان غازی کے قدموں کی چاپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

پہلے واقعے کے تین روز بعد پھر وہی چمکیلی کار اُردو بازار کے سامنے سڑک پر رک گئی ہے اور اس میں سے وہی نستعلیق، خوبرو اور خوش وضع صاحب اسی تیزی سے نقوش کے دفتر کی طرف قدم بڑھاتے ہیں جس تیزی کا مظاہرہ اُنہوں نے پہلے کیا تھا۔ طفیل صاحب تنہا سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مہاتما بدھ کے اس زمانے کا خیال آجاتا ہے جب وہ دنیاداری سے الگ ہو کر ایک بڑ کے پیڑ تلے گیان دھیان میں ڈوب گئے تھے۔

"طفیل صاحب! میں آج ہر قیمت پر نقوش کا لاہور نمبر وصول کر کے جاؤں گا۔"

طفیل صاحب تعظیماً کھڑے ہو گئے ہیں۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لاہور نمبر کی کوئی قیمت بھی ہو سکتی ہے" طفیل صاحب مسکرا کر پوچھتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ انمول چیز ہے۔"

"جب انمول ہے تو آپ مول کیا دیں گے؟

دونوں صاحب مسکرانے لگتے ہیں۔

طفیل صاحب دفتر کے ملحقہ کمرے میں جاتے ہیں اور خاکی رنگ کے ایک بڑے سے لفافے میں لپٹی ہوئی ایک شے لے آتے ہیں

"لیجئے صاحب۔"

"یہ کیا ہے؟"

"جو آپ طلب فرما رہے ہیں، یہ میرے ریکارڈ کا آخری پرچہ ہے جو پیش خدمت کر رہا ہوں۔"

آنے والے صاحب جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔

اس کی ضرورت نہیں اپنا ہاتھ جیب کی گرفت سے آزاد کر دیں اسے میری طرف سے تحفۂ محبت سمجھ کر قبول کر لیں۔"

"مگر کیوں طفیل صاحب؟" ان صاحب کے چہرے پر حیرت و مسرت کے وافر اثرات چھا گئے ہیں۔

"یہ اس لئے کہ آپ کی طرح میں نے بھی آواز دوست سُن لی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آپ نے پہلے سنی اور میں نے بعد میں۔"

ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے اور وہ صاحب پرچہ لے کر دفتر سے نکل جاتے ہیں طفیل صاحب پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کو اس پرچے کی خاص طور پر ضرورت کیا ہے۔ مگر وہ لوگوں کے ہجوم میں سے تیر کی طرح چلے جا رہے ہیں اور کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔

چند ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔

وہی چمکیلی کار لاہور کے عجائب گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی اس میں ایک تو وہ صاحب بیٹھے تھے جو دو مرتبہ نقوش کے دفتر میں نقوش کا لاہور نمبر حاصل کرنے کے لئے آئے تھے اور ان کے پہلو میں طفیل صاحب بیٹھے تھے۔

دونوں خاموش تھے اور کار درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

ریگل سینما سے آگے بڑھ کر کار اس مقام کے قریب رُک گئی' جہاں مسجد شہدا زیر تعمیر تھی۔

" آیئے طفیل صاحب"؟

طفیل صاحب کار میں سے اتر کر اُن کے ساتھ ادھر جانے لگے جدھر تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔

" طفیل صاحب!" وہ صاحب چند لمحے خاموش کھڑے رہنے کے بعد طفیل صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"جی فرمایئے"۔

"میں نے بڑے اصرار سے لاہور نمبر حاصل کیا ہے"۔

" چلیئے یونہی سہی"۔

میرا اصرار بالکل بجا تھا۔ اور جب آپ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی' تو آپ میرے اس اصرار کو بالکل حق بجانب سمجھیں گے۔ طفیل صاحب' یہ آپ دیکھ رہے ہیں' مسجدِ شہداؑ زیر تعمیر ہے۔ اس کی تعمیر کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے' اس کی بنیادیں' میں ایک ایسی چیز رکھنا چاہتا تھا جو ہر طرح اللہ کے گھر کے شایان شان ہو' اور یہ اللہ کی کتاب کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ تو میں نے یہاں قرآن پاک کی ایک بہت خوبصورت جلد رکھ دی تھی۔ اور اس کے ساتھ آپ کے نقوش کا لاہور نمبر بھی — جو لاہور کے ماضی اور حال کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے

طفیل صاحب۔ خاموشی سے یہ الفاظ سن رہے ہیں۔

" مسجد کی بنیاد میں ایسے مصالحے استعمال کئے گئے ہیں کہ صدیوں پر صدیاں گزر جائیں قرآن پاک اور نقوش کا ایک صفحہ بھی داغدار نہیں ہو گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں نقوش کے لاہور نمبر کا یہ مصرف غیر مناسب ہے؟ صدیوں بعد' ہو سکتا ہے' اس کی کھدائی ہو اس وقت بھی یہ دونوں چیزیں بالکل محفوظ ہوں گی"۔

طفیل کے ہونٹ تھر تھرانے لگتے ہیں۔

" مختار مسعود صاحب! آپ مصرف کی بات کرتے ہیں۔ آپ نے تو آج مجھے وہ کچھ دے دیا ہے' جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے لاہور نمبر کے بدلے میں ساری دنیا میری جھولی میں ڈال دی ہے یہ سعادت' یہ سرفرازی' یہ عظمت' محنت کا یہ اجر جو مجھے مل گیا ہے' میرے خواب و خیال سے بھی بہت

زیادہ ہے۔ مسجد کی بنیاد میں میرا پرچہ رکھا جائے، یہ تو میری انتہائی خوش قسمتی ہے۔ میرے پرچے میں میرا دل بھی دھڑکتا رہے گا۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔“

اور طفیل صاحب کو لفظوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ فرطِ تشکر سے اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"نقوش" کا آپ بیتی نمبر — محمد طفیل کا ایک بے مثل کارنامہ

ڈاکٹر انور سدید

جون ۱۹۶۴ء میں جب نقوش کا ۱۹۶۴ صفحات پر مشتمل آپ بیتی نمبر شائع ہوا تو محمد طفیل کو اس عظیم ادبی پرچے کی ادارت سنبھالے قریباً تیرہ سال ہو چکے تھے اور اس کے ۷۴ خاص شمارے (اکیس ہزار صفحات) جن میں غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، دس سالہ نمبر، پطرس نمبر، ادب عالیہ نمبر، لاہور نمبر، شوکت تھانوی نمبر، افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء پنج سالہ نمبر ۱۹۵۳، افسانہ نمبر ۱۹۵۴، خاص نمبر ۱۹۵۹، افسانہ نمبر ۱۹۶۰ اور سالنامہ ۱۹۶۲ شامل ہیں منظر عام پر آ کر ادب کی مجلاتی دنیا میں انقلاب بپا کر چکے تھے۔ اتنے ضخیم نمبروں کی اشاعت کے بعد بظاہر نظر آتا تھا کہ اب کوئی موضوع ایسا باقی نہیں رہا جس پر وقیع ضخامت میں خاص نمبر پیش کیا جا سکے لیکن جن لوگوں نے محمد طفیل کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی جنوں سامانی ہمیشہ نئے جادے تلاش کر لیتی تھی۔ اپنی اس انفرادیت کا شاید انہیں اپنی زندگی میں ہی عرفان ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے نقوش کے ایک خاص نمبر میں اس کی تمثیلی وضاحت بھی کر دی کہ

> "میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چل جا رہی ہیں اور چلی جا رہی ہیں۔ یوں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ان اِکا دُکا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی جو قطار سے الگ، مخالف سمت چلی جا رہی ہوں۔ میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں، قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ ان اکا دکا اداس، پریشان، گرم حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں۔ مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رخ کیا جائے۔" (۱)

محمد طفیل کی یہی روش تھی جس نے انہیں اس بات پر غور کرنے کی اجازت نہ دی کہ

"چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

اور وہ ہواؤں کا رُخ دیکھے بغیر ہی نئے نئے چراغ جلانے میں مصروف رہے۔

"آپ بیتی" نمبر کی اشاعت بھی ایک ایسا ہی منصوبہ تھا جس پر اردو ادب میں اس سے پہلے اتنا مربوط کام نہیں ہوا تھا لیکن ٹھہریئے، مجھے اپنے اس بیان میں تھوڑی سی ترمیم کر لینے دیجئے۔ آپ بیتی نمبر اگرچہ موضوع کے اعتبار سے ایک نیا منصوبہ

۱۔ محمد طفیل، نقوش آپ بیتی نمبر. تصریحات ۔ ص ن ۔ لاہور ۱۹۶۴

تھا لیکن نوعیت کے اعتبار سے یہ مکاتیب نمبر اور شخصیات نمبر کے سلسلے کی ہی ایک کڑی تھا۔ فرق یہ کہ خطوط نمبر میں مصنفین کی ذات کی قاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دل کے ٹکڑے ہزار ہوتے تھے۔ کوئی یہاں گرا تھا، کوئی وہاں گرا تھا اور انہیں جمع کر کے انہیں مربوط بیانیہ میں ڈھالنا بے حد مشکل تھا۔ دوسری طرف شخصیات نمبر میں سوانح اور سیرت نگاری کا فریضہ مصنف کے بجائے ان کے احباب نے سرانجام دیا۔ یہ کام سوانحی نوعیت کا ضرور تھا۔ لیکن بیشتر مصنفین نے اپنے ممدوحین کو تحسین آمیز زاویوں سے دیکھا اور ان کی روشن تصویریں بنانے کی کوشش کی۔ خودنوشت سوانح میں مصنف اپنا محاسبہ خود کرتا ہے اور اپنی ذات کے ایسے گوشوں کو بھی منظرِ عام پہ لے آتا ہے جن تک مصنف کے دوستوں کی رسائی بھی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ شخصیات نمبر اور مکاتیب نمبر کے تجربے سے محمد طفیل کو مصنفین کے باطن میں جھانکنے کا جو شوق پیدا ہوا تھا اسی نے ان کو مصنفین اور ناموران عالم کی اس صورت کو دیکھنے کی ترغیب بھی دی ہوگی جو خود ان کے اپنے آئینہ قلم سے منعکس ہوتی تھی اور جسے اصطلاح ادب میں آپ بیتی کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل کچھ اس کی فنی وضاحت ———

آپ بیتی کیا ہے؟ ——— اس کی تعریف محمد طفیل نے مختصر لفظوں میں یوں کی ہے

> "آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم وکاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں۔" (۱)

آپ بیتی کے لئے شخصیت کا بڑا ہونا بہت اہم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ خود نوشت سوانح پیش کرنے والی شخصیت نے بھرپور زندگی گذاری ہو اور وہ اسے صداقت سے پیش کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ وجہ یہ کہ زندگی کو جب اندر سے ٹٹولا جائے تو اس میں سلسلہ در سلسلہ ناکامیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا اور ناکامیوں کی تلخی میں شرکت کرنا عام لوگوں کو قبول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جارج آرویل نے کہیں لکھا ہے کہ خودنوشت سوانح پر صرف اسی وقت اعتماد کیا جاسکتا ہے جب اس میں کوئی بڑی خوفناک حقیقت پیش کی گئی ہو۔[۲] حقیقت کی خوفناکی کو آشکار کرنے کا عمل بالواسطہ زندگی کے عمل کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ محمد طفیل نے اس عمل کو نسبتاً مختلف زاویے سے دیکھا اور لکھا کہ

> "میرے نزدیک کسی کا مرنا اور جینا اس کے مقاصد اور اس کے کام پر منحصر ہوتا ہے جتنے لوگ چل پھر رہے ہیں، مجھے انہیں زندہ سمجھنے میں تامل ہے اور جتنے لوگ مرے ہوتے ہیں مجھے انہیں مردہ

۱۔ محمد طفیل۔ نقوش آپ بیتی نمبر۔ تصریحات۔ ص۔ ن۔ لاہور ۱۹۶۴

۲۔ بحوالہ ڈیرک سٹینفورڈ۔ ہفت روزہ سٹیٹسمین۔ ۱۶، مئی ۱۹۸۵۔ کراچی

سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔" (۱)

بظاہر اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ جو لوگ بے مقصد زندگی گزارتے ہیں وہ سانس لینے کے باوجود زندوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں اور جس شخص نے کسی بڑے مقصد اور عظیم نصب العین میں زندگی گزار دی وہ بساطِ حیات سے اٹھ جانے کے باوجود زندوں میں شمار ہونے کا حقدار ہے۔ انہیں لوگوں کی آپ بیتی درحقیقت زندگی کے حقیقی تجربات کی عکاس اور مستقبل کی راہنما ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محمد طفیل کا مقصد انہیں لوگوں کو منظرِ عام پر لانا تھا۔ اس ضمن میں محمد طفیل کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی آپ بیتی نمبر کی اشاعت کے مقصد کی طرف بلیغ اشارہ کرتا ہے۔

> " زندگی تو اپنا ایک دستور العمل لے کر آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ جو لوگ گزرے ہوئے لمحات کو پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کی نہ تو زندگی زندگی ہوتی ہے اور نہ مستقبل کوئی مستقبل۔ ویسے اس دنیا کے رہنے والے بڑی دلچسپ چیز ہیں ——— ان کے نزدیک اچھا آدمی وہ ہے جو مر چکا ہو یا وہ جو ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہو[2] ——— !"

بالفاظِ دیگر آپ بیتی انہیں لوگوں کی دل نشیں ہوتی ہے جنہوں نے زندگی کے دستور العمل سے ہٹنے کی کوشش کی ہو اور جن میں یہ اہلیت بھی ہو کہ وہ گزرتے ہوتے لمحات کو پڑھ کر ان کا تجزیہ بھی کر سکیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے شیخ علی حزیں کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> "کارگاہِ آفرینش میں انسان کے لئے تحصیلِ عبرت سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ کوئی نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ دانشمندوں اور وقت کی قدر و قیمت پہچاننے والوں میں سے ایک گروہ نے کتبِ تاریخ کی تدوین اور احوالِ نیک و بد کی تحریر و تسوید میں اوقاتِ حیات صرف کیے۔ خود میں نے اپنی سرگزشت پر نظرِ بازگشت ڈالی تو اسے فائدۂ عبرت سے خالی نہ پایا[3]۔"

میرا خیال ہے کہ محمد طفیل کا ایک مقصد تو یقیناً ایسا سوانحی سرمایہ جمع کرنا تھا۔ جس سے عبرت کے علاوہ زندگی کے سابقہ تجربات کا تجزیہ بھی کیا جا سکے اور یہی وجہ ہے کہ محمد طفیل نے آپ بیتی نمبر کو چار سو سالہ شخصی تاریخ کی دستاویز شمار کیا ہے۔ ان کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ ۲۴۴ عظیم شخصیات کے خود نوشت سوانح سے ان شخصیات کے نقطۂ نظر، طرزِ حیات، نظریات اور مسائلِ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے اسلوب کا موازنہ، ان کے حسن و قبح کا تجزیہ اور ان کی کامرانی یا ناکامی کا ادراک پیدا کیا جا سکے۔ چنانچہ نقوش آپ بیتی نمبر کی ایک منفرد خصوصیت مجھے یہ نظر آئی ہے کہ اس میں دو سو چوالیس عظیم شخصیتوں کی انجمن سجائی گئی ہے۔ یہ دانشورانِ عالم آپس میں متصادم نہیں ہوتے بلکہ اس اسلوبِ حیات کو آشکار کرتے ہیں جسے قبول کر کے انہوں نے جریدۂ عالم پر مستقل نقوش

---

[2] محمد طفیل۔ تصریحات۔ آپ بیتی نمبر۔ ۱۹٦۴ء۔ لاہور

[3] مولانا غلام رسول مہر۔ آپ بیتیوں کی اہمیت۔ نقوش شمارہ ۱۰۰۔ ص ۳٦

قائم کر دیئے تھے اور اب اپنی اپنی آپ بیتیوں میں اپنے تجربات کی زنبیل کا منہ ہمارے سامنے کھول رہے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی میں کامرانیاں حاصل کرنے اور بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ان زعما کو اپنی داستانِ حیات قلم بند کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں داستان یا افسانے کا کوئی عنصر موجود ہوتا ہے اور ہر شخص اس کہانی کو سنانے کا آرزومند ہوتا ہے؟ ——— اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ

> "اپنی تمام تر انکساری کے باوجود ہر شخص خود کو "مرکزِ دو عالم" سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کو جھاڑ پونچھ کر اس طور پیش کرے کہ وہ پراسرار یا کرشماتی نظر آنے لگے!" (۱)

مولانا علم الدین سالک نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

> "آپ بیتی افسانے کا رنگ رکھتی ہے۔ مگر افسانہ نہیں ہوتی۔ افسانہ خیالی ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہوتی ہے۔ اس میں صحتِ واقعات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ اس میں لکھنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اس انداز میں لکھے کہ یہ آرٹ کا دلکش مرقع بن جائے۔" (۲)

مولانا علم الدین سالک نے آپ بیتی میں حقیقت کو فوقیت دی ہے۔ لیکن عملی طور پر حقیقت کی نقاب کشائی ایک خاصہ مشکل عمل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس راہ کے کانٹوں کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔ آپ بیتی میں "اگر گویم زباں سوزد" کی عقوبت ہر ہر گام پر زنجیر پا بن جاتی ہے۔ سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغے سے کام لیتا ہے۔" (۳)

خود نمائشی کی جو صورتیں خود نوشت سوانح اور آپ بیتی میں در آتی ہیں۔ ان کی توضیح ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں کی ہے

> "بعض لوگ جن کی زندگیوں میں سیاست ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اپنی کہانی سناتے ہوئے درپردہ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ تاریخ میں ان کا کیا مقام ہے۔ بعض دوسرے اپنے کردار کی اس سختی یا توانائی کو بیان کرتے ہیں جس کے طفیل وہ زمانے سے متصادم ہو کر ذرے سے آفتاب بن گئے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بے باکی اور صاف گوئی کو اپنا مسلک قرار دیتے ہوئے اپنے کردار کے ان پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں جو

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ "شام کی منڈیر سے" (آپ بیتی)، مکتبہ فکر و خیال۔ لاہور ۱۸۔ ص۷۔ لاہور ۱۹۸۷

۲۔ مولانا علم الدین سالک۔ نقوش شمارہ ۱۰۰۔ آپ بیتی نمبر۔ ص ۴۰

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۶۱

> خلقِ خدا کی نظروں میں گردن زدنی قرار پاسکتے ہیں، مقصود ان کا بھی شخصیت کو ابھارنا ہی ہوتا ہے۔ گو وہ یہ کام بظاہر اپنی شخصیت کی نفی سے سرانجام دیتے ہیں۔" (۱)

نقوش کے آپ بیتی نمبر میں اپنی کہانی سنانے کے یہ تمام زاویے مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان کا ت کیا جائے تو بعض حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ آپ بیتی صرف ادیبوں کا سوانحی مرقع نہیں۔ بلکہ اسے نامورانِ عالم کا شخصیت نامہ بنانے کی کاوش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس میں امیر تیم گورگانی، ظہیر الدین بابر، گلبدن بیگم، واجد علی شاہ، سرسید احمد خان، حضرت قائدِ اعظم، علامہ اقبال جیسے لوگوں کے نقوشِ حیات موجود ہیں تو ہٹلر، مسولینی، چرچل، نہرو، ملکہ ایلزبتھ، ٹراٹسکی، رادھا کرشنن، برنارڈ شا، ونگ چے، فنڈی کو غلو، جان اپڈائیک، گورکی ا من ستھ ناتھ گپت کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

اس خاص نمبر میں سب سے پہلے جو دو رویّے سامنے آتے ہیں وہ مشرق اور مغرب میں زندگی گذارنے کے رویّے ہی اور انہیں سے خود نوشت سوانح لکھنے کے دو مختلف اسلوب بھی آشکار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مغرب میں چھوٹی چھوٹی حقیقتو بے کراں مسرتیں سمیٹنے کا انداز نمایاں ہے۔ مغرب کے دانشوروں کے نزدیک حال کا لمحہ مسرّت افزا اور خوشیوں سے لبریز ہے اور یہ انہیں جہاں بھی نظر آتی ہے۔ مغرب کے لوگ اسے اپنے اوپر نچھاور کر لیے اور پھر اس میں شرابور ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ض میں مندرجۂ ذیل اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

> „ مجھے یاد نہیں کہ میں نے مسرت پر کبھی اعتبار کیا ہو۔ اگر یہ اب گزرتی ہوئی ساعتوں میں موجود نہیں تو میں اسے اس کے باہر کہیں اور تلاش نہیں کروں گا۔ مجھے گذرتے ہوئے لمحے سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں چونکاتی۔ ڈوبتا ہوا سورج ہمیشہ میری ذہنی کیفیت بحال کر دیتا ہے۔ یا اگر ایک چڑیا میری کھڑکی کے سامنے آجائے تو میں اس کی زندگی میں شریک ہو جاتا ہوں اور اس کے ساتھ مل کر زمین پر دانہ دنکا چگنے لگتا ہوں۔" (۲)

* * *

> "گاڈز لٹل ایکر" کے آخری صفحے کے آخری پیراگراف کے آخری جملے کے آخری لفظ کی نگارش میری اس وقت تک کی تخلیقی زندگی کا سب سے زیادہ طمانیت بخش تجربہ ہے۔ اپنے کام سے میں " ٹوبیکو روڈ" سے بھی زیادہ خوش تھا۔ اس وقت اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے یہ محسوس کیا کہ خود کو پیشہ ور ناول نگار سمجھ سکتا ہوں۔" (۳)

* * *

---

۱. ڈاکٹر وزیر آغا۔ " شام کی منڈیر سے "۔ ص ۷

۲. جان کیٹس۔ آپ بیتی نمبر۔ نقوش۔ شمارہ ۱۰۰۔ ص ۹۷۴

۳. ایرسکن کاڈویل۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۹۷۱

> "اسی دور کا خوش گوار واقعہ ہے کہ ایک لڑکی مس میری ہیننگٹن سے ملاقات ہوئی۔ چند ہی روز میں یہ رسمی سی ملاقات ہم دونوں کے جذبات کو گدگدانے لگی۔ ملاقاتیں بڑھیں اور ہم راہِ زیست کے ہم سفر ہو گئے۔ آج وہ لڑکی میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ ہم میاں بیوی ابھی جوان تھے۔ ہمارے ولولے بھی پرشباب تھے۔ میری بیوی میری زندگی کی ہی نہیں میرے ذوق، میرے خبط اور میرے مشاغل کی بھی ہم رکاب تھی۔ ہم دونوں نے ایک برس تک آکسفورڈ انگلینڈ کے رسکن سکول میں ڈرائینگ اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کی اور ہم واپس امریکہ چلے آئے۔" (۱)

برصغیر پاکستان اور ہندوستان کے دانش وروں میں لمحے سے خطا اٹھانے کا رجحان نسبتاً کم ہے۔ یہاں معاشرہ محتسب کا کردار سرانجام دیتا ہے اور دانشور اپنی تمام تر آزادہ خیالی کے باوجود معاشرے سے خوفزدہ نظر آتا ہے اور بقول سید عبداللہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست تیار کر سکتا ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال کا منصف بن سکتا ہے۔ نقوش کے آپ بیتی نمبر سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ بہت سے ادیبوں نے صرف وہی باتیں لکھنے یا کہنے کی سعی کی ہے جنہیں معاشرہ بلا تامل قبول کر سکتا ہے اور جن میں خوفِ فسادِ خلق کا خطرہ موجود نہیں۔ اس سلسلے میں آزادیِ فکر و نظر کے ایک بڑے علمبردار جناب نیاز فتح پوری کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے

> "میری زندگی تمام تر خطرات ہی میں بسر ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ میرا پاکستان آ جانا بھی ایک ایڈونچر ہی ہے جس میں عورت اور مولوی کے علاوہ بہت سی اور باتیں بھی شامل ہیں..... آپ کو کیا خبر کہ اس وقت تک میں نے کتنے گناہ کئے ہیں اور ان سے زیادہ کتنے ناکردہ گناہوں کی حسرت اب بھی دل میں لئے ہوئے ہوں..... کیا ان سب کو اپنی سوانح سے علیحدہ کر دوں اور اگر ایسا کروں تو پھر مجھ میں کیا رہ جائے گا ——— پروانہ ہوں" نیمہ داغ و نیمہ خاکستر" اسی حال میں اسے رہنے دیجئے۔ چھیڑئیے نہیں!" (۲)

نیاز فتح پوری کی زندگی واقعی داستانِ ہوشربا تھی لیکن نقوش کے آپ بیتی نمبر میں انہوں نے اس داستان کا جو باب رقم کیا ہے اس میں ہوشربا عناصر قطعاً موجود نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی نیاز فتح پوری اپنی اس آپ بیتی میں بھی نظر سے اوجھل رہتا ہے مشرق کی خود نوشت میں حقیقت کے نوکیلے کناسے ابھارنے، واقعہ کو مخصوص صورت دینے اور حقیقی کرداروں سے آشکار کرنے کی بجائے غزل کے اشعار کی طرح اسے عمومی بنانے اور اجمال کی بیضوی صورت میں پیش کرنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال رشید احمد صدیقی کی خود نوشت سوانح کے مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجئے۔

> "رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف سے گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے ماں باپ، بھائی بہن ——— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی

۱۔ جان اپڈائیک۔ نقوش آپ بیتی نمبر۔ ص ۹۸۴

۲۔ نیاز فتح پوری۔ ایضاً ص ۱۰۰۱

محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزت اور خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی ۔" (۱)

ماحول کی جبریت اور تنقید و تفحیص بے جا کا ایک زاویہ عصمت چغتائی کی آپ بیتی سے بھی نمایاں ہوتا ہے ۔ اقتباس دیکھئے ۔

> " ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پدرم پور اپنی ننہیال والوں پر گئی ہوں ۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے ۔ مگر ننہیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں ۔ وہی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان ۔ چنگیز خان کی اولاد سے اور کیا امید کی جاسکتی تھی ۔ لیکن اگر کوئی اماں کو پوچھتا کہ "بیٹی کو کیا ہو گیا ہے ؟" تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "نہ ددھیال کا قصور نہ ننہیال کا ۔ یہ سب نصیب کا پھیر ہے ۔" ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں ۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی ۔ قطعی ٹیڑھا نہ تھا ۔ ضرور پالنے پوسنے میں کوئی چوک ہوگی ۔" (۲)

محمد طفیل نقوش کے آپ بیتی نمبر میں مشرق اور مغرب کے مشاہیر کی آپ بیتیوں کو ایک ساتھ شائع نہ کرتے تو متذکرہ بالا قسم کے تجزیے کا امکان معدوم ہو جاتا اور اس قسم کے مطالعے کے لئے متعدد کتب خانے کھنگالنے پڑتے ۔

نقوش کا آپ بیتی نمبر مشاہیر کے شخصی مطالعے میں جو معاونت فراہم کرتا ہے اسے شخصیات کی سماجی حیثیت کے مختلف زاویوں سے بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔ اس خاص نمبر میں سربراہانِ مملکت (قائداعظم ، ایوب خان ، بابر ، ٹراٹسکی ، جمال عبدالناصر ، رضا شاہ پہلوی وغیرہ) ۔ اولیاء و صوفیہ (داتا گنج بخش ۔ مجدد الف ثانی ، شاہ محمد غوث ، امیر خسرو ، غوث علی قلندر ، مولانا اشرف علی تھانوی) علماء (شیخ عبد محدث دہلوی ، مولانا حسین احمد مدنی ، عبدالماجد دریا بادی ، ابوالاعلیٰ مودودی) ۔ مؤرخ (ملا عبدالقادر بدایونی ، جسٹس امیر علی ، مولو کریم الدین ، لالہ سری رام ، عبدالرزاق کانپوری وغیرہ) ۔ مصلحین و سیاسین (سر سید احمد خاں ۔ گاندھی ۔ محمد علی جوہر ، علامہ اقبال ، راجہ غضنفر خان ۔ ڈاکٹر اشرف ۔ شورش کاشمیری وغیرہ) ادباء و شعراء (روسو ، دستووسکی ، میر تقی میر ، غالب ، شیفتہ ، محمد حسین آزاد ، آغا حشر ، حسرت موہانی ، کرشن چندر ، منٹو ، شکیلہ بانو ، ممتاز مفتی ، نثار احمد فاروقی ، کنہیا لعل کپور ، شاہد احمد دہلوی وغیرہ) کو شامل کیا گیا ہے چنانچہ ان شعبہ ہائے حیات کے مختلف نقوش ان کے کرداروں سے اخذ کرنے کا موقع بھی اس ایک نمبر کے مطالعے سے ہی مل جاتا ہے ۔ اس ضمن میں سب سے پہلے قائداعظم کے کردار کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے

> " بمبئی کے محکمہ جوڈیشل کے انچارج سر چارلس رولینوٹ کی پندرہ سو روپیہ ماہوار گریڈ کی مستقل ملازمت کی پیش کش ٹھکرا دینے کے دو سال بعد جب سر چارلس انگلستان سے واپس آئے جہاں وہ پنشن پا کر جا چکے تھے تو اورینٹ کلب کے ایک جلسہ میں اتفاقاً میری ملاقات ان سے ہوئی ۔ خود اٹھ کر میرے پاس آئے

۱۔ رشید احمد صدیقی ۔ نقوش آپ بیتی نمبر ۔ ص ۱۰۰۷

۲۔ عصمت چغتائی ۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۲۷

اور پوچھا۔ کیسے گذرتی ہے؟" میں نے کہا" خدا کا شکر ہے ! پوچھا "آمدنی کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا
"دو ہزار روپیہ سے زیادہ کما لیتا ہوں" یہ سن کر بہت خوش ہوتے اور کہنے لگے
شاباش مجھے مسرت ہے کہ تم نے میری پیش کش ٹھکرا دی" (۱)

اور اب پنڈت نہرو کے کردار کی ایک جھلک دیکھئے۔

"اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور اباجان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انہیں اور ان کے دوستوں کو دیکھا کرتا تھا...... مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپے کا داؤ لگاتا تھا۔ پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا" (۲)

نقوش چونکہ ادبی پرچہ ہے اس لئے اس میں ادبا کو غالب حیثیت دی گئی ہے اور نہ صرف قدیم ادبا کی آپ بیتیاں شامل اشاعت کی گئی ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے بہت سے معروف ادبا سے ان کے خود نوشت سوانح حیات بھی لکھوائے گئے ہیں۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ اردو ادیبوں سے نثر لکھوانا کتنا مشکل کام ہے۔ محمد طفیل نے محبت کی اس مشقت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ مسلسل یاد دہانیوں سے متعدد ادبا سے ان کے سوانح حیات حاصل بھی کئے البتہ اس کے لئے انہیں آپ بیتی نمبر میں ادبا کے مقام اور مرتبے اور تقدیم و تاخیر کے آداب کو خیر باد کہنا ضروری ہو گیا۔ تصریحات میں اس مشکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد طفیل نے لکھا ہے کہ

"اس نمبر کی ترتیب یہ ہے کہ کوئی ترتیب نہیں ——— جیسے جیسے مضمون ملتے گئے۔ ہم انہیں چھاپتے رہے۔ اگر اس امر کا انتظار کرتے کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر آئے تو اس کے لئے ابھی اور کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ چونکہ معاملہ انتظار اور صبر کی حدود پھاند چکا تھا اس لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہم مضمون آخر میں چلے گئے۔ اب تو ترتیب صرف فہرست میں ملے گی"۔ (۳)

اس تکنیکی مجبوری سے قطع نظر آپ بیتی نمبر بنگالی، فارسی، عربی، گجراتی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، چینی، ترکی، ہیبریو اور ولندیزی زبانوں کے ادیبوں کے سوانحی حالات کی خود نوشت ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کو تراجم کے ذریعے مرصع اردو میں اس طرح منتقل کیا گیا ہے کہ یہ اردو ہی کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں۔ ایک اور خوبی یہ کہ اردو میں آپ بیتی نمبر کی اشاعت تک جتنی آپ بیتیاں موجود تھیں ان سب کے لئے اس خاص نمبر میں مناسب جگہ نکالی گئی ہے۔ مختصر آپ بیتیاں من و عن چھاپ دی

۱۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ نقوش آپ بیتی نمبر۔ ص ۲
۲۔ جواہر لعل نہرو۔ ایضاً ص ۹۶۴
۳۔ محمد طفیل۔ تصریحات۔ حوالہ ایضاً۔

گئی ہیں اور ضخیم آپ بیتیوں کی تلخیص شاملِ اشاعت کی گئی ہے اہم بات یہ ہے کہ بعض آپ بیتیاں جن میں محمد دین فوقؔ کی آپ بیتی بالخصوص قابلِ ذکر ہے مخطوطے کی صورت میں دستیاب ہوئی۔ محمد طفیل نے آپ بیتی نمبر میں اس قسم کے نوادرات کو بھی نمایاں جگہ دی ہے۔ اس نمبر کو جامع، بامعنی اور نمائندہ بنانے کے لئے بعض نامور ادبا جن میں علامہ اقبال، مولانا سلیمان ندوی، شیخ عبدالقادر بالخصوص اہم ہیں کی سوانح عمریاں ان کے خطوط، سفرناموں اور مضامین سے اس طرح اخذ کی گئی ہیں کہ انہیں بجا طور پر ان ادبا کی خودنوشت قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ سب اجزا آپ بیتی نمبر کو گرانقدر اور وقیع بنانے میں معاونت کرتے ہیں اور انہیں تلاشِ بسیار کے بعد اس ایک نمبر میں مجتمع کرنے میں محمد طفیل نے جو محنت کی ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ تاہم میری نظر میں ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زندہ ادیبوں سے بھی اپنی سوانح خود ان کے قلم سے لکھوائی اور انہیں اپنے بارے میں سچ بولنے کا ایک موقع فراہم کیا۔

> یہ بات شاید مشفق خواجہ نے لکھی تھی کہ : "آپ بیتی لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ جھوٹ بولنا بعض لوگوں کے لئے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے مشکل اس لئے کہ سچ بولنا اور وہ بھی اپنے بارے میں، دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔" (۱)

نقوش کی آپ بیتیوں کا تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ادیبوں نے بیشتر انکسار سے کام لیا ہے اور تزئین و تجمیلِ ذات کی کاوش بہت کم کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب اردو ادبا زندگی کی کامرانیوں ہی سے سرفراز ہوئے اور انہیں ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا۔ اس آپ بیتی نمبر میں متعدد ایسے لوگوں کی سوانح بھی موجود ہے جنہیں عمر بھر ناکامیوں سے ہی پالا پڑتا رہا لیکن جب ان ناکامیوں کے ذکر کا موقعہ آیا تو انہوں نے محرومیوں کے ازالے کی کوشش بہت کم کی ہے اور آپ بیتی کو واقعاتِ حیات کا عکس بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور زندگی کی ظاہری سطح کو ہی آشکار نہیں کیا گیا بلکہ اپنے داخل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے اور بعض انکشافات تو اتنے دلچسپ ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد ادبا کی تحریریں ایک نیا تناظر ہمارے سامنے مرتب کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے ایک مثال منٹو کی آپ بیتی سے ملاحظہ کیجئے۔ صیغہ واحد غائب میں منٹو کی خود انکشافیاں ———

> "جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۸۶ ۷ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ ——— اور یہ شخص جو اکثر خدا کا منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔ اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب میں بیان کئے دیتا ہوں ——— وہ چور ہے ——— جھوٹا ہے ——— دغا باز ہے ——— اور مجمع گیر ہے ——— اور اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے

۱۔ کالم "زندگی کوئی چھوت کی بیماری نہیں" از مشفق خواجہ۔ (خامہ بگوش) تکبیر کراچی۔ ص ۴۸

فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑاتے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کر دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا …… وہ ایک ایسا پاپی انداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے ——— !" (۱)

منٹو کی اس آپ بیتی میں اگرچہ صداقت کا عنصر موجود ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بڑے افسانہ نگار کی حیثیت، اس نے حقیقت کو افسانہ بنانے کی کاوش زیادہ کی ہے اور اس طرح منٹو پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے میں کامیاب ہے۔ چنانچہ جب وہ لکھتا ہے کہ منٹو ایک بڑا مجمع گیر ہے تو اس کا یہ انکشاف حقیقت سے بعید نظر نہیں آتا لیکن اس سے منٹو بہت کم نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسا فطری انسان نظر آتا ہے جسے رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکانا ممکن نہیں۔

میرزا ادیب کا ذہن رومانی خوابوں کا خزینہ ہے۔ آپ بیتی نمبر میں انہوں نے اپنے ایک ایسے خواب سے ہی عمرِ رفتہ کو زدی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

> "جب میں نے (شاہی قلعے کی) سیڑھیوں کے نیچے سڑک پر قدم رکھا تھا تو دور سے بانسری کی آواز سنی تھی۔ بانسری مجھ پر گہرا اثر کرتی ہے۔ عجیب درد ہوتا ہے اس کی آواز میں۔ میں چلا جا رہا تھا اور یہ آواز کانوں سے ہوتی ہوئی میرے دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا قدم اٹھا رہا تھا کہ یکایک ایک بڑی میٹھی، مترنم اور دلآویز آواز لہرائی ——— " تو کیا صحرانوردی کرو گی ؟" میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک لڑکی چہرے سے نقاب ہٹائے اپنی سہیلی سے مخاطب تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں ——— نگاہیں اٹھائیں ——— محجوب ہی ——— ایک بار پھر دیکھا اور چہرے پر نقاب پھیلا دیا ——— ابدیت کے سمندر سے ایک موج اٹھی اور مجھے بہا کر نہ جانے کہاں لے گئی ——— ایک نغمہ بلند ہوا اور افق تا افق میری کائنات پر چھا گیا۔ ایک ستارہ فضا میں چمکا اور میری روح میں سما گیا۔" (۲)

اس خواب نے میرزا ادیب کو صحرانورد کے خطوط لکھنے پر مائل کیا۔ وہ لڑکی عمر بھر میرزا ادیب کا تعاقب کرتی رہی اور ایک وہ خود بھی صحرانورد بن گئے۔ اس ضمن میں ان کا یہ انکشاف کتنا معصومانہ اور بے ضرر ہے کہ

> "میں نے زندگی بھر صحرا نہیں دیکھا۔ صحرا تو ایک طرف کبھی کوئی گھنا جنگل بھی نہیں دیکھ سکا یہ محض تخیل کی پرواز تھی کہ مجھے صحراؤں میں لے گئی۔ میں نے "صحرانورد کے خطوط" کی بیشتر کہانیاں قلعے کی سیڑھیوں کے اوپر لوہے کے جنگلے کے پاس بیٹھ کر لکھی ہیں۔" (۳)

۱۔ منٹو۔ آپ بیتی نمبر۔ ص ۱۳۹۲

۲۔ میرزا ادیب۔ نقوش آپ بیتی نمبر۔ ص ۱۱۸۷

۳۔ میرزا ادیب۔ حوالہ ایضاً ص ۱۱۸

رومانی خواب سے بے رحم حقیقت کی طرف آئیں تو محمد طفیل ہماری ملاقات ڈاکٹر محمد حسن سے کراتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے زمینداروں کے گھرانے میں جنم لیا اور پرانی معاشرت میں آنکھ کھولی تھی۔ زمیندار، احسان اور مدینہ کے مطالعے نے انگریز دشمنی کا تصور دل میں پیدا کیا اور مسلم لیگ سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں انہیں صرف اشتراکیت میں روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی عملی زندگی میں عام لوگوں کو کیسی راہنمائی فراہم کر رہی تھی اس کا احوال ڈاکٹر محمد حسن کی زبانی سنیے ۔

> " اس تشکیک اور بے یقینی کے دور میں میں کمیونسٹ پارٹی سے اور زیادہ قریب ہوا۔ اس کا عملی کارکن بنا مگر خیال یہی تھا کہ یہ میرا میدان نہیں ہے ۔ انقلاب آجاتے تو پھر کسی گوشے میں بیٹھ کر لکھوں پڑھوں گا ۔ ہندوستان گیر ریلوے ہڑتال کی آواز بلند کی گئی اور یاروں کا خیال تھا کہ ۱۹۰۵ یا ۱۹۱۷ کے روس کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ ۲۷ ۔ مارچ کی شام کو عجیب صورتِ حال تھی۔ ہم میں سے ہر شخص صبحِ قیامت کا انتظار کر رہا تھا ۔ رات بھر ہم اپنے دوستوں کے ہاں چھپے پڑے رہے ۔ اجنبی گلیوں میں ریلوے کوارٹروں میں، چڑیا گھروں کے پیچھے والے جنگلوں میں ——— صبح کو معلوم ہوا کہ کہیں بھی ہڑتال نہیں ہوئی ۔ گویا اشتراکی سیاست محض ہوائی قلعے بنا رہی تھی ۔" (۱)

اس قسم کے واقعات آپ بیتی نمبر میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور اس نمبر کو افسانے کی طرح لذیذ اور کہانی کی طرح لطافت آفریں بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔ آپ بیتی نمبر پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ان عظیم شخصیات کے تجربے سے استفادہ ہی نہیں کر رہے بلکہ ان کے سفرِ حیات میں بھی شریک ہیں ۔ ہر آپ بیتی دوسری آپ بیتی سے مختلف ہے ہر مشاہدہ نیا تجربہ سامنے لاتا ہے ۔ ہر تجربے سے جداگانہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے ۔ اور زندگی کی گرہ جب اچانک کھل جاتی ہے تو محمد طفیل کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ انہوں نے خلقِ خدا کی راہنمائی کے لئے دنیا کے عظیم انسانوں، خیال نگاروں، مفکروں، دانشوروں اور کشور کشاؤں کی یہ محفل آراستہ کی اور ثابت کر دیا کہ بڑے لوگ مرا نہیں کرتے بلکہ اپنے کارناموں میں زندہ رہتے ہیں۔ نقوش کا آپ بیتی نمبر ان کی اسی عظمت کا ہی اثبات ہے۔

میرے لئے طمانیت کی بات یہ بھی ہے کہ محمد طفیل نے آپ بیتیاں شائع کرنے کی جو روایت قائم کی تھی اسے مستقبل میں نہ صرف فروغ حاصل ہوا بلکہ سرگزشت (عبدالمجید سالک)۔ جہانِ دانش (احسان دانش)۔ عشرتِ فانی (عشرت رحمانی)، یادوں کی بارات (جوش ملیح آبادی)۔ مٹی کا دیا (میرزا ادیب)۔ گردِ راہ (اختر حسین رائے پوری)۔ شام کی منڈیر سے (ڈاکٹر وزیر آغا)۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو (شہرت بخاری)، سرگزشت (ذوالفقار بخاری)۔ رو میں ہے رخشِ عمر (عبدالسلام خورشید)۔ آشفتہ بیانی میری (رشید احمد صدیقی)۔ جیسی اعلیٰ پائے کی خود نوشت سوانح عمریاں کتابی صورت میں بھی منظرِ عام پر آئیں۔ اردو رسائل نے شان الحق حقی، محمد یونس احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، محمد احمد سبزواری، قدوس صہبائی، خدیجہ مستور، نصر اللہ خان،

۱۔ محمد حسن ۔ نقوش آپ بیتی نمبر ۔ ص ۱۲۵۱

جابر علی سید جیسے ادبا کی آپ بیتیاں شائع کیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیضانِ نقوش کے آپ بیتی نمبر ہی کا ہے کہ اتنے ادیبوں کو اپنی زندگی پر نگاہِ بازپس ڈالنے کا خیال پیدا ہوا اور اس خزاں آشنا صنف پر جیسے بہار آگئی۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ خود محمد طفیل کو بھی اپنی آپ بیتی لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا اور انہوں نے یہ کام اپنی زندگی میں ہی سرانجام دے دیا اور اب جس زاویے سے بھی دیکھیے نقوش کا آپ بیتی نمبر اردو ادب کا ایک عظیم واقعہ نظر آتا ہے۔ یہ نمبر پہلے بھی بے مثال تھا اور شاید آئندہ بھی طویل عرصے تک اس موضوع پر اتنا ضخیم اور اتنا وقیع نمبر شائع نہ ہو سکے اور نقوش کا یہ آپ بیتی نمبر بے مثال رہا ہے۔

نقوش اور مطالعۂ غالب

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

(۱)

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ء–۱۹۵۰ء) کی زیرِ ادارت "مخزن" (لاہور) کے اجرا سے بیسویں صدی میں اُردو کے ادبی رسائل کے ایک مُہتم بالشان دور کا آغاز ہوا اور پھر ۱۹۲۱ء میں دو اور رسائل نے اپنا نقش جمایا اور بڑا اعتبار پایا۔ ایک مولوی عبدالحق کا رسالہ "اُردو" اور دوسرا نیاز فتح پوری کا رسالہ "نگار"۔ ان دونوں رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء–۱۹۶۱ء) اور نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ء–۱۹۶۶ء) کے انتقال کے بعد اور باوجود اب تک کسی نہ کسی شکل میں چلا آتا ہے، اگرچہ ان دونوں رسائل کا عہدِ زریں تقسیمِ ہند کے ساتھ تمام ہوتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے چھ ماہ بعد رسالہ "نقوش" (لاہور) کے اجرا (مارچ ۱۹۴۸ء) سے اُردو کے ادبی رسائل کا ایک عہد آفریں دور شروع ہوا ـــ ابتداً کوئی دو برس (شمارہ ۱–۱۰) ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کا نام بطور "مُدیر" "نقوش" پر درج ہوتا رہا۔ محمد طفیل پرنٹر اور پبلشر تھے۔ اُس وقت ہاجرہ مسرور عمرِ عزیز کے اُنیسویں، طفیل صاحب چھبیسویں اور احمد ندیم قاسمی اکتیسویں برس میں تھے۔ "نقوش" کے شمارہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ کا "طلوع" (اداریہ) ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے۔ شمارہ نمبر ۳ کا اداریہ احمد ندیم قاسمی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ "نقوش" کے ایک ابتدائی پرچے میں سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء–۱۹۵۵ء) کا ایک افسانہ ("ٹھنڈا گوشت"؟) "کھول دو" شائع ہونے کی پاداش میں "نقوش" کی اشاعت پر چھ ماہ کی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس پابندی کے بعد شمارہ نمبر ۵، مارچ اپریل ۱۹۴۹ء کے مشترکہ شمارے کے طور پر چھپا۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں بعض ناسازگار حالات کی بنا پر نقوش کی اشاعت پھر رک گئی اور مئی ۱۹۵۰ء میں یہ پھر نکلا۔

مئی ۱۹۵۰ء میں سیّد وقار عظیم (۱۹۰۹ء–۱۹۷۶ء) "نقوش" کے مُدیر ہوئے۔ انہوں نے "نقوش" کی شدت کو ملائمت سے بدلا اور اس طرح "نقوش" انتہا پسندی کی روش کو ترک کر کے اعتدال کی روش پر گامزن ہوا۔ مارچ ۱۹۵۱ء کے بعد سید وقار عظیم کو پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ سے، جہاں وہ فروری ۱۹۵۰ء سے شعبۂ اُردو میں بحیثیت استاد مامور تھے، اجازت میں توسیع نہ ملنے کے باعث "نقوش" کی ادارت سے علاحدہ ہونا پڑا۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں شمارہ ۱۹–۲۰ سے محمد طفیل (ولادت ۱۴۔ اگست ۱۹۲۳ء) کی زیرِ ادارت "نقوش" کے مسعود اور طویل عہدِ نو کا آغاز ہوا۔ طفیل صاحب کا عہدِ ادارت اُن کے انتقال (۵ جولائی ۱۹۸۶ء) تک کوئی پینتیس برس (یعنی ایک تہائی صدی سے متجاوز) مسلسل ادبی فتوحات اور معیلات کے سلسلہ ہائے دراز و بلند کی ایک ناقابلِ تسخیر اور قابلِ رشک مثال اور روایت کے طور پر چلا اور ان کی ادارت میں "نقوش" کا ہر نقشِ مؤخر، نقشِ مقدم سے بہتر اور برتر ثابت ہوا۔

اگلے صفحات میں "نقوش" کے مجموعی کرشمے یا کارنامے سے قطعِ نظر، صرف غالبیات کی حد تک "نقوش" کے اختصاص و کردار کا

اختصار کے ساتھ جائزہ لینا مقصود ہے یعنی "نقوش" اور مطالعۂ غالب کی روایت یا "نقوش" میں ذخیرۂ غالبیات کی نشاندہی کو اس جائزے کی حدودِ کار سمجھنا چاہیے۔

(۲)

"نقوش" کے ابتدائی دور (شمارہ ۱ - ۱۰) میں غالب سے متعلق صرف ایک سرسری سی تحریر (شمارہ ۶، صفحہ ۲۴ - ۲۹، از قلم محمد صفدر) ملتی ہے جس کا عنوان ہے "اے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ"۔ — پیرایۂ بیان یہ ہے :

> "— میں تجھے تیرے اشعار سنانے نہیں آیا ہوں۔ میں تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ جہانِ گزراں نے ہم کو بھی ایک ایسی ہی منزل، ایک ایسے ہی موڑ پر لا ڈالا ہے جس منزل سے اور جس موڑ سے تجھ کو گزرنا پڑا۔ ہمارے مسائل الگ ہیں لیکن ہماری کیفیت وہی ہے۔" (شمارہ ۶، صفحہ ۲۹)

یہ خطیبانہ اور صحافیانہ مزاج کی تحریر، انجمن ترقی پسند مصنفین، کراچی کے زیرِ اہتمام "یومِ غالب" کی تقریب (۲۰ مارچ ۱۹۴۹ء) میں پڑھی گئی اور یہی ہے "نقوش" کے دورِ اول میں سلسلۂ غالبیات کی کل متاع اور پونجی!

"نقوش" کے دوسرے مختصر تر دور میں (شمارہ ۱۱-۱۸) جب سید وقار عظیم اس کے مدیر رہے، دو مضامین غالب سے متعلق "نقوش" میں چھپے — شمارہ نمبر ۱۴ میں "غالب کی تصویریں" کے تحت خیر بہوروی کا مضمون (جسے دراصل ڈیڑھ صفحے کا مراسلہ کہنا چاہیے) — اور شمارہ ۱۵، ۱۶ میں ممتاز حسین کا تنقیدی مضمون "غاب کا نظریۂ عشق" (صفحہ ۴۶ - ۵۱) یہ مضمون، نظرِ ثانی کے بعد ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مضامین "نقدِ غالب" (علی گڑھ، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۸ - ۲۰۹) میں شامل ہوا — ان دو نگارشات کے علاوہ، طفیل صاحب کے "نقوش" کی ادارت پر فائز ہونے تک غالب سے متعلق "نقوش" میں اور کوئی چیز مجھے دکھائی نہیں دیتی —

(۳)

"غالب" کو "نقوش" کے خوانِ ادب کا جزوِ لازم دراصل محمد طفیل ہی نے بنایا۔ طفیل صاحب نے خود ایک موقع پر لکھا ہے کہ: —— "غالب سے میرا ذہنی ربط سنِ شعور سے تھا۔" —— (شمارہ ۱۱۱، ص ۵)۔ اِس ربط کا نتیجہ ہے کہ "نقوش" میں مطالعۂ غالب کی ایک ایسی ریت اور روایت پڑی اور یہ اس درجہ محکم اور بارآور ہوئی کہ اب اسے "نقوش" کے ایک قابلِ رشک شعبے اور ایک ناقابلِ تسخیر امتیاز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

محمد طفیل کے عرصۂ ادارت (اپریل ۱۹۵۱ء سے جولائی ۱۹۸۶ء تک) کے پینتیس برسوں میں "نقوش" کی تین اشاعتیں (کوئی دو ہزار صفحات کے قریب) غالب سے مخصوص ہوئیں۔ "نقوش" کا چوتھا غالب نمبر (کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل) طفیل صاحب ترتیب دے چکے تھے لیکن یہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔

"نقوش" کا پہلا غالب نمبر (شمارہ ۱۱۱) اپریل ۱۹۶۹ء میں سامنے آیا (صفحات ۸۴۰)۔ اس میں ۵۳ مضمون نگاروں کے ۵۹ مضامین شامل ہیں (کچھ اصحاب کی دو دو نگارشات شامل ہیں۔) اس شمارۂ خاص کے بارے میں خود طفیل صاحب نے لکھا ہے کہ :

> "اس نمبر کا نام یا تو غالب نمبر ہو سکتا تھا یا ڈاکٹر نمبر کیوں کہ اس نمبر میں بائیس
> ڈاکٹروں[1] کے مضمون ہیں ـ" (صفحہ ۵)

طفیل صاحب نے یہ بات اپریل ۱۹۶۹ء میں کہی تھی، اب اس پر اٹھارہ برس گزر گئے ـ اس عرصے میں میرے علم اور یقین کی حد تک "نقوش" کے زیرِ نظر 'غالب نمبر' کے مزید پانچ مضمون نگار ادب کے ڈاکٹر ہوئے یعنی : ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور ڈاکٹر وفا راشدی ـ

اس بات کو اور بڑھایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ "نقوش" کے اس 'غالب نمبر' کے مضمون نگاروں میں درجِ ذیل گیارہ اصحابِ کبار بھی شامل ہیں جو خود اگرچہ ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں ان کی نگرانی میں متعدد اہلِ علم نے ڈاکٹریٹ کی اسنادِ فضیلت پائیں یا بجائے خود ان کی خدماتِ جلیلہ ڈاکٹریٹ کا موضوع بنیں :

پروفیسر عبدالقادر سروری، مولانا غلام رسول مہر، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود
یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، پروفیسر سید وقار عظیم، محمد عتیق صدیقی، پروفیسر عبدالقوی
دسنوی، مالک رام اور عبدالرحمٰن چغتائی ـ

مضمون نگاروں کے پایۂ علمی کی وجاہت اور ثقاہت کے حوالے سے "نقوش" کے اس غالب نمبر کو جو امتیاز حاصل ہے، اس کی کوئی دوسری مثال کسی رسالے کے کسی 'غالب نمبر' سے پیش نہیں کی جا سکتی ـ طفیل صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ "نقوش" کے اس 'غالب نمبر' کے مضمون نگاروں میں جو ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں وہ بھی اپنی جگہ بھاری پتھر ہیں ـ ایسے غالب شناس کہ جن کے نام ہی اس امر کی ضمانت ہیں کہ بات میں وزن ہے، معاملہ مستند ہے ـ اس شمارے میں پاک و ہند کے تقریباً تمام بڑے ادیبوں نے لکھا ہے ـ اس حد تک مخلصانہ تعاون شاید ہی کسی دوسرے رسالے کو نصیب ہو ـ

غالب پر اتنا کام ہوا ہے کہ نئے گوشے تلاش کرنا بڑا مشکل تھا لیکن طفیل صاحب نے بجا طور پر خوشی کا اظہار کیا ہے ـ کہ اس نمبر میں بہت سی باتوں پر پہلی بار قلم اٹھایا گیا ہے ـ بہت سی باتیں پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں ـ غرض کچھ ریاضتیں، کچھ دریافتیں، کچھ انکشافات، کچھ انکشافات (شمارہ ۱۱۱ ص۵) ـ

---

[1] طفیل صاحب نے جن بائیس ڈاکٹروں کے مضامین کی جانب افتخار کے ساتھ اشارہ کیا ہے اُن کے اسمأ یہ ہیں :
ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا،
ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر نبی بخش قاضی، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر ظہیر الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر
وارث کرمانی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر اے ڈی نسیم، ڈاکٹر
عبدالسلام خورشید اور ڈاکٹر اکبر حیدری

"نقوش" کا یہ غالب نمبر طفیل صاحب کے جمالیاتی ذوق کا بھی اچھا نمونہ ہے۔ اس نمبر میں کہیں کہیں آرائشِ جمال کے لیے غالب کی غزلیں بھی لکھ دی گئی ہیں یہ تعداد میں بیس بنتی ہیں اور انھیں اسلم کمال نے رنگوں اور خطوں سے آراستہ کیا ہے۔ اس نمبر میں غالب کی ایک تصویر بھی شامل ہے جو چغتائی کے موقلم کا شاہکار ہے۔

غالب کی شبیہ (عملِ چغتائی) کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر خان نے بتایا ہے کہ غالب کی یہ شبیہ قیامِ پاکستان سے پہلے کی تخلیق ہے۔ یہ شبیہ محض مصور کے مطالعے اور کمالِ فن کی وضاحت نہیں کرتی بلکہ مصور کے اُس تصور کی بھی ترجمان ہے جس کے ذریعے اس نے رنگوں اور خطوں کے ذریعے ایک کردار پیش کیا ہے۔ چغتائی نے جز بندی، ترتیب اور رنگوں کے استعمال میں اُس ہنرمندی کا اتمام و کمال ثبوت دیا ہے جو شبیہ نگاری کی شرطِ لازم ہے۔

مختصر یہ کہ "نقوش" کا یہ غالب نمبر اپنے نادر مشمولات کی بنا پر ایک قیمتی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ پاک و ہند کی متعدد یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے اُردو کے متعلمین کے زائد مطالعے کے لیے نصابات میں تجویز ہوتا ہے اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس اعزاز میں بھی شاید ہی کسی دوسرے رسالے کا کوئی غالب نمبر "نقوش" کا ہم دوش ہوا!

"نقوش" کا یہ غالب نمبر، جو ۸۴۰ صفحات پر مشتمل ہے طفیل صاحب کے لیے قطعِ سلسلہ شوق نہیں تھا۔ اپنے ادارتی نوٹ میں انھوں نے یہ نوید دی کہ:

> "آئندہ شمارہ بھی غالب ہی سے متعلق ہوگا اور وہ شمارہ موجودہ شمارے سے مختلف ہوگا۔ موجودہ شمارے میں غالب کی شخصیت و فن پر دوسرے نامور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ آئندہ شمارے میں صرف غالب کی تحریریں ہوں گی۔ کچھ کمیاب، کچھ نایاب، کچھ غیر مطبوعہ! غالب نمبر کا دوسرا حصہ بھی تقریباً مکمل ہے۔ وہ بھی انھی دنوں پیشِ خدمت ہوگا۔ مارچ میں نہ سہی اپریل میں سہی۔"[1] [ش ۱۱۱، ص ۶]

(۴)

"نقوش" کے غالب نمبر کا "حصہ دوم" نو دریافت بیاضِ غالب بخطِ غالب کے ساتھ شمارہ نمبر ۱۱۳ کے طور پر اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا (صفحات ۳۷۲)۔ اس غالب نمبر کا حصہ غالب بیاضِ غالب پر مبنی ہے۔ غالب صدی کی اس اہم ترین دریافت کو "نقوش" کے ذریعے منصۂ شہود پر لانے کا اعزاز اور افتخار، محمد طفیل کا شاید سب سے بڑا کارنامۂ ادب قرار پائے۔ طفیل صاحب اس نمبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> میں نے دوسرے حصے کے سلسلے میں اعلان یہ کیا کہ اس میں صرف غالب کی کمیاب، نایاب اور

---

[1] "نقوش" کے اس غالب نمبر پر "اپریل ۱۹۶۹ء" کی تاریخ درج ہے جبکہ "مارچ میں نہ سہی اپریل میں سہی" کے الفاظ سے خیال ہوتا ہے کہ وہ یہ بات مارچ یا اس سے پہلے لکھ رہے ہیں۔ "نقوش" کے اس غالب نمبر کی تقریب لاہور میں ۲۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو ہوئی۔

غیر مطبوعہ تحریریں پیش کروں گا۔ میرے اس اعلان کو جب ایک غالب شناس نے پڑھا تو انہوں نے لکھا :

> "غالب کی تو ایک ایک سطر چھپ چکی ہے۔ اس لیے اب آپ دوسرے حصے میں کیا چھاپیں گے؟"
>
> قدرت کو میرے اعلان اور جذبے کی لاج رکھنا تھی، سو رکھی — وہ کام جو قریب قریب ناممکن تھا ممکن ہو گیا۔ اور اب اگر میں یہ کہوں کہ پوری ایک صدی میں غالب پر جو کچھ چھپا ہے، اُس میں یہ سب سے قیمتی دستاویز ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس نمبر میں غالب کی اوّلین بیاض کو پہلی بار عکسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔" (۱۱۳ : ۳)

بلاشبہ غالب کے نو دریافت دیوانِ اردو کا یہ نسخہ، جو غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے غالب صدی کا بیش قیمت خزینہ اور بے بہا گنجینہ ہے جسے بقول کسے "گنجِ شائیگاں" کہنا چاہیے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "میرا احساس یہ ہے کہ یہ مرزا غالب کے متعلق آخری بڑی دریافت ہے کیوں کہ بظاہر یہ مرزا کے مستند اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُردو میں گنتی کی نئی غزلوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔" (۱۱۴ : ۱۴)

پروفیسر سید وقار عظیم کی رائے یہ ہے کہ "نقوش کے ایک دو نہیں سبھی شمارے ہماری سمیٹی ہوئی دولت کے بیش بہا جواہر ہیں اور بلاشبہ سب سے بڑی قیمت والا، غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اُن کا وہ دیوانِ اُردو ہے جس کے مطالعے سے فکر، تنقید اور تفتیش کے نئے باب کھلیں گے اور ہمارے دل سے اس مجاہد کے حق میں دعائیں نکلیں گی جس کی لگن اور دلسوزی کی بدولت یہ گوہرِ آبدار ہم تک پہنچا۔"

(۱۲۱ : ۵۰۱)

یہ نادر نسخہ اپریل ۱۹۶۹ء کے شروع میں بھارت کے شہر بھوپال میں دریافت ہو کر امروہہ پہنچا۔ محمد طفیل نے پاکستان میں "نقوش" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اسے حُسنِ طباعت کے مثالی معیار کے ساتھ شائع کیا۔ اس اشاعتِ خاص کی افتتاحی تقریبات اعلیٰ پیمانے پر راولپنڈی (۲۹ر نومبر ۱۹۶۹ء) اور لاہور (۶ر دسمبر ۱۹۶۹ء) میں منائی گئیں۔

"نقوش" کے اس دوسرے غالب نمبر میں، غالب کی نو دریافت بیاض کے بارے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کا ایک تعارفی مضمون اور تصریحات بھی شامل ہیں۔ فاروقی صاحب نے خود اس مضمون کے بارے میں ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ:

> "مضمون کی تسوید بہت مختصر مدت میں ہوئی اور بوجوہ اس پر نظرِ ثانی نہ ہو سکی اس لیے بعض غلطیاں رہ گئیں جن کی تصحیح یا وضاحت ضروری ہے۔ مضمون میں لکھا گیا ہے کہ اس نسخے کے ذریعے ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں اور ۱۳ رباعیاں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ یہ تعداد درست نہیں ہے[1]۔ افسوس میری عجلت کے باعث یہ غلطی رہ گئی

---

[1] پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی نے بھی دعوے کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ چیز "ہماری نظر میں واضح" ہے کہ "انیس غزلیں اس نسخے میں زائد ہیں" (مقدمہ گلِ رعنا، عابدی، ص ۳) لیکن ظاہر ہے کہ عابدی صاحب کا یہ بیان درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نسخے میں زائد غزلوں کی صحیح تعداد ۲۵ ہے۔

(دراصل اس نسخے) میں ۲۵ غزلیں اور ۱۴ رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۲ مفرد اشعار ہیں۔ یہ سب کلام "نقوش" کے 'بیاضِ غالب نمبر' میں شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند غزلوں کی اور ایک رباعی کی نشاندہی نہ ہو سکی تھی۔"
(نقوش، شمارہ ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۰)

جن ۲۲ مفرد اشعار کو نثار احمد فاروقی نے غیر مطبوعہ بتایا ہے، ان میں ایک یہ شعر بھی درج ہے:

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

(نقوش ۱۱۴، صـ۲۰)

یہ شعر، نقوش بیاضِ غالب کی انتالیسویں غزل کا دوسرا شعر ہے (ص ۸۸، ۸۹) اور غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ یہ دیوانِ غالب اردو نسخہ عرشی (۱۹۵۸ء) کے صفحہ ۲۱، دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ (حمید احمد خاں، ۱۹۶۹ء) کے حاشیہ صفحہ ۱۸ اور نسخہ شیرانی (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) کے صفحہ ۱۲ الف پر موجود ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اس شعر کو بھی غیر مطبوعہ قرار دیا ہے:

کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

(نقوش، جولائی ۱۹۷۰ء، صـ۲۴)

اس شعر کا صرف پہلا مصرع نیا ہے ورنہ یہ نسخہ عرشی، نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی، یہاں تک کہ غالب کے مروج و متداول دیوان تک میں بصورتِ ذیل موجود ہے:-

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

میرے مطالعے کے مطابق غالب کی اس بیاض میں غیر مطبوعہ کلام کی صحیح کیفیت یہ ہے:

ا : پچیس اردو غزلیں، تعداد اشعار :	۱۴۲
ب : رباعیاتِ اردو :	۲
ج : رُباعیاتِ فارسی :	۱۲
د : متفرق مفرد اشعار (اردو) :	۲۵
ہ : مصرعے (سات اردو اور ایک فارسی) :	۸

غزلیں اور رباعیات (اردو، فارسی) وہی ہیں، نثار احمد فاروقی جن کی دو قسطوں میں نشاندہی کر چکے۔ ۲۲ میں سے دو مفرد اشعار کے بارے میں جنہیں فاروقی صاحب نے غیر مطبوعہ بتایا ہے وہ نئے نہیں ہیں مطبوعہ ہیں۔ یہاں "نقوش" کی اس بیاضِ غالب سے تین ایسے شعر درج کیے جاتے ہیں جو پہلی بار اسی بیاض کے ذریعے سامنے آئے ہیں لیکن جو فاروقی صاحب کی نظر میں نہیں آ سکے:

۱۔ نہیں ہے حوصلہ پامردِ کثرتِ تکلیف
جنونِ ساختہ حرزِ فسونِ دانائی
[غزل نمبر ۱۹۲، شعر نمبر ۴، نقوش بیاضِ غالب ص ۲۳۴، - ۲۳۵]

۲۔ بہ پیچ ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ خاک
جوں شمع آپ وہ اپنی خوراک ہو گئے
[۱۹۳ : ۵، ص ۲۳۴ - ۲۳۵ (حاشیہ)]

۳۔ نقش، رنگینیِ سعیِ قلمِ مانی ہے
بہ کمر دامنِ صد رنگ گلستاں زدہ ہے
[۲۰۲ : ۳، ص ۲۴۴ - ۲۴۵]

نقوش، بیاضِ غالب میں دو شعر مزید ایسے ہیں جنھیں میں بمنزلۂ نو دریافت خیال کرتا ہوں گو یہ نسخۂ حمیدیہ میں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہیں :

۱ ۔ اسد یہ گوشۂ چشمِ عنایت اے آقا
کہ یہ سرشکِ زچشم افتادہ، گوہر ہو
[نقوش، صفحہ ۱۸۲-۱۸۳]

صدف کی ہے ترے نقشِ قدم میں کیفیت
سرشک چشم اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو
[نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۶۶]

۲۔ جنونِ عیش ہے یارب سر و سامانِ آزادی
کروں یک گوشۂ دامن تر، گر آبِ ہفت دریا ہو
[نقوش، ص ۱۸۲-۱۸۳]

بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ[1] معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
[نسخۂ حمیدیہ ص ۱۶۸]

---

[1] حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "عیش" کو کاٹ کر "ذوق" کر دیا ہے (نسخۂ حمیدیہ، ۱۶۸)۔ یہ شعر نسخۂ شیرانی میں بھی شامل ہے۔ شیرانی کے متن میں "ذوق" کے بجائے "عیش" درج ہے (ص ۵، الف) ۔

نسخۂ حمیدیہ میں ان اشعار کا نظرِ ثانی شدہ متن شامل ہے۔ اصلاح کے بعد یہ اتنا بدل گئے اور لطیف ہو گئے ہیں کہ ان کی اوّلین روایت جو "نقوش" کے ذریعے اب سامنے آئی ہے بالکل اجنبی اور مختلف معلوم ہوتی ہے۔

طفیل صاحب نے غالب کی اس بیاض کو اہلِ علم کے لیے پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ "مروجہ دیوان اور بیاض میں زمین آسمان کا فرق ہے" بلاشبہ اس بیاض کی فضیلت اس میں بھی ہے کہ اس کی شعری روایت، متداول دیوان کی شعری روایت سے مختلف ہے۔ یہ فرق اور اختلاف، اصلاحاتِ غالب کا نتیجہ ہے۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں جہاں تہاں شعر اور مصرعے معنوی یا لفظی ترقی پا کر اتنا بدل گئے ہیں کہ شعر یا مصرعے کی پہلی اور دوسری متبدلہ قرأت، تازہ شعر یا مصرعے کا لطف بہم پہنچاتی ہے یہاں اس طرح کے آٹھ "نئے" مصرعے (سات اُردو اور ایک فارسی) پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی، ان اشعار کے مصرع ہائے اولی میں ہوئی ہے جو بجائے خود ایک جداگانہ قابلِ لحاظ پہلو ہے:

(۱)
غنچے کا دل خوں ہُوا، لیکن زباں پیدا نہ کی
گل ہُوا ہر ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
[نقوش، صـ ۱۱۲-۱۱۳]

ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہُوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
[نسخۂ حمیدیہ، صـ ۹۷]

(۲)
نورِ خوباں سے یدِ بیضا ہے آج
ورنہ تھا خورشید یک دستِ سوال
[نقوش، صـ ۱۴۲-۱۴۳]

نورِ حیدر سے ہے اس کی روشنی[1]
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال
[نسخۂ حمیدیہ، صـ ۱۳۳
نسخۂ شیرانی، صـ ۸۳ ب)

---

[1] حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ: "یہ مصرع یوں بدلا ہے:

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی

اس اصلاح کا عالم یہ ہے کہ بجنسہٖ غالب کی تحریر معلوم ہوتی ہے، (نسخۂ حمیدیہ، صـ ۱۳۳، حاشیہ) نسخۂ شیرانی کے متن میں حمیدیہ کی اصلاحی شکل درج ہے نسخۂ عرشی میں بھی مصرعے کی یہی صورت ضبط میں آئی ہے یعنی "نور سے تیرے ہے اس کی روشنی" صـ ۵۱

(۳) حسرت لے آغاز و انجام سیہ شامِ شباب
ماہ کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے
[نقوش، ص ۲۱۰-۲۱۱، ۲۱۲-۲۱۳]

دیکھ لی جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے
[نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۲۰ نسخۂ شیرانی، ص ۸۳ ب]

(۴) اسدؔ کو کیوں نہ ہو اُمید لطف بندہ نوازی
علیؑ ولی اسد اللہ جانشین نبیؐ ہے
[نقوش، ص ۲۲۴-۲۲۵]

امام ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشین نبیؐ ہے
[نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۹۰
نسخۂ شیرانی، ص ۶۶ ب]

(۵) کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے
[نقوش، ص ۲۴۸-۲۴۹]

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے
[نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۹۰
نسخۂ شیرانی، ص ۶۶ ب]

(۶) طراوت جوششِ طوفانِ آب گل سے ممکن ہے
کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
[نقوش، ص ۲۵۶، ۲۵۹]

زبس طوفانِ آب و گل ہے غافل کیا تعجب ہے
کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
[نسخۂ حمیدیہ ص ۲۴۴، شیرانی، ص ۸۹ ب)

(۷) در طلسمِ عاجزی اے اضطراب آرام کو
پرفشانی ہا فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
[نقوش، ص ۲۷۲-۲۷۳]
دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں؟
پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
[حمیدیہ، ۲۳۹، شیرانی ۸۶ الف]

(۸) شاہیم وجنونِ ما ز تمکیں دل تنگ　　داریم بہ بحر و بر ز وحشت آہنگ
مرجاں دِرَدیم زآرۂ پشتِ نہنگ　　برکوہ زنیم سکہ از داغ پلنگ۔
[فارسی رباعی نمبر ۱۱، نقوش ص ۲۹۲ - ۲۹۳]
شاہیم زبانہ افر داغ اورنگ　　داریم بہ بحر و برز وحشت آہنگ
مرجاں دو ردیم زارۂ پشت نہنگ　　برکوہ زنیم سکہ ازداغ پلنگ
[دیوانِ غالب فارسی، طبع اوّل، ص ۴۹۱]

بیاضِ غالب کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی روایت، غالب کے مروجہ دیوان کی شعری روایت سے مختلف ہے۔ ہر دو کے تقابلی مطالعے سے غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کہ یہ روایت دستیاب متون میں قدیم ترین بھی ہے اس لیے اس کی مدد سے کلامِ غالب کی "تاریخی حد بندی اب زیادہ متعین بنیادوں پر ممکن ہو گئی ہے اور سب پر مستزاد" بہت سا غیر مطبوعہ کلام" دل دادگانِ غالب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیاضِ غالب کی اس غیر معروف روایت کو پڑھ لینا محالات میں سے نہ سہی، لیکن یہ کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ محمد طفیل نے صفحہ بہ صفحہ بخطِ غالب متن کو، نستعلیق قرأت میں پیش کرنے کا اہتمام کر کے اس سے استفادے کے دائرے کو عام اور اہلِ علم کیلئے آسان بنا دیا ہے اُن کی اس سعیِ بلند اور اکتشافی اور اہتمامی اشاعت پر بے اختیار دل سے آفرین نکلتی ہے۔

بیاضِ غالب صرف اسی لیے "متبرک" یا اہم نہیں ہے کہ یہ ایک ایسے عظیم شاعر کی خود نوشتہ بیاض ہے جو ہمارے تہذیبی ورثے کا امین اور "ہند اسلامی تمدن کا آخری ترجمان" تھا بلکہ اس سے ہٹ کر اور بڑھ کر اس بیاض سے غالب کے فنی شعور، اُن کے ذوقِ سخن اور ان کی عظمتِ شاعرانہ کے فہم و ادراک میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ اس بیاض کی اہمیت محض تاریخی نہیں ہے یعنی وہ صرف اس وجہ سے اہم نہیں کہ غالب کے ہاتھ کا ایک قدیم مخطوطہ ہے بلکہ اس کی دریافت سے غالب کے مرتبۂ شعری اور ادّعاتِ فن کے ثبوت میں بعض تازہ دلیلیں اور نئی تاویلیں بھی ہاتھ آتی ہیں۔" (نقوش، غالب نمبر ۳، ص ۴۶۶)

دیوانِ غالب بخطِ غالب پر مبنی یہ بیاض ۱۸۱۶ء / ۱۲۳۱ھ کی مکتوبہ ہے۔ یہ کیسا عجیب اور نادر حسنِ اتفاق ہے کہ یہ نسخہ لکھے جانے کے ڈیڑھ سو برس سے بھی زیادہ تک گوشۂ گمنامی میں محفوظ رہنے کے بعد بھوپال میں نمودار ہوا، وہاں سے امروہہ کو منتقل ہوا[1]۔ لیکن اسے ہر خاص و عام کے سامنے پیش کرنے کی سعادت اور توفیق ارضِ لاہور کے حصے میں آئی۔ محمد طفیل نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ :

> چونکہ یہ بیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ اسے نسخۂ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے۔ (۱۱۴، ص ۴)

طفیل صاحب نے اس گوہرِ آبدار کو غالب دوستوں اور ادب شناسوں کے لیے عام کر کے جو احسان کیا ہے اس کے ادنیٰ اعتراف کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس بارے میں ان کی خواہش کا احترام کیا جائے اور اس دیوان کو نسخۂ لاہور یا اس سے بھی بڑھ کر "نسخۂ نقوش" کہا اور لکھا جائے۔

بیاضِ غالب (نسخۂ لاہور / نقوش) نے رسالے کے ابتدائی ۳۱۲ صفحات گھیرے ہیں۔ "نقوش" کے اس غالب نمبر میں اس نسخے کے علاوہ چند اور اہم مضامین بھی شامل ہیں۔ طفیل صاحب ہی کے بقول "بیاض کے علاوہ جو چند مضامین اور" اس نمبر کی زینت ہیں وہ بھی اپنی جگہ بڑے قیمتی ہیں، بڑی اہمیت والے ہیں اور غالبیات کے سلسلے میں اضافہ ہیں۔" (۱۱۳، ص ۴) ان مضامین کی صورت یہ ہے :

۱۔ دیوانِ غالب کا ایک نادر انتخاب	مولانا امتیاز علی خاں عرشی	ص ۳۱۳ - ۳۲۶
۲۔ گلِ رعنا بخطِ غالب (عکسی)	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۳۲۷ - ۳۳۳
۳۔ غالب کے نام دو غیر مطبوعہ خطوط	ڈاکٹر سید حامد حسین	۳۳۴ - ۳۳۸
۴۔ غالب : رغبۃ الطالبین (عکسی)	جلال الدین	۳۳۹ - ۳۴۷
۵۔ میخانۂ آرزو سر انجام (عکسی)	مسلم ضیائی	۳۴۸ - ۳۵۱
۶۔ غالب کے سات فارسی خطوط (عکسی) (مکتوب الیہ کی بیاض سے)	وزیر الحسن عابدی	۳۵۲ - ۳۷۱

غالب کے اشعار پر مبنی صادقین کی تیرہ تصویریں بھی اس نمبر کی "زینت" ہیں۔ "نقوش" کے اس غالب نمبر (نسخۂ نقوش) کی معنوی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم" لیکن یہ طباعت و تزئین کے اعتبار سے بھی بے مثل ہے اور دربارۂ خاص یہ :

---

[1] "کہاں کا نسخۂ بھوپال اور کہاں کا نسخۂ امروہہ، یہ مخطوطہ ۱۹۶۹ء میں ظاہر ہوا اور ۱۹۷۰ء میں پھر زیرِ زمین چلا گیا (ڈاکٹر گیان چند، النقوش ۱۱۶، ص ۳۸۰) اب اس نسخے سے عام استفادے کا واحد ذریعہ "نقوش" کا غالب نمبر ہی رہ گیا ہے۔

محمد طفیل کے اپنے سابقہ معیارات و کمالات پر سبقت لے گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز بٹالوی کے لفظوں میں:

> "بیاضِ غالب، بخطِ غالب کی اشاعت لاہور، ایک تاریخ ساز واقعہ ہے اور اس کا چھپنا غالبیات میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔" (۱۱۴، ص ۳۵)

(۵)

محمد طفیل کی ادارت میں "نقوش" کا تیسرا غالب نمبر ۶۲۸ صفحات پر مشتمل شمارہ ۱۱۶ کے طور پر ۱۹۷۱ء میں آیا۔ اس کے مشمولات کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ اس عہد کے شاعروں کا غالب کے بارے میں اظہارِ خیال: صفحہ ۱ - ۳۲

جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، ادا جعفری

۲۔ انکشافات:-

۱ - غالب اور نواب حسام الدین حیدر نامی	ڈاکٹر اکبر حیدری،	صفحہ ۷
۲ - غالب اور تذکرۂ بحرِ ذخار	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی،	۴۳
۳ - نواب الٰہی بخش معروف کا غیر مطبوعہ کلام	ڈاکٹر محمد ایوب قادری،	۵۹
۴ - مرزا غالب اور فنِ تاریخ گوئی	ڈاکٹر اکبر حیدری،	۷۲
۵ - قادر نامۂ غالب	عبدالقوی دسنوی،	۸۳
۶ - مرزا محمد عظیم بیگ شاگرد غالب اور سودا	ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی،	۸۸
۷ - غالب کے نو دریافت خطوط	آفاق احمد،	۹۵
۸ - شادان بلگرامی کی غیر مطبوعہ شرح غالب	سید احمد رضا بلگرامی،	۱۰۰
۹ - رفعت شروانی شاگرد غالب کی خود نوشت تحریریں	نادم سیتاپوری،	۱۱۱
۱۰ - کلیات غالب پر غالب کی تحریر	عطیۂ خدا بخش لائبریری،	۱۱۵
۱۱ - دیوانِ غالب کے حاشیے پر غالب کی تحریر	عطیۂ خدا بخش لائبریری،	۱۱۶
۱۲ - صوفی منیری کے کلام پر غالب کی تحریر	عطیۂ اطہر شیر،	۱۱۷
۱۳ - ایک لفافے پر غالب کی تحریر	عطیۂ اطہر شیر،	۱۱۸

۳۔ عہد:

۱۴ - غالب کا عہد	ڈاکٹر انور سدید،	۱۶۷
۱۵ - غالب تہذیبی سنگم پر	سلطان صدیقی،	۱۸۰

۴- فن و شخصیت:

۱۶- غالب کی شخصیت	رشید احمد صدیقی،	۱۱۹
۱۷- غالب کی شاعری	رشید احمد صدیقی،	۱۴۲
۱۸- غالب کی شخصیت اور فن	ڈاکٹر وارث کرمانی،	۱۹۱
۱۹- اشاریۂ غالبانہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	مولانا غلام رسول مہر،	۲۰۳
۲۰- غالب - ایک انفرادیت پسند شاعر	ڈاکٹر ممتاز حسن،	۳۳۲
۲۱- مطالعۂ غالب کے نئے امکانات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی،	۲۱۵
۲۲- غالب کا فنی ارتقا	ڈاکٹر شوکت سبزواری،	۲۲۲
۲۳- غالب کا نارسیدہ کلام	ڈاکٹر سید عبداللہ،	۲۳۱
۲۴- معرکۂ کلکتہ اور آشتی نامہ	مسلم ضیائی،	۲۴۵
۲۵- دیوانِ غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ	علی سردار جعفری،	۳۴۵
۲۶- غالب کے تنقیدی نظریات	ڈاکٹر سید محمد عقیل،	۲۶۴
۲۷- عظمتِ غالب کی حقیقی بنیاد	ڈاکٹر عبدالمغنی،	۲۷۱
۲۸- مشکل پسند غالب	سید مرتضیٰ حسین فاضل،	۲۸۶
۲۹- غالب اور چراغاں	ڈاکٹر مسیح الزماں،	۲۹۲
۳۰- غالب، غمگین اور غالب	یوسف جمال انصاری،	۳۵۷
۳۱- غالب کی دقت پسندی اور فارسیت	افتخار احمد فخر،	۲۹۷
۳۲- غالب اور اقبال	جگن ناتھ آزاد،	۳۰۷
۳۳- غالب سے متعلق کچھ تاریخی قطعے	عبدالرؤف عروج،	۳۲۷

۵- بیاضِ غالب:

۳۴- چند حقائق بلا تبصرہ	محمد طفیل، مالک رام، توفیق احمد،	۳۷۳
	مالک رام، ڈاکٹر گیان چند،	۳۷۵
	عبدالقوی دسنوی،	۳۷۳ - ۳۷۸
۳۵- بیاضِ غالب کی اصلاحیں	ڈاکٹر گیان چند،	۳۷۹
۳۶- بیاضِ غالب (نسخۂ بھوپال ثانی)	عبدالقوی دسنوی،	۴۰۵
۳۷- غالب، نو دریافت بیاض کی روشنی میں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری،	۴۶۵

۳۸۔ بیاضِ غالب کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سلیم اختر،	ص ۴۷۷
۳۹۔ کیا نو دریافت بیاض کا کاتب غالب ہے؟	ڈاکٹر گیان چند،	۵۱۹

۶۔ تقریبات بہ سلسلہ بیاضِ غالب:

۴۰۔ (پہلی تقریب) خطبۂ صدارت	نوابزادہ شیر علی خاں،	۴۹۴
۴۱۔ غالب کی تلاش	پروفیسر سید وقار عظیم،	۴۹۹
۴۲۔ بہ تقریبِ افتتاح غالب نمبر	کرنل محمد خاں،	۴۹۶
۴۳۔ نقوشِ طفیل / طفیلِ نقوش	سید ضمیر جعفری ،	۵۰۲
۴۴۔ (دوسری تقریب ابتدائی کلمات)	قیوم نظر،	۵۰۷
۴۵۔ بیاضِ غالب کی دریافت	مولانا غلام رسول مہر،	۵۰۹
۴۶۔ غالب نمبر حصۂ دوم کے بارے میں	ڈاکٹر وحید قریشی	۵۱۵

۷۔ تبصرے:

۴۷۔ غالب، حیات اور خطوط (رالف رسل، خورشید الاسلام،)	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۵۹۹
۴۸۔ گلِ رعنا (مرتبہ مالک رام)	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۶۰۰
۴۹۔ غالب شاعرِ امروز و فردا (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)	پروفیسر سید وقار عظیم	۶۰۲

"نقوش" کا یہ تیسرا غالب نمبر بھی موضوعات کے تنوع، قیمتی اور نادر مواد اور انکشافات، ترتیب کے حسن، بحیثیتِ مجموعی اپنے مشمولات و مندرجات اور مضمون نگاروں کے وزن و وقار کے اعتبار سے بے حد وقیع ہے اور ادبِ غالب میں یہ طفیل صاحب کی مستقل یادگار کے طور پر ہمیشہ حوالے کا کام دے گا۔

(۶)

مَیں نے ایک برس کی جدوجہد سے غالب نمبر (حصہ سوم) مرتّب کیا تھا کوئی تیرہ سو صفحات کے لگ بھگ۔ جب (چھ سو سے زائد) صفحات چھپ گئے تو نیوز پرنٹ آرڈیننس جاری ہو گیا۔ اس لئے مجبوریوں کا پھندا "نقوش" کے گلے میں بھی ڈال دیا گیا۔ (کہا گیا) کہ جتنا پرچہ چھپ چکا ہے اتنا ہی بازار میں لے آؤ۔ میرے نزدیک اس نمبر کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک جسم کے دو ٹکڑے کر دے ـــ اسی کاوشِ دو نیم کو لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ باقی معاملہ یہ کہ یار زندہ صحبت باقی!

[محمد طفیل، غالب نمبر ۳، التوا]

ـــ ایک نہیں اکٹھے تین (چوتھا بھی آ رہا ہے) غالب نمبر چھاپ ڈالے مَیں اپنے ان نمبروں

> کے مندرجات کے بارے میں "کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا" والی بات کہوں گا اور "یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے" کبھی نہ کہوں گا۔"
>
> [محمد نقوش، غالب نمبر ۳، اس شمارے میں]

طفیل صاحب کی زندگی میں "نقوش" کا جو آخری سالنامہ (شمارہ نمبر ۱۳۲) جون ۱۹۸۵ء میں آیا، اس میں انہوں نے لکھا کہ:

> "دو نمبر: ایک اقبال پر جو اُن کی غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا نمبر غالب پر جو اُن کی غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں نمبر کتابت شدہ صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پوری کوشش ہوگی کہ انھیں جلد منظرِ عام پر لایا جا سکے" (ص ۳۵۰)

"نقوش" کے اس موعودہ غالب نمبر (حصہ چہارم) کے سات سو صفحات کی کتابت شدہ کاپیاں میری نظر سے گزری ہیں — اس نمبر کا بیشتر کام وہ ۱۹۷۳ء تک مکمل کر چکے تھے۔ غالب کی غیر مرتب نگارشات کا اشاریہ انہوں نے مجھ سے حاصل کیا تھا۔ غالب صدی پر ۱۹۷۳ء تک چھپنے والی بھارت اور پاکستان کی کتابوں اور رسائل کے غالب نمبروں کا جائزہ نقوش کے اس نمبر کے لیے میرے اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے قلم سے ہے۔ ایک اچھا مضمون اس میں کوئی ۴۵، ۵۰ صفحات کا ضمیر نیازی کا ہے جس میں انہوں نے تذکروں میں غالب کے تذکرے/تراجم فراہم کیے ہیں کوئی دس برس بعد — ۱۹۸۴ء میں طفیل صاحب نے اس نمبر کا جمع جتھا نکالا اور اسے تازہ مصادر سے مرصع کرنے کے لیے مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے دو جائزے مرتب کیے:

۱۔ غالبیات کا سرمایہ: عصرِ غالب سے سالِ غالب ۱۹۶۹ء تک
۲۔ غالبیات کی دوسری صدی: ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۴ء تک کا جائزہ

پہلا جائزہ انھوں نے سالنامہ ۱۹۸۵ء میں شامل کر لیا اور دوسرا نسبتاً طویل مقالہ انہوں نے غالب نمبر حصہ چہارم کے لیے بچا لیا۔ افسوس کہ یہ غالب نمبر جس کے سات سو صفحات وہ کتابت کرا چکے تھے اور کوئی تین سو صفحات مزید کتابت کے لیے تیار تھے وہ اپنی زندگی میں شائع نہ کر پائے۔

(۷)

"نقوش" کی مستقل اشاعتوں سے قطعِ نظر جو غالب سے مخصوص اور منسوب ہوئیں، طفیل صاحب نے "نقوش" کے بعض عام پرچوں میں غالب سے متعلق خصوصی گوشے قائم کیے۔ یہاں میں اس کی صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ شمارہ ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) میں مقالات کے بعد انہوں نے "حصۂ غالب" کے زیرِ عنوان غالبیات کے بارے میں کارآمد مطالعات پیش کیے ہیں۔ مقالہ نگاروں میں، مالک رام، مولانا امتیاز علی عرشی اور اکبر علی خاں عرشی زادہ ایسے غالب شناس شامل ہیں۔

شمارہ ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) کے اولین سیکشن کا عنوان ہے "ضمیمہ غالب نمبر" اور اس کے تحت یہ چیزیں شامل ہیں:

۱۔ اس شمارے میں (پچھلے شمارے غالب نمبر ۲ کی باتیں)	محمد طفیل
۲۔ خطبۂ صدارت (غالب نمبر ۲ کی افتتاحی تقریب کا)	جنرل شیر علی خاں
۳۔ بیاضِ غالب کے بارے میں	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
۴۔ بیاضِ غالب کی تصحیح :	مبارک علی گیلانی / لطیف عارف
۵۔ لاہور نامہ (بسلسلہ بیاضِ غالب)	انتظار حسین
۶۔ دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور	ڈاکٹر اعجاز حسین بٹالوی
۷۔ اخباری کالم: لاہور نامہ	مشرق، ۹ر دسمبر ۱۹۶۹ء
شہر سرائے	امروز، ۷ر دسمبر ۱۹۶۹ء
سرگرمیاں	اخبار خواتین، ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۹ء
شہر خیال	نوائے وقت، ۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء
۸۔ تبصرے :	امروز، جنگ، مشرق، پاکستان ٹائمز
۹۔ خبریں :	پاکستان ٹائمز، جنگ، مشرق، امروز، ندائے ملت، نوائے وقت
۱۰۔ 'بیاضِ غالب' کے افتتاح کی چند تصویری جھلکیاں۔	

یہ سب مواد کسی نہ کسی شکل میں غالب اور غالب کی بیاض (نسخۂ لاہور/نقوش) کی دریافت سے متعلق ہے اور اچھا ہوا کہ 'نقوش' کے ان صفحات میں طفیل صاحب کے ہاتھوں محفوظ ہو گیا۔ بیاضِ غالب کی دریافت و اشاعت نے تحقیق کے مذاق کو عام اور اونچا کیا۔ سلسلۂ غالب کے اس "گنجِ شایگاں" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جائے گا۔

'نسخۂ لاہور/نقوش' کی اشاعت کے بعد ہی سے صرف "نقوش" کے تین پرچوں میں، اس نسخے کے تحسینی، تنقیدی اور تحقیقی مباحث کے بارے میں مجموعی طور پر تین سو سے زیادہ صفحات میں علمی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور لکھنے والوں میں پاک و ہند کے ممتاز غالب شناس اور اہلِ نظر شامل ہیں۔

(۸)

"نقوش" کے غالب نمبروں یا بعض عام نمبروں میں غالب کے لیے مخصوص گوشے قائم کرنے کے علاوہ 'نقوش' کے متفرق شماروں میں بھی جہاں جہاں طفیل صاحب غالب کے بارے میں اہم مضامین شامل اور شائع کرتے رہے۔ اس سلسلے کے چند منتخب حوالے یہاں بے محل نہ ہوں گے :

۱۔ شمارہ ۲۹ ـ ۳۰	غالبیات سے متعلق نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مضامین۔

۲۔ شمارہ ۴۵ - ۴۶	"قاضی عبدالودود کا 'جہانِ غالب'
۳۔ شمارہ ۶۱ - ۶۲	غالب کی مقبولیت کے اسباب (شیخ محمد اکرم) 'متفرقات' کے تحت "قاضی عبدالودود کے اشارات۔
۴۔ شمارہ ۶۷ - ۶۸	غالب کی شاعری (عطا محمد شعلہ)۔
۵۔ شمارہ ۶۹ - ۷۰	غالب اور جدید شاعری (آفتاب احمد) متفرقات "قاضی عبدالودود۔
۶۔ شمارہ ۷۷ - ۷۸	"تلامذۂ غالب" پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مضمون
۷۔ شمارہ ۸۱ - ۸۲	دیوانِ غالب کا نادر مخطوطہ/نسخہ بدایوں (امتیاز علی عرشی)
۸۔ شمارہ ۸۳ - ۸۴	غالب اور حادثہ اسیری۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۹۔ شمارہ ۸۹	شمشیر تیز تر (قاضی عبدالودود)۔
۱۰۔ شمارہ ۹۴	حادثۂ اسیری اور غالب (ڈاکٹر نثار احمد فاروقی)
۱۱۔ شمارہ ۹۵	نکات و رقعات غالب (اکبر علی خاں عرشی زادہ)۔
۱۲۔ شمارہ ۹۶	نوادرِ غالب (ڈاکٹر نثار احمد فاروقی)
۱۳۔ شمارہ ۹۷،	غالب اور مرثیہ نگاری (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)
۱۴۔ شمارہ ۱۰۳	غالب کی نئی فارسی تحریریں (امتیاز علی خاں عرشی)
۱۵۔ شمارہ ۱۰۶	غالب کے قصائد (ملک اسمٰعیل حسن خاں)۔
۱۶۔ شمارہ ۱۱۲	قدیم ترین نسخۂ دیوانِ غالب کی دریافت (جلال الدین)
۱۷۔ شمارہ ۱۲۰	قاطع برہان کی حمایت میں (اکبر حیدری کاشمیری)
۱۸۔ شمارہ ۱۲۱	اقبال اور غالب کے ذہنی رشتے (ڈاکٹر عبدالحق)
۱۹۔ نقوش (نیرنگ)	میر، غالب اور اقبال (مولانا حامد حسن قادری)
۲۰۔ شمارہ ۱۳۲	غالبیات کا مطالعہ (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، شعور اور لاشعور کا شاعر (تبصرہ میرزا ادیب)، فیض اور غالب (ڈاکٹر آفتاب احمد)

"نقوش" کے ان متفرق شماروں کے علاوہ "نقوش" کے دس سالہ نمبر، ادبِ عالیہ نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر اور ادبی معرکے نمبر' میں بھی غالب کی نگارشات یا غالب کے بارے میں مقالات و مضامین شامل ہیں۔

"نقوش" کے ان پرچوں میں غالبیات کے سلسلے کے اہم مطالعات نے جگہ پائی ہے۔ یہ تحریریں اپنے نفسِ مضمون اور اپنی معنویت، اپنے سلیقۂ اظہار اور بجائے خود مضمون نگاروں کی وجاہتِ علمی و استقامتِ ادبی کے اعتبار سے بے حد وقیع ہیں اور غالب

کے کسی بھی اچھے سے اچھے تحقیقی یا تنقیدی انتخاب میں لیے جانے کے قابل ہیں ۔

(۹)

"نقوش" کے غالب نمبروں کو بیک نظر دیکھیں یا "نقوش" کے دیگر شماروں میں موجود غالب سے متعلق کاوشوں پر نظر ڈالیں تو یہ تحقیق، تلاش، محنت، جانکاہی، منفرد مسلک اور حسنِ انتخاب اور صوری محاسن کی ان ساری خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ اور صف بستہ دکھائی دیتی ہیں جو ابُ نقوش' اور طفیل صاحب کا امتیاز اور وطیرہ بن چکا ہے ۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جسٹس سجاد احمد جان نے ایک موقع پر طفیل صاحب سے بے اختیار یہ سوال کیا کہ "آپ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے ہیں؟"

اُن کا بے ساختہ جواب تھا کہ "اسے پاگل پن سمجھ لیجیے !" جسٹس سجاد احمد جان نے بالکل صحیح کہا ہے کہ اس بے ساختہ جواب میں طفیل صاحب کی ساری شخصیت منعکس ہو گئی ہے" پاگل پن" کے لفظ کو مجنوں کی مناسبت سے "جنوں" میں تبدیل کر دیں تو حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا ۔

> "میں جب تہیہ کر لیتا ہوں کہ یہ کام کرنا ہے تو وہ کام میرے رگ و ریشے میں پیوست ہو جاتا ہے ۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر میں اس میں منہمک ہو جاتا ہوں ۔ سود و زیاں کا احساس غائب ہو جاتا ہے ۔ لگن، بے کل رکھتی ہے کہ کسی طرح یہ کام خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے ۔" (محمد طفیل، نقوش، ۱۳۱، ص ۹)

> "ادب کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے ۔۔۔ زمان و مکان سے آزاد! غالب نے بھی بھلا یہ کب سوچا ہوگا کہ میرے عشاق میں پنجاب کا مسمی محمد طفیل بھی ہوگا، جو یوں میرے لیے اپنی جان ہلکان کرے گا ۔ !"
>
> (محمد نقوش، غالب نمبر ۲، اس شمارے میں)

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ طفیل صاحب نے "غالب" کو "نقوش" کے خوانِ ادب کا جزوِ لازم بنایا اور ان کے ہاتھوں "نقوش" میں مطالعۂ غالب کی ایک ایسی ریت اور روایت پڑی اور یہ اس درجہ محکم اور بارآور ہوئی کہ اسے "نقوش" کے ایک قابلِ رشک شعبے اور ایک ناقابلِ تسخیر امتیاز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔۔۔ اور ہم عصر ادبی رسائل پر اس کے خوشگوار اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں ادبِ غالب میں "نقوش" کی حیثیت عہد ساز کی بھی ہے اور روایت ساز اور روایت آفریں کی بھی!

محمد طفیل اور "نقوش" کے اقبال نمبر

رفیع الدین ہاشمی

"موت سب کچھ چھین لیتی ہے، مگر وہ کسی سے اُس کے کارنامے نہیں چھینتی" (محمد طفیل: طلوع "نیرنگِ خیال" اقبال نمبر)

اپنی وفات سے نو برس پہلے، "طلوع" کی یہ آخری سطر لکھتے ہوئے مرحوم کو شاید احساس نہ تھا کہ وہ ایک ایسی بات کہہ گئے، کہ (اگرچہ انھوں نے تو بات عمومی انداز میں کہی مگر) وفات کے بعد انھیں ہی کی ذات اس کا مصداق ٹھہرے گی۔ موت نے محمد طفیل کو ہم سے اور دنیائے علم و ادب سے چھین لیا، مگر نقوش کی صورت میں ان کا کارنامہ زندہ ہے اور ایک ایسا یادگار اور لازوال کارنامہ، جو محمد طفیل کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

ایک عہد ساز جریدے کی حیثیت سے، اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں "نقوش" کی کوئی مثال نہیں ملتی، اگر "نقوش" کی عمومی اشاعتوں کو نظر انداز کر دیا جائے (اگرچہ یہ عمومی اشاعتیں بھی، بعض دیگر ادبی جرائد کی خصوصی اشاعتوں اور سالناموں کے برابر، بلکہ اکثر صورتوں میں اُن سے بڑھ کر ہیں۔ کیا بہ لحاظ معیار اور کیا بہ لحاظ ضخامت) اور قاموسی نوعیت کے حامل، اس کے خاص نمبروں پر نظر ڈالی جائے تو یقین نہیں آتا کہ یہ کسی ایک شخص کا کام ہے۔ افسانہ نمبروں سے لے کر رسول نمبروں تک میں اس قدر تضاد ہے (آپ اسے تنوع بھی کہہ سکتے ہیں) کہ کسی یک رُخے شخص یا معمولی ایڈیٹر کے لیے اس تضاد سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ یقیناً غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والا کوئی بڑا ایڈیٹر ہی یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

محمد طفیل غیر معمولی شخص تھے اور ایک بڑے ایڈیٹر!

"نقوش" اور محمد طفیل کا معاملہ تُو من شدی، من تو شدم والا معاملہ تھا۔ وہ محمد طفیل سے محمد نقوش ہو گئے۔

"نقوش"، محمد طفیل کی فنا فی النقوش شخصیت اور محمد نقوش کے ادبی کارناموں پر جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے، اس سے بہت کچھ آئندہ لکھا جائے گا۔ ع، لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ——— فی الوقت ہمارے پیشِ نظر نقوش کے اقبال نمبر ہیں۔ مختصراً یہ جائزہ لینا مقصود ہے کہ "نقوش" کے ان اقبال نمبروں نے اقبالیاتی ادب کو کس حد تک باثروت و مایہ دار بنایا اور اقبالیات میں جناب محمد طفیل کی پیش کردہ ان خاص اشاعتوں کا کیا مقام ہے۔

اقبالیاتی ادب میں جرائد کے اقبال نمبروں کا ایک خاص مقام ہے۔ اس روایت کا آغاز علامہ اقبال کی زندگی میں ہوا۔ "نیرنگِ خیال" نے ۱۹۳۲ء میں پہلا اقبال نمبر شائع کیا۔ اوّلیت کا اعزاز بھی کم نہیں ہوتا، مگر یہ نمبر، اس سے قطع نظر بھی، اقبال نمبروں کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ——— پہلا سنگِ میل ———!

اقبالؒ کی وفات کے معاً بعد چار اقبالؒ نمبر شائع ہوئے ،

(۱)	علی گڑھ میگزین	علی گڑھ	اپریل ۱۹۳۸ء ،
(۲)	جوہر	دہلی	۱۹۳۸ ، ۲۲۶ ص
(۳)	سب رس	حیدرآباد دکن	جون ۱۹۳۸ء ۱۸۰ ص
(۴)	اُردو	دہلی	اکتوبر ۱۹۳۸ء ۴۲۰ ص[1]

یہ چاروں نمبر علمی اعتبار سے انتہائی دقیع اور مستقل قدر و قیمت کے حامل تھے۔ چنانچہ ۲ تا ۴ دوبارہ، بلکہ سہ بارہ بھی چھاپے گئے۔ وفاتِ اقبال (۱۹۳۸ء) سے اقبال صدی (۱۹۷۷ء) تک ۳۹ برس کی اقبالیاتی پیش رفت میں، اقبال نمبروں کی یہ روایت بھی فروغ پذیر رہی۔ اس عرصے میں چھوٹے بڑے بیسیوں بلکہ سینکڑوں اقبالؒ نمبر منظرِ عام پر آئے۔ ان میں سے بعض نمبر اپنے محتویات کی بنا پر نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتے ہیں:۔

(۱)	پیغامِ حق	لاہور	۱۹۴۶ء	۲۹۸ ص
(۲)	نویدِ صبح	سرگودہا	۱۹۵۲ء	۱۴۷ ص
(۳)	نگارِ پاکستان	کراچی	۱۹۶۲ء	۱۲۳ ص
(۴)	خیابان	پشاور	۱۹۶۲ء	۱۶۰ ص
(۵)	ادبی دنیا	لاہور	۱۹۶۳ء	۲۶۳ ص
(۶)	سیارہ	لاہور	۱۹۶۳ء	۲۴۲ ص
(۷)	ماہِ نو	لاہور	۱۹۷۰ء	۲۶۲ ص
(۸)	ضیاءِ بار	سرگودھا	۱۹۷۳ء	۲۴۰ ص
(۹)	صحیفہ اوّل	لاہور	۱۹۷۳ء	۳۱۱ ص
(۱۰)	صحیفہ دوم	لاہور	۱۹۷۴ء	۱۳۵ ص
(۱۱)	اسلامی تعلیم	لاہور	۱۹۷۴ء	۲۰۳ ص
(۱۲)	راوی	لاہور	۱۹۷۴ء	۲۶۰ ص
(۱۳)	مہک	گجرانوالہ	۱۹۷۵ء	۴۹۶ ص[2]

نقوش کا اقبال نمبر (جلد اوّل، ستمبر ۱۹۷۷ء، ۵۷۶ ص) اس پس منظر میں طلوع ہوا۔ اپنے پیش رو اقبال نمبروں کے مقابلے میں یہ ضخیم تر تو تھا ہی، معنوی اعتبار سے بھی ان سب پر فائق تر ثابت ہوا۔ صرف تین ماہ بعد جناب محمد طفیل نے ایک اور ضخیم تر نمبر

---

[1] طبع جدید۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۷ء (ادارہ)

[2] اس فہرست میں اقبال صدی (۱۹۷۷ء) میں شائع ہونے والے رسالوں کے اقبال نمبر شامل نہیں ہیں (ادارہ)

پیش کیا (جلد دوم دسمبر ۱۹۷۷ء، ۶۵۳ صفحات) ——— دونوں جلدوں میں شامل جملہ تحریریں نوعی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:-

(۱) سوانحی احوال و کوائف (۲) تنقیدی مضامین (۳) علامہؒ کے فرمودات و ملفوظات

"حیات نامۂ اقبال" میں علامہ کی زندگی کے تقریباً تین سو اہم واقعات کی تاریخ اور ماہ و سال کے تعین کے ساتھ نشان دہی کی گئی ہے (ایک طرح سے یہ حیاتِ اقبال کا بنیادی خاکہ ہے) پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے "حیاتِ اقبال" کے عنوان سے علامہ کے وطن، اسلاف، پیدائش، تعلیم اور ملازمت وغیرہ کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں — مگر تحقیقی اعتبار سے (جلد دوم میں) اقبال کی تاریخ ولادت پر برِ صغیر کے دو نامور محققوں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے مقالے زیادہ تر اہم ہیں، جن کے مطابق اقبالؒ کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ یہ عین وہ زمانہ تھا جب سرکاری طور پر ۱۸۷۷ء کو علامہ کا سنِ پیدائش قرار دیا جا چکا تھا اور اسی حساب سے صد سالہ جشنِ ولادت منایا جا رہا تھا۔ جن دنوں "نقوش" کی جلد دوم منظرِ عام پر آئی، انہی ایام میں (۲ - ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء) لاہور میں اقبال پر سب سے بڑی بین الاقوامی کانگرس منعقد ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال میں مقالہ نگاروں کی جرأت مندی کے ساتھ "نقوش" کی جسارت آفرینی بھی لائقِ داد تھی۔ تاریخ ولادت کے مسئلے پر یہ دونوں مضامین محاورے کی زبان میں پتھر پر لکیر ثابت ہوئے اور آج تک کسی سے ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ یہ بات "نقوش" کے لیے باعثِ افتخار و اعزاز ہے ——

جلد اوّل کے تیسرے حصے میں اقبال کے سوانح اور شخصیت سے متعلق بہت سارا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے خصوصاً علامہ کے سفرِ مدراس، دکن اور علی گڑھ سے متعلق تفصیلات۔ محمد حنیف شاہد کے مضمون "اقبال بحیثیت ممتحن" سے علامہ اقبال کی زندگی کا ایک ایسا پہلو سامنے آتا ہے، جس کی تفصیلات سے اقبالؒ پر سوانحی کتابیں خالی نظر آتی ہیں، مڈل سے ایم اے، علامہ نے مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانی پرچے مرتب کیے اور جوابی کاپیاں جانچیں۔ اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بحیثیت ممتحن، اقبال کا رویہ حد درجہ بے لاگ اور منصفانہ تھا۔ ایک بار حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر ایم اے فارسی کے ایک طالب علم کو لے کر اقبالؒ کے ہاں گئے، مقصود یہ تھا کہ اس طالب علم کے پرچے میں دو چار نمبر بڑھا دیئے جائیں تاکہ سٹیٹ سکالرشپ، اس کے مدِ مقابل ہندو طالب علم کو نہ مل جائے۔ مگر علامہ کا جواب آج کے طالب علموں اور ممتحنوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ فرمایا:-

> "جو مستحق ہے اُسے یہ سکالرشپ ملنا چاہیئے۔ میرے کچھ اُصول ہیں، جن پر کار بند ہوں اور اپنے افعال کا جواب دہ ہوں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں، اُمید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔"

عبدالرشید طارق ایک بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ کسی امتحان کے پرچے ملاحظہ کر رہے تھے۔ علامہ کے پرچے جانچنے کے طریق اور معیار کا ذکر کرتے ہوئے راوی بتاتے ہیں کہ وہ پرچے دیکھتے ہوئے بڑے غور سے ایک ایک لفظ پڑھتے، جوابات پرکھتے، پھر کہیں جا کر نمبر لگاتے۔

جلد دوم میں بعض اصحاب کی یادداشتوں پر مشتمل مضامین بعض نئی سوانحی معلومات سامنے لاتے ہیں خصوصیت سے

خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ اور میاں عبدالعزیز مالواڈہ کا انٹرویو۔ ان میں بعض باتیں بالکل نئی ہیں۔ مثلاً گرامی سے اقبالؒ کے تعلقات کا آغاز اور اقبالؒ کے فارسی کلام پر گرامی کی اصلاح وغیرہ ـــــ الٰہ آباد میں علامہ کے دو روزہ قیام (۱۹۳۰ء) سے متعلق مختلف اصحاب کی یادداشتوں پر مشتمل مختار زمن کا مضمون (جلد اوّل) سوانحی اہمیت رکھتا ہے۔ پروفیسر عمرالدین کے نام غیر مطبوعہ خطوط (جلد دوم) اور شیخ دین محمد کے نام غیر مطبوعہ خط (پیش کردہ، ارشد میر، جلد اوّل) دستاویزات کے باب میں ایک اضافہ ہیں۔

تنقیدی مضامین کے بیشتر موضوعات نئے ہیں اور نادر ہیں۔ ان پر پہلے کسی نے شاذ و نادر ہی قلم اٹھایا ہوگا، اور لکھنے والے اہم تر ـــــ مولانا امتیاز علی عرشی (اقبال اور عراقی۔ اقبال اور آرزوئے نایافت) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (اقبال اور ابن عربی) ڈاکٹر یوسف حسین خاں (اقبال اور حافظ) رشید احمد صدیقی (اقبال اور شاعری) بشیر احمد ڈار (اقبال اور سنائی) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (اقبال کا نظامِ فکر) ڈاکٹر شمس الدین صدیقی (اقبال کا نظریۂ تاریخ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد (اقبالؒ کی اپنے کلام پر نظرِ ثانی) پروفیسر اسلوب احمد انصاری (جاوید نامہ کا ایک پہلو) ڈاکٹر نجم الاسلام (اقبال اور رسالہ معارف) پروفیسر گوپی چند نارنگ (اقبال کی شاعری میں صوتیاتی نظام) ڈاکٹر عبدالحق (اقبال اور غالب) اسی طرح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، کرنل خواجہ عبدالرشید، مکیش اکبر آبادی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محمد ہادی حسین، سید نذیر نیازی، پروفیسر محمد منوّر، ظ انصاری، ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر انور سدید، محمد طاہر فاروقی اور بہت سے دوسرے جید نقّاد اور علمائے اقبالیات اپنے حاصلِ تحقیق و تنقید کے ساتھ موجود ہیں۔ اس دور کے اقبال نمبروں میں (اور ماسبق کے نمبروں میں بھی) ہمیں مضامین و مقالات کا نیاپن نظر آتا ہے نہ ایسا تنوع اور نہ اتنی بڑی تعداد میں نامور فاضلین کا ایسا بڑا اجتماع۔ یقیناً یہ نقوش کے ان نمبروں کا خاص امتیاز ہے۔

اقبال کے فرمودات و ملفوظات کا ایک حصہ وہ ہے، جسے محمد حنیف شاہد نے پیسہ اخبار، انقلاب اور زمیندار کے پرانے شماروں سے حاصل کر کے مرتب کیا ہے (جلد اوّل) فرمودات کا ایک اور حصہ جلد دوم میں شامل بعض اصحاب کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ یہ سب اقبالیات کے بنیادی لوازمے کا حصہ ہیں ـــــ

'نقوش' کے اقبال نمبروں کے بیچ میں، جناب محمد طفیل نے ادارہ "نقوش" کی جانب سے نیرنگِ خیال کا تاریخی اقبال نمبر قندِ مکرر کے طور پر پیش کیا۔ ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والا یہ نمبر نایاب تھا اور نوادرِ اقبالیات میں شمار ہوتا تھا۔ اس نمبر کے قلم کاروں میں راغب احسن، محمد عبدالرشید فاضل، چودھری محمد حسین، ممتاز حسن، صوفی تبسم اور نذیر نیازی کے نام نظر آتے ہیں؛ اس وقت شاید یہ نام نئے ہونگے، مگر بعد ازاں کم و بیش یہ سارے اہلِ قلم بحوالۂ اقبالیات نامور ہوئے اور اقبالیاتی ادب میں وقیع اضافوں کا سبب بنے۔ طفیل صاحب اس یادگار دستاویز کو نئے پیرہن سے آراستہ کر کے، دیدارِ عام کے لیے سامنے لائے ـــ مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس طبعِ ثانی میں نیرنگِ خیال کے مختلف شماروں میں شائع شدہ مضامینِ اقبالیات "اضافہ" کے تحت جمع و مرتب کیے گئے۔ خاص نمبر میں ۲۸ مضامین تھے۔ نئے مضامین کی تعداد ۳۲ ہے یعنی بقول محمد نقوش:
"اصل زر سے سود بڑھ گیا" لکھنے والوں میں ایک سے ایک بڑھ کر نمایاں اور نامور ادیب اور نقّاد شامل ہیں۔ پروفیسر بوزانی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پطرس بخاری، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر تاثیر، نجیب اشرف ندوی،

تمکین کاظمی وغیرہ۔ یہ سب اُس وقت بھی علما اور جدید اہلِ قلم میں شمار ہوتے تھے اور آج بھی ہماری علمی دنیا اِن روشن ناموں اور ان کی ادبی فتوحات سے جگمگا رہی ہے۔ "نیرنگِ خیال" کے متفرق شماروں سے مضامین کے اخذ و تلاش کے سلسلے میں جناب محمد طفیل لکھتے ہیں:-

"میں نے "نیرنگِ خیال" کی فائلیں اُٹھائیں، گرد جھاڑی، انھیں چوما، ورق ورق دیکھا۔ وہ مضامین جو مجھے فائلوں میں ادھر اُدھر بکھرے نظر آئے۔ انھیں بھی، اس نمبر کی زینت بنا ڈالا...... محمد طفیل مطمئن ہو گیا۔ ٹنٹا ختم ہو گیا۔"

طفیل صاحب نے سارے حصے کو دو تین سطروں میں نمٹا دیا، حالانکہ معاملہ اتنا آسان ہے، نہ ایسا مختصر۔ ترتیب و تدوین کی راہ بہ ظاہر آسان، مگر فی الحقیقت بہت دشوار گزار اور پُر صعوبت ہوتی ہے۔ تلاش و تفتیش ایک طرح کی آزمائش ہے۔ محمد طفیل نے ہر کام کو ایک امتحان سمجھ کر کیا اور ہر آزمائش میں پورے اُترے، اقبال نمبروں کی تاریخ میں، اس پہلے "نمبر" کی اشاعتِ مکرر (مع اضافات) کا اہتمام کر کے طفیل صاحب "نیرنگِ خیال"، اور حکیم یوسف حسن کے ساتھ اپنی بقا کا سامان بھی کر گئے۔

"نقوش" کے دوسرے نمبروں کی طرح، اقبال نمبر بھی دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض چیزیں بلاشبہ بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس اعتبار سے اقبالیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ان سے رجوع و استفادہ ناگزیر ہوگا۔ تنقیدی حصے کی اہمیت یہ ہے کہ پامال اور روایتی موضوعات کے بجائے فکرِ اقبال کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ کسی مدیر کے لیے اقبال شناس حضرات کو اتنی بڑی تعداد میں جمع کر لینا آسان نہیں۔ یہ محمد طفیل کے حسنِ ادارت ہی سے ممکن ہو سکا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جملہ دستاویزات و مضامین کو جس ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شاید اس سے بہتر ترتیب ممکن نہ تھی۔

پہلی جلد کے اداریے میں طفیل صاحب نے لکھا تھا:

> "ایک امتحان کل [غالب صدی پر] درپیش تھا۔ ایک امتحان آج [اقبال صدی پر]
> درپیش ہے ——"

وہ اس آزمائش سے بھی سرخرو ہو کر نکلے۔ اُن کا پرچہ جوابات نقوش کے اقبال نمبروں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

دسمبر ۱۹۷۷ء کی دوسری جلد کے بعد بھی انھوں نے "نقوش" میں اقبالیات پر بہت سی چیزیں شائع کیں مثلاً جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر برِ صغیر کے چودہ نامور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں مگر "اقبالیاتِ نقوش" ایک الگ جائزے کا موضوع ہے۔

طفیل صاحب کسی خاص موضوع پر نادر و نایاب تحریروں کے کھوج لگا کر، اُن تک رسائی اور پھر اُن کے حصول کا گُر جانتے تھے۔ اُنھوں نے اقبالیات سے متعلق ایسی بہت سی چیزیں جمع کر لی تھیں۔ جلد دوم میں انھوں نے بتایا تھا کہ: ہمارا

کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی ایک جلد اور پیش کریں گے۔ وہ جلد علامہ اقبال کی دستاویزات اور ان کے نوادرات سے متعلق ہو گی ان شاءاللہ وہ جلد بھی جلد پیش کر دی جائے گی۔" ظاہر ہے کرنے والے کے لیے کام کبھی ختم نہیں ہوتا ———

طفیل صاحب "نقوش" کے ترکے میں یہ جلد بھی چھوڑ گئے ———

برادرم جاوید طفیل صاحب! کہتے ہیں، جانے والوں کا قرض چکانے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

مزید اقبال نمبر (ادارہ)

البیان، امرتسر ۱۹۴۲ء ص ۸۸ ۔ نگار، رام پور، ۱۹۶۳ء ص ۴۸ ۔ جام نو کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۰ ۔ راوی، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۱۵۲ ۔ القمر، لائل پور ۱۹۷۴ء ص ۱۵۲ ۔ اقرأ، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۲۸۰ تا

دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

ڈاکٹر تحسین فراقی

(۱)

۱۔ ع جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے

۲۔ ے جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

۳۔ ے سروِ لبِ جو، لالہ و گل، نسرین و سمن ہیں، شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا!

۴۔ ے تبعیت سے فارسی کے جو میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

۵۔ ع رفتہ رفتہ ہندستاں سے شعر مرا ایران گیا

۶۔ ع اوّل تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے

۷۔ ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا

۸۔ ے پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں!

۹۔ ع تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا!

یہ اور اس طرح کے متعدد اظہارات میر کے یہاں ملتے ہیں جنھیں عرفِ عام میں تعلّی کہا جاتا ہے لیکن جنھیں میر کے باب میں تعلّی کہنا شاید ظلم کے مترادف ہو۔ میر نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ "نکات الشعرا" کے آخری "خاتمہ" کے زیرِ عنوان ریختہ کی چند قسمیں بیان کرتے ہوئے انہوں نے چھٹی قسم کا نام "انداز" بتایا ہے:

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے

گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ۔ ایں ہمہ را در ضمنِ ہمیں است وفقیر ہم از ہمیں وتیرہ مخطوظم۔"

گویا میر کی شاعری صنائع بدائع کے جملہ محاسن کی حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں حسن وعشق کی ہزار رنگ کیفیتیں بھی ہیں، زمانے کی نیرنگیاں اور شعبدہ کاریاں بھی۔ فنا اور زوال کے مضامین بھی ہیں اور ان کو سہارتے اور زندگی کرنے کا متوازن سلیقہ بھی۔ ان رنگا رنگ کیفیتوں اور ان پہلو دار جذبوں اور حقیقتوں کو میر نے ایک ایسے اسلوب میں بیان کیا ہے جس پر ان کی ہمہ گیر شخصیت کی مہر لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کے اربابِ نظر ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ لاعصریت یا ہر عہد کی معاصرت — یہ میر کی شاعری کا امتیازِ خاص ہے اور اس ہمہ عصر رنگِ شاعری کے عقب میں ان کے عشق اور تصورِ عشق کی کار فرمائی صاف دیکھی جا سکتی ہے جو بیک وقت جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ کہا کرتے تھے:

> "اے بیٹا عشق اختیار کر، عشق ہی اس دنیا میں برسرِکار ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو یہ کائنات قائم نہ رہ سکتی۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے اور عشق کا دل باختہ ہونا کمال ہے۔ عشق بناتا بھی ہے، جلاتا بھی ہے۔ کائنات میں صرف اور صرف عشق ہی کا ظہور ہے۔ آگ سوزِ عشق کا نام ہے تو پانی رفتارِ عشق کا، خاک قرارِ عشق کا نام ہے تو ہوا اضطرارِ عشق کا۔ موت مستیٔ عشق کا نام ہے تو حیات ہشیاریٔ عشق کا۔"

میر کے درج ذیل اشعار انہی حقائق کی تفسیر ہیں: ـــ

؎ عشق معشوق عشق عاشق ہے　　یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

؎ شہرۂ عالم اسے یمنِ محبت نے کیا　　ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

کھا گیا نشترِ سرتیز جگر دل دونوں　　رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا

بُشرے کی اپنے رونق اے میر عارضی ہے　　جب دل کو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا

اس کا بحرِ حسن سراسر اوجِ موج و تلاطم ہے　　شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس کنار ہے آج

ایک طرف میر کی شخصیت میں عشق اور اس کی ہمہ گیری کا کامل رچاؤ تھا تو دوسری طرف اس کے پس منظر میں فارسی شاعری کی فلک بوس عمارت کھڑی تھی جس میں کہنا چاہیے کہ مسلم تہذیب کا عطر کھنچ آیا تھا۔ میر کی غزل منفرد ہوتے ہوئے بھی فارسی غزل کے اسالیب و اثرات سے آزاد نہیں ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ میر نے نہ صرف فارسی شاعری کے اثرات کو قبول کیا بلکہ کامل دو سال تک صرف فارسی ہی میں کہتے رہے اور بعد کے سالوں میں بھی کبھی کبھار یہ شغل جاری رکھا۔ ان کے بعض شعر بعض فارسی اشعار کا ٹھیٹھ اردو ترجمہ ہیں۔ دورانِ مطالعہ ان کے بعض شعر جو معروف فارسی اشعار کا ترجمہ نظر آئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

؎ اس گل تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند   رنگوں گلبرگ کے ناخن ہے معطر اپنا   میر

فارسی شعر:

؎ ناخن تمام گشت معطر ز برگِ گل   بندِ قبائے کیست کہ وامی کنیم ما — ؟

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ   ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں   میر

فارسی شعر:

؎ میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست   تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو   معشوق کا ہے حسن اگر دلنواز ہو

فارسی شعر:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

پھر میر کی وہ مشہور غزل "مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو"۔ ذہن میں لائیے اور اندازہ کیجئے کہ اس پر حافظ کی دو مشہور غزلوں

؎ معاشراں ز حریفانِ رفتہ یاد آرید

اور

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید

کا فیضان کس قدر واضح ہے۔ بہرحال کہنا صرف اس قدر ہے کہ میر کی تہ دار شاعری میں ان کی طبیعت تربیت اور تبعیت، تینوں کا ہاتھ ہے۔

میر کی ذہنیت اور طبیعت ادب خوردۂ دل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک قد آدم آئینہ ہے جس میں ہر دیکھنے والے کو اپنا چہرہ نظر آتا ہے۔ ذرا دیکھئے آج کی، مادیت میں گردن گردن ڈوبی انسانیت کے بارے میں میر کا اعلان کس قدر دلدوز ہے:

فکرِ تعمیرِ دل کسی کو نہیں   ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں

لیکن وہ جو تعمیرِ دل اور تہذیب نفس کر چکے ہیں ان کی عظمت کا اعلان بھی میر نے منفرد انداز میں کیا ہے:

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر   اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں   مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں   اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کی شاعری اور بالخصوص ان کی غزل اردو شاعری کا معجزہ ہے اور معجزے روز روز ظہور نہیں کرتے، البتہ ان کے ذریعے نئے سے نئے چراغ ضرور جلتے رہتے ہیں۔ میرؔ کی غزل نے اپنی معاصر شاعری ہی کو نہیں جدید ترین اردو غزل کو بھی متاثر کیا ہے جو اپنی جگہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے اور جس سے یہاں صرفِ نظر کیا جاتا ہے اور تو اور دو چار جگہ تو اقبال کے یہاں بھی میرؔ کی آواز سنی جا سکتی ہے کیا اقبال کے درج ذیل دو شعر میرؔ کے اشعار کی یاد نہیں دلاتے؟

ا۔ حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں ——— مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند اقبال
ب۔ اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے ——— اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں ″
ا۔ معمورِ شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر ——— مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالہ میر
ب۔ خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب ——— کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ ″

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق میں شعور سے جنون کرنے کا تصور نیا نہیں ہے اس لئے میرؔ و اقبال دونوں نے گویا ایک ہی سرچشمے سے استفادہ کیا ہے۔ میرؔ و اقبال کے یہ دونوں اشعار بیدل کا یہ شعر یاد دلاتے ہیں:

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

حافظ کے کلام کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگ ان کے دیوان سے فال لیتے تھے۔ میرؔ کا کلام بھی فال اور احوال کی چیز ہے اور اس میں گذشتہ و موجود کا حال ہی نہیں استقبال کا حال بھی موجود ہے۔ بعد کے آنے والوں نے نہ صرف ان کے اسلوب و ادا کی تقلید کی بلکہ بعض نے تو اپنے ادبی کارناموں کے نام بھی میرؔ کے اشعار سے اخذ کئے۔ "تلاشِ میرؔ" (نثار احمد فاروقی) اور "آخرِ شب" (کیفی اعظمی) کی ترکیبیں میرؔ کے ذیل کے دو شعروں سے ماخوذ ہیں۔ (یہ مسئلہ صرف دو کتب کے ناموں تک محدود نہیں):

تلاشِ میرؔ کی اب میکدوں میں کاش کریں ——— کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

———

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں ——— جیسے چراغِ آخرِ شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں

(۲)

میرؔ کی شاعری کی اسی ہمہ گیریت کا نتیجہ ہے کہ میرؔ پر اب تک متعدد کتب لکھی جا چکی ہیں، ان کے فکر و فن پر کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں اور ان کی شاعری کے متعدد منتخبات (خصوصاً مولوی عبدالحق اور محمد حسن عسکری کے انتخاباتِ میر) طبع ہو چکے ہیں اگرچہ میرؔ جیسے بڑے شاعر کا کوئی انتخاب بھی جامع نہیں کہلا سکتا۔ ان کی شاعری کی شرح نگاری سے بھی کسی قدر اعتنا کیا گیا ہے اور اس باب میں شمس الرحمٰن فاروقی کی کاوشیں لائق داد ہیں۔ میرؔ کی شاعری پر اہم کتب میں "میر تقی میر حیات اور شاعری" "تلاشِ میرؔ" "نقدِ میرؔ" اور "محمد تقی میرؔ" وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک ان کے فن و فرہنگ پر خصوصی شماروں کا

تعلق ہے اس باب میں نیرنگ خیال (رامپور) کے میر نمبر ۱۹۲۸ء، ساقی کے میر نمبر ۱۹۵۸ء، اور دلی کالج کے میر نمبر (۱۹۶۲ء) کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن خصوصی نمبروں کے سلسلے میں بہت اہم کارنامہ نقوش کا میر تقی میر نمبر ہے جو تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے، جس کے بعض مشمولات پہلی دفعہ منظر عام پر آئے ہیں اور جن کی وجہ سے میر شناسی کے بعض نئے ابواب کھلنے کا امکان ہے۔ ذیل میں اس کی تینوں جلدوں کا مختصر تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

نقوش کا میر نمبر جلد اول میر کی زندگی میں لکھے گئے نسخۂ محمود آباد (مخطوطہ ۱۲۰۳ھ) کے متن، غزلیاتِ میر کے انتخاب (از محمد طفیل) اور فرہنگِ کلیاتِ میر پر مشتمل ہے۔ نسخۂ محمود آباد ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کی دریافت ہے جسے اصلاً تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے پاکستان میں نقوش ہی کی جانب سے اشاعت کے لیے مرتب کیا تھا لیکن اس زمانے میں ۱۹۷۱ء) پاک و ہند کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہو گئے چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو اسے مجبوراً سری نگر سے شائع کرانا پڑا۔ البتہ پاکستان میں یہ نسخہ پہلی بار ادارۂ نقوش ہی کے توسط سے منظر عام پر آیا۔ فاضل مرتب کی تحقیق کے مطابق راجہ صاحب محمود آباد کے نادر کتب خانے میں دیوان میر کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے سب سے قدیم نسخہ ۱۲۰۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ نسخہ میر سوز کے شاگرد موتی لال حیف کا لکھا ہوا ہے۔ مرتب کا قیاس ہے کہ یہ نسخہ میر کی نظر سے بھی گزرا ہوگا کیونکہ یہ میر کی زندگی ہی میں لکھا گیا اور میر اس کی کتابت کے بعد ۲۳ سال تک زندہ رہے۔ مرتب نے زیر نظر نسخہ کا کئی پرانے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے تقابل کر کے اسے مرتب کیا ہے۔ اس نسخے کا صرف یہی امتیاز نہیں کہ یہ میر کی زندگی میں لکھا گیا بلکہ اس میں سینکڑوں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو سب کے سب غیر مطبوعہ تھے اور جو اپنے اندر ویسی ہی نشتریت رکھتے ہیں جس کے لئے میر کے بہتر نشتر مشہور ہیں۔ نسخۂ محمود آباد کے توسط سے میر کا جو کلام پہلی دفعہ منظر عام پہ آیا ہے اس میں میر کی پندرہ غزلیں۔ ایک مثنوی، دو قصیدے اور آٹھ رباعیات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مرتب نے مختلف تذکروں، نسخۂ آصفیہ اور دیگر مختلف مخطوطات سے بھی میر کے تین سو کے قریب غیر مطبوعہ اشعار اس مخطوطے میں شامل کئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر نے یہ مخطوطہ کس سن میں مرتب کیا۔ اس ضمن میں مرتب کا موقف یہ ہے کہ نسخۂ محمود آباد میں میر کا وہ کلام درج ہے جو انہوں نے ۱۱۶۵ھ سے قبل دلی میں ترتیب دیا تھا۔ ان کی روانگی لکھنؤ سے قبل دلی میں یہی دیوان مروج تھا۔ اس بات کا وافر ثبوت خود میر کے تذکرہ شعراء "نکات الشعراء" سے ملتا ہے جس میں میر کا اپنے اشعار کا تمام تر شامل کردہ انتخاب نسخۂ محمود آباد سے ماخوذ ہے۔

مخطوطے کے متن سے پہلے فاضل مرتب نے کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات میں میر کے حالات زندگی۔ ان کے بارے میں تذکرہ نویسوں اور اساتذہ کی آراء، الحاقی کلام، دیوانِ میر کے قلمی نسخے، کلیاتِ میر کے مطبوعہ نسخے اور آخر میں موجودہ نسخے کی اہمیت جیسے موضوعات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بہت وقتِ نظر سے زیر نظر مخطوطے کا متداول نسخوں سے تقابل کر کے اختلافِ نسخ واضح کیا ہے۔ کلیاتِ میر کے مطبوعہ نسخوں کی خصوصیات بھی انہوں نے خوبی سے واضح کی ہیں۔ اس باب میں انہوں نے کلیاتِ میر کے نسخۂ عبادت بریلوی کا بھی ذکر کیا ہے جو بے حد حیرت خیز ہے۔ جناب عبادت بریلوی کے تمام تر بلند بانگ دعووں

کے علی الرغم کہ انہوں نے کلیات میر کی ترتیب و تدوین میں تمام مطبوعہ و قلمی نسخوں کو دیکھا ہے اور یہ کہ کتب خانہ رامپور، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ انجمن اور کتب خانہ محمود آباد کے مخطوطے خاص طور پر ان کے پیش نظر رہے ہیں واقعہ یہ ہے بقول ڈاکٹر اکبر حیدری کہ عبادت صاحب نے "کلیات میر مرتب کرنے میں کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے بلکہ یہ نسخہ آسی کی ہو بہو نقل ہے۔ جو خامیاں آسی کے یہاں رہ گئی ہیں وہ سب کی سب اس میں موجود ہیں" (ص ۱۵۴) ۔ کم و بیش ایسا ہی حال کلیات میر مرتبہ ظل عباس عباسی کا ہے جس میں مرتب نے اسے نسخہ کلکتہ (۱۸۱۱ء) سے تقابل کے بعد شائع کرنے کا بے بنیاد دعویٰ کیا ہے حالانکہ یہ بھی نسخہ آسی کی نقل ہے اور وہ بھی نامکمل ۔

ایک بات جس کی جانب فاضل مرتب کا دھیان نہ ہوا یہ ہے کہ ان کا زیر تعارف مخطوطہ میر کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا اور میر اس کی کتابت کے بعد متصل تیئس ۲۳ سال تک زندہ رہے۔ اب اہل نظر خصوصاً شاعر یا شعری و تخلیقی عمل سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ شاعر کا ایک دفعہ کا کہا گیا کلام حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی اور نظر ثالث کی کٹھالی سے گزرتا رہتا ہے۔ میر جو زیر نظر مخطوطے کی کتابت کے بعد کم و بیش ایک چوتھائی صدی جیئے کیا انہوں نے اس طویل عرصے میں اپنے سابقہ کلام پر نظر ثانی نہ کی ہوگی۔ یقیناً کی ہوگی کیونکہ اسی کے باعث متداول نسخوں میں متون کا اختلاف سامنے آتا ہے۔ (اگرچہ اس کی وجوہ میں کاتب کے تصرفات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) ۔ ایسی صورت میں صرف وہی نسخہ اہم ترین قرار دیا جا سکتا ہے جو آخری نظر ثانی کے بعد شائع ہوا ہو۔ کیا اس اعتبار سے نسخہ کلکتہ سب سے بڑھ کر قابل ترجیح نہ ہوگا گو کہ کتابت کی غلطیوں سے وہ بھی پاک نہیں۔ اس ضمن میں کسریٰ منہاس کا قابل قدر مضمون "میر کی اصلاحیں" جلد سوم میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مرتب کے زیر تعارف نسخے اور کسی متداول نسخے (مثلاً نسخہ سردار جعفری) میں سے تین شعروں کا تقابل ملاحظہ ہو :

نسخۂ سردار جعفری	نسخۂ محمود آباد
۱۔ آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم	آتش بلند دل کی نہ ہوئی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا	یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
۲۔ صدائے آہ جیسے تیر، جی کے پار ہوتی ہے	صدائے آہ جی کے پار ہوئی تیر سی شاید
کسو بے درد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو	کسو بے درد نے کھینچا کسی کے دل سے پیکاں کو
۳۔ جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی	جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گھسی
حق بندگی ہم ادا کر چلے!	حق بندگی ہم ادا کر چلے!

پہلے شعر کے تقابل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسخۂ سردار جعفری میں آتش بلند دل کی نہ تھی ..... الخ ہے جبکہ نسخۂ زیر تعارف میں یہ ہوئی ہے . الخ ہے اب دیکھئے کہ نسخہ جعفری میں مصرعے کی بندش کس قدر چست ہے اور اس کے مقابلے میں ہوئی کا واؤ جب تک قریب قریب ساقط نہیں کر دیا جاتا مصرعہ وزن میں نہیں پڑھا جا سکتا۔ اسی طرح دوسرے شعر کے تقابل سے بھی

نسخۂ زیرِ تعارف کے شعر کا عیب واضح ہوتا ہے کیونکہ صدائے آہ جی کے پار ہوئی تیر... الخ سے تنافر کا عیب ابھرتا ہے جس سے نسخۂ جعفری والا شعر پاک ہے۔ تیسرے شعر کے تقابل سے بھی ترجیح نسخۂ جعفری کے شعر ہی کو دی جا سکتی ہے کیونکہ حقِ بندگی" تو کماحقہٗ تبھی ادا ہو سکتا ہے جب جبیں سجدہ کرتے کرتے معدوم ہو جائے چنانچہ "جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی" ——— میں جو بلاغت ہے وہ" جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گھسی" میں ہرگز نہیں۔

لیکن اس اختلاف سے قطع نظر یہ بھی واقعہ ہے کہ زیرِ تعارف مخطوطے کا متن متداول نسخوں کے متن کی نسبت زیادہ قرینِ صحت ہے خصوصاً صحتِ کتابت کے حوالے سے، غیر مطبوعہ کلام اس پر مستزاد۔

اس جلد کے آخر میں کلیاتِ میر مرتبہ آسی سے فرہنگ لے کر بھی شامل کر دی گئی ہے جس سے جہاں میر فہمی میں آسانی ہو گی وہیں میر کی لفظیات کی وسعت اور تنوع کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

نقوش کے میر نمبر کی جلد دوم میں میر کے فکر و فن، حالات اور شخصیت پر ۳۷ مضامین شامل ہیں۔ اس جلد کو اگر میر پر لکھے گئے سیکڑوں مطبوعہ مضامین میں سے بعض اہم مضامین کا منتخب گلدستہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ مضامین جن کتب یا رسائل میں سے منتخب کیے گئے ہیں ان میں سے چند کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ کلیاتِ میر (نسخۂ آسی)، حدیثِ میر، نقدِ میر، تلاشِ میر، انسان اور آدمی، بہترین مقالے — حلقۂ اربابِ ذوق، دلی کالج میر نمبر، کلیاتِ میر (مرتبہ ظلِ عباس عباسی) رسالہ اُردو کراچی، اور معارف اعظم گڑھ وغیرہ۔ یوں زیرِ نظر جلد کے کم و بیش نوّے فی صد مضامین مطبوعہ ہیں۔ تازہ لکھوائے گئے مضامین میں کسریٰ منہاس کا مضمون "میر کے شاگرد" اور میرزا ادیب کا مضمون "میرؔ کا مرثیۂ دلی" شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا طویل اور قابلِ قدر مضمون "مطالعۂ میرؔ" بھی غیر مطبوعہ ہے۔ بعد ازاں یہی مضمون کتابی شکل میں "محمد تقی میرؔ" کے نام سے بھی شائع ہوا اور جالبی صاحب کی تاریخ ادب اردو جلد دوم کا حصہ بھی بنا۔ اصلاً یہ انجمن ترقی اردو میں دیئے گئے دو[۲] بابائے اُردو یادگار لیکچر تھے۔ ان پر کسی قدر محاکمہ آگے چل کر ہو گا۔ ان منتخب ۳۷ مضامین میں سے جو مضامین خصوصیت کے ساتھ میر شناسی کے باب میں اہم ہیں وہ ہیں: دیباچہ کلیاتِ میر (آسی)، انتخابِ میر (عبدالحق) میر کا مدفن (نادم)، میر کے مطالعہ کی اہمیت (آلِ احمد سرور)، میر کا رنگِ طبیعت (سید عبداللہ) میر اور ہم (مجنوں گورکھپوری)، میر کی شاعری کے چند پہلو (فراق)، میر تقی میر (امرناتھ جھا) مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (شبیہ الحسن نونہروی)، میر کی عشقیہ مثنویاں (گیان چند) کیا میر قنوطی تھے (سلامت اللہ خاں) میر کی ہجویہ شاعری (اظہر راہی) میر تقی میر (ناصر کاظمی)، عہدِ میر کی زبان (وحید الدین سلیم) میر کی فارسی شاعری (ابواللیث صدیقی)، میر کا فارسی کلام (اختر تلہری) اور مطالعۂ میر (جمیل جالبی)۔ چونکہ ان مضامین کا فرداً فرداً محاکمہ ممکن نہیں اس لیے ان میں سے چند پر اجمالاً گفتگو کی جاتی ہے۔

میر کا مدفن میں نادم سیتاپوری نے میر کی قبر کے سلسلے میں مختلف اوقات میں ہونے والے قیاسات کی دلچسپ تفصیل فراہم کی ہے لیکن نتیجہ یہ نکالا ہے کہ آج تک میر کی قبر کی صحیح نشاندہی نہیں ہو سکی۔ میرا خیال ہے کہ میر کو اپنی زندگی ہی میں اس کا احساس ہو گیا تھا تبھی انہوں نے اس امر کی پیش قیاسی کر دی تھی:

مت تربتِ میر کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

ہم رہروانِ راہ فنا ہیں برنگِ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

فراق صاحب کا مضمون "میر کی شاعری کے کچھ پہلو" زیرِ نظر دوسری جلد کا اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں فراق نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ میر کے دکھ اور درد ہی پر نہیں بلکہ ان کی بصیرت اور بلند فکری پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے کیونکہ کلامِ میر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ یہی وہ اہم پہلو ہے جس کا ذکر سید عبداللہ نے بھی اپنے مضمون "کلامِ میر میں فکری عنصر" میں کیا ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مضمون میں میر کو اپنے وقت کے ہندوستان کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اردو ہی نہیں دنیا بھر کے ادب میں شاید دو چار ہی شاعر ایسے گزرے ہوں جو اپنی شاعری میں اپنی تصویر کھینچ سکے ہوں۔ فراق کے بقول میر کے زمانے میں کسی شعبۂ زندگی میں کوئی بڑا آدمی تھا ہی نہیں۔ اصل میں تاثراتی تنقید کی یہی سب سے بڑی ٹھوکر ہے کہ اس کی رو بعض اوقات ایسی جذباتی دھند پیدا کرتی ہے کہ سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اول تو دنیا بھر کے ادب کے عرفان کا دعویٰ ہی بڑی بات ہے دوسرے جس زمانے میں شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت موجود ہو جس نے مسلم فکریات میں انقلاب برپا کر دیا اور جس کے عمرانی نظریات دیگر قوموں کے لئے بھی رہنما اصول کا کام دے سکتے ہیں۔ اس دور کے بارے میں کہنا کہ اس میں کسی بھی شعبے میں کوئی بڑی شخصیت نہ تھی اصلاً تاریخ ناشناسی کی کھلی علامت ہے۔ پھر آگے چل کر اقبال کی معاصر دسیوں شخصیات کو اقبال کی شخصیت سے زیادہ وزنی قرار دینا اور میر کی آفاقیت کے مقابلے میں اقبال کو ملیت اور خودی کا پرچارک قرار دے کر انھیں ایک چھوٹی شخصیت قرار دینا بھی فراق کی تنگ نظر ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ در اصل اقبال بہت سوں کی طرح فراق کی بھی چڑ ہیں نتیجہ یہ ہے کہ فراق جیسے بہت سے ؏

آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے.

آگے چل کر فراق، غالب اور میر کے غم کا تقابل کر کے بتاتے ہیں کہ غالب کا غم غالب کا غم معلوم ہوتا ہے جبکہ میر کا غم ایک دورِ تاریخ کا بھی غم ہے اور پوری انسانیت کا بھی غم ہے۔ اگرچہ یہ تقابل بذاتِ خود بہت حد تک قابلِ بحث ہے لیکن اصل لطیفہ آگے چل کر ہوتا ہے جب فراق لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے قریب جب غالب نے وہ قطعہ نما غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:
داغِ فراقِ صحبتِ شب .... الخ تو غالب کا غم آفاقی غم بن جاتا ہے۔" حالانکہ یہ بات اب متحقق ہے کہ غالب نے یہ پوری غزل ۲۹ سال کی عمر میں ۱۸۲۶ء میں لکھی۔ بہر حال اس مضمون میں فراق نے بعض بہت پتے کی باتیں بھی کی ہیں مثلاً یہ کہ شاید ہی اردو کا کوئی شاعر احساسِ حسن کے معاملے میں ان منتخب خارجی مناظر کی مصوری میں اتنے جیالے حواسِ خمسہ کا ثبوت دے سکا ہو جن کی مثالیں میر کے یہاں ملتی ہیں۔ مزید یہ کہ بقول فراق میر اپنی تمام باتوں کو کم کر کے بلکہ خاموش رہ کے یا قریب قریب خاموش رہ کے بات کو بہت بڑھا دیتے ہیں

موٹے لوہے کو باریک کرکے یعنی لوہے کی مقدار کم کرکے وہ دھار پیدا کی جاتی ہے جسے ہم تشریت کہتے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں DILUTION دواؤں کی قوت کو سیکڑوں، ہزاروں لاکھوں گنا تک بڑھا دیتا ہے .... میر کے اشعار کی کم گوئی قیامت کا اثر رکھتی ہے (دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی میر کی غزل کو ہومیوپیتھی کے حوالے سے سمجھایا ہے اگرچہ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ میر کے غم کا اثر ایک کامیاب ٹریجڈی کا سا ہوتا ہے .... یہ اثر ہومیوپیتھی کی دوا کی طرح ہوتا ہے جو مرض کو بڑھا کر اس کا علاج کرتی ہے)

مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "میر اور ہم" میں ثابت کیا ہے کہ میر کا یاس پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں میر کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے سارے کرب اور اضطراب کو ظاہر کرتی ہے۔ آگے چل کر مجنوں اس امر کا اعتراف کرنے کے باوجود کہ میر صوفیوں اور درویشوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں تصوف اور معرفت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میر کے یہاں متصوفانہ مضامین بھی موجود ہیں اور ان کے اشعار سے وہ طرزِ زیست بھی پھوٹا پڑتا ہے جس کو تصوف کے ساتھ ایک نسبتِ خاص ہے۔ تصوف میر کے لیے "برائے شعر گفتن خوب است" نہیں تھا بلکہ ایک طرزِ زیست تھا۔ یہ طرزِ زیست میر کے گھٹ میں اتر چکا تھا اور اسی لیے انہوں ایسے اشعار کہے جو قال نہیں حال معلوم ہوتے ہیں۔ صرف چند شعر ملاحظہ کریں۔

؎ میر فقیر کو سُکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب   ملنے والوں پھر ملے گا وہ ہے عالم دیگر میں

خوب کیا جو اہلِ کرم کے جور کا کچھ نہ خیال کیا
ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ہی ترکِ سوال کیا

ثباتِ قصر و در و بام و خشت و گل کتنا   عمارتِ دل درویش کی رکھو بنیاد

مشو غافل اوقات را در نظر دار   کہ وقت است چوں سیفِ قاطع، خبردار

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم   یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نما کا

آبِ حیات وہی نا جس پہ خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت ہے

جس طرح مجنوں نے بتایا ہے کہ میر کا یاس پرستی سے کوئی تعلق نہیں، سو اسی خیال پر ڈاکٹر سلامت اللہ خاں نے بھی ایک اچھا مضمون بنایا ہے۔ ان کے خیال میں میر کا غم بیشتر بنی نوع انسان کا غم ہے اور اہم تر بات یہ ہے کہ میر کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں وہ جس فراخدلی سے اپنے آپ پر ہنستے ہیں وہ اردو غزل میں نئی اور قابلِ لحاظ بات ہے۔

میری رائے میں زیرِ نظر جلد کا اہم ترین مضمون ناصر کاظمی کا "میر تقی میرؒ" ہے۔ اصل میں ایسی تخلیقی تنقید میر سے شدید جذباتی ربطِ ذہنی و قلبی کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ میر پر لکھنے والے عموماً میر کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی شکست و ریخت کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ایک نئی شان اور نئے آہنگ سے: "شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی۔ علم و ہنر کی رسم اٹھ چکی تھی۔ جانے والے تختِ طاؤس، کوہِ نور کا ہیرا۔ عقیق و مرجان کی ٹہنیاں اور عصمت کے پھول چن چن کر لے گئے۔ خون کی ہولی اور زرد چہروں کی بسنت چھوڑ گئے۔"

آگے چل کر میر کی الم پرستی کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ غم اور خوشی، امید اور نا امیدی ایک دوسرے کی سوت نہیں بلکہ زوجین ہیں اور بڑے شاعر کا احساسِ الم، غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ میر کی شاعری کس طرح اپنے زمانے کی تصویر بن گئی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے ناصر کاظمی لکھتے ہیں کہ میرؔ نے اپنے زمانے کی تصویر کشی کے لیے اپنے مقطعوں سے بھی خوب کام لیا ہے۔ ان مقطعوں میں بے حد وسعت ہے چنانچہ میر کا تخلص محض میر تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اسی مضمون میں ناصرؔ نے میر اور اقبال کے متحد المعانی مضامین کی نشاندہی بھی کی ہے میر اور اقبال کی ایسی فکری و اسلوبی مماثلتیں میرے خیال میں پہلی بار ناصر ہی کے قلم سے ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن کیا میرؔ بعض اصنافِ سخن مثلاً واسوخت، مثلث، مربع اور تضمین کے موجد بھی تھے جیسا کہ ناصر کا خیال ہے، یہ دعویٰ ہرگز درست معلوم نہیں ہوتا۔

زیرِ نظر جلد کے دیگر اہم مضامین میں ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کا "میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ" میر کا فارسی کلام (اختر علی تلہری)، اور مطالعہ میر (جمیل جالبی) شامل ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں نے اپنے مضمون میں مولانا راشد برہان پوری کے یہاں ایک مخطوطہ مثنوی بنام "قضا و قدر" کی نشاندہی کی ہے جس میں سوائے چند اختلافات کے وہی قصہ نظم کیا گیا ہے جو بعد ازاں میرؔ نے اپنی مثنوی کے لیے چنا۔ مثنوی قضا و قدر ۱۱۳۳ھ میں کتابت کی گئی۔ لیکن اس کے لکھنے والے کا نام یا تخلص معلوم نہیں۔ فنی اعتبار سے بھی یہ مثنوی کمزور ہے اور مصنف نے بعض جگہ تو قوافی تک کا بھی خیال نہیں رکھا۔ ہو سکتا ہے یہ مثنوی میر کی مثنوی کا ماخذ رہی ہو لیکن میرے خیال میں اس بات کا بھی تو امکان ہے کہ یہ قصہ بطورِ قصہ اس زمانے میں مشہور ہو اور دونوں شعراء نے اسے اپنے اپنے طور پر نظم کیا ہو۔ بہر حال یہ بات ابھی تک تحقیق طلب ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں میر کی فارسی شاعری پر تین مضامین شامل ہیں۔ ابواللیث صدیقی نے اپنے مضمون "میر کی فارسی شاعری" کا اچھا تعارف کرایا ہے۔ البتہ مضمون کی ابتداء میں انہوں نے بتایا ہے کہ اب تک میر کے دو فارسی کارنامے عام طور پر متعارف تھے یعنی نکات الشعراء اور ذکرِ میر۔ "ذکرِ میر" کی تہ میں بقول مصنف میر کے اندوہگیں جذبات کی شدید رو چلتی صاف نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہاں معاملہ تہ کا نہیں۔ یہ درد اور گداز تو اتنا ظاہر و باہر ہے کہ میر کی یہ آپ بیتی حزن و گداز کا ماتم کدہ لگتی ہے۔ پھر مسلم الثبوت اساتذہ کے ذکر میں ابواللیث، غالب کا ذکر کرتے ہیں اور ایک پیش پا افتادہ کلیشے کو دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب تو اپنے فارسی کلام ہی پر فخر کرتے ہیں اور اردو کو اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض نیم صداقت ہے۔ اگر غالبؔ نے اپنی فارسی کلام شاعری پر فخر کرتے ہوئے اردو شاعری کو اپنے لیے بے رنگ کہا ہے (باعثِ ننگ نہیں)، تو یہی غالب اپنی اردو شاعری کے بارے میں ایک موقعہ پر یہ بھی تو کہتے ہیں جس کی طرف معلوم نہیں ابواللیث صاحب کا ذہن کیوں منتقل نہ ہو سکا۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اسی مضمون میں دنیا کی بے ثباتی کے ذکر میں انہوں نے انشاؔ کے مشہور شعر "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں ... الخ" کو غالب سے منسوب کر دیا ہے مگر ان تمام تر تسامحات کے باوجود لیث صاحب کا یہ مضمون بحیثیتِ مجموعی میر کی فارسی شاعری کو بطریقِ احسن متعارف کراتا ہے انہوں نے اس ضمن میں مسلم یونیورسٹی کے سبحان اللہ سیکشن میں موجود میر کے فارسی شاعری کے مخطوطے کا تعارف کرایا اور ان کی فارسی شاعری کا کہیں کہیں ان کی اردو شاعری کے بعض مضامین سے تقابل کیا ہے ۔

مصحفی نے اپنے تذکرے "عقدِ ثریا" میں میرؔ کی فارسی شاعری کے ذکر میں لکھا ہے کہ چونکہ ریختہ کے فن میں میر کو شروع ہی میں ناموری حاصل ہو چکی تھی اس لئے اپنی فارسی شاعری پر انھیں اتنا فخر نہیں اگرچہ ان کا فارسی کلام ریختہ سے کم رتبہ نہیں۔ مصحفی میر سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے دو برس تک ریختہ کا شغل موقوف رکھا تھا اور اس زمانے میں قریباً دو ہزار فارسی اشعار پر مشتمل دیوان تیار ہو گیا تھا ۔

ممکن ہے ابتداً یہ دیوان دو ہزار اشعار ہی پر مشتمل ہو جبکہ اصلاً یہ تین ہزار اشعار سے متجاوز ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میر اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً فارسی میں شعر کہتے رہے ہوں گے ۔ بہر حال جس طرح مصحفی نے میرؔ کے فارسی کلام کی اہمیت کا احساس دلایا ہے اسی طرح اختر علی تلہری نے بھی اپنے مضمون "میر کا فارسی کلام" میں ان کی فارسی شاعری کو منفرد قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فارسی میں میر کی تراکیب تراشی کا بھی خوبی سے محاکمہ کیا ہے ۔

زیرِ نظر جلد کا ایک اور اہم اور شاید اس شمارے کا طویل ترین مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کا "مطالعہ میر" ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں جالبی صاحب نے میر کے سنِ ولادت کا تعین کیا ہے اور اس سلسلے میں میر کے نسخۂ محمود آباد کے دیوانِ چہارم سے استناد کیا ہے ۔ خان آرزو کے باب میں نکات الشعرا اور ذکرِ میر کے باہم متعارض بیانات کی چھان پھٹک کی ہے اور قائم، میر حسن، عشقی، قاسم اور صاحب نوادر الکلام کے بیانات سے استشہاد کر کے بتایا ہے کہ میر نے خان آرزو سے ایک مدت تک تحصیلِ علم کی گو ذکرِ میر میں میر اس کا اعتراف نہیں کرتے حالانکہ ذکرِ میر تک میں مستعمل فارسی محاورات پر خان آرزو کے فیضان کی گواہی ملتی ہے ۔ اسی لیکچر میں جالبی صاحب نے میر کے ذہن کی ساخت کا بھی بصیرت افروز مطالعہ کیا ہے ۔ ہکسلے کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ میر کا دماغ ایسا تھا جو قتل ہو جانے پر آمادہ ہو :

بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت بھی
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

جالبی صاحب نے اپنے اس مضمون میں میر کی ہمہ وقت بے دماغی کے عام تاثر کو بھی یک طرفہ بتایا ہے ۔ ان کے خیال میں میر انا پرست ضرور تھے لیکن وہ زمانے کی کشمکش سے الگ تھلگ رہ کر اپنے ہی غموں میں محو نہیں رہے بلکہ وہ اس دور کے سیہ واقعات کے عینی شاہد اور ان میں کسی قدر شریک تھے ۔ یہ بات بھی بقول مصنف قابلِ غور ہے کہ میر سے زیادہ سفر اس دور "

کسی شاعر نے نہیں کیا۔ اصل میں میر کی بے دماغی یا بددماغی کا دور ۱۷۷۲ء، اس کے بعد شروع ہوتا ہے جب وہ معرکۂ سکرتال کے بعد دلی آکر خانہ نشین ہو گئے تھے۔

مضمون کے دوسرے حصے میں میر کی شاعری سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ میر کی شاعری کے بارے میں معروف حوالے "پستش بغایت پست ... الخ" کا ذکر کرتے ہوئے جالبی صاحب نے بڑی فکر افروز بات کی ہے اور وہ یہ کہ ہر بڑے شاعر کے کلام میں پست اور بلند میں گہرا تعلق ہوتا ہے جس سے اس کے تخلیقی عمل کے ارتقا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں جالبی صاحب نے زبان کے سلسلے میں میر کی خدمات کا جائزہ بھی مرتب کیا ہے۔ یوں اس مضمون میں تحقیق و تنقید ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی نظر آتی ہیں۔

یوں تو نقوش کے میر تقی میر نمبر کی پہلی دو جلدیں بھی اہم ہیں لیکن اس کی تیسری جلد میری نگاہ میں اہم ترین ہے۔ اس حصے میں دس مضامین شامل ہیں۔ اس جلد کا آغاز امتیاز علی خاں عرشی کے مضمون "کلیاتِ میر کا ایک نادر نسخہ" سے ہوتا ہے اور اس کا آخری مضمون کسریٰ منہاس کا "میر کی اصلاحیں" ہے۔ عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں رضا لائبریری رامپور میں موجود میر کی کلیات کے ایک "بہت اچھے نسخے" کا تعارف کرایا ہے۔ اس نسخے کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں میر کی مثنوی دریائے عشق کا فارسی نثر میں (مسجع و مقفیٰ) خلاصہ بھی درج ہے جس کا عنوان ہے "نثرِ مثنوی دریائے عشق"۔ بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ یہ نثری خلاصہ بھی میر ہی کے قلم سے ہے مگر اس باب میں فاضل مضمون نگار نے کوئی وضاحت نہیں کی۔

اگرچہ اس جلد کے دیگر مضامین بھی مثلاً میر کے دیوانِ سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ (ڈاکٹر حنیف نقوی) اور میر کا دیوانِ چہارم (نسخہ محمود آباد ـــ اکبر حیدری) قابلِ قدر ہیں لیکن اس جلد کا اہم ترین مضمون دراصل مظفر علی سید کا "میر کی فارسی سخن گوئی ـــ برصغیر کے تہذیبی پس منظر میں" ہے جبکہ تحقیقی حوالے سے اس جلد میں مخطوطہ دیوانِ فارسی (نسخۂ رضوی) اور میر کے کلیاتِ فارسی (مخطوطہ حیدرآباد دکن) کے عکس کے شمول سے اس جلد کی قدر و قیمت بے انتہا بڑھ گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میر کو جس طرح اپنی اردو شاعری پر ناز تھا، اسی طرح وہ اپنی فارسی شاعری پر بھی بجا طور پر مفتخر تھے چنانچہ خود کہتے ہیں:

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما

دیگر

گذشت نوبتِ قدسی و صائب و طغرا
دریں زماں ہمہ دیوانِ میر می خوانند

چنانچہ اسی فارسی کلام کے حامل "مخطوطہ دیوانِ فارسی" (نسخہ رضوی) کا تعارف مسعود حسن رضوی ادیب کے فرزند ڈاکٹر نیر مسعود نے کرایا ہے اور انہی کے توسط سے یہ نسخہ پہلی بار منصۂ ظہور پر آیا ہے۔ آج سے پینسٹھ چھیاسٹھ برس قبل ادیب صاحب کو لکھنؤ ہی سے میر

کی غیر مطبوعہ اور نہایت کم یاب تصانیف کا جو مجموعہ ہاتھ لگا تھا انہی میں میر کا دیوانِ فارسی بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی فراہم کردہ مخطوطۂ رامپور کی نقل اور جزوی طور پر مخطوطۂ ادبیاتِ اردو (ن ۲) سے تقابل کر کے نسخۂ رضوی ادیب مدون و مرتب کیا ہے۔ ادبی دنیا کو ڈاکٹر نیر مسعود اور محمد طفیل مدیر نقوش کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے توسط سے میر کی پانچ سو بائیس فارسی غزلیات، ایک سو چار رباعیات، ایک مثنوی (اے صبا گر سوئے دہلی بگزری) اور ایک مسدس (ترجیع بند) پہلی بار سامنے آتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر نیر مسعود نے اس فارسی دیوان کا اشاریہ اور فرہنگ اضافہ کر کے اس کی افادیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اس طرح محمد اکبر الدین صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جن کے تعاون سے میر کی کلیاتِ فارسی کے مخطوطہ، ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن کا مکمل عکس فراہم ہوا اور جو زیرِ نظر تیسری جلد میں موجود ہے۔ اس طرح محققین کے لیے ڈاکٹر نیر مسعود کے تیار کردہ نسخۂ رضوی کے متعینہ اور اکبر الدین صدیقی کے فراہم کردہ عکس کا تقابل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں میر کے فارسی کے شعری کلام کے پہلی دفعہ منظرِ عام پر آنے سے میر شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

جناب مظفر علی سید نے میر کی فارسی سخن گوئی کا برصغیر کے تہذیبی پس منظر کا بڑی شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے برعظیم کے فارسی گوؤں کے اسالیب اور بالخصوص سبکِ ہندی کا بھی ذکر کیا ہے جو اصلاً ایران ہی سے شروع ہوا تھا۔ انہوں نے یہ اہم سوال بھی اٹھایا ہے کہ جس وقت ہمارے یہاں میر و سودا کا دور دورہ تھا اور ہمارے شاعر بیدل اور ناصر علی کی روش پر چلنے کی بجائے ریختہ میں فارسی کے کلاسیکی شعرأ کا معیارِ سخن قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس معیار کی طرف ان کے رہنما کون ہوئے؛ خان آرزو، مرزا مظہر یا شاہ گلشن؟ سید صاحب خان آرزو کی رہنمائی کو تو یک قلم خارج از امکان قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کا تدریسی اندازِ نقد اور ایران کی معاصر شاعری سے بے اعتنائی کسی تخلیقی تحریک کو جنم نہ دے سکتے تھے۔ باقی دو کے باب میں، سید صاحب خاموش ہیں چنانچہ میرا خیال ہے کہ ان باقی دو کو وہ تخلیقی محرک کے طور پر قبول کرتے ہوں گے۔ خود اقبال تک اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان میں کلاسیکی فارسی ذوقِ شعری کی آبیاری بہت حد تک مرزا مظہر جانِ جاناں کی "خریطۂ جواہر" کی رہینِ منت ہے۔ رہا شاہ گلشن کا معاملہ تو ان کا ولی کو مشورہ آسانی سے نظر انداز کیے جانے کی چیز نہیں۔

مظفر علی سید کا موقف میر کی فارسی شاعری کے نقادوں مثلاً اختر علی تلہری، نیر مسعود اور ابو اللیث صدیقی وغیرہ کے برعکس یہ ہے کہ میر کے فارسی دیوان میں ان کی اردو شاعری سے مماثل سو سوا سو شعر یا بیس پچیس غزلوں کے علاوہ (جو ان کی اردو شاعری سے مماثل ہیں) بہت کچھ ایسا سرمایہ موجود ہے جو اپنی ایک شان رکھتا ہے۔ انہوں نے میر کی فارسی گوئی کے محرکات پر بھی چشم کشا بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی عاشقانہ اور دردمندانہ فارسی غزلیں ان کے باب میں فارسی گوئی کی شدید داخلی ضرورت کا احساس دلائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ پھر انہوں نے اپنے اس قابلِ قدر مضمون میں متاخر فارسی شعرا اور میر کے کلام کے امتیازات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے میر کی فارسی رباعیات سے بھی اعتنا کیا ہے۔ انہوں نے فراق صاحب پر بھی جائز گرفت کی ہے۔ انہوں نے میر کے کلام کی تہ داری کو خوبی سے آئینہ کیا ہے اور ان کی فارسی شاعری کا جاندار محاکمہ کیا ہے۔ یہ کام شاید مظفر علی سید ہی کر سکتے تھے۔

آخر میں ایک اور مضمون کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جو دراصل رالف رسل اور پروفیسر خورشید الاسلام کی مشترکہ کاوش ہے۔

— رالف رسل اور خورشید الاسلام کے اس مضمون کا اردو ترجمہ "میر کی عشقیہ شاعری" کے عنوان سے خالد اقبال یاسر نے کیا ہے اور بلاشبہ بڑی محنت سے رواں دواں اسلوب میں کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی اس مشترکہ کاوش میں بہت سے پہلو قابل بحث ہیں۔ مثلاً انہوں نے برعظیم کے معاشرے میں پردہ اور پابندیوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے گویا یہ ایک غیر مہذب اور اکھڑ معاشرہ تھا۔ حالانکہ مشرق کا طرزِ زیست بالعموم اور برعظیم کا بالخصوص اپنے اندر "استتار" کی ایسی تہ داری رکھتا تھا جسے "سبکسارانِ ساحل" سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس طرزِ زیست میں وہ عناصر موجود تھے جو پردہ اور چار دیواری کے ذریعے محبوب و محب دونوں کی شخصیات میں گداز اور اس کی کاملِ طلب ماہیت کا سامان کرتے تھے۔ یہ اپنی مابعد الطبیعیاتی جہت میں عشقِ حقیقی کا عکس تھا کیوں کہ محبوب مجازی کی طرح محبوب حقیقی بھی شاہ رگ سے زیادہ قریب ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور سالکانِ راہِ طریقت کی خواہشِ وصل کو بھڑکاتا ہے اور یہی آتش افروزی شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی زبردست محرک بنتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشرق کا تصورِ عشق دراصل وصل سے زیادہ ہجر کے اصول پر قائم تھا اور اسی کا مظہر وہ خاندانی نظام تھا جس میں پردہ اور نام نہاد "سوشل ٹیبوز" کی ایک بنیادی اہمیت ہے۔ کاش رالف رسل صاحب میر کے اس مصرعے کی معنویت سمجھ سکتے اور اس کا اطلاق معاشرتی مظاہر پر کر سکتے:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ

مختصر یہ کہ میر پر نقوش کی متذکرہ بالا تینوں جلدیں اردو میں تحقیق، تنقید اور تحسین کی وہ طلائی تثلیث ہیں جن پر اردو کا تجلیاتی ادب عرصے تک نازاں رہے گا۔

نقوش کا ادبی معرکے نمبر

ڈاکٹر گیان چند

تعلیمی سال کے شروع میں جب طلبہ پی ایچ ڈی میں داخلہ چاہتے ہیں تو اُن کے لئے نیا موضوع پیدا کرنے کے لئے دماغ کی نسیں کئی دن تک کریدنا اور کھرچنا پڑتا ہے میں نے ایک موضوع تلاش کیا اُردو کے تصنیفی وعلمی ادارے، بھوپال میں ایک صاحب کو یہ موضوع دیا لیکن اُنہوں نے کام کر کے نہ دیا میں جہاں گیا اس موضوع کا ذکر کرتا رہا میرے جموں چھوڑنے کے بعد ایک صاحب دیویندر کمار گپتا نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، تصنیفی اداروں سے ہمارے ذہن میں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اُردو ہند، دونوں ملکوں کے ترقی اردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب لاہور وغیرہ کوند جاتے ہیں جو اہل قلم سے کتابیں تصنیف وتالیف کراتے ہیں۔ لیکن ایک ادارہ ایسا ہے جس نے سیکڑوں کتابیں (مجموعے) لکھائیں، مدوّن کیں، شائع کیں لیکن اس کا نام اداروں کی فہرست سے نظر انداز ہو جاتا ہے، شاید اس لئے کہ یہ ادارہ محض ایک فرد پر مشتمل ہے۔

اس ادارے کا نام نقوش اور اس کے کارساز کا نام محمد نقوش ہے۔ اُردو کے ادبی رسالوں کے جو مدیر مثلاً اُردوئے معلیٰ کے حسرت موہانی، اُردو اور ہماری زبان کے مولوی عبدالحق اور نگار کے نیاز فتح پوری اپنے نام کے جھنڈے گاڑ گئے ہیں ان کی اہمیت اور اُن کی مدیری سے زیادہ مصنفی کے سبب تھی، وہ مصنف پہلے تھے ایڈیٹر بعد کو۔ اُنہوں نے اپنے پرچوں میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھ دیا اس کی تاریخی اہمیت ہے لیکن محمد طفیل نے مدیر اور مصنّف کے خانوں کو الگ الگ رکھا۔ خاکہ نگاری کی حیثیت سے اُن کا اہم مقام ہے لیکن اس سے ہٹ کر وہ ایڈیٹری کے تلہ کوہ پر ایک دیوقامت مجسمے کی طرح یوں استادہ ہیں کہ برعظیم کے ہر گوشے سے دکھائی دیتے ہیں، نقوش میں خود مضامین نہ لکھنے کے باوجود اسے چوٹی کا رسالہ بنا دیا وہ خالص مدیر ہیں۔

اُنہوں نے رسالے اور کتاب کی فصیلیں منہدم کر دیں۔ رسالے کو وہ تن و توش اور گراں ڈیلی عطا کی کہ کتابیں احساس کمتری کا شکار ہو گئیں اُردو کی ادبی صحافت کا منتہا رسالہ نقوش ہے، پہلے کے اُردو رسالوں اور نقوش کا مقابلہ کر کے دیکھئے تو اس کے مقام کا اندازہ ہوگا۔ رسالوں میں یہ کیفیت اور کمیت پہلے کب تھی اس کا عام شمارہ جیسا ہوتا ہے دوسرے رسالوں کو ویسا خاص شمارہ بھی نصیب ہو جائے تو بغلیں بجاتے پھریں اس کا خاص شمارہ داستان امیر حمزہ کے دفتروں پر چشمک زن ہوتا ہے طفیل صاحب ایک ہی جلد کے خاص شمارے پر اکتفا نہیں کرتے بعض اوقات دو یا تین جلدوں تک پہنچ جاتے ہیں——

——اور ایک عظیم شخصیت کے بارے میں وہ تیرہ جلدوں کی قاموس کو رسالے کا شمارہ کہہ کر پیش کر رہے ہیں، میں نے جائزہ تو نہیں لیا لیکن ظن غالب یہی ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں کسی رسالے کا اتنا ضخیم نمبر نہ نکلا ہوگا انہیں چاہئے کہ وہ گنیز کی عالمی ریکارڈ کی کتاب میں اس شمارے کی تفصیلات پیش کر کے اسے نمایاں مقام دلا دیں خاص نمبر نکالنے کے لئے انہیں جو انوکھے

موضوعات سوجھے، مثلاً شخصیات، لاہور، خطوط، آپ بیتی، ادبی معرکے، رسولؐ، اس سے پہلے کسی رسالے کے ایڈیٹر کو سوجھے ہوں گے؟ بعد میں دوسروں نے بھی نقوش کی تقلید کی اس جیسے خاص نمبر نکالنے چاہئے لیکن وہ بات نہ آسکی۔ محمد طفیل اُردو کی ادبی صحافت کے مولوی مدن ہیں۔

بعض حضرات مضامین بالخصوص سیمناروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کرتے ہیں۔ ان میں ایک آدھ مضمون ان کا بھی ہوتا ہے اور وہ ایک کتاب کے مؤلف بن جاتے ہیں۔ محمد طفیل نے مضامین کے ایسے کتنے مجموعے مرتب کر دیے، ایسے مجموعے جن کے مضامین پہلے سے لکھے ہوئے موجود نہ تھے بلکہ جو فرمائش اور تقاضائے بسیار کر کے لکھائے گئے غالبؔ اور اقبالؔ پر کئی کتابیں ایسی ہیں جن میں مختلف حضرات کے مضامین ہوتے ہیں، پھر طفیل کو کیوں غالبؔ، اقبالؔ، میرؔ، انیسؔ وغیرہ پر کتابوں کا مؤلف نہیں سمجھا جاتا نقوش کے ڈیڑھ سو سے کچھ کم شمارے دراصل کتابیں ہیں جنہیں طفیل صاحب نے مدوّن کیا ہے دیکھا جائے تو طفیل صاحب ادبی صحافت کے سب سے بڑے مدیر ہی نہیں، اُردو کے سب سے بڑے مؤلف بھی ہیں۔

طباعت اور اشاعت کا ایک انتظامی پہلو بھی ہوتا ہے ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں نے راقم الحروف کی کتابوں کو مسودہ قبول کرنے کے بعد، نو دس سال میں چھاپا۔ پاکستان میں بھی ایک کتاب کی طباعت چھ سال میں سر ہوئی نقوش کے شمارے بڑے سائز کی خفی کتابت میں لکھے ہوتے ہیں۔ ضخیم کتاب سے بھی زیادہ مواد پر حاوی۔ اس کے باوجود پچھلے تیس سال میں تقریباً ڈیڑھ سو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اتنے بڑے بڑے دفتر اتنی جلدی جلدی چھاپنا ایسے شخص ہی سے ممکن ہے جس نے گھر بار، یار دوست دنیا بھر کے شوق تیاگ کر دیے، اپنے شب و روز محض ایک جنوں کو وقف کر دیے ہوں کتابوں میں غلط نامے ہوتے ہیں، غلط نامے نہیں ہوتے تو اغلاطِ کتابت ہوتی ہیں۔ نقوش میں اغلاطِ کتابت آٹے میں نمک کے برابر ہوں تو ہوں اس سے زیادہ نہیں طباعت و اشاعت پر اس عبور کو دیکھتے ہوئے مدیر نقوش کو اُردو کا ممتاز طابع اور ناشر ماننا پڑتا ہے۔

اب اگر میں اس تن تنہا فرد کو ایک ادارہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہیں مصرع ہے

؎ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

میں طفیل صاحب کے لئے اس میں ترمیم کرتا ہوں۔

وہ اپنی ذات میں ہیں ایک ادارہ

میں نے نقوش کے رسولؐ نمبر کی زیارت نہیں کی لیکن ایمان بالغیب کے مصداق اسے دیکھے بغیر اس کی قدر و قیمت کا تصور کر سکتا ہوں۔ جیسی عالی مرتبت شخصیت ہے، اسی کے شایانِ شان ہدیہ۔ ایسی ذات سے متعلق نمبر نکالنے کے بعد لکھنے لکھانے کے لئے اور کیا بچتا ہے فراز سے نشیب کی طرف کو کیوں ڈھلیں۔ بجا ہے اگر طفیل صاحب اپنا قلم توڑ کر بیٹھ جائیں کہ اب اور کچھ تسخیر کرنے کو بچا ہی نہیں۔

نقوش کے اکتسابات کا بیان کرنے کے لئے ایک سفینہ درکار ہے۔ مجھے اس کا سر و برگ نہیں، میں بس ایک خصوصی شمارے کی حکایت سرائی کیا چاہتا ہوں ایسا شمارہ جو علم کا گنجینہ ہے لیکن اس کے جوہر و گوہر پر وہ توجہ نہیں کی گئی جو مثلاً غالبؔ نمبر یا اقبالؔ نمبر پر کی گئی میرا مطلب ادبی معرکے نمبر سے ہے میں پی ایچ ڈی کے ایک مقالے کا ممتحن تھا جس کا موضوع ادبی معرکے تھا لیکن

وہ ایک دور کے شعری معرکوں تک محدود تھا نقوش کا نمبر گیارہ سو صفحوں کی دو جلدوں پر پھیلا ہوا ہے، گاڑھے مغز سے بھرپور صفحات اس خصوصی شمارے میں ایک دو نہیں دس تحقیقی مقالوں کا سامان ہے۔ سچ کہا ہے محمد نقوش نے جلد دوم کے تعارف میں۔

"مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم میں سے کوئی خواہ کتنا بھی پڑھا لکھا ہو وہ اس نمبر کے مطالعے کے بعد مزید پڑھا لکھا کہلا سکے گا کیونکہ اس نمبر میں جو کچھ درج ہے وہ سب کچھ ہر ایک نہیں جانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اس نمبر کے کسی ایک شعبے کا ماہر ہو وہ بھی اپنے موضوع سے متعلق پڑھے گا تو اس کے علم میں کچھ نہ کچھ، بلکہ بہت کچھ، اضافہ ہو گا۔ میں خود کو فرسودہ ادب اور دقیانوسی موضوعات کا طالب علم سمجھتا ہوں۔ اس شمارے میں ان موضوعات کو دیکھ کر ایک بار پھر اپنی ہیچ مدانی کا عرفان ہوا اُردو ادب بحرِ زخار ہے اس کا قدیم ادب بھی ایسا دریائے ناپیدا کنار ہے کہ اس کے کسی ایک شعبے پر عبور پانے کے لئے عمرِ خضر درکار ہو گی۔

ادبی معرکے نمبر کیا ہے، افلاطون کی اکادمی، شیخ الرئیس کا کتاب خانہ ہے افسوس! میں اس بزم سے باہر رہا۔ میں نے اپنا مضمون دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا معرکہ، دیر سے بھیجا۔ بس چھوٹ چکی تھی میرے مزخرفات کو اس میں جگہ نہ ملی۔

جب ادبی معرکوں کی بات چھڑ جاتی ہے تو معاً ہماری آنکھوں کے سامنے میر و مرزا، انشا و مصحفی، آتش و ناسخ، انیس و دبیر اور چکبست و شرر گھوم جاتے ہیں لیکن مدیر نقوش کی آنکھ زیادہ کشادہ ہے، ان کے لئے معرکوں کا منظر نامہ وسیع تر ہے اُنہوں نے ایسے موضوعات کھوج نکالے جن پر مختلف قلم کاروں نے مختلف زاویوں سے نظر کی۔ ان کی مختلف الرائے تحریریں ایک قسم کا سمپوزیم ہیں شمارے کی پہلی جلد اسی پر مشتمل ہے شخصی معرکے دوسری جلد میں انشا کئے گئے ہیں۔ پہلی جلد کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل۔ زبان کے نام پر معرکے

باب دوم۔ بہ سلسلۂ زبان، صوبوں کے نام پر معرکے

باب سوم۔ تحقیق کے معرکے

باب چہارم۔ شعر و ادب کے معرکے

باب پنجم۔ موضوع زیرِ بحث پر مقالے

دوسری جلد میں حسب ذیل مشمولات ہیں

ادبی معرکوں پر تبصرہ (ادارہ)

شخصی معرکے (۱)

شخصی معرکے (۲) معرکۂ سخن

معرکہ آرائی پر ایک ابتدائی کتاب

دونوں جلدوں میں عموماً اور دوسری جلد میں خصوصاً مضامین اس ترتیب سے نہیں جیسے فہرست مضامین میں دیے ہیں فہرست میں موضوع وار گروہ بندی ہے تاریخی ترتیب ہے، متن میں ایسا نہیں اس کی معقول وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مضامین جیسے جیسے وصول ہوتے گئے، ویسے ویسے ان کی کتابت کرا دی گئی لیکن فہرست مضامین میں ترتیب درست کر دی گئی اب جلد دوم کی

فہرست میں ص ۲۰ کے مضمون کے بعد ص ۴۰۲ کا مضمون ہے اور پھر ص ۲۰ کا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی بہترین حل تھا۔ اگر جملہ مضامین کے موصول ہونے کے بعد کتابت کی جاتی تو مزید ایک سال کی تعویق ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی جلد میں موضوع بحث پر تین نظریاتی مقالوں کو پانچویں باب میں رکھنا پڑا۔ مدیر کو ان کے غلط مقام کا احساس ہے۔ بڑے بھولے پن (شاہد احمد دہلوی کے روزمرہ میں بھولا پن) سے کہتے ہیں "اس باب کو ابتدا میں آنا چاہئے تھا۔ چونکہ یہ رسالہ پڑھے لکھے لوگوں کا ہے اور اہل علم کو رہنمائی کی کم، تائید کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے یہ جگہ بھی مناسب جگہ معلوم ہوتی"

یہ عذرِ لنگ ہے حالانکہ اس کا سیدھا سادا حل وہی تھا جو دوسری جلد میں بروئے کار لایا گیا کہ متن میں مضمون کہیں بھی ہو فہرست میں ٹھیک مقام پر ہوں میں بھی فہرست کی حد تک ترتیب میں کچھ تبدیلیاں تجویز کرتا ہوں۔

جلد اوّل کا آخری باب پنجم ذیل کے تین مقالوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ ادبی معرکوں میں روایت۔ ڈاکٹر محمد یعقوب
۲۔ ادبی معرکوں کی کہانی امیر حسن نورانی
۳۔ فارسی شعرا کی معرکہ آرائیاں ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی

دوسری جلد کا پہلا مضمون۔ ادبی معرکوں پر تبصرہ، ادارہ کی طرف سے ہے فہرست کا آخری موضوع معرکہ آرائی پر ایک کتابچہ فارسی شعرا شیخ حزین اور خان آرزو سے متعلق ہے۔

نظریاتی اور عمومی مضامین پہلے آنے چاہئیں۔ چونکہ فارسی کو اُردو پر تقدمِ زمانی حاصل ہے اس لئے فارسی شعرا، کے معرکوں کا بیان اُردو شعراء سے پہلے ہونا چاہیے۔ اس طرح جلد اوّل کے باب پنجم کے دو مضامین اور جلد دوم کے پہلے مضمون کو ملا کر پہلی جلد کا پہلا باب بنانا چاہئے تھا بہ تفصیلِ ذیل۔

جلد اوّل، باب اوّل

۱۔ ادبی معرکوں پر تبصرہ ۲۔ ادبی معرکوں میں روایت۔ ۳۔ ادبی معرکوں کی کہانی دوسری جلد میں سب سے پہلے فارسی شعرار کے معرکے درج کئے جاتے۔ بہ تفصیل ذیل۔

الف۔ فارسی شعرار کے معرکے

۱۔ فارسی شعرار کی معرکہ آرائیاں ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی
۲ معرکہ آرائی پر ایک ابتدائی کتاب قول فیصل حزیں، آرزو، صہبائی
قول فیصل اور اس کا پس منظر ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام

ب۔ اُردو شعرار کے معرکے

ترتیب کی مزید تبدیلی کی تجاویز مضامین پر تبصرے کے ضمن میں پیش کی جائیں گی۔ اب مختصراً مضامین کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

باب اول کا عنوان ہے، زبان کے نام پر معرکے، اس میں اُردو، ہندی، ہندوستانی نیز اُردو اور دیوناگری رسم الخط

کے بارے میں آٹھ مضامین ہیں، ان مضامین میں مختلف عمائد کے نظریات کو اکثر انہیں کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے لیکن یہ انتخاب و ترتیب کس نے کی یہ واضح نہیں کیا گیا۔ کہیں کہیں مرتب یا راوی کے الفاظ بھی ہیں مثلاً دوسرے اور تیسرے مضامین کی ابتدا میں یہ جملے ملتے ہیں۔

"مسٹر کرم چند گاندھی نے جن کو ہندو قوم مہاتما کے نام سے یاد کرتی ہے"۔ ص ۲۹
"مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی آنجہانی ہندو قوم کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ ص ۴۸

یہاں صرف گاندھی جی یا جناب گاندھی لکھنا کافی تھا، مندرجہ بالا جملوں کے اوصافی فقرے ادب نہیں، سیاست ہیں، اہل ہند کسی ہندو قوم سے واقف نہیں۔ مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ فسادات کے طوفان کے بیچ اس لئے مرن برت رکھا کہ حکومت ہند پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپیہ زر نقد ادا کرے۔ اُنہوں نے روپیہ دلایا جس کی پاداش میں ایک متعصب ہندو کے ہاتھوں شہید ہوئے اور یہ صاحب ہیں کہ مہاتما گاندھی کو ہندوؤں کا لیڈر گردان کر خوش ہو رہے ہیں، ادبی تحریروں میں سیاست کی پُٹ لانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ماننا مشکل ہے کہ مختلف مضامین کی تشکیل و ترتیب کا کام، اپنی تمام مصروفیت کے باوجود، خود طفیل صاحب نے کیا ہے اُنہوں نے اداریے میں بتایا ہے کہ اس نمبر کی تکمیل میں جناب کسریٰ منہاس، محمد عالم مختار حق، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر محمد زکریا نے ان کی مدد کی۔ اگر یہ واضح کر دیا جاتا کہ کس باب کی تلخیص و ترتیب کسی فاضل نے کی تو تحقیقی صحت کا حق بہتر طریقے سے ادا ہو جاتا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زیادہ کام خود طفیل صاحب نے کیا ہو اور بار بار اپنا نام لکھنا پسند نہ کیا ہو۔

پہلے باب کا پہلا مضمون ہے، 'اُردو کیوں اور کہاں پیدا ہوئی' اس بحث کا مناسب مقام باب دوم تھا جہاں یہ بحث ہے کہ اُردو کس صوبے میں پیدا ہوئی بہرحال مرتب نے ص ۱۵ پر سید سلیمان ندوی کے مُوقف کو انہیں کی تلوار سے کاٹا ہے۔ اس نے کہیں سے ندوی صاحب کا جولائی ۳۲ء کا مضمون برآمد کیا جس میں اُنہوں نے اعتراض کیا تھا کہ پنجاب میں پنجابی، گجرات میں گجراتی اور دکن میں دکنی پیدا ہو سکتی ہے، اُردو نہیں۔ اس دلیل کا اطلاق ندوی صاحب کے مُوقف پر کیا جائے تو نتیجہ نکلے گا کہ سندھ میں جو زبان پیدا ہوئی وہ اُردو نہیں، سندھی ہوگی۔

یہ مضمون تاریخی لسانیات کا ہے لیکن مضامین نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۷، ۸ اُردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث سے تعلق رکھتے ہیں ان سے اس بحث کے بارے میں جملہ معلومات یکجا مل جاتی ہیں اور مسئلہ زبان کے تعلق سے قبل تقسیم کے ساٹھ ستر سال کی تاریخ نظر کے سامنے سے گذر جاتی ہے۔ مولوی عبدالقدوس ہاشمی نے کتنی دیدہ وری سے فرمایا ہے۔ "زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی ملک یا دیس کی ہوتی ہے...... نہ آپ کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت بولتے ہوں گے کیونکہ ایسا ہونا عقل کے خلاف ہے اور فطرت انسانی کے اقتضا کے بالکل منافی۔ ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بات چیت کیا کرتے ہیں اور وہی زبان ان کے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے۔ پھر یہ کیا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اردو مسلمانوں کی اور بھاشا کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے"۔ ص ۸۷

اس باب میں ایک مضمون ہے، 'اُردو اور اہل زبان' جس میں کسی مجہول الاسم 'شیر پنجاب' نے دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کی زبان میں کیڑے ڈالے ہیں۔ مضمون اس انداز کا ہے جیسے انیسویں صدی میں شاہ نصیر و ذوق کے بیچ یا بیسویں صدی میں چکبست و شرر کے درمیان

اعتراض وجواب کی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔ اس مضمون کو پیش کرنے والوں کی بڑی چوک ہے کہ انہوں نے یہ نشان دہی نہیں کی کہ یہ مضمون کہاں سے لیا گیا ہے اور اسے کس نے لکھا ہے اگر ان کو شیرِ پنجاب کی نقاب پوش شخصیت کا علم رہا ہو تو اسے فاش کرنا ضروری تھا شیرِ پنجاب کی تحقیق کا منتہا یہ ہے۔

"ہم کو ایک بہت معتبر بزرگ کی زبانی معلوم ہوا کہ ولی ہندوستان میں ٹوٹے پھوٹے شعر ضرور کہہ لیا کرتے تھے لیکن یہ دیوان ان کا کہا ہوا نہیں بلکہ ناصر علی سرہندی کا ہے ولی نے چند شہدوں کے ذریعے سے ناصر علی کا دیوان اڑوایا اور خود مالک بن بیٹھے"۔ ص ۹۶

گویا ادبی تحقیق کا صحیح مقام دانش گاہ نہیں چانڈو خانہ ہونا چاہیئے۔

جگر مراد آبادی کی بڑی مترنم غزل ہے۔

بے خواب ہے، بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں   دل ماہیٔ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں ؟
دیکھا تھا کبھی خواب سا، معلوم نہیں کیا   اب تک اثرِ خواب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

تقسیم ملک سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں کسی من چلے نے اس زمین کی اپنی غزل میں یہ شعر داغ دیا۔

ــ یوپی بھی ہے، سی پی بھی ہے، بنگال بھی، لیکن   اک صوبۂ پنجاب ہے، معلوم نہیں کیوں ؟

پنجابی طلبہ نے بڑا ہنگامہ کیا۔ دورِ حاضر میں یہ بحث بے معنی ہے کہ پنجاب کی زبان مستند ہے کہ نہیں، اقبال، فیض، کرشن چندر، منٹو بیدی اور مالک رام وغیرہ کے بعد کوئی اہلِ پنجاب کی اُردو کے درپے آتا ہے تو وہ اگلے وقتوں کا ہوگا۔ اب لاہور اور کراچی، دلی و لکھنؤ سے بڑے اُردو کے مرکز ہیں۔ کون اہلِ زبان ہے اور کون نہیں، اس کی تنقیح کر کے اُردو کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں اور چوک لکھنؤ کے دروازوں کے بیچ محصور و محدود کر دیا جائے تو یہ اردو کی کون سی خدمت ہوگی۔ اردو کو بسم اللہ کے گنبد میں نظر بند کرنے والوں کو جاننا چاہیئے کہ اُردو کے معاملے میں مغربی پنجاب و کراچی، یو پی و دلی سے منزلوں آگے نکل گئے ہیں۔

باب دوم کا عنوان ہے "بہ سلسلۂ زبان صوبوں کے نام پر معرکے"، اور پھر پنجاب، دکن، گجرات، مدراس، دلی، بہار، بنگال اور میسور میں اُردو کی ذیلی فصلیں ہیں۔ عنوانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لسانی مناظرے ہوں گے، پھل جھڑیاں چھٹیں گی، لیکن اس کے مشمولات کو پڑھ کر ناامیدی ہوتی ہے۔ پونے دو سو صفحات کے اس جزو میں معرکوں کا کوئی ذکر نہیں، ان علاقوں میں محض زبان و ادب کے ارتقاء کی مختصر کہانی ہے، پنجاب میں اُردو کی فصل میں محمود شیرانی کا ایک طویل اقتباس تو دیا ہے، کسی نے یہ زحمت نہیں کی کہ کتاب پڑھ کر اپنے الفاظ میں اُن کے پُر زور دلائل دے دیتے۔ دکن میں اُردو کی فصل میں خیال رکھا گیا ہے کہ بھولے سے بھی اس دعوے کا ذکر نہ آ جائے کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی۔ اس باب کی ابتدا میں غیر متعلق طور پر پنجابی کی بحث بھری ہوئی ہے، بعد میں، دکن میں اُردو کے ارتقاء کا ذکر ہے ص ۱۴۲ پر ایک اقتباس کے بعد یہ جملہ نظر آیا "حالانکہ نہ تو جولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے"۔

اب یہ نہیں کھلتا کہ یہ "میں" کون صاحب ہیں۔ پیچھے کی طرف صفحے اُلٹ کر دیکھا تو ص ۱۴۱ پر معمولی باریک خط میں یہ جملہ ملا۔ "اُردوئے معلیٰ (لسانیات نمبر) جلد سوم، شمارہ ۴۔ ۵ کے ص ۵۹ پر اُردو کی ابتدا کے عنوان سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا خیال ہے"

اور اس کے بعد اس رسالے کے ص ۵۰ تا ۶۲، یعنی ۱۲ صفحات نقل کر دیئے گئے ہیں اقتباس میں دس جگہ واوین کھلتے اور بند ہوتے ہیں بیچ میں ایک نہایت جلی عنوان اُردو ادب کا آغاز نظر آتا ہے اگر اتنا طویل اقتباس دینا تھا تو اس کے اوپر کم سے کم اتنا ہی جلی عنوان دینا چاہیئے تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کے اس اقتباس کا مرکزی موضوع دکن ہی نہیں، پنجابی اور ہریانی ہے، چاہیئے یہ تھا کہ دوسرے باب کے مرتب یا مرتبین اُردو کے آغاز کے مختلف نظریوں کی موافقت اور مخالفت میں دلائل کا خلاصہ اپنے الفاظ میں دے دیتے کہیں کہیں مختصر اقتباسات دیئے جا سکتے تھے لیکن مرتبین نے سہولت اس میں دیکھی کہ کتابوں میں نقصان لگا کر کاتب کے حوالے کر دیا اور اس نے صفحے کے صفحے نقل کر دیے۔

چونکہ اس پورے باب دوم میں معرکوں کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے نقوش کے اس شمارے میں اس کے شمول کا جواز نہیں۔ اُردو زبان یا ادب کی تاریخ پیش کرنا تو مقصود تھا نہیں۔ اس سخت گیری کے باوجود میں اعتراف کروں گا کہ اس باب کی مختلف فصلوں میں معلومات بھری پڑی ہیں بالخصوص ضمنی مراکز کے سلسلے میں۔

باب سوم تحقیق کے نام پر معرکے، ہے اس میں چار مضامین ہیں پہلا نواح دہلی کی اُردو کی دو قدیم کتابیں اور تیسرا "مرزا محمد حسن قتیل کا وطن" خالص ادبی تحقیقی ہیں جن کے پڑھنے سے ان موضوعات پر روشنی ملتی ہے "ہجری و عیسوی تاریخوں کی مطابقت" کے عنوان سے منشی مہیش پرشاد کا مفید علمی مضمون ہے جس کے بعد شمس اللہ قادری نے تتمے کے طور پر چند کتابوں کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اس تتمے میں تنقید یا معرکے کا دور دور تک شائبہ نہیں۔ اصل مضمون اور تتمے کی افادیت مسلم لیکن انہیں ادبی معرکے نمبر میں کیوں جگہ دی گئی۔ "ملتان سے لکھنو" نام کا مضمون منتشر تحریروں پر مشتمل ہے اور موضوعاتی اعتبار سے دو لخت ہے۔ اس میں رباعی کے اوزان کی بحث اگلے باب کے ذیل میں آنی چاہیئے تھی۔ ملتان کی عمارتوں کی بحث کو ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تاریخ یا آثار قدیمہ کی چیزیں ہیں۔

اس باب کے بقیہ ۱۲ مضمون زبان محاورہ، روز مرّہ، فن شعر، بلاغت، عروض، ادبی استفسارات اور جوابات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ مضامین نہیں خالص سونا ہیں، لعل و الماس ہیں ان میں بیسویں صدی کے نصف اول کی شعری و لسانی بحثیں بھری ہوئی ہیں ہر مضمون اتنا پرمغز ہے کہ ہر قاری کی معلومات میں تھوڑا نہیں، بہت کچھ اضافہ کرے گا۔ ماضی کے شعور فن و زبان سے متعلق یہ معلومات ایسا گنجینہ ہیں جو ہمارے دور کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے "نقوش" کا یہ باب یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیئے اس کی جملہ بحثیں اتنی پرمغز ہیں کہ مجھے ان کے بارے میں لب کشائی کی ہمت نہیں۔ دور حاضر میں زبان کے نکات اور فن شعر کو کار زائد سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ان میں اب بھی ہمارے استفادے کا بہت کچھ سامان ہے۔ ان بحثوں کو پڑھیئے، ان پر سوچیئے اور جو کچھ کام کا پایئے اسے گرہ میں باندھ لیجئے ادبی معرکے کی دونوں جلدوں میں یہ باب بیت الغزل ہے اس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ نقوش نے ان آثار گم شدہ کی بازیافت کر کے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

اس جلد کا آخری حصہ باب پنجم ہے جس میں ادبی معرکوں سے متعلق تین مضامین ہیں پہلا مضمون اُردو میں ادبی معرکوں کی روایت ڈاکٹر محمد یعقوب کا ہے۔ اُنہوں نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ میں ان کے مقالے کا ممتحن تھا۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے ہم وطن ہیں یعنی سیوہارہ ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مضمون میں پہلے فارسی شعراء کی معرکہ آرائیوں کا ذکر کیا ہے

پھر اُردو شعراء کا۔ امیر حسن نورانی بجا طور پر محض اُردو شعراء تک محدود رہے ہیں تیسرا مضمون ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی کا ہے "فارسی شعراء کی باہمی معرکہ آرائیاں"۔ اس میں مجھ جیسے اُردو قارئین کے لئے دلچسپی اور علم افروزی کا وافر سامان ہے ان مضامین کی ترتیب کے بارے میں پیچھے عرض کیا جا چکا ہے۔

دوسری جلد کی ابتداء میں ادارے کی طرف سے ایک طویل مضمون ادبی معرکوں پر تبصرہ ہے یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کا مصنف کون ہے۔ مضمون کے دو حصے ہیں پہلا حصہ فارسی شعراء سے متعلق ہے، دوسرا اُردو شعراء سے۔ حسب معمول فارسی کا حصہ میرے لئے زیادہ مفید ہے۔ اُردو حصے کے بیشتر مندرجات آب حیات سے ماخوذ ہیں دوسرے ماٰخذ سے جو کچھ لیا گیا ہے وہ بھی پیشتر سے مجھے معلوم تھا۔

ان چاروں مضامین میں ادبی معرکوں کی عہد بہ عہد مثالیں دی ہیں۔ معرکوں کے بارے میں ایک عمومی نظریاتی مضمون کی کمی محسوس ہوتی ہے اس مضمون میں معرکہ آرائیوں کی نفسیاتی وجہ تلاش کی جاتی۔ ان کے اخلاقی و سماجی پہلو پر تبصرہ کیا جاتا، جو اور معرکہ آرائی کے بیچ مقاماتِ اشتراک و اختلاف کی نشان دہی کی جاتی۔ معرکوں کے آئینے میں اس دور کے تنقیدی پیمانوں کا جائزہ لیا جاتا ان سے زبان و ادب کو جو سود و زیاں ہوا، تقلید و اجتہاد پر جو اثر ہوا اس پر نظر ڈالی جاتی۔

دوسری جلد میں ادارے کے مضمون کے بعد شخصی معرکوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ پہلی جلد میں معرکے نہیں، مباحث تھے اگر کچھ معرکہ آرائی تھی تو وہ زبان اور فن کے بارے میں زیادہ ادب کے بارے میں کم تھی۔ یہ جلد اُن مطالب پر مشتمل ہے جنہیں ہم اور آپ ادبی معرکے کہتے ہیں۔ متن میں مضامین شعراء کی تاریخی ترتیب سے نہیں فہرست مضامین میں ہیں ہم فہرست کے مطابق جائزہ لیتے ہیں۔

"میر کے معرکے" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد یعقوب نے دو مضامین لکھے ہیں۔ دونوں بھرپور اور جامع ہیں، میر کے حریفوں میں سے کوئی نظر انداز نہیں ہوا۔ میر کے اکثر مخالفوں کے معرکوں کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ڈاکٹر یعقوب کے بیان سے ہر جگہ کچھ نہ کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، بالخصوص بقا، خاکسار اور یقین کے بارے میں۔ سودا کے معرکوں پر ڈاکٹر خلیق انجم نے ۲۷ صفحات لکھے ہیں۔ وہ سودا کے ماہر ہیں انہوں نے جملہ معرکوں پر اچھی تحقیق کے بعد لکھا ہے، ان میں فاخر مکین اور ضاحک کے ساتھ معرکے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مصحفی کے سلسلے میں دو مضامین ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھے ہیں پہلے میں کلیاتِ سودا کے آخر میں مصحفی کے طویل ہجو یہ قصیدے کا تحقیقی تجزیہ کیا ہے اور اس کے زمانے کا تعین کیا ہے۔ دوسرے مضمون میں مصحفی اور انشا کے معرکوں کا تفصیلی ذکر ہے اس سلسلے میں آبِ حیات میں کافی مواد ہے لیکن ڈاکٹر تبسم نے اس پر کچھ اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان میں ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پشاوری نے اپنی کتاب "انشا" کے حریف و حلیف میں اس سے کہیں زیادہ تفصیلی تحقیق کی ہے دراصل انشا کے معرکوں پر علیحدہ سے ایک مضمون ہونا چاہیئے تھا جس میں انشا اور مصحفی کے قضیئے کے ساتھ ساتھ انشا اور عظیم بیگ کے معرکے کو بھی سمیٹ لیا جاتا۔ ویسے یہ کمی شروع کے ادارتی مضمون سے پوری ہو گئی ہے۔

غالب کے ادبی معرکوں پر جناب مالک رام نے قلم اٹھایا ہے۔ ان سے موزوں تر کون ہو سکتا تھا معرکوں میں اہم ترین دو ہیں کلکتے کا اور برہانِ قاطع کا، جن پر مالک رام صاحب نے بڑی قدرت کے ساتھ لکھا ہے۔ غالب نے قاطع القاطع کے مصنف امین الدین دہلوی پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ مالک رام صاحب نے اس کی جملہ تفاصیل دی ہیں جن سے کم از کم راقم الحروف

کے علم میں بہت اضافہ ہوا اُنہوں نے کلب علی خاں سے چپقلش کا ایک انوکھا عنوان قائم کرکے تمام معارضات کا احصا کر لیا۔ ذوق اور شاہ نصیر کے معرکوں پر ڈاکٹر تنویر علوی نے لکھا ہے کہ وہی اس کے ماہر ہیں اس کا بیشتر مواد آبِ حیات میں ملتا ہے۔ لیکن صاحب نے ان کا اور دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد کے مقدمے کے بیان کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور یہی ان کا اضافہ ہے

ناسخ کے معرکوں پر ڈاکٹر شبیر الحسن نونہروی نے لکھا ہے اُنہوں نے ناسخ ہی پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ناسخ پر ان سے زیادہ کون ہے۔ آبِ حیات میں آتش و ناسخ کے معرکے معروفِ عام ہیں لیکن شبیر الحسن نے ناسخ کے چند ایسے معرکوں کی تفصیل دی ہے جن کا عام پر علم نہیں۔ اُنہوں نے ناسخ و آتش کے تعلقات پر بھی ایک عارف کی طرح لکھا ہے ڈاکٹر محمد صدر الحق نے عبد الغفور نسّاخ کے معرکوں پر ہے چونکہ یہ بحث انیس و دبیر کے مرثیوں کی تنقید سے متعلق ہے اس لئے فہرست مضامین میں اسے انیس و دبیر کے بعد دینا چاہئیے تھا۔ لیک جناب مدیر ناسخ و نسّاخ کی حرفی و معنوی مماثلت کا لحاظ کر گئے۔ نسّاخ نے انیس و دبیر کے مرثیوں پر اعتراضات کو 'انتخاب نقص' کے نام کے کتابچے میں پیش کیا اس کے جواب اور جواب الجواب میں 'تطہیر الاوساخ نسخ النسّاخ'، 'ردِ نسّاخ و جوابِ انتخاب نقص'، 'سنانِ خراش گستاخی معاف در ابراداتِ نسّاخ'، 'تفضیح'، 'تردید الایرادات' لکھے گئے، مضمون میں ان سے ضروری اقتباسات پیش کئے گئے؛ 'قاطعِ برہان' اور 'انتخاب نقص' وہی کتابوں کے معرکوں کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کے سلسلے میں کئی مناظراتی کتابیں لکھی گئیں نسا کے سلسلے کا پہلا کام ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم نے 'اُردو تنقید کی تاریخ' جلد اوّل میں پیش کیا تھا ڈاکٹر محفوظ الحق نے مزید تفصیل سے لکھا ہے 'اعتراض و سند کے دور کی پُر مغز بحث ہے۔

انیس و دبیر کے معرکوں پر دو مضامین موازنۂ انیس و دبیر اور المیزان کے اقتباسات سے تشکیل دیئے گئے ہیں اُردو میں سب سے مشہور اور سب سے لمبے عرصے تک چلنے والا معرکہ چکبست و شرر کا ہے اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس معرکے پر ایک پوری کتاب موجود ہے اس لئے مضمون میں کوئی نئی بات نہیں ہو سکتی تھی لیکن ادبی معرکوں کے شمارے میں اس کا خلاصہ تو بہر حال دینا ہی تھا۔

اس کے بعد کے حصے میں جن معرکوں اور چشمکوں کا بیان ہے وہ معروفِ عام نہیں اس لئے خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں۔

کسریٰ منہاس کا مضمون ایک نرالے موضوع پر ہے، جلال، تسلیم اور ولا کی معرکہ آرائی (تاریخ گوئی کے آئینہ میں) دقیق عالمانہ مباحث ہیں۔ الفِ ممدودہ، تائے مدّورہ اور یائے تحتانی ہمزہ دار کے اعداد جیسے اختلافی مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" کے معرکہ آراؤں کے نام شبلی حالی اور ایم مہدی حسن ہیں مضمون میں ضمناً ڈاکٹر نذیر احمد کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ یہ صراحت نہیں کی گئی کہ ادارے کی طرف سے یہ مضمون کس نے لکھا۔ بہر حال جس پائے اور متانت کے یہ بزرگ تھے اسی پائے اور متانت کا یہ مضمون ہے۔ ادبی معرکوں میں زیادہ سے زیادہ اس حد تک چشمک کی اجازت ہونی چاہئیے "داغ خطوط کی روشنی میں" کے مرتب کا نام بھی حسبِ معمول حذف کر دیا گیا ہے اس میں پہلے پنڈت کیفی کا اس عنوان کا مضمون ہے بعد میں اس پر تبصرے کا مضمون کچھ داغ سے متعلق ہے، یہ کہیں ظاہر نہیں کیا کہ یہ کس کا مضمون ہے اور کہاں سے لیا گیا ہے۔ ص ۲۰۷ کے ایک فٹ نوٹ کے آخر میں 'تمکین' لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مضمون کے مصنف تمکین کاظمی ہیں اس مضمون میں معرکہ تو برائے نام ہے بیشتر حصے میں داغ سے متعلق معلومات دی ہیں،

لیکن ہیں یہ نئی اور دلچسپ۔

محمد عبداللہ قریشی نے "اقبال کے ادبی معرکے" کے عنوان سے دو مضامین لکھے ہیں اس کا پہلا حصہ اقبال کے مضمون "اردو زبان پنجاب میں" (مشمولہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ باز طباعت "اقبال کے نثری افکار" مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل دلی ۱۹۷۷ء) پر مبنی ہے کسی نے کسی رسالے میں تنقید ہمدرد کے قلمی نام سے اقبال کی زبان پر کچھ اعتراض کئے تھے جن کا جواب اقبال نے اپنے مضمون میں دیا ہے اعتراض و جواب کی تفصیل جناب جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون "اقبال کی اپنے کلام پر نظر ثانی" مشمولہ نقوش، اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء میں بھی دی ہے اور جناب عبداللہ قریشی نے محولہ بالا مضمون میں بھی لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ تنقید ہمدرد کے نام سے کون لکھتا تھا اور کس رسالے میں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مضمون "اقبال کا سفر لکھنؤ حقیقت یا افسانہ؟" مشمولہ ہماری زبان دلی بابت ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء میں ص ۳ پر راز فاش کر دیا ہے۔

حسرت موہانی ۱۹۰۳ء سے سالہا سال تک اقبال کی نظم و نثر پر اپنے رسالے میں "تنقید ہمدرد" کے فرضی نام سے تابڑ توڑ حملے کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "اقبال اردو کو الٹی چھری سے ذبح کرتے ہیں" (اردوئے معلی فروری ۱۹۰۷ء ص ۳۰)

معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۰۳ء سے نہیں، ۱۹۰۲ء ہی سے اعتراض کرتے ہوں گے تب ہی تو اقبال نے اکتوبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں جواب دیا محمد عبداللہ قریشی کا دوسرا مضمون "حیات اقبال" کی گم شدہ کڑیاں، معرکۂ اسرار خودی" ہے اس میں اسرار خودی سے متعلق تمام مضامین اور اقبال کی صراحتیں درج کی ہیں۔ یہ مضمون "تصوف اور اسلام" کے موضوع پر معلومات کا گنجینہ ہے اور نقوش کے اس شمارے کے بہترین مضامین میں سے ہے اقبال سے متعلق تیسرا مضمون "مشہور شعر" ہزاروں سال نرگس.... پر ہے اس میں مختلف عمائدین ادب نے اس کے معنی پر بحث کی ہے۔ مضمون میں کوئی معرکہ آرائی نہیں۔

"ریاض خیرآبادی کے بعض یادگار ادبی معرکے" سید عقیل احمد جعفری کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔ نہایت دلچسپ، نہایت مفید مجھے اس کے کسی جزو سے واقفیت نہ تھی اس مضمون کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مذاق پھسل جاتا ہے کہ اردو کا لطف ملتا ہے تو داغ اور شاگردانِ داغ کی زبان کی شاعری ہی میں، ان اہل زبان بلکہ آقایان زبان کی تحریروں کے آداب دیکھیے کہ اعتراض اور جواب میں بھی کیا تہذیب کیا نرمی، کیا انشا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ریاض سے متعلق دوسرا مضمون ان کے ایک مصرع پر متعدد شعرا کی گرہوں پر مشتمل ہے

اگلا مضمون ڈاکٹر محمد رضوان الحق ندوی کا "جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے ادبی معرکے" ہے، طویل مضمون ہے جس میں الفاظ اور روزمرہ کی بحثیں ہیں۔ نقوش کے اس شمارے کو دیکھنے سے قبل مجھے اس بحث کا قطعاً علم نہ تھا اس مضمون سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ شاید کوئی بھی اہل زبان ایسا نہیں جس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ جلال جیسے ماہر زبان لکھنؤ کی غلطیاں دیکھنے سے طلسم لکھنؤ کی حقیقت فاش ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون "ظفر علی خاں کے ادبی معرکے" ہے۔ آدھے سے زیادہ صفحات میں ظفر علی خاں کی شاعری کے فن اور ہئیت کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس حصے کو معرکے سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں مضمون کے دوسرے حصے میں ان کی طنزیہ نظمیں درج ہیں جو یکطرفہ معرکے ہیں، نظمیں بہرحال دلچسپ ہیں۔

ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے معرکے پر ۲۷ صفحوں کا مضمون لکھا ہے ۱۹۱۲ء میں

کے علم میں بہت اضافہ ہوا اُنہوں نے کلبِ علی خاں سے چپقلش کا ایک انوکھا عنوان قائم کر کے تمام معارضات کا احصا کر لیا ہے۔

ذوق اور شاہ نصیر کے معرکوں پر ڈاکٹر تنویر علوی نے لکھا ہے کہ وہی اس کے ماہر ہیں اس کا بیشتر مواد آبِ حیات میں ملتا ہے۔ لیکن تنویر صاحب نے ان کا اور دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد کے مقدمے کے بیان کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور یہی ان کا اضافہ ہے

ناسخ کے معرکوں پر ڈاکٹر شبیر الحسن نونہروی نے لکھا ہے اُنہوں نے ناسخ ہی پر پی، ایچ ڈی کی ہے۔ ناسخ پر ان سے زیادہ کون جانتا ہے۔ آبِ حیات میں آتش و ناسخ کے معرکے معروفِ عام ہیں لیکن شبیر الحسن نے ناسخ کے چند ایسے معرکوں کی تفصیل دی ہے جن کا عام طور پر علم نہیں۔ اُنہوں نے ناسخ و آتش کے تعلقات پر بھی ایک عارف کی طرح لکھا ہے ڈاکٹر محمد صدر الحق نے عبدالغفور نسّاخ کے معرکوں پر لکھا ہے چونکہ یہ بحث انیس و دبیر کے مرثیوں کی تنقید سے متعلق ہے اس لئے فہرستِ مضامین میں اسے انیس و دبیر کے بعد دینا چاہئیے تھا۔ لیکن جناب مدیر ناسخ و نسّاخ کی حرفی و معنوی مماثلت کا لحاظ کر گئے۔ نسّاخ نے انیس و دبیر کے مرثیوں پر اعتراضات کو انتخابِ نقص، کے نام کے کتابچے میں پیش کیا اس کے جواب اور جواب الجواب میں تطہیر الاوساخ نسخ النسّاخ، ردِ نسّاخ و جوابِ انتخابِ نقص، سنانِ دل خراش گستاخی معاف وزابرادات نسّاخ، تفضیح، تردید الایرادات لکھے گئے، مضمون میں ان سے ضروری اقتباسات پیش کئے گئے ہیں قاطعِ برہان اور انتخابِ نقص دو ہی کتابوں کے معرکوں کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کے سلسلے میں کئی مناظراتی کتابیں لکھی گئیں نسّاخ کے سلسلے کا پہلا کام ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم نے اُردو تنقید کی تاریخ، جلد اوّل میں پیش کیا تھا ڈاکٹر محفوظ الحق نے مزید تفصیل سے لکھا ہے 'اعتراض و سند کے دور کی پُر مغز بحث ہے۔

انیس و دبیر کے معرکوں پر دو مضامین موازنۂ انیس و دبیر اور المیزان کے اقتباسات سے تشکیل دیئے گئے ہیں اُردو میں سب سے مشہور اور سب سے لمبے عرصے تک چلنے والا معرکہ چکبست و شرر کا ہے اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس معرکے پر ایک پوری کتاب موجود ہے اس لئے مضمون میں کوئی نئی بات نہیں ہو سکتی تھی لیکن ادبی معرکوں کے شمارے میں اس کا خلاصہ تو بہر حال دینا ہی تھا۔

اس کے بعد کے حصے میں جن معرکوں اور چشمکوں کا بیان ہے وہ معروفِ عام نہیں اس لئے خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں۔

کسریٰ منہاس کا مضمون ایک نرالے موضوع پر ہے، جلال، تسلیم اور ولا کی معرکہ آرائی (تاریخ گوئی کے آئینہ میں) دقیق عالمانہ مباحث ہیں۔ الفِ ممدودہ، تائے مدورہ اور یائے تحتانی ہمزہ دار کے اعداد جیسے اختلافی مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" کے معرکہ آراؤں کے نام شبلی حالی اور ایم مہدی حسن ہیں مضمون میں ضمناً ڈاکٹر نذیر احمد کا ذکر بھی آگیا ہے۔ یہ صراحت نہیں کی گئی کہ ادارے کی طرف سے یہ مضمون کس نے لکھا۔ بہر حال جس پائے اور متانت کے یہ بزرگ تھے اسی پائے اور متانت کا یہ مضمون ہے۔ ادبی معرکوں میں زیادہ سے زیادہ اس حد تک چشمک کی اجازت ہونی چاہئیے "داغ خطوط کی روشنی میں" کے مرتب کا نام بھی حسبِ معمول حذف کر دیا گیا ہے اس میں پہلے پنڈت کیفی کا اس عنوان کا مضمون ہے بعد میں اس پر تبصرے کا مضمون کچھ داغ سے متعلق ہے، یہ ہیں ظاہر نہیں کیا کہ یہ کس کا مضمون ہے اور کہاں سے لیا گیا ہے۔ ص ۲۰۹ کے ایک فٹ نوٹ کے آخر میں تمکین، لکھا ہے جس سے اندازہ تا ہے کہ اس مضمون کے مصنف تمکین کاظمی ہیں اس مضمون میں معرکہ تو برائے نام ہے بیشتر حصے میں داغ سے متعلق معلومات دی ہیں،

لیکن ہیں یہ نئی اور دلچسپ۔

محمد عبداللہ قریشی نے "اقبال کے ادبی معرکے" کے عنوان سے دو مضامین لکھے ہیں اس کا پہلا حصہ اقبال کے مضمون "اردو زبان پنجاب میں" (مشمولہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ باز طباعت "اقبال کے نثری افکار" مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل دلّی ۱۹۷۷ء) پر مبنی ہے کسی نے کسی رسالے میں تنقید ہمدرد کے قلمی نام سے اقبال کی زبان پر کچھ اعتراض کئے تھے جن کا جواب اقبال نے اپنے مضمون میں دیا ہے اعتراض و جواب کی تفصیل جناب جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون "اقبال کی اپنے کلام پر نظرِ ثانی" مشمولہ نقوش، اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء میں بھی دی ہے اور جناب عبداللہ قریشی نے محولۂ بالا مضمون میں بھی لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ تنقید ہمدرد کے نام سے کون لکھتا تھا اور کس رسالے میں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مضمون "اقبال کا سفر لکھنؤ حقیقت یا افسانہ؟" مشمولہ ہماری زبان دلّی بابت ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء میں ص ۳ پر راز فاش کر دیا ہے۔

حسرت موہانی ۱۹۰۲ء سے سالہا سال تک اقبال کی نظم و نثر پر اپنے رسالے میں "تنقید ہمدرد" کے فرضی نام سے تابڑ توڑ حملے کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "اقبال اردو کو الٹی چھری سے ذبح کرتے ہیں" (اردوئے معلی فروری ۱۹۰۷ء، ص ۳۲)

معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۰۳ء سے نہیں، ۱۹۰۲ء ہی سے اعتراض کرتے ہوں گے تب ہی تو اقبال نے اکتوبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں جواب دیا محمد عبداللہ قریشی کا دوسرا مضمون "حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں، معرکۂ اسرارِ خودی" ہے اس میں اسرارِ خودی سے متعلق تمام مضامین اور اقبال کی صراحتیں درج کی ہیں۔ یہ مضمون "تصوف اور اسلام" کے موضوع پر معلومات کا گنجینہ ہے اور نقوش کے اس شمارے کے بہترین مضامین میں سے ہے اقبال سے متعلق تیسرا مضمون "مشہور شعر" ہزاروں سال نرگس .... پر ہے اس میں مختلف عمائدینِ ادب نے اس کے معنی پر بحث کی ہے۔ مضمون میں کوئی معرکہ آرائی نہیں۔

"ریاض خیرآبادی کے بعض یادگار ادبی معرکے" سید عقیل احمد جعفری کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔ نہایت دلچسپ، نہایت مفید مجھے اس کے کسی جزو سے واقفیت نہ تھی اس مضمون کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مذاق پھسل جاتا ہے کہ اردو کا لطف ملتا ہے تو داغ اور شاگردانِ داغ کی زبان کی شاعری ہی میں، ان اہلِ زبان بلکہ آقایانِ زبان کی تحریروں کے آداب دیکھیے کہ اعتراض اور جواب میں بھی کیا تہذیب کیا نرمی، کیا انشا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ریاض سے متعلق دوسرا مضمون ان کے ایک مصرع پر متعدد شعرا کی گرہوں پر مشتمل ہے

اگلا مضمون ڈاکٹر محمد رضوان الحق ندوی کا "جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے ادبی معرکے" ہے، طویل مضمون ہے جس میں الفاظ اور روزمرہ کی بحثیں ہیں۔ نقوش کے اس شمارے کو دیکھنے سے قبل مجھے اس بحث کا قطعاً علم نہ تھا اس مضمون سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ شاید کوئی بھی اہلِ زبان ایسا نہیں جس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ جلال جیسے ماہرِ زبان لکھنؤ کی غلطیاں دیکھنے سے طلسم لکھنؤ کی حقیقت فاش ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون "ظفر علی خاں کے ادبی معرکے" ہے۔ آدھے سے زیادہ صفحات میں ظفر علی خاں کی شاعری کے فن اور ہیئت کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس حصّے کو معرکے سے دُور دُور تک کوئی علاقہ نہیں مضمون کے دوسرے حصّے میں ان کی طنزیہ نظمیں درج ہیں جو یکطرفہ معرکے ہیں، نظمیں بہرحال دلچسپ ہیں۔

ابو سلمان شاہجہاں پوری نے مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے معرکے پر ۲۷ صفحوں کا مضمون لکھا ہے ۱۹۱۲ء میں

مولانا عبدالماجد نے اپنی کتاب 'فلسفۂ جذبات' میں حظ و کرب کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ مولانا آزاد نے ان کے بجائے لذت والم کو موزوں تر ٹھہرایا اتنی سی بات پر اتنا لمبا مناقشہ کھڑا ہوگیا۔ میرے اور میرے بعد کی نسلیں اس بحث سے بالکل بے خبر ہیں۔ یہ ابو سلمان صاحب کی دریافت اور بازیافت ہے۔

ایک نہایت گاڑھا معرکہ، اثر لکھنوی کی ایک غزل ہے جس میں مرزا جعفر علی اثر، نیاز اور دوسرے دو صاحبوں نے حصہ لیا۔ یہ نقوش کے اہم صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ زیادہ تر عروض سے تعلق رکھتا ہے لیکن آخر میں دوسری ضمنی بحثیں بھی آگئی ہیں۔ بحثیں نہایت پُرمغز اور اسی قدر غیر دلچسپ ہیں۔ معرکہ زیادہ پرانا نہیں۔ میں نے نگار کے صفحات پر اس کی چند قسطیں پڑھی تھیں۔

ان نہایت پُرمغز فاضلانہ بحثوں کے بعد دو اودھ پنچانہ معرکوں کو دیکھیئے، پہلا چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا ہے پورے شمارے میں یہ واحد منظوم معرکہ ہے جس میں حسرت اور تاثیر دو اہم فریق تھے لیکن ساتھ ہی ان کے حلیف شعرا نے بھی حصہ لیا۔ یہ معرکہ سودا و ضاحک اور انشا و مصحفی کی نظموں کا جدید ایڈیشن پیش کرتا ہے۔

شخصی معرکوں کے سلسلے کا آخری معرکہ جوش اور شاہد دہلوی کا ہے۔ دو بے نظیر مضمون ہیں جوش ملیح آبادی کا ضرب شاہد بفرقِ شاہد باز اور شاہد احمد کا "نہ جنتی نہ ڈھول بجتے" یہ دو بڑے آدمیوں کا معرکہ ہے لیکن اس میں علمی بحثیں بالکل نہیں، ذاتیات کا معرکہ ہے اور اس لئے بہت پُرلطف ہے شاہد احمد کے مضمون میں روزمرہ اور محاورے کا ایسا لطف ہے کہ بول کر پڑھیے۔ تو ہونٹ چاٹتے رہ جایئے۔

مولانا عبدالباری آسی اپنے رسالہ 'مخزن' میں ایک باب 'معرکۂ سخن' کے نام سے لکھتے تھے جس میں شعرا کے مناظرے اعتراضات اور جوابات دیتے تھے اور آخر میں ہر اعتراض کے متعلق بطور حکم اپنی رائے درج کرتے تھے بعد میں ان مطالب کو جمع کر کے ۲۰۷ صفحات کا تذکرہ 'معرکۂ سخن' شائع کر دیا۔ نقوش میں اس تذکرے کی تلخیص ہے جس کے بعد علامہ اطہر ہاپڑی (اس ترکیب میں واؤ کہاں سے اتر گیا) کا مضمون 'محاکمہ معرکۂ سخن' ہے جس میں انہوں نے مولانا آسی کے بعض فیصلوں سے اختلاف کیا ہے۔ دونوں مضامین ۵۰ صفحوں کو محیط ہیں۔ ان میں قدیم نقطۂ نظر سے فن و شعر کے سیکڑوں نکتے محفوظ ہیں جنہیں پڑھنا دورِ حاضر کے ادیبوں کے لئے بھی مفید ہوگا خواہ وہ اس کی تقلید کریں یا نہ کریں۔

فہرست کے آخر میں ایک فارسی معرکے کا بیان ہے۔ خان آرزو نے شیخ علی حزیں کے کلام پر اعتراضات کر کے رسالہ تنبیہ الغافلین لکھا۔ امام بخش صہبائی نے آرزو کے اعتراضات کا جواب "قول فیصل" کے نام سے لکھا۔ نقوش نے چاہا کہ قول فیصل کا اردو ترجمہ کرا کے چھاپ دیں۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے ترجمہ شروع کیا لیکن مکمل کرنے سے پہلے انتقال کر گئے۔ یہ نامکمل ترجمہ ۵۲ صفحات پر ہے اس سے اٹھارہویں صدی کے وسط کی شعریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ پورا ہو جاتا تو اور مفید ہوتا گو اس دور میں فارسی شاعری سے دلچسپی لینے والے کم ہیں۔

یہ ایک جھلک ہے نقوش کے ادبی معرکہ نمبر کی جس کو کتابی شکل میں ڈھالا جائے تو تین ضخیم جلدوں میں سمائے گا ان معرکوں میں نثر نگاروں کی نمائندگی تقریباً نہیں کے برابر ہے حالی و شبلی ہی اس کمی کو پورا کرتے ہیں، ابوالکلام آزاد

اور عبدالماجد دریابادی ہیں، تو نثر نگار، لیکن ان کی بحث محض دو لفظوں کے ترجمے تک محدود ہے۔ تخلیقی نثر میں سب سے مشہور معرکہ باغ و بہار، فسانہ عجائب، سروشِ سخن اور طلسم حیرت کا ہے میں نے اسی پر ایک مضمون بھیجا تھا لیکن وہ شمارے کی طباعت کے بعد پہنچا۔ اسی سلسلے کی ایک بحث سروشِ سخن کے مصنف سخن اور صفیر بلگرامی کی تھی حالیہ میں پریم چند کے تعلق سے ہندوستان میں کچھ معرکہ آرائی ہوئی ہے ایسے کچھ مضامین نقوش کی اشاعت ۱۹۸۱ء تک وجود میں آچکے تھے بقیہ بعد میں شائع ہوئے۔

شاعروں اور شاعری سے متعلق کچھ معرکے چھوٹ گئے ہیں ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ غزل کے بارے میں ایک مباحثہ ہوا جس کی تحریک عظمت اللہ خاں کی غزل بیزاری سے ہوئی اس میں جوش ملیح آبادی عندلیب شادانی اور نہ جانے کس کس نے حصہ لیا۔ آزاد نظم کا معرکہ فرحت کاکوروی کی کتاب 'مداوا' میں محفوظ ہو گیا ہے فراق کے معرکے بھی چھوٹ گئے ہیں جو جعفر علی خاں اثر اور سردار جعفری سے ہوئے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں دیوانِ غالب بخط غالب کی صحت و صداقت کے تعلق سے جو متعدد تحریریں وجود میں آئیں وہ نقوش ہی کے غالب نمبر میں موجود ہیں۔

اس نمبر کا دوسرا باب معرکوں پر مشتمل ہے بقیہ مضامین میں بھی بعض جگہ ایسے مطالب آ گئے ہیں جن میں معرکہ آرائی کا ہنگامہ نہیں بلکہ ایک نکتے پر مختلف رایوں کا اظہار ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی اس شمارے میں لسانیات، زبان و بیان اور قدیم شعریات کے اتنے خزینے بھرے پڑے ہیں کہ یہ علم و فن کا ایک گنج قارون بن گیا ہے جو ہمیں گنج باد آورد کی طرح گھر بیٹھے بیٹھے مل گیا ہے، اس کی ترتیب میں ادارے کو کتنی تحقیق و تدقیق اور کتنی دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی اسے پڑھنے سے نئی نئی معلومات کا ایک در نہیں، ہزار در کھل جاتے ہیں۔ کتنے ایسے معرکے ہیں اور کتنی ایسی مناظراتی کتابیں ہیں جن کا مجھ ہیچمداں کو علم نہ تھا۔ نقوش کے عالی شان نمبروں کے کئی فرسنگ لمبے قافلے میں بے شک رسولؐ نمبر (جو میری نظر سے نہیں گزرا) معلومات کے لحاظ سے سرفہرست ہوگا لیکن اس کے بعد ادبی معرکے نمبر اور لاہور نمبر کو رکھیں گے۔ رسول نمبر تو مذہبی صحائف کی طرح محترم ہے اس سے ہٹ کر، میری جاں بخشی کی جائے تو میں کہوں گا کہ جملہ خصوصی نمبروں میں ادبی معرکے نمبر سب سے زیادہ بیش بہا ہے کم از کم مجھ جیسا بے متاع، کم مایہ، ہیچمداں شخص اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے تمام نمبروں میں اسی کو سب سے اوپر رکھے گا۔ خدا اس کے مؤلف محمد طفیل صاحب کا دونوں جہاں میں بھلا کرے۔

نقوش کا میر انیس نمبر

کسریٰ منہاس

مارچ ۱۹۴۸ء سے مارچ ۱۹۵۱ء تک نقوش کے اٹھارہ شمارے جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ ہاجرہ مسرور اور سید وقار عظیم نے مرتب کیے۔ یہاں سے جناب محمد طفیل نے نقوش کی ادارت کا کام سنبھالا۔ پہلا شمارہ (نمبر ۱۹ - ۲۰) ہے جس کے وہ تنہا مدیر بھی ہیں اور پرنٹر اور پبلشر بھی۔ لیکن بعض حلقوں نے دبی زبان میں طفیل صاحب کے اس اقدام کو حیرت کی نظر سے دیکھا یہاں تک کہ نقوش کے مستقبل سے بھی قدرے مایوس ہو گئے۔ لیکن طفیل صاحب مطمئن تھے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر پورا پورا اعتماد تھا۔ جب نقوش کا نمبر (۱۹ - ۲۰) منظرِ عام پر آیا تو ان لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ جب انہوں نے اس نمبر کا "طلوع" پڑھا تو ان کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا۔ 'طلوع' کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

> "نقوش کی ترتیب کا بار اب میرے ذمہ ہے۔ اس راہ میں جن جن ذمہ داریوں اور نزاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے میں ان سے آشنا بھی ہوں اور متاثر بھی۔ اس لیے لمبے چوڑے دعوے کرنا میرے بس کی بات نہیں رہی اور پھر جب یہ احساس دامنگیر ہو کہ اس سے قبل ہم سے غلطیں بھی سرزد ہوئیں تو میں اس کی اچھائیوں پر خوش ہونا اور اس کی کمزوریوں پر افسوس کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اس کی باگ ڈور ہمیشہ انسانی ہاتھوں میں رہی ہے۔ پھر جیتے جی فرشتہ بننے کو دل نہیں چاہتا۔
>
> احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور وقار عظیم نے اسے اپنی خداداد علمیت اور قابلیت کے بل پر زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مجھ میں علمیت اور قابلیت دونوں کا فقدان سہی لیکن میں پاکستان اور ہند کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خلوص اور ان کے بھرپور تعاون پر اعتماد رکھتے ہوئے یوں لکھ رہا ہوں کہ انشاء اللہ نقوش کے ادبی معیار کو کبھی ضعف نہیں پہنچے گا جس کا حسین اظہار زیرِ نظر شمارہ بھی ہے۔
>
> اردو ادب کی یہ بدنصیبی ہے کہ آج یہ مختلف نظریات اور مختلف گروہوں کی زد میں آکر بے جان اور بے آبرو ہو رہا ہے۔ میری یہ خواہش ہو گی کہ نقوش ایک مخصوص قسم کے دائرے کے اندر گھٹ گھٹ کر نہ جئے بلکہ اس کی اڑان وسیع تر اور واضح ہو۔ اسے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کی تخلیقات پر بھی ناز ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اس حقیقت کو بھی نہ بھولے کہ عزیز احمد، ممتاز مفتی اور قرۃ العین حیدر کی نگارشات کو بھی اردو ادب میں ایک قابلِ فخر

مقام حاصل ہو۔ اس لیے نقوش اردو کے ہر صاحبِ بصیرت ادیب و شاعر کو اپنے سینے سے لگائے گا۔ وقت خود کھرے کھوٹے کی پہچان بڑی آسانی سے کر لیتا ہے۔ جس قلم کار کی تحریر میں خلوص اور حسن ہوگا اُسے اہلِ علم دل اور آنکھوں میں جگہ دے لیں گے اور جن کی تحریریں صرف ذہنی تعیش کی پرچھائیاں ہوں گی وُہ خود بخود بے اثر رہ جائیں گی اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہُوں کہ بحیثیت "امین" کے خامکار ثابت نہیں ہوں گا۔

آج سے قبل جب میں نے نقوش کا کوئی نمبر شائع کیا ہے تو میرا سر مسرت سے ذرا بلند سا ہوگیا ہے لیکن نتیجہ میں جب جیب پر ہاتھ رکھا تو خاصی ہلکی پائی.... اس لیے خیال تھا کہ نقوش کا یہ "الوداعی نمبر" چھاپ کر چُپ سادھ لوں لیکن اس خبر سے سبھی کو دکھ ہُوا۔

ادبأ و شعرا نے لکھا کہ خدا نخواستہ نقوش بھی بند ہوگیا تو پھر ہم کس کے لیے لکھیں گے۔

قارئین نے کہا کہ ادب کا یہ روشن ستارہ بھی ڈوب گیا تو آسمانِ ادب پر کسی اور کا دو گھڑی بھی جھلملانا مشکل ہے۔

میں نے سبھی دوستوں کی باتیں سُنیں لیکن میری بات کوئی نہیں سُنے گا ـــ اور وہ یہ ہے کہ ـــ نقوش میرے علاوہ آپ کا بھی ہے۔ جتنی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں اتنی آپ بھی تو محسوس کریں۔ تنہا میری کوششیں اسے کب تک سہارا دے سکیں گی، اس کے بناؤ سنگار اور معیار کو برقرار رکھنے میں مَیں نے بہت کچھ صرف کیا ہے اب تو آپ کے خونِ جگر اور مخلصانہ تعاون کی مزید ضرورت آپڑی ہے۔ خون کا مطالبہ میرا ادبا و شعرا سے ہے ـــ وہ اپنے خونِ جگر سے لکھے ہوئے شاہپاروں سے نقوش کو برابر نوازتے رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نقوش کی ہر سطر اور ہر لفظ میں جو خونِ دل رواں تھا اس میں حسبِ ضرورت سُرخی نہ رہی۔

قارئین چاہیں تو (مستقل خریدار بن کر) اس کی مالی حیثیت اتنی مضبوط بنا سکتے ہیں کہ اس میں کبھی ہلکا سا جھکاؤ بھی پیدا نہ ہو سکے۔ اور اگر عین شباب کے عالم میں اس کی تر و تازہ اور پاک و مصفا روح مرجھا کے رہ گئی تو کیا آپ بھی مستقبل کے قاری سے میری طرح شرمسار نہ ہوں گے۔

ہمارا ارادہ ہے کہ اب پھر نقوش کو باقاعدہ ہر ماہ شائع کیا جائے۔ ایسی صورت میں آپ کا پُرخلوص تعاون بڑا مضبوط سہارا بن سکتا ہے۔"

محمد طفیل

یہ الفاظ تھے جو طفیل صاحب نے قارئینِ نقوش اور ادبا و شعرا تک صاف لفظوں میں پہنچائے۔ انہوں نے اپنے لائحہ عمل اور اپنی منزل کی نشان دہی کر دی۔ انہوں نے (۱۹ ـــ ۲۰) شمارہ سے جس ادبی و علمی سفر کا آغاز کیا تھا اس کی وقت کے ساتھ ساتھ افادیت و اہمیت بڑھتی گئی اور یہ باغ ہر موسم میں پھولتا پھلتا رہا۔ اہلِ نظر نے دل و جان سے اس کی پذیرائی کی،

اس کو سراہا اور مجلاتی صحافت میں اسے اونچے سے اونچے مقام پر نوازا۔ اس کے عام نمبروں کو بھی خاص نمبروں کی طرح پُر وقا سمجھا۔ اہلِ دانش نے اس کی قدر کی اور اردو ادب کی تاریخ میں اسے سنگِ میل قرار دیا طفیل صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیہ اور ان کی انتھک کوششوں کی زرّیں الفاظ میں تشہیر کی۔

۱۹۵۱ء میں جس سفر کا آغاز ہوا تھا وہ بخیر و خوبی نومبر ۱۹۸۱ء تک پہنچا اور یہی سال "میر انیس نمبر" کی اشاعت کا ہے۔ اس دوران نقوش کے بہت سے عمومی اور خصوصی نمبر چھپ چکے ہیں جن کی تعداد ایک سو دس (۱۱۰) تک پہنچتی ہے اس میں خصوصی و عمومی اشاعتیں شامل ہیں۔ عمومی اشاعتوں میں عام شمارے، خاص شمارے، خاص نمبر، پنج سالہ، دس سالہ خاص نمبر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ خصوصی اشاعتوں میں بعض موضوعات سے مختص ہیں مثلاً افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، ناولٹ نمبر، لاہور نمبر، ادبی معرکے نمبر وغیرہ یہ سب اشاعتیں اپنی اپنی جگہ وقیع، محققانہ، دلچسپ، جامع و مستند ہیں۔ ان ایک سو دس (۱۱۰) نمبروں میں چند اشاعتیں ایسی بھی ہیں جن کا موضوع شخصی ہے۔ مثلاً منٹو نمبر، پطرس نمبر، شوکت نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، انیس نمبر، یہ سب نمبر شخصی اشاعتیں ہیں اور ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک ممتاز شخصیت کے لیے دوسری ممتاز شخصیتیں اظہارِ خیال کر سکتی ہیں۔ ان شخصی نمبروں کی فہرست مع ضروری کوائف ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

شمارہ	سالِ اشاعت	عنوان	صفحات
۴۹ - ۵۰	۱۹۵۵ء	منٹو نمبر	۳۸۴
۷۵ - ۷۶	ستمبر ۱۹۵۹ء	پطرس نمبر	۶۴۰
۹۹	ستمبر ۱۹۶۳ء	شوکت تھانوی نمبر	۶۲۴
۱۱۱	فروری ۱۹۶۹ء	غالب نمبر (۱)	۸۴۰
۱۱۳	اکتوبر ۱۹۶۹ء	غالب نمبر (۲)	۳۸۸
۱۱۶	ستمبر ۱۹۷۱ء	غالب نمبر (۳)	۶۱۲
۱۲۱	ستمبر ۱۹۷۷ء	اقبال نمبر (۱)	۵۵۷
۱۲۲	نومبر ۱۹۷۷ء	اقبال نمبر (نیرنگِ خیال نمبر)	۶۰۰
۱۲۳	دسمبر ۱۹۷۷ء	اقبال نمبر (۲)	۶۵۴
۱۲۵	اکتوبر ۱۹۸۰ء	میر نمبر (۱)	۶۳۲
۱۲۶	نومبر ۱۹۸۰ء	میر نمبر (۲)	۶۴۰
۱۲۸	نومبر ۱۹۸۱ء	انیس نمبر	۷۲۸

مذکورہ اشاعتوں میں آخری اشاعت شمارہ (۱۲۸) میر انیس نمبر ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کے موقع پر

"اس شمارے میں" کے عنوان کے تحت طفیل صاحب فرماتے ہیں؛

> "ایک دن سوچا، میر، غالب، اقبال کے بعد چوتھا شاعر کون ہے؟ ذہن نے جھٹ فیصلہ کر لیا ——— میر انیس۔ اگر موضوع کی پاکیزگی اور بلندی کو دھیان میں رکھیں تو میر و غالب کٹ جاتے ہیں اقبال اور انیس میدان میں رہ جاتے ہیں۔ پہلے تین شاعروں پر ادارۂ نقوش بساط بھر کام کر چکا ہے۔ باقی رہ گئے میر انیس۔ ان کے بارے میں کچھ کرنے کا خیال ضرور تھا۔ مگر محض نمبر چھاپنا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ کچھ ایسا نایاب[لہ] مواد چھاپا جاتا جو زندہ رہنے والا ہوتا۔ لیجئے وہ آرزو بھی پوری ہوئی ایک صدی سے زیادہ عرصہ کی تحریریں مل گئیں اور کاغذ پر زندہ لفظوں کی سبیلیں لگ گئیں۔"
>
> (انیس نمبر ص ۶)

میر انیس نمبر جیسا کہ فٹ نوٹ (۱) سے ظاہر ہوتا ہے پہلے ہندوستان میں چھپا جس کے مرتب ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری ہیں۔ حیدری صاحب ہی کی خواہش پر یہی نمبر نقوش کے انیس نمبر کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔ اس میں کیا ہے؟ اس پر ہم ہلکی سی روشنی ڈالتے ہیں اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی محنت کاوش تحقیق و جستجو کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

فہرستِ مضامین پر جب نظر ڈالیں تو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا وہ مضمون سامنے آتا ہے جس میں انہوں نے میر انیس کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ میر انیس کا شجرۂ نسب بھی دیا ہوا ہے جس سے ان کا یہ فرمانا ؏

پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ میر انیس ——— مختصر تعارف، میر انیس کی استعداد، میر انیس کی سیرت، میر انیس کی خوش بیانی، خوش آوازی اور مرثیہ گوئی، میر انیس کے چشم دید حالات، میر انیس کے عقیدت مند رفیق کا بیان، میر انیس کے دو استاد، سفرِ حیدر آباد، میر انیس کی وفات۔ ان عنوانات سے میر انیس کے حالاتِ زندگی سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ دوسرا مضمون 'مطالعۂ انیس' پروفیسر سید احتشام حسین کا ہے جس میں میر انیس کی شاعرانہ بصیرت، فنی صلاحیت، تخلیقی

[لہ] مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر اکبر حیدری اپنے نامکمل کاموں کو میرے سپرد اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں مکمل میں کردوں یا بنا سنوار کر پیش کروں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نسخہ اس نسخے سے بہتر نظر آئے گا جو ہندوستان میں چھپا۔ پھر اس نسخے میں مزید غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔

جو مرثیے یا بند غیر مطبوعہ ہیں ان کی فوری پہچان کے لیے میں نے اسٹار (★) کا نشان بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اِروں آدمیوں سے ایک شخص کی دیدہ ریزی بھلی!

بہرحال ڈاکٹر اکبر حیدری کا جو احسان اردو ادب پر ہے ——— وُہ تو ہے۔"

م۔ ط

قوت اور قدر ہے۔ بیان کا اظہار نہایت عالمانہ طور سے کیا گیا ہے۔ مرثیوں میں ایپک کی تلاش، ایپک میں معنوی حیثیت سے اعلیٰ مقاصد، بلند اخلاقی، خیر و شر کی کشمکش، اچھے اور بُرے نمونوں کی نمائش، انسانیت اور بہیمیت کا مقابلہ بہیمانہ قوتوں کی صف آرائی اور ناقابلِ بیان مصائب کے ہجوم میں امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی بلندیِ کردار، مرثیے میں ڈرامائی عناصر کی فراوانی اور ٹریجڈی بننے کی وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔" ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کا مقالہ کتنی محنت اور مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس مقالہ سے مرثیہ کی عظمت اور حضرت امام حسین کے صبر و استقلال کا بھی پتا چلتا ہے اور دشمنانِ اہلبیت کی شقاوت کا اظہار بھی۔

میر انیس نمبر میں ستائیس ۲۷ تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ ان تصاویر کا مختصر تعارف مرزا امیر علی جونپوری کی پُرخلوص کوشش کے صلے میں لکھا گیا۔ ان کی محنت اور جانفشانی کی داد کہاں تک دی جائے۔ ان تصاویر میں تیئیسویں تصویر انیس کے پرپوتے سید علی احمد دانش کی ہے۔ چوبیسویں تصویر مقبرۂ قدیم جو میر مونس کی وفات کے بعد حضرت نفیس اور چند رؤسائے لکھنؤ نے تعمیر کروایا تھا جو بعد میں چند برس قبل کارکنان انجمن یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ نے میر انیس کے ممتاز افراد کے تعاون سے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ تصویر پچیسویں نو تعمیر مقبرۂ انیس کی ہے۔ چھبیسویں تصویر میر انیس کی نشست گاہ ہے جہاں احباب سے ملاقاتیں اور شعر و سخن پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ ستائیسویں تصویر میر انیس کے صاحبزادے میر نفیس کی ایک یادگار مجلس کی تصویر ہے۔ شروع کی بائیس تصاویر میر انیس کے خاندان کی تصاویر ہیں جن میں میر انیس کے پردادا میر غلام حسین ضاحک، میر انیس کے دادا غلام حسن حسن، میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق، میر انیس کے بھائی میر انس، میر مونس، فرزند میر نفیس، میر سلیس، میر انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج اور میر انیس کے خاندان کی دوسری ممتاز شخصیتوں کی تصاویر بھی اس نمبر کی زینت ہیں۔ جن میں مانوس، فائز، جلیس، رشید، سلیس، شائق، وحید اور دوسرے نامور افرادِ خاندان کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان تصاویر کا تعارف مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ جو حضرات میر انیس اور ان کے خاندان کے حالات معلوم کرنا چاہیں ان کے لیے یہ مضمون بہت کار آمد اور مفید ہے۔

میر انیس کی شان میں دو رباعیاں شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالیؔ نے کہی تھیں۔ مولانا حالیؔ کے خط میں ان دونوں رباعیوں کا عکس بھی میر انیس نمبر میں چھپا ہے۔ مولانا حالیؔ کی تحریر، وہ بھی ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تبرک کا درجہ رکھتی ہے۔

دو رباعیاں یہ ہیں :

(۱)

اُردو کو راج چار سُو تیرا ہے
شہروں میں رواج کُو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سحر ہے باقی
تُو لکھنؤ کا ہے اور لکھنؤ تیرا ہے

(۲)

دلی کی زباں کا سہارا تھا انیس
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی اُجڑی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

میر انیس ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے جن کے نام سے انیس نمبر منسوب کیا گیا ہے وہ مداحِ اہلبیتِ رسولؐ تھے۔ خود ان کے خاندان میں مرثیہ نگاری اور شاعری کی زبردست روائتیں مختلف تذکروں میں ملتی ہیں۔ انیس کے مورثِ اعلیٰ جو شاہجہان کے زمانے میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اپنی علمیت اور فضیلت کی وجہ سے تین ہزاری منصب پر سرفراز ہوئے۔ وہ بھی کبھی کبھار شعر کہتے تھے۔ میر انیس کے پردادا میر ضاحک صاحبِ دیوان اور اپنے وقت کے سربرآوردہ شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ میر ضاحک کے فرزند میر حسن، میر انیس کے دادا صاحبِ دیوان اور مثنوی سحرالبیان کے مصنف تھے۔ اس مثنوی کا جادو آج تک چل رہا ہے۔ اسی طرح میر حسن کے بیٹے اور میر انیس کے والد میر خلیق کا رتبہ شاعری اور زباں دانی میں مشہور ہے ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا تھا۔ فیض آباد کے دورانِ قیام میں محمد خاں رِند اور علی اوسط رشک میر خلیق کے حلقۂ تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ میر خلیق کے تینوں فرزند انیس، انس اور مونس مرثیہ گوئی میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مرثیہ گو مانے جاتے تھے۔ لیکن جو عظمت، فضیلت اور مقبولیت میر انیس کو حاصل تھی۔ وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ میر انیس کا کلام محاسنِ شعری کا مرقع ہے۔ جو بلند پروازی، رعنائیِ خیال اور اسلوبِ بیان کی شگفتگی قاری کو میر انیس کے کلام میں ملتی ہے دوسروں کے ہاں خال خال نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسے اور دبیرے تاریخِ ادب میں رہ کر معدوم ہو گئے لیکن انیس کی گویائی کے ڈنکے آج بھی بج رہے ہیں۔ یہ سب کچھ انھیں پنجتن پاکؑ کی مدح کے صلے میں ملا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں: ؎

ہے زیورِ عروسِ سخن پنج تنؑ کی مدح   زینت کلام کی ہے رسولؐ زمن کی مدح
ہے لذتِ زباں شہِ خیبر شکن کی مدح   آرامِ جان و دل ہے حسینؑ و حسنؑ کی مدح
ہر دم یہ ذکر باعثِ عیش و سرور ہے
دل کی جو روشنی ہے تو آنکھوں کا نور ہے

شعر کہتے وقت میر انیس کن باتوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے: ؎

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی   لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں، جسے صنعت ہو وہی   یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبادت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بزم کا رنگ جدا ، رزم کا میداں ہے جدا   یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا   مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقّت بھی ہو، تعریف بھی ہو

مرثیہ میں رونے اور رُلانے کا بیان اکثر ملتا ہے اور کوئی مرثیہ ان سے خالی نہیں ہوتا۔ رونے رُلانے کے علاوہ میر انیس فنی نقطۂ نظر کو بھی اہمیت دیتے ہیں مذکورہ بندوں میں شرفا کے روزمرہ، موقع و محل کے مطابق الفاظ کا انتخاب، چست بندش اور مضامین کی بلندی، رزم اور بزم دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ بقول ان کے مرثیہ کا ہر میدان دوسرے مرثیے سے جُدا ہے مراثی انیس میں غم کے مدارج بھی جدا جدا ہیں، کہیں ماں کا غم، کہیں باپ کا غم، کہیں بہن بھائی بیٹے کا غم مراثی انیس میں غم کے مختلف مدارج دیکھنے میں آتے ہیں اور ہر جگہ اظہارِ بیان کے طریقے جدا جدا ہیں۔ مرثیوں میں انیس کے شخصی غم کی غم انگیز جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ ذیل کا بند اس کیفیت کا اظہار ہے: ؎

آئے خزاں گلوں پہ تو ہو پھر بہارِ غم   تازہ ہوائے آہ سے ہوں برگ و بارِ غم
داغوں کے گُل کھلیں تو گلوں میں ہوں خارِ غم   آنسو بہیں تو پھُولے پھلے شاخسارِ غم
گلچیں نسیمِ غم ہو الم باغباں بنے
نالہ ہو عندلیب تو دل آشیاں بنے

میر انیس مجلسِ عزا میں خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں اور ان کے مراثی میں یہ ایک منفرد مقام ہے جس سے ان کی شاعری مالا مال ہے۔

میر انیس کے کلام میں دو ایسی خوبیاں موجود ہیں جن کا ایک جگہ ہونا بظاہر محال ہے۔ اوّل درد انگیز اور مؤثر طرزِ بیان جس میں رونا رُلانا آتا ہے۔ اس کا مرثیہ نگاری کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ شجاعت کے بیان میں جس زور اور طنطنے کی ضرورت ہے وہ بھی میر انیس کے کلام میں بدرجۂ اُتم موجود ہے اس وصف کا تعلق اصل میں رزم نگاری سے ہے۔ لیکن عظیم شاعر وُہ ہے جو مختلف اوصاف کو گھلا ملا کر یک جان کر دے، جیساکہ انیس نے کر دکھایا ہے۔

چنانچہ حضرت عباسؓ کی شجاعت کا نقشہ پیش کرنا منظور ہو تو انیس کا زورِ بیان اپنی انتہا کو چھو لیتا ہے۔ جس فاتحانہ شان کے ساتھ عباسؓ میدانِ جنگ سے دریا تک پہنچتے ہیں۔ میر انیس اس کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں: ؎

اللہ رے رعب آمدِ عباسؓ عرش قدر   سینوں میں دل چھپے ہوئے ہیں جوشنوں میں صدر
غل ہے قریب تر ہے سپہرِ وفا کا بدر   زہرے ہیں آب، گھاٹ سے بھاگے ہیں اہلِ غدر
آتا ہے ابنِ ضیغمِ یزداں لڑائی کو
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہے ترائی کو

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر　　　تھیں موج کی طرح سب اِدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا ترائی کو چھوڑ کے

میدان میں حضرت عباسؑ کی آمد سے لشکر میں ہل چل کا پڑ جانا، اشقیا کا ہراساں ہونا، گھوڑے مرتجز کی اڑان اور ذوالفقارِ حیدری کی کاٹ‘ یہ ایسے اشارے ہیں جس سے میر انیس کی رزم آرائی کی شان نمایاں ہے۔ یہ سب کچھ مولا کی غلامی کے طفیل ہے جس پر میر انیس کو ناز ہے۔

کلامِ انیس کے بعض پہلو پرانی باتیں اور ماضی کے دھندلائے ہوئے نقوش معلوم ہونے لگتے ہیں نہ یہ کہ بعض محاورے اب فرسودہ ہو چکے ہیں بلکہ معاشرتی لحاظ سے بہت سی رسمیں بھی ختم ہو گئی ہیں جن کا ذکر میر انیس نے اپنے دور میں بڑی آب و تاب سے کیا ہے۔ اب تو مجلسی فضا بھی بدل چکی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جائے گی لیکن یہ کلامِ انیس کے اصلی جوہر نہیں۔ کلامِ انیس میں جو اخلاقی اور روحانی اقدار ہیں وہ لازوال اور غیر فانی ہیں۔ وقت کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔ دَور کتنے ہی کیوں نہ گزر جائیں زبان کے سانچے یہاں تک کہ خود زبان میں تبدیلی آ جائے۔ پھر بھی کلامِ انیس کے اصلی جوہر پر حرف نہیں آ سکتا۔ اخلاقی اور روحانی اقدار جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔ وہ ہر معاشرہ اور ہر دَور کو پیغام دیتے ہی رہیں گے جو کچھ بدل سکتا ہے وہ زمانے کا رہن سہن اور زبان کا استعمال ہوتا ہے، عارضی قدریں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ معاشرتی تبدیلیاں واقعۂ کربلا سے لے کر انیس کے دور تک جس طرح رونما ہوتی رہی ہیں اسی طرح انیس کے بعد اور آئندہ زمانے میں بھی ہوتے رہنے کا امکان ہے، جو چیز باقی رہے گی وہ اخلاقی جوہر ہے جو غیر مبتدل ہے۔ زبان کو لیں انیس نے ہزاروں الفاظ ادب کو دئے۔ سپاہ گری کا فن، سپاہ گری کے آلات، معارکے کی ہو بہو تصویر اور ان سے متعلقہ الفاظ کسی دُوسرے شاعر کے کلام میں آپ نہ پائیں گے۔ بہت سے مردہ الفاظ و محاورات کو انیس کی نکتہ سنجی اور قادر الکلامی نے زندۂ جاوید کر دیا۔ آمد اور آورد میں کیا فرق ہے! میر انیس کے کلام سے جانچا جا سکتا ہے۔ اردو کو اگر میر انیس کا شعور اور ان کی نکتہ آفرینی اور معجز بیانی نہ مل جاتی تو اردو ادب کی ارتقائی تاریخ یہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ میر انیس کا کلام گلدستۂ ہزار رنگ ہے جس کی رنگینیاں ہمیشہ فردوسِ نظر رہیں گی۔ میر انیس کثیر الجہات شاعر ہیں چند سطروں میں ان کے کلام کے محاسن محدود نہیں کئے جا سکتے۔ وہ اپنی دُعائیہ نظم میں کہہ گئے ہیں: ؎

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں

باقیاتِ انیس (انیس نمبر) جسے ہم آئندہ نسخۂ لکھنؤ کے نام سے موسوم کریں گے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری

مرتبہ ہے جو جون ۱۹۷۹ء میں محمدی پبلشرز کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات ۳۷۰ ہیں جن میں دس صفحات غلط نامے کے بھی شامل ہیں۔ اس میں چھبیس مرثیے چھپے ہیں جبکہ نسخۂ لاہور کے صفحات کی تعداد ۲۸۷ ہے جو آفسٹ پیپر پر چھپا ہے جس کی کتابت اور طباعت معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں مراثی کی تعداد انتیس (۲۹) ہے۔ اسے ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے نومبر ۱۹۸۱ء میں نہایت اہتمام سے اہلِ نظر کے سامنے پیش کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

تفصیلِ مراثی

۱۔ غیر مطبوعہ مرثیے	۱۷
۲۔ تلاش کیے گئے	۴
۳۔ مطبوعہ مگر غیر مطبوعہ	۸

⊙ جو غیر مطبوعہ مرثیے ہیں وہ مختلف بیاضوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔

⊙ جو مرثیے تلاش کیے گئے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ دو مرثیے مونس کے ایک مرثیہ رئیس کا اور ایک مرثیہ اُنس کا شامل ہے جو غلطی سے ان کے نام شائع ہو گئے ہیں۔ اصل میں یہ مرثیے میر انیس کے ہیں۔

⊙ جو مرثیے مطبوعہ ہیں ان میں ۲۶۹ غیر مطبوعہ بند ہیں۔ یوں یہ مطبوعہ مرثیے بھی موجودہ صورت میں غیر مطبوعہ ہیں۔ (نقوش، انیس نمبر، ص ۴)

مذکورہ تفصیل کے متعلق چند ضروری وضاحتیں حاضر ہیں۔

۱۔ کھولا علم جو خسروِ زریں کلاہ نے

یہ مرثیہ جس کا پہلا مصرع اوپر لکھا گیا ہے میر انیس کے نام سے شائع ہوا ہے لیکن یہ میر اُنس کا ہے۔

۲۔ ہند آتی ہے زنداں میں بڑے جاہ و حشم سے

یہ مرثیہ میر انیس کی جلدوں میں طبع ہوا ہے یہ مرثیہ بھی میر مہر علی اُنس کا ہے۔

۳۔ سب سے جُدا روش میرے باغِ سخن کی ہے

یہ مرثیہ میر انیس کے نام سے طبع ہوا ہے یہ بھی میر اُنس کا ہے۔

۴۔ خورشیدِ فلک عکسِ دُرِ تاجِ علیؑ ہے

یہ مرثیہ ریحانِ غم میں میر اُنس کے نام سے چھپا ہے حالانکہ یہ مرثیہ میر انیس کا ہے۔

۵۔ تاجِ سرِ سخن ہے شہِ لافتیٰ کی مدح

یہ مرثیہ میر انیس کا ہے لیکن میر مونس کے نام سے مونس جلد دوم میں چھپا ہے۔

اگر نقوش کا انیس نمبر طبع نہ ہوتا تو اُنس کے مرثیے میرانیس کے نام، میر اُنس کے مونس کے نام اور میرانیس کے مرثیے میر اُنس کے نام مطبوعہ ہی ملتے۔

نسخۂ لکھنؤ میں صحت نامہ دس صفحوں پر مشتمل ہے۔ نسخۂ لاہور میں بڑی دیدہ ریزی سے ان اغلاط کی تصحیح کی گئی۔ اب یہ نسخۂ لکھنؤ کے نسخے سے بہتر ہو گیا۔ لاہور نمبر کا بیشتر حصہ نسخۂ لکھنؤ کے متن پر مبنی ہے۔ چنانچہ نسخۂ لاہور میں بھی ان کتب خانوں کا ذکر موجود ہے جن میں میرانیس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے پائے جاتے ہیں یا اُس زمانے کے کسی کاتب کی تحریر ہیں۔ قلمی مراثی مملوکہ سید محمد رشید، قلمی مراثیِ انیس کتاب خانہ راجہ محمود آباد اور مراثیِ انیس قلمی امیر علی جونپوری۔ ان کی تعداد ۱۵۱ ، ۲۲۹ ، ۳۰ علی الترتیب ہے جن کی مجموعی تعداد چار سو دس (۴۱۰) ہے۔ قلمی مراثی کا اشاریہ بھی مرتب کیا گیا ہے جس کا گوشوارہ اس طرح ہے:

نمبر شمار - مطلع - بند - نسخے - کتب خانہ مہاراجکمار - کتب خانہ رشید صاحب - کتب خانہ امیر علی - کیفیت

گوشوارے کے ان عنوانات سے قلمی مراثیِ انیس کی جو فہرست مرتب ہوئی ہے اس سے میرانیس کے بہت سے مراثی کے متعلق واقفیت بہم پہنچ سکتی ہے۔ "میرانیس کے غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے" کے عنوان سے چند مرثیوں کا تعارف بھی ملتا ہے۔ یہ سب کچھ نقوش کے میرانیس نمبر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میرانیس نمبر میں ان فروگذاشتوں اور اسقام کو دُور کر دیا گیا ہے جو مطبوعہ نسخوں میں پے در پے چلے آ رہے تھے۔ میرانیس جناب طفیل کے پسندیدہ شاعر تھے وہ اس نمبر کے بعد کسی وقت بھی میرانیس کا سارا کلام (چار جلدوں میں) شائع کرنے کا پختہ ارادہ رکھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے "عمرِ مختصر" کے عنوان سے اسی نمبر کے صفحہ ۱۵۶ پر کیا ہے۔

میرانیس صدی کے موقع پر پاک و ہند میں خاصی تعداد میں میرانیس نمبر طبع ہوئے جن میں اردو (سہ ماہی)، ماہِ نو، سیپ، نگار، پیامِ عمل، سرفراز لکھنؤ اور 'آج کل' دہلی شامل ہیں جو اپنی اپنی جگہ سب وقیع ہیں لیکن نقوش کے میرانیس نمبر کی شان سب سے نرالی ہے۔ بقول میرانیس: ؎

بینا ہے رقوماتِ ہنر چاہیے اس کو
سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو

نقوش کا رسولؐ نمبر

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

سیرتِ رسولؐ پر سب سے پہلی اور مُستند ترین کتاب قرآن ہے، حضرت عائشہؓ نے یہی فرمایا ہے۔ "کان خلقہ القرآن"۔

اس وقت جدید ترین کتابِ سیرت، طفیل صاحب کے رسالہ نقوش کے دس ہزار صفحات پر مشتمل تیرہ جلدیں ہیں، جسے اُنہوں نے صدیوں زندہ رہنے اور "عاشقانِ رسولؐ کی صف میں سب سے آخر میں کھڑا" ہونے کے لیے مرتب کیا ہے یہ جلدیں اپنے اعلیٰ آفسٹ کاغذ، خوشخط کتابت، عمدہ طباعت، مضبوط جلد سازی کے ساتھ واقعی کتب خانوں میں تا دیر محفوظ رہیں گی۔ سیرت نگاروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں سیرت کے موضوع پر اتنا یکجا وسیع مواد موجود نہیں، یہ اعزاز پاکستان کو اور اس کی قومی زبان کو حاصل ہوا کہ سیرت مقدسہ پر سب سے مفصل اور جامع کام اُردو میں ہوا۔

قرونِ اولیٰ، متوسط اور دورِ حاضر کی کتب سیرت کے ساتھ تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مضامین کے تنوع، دلائل کی کثرت اور مواد کے احاطہ کے اعتبار سے یہ جامع ترین کوشش ہے یہی وجہ ہے کہ ابوالحسن علی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، سعید احمد اکبر آبادی عبدالقدوس ہاشمی، نعیم صدیقی، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے پایے کے قومی اور بین الاقوامی، ماہر سیرت نگاروں نے متفقہ طور پر اسے سیرت کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے انسائیکلوپیڈیا وہی ہوتا ہے جس میں امکانی حد تک موضوع متعلقہ کے اصول اور فروع کا احاطہ کیا گیا ہو رسولؐ نمبر میں اس کا التزام موجود نظر آتا ہے عظمت و اعتراف کا مسلمہ پیمانہ یہ ہے کہ وہ مانیں جنہیں خود مان ہو۔

برصغیر پاک و ہند میں دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوہ المصنفین لکھنؤ اور دار العلوم دیوبند وہ ادارے ہیں جنہیں منفرد اور قابلِ فخر ناشرینِ سیرت کا مقام حاصل ہے اُنہوں نے رسولؐ نمبر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے یہ معمولی بات نہیں صرف ایک مثال کافی ہے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ کو چھ جلدوں میں اب تک مکمل سمجھا جاتا رہا یہ رسولؐ نمبر کو کریڈٹ جاتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کی ساتویں جلد کا انکشاف ہوا اور وہ اس نمبر کی زینت بنی قیام پاکستان سے اب تک صحت و سند کے التزام اور زبان و فن میں کمال و مہارت کے سبب ہمارے ہاں بالعموم انہیں ہندی اداروں کی اسلامی کتب، قارئین کے مطالعہ اور ناشرین و کتب فروشوں کی نفع اندوزی کا ذریعہ بنتی رہیں کیونکہ ہمارے ہاں قبل از تقسیم ہند اس کی روایت نہ تھی اور بعد از قیامِ پاکستان اس کی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی

پاکستان میں بہت سے اسلامی تحقیقات کے ادارے قائم ہیں مگر ان کے محققین جتنے اپنے قارئین سے بیزار نظر آتے ہیں اس سے زیادہ محققین کی تحقیقات سے بیزار معلوم ہوتے ہیں اکثر اوقات پچاس فیصد سے زیادہ رعایت کے باوجود ان کی تحقیقات فروخت نہیں ہوتیں، گوداموں میں کرم خوردنی کے سبب، ایک وفاقی وزیر صاحب کو انہیں مفت تقسیم کرنے کا حکم جاری کرنے کی زحمت گوارا کرنا پڑی یہ قومی سرمایہ افتخار ہے کہ متذکرہ ہندی اداروں نے رسولؐ نمبر کے حوالے سے سیرت پر پاکستان کی علمی، تحقیقی اور تصنیفی حیثیت اور

---

* یہ مضمون نقوش ایوارڈ ۱۹۸۴ء کی تقریب میں پڑھا گیا۔ (ادارہ)

عظمت کو مان لیا ہے وہ اس کے مداح اور معترف ہیں، بے شک انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اردو ترجمہ کے وقیع ادارے دائرۃ المعارف الاسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کو بہت بڑا کریڈٹ جاتا ہے جس نے علم و تحقیق کی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے

ہماری تاریخ میں خلافت و ملوکیت کی بحث عام ہے۔ رسولؐ نمبر میں اسلامی ریاست کے موضوع پر تحقیقی مضامین میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خلافت چند برس چلی۔ ملوکیت صدیوں سے چل رہی ہے ابھی کچھ مدت مزید چلنے کی امید ہے علم و سائنس کے اس دور میں اگر ملوکیت بیسویں صدی کے آخری پندرہ برس مزید چل جائے تو بڑی بات ہے اکیسویں صدی شاید اس کی متحمل نہ ہو سکے مسلمانوں کو ان پندرہ برسوں میں خلافت سنبھالنے کی تیاری کر لینی چاہئیے ملوکیت میں اسلامی تحقیقات کے سرکاری ادارے مفاد ملوکیت کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں امت کی فلاح و بہبود ثانوی و جزوی حیثیت رکھتی ہے۔ مجتہد، محقق اور مفکر کے لئے ایسے اداروں میں گنجائش نہیں ہوتی حریت فکر، اجتہادی قوت، تازہ افکار مسائل کا آزادانہ تجزیہ ممنوع نہیں تو محدود ضرور ہوتا ہے خلافت میں علم و تحقیق کے سرکاری ادارے مقاصد امت کے قائد اور پاسبان ہوتے ہیں۔ مفاد ملی کو اولین ترجیح دیتے ہیں، اخوت، مساوات، حریت کے نقیب و علمبردار ہوتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں حریت کے ماحول میں عرب کے ناخواندہ لوگ خلفاء راشدین کی پالیسیوں پر تنقید کرتے تھے حتیٰ کہ آزادی فکر اور حریت کی فضا میں خواتین ناقص العقل نہیں ہوتی تھیں بوڑھی اور ضعیف العمر خواتین اہم ترین آئینی اور قانونی امور پر عمرؓ فاروق اعظم جیسے خلیفۂ راشد کی رہنمائی کرتیں اور وہ متعلقہ امور میں اپنے قصور فہم کو مانتے اور ان کے صحیح فہم کا اعتراف کرتے۔ ملوکیت کے قیام کے بعد امام ابوحنیفہ امام مالکؒ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ مجتہدین کے لئے سرکاری اداروں میں گنجائش نہ رہی، کیونکہ ان کے اجتہادات، امت کے موافق اور ملوکیت کے مخالف تھے۔

ان کے افکار و نظریات میں اتنی قوت تھی کہ ہزار بارہ سو سال گزرنے کے باوجود ان کے ناموں پر قائم فقہی مذاہب، اب تک قائم ہیں۔ مگر وہ ملوکیت کے مخالف تھے اس لئے ان کے اجتہادات نہ ان کے اور نہ عصر حاضر کے ملوک کے موافق ہیں۔ البتہ ان کے شاگردوں نے سرکاری اداروں میں ملازمت اختیار کرلی، جنہوں نے معیشت، سیاست، معاشرت کے بنیادی معاملات میں اپنے اساتذہ کے اجتہادات کے خلاف فتوے دیئے جو امت کے خلاف اور ملوکیت کے مفاد میں ثابت ہوئے امام ابوحنیفہ کا مسلمہ مذہب ہے کہ زمین تہائی چوتھائی وغیرہ حصوں پر مزارعت پر دینا باطل ہے۔ "قال ابوحنیفہ المزارعۃ بالثلث والربع باطلۃ" (الھدایہ کتاب المزارعۃ) اس کے خلاف امام ابوحنیفہ ہی کے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد نے فتویٰ دیا کہ مزارعت جائز ہے "قالا جائزۃ" چنانچہ شاگردوں کا فتویٰ مان لیا گیا اور نافذ کر دیا گیا اس کا نفاذ ملوکیت نے کیا تھا اور جب تک ملوکیت رہے گی یہ فتویٰ نافذ رہے گا البتہ جب کبھی مسلمانوں کو خلافت نصیب ہو گی حنفی فقہ کے امام اعظم ابوحنیفہ کا فتویٰ خود بخود نافذ ہو جائے گا۔

رسولؐ نمبر کی جلد سوم میں فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام اور جلد پنجم میں اسلامی ریاست کا مالی انتظام" کے تحت شائع کردہ مضامین اسلام کے زرعی اور معاشی نظام کو سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی پس منظر میں غیر سرکاری اداروں کی اہمیت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ بالخصوص ادارہ نقوش کے بقاء و دوام کے لئے اہل علم و دانش کے دل سے دعا نکلتی ہے جس نے کئی سرکاری اداروں بورڈوں اور اکیڈیمیوں سے زیادہ تن تنہا یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔ رسولؐ نمبر کی اشاعت کے بارے میں مرتب نے کہا "میرے نزدیک ضرورت یہ تھی اور ہے کہ میرے ملک کا معاشرہ بگڑ رہا ہے اسے سیرت النبیؐ کی روشنی میں سنوارا جائے قوم کی سوچ کا چلن بدلا

جائے اور وہ چلن وہ ہے جس کا درس ہمیں محمد رسول اللہ نے دیا تھا (ج ۲ ص ۱۰۷) واقعی یہ سب سے بڑا قومی منصوبہ ہے ہر بڑے منصوبے کی منصوبہ بندی کے لئے گہرے غور و خوض اور عمیق تخطیط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدیر نقوش نے ذاتی طور پر جو تفکیر کی یہ نمبر اس کی تعبیر ہے

جلد اوّل کے ابتدائی ۸۰ صفحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدیر نے آخری نتیجے تک پہنچنے کے لئے کھلے دل و دماغ سے سید ابوالحسن علی ندوی اور قاری محمد طیب جیسے اپنے ہم عصر جید علماء مفکرین اور محققین کے خیالات و افکار سے بھرپور استفادہ کیا ہے جن کا اظہار انہوں نے جلد اوّل میں اپنے مضامین "پندرھویں صدی ماضی و حال کے آئینہ میں" "سیرت نگاری کی ذمہ داریاں" "سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول" میں کیا ہے۔ جو مدیر نقوش کے لئے رہنما اصول بنے۔ سیرت کے اس وسیع ذخیرہ میں موضوعات کی تخلیق، مواد کی تدوین اور مضامین کی ترتیب میں یہ اکابرین، مدیر کی فکر کو صحیح سمت پر لے جانے میں ان کے ساتھی معلوم ہوتے ہیں۔

بگڑے ہوئے معاشرے کو سیرت النبیؐ کی روشنی میں سنوارنا فرمان الٰہی ہے۔ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" تحقیق تمہارے لئے رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے۔ اسوۃ حسنۃ عالم انسانیت کی متوازن و معتدل گردش کا مدار و محور ہے۔ نظام اجرام فلکی کی تیز ترین گردش اپنے اپنے مدار پر قائم رہنے کی مرہون منت ہے، نظام ارضی بھی اس وقت تک حرکت و گردش پر قائم ہے، جب تک وہ اپنے محور پر چلنے کے اصولوں کا پابند ہے، نظام معاشرت کا وجود و قیام بھی چند مسلمہ اور متفق علیہ معیاروں اور پیمانوں کا مرہون منت ہے' ناپ تول اور وقت کے مسلمہ پیمانوں کے ساتھ معاشرہ کا شیرازہ منسلک ہے میٹر، لیٹر اور گھنٹہ ہمارے جانے پہچانے پیمانے ہیں، جنہیں بین الاقوامی سطح پر ناپ تول اور وقت کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لئے تسلیم کیا گیا ہے، ان پیمانوں کا ایک ایک معیاری پیمانہ نمونے کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے، تاکہ رفع تنازعہ کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ ذرا غور فرمائیے اگر اجرام فلکی اپنے اپنے مدار سے اور نظام ارضی اپنے اپنے محور سے ہٹ جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ وہی ہو گا جس کا ذکر قرآن نے کیا۔ آسمان پھٹ پڑے گا پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے اور زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر ناپ تول اور وقت کے مسلمہ پیمانوں کو چھوڑ کر جعلی چھوٹے پیمانے وضع کر لئے جائیں تو زراعت، صنعت، تجارت اور معاشرت، معیشت، سیاست اور تہذیب و تمدن کے تمام جوڑ اکھڑ جائیں۔ انتشار، افتراق اور انفکاک کی تباہ کن صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ قدرت نے جیسے اجرام فلکی اور نظام ارضی کی حرکت و گردش کے لئے مدار اور محور بنائے اور نظام معاشرت کو چلانے کے لیے، مسلمہ پیمانے بنانے کی ہدایت کی، ایسے ہی ضرورت تھی، کہ عالم انسانیت کو صحیح رخ پر چلانے صراط مستقیم پر قائم رکھنے اور اس سے تخلیق، تعمیر اور تحقیق کا کام لینے کے لئے اعمال و افعال اور اقوام کا ایک معیاری نمونہ دیا جائے، جب تک انسان اس نمونہ کو سامنے رکھ کر اذہان و قلوب کے فکری اور فلسفیانہ افعال انجام دے اور اعضاء و جوارح کو حرکت میں لا کر عملی اعمال پر دکھالائے اس وقت تک وہ مسلسل تزکیہ و تقویٰ، خیر و فلاح، ترقی و عروج، توازن و اعتدال کی راہ پر گامزن رہے گا۔ اور جب اس نمونہ سے ہٹ کر جعل و کذب کی راہ اختیار کرے گا تو شر و فساد، ظلم و عدوان انتشار و افتراق کا شکار ہو کر ہلاکت و بربادی کے انجام کو پہنچے گا۔ انسان میں فجور اور تقویٰ کی دونوں قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ "فالھمہا فجورھا وتقوٰھا" اب فجور کو منتخب کرنے یا تقویٰ کو اپنانے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان تقویٰ کی طرف لے جانے والے نمونہ کی پیروی کرتا ہے یا فجور کی راہ

دکھانے والے اصولوں کو اپناتا ہے۔ چنانچہ وہ نمونہ جو انسان کو انفس و آفاق کی تسخیر کے دوران یا تعمیر اخلاق اور تشکیل کردار کے مراحل میں تقویٰ کی طرف لے جائے اسے قرآن نے رسولؐ اللہ" کا اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے جو عالم انسانیت کی ہموار متوازن اور معتدل حرکت اور گردش کا مدار، محور اور مسلمہ پیمانہ ہے۔

رسولؐ نمبر کے مرتب نے عہد حاضر کے نظریاتی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی مسائل کے بگاڑ کر اسوۂ حسنہ کی روشنی میں سلجھانے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اس نمبر کی مختلف جلدوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عصر جدید کے مختلف مسائل کا کافی حد تک احاطہ کیا گیا ہے مثلاً یہ جدید معاشرتی مسائل ہیں۔" اصلاح معاشرہ اور سیرت نبوی، عظمت انسانی کا نقیب ہمارے رسولؐ" فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام" اخلاقی، اصلاح اور ہمارے رسولؐ علوم انسانی کے فروغ میں ہمارے رسولؐ کا اثر" رسول نمبر میں ان میں سے ہر موضوع پر کئی کئی مضامین شامل اشاعت ہیں

یہ مسلمہ امر ہے کہ معاشرہ کے بناؤ و بگاڑ میں ریاست کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ایک مثالی اسلامی ریاست اس نمبر کا خاص موضوع ہے پوری جلد پنجم اس کے لئے مختص ہے۔ اس کے دونوں مضمون اسلامی سیاست و ریاست پر اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہیں۔ نفس مضمون کے ساتھ حواشی میں حوالہ و سند کا جدید طریق تحقیق اپنایا گیا ہے۔" عہد نبوی میں ریاست کا نشو و ارتقاء" والے مضمون میں بعثت نبوی کے وقت دنیا کا سیاسی نظام" تاسیس ریاست" توسیع ریاست، استحکام ریاست، انتظام ریاست" کے عناوین کے تحت فاضلانہ بحث کی گئی ہے اس طرح "ریاست کی فکری بنیادیں" اہم بحث ہے جس میں ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالرسالت ایمان بالکتب، ایمان بالآخرۃ کو اسلامی ریاست کی بنیادوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ عہد حاضر میں سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کا جذبہ محرکہ ذاتی ملکیت کے ذرائع پیداوار اور منافع میں بے حد و حساب اضافہ ہے یہ نظام ذاتی محنت، محنت کش اور مزدور کی محنت و قوت کو ذاتی ملکیت میں اضافے کے لئے استعمال کرنے کا نام ہے جس کا لازمی نتیجہ طبقاتی معاشرے کا قیام ہے اشتراکیت میں ذرائع و وسائل پیداوار کو اجتماعی ملکیت کی شکل دے کر ہر فرد کو پیداوار میں شریک کرنے کا جذبہ کارفرما ہے، جسے غیر طبقاتی نظام قرار دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں صنعت و کھیت مزدور کی محنت کے استحصال کا ذکر ہوتا ہے اور طبقاتی کشمکش ابھرتی ہے اشتراکی نظام میں ہر فرد کو بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کے بعد محنت کش میں مزید محنت کا جذبہ محرکہ ماند پڑنا بیان کیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں ذرائع پیداوار کو امت کی مشترکہ امانت قرار دیئے جانے اور امت کی کفالت عامہ کے تصور کو اپنانے کی صورت میں محنت کے جذبہ محرکہ کو کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے اس ضمن میں رسول نمبر کے متذکرہ مضمون میں ایمانیات کی بحث مفید ہے۔

اس جلد کا دوسرا مضمون" عہد نبویؐ میں تنظیم ریاست و حکومت ہے" اس موضوع پر زیادہ جامع اور مبسوط ہے۔ اس میں مصنف نے علمی تحقیق کے ساتھ تخلیقی کا مظاہرہ کیا ہے" اسلامی ریاست کا ارتقاء" مرحلہ وار دکھایا گیا ہے جو اسلام کے اصولِ تدریج کا ثبوت ہے قبائل عرب اور اسلام" بہت قیمتی بحث ہے۔ ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب میں قریش مکہ، مغربی قبائل، مشرقی قبائل، شمالی قبائل، جنوبی قبائل، پراگندہ قبائل کی تاریخ، ان کا سیاستِ عرب پر اثر اور اسلام کے ساتھ ان کی کشمکش اور ان پر غلبۂ اسلام ایسے مباحث ہیں جنہیں سمجھے بغیر اسلامی ریاست کے قیام کو سمجھنا ممکن نہیں۔ رسول نمبر کی پانچویں جلد کے مضامین" فوجی تنظیم

عہد رسالت میں" اور اسلامی ریاست کا شہری نظم و نسق" سیرت النبیؐ کے موضوع پر قابل قدر تحقیقاتی اضافہ ہیں۔ اس مضمون میں اسلامی ریاست کا مالی انتظام" دور حاضر کے افراط و تفریط پر مبنی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کی موجودگی میں اسلامی مساوات کی عمدہ تصویر کشی ہے، خلافت راشدہ' خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ عہد رسالت کی عملی توسیع ہے۔ خلیفہ راشدہ اول حضرت ابوبکرؓ صدیق اکبر نے اسلام میں نظام تقسیم دولت میں" تسویہ" یعنی مکمل مساوات کے اصول کو اپنایا' چھوٹے بڑے، مرد و عورت آزاد و غلام سب کو یکساں اور برابر حصہ دیا۔ اس پر اعتراض یہ ہوا کہ آپ نے اہل قدم' اہل فضل اور اہل سوابق (ALNIERMOST SUPERIORMOST اور MERITORIOUS'ERVICES والوں کا لحاظ کئے بغیر سب افراد کو یکساں معاشی درجہ دے دیا ہے بہتر ہوتا کہ آپ SENIORITY' SUPERIORITY اور SERVICES کے اعتبار سے معاشی درجہ بندی کرکے، ان کے مراتب و درجات کے مطابق نظام تقسیم دولت اپناتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا" میں قدم (SENIORITY)' فضل (SUPERIORITY) اور سوابق (SERVICES) کی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ کیونکہ وہ سب سے پہلے اسلام لائے تھے اور ان کی فضیلت و مسابقت فی الخیرات کے کارناموں پر خود قرآن گواہ ہے اس لئے آپ نے فرمایا" اسلام میں اولیت، فضیلت اور مسابقت وہ چیزیں ہیں، جن کا اجر اللہ کے پاس ہے۔" فذلک شئ اجرہ علی اللہ" جہاں تک نظام تقسیم دولت کا تعلق ہے یہ معاش کا مسئلہ ہے لہٰذا معاش میں مساوات، ترجیح سے بہتر ہے۔" فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ" حضرت ابوبکرؓ کی اس فیصلہ کن دلیل سے تمام صحابہ کرامؓ مطمئن ہو گئے مدینہ کی مجلس شوریٰ کے متفق علیہ اور اجتماعی فیصلہ کے مطابق عہد خلافت راشدہ میں نظام تقسیم دولت تسویۃ یعنی کامل مساوات کے اصول پر قائم ہوا حضرت عمرؓ نے تسویہ کی جگہ تفضیل یعنی درجہ بندی کی پالیسی کو چند سال آزما کر دیکھ لیا کہ اولیت، فضیلت اور مسابقت کے پیش نظر معاشی درجات۔ اور طبقات پیدا کرنا خطرناک ہے اس لئے انہوں نے عملی تجربہ کے بعد درجہ بندی اور طبقاتی پالیسی سے رجوع فرما کر پھر تسویۃ کی پالیسی کو اپنانے کا اعلان کر دیا۔ حضرت علیؓ نے اپنی پوری مدت خلافت میں تسویہ میں تسویہ کو اپنائے رکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ" اسلامی مساوات کی تعلیم میں محنت کا ایسا جذبہ محرکہ ہے جو محنت کش کو امت کی اجتماعی خیر و فلاح اور ترقی و نشوونما کے لئے اسلامی کفالت عامہ کے نظام کے تحت مسلسل جوش عمل پر آمادہ رکھتا ہے وہ!

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

کے جذبہ کے تحت پوری محنت، اہلیت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔ عہد رسالت کی روشنی میں ترتیب پانے والا خلافت راشدہ کا نظام تسویہ دور حاضر کے انتہا پسندانہ نظاموں میں آیہ رحمت ثابت ہوگا۔

رسولؐ نمبر میں مثالی اسلامی ریاست کے موضوع پر جتنا مواد شائع کیا گیا ہے وہ جدید طرز تحقیق اور منہاج تصنیف کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد کے مضمون" عہد نبویؐ میں ریاست کا نشو و ارتقاء" کے صرف حواشی و حوالہ جات ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہیں، اسی طرح ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے مضمون" عہد نبویؐ میں تنظیم ریاست و حکومت" کے حواشی و حوالہ جات اتنے زیادہ تھے کہ پانچویں جلد ان کی متحمل نہ ہو سکی اور انہیں بارہویں جلد کے ۲۳۱ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔ تعلیقات، حواشی اور حوالہ و

سند کے التزام کو جدید منہاج تحقیق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے رسولؐ نمبر کے یہ مضامین اس ضرورت کو کما حقہ پورا کرتے ہیں اور انہیں اعلیٰ تحقیقی و معیاری تحقیقات کی صف اوّل میں شامل کرتے ہیں۔

رسولؐ نمبر نے موجودہ بگاڑ کو سنوارنے کے لئے اسلامی ریاست کے دو اہم ترین وظائف عدلیہ اور انتظامیہ پر خصوصی توجہ دی ہے اسکی گیارہویں جلد میں ایک مضمون عہد رسالتؐ میں عدلیہ اور انتظامیہ اور تیرہویں جلد میں خلافت راشدہ میں عدلیہ اور انتظامیہ شائع کئے ان مضامین کی قدر و قیمت پر صرف اتنا واضح کردینا کافی ہے کہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق پانچ چیف جسٹس ان کی صحت و صداقت پر اپنے فیصلے دے چکے ہیں، مرحوم چیف جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمٰن کی رہنمائی اور نگرانی میں ان کا اصل مسودہ تیار ہوا مرحوم چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن نے لکھا ہے کہ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں اس موضوع پر یہ سب سے جامع، مفصل اور مستند کام ہے اور یہ ہمارے موجودہ عدالتی نظام کو اسلامی عدالتی نظام میں ڈھالنے میں رہنما ثابت ہوگا۔ چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس کی تحسین روزنامہ جنگ میں جسٹس، جناب چوہدری یعقوب علی خاں کی تعریف روزنامہ نوائے وقت میں اور چیف جسٹس جناب شیخ انوار الحق کی توصیف روزنامہ امروز کے خصوصی نمبروں کے کئی کئی صفحات پر چھپ چکی ہے۔ ان مضامین نے ثابت کیا ہے کہ ہمارے رسولؐ نے دنیا کو سب سے پہلا تحریری آئین عطا کیا آپ کی ریاست مدینہ ایک دن بغیر آئین نہیں رہی آپ دنیا میں پہلے حکمران ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو عام شہری کی طرح آئین کا پابند بنایا۔ آپ نے متعدد بار اپنی ریاست کے عام شہریوں کے سامنے جوابدہی کی آپ نے ان لوگوں کو آئین دیا جو خود آئین سے ناواقف تھے۔ آپؐ کے عہد میں انتہا درجے کے ہنگامی حالات پیدا ہوئے مگر انسانیت کے آئینی حقوق ایک لمحہ کے لئے معطل نہ ہوئے رسولؐ نمبر کے یہ مضامین ہمیں اپنا ماضی یاد دلاتے ہیں اور اپنا حال اس کے مطابق بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

تحقیقی کام میں موضوع متعلقہ کے مصادر و مآخذ کو اصلی، اساسی اور بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے رسولؐ نمبر کی جلد اول "سیرت نبوی کا بنیادی مواد" کے عنوان سے سیرت کے مصادر و مآخذ کے لئے مختص ہے اس میں منجملہ دیگر نوادرات کے یہ ندرت شامل ہے کہ فہم قرآن در شان محمدؐ" کے عنوان کے تحت ایک اچھوتا موضوع شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس میں فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے الحمد سے والناس تک پورے قرآن کو سیرت کے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے جتنے بھی واقعات قرآن پاک کی سورتوں میں آئے ہیں ان کا مرکزی اور محوری نقطہ سیرت النبی کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا ہے یہ سیرت کو پیش کرنے کا سب سے مستند طریقہ یہ ہے۔

مصادر سیرت کی بحث میں "سیرۃ ابن اسحاق" کی دریافت اس کی ترکی میں طباعت اور اس کے اردو ترجمے کی رسولؐ نمبر کی گیارہویں جلد میں اشاعت ایک حیرت ناک کارنامہ ہے تیرہ سو سال تک اس کا ذکر ہوتا رہا مگر یہ کہیں دستیاب نہ تھی، واقعی بقول طفیل صاحب "یہ سعادت کوئی معمولی سعادت نہیں جو ہمارے حصے میں آئی"۔ اس نمبر کی چوتھی جلد میں ایک قابل توجہ موضوع "ہمارے رسول غیر مسلموں کی نظر میں" شامل اشاعت کیا گیا ہے، جس میں ان غیر مسلم سیرت نگاروں کا ذکر ہے جنہوں نے ہمارے رسولؐ کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ سیرت پر مواد کے ضمن میں "مستشرقین اور مطالعہ سیرت" عہد حاضر کا بہت ضروری موضوع ہے سیرت کا کوئی کام اس کے تجزیہ و تحقیق کئے بغیر مکمل تصور نہیں ہوتا۔ مستشرقین یہود و نصاریٰ نے مختلف ادوار میں مختلف قومی تقاضوں کے پیش نظر سیرت پر کتابیں لکھیں، ابتدا

میں سخت معاندت و مخالفت کو اپنایا گیا جس کے نتیجے میں صلیبی جنگیں لڑی اور ہاری گئیں درمیان میں سامراجی مقاصد کے تحت مستشرقین نے اپنی اپنی اقوام کو آگاہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کے زاویہ نگاہ سے اس موضوع کو اپنایا اور اب تیسرے دور میں جب مغربی سامراج کم از کم سیاسی طور پر عالم اسلام سے پسپا ہو چکا ہے ایک نئے انداز میں سیرت پر لکھا جا رہا ہے۔ ان مختلف ادوار میں مستشرقین نے سیرت پر جو کچھ لکھا اگرچہ عام مسلمان قاری کے لئے اس کا مطالعہ ضروری نہیں البتہ محققین کے لئے اس پورے مواد سے واقفیت تحقیق کی ایک ناگزیر ضرورت ہے رسول نمبر کی گیارہویں جلد میں اس ضرورت کو پورا کرنے کا بڑے سلیقے اور عمدہ طریقے سے اہتمام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد نے بڑی محنت سے اس موضوع کو تعارف، تاریخ، تجزیہ اور فہرست" کے عنوانات کے تحت پیش کیا ہے محققین سیرت کے لئے جہاں سیرت کے اسلامی مصادر و مآخذ کو جاننا ضروری ہے وہاں جس زبان میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہو اس سے واقفیت حاصل کرنا اہم ہے۔ رسولؐ نمبر نے جہاں اور موضوعات کو نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے وہاں ہر زبان میں سیرت کے مصادر کو یکجا کر کے اس موضوع کی بڑی خدمت انجام دی ہے طالبان و محققین دونوں یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں گے ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے عالمی شہرت یافتہ سیرت نگار کی پوری کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" مواد سیرت میں عظیم اضافہ ہے۔

مصادر سیرت میں ذخیرہ حدیث کو بنیادی حیثیت حاصل ہے مگر ہماری تاریخ کا یہ دلچسپ تضاد ہے کہ محدثین نے جس محنت دیانت اور قابلیت سے مجموعہ احادیث میں سیرت مرتب کی۔ مسلمانوں نے بالعموم اسے سیرۃ کے نقطہ نظر سے اہمیت نہ دی۔ فقہی مسائل اور اخلاقی تعلیم کی خاطر تو ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، مگر انہیں سیرت کی کتابیں بہت کم تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ تمام محدثین، مورخین اور ماہرین فن اسماء الرجال جانتے ہیں، کہ ابن اسحاق ابن ہشام و واقدی و دیگر سیرت نگاروں نے صحت و سند کا وہ التزام نہیں کیا جو محدثین کا طرۂ امتیاز ہے بخاری مسلم و دیگر صحاح ستہ کی کتابیں مدون ہونے سے پہلے سیرت سے متعلق بہت سی بے بنیاد اور بے سروپا روایات عام ہو چکی تھیں محدثین نے چھان پھٹک کے معیاری اور مسلمہ اصول وضع کر کے امکانی حد تک صحیح روایات پر مبنی سیرت پر کتابیں لکھیں مگر غلط اور بے بنیاد روایات اتنی عام ہو چکی تھیں کہ وہ آج تک رائج ہیں۔ رسولؐ نمبر کی جلد ششم میں "فن حدیث" اور "اقوال رسولؐ" کے مضامین اسی تناظر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

غزوات کی دینی اور تاریخی اہمیت مسلم ہے البتہ ان کے محرکات زیر بحث رہے ہیں رسولؐ نمبر کی گیارہویں جلد کا ایک مضمون نبوی غزوات و سرایا کی اقتصادی اہمیت' اس موضوع پر انفرادیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس مضمون میں قدیم و جدید نظریات کو پیش کر کے ان کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے جو محققین اس پر مزید کام کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے بنیادی اصول وضع کر دیئے گئے ہیں۔ اسلام و سیرت کے ہر طالب علم کا جی چاہتا ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ جانے رسول نمبر میں اس پر انتیس مضامین شائع کئے گئے ہیں جنہیں قارئین بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے سیرت النبی کے حوالے سے کاتبان وحی کا موضوع نہایت ہی اہم ہے ان پاکیزہ ہستیوں کی کھوج لگانا اور انہیں تفصیل کے ساتھ مرتب کرنا معمولی کام نہیں۔ سیرت کی قدیم و جدید کتب ان کے حوالے

سے خالی نہیں مگر ان کی حتی الامکان مکمل فہرست مرتب کرنے اور ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے کا کام تشنۂ تکمیل تھا اس نمبر کی ساتویں جلد میں سیرت النبی کے اس موضوع کو پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جو قابل قدر ہے اسی طرح بارگاہ رسالت یں حاضر ہونے والے وفود کی تاریخی اہمیت سے تو ہر کوئی واقف ہے مگر انہیں بالاستیعاب پیش کرنے کی سعادت اس نمبر کو حاصل ئی۔ وہ نفوس قدسیہ جو مال اولاد اور وطن سب چھوڑ کر دیار حبیبؐ میں آ رہے تھے اور جن کا وظیفہ حیات یہ تھا کہ شب و روز ربِ رسولؐ میں رہیں اور وحی و رسالت کے ہر لفظ کو سنیں سمجھیں اور امت کو پہنچانے اور سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کریں، ان کی زندگی کے حالات جاننا ہر محبِ رسول کی دلی تمنا ہے۔ یہ لوگ اصحابِ صفہؓ کہلاتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ ان صحابہؓ کرام کی جتنی شہرت ہے ان کے حالات زندگی اتنے ہی مجمل ہیں اب تک ان کی معمولی تعداد یکجا تھی رسول نمبر نے اپنی آٹھویں جلد میں ۸۹ اصحابِ صفہؓ پر تحقیق کر کے اس موضوع پر اولیت حاصل کی ہے یہ بڑا اعزاز ہے۔

نعت کی ابتدا عہد رسالت میں ہوئی اور ہر دور میں نعت کہی گئی۔ مختلف اسلامی زبانوں عربی فارسی اُردو میں نعت کے نتخابی مجموعے تیار ہوئے رسول نمبر نے بھی نعتیہ شاعری کا انتخابی مجموعہ اپنی دسویں جلد میں شائع کیا ہے۔ جس میں درود و سلام قصائد مسدس، مخمس مثنوی تضمین رباعیات و قطعات، نعتیہ نظم آزاد، نعتیہ نظم اور نعتیہ غزل کو عنوانات بنا کر تخلیقات پیش کی ہیں طرز اسے دوسرے مجموعوں سے منفرد حیثیت عطا کرتی ہے۔

سیرت النبی کے مطالعے کے دوران تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کرنے میں درست تاریخوں کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ س موضوع کے طالب علم اور محقق دونوں کے لئے واقعات سیرت میں تاریخوں کے تضادات پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ خاص ور پر وہ تاریخیں جو حیات ملی میں مرکزی اور بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اسلامی تقویم کی مختلف قدیم و جدید کتابوں میں ہر محقق نے پنے اپنے مؤقف کی تائید میں دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جس پر پوری امت کا اجماع ہو، یرت کے اس نہایت اہم موضوع پر رسول نمبر کی دوسری جلد میں ایک قیمتی مضمون شائع ہوا ہے اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس یں اب تک کے مختلف تقویمی نظریات یکجا کر کے ان کی خوبیوں اور خامیوں کا علمی اور تحقیقی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے آخر ں اپنا نظریہ توقیت پیش کیا ہے جس کے مطابق مکہ اور مدینہ میں مختلف نظام توقیت رائج تھے اگرچہ بظاہر دونوں نے قمری قویم کو اپنا رکھا تھا اس نے اپنے دلائل میں سب سے قوی دلیل یہ پیش کی ہے کہ قریش مکہ زائرین بیت اللہ سے زیادہ سے یادہ مادی اور مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے حج کے انعقاد کی تاریخوں کو ان موسموں کے مطابق بنا لیتے تھے۔ جن میں فصلوں اور ویشیوں کی افزائش ہوتی تھی تاکہ زائرین، مجاورینِ کعبہ کے لئے زیادہ مقدار اور زیادہ قیمت کے نذرانوں کا بندوبست کر سکیں شمسی اور قمری تقویم میں مخصوص مقاصد کے تحت رد و بدل کے لئے عربوں نے خصوصی فن ایجاد کیا جسے نسی کہا جاتا اور جس کے ہرین "نسارۃ" کہلاتے قرآن نے اس کی مذمت کی ہے۔ مقالہ نگار نے اپنے نظریے کے حق میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ مدینہ میں وئی بڑا معبد نہ تھا اس لئے وہاں زمانہ قدیم سے قمری تقویم کا عام اور سادہ نظام رائج رہا آخر میں اس نے یہ نتیجہ تحقیق پیش کیا ہے کہ مہاجرین مکہ اپنی تقویم کے مطابق اور انصار مدینہ اپنی تقویم کے مطابق سیرت النبی کے مختلف واقعات کی یاد داشتیں یار کرتے رہے جو بعد میں اختلاف اور تضاد کا باعث بنیں محقق مذکور نے مکی اور مدنی تقویموں میں مطابقت پیدا کر کے توقیتی تضادات کو رفع کرنے کا نظریہ پیش کیا ہے۔ رسول نمبر کے دیگر مضامین کی طرح یہ مضمون بھی محققانہ [illegible] کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے

نقوش اور محمد نقوش

کتابیات

سیّد جمیل احمد رضوی

رسالہ "نقوش" مارچ ۱۹۴۸ء کو جاری کیا گیا۔ محمد طفیل اس کے ناشر تھے۔ پہلے اٹھارہ شمارے ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی اور سید وقار عظیم نے مرتب کیے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں شمارہ ۱۹-۲۰ شائع ہوا۔ اس کو طفیل صاحب نے مرتب کیا۔ اس طرح پرچے کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے سنبھال لیے۔ ان کی زندگی میں آخری شمارہ ۱۳۲ جون ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس طرح وہ ۳۵ سال سے بھی زائد مدت تک مدیرانہ ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے ادا کرتے رہے۔ شروع ہی سے انھیں رسالے کے معیار کا خیال رہتا تھا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ "نقوش" میں ان کی پہلی تحریر "عرضِ ناشر" کے عنوان سے دسمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے ۱۵-۱۶ میں شائع ہوئی، اس کو پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مدیر کے ساتھ ان کو رسالے کا معیار بہتر بنانے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ ذیل کا اقتباس واضح طور پر اس پر دلالت کرتا ہے:۔

> "نقوش" میری آرزوؤں کا ماحصل، آپ کے سامنے ہے۔ ممکن ہے آپ اسے اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر یہ کہہ دیں کہ ——— "ہاں اچھا ہی پرچہ ہے۔" آپ کے اس خیال سے قطع نظر مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں نے ہمیشہ "نقوش" کے ہر ہر کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے، کیونکہ شروع سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ اُردو ادب میں معیار کے اعتبار سے "نقوش" وہ بلند پایہ مقام پیدا کر لے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو، اور اسے حال کے علاوہ مستقبل میں بھی بُھلایا نہ جا سکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اسے اپنی طرف سے، اب تک اسی دلآویز خواہش کے ماتحت شائع کر رہا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ "نقوش" کے ادبی معیار اور نکھار کا تنہا ذمہ دار مدیر اور صرف مدیر ہی ہے۔ لیکن ان کے معاون کی حیثیت سے جتنی کاوش اور جد و جہد مجھے کرنا پڑتی ہے، اسے کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ ایسی مشترک مساعی کا نچوڑ آپ کے سامنے آتا ہے، جب کہیں جا کر آپ صرف اتنا کہہ پاتے ہیں کہ ——— "ہاں اچھا ہی پرچہ ہے"

اسی تحریر میں انھوں نے اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے کہ "نقوش" سے انھیں کوئی منفعت حاصل نہیں ہوئی، بلکہ الٹا نقصان ہوا ہے، لیکن ان کے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ کچھ احباب اس "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کے نمائندے" کے منتظر رہتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

> "نقوش" کو اب تک ہزاروں کا نقصان ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ہزاروں ہی دلوں

میں اپنے لیے ایک جگہ بھی پیدا کرلی ہے۔ اس سے کوئی مالی فائدہ تو حاصل نہ ہوسکا، لیکن مجھے اس کا علم ہے کہ ”نقوش“ کے ہر نئے شمارہ کے کچھ باشعور احباب دل و جان سے منتظر رہتے ہیں۔ اسے ہی میری کمائی سمجھتے اور اس کو مستقبل کے نقاد کی مختصر سی پونجی۔“

نومبر ۱۹۵۲ء کے شمارہ ۲۷ - ۲۸ میں بابائے اُردو کا ایک خط شائع ہوا جس میں انھوں نے محمد طفیل کو محمد نقوش کے نام سے خطاب کیا۔ یہ نام ان کو اتنا پسند آیا کہ اس کو بھی اختیار کرلیا اور رسالے میں ایک صفحہ بعنوان ”اس شمارے میں“ اسی نام سے لکھتے رہے۔ اگرچہ ان کے اپنے الفاظ میں بھی اس نام سے ایک یاد وابستہ ہے، لیکن اس کی ایک توجیہہ یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ ”نقوش“ کے ساتھ ان کی محبت کا شدید جذبہ بھی اس کا محرک بنا۔ سید وقار عظیم نے اپنے مضمون ”نقوش اور طفیل“ میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:

> ”......اور اب مجھے محمد طفیل اور محمد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ اگلی نسلیں بھی اس احسان کا بار محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دوسرے کا عکس بن گئے ہیں، ہمیشہ قائم رہیں گے......“ (شمارہ ۱۱۰، ص: ۱۲)

محمد طفیل مرحوم کا انتقال ۵؍ جولائی ۱۹۸۶ء کو ہوا۔ ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ کسی شخصیت پر تحقیق اس کی وفات کے بعد شروع کی جاتی ہے۔ اب ”نقوش“ اور ”محمد نقوش“ دونوں پر تحقیقی منصوبے بن رہے ہیں اور بنتے بھی رہیں گے۔ تحقیق کا سفر عام طور پر ثانوی ماخذ سے شروع کیا جاتا ہے اور بنیادی ماخذ کی جانب رواں رہتا ہے۔ کتابیات BIBLIOGRAPHY ان مصادر کی جانب رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں کتابیات اور اشاریے نے بہت اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ان کی ترتیب و تنظیم کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال بھی شروع ہوچکا ہے۔ کمپیوٹر کے استعمال سے اس شعبے میں بہت سی تبدیلیاں نہایت تیز رفتاری سے رُونما ہورہی ہیں۔ ان تمام وسائل سے کام لے کر تحقیق کرنے والوں کا بہت سا وقت بچایا جاسکتا ہے۔ وطنِ عزیز میں بھی کتابیات اور اشاریے کی اہمیت و افادیت کے شعور کی وسعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ موضوعات اور اخبار کے متعلق ببلیوگرافیاں چھپ رہی ہیں۔ رسائل و جرائد کی اشاریہ سازی کی جانب بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں تحقیقی عمل کو تیز رفتاری سے آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ اس پس منظر میں زیرِ حوالہ کتابیات مرتب کی گئی ہے۔ اس میں ایسا مواد شامل کیا گیا ہے جو ”نقوش“ میں شائع ہوا، اور اس کا تعلق ”نقوش“ اور ”محمد نقوش“ دونوں سے ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں چھپنے والے شمارے ۱۳۴ تک کے متعلقہ اندراجات اس میں شامل ہیں۔ اس میں اداریے شامل نہیں ہیں۔ کتابیات میں درج ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں:-

(ا) مقالات (بشمول مضامین)
(ب) خاکے (بشمول شخصیات)
(ج) خطوط
(د) سمپوزیم

(ھ) تبصرے (بشمول خبریں اور اخباری کالم)
(و) متفرقات
(ز) اشاریے (بشمول متعلقات)

ان عنوانات میں محمد طفیل مرحوم کی تحریروں کو ترتیب میں پہلے رکھا گیا ہے اور دوسرے لکھنے والوں کو بعد میں۔ اندراجات لکھنے والے کے نام سے الفبائی ترتیب میں ہیں۔ ان کے عناصر ترکیبی اس طرح ہیں: لکھنے والے کا نام، عنوان تحریر، نقوش کا شمارہ، خاص نمبر کا نام (اگر موجود ہے) قوسین میں شمارے کی تاریخ اشاعت اور آخر میں صفحہ یا صفحات جن پر وہ تحریر مشتمل ہے۔ سمپوزیم کو عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ عنوانات کے شروع میں چند اقتباسات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نقوش سے لیے گئے ہیں۔ ان کے آخر میں قوسین میں "نقوش" کے متعلقہ شمارے کا حوالہ مع صفحہ نمبر دے دیا ہے۔

مقالات

اس عنوان میں ۳۴ اندراجات شامل ہیں۔ ان میں سے سات محمد طفیل کے ہیں، باقی ۲۷ دوسرے مقالہ نگاروں کے ہیں۔ مدیر نقوش کی تیسری کتاب "آپ" چھپی تو ان کے احباب نے اس کے متعلق خطوط لکھے۔ ان میں کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا۔ محمد طفیل مرحوم نے ان کو مرتب کر کے "نقوش" میں شائع کر دیا اور اس کا نام "تبصروں پر تبصرہ" رکھا۔ اس کا ابتدائیہ خود لکھا۔ اس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

> "یہ مضمون، مضمون پہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے یا خطوں پر خط کی حیثیت، ہوا یہ کہ کبھی کبھار لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ یہ ایک ٹھرک ہے کیا کیا جائے! نتیجے میں کچھ مضمون ہو جاتے ہیں۔ پھر یار دوست ورغلاتے ہیں کہ تو تو بڑا لکھنے والا ہے۔ لہٰذا ان مضمونوں کو جلد سے جلد چھپوا دے ورنہ ہوگا یہ کہ ادب یتیم ہو کے رہ جائے گا،
>
> کہنے والے بھی خوب کہتے ہیں۔ سننے والے بھی خوب کان دھر کے سنتے ہیں۔ قصہ کوتاہ صاحب! میں نے اپنی تیسری کتاب چھپوائی کسی ال بل کے بغیر نام اس کا رکھا "آپ"۔ دوست مجھے روز مضمون بھیجا کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج موقع ہے کہ میں بھی انھیں "نواز" سکوں۔ چنانچہ میں نے بھی کتاب کا ایک ایک نسخہ یاروں کو بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ دوست، دوست ہی ہوتے ہیں۔ جھوٹ موٹ بھی تعریف کریں گے۔ لہٰذا آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔"
>
> (شمارہ ۱۰۸، ص: ۹۵۴)

مقالات میں سید وقار عظیم مرحوم کا ایک مضمون شامل ہے۔ اس میں انھوں نے نقوش اور مدیر نقوش محمد طفیل کے متعلق بڑے عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ نقوش کے خاص نمبروں کا ذکر کیا، اردو ادب میں ان سے جو اضافہ ہوا، اس کی طرف اشارہ کیا۔ مدیر نقوش کی پرچے کے ساتھ محبت اور گہری لگن کا اظہار کیا، اس مضمون کا عنوان "نقوش اور طفیل" ہے۔ اس میں مضمون نگار نے بتایا ہے کہ نقوش کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اسی سال محمد نقوش سخت بیمار پڑ گئے۔ اللہ نے شفا دی صحت یابی پر انھوں

نے اپنی زندگی کا آغاز نئے جذبے اور ولولے سے کیا۔ اس مضمون میں سے ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"طفیل کا سر جانِ آفریں کے آگے جھک گیا اور انھوں نے نئی زندگی کا سفر احسان مندی کے ایک تازہ جذبے اور احساس کے ساتھ شروع کیا۔ کچھ کرنے اور کچھ کر کے زندہ رہنے کی آرزو اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سفرِ شوق میں خلوص، انہماک، عزمِ راسخ، مروت، ایثار، حق پسندی، یقین اور خود اعتمادی نے زادِ راہ کا کام دیا ہے اور شوق کی بلندی اور ہمت کی استقامت نے بابر کا حصہ لے کر دس ۱۰ برس کی مدت میں "نقوش" کو اردوئے معلی، مخزن، اصلاحِ عام، زمانہ، ساقی، ہمایوں اور نیرنگِ خیال کا حریف بنا دیا۔ آزادی نمبر، امن نمبر، ناولٹ نمبر، افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر اس دور کے خاص نمبر تھے۔ ان نمبروں نے خاص نمبر کے مفہوم اور معنی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ نمبر ہمیشہ کے لیے ادب سے شناسائی اور معرفت کا وسیلہ بنے۔ انھوں نے اہم ادبی اصناف کی ابتداء اور ارتقاء کی داستان بھی سنائی اور ادب کے تخلیقی عوامل کی نشان دہی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان خاص نمبروں کی حیثیت ادب اور ادیب پر کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر ماخذ اور منابع کی ہو گئی۔ ان کے ذریعے ماضی اور حال کے باہمی رشتوں کا سراغ لگانے کے راستے کھل گئے۔ ان میں عہدِ حاضر کے انسان کا قلب اور ذہن محفوظ ہو گیا۔ زندگی سے محبت اور اس کی ترجمانی، تفسیر، تنقید، اصلاح اور رہنمائی کا جو فریضہ ادیب نے انجام دیا ان خاص نمبروں کے اوراق اس کی دستاویز بن گئے۔ جن ادیبوں کا رشتہ ادب کے ساتھ اب محض وضع داری کا رشتہ ہے، "نقوش" نے ان کے غیر فانی مرقعوں کو محفوظ کیا اور جن ادیبوں نے پہلے پہل افسانے اور غزل کی دنیا میں قدم رکھا، وہ ان کے نقشِ اول کا امانت دار بنا،..... "نقوش" کے ان نمبروں میں سے اور بھی بے شمار چیزیں نکلتی اور ابھرتی ہیں اور ان سب چیزوں کے لیے قیام اور بقا ہے، لیکن جو کچھ میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ ابھرتا ہے وہ اس کا مدیر ہے اور اس مدیر کے پیکر میں چھپا ہوا ادیب اور انسان، جو پہلے محمد طفیل تھا اور اب نقوش کے ازلی اور ابدی رشتے کی بدولت محمد نقوش تک کا سفر اس سخت کوش اور سخت جان انسان نے نہ جانے کتنے صحراؤں میں سے گزر کر، کتنی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر، کتنے سمندروں میں ڈوب کر اور کتنے پہاڑوں پر چڑھ کر طے کیا ہے۔

(شمارہ ۱۱۰، ص : ۱۱-۱۲)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محمد طفیل مرحوم کے الفاظ میں ان کی مدیرانہ حیثیت کو دیکھا جائے۔ انھوں نے اپنا خاکہ "مدیرِ نقوش" کے عنوان سے لکھا۔ اس میں انھوں نے اپنی شخصیت کے دو پہلوؤں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :-

"انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو ——— ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے۔ جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔ جب یہ کرسیٔ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ اس وقت انھیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔"

(شمارہ نمبر ۷۹ - ۸۰، ص: ۱۲۵۹)

رسالے کے ساتھ اپنی محبت کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"انھیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کر کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انھوں نے اپنے ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں جن دنوں کوئی خاص نمبر زیرِ ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام، صبح کے جتنے جتنے اگر رات کے بارہ ایک یا دو تین بج گئے ہیں تو بھی انھیں کچھ پروا نہیں، بلکہ مگن ہیں۔ مست ہیں۔

(شمارہ ۷۹ - ۸۰، ص: ۱۲۶۰)

وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی توفیق کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اس انفرادیت کا اظہار بھی کرتے ہو مدیر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے کام میں اختیار کی۔ اس صلاحیت کو تمثیلی زبان میں درج ذیل اقتباس کے دوسرے پیرے بیان کرتے ہیں:۔

"میں اپنی زندگی کے ان لمحات کو بڑا قیمتی جانتا ہوں جو ادب کی خدمت کے سلسلے میں، قدرت مجھ سے وصول کرتی ہے۔ یقین کیجیے۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا یا مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا، اس کے لیے میں اپنے آپ کو داد کا مستحق نہیں سمجھتا۔ بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی طاقت ہے جو مجھ سے یہ کام لے رہی ہے۔

اپنے ذہنی رُخ کی نشاندہی کے سلسلے میں میں نے اسی پرچے میں لکھا ہے:

"میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں، ایک دوسرے کے پیچھے چلی جا رہی ہیں اور چلی ہی جا رہی ہیں، یوں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ان اِکّا دُکّا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی جو قطار سے الگ، مخالف سمت چلی جا رہی ہوں۔

میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان اِکّا دُکّا، اُداس، پریشان، مگر حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رُخ کیا جائے۔

(شمارہ ۱۰۱، ص: ۲۹ - ۳۰)

مقالات از محمد طفیل :

۱ - ادب کی عدالت میں گواہی ، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹) ۱۵۸ - ۱۶۰ -

۲ - شبِ بیداری ——ناصر کاظمی کے کلام پر نیم خوابیدہ تاثرات - ۴۵ - ۴۶ (ستمبر اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۲۵۷ - ۲۶۰

۳ - مضمون ، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۹ - ۳۰ ، یہ مضمون جشن نقوش کی تقریب میں پڑھا گیا ،

۴ - موجد اپنے فن کے خود ہی موجد ، ۱۴۲ ، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۳۸۶ -

۵ - مہندر ناتھ کی شخصیت (خطوط کے آئینے میں) ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۶۰ - ۴۶۶ -

۶ - محمد طفیل (مرتب) : عطیات ، ۶۵ - ۶۶ ، مکاتیب نمبر ، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷) ۱۰۴۱ - ۱۰۴۲ ، اس عنوان کے ذیل میں خطوط کے عطیات دینے والوں کے نام اور خطوط کی تعداد درج کی گئی ہے -

۷ - تبصروں پر تبصرہ ، مدیر نقوش کی تیسری کتاب "آپ" پر بڑے ادیبوں کی آراء تفصیلی بھی ، مختصر بھی ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۹۴ - ۶۱۵ -

دوسرے مقالہ نگاروں کے مقالات :

۱ - اختر اورینوی ، ڈاکٹر : نقاش و نقوش ، ۷۹ - ۸۰ ، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۴ - ۱۵ ،

۲ - ادارہ : بیاضِ غالب کی تصحیح ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۶ - ۳۰ ،

۳ - ادارہ : چند حقائق ، بلا تبصرہ ، ۱۱۶ ، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۳۷۵ - ۳۷۸ ،

۴ - افتخار حسین آغا : آپ (تبصرہ) ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۹۶ - ۵۹۹ ،

یہ دراصل ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے - اس میں محمد طفیل کی خاکہ نگاری کے فن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے -

۵ - انور سدید : اردو میں خاکہ نگاری ، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۶۶ - ۲۷۹ ،

۶ - جاوید طفیل : سفرِ نقوش اور محمد نقوش ، ۱۳۴ (دسمبر ۱۹۸۶ء) ۲۲۹ - ۲۳۳ ،

۷ - جاوید طفیل : میرا والد ، میرا دوست ، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۴۱۶ - ۴۱۸ ،

۸ - خدیجہ مستور : نقوش کے خاص نمبر ، ۱۱۰ ، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۶ - ۱۸ ،

۹ - خورشید ، ڈاکٹر عبد السلام : مجلاتی صحافت میں "نقوش کا مقام" ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۲۹ - ۷۳۰ ،

۱۰ - خورشید ، عبد السلام : مجلاتی صحافت میں 'نقوش' کا مقام ، ۱۱۰ ، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸) ۱۶ - ۱۸ ،

۱۱ - شاہد احمد دہلوی : مضمون ، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۰ - ۲۲ ، جشن نقوش کی تقریب میں پڑھا گیا -

۱۲ - شہاب الدین ، خواجہ : خطبۂ صدارت ، ۱۱۰ ، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۵ - ۷ ،

۱۳ - صاحب کے لیے جواب ، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۶۸ - ۷۶ —— لکھنے والوں کے نام درج ذیل

ہیں :- علی عباس حسینی، کرشن چندر، اوزکل - احمد،

۱۴ - ضمیر جعفری، سید : نقوشِ طفیل، ۱۱۶، غالب نمبر (۱۹۷۱ء) ۵۰۲ - ۵۰۶،

۱۵ - کرشن چندر : صاحب کے لبد جاب، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۶۹ - ۷۱،

محمد طفیل کی خاکہ نگاری کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

۱۶ - محمد حسن، ڈاکٹر : طفیلیات، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۲۳ - ۱۲۵،

۱۷ - محمد عقیل، ڈاکٹر سید : محمد طفیل — ایک خاکہ نگار، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۹ - ۲۶۵،

۱۸ - مستقبل کی اُردو کے بارے میں کھلی چٹھیاں بنام مدیر نقوش، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۵ — ۳۱، جن کی چٹھیاں شامل ہیں، اُن کے نام مع صفحات درج ذیل ہیں :-

شاہد احمد دہلوی ۵ - ۱۲، ڈاکٹر گیان چند ۱۳ - ۱۴، سہیل بخاری ۱۵ - ۲۳، ل احمد ۲۳ - ۲۵، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۲۵ - ۲۸، اختر جمال، ۲۹ - ۳۱۔

۱۹ - مہر غلام رسول : بیاضِ غالب کی دریافت، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۱ - ۱۸،

اس میں طفیل صاحب کے بارے میں بھی اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔

۲۰ - مہر غلام رسول : نقوش کے بارے میں میرے تاثرات، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۱ — ۱۳،

۲۱ - نثار احمد فاروقی : اُردو میں خاکہ نگاری، ۷۲ (مئی ۱۹۵۹ء) ۷۴ - ۱۰۸،

۲۲ - نثار احمد فاروقی : مکرم، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۸۰ - ۲۸۶،

۲۳ - نثار احمد فاروقی : نقوش کے خاص نمبر، ۷۹ - ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۶ - ۴۴،

۲۴ - وحید قریشی : ادب اور ادیب، ۰۶ خاص نمبر (اکتوبر — دسمبر ۱۹۶۶ء) ۳ - ۴،

یہ مضمون جشنِ نقوش کی تقریب منعقدہ ۲۵ رجو ۱۹۶۵ء کے موقع پر پڑھا گیا۔

۲۵ - وحید قریشی، ڈاکٹر : غالب نمبر حصہ دوم کے بارے، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۵۱۵ - ۵۱۸،

۲۶ - وقار عظیم : نقوش اور طفیل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۱ — ۱۳،

۲۷ - یوسف حسن، حکیم : مضمون، ۱۰۱ (نومبر ۱۶۴ ۱۸ - ۱۹،

آپ بیتی نمبر کی تقریب "جشنِ نقوش" کے موقع پر پڑھا گیا

خاکے (بشمول شخصیات)

' نقوش ' میں جو خاکے محمد طفیل نے لکھے، ان کے اندراجات کی تعداد ۳۶ ہے۔ شمارہ ۶۱ - ۶۲ (جنوری - فروری ۱۹۵۷ء) میں "لاہور کی چند شخصیتیں" کے عنوان کے تحت ۱۴ مختصر خاکے لکھے ہیں۔ اس طرح خاکوں کی تعداد ۴۹ بنتی ہے۔ ان میں ان کا اپنا

"مدیر نقوش" کے نام سے بھی شامل ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں ایک کتابیاتی مقالہ الگ سے لکھا جا رہا ہے۔ اس بنا پر ان کے لکھے ہوئے خاکوں کے اقتباسات اس مضمون میں شامل نہیں کیے جا رہے ہیں۔ شمارہ ۱۴۴ تک محمد طفیل کے متعلق ۱۳ خاکے نقوش میں شامل ہیں۔ ان میں سے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

کرشن چندر نے "ہم قلم" کے عنوان سے محمد طفیل کا خاکہ لکھا۔ اس میں انھوں نے ان کی مدیرانہ اہلیت اور صلاحیت کا اپنے مخصوص انداز میں بھرپور اظہار کیا۔ اس میں سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

> "خوش قسمتی سے میرا شمار بھی طفیل کے طفیلیوں میں ہی ہوتا ہے، گو یہ بات طفیل کو معلوم نہیں، طفیل کی ظاہری شکل و صورت کا کیا کہوں کہ بالکل اپنے رسالہ نقوش کی طرح گرانڈیل اور بھاری بھرکم ہے۔ وہی سنجیدگی، وہی وقار، جس سے جی الجھتا ہے۔ طفیل کو چھاپیے نقوش کو نکالیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ذات باری نے طفیل کو نقوش کے لیے پیدا کیا یا نقوش کو طفیل کے لیے تولد کیا۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ ہیں کسی نے جڑواں بھائیوں میں بھی ایسی یکسانیت نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ایسی محبت۔ اگر کبھی نقوش کے کسی نمبر کے صفحات کی تعداد ایک ہزار سے کم ہو تو طفیل کی صحت کے بارے میں اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں اور اب تو جب سے مجھے قلب کا عارضہ لاحق ہوا ہے، ڈاکٹروں نے مجھے کتابوں کی الماری سے نقوش اٹھا کر لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے اب اگر مجھے 'نقوش' پڑھنا مقصود ہے تو ایک ملازم آئے گا اور وہ بیچارہ جیسے تیسے کر کے ہانپتا کانپتا نقوش کا نمبر اٹھا کر میرے سامنے لائے گا اور اسے میرے مطالعے کے لیے لکڑی کی رحل پر رکھ دے گا۔ صفحات الٹتے جائیے طفیل کے دل و دماغ کی پرتیں خود بخود کھلتی جائیں گی' کہ ان دنوں پاکستان کے اردو ادب میں کیا ہو رہا ہے؟ تمام مواقع، حادثے، رونمائیاں، رسوائیاں، دنگل کے جمگھٹ، تخلیقات کے ہجوم، وہ سب آپ کو گھیر لیتے ہیں اور جس دن گھر میں نقوش وارد ہوتا ہے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔"

(شمارہ ۱۲۰، ص ۳۰)

اشفاق احمد نے "عجیب و غریب شخص" کے نام سے محمد نقوش کا خاکہ لکھا۔ اس میں انھوں نے نقوش کے نمبروں کی ضخامت کے متعلق بات کی ہے۔ خاکہ نگار نے محمد طفیل کی بے پناہ مدیرانہ خوبیوں کو اپنے خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے الفاظ کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

> "محمد طفیل ایک عجیب و غریب شے ہے جو ہر مرتبہ عجیب و غریب نمبر لے کر آجاتا ہے، سوائے اپنے اداریے کے ہر جگہ شرماتا لجاتا لچکتا، بل کھاتا اپنا نمبر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے شرمیلا ٹیگور کا نام سن کر ہمیشہ محمد طفیل یاد آجاتا ہے۔ لکھنا پڑھنا شانتی نکیتن ٹیگور کا سا اور باقی سب کچھ شرمیلا جیسا ——— جن دنوں میری اس کی بول چال تھی بالواسطہ طور پر بہت کچھ اس سے پوچھ لیتا تھا۔ اب ہم دونوں اپنی اپنی عزت کے مورچے

میں اُترے ہوئے ہیں اور لام بندی کے سترہ سال گزارنے کے باوجود خندق سے باہر نہیں نکلتے ——— اگر میرا بس چلے تو اس سے پوچھوں کہ تم یہ نمبر کس طرح سے نکالتے ہو؟ اور لوگ بھی نمبر نکالتے ہیں، لیکن ان کے نمبروں میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو تمہارے نمبروں میں ہوتا ہے۔ جیسے سلاجیت اور پہاڑوں سے بھی نکلتی ہے لیکن چلاس کے پہاڑوں کی سلاجیت بیٹھنے ہی نہیں دیتی ——— کیا کوئی بہت بڑا ریسرچ سکالر یہ سارا سرمایہ چھوڑ کر مر گیا ہے اور اس کی کوٹھڑی کا بند راستہ اس علی بابا پر وا ہو گیا ہے یا سلیمانی ٹوپی والے جنوں اور موکلوں کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ اُردو کی دنیا سے ایسے دفینے کھود کر لاتے رہیں اور محمد طفیل کے جانماز تلے جمع کرتے رہیں کہ صبح نماز فجر کے بعد جب وہ دایاں کونہ اُٹھائے تو کاتب کو فیڈ کرنے کے لیے سات دن کا مواد وہاں رکھا ہو یا پھر یہ سارے نمبر بجا ہیں اور محمد طفیل نے اجتماعی نظر بندی کر کے ہم سب کو بھوندو بنا رکھا ہے۔ میں نے اس پر بڑا غور کیا ہے اور یہاں سے جانے کے بعد پھر غور کرنا شروع کر دوں گا مگر مجھے اس گتھی کا ابھی تک ایک سرا بھی نہیں ملا۔

(شمارہ ۱۲۹، ص: ۱۱-۱۲)

مسلسل محنت محمد طفیل کی زندگی کا شعار تھا۔ جب وہ نقوش کا کوئی نمبر مرتب کر رہے ہوتے تو اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں پورے انہماک سے مصروف رہتے۔ اگر 'نقوش' کے شماروں کا زمانی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اسی کا ذکر پروفیسر محمد عثمان نے اپنے خاکے "محمد طفیل" میں کیا ہے:۔

> "محنت اور لگن محمد طفیل صاحب کی شخصیت کا خمیر ہے۔ محنت بے شمار لوگ کرتے ہیں۔ خود شاعروں اور ادیبوں میں ایسوں کی کمی نہیں، جو سراپا محنت ہوتے ہیں، سراپا لگن ہوتے ہیں۔ مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں بعض کو محنت نگل جاتی ہے، وہ دن رات محنت کرتے ہیں مگر اس محنت سے نکلتا کچھ بھی نہیں۔ وہ محنت میں ڈوبتے ہیں اور محنت ان کو لے ڈوبتی ہے۔ تھوڑے ایسے خوش قسمت ہیں جن کی محنت ٹھکانے لگتی ہے، جن کی لگن ان کے کام آتی ہے۔ طفیل صاحب اُن خوش نصیبوں میں ہیں جن کی محنت رائیگاں نہیں جاتی، جو محنت کے ساتھ قابلیت، مہارت اور دُور اندیشی کو اس طرح کام میں لاتے ہیں کہ کام کارنامہ بن جاتا ہے۔ طفیل صاحب نے 'نقوش' کے جو درجن بھر نمبر نکالے ہیں، اُن کو دیکھ کر کوئی شخص اس حیرت زدگی سے بچ نہیں سکتا کہ یہ کسی انجمن یا ادارے کا نہیں بلکہ ایک شخص کی محنت کا ثمر ہے۔ ہر نمبر کے لیے اتنے وقیع اور بلند پایہ مضامین کا لکھوانا اور انھیں یکجا کرنا، کتابت و طباعت کے ایسے خوبصورت معیار کو قائم رکھنا اور پھر پورے مواد کو ایسا حسین و جمیل پیکر عطا کرنا کہ خوش ذوق انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ یہ عظمت کار، یہ مدبرانہ مہارت، یہ سلیقہ، یہ ہنر مندی اُردو رسائل کی تاریخ میں جتنی اور جیسی طفیل صاحب کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔

(شمارہ ۱۲۹، ص: ۱۴)

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی محمد طفیل کا خاکہ لکھا۔ اس کا عنوان "آج کا حاتم" ہے۔ اس میں بھی انھوں نے مرحوم کے اس سفر کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے جو انھوں نے محمد طفیل سے محمد نقوش کی منزل تک پہنچنے میں طے کیا۔ دراصل یہ جذبے اور لگن کی صداقت کا نتیجہ تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

> "محمد طفیل کی شخصیت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس کی مدیرانہ شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور وہ اتنا اچھا بھی ہے کہ میں اس میں مزید اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور پھر اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ محمد طفیل سے "محمد نقوش" بن گیا اور اس پر خوش بھی ہے۔ 'تو من شدم' کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی ! تاہم "نقوش" کے خاص نمبروں کے سلسلہ میں سامنے کی ایک بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ محمد طفیل نے خاص نمبر خواہ روایتی موضوعات پر نکالے، جیسے افسانہ، غزل، غالب، اقبال، میر اور انیس کے بارے میں خاص نمبر یا پھر غیر روایتی نمبروں کی طرح ڈالی، جیسے لاہور، مکاتیب، آپ بیتی اور یہ تازہ ادبی معرکے نمبر۔ لیکن بہرصورت اس نے ایک کام ضرور کیا اور وہ یہ کہ بہترین مواد کو خوبصورت ترین انداز میں پیش کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی بڑھ کر اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس تمام مواد کی ترتیب اور پیشکش کے پیچھے بطور محرک ایک خاص سوچ والے ذہن کے خواب اور ان کے ساتھ ساتھ ایک خاص ——— ——— زاویہ نگاہ بھی زیریں لہروں کی مانند موجیں مارتے نظر آتے ہیں۔ ہر ادبی پرچہ کی انفرادیت اس کے مدیر کی شخصیت اور زاویہ حیات کا عکس ہوتی ہے اگر یہ نہیں تو پرچہ محض مقالات، افسانوں اور شاعری کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر قسم کی تخلیقی سوچ سے عاری محض مطبوعہ اوراق !" (شمارہ ۱۲۹، ص : ۱۶-۱۷)

رحیم گل نے محمد طفیل کا خاکہ "ایک زندہ شخص" کے نام سے لکھا۔ اس میں انھوں نے ان کی منصوبہ بندی اور رفتارِ کار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ اپنے منصوبوں کو مسلسل محنت کے ساتھ پروان چڑھاتے تھے۔ ان کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ باتیں کم اور کام زیادہ کرتے تھے۔ رحیم گل نے اسی صلاحیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

> "محمد طفیل مجلسی آدمی نہیں ہے۔ مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے فن سے بھی نابلد ہے، لیکن وہ اتنا عظیم منصوبہ باز ہے کہ وہ لوگ، جو چرب زبانی اور محفل آرائی میں ثانی نہیں رکھتے، محمد طفیل کی منصوبہ بندی کے ہشت پہلو نتائج دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے کسی مضمون میں محمد طفیل کو ادب کی ویل مچھلی کہا تھا۔ یہ ویل مچھلی ٹنوں گوشت، ٹنوں چربی اور ٹنوں کے حساب سے ادبی نوادرات سمیٹے ہوئے ہے۔!
>
> لوگ کام نہیں کرتے مگر محفل جماتے ہیں، محمد طفیل کام کرتا ہے پھر محفل جماتا ہے۔ وہ گھوڑے کی طرح جُتا ہوا ہے پچیس تیس برس سے دوڑ رہا ہے، صبح ہوئی شام ہوئی، دن ہوا رات ہوئی، کام کام کام! وہ مسلسل دوڑ رہا ہے۔ نہ تھکتا ہے نہ سانس لیتا ہے، منصوبہ بنتا ہے پروان چڑھتا ہے۔ لوگ ایک بار ہمالہ کی چوٹی سر کرتے ہیں، اس نے کئی بار ہمالہ کی چوٹی سر کی ہے۔ (شمارہ ۱۲۹، ص : ۲۱)

علمی کام کرنے والوں پر ماحول کا اثر بھی ہوتا ہے، پُرسکون ماحول بہتر کام کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ محمد طفیل کا دفتر پہلے نقوش پریس والی عمارت میں تھا۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا نیا دفتر اسی عمارت کی پہلی منزل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس میں نسبتاً پرسکون فضا تھی۔ پہلے دفتر کے ساتھ ہی پریس کی مشینیں بھی چلتی تھیں، نتیجۃً شور ہوتا تھا۔ وہ اسی ماحول میں اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ سلمان بٹ نے ان کے خاکے میں اس پہلو کو موردِ بحث بنایا ہے:۔

> "وہ زیادہ تر اپنے پریس میں پائے جاتے ہیں، جس کمرے میں ان کا دفتر ہے وہاں دن بھر پریس کی مشینری سے متعلقہ بھیانک قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں، وہاں مسلسل بیٹھنا ہی جان جوکھوں کا کام ہے چہ جائیکہ وہاں بیٹھ کر تخلیقی کام بھی کیا جا سکے۔ میں تو جب بھی وہاں گیا ہوں وہاں واپس آکر سر درد کی ٹکیہ ضرور کھائی ہے لیکن محمد طفیل صاحب اسی ماحول میں اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر لیتے ہیں۔ کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ اسی باعث تو مجھے شبہ گزرتا ہے کہ وہ انسان نہیں بلکہ جن ہیں اور جن بھی نہایت طاقت ور نسل کے۔"
>
> (شمارہ ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳، ص، ۶۵۶)

خاکے از محمّد طفیل

۱۔ آپا (اسکیچ)، ۸۳۔ ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء)
۲۰۷ - ۲۱۶۔

۲۔ آغا بابر (خاکہ)، ۱۳۴، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء)
۳۰۵ - ۳۱۲

۳۔ اختر صاحب، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۴۴۵-۴۵۶

۴۔ اسرار الحق مجاز، ۵۵ - ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء)
۷ - ۸
ایک ملاقات کا حال نہایت مختصر خاکے کے انداز میں لکھا ہے۔

۵۔ بیگمات نے کہا، ۹۹، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء)
۴۱۱ - ۴۲۶

۶۔ تصویریں، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴) ۳۷ - ۳۸۔
نصیر الدین ہاشمی کے متعلق ہے۔

۷۔ جگر صاحب، ۳۳ - ۳۴ (اگست ۱۹۵۳ء)
۱۹۴ - ۲۰۶

۸۔ جناب پطرس، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء)
۱۱۶ - ۱۲۴

۹۔ جناب سالک، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء)
۳۸۴ - ۳۸۹

۱۰۔ جوش صاحب، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۱۱۷-
۱۴۷۔

۱۱۔ حفیظ ہوشیارپوری، ۱۱۸ سالنامہ (جولائی
۱۹۶۳ء) ۱۲۰ - ۱۲۱

۱۲۔ حکیم صاحب (مدیرِ نیرنگِ خیال)، ۱۱۰،
افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۴۹ - ۲۰۶؛

۱۳۔ خدیجہ مستور، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۳۶۲ - ۳۷۴

۱۴۔ روز ڈلیارے (کتاب اور صاحبِ کتاب پر تبصرہ)
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۵۵ - ۱۶۳؛

یہ کتاب عطاء الحق قاسمی کی ہے۔

۱۵۔ رحیم گل، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۸۳۲ – ۸۴۰

۱۶۔ زمر صاحب، ۱۳۴ (دسمبر ۱۹۸۶ء) ۵۶۲– ۵۶۹۔

۱۷۔ شاہد صاحب، (۱۱۲) اگست، ۱۹۶۹ء) ۳۴۶ – ۳۵۶

۱۸۔ شوکت تھانوی، ۳۷ – ۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۴۴۴ – ۴۴۹

۱۹۔ شیخ صاحب، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۴۶ – ۱۵۴

۲۰۔ صادقین، ۱۱۸، سالنامہ، (جولائی ۱۹۷۳ء) ۴۱۵ – ۴۴۵

۲۱۔ عابد صاحب، ۴۷ – ۴۸ شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵) ۳۳۷ – ۳۴۲

۲۲۔ فراق صاحب، ۳۵ – ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۴۰ – ۲۴۳

۲۳۔ قاضی عبدالستار، ۵۵ – ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۴ – ۵

ایک ملاقات کا حال بہت مختصر خاکے کی صورت میں لکھا ہے۔

۲۴۔ لاہور کی چند شخصیتیں، ۶۱ – ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۳۵۶ – ۳۷۱

یہ دراصل ان شخصیات کے مختصر خاکے ہیں:–

ڈاکٹر محمد باقر، حمید احمد خان، میرزا ادیب، بلونت سنگھ، عشرت رحمانی، ظہیر کاشمیری، قدرت اللہ شہاب، قیوم نظر، ابراہیم جلیس، سیف الدین سیف، اے حمید، اشفاق احمد، انتظار حسین اور ناصر کاظمی۔

۲۵۔ مختار مسعود، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۳۶۰ – ۳۶۸

۲۶۔ مدیر نقوش (خاکہ)، ۷۹ – ۸۰، ادب عالیہ نمبر، (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۴۹ – ۱۲۷۰

۲۷۔ مفتی صاحب (خاکہ) ۱۱۵، دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۸۷– ۳۰۹ء

۲۸۔ منٹو صاحب، ۳۱ – ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۱۹۷ – ۲۰۷

۲۹۔ منٹو صاحب، ۷۹ – ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۵۲۸ – ۵۴۴

۳۰۔ منٹو کا ایک خط، ۴۹ – ۵۰ (۱۹۵۵ء) ۳۵۸

۳۱۔ مولانا کوثر نیازی، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۲۳۵ – ۲۳۶

۳۲۔ مہندر ناتھ کی شخصیت (خطوط کے آئینے میں) ۱۲۰، (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۶۰ – ۴۶۶

۳۳۔ میرزا ادیب، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۵۸۴ – ۵۸۷

۳۴۔ ندیم صاحب، ۳۹ – ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۱۹۹– ۲۱۱ء

۳۵۔ نیاز صاحب، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۲۹۹ – ۳۱۴

۳۶۔ یگانہ چنگیزی، ۵۵ – ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۶ – ۷

ایک ملاقات کا حال نہایت مختصر خاکے کے انداز میں لکھا ہے۔

……

محمدؐ طفیل کے متعلق خاکے

۱ - احسن فاروقی، ڈاکٹر: صاحبِ طرز شخصیّت نگار، ۱۱۲ اگست ۱۹۶۹ء (۱۴۸ - ۱۵۵)
۲ - اشفاق احمد: عجیب و غریب شخص، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۱۱ - ۱۲
۳ - رحیم گل: ایک زندہ شخص، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۲۰ - ۲۲
۴ - سلمان بٹ: محمد طفیل (خاکہ)، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۵ - ۶۵۸
۵ - سلیم اختر، ڈاکٹر: آج کا حاتم، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۱۵ - ۱۹
۶ - شہاب، قدرت اللّٰہ: طفیلیانِ کرام، ۱۱۲، (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۳۱ - ۱۳۲
۷ - کرشن چندر: ہم قلم، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳ - ۵؛
۸ - مجنوں گورکھپوری: ایک جدید شخصیّت نگار، ۱۱۲، (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۳۹ - ۱۴۱
۹ - محمدؐ عثمان، پروفیسر: طفیل صاحب، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۱۳ - ۱۴
۱۰ - ممتاز مفتی: شخصیّت نگار کی تلاش، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۴۲ - ۱۴۷
۱۱ - ندیم قاسمی، احمد: طفیل صاحب، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۳۳ - ۱۳۸
۱۲ - وزیر آغا، ڈاکٹر: یاروں کا یار، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۵۶ - ۱۵۷
۱۳ - وقار عظیم، سیّد: نقوش اور طفیل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۱ - ۱۳؛

خطوط

اس عنوان کے تحت دس خطوط محمد طفیل کے ہیں اور باقی بنام محمد طفیل ہیں۔ دوسرے حصّے کے خطوط کی زیادہ تعداد آپ بیتی نمبر اور رسولؐ نمبر جلد ۱۳ میں شامل ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو کھلے خطوط کا نام دیا گیا ہے۔ مدیر نقوش کے دو خطوط گوپی چند نارنگ کے نام ہیں۔ پہلا خط ۹ جولائی ۱۹۶۲ء کو لکھا گیا۔ اس میں مزاح کا عنصر غالب ہے اور تحریر کا اسلوب لکھنے والے کی شگفتہ مزاجی پر دلالت کرتا ہے۔ خط کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

برادرم، تسلیمات!

"آپ کی شکایت بجا کہ میں آپ کو خط نہیں لکھتا۔ مگر میں کیا کروں میں تو انھیں خط لکھتا ہوں، جو میرے خط پڑھ کر بدمزہ نہیں ہوتے۔ آپ کے تو اپنے خطوں میں غالب کے خطوں کی سی مٹھاس ہوتی ہے۔ یہ کم بخت غالب بھی بہت بُرا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگ آج تک شرمندہ ہو رہے ہیں۔ نہ وہ پیدا ہوتا، نہ آپ کو مجھ سے شکایت پیدا ہوتی کہ میں خطوں کے جواب نہیں دیتا۔ قصور غالب کا، آپ کا، میرا تو نہیں۔ میں تو بالکل معصوم ہوں۔

آج آپ کی کتاب "اُردو مثنویاں" ملی۔ اسے پڑھوں گا۔ پھر اس میں سے چوری کروں گا۔ تحقیقی کاموں میں چوریوں کا ایسا سلسلہ چلتا ہے کہ پھر ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ جو جتنا بڑا چور ہوگا۔ وہ اتنا ہی بڑا محقق ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو بتاؤں کہ میرا یار نارنگ سارے ہی چوروں سے بازی لے گیا۔ میرے نامۂ اعمال میں دوستوں کی مخبری نہ ہی لکھی جاتی تو اچھا ہوتا۔

آپ نے صاحب پر۔ نہیں نہیں جناب پر تبصرہ کرکے بھوا ہی دیا۔ دیکھیے اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کچھ نہ لکھوں گا۔ اگر آپ نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تبصرہ کیا ہوگا تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ یاری نبھائی ہوگی تو آپ کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ لہٰذا میں آئندہ ایسا کوئی موقع نہ دوں گا کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی ڈوبے۔ ابھی ہم نے دنیا کا لطف ہی کون سا اُٹھایا ہے کہ بے موت مر جائیں۔

آپ کا مضمون "ایک چادر میلی سی" پر ملا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو ناول، افسانے کا کچھ پتا نہ ہوگا۔ جیسے ہمارے اور محققوں کو علم نہیں، مگر آپ تو چوکھی لڑ سکتے ہیں۔ آپ جیسا شریف زادہ، اور یہ سب کچھ، اے اللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

آپ نے جو پچھلی صدی میں وعدہ کیا تھا کہ آئندہ صدی میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ وہ اب مکمل ہو ہی گیا ہوگا۔ وہ بھیج دیجیے نا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ صرف وعدہ حور کی ذیل میں لا کر مار دیتے۔

یہ خط آپ نے پڑھ لیا۔ اس لیے اسے پھاڑ دیجیے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی نامحرم کے ہاتھ پڑے۔

محمد طفیل

(شمارہ، ۱۰۹ خطوط نمبر جلد سوم، ص: ۴۶۸-۴۶۹)

دوسرے خط میں بھی بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اس کو بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی گوپی چند نارنگ کے نام ہے۔

جناب ا——خط لکھنے کا وعدہ تھا۔ خط لکھ نہ سکا۔ یوں تو خط یہ بھی ہے۔ مگر میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ خط جلد نہ لکھ سکا۔ آپ کو بھی کیا پروا ہوگی۔ میں اپنی جگہ بلا وجہ شرمندہ ہو رہا ہوں۔ اتنے میٹھے انسان کے ہاں دوستوں کی کیا کمی ہوگی۔

اس وقت میں بڑے غصے میں ہوں۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے موڈ خراب کر دیا ہے۔ چونکہ خط لکھنا شروع کر چکا تھا۔ اس لیے اب اسے کھینچنا ہی پڑے گا۔

آج کل سالنامہ کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ہونا کیا ہے، دو تین سیر وزن کم ہو جائے گا، اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤں گا۔ بیوی ایک بار پھر مجھے رو لے گی۔

آپ کا بڑا اچھا مضمون میرے پاس ہے۔ اس میں وہ بچے گا۔ اپنی تصویر بھی بھیجیں (سوہنا مکھڑا) ایک

تخلیق اور صاحب تخلیق دونوں کو رسوا کرنے کا ارادہ ہے تخلیق تو خود بخود رسوا ہو جائے گی۔ صاحب تخلیق کو میں رسوا کروں گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں دلی آیا تھا۔ چند دن، چند گھنٹے ثابت ہوتے۔ جانا اتنا اچانک ہوا تھا کہ اتوار کی صبح ٹرنک کال آیا۔ دلی پہنچو۔ اسی دن بارہ بجے چل پڑا۔ پھر لاہور سے ٹرنک کال پہنچا۔ لاہور پہنچو۔ اسی دن لاہور کے لیے چل پڑا۔ یہ تو ہوا اس غریب کے ساتھ۔ بجائے ہمدردی کے آپ ناراض ہوتے ہیں۔ ہے نا ستم! — رسید حاضر ہے۔ خود غیر حاضر ہوں۔

محمد طفیل

(شمارہ ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم، ص: ۴۶۹)

محمد طفیل کے خطوط

۱۔ ایک خط بنام نامعلوم مکتوب الیہ، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۶۷-۱۲۶۸،

۲۔ ایک خط بنام اختر انصاری، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۶۸-۱۲۶۹،

۳۔ ایک خط بنام شورش کاشمیری، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۲۳۷

۴۔ ۲ خطوط بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۸-۴۶۹؛

۵۔ ۵ خطوط بنام اکبر حیدری کاشمیری، ۱۲۵، میر تقی میر نمبر (نسخۂ لاہور)، (اکتوبر ۱۹۸۰ء) ۷-۸؛

خطوط بنام محمد طفیل

۱۔ آغا خان: ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصّہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۱

۲۔ آفتاب حسین، شیخ: ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۱

۳۔ آئزن ہاور، جنرل: ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۶۳۱

۴۔ ابن انشا: ایک خط، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۹

۵۔ ابوسلمان شاہجہان پوری: ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۵

۶۔ اثر لکھنوی: ایک خط، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۳۷۲-۳۷۶

۷۔ احتشام حسین، سیّد: ایک خط، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۵

۸۔ احسن فاروقی، محمد: ایک خط، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸

۹۔ احمد، ل: ایک خط، ۲۷-۲۸، (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۰

۱۰۔ احمد، ل: کھلی چٹھی، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۲۳-۲۵ (یہ چھٹی مستقبل کی اُردو کے بارے میں ہے)

۱۱۔ احمد جمال پاشا: ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۶۰۶ - ۶۰۷

۱۲۔ احمد فاروقی، خواجہ: ایک خط، ۲۷ - ۲۸
(نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء)' ۷

۱۳۔ احمد فاروقی، خواجہ: ایک خط، ۴۹ - ۵۰،
منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۷

۱۴۔ اختر جمال، کھلی چٹھی، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء)
۲۹ - ۳۱
یہ چٹھی مستقبل کی اُردو کے بارے میں ہے۔

۱۵۔ ادیب، میرزا: ایک خط، ۳۱ - ۳۲ (اگست ۱۹۶۰ء)
۴ - ۵

۱۶۔ ادیب، سید مسعود حسن رضوی: ایک خط، ۴۹ - ۵۰
منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۵ - ۳۷۶

۱۷۔ ادیب، سید مسعود حسن رضوی، ایک خط، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۳

۱۸۔ اسعد گیلانی، سید: ۲ خطوط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۶ - ۶۳۷

۱۹۔ اظہر، ظہور احمد، ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد
۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۹

۲۰۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید: ایک خط، ۴۹ - ۵۰،
منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۶

۲۱۔ اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر: ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۱

۲۲۔ اکبر الدین صدیقی، محمد: ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۴ - ۶۴۵

۲۳۔ انجم، خلیق احمد: ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۶۰۱ - ۶۰۲

۲۴۔ اہرن برگ، ایلیا: ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر،
حصہ اول (جون ۱۹۶۴) ۱۹

۲۵۔ ایک خط، ۲۷ - ۲۸ (نومبر دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۸

۲۶۔ ایک خط، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء)
۱۲۶۷، ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصۂ اوّل
(جون ۱۹۶۴ء) ۲۵ -
مکتوب نگار: چینی سفیر

۲۷۔ ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۶
مکتوب نگار: انفارمیشن منسٹر، اٹلی

۲۸۔ ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۶
مکتوب نگار: امریکی سفیر

۲۹۔ ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۷
مکتوب نگار: فیض احمد فیض

۳۰۔ ایک خط، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۸
مکتوب نگار: سفیر متحدہ عرب جمہوریہ

۳۱۔ ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۸
مکتوب نگار: سفیر سعودی عرب

۳۲۔ ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۸
مکتوب نگار: ترکی سفیر

۳۳۔ ایک خط، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون

۱۹۶۴ء) ۲۹
مکتوب نگار : لبنانی سفیر
۳۴ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۹
مکتوب نگار : سوڈانی سفیر
۳۵ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۲۹
مکتوب نگار : برازیلی سفیر
۳۶ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۰
مکتوب نگار : سفیر یوگوسلاویہ
۳۷ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۱
مکتوب نگار : برطانوی ہائی کمشنر
۳۸ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۱
مکتوب نگار : سفیر جاپان
۳۹ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۱
مکتوب نگار : ہائی کمشنر کینیڈا
۴۰ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۲
مکتوب نگار : سفیر بلجیم
۴۱ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۳
مکتوب نگار : سفیر سوئٹزرلینڈ

۴۲ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۳
مکتوب نگار : ہائی کمشنر، آسٹریلیا
۴۳ ۔ ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون
۱۹۶۴ء) ۳۴ مکتوب نگار : ہائی کمشنر ملیشیا
۴۴ ۔ ایک خط مدیر "نقوش" کے نام ، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء)
۳۸۷ - ۳۸۹
۴۵ ۔ ایلیٹ ، ٹی ۔ ایس : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر،
حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۰
۴۶ ۔ برق ، غلام جیلانی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ ، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۰
۴۷ ۔ بروکس ، وان ریک : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر،
حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۴
۴۸ ۔ بیدی ، راجندر سنگھ : ایک خط ، ۲۷ - ۲۸
(نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۷ - ۸
۴۹ ۔ پاؤنڈ، ایزرا ، ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر،
حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۰
۵۰ ۔ پطرس ، احمد شاہ بخاری : ایک خط ، ۷۵-۷۶
پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹) ۶ - ۷
۵۱ ۔ تاج ، سید امتیاز علی : ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ،
پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۷ - ۹
۵۲ ۔ تھربر ، جیمز : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر حصہ
اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۳
۵۳ ۔ تمکین کاظمی ، ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ، پطرس نمبر،
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹
۵۴ ۔ جالبی ، ڈاکٹر جمیل ، ۲ خطوط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر،

جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۱ ـ

۵۵ ـ جوش ملیح آبادی : ایک خط بنام محمد طفیل، ۶۱ ـ ۶۲
سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۵۷

۵۶ ـ جوگندر پال : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۸ ـ ۶

۵۷ ـ جیلانی بانو : ایک خط، ۴۹ ـ ۵۰، منٹو نمبر،
(۱۹۵۵ء) ۳۸۰

۵۸ ـ جیلانی بانو : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۳

۵۹ ـ چرچل، مسرونسٹن : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ
اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸

۶۰ ـ حجاب امتیاز علی : ایک خط، ۲۷ ـ ۲۸، (نومبر، دسمبر
۱۹۵۲ء) ۱۶

۶۱ ـ حجاب امتیاز علی : ایک خط، ۴۹ ـ ۵۰، منٹو نمبر،
(۱۹۵۵ء) ۳۷۸ ـ ۳۷۹

۶۲ ـ حجاب امتیاز علی : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۶۰۸ ـ ۶۰۹

۶۳ ـ حسن عسکری، محمد : ایک خط، ۲۷ ـ ۲۸ (نومبر،
دسمبر ۱۹۵۲ء) ۹

۶۴ ـ حمید اللہ محمد : ۲ خطوط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۶

۶۵ ـ حنیف نقوی، ڈاکٹر : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۴

۶۶ ـ خورشید، عبدالسلام : کھلی چٹھی، ۹۸ (جون
۱۹۶۴ء) ۲۵ ـ ۲۸

یہ چٹھی مستقبل کی اُردو کے متعلق ہے ـ

۶۷ ـ دلویندر ستیارتھی : ایک خط، ۲۷ ـ ۲۸،
(نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۰

۶۸ ـ ڈل ہوزن، لارڈ : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر،
حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۰

۶۹ ـ رادھا کرشنن، ڈاکٹر : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی
نمبر حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۱

۷۰ ـ راز یزدانی : کھلا خط، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء)
۴۹۴ ـ ۴۹۶

۷۱ ـ راشد، ن، م : ایک خط، ۷۵ ـ ۷۶، ایلپرس
نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۳

۷۲ ـ رام لعل : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۶۰۹ ـ ۶۱۰

۷۳ ـ رحمان، ایس ـ اے : ایک خط، ۴۹ ـ ۵۰،
منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۷

۷۴ ـ رسل، برٹرینڈ : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر حصہ
اول (جون ۱۹۶۴ء) ۱۹

۷۵ ـ رشید احمد صدیقی : ایک خط، ۲۷ ـ ۲۸، (نومبر،
دسمبر ۱۹۵۲ء) ۶

۷۶ ـ رشید احمد صدیقی : ایک خط، ۴۹ ـ ۵۰، منٹو نمبر،
(۱۹۵۵ء) ۳۷۵

۷۷ ـ رشید احمد صدیقی، ایک خط ۷۵ ـ ۷۶، ایلپرس نمبر،
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶

۷۸ ـ رضوان اللہ آروی : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۲

۷۹ ـ ریاض پراچہ : ایک خط، ۷۵ ـ ۷۶، ایلپرس نمبر،
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۱

۸۰ ـ سالک، عبدالمجید : ایک خط، ۴۹ ـ ۵۰ منٹو نمبر،

۱۹۵۵ء) ۳۷۴

۸۱ ۔ تشنیش تبرا : ایک خط ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۲

۸۲ ۔ سرور آل احمد : ایک خط ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۶۰۰ ۔ ۶۰۱ ؁

۸۳ ۔ سلام مچھلی شہری : ایک خط ، ۲۷ ۔ ۲۸ (نومبر ۱۹۵۲ء)
۱۴ ۔ ۱۵ ۔

۸۴ ۔ سہیل بخاری : کھلی چٹھی ، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ،
۱۵ ۔ ۲۳

یہ چٹھی مستقبل کی اُردو کے متعلق ہے ۔

۸۵ ۔ سٹیون سن ، اے ، ای : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر
حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۴

۸۶ ۔ سعید احمد اکبرآبادی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ،
جلد ۱۳ ، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۱ ۔ ۶۳۳

۸۷ ۔ شاد عارفی : ایک خط ، ۴۹ ۔ ۵۰ ، منٹو نمبر ،
۱۹۵۵ء) ۳۷۸

۸۸ ۔ شاہد احمد : ایک خط ، ۸۳ ۔ ۸۴ (اگست
۱۹۶۰ء) ۲ ۔ ۳

۸۹ ۔ شاہد احمد دہلوی : کھلی چٹھی ، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۵ ۔ ۱۲
یہ چٹھی مستقبل کی اُردو کے بارے میں ہے ۔

۹۰ ۔ شور ، منظور حسین : ایک خط ، ۲۷ ۔ ۲۸ (نومبر ، دسمبر
۱۹۵۲ء) ۱۸

۹۱ ۔ شوکت تھانوی : ایک خط ، ۲۷ ۔ ۲۸ (نومبر ، دسمبر
۱۹۵۲ء) ۸

۹۲ ۔ شوکت تھانوی : ایک خط ، ۷۵ ۔ ۷۶ ، پطرس نمبر
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۷

۹۳ ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن ، سیّد : ایک خط ، ۱۳۲ ،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۶۹۷ ۔ ۶۹۹

۹۴ ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن ، سیّد : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۵

۹۵ ۔ صلاح الدین ، محمد : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۷ ،

۹۶ ۔ ضمیر جعفری ، سیّد : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۲

۹۷ ۔ طفیل محمد ، میاں : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ، ۱۳
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۲

۹۸ ۔ طٰہٰ حسین ، ڈاکٹر : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر ،
حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۲

۹۹ ۔ ظفر اللہ خان ، سر : ایک خط ، ۷۵ ۔ ۷۶ ، پطرس نمبر
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۹ ؁

۱۰۰ ۔ ظہیر احمد صدیقی ، پروفیسر : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ،
جلد ، ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۷

۱۰۱ ۔ عارف ، خالد محمود : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ ،
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۳

۱۰۲ ۔ عبد ، پروفیسر عبدالرحمٰن : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ،
جلد ، ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۳

۱۰۳ ۔ عبدالحق ، مولوی : ایک خط ، ۳۱ ۔ ۳۲ (مئی ، جون ،
۱۹۵۳ء) ۴

۱۰۴ ۔ عبدالحق ، مولوی : ایک خط ، ۲۷ ۔ ۲۸ (نومبر ، دسمبر
۱۹۵۲ء) ۴ ؁

۱۰۵ ۔ عبدالحق ، مولوی : ایک خط ، ۴۹ ۔ ۵۰ ، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۳۷۳ ۔ ۳۷۴ ،

۱۰۶ ۔ عبدالحق ، مولوی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ ،

(جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۲۱ ۔

۱۰۷ ۔ عبدالرحمٰن چغتائی : ایک خط، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۶ - ۷

۱۰۸ ۔ عبدالرحمٰن چغتائی : ایک خط، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰

۱۰۹ ۔ عبدالستار، قاضی : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۴۱۴ ۔

۱۱۰ ۔ عبدالقدوس ہاشمی : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۴

۱۱۱ ۔ عبدالقوی دسنوی : ۲ خطوط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۸ - ۶۵۱

۱۱۲ ۔ عبدالماجد دریابادی : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۹۶ ۔

۱۱۳ ۔ عبدالمغنی : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۳

۱۱۴ ۔ عدم، عبدالحمید : ایک خط، ۶۱ - ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۳۷۶ - ۳۷۸

۱۱۵ ۔ عرشی، امتیاز علی : ایک خط، ۴۹ - ۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۴ - ۳۷۵ ۔

۱۱۶ ۔ عصمت چغتائی : ایک خط، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۴

۱۱۷ ۔ علی عباس حسینی : ایک خط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۳ ۔

۱۱۸ ۔ غلام عباس : ایک خط، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۹ ۔

۱۱۹ ۔ غلام عباس : ایک خط، ۴۹ - ۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۷ ۔

۱۲۰ ۔ غلام عباس : ایک خط، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۴ ۔

۱۲۱ ۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۹ ۔

۱۲۲ ۔ فارغ بخاری : ایک خط، ۴۹ - ۵۰، منٹو نمبر، (۱۹۵۵ء) ۳۷۹

۱۲۳ ۔ فراسٹ، رابرٹ : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۲

۱۲۴ ۔ فراق گورکھپوری : ایک خط بنام محمد طفیل، ۳۳ - ۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۵ - ۷

۱۲۵ ۔ فراق گورکھپوری : فراقؔ کے خطوط بنام محمد طفیل مدیر نقوش، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۳۵۱ - ۳۶۶

۱۲۶ ۔ فراق گورکھپوری : میری گذارش (ایک خط بنام محمد طفیل)، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۴۰ - ۲۴۳ ۔

۱۲۷ ۔ فرح دیبا پہلوی : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۱

۱۲۸ ۔ فکر تونسوی : ایک خط، ۴۹ - ۵۰، منٹو نمبر، (۱۹۵۵ء) ۳۷۹

۱۲۹ ۔ فیض، فیض احمد : ایک خط، ۸۳، ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۳

۱۳۰ ۔ فیض، فیض احمد : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۷

۱۳۱ ۔ قدیرالدین احمد : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۷ - ۶۳۸

۱۳۲ ۔ قرۃ العین حیدر : ایک خط، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر،

ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۴

۱۳۳ ۔ کپور، کنہیا لال : ایک خط، ۷۵ ۔ ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۷

۱۳۴ ۔ کرشن چندر : ایک خط، ۴۹ ۔ ۵۰، منٹو نمبر، (۱۹۵۵ء) ۳۷۶

۱۳۵ ۔ گیان چند، ڈاکٹر : کھلی چٹھی، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۲ ۔ ۱۴

یہ چٹھی مستقبل کی اُردو کے بارے میں ہے ۔

۱۳۶ ۔ مالک رام : ایک خط، ۴۹ ۔ ۵۰، منٹو نمبر، (۱۹۵۵ء) ۳۷۵

۱۳۷ ۔ مالک رام : ایک خط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۰

۱۳۸ ۔ ماہم، ڈبلیو ایس : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۳

۱۳۹ ۔ ماہم سمرسٹ : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۴

۱۴۰ ۔ مجیب، مجیب اللہ : کھلا خط، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۴۹۷ ۔ ۴۹۹

۱۴۱ ۔ محمد اشرف، آغا : ایک خط، ۴۹ ۔ ۵۰، منٹو نمبر، (۱۹۵۵ء) ۳۷۸

۱۴۲ ۔ محمد اشرف، آغا : ایک خط، ۷۵ ۔ ۷۶، پطرس نمبر، (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۲

۱۴۳ ۔ محمد ایوب خاں، فیلڈ مارشل : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۱۷

۱۴۴ ۔ محمد خاں، کرنل : ۲ خطوط، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۶ ۔ ۶۴۷،

۱۴۵ ۔ محمد عبدالغفار : ایک خط، ۲۷، ۲۸ (دسمبر ۱۹۵۲ء) ۵

۱۴۶ ۔ محمد علی ردولوی : ایک خط، ۲۷ ۔ ۸۰، (دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۷ ۔ ۱۸

۱۴۷ ۔ محمد مالک کاندھلوی : ایک خط، ۱۳۰، رسو
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۳ ۔ ۳۴

۱۴۸ ۔ محمد نواز سید : کھلے خط، ۱۰۷ (مئی ۹۶۷
۴۱۱ ۔ ۴۱۶

یہ ایک خط ہے جس میں حفیظ ہوشیار
منظوم مکتوب شامل ہیں۔ ان کا اور کلام بھی
گیا ہے۔

۱۴۹ ۔ مختار صدیقی : ایک خط، ۴۹ ۔ ۵۰، (۱۹۵۵ء) ۳۸۰

۱۵۰ ۔ مرتضیٰ حسین فاضل سید : ۲ خطوط، ۱۳۰،
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۴ ۔ ۳۵

۱۵۱ ۔ مشفق خواجہ : ۲ خطوط، ۱۳۰، رسولؐ نم
جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۲

۱۵۲ ۔ مصوّر سبزواری : ایک خط، ۱۳۰، رسوا
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۵ ۔ ۶

۱۵۳ ۔ منظر صدیقی، ڈاکٹر محمد الیسین : ایک خط، ۰
جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۵

۱۵۴ ۔ معین، محمدؐ : ایک خط، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر
(جون ۱۹۶۴ء) ۲۵

۱۵۵ ۔ معین الدین احمد ندوی : ایک خط، ۴۹
منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۶ ۔ ۳۷۷

۱۵۶ ۔ ممتاز شیریں : ایک خط، ۲۷ ۔ ۲۸،

دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۱ - ۱۴

۱۵۷ - ممتاز مفتی : ایک خط ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۱

۱۵۸ - ممتاز مفتی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ ، جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۳

۱۵۹ - منصور ، فیض اللہ : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۳

۱۶۰ - مہر غلام رسول : ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ، پطرس نمبر ، (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۵

۱۶۱ - میکیلن ، ہیرلڈ : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر ، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸

۱۶۲ - نثار احمد فاروقی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ ، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۰ - ۶۴۱ ،

۱۶۳ - ندوی ، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن : ۲ ، خطوط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ ، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۱ ،

۱۶۴ - ندوی ، سید ابوالحسن علی ، ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۵ - ۶۳۶

۱۶۵ - ندیم قاسمی ، احمد : ایک خط ، ۲۷ - ۲۸ (نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۷

۱۶۶ - نصیر الدین ہاشمی : ایک خط ، ۲۷ - ۲۸ (نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۶

۱۶۷ - نعیم صدیقی : ایک خط ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۲

۱۶۸ - نگار زہرہ : ایک خط ، ۲۷ - ۲۸ ، (نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۶

۱۶۹ - نولوکوو ، والڈے میر : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر ، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۵

۱۷۰ - نیاز فتح پوری : ایک خط ، ۲۷ - ۲۸ (نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۵

۱۷۱ - نیاز فتح پوری : ایک خط ، ۳۱ - ۳۲ (مئی ، جون ۱۹۵۳ء) ۴

۱۷۲ - نیاز فتح پوری : ایک خط ، ۴۹ - ۵۰ منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۴

۱۷۳ - نیاز فتح پوری : ایک خط ، ۷۷ - ۷۸ ، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۸

۱۷۴ - وزیر آغا : ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸

۱۷۵ - ہاجرہ مسرور : ایک خط ، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۲۰۶

۱۷۶ - ہاشم رضا ، سید : ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۵

۱۷۷ - ہرچرن چاولہ : ایک خط ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۴ - ۶۱۵

۱۷۸ - ہکسلے ، الڈوس : ایک خط ، ۱۰۰ ، آپ بیتی نمبر ، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۳

۱۷۹ - ہیمر شولڈ : ایک خط ، ۷۵ - ۷۶ ، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۰

سمپوزیم

اس میں مذاکرے اور انٹرویو شامل ہیں ۔ "نقوش" نے ادبی موضوعات پر مذاکرے منعقد کروائے ۔ رسولؐ نمبر کے

بارے میں مجالس مذاکرہ بھی منعقد ہوتیں۔ اس نمبر کے متعلق محمد طفیل مرحوم کے انٹرویو بھی اس میں شامل ہیں۔ محمد نقوش کے لیے: حاصل حیات نمبر تھا۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ سوالات اسد اللہ غالب نے کیے، جوابات محمد طفیل نے دیئے۔

"...... اس نمبر کی تیاری میں کیا قیامتیں ٹوٹیں؟"

"اس نمبر کے سلسلے میں قیامت کا لفظ استعمال نہ کریں۔ اس مہم میں جو کچھ پیش آیا اُسے مشکلات کا نام نہ دیں۔ وہ سب راحتوں کے مرحلے تھے، وہ سب قرب حضوری کی منزلیں تھیں۔ میں تو راہِ حبیب میں دوڑتا چلا گیا، منزل قریب آتی گئی۔ میں نے تو ایسے ایسے تن آسان علمأ سے مضامین لکھوا لیے جو ایک لفظ لکھنے کے بعد اللہ میاں سے پوچھا کرتے تھے دوسرا لفظ لکھوں یا نہ لکھوں یقین جانیے مجھے تو یوں لگا کہ جیسے میرے ہاتھ اسم اعظم لگ گیا ہو میں نے جو چاہا وہ ہوگیا۔ یہ برکتیں موضوع کی تھیں۔"

"پہلی چار جلدوں کے سلسلے میں آپ کی پذیرائی ہوئی۔ اس سے آپ مطمئن ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ کام کسی دنیاوی لالچ کی خاطر نہیں کیا تھا، بلکہ میرا تو یہ خیال تھا کہ اتنا ضخیم کام میری زندگی میں چھپ نہ سکے گا۔ بے شک میں نے یہ کام تیرہ برسوں میں انجام دیا۔ ان تیرہ برسوں میں جن کے مہینے ۱۵۶، دن ۴۷۴۵، گھنٹے ۱۱۳۸۸۰، اور منٹ ۶۸۳۲۸۰۰ ہوتے ہیں۔ یہ حساب میں نے اس لیے کیا کہ میں نے یہ کام منٹوں کو ذہن میں رکھ کر کیا۔ برسوں کو نہیں، اگر ایسا نہ کرتا تو یہ کام نہ ہوسکتا تھا۔ میں نے زندگی کے معمولات بدل ڈالے۔ جن تقریبات کو چھوڑ سکتا تھا وہ چھوڑیں، جن رشتہ داروں کی شادیوں میں عدم شرکت سے گذارہ ہوسکتا تھا، وہ وقت بچایا۔ بلکہ یہاں تک کہ اس عرصہ میں جو مجھے چھوٹے موٹے عارضے لاحق ہوئے ان پر بھی میں نے خدا سے کہا: مجھے رسولؐ نمبر چھاپنے کی مہلت دیجئے، اس کے بعد تیری رضا۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا کہ جس کی آرزو اس کی زندگی میں پوری ہوگئی، وہ بھی سب سے بڑی آرزو......"

(شمارہ ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳، ص: ۶۶۹ - ۶۷۰)

حسن رضوی نے سوال کیا: "کن کن ادیبوں نے آپ کی رسولؐ نمبر کے سلسلے میں مدد کی؟"

"اس کا جواب یہ ہے کہ سارے پاکستان اور سارے ہندوستان کے علمآ و فضلا جس کا ذکر میں نے اپنے ادارتی نوٹ میں کیا ہے ایسا میں نے ہر نمبر کے بارے میں لکھا البتہ یہ ہے کہ ہر شخص ہر موضوع کا پارکھ نہیں ہوسکتا اس لیے میرے کرم فرماؤں کا حلقہ متنوع اور وسیع ہے جو بڑھ کر اب ساری دنیا پر محیط ہوگیا ہے۔"

(ایضاً ص: ۶۸۱)

اسداللہ غالب نے پوچھا: "کوئی پیغام؟"

"مجھے اپنے اہلِ وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک میں نے زندگی ان کے نام لکھ دی تھی، اب وہ میرے لیے دُعا کریں کہ مجھے میرا مقصود ملے۔ وہ یہ کہ دربارِ رسالتؐ کی آخری صف میں جو آخری آدمی کھڑا ہو وہ محمد طفیل ہو۔"

(ایضاً؛ ص: ۶۷۲)

۱۔ آغا سہیل، ڈاکٹر: افسانہ، ۱۳۲، سالنامہ، (جون ۱۹۸۵ء) ۳۴ - ۵۱

بحث میں حصہ لینے والے:۔

محمد طفیل، جیلانی کامران، آغا سہیل، سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی۔

۲۔ اُردو افسانہ کے مسائل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۶۰۱ - ۶۶۸

حصّہ لینے والے:۔

سیّد وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، میرزا ادیب، انتظار حسین، اعجاز حسین بٹالوی، ڈاکٹر اعراز نقوی، انور سجاد، ڈاکٹر میمونہ انصاری اور محمد طفیل؛

۳۔ اُردو افسانے میں روایت اور تجربے، ۳۷ - ۳۸، (جنوری ۱۹۵۴ء) ۴۶۷ - ۵۰۱

حصّہ لینے والے:۔

سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر، شوکت علی تھانوی اور محمد طفیل،

۴۔ اُردو افسانے میں روایت اور تجربے (سمپوزیم)، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر، جلد دوم (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۰۷۴ - ۱۰۶۴

حصّہ لینے والے:

سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت تھانوی، حمید اختر اور محمد طفیل۔

۵۔ اُردو غزل کا مستقبل (سمپوزیم)، ۴۳ - ۴۴ (جولائی، اگست ۱۹۵۴)، ۲۳۳ - ۲۴۷،

حصہ لینے والے:۔

چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، ابواللیث صدیقی، وقار عظیم، عبادت بریلوی، حفیظ جالندھری، حامد علی خاں، صوفی تبسّم، احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، حبیب اشعر اور محمد طفیل۔

۶۔ جنگ فورم کے تحت ایک خصوصی نشست کی رُوداد، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۷۳، ۶۷۸ -

تحریر و میزبانی: ضیا شاہد، حسن رضوی،
شرکا:۔ آغا سہیل، اسعد گیلانی، ڈاکٹر سلیم اختر، حفیظ تائب، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سید محمد متین ہاشمی،

۷۔ رؤف ظفر (رپورٹر): نقوش کا رسولؐ نمبر، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد، ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۸۷ - ۶۹۵ -

اس تقریب کے شرکاءِ مذاکرہ : ارشد میر، میرزا ادیب، صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی، ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، احمد سعید کرمانی، مولانا سید اسعد گیلانی، مولانا سید محمد متین ہاشمی، محمد طفیل، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ڈاکٹر محمد افضل ۔

۸ ۔ سلیم اختر، ڈاکٹر : خاکہ نگاری ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲ - ۶۳ ۔

بحث میں حصہ والے :۔

احمد ندیم قاسمی، آغا سہیل، تحسین فراقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور محمد طفیل ،

۹ ۔ سوالات اسد اللہ غالب کے، جوابات محمد طفیل کے، ۱۳۰، رسول نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۶۹ - ۶۷۲

۱۰ ۔ عارف، ارشاد احمد : نقوش رسول نمبر کی تعارفی تقریب ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۸۳ - ۶۸۶

۱۱۔ محمد طفیل سے گفتگو، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۷۹ - ۶۸۳ ۔

سوالات : حسن رضوی

۱۲۔ نوائے وقت فورم کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مذاکرے کی تفصیل، ۱۳۰، رسول نمبر جلد ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۹ - ۶۶۸

شرکاء مذاکرہ : بیدار سرمدی، مولانا محمد مالک کاندھلوی، ڈاکٹر محمد یوسف گورایا، نعیم صدیقی، محمد طفیل، ڈاکٹر معین الرحمٰن، پروفیسر محمد منور اور حافظ سلیم تابانی ۔

۱۳ ۔ وحید قریشی، ڈاکٹر : عصری تنقید، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۸ - ۲۳

شرکاء بحث :

ڈاکٹر وحید قریشی محمد طفیل، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، جیلانی کامران اور آغا سہیل ۔

تبصرے (بشمول خبریں اور اخباری کالم)

محمد طفیل نے 'نقوش' کے مختلف شماروں میں سات تبصرے لکھے ۔ ان کا اندراج پہلے کیا ہے ۔ دوسرے اندراجات کو "دیگر تبصرے اور متعلقات" کے تحت رکھا ہے ۔ اس حصے میں محمد نقوش کی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں ۔ نقوش کے مختلف نمبروں کے متعلق تبصرے، خبریں اور اخباری کالم رکھے ہیں ۔

شورش کاشمیری نے اپنا مجموعہ کلام "گفتنی ناگفتنی" تبصرے کے لیے دیا ۔ ایک خط کی صورت میں اس پر نہایت مختصر تبصرہ کیا، لیکن صاحبِ تخلیق اس سے خوش نہ ہوئے، چنانچہ طفیل صاحب نے اس کتاب پر بھی تبصرہ کیا ۔ اس سلسلے میں شورش کے نام خط کو یہاں پر درج کیا جاتا ہے :۔

شورش بھائی !

آج آپ نے مجھ پر ظلم کیا ——— کاہے کو مجھے اپنا شعری مجموعہ "گفتنی ناگفتنی" دے گئے !

جب سے کتاب ملی ہے اسی میں گم ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ ہم نقاد ہیں، وہ آپ کا دیباچہ نہ پڑھیں اور جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سخن فہم ہیں، وہ آپ کے اشعار نہ پڑھیں ورنہ وہ اپنی اپنی حیثیتوں کو غیر معتبر سمجھنے لگیں گے۔
ابتدائیہ میں نقاد کا ذہن اور فن کار کا خلوص ہے۔ شعروں میں ظفر علی خاں کی گونج گرج اور مطالعہ کے ساتھ فن کی عظمت!

محمد طفیل

(شمارہ ۵۵۔۵۶، ص: ۲۳۷)

شورش کاشمیری کی پانچ کتابوں: نورتن، مولانا ظفر علی خان، حمید نظامی، میاں افتخار الدین اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: پانچ کتابیں ——ایک مصنف اس میں لکھتے ہیں:۔

شورش صاحب نے ابوالکلام آزاد سے نور علم حاصل کیا۔ ظفر علی خاں سے سیاسی شعور اور عطاء اللہ شاہ بخاری سے خطابت۔ یہی وجہ ہے کہ میں انھیں سہ آتشہ کہتا ہوں۔ ابوالکلام ہی کی طرح ان کے ہاں الفاظ کا شکوہ ہے۔ ظفر علی خاں ہی کی طرح، ان کے ہاں سیاسی پھڑک ہے اور عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کی طرح کی جادوگری!

شورش صاحب کھلے دوست اور کھلے دشمن ہیں۔ مجھے ان کی یہی ادا پسند ہے اور بعضوں کو ان کی یہی ادا ناپسند ہے۔

...... میں شورش کاشمیری کو ادب و صحافت کا محمد حسین آزاد سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ اتنے بڑے جادوگر ہیں کہ جسے چاہیں آسمان پر بٹھا دیں اور جسے چاہیں تحت الثریٰ میں گرا دیں۔ آزاد کی نوازشش صرف شاعروں اور ادیبوں تک تھی، ان کا دائرہ وسیع ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ان کے نرغے میں سیاسی شخصیتیں بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم ریشم کی سی نرمی کے ساتھ تلوار کی سی کاٹ بھی رکھتا ہے۔ پھر فقروں کی چبھن بھی ایسی کہ دُہائی......

الفاظ کی آمد کا جیسا جادو یہ جگاتے ہیں، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا۔ تحریر و تقریر کا یہ خاص انداز اس دَور میں انہی کا حصہ ہے۔ ورنہ مجھے کوئی اور نام بتائیے؟ (عطاء اللہ شاہ بخاری کے بارے میں لکھتے ہیں):۔

کالی داس نے عورت کے رُوپ کی تصویر کھینچتے ہوئے کائنات کی جن تصوری اور نظری خوبصورتیوں کو یکجا کیا ہے، ان تمام خوبصورتیوں کا مرقع شاہ جی کی خطابت ہے۔ رعد کی گونج، بادل کی گرج، ہوا کا فراٹا، فضا کا سناٹا، صبح کا اجالا، چاندنی کا جھالا، ریشم کی جھلملاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ، گلاب کی مہک، سبزے کی لہک، آبشار کا بہاؤ، شاخوں کا جھکاؤ، طوفان کی کڑک، سمندروں کا خروش، پہاڑوں کی سنجیدگی، صبا کی چال، اوس کا نم، چنبیلی کا پیراہن، تلوار کا لہجہ، بانسری کی دھن، عشق کا بانکپن، حسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع اور مقفیٰ عبارتیں انسانی آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صورت اختیار کر لیتی ہیں، اس کا جیتا جاگتا مرقع شاہ جی کی ذات ہے۔

تبصرے کو اس طرح ختم کرتے ہیں۔

بات طول پکڑتی جاتی ہے، قصہ مختصر، یہ کتابیں بصیرت دیتی ہیں، شعور دیتی ہیں، اسلوب دیتی ہیں، علم دیتی ہیں، یہ میری رائے ہے آپ بھی تصدیق کر دیں تو سبحان اللہ!   (شمارہ ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم، ص ۶۱۳ – ۶۱۵)

تبصرے از محمد طفیل

۱۔ پانچ کتابیں — ایک مصنف (تبصرہ)، ۱۰۹؛ خطوط نمبر، جلد نمبر ۳ (اپریل مئی ۱۹۶۸ء) ۶۱۳ - ۶۱۵ ۔

شورش کاشمیری کی پانچ کتابوں پر تبصرہ ہے، ان کے نام یہ ہیں:- نورتن، مولانا ظفر علی خاں، حمید نظامی، میاں افتخار الدین اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔

۲۔ خون جگر ہونے تک (تبصرہ)، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۴۵۲ - ۴۵۳

یہ کتاب فضل احمد کریم فضلی کا ناول ہے ۔

۳۔ شب بیداری، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۲۵۷ - ۲۶۰

۴۔ تکرار سخن، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۵۷۱ - ۵۷۲ ۔

یہ کتاب صدیق کلیم کے مضامین کا مجموعہ ہے ۔

۵۔ گفتنی ناگفتنی (تبصرہ)، ۵۷ - ۵۸، (جون ۱۹۵۶ء) ۲۳۷ - ۲۳۸

زیر تبصرہ کتاب شورش کاشمیری کا مجموعہ کلام ہے ۔

۶۔ مقالات سرسید، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۵۶۶ - ۵۶۸ ۔

۷۔ مکتوبات سرسید (تبصرہ)، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۳۹۰ - ۳۹۱ ۔

مکتوبات سرسید کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا ۔

دیگر تبصرے و متعلقات

۱۔ اثر لکھنوی: صاحب پر تبصرہ، ۵۷ - ۵۸، (جون ۱۹۵۶ء)

یہ تبصرے کا اقتباس ہے جو ٹائیٹل کے اندرونی حصے پر درج ہے ۔

۲۔ احمد، ل: صاحب کے بعد جناب، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۷۱ - ۷۹

اس میں صاحب اور جناب پر تبصرہ کیا گیا ہے، ان دونوں کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے ۔

۳۔ احمد جمال پاشا: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۶ - ۶۰۷

۴۔ ادیب میرزا: نقوش، رسول نمبر ایک نظر میں، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۹۸ - ۷۰۲

۵۔ اعجاز حسین بٹالوی: دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۲ - ۳۵

بیاض غالب کے بارے میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے ۱۳ر جنوری ۱۹۷۰ء کو نشر ہوا ۔

۶۔ افتخار حسین، آغا: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۹۶ - ۵۹۹ ۔

۷۔ اسلم کمال، دس دروانعل والاشہر، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۰۶ - ۷۰۸

۸۔ انتظار حسین، لاہور نامہ، ۱۱۴، (جولائی ۱۹۷۰ء)

۳۱ - ۳۲

یہ کالم بیاضِ غالب کے متعلق ہے۔

۹ - انتظار حسین، لاہور نامہ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء)، ۳۶ - ۳۷

بیاضِ غالب کی تقریب کے متعلق ہے۔

۱۰ - انور سدید، ڈاکٹر: نقوش کا رسولؐ نمبر، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۰۲ - ۷۰۵

۱۱ - پاکستان میں اولین بیاضِ غالب کی اشاعت کا خیر مقدم ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۳ - ۵۴

یہ خبر روزنامہ امروز، لاہور میں، ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی۔

۱۲ - تبصرہ (بیاضِ غالب) ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء)، ۴۷ - ۴۹۔

یہ تبصرہ مشرق میں شائع ہوا۔

۱۳ - تبصرہ (بیاضِ غالب)، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۴۶ - ۴۷

یہ تبصرہ جنگ میں شائع ہوا۔

۱۴ - تحسین فراقی: نقوش، رسولؐ نمبر ۱۱، ۱۲۰، ۱۳۰ — ایک جائزہ، ۱۳۳، سالنامہ (ستمبر ۱۹۸۶ء)، ۴۳۵ - ۴۴۰

۱۵ - تبصرہ (بیاضِ غالب)، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۴۴ - ۴۶

یہ تبصرہ امروز میں شائع ہوا۔

۱۶ - جوگندر پال: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۸

۱۷ - خبریں اور تبصرے (تراشے مختلف اخبارات)، ۱۱۴، (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۱ - ۵۶

۱۸ - خلیق انجم: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۱ - ۶۰۲

۱۹ - خلیق انجم، ڈاکٹر: نقوش کا رسولؐ نمبر، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۱۰ - ۷۱۱

۲۰ - رام لعل: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۹ - ۶۱۰

۲۱ - رسولؐ نمبر پر صدقِ جدید کا تبصرہ، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۰۹ - ۷۱۰

۲۲ - رسولؐ نمبر کی تعارفی تقریب، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۸۷

۲۳ - ستیش بترا: آپ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۲

۲۴ - سجاد، عطاء اللہ: ادبی معرکے — ایک مبسوط تاریخ، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۹ - ۱۰

۲۵ - سرگرمیاں، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۹ - ۴۱۔

بیاضِ غالب کی تقریب کے بارے میں اخبار خواتین، ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۹ء کا کالم۔

۲۶ - شہر خیال، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۴۱ - ۴۳،

بیاضِ غالب کے متعلق نوائے وقت" ۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء کا کالم۔

۲۷ - شہر سرائے، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۷ - ۳۹

اخباری کالم امروز، ۷ر دسمبر ۶۹ء، بیاضِ غالب کے متعلق ہے۔

۲۸ - صباح الدین عبدالرحمٰن، سید: تبصرہ (رسولؐ نمبر جلد ۱۱ تا ۱۳)، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۶۹۷ - ۶۹۹۔

۲۹ - ظہیر احمد صدیقی: نقوش، رسولؐ نمبر، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۷ - ۶۴۸

یہ اشعار ہیں۔

۳۰ ۔ عبدالماجد دریابادی : ایک خط ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۵۹۴ ۔ ۵۹۵ ؛

۳۱ ۔ عبدالمغنی : آپ ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۳

۳۲ ۔ علی عباس حسینی : صاحب کے بعد جناب ،
۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۶۸ ۔ ۶۹
اس میں صاحب پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔

۳۳ ۔ غالب کی تحقیقات آج بھی نئی ہیں ، ۱۱۴ (جولائی
۱۹۷۰ء) ۵۱ ۔ ۵۲ ۔
بیاض غالب کی تقریب کے متعلق یہ خبر روزنامہ جنگ '
راولپنڈی میں ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی ۔

۳۴ ۔ فوق ، ڈاکٹر محمد حنیف : محمد اردو کیں یا محمد پاکستان '
۱۳۲ ، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۷۵ ـــ ۷۰۷ ،
"محمد نقوش" پر تبصرہ ہے ۔

۳۵ ۔ کپور ، کنہیالال : صاحب ، ۵۵ ۔ ۵۶ ، (مارچ
۱۹۵۶ء) ۹۶ ۔ ۱۰۰

۳۶ ۔ کوثر نیازی : قابلِ قدر دینی اور علمی خدمت (رسولؐ نمبر
پر تبصرہ) ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء)
۶۵۸ ۔ ۶۵۹ ۔

۳۷ ۔ محمد زکریا ، خواجہ : مجلّی ۱۲۹ ، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء)
۸۵۶ ۔ ۸۶۰

۳۸ ۔ محمد عقیل ، سید : آپ ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ،
۶۰۳ ۔ ۶۰۵ ،

۳۹ ۔ محمد منور ، پروفیسر : لاثانی شخصیت کو لاثانی انداز
میں پیش کیا ، ۱۳۰ ، رسولؐ نمبر ، جلد ۱۳ (جنوری
۱۹۸۵ء ۶۹۷ ۔ ۶۹۸

۴۰ ۔ مرزا غالب نہ صرف برِ صغیر ، بلکہ دنیا کے عظیم شاعروں
میں سے ہیں ، ۱۱۴ ، (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۵

بیاض غالب کی تقریب کے بارے میں یہ
خبر ندائے ملت ، لاہور میں ، ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء
کو شائع ہوئی ۔

۴۱ ۔ نعیم صدیقی : "آپ" ، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۹۹ ۔ ۶۰۰

۴۲ ۔ 'نقوش' سالنامہ ۱۹۶۶ء (تبصرہ) ، ۱۰۶ ، خاص نمبر
(اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۶ ۔ ۷
روزنامہ "امروز" (۱۰ جولائی ۱۹۶۶ء) میں شائع ہوا ۔

۴۳ ۔ نقوش ، سالنامہ ۱۹۶۶ء (تبصرہ) ، ۱۰۶ ، خاص نمبر
(اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۷
روزنامہ نوائے وقت' (۱۹ جولائی ۱۹۶۶ء) میں شائع ہوا ۔

۴۴ ۔ نقوش ' سالنامہ ۱۹۶۶ء (تبصرہ) ، ۱۰۶ ، خاص نمبر
(اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۷ ۔ ۸
یہ تبصرہ "اخبارِ خواتین" (۳۰ جولائی ۱۹۶۶ء)
میں انور اختر احمد صاحبہ نے لکھا ۔

۴۵ ۔ نقوش ، سالنامہ ۱۹۶۶ء (تبصرہ) ، ۱۰۶ ، خاص نمبر
(اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۸ ۔
روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی نے اپنی ۶ نومبر
۱۹۶۶ء کی اشاعت میں لکھا ۔

۴۶ ۔ 'نقوش' کے غالب نمبر کا افتتاح ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء)
۵۶ ۔
یہ خبر 'نوائے وقت' راولپنڈی میں ۳۰ دسمبر
۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی ۔

۴۷ ۔ 'نقوش' کے غالب نمبر کی افتتاحی تقریب ، ۱۱۴ ،
(جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۶
نوائے وقت' ، لاہور ، (۳۰ ، نومبر ۱۹۶۹ء)

۴۸ ۔ وزیر اطلاعات نے 'نقوش' کے 'غالب نمبر' کا
افتتاح کیا ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۲

یہ خبر روزنامہ "مشرق" لاہور میں ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء
کو شائع ہوئی۔

۴۹ - ہرچرن چاولہ: "آپ"، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۴
- ۶۱۵ -

۵۰ - یوسف حسن، حکیم: "آپ" ۱۰۸، (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۵۹۴ - ۵۹۵

حکیم صاحب نے محمد طفیل کی خاکہ نگاری کے متعلق بات کی ہے۔ آخر میں "آپ" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

۵۱ - The Diwan in Ghalib's own hand publication being launched today.

۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۳

یہ خبر پاکستان ٹائمز لاہور میں ۶ دسمبر ۱۹۶۹ء
کو شائع ہوئی۔

۵۲ - Ghalib's New Found Diwan.

۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۴۹ - ۵۰

یہ تبصرہ پاکستان ٹائمز میں (۱۲ اپریل ۱۹۷۰ء)
کو شائع ہوا۔

۵۳ - Khaled Ahmad : Naqoosh : Rasul Number, Monumental Work of Homage.

۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۱۲ - ۷۱۵

۵۴ - Publication of Diwan-i-Ghalib launched.

۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۵

یہ خبر روزنامہ پاکستان ٹائمز میں ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء
کو شائع ہوئی۔

۵۵ - Rare 'Nuskha' of Ghalib launched.

۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۱

بیاض غالب کے متعلق یہ خبر پاکستان ٹائمز، راولپنڈی میں ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی۔

۵۶ - Siddiqui, M.A. : A Historic Feat.

۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء)
۷۱۶ - ۷۱۸

متفرقات

محمدؐ طفیل کی متفرق تحریریں

۱ - ابتدائیہ، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳، (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۲۹ (رسولؐ نمبر کے بارے میں)

۲ - التماس، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۰ - (رسولؐ نمبر کے متعلق ہے)

۳ ۔ التوا، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (ستمبر ۱۹۷۱ء)

یہ تحریر "اس شمارہ میں" کے بعد والے صفحے پر ہے۔

۴ ۔ ایک گواہی، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۸

۵ ۔ تکملہ، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸۵۲

آپ بیتی نمبر کے بارے میں لکھا ہے :۔

"یہ پرچہ ۱۹۶۴ء میں چھپا ہے۔ اس لیے ہم نے التزام یہ رکھا کہ اس نمبر کے بھی ۱۹۶۴ صفحات ہوں" (ص ۔ ۱۸۵۲)

۶ ۔ دردِ مدح خود (ابتدائیہ)، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۸

۷ ۔ طلوع، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۴ — ۳۶

آپ بیتی نمبر کی تقریب (جشنِ نقوش) کی کارروائی۔

۸ ۔ عرضِ ناشر، ۱۵ ۔ ۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۶

یہ محمد طفیل مرحوم کی پہلی تحریر ہے، جو 'نقوش' میں بحیثیت ناشر شائع ہوئی۔ اس میں پرچے کے معیار کے متعلق بات کی گئی ہے۔

۹ ۔ فراق صاحب [ایک ملاقات]، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۳۵ - ۲۳۹

۱۰ ۔ معروضات، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲ - ۴

ان کو جشن "نقوش" کی تقریب منعقدہ ۲۵ جون ۱۹۶۵ء کے موقع پر پیش کیا گیا۔

دیگر متفرق تحریریں

۱ ۔ احمد شجاع، حکیم: تقریر، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۴ - ۵

یہ تقریر جشنِ نقوش کی تقریب منعقدہ ۲۵ جون ۱۹۶۵ء کے موقع پر کی گئی۔

۲ ۔ احوال ایک تقریب کا، ۱۱۰، افسانہ نمبر ۱۹۶۸ء) ۱ - ۴۔

'نقوش' کی بیسویں سالگرہ کی تقریب منعقدہ ۱۱ مئی ۱۹۶۸ء۔

۳ ۔ اکبر حیدری کاشمیری: حرفے چند بطور معذرت' ۱۲۵ میر تقی میر نمبر (نسخۂ لاہور) (اکتوبر ۱۹۸۰ء) ۷ - ۸

مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیات میر (مع غیر مطبوعہ کلام)

۴ ۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۴۴ - ۲۴۵

۵ ۔ ایک تقریب، بہ سلسلہ نقوش، ۱۰۶، خاص نمبر، (اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۱ - ۸، یہ دراصل آٹھ اوراق ہیں۔

۶ ۔ بھٹو، ذوالفقار علی: پیغام (جشنِ نقوش کے موقع پر) ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۳۰

۷ ۔ خدا بخش، ملک: صدارتی خطبہ، ۱۰۶، خاص نمبر، (اکتوبر ۔ نومبر ۱۹۶۶ء) ۶

جشنِ نقوش کی تقریب منعقدہ ۲۵ جون ۱۹۶۵ء

کے موقع پر دیا گیا۔

۸۔ حفیظ جالندھری : اعتراف، ۱۲۹، عصری ادب نمبر
(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۸

۹۔ حفیظ جالندھری : تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴-
۲۵۔

جشنِ نقوش کے موقع پر کی گئی۔

۱۰۔ رسالہ نقوش کے متعلق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق
کی تقریر کا اقتباس، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۲،
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۲۸

تقریر ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

رسالہ نقوش کے متعلق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق
کی تقریر کا اقتباس، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳،
(جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۲۸

تقریر ۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء

۱۲۔ سالک، علم الدین : تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء)
۱۴ - ۱۷

آپ بیتی نمبر کی تقریب (جشنِ نقوش) کے موقع
پر کی گئی۔

۱۳۔ سجاد احمد جان : غالب کی یاد میں، ۱۱۳، غالب نمبر (حصہ
دوم) مع (نو دریافت، بیاض غالب بخط غالب)،
(اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۵ - ۸۔

۱۴۔ شخصیات نمبر کے بارے میں احباب کے تاثرات، ۴۹-
۵۰۔ منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۷۳ - ۳۸۱

ابتدائیہ محمد طفیل کی تحریر ہے۔ باقی ان کے
احباب کے خطوط پر مشتمل ہے۔

۱۵۔ شمس اللہ قیمتی : تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶

یہ تقریر جشنِ نقوش کے موقع پر کی گئی۔

۱۶ شہاب الدین، خواجہ : خطبۂ صدارت، ۱۱۰، افسانہ نمبر
(نومبر ۱۹۶۸ء) ۵ - ۷

خطوط نمبر کی تقریب میں پڑھا گیا،

۱۷۔ شیر علی خان، جنرل : خطبۂ صدارت، ۱۱۴،
(جولائی ۱۹۷۰ء) ۹ - ۱۰

بیاض غالب کا بھی اس میں ذکر ہے۔

۱۸۔ عادل رشید : تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲-
۲۴۔

یہ تقریر جشنِ نقوش کے موقع پر کی گئی۔

۱۹۔ علی احمد تالپور، میر : صدارتی خطبہ، ۱۲۹، عصری ادب
نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵ - ۷

۲۰۔ فن کاروں نے لکھا (احباب سے معذرت کے ساتھ)،
۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۵۷ - ۲۶۱،

لکھنے والے :۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی،
قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین، محی الدین زور،
خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، احتشام حسین،
ممتاز شیریں، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، حامد علی خان،
اثر لکھنوی، وحشت کلکتوی، شور علیگ، شاد عارفی،
محمود جالندھری، ہکر زولنسوی، تاجور سامری، جگن ناتھ
آزاد، شاعر لکھنوی، کرشن چندر، عزیز احمد، راجندر سنگھ
بیدی، خواجہ احمد عباس، قدرت اللہ شہاب، تسنیم
سلیم چھتاری، بلونت سنگھ، مہندر سنگھ، انور شوکت
صدیقی، عشرت رحمانی، محمود ہاشمی، زاہد قیصر، رضیہ سلطانہ۔

۲۱۔ فوزی الخلیل، تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷-۲۸

یہ تقریر جشنِ نقوش کے موقع پر کی گئی۔

۲۲ - محمد ایوب خاں، فیلڈ مارشل: پیغام (جشن نقوش کے موقع پر) ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۳۰

۲۳ - محمد خاں، کرنل: سیلیوٹ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۹ - ۲۰

۲۴ - محمد ضیاء الحق، جنرل: "ادبی معرکے نمبر" کی تقریب میں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۱ - ۴

۲۵ - محمد یسین وٹو: تقریر، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۳۱ - ۳۶

یہ تقریر آپ بیتی نمبر کی تقریب جشن 'نقوش' کے موقع پر کی گئی۔

۲۶ - مختار احمد صدیقی: تعارفی کلمات، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۱ - ۲

جشن "نقوش" کی تقریب منعقد ۲۵ جون ۱۹۶۵ء کے موقع پر کہے گئے۔

۲۷ - مسعود مفتی: بیسویں سالگرہ پر، ۱۱۰، افسانہ نمبر، (نومبر ۱۹۶۸ء) ۸ - ۱۰

۲۸ - نظر، قیوم: ابتدائی کلمات، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۵۰۷ - ۵۰۸

اشاریے (بشمول متعلقات)

۱ - احمد نواز ملک: اشاریہ رسالہ نقوش (مصنف وار) شمارہ ۱ تا ۱۰۸، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد ۳ (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۷ - ۶۱۱

صفحہ ۵۶۷ پر ایک وضاحتی نوٹ ہے کہ یہ اشاریہ صرف مضامین کی حد تک ہے، لیکن اس میں خطوط کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

۲ - جمیل احمد رضوی، سید: اشاریہ نقوش رسولؐ نمبر، جلد ۱ تا ۱۲، ۱۳۰، رسولؐ نمبر جلد ۱۲ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۴۹۳ - ۸۲۰ ۓ

یہ اشاریہ پانچ عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے — مقالہ نگاران، مقالات، موضوعات، مقامات اور کتب۔

۳ - 'نقوش' کا اشاعتی خاکہ، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۲۲ - ۷۲۵

۴ - نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۰۹ - ۱۲۴۵ ۓ

۵ - ادارہ: 'نقوش' میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ (۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک)، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳ - ۴

۶ - 'نقوش' میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۴۶ - ۱۲۴۷ ۓ

طلوع

طلوع

۱۹ ، ۲۰

نقوش کی ترتیب کا بار اب میرے ذمہ ہے۔ اس راہ میں جن جن ذمہ داریوں اور نزاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں ان سے آشنا بھی ہوں اور متاثر بھی۔ اسی لیے لمبے چوڑے دعوے کرنا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ اور پھر جب یہ احساس بھی دامن گیر ہو کہ اس سے قبل ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں تو میں اس کی اچھائیوں پر خوش ہونا اور اس کی کمزوریوں پر افسوس کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اس کی باگ ڈور ہمیشہ انسانی ہاتھوں میں رہی ہے۔ پھر جیتے جی فرشتہ بننے کو دل بھی تو نہیں چاہتا۔

احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور وقار عظیم نے اسے اپنی خداداد علمیت اور قابلیت کے بل پر زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مجھ میں علمیت اور قابلیت دونوں کا فقدان سہی لیکن میں پاکستان و ہند کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خلوص اور ان کے بھرپور تعاون پر اعتماد رکھتے ہوئے یہ بڑے بول لکھ رہا ہوں کہ ان شاء اللہ نقوش کے ادبی معیار کو کبھی کوئی ضعف نہیں پہنچے گا جس کا حسین اظہار زیرِ نظر شمارہ بھی ہے۔

اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ آج یہ مختلف نظریات اور مختلف گروہوں کی زد میں آ کر بے جان اور بے آبرو ہو رہا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہو گی کہ نقوش ایک مخصوص قسم کے دائرے کے اندر گھٹ گھٹ کر نہ جیئے بلکہ اس کی اڑان وسیع تر اور واضح ہو۔ اسے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کی تخلیقات پر بھی ناز ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اس حقیقت کو بھی نہ بھولے کہ عزیز احمد، ممتاز مفتی اور قرۃ العین کی نگارشات کو بھی اردو ادب میں ایک قابلِ فخر مقام حاصل ہے۔ اس لیے نقوش اردو کے ہر صاحبِ بصیرت ادیب و شاعر کو اپنے سینے سے لگائے گا۔ وقت خود کھرے کھوٹے کی پہچان بڑی آسانی سے کر لیتا ہے جن قلم کار کی تحریر میں خلوص اور حسن ہو گا، اسے اہلِ علم دل اور آنکھوں میں جگہ دے لیں گے اور جن کی تحریریں صرف ذہنی تعیش کی پرچھائیاں ہوں گی وہ خود بخود بے اثر ہو کر رہ جائیں گی اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بحیثیت "امین" کے خامکار ثابت نہیں ہوں گا۔

آج سے قبل جب بھی میں نے نقوش کا کوئی نمبر شائع کیا ہے تو میرا سر مسرت سے ذرا بلند سا ہو گیا — لیکن نتیجہ میں جب جیب پر ہاتھ رکھا تو خاصی ہلکی پائی …… اسی لئے خیال تھا کہ نقوش کا یہ "الوداعی نمبر" چھاپ کر چپ سادھ لوں لیکن اس خبر سے سبھی کو دکھ ہوا۔

ادبا و شعرا نے لکھا کہ اگر خدانخواستہ نقوش بھی بند ہو گیا تو پھر ہم کس کے لیے لکھیں گے؟

قارئین نے کہا کہ اگر ادب کا یہ روشن ستارہ بھی ڈوب گیا تو آسمانِ ادب پر کسی اور کا دو گھڑی بھی جھلملانا مشکل ہے۔

میں تے سبھی دوستوں کی باتیں سُنیں لیکن میری بات کوئی نہیں سُنے گا اور وہ یہ کہ — نقوش میرے علاوہ آپ کا بھی ہے۔ جتنی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں، اتنی آپ بھی تو محسوس کریں۔ تنہا میری کوششیں اسے کب تک سہارا دے سکیں گی۔ اس کے بناؤ سنگھار اور معیار کو برقرار رکھنے میں میں نے بہت کچھ صرف کیا ہے۔ اب تو آپ کے خونِ جگر اور مخلصانہ تعاون کی مزید ضرورت آپڑی ہے۔ خون کا مطالبہ میرا ادباً وشعراً سے ہے — وہ اپنے خونِ جگر سے لکھے ہوئے شہ پاروں سے نقوش کو برابر نوازتے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نقوش کی ہر سطر اور ہر لفظ میں جو خون رواں دواں تھا اس میں حسبِ ضرورت سُرخی نہیں رہی۔

قارئین چاہیں تو (مستقل خریدار بن کر) اس کی مالی حیثیت اتنی مضبوط بنا سکتے ہیں کہ اس میں کبھی ہلکا سا جھکاؤ بھی پیدا نہ ہو سکے اور اگر عین شباب کے عالم میں اس کی تر و تازہ اور پاک و صاف روح مرجھا کے رہ گئی تو کیا آپ بھی مستقبل کے قاری سے میری طرح شرمسار نہ ہوں گے؟

ہمارا ارادہ ہے کہ اب پھر نقوش کو باقاعدہ ہر ماہ شائع کیا جائے۔ ایسی صورت میں آپ کا پُرخلوص تعاون بڑا مضبوط سہارا بن سکتا ہے۔

محمد طفیل

۲۱ ، ۲۲
مئی ۱۹۵۲ء

ہمیں نقوش کے موجودہ شمارہ کی ادبی حیثیت کے متعلق تو کچھ بھی کہنا نہیں ہے، جو کچھ بھی آپ کی دیانتدارانہ رائے ہو، وہی وقیع ہے، وہی ہماری رائے ہے۔ ہم نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ نقوش ماہ بہ ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہُوا کرے گا لیکن تاخیر پہ تاخیر اس لیے ہوتی رہی کہ جو معیار ہمارے ذہن میں تھا اس کی تسکین نہ ہوتی تھی۔ ہمارے نزدیک تو نقوش کی اشاعت کا مقصد بھی کاروباری نہیں ہے بلکہ معیار اور صرف معیار ہے۔ ایسی صورت میں اپنے نظریات کی لاج رکھنے کے لیے خون کو پانی بھی بنانا پڑتا ہے اور ستم کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فنکار بھی اپنی اپنی اقتصادی اُلجھنوں میں ایسی بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔ ہم اور آپ ان کی تخلیقات کی دلآویزیوں پر واہ وا تو کر سکتے ہیں۔ لیکن کون ہے جو ان کے پیٹ اور ذہن کی مجبوریوں پر آہ کرتا ہو۔ اب آپ ہی فیصلہ کر لیں کہ کوئی کیسے لکھے اور کوئی کیسے چھاپے۔

آج قومی زبان (اُردو) کا مسئلہ پاکستان کے لئے بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ الجھا نہیں بلکہ الجھایا گیا ہے اب تو یہ مسئلہ زبان کے مسئلے سے بڑھ کر سیاست کا روپ دھار چکا ہے مصلحت آمیز سیاست دانوں سے کون کہے کہ یہ معاملہ بڑا نازک ہے اور اس نازک سے موڑ پر صرف تدبر کی ضرورت ہے اپنے جذبات کو مقصد پر قربان کر دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ لیڈرانِ کرام سے طے نہ ہوگا بلکہ اس مسئلے کو صرف زیرک ماہرینِ تعلیم اور ادبا ہی دلوں میں کشادگی اور وسعت پیدا کر کے سلجھا سکیں گے۔

آج کل پاکستان اور بھارت کے پبلشر، اپنے دوسرے بھائیوں کی کتابیں بلا روک ٹوک چھاپ رہے ہیں۔ یہ الزام کسی ایک ملک کے پبلشروں کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس دیدہ دلیری میں دونوں ملکوں کے (بعض) پبلشروں میں سے کوئی بھی اپنی پاکدامنی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ دونوں حکومتیں ایک مشترکہ قسم کا کاپی رائٹ قانون بنائیں (سب سے بڑا قانون تو اخلاقی قانون ہے

بشرطیکہ اسے محسوس کیا جا سکے) تاکہ مصنفین کے حقوق کی، پبلشروں کے حقوق کی، اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کی جا سکے۔

ہمارے وزیرِ مواصلات نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو قریب تر کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے وہ اپنے اندر بعض اوصاف کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ دوری کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ یکم اپریل سے پہلے کتب، اخبارات اور رسائل کی ترسیل میں کافی سہولتیں تھیں مثلاً پہلے کتابیں آٹھ آنے فی سیر کے حساب یہاں سے مشرقی پاکستان بھیجی جاتی تھیں۔ آج پانچ روپے فی سیر کے حساب سے جاتی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اگر دو روپے قیمت کی کتاب ہے تو اب اس پر ڈھائی روپے کے قریب محصول ڈاک صرف ہوتا ہے۔ یہی حال اخبارات اور رسائل کی دشواریوں کا ہے۔ اگر اس علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی رشتے کو یوں گراں کر کے ختم کر دیا گیا تو مشرقی پاکستان کے رہنے والے بھائی ہمارے قطعی قریب نہ ہوں گے بلکہ اور دور ہو جائیں گے۔

نقوش کے زیرِ نظر شمارہ میں محترم آثر لکھنوی نے جناب فراق گورکھپوری کی ایک نظم (امریکی بنجارہ نامہ) پر تبصرہ فرمایا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں ہر دو احباب سے معذرت کرنا ہے۔ آثر صاحب سے اس لئے کہ ہم نے ان کے بعض تیز تر فقروں کو قدرے معصوم بنا کر پیش کیا ہے۔ اور فراق صاحب سے اس لیے کہ ان کی شاعری محض "امریکی بنجارہ نامہ" ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری نام ہے ان غزلوں، نظموں اور رباعیات کا، جن کی یاد سے آج بھی ذہن جھوم جھوم جاتے ہیں۔

محترمہ ممتاز شیریں صاحبہ نے اس شمارہ کے لئے چند ایک بڑی کام کی چیزیں عنایت فرمائیں، جن کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ غلام عباس کا افسانہ، سلام مچھلی شہری کی نظم اور سلیم احمد، شان الحق حقی، تابش دہلوی، انجم اعظمی کی غزلیں آپ ہی کی عنایات کا نتیجہ ہیں۔

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آئندہ شمارہ افسانہ نمبر ہو۔ اگر ہمیں اس نمبر کی اہمیت کے پیشِ نظر کوئی دشواری پیش آئی اور یہ خاطر خواہ مرتب نہ ہو سکا تو ہم افسانہ نمبر سے قبل مختلف موضوعات پر ایک اور پرچہ پیش کر دیں گے۔

محمد طفیل

۲۳، ۲۴

جولائی ۱۹۵۲ء

یوں تو نقوش ہمیشہ اردو دان طبقہ کا محبوب رسالہ رہا ہے لیکن قارئین نے جس گرمجوشی سے اس کے سابقہ دو شماروں کا استقبال کیا وہ ہمارے لئے باعثِ تسکین ہی نہیں، باعثِ عزت بھی ہے لیکن باعثِ افتخار نہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ ہمارے نزدیک اسے ابھی وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کی آرزو ہمارے دلوں میں پل رہی ہے۔ ویسے تو آپ کی دعائیں شاملِ حال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا شمارہ (۱۹، ۲۰) چھپتے ہی نایاب ہو گیا تھا۔ بعض دکانداروں نے اس کی مقبولیت سے غلط قسم کا فائدہ بھی اٹھایا اور اسے اصل سے زائد قیمت پر فروخت کیا۔ ممکن ہے ہمیں سُنی سُنائی باتوں پر یقین نہ آتا لیکن جو بات خود اپنے اوپر بھی بیت جائے اس میں تو شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ کراچی میں مجھی کو صرف ایک پرچہ کی ضرورت آن پڑی۔ متعدد دکانوں پر دیکھا بھالا۔ لیکن معلوم یہی ہوتا رہا ہے کہ صاحب ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ بڑی کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کے ہاں نقوش پایا گیا ہے۔ انہیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ اور عرض کیا کہ حضرت نقوش چاہئے۔ میرے اس استفسار پر پہلے تو وہ دیر تک خاموش رہے۔ پھر اطمینان سے، مگر سرگوشی کے انداز میں بولے "میرے پاس نقوش کی صرف ایک کاپی ہے اور وہ کسی قدر دان کو دینا چاہتا ہوں" بہ ہزار دقت انہیں یقین دلایا

کہ میں بھی اس کا قدر دان بننے کی کوشش کروں گا۔ تو وہ کچھ سوچنے پر آمادہ ہوئے اور پھر لمحہ بھر بعد میرے کانوں میں صرف اتنی آواز سرسرائی — پانچ روپے — میں نے اس وقت تو ان سے کچھ نہ کہا لیکن اب آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں اس ”ادب پروری“ کے غلاف ضرور کچھ نہ کچھ کہتا اگر میرے اندر ہی سے ایک جذبہ اٹھ کر مجھے یہ تھپکی نہ دے دیتا کہ ادبی خدمت کی داد اس عنوان سے بھی ملتی ہے۔

دوسرے شمارے (۲۱، ۲۲) کو تو اس سے سوا مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ایک ہی ہفتہ میں ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چھپا کر ختم ہو چکا ہے اور اب بعض دکاندار ”قدر دان“ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اخبارات اور رسائل نے بڑے اچھے اچھے تبصرے کئے۔ قارئین نے بیشمار تعریفی خطوط لکھے۔ اب ہم حیران ہیں کہ ان سب کی محبت اور خلوص کا جواب کس طرح سے دیں۔ اگر ہم اس سلسلے میں صرف اتنا کہہ دیں کہ ہم اپنے تمام کرمفرماؤں کے شکر گذار ہیں تو بھی کیا بات ہوئی۔ ارادہ ہے کہ چپ سادھ لیں۔ اگر قلم اور زبان خاموش بھی رہیں تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے کرمفرماؤں کی عنایتوں کا کچھ بھی جواب دے سکے۔

اعلان کے مطابق اس شمارے کو افسانہ نمبر ہونا چاہیے تھا۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اصل میں دو ماہ کی مدت افسانہ نمبر کی ترتیب اور آرائش کے لیے قطعی ناکافی ثابت ہوئی۔ جوں جوں ہمارے قدم اس منزل کی طرف بڑھتے اور لپکتے گئے معلوم یہی ہوا ہنوز دلی دور است۔ ہم نے اپنی رفتار اور تیز کر دی ہے۔ نہیں معلوم یہ ادبی کارواں کہاں جا کر دم لے گا۔ اگر خدانخواستہ منزل پر نہ بھی پہنچ سکا تو منزل کی نشان دہی تو کر ہی دے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ نقوش کا یہ نمبر افسانوی ادب میں صرف خانہ پری کی حیثیت نہ رکھے۔ بلکہ اردو افسانہ کا معیار و میزان ہو۔ تاکہ ہم اور آپ کہہ سکیں۔ یہ ہے اردو افسانہ — اور اس کے ساتھ جب یہی ارادہ ہو کہ دوسری زبانوں کے بعض اہم افسانوں کے تراجم بھی پیش کریں تو یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی بن پڑا وہ آئندہ شمارہ کی صورت میں آپ کے سامنے ہوگا تھوڑی سی دشواری اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ ہمیں بیک وقت افسانہ نمبر اور موجودہ شمارہ کے لئے کام کرنا پڑا۔ پھر بھی خیال ہے کہ ہم دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر بھی گرتے پڑتے پار اتر ہی جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

چلتے چلتے ایک لطیفہ سن لیجئے۔ چند دن ہوئے ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ ”نقوش تو پھر ترقی پسند بن گیا“ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایتاً کہا ”آپ نے تو پرچے کو ایکدم رجعت پسند بنا دیا“۔ — یا اللہ یہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کیا بلا ہے اور کیوں ہم ایک دوسرے کی باتیں سننے کے لیے دلوں میں کشادگی پیدا نہیں کرتے۔

محمد طفیل

۲۵، ۲۶

ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء

افسانہ نمبر حاضر ہے، اب آپ کی رائے کا انتظار ہے۔
آج کل افسانے بہت کم لکھے جا رہے ہیں، اسی لیے ہم نے افسانہ نمبر پیش کرنا چاہا۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس نمبر کی ترتیب کسی اصول اور ضابطہ کے ماتحت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمیں بعض کہانیاں بہت دیر سے ملیں۔ نقوش کی اس بزم میں ترقی پسند ”غیر ترقی پسند“ نئے اور پرانے سبھی افسانہ نگاروں کو ساتھ ساتھ لا بٹھایا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ بھی اس شمارے کی ایک خصوصیت ہے۔

حصۂ تراجم پر بھی خاص طور سے توجہ کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم نے ہر زبان کی بہترین کہانی پیش کر دی۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ہم نے معیاری کہانیاں پیش کی ہیں۔

اس شمارے میں بعض نئے لکھنے والوں کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ مثلاً ضمیر الدین احمد، ابو الخطیب، خلیل احمد اور ابن الحسن۔

حصۂ تصاویر میں ہم نے اب کے خواتین افسانہ نگاروں کی تصویروں کو نمایاں جگہ دی ہے۔ اس سے قبل نقوش کے آزادی نمبر (۱۹۴۸ء) میں اسی اہتمام کے ساتھ نامور ادباء و شعراء کی تصویریں شائع کی جا چکی ہیں۔

چند ایک پیاری سی منظوم کہانیوں کو (بادلِ نخواستہ) روک لینا پڑا۔ اس لئے کہ جن جن دوستوں سے اس سلسلے میں درخواست کی تھی۔ اُن سب کی نگارشات بروقت نہ مل سکیں۔ گلہ کسی سے نہیں، البتہ ان معزز شعراء سے معذرت ضروری ہے۔ جن کی کہانیاں بروقت مل گئی تھیں۔ اب یہی شاہپارے آئندہ شمارے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

اِس پرچے کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ارادہ تھا کہ اتنے ہی صفحات کی قیمت تین روپے رکھیں گے لیکن کاغذ ایک دم ڈیوڑھی قیمت پر آنے کے علاوہ نایاب ہو گیا۔ بس غنیمت جانئے کہ موجودہ حالات میں بھی اتنا ضخیم نمبر چھپ گیا۔

محمد طفیل

---

۲۷ ، ۲۸

ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء

اب کے اِس عنوان کے ماتحت، ہم نے چند مقتدر اہلِ قلم کو بھی شریک کر لیا ہے۔ تاکہ یہ خشک سا موضوع بھی دلچسپ بن جائے۔ افسانہ نمبر پیش کیا، تو یہ دھڑکا تھا، کہ نہ جانے چار روپے کا پرچہ بکے گا بھی یا نہیں، جنہوں نے سنا کہ 'نقوش' کی قیمت چار روپے ہو گی۔ وہ مُنہ میں انگلی دبا لیتے تھے اور کہتے تھے۔ اتنی زیادہ! اِدھر یہ دھن سوار تھی کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ مکمل بنے۔ خواہ صفحات کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم اپنی محنت اور اِس نمبر کے معیار سے مطمئن تھے۔ معیار سے اطمینان اس معنی میں نہیں، کہ اس میں کوئی کسر باقی ہی نہ رہی تھی۔ بلکہ اس معنی میں کہ آج جبکہ اردو افسانہ روبہ زوال ہے۔ ایسے سے ہمارا یہ نمبر، اردو افسانہ سے قطعی مایوس ہونے والوں کے لیے ڈھارس کا موجب بنے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہر طرف سے واہ وا ہوئی۔ بکا بھی خوب! کچھ دوست خفا بھی ہیں، انکی خفگی اس نمبر کی تقویت ہے۔ دوست اگر خفا بھی ہوں، تو انکی خفگی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ دوست جو ہوئے۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اس نمبر کی کامیابی کا دار و مدار صرف ہماری کوششوں پر نہیں، بلکہ اُن تمام ادیبوں کے تعاون پر ہے، جنہوں نے ہماری درخواست کبھی بھی رد نہیں کی۔ بلکہ مشورے دیئے، عملاً مدد کی۔ ورنہ ہم تنہا کیا کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو محترم ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے ادیبوں کے اِس بھرپور تعاون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لیئے

ایک گرامی نامہ میں فرمایا :-

انجمن ترقی اُردو
مورخہ ۲۱، اکتوبر ۵۲ء

مکرم و کرم فرما! تسلیم!

آپ کا خط کراچی سے ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ آپ کی شکایت بجا ہے۔ لیکن جب آپ کے نقوش کے لیے پاک اور بھارت کے بہترین نقاش اور ادیب حاضر ہیں تو پھر آپ کو شکایت کا کیا موقع؟ آپ کو ایسے اچھے لکھنے وا گئے ہیں (یہ حسنِ اتفاق ہے یا آپ کی سعی) کہ میں اُن کے مقابلے میں کوئی چیز ایسی پیش نہیں کر سکتا جو آپ کی پسند پھر میں جیونٹیوں بھرا کباب ہوں، کام کا بار زیادہ تر مجھ پر آ پڑا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی ایسا مضمون لکھنا جو کے قابل ہو ممکن نہیں۔ مجھے انجمن کے رسالوں ہی کے لیے لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آ پر عنایت فرماتے ہیں اور مجھ سے حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اس زمانے میں اتنا ضخیم اور اتنا اچھا رسا آب و تاب کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

یہ رسالہ جو مجھے آپ نے بھیجا ہے فسانہ نمبر ہے۔ اگر گزشتہ نمبر ممکن ہو تو بھیج دیجیے جس میں علمی و ادبی مضامین ہیں تاکہ میں اس پہ تبصرہ کر دیا جائے۔

خیر طلب

عبدالحق

---

۲۹ - ۳۰

فروری، مارچ ۱۹۵۳ء

رسالہ نکالنا عام سی بات ہے۔ لیکن اچھا رسالہ شائع کرنا عام سی بات نہیں ہے۔ اب تک اَن گنت رسالے بند ہوئے۔ اُن میں سے اکثر رسائل کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ بعض ایسے بھی تھے جن کی اہمیت اور افادیت کا آج بھی پڑتا ہے۔ نقوش بھی اُن بے شمار شائع ہونے والے رسالوں میں سے ایک رسالہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل کا نقاد ا اس کے نام اور کام کو یاد بھی رکھ سکے گا یا نہیں۔ بہرحال اپنی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ اُردو رسائل کی تاریخ میں اگر نام سرِ فہرست نہیں آ سکتا۔ تو پھر بھی اس کا اپنا ایک الگ مقام ضرور ہو۔ اسی جذبے کے سہارے اب تک چل رہے ہیں۔ ی رہا تو کبھی آرزو بھی بر آئے گی۔

آج نقوش اپنے پانچویں پڑاؤ پہ آ پہنچا۔ اس راہ کی پوری تفصیل دہرائی جائے تو آپ بلا وجہ بے کیف ہو جائیں گے۔ مناسب یہی ہے کہ دو لفظوں میں بات ہو جائے۔

کبھی برادرم احمد ندیم قاسمی ریڈیو پاکستان پشاور میں بھی ملازم تھے۔ میں لاہور میں تھا۔ خط کے ذریعے طے یہ پایا کہ ایک خالصتاً علمی و ادبی پرچے کی بسم اللہ کی جائے باہمی مشورے سے ادارت کے لیے محترمہ ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کا نام تجویز ہوا۔ ان دونوں بہن بھائیوں نے توقع سے زیادہ محنت کی یہی وجہ تھی کہ چند ہی دنوں میں نقوش پڑھے لکھوں کا محبوب پرچہ بن گیا اپنی حکومت نے بھی تیسرے ہی شمارہ پر داد دی۔ اور اس خالص علمی و ادبی جریدہ کی اشاعت قانوناً چھ ماہ کے لیے روک دی۔ اس سانحہ پر مدیروں کا حال خدا جانے۔ مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ شدید بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا مرتے مرتے بچا ——— جب کسی پرچے کو بغیر کسی جرم کے سزا دی جاتی ہے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے۔ جو نقوش کا ہوا۔ پہلے نقوش کے مدیر پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ پھر تو وہ یوں بے دھڑک چلے کہ جیسے اب تک کی گم شدہ منزل کا سراغ خود حکومت نے انہیں دے دیا ہو ——— یہ تقاضا قدرتی تھا خطا کس کی تھی ——— یہ آپ جانیں!

اس کے کچھ عرصہ بعد میرے اور مدیران نقوش کے درمیان، ادبی نظریات کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا۔ میں نے دوستانہ انداز میں ان کی خدمت میں چند تجویزیں پیش کیں، جو قبول نہ ہوئیں۔ یوں میری نالائقی سے یا معاملہ فہمی سے نقوش ان لائق مدیروں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

عین منجدھار میں برادرِ محترم سید وقار عظیم مدد کو پہنچے۔ انہوں نے نقوش کو اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود سنبھالا دیا۔ نقوش پھر ایک ڈھرے پہ چل نکلا تھا کہ یونیورسٹی کی سیاست آڑے آئی اور خود وقار صاحب نے مناسب نہ سمجھا کہ پہلے سال کی طرح اب کے پھر یونیورسٹی سے نقوش کی ادارت کے لیے اجازت حاصل کی جائے۔

اب کے تو میں ایسے اکیلا رہ گیا کہ کوئی یار و مددگار نہ ملا۔ اپنی اس بیچارگی پر راتوں کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس تصویر میں احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور سید وقار عظیم نے پیارے پیارے رنگ بھرے ہوں۔ اور جب وہ تصویر بھی حسین سے حسین تر بن گئی ہو تو پھر کسی وجہ سے اُس تصویر کے حسن و جمال میں ذرا سا بھی فرق آنے پائے یہی سبب ہے کہ میں نے جھجکتے جھجکتے اسی پیاری سی تصویر میں ہلکے ہلکے سے رنگ بھر دکھائے۔ اپنی طرف سے، اسے اب تک اپنے ہاتھ اور اپنے ذہن کی لغزش سے بچا رہا ہوں۔ پھر بھی آپ ہی بتائیں کہ وہ تصویر جسے ان تین نامور فن کاروں نے ایک مثال کی صورت بخش دی تھی کہیں خراب تو نہیں ہو گئی۔

محمد طفیل

---

۳۱ - ۳۲
مئی، جون ۱۹۵۳ء

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا:۔

مکرمی محمد نقوش صاحب سلمہٗ

آپ نے مجھے نقوش کا آخری نمبر عنایت فرمایا تھا میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اور ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اتنا بڑا اتنا ضخیم اور جسیم "رسالہ" کیا پورا توپ خانہ ہے۔ پھر مختلف اور متنوع مضامین سے بھرپور لکھنے والوں میں ایک سے ایک بڑھیا۔

باوجود اِن تمام خوبیوں کے مجھے کبھی پورا پڑھنا نصیب نہ ہُوا۔ جب باوجود شوق کے پورا نہیں پڑھ سکتا تو حیرت ہے کہ آپ اتنے سارے اور اتنے اچھے مضمون کیونکر لکھواتے اور انھیں مرتب کرتے اور چھاپتے اور شائع کرتے ہیں۔ اور اِس زمانے میں جبکہ ہر شے کی گرانی کے ساتھ کاغذ بھی گراں ہوگیا ہے!

آپ کو اپنے صاحبزادہ نقوش سلمہٗ کی پانچویں سالگرہ مبارک ہو۔ یہ ایسا خوب صورت، ہونہار، موٹا تازہ گبدوسا ہے کہ دیکھے سے نظر لگتی ہے۔ خدا اس کو نظر بد سے اور مجھے آپ کے تقاضوں سے بچائے۔

خیر طلب عبدالحق

نیاز فتحپوری صاحب نے لکھا:۔

مکرمی! تازہ نقوش مل گیا اور تازہ باسی پر کیا موقوف ہے۔ نقوش جب بھی ملتا ہے۔ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ آپ اتنا اچھا، اتنا ضخیم، اس قدر خوب صورت و دلکش پرچہ نکالنے میں کیوں کر کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اگر اس کے خریدار اتنے ہیں کہ تمام مصارف پورے ہوجاتے ہیں تو یہ یقیناً نقوش کا معجزہ ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہے صرف آپ کی باطنی قوت و ہمت کا تو آپ کے ولی ہونے میں شک نہیں اور اگر آپ محض ایثار سے کام لے کر یہ سب کچھ کررہے ہیں تو پھر آپ اپنے وقت کے حاتم بھی ہیں اور غالباً دولت کے لحاظ سے قارون بھی! پھر ایسے پرچے کے متعلق جو بجائے خود ایک معجزہ ہو اور جس کے نکالنے والے قطب ابدال کی حیثیت رکھتے ہوں۔ آپ میری رائے کیا پوچھتے ہیں۔

این قدر آئینہ نتواں شد کہ حیرانیم ما!

نیاز

---

۳۳ - ۳۴

اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء

گذشتہ دو شماروں سے 'ایک بحث' اسلامی ادب کے بارے میں چل رہی ہے۔ اس کی ابتدا فراقؔ گورکھپوری صاحب نے کی۔ جواب میں ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کا مقالہ شائع ہوا۔ اب کے آفتاب احمد صاحب کا مضمون شریکِ اشاعت ہے اور ایک خط فراقؔ صاحب کا بھی۔

یہ مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اسی لئے ادارۂ نقوش نے اس پر سنجیدگی سے اظہار رائے کی دعوت دی۔ تاکہ یہ بحث نتیجہ خیز ثابت ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بحث کے خد و خال زیرِ نظر شمارہ سے زیادہ واضح ہوں گے۔

اس ضمن میں ادارۂ نقوش' اپنی رائے درمیان میں نہ لڑھکائے گا۔ بلکہ کوشش یہ ہوگی کہ مختلف نظریات کو من و عن پیش کر دیا جائے۔ تاکہ بات کسی نتیجے پر پہنچے۔ جن نظریات میں خلوص اور صداقت ہوتی ہے۔ وہ خود بخود قبول کرلئے جاتے ہیں۔ ورنہ کوئی فیصلہ کسی پر ٹھونسا نہیں جاسکتا۔

ہم نے پچھلے نمبر سے شخصیات پر ایک نیا سیکشن قائم کیا ہے۔ جسے پسند کیا گیا۔ بلکہ اصرار ہوا کہ اس سلسلے کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ ایک تو اس نوع کی چیزیں اُردو ادب میں بہت کم ہیں۔ دوسرے ہر ایک کو یہ ٹوہ ہوتی ہے کہ ہم فن کے ساتھ ساتھ فن کار کو بھی پڑھیں۔ یہ کام جتنا اہم ہے۔ آتنا ہی نازک بھی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس نازک سے کام کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں۔ اس سلسلے میں جتنی چیزیں شائع کی جائیں گی۔ اُن میں توازن اور خلوص شرط ہوگا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ سیکشن بھاری بھرکم قسم کا ہو۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ہلکا پھلکا بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہ خوبی یا خرابی شعوری ہے۔

آئندہ شمارے میں ہم مولانا حالیؔ کا ایک غیر مطبوعہ مضمون پیش کرنے کا شرف حاصل کریں گے اور اس کے ساتھ قاضی عبدالودود کا غالب کے متعلق ایک نیا سلسلہ، غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ الاماں والحفیظ! پھر بھی اگر کوئی بات نئے ڈھنگ سے کہی گئی ہو تو اس کی ضرورت آج بھی ہے اور کل بھی۔

ادبِ عالیہ کے نام سے نقوش کا انتخاب ہو رہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ پچھلے پانچ برسوں میں جو جو نمائندہ چیزیں چھپی ہیں۔ وہ سب یکجا ہو جائیں۔ کہنے کو تو یہ ذرا سی بات ہے لیکن یہ ذرا سی بات جب عمل کی صورت میں سامنے آئی۔ تو معلوم ہوا ایورسٹ سر کرنی ہوگی۔ بہرحال اس مشکل کو آسان بنائیں گے اور جلد ہی ایک خوبصورت کتاب، جو صورت و معنی کے اعتبار سے بے مثال ہو، ادبِ عالیہ کے نام سے پیش کر دیں گے۔

جب انڈیا میں اُردو پر وار ہوتا ہے تو پاکستان کا بچہ بچہ چیخ اٹھتا ہے کہ ہائے ظلم ہوا۔ پاکستان میں اُردو پر جو بیت رہی ہے وہ بات شاید اس قابل بھی نہیں ہوتی کہ اس پر افسوس ہی کر لیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں اُردو کا جو حشر ہوا۔ وہ سب کے سامنے ہے۔ سید سلیمان ندوی ایسے عالم کو اردو کی حمایت ہی کے سلسلے میں تحریری معافی مانگنی پڑی۔ مرکز اسے پاکستان کی واحد قومی زبان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پنجاب میں میٹرک اور میٹرک کے بعد ذریعہ تعلیم اُردو کے بجائے انگریزی ہوگا۔ سندھ اور سرحد کی بات جانے دیجئے جب اس نوع کا مسئلہ اُن کے سامنے آیا تو وہ پنجاب سے بھی دو ہاتھ آگے ہوں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر علاقائی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہئے لیکن پاکستان کی سرکاری زبان ایک ہو۔ اور وہ اُردو ہو۔ یہی لیل و نہار رہے تو پاکستان کے بجائے انڈیا میں اُردو کا مستقبل زیادہ درخشاں ہوگا۔

سرورق پر جگرؔ صاحب کے اسکیچ کے لیے ہم پاکستان کے مشہور آرٹسٹ انور کے ممنون ہیں۔ اس انداز کے خطوط سے تصویر میں زندگی بھرنے کے لیے کن کن منزلوں سے گذر کر مسیحائی کی نوبت آتی ہے۔ یہ کچھ اہلِ فن ہی جانتے ہوں گے۔

محمد طفیل

---

۳۵ - ۳۶

اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء

ہماری کوشش تھی کہ ہم آپ کے سامنے، اب افسانہ نمبر ہی پیش کرتے لیکن کچھ اس کام کے پھیلاؤ اور کچھ افسانہ نگاروں کی بے توجہی نے ہمارے ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ اب یہ وعدہ آئندہ شمارہ کے لئے سہی!

اس شمارہ میں جوشؔ صاحب کی ایک نظم "شکستِ زنداں" پیش کی جا رہی ہے! اچھا ہوا کہ اس پر جوشؔ صاحب نے نوٹ لکھ کر، (ترقی پسند دوستوں سے) اپنی اور ہماری پوزیشن صاف کردی۔ ورنہ غلط فہمیوں کا احتمال تھا۔

ارادہ تھا کہ اب کے اسلامی ادب کی بحث ختم کر کے، کسی اور اہم موضوع کو چھیڑا جاتا۔ لیکن افسوس کہ ہمیں وہ تمام مضامین موصول نہ ہوئے۔ جن کی روشنی میں یہ بحث کسی نتیجے تک پہنچ پاتی — اب یہ مسئلہ افسانہ نمبر کے بعد والے شمارہ میں سلجھانے کی کوشش کریں گے۔

پچھلے دنوں لاہور ہی سے یہ آواز سننے میں آئی کہ اردو کراچی کے مہاجروں کی زبان ہے۔ اس لئے یہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی — اردو کو پنجاب نے پالا پوسا ہے۔ اس لیے اردو پنجاب کی زبان ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پنجابی، بلکہ ہمیں اردو سے اس لیے بھی زیادہ محبت ہے کہ اس میں پاکستان کی قومی زبان بننے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں ہیں۔

آج کل کی تنقید نے بڑی عجیب صورت اختیار کر لی ہے کہ ہر پارٹی، اپنی پارٹی کو۔ ہر رسالہ، اپنے مضمون نگار کو اور ہر مضمون نگار، اپنے دوستوں کو سراہ رہا ہے۔ اگر یہ صورت برقرار رہی تو اردو ادب کو بڑا نقصان پہنچے گا۔

پچھلے دنوں انجمن ادبی رسائل (پاکستان) کا قیام عمل میں آیا ہے۔ تاکہ مشترکہ جدوجہد سے تمام ادبی رسائل زندہ رہ سکیں۔ خدا کرے یہ انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہو۔

پاکستان بھر میں اچھی کوالٹی کا کاغذ قطعی نایاب ہے۔ یہی سبب ہے کہ نقوش کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں فرق آ گیا ہے۔ ورنہ ہم اس کی ظاہری آراستگی سے غافل نہیں ہیں۔

ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ افسانہ نمبر کی صورت میں جو کچھ ہم پیش کرنے والے ہیں وہ پہلے افسانہ نمبر سے وقیع ہوگا۔

محمد طفیل

---

۳۷ - ۳۸

جنوری ۱۹۵۴ء

یوں تو پورا ادب ہی انحطاط پذیر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ زوال جس صنفِ ادب پر آیا، وہ افسانہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے افسانوی ادب پر نظر دوڑائیے۔ تو آپ کو آج کا افسانوی ادب بڑا بے جان اور بے روح نظر آئے گا۔ گو لکھنے والے آج بھی وہی ہیں لیکن اُن سب کے قلم کچھ تھکے تھکے سے ہیں۔ بیشتر لکھنے والوں نے ماحول سے سمجھوتہ کر کے لکھنا ہی ترک کر دیا ہے ایسے ادب کُش ماحول میں ہمارا یہ نمبر ایک معجزہ ہی تو ہے۔ معجزے کے لفظ سے ہم پر تعلّی کا الزام نہ دھریئے گا، جب کہ ہم آج بھی یہ سمجھتے ہوں کہ "ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں"۔

بہت سے دوستوں کے افسانے روکنے اور تراجم کے حصے کو بالکل ہی حذف کر دینے کے بعد بھی اس کی ضخامت کا یہ حال ہے۔ اگر ملکی حالات سازگار ہوتے، تو ہم آپ کی خدمت میں اس سے مکمل پرچہ پیش کرتے۔ اب بھی اگر یہ شمارہ اپنے جلو میں کچھ رنگا رنگیاں سمیٹے ہوئے ہے، تو اسے ہماری شب بیداریوں کی ایک داستان سمجھئے۔ وہ داستان جو آج بھی ہمارے لئے تعبیر طلب ہے۔

سنا ہے کہ آج صداقتوں اور اچھائیوں کے اظہار کے لئے بھی ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی کان تک نہیں دھرتا۔ اب کوئی کان دھرے یا نہ دھرے، ہم سے تو ڈھنڈورا نہیں پٹتا — اس نمبر میں افسانوں اور خاکوں کے علاوہ ایک اور اہم چیز بھی ہے۔

میری مراد اردو افسانہ کے متعلق سمپوزیم سے ہے۔ اسے افسانوی ادب کی تاریخ کہہ لیجئے تو بھی بات غلط نہ پڑے گی۔ اس میں پورے افسانوی ادب کے علاوہ افسانہ نگاروں تک کا تجزیہ موجود اور پھر دلچسپ اتنی کہ افسانوں سے زیادہ جی لگے۔

اب ایک جملہ معترضہ بھی، کہ ہم نے نقوش کی اتنی زیادہ قیمت کیوں رکھی۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم نے اب تک نقوش کے عشق میں جو جو مالی صدمے اٹھائے، اس کی میزان میں اب تک توازن پیدا نہ کر سکے دوسرے کاغذ کی نایابی بھی سدِ راہ —— اس پر بھی آپ ہماری طرف سے قیمت کی زیادتی کی وجہ سے بدگمان ہوں تو ہمیں دکھ ہوگا۔

لیجئے میرا وعدہ پورا ہوا۔ وہ یہ کہ زیر نظر شمارہ ہمارے سابقہ افسانہ نمبر سے کسی طرح دبتو نہیں رہا۔ اور میری آپ سے سرخروئی، اس نمبر میں حصہ لینے والے تمام دوستوں کی بدولت ہے۔

محمد طفیل

---

۳۹ - ۴۰

مارچ ۱۹۵۴ء

ہم نے افسانہ نمبر پیش کیا۔ آپ نے اسے پسند کیا۔ اس طرح ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ البتہ سمپوزیم پر خوب واہ واہ اور ساتھ ہی خوب لے دے ہوئی۔ کچھ احباب نے اس نئی چیز کو اتنا پسند کیا کہ سرشار ہو گئے۔ بعض دوست ایسے بھی نکلے کہ خفا ہو گئے۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ چند دوستوں کی گفتگو کو قلمبند کر کے پیش کر دیا گیا تھا —— کیا کسی ادبی مسئلے پر سب کے سب لکھنے والوں کا متفق ہونا ضروری ہے؟ —— خدا کرے کہ وہ دن نہ آئے جب ہم ادبی تخلیقات پر سب کے سب متفق الرائے ہونے لگیں۔ غلط اور صحیح کی جستجو ہی سے تو ادب زندہ ہے اور رہے گا۔

اس مسئلے پر یوں بھی سوچئے کہ ایسی تحریریں کہاں سے آئیں جن پر تمام حضرات کو کلی اتفاق ہو۔ اگر اس سے پہلے ادب میں ایسے فیصلے ہوئے ہوں تو اس سے ہمیں مطلع فرمایا جائے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ ہمیشہ لکھنے والوں میں ٹھنی رہی۔ ایک دور میں ایک لکھنے والا دوسرے لکھنے والوں کو صلواتیں ہی سناتے سدھارا۔ سودا اسی کے سہارے جیئے۔ غالب اور ذوق میں یہی ہمعصری عصبیت بنی رہی۔ محمد حسین آزاد نے مومن تک کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ معرکۂ چکبست و شرر سب کے سامنے کی بات ہے۔ برخلاف اس کے ہم نے جو سمپوزیم پیش کیا تھا۔ وہ ایسی دھاندلی سے یکسر پاک تھا۔ چلیے یہ بھی مانا کہ وہ رائے سمپوزیم میں حصہ لینے والوں کے غلط مطالعے کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس "غلط رائے" میں بھی جانبداری کی بجائے خلوص کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بعض افسانہ نگاروں کی موجودگی میں ان کی فنی خامیوں کی طرف اشارے کئے گئے۔ اور کئی ایک کے فن کو روبرو نہ ہونے کے باوجود سراہا گیا۔

ہم اس کا کئی بار اظہار کر چکے ہیں کہ ہم ادب میں جانبداری کو ایک ناقابلِ معافی جرم تصور کرتے ہیں۔ اسی مقصد کو لے کر ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور بڑھیں گے۔ ہماری سوچی ہوئی راہیں غلط ہو سکتی ہیں۔ ہمارے بعض فیصلے غلط ہو سکتے ہیں۔ لیکن ادب کی ترویج و ترقی کے باب میں ہماری جدوجہد بے داغ ہونے کے علاوہ چڑھتے سورج کی دلیل ہے۔ اس پر بھی شکوے ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو   یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اب کے مضامین کا سیکشن اسلامی ادب کی بحث کے لیے مختص ہے۔ اس بحث میں ہر نقطۂ نظر کے لکھنے والوں کو دعوتِ فکر دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس بحث کے مندرجات سے اختلاف بھی ہوگا اور اتفاق بھی، قارئین کرام پر کوئی فیصلہ ٹھونسنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہے اور ہونا چاہیئے کہ ہم کسی مسئلے پر موافق اور مخالف آرا کو اکٹھا کر دیں۔ نہ جانے ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں بہرحال اس بحث کو ختم سمجھئے اور آئندہ شمارہ کے لئے ایک نوید سنئے۔ وہ یہ کہ ہمارا آئندہ شمارہ "غزل نمبر" ہوگا۔ اس میں ولی سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام نمایاں غزل گو شعراء کا انتخاب شامل ہوگا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ تمام شعراء کی ایسی نمائندہ غزلوں کو پیش کیا جائے، جن میں ان کا اسلوب اور ان کے فن کی تمام لطافتوں کو برقرار رکھا جا سکے۔ شاید اس طرح ہمارا یہ کام ایک یادگار بن کر اہلِ علم حضرات کے دلوں میں جگہ پا سکے۔

محمد طفیل

۴۱ - ۴۲

مئی جون ۱۹۵۴ء

شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ، اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کے انتخاب سے شعر بہ شعر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتحپوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بہ خلوصِ تمام ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں گے۔ یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومن غالب سے بڑا شاعر تھا یا غالب مومن سے۔ کلیم الدین احمد نے تو اس صنفِ سخن ہی کو نیم وحشی قرار دے دیا۔ ہم ایسے تمام جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو نقادوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ ان میں سے بیشتر لکیر کے فقیر بننے میں پوری سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہوا کہ جو بعض اچھا کہنے والے مر گئے تو بس مر ہی گئے۔ حالانکہ ژرف نگاہ نقاد کے پاس مسیحائی کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ اگر چاہے تو مرے ہوئے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے۔ ہم میں سے بعضوں کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ یہ غزل ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

ظفر کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک اُمّی شاعر حسامی کی ہے۔ ہم میر و غالب کو جانتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ بعض شاعر ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں ؎

؎ جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے (آصف)

؎ میں نے آنکھوں سے لے لیا اُس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا (میر مستحسن خلیق)

؎ آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گُل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
(میر امانی اسد)

اس نمبر میں جتنے بڑے بڑے شعرا ہیں۔ ان کی غزلوں پر بیشک جھوم جھوم جائیے لیکن ان شعرا کو ضرور پڑھیے جن کی ایک ایک یا دو دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ افسوس کہ اتنے مختصر وقت میں ہمیں ایسے شعرا کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ہم اپنی تمام تر توجہ اس حصہ پر صرف کر دیتے۔ ضرورت ہے کہ کوئی اُن زندہ رہنے والے گمنام شاعروں پر کام کرے۔ جب مجھ ایسا شعر دشمن بھی اس کام کی افادیت سے منکر نہیں ہو سکا۔ تو اردو شاعری پر کام کرنے والے کیوں خاموش ہیں۔

ہم نے اس نمبر کی ترتیب میں کن کن امور کا خیال رکھا اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گذرے اور کون کون سے تذکروں سے استفادہ کیا، اس کی کہانی کافی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ موجودہ شعرا کی بھی فنی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ منزل ہی پیچھے رہ گئی۔ بعض شاعروں کو ہم اس نمبر میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وقت کی کوتاہی کے باعث ہماری دسترس ان کے کلام تک نہ ہو سکی۔ اس لئے بادلِ نخواستہ انھیں چھوڑنا پڑا۔ نہ جانے ہم اتنی احتیاطوں کے باوجود کہاں تک کامیاب ہوئے۔

اس نمبر میں بعض شعرا کی دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی —— اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعرا سے کمتر کہنے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں ایسی تھیں جن کی بنا پر ایسا کرنا پڑا۔

ہمیں افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے تصویروں کے لیے آرٹ پیپر حاصل نہ کر سکے۔ مجبوراً معمولی کاغذ پر انھیں چھاپنا پڑا۔ کاغذ کی نایابی ہی کا یہ سبب ہے کہ ہم دو برس سے کوئی کتاب ہی نہ چھاپ سکے۔ اور ہماری برسوں کی محنت اکارت جا رہی ہے۔

اس شمارہ کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک تابندہ مثال ہے۔ جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

اگر اس نمبر کے سلسلہ میں حبیب اشعر، ملک اسلم، تمکین احسن کلیم اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھرپور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔

محمد طفیل

---

۴۳ - ۴۴
جولائی۔ اگست ۱۹۵۴ء

غزل نمبر

جتنی بھی کاوش ہمارے بس میں تھی۔ اُس سے کام لے کر ہم نے غزل نمبر پیش کیا تھا اور یہ سمجھ کر پیش کیا تھا کہ یہ کوئی حرفِ آخر قسم کی چیز نہیں ہے، جب ایسے نازک موضوع پر کوئی بھی حرفِ آخر قسم کی چیز پیش نہیں کر سکتا تو ہم اتنا بڑا دعویٰ کیسے کر سکتے تھے، یوں بھی ہمارے ہاں یہ دستور ہو گیا ہے کہ ہر اچھی چیز کی مخالفت کی جائے تاکہ دوسروں کو چونکایا جا سکے اور اپنی اہمیت بڑھائی جا سکے۔ ہم نے

توغزل کی صنف میں کام کرتے والوں کو ایک راستہ دکھایا ہے۔ اگر کوئی اور اس سے بہتر کام کر دکھائے گا تو ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہو گی۔ اس لئے کہ جس دشوار گذار راستے کو ہم نے کانٹوں اور جھاڑیوں سے اپنے ہاتھ لہو لہان کرکے صاف کیا تھا۔ اس پر اب دوسروں کے لئے چلنا آسان ہو گیا ہے۔

ہمیں ایسے بھی بیشمار خطوط موصول ہوئے جن میں یہ اقرار تھا کہ پورے اُردو ادب میں اس نوعیت کی کوئی چیز نہیں۔ ممتاز اہلِ قلم نے بھی ہماری اس کوشش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، لیکن بعض دوستوں نے پرچے کی ترتیب پر اعتراض کیا۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ ترتیب کے بارے میں ہم اُس نمبر میں کچھ نہ لکھ سکے، ہمارا خیال یہ تھا کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولیؔ، میرؔ، سوداؔ اور دردؔ ایسے درجہ اول کے شعرا کے ساتھ، دور متاخرین کے درجہ اول کے شعرا اقبالؔ، حسرتؔ، حفیظؔ اور فراقؔ تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے، اس طرح ہم نے درجہ دوم اور درجہ سوم کے مرتبہ کے شعرا کو ایک ساتھ لانا چاہا۔ یہاں یہ اعتراف کر لیا جائے تو بہتر ہوگا کہ پرانے شعرا سے اس حد بندی میں ہم سے ضرور زیادتی[1] ہوتی ہے، لیکن حتی الامکان موجودہ شعرا کے ساتھ پورے دیانتدارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے اگر ہماری اس مخلصانہ جدوجہد میں بھی کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو ہم معذرت خواہ ہیں۔

ضمیمہ غزل نمبر:

موجودہ شمارہ میں غزل سے متعلق جتنی چیزیں پیش کی جا رہی ہیں وہ غزل نمبر میں ہی آ رہی تھیں، لیکن کاغذ کی کمی اور وقت کی کوتاہی کے پیش نظر ہم انھیں پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ غزل پر جتنے مشاہیر اور شعرا پر جتنے تذکرہ نویسوں کی آرا ہم اکٹھی کر سکے، انھیں ایک ساتھ پیش کر رہے ہیں، تاکہ غزل پر ایک ہی جگہ زیادہ سے زیادہ مواد مل سکے بعض اہم تصانیف میں سے ہم کچھ نہ لے سکے، مثال کے طور پر شبلی کی شعرالعجم میں صرف فارسی غزل پر بحث ہے، اس لیے وہ ہمارے موضوع سے ہٹی ہوئی چیز ہے، اسی طرح بعض اہم نقادوں کی آرا کو بھی شامل نہ کر سکے۔ اس لئے کہ اُنھوں نے غزل پر کچھ لکھا ہی نہیں یا کم از کم ہمیں نہیں ملا۔

افسانہ نمبر کی طرح اب کے بھی غزل سے متعلق سمپوزیم پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب کے سمپوزیم میں ذرا سی احتیاط یہ کی گئی ہے کہ ہر شاعر کا الگ الگ ذکر نہیں کیا گیا (کیونکہ اس سے بہت سے دوست ناراض ہو جاتے) بلکہ غزل کے مستقبل پر چند باتیں پیش کی جا رہی ہیں ہمیں یہ تسلیم ہے۔

محمد طفیل

---

۴۵ - ۴۶

ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴

زیر نظر شمارہ ہمیں اتنی افراتفری میں پیش کرنا پڑا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ اپنی طرف سے ہم شخصیات نمبر کی تیاریوں میں مگن تھے کہ اچانک

---

[1] یہ ایک مجبوری تھی، اس لیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے بعض اہم شعرا کے ہمیں دواوین ہی نہیں ملے تھے۔

اپنا پینترا بدلنا پڑا۔ وہ یوں کہ ہمیں اس نمبر کے لیے وہ تمام چیزیں نہ مل سکیں جن کی توقع تھی، یا جو جو وعدے تھے۔ ناچار اپنے محور سے ہٹے اور اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ کچھ پُرانے مسودات کام آئے۔ کچھ دوستوں نے ہمارے "نادر شاہی حکم" کی لاج رکھی۔ اس طرح ہم اس قابل ہوئے کہ یہ پرچہ بھی پیش کر سکیں۔ پھر بھی ترتیب کی گڑبڑ سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔

ہمارے نزدیک شخصیات ایک بڑا ہی اہم اور اچھوتا موضوع ہے۔ یہ بھی خوش فہمی ہے کہ یہ نمبر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ خوش فہمی اس لیے ہے کہ اس میں جن شخصیتوں کا تذکرہ ہوگا۔ وہ زندہ رہنے والی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے اہتمام یہ کیا ہے کہ بیسویں صدی کی تمام علمی و ادبی شخصیتوں کو لے آئیں۔ انشاء پردازوں میں اگر شبلیؔ، آزادؔ اور نذیرؔ احمد ہوں تو شعرا میں حالیؔ، اقبالؔ اور فیضؔ سے اس کا آغاز کریں۔ صحافیوں میں اگر ابوالکلام، ظفر علی خاں اور عبدالمجید سالک ہوں تو مزاح نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس اور رشید احمد صدیقی ہوں۔ نقادوں میں اگر مجنوں، آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد ہوں تو افسانہ نگاروں میں پریم چند، یلدرم اور نیاز سے اس نمبر کی ابتدا کر کے اس دور تک کی تمام بڑی بڑی ادبی شخصیتوں کو لے آئیں —— یہ پہاڑ سی مشکل، ہوتے ہوتے ہی آسان ہوگی۔ بہر صورت اب آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ہمارا آئندہ شمارہ "شخصیات نمبر" ہی ہوگا۔

اُردو ڈرامہ

ہمارے ہاں ڈرامے کو سرے سے کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں اچھے ڈرامے لکھے ہی نہیں گئے۔ ورنہ اُردو ڈرامے سے اس قدر بیزاری کا اظہار نہ ہوتا۔ اگر کوئی اچھا ڈرامہ لکھا گیا ہے تو لوگوں نے اس کی قدر بھی کی ہے۔ انارکلی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آغا حشر کے ڈرامے اپنی پرانی طرز کے باوجود آج بھی سراہے جاتے ہیں۔ ڈرامے کو مقبول بنانے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اچھے ڈرامے لکھے جائیں اور انھیں بڑے اہتمام سے چھاپا جائے۔ ورنہ عوام سے اس صنفِ ادب کے مقبول نہ ہونے کا گلہ بے کار ہے —— ہم اس باب میں کچھ نہ کچھ خدمت کا وعدہ کرتے ہیں۔

مکاتیب

ہم نے "ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو" کا ایک سلسلہ عرصہ ہوا شروع کیا تھا۔ جو دو تین نمبروں کے بعد رک گیا تھا۔ اب پھر اسے شروع کر رہے ہیں تاکہ کچھ نادر علمی و ادبی خطوط، محض ذاتی ملکیت بن کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ ان سے ادب کو بھی فائدہ پہنچے! احباب سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائیں۔

ایک نیا سلسلہ

ہمارا خیال ہے کہ خود ادیبوں سے بھی اپنی ذات کے بارے میں لکھوانا چاہئے کہ وہ خود کو کس عینک سے دیکھتے ہیں۔ اِس شمارے میں منٹو نے اپنے بارے میں کچھ فرمایا ہے۔ ان کا قلم چونکہ بڑا بے باک ہے۔ اس لئے وہی بے باکی انہوں نے اپنے

بارے میں بھی اختیار کی ہے۔ ویسے یہ بڑی ہمت کی بات ہے کہ جس طرح ان کا قلم دوسروں کے لیئے "بے لگام" ہے وہی قلم اپنے لیئے بھی اتنا ہی بے رحم ہے۔ بہر حال اس عنوان کے تحت کچھ نہ کچھ پیش کرتے رہیں گے اور "شخصیات نمبر" کے بعد بعض اور بھی نئی چیزیں قارئین کو دیں گے۔

محمد طفیل

۴۷ - ۴۸

جنوری ۱۹۵۵ء

اِن ابتدائی صفحات میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں —— کچھ کہنا بھی چاہوں گا۔ تو سوائے معذرتوں کے اور کوئی بات ہی ذہن میں نہ آئے گی ۔ اگر اس نمبر کی ترتیب و تدوین اور مشکلات کے بارے میں کچھ کہتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو بھی ہمدردی نہ ہوگی اس لئے مناسب یہ ہوگا۔ کہ چند ایک ضروری باتیں کہہ کے چپ ہو جاؤں۔

جی چاہتا ہے کہ شخصیت کے موضوع پر بھی چند سطریں لکھوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ موضوع مشکل ہے۔ دوسرے بعض اہلِ قلم نے ضمناً اِس موضوع پر (زیرِ نظر شمارہ میں) بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اس لئے کہنے کی نئی بات کہاں سے لاؤں گا —— لہٰذا یہ بات بھی گئی۔

اب لے دے کے اِس پرچے کی ترتیب کے بارے میں کچھ عرض کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کام کے لئے کوئی بھی مجھ سے بہتر ثابت نہ ہو۔

اِس نمبر کی شانِ نزول، معیار اور افادیت کے ضمن میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اتنے اچھوتے موضوع پہ اب تک جتنا کام ہُوا ہے۔ وہ دوسری اصنافِ ادب کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر گِنے چُنے اہلِ قلم بھی اِس طرف توجہ نہ کرتے۔ تو اس صنفِ ادب کا اللہ ہی حافظ تھا۔

آج سے اسّی نوّے برس بعد ہم میں سے کوئی بھی اِس بھری دنیا میں زندہ نہ ہوگا۔ جیسے آج سرسید اور آزاد کے دَور سے پہلے کا کوئی بھی دیدہ ور موجود نہیں ہے، جو ہمیں یہ بتا سکے کہ غالب ایسے تھے اور مومن ایسے تھے۔

یہ تسلیم کہ تذکروں، مکاتیب اور اِکّا دُکّا مضامین سے اُن مشاہیر کی شخصیت کو آج بھی کچھ کچھ سمجھا جا سکتا ہے لیکن کسی شخصیت کے بارے میں مخلصانہ، عمیق اور ذاتی مشاہدہ، جتنا اس شخصیت کو اجاگر کر سکتا ہے۔ وہ تذکروں، مکاتیب اور مضامین سے ممکن ہی نہیں۔ اسی کمی کے شدید احساس نے مجھ سے یہ کٹھن کام کرا لیا ہے۔

سرسید سے لے کر موجودہ دَور تک کے مشاہیر پر شخصی نوعیت کے مضامین[1] انہی کے دوستوں اور عزیزوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ سرسید سے اس نمبر کو اس لئے شروع کیا ہے۔ کہ یہ ادب کی زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] مضامین کا مفہوم یہاں PERSONAL SKETCHES ہے ۔

بعض مجبوریوں کی بنا پر اس پرچے کی کوئی باضابطہ ترتیب نہیں رہی۔ اس لئے کہ بعض وہ مضامین، جو ترتیب کے اعتبار سے ابتدا میں آنے چاہئیں تھے۔ وقت پر نہ مل سکے۔ جو وقت پر میسر آ گئے تھے۔ انھیں ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

پہلے حصہ میں صرف مرحومین کو رکھا ہے۔ خواہ وہ آج سے پچاس برس پہلے ہم سے رخصت ہوئے ہوں۔ خواہ ایک برس پہلے، پھر بھی اس حصہ میں زمانی ترتیب موجود ہے۔ ان مشاہیر کی شمولیت اس حقیقت کی دلیل ہے کہ ان سب کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔

دوسرے حصہ میں وہ اہلِ قلم شامل ہیں۔ جو اپنی ایک مستقل ادبی حیثیت بنا چکے ہیں۔

تیسرے حصہ میں آج کے نقاد، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ جن میں سے بیشتر کی ادبی خدمات کو تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے۔ اس حصہ میں کچھ نام کھٹکیں۔ لیکن میں نے ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور خداداد ذہانت کے خوف سے شامل کر لیا ہے۔ اس لئے کہ اس کا بڑا امکان ہے کہ وہ چند ہی برسوں کے بعد اپنے پیشروؤں سے پیچھے نہ رہیں۔ چونکہ اس نمبر کی آج کے لیے کم اور کل کے لیے زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے ان سب کی شمولیت ناگزیر تھی۔

اس حصہ کے بعد ایک بڑا ہی اہم سیکشن اُردو کے مرکزوں، یعنی لاہور، دِلّی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن کی کچھ نمایاں علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں ہے جو نامکمل بھی ہے اور مکمل بھی۔ مکمل اس لئے کہ ایک دور کی شخصیتیں آ گئی ہیں اور نامکمل اس لیے کہ کسی ایک اہلِ قلم سے یہ توقع رکھنا مناسب نہیں کہ وہ شخصی طور سے سب نئے اور پرانوں کو جانتا ہو۔ یہ حصہ اس لحاظ سے بھی بڑا کارآمد ہے کہ بعض ان اہم ادبی شخصیتوں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ جن پر الگ الگ مضامین حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا۔

آخری حصہ انتظاریہ ہے۔

اس حصہ میں بعض مضامین ایسے ہیں۔ جو بڑی مشکلوں سے ملے۔ تاخیر کا سبب بھی یہی مضامین ہوئے۔ ان مضامین کی عدم اشاعت، اس نمبر کی نمایاں خامی ہوتی۔ اتنی تاخیر بھی گوارا کی اور جتنی انسانی کوششیں ہو سکتی تھیں۔ اُن سے بھی کام لیا۔ پھر بھی کچھ شخصیتوں پر مضامین حاصل نہ ہو سکے۔ خدا نے چاہا تو اس کمی کو آئندہ پورا کر دیا جائے گا۔ اس حصہ کی ترتیب بھی حسبِ سابق ہے۔ پہلے مرحومین ہیں۔ جو سر سید سے شروع ہو کر میراجی پر ختم ہوتے ہیں۔ پھر وہ اہلِ علم ہیں۔ جن کے قلم کی سحر کاریوں سے موجودہ ادب مالا مال ہے۔ یہ حصہ ظفر علی خاں سے غلام رسول مہر تک ہے۔ ان کے بعد نئے تقاضوں سے گہری وابستگی رکھنے والے نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ میرے خیال میں شوکت تھانوی اور حجاب امتیاز علی کو اس سے پہلے حصہ میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ دونوں مضامین اتنی تاخیر سے ملے کہ میں انھیں اس جگہ رکھنے پر مجبور ہو گیا۔

کچھ مضامین تاخیر سے ملنے کے سبب شاملِ اشاعت نہ سکے۔ اُن میں اصغر گونڈوی، مسعود حسن رضوی، یگانہ، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، مجاز، جذبی اور اختر انصاری ہیں۔ یہ سب کے سب اہلِ قلم اُردو ادب میں مسلمہ حیثیت کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کی عدم شمولیت میرے لیے بھی بار گذری ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ مشرقی پر بھی (صرف انکی ادبی حیثیت کے پیشِ نظر) مضامین حاصل کئے گئے تھے۔ جنھیں دوسرے مضامین کے ساتھ آئندہ پیش کر دیا جائے گا۔

اس نمبر میں زیادہ تر اسکیچ ہیں اور یہی ہمارا مقصد تھا۔ صرف چند مضامین ایسے ہیں۔ جو اسکیچ کی بجائے سوانحی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ چونکہ ایسے مضامین سے بھی شخصیت کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔ اس لئے موضوع کی مطابقت کے پیشِ نظر انھیں بھی شریکِ اشاعت کر لیا گیا ہے۔

بعض مضامین ہمیں انگریزی اور ہندی میں موصول ہوئے۔ اُن کا اُردو ترجمہ پیش کرنے کے سلسلے میں مکین احسن کلیم اور پرکاش پنڈت کا شکر گزار ہوں۔ جوش ملیح آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد پر مضامین ڈاکٹر عبادت بریلوی اور حالی۔ سرسید پر مضامین شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی کی وساطت سے ملے۔ میں ان حضرات کا بھی شکر گزار ہوں۔

آخر میں مجھے آپ سے پھر یہی کہنا ہے کہ میری کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں۔ جن شخصیتوں پر مضامین نہیں چھپ سکے۔ اُن سے تو معذرت ضروری ہی تھی۔ لیکن میری سادگی ملاحظہ ہو کہ میں اُن سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ جن کے تذکرے اس نمبر کی زینت ہیں۔ بہت ممکن ہے کسی کو اپنا تذکرہ نہ دیکھ کر اور کسی کو دیکھ کر افسوس ہو۔

اِن تصریحات اور اعترافِ عجز کے بعد اِس نمبر کو ملاحظہ فرمائیں۔

محمد طفیل

---

۴۹ - ۵۰

ماہ و سال درج نہیں

"یار منٹو نمبر نکالو۔"

"جی!"

"میں کہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔"

"آج یہ آپ کیسی باتیں۔"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا۔"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے۔"

"مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ہے۔"

"اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔"

"اچھا یہ بتلائیے، اس نمبر میں کیا کیا ہو گا؟"

"اب تک جتنی گالیاں ملی ہیں۔ وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر

تمھیں میں مرتب کر دوں گا۔"

"اگر آپ مرتب کر دیں گے۔ تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا۔"

"اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کریں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں۔"

"میں چاہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکلے۔"

"تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تُو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے۔"

"قابلیت کو چھوڑیے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے۔"

"ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔"

"اِس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری درگت بنانی چاہتے ہو۔ میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔"

اگرچہ یہ واقعہ ایک برس پہلے کا ہے، لیکن میں آج بھی یہ نمبر منٹو کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں — اِس لیے کہ منٹو کسی اور کے خیال میں مرا ہو تو مرا ہو، میرے نزدیک نہیں مرا۔

محمد طفیل

---

۵۱ - ۵۲

جولائی ۱۹۵۵ء

اب کے عام شمارہ پیش کر رہے ہیں تاکہ نقوش کی "رسالیت" کو برقرار رکھا جا سکے۔

اردو کے دوسرے رسائل افسانے نظمیں اور مضامین چھاپتے رہتے ہیں لیکن ہم نے اپنے لئے اس سے مشکل راستہ پسند کیا۔ ایک موضوع پر پرچہ پیش کرنا، جتنا مشکل کام ہے۔ اس کا اظہار اتنا آسان نہیں ہے کہ دو لفظوں میں ادا ہو جائے۔

نقوش کا آئندہ شمارہ تمام افسانوی ادب کا انتخاب ہوگا۔ ابتدا سے اب تک یہ کام نہ صرف بے حد کٹھن ہے۔ بلکہ حد درجہ ذمہ داری کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اہم کام کو ہم نے روا روی میں نہیں کیا ہے۔ بلکہ مسلسل ایک برس سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اب جا کر اس قابل ہوئے ہیں کہ آئندہ نمبر کی صورت میں اسے پیش کر سکیں۔

شخصیات نمبر (حصہ دوم) ابھی زیر ترتیب ہے۔ ابھی اس کا بہت سا کام باقی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے حصہ کے بعد بھی تیسری جلد کی ضرورت بھی جائے — اہلِ قلم سے درخواست ہے۔ کہ وہ بھی اس کام کی اہمیت کے پیشِ نظر ہماری پوری پوری مدد کریں تاکہ

کوئی آپ سب کی موجودگی میں یہ نہ کہہ سکے "اب بھی یہ تذکرہ نامکمل ہے۔"

بڑے بڑے لکھنے والوں کا انتقال ہوا۔ لیکن چراغ حسن حسرت کے انتقال سے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے ایک ادیب کا انتقال ہو گیا ہو۔ لکھنے والے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن حسرت ایسی ہمہ گیر علمیت کے مالک کا روز روز میسر آنا محال ہے۔

حسرت صحافی، مزاح نگار، تاریخ دان اور بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ اور ان اصناف میں ایک طرز خاص کے موجد۔ ان کے انتقال سے بیوی خاوند سے اور بچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ لیکن ادب کے جتنے شعبے ان کی ذات سے پل رہے تھے وہ یتیم ہو گئے ہیں۔

محمد طفیل

---

۵۳ - ۵۴

دسمبر ۱۹۵۵ء

کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہُوا۔ جو بے حد ذہین، موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر اُتر آتا تو چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دُودھ نصیب نہ ہُوا۔

جب یہ بچہ کچھ بڑا ہُوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بے حد انسیت پیدا ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یا وہ گوئی نہ رہی۔ قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطہ نظر تھا۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اِسی بے منزلی میں اس نے، اپنے ملک سے دُور، مغرب کے بچوں سے یارانہ گانٹھا۔ کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا۔ اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دُہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اُس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا۔ تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ اُن بچوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اس کی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اُس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بچہ جو بعد میں بالغ ہو کر جوان بھی ہُوا آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گذار رہا ہے۔

یہ کہانی اردو افسانے کی تھی۔

محمد طفیل

۵۵ - ۵۶

افسانہ نمبر کی ضخامت اور قیمت کو ذہن میں رکھ کر خیال یہ تھا کہ ادب کی خدمت کے شوق میں مارے جائیں گے۔ بات تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ پوری ہوتے ہوتے رہ گئی:

قصّہ یہ ہوا کہ سجاد ظہیر کے افسانہ (نیند نہیں آتی) میں چند ایسے فقرے چھپ گئے تھے جو واقعی کسی صورت میں بھی نہیں چھپنے چاہئیں تھے سہواً جو کچھ ہوا اس کی صدقِ دل سے معذرت!

اس پر "ہنگامہ" برپا ہو گیا۔ اگر اس "ہنگامے" کی تہ میں صرف حُبِّ رسولؐ اور خدائے قدوس کی محبت ہی شامل ہوتی تو میرے دل میں اپنے دوستوں کی عزت بڑھ جاتی — اب بھی ممنون! — اگر برادرم شورش کاشمیری (ایڈیٹر چٹان) اور محترم حمید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت) بروقت مدد نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ادب کے اس خدمت گذار کو ذاتی رنجشوں ہی کی بنا پر ہمیشہ کی نیند سُلا دیا جاتا۔

بفضلِ خدا، آج جبکہ وہ "ہنگامہ" قریب قریب ختم ہو چکا ہے، میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جن "دوستوں" نے میری اس نادانستہ کوتاہی کو اتنی ہوا دی تھی — کیا وہ مجھ سے زیادہ مسلمان ہیں؟ — اور کیا ان کے دل میں مجھ سے زیادہ خدا اور رسولؐ کی محبت ہے؟ — اس کا جواب اس دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اس کا فیصلہ خدا و رسولؐ ہی کی بارگاہ میں ہوگا۔ جن کا نام لے کر یہ سب کچھ ہوا — یا ہونے والا تھا۔

بعض "دوستوں" نے محض کاروباری رقابت کے شوق میں مجھے گالیاں دے کر، کمیونسٹ کہہ کر، غدارِ وطن بنا کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لی ؎

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

موجودہ شمارہ

قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اس نمبر کو ویسا نہ بنا سکا جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ کام کے بہت سے دن ذہنی پریشانیوں میں گذر گئے — اس کے باوجود میں نے اس عام نمبر میں بھی یہ التزام رکھا ہے کہ مختلف موضوعات پر مضامین چھاپنے کے بجائے چند مضامین مخصوص موضوع پر ضرور ہوا کریں۔ اس کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد سے ہوئی ہے۔ اس طرح (یکے بعد دیگرے) اُردو کے ہر محسن پر مسلسل دس دس بارہ بارہ مضامین پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ منزل کٹھن، مگر حصول ناممکن نہیں۔

ایسے سلسلہ مضامین میں اختلافات کے بہت سے پہلو نکل سکتے ہیں۔ (سنجیدہ اختلافی مضامین کو بھی نقوش خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کرے گا) ان نزاکتوں کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ کارآمد قسم کا مواد ہم برابر پیش کرتے رہیں۔

پچھلے دنوں اُردو کے کئی نامور لکھنے والے اللہ میاں کو پیارے ہو گئے اور ایسے ایسے قلم کے دھنی چل دیئے جن کی عدم موجودگی

ہمیشہ رُلائے گی۔ سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت کے بعد۔ دتاتریہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، یگانہ اور مجاز

افسانہ نمبر کی تکمیل کے شوق میں مجھے پچھلے دنوں ہندوستان بھی جانا پڑا اور ان چل بسنے والوں میں سے قاضی عبدالغفار، یگانہ اور مجاز کی باتیں اب بھی میرے ذہن میں گھوم رہی ہیں۔

قاضی عبدالغفار

سخت بیمار تھے۔ چل چلاؤ والی بات تھی۔ اس پر اخلاق ملاحظہ فرمائیے کہ کارڈ بھیجنے پر بلوا لیا۔ نحیف و نزار، تکیوں کے سہارے پڑے تھے۔ بات تک کرنے میں انھیں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر جب کمرے میں پہنچا ہوں تو قدرے اٹھ کر ہاتھ ملانے کی کوشش کی اور رُک رُک باتیں کرتے رہے۔ باتوں کا زیادہ تر موضوع یہ رہا کہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے بے بس ہوں۔ صحت کا جو حال تھا وہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بس سانس چل رہی تھی۔ مگر ہمت ملاحظہ ہو کہ اس حالت میں بھی کچھ فائلیں اور کچھ کاغذات ارد گرد رکھے ہوئے تھے۔ بالکل وہی نقشہ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بھلا سوچئے تو کہ موت سامنے ناچ رہی ہے اور یہ اس سے آنکھیں چرا کر کچھ نہ کچھ کئے جا رہے ہیں۔

کہتے تھے کہ میں سان پر مرنا نہیں چاہتا۔ چاہتا ہوں کہ زندگی کی ریل گاڑی میں چلتا ہوا مروں — بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ — جس دن ان کے انتقال کی خبر پہنچی اسی دن مجھے ان کا ایک خط بھی ملا۔

باتوں باتوں میں اس پر بے حد افسوس کرتے رہے کہ اکثر ادیب اور شاعر فکرِ معاش سے مجبور ہو کر فلم کمپنیوں میں جا رہے ہیں اور اپنے جوہروں کو فلم کمپنیوں کی چار دیواریوں میں دفن کر رہے ہیں — جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کو اکٹھا کر لیں اور اپنے سے کبھی جُدا نہ ہونے دیں — نہ ان کا بس چلا نہ ان کا ارمان پورا ہوا۔

میں نے پوچھا " قاضی صاحب آج کل کوئی کتاب بھی زیرِ تصنیف ہے؟"

"جی ہاں! طویل بیماری کی وجہ سے میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے ذہن میں تو کئی کتابیں لکھ لی ہیں۔ اگر میرے ہاتھ نے ذہن کا ساتھ دیا تو جلد ہی تین چار کتابیں مکمل ہو جائیں گی۔"

" مجھے آپ کی کتاب "آثارِ جمال الدین افغانی" بڑی عزیز ہے۔"

" مجھے بھی اپنی وہی کتاب پسند ہے — اس کتاب کے سلسلے میں میں نے یورپ کا سفر کیا اور ڈاکٹر براؤن نے میری بڑی مدد کی — اتفاق دیکھئے کہ جب میں لندن پہنچا تو ڈاکٹر براؤن سخت بیمار تھے — میں نے خط لکھ کر اپنا مقصد عرض کیا اور ساتھ ہی ملاقات کی اجازت چاہی، بلوا لیا — ان کی بیگم نے استقبال کیا اور ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھئے گا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں معلومات کے ہجوم میں گھر کے رہ گیا۔ اٹھنا بھی چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے روکا، گھنٹوں باتیں ہوئیں — واپس آنے لگا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک دوسرے کمرے میں میرے کام کی جتنی بھی کتابیں ہو سکتی تھیں وہ سب میز پر پھیلا رکھی تھیں

— خوب استفادہ کیا۔ بہت سے دوستوں کے نام ڈاکٹر صاحب نے خط بھی لکھ دیئے۔ میں ان سب سے ملا اور ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے سب نے میری بڑی مدد کی۔

اس کے بعد میں مصر پہنچا۔ ڈاکٹر رشید رضا سے ملنے، کیونکہ مفتی محمد عبدہٗ کی بدولت ان سے جمال الدین افغانی پر بڑا مواد مل سکتا تھا۔ انھیں تین چار خط لکھے اور اپنے ہندوستان سے آنے کی غرض بتائی۔ جواب تک نہ دیا۔ خود ملنے گیا تو ملاقات سے انکار کر دیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور ایک خط لکھ کر واپس ہندوستان آ گیا۔

میرے ہم سفر حکیم اجمل خاں بھی تھے۔ میں تو پہلے مصر پہنچ گیا تھا وہ بعد میں آئے۔ ان کے رشید رضا سے دوستانہ مراسم تھے۔ جب حکیم صاحب رشید رضا سے ملے تو انہوں نے میری شکایت کی کہ ہندوستان سے عبدالغفار آئے تھے۔ میں ان سے نہیں ملا تو بڑا سخت خط لکھ کر چلے گئے۔"

قاضی صاحب نے اس سارے واقعہ پر یوں بھی تبصرہ کیا "جن کا جمال الدین تھا انہوں نے میری کوئی مدد نہ کی۔ جن کا جانی دشمن تھا انہوں نے میری رہنمائی کی۔"

اس پر میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا "آپ کو اس کتاب کی خاطر بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔"

"جی ہاں مجھے اس ایک واقعہ پر کہ جمال الدین افغانی کو زہر دے دیا گیا یا وہ طبعی موت مرے تھے، کئی مہینے ریسرچ کرنی پڑی۔ جب تک جمال الدین افغانی کے معالج ڈاکٹر سے خود پوچھ گچھ کر کے تسلی نہ کر لی، میں نے قلم کو روکے رکھا۔"

"قاضی صاحب کو میں نے بے حد متواضع، خلیق، سادہ اور دھن کا پکا پایا۔ اکہرا بدن، قدرے لمبا قد، چھوٹی سی داڑھی، چہرے پر جھریاں اور باتوں میں شعر ڈھلتے دیکھے۔

یگانہ چنگیزی

یگانہ اکھڑتی ہوئی سانسوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

ایک کمرے میں بند، چند ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب سی چیزوں کی موجودگی میں میرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اپنے باکمال شاعر کو یوں خستہ حال دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔

ان کو اس حالت تک پہنچانے میں زیادہ تر ان کی اپنی ہی کوششوں کو دخل ہے۔ وہ اس وقت بھی غالب کے بری طرح رقیب بنے بیٹھے تھے اور غالب کی شاعری کو ذہنی آوارگی کا درجہ دیتے تھے۔ اقبال کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔

میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ مدت سے اپنے حالات کے قطعی ناموافق ہونے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو ہی چکے تھے۔ جبھی وہ کبھی تو خدا پر برستے تھے، کبھی غالب کو آوارہ شاعر کہتے تھے اور کبھی اقبال کی عظمت کے منکر بنتے تھے —— ان کمزوریوں کے باوجود، اردو غزل میں اپنے اسٹائل کے تنہا مالک !

بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگے اور پھر مجھ سے پوچھا "آپ نے میرا جلوس دیکھا تھا؟"

"کیسا جلوس؟"

"اجی وہی جس میں مجھے جوتوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ میرا منہ بھی کالا کیا گیا تھا اور گدھے پر سوار کر کے مجھے شہر بھر میں گھمایا گیا تھا۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ میں نے وہ جلوس نہیں دیکھا۔"

"واہ صاحب واہ! آپ نے تو ایسے اللہ کا شکر ادا کیا ہے جیسے کوئی گھٹیا بات ہو گئی ہو۔ سوچو تو سہی کہ آخر کروڑوں آدمیوں میں سے صرف مجھی کو اپنی شاعری کی وجہ سے اس اعزاز کا کیوں مستحق سمجھا گیا؟ — جبکہ یہ درجہ غالب تک کو نصیب نہ ہوا۔ میر تک کو نصیب نہ ہوا۔

میں چاہتا تھا کہ میرزا صاحب اس تکلیف دہ قصہ کو یہیں ختم کر دیں۔ مگر وہ مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہو اور اس کے بدلے یہ گرانقدر انعام پایا ہو۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فوراً دوغزلہ کے موڈ میں آ گئے۔ "جی ہاں جناب! آپ کے لاہور میں بھی گرفتار ہوئے تھے۔"

"وہ قصہ کیا تھا؟"

"جناب قصہ یہ تھا کہ میرزا یگانہ چنگیزی یہاں سے کراچی کا پاسپورٹ لے کر چلے تھے اور لاہور پہنچ کر اپنے ایک دوست کے ر پنجاب سے نکل کر سرحد پہنچ گئے تھے۔ واپسی پر گرفتار کر لیا گیا (ایک دم جمع سے واحد کے صیغے پر آ گئے) اکیس روز جیل میں بند رہا۔ ہتھکڑی لگا کر عدالت میں لایا گیا۔ پہلی پیشی پر مجسٹریٹ صاحب نے نام پوچھا۔ میں نے بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بڑی شان سے بتایا۔

"یگانہ!"

ساتھ کھڑے ہوئے ایک وکیل صاحب نے بڑی حیرت سے مجھ سے سوال کیا۔ "یگانہ چنگیزی؟"

"جی ہاں جناب!"

یہ سنتے ہی مجسٹریٹ صاحب نے (غالباً آفتاب احمد نام بتایا تھا) میری رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔

جب رہا ہو گیا تو جاتا کدھر؟ اور پریشان ہو گیا ہے — مجسٹریٹ صاحب نے میری پریشانی کو پڑھ لیا۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ جناب میرے تمام روپے تو تھانے والوں نے جمع کر لیے تھے۔ اب مجھے وہ دلوا دیجئے تاکہ یہاں سے کراچی جا سکوں۔

انہوں نے کہا۔ درخواست لکھ دیجئے — میرے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ کاغذ کہاں سے لاتا اور کیسے درخواست لکھتا — اس پر بکمال شفقت مجسٹریٹ صاحب نے مجھے ایک آنہ دیا اور میں نے کاغذ خرید کر درخواست لکھی جس پر مجھے فوراً روپے مل گئے۔ آپ لاہور جائیں تو آفتاب احمد صاحب کے پاس جا کر میرا سلام ضرور عرض کریں — اور ہاں آپ بھی لاہور جا کر اب یہ کہیں گے کہ یگانہ سے ملے تھے — آپ یگانہ سے کہاں ملے ہیں۔ یگانہ کو گوشت پوست کے ڈھانچہ میں دیکھنا غلط ہے۔ یگانہ کو اس کے شعروں میں دیکھنا ہوگا — یگانہ کو آ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر دیکھنے کے بجائے اس مسند پر دیکھنا ہوگا جس پر وہ آج سے پچاس برس بعد بٹھایا جائے گا۔"

میں نے میرزا صاحب کو خود سر — مفروضات کے مالک — صرف خود کو خدائے سخن ماننے والے — زمانہ کی ناقدری کے تحت شاکی (جن میں شمع معمے کے حل پر انعام نہ ملنا بھی شامل ہے) — اپنے غلط نظریات پر اٹل ایمان رکھنے والے — خود کو با اصول تصور کرنے والا پایا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ علم تھا کہ میں ایک ایسے صاحب فن کی خدمت میں حاضر ہوں جس پر مجھے فخر ہونا چاہیے۔ کاش زمانہ ان

ساتھ دیتا اور وہ اپنے ذہن کی غلط روش سے بچ نکلتے۔

اکہرا بدن، چپٹی ناک، کالا رنگ، کلین شیو، بھونڈی شکل و صورت والے کا ایک خوبصورت شعر یہ بھی ہے ؎

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

اسرار الحق مجازؔ

آل احمد صاحب سرورؔ نے کافی ہاؤس چلنے کے لیے کہا، پہنچے، سامنے کی میز پر ایک صاحب کو پہچاننے کی بڑی ناکام سی کوشش کی۔ سرور صاحب نے پوچھا "مجازؔ سے تعارف ہے؟"

"جی ہاں! کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔"

سرور صاحب کے اس سوال پر میں نے ذہن کو کئی جھٹکے دیئے۔ تب جا کر پہچانا کہ سامنے کی میز پر مجازؔ ہی تو ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اٹھ کر ہماری میز پر آگئے اور آتے ہی پوچھا "کب آئے ہیں آپ؟"

یہ وہ مجازؔ تھے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑی پیتے تھے۔ ڈوب ڈوب کر پیتے تھے — وہ مجھ سے زیادہ باہوش تھے۔ نہ صرف پہچانا بلکہ اخلاق میں بھی (ہماری میز پر آکر) سبقت لے گئے۔

پہلے سے زیادہ دُبلے — پہلے سے زیادہ خستہ حال — پہلے سے زیادہ سنجیدہ — پہلے سے زیادہ چپ چاپ!

میں نے خیریت پوچھی تو اللہ کے شکر کا اقرار کیا۔ شعر و شاعری کی بات کی تو اپنے بانجھ ہونے کا یقین دلایا۔ وجہ پوچھی تو چپ ہو گئے — جیسے کہہ رہے ہوں کہ جناب تو بڑے بیوقوف ہیں۔

اس حالت میں بھی کوئی نہ کوئی بات کر گزرتے تھے جس سے ان کی ذہانت پر ایمان لا کر مسکرانا پڑتا تھا۔ یہ ملاقات بڑی مختصر رہی۔ دوسرے دن کے لیے پھر کافی ہاؤس ہی میں ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے اور یہ بھی کہہ گئے۔ کل خوب باتیں ہوں گی۔

حسب وعدہ وہ دوسرے دن موجود تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی ڈرا کہ لیجیے آج تو خوب باتیں ہوں گی۔ ڈرا اس وجہ سے کہ میں اوّل درجہ کا بات چور ہوں۔

یہ اکیلے ہی ایک میز پر براجمان تھے۔ کافی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے، میرے حصہ کی بھی کافی منگوا رکھی تھی۔ خود پی رہے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

ہماری ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو ملاحظہ ہو جس کی ابتدا میں نے کی۔

"خیریت؟"

"جی ہاں!"

"چپ چپ کیوں ہیں؟"

"یونہی!"

اب مجاز صاحب سے "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟"

"جی ہاں!"

"آپ بولتے کیوں نہیں، کیا بات ہے؟"

"یونہی!"

"اچھا!"

"جی ہاں!"

"لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ!"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی!"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتایئے اس رفتار سے آپ دانتاسس تک کب پہنچیں گے؟"

یہ تھے وہ تمام مکالمے جو کوئی سوا گھنٹہ کی نشست میں ہوئے۔ کبھی میں بات کرکے ڈوب جاتا تھا کبھی وہ، آخر ان کے ایک دوست نے آکر ہم دونوں کو بے بسی سے نجات دلائی۔ کوئی نیند رہ منٹ اور نشست رہی ہوگی کہ مجاز صاحب نے پھر دوسرے دن گھر پر آنے کی دعوت دی۔ مگر میں جا نہ سکا — آج وہ جس گھر میں ہیں وہاں خود کسی کو بلاتے ہوئے ہچکچاتے ہوں گے۔

لمبے قد، اکلین شیو، سانولے رنگ، لمبے بال، قدرے خوبصورت خد و خال والے مجاز ہی کا تو یہ شعر ہے ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

محمد طفیل

---

۵۷ - ۵۸

جون ۱۹۵۶ء

دو چار شعر سنیئے گا؟ — مگر ذرا ٹھہریے۔ پہلے میں "سماں" تو باندھ لوں۔

ایسے بھی ادیب گزرے، جو اچھے شعروں کو، اپنی نثر میں سجا لینے کے لیے ہی نثر لکھا کرتے تھے۔ ان کا یہ حربہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

آج کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ جبکہ اسی شمارہ کے چند اچھے شعروں کی خاطر یہ صفحہ کالا کروں گا۔ شعر کہنا اور شعروں کو اظہار کا ذریعہ بنانا، دونوں باتیں معصوم سہی، مگر غیر صحت مندانہ نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب شاعری صرف ذہنی تعیش ہی کا سامان تھی۔ مگر وہ دور گزر چکا۔ آج تو شعر تلوار کا کام دیتے ہیں ؎

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو وہی بات نہ کہہ دوں

یہ شمارہ آزاد فضا میں پیدا ہو رہا ہے۔ مارشل لا جو ختم ہوا۔ گو مارشل لا نے ادیبوں اور ادب پر بظاہر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ مگر ہم لوگ سہمے ہوئے ضرور تھے۔ ڈرتے تھے کہ اگر ہمارے قلم سے کوئی نادانستہ بھی ایسی بات نکل گئی جو سرکار کو پسند نہ آئی تو کیا ہوگا؟ ایک بھیانک نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ دیکھا جائے تو (بعض حیثیتوں میں) ملک اور ادیبوں کو جتنا فائدہ اس مارشل لا نے پہنچایا۔ اس سے پہلے کے جمہوری "دیوتاؤں" نے نہیں پہنچایا تھا۔ مگر مارشل لا، مارشل لا ہی ہے۔ ایک خطرناک کھیل۔ عوام کے لیے بھی، سربراہوں کے لیے بھی!

اک چال وہی لیکن اس کے بازیٔ جہاں میں نام ہیں دو
ہارے تو بغاوت کہلاتی ہے، جیتے تو نبوت ہوتی ہے

ادیب اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اچھا ہوا تھا کہ بُرا، بہرحال موجودہ فضا ادب کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ہے۔ ہم لوگ اب آزادی سے سوچ سکتے ہیں۔ آزادی سے لکھ سکتے ہیں۔ گو پہلے بھی ہماری گردنوں پر کوئی تلوار نہیں لٹک رہی تھی، مگر ہمیں اس کا احساس تو تھا کہ تلوار کا وجود ہے! احساس ہی تو ادیب کی کل کائنات ہوتی ہے۔ سرمایۂ فن یہی، سرمایۂ حیات یہی، بہرحال وہ دور خوش اسلوبی سے گزر گیا۔ جس کا آج ماتم فضول ہوگا۔ جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب ؎

ہاں آنکھ نہ جھپکے کہ ہے پتھراؤ کی زد پر
یہ کارگہِ شیشہ گراں، جاگتے رہنا

ادیب بھوکا پیاسا جیتا چلا آیا ہے۔ وہ اب بھی جی لے گا۔ مگر وہ آزادیٔ رائے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے یہ حاصل نہیں تو جیتے جی مرتا رہے گا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے قلم پر پہرے بٹھائے جائیں۔ خواہ وہ دور کوئی بھی ہو۔ جمہوری شاطروں کا ہو یا صدارتی ناخداؤں کا، ہماری تو سرشت یہ ہے۔

ہم نے خود اپنے آپ زمانے کی سیر کی
ہم نے قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

یہ صفحہ میں نے صرف شعروں کی خاطر ہی کالا کیا ہے۔ ورنہ آپ کو تو علم ہے کہ میں مصرعِ طرح کا قائل ہی نہیں

محمد طفیل

---

۵۹ - ۶۰

اکتوبر ۱۹۵۶ء

۱۹۵۵ء میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد، اس وقفے میں جتنے بھی دن رات گزرے، میں اُن

میں اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے غافل نہیں رہا۔

جس طرح پہلی جلد کے بعد، دوسری جلد کا اعلان کر کے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے۔ اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے تاکہ میری جدوجہد کے باوجود، جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ سب آجائیں۔

اس ضخیم نمبر میں ایک دو مطبوعہ مضمون بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں سے زیادہ انتظار نہ ہوا۔ ادھر پرچہ جلد مکمل نہ ہو سکا۔ دونوں کی مجبوریاں سے آپ درگذر فرمائیں۔

اس پرچے میں چند ایک مضمون، اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو حتمی طور پر مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی — ترتیب وہی ہے جو پہلے حصے کی تھی۔

نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا — اس کے بعد مکاتیب نمبر!

محمد طفیل

---

۶۱ - ۶۲

جنوری، فروری ۱۹۵۷ء

نقوش اب کے خاصی تاخیر سے آ رہا ہے۔ اس کی یوں تو کئی وجوہ ہیں۔ اُن میں سے دو ایک یہ بھی ہیں کہ میں پچھلے دنوں خاصا بیمار رہا۔ علالت بھی دل کے ڈوبنے کی۔ جس میں رات کو سوتے وقت صبح زندہ اُٹھنے کی امید کم ہوا کرتی ہے۔ خیر یہ مسئلہ سراسر ذاتی ہے ممکن ہے اس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

دوسری بات یہ تھی کہ شخصیات نمبر جلد دوم میں کچھ زیادہ ہی خسارہ ہو گیا۔ میں اپنی دو برس کی محنت کو جب بازار میں لایا تو ادب کے پرستاروں کو نیند آگئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری وہ جانکاہی قارئین کے نزدیک تضیع اوقات کی حیثیت رکھتی ہو۔ میرے نزدیک تو وہ نمبر اردو ادب کا ایک ضروری باب ہے۔

اب مکاتیب نمبر کو میری آرزوؤں کا حاصل سمجھئے۔ جتنے بھی نمبر میں نے اب تک پیش کئے ہیں۔ اُن میں افادیت کے اعتبار سے شاید اسی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہو۔ اگر یہ نمبر میری آرزوؤں کے مطابق مرتب ہو گیا تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا

اس شمارہ میں جتنی تخلیقات شامل ہیں۔ وہ سب کی سب معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مگر اس میں ایسی چیزیں ضرور موجود ہیں۔ جن سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ذہن کی گرہیں بھی کھولی جا سکتی ہیں۔ ہوتے ہوتے یہ عام شمارہ بھی سالنامہ بن گیا۔ نہ جانے آپ کے نزدیک یہ بات خوشی کی ہے یا افسوس کی۔

کلیم الدین احمد، امتیاز علی تاج، شیخ محمد اکرام اور راجندر ناتھ شیدا پہلی بار بزم نقوش میں تشریف لائے ہیں۔ میں ان کے استقبال کے لیے اٹھتا ہوں۔

اتفاق سے ہمیں منٹو مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ مل گیا ہے۔ جسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ افسانہ اس وقت لا

جب پرچے کا بہت سا حصہ چھپ چکا تھا۔ اس لیے ترتیب میں یہ اپنے صحیح مقام سے محروم رہا۔ یہ افسانہ کچھ مرحوم کے اپنے حالات پر بھی روشنی ڈالے گا۔ اس لئے بھی اس کی آج بڑی اہمیت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ منٹو ہم میں موجود تھا — اُسے دُور گئے ابھی دو ہی برس ہوئے ہیں۔ اور یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سب اُسے بھول گئے ہوں۔ پچھلے برس تو اس کی برسی پر کچھ حضرات اکٹھے ہو گئے تھے۔ اب کے تو اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں بھی چل دیئے۔ ایک اور ستون گرا۔ یہ خلا بھی پُر ہونے والا نہیں ہے۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ جتنے صاحبِ طرز اور زندہ رہنے والے ادیب تھے وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں سے کچھ زیادہ شاندار روایات کی امید رکھنا، اپنے آپ کو فریب دینے کے مترادف نظر آ رہا ہے۔

سوچتا ہوں کہ مکاتیب نمبر سے پہلے اسی طرح کے ایک دو اور پرچے پیش کر دوں تاکہ مکاتیب نمبر میں، میرے نزدیک کوئی کسر نہ رہے۔

محمد طفیل

---

۶۳ - ۶۴

جون-۱۹۵۷ء

اب کے کچھ ایسی بے ڈھب مصروفیت رہی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ یہ چند سطریں بھی لاہور سے پشاور جاتے ہوئے ٹرین میں لکھ رہا ہوں۔ اس شمارہ کی تدوین کے بارے میں، اگر میں یہ عرض کر دوں کہ یہ میری جدوجہد سے زیادہ اہلِ قلم کی عنایتوں کا مرہونِ منت ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

فراق صاحب کی خدمت میں مجھے یہ گزارش کرنی ہے کہ میں نے آپ کا وہ خط نہیں چھاپا، جو آپ نے اثر صاحب کے بارے میں لکھا ہے اور نہ آئندہ اثر صاحب کا کوئی (اس نوعیت کا) خط چھپے گا۔

فراق صاحب اور اثر صاحب جب دونوں ہی میرے کرم فرما ہیں تو کیوں نہ ان کی خدمت میں گزارش کروں کہ اِس سلسلے کو ختم ہی کر دیں اور مصحفی و انشا کی یاد پھر تازہ نہ کریں جب کہ ہم اُس حادثہ کو بھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

نقوش کا آئندہ شمارہ مکاتیب نمبر ہوگا۔ جو کچھ میں دو ڈھائی برس میں کر سکا۔ وہ پیش کر دوں گا۔

مدت سے آرزو تھی کہ نقوش اپنا پریس قائم کرے۔ الحمد للہ کہ اب یہ شمارہ نقوش پریس میں چھپ کر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے ہم پرنٹنگ کے معیار میں بھی کچھ اضافہ کر سکیں۔

ابھی میں نے یہ چند سطریں ہی لکھی ہیں کہ ایک صاحب نے کہا ہے: "مہربانی کر کے لائٹ آف کر دیجئے"۔

محمد طفیل

۶۵ - ۶۶

نومبر ۱۹۵۷ء

جناب، السلام علیکم

جی چاہتا ہے کہ آپ سے روایتی ہی انداز میں یوں بات شروع کروں ”یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت خداوند کریم سے نیک مطلوب؟“ آپ کی خیریت بے شک مطلوب ہے مگر یہاں سب خیریت ہے۔ اس کا مجھے کچھ علم نہیں، اپنی سُدھ بُدھ ہی کہاں ہے

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ مشاہیر کے خطوط جلد پیش کروں گا۔ جلد پیش نہ کرنے کی وعدہ خلافی ہوئی۔ شرمندہ ہوں۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے۔ میری پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ اگر آپ کو یقین آسکے تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے یہ خطوط دن رات ایک کر کے جمع کئے ہیں۔ واضح رہے دن رات والا فقرہ میں نے بطور محاورہ استعمال نہیں کیا ہے۔

میں نے ان خطوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ شہر شہر گھوما، گھر گھر صدا دی۔ کسی نے میرے شوق کو سینے سے لگایا، کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ یوں امید و بیم کے درمیان چلتا چلتا نیم جان ہو گیا۔ مگر جنون میں کمی واقع نہ ہوئی۔

بچپنے میں چوری کی ہو تو کی ہو۔ اس عمر میں تو نہیں کی تھی۔ مگر اس کمبخت شوق میں یہ کام بھی کیا۔ بخدا اپنی خاطر نہیں۔ آپ کی خاطر، اگر میں نے یہ چوری اپنی ذات کے لئے کی ہو تو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔

چاہئے تو یہ ہے کہ میں آپ کی خدمت میں جتنے خطوط پیش کر رہا ہوں۔ ان سب کے بارے میں آپ سے کچھ عرض کروں۔ واقعی یہ ضروری بات ہے مگر اس ضروری بات کی وضاحت کے لیے، کم از کم بھی پچاس صفحے درکار ہوں گے۔ اتنی ضخامت میں اور پچاس صفحوں کا اضافہ کروں۔ یہ بات مجھے پسند نہیں۔ جبکہ مجھے یہ بھی معلوم ہو کہ میرا مخاطب خوب پڑھا لکھا ہے اور اسے رہبری کی ضرورت نہیں

خطوط کے اب تک کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ گویا یہ صنفِ ادب کچھ زیادہ مُردہ نہیں ہے۔ غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، حالی، مہدی افادی، اقبال، نیاز فتحپوری اور ابوالکلام کے مکاتیب کے مجموعے آپ کے سامنے ہیں۔ اُن میں میری بھی یہ ایک مخلصانہ کوشش شامل کر لیجیے۔

خطوط صرف ادب و انشاء ہی کے آئینہ دار نہیں ہوتے۔ بلکہ اس سے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخیں بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ میرا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے۔ اگر آپ نے خطوط کو اس نظر سے دیکھا، تو آپ کو ان میں بڑا مواد ملے گا۔ اس اعتبار سے مجھے یہ چھوٹا سا دعویٰ کر لینے دیجئے کہ میری اس کاوش سے سو سالہ علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یا مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

میرے نزدیک خطوط کو دلچسپی کے اعتبار سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ مجھ سمیت کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکے گا کہ اس نے لوگوں کے خط چوری چھپے نہ پڑھے ہوں۔ باپ نے بیٹے کے خط پڑھے، بیٹے نے باپ کے خط پڑھے۔ ماں نے بیٹی کے خط پڑھے، بیٹی نے ماں کے خط پڑھے۔ اور ویسے خط کس نے نہیں پڑھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس کام پر دو برس صرف کر دیئے ہیں۔ مگر اتنا عرض کر دوں۔ یہ کام دس برس کا تھا۔ جسے میں نے دو برس میں کیا ہے۔ اگر مجھے عمرِ مستعار پر اعتبار ہوتا، تو میں آپ کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کام پر دس ہی برس صرف کرتا۔ تاکہ میری اس سے زیادہ

ڈھارس بندھتی، اس سے زیادہ سکون نصیب ہوتا۔ مگر زندگی کا اعتبار ہی کیا۔
لیجیے اب اجازت دیجیے۔ میری یاوہ گوئی تو ختم ہوئی۔ کچھ اپنی بھی تو کہیے۔

آپ کا
محمد طفیل

---

۶۷ - ۶۸

جون ۱۹۵۸ء

یوں تو بات، کل کی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نقوش کی اشاعت کو، دس برس ہونے کو آئے ہیں۔ بلکہ اب قدم گیارھویں میں ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے جو کچھ پیش کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ اس کا معیار بھی، اس کی اہمیت بھی۔

نقوش کا پہلا شمارہ ۱۹۴۸ء میں نکلا تھا۔ اس وقت اس کے لائق مدیر ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ کہی ہوئی بات کو پھر دہراتا ہوں کہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نقوش کو صفِ اول کا جریدہ بنایا ہی نہیں بلکہ منوایا بھی۔

۱۹۵۰ء میں سید وقار عظیم نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھالے جس حسن و خوبی کے ساتھ انھوں نے نقوش کو متانت اور میانہ روی کا انداز سکھایا، وہی انداز اب اس کی روایت ہے، اس کی جان ہے۔

اس کے بعد نقوش کی ادارت میرے حصہ میں آئی۔ یقین کیجیے میں اس کا خواہاں نہ تھا بلکہ نقوش ہی نے مجھے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ بھی آپ سے ڈھکا چھپا نہیں، عیاں ہے۔

ادبی رسالہ چھاپنا نہ پہلے خالہ جی کا گھر تھا نہ اب ہے۔ ایک امتحان پہلے بھی تھا ایک امتحان اب بھی ہے مگر اب دن بہ دن مشکلیں بڑھ رہی ہیں۔ نہ لکھنے والوں میں وہ پہلا سا ذوق و شوق ہے نہ پڑھنے والوں میں یہی وجہ ہے کہ میں ادب کی موجودہ رفتار سے بڑی حد تک دل برداشتہ ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے تمام ادیبوں کو اس مضمون کا خط لکھا تھا:

> "اچھی تخلیقات کے حصول میں جتنی مشکلیں آج ہیں پہلے نہ تھیں۔ اہلِ قلم میں بھی وہ پہلی سی تخلیقی لگن نہیں رہی۔ قاری تازہ واردانِ ادب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالے دم توڑ رہے ہیں۔ جو خال خال رہ گئے ہیں ہمیں انھیں تو کسی طرح زندہ رکھنا چاہیے۔ کیا ہم سب مل کر بھی چند اچھے پرچوں کو زندہ نہیں رکھ سکتے؟ میری بے انتہا خواہش رہی ہے کہ برابر معیاری اور نئی تخلیقات ہی کو پیش کرتا رہوں۔ مگر تازہ تخلیقات کو لاؤں کہاں سے؟ یونہی سا پرچہ چھاپنا مجھے پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں مجبوراً مستقل موضوعات پر کام کر کے نقوش کی زندگی کو کھینچ رہا ہوں۔ اگر اہلِ قلم کی بے توجہی کا یہی عالم رہا تو مجبوراً چند اہم موضوعات پر کام کر کے نقوش کو بند کرنا پڑے گا۔ بجائے اس کے کہ نقوش بھی دوسرے مشہور ادبی پرچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرے، میں اسے پسند کروں گا کہ یہ اپنے عہدِ شباب ہی میں سب سے باادب رخصت ہو جائے۔"

ایسے حالات[1] میں بھی ہم نے اردو ادب کو کچھ نہ کچھ دیا ضرور ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے ۵۱۵ مقالے، ۴۰۹ افسانے، ۲۱ ڈرامے، ۶ ناولٹ، ۳۴۶ نظمیں اور ۱۳۳۷[2] غزلیں دی ہیں۔ بیشتر ایسے ادیبوں کی تخلیقات ہیں جو اپنے دور کے نمائندہ ادیب ہیں، جن کا نہ نام مٹے گا نہ کام۔

محمد طفیل

۶۹ - ۷۰

اکتوبر ۱۹۵۸ء

یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے حالات نے ادیبوں کے ہاتھ سے قلم چھین لئے ہیں۔ ذہن چھین لیا ہے۔ اول تو کوئی لکھتا ہی نہیں۔ اگر کوئی ادیب لکھتا ہے تو وہ اپنی ہی گذشتہ تحریروں کے سامنے شرمسار نظر آتا ہے۔

اب غالب و اقبال، آزاد و نذیر احمد کے تو پھر پیدا ہونے کے زمانے لد گئے۔ چلئے صاحب صبر کر لیا۔ مگر یہ کیا قیامت ہے کہ ہم نے ادب کے رشتے سے، جو کچھ وراثتاً پایا تھا۔ اس میں بھی کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کر سکے۔

پچھلے برسوں میں، اوسط درجے کے ادب کی بے شک دکان چمکی ہے۔ مگر اس میں باقی رہنے والا ادب کتنا ہے کوئی مجھے اس کا تو حساب لگا کر بتائے۔ اگر گاڑی یوں بھی چلتی رہتی تو بھی غنیمت تھا۔ کتنے ادیب اُدھ گئے ہیں — جو ٹکیں گے تو مایوسیوں کے بلوں چھپٹ جائیں گے۔ مگر ادھر تو کچھ موت کا سا سناٹا ہے۔

آج کے ادیبوں کو سوچنا چاہیے کہ انہوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں سے کتنا ایسا ہے جو باقی رہے گا اگر کسی ادیب کو یہ اطمینان ہے کہ اس نے اتنا کچھ پیش کر دیا ہے کہ وہ اب کچھ بھی نہ لکھے تو بھی یادوں کے چراغ لے کر ڈھونڈنے والے اس کا سراغ لگا لیں گے، تو وہ بے شک کچھ نہ لکھے۔ مگر جن کی تحریریں دس بیس برس کی مار بھی نہیں کھا سکتیں، انہوں نے کیوں قلم رکھ دیئے ہیں؟

ادب جب سے تفریحِ طبع کا سامان بنا ہے — اس کی آبرو پر بن آئی ہے۔ پہلے کے لکھنے والے، لکھنے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر جیتے رہے۔ مرتے رہے۔ آج کا ادیب اس کے لئے جینے اور مرنے کے لیے تو تیار کیا ہو گا۔ ادب کے لیے تھوڑی سی محبت ہی اپنے دل میں پیدا کرے تو بھی بہت ہے۔ اگر کوئی اپنے آپ کو ادیب کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے تو اسے اپنی ادبیت کا سکہ، آج کے بھی سو پچاس برس بعد تک تو منوانا ہی چاہیے ورنہ —

قصہ مختصر، آج کے ادبا و شعرا کوئی ایسی صورت ضرور پیدا کریں، جس سے اس دور کے ادیبوں کی لاج رہ جائے۔ — کہیں یہ ارادہ تو نہیں کہ ادب کا جنازہ ہمارے ہی کندھوں پہ اُٹھے؟

محمد طفیل

---

[1] حالات جیسے بھی ہیں، ان میں بھی یہ عہد کرتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ پرچے کو ہر دوسرے مہینے پوری باقاعدگی کے ساتھ پیش کرتا رہوں۔

[2] مجموعی طور پر ہم نے اب تک ۱۲۲۷۶ صفحات پیش کئے ہیں۔

۷۱ - ۷۲
جنوری، فروری ۱۹۵۹ء

میں اپنی اس ناچیز کوشش کو پطرس مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں جن کی زندگی کا آغاز اب ہوا ہے۔
محمد طفیل

خاکساری برتتے برتتے، بال سفید ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا: ”خوب ہیں آپ کے نمبر“ تو ہم مارے انکسار کے کہتے ہیں ”جی کس قابل ہیں؟“ غرض جھوٹ بولتے بولتے یہ دن آ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمیں اب لاکھ برخود غلط کہے ہم بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیں —”جی ہاں! ہم نے خوب نمبر نکالے ہیں۔“

تکلف سے یارانہ نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کسی ایسی بات میں پکڑے جائیں جس پر پیچ ہی پیچ کا اطلاق ہو اور سرے سے سچی بات ہی کوئی نہ ہو۔ ہم اپنے نمبروں کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ کہنا ہے تو صرف یہ کہ — اب تک کسی نے کیا نہیں۔

اچھے رسالوں نے بے شک اچھے نمبر نکالے ہیں مگر ان کے موضوعات محدود رہے، جیسے کسی ایک شاعر پر، ایک ادیب پر، یا پھر کسی بھی مختصر موضوع پر۔ اس کام کی افادیت سے انکار، مجھے بھی نہیں مگر یوں کسی ایک بڑے موضوع کو چن کر اُسے شیشے میں کسی نے نہیں اتارا۔

اقرار کرتے ہی چلیں تاکہ یہ الزام عائد نہ ہو کہ ہم کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ نگار، مخزن، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، ہمایوں، ساقی۔ عالمگیر اور ادبِ لطیف نے اپنی اپنی جوانی میں کام کے نمبر نکالے ہیں اور ان سب کا باوا آدم ہے ”نگار“ — یہ ہماری رائے ہے — آپ کو اختیار ہے مانیں، نہ مانیں — ان میں سے اگر کسی سے ڈر لگتا بھی ہے تو مدیرِ نگار ہی سے، ممکن ہے وہ یہ کہہ دیں کہ نکالیے تو جناب! آپ نے میرے پایہ کے کون کون سے نمبر نکالے ہیں —؟

بزعمِ خود، یہ نمبر بھی ایک طرح سے طنز و مزاح کی تاریخ ہے۔ جب سے اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا، اس وقت سے لے کر اس کی جوانی تک کا تمام کچا چٹھا — کچا چٹھا کا لفظ، زیادہ تر ہمیں سودا، جرأت، رنگین، انشا اور مصحفی کے ساتھ ریختی گو شعرا کی وجہ سے لکھنا پڑا ہے ورنہ یہ موضوع بہ ذاتِ خود شریفانہ بھی ہے اور صحت بخش بھی۔

طنزیہ و مزاحیہ چیزیں پڑھتے پڑھتے، خواہ مخواہ کچھ شوخ قسم کے فقرے قلم کی زبان پر آ گئے ہیں ورنہ مجھ ایسا انکسار مآب یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہیں ہوا۔ ہاں اتنی دعا آپ بھی کریں کہ میں اُن موضوعات پر بھی کام کر سکوں جن کے لیے میرا دل انگڑائیاں لیتا رہتا ہے تاکہ اِس وقت کی جھوٹی بات، کل کلاں کو سچی ہو جائے۔

جب سے دنیا بنی ہے پریشانیوں سے چھٹکارا کوئی نہیں پا سکا۔ بادشاہ ہو تو، فقیر ہو تو، وزیر ہو تو، غریب ہو تو، کوئی سلطنت

کے عشق میں روتا رہا، کوئی اپنی دال روٹی کے غم میں۔ یہ سب کچھ ازل سے چلا ہے، ابد تک چلے گا۔ ایسے میں انسان، اگر اپنے لئے ہنسی خوشی کے چند لمحے بھی نہ نکال سکتا تو پھر کیا ہوتا۔ سوچیے نہیں غش آجائے گا۔

ہمارے لیے بھی مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جھٹ پٹ بقراطانہ قسم کی باتیں چھوڑ، اصل موضوع پر آجائیں ورنہ کہیں واقعی وہ بات نہ ہوجائے جو اوپر لکھ آئے ہیں۔

لیجئے جناب! یہ نمبر ۱۲ عنوانات کے تحت مکمل ہوا ہے۔ اب اس کی ترتیب کے بارے میں حسب وعدہ جلدی جلدی باتیں سن لیں اور ہمیں چھٹی دیں۔

۱۔ مضامین۔ اس عنوان کے تحت اب تک جتنے بھی کار آمد مضمون چھپے تھے وہ سب برآمد کئے۔ جو گوشے تشنہ رہے ان پر نئے مضامین لکھوائے۔ اب یہ حصہ اتنا مکمل ہے کہ اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ کیا ہوتا۔ اس حصہ میں کلیم الدین احمد جیسے پڑھے لکھے انتہا پسند بھی ہیں (جو میں نہ مانوں، میں نہ مانوں قسم کی تنقید کے امام ہیں) ڈاکٹر خورشید الاسلام ایسے نکتہ شناس بھی اور ڈاکٹر اعجاز حسین ایسے اعتدال پسند بھی اور پروفیسر محمد علم الدین سالک ایسے عالم بھی۔ غرض اس حصہ میں جتنے بھی مقالہ نگار ہیں انہوں نے اس موضوع کو پانی کر دیا ہے۔ واضح رہے ہم نے 'پانی پھیر دیا ہے' نہیں کہا۔

۲۔ دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب۔ ہمارے بعض مزاح نگار بدنام ہیں کہ انہوں نے فلاں انگریز مصنف کا ترجمہ اپنے نام سے کر ڈالا۔ فلاں نے فلاں فرانسیسی ادیب کی تخلیق کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا۔ فلاں فارسی کے مصنف کا لفظی ترجمہ فلاں صاحب نے کر ڈالا۔ یہ باتیں سچی ہیں یا جھوٹی، اس بحث میں خواہ مخواہ الجھ کر کیوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ٹھانیں۔ ہمیں عرض صرف یہ کرنا ہے کہ انگریزی اور فارسی کا اردو مزاح نگاری پر بڑا اثر ہے۔ بڑا ہی اثر ہے۔ ہمارے ادیب ان زبانوں سے متاثر ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے انگریزی فارسی اور فرانسیسی کے علاوہ دنیا کی دیگر بڑی بڑی زبانوں کے بھی تراجم پیش کر دیے ہیں تاکہ یہ تراجم پس منظر کا کام دیں یا نہ دیں، دنیا کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا تو ہلکا سا تصور سامنے آجائے۔

۳۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے۔ یوں تو شروع سے لے کر اب تک سینکڑوں ہی مزاحیہ پرچے نکلے ہیں بلکہ ایک علامہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اودھ پنچ سے بھی پہلے ڈیڑھ سو سے زیادہ پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے بھی محنت سے کچھ ابتدائی نمونے اکٹھے کیے ہیں۔ ان سے بس اتنا ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے پہل نثر میں کس معیار کی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو نمونے اودھ پنچ سے پہلے کے ہیں، کچھ اسی دور کے۔

۴۔ اودھ پنچ کا دور۔ اودھ پنچ سے اردو مزاح نگاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جس معیار کا مزاحیہ پرچہ تھا اس معیار اور انداز کا کوئی دوسرا پرچہ اب تک نہیں نکلا۔ اس پرچے کا کام لوگوں کو صرف ہنسانا ہنسانا نہ تھا بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی بیدار کرنا تھا۔ ہمارے نزدیک تو اس پرچے کا زیادہ تر مقصد سیاسی بیداری ہی تھا مگر اس نے آڑ لی طنز و ظرافت کی۔ اودھ پنچ کے اب تک جتنے انتخابات چھپے ہیں ہم نے ان سے مدد لی۔ اس کے علاوہ خود بھی اودھ پنچ کی فائیلوں میں غوطہ زن رہے۔ ہمارے اس انتخاب میں دوسرے انتخابات سے زیادہ مواد ملے گا اور پھر مختلف۔ ہم نے انتخاب ہی انتخاب پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس

پر کہ معلوم ہو سکے کہ اس پرچے کا عام معیار اور انداز کیا تھا اور اس میں کیا کچھ چھپتا تھا کہ کمی کو ہمارے علاوہ اب تک کسی نے پورا نہیں کیا — اس اخبار کے بارے میں اودھ پنچ ہی کے شاعر کا کہنا، یہ بھی ہے ؎

مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورتِ طفل
جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

۵۔ فتنہ اور عطرِ فتنہ: یہ پرچے ریاض خیرآبادی نے نکالے اور اودھ پنچ کے زمانے ہی میں نکلے۔ یہ پرچے اودھ پنچ کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر ریاض کی شگفتہ بیانیوں نے ان کی حیثیت کو منوا ضرور لیا۔ اودھ پنچ کے ساتھ تو لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ٹیم تھی، یہی اس کی جیت بھی تھی، ورنہ اکیلے سجاد حسین کیا کرتے، مگر ادھر قریب تریب ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش رہی کہ ان پرچوں کے انتخابات سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے۔ بہرحال طنز و مزاح کے سلسلے میں ان پرچوں کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا — جب خضر صورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی تو بات ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے ریاض کی تصویر دیکھی ہے، تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

بڑے نیک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

۶۔ شیرازہ ۔ اودھ پنچ سے زیادہ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ فتنہ اور عطرِ فتنہ میں تھا اور فتنہ، عطرِ فتنہ سے زیادہ شیرازہ میں — چراغ حسن حسرت جیسے بالغ نظر اور بذلہ سنج اس کے مدیر تھے۔ یہ پرچہ اودھ پنچ کے کوئی نصف صدی کے بھی بعد نکلا اتنا نکھار اور بانکپن، کچھ تو دیا وقفے نے اور کچھ حسرت صاحب کی عبقریت نے۔ اس پرچے میں زیادہ تر حسرت صاحب ہی چھائے رہے۔ اگر فتنہ، عطرِ فتنہ ریاض کی وجہ سے مقبول ہوا تو شیرازہ حسرت صاحب کی وجہ سے۔ بہرحال اسے یہ امتیاز ضرور حاصل رہا کہ اس کی ہر بات میں وقار اور اس کی ہر چیز میں فنی اور علمی شان تھی۔ حسرت صاحب نثار کی حیثیت ہی سے زیادہ ابھرے مگر جب کبھی وہ نظم میں کچھ کہہ گئے ہیں تو وہ بھی مزے کی چیز ہو گئی۔ مثلاً اتحاد پارٹی کی شان میں ؎

تیرے گورے گورے گال   اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال   اتحاد پارٹی — وغیرہ

۷۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور۔ جس ادیب نے بھی نثر میں لکھا ہے اس کے ہاں ڈھونڈے سے شگفتہ، طنزیہ اور مزاحیہ چیزیں مل ہی جاتی ہیں جب مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے ہاں بھی اس نوع کی چیزیں مل جاتی ہیں تو پھر بھلا اور کون پیچھے رہا ہوگا ہم نے اس سلسلے میں غالب سے شروع کیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ جن کی تحریروں میں اس موضوع سے متعلق نمایاں حصہ ہو صرف انہی کو لیا جائے ۔ اس حصے میں بڑے بڑے ادیبوں کے نام سامنے آتے ہیں مگر سب کے سب باقاعدہ قسم کے طنز نگار یا مزاح نگار نہ تھے۔ اگر ہم ان میں سے کچھ کو چھوڑ دیتے تو اس موضوع کی ارتقائی کڑیاں ملانے میں دشواری ہوتی۔ بہرحال اس حصے میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تبرک نہیں ہے، کام کی چیزیں ہیں ۔ انہی سے بعد کے مزاح نگاروں کو نئی راہیں ملی ہیں ۔

۸۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زرّیں دَور** ۔ ہم چونکہ خود اس دور سے گذر رہے ہیں یہی وجہ ہے شاید کہ ہم اپنے سے ذرا پہلے تک ہی کو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور سمجھتے ہیں۔ جب اس دور میں پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی ہوں تو ہم کیوں نہ اس دور کو زریں دور کہیں۔ یہ حصہ پطرس سے شروع ہو کر زمانۂ حال کے لکھنے والوں تک آ جاتا ہے۔

۹۔ **اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر** ۔ حصہ نظم کے بارے میں فاضل مقالہ نگار محمد عبداللہ قریشی نے ابتدا ہی میں اس کی ترتیب کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے اس لئے میں چپ بھی رہوں جب بھی حرج کچھ نہیں۔ اُردو نثر سے پہلے اُردو نظم میں ہی طنزیہ و مزاحیہ چیزیں ظہور میں آئیں۔ پھر جو جو شاعروں نے گل کھلائے وہ سب ہم پیش کر دیتے تو ڈر یہ تھا کہ بعض نستعلیق قسم کے دوست کہہ دیتے "ہمارے شاعر بڑے بدمعاش تھے"۔ ہم نے حتی الامکان سُبک، لچر اور لغو شعروں سے اس حصہ کو بچایا ہے اور پھر زمانہ حال کے شاعروں سے زیادہ مرحوم شعرا پر پوری توجہ دی۔ موجودہ شعرا پر غیر جانبداری سے کام کرنے کا یہ موقع ہے بھی نہیں۔ کون بُری بھلی باتیں سُنے — آخر میں اس حصّے کے بارے میں یہ بات اور سُن لیں — خوب ہے یہ چیز!

۱۰۔ **مزاحیہ کردار** ۔ جب تک کوئی بڑا لکھنے والا نہ ہو وہ کسی کردار کو زندہ جاوید بنا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں مزاح نگار پیدا ہوئے مگر وہ سینکڑوں زندہ کردار نہ دے سکے۔ کھینچ تان کر آپ زیادہ سے زیادہ چھ سات کردار پیش کر سکتے ہیں جیسے خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، مرزا جی اور قاضی جی، بس! — مجید لاہوری نے کئی کرداروں کو روشناس کرانا چاہا مگر وہ زیادہ کردار روشناس کرانے کی دھن میں مارے گئے۔

۱۱۔ **مزاحیہ کالم** ۔ شروع سے لیکر اب تک اخباروں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس کا ایک کالم تو ضرور مزاحیہ ہو۔ بیشمار اخبار نکلے، بیشمار ہی مزاحیہ کالم لکھے گئے۔ اگر ان سب کے مزاحیہ کالموں کو یہاں درج کر دیتے تو وہ بھی ہزاروں صفحوں میں پھیلتے۔ ہم صرف چند نمایاں اخباروں کے مزاحیہ اور طنزیہ کالموں کو یہاں جگہ دی ہے یہاں ایک بات کہنے کی ہے نہ کہوں تو کوئی گڑبڑ بھی نہ ہوگی، وہ یہ کہ یہ کالم بڑے بڑے ادیب ہی لکھتے رہے ہیں۔ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی نہ ہے۔

۱۲۔ **ادیبوں کے لطائف** ۔ یہ موضوع بھی بڑا لمبا چوڑا ہے مگر فاضل مضمون نگار شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تو نمایاں ادیبوں کے اچھے اچھے لطیفے جمع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارا پرچہ پہلے ہی زیادہ ضخیم نہ ہو جاتا تو اس موضوع پر اور بھی کچھ پیش کرتے۔

آخر میں مجھے ان چیزوں کے انتخاب کے بارے میں یہ اعتراف کرنا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں نے جتنی چیزیں چنی ہوں وہ سب اس موضوع پر لکھنے والوں کی شاہکار ہی ہوں۔ میں نے انہیں صرف اپنی عینک سے دیکھا ہے۔ اگر میری عینک کا نمبر ٹھیک نہیں ہے تو اس پر آپ بے شک ماتم کریں — بہرحال یہ چیزیں مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند ضرور ہیں۔ پسند کے علاوہ ایک مجبوری کو اور بھی پیش نظر رکھا جائے۔ وہ یہ کہ بعض لکھنے والوں کی سب کی سب تخلیقات میرے سامنے نہ تھیں۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ اللہ کی شان! یوں ٹھوکر کھانا بھی میری ہی نالائقیوں میں شمار ہوگا۔

کچھ نام ایسے ضرور نکل آئیں گے جن کا اس نمبر میں آنا ضروری ہو مگر میں کیا کروں، اس نمبر کی ضخامت کے ہاتھوں موجودہ صورت میں بھی پریشان ہوں، جب تو اور پریشان ہوتا۔ اور تو اور میں نے خود اس نمبر کے لیے ایک بڑا "معرکۃ الآرا" مضمون لکھا تھا مگر وہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے روکنا پڑا۔ اور تو کسی کا ذکر ہی کیا۔ پنجابی میں ایک مثل ہے "ملاح دا حقہ سدا ای سکا![1]"

محمد طفیل

---

۷۳ - ۷۴

مئی ۱۹۵۹ء

طنز و مزاح نمبر چھپا۔ اہلِ علم نے جی بھر کے داد دی۔ بکا بھی خوب، پہلے ہی ہفتہ میں ایڈیشن ختم۔ محبوبیت کی یہ شان، کاہے کو کسی اور کو نصیب ہوئی ہو گی۔ نقوش کی ہر دلعزیزی پر ہمارا سر ہمیشہ ہی اللہ کی بارگاہ میں جھکا ہے۔

بعض "دوستوں" کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نقوش کے نمبروں نے اس کی "رسالیت" کو ختم کر دیا ہے اور یہ رسالے کی حدود سے نکل کر کتاب بن گیا ہے۔ یہ بات، یوں تو بہ طور مخالفت کہی جاتی ہے۔ مگر وہ لوگ نا سمجھی میں ہماری بڑائی ہی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ رسالے کو مستقل کتاب کا درجہ دینا نقوش کے سوا، اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

"دوستوں" کو یہ بھی دکھ ہے کہ اس کا شوق کی نگاہوں سے کیوں استقبال ہوتا ہے۔ ان میں بعض "دوست" تو وہ ہیں جن کی "نگارشات" نقوش میں نہیں چھپتیں۔ بعض وہ، جو خود رسالہ نکالتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایسے ہیں جو سورج کی روشنی میں اپنی آنکھیں بند کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں، ابھی سورج چڑھا ہی نہیں۔

ہم یہ اعتراض بھی سنتے ہیں کہ نقوش نے لوگوں کے ذہنوں کو بدل ڈالا ہے۔ اس لئے دوسرے پرچے بھی، اس کی روش پہ چلنے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ دیکھیے، سینکڑوں پرچے اکیلے نقوش کو اپنے ڈھب پہ نہ لا سکے۔ مگر اکیلے نقوش کی وجہ سے سینکڑوں پرچے اسی ڈھب پہ نکلنا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ اب قاری زیادہ باہوش ہے۔ وہ لغویات کو پسند نہیں کرتا۔ اب تو وہی پرچے چلیں گے۔ جن میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہو گی ـــــ آج اپنا اور قاری کا وقت، ادب کا نام لے لے کر ضائع کر دینا، ادب کی کوئی خدمت نہیں۔

یہ بات بھی سننے میں آتی ہے کہ ادبِ حاضر کی تخلیقات پر ہمارا زیادہ دھیان نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اول تو سینکڑوں پرچے ادبِ حاضر ہی کو پیش کرتے ہیں۔ ہم زیادہ دھیان نہ بھی دیں، تو کیا موجودہ ادب ڈوب جائے گا؟ ہم جو کام کر رہے ہیں۔ وہ کسی اور کے بس کا نہیں رہا۔ اس لیے ہماری زیادہ تر توجہ ادب کے بنیادی مسئلوں پہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے ہر موضوع پر تاریخی دستاویزیں، بطور ورثہ چھوڑ جائیں۔ ایسے کام حکومتوں کے کرنے کے ہیں۔ یا اُن اداروں کے جنھیں حکومت لاکھوں روپیہ دیتی ہے مگر ان اداروں میں یا تو اتنی صلاحیت نہیں یا ہمت نہیں۔

ویسے ہم ادبِ حاضر کی ارتقائی نشوونما سے کبھی بھی غافل نہیں رہے۔ ہم برابر تازہ ادب بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایمانداری سے کام لے اور یہ دیکھے کہ ہم سال بھر میں، کتنے نئے افسانے، نظمیں، غزلیں اور مقالے (بہ لحاظ، تعداد بھی، معیار بھی) پیش کر دیتے ہیں تو وہ پر

---

[1] ملاح کا حقہ پانی سے محروم ہی رہتا ہے۔

اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس باب میں بھی نقوش کا کوئی حریف نہیں۔ اب موجودہ عام شمارہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیا آج کل میں کسی دوسرے رسالے نے اپنا ایسا سالنامہ بھی پیش کیا ہے؟ — ہم تو چپ ہیں۔ اس لیے کہ ذاتی مصلحتیں، غیر فانی کاموں کے سامنے، ہمیشہ سر بہ سجود ہی ہوئی ہیں۔

محمد طفیل

پطرس نمبر

۷۵ - ۷۶
ستمبر، ۱۹۵۹ء

خبر آئی۔ بخاری صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جی ڈوب سا گیا۔ ذہن ماضی کی طرف پلٹا۔ کوئی مجھ سے مخاطب تھا۔

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون!

ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے لاہور ضرور آؤں گا۔ اور منجملہ اور احباب کے آپ سے بھی تجدیدِ نیاز کروں گا۔ لیکن افسوس کہ بوجوہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ آج شام واپس یورپ جا رہا ہوں اور وہاں سے امریکہ، اِن شاء اللہ!

آپ کے کرم اور بخشش سے آپ کا رسالہ اکثر مل جایا کرتا تھا۔ اور امید ہے کہ آپ کا یہ فیض اب بھی جاری رہے گا۔ البتہ میرا پتا اب پاکستان مشن نیویارک نہیں بلکہ یونائیٹڈ نیشنز نیویارک ہے سب سے بہتر تو یہ ہو کہ آپ مجھے معرفت مرکزِ اطلاعات اقوامِ متحدہ کراچی کے پتے سے بھجوا دیا کریں۔ محصول میں بھی بچت رہے گی۔ کراچی کا مرکزِ اطلاعات آگے بھیجنے کا خود ہی انتظام کر دے گا۔

آپ کی مہربانیوں کا بے حد شکریہ اور کیا عرض کروں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

خاکسار
احمد شاہ بخاری

میرے نام بخاری صاحب کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اچانک چلا آیا تھا۔

معاً ذہن پھرکی کی طرح گھومنے لگا — بڑے آدمی کا انتقال — بڑے ادیب کا انتقال — بڑے عالم کا انتقال — بڑے مفکر کا انتقال — بڑے مخلص کا انتقال — بڑے جیالے کا انتقال۔

"شیطان" نے بہکایا — اٹھو اور خراجِ عقیدت پیش کرو۔ پطرس نمبر نکالو۔

فوراً ذہن نے تردید کر دی۔ یہ کام نہ کرنا۔ لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔ جتنے ذہن اتنے نتیجے۔ کوئی کہے گا اچھا کام کیا۔ کوئی کہے گا۔ یہ تو اسی دن کے انتظار میں تھا۔

بالآخر دل و دماغ نے یہ فیصلہ کیا — اگر تجھے پطرس سے عقیدت ہی ہے تو چپکے سے رو لے اور بس۔

یہ فیصلہ ہُوا ہی تھا کہ بخاری صاحب کا دوسرا خط میرے سامنے آیا۔ خط کیا خود پطرس نے مجھ سے باتیں کیں:

مشفقی و مکرمی۔ سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ۔ پڑھتا گیا خوش ہوتا گیا۔ مگر خط کی آخری تین چار سطریں میرے لیے بہت بڑا سوالیہ نشان بن گئیں۔ ہاں کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ میری تحریر کی کسی جنبش سے اگر آپ کی دل آزاری ہوئی تو مجھے کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔ انکار کرتا ہوں تو نہ یہ خوش مذاقی کی ذیل میں آتا ہے اور نہ شرافت کی ذیل میں۔ اگر آپ دل کو کڑا کر لیں اور میں جو کچھ آپ کی کتاب پر لکھ دوں اُسے قبول کر لیں تو بے شک پروف بھیج دیں۔ میں بخوشی مقدمہ لکھ دوں گا۔

ویسے مقدمہ نویسی میرے لیے ہمیشہ آزمائش کا وقت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح عورت بچہ جننے سے۔ مگر کبھی احباب کے کام سے متاثر ہو کر مقدمہ لکھا کبھی احباب کی دوستی کے ڈر سے۔ آپ کس خانے میں جائیں گے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا ویسے میں نے آپ کے دو تین مضمون اس سے پہلے پڑھے ہیں۔ اس لیئے جرأت کر کے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ بدمزہ نہ ہوں۔

میرا یہاں قیام دس پندرہ روز کا ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو۔ پروف بھیج دیجئے۔ ورنہ پھر فرصت کے دن نصیب نہ ہوں گے۔

لاہور کے احباب کو میرا سلام کہہ دیجئے گا

خاکسار

بخاری

جس دن بخاری صاحب کا یہ خط ملا تھا۔ دل ناچ اٹھا تھا۔ اترا اترا کے میں نے یہ خط اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا۔ مسرتوں کی برات کے ساتھ، جلدی جلدی" صاحب" کے پروف تیار کر ڈالے۔ رجسٹری کر کے بھجوائے۔ مگر پروف بھیجنے کے دوسرے دن بخاری صاحب کا ایک اور خط ملا۔ جو بڑا مختصر تھا۔ لکھا تھا:

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کے پروف اب تک نہ ملے مگر میرے جانے کا وقت آ گیا۔ میں آج ہی ایک لمبے دورے پر جا رہا ہوں۔ نہ جانے امریکہ کب پہنچوں۔

مجھے اس کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کی کتاب پر کچھ نہ لکھ سکا۔

خاکسار

بخاری

یہ تینوں خط میرے ذہن پر پھر سوار ہو گئے۔ سوار ہوتے چلے گئے۔

پطرس سے میرا کوئی یارانہ تھا یہی خط و کتابت نہ تھی۔ رتبہ ایک نہ تھا۔ ایک عالم فاضل، دوسرا جاہلِ مطلق، ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک، ایک کنویں کا مینڈک، کوئی خوبی، کوئی خرابی، میری ایسی نہ تھی جو پطرس کے دل میں جگہ بناتی۔

خیالات اُمڈتے رہے کئی پلٹے کھائے۔ پطرس نے کیوں خط لکھنے میں پہل کی تھی۔ کیوں میری باتیں مانی تھیں۔ یہ جتنا سوچتا، اتنی ہی پطرس کی عظمت میرے دل میں بڑھتی۔

پطرس کی عظمت کے چکر ہی میں گم تھا کہ ایک بار ذہن پھر پٹڑی سے اُترا۔

سنو میاں! لوگوں کی پروا نہ کرو۔ پطرس نمبر ضرور چھاپو۔ یوں ڈرتے رہے تو زندگی بھر سلیقے کا کام نہ کر سکو گے۔

خیالات میں تصادم رہا کبھی یوں۔ کبھی ووں۔

بالآخر جی کڑا کرکے، کچھ نیم دلی کے ساتھ، میں نے پطرس کے دوستوں کی فہرست بنائی۔ خط و کتابت کی۔ اس سلسلے میں میری جتنی مراسلت ہوئی۔ وہ سب یہاں درج کرتا ہوں۔ سوائے ان باتوں کے جو ذاتی ہیں اور اخفا کی ہیں۔ میرے خطوں کا مضمون یہ تھا۔ پطرس پر لکھیے اور ہمیں بتائیے کہ وہ بہ حیثیت انسان کیسے تھے اور بہ حیثیت ادیب کیا مقام رکھتے تھے۔

بڑے بڑے ادیبوں کے، میرے نام ہزاروں خط آئے ہوں گے۔ جن میں سے کچھ ضائع ہو گئے۔ کچھ کو دیمک چاٹ گئی۔ کچھ ہیں۔ مگر مجھے ان کی اشاعت کا کبھی خیال نہ آیا۔ ان خطوں کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے پطرس کی شخصیت کچھ اور نکھرے گی — اور پھر معلومات!

یہ خط تبصرے کے بغیر ہی ملاحظہ فرمائیں۔ میرے لیے ابھی اس نمبر کی ترتیب و تدوین کا بہت سا کام باقی ہے۔ ذرا اسے سمیٹ لوں اگر کہیں لکھنے کی ضرورت پڑی تو کچھ عرض کر دوں گا۔ ورنہ ضرورت ہی کیا۔

مکرمی طفیل صاحب۔ تسلیم!

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بخاری مرحوم کے چند خطوط ارسالِ خدمت ہیں۔ میرے نام اُن کے اکثر خطوط ایسے ہیں جنھیں بہت زیادہ ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے مقابلتاً زیادہ دلچسپ اور مجھے زیادہ عزیز وہ خطوط ہیں۔ جو مجھ میں اُن میں کوئی کشیدگی پیدا ہو جانے کے بعد اُنھوں نے مجھے لکھے۔ لیکن اُن میں بعض دوسرے دوستوں کا تذکرہ اور اُن کے طرزِ عمل پر بے تکلفانہ اس قسم کی رائے زنی ہے جسے کسی رسالے میں چھپا ہوا دیکھنا شاید انھیں مرغوب نہ ہو۔ اِس لیے انھیں شائع کرنے کے لیے دینا مجھے قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ پھر کئی خطوط میں جابجا اس قسم کے حوالے اور اشارے ہیں۔ کہ جب تک اُن کی مکمل تشریح نہ کی جائے کسی کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا اور اُن حوالوں اور اشاروں کی تشریح لکھنا آسان کام نہیں۔ اس لئے تعمیلِ ارشاد میں چند ایسے خط بھیجنے کے سوا چارہ نہیں۔ جو مکمل کے مکمل یا بہت تھوڑی سی قطع و برید کے بعد عام دلچسپی کے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے خطوط میں نے زیادہ احتیاط سے نہ رکھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جو اس وقت مل گئے۔ ارسالِ خدمت ہیں۔

اِن خطوط کے ساتھ چند ایسے مضامین بھی بھیج رہا ہوں ۔ جو ادبی رسائل پڑھنے والوں کی نظر سے شاید نہ گزرے ہوں اس قسم کے کئی مضامین یوں لکھے گئے تھے کہ بخاری صاحب حسبِ معمول مجھے اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانے کے لیے آئے ۔ دیکھا کہ اخبار کا کاتب انتظار میں بیٹھا ہے ۔ اور میں اس کے لیے مضمون لکھنے کے تردد میں دفتر سے نہیں اُٹھا ۔ میری امداد کے لئے یا جلد از جلد اپنے ساتھ لے چلنے کے خیال سے انہوں نے مجھے تیار ہونے کے لئے گھر میں بھیج دیا ۔ اور میری بجائے خود مضمون لکھنے بیٹھ گئے ۔ میں شیو غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اور کپڑے بدل کر واپس آیا تو تیار مضمون میرے حوالے کر دیا ۔ ایسے مضامین جو قلم برداشتہ لکھتے تھے اور ایک ایسے مضامین ہی کیا ۔ جو مضمون بھی لکھنے بیٹھ جاتے ۔ اُسے عموماً ایک ہی نشست میں ختم کر کے اُٹھتے تھے ۔ عبارت کاٹتے چھانٹتے بھی نہ تھے ۔ البتہ لکھنے کے بعد مضمون پڑھوا کر سنتے ضرور تھے ۔ اُس میں کہیں کوئی لفظ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو کبھی نہ بھولتے ۔ مضمون سننے کے بعد وہ لفظ بدل دیتے ۔ مگر ایسی تبدیلیاں اتنی کم ہوتی تھیں کہ مسودہ نقل کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی تھی ۔

تہذیبِ نسواں اور پھول میں نہ جانے اُن کے کتنے مضامین اِسی طور چھپ گئے ۔ بعض "پطرس" کے نام سے مضمون زیادہ خاطر خواہ نہ ہو سکا ۔ تو کسی اور فرضی نام سے" رذا رلانا" اِسی قسم کے مضامین میں سے ایک ہے ۔ نظم" دلّی کی سَیر" انہوں نے پھول کے کسی سالگرہ نمبر کے لیے لکھی تھی ۔ اخبار میں نظموں کی کمی تھی انھیں اسی قسم کی کوئی انگریزی نظم یاد آئی ۔ اُسے ذہن میں رکھ کر ذرا سی دیر میں یہ نظم کہہ ڈالی تھی ۔

"کاغذی روپے" کا مضمون بچوں کے لیے اقتصادیات کی ایک کتاب کا باب ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے مجھے بتائے بغیر دارالاشاعت پنجاب لاہور کو عنایت فرمانے کے لیے لکھنی شروع کی تھی ۔ ایک روز اس کے دو تین باب لے کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے ارادہ تھا کہ کتاب ختم کر کے چھاپنے کے لیے تمھیں دوں گا ۔ مگر بعض دوسری اہم مصروفیتیں نظر آ گئی ہیں ۔ نہ معلوم ان سے کب فراغت ہو اور جب فراغت ہو تو کتاب ختم کرنے کا جوش باقی رہے یا نہ رہے ۔ یہ چند باب GETTING OUR LIVING کو سامنے رکھ کر از سرِ نو لکھے گئے ہیں کتاب اب خود مکمل کر لو ۔ یہ کتاب میں اب تک مکمل نہیں کر سکا ۔ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اسے مکمل کرنے کی ضرورت اب تک محسوس نہیں ہوئی ۔ اب پہلی فرصت میں اسے مکمل کروا ڈالنا چاہتا ہوں ۔

میرے دارالاشاعت پنجاب کے اکثر مشاغل میں وہ مخلصانہ ہمدردی کے ساتھ میرے شریک رہتے تھے ۔ ایک بار مجھے تہذیبِ نسواں پھول اور دارالاشاعت پنجاب کی مطبوعات کے پوسٹر تیار کرتے دیکھا ۔ تو اگلے روز خود تین پوسٹروں کا مضمون تیار کر کے لے آئے ۔ اُن کی عبارت بھی ارسالِ خدمت

ہے شاید آپ کے قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہو مثلاً:—

" عورتوں اور بچوں کے لیے مردوں اور عورتوں کے لیے
بوڑھوں اور بچوں کے لیے
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب کے لیے
بہترین کتابوں کا ذخیرہ
دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۵ ریلوے روڈ۔ لاہور
تصنیف را۔ تو خیر مصنف نیکو کند بیاں
ظاہری نفاست کے ہم ذمہ دار ہیں
اور باقی چیزیں خود " بوید "

باقی بخاری پر مضمون لکھنے کے لئے طبیعت فی الحال کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ اُن کے میرے تعلقات ۲۵ء میں شروع ہوئے تھے۔ اس وقت وہ نئے نئے پشاور سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تھے۔ اُس زمانے میں ان کی شخصیت کی رعنائی بقولِ بیدل مرحوم کے اُن کی " بدویت " سے تعلق رکھتی تھی ۳۵ء تک بہت کم دن ایسے گزرے ہوں گے کہ وہ اور میں لاہور میں ہوں اور ہم نے سہ پہر سے رات تک کا وقت اکٹھے نہ گزارا ہو۔ البتہ ۳۵ء کے بعد جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں دہلی چلے گئے۔ تو تعلقات کی صورت کچھ اور بن گئی لیکن تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا زمانہ جو لاہور میں اکٹھا گزرا۔ اُس کی پوری داستان بیان کرنا کچھ آسان نہیں گھومنا پھرنا کھانا پینا۔ دلچسپیاں۔ تفریحیں، ملاقاتیں سب کچھ تھا۔ مختلف مشاغل کے دَور آئے اور گزر گئے۔ کئی جنون سر پہ سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے وقت اور واقعات نے عجیب عجیب تماشے دکھائے۔ اتنے لمبے ساتھ میں سے چند باتیں چن کر لکھنا دوستی کی داستان سے بے انصافی معلوم ہوتی ہے۔ سوچتا بھی ہوں تو خیال ساتھ نہیں دیتا۔ کچھ سوچتا ہے تو لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ دل البتہ یہ ضرور کہتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ اپنے اور بخاری کے تعلقات پر کچھ لکھنے بیٹھوں گا تو بھولے بسرے واقعات آپ سے آپ زندہ ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ اُن محفلوں اور صحبتوں کی دھندلی سی تصویر کھینچ سکوں گا۔ جن کی جان بخاری تھے اور تناسب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرحوم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا دشوار کام اِس حد تک سرانجام دے لوں گا۔ کہ جو لوگ انھیں نہ جانتے تھے انھیں عہدِ حاضر کی اس عدیم المثال شخصیت کی دلکشی اور رعنائی اور طباعی کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو جائیگا

خاکسار سید امتیاز علی تاج (سید امتیاز علی تاج)

ہیگ۔ ۱۵ر جون ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کی ذہنی پرواز مجھ جیسے ”زمین پیماؤں“ کی نظروں سے بہت بلند تھی۔ میں اس موضوع پر کچھ کہنے کا اہل نہیں لیکن تعمیلِ ارشاد میں چند سطریں گذارشِ خدمت ہیں۔ ممکن ہے آپ انھیں قابلِ التفات پائیں۔

بخاری کے خط تو میرے نام بہت سے آئے خصوصاً اس زمانے میں جب وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ تھے لیکن میں جواب دینے کے بعد خط تلف کر دیتا ہوں اس لئے افسوس ہے اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ نہیں۔ والسلام

خاکسار

ظفر اللہ خان (سر ظفر اللہ خاں)

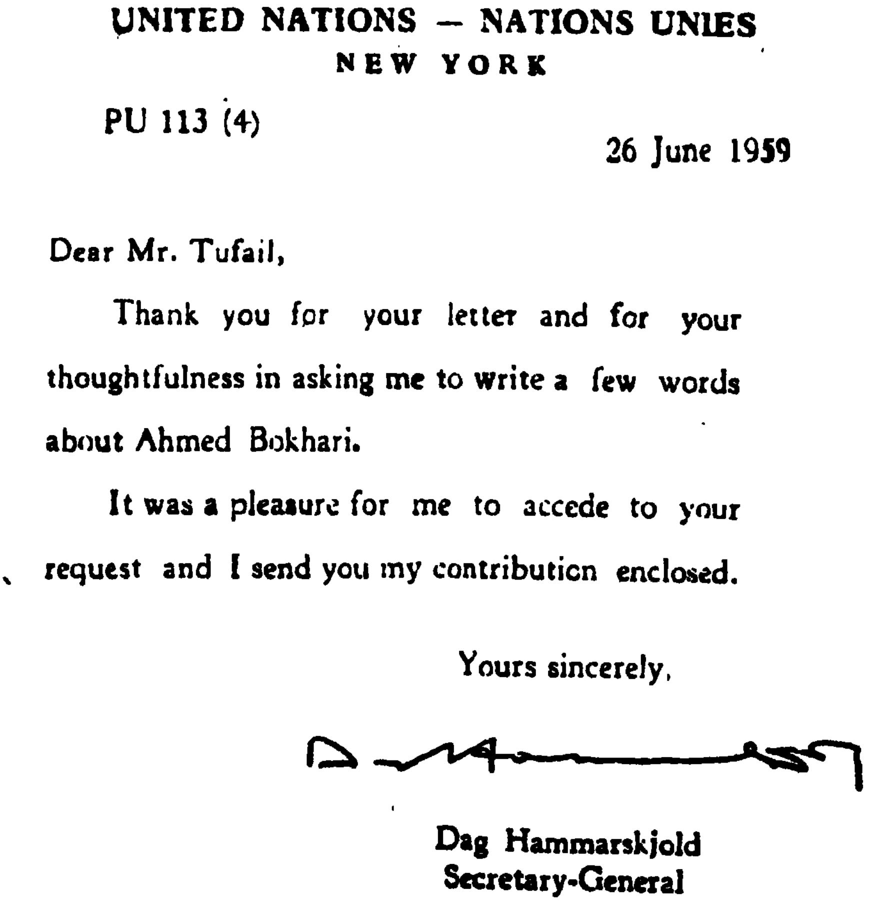

UNITED NATIONS — NATIONS UNIES
NEW YORK

PU 113 (4)

26 June 1959

Dear Mr. Tufail,

Thank you for your letter and for your thoughtfulness in asking me to write a few words about Ahmed Bokhari.

It was a pleasure for me to accede to your request and I send you my contribution enclosed.

Yours sincerely,

Dag Hammarskjold
Secretary-General

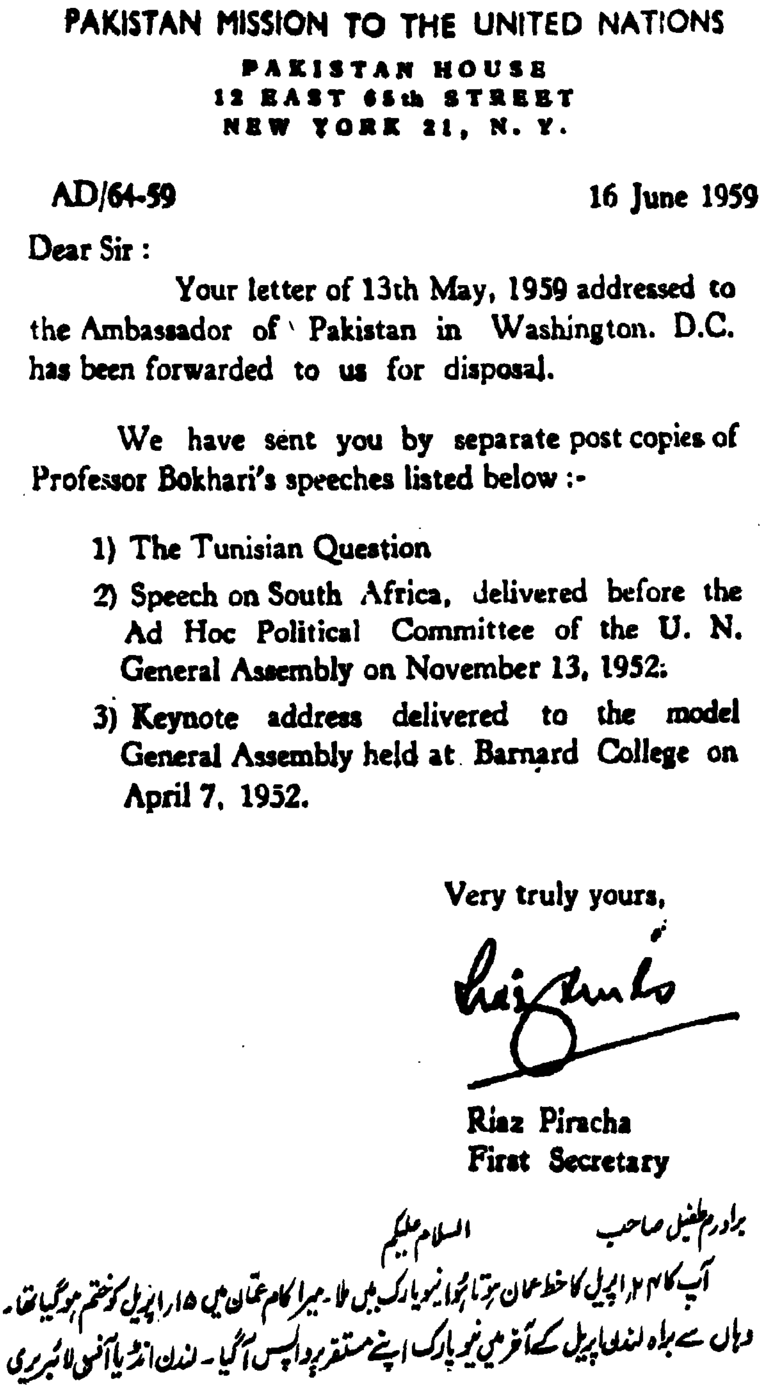

PAKISTAN MISSION TO THE UNITED NATIONS
PAKISTAN HOUSE
12 EAST 65th STREET
NEW YORK 21, N. Y.

AD/64-59　　　　16 June 1959

Dear Sir :

Your letter of 13th May, 1959 addressed to the Ambassador of Pakistan in Washington. D.C. has been forwarded to us for disposal.

We have sent you by separate post copies of Professor Bokhari's speeches listed below :-

1) The Tunisian Question
2) Speech on South Africa, delivered before the Ad Hoc Political Committee of the U. N. General Assembly on November 13, 1952:
3) Keynote address delivered to the model General Assembly held at Barnard College on April 7, 1952.

Very truly yours,

Riaz Piracha
First Secretary

برادرم طفیل صاحب　　　السلام علیکم

آپ کا ۲۴ر اپریل کا خط عمان ہوتا ہوا نیویارک میں ملا۔ میرا کام عمان میں ۱۵ر اپریل کو ختم ہو گیا تھا۔
وہاں سے براہ لندن اپریل کے آخر میں نیویارک اپنے مستقر پر واپس آگیا۔ لندن انڈیا آفس لائبریری

میں اس مرتبہ متعدد کوششوں کے بعد مولانا آزاد کے سنٹرل ایشیا اور روس کے سفر کے حالات مفصل مل گئے۔ اب ان کا یہ سیاسی مشن ایک مستقل مقالہ بن سکتا ہے۔ میں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے اور ان شاء اللہ اگست تک اسے مکمل کر لوں گا۔

پروفیسر بخاری کی تقریریں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے ۵۴ء میں ختم ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ اقوامِ متحدہ کے انڈر سکرٹری ہو گئے تھے۔ اور جو انہوں نے کہا وہ محکمے کے لیے کہا البتہ ان کی ایک تقریر جو سان فرانسسکو میں ہوئی تھی لاجواب تھی۔ میں اس کی نقل آپ کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر صرف یہی شائع ہو جائے تو سب سے عمدہ رہے گی۔ جو تقریریں انہوں نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے کیں انھیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ مگر اس میں ذرا دیر لگے گی۔ بہر حال پطرس نمبر کے لئے یہ مواد اچھا ہے۔ نیویارک ٹائمز نے ان کی وفات پر جو افتتاحیہ لکھا تھا اسے ضرور شائع کیجیے۔ اس کی نقل S I S U کے لاہور کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ مرحوم کا سامان سنا ہے کہ واپس پاکستان چلا گیا۔ آپ ان کے صاحبزادے یا ان کی بیوی سے مل کر دریافت کیجئے کہ سامان میں تقریروں کے مسودے آئے ہیں یا نہیں۔ یہ مسودے بہت حفاظت سے رکھتے تھے اور ان کی اپنی تصاویر کا البم نہایت مکمل تھا۔ اس سے بھی آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سنا ہے کہ یہ اپنی سوانح عمری بھی لکھ رہے تھے۔ خدا جانے اس کا مسودہ سامان کے ساتھ گیا ہے یا نہیں اس کے متعلق ضرور دریافت کیجئے اور پھر مرحوم کے ذاتی خطوط بے شمار ہیں۔ ان کا آخری خط جو مرنے سے ایک ہفتہ قبل انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ آپ نے غالباً ماہِ نو کے جنوری سنہ ۱۹۵۹ء نمبر میں پطرس پر میرا مضمون پڑھا ہوگا۔ اس میں بھی میں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔

خاکسار

(آغا محمد اشرف)

VICE-CHANCELLOR
B.A. HASHMI, M.A., M.ED., LL.D.

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI

حضرت سلامت

آپ کا والا نامہ اور بعد ازاں نقوش وصول ہوئے۔ شکریہ۔ کوئی پندرہ بیس سال ہوئے قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر توفیق نہ ہوئی کہ اسے سنبھالوں۔ بہر حال انتہائی کوشش کروں گا کہ ایک آدھ صفحہ خدمتِ عالی میں ارسال کروں۔

پچھلے چند ماہ سے مصروفیاتِ پیہم اور مسلسل ہیں اور یہ سلسلہ ابھی باقی ہے۔ گزارش رسمی نہیں واقعی

ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے کچھ نہ کچھ ارسال کرنے کی کوشش کروں گا۔ آخری تاریخ سے مطلع فرمائیے کہ وہ مدِنظر رکھوں۔

میرے پاس خط ہوتے تو کبھی کے پیشِ خدمت کر دیتا۔ میں خط پڑھنے کے بعد چاک کر دینے کی عادت کا شکار ہوں۔ ڈاکٹر اقبال اور قائداعظم کے خطوط بھی اسی لاپروائی کے باعث ضائع کر دیئے میری بے مائیگی۔

(محمد بشیر ہاشمی)

UNITED NATIONS - NATIONS UNIES

کراچی۔ ۲۶ مئی ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ سلام نیاز۔ گرامی نامہ ملا اور "نقوش" کے دو شمارے بھی۔ "نقوش" کے لئے لکھنے میں آپ کے ساتھ "مراسم کی کمی" حائل نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صحافی قسم کی انشا پردازی سے تائب ہو چکا ہوں۔ بخاری مرحوم کے بارے میں آپ کی یا کسی اور کی فرمائش پر جو کچھ لکھوں گا۔ اس کی قیمت صحافت نگاری سے زیادہ کیا ہوگی؟ "عالمانہ" مضمون لکھنے کے لئے وقت درکار ہے۔ اور عالمانہ مضمون لکھنے کے قابل بھی خود کو نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے معذرت قبول فرمائیے۔ آپ کی عالی ہمتی کا ہمیشہ قائل رہا ہوں کیونکہ "نقوش" جیسا رسالہ اس باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہنا، اپنے آپ پر ہزار جبر کے مترادف ہے! والسلام

آپ کا مخلص
(ن۔ م راشد
راشد

طفیل صاحب، تسلیم

یہ قطعی زیادتی ہے کہ آپ مجھ سے زبردستی مضمون لکھوا ہی لیتے ہیں۔ میں پطرس کو بہت ہی کم جانتی تھی۔ مگر اس پر بھی آپ نے پطرس پر لکھنے کے کیا کیا جواز نکالے۔ میرے پاس جو کچھ تھا بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہے۔ آپ جانیں۔

شاہد عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ آج تک نقوش کے جتنے نمبر نکلے ہیں۔ یہ طفیل صاحب سے منگوا دو۔ مجھے یہ فرمائش کرتے، تکلف سا ہوتا ہے۔ جس پر شاہد کو اور بھی جلن ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا شاہد کی اس ہٹ دھرمی کے بارے میں؟

اچھا ایک مہربانی کیجئے کہ نقوش کا ایک پرچہ مندرجہ ذیل پتا پر بھیج دیں۔ میری جانب سے۔

(عصمت چغتائی) خاکسار عصمت۔

کراچی
۸ر جون ۵۹ء

عزیزم طفیل صاحب

بطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا۔ اور آپ ہیں کہ حسبِ معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اور اپنے تاکیدی خطوں سے حواس مختل کیے دیتے ہیں۔ بقیہ مضمون آپ کو ۲۵۔ ۳۰ر جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے، وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ ان دنوں میں کہاں اور لکھنا کہاں، لہٰذا صبر کیجیے، یا پھر جی کڑا کر کے اپنی سکیم سے نکال دیجیے۔

آپ کا
عباس (غلام عباس)

کراچی
۱۸ر جولائی ۵۹ء

محترمی تسلیم

۱۔ مجھے افسوس ہے کہ مرزا محمد سعید صاحب سے پطرس کے متعلق مضمون حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور ان سے اصرار کرنا اچھا بھی نہیں لگتا۔ ان کے پاس پطرس کے خط بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آمنہ مجید ملک کے نام یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اگر پطرس نمبر کی ترتیب مکمل نہ ہو گئی ہو تو شامل کر لیجیے۔

۲۔ پطرس نے میرے والد کے انتقال کے موقعے پر انگریزی میں ایک مضمون ان کے متعلق دہلی کے انگریزی اخبار STATESMAN میں لکھا تھا۔ وہ مضمون انگریزی میں ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے کہیں سے وہ حاصل کر لیں تو اس کا ترجمہ چھاپ سکتے ہیں۔ اس کے لیے دلی خط لکھنا پڑے گا کہ STATESMAN والے ۴۳ء کے فائل نکال کر اس میں سے وہ مضمون تلاش کریں۔ مجھے اس کی تاریخ اشاعت کا بھی علم نہیں۔ اسٹیٹسمین کے نمائندے جو کراچی میں رہتے ہیں آجکل یہاں موجود نہیں ورنہ میں ان سے کہتی۔

پطرس نمبر کب تک نکل آئے گا؟ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص
قرۃ العین
(قرۃ العین حیدر)

کراچی
۲۶ رمئی ۱۹۵۹ء

محترمی، سلام مسنون، حسب فرمائش بخاری مرحوم کا خط ملفوف ہے۔ جس ملاقات کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی، جب میں نے دیارِ غیر میں ان کی موت کی خبر سنی تو سناٹے میں آگیا، ایسے دانائے راز اور زندہ دل صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے،

مستدعی ہوں کہ یہ خط مجھے واپس بھیج دیا جائے، خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

مخلص
(سید ہاشم رضا) ہاشم رضا

باسمہٖ سبحانہٗ

برادرِ مکرم! تکلیف فرمائی کے لیے شکریہ، میں نے گزشتہ دس روز میں دو دفعہ آپ کے ادارہ فروغِ اردو کی زیارت کی۔ آپ نہ ملے اور مایوس پھر آیا۔

پطرس کے متعلق میری معلومات زیادہ نہیں۔ اگرچہ ابتدا ہی سے خاص تعلق رہا۔ فی الحال وعدہ نہیں کرتا۔ ذرا فوری کاموں سے فارغ ہو جاؤں تو سوچوں گا۔

ہاں بھائی، غالباً مولوی عبداللہ قریشی نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ میرے جانے کا مقصد یہی تھا کہ اس کے متعلق پوچھوں۔

ملاقات کو بہت دن ہو گئے۔ یہ دعوتِ تکلف نہیں۔ محض اظہارِ آرزو ہے۔

آپ کا
مہر (غلام رسول مہر)

ذکاء اللہ روڈ۔ یونیورسٹی علی گڑھ
۶ رجولائی ۱۹۵۹ء

مکرمی تسلیم

نقوش کے پطرس نمبر کے لیے مضمون کا تقاضا موصول ہوا تھا۔ جو کچھ بن پڑا لکھ ڈالا ہے۔ دو چار دن میں مکمل کر کے ٹائپسٹ کو دے دوں گا۔ اس میں شاید آٹھ دس دن اور لگ جائیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مضمون کم و بیش ۸-۱۰ صفحے آپ کے رسالے کے لے لے گا۔

امید ہے آئندہ آپ مضمون کے لیے اس طرح اصرار نہ فرمایا کریں گے۔ مضمون وغیرہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

یہی صورتِ حال کیا کم تکلیف دہ ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کی فرمائش نہ پوری کرنے پر اپنے اوپر نفرین کرنے کا فرض بھی ادا کرنا پڑے۔

یہ نمبر بھی (طنز و مزاح نمبر) اپنے پیشروؤں کی طرح حسب توقع خاطر خواہ نکلا۔ خاص نمبر شائع کرنے میں آج شاید آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ یقیناً اپنے کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں اور ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی (رشید احمد صدیقی)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۴ جون ۵۹ء

پیارے طفیل۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں "پطرس کے مضامین" پر ایک مختصر سا تبصرہ حاضر ہے۔ ایک اور مضمون میر پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے جواب میں بھی تیار ہے۔ اگر تم چھاپنا گوارا کرو تو وہ بھی بھیج دوں۔ مگر طویل اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے متعلق میری تردید میں ہے۔

میں بہت بیمار رہتا ہوں اور موت کا منتظر۔ خدا تم کو سلامت اور شاد کام رکھے۔ والسلام

تمہارا اثر (اثر لکھنوی)

برادرم، تسلیم وغیرہ

آپ کے خط کا جواب دینا ضروری تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ میں سید ذوالفقار بخاری کے پاس گیا۔ ان سے وعدہ لیا۔ اور وعدے کے علاوہ ایک تصویر بھی حاصل کر لی۔

آپ مایوس ہو چکے ہوں گے اور میری اس خاموشی کو طرح طرح کے معنی پہنا رہے ہوں گے، مگر میں بڑے بخاری پر ان کے شایان شان چیز لکھ رہا ہوں۔ جو آپ کو امروز فردا میں مل جائے گی۔

طفیل! خدا کی قسم اب اس سرد جنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔ جو میرے اور تمہارے درمیان جاری ہے اس مفروضہ جنگ پر فطری محبت حاوی ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے تم کو گلے لگانے کو لہٰذا ختم کرو یہ بیہودگی اور گلے لگ جاؤ۔ بخاری صاحب کا مضمون اور اپنا مضمون جلد بھیجوں گا اور کوئی حکم۔

نیاز مند شوکت (شوکت تھانوی)

برادرم طفیل صاحب!

بجے نقوش۔ پطرس پر مضمون حاضر ہے۔ پیرو مرشد کے "مرحوم کی یاد میں" اس لیے نہ رکھا کہ یہ مرحوم کے

ایک مزاحیہ مضمون کا عنوان ہے۔ پطرس پر سینکڑوں مضامین لکھے جائیں گے لیکن اس مضمون میں آپ کو چند نئی باتیں اور واقعات ملیں گے تعمیلِ ارشاد حسبِ معمول دیر سے کر رہا ہوں۔ امید ہے حسبِ سابق آپ فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

نقوش کا "طنز و مزاح نمبر" بہت پسند آیا۔ کارٹون اس نمبر کی جان کہے جا سکتے ہیں۔ مجھے اپنا کارٹون اتنا پسند آیا کہ ہر واقف ناواقف کو دکھاتا پھرتا ہوں۔ میری طرف سے کارٹونسٹ کو مبارکباد دیجئے اور اس کا نام اور پتا بھی تحریر فرمائیے۔ بخدا یہ شخص لائقِ قدر فن کار ہے۔

مضمون کی رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ خطوط کا جواب نہ دینا یا بہت دیر سے دینا میری پرانی عادت یا خباثت ہے۔ مجھے آپ کے خطوط مل گئے تھے۔ طویل اور مجرمانہ خاموشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

"آج کل" دہلی میں میرا ایک مضمون "پطرس" پر چھپا تھا۔ افسوس کہ وہ میرے پاس نہیں۔ لاہور ہی رہ گیا تھا۔ اگر کسی لائبریری سے (جہاں کہ "آجکل" کی پرانی فائلیں ہوں) پتا کریں تو شاید مل جائے ویسے عرش ملسیانی حال چیف ایڈیٹر "آجکل" آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اگر انھیں لکھیں۔ تو پرانی فائل میں سے یہ مضمون نقل کروا کر آپ کو بھیج سکتے ہیں مضمون برا نہیں تھا۔ پطرس نے اسے خود سراہا تھا۔

(کنہیالال کپور)

کنہیا لال کپور

۶/۴ بلاک II سی۔ ناظم آباد۔ کراچی
۲۲، مئی ۵۹ء

بھائی طفیل صاحب۔ السلام علیکم

مئی کا نقوش ملنے کے بعد۔ آپ کو کئی خط لکھے۔ مگر یقیناً ان میں سے کوئی بھی آپ کو نہ ملا ہو گا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی یہاں سے روانہ نہ ہو سکا۔

خیر وہ سب خط آپ کو ایک ساتھ بھیجے دے رہا ہوں:۔

نمبر ایک مورخہ بارہ مئی نقوش ملا۔ برابر لکھتے رہنے کا وعدہ۔ لاہور آنے کا ارادہ
نمبر دو " سترہ مئی پطرس نمبر۔ اس کے لیے لکھنے کا ارادہ
نمبر تین " ۲۲ مئی مضمون حسبِ ذیل

میں اردو کے مزاحیہ نگاروں پر لکھ رہا ہوں۔ ایک مضمون مزاح اور مزاحیہ نگاری لکھا۔ دہ ماہ نو "والے خدا ان کو نیک ہدایت دے دسمبر سے دبائے بیٹھے ہیں۔ دوسرا مضمون غالب کا مزاح شروع تو ہو گیا مگر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ تیسرا مضمون "پطرس کا ہیومر" غالب والے مضمون کو چھوڑ کر اسے پہلے لکھ ڈالا تاکہ پطرس نمبر

میں آسکے۔ اب آگے آپ جانیں آپ کا کام جانے!

مضمون منسلکِ دستاویز ہذا ہے۔ فقط

محمد احسن فاروقی
(ڈاکٹر احسن فاروقی)

از وزیر کوٹ سرگودھا

۸؍جون

محترمی طفیل صاحب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ تاخیر سے جواب دے رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل ان دوران میں آپ ہی کے لیے مضمون حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ لاہور میں بڑی کوشش کے باوجود ایڈیٹر راوی سے مطلوبہ مضمون حاصل نہ کر سکا کیونکہ وہ خود پطرس نمبر نکالنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

اب صورت یہی باقی ہے کہ کوئی تازہ مضمون لکھ دوں۔ اگر آپ مجھے دس بارہ روز کی مہلت دے سکیں تو توقع ہے کہ سبکدوش ہو سکوں گا۔ دوسری طرف اگر آپ کو ضروری مضامین مل گئے ہوں اور آپ کا پرچہ اس سے قبل ہی آرہا ہو تو پھر آپ میرے مضمون کی شمولیت کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں آخر اس سے فرق ہی کیا پڑے گا؟

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

مخلص
وزیر آغا
(ڈاکٹر وزیر آغا)

مکرمی!

پطرس پر مضمون، آپ کو پسند آیا، غنیمت ہے میں نے بڑی تکلیف میں اس مضمون کو لکھا ہے۔ سانس کی تکلیف الگ تھی اور خون کا دباؤ جدا، جواب بھی ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ عبدالمنعم سعیدی میرے ایک دوست تھے جو حال میں کراچی پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انہوں نے آسکر وائیلڈ کے ایک ڈرامے کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا جب ٹٹو نہ چلا تو مجھے بھی شریک کر لیا اور ہم دونوں نے لشتم پشتم اسے ختم کر کے چھپوا ڈالا، غلطیاں خاصی تھیں۔ اس پر محمد دین تاثیر نے ایک سخت تنقید کی جو مخزن (جسے حفیظ نکالتے تھے) میں چھپی، میں نے اس کا جواب لکھا تو پنجاب کے پرچوں نے تاثیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے شائع کرنے سے انکار کر دیا، انھیں دنوں یوپی سے ایک نیا پرچہ نکلا تھا اس میں یہ جواب میں نے چھپوا دیا۔ جو جواب کم اور سب و شتم زیادہ تھا، اس پر محمد دین بھپرے۔ انھیں دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ غنچۂ تبسم شائع ہونے لگا۔ تو میں نے اس مضمون کو بھی اس مجموعہ میں شریک کر دیا اور عبدالمنعم سعیدی نے اس کتاب کے مقدمے میں بعض چوٹیں بعض لوگوں پر کیں، اتفاق سے انھیں دنوں میری خط و کتابت پطرس سے ہوئی تو انہوں نے اس قصے کو چھیڑا میں نے اعتراف کر لیا کہ غلطیاں واقعی خاصی ہیں اور اگر ان غلطیوں کی فہرست وہ بنا دیں تو میں آئندہ اس میں ترمیم کر لوں گا چنانچہ پطرس نے بڑی مہربانی سے اصل ڈرامے سے اس

کا مقابلہ کر کے ایک ضخیم فہرست ان غلطیوں کی بنا دی اور مشورہ دیا کہ اب اس کا دوسرا اڈیشن نکالنے کے بجائے اسے نام اور ذرا سے کردار بدل کر "اردا ادو" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔

غنچۂ تبسم پر مقدمہ تعارف' وغیرہ کئی ایک چیزیں تھیں انھیں دیکھ کر ڈاکٹر "تاثیر نے تبسم وغیرہ چند احباب کو ساتھ لے کر غنچۂ تبسم پر ایک مضمون لکھا جو اس کی مخالفت میں تھا، یہ مضمون نیرنگِ خیال میں نیاز مندانِ لاہور" کے نام سے طبع ہوا۔ میرا خیال یہی تھا کہ پطرس اور سالک بھی اس میں شریک ہیں مگر پطرس نے مجھے لکھا کہ میں اس مضمون سے واقف ضرور ہوں اور اس کی تحریر کی اطلاع مجھے ضرور تھی مگر اُن کے لکھنے میں شریک نہیں ہوں۔

یہ ایک ہی مضمون میرے اور غنچۂ تبسم کے خلاف "نیاز مندان لاہور" کے نام سے چھپا ہے، اب نہ تو یہ مضمون ہی میرے پاس ہے اور نہ اس کا سنہ ہی یاد ہے چونکہ اس کا جواب لکھ کر میں نے نیرنگِ خیال میں چھپوانا چاہا اور نیرنگِ خیال نے اس کے چھاپنے سے انکار کر دیا اس لیے میں نے نیرنگِ خیال میں لکھنا ترک کر دیا۔

احمد جمال پاشا نے حال ہی میں پطرس پر ایک مضمون قومی زبان کراچی میں لکھا ہے جس میں انہوں نے غنچۂ تبسم کے خلاف نیاز مندانِ لاہور والے مضمون کو پطرس کا بتایا ہے، چونکہ خود پطرس نے مجھے لکھا تھا کہ اس سازش میں وہ شریک نہیں ہیں اس لیے میں نے اس مضمون کو پطرس کے مضامین میں شمار نہیں کیا۔

آپ کا

(تمکین کاظمی) تمکین کاظمی

مکرمی طفیل صاحب، سلام مسنون

میں ہر کار کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نقوش برسوں سے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور خاص نمبر نکالنے میں بڑے بڑے رسالوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ایک نمبر میری تجویز پر ترتیب دیا جائے اور وہ نظم نمبر ہو اور اس میں ساری دنیا کی بہترین نظمیں ہوں۔

میں پطرس نمبر کا ٹائیٹل ضرور بناؤں گا۔ آپ سے بھی تعلق خاطر ہے اور پطرس سے بھی زندگی بھر کا ساتھ تھا۔ ہو سکا تو مضمون لہ بھی لکھ دونگا۔ مگر ادھر میری کچھ دنوں سے طبیعت بڑی خراب ہے۔

آپ کی نوازش کا شکریہ ــ کہ آپ ہر موقع پہ مجھے بھی یاد رکھتے ہیں اور ہمارے لیے آپ کے رسالے ادبی سرمایہ ہیں جو ہم حاصل کرتے ہیں۔

آپ کا

(عبدالرحمٰن چغتائی)

لہ چغتائی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکے۔ مگر انہوں نے پطرس کی شخصیت اور فن کو اپنے لازوال خطوط کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ نقوش کا مرتب

خطوط پڑھ لیے آپ نے، اچھا ہوا۔ نہ چھپنے سے ان کا چھپنا بہتر ہی ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو ان کی عدم اشاعت کے باعث معلوم نہ ہیں اب آپ کو معلوم ہوگئیں۔ اگر آپ نے ان خطوط کی اشاعت سے کچھ پایا ہے تو میں سرخرو، ورنہ مجرم تو ہوں ہی، یہ اعزاز مجھ سے ن چھین سکتا ہے۔

مرحوم کے کئی قریبی دوست لاہور میں تھے۔ ان سے خط و کتابت نہیں ہوئی۔ باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دو تحریریں خط کی صورت میں ملی تھیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ان حضرات سے جو جو باتیں ہوئیں۔ وہ اس نمبر کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، مشوروں کی صورت میں، ریر کی صورت میں، تکمیل کی صورت میں۔

اس پرچے کی ابتدا پطرس پر شخصی نوعیت کے مضامین سے ہوتی ہے۔ ان مضامین پر الگ الگ لکھنا طوالت کا باعث ہوگا ویسے س حصہ میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں۔ جو محض مضمون ہو اور کچھ نہ ہو۔ ان میں سے ہر مضمون میں پطرس سے ملاقات ہوتی ہے۔ مرحوم کو پنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ مرحوم احباب سے ہمکلام ہیں اور احباب مرحوم سے۔ اس سے زیادہ مضمون اپنا کرشمہ کیا دکھا سکتے تھے۔

اس کے بعد پطرس کے فن پر چار ہلکے پھلکے مضمون ہیں۔ اس حصہ کو ہم نے جان بوجھ کر بھاری بھر کم نہیں بنایا۔ اس لیے کہ مرحوم کے فن پر اب تک ہت کچھ لکھا گیا ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اصل میں ہم چاہتے ہی نہ تھے کہ جو کام آئندہ ہو سکتا ہو۔ اسے بھی آج کر کے اپنے کام کو اور بڑھائیں نے اپنے ذمہ وہ کام لیا۔ جو آئندہ چل کر مشکل ہو جاتا۔ پھر بھی مرحوم کے فنی محاسن پر یہ مضامین کارنامہ ہیں اور اس نمبر میں ان کی اسی حد تک ضرورت تھی۔

یہاں تک تو جو کچھ پیش کیا گیا۔ وہ یا تو مرحوم کی شخصیت پر تھا یا فن پر۔ اب مرحوم کے فن پاروں کا آغاز ہوتا ہے، ابتداً مرحوم ی منظوم تخلیقات سے ہوئی۔ مرحوم نے اُردو میں بھی شعر کہے، فارسی میں بھی، کہا بہت کچھ، مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ کہ ہا اور ضائع کر دیا۔ بعض شعری کارنامے صرف تفریحِ طبع کا سامان بنے اور بس۔ چند ایک چیزیں جو محفوظ ہو گئیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم اُردو سے زیادہ اچھے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بیدل شاہجہانپوری مدیر مخزن نے ۱۹۳ء میں لکھا تھا۔

> "ایک غیر زبان خوش نوا کا ہم صفیرانِ عجم ہونا اور اجنبی نہ سمجھا جانا اگر آئینہ حیرت ہے تو یہ نظم قطعاً مستحق ہے کہ معجزۂ ادب کہی جائے۔ سید احمد شاہ بخاری میرے جذباتِ دوستی کی آرزو اور اعترافِ قابلیت کا ایمان ہیں۔ اس لیے بجائے حقیقت نمائی کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اربابِ کیف کے ذوقِ سلیم کو دوبارہ اس شعر کے تاثر لطیف سے متوجہ کروں ؎

نشانِ سجدہ کامِ اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آں آستاں گم شد

منظومات کے بعد وہ تمام مضامین پیشِ خدمت ہیں۔ جو مرحوم کا زندگی بھر کا سرمایہ ہیں۔ انھیں یکجا اور اکٹھا کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ س لیے کہ آج کسی بھی لائبریری میں اچھے اچھے رسالوں کی بھی جلدیں محفوظ نہیں۔ ہم نے پہلے تو لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔ مگر وہ بسلسلۂ پطرس ایسا وسیع نہ تھا جو آپ حضرات کے سامنے پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذاتی لائبریریوں کی خاک چھانی بھی، پھانکی بھی، لاہور میں

بھی، لاہور سے باہر بھی، اس کام کے سلسلے میں سیلاب سے بھی واسطہ پڑا۔ کہیں اٹکے، کہیں بھیگے، کہیں پھنسے، کہیں تیرے، غرض جیسے بھی بن پڑا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہم مرحوم کی اس سے بڑی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے تقریباً سارے کام کو یکجا کر دیا ہے۔ ورنہ قارئین کے ذہن میں تو مرحوم کی بس ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ساری چیزیں مرحوم کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر ان سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ یہ صرف مزاح نگار نہ تھے۔ بلکہ ادب کے ہر موضوع پر نہ صرف لکھ سکتے تھے بلکہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں۔ جن کا ترجمہ تو مرحوم ہی نے کیا تھا۔ مگر وہ ان کے نام سے نہیں چھپی تھیں۔ جن میں "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں" اور "نوعِ انسان کی کہانی" اور "دیہات میں بوائے اسکاؤٹ کا کام" ہیں۔ ایسے کاموں کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ مگر ہم نے یہ کام بھی کیا یہ کتابیں بچوں کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے ترجمہ کرائی تھیں۔ ان کا ریکارڈ موجود ہے۔ اس نمبر میں ان کتابوں میں سے بھی چند ٹکڑے دے دیئے گئے ہیں۔

مرحوم کے تنقیدی اور فنی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواہ وہ دیباچوں کی صورت میں ہوں۔ خواہ مضامین کی صورت میں۔ نتیجہ خیز بات کرنے میں، فن کی باریکیوں اور اس کی تہ تک پہنچنے میں جیسی نظر ان کی تھی۔ کم کسی کو نصیب ہوئی۔ زیرِ نظر شمارہ میں دیکھئے تو کیا کچھ ہے اور کتنے پائے کا ہے۔

ڈرامہ سے بھی مرحوم کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اچھے ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ڈرامے ڈائریکٹ کیے۔ ڈراموں میں کام کیا اور خوب خوب داد حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب کے نکھار میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ چند ڈرامے اس نمبر کی بھی زینت ہیں۔ یہ ڈرامے کاغذ پر بھی خوب ہیں۔ جب یہ سٹیج ہوئے ہوں گے اور خود بخاری صاحب اسٹیج پر موجود ہوں گے۔ نہ جانے اس وقت کیا قیامت برپا ہوئی ہوگی۔

اس پرچے میں ایک جھگڑے کی بات بھی ہے۔ وہ ہے نیاز مندانِ لاہور کا سلسلہ۔ پہلی بات تو اس میں جھگڑے کی یہ ہے کہ بعض حضرات ان تحریروں کو صرف بخاری صاحب کی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں ایک اور جگہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ صلاح مشورے کی حد تک، سالک صاحب، تاثیر صاحب اور امتیاز صاحب شریک رہے۔ مگر ان میں لکھا پطرس ہی نے۔ چند ایک اسی نوع کی چیزیں ڈاکٹر تاثیر نے بھی لکھی تھیں۔ مگر ہم نے انھیں پیش نہیں کیا۔ ہم جو تین مضمون پیش کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً پطرس ہی کے ہیں۔ تفصیل میں کیا جائیں۔ ایک آدھ کا تو اصل مسودہ موجود ہے۔ دوسرے حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" اس کی شہادت دیتے ہیں (بھلا ایڈیٹر کو مضمون نگار کا پتا نہ ہو) پھر مرحوم کے قریبی دوست بھی میری ہی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً سالک صاحب، تاج صاحب۔

"غنچۂ تبسم" کے مصنف نے ایک بات پطرس کے حوالے سے کہی ہے کہ وہ "مضمون میرا لکھا ہوا نہیں" میرے نزدیک یہ حوالہ نقل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس مضمون پر ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی تھا:

> "جس ذریعے سے ہمیں یہ مضمون ملا ہے۔ اس سے اور مضمون کی گراں قدری سے ہمیں چار احباب پر شک ہو سکتا ہے۔ پروفیسر بخاری، سید امتیاز علی تاج، پروفیسر تاثیر اور قبلہ سالک صاحب۔ ان چار پر اس لیے کہ ایسا وقیع مضمون لکھنے والے "نیاز مند" یہی اربعہ عناصر ہو سکتے ہیں۔ الگ الگ شک کے وجوہ یہ ہیں: (۱) تاثیر صاحب اس سے قبل مکین کاظمی صاحب کے وائلڈ کے ڈرامے کے ترجمہ پر لکھ چکے ہیں۔ جس کا آج تک جواب نہیں دیا جا سکا (۲) سلاست اور روانی تاج کی سی ہے

(۳) ادبی تنقید اور زبان دانی حضرت سالک کی آئینہ دار ہیں۔ (۴) شوخیٔ کلام اور اندازِ بیان سید احمد شاہ بخاری کی چغلی کھا رہے ہیں۔ بلکہ کئی فقرے تو مضامینِ پطرس ہی سے لئے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ہم آہنگی اور نگارش کی یگانگت سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں کا کام نہیں۔ ایک ہی قلم کی تراوش ہے۔ حقیقت کچھ ہو ہمارے شکوک ان چاروں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو زیادہ، امتیاز، سالک اور تاثیر کو کم۔"

ایڈیٹر لفظی پینتروں کے ساتھ واضح اشارے تو کرتے ہیں کہ یہ مضمون پطرس ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک ہو تو کیا کیا جائے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ مضمون لکھ کر بخاری صاحب نے اچھا کیا تھا یا برا۔ مجھے تو ان کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کم از کم یہ تین مضمون پطرس ہی کے ہیں۔ بس! — زیادہ وضاحت میں گیا یا اپنی رائے کو دخل دیا تو گتھم گتھا ہونے کے بڑے امکانات ہیں۔

مرحوم اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ بلاشبہ ان کی تقریروں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا گویا یہ بھی مرے دل میں ہے

یہاں بخاری صاحب کی دو ایک تقریریں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ان کی لسانی خوبیوں کا بھی اندازہ ہو سکے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ یو۔ این۔ او میں تقریر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ساری دنیا گوش بر آواز ہوتی ہے۔ جن کے سامنے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ مانے ہوئے مدبر ہوتے ہیں۔ ایسے گھاگ قسم کے لوگوں کے سامنے اپنی بات کہنا اور پھر منوانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اپنی ایک تقریر کے بارے (جو ہم بھی پیش کر رہے ہیں) مرحوم ہی نے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"پیرس آیا۔ مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی تو حیلہ باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو۔ این۔ او میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔"

اس نمبر میں مرحوم کی اکلوتی مگر معرکۃ الآرا کتاب "پطرس کے مضامین" بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بظاہر اس کا شامل کرنا عجیب سا لگتا ہے مگر ہم نے اس نمبر کو مرحوم کے تمام تر کارناموں سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اس کی بھی اشاعت ناگزیر تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ کہ منتشر مضامین کو یکجا کرنے کے بعد ہمیں یہ خیال گذرا کہ ان مضامین سے، مرحوم کی اتنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا جتنا کہ پہلے سے موجود ہے (اس لیے کہ اس میں تو نرم گرم سبھی کچھ موجود ہے) اسی خوف سے کہ کوئی مرحوم کے انہی منتشر مضامین کو سامنے رکھ کر غلط رائے قائم نہ کر بیٹھے۔ اس کتاب کو شامل کیا گیا۔ تیسری بات یہ تھی کہ مرحوم کا سکہ مزاح نگاری کے سلسلے میں رائج ہے۔ منتشر مضامین میں مزاحیہ انداز کی چیزیں کم تھیں۔[1]

---

[1] یوں بھرپور قسم کا نمبر پیش کرنے کے سلسلے میں ادارۂ نقوش مولانا عبدالمجید سالک کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے بعض شرائط کے ساتھ ہمیں بیگم پطرس سے مضامین کی اشاعت کی اجازت دلوا دی۔ اگر ہمیں مولانا سالک اور بیگم پطرس کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ تو یہ نمبر چھپ ہی نہیں سکتا تھا۔ ادارہ محترمہ بیگم صاحبہ کا بے حد ممنون ہے۔

پطرس کے خطوط، اتنی تعداد میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ یہ خطوط کیسے ہیں؟ ادب میں کیا مقام رکھیں گے؟ میری ناقص رائے میں ان کا فیصلہ بھی اس سے مختلف نہ ہوگا۔ جو مزاح نگاروں کے دربار میں "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہے۔ یہ خوش گفتاری کے تمام آداب کے ساتھ بولتے ہیں۔ اپنا بنا لیتے ہیں۔ پڑھئے گا تو ڈوب جائیے گا۔ سرشاری کی کیفیت پائیے گا۔ پھر نئی ترکیبیں سامنے آتی ہیں۔ نئے استعارے سامنے آتے ہیں جو موہ لیتے ہیں۔ اُتر جاتے ہیں۔ ابوالکلام اور نیاز فتح پوری کی طرح، پطرس فرضی خطوط کے انداز میں مضمون نہیں لکھتے۔ بلکہ ان کا واقعی کوئی مخاطب ہوتا ہے اور یہ واقعی خط ہوتے ہیں۔ جب کوئی ابوالکلام اور نیاز فتح پوری کے مضمونوں کو (بلاشبہ بلند پایہ سہی) خطوط سمجھ کے پڑھتا ہے تو بڑا ظلم کرتا ہے۔ غالب نے بھی بعض خطوط یہ سمجھ کے لکھے تھے کہ یہ چھپیں گے۔ جیسا کہ نواب امیرالدین احمد خاں نے غالب سے کہا۔ آپ کے خط چھپ رہے ہیں۔ ایک خط میرے نام بھی لکھ دیجیے" تاکہ وہ بھی چھپ جائے۔ چنانچہ غالب نے خط لکھا اور وہ چھپا۔ اس کے برعکس یہ خط، خط ہی ہیں — غالب کے بعد اتنے دلکش خط اور کتنے ادیبوں نے لکھے؟ آپ سوچیں۔ میں ایک دو سطریں اور لکھ لوں۔

ہیمر شولڈ نے کہا —— سیاست داں میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ احمد شاہ بخاری میں موجود تھیں۔

بشیر احمد ہاشمی نے کہا —— بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔

رشید احمد صدیقی نے کہا —— پطرس نے اُردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا۔ مگر کتنا اونچا مقام پایا۔

عبدالمجید سالک نے کہا —— احمد شاہ بخاری کی موت علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے۔

امتیاز علی تاج نے کہا —— پطرس کی ڈرامہ پر بڑی نظر تھی۔ کسی ڈرامے میں خود کام کیا تو اپنی ایکٹنگ کا بھی لوہا منوایا۔

صوفی تبسم نے کہا —— بخاری کی حیثیت صرف استاد کی نہ تھی بلکہ وہ طالب علموں کے مشفق رہنما اور دوست تھے۔

عصمت چغتائی نے کہا —— نہ جانے کیوں پطرس بھاگ گئے اور ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔

فیض احمد فیض نے کہا —— بخاری صاحب عالم بھی تھے، ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش گفتار بھی، سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحبِ سیاست بھی۔

محمد طفیل

---

۷۷ - ۷۸

دسمبر ۱۹۵۹ء

(خاص نمبر)

میں آج آپ سے لمبی چوڑی باتیں نہ کروں گا۔ کی بھی کب ہیں۔ باتیں کرنا بھی تو ایک آرٹ ہے۔ جو مجھے نہیں آتا۔

پہلے آپ کی ایک ضروری مسئلہ کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے انتخابی پرچوں کا۔ میری مراد ان رسائل سے ہے جو ادھر اُدھر سے مطبوعہ چیزیں ڈھونڈھا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

ذرا یوں سوچیں کہ میں کرشن چندر یا عصمت چغتائی سے — نیاز فتحپوری یا رشید احمد صدیقی سے — جوش ملیح آبادی یا جگر مرادآبادی سے ہزار منتوں سے ایک چیز لکھواتا ہوں اور اُسے پیش کیے ابھی چند دن ہی گزرتے ہیں کہ دھڑا دھڑ وہی مضمون انتخا

پرچوں میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ لوگ نہ مضمون نگار سے اجازت لیتے ہیں اور نہ چھاپنے والوں سے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ رسالے جو پوری تندہی کے ساتھ ادیبوں سے نئی چیزیں لکھواتے ہیں۔ ایسے پے بہ پے حملوں سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ادبی پرچے جو پہلے ہی سسک رہے ہیں۔ وہ اس دھاندلی کی وجہ سے بھی دم توڑے دے رہے ہیں۔ محنت کوئی کرے اور فائدہ کوئی اٹھائے۔ یہ مسئلہ صرف میرا نہیں ہے (بلکہ میرا تو کسی حد تک ہے ہی نہیں) بلکہ اُن تمام ادبی رسائل کا ہے۔ جنہوں نے ماضی میں بڑا کام کیا۔ مگر آج نڈھال ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں یا اُن پرچوں کا، جن کی اٹھان اچھی ہے مگر انھیں یہ "قینچی پرچے" ختم کیے دے رہے ہیں۔

میرا قارئین سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ ایسے چوری کے مضامین چھاپنے والے پرچوں کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کریں اور ادیبوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ ایسے پرچوں سے کسی قسم کا تعاون نہ کریں۔ ورنہ آج نہیں تو کل انتخابی پرچے نتائج کے اعتبار سے مہلک ہی ثابت ہوں گے۔

یہ اعتراض ادارۂ نقوش پر بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے بھی تو چھپی ہوئی چیزوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ تسلیم، مگر ہمارے ہاں کاتا اور لے دوڑی والی بات نہیں ہے۔ ہم نے اگر استفادہ کیا بھی ہے تو حال کی چیزوں سے زیادہ ماضی کی تخلیقات سے کیا ہے اور ایسی چیزوں کا حصول نئی چیزوں کے حصول سے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے۔ پھر ہمارے سامنے ایک پروگرام ہوتا ہے۔ ایک موضوع ہوتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ متعلقہ موضوع پر ادب کی دو ڈھائی سو سالہ تاریخ مرتب ہو جائے اگر انتخابی پرچوں کو چھپی ہوئی چیزیں ہی چھاپنے کا شوق ہے تو وہ آئیں اور ہماری طرح اپنے آپ کو انگاروں پر لوٹنا سکھائیں۔ ابھی ادب کے بڑے بڑے موضوعات تشنہ ہیں اور ان موضوعات کو ہمارے خون کی ضرورت ہے۔ ہماری دیدہ وری کی ضرورت ہے۔

(۲)

پطرس نمبر کے بعد، میرا ذرا سستانے کا ارادہ تھا۔ کام کی زیادتی سے آدمی تنگ بھی تو آ جاتا ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح جُتے رہنا معقولیت بھی تو نہیں۔

میں نے کرشن چندر کو ایک خط لکھا اور یہ رونا رویا کہ اردو افسانہ کا جنازہ نکل رہا ہے۔ مگر آپ چُپ ہیں۔ ذرا مجھے بتائیں تو ماجرا کیا ہے؟ میری شامتِ اعمال کہ انہوں نے کام کی باتیں لکھ کر بھیج دیں۔ اب مجھے یہ چُل کہ یہ خط چھپ جائے۔

سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ کہ یہ خط کس انداز سے چھاپوں۔ ذہن نے کئی رستے سجھائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ صرف افسانہ ہی تو رو بہ زوال نہیں ہے۔ پورے ادب ہی کا یہ حال ہے۔ اس لیے کیوں نہ اس موضوع پر ایک سمپوزیم ہو جائے چنانچہ صاحب! کرشن چندر کا جواب میرے اس خاص نمبر کا محرک ہے۔ ورنہ بخدا میرا ارادہ ایک عام نمبر ہی نکالنے کا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اگر آپ اسے بھی عام نمبر ہی سمجھیں۔ ہر چند کہ ٹائٹل پر خاص نمبر لکھا ہوا ہے۔

سمپوزیم کے سلسلے میں، میں نے اہتمام یہ کیا ہے کہ جو ادیب جس صنفِ ادب پر لکھنے میں نام پا چکا ہے۔ وہ اگر رائے دے تو صرف اپنے ہی موضوع پر تاکہ فنکار کے بھی جذبات و خیالات کا علم ہو۔ اس ضمن میں ہر صنفِ ادب پر ایک ایک تفصیلی مضمون ہے اور باقی آرا۔ افسانہ پر تفصیلی مضمون قرۃ العین حیدر کا ہے۔ شاعری پر جوش ملیح آبادی کا اور تنقید و تحقیق پر ڈاکٹر نذیر احمد کا — اس "اُپج" پر میں تو

مطمئن ہوں کہ میں نے وقت کے ایک ضروری مسئلہ پر (غور و فکر کے لیے) کام کا مواد پیش کیا ہے — اور اپنی رائے سے قصداً گریز کیا ہے۔ سُنی سب کی ہیں۔ کہی کوئی نہیں کچھ کہوں گا تو دوستوں کی گھُرکی کا ڈر ہے۔

(۳)

کرشن چندر نے جہاں مجھے اس نمبر کے سلسلے میں "غلط راستے" پر ڈالا۔ وہاں ایک مصیبت اور بھی کھڑی کر دی وہ یہ کہ ایڈیٹر لوگ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ میرے سوا یہ کام سارے ایڈیٹر کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس سے قصداً پہلوتہی کی اور یہ چاہا کہ نقوش کا معیار ہی اتنا بلند ہو کہ جو کوئی نیا لکھنے والا اس میں نظر آئے۔ اس کے بارے میں یہ سمجھا جا سکے کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہو گی۔ مدعا دونوں کا ایک ہے توصیفی جملے لکھنے والوں کا بھی اور میرا بھی۔ کوئی لکھ کر اس کا اظہار کر دیتا ہے اور کوئی نہ لکھ کر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

اگر تعارفی جملوں سے نئے لکھنے والے کل کلاں کو بڑے ادیب بن سکتے ہیں، تو لیجیے میں آج ہی سے توصیفی جملے بانٹنے کی بسم اللہ کیے دیتا ہوں۔ بخل کیسا! مگر مجھے کوئی جاندار لکھنے والا نظر آئے۔ جو چونکا دے۔ اپنی طرف متوجہ کر لے — میں نے ہر شمارہ میں تین چار نئے لکھنے والوں کو پیش کیا ہے۔ بے شک نقوش کا کوئی سا پرچہ اٹھا کے دیکھ لیں۔ افسانوی حصہ میں اب کے پھر دو نئے لکھنے والوں کو لایا ہوں۔ پہلی ہیں طاہرہ، بنگال کی رہنے والی، انہوں نے مجھے بڑا معصوم سا خط لکھا۔ ساتھ ہی افسانہ بھیجا۔ میں دونوں ہی پیش کر رہا ہوں۔ خط نہ پیش کرتا تو افسانے کا بھی اتنا لطف نہ آتا۔ خیر افسانہ تو کوئی بڑا افسانہ نہیں ہے۔ مگر اُن کا اُردو زبان سے جو لگاؤ ہے۔ وہ ہے قابلِ قدر۔ بنگلہ زبان میں لکھے ہوئے ناول اور افسانے اُردو کے ناولوں اور افسانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ ناول تو اُردو سے کچھ آگے ہی ہیں۔ اگر طاہرہ بھی ہمیں بنگال کی زندگی کے بارے میں کہانیاں لکھ کر دیں اور محنت سے لکھ کر دیں تو عجب نہیں۔ ان کا نام بھلایا نہ جا سکے۔

دوسرے ایوب جاوید ہیں۔ انہوں نے جو افسانہ لکھا ہے۔ وہ واقعی افسانہ ہے اور ایسا افسانہ ہے جسے مانتے ہوئے افسانہ نویس بھی پڑھیں تو چونکیں ضرور، ہُما شُما کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کا مشاہدہ پختہ اور تشبیہات نادر ہیں اور ایسی نادر کہ بڑے بڑوں سے پانی بھروا لیں۔ پھر افسانوی تکنیک پر بھی دسترس، قیافہ ہے اگر انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ افسانے لکھے تو چوٹی کے افسانہ نویس ثابت ہوں گے — میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ جنسی موضوعات سے اپنے آپ کو جتنی جلد ممکن ہو بچا لیں۔ مگر یہ تو نفسیاتی افسانہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ!

مضمون نگاروں میں ایک صاحب ہیں نثار احمد فاروقی، پہلے انہوں نے نقوش میں شخصیت نگاری پہ ایک مضمون لکھا تھا۔ دوسرا مضمون یہ ہے۔ بلکہ نہیں یہ تیسرا مضمون ہے۔ جس نے پہلے دو مضمون پڑھے ہیں۔ وہ میری بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کے لب و لہجہ میں مٹھاس ہے۔ مواد کی تہ میں درک ہے۔ جو آج کئی لکھنے والوں کو نصیب نہیں۔ آپ حضرات میری بات لکھ لیں کہ فاروقی صاحب اپنی ریاضت سے اپنے جنوں سے' ایک نہ ایک دن اپنا لوہا ضرور منوا لیں گے — میں چاہتا ہوں ایمان لانے والوں میں میرا نام سرِفہرست آئے۔

(۴)

پطرس نمبر پر حسبِ معمول واہ واہ ہوئی۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس ضمن میں آئے ہوئے ڈھیروں خط چھاپ دوں۔ پھر سوچتا ہوں بات ذرا ہلکی

رہ جائے گی۔ چلیے صرف ایک خط آپ پڑھ لیں۔ باقیوں کو میں خود دوبارہ پڑھتا ہوں۔ کیا کروں، انا کو کسی طرح تو تسکین ملے۔

" طفیل صاحب، لارڈ کرزن جب تاج محل دیکھنے آگرہ گئے تو ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ انہوں نے تاج دیکھ کر اپنے شوہر سے کہا۔" اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میں یہاں دفن ہو سکتی ہوں تو اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

پطرس نمبر دیکھ کر میں نے بھی دل میں کہا کہ" اگر طفیل صاحب میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی خصوصی نمبر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

نیاز فتحپوری

---

٧٩ - ٨٠

آدب عالیہ نمبر

اپریل ١٩٦٠ء

ادب کی براتیں، اس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں گم ہو جائیے گا تو شہنائیوں کی آوازیں، آج بھی سنائی دیں گی۔

اور لاڈلوں کی طرح، نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سپرد ہوئے۔ سیانے کہتے ہیں، بچپن کی تربیت ہی پر مستقبل کی نشان دہی ہوا کرتی ہے۔

پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سید وقار عظیم کی آغوش میں پلتا رہا۔ کسر کسی نے بھی نہ اُٹھا رکھی۔ سبھی نے لاڈ پیار سے رکھا۔

ابھی نقوش تین ہی ماہ کا ہوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اس کی بہن بھاتی نہ تھی۔ انہوں نے ایسی چال چلی کہ یہ بے چارا چھ ماہ تک بے سدھ پڑا رہا۔

جب نقوش سمجھنے اور ٹوں ٹاں کرنے لگ گیا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیماری سمیت اُس وقت اس کی عمر کوئی ڈھائی برس ہو گی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری۔ میری راتوں کی نیند اُچٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صورت سا اور ہونہار بچہ، اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہو گی۔ میں تو لاجوں مرتا رہا۔

میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں۔ حوصلے اتنے، وسائل محدود۔ اللہ کی بارگاہ میں دن رات دعائیں مانگیں۔

پھر تو کرنا خدا کا یہ ہوا۔ نقوش نے اپنے پرائے کا من موہ لیا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی محنت کی اور اتنے خلوص سے کی کہ اس نے ایک ایک سال میں، دو دو تین تین امتحان دینے شروع کر دیے اور خدا کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس کے کئے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کے دیکھ لیں۔ اس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہو گا۔

اس کی قابلیت نے، اس کے بہت سے حاسد بھی پیدا کر دیے ہیں۔ جو اس سے للّہی عناد رکھتے ہیں۔ گو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مگر اس سے دل دکھتا ہے۔ حالانکہ یہ اپنی ہی دھن میں دیوانہ وار چلا جا رہا ہے۔ کسی سے کچھ غرض نہیں۔ مگر لوگ ہیں کہ اسے کنکریاں مارنے سے باز نہیں آتے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں۔ یہ رنجشوں کی بازی کو بھی محبتوں سے جیتنا چاہتا ہے۔

ماشاء اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بانکپن تو دیکھے۔ ڈرتا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ للہ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں۔ میں تو دیوانہ ہوں۔ دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا۔ مگر مجھے اتنا ہوش ہے۔ آج میرے بھی لاڈلے کی برات چڑھی ہے۔

محمد طفیل

---

۸۱ - ۸۲

جون ۱۹۶۰ء

آئیے آج اسی شمارے کی باتیں کریں —

میری خوش قسمتی کہ آپ کے نقوش کا عام شمارہ نکل رہا ہے۔ خاص نمبر نکالنا اور تلوار کی دھار پر چلنا، میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ ارادہ ہے کہ ابھی دو چار ایسے ہی "غریبانہ قسم" کے عام شمارے نکالوں۔ تاکہ ذرا سستا لوں اور اس قابل ہو سکوں کہ اپنے ادبی گناہوں کا کفارہ پھر کسی اہم نمبر کی صورت میں ادا کر سکوں۔

۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ ہمارے ہاں 'مسودات' کے انبار میں ایک افسانہ "بونے" بھی پڑا تھا۔ اسے پڑھا تو صادق حسین سے ملاقات ہوئی۔ وہ افسانہ چھپ گیا۔ چھوٹا سا سیدھا سادا، مگر اچھا افسانہ تھا۔ غالباً یہ ان کا پہلوٹھی کا افسانہ تھا۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہ تھا کہ ایک دن یہ ایسے افسانے لکھیں گے کہ 'نقوش' ان کی اشاعت پر سینہ تان سکے گا۔

ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جب تک لکھنے والا صورتاً مرنے کے قابل نظر نہ آئے۔ اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اب کے ذرا نقادوں سے پوچھوں کہ آپ صادق حسین کے افسانے پڑھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں پڑھ رہے تو میری بات سن لیں۔ یہ نئے افسانہ نگاروں میں تو ممتاز نظر آ رہے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں سے ان کے افسانوں کا تقابل، احتراماً مقصود نہیں۔ بہرحال ان کے اکٹھے تین افسانے پیش کئے جا رہے ہیں۔

اپنے ادب کا دامن جبھی وسیع ہوگا۔ جب ہم دنیا کے بڑے ادب میں سے بھی اپنے وہاں کچھ نہ کچھ منتقل کرتے رہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہمیں جاپانی ڈرامے کی ایک خاص صنف سے روشناس کرایا ہے اور شروع میں چند ایک صفحے، بطور تمہید لکھ کر بڑی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ ضرورت ہے سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب (معاف کیجئے گا، ہر ادیب کے حصے میں سوجھ بوجھ نہیں آیا کرتی) برابر اردو میں ایسی چیزیں منتقل کرتے رہیں۔ ان کا ادب پر احسان ہوگا۔

"پکے کافر" اور منفرد ادیب جناب نیاز فتحپوری ۹ مئی ۱۹۶۰ء کو لکھنؤ سے لاہور پہنچے۔ ادارۂ نقوش میں لاہور کے دانشوروں نے ان کا استقبال کیا۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔ مزے مزے کی چوٹیں ہوئیں۔ اب میں کیسے ان قہقہوں میں آپ کو شریک کروں؟ اور کیسے بتاؤں کہ زبان و ادب کے کیسے کیسے ادق مسئلے منٹوں میں پانی ہوئے۔ بہرحال چند تصویریں اس محفل کی یادگار ہیں۔ جو "تصویری مضمون" کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

آج سے پندرہ بیس برس پہلے راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ پھر نہ ملیں۔ چنانچہ میں نے راجہ مہدی علی خاں کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ بھی لگا رکھا تھا۔ مگر پچھلے دنوں ان کے تین خط آئے۔ پھر ایک زندہ قسم کی نظم بھی ملی۔ اب میں کیسے یقین کروں کہ راجہ مہدی علی خاں مر چکے تھے

محمد طفیل

---

۸۳ - ۸۴

اگست ۱۹۶۰ء

لڑائی جھگڑوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعضوں کا مشغلہ یہ بھی ہے۔ میں نے انتخابی پرچوں کے بارے میں اصولی باتوں کو چھیڑا تو کراچی کا ایک پرچہ بدک اٹھا۔ میں نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مخاطب کوئی ایک رسالہ نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے ہی رسالے تھے جو صرف انتخاب چھاپا کرتے ہیں۔ مگر "موصوف" نے بے قابو ہو کر (واضح اشاروں کے ساتھ) غریب نقوش کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ دیکھی سینہ زوری ہماری بلی ہمیں سے میاؤں، یعنی ایک تو ہماری اجازت کے بغیر چیزیں چھاپیں۔ اُلٹا ڈانٹیں بھی۔ ہم تو کسی سے بھی اُلجھنا نہیں چاہتے، نہ ہمیں کسی ایک رسالے سے کوئی سروکار ہے۔ نہ ہم اس بحث کو ذاتی بحث بنانا چاہتے ہیں۔

یاروں نے کہا (مدیرانِ رسائل نے) کہ کسی طرح انتخابی پرچوں کی وبا کو روکا جائے۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے پرچے بند ہو جائیں گے، اس لیے کہ ہم نئے مضامین حاصل کرنے کے لئے اَن تھک محنت کرتے ہیں) اور انتخابی پرچے بکا کریں گے (اس لیے کہ انہوں نے دو روپے کی قینچی خرید لی ہے۔

اسی ضمن میں، میں نے ایک آدھ بار پہلے بھی لکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے ساتھ چند دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ پہلے آپ اُن کی باتیں سُن لیں۔ میں تو گھر کا آدمی ہوں۔ میری باتیں تو آپ روز سنتے ہیں:

برادرم سلام مسنون۔ آپ کا ایک خط دس بارہ دن پہلے آیا تھا اور میں عجب چہ کنم میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں؟ اس سے چھوٹنے نہ پایا تھا کہ ایک اور خط آ گیا اور اب پھر دو دن جواب سوچنے میں گزر گئے۔

برادرِ عزیز! مجھے اپنی دونوں آنکھیں پیاری ہیں۔ آپ بھی مجھے عزیز ہیں اور شمس صاحب بھی۔ آپ کی شکایت کو رفع کرنے کے لئے میں نے شمس صاحب سے کہہ دیا تھا کہ جو مضمون نقل کریں اس کی اجازت پہلے مضمون نگار سے حاصل کر لیں۔ دوسری بات یہ کہ نقوش کے تازہ پرچہ سے کوئی مضمون فوراً نقل نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جس مضمون کا کاپی رائٹ صاحبِ رسالہ کے پاس ہو اُسے یا تو نقل نہ کریں یا صاحبِ رسالہ سے اجازت لے کر نقل کریں۔ میری اور آپ کی گفتگو میں یہی باتیں طے ہوئی تھیں۔ شمس صاحب نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور ان پر عمل بھی کرنے لگے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں؟ میرے خیال میں تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ "نقوش" کا قدردان تو نقوش ہی خریدے گا۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گا کہ نقوش کے اچھے افسانے جب نقش میں چھپ کر آئیں گے تو پڑھ لے گا۔

نقوش اپنی جگہ پر ایک بھاری پتھر ہے، بلکہ پہاڑ ہے جسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ لہٰذا آپ چشم پوشی سے کام لیجئے۔ باسی روٹیاں تو کشکولوں ہی میں جگہ پاتی ہیں۔

خاکسار شاہد احمد[1]

طفیل صاحب اس وقت یہی اشعار ذہن میں ہیں جو بھیجتا ہوں، جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوئے انتخابی پرچوں کا مسئلہ خالص کاروباری مسئلہ ہے، میں کاروباری اعتبار سے انھیں یقیناً غیر مستحسن سمجھتا ہوں لیکن اس بارے میں آپ کی رائے زیادہ وقیع ہے۔ فقط

فیض احمد فیض

"انتخابی" رسائل میں ادبی تخلیقات کی پے در پے اشاعت ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ ہر مہینے مختلف معیاری ادبی رسائل کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھاپنے والے اصحاب کے پاس اگر اپنے اس فعل کا کوئی جواز ہے تو صرف یہ ہے کہ یوں ہمارے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا ادبی اور جمالیاتی ذوق نکھرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے سہارے چلنے والے رسالے اپنے فعل کا یہ جواز پیش کر کے در پردہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو ایسا کر کے ادیبوں اور شاعروں پر احسان کرتے ہیں اور انھیں ہمارا ممنون ہونا چاہئے اور اس لیے انھیں حرفِ شکایت زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ ان اصحاب میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی (اور اگر سوچا ہے تو اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے) کہ اگر پاکستانی فن کاروں کے افسانے اور اشعار "اشاعت پر اشاعت" کے مستحق ہیں تو ہر اشاعت کے معقول[2] معاوضے کے بھی تو مستحق ہیں دوسروں کو بزعمِ خود ان کی جیبوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلا کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرنے والے چاہے محل کھڑے کر لیں۔ مگر ہمیشہ جیب کترے ہی کہلائیں گے۔ اگر بعض حضرات کو "ڈائجسٹ" قسم کے رسالے چھاپنے کا شوق ہے تو انھیں اس حقیقت کو بھی تو "ڈائجسٹ" کرنا چاہئے کہ ادیب اپنی تخلیق صرف ایک رسالے کو اشاعت کے لیے دیتا ہے اور اس کے بعد سب تخلیقات کو اس توقع کے ساتھ مجموعوں میں جمع کر دیتا ہے کہ ادب کے قارئین انھیں ہاتھوں ہاتھ ضرور خریدیں گے۔ اگر "انتخابی" رسالے چھاپنے والے اصحاب کو لوگوں کا ادبی ذوق نکھارنے، ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے کے مقاصد ایسے ہی عزیز ہیں (اور یقیناً یہ بڑے مبارک مقاصد ہیں) تو وہ یوں کریں کہ معیاری ادبی کتابوں کی بیش از بیش خریداری کی ملک گیر تحریک چلائیں اس کام کے لئے وہ رسائل میں سے مضامین چپکے سے اُچک لینے کے بجائے ہر مہینے نئی ادبی مطبوعات کی ایک جامع اور خوب صورت فہرست شائع کیا کریں۔ یوں وہ ادب اور ادیب کی بے مثال خدمت کریں گے۔ مگر کیا وہ ایسا کریں گے جبکہ اس ماہانہ فہرست کتب کو بہت ہی کم لوگ خریدیں گے اور انھیں بہت ہی کم آمدنی ہوگی۔ ثابت ہوا کہ اصل مقصد نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ادیب کی (اخلاقی) امداد۔ اصل مقصد حصولِ زر ہے۔ اس صورت میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ہمہ گیر استحصال کو متحد ہو کر روکیں۔

---

[1] بھائی شاہد کا ماہنامہ نقوش سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ صرف مدیر نقوش سے دوستی ہے جس کا اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

[2] سنا ہے کہ یہ حضرات دس روپے فی غزل اور بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے ادیبوں کو ٹرخا رہے ہیں۔

جن ادیبوں اور شاعروں نے ان "انتخابی" رسائل کو اپنی تخلیقات مفت میں چھاپنے کے "دوامی" اجازت نامے دے دیئے ہیں وہ یہ اجازت نامے واپس لے لیں اور صرف اس صورت میں اجازت دیں جب یہ رسالے انھیں معقول اور مناسب بلکہ پہلی اشاعت سے دُگنا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ آخر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی کتابوں کے پانچ دس ہزار مستقل قارئین سے ہاتھ دھونے کی اجرت تو ملنی چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی

کیا ہمارے ہاں کوئی صحیح قسم کا ادبی ڈائجسٹ چھپ رہا ہے؟ صحیح قسم کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ کوئی بھی شریفانہ کام ہو اس کے چند آداب ہوتے ہیں۔ اگر یہ آداب محفوظ رکھے جائیں تو بلیک مارکیٹ، تجارت اور سرقہ بھی فن کہلائے گا۔

ہمارے اکثر انتخابی پرچے انتخاب کے کسی معقول معیار سے محروم ہیں۔ مگر یہ تو اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیک انتخاب کا یہی معیار معقول اور مقبول ہو۔

انتخاب کے معاملے میں نہ تو ادیب کی رائے لی جاتی ہے نہ اجازت اور نہ معاوضے کی ادائیگی کا منافع بخش معاملہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادیب کو تو صرف اس اعلیٰ قسم کی بات سے خوش کر دیا جاتا ہے کہ اسکی تخلیق انتخاب میں آگئی ہے۔ بھلا خوشی سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ انتخابی جرائد ادھر ادیب کو خوشیوں کے معاوضے سے مالا مال کرتے ہیں، اُدھر اُن ادبی رسائل کا شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں جن کی چیزوں سے اپنے پرچے کو مالا مال کرتے ہیں۔ شکایت کا کسی کو بھی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ مگر مشکل یہ ہے شکریہ اور خوشیوں کا معاوضہ دونوں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ انتخابی رسائل ان پرچوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جو ہزاروں دقتوں کے بعد ادیب کو معاوضہ ادا کر کے اپنے آپ کو بناتے سنوارتے ہیں۔ مگر ان کا شمارہ ابھی اپنے قارئین تک ڈھنگ سے پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ انتخابی جریدے ان کا نچوڑ حاصل کر کے اسٹال پر پہنچ جاتے ہیں۔ لکھا لکھایا سامان مل گیا چھاپ کر سستے داموں بیچ ڈالا۔ ادھر قاری کا یہ رویہ کہ انتخاب کا انتظار ہو رہا ہے۔ مہنگے ادبی رسائل کون خریدے۔ روپیہ بارہ آنے خرچ کر کے ملک کے تمام رسائل کے ادب کا نچوڑ پڑھ لیا گیا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ اس انتخاب میں واقعی نچوڑ ہے یا نہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادبی رسائل کے مالک سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ وہ بھی آسان ترکیب استعمال کریں۔ مجھے ایک اچھے خاصے اشاعتی ادارے کے بارے میں معلوم ہے کہ پہلے اس نے ایک ادبی پرچہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں ادبی ڈائجسٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل ہمارے ملک کا ماحول ابھی ادبی ڈائجسٹ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پڑھے لکھے باذوق پاکستانیوں کی تعداد کم ہے۔ اچھے ادبی رسائل بھی دو چار ہی شائع ہوتے ہیں۔ معقول کتابوں کی منڈی بھی محدود ہے۔ اگر ادبی رسائل اور کتب کا حصہ انتخابی جریدے سنبھال لیں تو انجام ظاہر ہے۔

خدیجہ مستور

برادرم طفیل صاحب! اس وقت مسئلہ پیش نظر یہ ہے کہ یہ جو "....." اور "....." وغیرہ اُردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد میں سے مستقلاً چیزیں لے کر شائع ہو رہے ہیں تو ان کے اس اقدام سے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور ہم اس سے کن صورتوں میں اور کہاں تک متاثر ہوتے ہیں! ۔ میں یہاں دو حیثیتوں سے اظہار خیال کروں گا۔ میری پہلی حیثیت ایک مصنف کی ہے ایک ایسے مصنف کی جو کچھ تجارتی رموز بھی جانتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ایک مصنف رسائل و جرائد میں جو کچھ لکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے

لکھتا ہے کہ ایک دن اس کی یہی ذہنی کاوشیں جمع ہو کر ایک مستقل صورت یعنی کتابی شکل اختیار کر لیں گی اور وہ ناشر سے اس کتاب کے عوض ایک معقول معاوضہ حاصل کرنے کا حقدار ہو جائے گا۔ اب اگر کسی مصنف کی تخلیقات کتاب میں تشکیل پذیر ہونے سے پیشتر دو تین مرتبہ منظرِ عام پر آ چکی ہیں تو لازماً اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا، اور نتیجتہً کتاب زیادہ فروخت نہیں ہو سکے گی جس کا اثر براہِ راست مصنف کی ذات پر پڑے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مرقومہ بالا پرچوں کی روش، تجارتی اعتبار سے ہر مصنف کے لیے نقصان دہ ہے۔

میری دوسری حیثیت ایک ایڈیٹر کی ہے — ایک ایسے ایڈیٹر کی جس کی زندگی کے کم و بیش ستو سال ایک ادبی ماہنامے کے ادارتی فرائض ادا کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادارت کتنی محنتِ شاقہ کی متقاضی ہے اور مدیر رسالہ کو اپنا رسالہ زندہ رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں کے سامنے جو مضامینِ نظم و نثر آتے ہیں وہ عموماً اس انداز میں نہیں آتے جس انداز میں مصنفوں نے انہیں لکھا ہے۔ ایڈیٹر بسا اوقات گھنٹوں محنت کر کے ان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ ان کے حصول کی خاطر اہلِ قلم سے طویل مراسلت کرتا ہے بعض مضامین پر معاوضہ بھی دیتا ہے اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہے۔ جب کہیں جا کے رسالہ چھپ کر قارئین کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ایک ایڈیٹر کے لیے یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ ہر طریق پر محنت تو وہ کرے اور فائدہ اس کے اپنے پرچے کی بجائے ان رسالوں کو پہنچ جائے جن کے مدیرانِ کرام وقت کا بہت مختصر سا حصہ صرف کر کے مختلف رسالوں کے منتخب مضامینِ نظم و نثر پر محض نشان لگا کے کاتبوں کے حوالے کر دیں اور یوں ان کے رسالے اشاعت پذیر ہو کر مارکیٹ کے بیشتر حصے پر غاصبانہ قبضہ کرتے ہیں؟

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو پرچہ ہر ماہ ہمارے معیاری جریدوں کی نمایاں چیزیں اپنے دامن میں سمیٹتا رہتا ہے اس کا خیر مقدم ان پرچوں کے مقابلے میں زیادہ گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جن سے وہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور یہ ہمارے پرچوں پر ایک ناقابلِ برداشت ظلم ہے۔

ان زیادتی کرنے والے پرچوں کے خلاف متفقہ طور پر قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہوگی اسے اہلِ قلم اور مدیرانِ رسائل و جرائد کی پرجوش تائید حاصل ہوگی۔

میرزا ادیب

اردو میں ڈائجسٹ طرز کے رسائل کا سوال، اردو ادب میں ایک لمحہ فکریہ بن گیا ہے۔ سب سے اوّل ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بدعت جہاں سے آئی ہے وہاں اس کا طرزِ عمل کیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جو ڈائجسٹ رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو صرف شائع شدہ کتب اور مضامین کا خلاصہ تیار کرا کر شائع کرتے ہیں۔ کسی بڑے ناول یا مضمون کا خلاصہ یعنی نفسِ مضمون کسی قابل اہلِ قلم سے چند صفحات میں تیار کرایا جاتا ہے اور مرتب کنندہ کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اصل کتاب یا مضمون یا افسانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جن لوگوں کو یہ پسند ہو یا ان کے مذاق کی چیز معلوم ہو وہ اصل کتاب یا مضمون حاصل کر کے اس کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے رسائل اور کتب کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ ڈائجسٹ رسائل ہیں جو مدیران رسائل سے اجازت حاصل کر کے ان کے حوالہ مضمون نقل کرتے ہیں۔ پاکستان کے اردو ڈائجسٹ رسائل کتابوں، افسانوں یا مضامین کا خلاصہ تو تیار نہیں کراتے کیونکہ یہ کام تو اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے رسائل کے مضامین کو اکثر بلا اجازت نقل کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی، ہینگ

لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

ہمارے ہاں یہ بدعت کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ میرے عزیز دوست اختر شیرانی مرحوم نے اسی قسم کا ایک رسالہ انتخاب کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو چند مہینے شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے تمام مضامین دوسرے رسائل سے نقل کیے جاتے تھے اور کتابت، طباعت بہترین ہوتی تھی اور مضامین پر اختر صاحب کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ عالمانہ اور محققانہ ہوتے تھے۔ اس کے باوجود پبلک نے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا تھا۔ بلکہ بعض تو اٹھا کر پھینک دیتے اور کہتے کہ اوہ! اس میں تو تمام مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔ اُس زمانہ میں مطبوعہ مضمون چھاپنا ایک گالی تھی اور کسی اخبار یا رسالہ کی یہ سب سے بڑی ہتک کی بات تھی کہ وہ کوئی شائع شدہ مضمون نقل کرے۔

میں ۳۸ سال سے نیرنگِ خیال کو شائع کر رہا ہوں۔ کیوں کر اور کیسے؟ اس کی واردات لکھوں تو خونِ جگر اور آنسوؤں، آہوں اور چیخ و پکار کی داستان ہوگی۔ ہم لوگ ایک مضمون حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں۔ پہلے زمانے میں مضمون دس بیس، سو پچاس سے نہیں ملتے تھے۔ اہلِ قلم معاوضہ لینا گناہ اور ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اگر لکھتے تھے تو شوق سے، اپنے نام کے لیے، خدمتِ فن کے لیے۔ ادب کے لیے۔ عوام کے افادہ کیلئے۔ اس کے لیے ایڈیٹروں کو اہلِ قلم سے ذاتی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے ہندوستان کے درجنوں سفر کیے، دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی تک خاک چھانی۔ میرا دورہ قریباً ہر سال ہوتا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف اہلِ قلم سے ذاتی تعارف و تعلق پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آج کے معاوضہ سے جو بعض اصحاب حاصل کر رہے ہیں ہمیں اس مد میں اس سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور اس کے ساتھ زحمتِ سفر مستزاد۔

ایک واقعہ سن لیجئے۔ سید امتیاز علی تاج نیرنگِ خیال میں لکھا کرتے تھے اُن سے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئین کرام نہیں کر سکتے۔ ہر اہلِ قلم جداگانہ مزاج اور انفرادی ساخت رکھتا ہے۔ امتیاز صاحب سے مجھے ایک افسانہ تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ملا۔ یقین کیجئے کہ یہ چیز اٹھائیسویں چکر میں ملی تھی۔ ایک ایڈیٹر[1] ۲۸ بار کوشش کرنے کے بعد ایک مضمون حاصل کرتا ہے۔ اُس نے کتنا وقت اس کے لیے دیا اور تانگہ (سواری) کے اخراجات کیا ہوئے۔ کیونکہ وہاں جب بھی جانا پڑتا۔ دوریٔ مسافت کی وجہ سے بغیر سواری کے نہ جا سکتا تھا۔ یہ افسانہ نیرنگِ خیال میں شائع ہوا تو میرے دوست اختر صاحب نے اسے انتخاب میں نقل کر لیا۔ چند دن بعد وہ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے انھیں کہا کہ اختر صاحب دو سو روپے آپ کے ذمہ ہیں۔ وہ کہنے لگے کیسے! میں نے کہا آپ نے نیرنگِ خیال سے جناب تاج صاحب کا جو افسانہ نقل کر لیا ہے اس کا معاوضہ! اختر صاحب نے کہا۔ واہ حضرت، دیکھئے افسانہ نقل کیا اور ٹھاٹھ سے نقل کیا اور حوالہ بھی دیا اور نوٹ بھی لکھا۔ کیا آپ نے تاج صاحب کو کچھ معاوضہ دیا تھا؟ میں نے کہا معاوضہ تو نہیں دیا نہ وہ مجھ سے معاوضہ لیتے ہیں۔ لیکن تین ماہ کی کوشش کے بعد اٹھائیسویں پھیرے میں یہ افسانہ ملا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آپ نے

---

[1] اس شمارے میں مجنوں گورکھپوری کا ایک طویل افسانہ "تنہائی" چھپ رہا ہے۔ خود موصوف کا خط پڑھ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ مجھے ایک افسانہ حاصل کرنے کے لیے کتنے برس صرف کر دیئے ہیں۔ (مدیر)

اُسے نقل کر کے نیرنگِ خیال کی انفرادیت، وقار اور شہرت کو نقصان پہنچایا۔

حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد انہوں نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے "حکیم صاحب میں نے اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا تھا، ہماری قینچی بے پناہ ظلم کر رہی ہے اور اس کے ساتھ پبلک بھی پرچے سے نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں تو چھاپہ شدہ (نقل شدہ) مضامین ہوتے ہیں۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، یہ پرچہ تو خود بخود بند ہو جائے گا۔" اور آخر انتخاب بند ہو گیا۔

آج میں سید امتیاز علی صاحب کا مضمون اس لیے شائع نہیں کر سکتا کہ بوڑھا اور ضعیف ہو جانے کی وجہ سے ۲۸ چکر اُن کی کوٹھی کے لگانے کی سکت اور ہمت اپنے میں نہیں پاتا

وہ رسائل جو نقل شدہ مضامین کے بل بوتے پر تجارت کر رہے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مضامین کا حصول کتنا دشوار اور سنگلاخ مسئلہ ہے اور نقد معاوضہ سے زیادہ اہمیت، تعلقات اور مضمون حاصل کرنے کی جد و جہد کو ہے۔ پھر کسی ایڈیٹر کی قینچی یا لال پنسل کا نشانہ اُسے اپنے پرچے کی زینت بنا لے تو کیا یہ ظلم نہیں ہو گا؟

حکیم یوسف حسن

میرا اندازہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس مسئلے کے تمام تر پہلوؤں پر سوچا ہی نہ تھا۔ بظاہر تو یہ سہانا خواب ہے مگر اس کی تعبیر بے حد خوف ناک۔

ارادہ نہ تھا کہ اس مسئلے میں احباب کو بھی زحمت دیتا پھر سوچا مشورے کی حد تک حرج ہی کیا ہے! اطلاع دی تو وہ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہو لئے۔ اب میں اس سلسلے کو پوری معقولیت کے ساتھ اور آگے بڑھاؤں گا۔ پاک و ہند کے سارے ادیب میرے دوست ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ وہ میری بات سنیں گے اور ہماری جائز مشکلوں میں ہمارا ساتھ بھی دیں گے۔

سب سے پہلے تو انتخابی پرچوں پر یہ چوٹ پڑی کہ انھیں مصنفین کو بھی معاوضہ دینا پڑ گیا۔ ورنہ صاحب پہلے کون پوچھنے والا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ رائٹرز گلڈ نے غور کیا۔ نتیجہ معاوضے کی حد تک مصنف کے حق میں نکلا۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ مل جانے پر مصنف کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ایک انٹرویو قابلِ توجہ ہے۔ جو ہفت روزہ نصرت (۲۴ ر اپریل ۱۹۶۰ء) میں چھپا تھا :-

> " دراصل افسانے کے تنزل کا پراپیگنڈا کرنے میں کسی حد تک ہمارے ناشروں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانوں کا مجموعہ اب بکتا ہی نہیں لہٰذا اسے شائع کرنا خسارے کا سودا ہے۔ وہ لوگ بھی ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر آج ایک افسانہ کسی پرچے میں چھپتا ہے تو دوسرے رسالے اُسے نقل کر کے حسبِ توفیق استفادہ کر لیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر ہمارے چند ایک ریڈرز ڈائجسٹ قسم کے پرچے نکال دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک افسانہ "مول تول" اب تک چھ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ایک افسانہ قاری کی ایک بڑی تعداد کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ اور جب ایک مصنف کے ایسے ہی افسانے مجموعے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں تو قاری انھیں پہلے ہی متعدد بار پڑھ چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مجموعہ خریدنے

میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔"

بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا افسانہ پانچ دس پرچوں میں نقل ہو جائے گا تو اس سے ہماری پبلسٹی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ایک مبتدی کے لیے تو شاید سود مند ہو۔ مگر جس ادیب کا ادب میں کوئی مقام ہے اور اس کی کتابیں بھی چھپتی ہوں۔ اس کے لیے یہ سودا قطعاً سود مند نہیں۔ اس ضمن میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تجزیہ بہر صورت قابلِ غور ہے۔ اگر انتخابی پرچوں کی روش یہی رہی تو نوبت یہاں تک پہنچنے کا خطرہ ہے کہ ادیب کو اپنی دائمی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خود اپنی گرہ سے اپنی کتابیں چھپوانا پڑیں گی۔

رسائل قاری اور مصنف کے درمیان ایک طرح کا رابطہ ہوتے ہیں۔ آج جتنے بھی بڑے بڑے ادیب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل رسائل ہی میں لکھنا سیکھا۔ کسی نے نیرنگِ خیال میں، کسی نے ادبِ لطیف میں، کسی نے ساقی میں (وغیرہم) رسائل ہی کے ذریعے ادیب نامور ہوئے اگر نئے اور ذہین قلمکاروں کی ذہنی کاوشوں کو یہ رسالے منظرِ عام پر نہ لاتے تو آج کئی بڑے ادیبوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی بقا اور نشو و نما کے لیے اچھے اچھے ادبی رسالوں کا وجود بے حد ضروری ہے جو اچھے لکھنے والوں کے جوہروں کو اور بھی بنا سنوار کے قارئین کے سامنے پیش کریں اور جو بالکل مبتدی ہوں۔ ان کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ مستقبل کے ایسے ادیب بن سکیں۔ جن پر ادب فخر کرے۔ بے شک ہر نیا ادیب اپنی ہی صلاحیتوں سے چمکتا ہے۔ مگر اس میں مدیرانِ رسائل کی جانکنی بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو اچھے رسائل، نئے ادیبوں کے لیے ٹریننگ اسکول ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ رسائل جو ادب کی ترویج و ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ آج انتخابی پرچوں کے ہاتھوں اپنی آبرو لٹوا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہ دوست محض ذاتی تجارت کی خاطر، ہر پرچے سے پانچ دس چیزیں اُڑا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پرچے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ سخت پریشان ہیں۔ ان کی اشاعت پر یہ پرچے اثر انداز ہو رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ جن کے دم سے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کی روایات وابستہ ہیں۔ وہ سب دم توڑ دیں گے۔ آج انتخابی پرچوں کی حوصلہ افزائی کا بالکل یہی مطلب ہے کہ ادب کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا جائے اور شاخوں اور پتوں کی نشو و نما ہی کو ادب کی ترویج و ترقی سمجھ لیا جائے۔

بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ ادارۂ نقوش نے بھی تو تین چار نمبر صرف انتخابات پر مشتمل چھاپے ہیں۔ جی ہاں، یہ جرم سرزد ہو چکا ہے نقوش نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں، صرف چار نمبر (افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر اور آخر میں خود نقوش ہی کا انتخاب ادبِ عالیہ نمبر) ایسے چھاپے ہیں۔ جو لوگ موجودہ انتخابی پرچوں سے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بڑے بے درد ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایک ایک نمبر پر برسوں ہی محنت کی۔ اگر میں اور مجھ سے پہلے کچھ اور باہمت حضرات ایسا نہ کرتے تو آج نہ کوئی تذکرہ ملتا اور نہ اُردو ادب کی تاریخ ہی کا کوئی سراغ ملتا۔ دوسرے میں نے آج کے پرچوں کو اُٹھا کر لال پنسل سے نشان نہیں لگا دیئے تھے۔ جو کسی پہ زد پڑتی۔

آج انتخابی پرچے چھاپنے والے، کسی نہ کسی حیثیت میں، پہلے نئی چیزیں ہی حاصل کر کے اپنے رسالے چھاپا کرتے تھے۔ وہ کام کٹھن تھا۔ محنت طلب تھا سوجھ بوجھ چاہتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ مارکیٹ میں اُن کے پرچوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح جب نقصان ہُوا تو انہوں نے تعمیری کام کرنے والے پرچوں پر حملہ بول دیا اب اُن کی تیغ ہے اور ہم مدیرانِ رسائل کی محنتوں کا خون!

اس مہم میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ مدیرانِ رسائل میرے ساتھ ہیں۔ ادیب میرے ساتھ ہیں۔ اس لئے ہم اپنے اُن دوستوں کو ضرور سمجھا سکیں گے۔ جو اس وقت اپنی ذاتی منفعت کی بنا پر علم و ادب کی خدمت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

محمد طفیل

---

۸۵ - ۸۶
نومبر ۱۹۶۰ء
افسانہ نمبر

میں نے ایک مشہور افسانہ نگار سے کہا "افسانہ نمبر کے لئے کہانی لکھ دیجئے۔" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آخر اس کا فائدہ؟"

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ مگر میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی "میری بھی اس جانکاہی کا کیا فائدہ؟"

وہ اپنی جگہ سوچتے رہے۔ میں اپنی جگہ!

میرا ذہن آئے ہوئے افسانوں کی طرف نکل گیا۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ، معرکے کی چیز ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تو انہوں نے دو چار ہی چیزیں لکھی ہیں اور ان میں بھی یہ سب سے جاندار، چھپتے ہی ضرور واہ واہ ہوگی اور جنہیں پنجاب کے کلچر سے دلچسپی ہوگی وہ تو واری نثاری ہو ہو جائیں گے۔

پھر ایک دم خیال آیا۔ منٹو کا بھی ایک آدھ غیر مطبوعہ افسانہ، کہیں رکھا ہوا ہے۔ اُسے بھی تو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ مگر وہ کہاں رکھا ہوا ہے یہ سوچ کر پایا ہوا خزانہ چھنتا ہوا نظر آیا۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے۔ جب منٹو روز ہمارے دفتر آیا کرتے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے افسانہ لکھ دیا کرتے تھے۔ پھر وہ افسانہ بھی تو بڑا خوب صورت تھا۔ بے شک وہ ان کے اسلوبِ خاص سے ہٹا ہوا تھا۔ مگر تھا تو بے حد نازک اور لطیف! — پھر اس افسانے کی اہمیت یوں بھی تھی کہ وہ مرحوم کا آخری افسانہ تھا۔ انھیں تو نظرِ ثانی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

کرشن چندر نے بھی بڑی پیاری سی کہانی بھیجی ہوئی تھی۔ جس کے جواب میں، میں نے انھیں لکھا تھا کہ واقعی ابھی کرشن کا آرٹ زندہ ہے اور ناقابلِ تسخیر، دوسرے یہ بھی کہ اگر آپ میرے پاس ہوتے تو میں آپ کو چوم لیتا۔

احمد ندیم قاسمی بھی اپنے چھوٹے بھائی کو خوش کرنے کے لئے ایک شاندار کہانی لائے تھے۔ یوں تو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد جتنی بھی کہانیاں لکھی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر لکھی تھی۔ مگر اس کہانی سے وہ خود کتنے خوش تھے۔ کتنے مطمئن تھے۔ میں ہی تو جانتا ہوں۔

عصمت چغتائی نے جو کہانی بھیجی تھی۔ اُس میں اُن کا قلم اور ذہن دونوں ہی قابو میں تھے۔ پہلے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ ان کے قلم اور ذہن میں تصادم ہوا تو کبھی قلم پھسل گیا اور کبھی ذہن، مگر اس میں دونوں چاق و چوبند تھے۔ پھر عصمت کا آرٹ، جو کسی حالت میں بھی اپنا لوہا منوائے بغیر نہیں رہتا۔ وہ بھی موجود تھا۔

ایک سیدھی سی کہانی شکیلہ اختر کی بھی تھی۔ یہ بھی ایک عجیب رومانوی اور ایک عجیب معاشرتی کہانی ہے۔ اچھی خاصی لمبی کہانی ہے یہ، مگر کیا مجال کہ یہ کہانی ذرا بھی ہلنے دے۔ ہر چند کہ اس میں بھاری الفاظ کھلتے ہیں۔ مگر علاقائی ٹچ بُری بات تو نہیں۔

واجدہ تبسم کی کہانی بھی مجھے اپنے تأثر اور خلوص کی بنا پر بڑی ہی جاندار دِکھتی تھی۔ غرض مجھے کبھی کوئی کہانی متاثر کرنے لگی، کبھی کوئی۔ — پھر چند نئے لکھنے والوں کی بھی تو اچھی کہانیاں تھیں۔ چند بڑے افسانہ نگاروں کے وعدے بھی یاد آئے کہ کہانیاں لکھ کر دیں گے — ان میں قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور، خواجہ احمد عباس اور جیلانی بانو تھیں۔

غرض میرا ذہن ابھی اُتھل پُتھل ہی ہو رہا تھا کہ میرے اُسی افسانہ نگار دوست نے کہا ”اچھا تو میں افسانہ لکھ دوں گا۔“

میں نے بھی سوچا، کچھ بھی ہو۔ اُردو افسانے کی ترویج و ترقی میں، میری ایک اور عاجزانہ کوشش ہونی ہی چاہیے۔

اس کے بعد وہ پھر اپنی جگہ سوچنے لگ گئے۔ میں اپنی جگہ، جیسے ہم نے کوئی غلط فیصلہ کر لیا ہو۔

محمد طفیل

۸۷

فروری ۱۹۶۱ء

قرارداد رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان

”اراکین کا خیال عموماً یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کی موجودہ روش سے اُردو کے سب رسالوں کی اشاعت پر اثر پڑ رہا ہے اور یہ صورتِ حال رسالہ نکالنے والوں کے علاوہ ادب کی اشاعت اور ترقی کے نقطۂ نظر سے بھی اچھی نہیں لیکن چونکہ یہ بات براہِ راست ادیبوں کا مسئلہ نہیں اس لیے یہ تجویز بالاتفاق رائے منظور ہوئی:-

یہ طے ہوا کہ گلڈ چونکہ ادیبوں کی جماعت ہے اس لیے اس مسئلے کے صرف اس پہلو کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا چاہیے جس کا تعلق براہِ راست ادیب سے ہے اور یہ طے پایا کہ انتخابی رسالوں سے کہا جائے کہ وہ کسی ادیب کی تحریر اس کی اجازت کے بغیر کسی رسالے سے نقل نہ کریں اور اسے حسبِ طلب رائلٹی کے طور پر معاوضہ بھی دیں۔ ہر تحریر کے لیے الگ اجازت نامے کی ضرورت ہوگی۔ عام اجازت حاصل کر لینا کافی نہیں۔“

(۲)

تمام انتخابی پرچوں کے نام سیکرٹری رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان کا مکتوب

گلڈ کے ایک ممبر نے ہمارے پاس ایک تحریر بھیجی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انتخابی پرچے ان ادیبوں کی تحریریں شائع نہ کریں جن کے اس تحریر پر دستخط ہیں۔ میں نے یہ تمام دستخط دیکھے ہیں۔ ان کی نقل آپ کی خدمت میں ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ ادیبوں کی اس خواہش کا احترام کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ کسی کی چیز اجازت کے بغیر نہ چھاپیں۔ اس لیے یقین ہے کہ اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔[1]

محمد طفیل

---

[1] ادیبوں کا عہد اور دستخط صفحہ ۳۰۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۸۸

مئی ۱۹۶۱ء

مختصر بات کرنے کی عادت پہلے بھی تھی۔ مگر اب کے تو کچھ مجبوری بھی ہے۔

ہوا یوں کہ ۱۱؍ مارچ کو، ابھی قلم ہاتھ ہی میں تھا کہ ایک دم بے ہوش ہو گیا۔ چند منٹوں تک اس دنیا سے بے تعلق رہا۔ جو کچھ گزری میں جانتا ہوں۔

احباب موٹر پہ ڈال کے ہسپتال لے گئے۔ بارہ دن تک ہسپتال میں رہا۔ کاغذ، قلم اور دوات کے عاشق کو دواؤں، انجکشنوں اور نرسوں سے واسطہ پڑا۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا، مکمل آرام کیجئے۔ جب سے اب تک آرام ہی کر رہا ہوں۔ اس "آرام" میں میرے لیے بڑی ہی بے قراریاں ہیں۔ زندگی رہی تو آپ سے باتیں، اگلی ہی صحبت میں ہوں گی۔ ابھی نڈھال سا ہوں۔

محمد طفیل

۸۹

اگست ۱۹۶۱ء

نون لاج، فلیٹ نمبر ۲
پنڈی پوائنٹ، مری

محترم، سلام مسنون!

اب کے پرچہ کو بغیر طلوع کے چلنے دیجئے۔ کچھ فرق نہ پڑے گا۔ کوئی نہیں جو اس صفحہ کے لیے بیقرار ہو۔

میں بیمار کیا ہوا۔ پرچہ بھی "بیمار" ہو گیا۔ معلوم ہوا وہ خونِ عاشق ہی تھا۔ جو اس میں رواں دواں تھا۔

پرچہ مجھے جان کی طرح عزیز ہے۔ مگر میرے عزیزوں کو، پرچے سے زیادہ میری جان عزیز، یہی سبب ہوا کہ ایک پروگرام کے تحت، مجھے یہاں بھیجا گیا۔ یہاں بیٹھ کر، میں جو کچھ بھی اپنے "محبوب" کے لیے کر سکتا تھا کر گزرا۔ مگر کچھ اس طرح کہ اب کے آنکھیں جھک ہی گئیں۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ مارے شرم کے سر ہی نہ اٹھا سکوں۔ حصۂ نظم ہی تو کمزور ہے۔ آج میں حصۂ نظم کو رو رہا ہوں۔ کل مجھے تمام اصنافِ ادب کے بارے میں رونا پڑے گا۔ اس لیے کہ اچھی چیزوں کا حصول اب روز بہ روز ناممکن بنتا جا رہا ہے۔ جیسی چیزیں آج لکھی جا رہی ہیں، ویسی آج کے پانچ دس برس بعد لکھی نہ جا سکیں گی۔ میرے نزدیک یہ زوال مسلسل ہے (چند تجربے ضرور ہوئے، جن کی بدولت چند افسانے ملے، چند نظمیں اور ایک آدھ ناول) میں نے یہ مسئلہ ادیبوں کے سامنے کئی بار رکھا ہے۔ عرض کرتے کرتے قلم اور زبان گھس گئی۔ مگر کون سنتا ہے۔ پہلے لکھنے والے ادیب ہوتے تھے۔ آج کے لکھنے والے بقراط ہیں۔

آپ مجھ سے مری کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ ادب کی طرح اخلاق کا بھی حال پتلا ہی ہے۔ یہاں پر پاکستان بھر کے فیشن زدہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں۔ عورتیں ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہر انداز میں دکھانا چاہتی ہیں۔ مرد ہیں کہ انھیں ہر انداز میں دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ میں تو مال روڈ پہ آنکھیں

جھکائے گزرتا ہوں کہ جیسے سامنے کوئی میری ہی ماں بہن ننگی چلی آرہی ہو۔ میں آج تک اس وہم میں مبتلا رہا کہ میں ایک متوازن ذہن رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ نہ تو میں مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسا مومن ہوں اور نہ منٹو جیسا رند' اس پر بھی میں نے ہار مان لی۔ الٰہی توبہ!

آخری عمر میں، انسان بڑا نمازی اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ نمازیں پڑھتا ہے۔ روزے رکھتا ہے ۔ بالکل اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ ادب کی جائے نماز بچھالوں اور کچھ نیک کام کرجاؤں۔ یعنی اپنے سارے ہی ادھورے خوابوں کی تعبیر، اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لوں۔ میری مراد اُس کام سے ہے جس پر محنت کرچکا ہوں۔ یا جن کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ اُن کاموں میں، مثنوی نمبر، لاہور نمبر مکاتیب (حصہ دوم) صحافت نمبر اور ڈرامہ نمبر ہیں ——— لاہور نمبر پر بہت سا کام ہوچکا ہے۔ مزید دو تین مہینے کے لیے اس نمبر میں خود کو کھو دینا ہوگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میں اپنی جنم بھومی کے بارے میں ایک کام کی چیز پیش کرجاؤں۔ لاہور جو شاہنشاہوں کے دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ لاہور جو ادب کا مکہ اور مدینہ ہے۔ لاہور جو حسن اور خوب صورتی کا کعبہ ہے۔

یہاں پہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ وہ اس پرچہ کے علاوہ مثنوی نمبر ہی کے بارے میں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ نمبر بھی بڑے کام کا ہوگا۔ بڑے بڑے مشہور شعرا کی نایاب مگر غیر مطبوعہ مثنویاں، اس نمبر کے ذریعے سامنے آجائیں گی۔ جوں جوں اس نمبر کے بارے میں کام کرتا جاتا ہوں لطف آرہا ہے۔ ہائے ہائے، مثنوی بھی کیا لطیف صنفِ سخن ہے ہمارے شعرا بھی کیا مزے کے تھے۔ عشق کرتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ جانے ان کی عاقبت کیا ہوئی۔ مگر ہمارا ادب مالا مال کر گئے۔

امید ہے اس شمارہ کے سلسلے میں، اب میری ضرورت نہ پڑے گی۔ سارا ہی کام ٹھیک چل رہا ہے۔ روڑا اٹکے تو بلالیں۔ بلندیوں سے پستیوں کی طرف لوٹ آؤں گا۔ (زیادہ موزوں تو یہ کہ "پستیوں سے بلندیوں کی طرف لوٹ آؤں گا") میرا سب سے سلام عرض کریں۔ اخلاق سلمہٗ کی صحت اب اچھی ہے۔ یہ غریب پہلے ہی "پہلوان" تھا۔ اب کے اور مہین ہوگیا۔ والسلام

محمد طفیل ۱۸ ۷/۶۱

۹۰

اکتوبر ۱۹۶۱ء

میں اس وقت لاہور اسٹیڈیم میں ہوں۔ دھوپ میں بڑی چلک ہے۔ اے سی سی (ہندوستان) اور ایگلٹس (پاکستان) کے درمیان جو کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہوں۔ ابھی ابھی پاکستان نے تین وکٹوں پہ ۲۹۶ رنز بنا کر ڈکلیئر کر دیا ہے۔ سارے کھلاڑی واپس پویلین کی طرف جا رہے ہیں۔

کھلاڑیوں کے آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ میں نے سوچا، اس وقت طلوع کھو ڈالوں۔ جیب ٹٹولی تو ڈاکٹر کا ایک "نسخہ کا غذ" اور ایک کوئی "رسیدیہ پرزہ" بل گیا۔ یہ چند اکھر انہی کی پشت پر لکھ رہا ہوں۔

مشہور ہے کہ نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے۔ کچھ اسی طرح، لکھنے والے کے لیے بھی، جگہ اور موقع محل کی کوئی قید نہیں ہوتی مصیبت

ہے کہ میں بھی شاعروں کی طرح آمد کا منتظر رہتا ہوں۔ عموماً سفر کرتے، پیدل چلتے، ہوٹل میں بیٹھے، میرے طلوع مکمل ہوتے ہیں۔

میں نے طلوع میں، کبھی بھی آفاقی مسائل پر گفتگو نہیں کی اور نہ مجھے کبھی اپنی قابلیت بگھارنے کا شوق چرایا۔ میں نے کبھی بات کی ہے تو اپنے ادب کی بات کی ہے۔ یا پھر اپنے پرچے کی — یا اپنی ذات کی۔ معاف کیجیے گا۔ میں اپنی ذات کو پرچے اور ادب سے کوئی الگ چیز نہیں سمجھتا آپ بھی مجھے اس خوش فہمی کے سہارے جی لینے دیں۔

اس شمارہ میں دو مضمون، سب سے زیادہ طویل ہیں۔ مختصراً انہی کے بارے میں عرض ہے۔ ایک مضمون ہے "عظیم بہ زبان کلیم" ٹھوس اور جاندار مضمون، میرے نزدیک اتنے لمبے چوڑے مضمون کی اشاعت سے دو مقصد (مقاصد نہیں) ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلیم صاحب نے آج تک کسی کو شاعر اور ادیب مانا ہی نہیں (اس سلسلے میں ان کا تقریباً سارا ہی ریکارڈ "بے داغ" ہے) جسے مانا ہے۔ اس کے بارے میں ایک ناقد کی رائے کیا ہے؟ — دوسرے یہ مضمون مجھ ایسے طالب علموں میں شعر سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت پیدا کرے گا۔ میں مانتا ہوں کہ شعر تو وہ ہوتا ہے جو خود بخود دل و دماغ میں اتر جائے۔ مگر ہر فن کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ انہی کی طرف اس میں اشارے ملیں گے — پھر یہ مضمون دو نامور ادبی پہلوانوں کی ذہنی کشتی ہے۔ قاری کو استادانہ داؤں پر لطف تو آنا چاہیئے۔

دوسری چیز ہے "ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ"۔ یہ نہ افسانہ ہے۔ نہ مضمون اور نہ رپورتاژ، اس کے باوجود میں نے اس کے لئے بہ طور خاص گنجائش نکالی۔ مجھے یہ "تاثریہ" حیرت ناک حد تک، اپنی بے باکی اور صاف گوئی کی بنا پر پسند ہے۔ ایک خاتون اور اس کا قلم اتنا "بہادر" جب یہ مضمون میرے مطالعہ میں آیا تو میں نے جان بوجھ کر ان حصوں کو نہ چھیڑا۔ جہاں نگارندہ، مردوں سے اپنی نفرت کا "اظہار" بہ "صمیم قلب" کرتی چلی گئیں۔ اس کی وجہ سے مضمون کا توازن بگڑا۔ مگر مجھے ایک خاتون کے "جذبات کا قتل" منظور نہ تھا۔

میں لاہور نمبر پیش کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ خود کو اس وقت پوری فارم میں سمجھتا ہوں۔ تلوار کی دھار پر ایک بار پھر چلنے کا ارادہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اہلِ ہنر کو اپنے جوہر دکھاؤں۔ یہ الگ بات ہوگی کہ آتے ہی میری وکٹ اڑ جائے۔ کرکٹ اور ادارت میں بڑی مماثلت ہے۔

لیجئے کھلاڑی آ گئے ہیں۔ باقی باتیں پھر کریں گے۔ پنجابی کی ایک ضرب المثل کے مطابق:۔

کیہڑا مرزا مک گیا اے، یا سرنگی ٹٹ گئی اے[1]

محمد طفیل

۹۱

دسمبر ۱۹۶۱ء

انسان جو کچھ چاہتا ہے ضروری نہیں کہ وہ ہو بھی جائے۔ قدرت اچھے برے سبھی قسم کے کاموں میں روڑے اٹکا سکتی ہے۔ بے نیاز جو

---

[1] مفہوم کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یوں ہوگا "یار زندہ صحبت باقی"۔ یہ تلمیح مرزا صاحباں کے بارے میں ہے۔ ترجمہ یوں سمجھئے۔ نہ مرزا (قصہ) ختم ہوا ہے نہ ساز (سازنگی) ٹوٹا ہے۔

ٹھہری۔ زیادہ محتاط لفظوں میں — ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

اس عاجز نے ناک چوٹی زور لگایا کہ اب کے لاہور نمبر ہی کو اپنی سعی و کوشش کا حاصل بنا کر، نذر کروں مگر یوں نہ ہو سکا۔ اپنی "علالت کی بھاری" کے با وجود، میں نے اپنی جان کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی۔ سبھی پاپڑ بیلے، کوچہ رقیب میں بھی جانا پڑا تو سر کے بل گیا — مگر "بی منزل" دور کھڑی مسکراتی رہیں۔

تاریخ میرا موضوع نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے روگ لگا بیٹھا۔ اب بھگت رہا ہوں اُسے۔ ادب میں تو یہ ہوتا ہے تاکہ افسانے کا پلاٹ اگر یوں نہ سہی تو نہ سہی، کام چل گیا۔ مضمون پٹڑی سے اُتر گیا ہے تو اُتر جائے، بات رہ جائے گی۔ نظم سمجھ سے بالاتر ہو گئی ہے تو ہو جائے۔ بڑی نظم قرار پائے گی — مگر تاریخ کی نزاکتیں ہی اور ہیں۔ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی شخصیت فلاں سن اور فلاں تاریخ اللہ کو پیاری ہوئی ہو، تو ہم لاکھ کوشش کریں۔ اُسے ایک دو دن اِدھر اُدھر نہیں مار سکتے۔

ستم پہ ستم یہ کہ دس بیس، سو پچاس برسوں کی (لاہور کی) تاریخ پیش کرنا ہوتی تو اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ ہم نے کام کا آغاز اس وقت سے کر دیا ہے۔ جب سے لاہور کا سراغ ملنے لگتا ہے۔ یعنی کہ جب لاہور لہور تھا۔ اس عرصہ میں ہزاروں ہی شخصیتیں سامنے آتی ہیں ہزاروں ہی کارنامے انجام پائے۔ سیکڑوں ہی آثار تاریخ کے باب بنے۔ ان سب کی جستجو اور ان کے بارے میں صحیح معلومات' ایک مہم ہے اور اس میں پار اُترنا، ایک معجزہ، خدا اگر توفیق دے، تو عجب نہیں کہ اس چودھویں صدی میں' معجزے گنہگاروں سے بھی سرزد ہونے لگیں۔ — شاید کچھ ایسی ہی ڈھارس پہ مجھے اپنی ولایت کا ابھی سے یقین ہونے لگا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آئندہ پرچہ لاہور نمبر ہی ہو تاکہ روز روز کی معذرتوں کا تو ٹنٹا ختم ہو۔

آپ تو لحاف میں بیٹھ کے مزے سے یہ پرچہ پڑھیں گے۔ مگر آپ کو کیا علم، کہ یہ چھوٹا سا پرچہ بھی پیش کرنے کے لیے میرے کیسے کیسے پسینے نہ چھوٹے۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ لاہور نمبر کام کے پھیلاؤ کی وجہ سے' اس ماہ نہ آ سکے گا۔ تو سٹی گم ہو گئی۔ دوستوں کو مدد کے لیے پکارا۔ اپنی بے وقوفی اور مصیبت سے انھیں آگاہ کیا۔ سبھی ہنسے، مگر قلم دوات لے کر بیٹھ گئے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو یہ پرچہ چپ چاپ کیسے آ جاتا۔

مجھے اپنے اس شمارہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا۔ جو کچھ لاہور نمبر کے بارے میں کہہ چکا ہوں۔ اسی سے ٹُچا پن جھلکے ہے۔

محمد طفیل

۹۲

فروری ۱۹۶۲ء — لاہور نمبر

آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ آپ کی خدمت میں 'لاہور نمبر' پیش کر سکوں — الحمد للہ!

اگر میں اس نمبر کے بارے میں کچھ سچی باتیں بھی کہوں گا تو ایسے فقرے ضرور راہ پا جائیں گے۔ جن سے کچھ میری تعریف اور کچھ اس نمبر کی اہمیت کے پہلو نکلیں گے۔ ایسی صورت میں سبھی یہ کہیں گے۔ بنتا ہے — اس لیے مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ خاکساری کا وہ انداز اختیار کروں جو سبھی کو بھائے۔ سو بندہ پرور! اس ہیچمدان کی طرف سے عرض ہے کہ اِس عاجز، ناچیز اور پُرتقصیر انسان نے

جو یہ "کارنامہ" سرانجام دیا ہے اُسے لمبے چوڑے دعووں کی زد میں لا کر آپ کو بدمزا کرنے کا ارادہ نہیں۔

میری ادنیٰ سی کوششیں یہ تھیں کہ یہ نمبر اپنے مواد کے اعتبار سے، لاہور پر موجود کتابوں سے زیادہ وقیع، زیادہ جامع اور زیادہ متنوع ہو۔ اب دیکھ لیجئے کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ تکمیل کا دعویٰ مجھ ایسے ادارتی گنہگاروں کو زیب نہیں دیتا۔

اس نمبر میں جتنی بھی چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر چند سطریں مطبوعہ نظر آ جائیں تو اپنے اس نیازمند کو معاف کر دیجئے گا۔ اِس لئے کہ میں اس جرم میں اہلِ قلم کا شریک نہیں ہوں۔

پہلے میں نے مکاتیب نمبر پیش کرتے ہوئے توبہ کی تھی یا اب یہ نمبر پیش کرتے ہوئے کی ہے۔ مکاتیب نمبر کا تو یہ تھا کہ اہلِ دل (جن خطوں میں ادیبوں نے اہلِ دل ہونے کا ثبوت دیا تھا وہ ابھی میرے پاس محفوظ ہیں) اور اہلِ قلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جمع کرنا تھا۔ اِس نمبر کے سلسلے میں ضخامت طلب موضوعات کو سمیٹنا تھا۔ جو موضوع جسے زیادہ وہیں ٹھٹھک گیا، میں وہیں اٹک گیا۔

میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ اِس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سِلسلے میں ملتی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے۔ گنہگار ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں!

میں آج ادب کی وادیوں سے نکل کر تاریخ کے میدان میں آن پہنچا ہوں۔ بے شک راہیں پُرپیچ اور اَن جانی تھیں۔ مگر میرے جنون نے ہار ماننے سے اِنکار کر دیا۔ اب یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ جنون اور تاریخ کے اس معرکے میں کون جیتا، کون ہارا۔

یوں تو ہر شہر، شہر ہی ہے۔ مگر بعض شہر اپنی آغوش میں رہنے بسنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔ لاہور بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے۔ نقوش نے لاہور کا تاریخی اور تہذیبی سرمایہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے — دوسرے تاریخی شہر بھی "دیوانوں" کا منہ تک رہے ہیں۔

محمد طفیل

۹۳

مئی ۔ ۱۹۶۳

چھ طویل کہانیاں

یقین کیجئے کہ اب کے کچھ بھی لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو آمادہ بھی کیا۔ مگر دل یہی کہتا رہا۔ چھوڑو میاں، کچھ کہہ کے کیا کروگے۔ تمہاری سنتا کون ہے!

مجھے کسی سے گلہ نہیں۔ اس لیے کہ میں بھی کسی کی نہیں سنتا۔ مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کو بھی سن لینی چاہئیں اور مجھے بھی۔

میرا ارادہ تھا کہ میں نقوش کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کرتا اور آپ میرا ساتھ دیتے۔ میں نے ایک تجربہ لاہور نمبر کی صورت میں کیا۔ مگر آپ نے میرا ساتھ تو دیا مگر کچھ بے دل کے ساتھ

ہمارے دوسرے نمبروں کے تو کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ مگر اس کا پہلا ایڈیشن ہی میری تجرباتی حس کو شرمندہ کئے دے رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں قصور میرا ہے یا آپ کا؟ — جہاں تک اس نمبر کی اہمیت کا تعلق ہے۔ یہ نمبر نقوش کے پہلے نمبروں سے زیادہ دنوں تک بکے گا۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ آپ نے کیوں میرے جذبات کا ساتھ نہیں دیا؟

"قیمت زیادہ ہے صاحب!"

"اجی یہ بھی کوئی موضوع ہے!"

مجھے آپ کی ایسی شکایتوں کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ اس کے باوجود اس "حماقت" کا مرتکب ہوا۔ میری صحت اور جیب، اگر مجھے اس سے بھی زیادہ حماقت کی اجازت دیتی تو میں آپ کو، اس سے بھی زیادہ ناراض کر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لیے کہ اس نمبر کے سلسلے میں ابھی میرا ارمان پورا نہیں ہوا۔

میں نے آج تک آپ کے جذبات کا خیال رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع آیا تھا کہ آپ بھی میرے جذبات کا خیال رکھتے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا پھر میری آپ کی دوستی کیا ہوئی؟— باقی رہا میری تجرباتی حس کا ماتم، سو اس میں میں آپ کو اپنا شریک نہیں بناتا۔ میرے لیے تو اس غم میں بھی سو راحتیں ہیں۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں— میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا— بلکہ تاریخ کے اوراق میں اپنا نام درج کرانے کی ایک کوشش تھی وہ!

محمد طفیل

۹۴

جولائی ۱۹۶۲ء

دو چار شعر سنیے گا؟— مگر ذرا ٹھہریے۔ پہلے میں "سماں" تو باندھ لوں۔

ایسے بھی ادیب گزرے، جو اچھے شعروں کو، اپنی نثر میں سجا لینے کے لیے ہی نثر لکھا کرتے تھے۔ ان کا یہ حربہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ جب کہ اسی شمارہ کے چند اچھے شعروں کی خاطر یہ صفحہ کالا کروں گا۔ شعر کہنا اور شعروں کو اظہار کا ذریعہ بنانا، دونوں باتیں معصوم سہی، مگر غیر صحت مندانہ نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب شاعری صرف ذہنی تعیش ہی کا ساماں تھی۔ مگر وہ دور گزر چکا۔ آج تو شعر تلوار کا کام دیتے ہیں ؎

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو وہی بات نہ کہہ دوں

یہ شمارہ آزاد فضا میں پیدا ہو رہا ہے۔ مارشل لاء جو ختم ہوا۔ گو مارشل لا نے ادیبوں اور ادب پر بہ ظاہر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی مگر ہم لوگ سہمے ہوئے ضرور تھے۔ ڈرتے تھے کہ اگر ہمارے قلم سے کوئی نادانستہ بھی ایسی بات نکل گئی جو سرکار کو پسند نہ آئی تو کیا ہوگا؟ ایک بھیانک نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ دیکھا جائے تو (بعض حیثیتوں میں) ملک اور ادیبوں کو جتنا فائدہ اس مارشل لا نے پہنچایا۔ اس سے پہلے کے "جمہوری دیوتاؤں" نے نہیں پہنچایا تھا۔ مگر مارشل لا، مارشل لا ہی ہے— ایک خطرناک کھیل— عوام کے لیے بھی، سربراہوں کے لیے بھی!

اک چال وہی لیکن اس کے بازی جہاں میں نام ہیں دو
ہارے تو بغاوت کہلاتی ہے، جیتے تو نبوّت ہوتی ہے

ادیب اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اچھا ہوا تھا کہ بُرا، بہرحال موجودہ فضا ادب کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ہے۔ ہم لوگ اب آزادی سے سوچ سکتے ہیں۔ آزادی سے لکھ سکتے ہیں۔ گو پہلے بھی ہماری گردنوں پر کوئی تلوار نہیں لٹک رہی تھی۔ مگر ہمیں اس کا احساس تو تھا کہ تلوار کا وجود ہے۔ احساس ہی تو ادیب کی کل کائنات ہوتی ہے۔ سرمایۂ فن یہی، سرمایۂ حیات یہی۔ بہرحال وہ دَور خوش اسلوبی سے گزر گیا۔ جس کا آج ماتم فضول ہوگا۔ جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب ؎

ہاں آنکھ نہ جھپکے کہ ہے پتھراؤ کی زد پر
یہ کارگہِ شیشہ گراں، جاگتے رہنا

ادیب بھوکا پیاسا جیتا چلا آیا ہے۔ وہ اب بھی جی لے گا۔ مگر وہ آزادیٔ رائے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ یہ حاصل نہیں تو جیتے جی مرتا رہے گا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے قلم پر پہرے بٹھائے جائیں۔ خواہ وہ دَور کوئی بھی ہو۔ جمہوری شاطروں کا ہو یا صدارتی ناخداؤں کا، ہماری تو سرشت یہ ہے۔

ہم نے خود اپنے آپ زمانے کی سیر کی
ہم نے قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

یہ صفحہ میں نے صرف شعروں کی خاطر ہی کالا کیا ہے۔ ورنہ آپ کو تو علم ہے کہ میں مصرعِ طرح کا قائل ہی نہیں۔

محمد طفیل

۹۵

اکتوبر ۱۹۶۲

بچپن کی یادیں، اتنی ناپختہ نہیں ہوتیں کہ دماغ سے محو ہی ہو جائیں۔ البتہ وہ دَور ایسا ہوتا ہے کہ اس میں جنوں کی کہانیاں پریوں کی کہانیاں اور جادو کے قصے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔

اپنی عمر کے اُسی دور میں، میں نے بنگال کے جادو کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا تھا کہ وہاں آدمی کو یوں مکھی بنا دیا جاتا ہے اور یوں مکھی کو آدمی بنا دیا جاتا ہے۔ سنِ شعور کو پہنچا تو یہ بھی سنا کہ بنگال میں داخل ہونے کے تو کئی راستے ہیں۔ مگر واپسی کا کوئی نہیں۔

اس دلچسپ سرزمین سے لگاؤ قدرتی امر تھا۔ بنگال کا جادو کیا ہے۔ یہ وہاں کے نسائی حسن کی تعریف ہے۔ لمبے لمبے بال، سیاہ مگر غزالی آنکھیں، تیکھے نقش، تھرکتے جسم اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی دیوی کے مختلف روپ — جادو نام پا گئے۔

پھر سبزہ ہی سبزہ، پانی ہی پانی، مناظر ہی مناظر اور ان میں بسنے والے غریب، مخلص، حساس اور سادہ دل بندے!

ایسے رومانوی اور ایسے دل کش خطے کے بارے میں، یہ بھی آئے دن سنتے رہتے ہیں کہ وہاں گولی چل گئی۔ اتنے زخمی اور اتنے شہید ہوئے۔ ایسی خبریں قطعاً خوشی والی نہیں۔ مگر ایسی خبریں، اس لحاظ سے خوشی والی ضرور ہیں کہ وہ لوگ کسی مقصد کی خاطر جان دینے کو کوئی بڑی بات نہیں سمجھتے۔

اچھے ادب کی تخلیق کے لیے، جو محرکات مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ وہ سب اہلِ بنگال کے لیے ارزاں ہیں۔ جادو! — شدت

احساس! — سیاسی بیداری! — اور قلم کی عصمت! — یہی وہ وجوہ ہیں کہ بنگلہ ادب میں جان ہے ۔ واقعہ ہے ۔ میں نے جب بھی کوئی ترجمہ، نظم افسانہ یا ناول پڑھا ۔ متاثر ہوا ۔ اگر میں یہاں تھوڑی سی جرأت سے کام لے کر یہ کہہ دوں تو یہ کہہ سکوں گا کہ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے بنگلہ ادب اردو ادب سے کہیں آگے ہے ۔

جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کے یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے دُور ہیں ۔ مگر جغرافیائی دُوری اتنی پریشان کن نہیں ۔ جتنی دلوں کی دوری، یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ہم اب تک ایک دوسرے کے دُکھ درد کو اپنا نہ سمجھ سکے ۔ پیار کی جوت جگا ہی نہ سکے ۔ بہرحال وقت کا فیصلہ اب یہ ہے کہ جو کام جھوٹے سیاست والوں سے نہ ہو سکا ۔ اُسے اب اہلِ قلم ہی پورا کریں ۔

محمد طفیل

۹۶
جنوری ۱۹۶۳ء

سالنامہ

لت کوئی بھی ہو، بُری ہوتی ہے ۔ اگر کوئی لت لگی نہ ہو ۔ تو زندگی کا لطف ہی کیا ۔ اس اعتبار سے خوش بخت ہوں کہ ایک چھوڑ کئی کئی لتیں لگا رکھی ہیں ۔

پچھلے دنوں دوست احباب "تعزیت" کے لیے آنے لگے — "بھئی کیا بات ہے ۔ اب کوئی خاص نمبر نہیں آ رہا؟" — میں جواب دیتا رہا ۔ "بہت ہو چکی، تھک گیا ہوں، کوئی موضوع بھی تو ہو ۔ جن جن نمبروں کا ڈول ڈال رکھا ہے ۔ وہی مکمل نہیں ہوتے ۔ کیا کروں؟ — میں تو خود شوق اور بے بسی کے درمیان معلق ہوں ۔"

یاروں نے مشورہ دیا ۔ "اور کچھ نہیں تو ہر سال ایک سالنامہ ہی نکال دیا کریں ۔"

چلو، یہ بات، اس نمبر کے نکالنے کے لیے سہارا بن گئی — وہی لت والی بات!

یوں تو نقوش کے پہلے بھی سالنامے نکلے ۔ مگر یہ پہلا نمبر ہے ۔ جسے میں خود سالنامہ سمجھ کر پیش کر رہا ہوں ۔ ایک آدھ دفعہ کے علاوہ، پہلے تو یہ ہوا کہ بغیر کسی پلان کے اگر زیادہ چیزیں جمع ہو گئیں تو ادارہ نے پرچے کی پیشانی پر سالنامہ کا لفظ لکھ دیا ۔ اب کے ایسا نہیں ہوا ۔ اچھا یا بُرا، جو کچھ بھی ہوا ۔ خوب سوچ سمجھ کر ہوا ۔ ذرا آپ بھی تو دیکھیں کہ اس سالنامہ پر زرِ کثیر صرف ہوا ہے یا کثیر خونِ دل، یا کچھ بھی نہیں؟ — میں اپنی طرف سے کیا کہوں، چُورا ہو چکا ہوں ۔ اگر کچھ بھی سکت ہوتی، تو باتیں کرنے کی بجائے، آسمان سے اور تارے نہ توڑ لاتا — اب ذرا اطمینان ہے تو یہ، کہ میرا قلم گنگ بھی ہوا تو نقوش کے صفحات بولیں گے ۔

منٹو کہا کرتے تھے ۔ "جب تک میرا لکھا ہوا افسانہ چھپ نہیں جاتا ۔ میں یہی سوچتا ہوں میرے ہاں میت رکھی ہے ۔" میں بھی اپنی اور اپنے دوستوں کی کاوشوں کو جب تک آپ کے حوالے نہیں کر لیتا ۔ چین نہیں پڑتا ۔ بیکل رہتا ہوں ۔ جان سُولی پہ لٹکتی رہتی ہے ۔

اُفوہ! — خونِ دل کی سبیل لگانا بھی کتنا دشوار ہے!

محمد طفیل

۹۷

مارچ ۱۹۶۳ء

آپ بھی دل میں کشادگی پیدا کریں۔ تاکہ کہا سنا بُرا نہ لگے۔

اردو بھی کیا اچھی زبان ہے۔ اُردو ہی پہ کیا منحصر، دنیا کی ساری بڑی زبانیں، اپنے اندر دوسری زبانوں بلکہ مقامی بولیوں تک کے الفاظ اپنانے کی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ وہ زبان کیا ترقی کرے گی جو اپنے اندر چھوت چھات رکھتی ہو۔

ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلی کی زبان سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ یہ الگ بات کہ زبان کے معاملے میں یہ دونوں فریق بھی کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ لکھنوی کچھ کہتے رہے۔ دہلوی کچھ کہتے رہے۔ جو چیز لکھنؤ سے مؤنث چلتی تھی وہ دلی پہنچ کر مذکر بن جاتی تھی۔

زبان کے اعتبار سے، آج لکھنؤ نہ وہ لکھنؤ ہے۔ نہ دلی وہ دلی ہے۔ اس لئے اُردو کے طالب علم اب کدھر جائیں جسکے اپنا امام تسلیم کریں؟ سند کس سے پائیں؟ — امیر و داغ سے؟ آزاد و سرشار سے؟ چھوڑئیے صاحب! یہ لوگ اپنی عظمتوں کے باوجود اپنا وقت گزار چکے۔ اُن کے سامنے آج کا ماحول نہ تھا۔ اُن کے سامنے اُردو کو اپنے گھر سے دھکے مار کر نہیں نکالا گیا تھا۔ اُن کے سامنے پاکستان اُردو کے لیے پناہ گاہ نہیں بنا تھا۔

آج جبکہ اُردو کا مسکن صرف مغربی پاکستان ہے تو پھر سوچئے کہ پاکستان میں آئندہ چل کر اُردو کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس میں بسنے والے سرحدی ہیں، پنجابی ہیں، سندھی ہیں، بلوچی ہیں۔ اگر آج ہم نے اُس اُردو کو رواج دینے کی کوشش کی۔ جو اُردوئے معلّٰی کہلاتی تھی تو بات نہ بنے گی۔ مستقبل کی اُردو کے خط و خال کچھ اور ہی ہوں گے۔ جس میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی کے الفاظ کو بھی جگہ دینا ہوگی۔ آج اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ "میں نے جانا ہے" غلط ہے۔ تو وہ کوئی دانشمندی کا ثبوت نہ دے گا۔ آج اُردو کو اہلِ پنجاب کے مزاج کا ساتھ دینا ہوگا۔ نہ صرف اہلِ پنجاب کا، بلکہ اہلِ سرحد کا، اہلِ سندھ کا اور اہلِ بلوچستان کا بھی، ان سارے خطوں کے خمیر سے جو اُردو بنے گی۔ وہی مستقبل کی اُردو ہوگی — لہٰذا — "بادشاہو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں!"

میرا نعرہ اُدھ کچری اُردو کو رواج دینا نہیں ہے۔ بلکہ مؤدبانہ گزارش صرف اتنی ہے کہ اس "خود رَو پودے" کی نشوونما میں غیر فطری باڑیں نہ لگائی جائیں — آپ اگر کسی طرح صدی یا نصف صدی کے بعد پھر اس دنیا میں آسکیں تو دیکھ لیجئے گا کہ آپ کو اُردو اُسی طرح غیر مانوس نظر آئے گی۔ جس طرح آج ہمیں دکنی اُردو نظر آتی ہے — مرکز بدلنے سے زبانیں بھی بدل جایا کرتی ہیں اور اس فطری امر کو خوش فہمیوں کی آغوش میں رہ کر بدلا نہ جا سکے گا۔

اُردو جو لال قلعہ کی زبان ہے اُسے آج مغربی پاکستان کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہوگا۔ ورنہ — ورنہ اس ڈولی کا بوجھ ہمارے کندھے سہار نہ سکیں گے۔

آج میری باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میں اُردو جیسی پیاری اور نستعلیق زبان کے معاملے میں سوتیلی ماں کا سا رول ادا کرنے نکلا ہوں۔ یہ تہمت تسلیم، مگر میں نہیں چاہتا کہ سگی ماں کے بے جا چونچلوں سے اس غریب کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ "سگی ماں" نے جو کچھ مشرقی پاکستان میں اُردو کے ساتھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔

میں "اُردو دشمن" بن کر جی لوں گا۔ مگر یہ چاہتا ہوں، بہ صد خلوص چاہتا ہوں کہ ——— اُردو کی مانگ کا سیندور نہ لٹے!

محمد طفیل

۹۸

جون ۱۹۶۳ء

آئیے آج چہ لفظی بات کریں ———

علیؓ نے بلا الف خطبہ دیا۔ فیضی نے بغیر نقط تفسیر لکھی ——— دبیر نے بے نقط مرثیے لکھے ——— انشا کا بھی ایسا کلام ہے ——— واللہ! یہ لوگ کتنے فاضل تھے ——— ہم ذرا سی پابندی پہ عاجز ———
سابقہ طلوع پہ واویلا مچا ہے ——— یاروں کو اپنی اپنی کہنے دیجئے ——— میں تو ابھی چپ رہوں گا
انگریز کو گئے سولہ سال ہوئے ——— مگر ابھی ہمارے ذہن نہیں بدلے۔ انگریزی بولنے میں شان سمجھتے ہیں
——— اُردو بولنے سے دانستہ کتراتے ہیں ——— اپنی روایات، اپنا تمدن، اپنا کلچر ——— یہی علامتیں زندہ قوموں کی ہیں۔
دوستوں کو میرا یہ مشورہ ہے ——— بلاوجہ جو کوئی انگریزی بولے ——— چپ سادھ لیں، جواب نہ دیں ———
آئیے آج ہم یہی تحریک چلائیں ———

محمد طفیل

۹۹

ستمبر ۱۹۶۳ء

شوکت نمبر

لیجئے، وہ صاحب بھی مر گئے۔ جو مجسم زندگی تھے۔

شوکت صاحب کی شخصیت میں، کچھ ایسی موہنی تھی کہ انھیں دیکھ کر اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ زندگی کی ساعتیں طویل تر ہو جائیں۔

گھر کی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بھی ہفتوں قلق رہتا ہے۔ پھر یہ تو شوکت تھانوی تھے۔ ایک ایسی بھرپور ہستی، جسے میں اس دکھی دُنیا کیلیے خدا کی طرف سے عطیہ سمجھتا رہا۔ انھوں نے ہزاروں کو زندگی سے پیار کرنے کا درس دیا۔ مگر جب ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد بڑھی تو یہ چپکے سے موت کی انگلی پکڑے دور نکل گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شوکت صاحب صرف میرے دوست تھے۔ نہ ہی یہ دعویٰ کروں گا کہ انھیں جتنا میں جانتا تھا اُتنا کوئی اور واقف نہ تھا۔ اتنی "بے تعلقی" پر بھی، میرا ان سے جتنا بھی ربط ضبط رہا۔ اُس کی بنا پر، مجھ سے اُداس ہونے کا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

بیماری کے دنوں میں، شوکت صاحب اپنے دوستوں کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان یوں ٹپ ٹپ آنسو بہائے اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر انسانی زندگی پر شوکت صاحب کا یہ خاموش طنز بھی بھولنے والی بات نہیں۔

ہم سب کتنے عاجز ہیں کہ زندگی رونے کی آواز سے شروع ہو کر، درد کی آواز پر ختم ہو جاتی ہے۔

شوکت صاحب کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ اُن لوگوں کے بارے میں سوچیں، جو دفن ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔

محمد طفیل

۱۰۰

آپ بیتی نمبر

جون ۱۹۶۴ء

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا پاگل پن، کبھی مجھے اس حد تک بھی "رسوا" کرائے گا کہ جھونپڑی میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھوں گا۔

خاکسار ادب کی خدمت کا مدعی ہے۔ اب کے بادشاہوں کے حضور جا پہنچا۔ وہی بات ہوئی۔ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگوا تیلی!

یقین کیجئے آپ کے اِس گنگوا تیلی کو دیو جانس کلبی کی وہ بات پسند ہے کہ جب اس سے سکندرِ اعظم نے پوچھا تھا کہ —

"بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

تو اُس نے جواب میں کہا تھا "وہ دھوپ مجھ تک پہنچنے دیجیے۔ جو آپ نے روک رکھی ہے۔"

چلو، چھوڑیں اِس بات کو، میں تو کہنے یہ چلا تھا کہ اس گنہگارِ ادب نے اب کے بڑے ادیبوں کے ساتھ، بڑے لوگوں سے بھی قلمی مدد چاہی۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں کہ ادبی بادشاہوں کے ساتھ دنیاوی بادشاہوں سے بھی ملاقات کر لی جائے۔ بادشاہ تو بادشاہ، میں تو اس نمبر کے لیے اللہ میاں سے بھی مضمون لکھوانے کا ارادہ کرتا۔ بشرطیکہ اس پہ قدرت رکھتا۔

ایک طفلانہ سی بات یاد آئی۔

آپ نے سنا ہی ہو گا کہ ایک معصوم سے یتیم بچے نے اپنی ماں سے پوچھا تھا۔ "اماں میرے ابا کہاں ہیں؟"

"اللہ میاں کے پاس!"

چنانچہ اس بچے نے اپنے ابا کو خط اللہ میاں کی معرفت بھیجا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ اس نمبر کے سلسلے میں، اُس یتیم بچے والی معصومیت کو شعوری صورت دے دیتا۔ لوگ نادان ہی تو کہتے۔

اب جبکہ یہ نمبر آپ کے ملاحظہ میں آ رہا ہے۔ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں:

"کیا اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں، اللہ میاں نے میری کوئی مدد نہیں کی؟"

پتا نہیں آپ کا جواب کیا ہے۔ مگر میں بارگاہِ ربّ العزّت میں اپنا سر جھکا دینا چاہتا ہوں۔

محمد طفیل

۱۰۱

نومبر ۱۹۶۴

انسان کا خواب سے رشتہ بڑا پرانا ہے۔

خواب ہی تو ہیں جن سے انسان کی زندگی میں کچھ دلکشی باقی ہے۔ جب یہ آس بھی ٹوٹ جاتی ہے تو انسان یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر خودکشی کر لیتا ہے۔

ادب کے سلسلے میں، مَیں نے آسوں کے ٹوٹنے کے باوجود خودکشی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری دیوانگی تک بہت کم لوگ پہنچیں گے۔

سوال یہ ہے کہ میں نے خودکشی بھی نہیں کی اور پاگل بھی نہ ہوا۔ تو کیا میں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے زندہ ہوں؟ ۹؍جون ۱۹۶۴ء یہ دن بھی کیسا خون خشک کر دینے والا دن تھا۔ بلاوجہ ٹپ ٹپ کرنا، عادت جو ٹھہری۔

اس تاریخ سے بھی پہلے مجھے بھائی عشرت رحمانی نے یہ بتایا تھا کہ انجمن ادبی رسائل نقوش کے آپ بیتی نمبر کے سلسلے میں ایک جشن منانا چاہتی ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض؟

"جی ہاں! مجھے اعتراض ہے۔ اس لئے کہ خاکسار انجمن کا نائب صدر ہے۔ اس لیئے مناسب نہیں۔"

"آپ نائب صدر ہیں تو ہوا کریں۔ میں سیکرٹری ہوں۔ اس لیے میں بھی معاملات کو سمجھتا ہوں۔ پھر آپ سے بھی بڑے عہدے دار کراچی میں بیٹھے ہیں۔ میں اُن لوگوں سے بھی بات چیت کر چکا ہوں۔"

"بھئی وہ باتیں جو راولپنڈی میں ہوئی تھیں بڑی رسمی تھیں۔ شرما حضوری میں، ہاں کو رضامندی نہ سمجھا جائے۔"

"پھر اس نمائش کا فائدہ؟"

فائدہ آپ کو ہو یا نہ ہو۔ انجمن کو تو ہوگا۔ اس لئے کہ کئی سال سے اس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ اس بہانے ایک دفعہ پھر، انجمن کی زندگی کا ثبوت مل جائے گا۔"

"بات یہ ہے جناب! مجھے بھی انجمن سے دلچسپی ہے۔ مگر انجمن کی زندگی کے لیے، میں قربانی کا بکرا بننا نہیں چاہتا۔"

"تو بھئی! آپ کو قربانی کا بکرا کون بنا رہا ہے۔ ہم تو آپ کو برات کا دولہا بنا رہے ہیں۔"

"رہنے دو یار دولہا! زندگی میں جو ایک بار دُولہا بنے تھے، اُس پہ آج تک پچھتا رہے ہیں۔"

"ذرا ایک منٹ خاموش رہیے۔ پہلے میرا پروگرام سُن لیجیے۔"

"اچھا صاحب سنائیے۔ ایک منٹ چھوڑ، دو منٹ کے لئے چُپ ہو گیا۔"

"صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، اس جشن کا افتتاح کریں گے۔ مرکز کے وزیر تعلیم اس کی صدارت کریں گے۔ پاکستان اور ہندوستان کے ادیب اور مدیر اس میں شرکت کریں گے۔" یہ سب کچھ کہہ کر عشرت صاحب نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔

چونکہ ابھی دو منٹ نہیں گزرے تھے، اس لیے میں خاموش رہا۔ پورے دو منٹ کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا: "ماشاءاللہ! پروگرام

شاندار ہے۔ مگر جناب نے جو یہ فرض کر لیا ہے کہ آپ کے کہے پر سب دوڑے آئیں گے، یہ سب خوش فہمیاں ہیں۔ آسمان پر نہ اُڑئیے۔ زمین پر ہی رہا کیجئے۔ میں بھی خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ پر اتنے بھی نہیں۔"

"آپ کو اس سے کیا۔ میں آسمان پر اُڑوں یا زمین پر رہوں۔ آپ بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں آج میں نے صدر پاکستان کو جشنِ نقوش کے افتتاح کے لئے خط بھی لکھ دیا ہے۔"

"خط لکھ دیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"بھئی غضب کر دیا۔ پہلے سارے دوستوں کو بلاتے۔ ان سے مشورہ کرتے۔ پھر جو طے ہوتا وہ کرتے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات ٹھیک نہیں۔"

"میں نے سوا آپ کے سب سے بات کر لی تھی۔ لہٰذا اب تو یہ بتائیے کہ پروگرام کیا کیا ہو۔"

"آپ نے پروگرام تو پہلے ہی ہفتے میں بتا دیا تھا۔ اب مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ اب تو میں یہ دعا کروں گا کہ خدا میری عزت رکھے۔"

"اور ہماری رکھے نہ رکھے۔"

"آپ نے تو خود ہی آ بیل مجھے مار والی بات کی۔"

"بہرحال اب تو قدم اٹھا دیا ہے۔ لہٰذا پیچھے نہ ہٹے گا۔ اگر آپ اِس ضمن میں کوئی دلچسپی لینا نہیں چاہتے تو نہ لیں۔ مگر کل کلاں کو کوئی شکایت نہ کیجیے گا کہ یہ بات مناسب نہ ہوئی۔ وہ بات مناسب نہ ہوئی۔"

میں عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔ کچھ کہتا تو سبک ہوتا، چپ رہتا تو سو خطرے نظر آتے۔ اس لئے مجبوراً بہ ظاہر بے تعلق سا رہ کر، دلچسپی لینے لگا۔ اس لیے پوچھا۔ "جناب اتنے شاندار پروگرام کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"آئے گا۔"

"آخر کہاں سے؟"

"بس جو میں کہوں۔ وہ کرتے جائیے۔"

"مثلاً آپ اگر یہ کہہ دیں کہ اتنے ہزار کے نوٹ اپنے پریس میں چھپوا دیجیے۔ تو یہ میں کیسے چھپواؤں گا؟"

"آپ پریس میں نوٹ نہ چھپوائیں۔ مگر اتنا تو کر سکتے ہیں کہ میں جسے کہوں اُسے ٹیلی فون کر دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام!"

اُس وقت میں نے یوں سوچا کہ عشرت صاحب جنھیں میں نے ہمیشہ بھائی جانا اب ضرور مجھ سے بلیک میل کریں گے یا کرائیں گے۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اس معاملے میں مخلص تھے۔

چنانچہ عشرت صاحب نے مجھے جو حکم دیا۔ وہ کیا اور جو نہ کیا وہ سب انہوں نے خود کیا۔ روپے کا بھی انتظام ہوا۔ جلسہ بھی ہوا۔

اب آئیے میں آپ کو پارک لگژری ہوٹل لیے چلتا ہوں جہاں یہ ہنگامہ ہوگا۔

میں وقتِ مقررہ پر ہوٹل پہنچا۔ دیکھا باہر لان میں بےشمار کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک طرف چائے کا انتظام ہے۔ دوسری طرف سننے سنانے کا، اس وقت قریباً ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ کچھ آدمی کھڑے ضرور تھے۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس ہوں گے۔ میں ڈر کے مارے ہوٹل کے پورچ ہی میں کھڑا ہو گیا۔ کون بعد آڑو آتا۔

ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ چھ بجے کے قریب احباب آتے دکھائی دیے۔ پھر تو آتے ہی چلے گئے ڈھارس بندھ گئی۔

میں نے اس خیال سے دیکھا کہ کون کون آن پہنچا تو مجھے ادیبوں میں مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، حامد علی خاں، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولانا علم الدین سالک، ابوالخیر مودودی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، شیخ منظور الٰہی، خدیجہ مستور، حجاب امتیاز علی، مختار مسعود، شاہد احمد دہلوی، امتیاز علی تاج، حکیم یوسف حسن، صادق حسین، مولانا رازق الخیری، ڈاکٹر وحید قریشی، عشرت رحمانی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، جمیلہ ہاشمی، ظہیر بابر، میرزا ادیب، مسعود مفتی، عادل رشید، قیوم نظر، یوسف ظفر، محمد عبداللہ قریشی، کسریٰ منہاس، حبیب اللہ اوج۔ ظہور نظر، اشرف صبوحی، قاسم محمود، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مکین احسن کلیم، انتظار حسین، عطا حسین کلیم اور انجم رومانی۔ نظر آئے اس کے بعد، میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، مجھے کسی نے بتایا: "وزیر تعلیم آئے ہیں۔ اس لیے ان کے استقبال کے لیے اٹھو۔"

میں نے کہا: "میرا ان سے شخصی تعارف نہیں ہے۔ اس لیے مجھے کیوں اٹھاتے ہو؟" مگر تھوڑی سی رد و کد کے بعد مجھے اٹھنا پڑا۔

موصوف اپنی موٹر سے اتر کر جلسہ گاہ کی طرف آ رہے تھے۔ "راستے" میں ان سے ملاقات ہوئی۔

"میرا نام محمد طفیل ہے۔"

"بہت خوب، آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔"

"واقعی؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

اس کے بعد، اور لوگوں نے بڑھ بڑھ کر، وزیر تعلیم سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا اور میں پیچھے ہٹ گیا اور پھر جا کر، اپنی اسی کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عشرت رحمانی صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ اعلان کیا جلسے کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ میں میاں محمد یٰسین وٹو وزیر تعلیم مغربی پاکستان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کرسی صدارت پر تشریف لائیں۔

جب مسکراتے ہوئے میاں صاحب کرسی پر جا کر بیٹھ گئے تو سیکرٹری صاحب (عشرت رحمانی صاحب) نے پھر اعلان کیا۔ اب میں جناب علم الدین سالک سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لا کر خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمائیں۔

سالک صاحب نے فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا۔ خوب رواں زبان میں، بڑی معلوماتی اور عالمانہ باتیں کیں۔ خوب خوب لپٹے۔ خوب خوب برسے، نہیں نہیں۔ خوب خوب ہماری وجہ سے نہ برسے، ورنہ سالک صاحب لگی لپٹی رکھنے والے نہیں۔ وہ جابر سے جابر حاکم کے سامنے بھی کلمۂ حق کہہ گزرنے والوں میں سے ہیں۔

انہوں نے بڑے پیار سے وزیرِ معارف کو سمجھایا کہ آپ جس عہدے پر ہیں۔ اس کی بڑی ذمہ داریاں ہوا کرتی ہیں۔

پھر اُردو رسالوں کے باوا آدم جناب حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگِ خیال تشریف لائے۔ جو بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لکھے کو بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے۔ مجھے ان کی معذوریوں پر دُکھ ہوا۔ اپنا بھی انجام نظر آ گیا۔ انہوں نے اپنی جوانی میں ادب کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مگر آج اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے پرچے کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ مجبوراً غیر ادبی دھندے کرتے ہیں۔ اس سے جو کچھ کماتے ہیں۔ پرچے کو کھلا دیتے ہیں۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ اُردو ادب کا یہ بوڑھا سپاہی آج اپنی ادبی کارگزاریوں کی بنا پر زندہ بھی نہیں رہ سکتا؟ — اُردو ادب زندہ باد!

اس کے بعد اُردو کے جیالے ادیب، بڑے ادیب کے پوتے، جناب شاہد احمد دہلوی تشریف لائے۔ دل دھڑک رہا تھا کہ جانے کیا کہہ دیں۔ "سوت" والا معاملہ جو تھا۔ پھر ایک بار قدرے تھکم تھکا بھی ہو چکی تھی۔ اگر کسی سے انتقام لینا ہو اور اُسے ایسا موقع مل جائے تو اسے چوکنا بھی نہیں چاہیے۔ پھر شاہد صاحب کا قلم جتنا بے لگام ہے وہ بھی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ان کا کلیہ یہی ہے کہ خاکساری برتی جائے تو دنیا بے وقوف سمجھتی ہے۔ اس لئے یہ زمانہ جوتے مارنے کا ہے۔ مگر اللہ کا شکر کہ انہوں نے مجھ سے پیار کا رشتہ نبھایا۔ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور ادبی رسالوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا۔ وہ بڑا دلدوز تھا۔ شاہد صاحب کی زبان میں جو مٹھاس ہے اس نے معاملے کی ساری باتوں میں شیرینی گھول دی۔ ہم لاکھ کوشش کریں ہماری تحریروں میں "مولوی مدن والی" بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا کی اس دین سے انہوں نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا۔ جائز بھی، ناجائز بھی! جائز اصول کی "بنا" پر، ناجائز تنا تنی کی بنا پر، یہ انجمن تو انہی کی تھی۔ اس لیے سارے حق ادا کر گئے۔

پھر عادل رشید صاحب کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں ان سے بھی چخ چخ ہو چکی تھی۔ لہٰذا میرا سنبھل کے بیٹھنا، قدرتی بات تھی۔ مجھ ایسا تھڑدلا بھی کوئی نہ ہو۔ مگر اُس وقت وہاں، وہ عادل رشید کھڑے نہ تھے جو مشہور ناول نگار ہیں بلکہ ہندوستانی ادیبوں کے نمائندہ عادل رشید کھڑے تھے اور ان دونوں ہستیوں میں فرق تھا۔

مگر صاحب! انہوں نے چند بڑی اہم باتیں کہیں اور دُور رس نتائج والی باتیں کہیں۔ جن میں خلوص تھا معاملات کی نزاکت کا احساس تھا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا۔ وہ ایک ہندوستانی ادیب ہی کہہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ ہمارے مسائل مشترکہ ہوتے ہوئے بھی ملکی فیصلوں کی بنا پر مختلف ہیں، ہندوستان نے اعلانیہ اُردو سے بیزاری کا اعلان کیا۔ ہم نے دانستہ اسے کوئی مقام نہ دیا۔ اسے ختم کرنے کے سو حیلے وہاں بھی ہوئے۔ سو حیلے یہاں بھی ہوئے۔ چونکہ جاندار زبانوں کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے کہ انھیں کوئی بھی مٹا نہیں سکے گا۔ اس لیے یہ یہاں بھی لوگوں کے دلوں پہ راج کر رہی ہے۔ وہاں بھی لوگوں کے دلوں پہ راج کر رہی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی بھی کیا مزے کے آدمی تھے۔ وہ ہندی کی "فوقیت" کے سلسلے میں کچھ کہہ گئے ہیں۔ وہ سن لیجیے۔ بے موقع سہی مگر لطف سے خالی نہیں:

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو　　بعد مرنے کے کھلے گا کہ ہے یہ کام کی بات
بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں　　کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فوراً ہی نجات

ویسے ہی یہاں اُردو کے رسم الخط کو تبدیل کر کے اکبر الہ آبادی کے فیصلے کی روشنی میں "نجات" کا راستہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ ایک بار رومن رسم الخط کا نعرہ لگا تھا۔ اسی طرح آج کل ایک اور نعرہ ریہرسل کی اسٹیج میں ہے۔

ہاں تو میں بات عادل رشید صاحب کی کر رہا تھا۔ اُن کی سوچوں کو سراہ رہا تھا۔ ایک تو انہوں نے میرے خلاف کچھ نہ کہہ کر اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔ دوسرے ہندوستان کے ادیبوں کی طرف سے مجھے قلم تحفتہً دے کر نوازا۔ شیفر کا یہ سیٹ یوں تو تین ساڑھے تین سو روپے کا ہوگا۔ مگر میرے نزدیک اس کی قیمت لاکھوں سے زیادہ ہے۔

بغیر سوچے، بغیر پوچھے، عشرت صاحب نے پروگرام میں خدیجہ بہن کا نام لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی آپ بیتی پڑھیں گی۔ جب پروگرام ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

"کونسی حرکت؟"

"بغیر پوچھے میرا نام کیوں لکھا؟"

"یہ عشرت صاحب سے پوچھیے۔"

"میں عشرت صاحب سے نہیں پوچھوں گی۔ آپ سے انتقام لوں گی اور اب تو میں جلسے میں بھی شریک نہ ہونگی۔"

"ہاں صاحب انتقام لینے کا اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ ضرور انتقام لیجیے۔ میں حاضر ہوں!"

میرے اس جواب پر خدیجہ بہن کھلکھلا کر ہنس دیں۔ کہنے لگیں "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں طفیل بھائی کے سلسلے میں، جو تقریب منائی جا رہی ہو اس میں شرکت نہ کروں۔ میں آؤں گی اور اپنی آپ بیتی پڑھوں گی۔"

چنانچہ خدیجہ بہن آئیں۔ انہوں نے بڑے ہی پیارے انداز میں اپنی آپ بیتی پڑھی چھا گئیں۔ ایک تو لکھنے کا انداز اچھا پھر پڑھنے کا انداز اچھا۔ "مشاعرہ" لوٹ لیا۔

اس کے بعد میں جوش صاحب کے پاس پہنچا۔ عرض کیا۔ "جناب! یہ لیجیے اپنا مسودہ، اب اپنی آپ بیتی پڑھ ڈالیے اس لیے کہ پروگرام میں یہی لکھا ہے۔"

"بڑے بدمعاش ہو۔ خوب پھانسا۔"

اعلان ہوا تو انھیں اُٹھنا پڑا۔ مائیک پر جا کر کہا۔ "طفیل صاحب نے مجھے پہلے نہیں بتایا تھا کہ مجھے بھی اپنی آپ بیتی کہنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اپنے لکھے کو ایک نظر پھر دیکھ لیتا کہ مجھے اپنی بیتی میں سے کونسا حصہ پڑھنا ہے۔ بہر حال عرض کرتا ہوں۔"

چنانچہ انہوں نے نثر میں شاعری کی۔ لطف آیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُکھڑے ہوئے انداز میں پڑھ رہے ہیں۔ جیسے مجھے سمجھا رہے ہوں بچو! اب تو پھنس گیا ہوں۔ یہاں سے نپٹ لوں۔ پھر تم سے سمجھوں گا۔ مگر میں نے انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ شام ہو رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر کہا۔ "اب آپ کی عبادت کا وقت ہو چلا ہے۔ اس لئے اُٹھیے۔"

"ہاں چلو، ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

میں جوش صاحب کو ہوٹل کے ایک کمرے میں بٹھا کر واپس چلا آیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہوٹل اور جوش آپس میں بڑے یار ہیں۔

مجھے حفیظ جالندھری صاحب نے جوش صاحب کے پڑھنے کے دوران ہی، بلا کر یہ کہہ دیا تھا " اب مجھے بھی جلدی سے پڑھوا لو مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں جانا ہے۔" اور یہ بات میں نے سیکرٹری صاحب تک پہنچا دی تھی۔

چنانچہ جوش صاحب کے فوراً بعد حفیظ صاحب کو زحمت دی گئی۔ جوش صاحب کو لیکر میں جا ہی رہا تھا کہ حفیظ صاحب نے ایک دو فقرے جوش صاحب پر کس دیئے۔

جوش صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ بوڑھا بچہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے؟"

"نہیں نہیں!"

"سُنو تو، وہ کچھ میرے ہی بارے میں کہہ رہے ہیں۔"

"وہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہم تو یو۔پی والوں کو اُستاد مانتے ہیں۔ مگر۔ آپ کوئی اُستاد ہیں؟"

"ہاں اُستاد تو ہیں۔"

"تو پھر آپ ہی کے بارے میں کہہ رہے ہیں"۔

" اتنی دیر میں ہم دور نکل آئے۔ اور پھر یہ رندِ باصفا بھی بہت دُور نکل گئے ہوں گے۔

جب میں واپس آیا تو حفیظ صاحب کی باتیں، جو وہ تقریر کی صورت میں بیان فرما رہے تھے، جاری تھیں۔ دو ایک فقرے مجھے بھی مخاطب کر کے لڑھکا دیئے۔ میں تو ان کا پرانا نیاز مند ہوں۔ جو بھی کہیں۔ سر آنکھوں پہ۔ پھر وہ میری تعریف ہی تو کر رہے تھے۔ بُرا کیوں لگتا۔

طے کچھ ایسا تھا کہ بیرونی سفارت خانوں کے نمائندے بھی اپنے اپنے ارشادات کا اظہار، بہ سلسلہ نقوش کریں گے۔ چنانچہ پہلے ایرانی سفارت خانے کے آقائی شمس اللہ صاحب نے چند کلمات فارسی زبان میں کہے۔ جدید فارسی لہجہ ایرانی ہم میں سے بیشتر، الفاظ ٹٹول ٹٹول کر رہ گئے۔

پھر متحدہ عرب جمہوریہ کے نمائندے جناب فوزی الخلیل نے بجائے اپنی زبان (عربی) میں کچھ کہنے کے انگریزی میں تقریر کی" تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ بڑی پاٹ دار آواز میں، جو کچھ انھیں کہنا تھا کہا۔ نہ جانے انھیں نقوش کے بارے میں اتنی معلومات کیسے تھیں ضرور انھوں نے یہاں کسی سے دریافت کیا ہوگا۔ انگریزی بولتے بولتے، ایکدم عربی بولنے لگے۔ ترجمہ کے فرائض پروفیسر محمد منور نے ادا کئے۔ انگریزی میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ نقوش کے بارے میں تھا۔ عربی میں جو کچھ کہا وہ ان کے اپنے ہاں کے رسائل اور اخبارات کے بارے میں تھا۔

اس کے بعد اس خاکسار کا نام پکارا گیا تاکہ چند باتیں میں بھی کہوں۔ تحریر و تقریر کا چور! اگر دھر لیا گیا۔ کوئی بھی تو آلا بالا کام نہ آیا مجبوراً اُٹھنا پڑا اور وہ چند کلمات کہے۔ جو لکھ کر لے گیا تھا۔ اس میں سے بھی ایک پیرا نہ پڑھا۔ کسی اور کو پتا نہ تھا کہ میں نے کیا پڑھا اور کیا نہ پڑھا۔ چونکہ میری بیوی کو علم تھا۔ اس لئے تن گئیں۔

"جناب نے وہ پیرا نہ پڑھا جو میرے متعلق تھا۔"

"بیکار کی تعریف سے کیا فائدہ؟"

"بیکار کی تعریف!۔ اگر میرا وجود نہ ہوتا تو آج نقوش بھی اس مقام پہ نہ ہوتا۔"

"اچھا جی!"

"جی ہاں!"

"بھئی میں نے تو انتقاماً وہ حصہ نہ پڑھا۔ اس لیے کہ جب ہم یہاں آ رہے تھے تو آپ نے مجھے نروس کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ آپ ہی کے تو الفاظ ہیں کہ آپ کے تو ابھی سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔"

پھر، مجھے وزیر تعلیم کی وساطت سے، چند قیمتی تحائف دیئے گئے۔ جس کے لیے میں اپنے کرمفرماؤں اور سیکرٹری انجمن ادبی رسائل کا شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔

پھر جناب محمد یاسین وٹو (وزیر تعلیم مغربی پاکستان) نے اپنی صدارتی تقریر اچھے انداز میں کی جس کی ہمیں امید نہ تھی۔ میرے سارے ہی ساتھی کہتے تھے کہ وزیر موصوف کیا کہیں گے۔ مگر انہوں نے جو کہا خوب کہا۔ ہر چند کہ ان کی تقریر نے سب سے زیادہ وقت لیا مگر تقریر میں دلکشی ایسی تھی کہ سبھی قائل ہو گئے۔

اور ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گیا کہ انہوں نے انجمن سے خوب صورت وعدے بھی کیے تھے۔ مثلاً:

> "ہمارے ہاں اُردو میں اچھے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے عمدہ اور معیاری رسائل ہمارے ادب اور معاشرہ کی نہایت بیش قیمت خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے اس قسم کے رسائل کو باقاعدگی سے اپنی لائبریری میں منگوا کر طلبہ میں اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا کریں تو اس سے نہ صرف طلبہ و طالبات کو ایسا لٹریچر مہیا ہوگا جو ان کی شخصیت و سیرت کی تشکیل میں ممد ہوگا۔ بلکہ اس سے رسائل و جرائد کو اپنا معیار بلند کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ایسے رسائل تعلیمی اداروں میں لگائے جائیں چنانچہ اس مطلب کے لیے مناسب لائحہ عمل پر غور کیا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد سیکرٹری صاحب نے اعلان کیا کہ جلسے کی پہلی نشست ختم ہوتی ہے۔ اب آپ حضرات چائے کے لئے تشریف لے چلیں — اور چائے کے بعد مشاعرہ ہوگا۔

چائے کے لیے بیٹھے تو میں نے چاروں طرف اپنے پیاروں اور اپنے دوستوں کو دیکھا۔ پہلی عرض کی ہوئی فہرست میں ادیبوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا اور دوستوں کا بھی، مگر چھوٹے چھوٹے دائروں کی صورت میں بیٹھے ہوئے احباب پر نظریں دوڑانا جبکہ وہ چائے پی رہے ہوں۔ بھلا نہ لگا۔ غرض خوب رونق تھی۔ جھلا جھل کا سا سماں تھا۔ وہ دن اس اعتبار سے کہ میرے بہت سے دوست میری نظروں کے سامنے تھے۔ میرے لیے حد درجہ خوشیوں کا باعث تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض حضرات نے یہ کہا۔ "ایسا مرتبہ تو کسی کو مرنے کے بعد بھی نہیں ملتا جو طفیل کو اپنی زندگی میں مل گیا۔" یہ میرا حق تھا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ آج کیا ہوگا۔ صحیح فیصلے کے لیے ہمیشہ وقت کا انتظار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وقت میری زندگی میں نہ آسکے۔

چائے کے بعد مشاعرہ ہوا۔ پہلے ہی سے صرف چند شعرا سے پڑھوانے اور انہیں زیادہ سے زیادہ سننے کا پروگرام تھا۔ چنانچہ ظہور نظر، جونئے

شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اِن سے بزمِ سخن کا آغاز ہوا۔ پھر قتیلؔ شفائی نے خوش گوئی اور خوش گلوئی سے حاضرین سے داد پائی۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی نے جی بھر کے سُنایا اور سامعین سے بھی جی بھر کے داد پائی۔ آخر میں حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے کلام سے نوازا۔ سبھی سرشار ہوئے۔ سبھی جھوم اُٹھے۔

اس جشن کے کوئی پندرہ دن بعد ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی جشنِ نقوش پر ریکارڈ کی ہوئی تقریروں کے اقتباسات سنائے۔ پیغامات دہرائے اور اس تقریب کی غرض و غایت بیان کی — اور اس کے ساتھ وہ مشاعرہ نشر کیا جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے۔

لیجیے جلسہ ختم ہو گیا۔ اس کے متعلق باتیں بھی ختم ہوئیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں۔

اگر وقت ٹھہر سکتا تو میں اس سے پوچھ لیتا کہ تُو بہلاوے دینے کا عادی کیوں ہے؟ — اور کیوں تُو بادشاہ سے لے کر فقیر تک سبھی سے مذاق کرتا ہے؟

بہلاووں کو جیسے زبان مل گئی۔ اگر ہمارا وجود نہ ہوتا تو اس دنیا میں سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔

میں بلاوجہ پریشان تھا۔ بہلاووں کا وجود ضروری ہے۔

محمد طفیل

---

(۲)

جشنِ نقوش کے سلسلے میں جو تقاریر ہوئیں یا جو مضامین پڑھے گئے۔ اب ان کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

مولانا علم الدین سالک

صدرِ گرامی، خواتین و حضرات!

سب سے پہلے یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ انجمن کی طرف سے میں آپ حضرات کا خیر مقدم کروں۔ یہ میں دل سے کہہ رہا ہوں۔ اس میں کسی قسم کی منافقت نہیں۔ آپ نے زحمت فرمائی، تشریف لائے، وقت دیا اور وقت کو تھوڑا سا برباد بھی کیا اس لیے کہ ہم سب وقت پر کسی چیز کو شروع کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس کے بعد مجھے چند باتیں کہنی ہیں اور وہ میں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادبی جرائد میں نمبروں کا رواج جہاں تک حالات سے معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے ۱۹۰۳ء میں شاید ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی پر "مخزن" نے نکالا تھا اور اس کا حجم تقریباً ڈیوڑھا تھا اُس پرچے سے جو عام طور پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے دو برس بعد رسالہ "زمانہ" نے اکبرِ اعظم پر ایک خاص نمبر نکالا اور غالباً وہ پہلا موقع تھا جس سے متاثر ہو کر برٹش امپیریلزم نے اس بات کی کوشش کی کہ اکبر کی عزت لوگوں کے دلوں میں ہے اس کے سلسلے میں کچھ ایسا کام ہونا چاہیے کہ اس پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے کرنل میلیسن کو آمادہ کیا گیا۔ اس نے رُولرز آف انڈیا سیریز میں ایک مختصر سا مقالہ لکھا اس کے بعد سب سے اہم کام جس کے اندر حکومت نے بہت کچھ مدد کی وہ ونسن سمتھ کی کتاب تھی "اکبر دی گریٹ مغل"۔ حالانکہ اُنہی ایام کے اندر ایک جرمن کتاب کا بھی ترجمہ ہوا تھا "اکبر دی گریٹ کیزر ادنیارکہ" اس

کے اندر وہ باتیں نہیں ملتیں جو سمجھ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ تو بہرحال اس پرچے کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلا انقلابی پرچہ تھا جس نے کسی حد تک ہیجان پیدا کیا۔

اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد بہت کچھ حالات میں اور کچھ معاشرے میں انقلاب آیا۔ روس کے انقلاب نے لوگوں کو سوچنے پر آمادہ کیا کہ عوام کی بھی قوت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد روس کے اثرات ملک میں پھیلنے شروع ہوئے۔ انھیں ایام کے اندر کچھ رسائل نکلے جس میں میرا خیال ہے کہ غالباً حکیم محمد یوسف حسن کا نیرنگِ خیال پہلا رسالہ ہے جس نے خاص نمبروں کو ایک خاص حیثیت دی اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی یہ طرح ہے اور یہ بدعت ہے کہ جس کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں۔ جس پہ اکثر رسائل نے آگے چل کر وہی راستہ اختیار کیا۔ جو نیرنگِ خیال نے اختیار کیا تھا۔

اس کے بعد دوسرا بڑا انقلاب جو آیا وہ ۱۹۴۷ء کا تھا جب کہ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ جب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے بعد ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ذہنی انقلاب کے بعد ہی دل کے اندر انقلاب پیدا ہوا کرتا ہے تاکہ دونوں کے اندر ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد کسی قوم کا بامِ ترقی پر پہنچنا آسان کام ہوا کرتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے بعد ہمارے ہاں جو روایات پیدا ہوئیں ان پر ہم کبھی بھی فخر نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس ملک کے خطے کو اس واسطے مانگا تھا کہ ہماری کچھ روایات ہیں۔ ہم ان روایات کا تحفظ چاہتے ہیں اور ہم ان روایات کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں مَیں اپنے نوجوان وزیر سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وزیرِ معارف کے بڑے بڑے فرائض ہوا کرتے تھے۔ ان کی دریا بخشیوں سے ملک کے اندر انقلاب آیا اور ادب اس مقام پر پہنچا کہ آج ایران طوعاً و کرہاً اُس ادب کا اعتراف کرتا ہے کہ جو ہم نے ہندوستان کے اندر پیدا کیا اور آج میں فخر کے ساتھ سر بلند کر کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ ادب ہے جس کی مثال آپ کو اُس ادب میں نہیں مل سکتی جو ایران کے اندر تھا۔ کیونکہ اس میں خانخاناں کا ہاتھ ہے، فیضی کا ہاتھ ہے، ابوالفضل کا ہاتھ ہے اور مغلوں میں سب سے اُن پڑھ شہنشاہ اکبر کا ہاتھ ہے اُس نے نہ صرف یہ کہ ادب کی سرپرستی کی بلکہ اُس نے تعلیم کے نئے نئے نظریات پیش کئے۔ اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جو انقلاب آپ تعلیم کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں خاص کر بچوں کی تعلیم کے ضمن میں وہ اکبر کی اُن اصلاحات کی صدائے بازگشت ہے جو اس زمانے سے تقریباً چار سو برس پہلے ہوا۔

شروع سے آخر تک وزراء کے یہاں، جہاں یہ چیز تھی کہ وہ جنگوں کے اندر بہادری کے کارنامے دکھایا کرتے تھے۔ وہاں ان کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ ادب کی سرپرستی کیا کرتے تھے شعرا کے مکانوں پہ جاتے، ادیبوں سے چیزیں لکھواتے اور معمولی معمولی بات کہ لاکھ روپیہ نہیں دیکھا لاکھ روپیہ بخش دیا کرتے تھے۔ آج اُن روایات کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک اس وقت صحرائے اعظم ہے۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ نہ یہاں علم ہے نہ ادب ہے نہ اس کا کوئی معیار ہے۔ آپ شکایت کس بات کی کرتے ہیں کہ صاحب لڑکوں کو یہ معلوم نہیں کہ محمد بن قاسم کس طرف سے آیا جب آپ ٹھیک سے پڑھائیں گے نہیں تو یہی کچھ ہوگا۔ اور یوں محمد بن قاسم بمبئی کے راستے بھی ہندوستان میں داخل ہو سکتا ہے۔

اگر علمی روایات کو زندہ رکھنا ہے تو اس ضمن میں ہمارے رسائل کا بھی یہ فرض تھا اور ہے کہ وہ بھی اس سلسلے میں قدم بڑھاتے

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سامنے ایک مسئلہ تھا اور وہ مسئلہ استادِ ازل نے اُن کے دماغوں میں ڈالا اور پھر وہ ان کے اندر جاگزین ہوا۔ اور وہ مسئلہ سیکس (SEX) تھا حالانکہ یہ کوئی پرابلم اس ملک کے لیے نہیں ہے۔ لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ حشرات الارض کی طرح چیزیں لکھی گئیں۔

۱۹۴۸ء کے اندر نقوش نے جنم لیا۔ اُس نے جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ سولہ برس کی مُدّت قوموں کی تاریخ میں کوئی مدت نہیں ہوتی لیکن ہمارے ملک کے اندر رسائل اور جرائد کی عمر کے اندر یہ ایک بہت لمبا عرصہ ہے۔ اس عرصے میں اس نے مختلف نمبر نکالے۔ ان میں سے بعض نمبر ایسے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جو کام آپ نے کرنا تھا وہ نقوش نے کر دیا۔ یہ حکومت کے فرائض میں ہونا چاہیے تھا کہ مہاجر جب لٹ پٹ کر آ رہے تھے تو اُن سے آپ بیتیاں لکھواتے، اُن کے حالات کا جائزہ لیتے تاکہ وقت کا مُورّخ جب قلم اُٹھاتا تو وہ چیز موجود ہوتی جس سے اُس ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا جو آج ہندوستان کے کم و بیش ہر فرد کے اندر کام کر رہی ہے۔

نقوش کا مکاتیب نمبر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اُس نمبر کو پڑھنے کے بعد آپ ملک کی اُن سماجی، علمی، ادبی روایات اور اس کے ساتھ ہی سیاسی روایات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جو روایات بیسویں صدی کے اندر اس مُلک میں قائم ہوتی رہیں۔

اس کے بعد انہوں نے شخصیات نمبر نکالا۔ بہت سے لوگ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے جن کی خدمات موجود تھیں مگر لوگ اُن کو بہت کم جانتے تھے۔ نقوش نے اُن لوگوں کو زندہ کیا یہ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔ آپ جب یہاں کے سیاسی انقلاب کی تاریخ لکھیں گے تو یہ نمبر آپ کو کافی مدد دے سکتا ہے۔

غزل ہمارے فنِ سخن کے اندر ایک خاص اہمیت اور خاص مقام رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے غلامانہ ذہنیت کی بنا پر انگریز کے ایک اشارے پر اور انگریز مصنفین کے کہنے پر ہم نے اسے بہیمیت کا نمونہ سمجھ لیا۔ کتابیں لکھی گئیں اور لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا وہ خود سراپا غزل ہے۔ ایک پیرے کا دوسرے پیرے کے ساتھ تعلق نہیں۔ ایک بات کا دوسری بات کے ساتھ تعلق نہیں۔ جس چیز کی وہ سب سے زیادہ مذمت کرتے ہیں وہ چیز خود ان کی تنقیدی کتابوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ نقوش نے غزل نمبر نکالا۔ ایک چیز آپ کے سامنے پیش کر دی۔ اب وہ لوگ جو غزل کی حمایت کر رہے ہیں یا جو غزل کو اپنے کلچر یا ثقافت یا تہذیب کا ایک ایسا جزو سمجھتے ہیں کہ جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا وہ غزل نمبر کو سامنے رکھ کر کچھ چیزیں تدوین تو کر سکتے ہیں جس سے ان تمام باتوں کا ازالہ ہو سکے جو مغربی مصنفین نے ہمارے ذہنوں میں ڈالی ہیں۔

لاہور جو ایک بہت بڑا مرکز ہے ہمارے علم کا، ہماری تعلیمی سرگرمیوں کا، ہماری ثقافت کا، پاکستان کے اندر بھی ایک شہر ہے جس کا ہماری "تاریخ" کے ساتھ بہت زیادہ تعلق رہا۔ اس کے بارے میں بھی بڑی مختصر سی چند کتابیں تھیں جو زائد المیعاد ہو چکی تھیں۔ نقوش نے لاہور نمبر نکالا۔ اب میرا خیال ہے کہ آج اس نمبر کو سامنے رکھ کر لاہور کی "تاریخ" کی تدوین بآسانی ہو سکتی ہے۔ اور ہونی چاہیے، اگر بلگرام جیسے قصبے، کاکوری جیسے قصبے کی تاریخیں لکھی جا سکتی ہیں تو یقینی طور پر لاہور کا بہت بڑا حق ہے۔ لاہور نے ہماری فنی تعمیرات میں، ادب میں، ثقافت اور معاشرے میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے اور اُن انقلابات کو یکجا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ

جو نسلیں آ رہی ہیں اُس کو پڑھیں اور اُن کے دل و دماغ میں ایک ذہنی انقلاب پیدا ہو۔

اب وہ آپ کے سامنے آپ بیتی نمبر پیش کر رہے ہیں۔ آپ بیتی دلچسپ چیز ہوا کرتی ہے۔ لیکن بسا اوقات سیاسی لوگ اپنی غلط کاریوں کو اسی آپ بیتی کے رنگ کے اندر چھپا لیا کرتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق و صداقت کہہ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً برٹش امپیریلزم کی تاریخ جب آپ لکھیں گے تو بے شک بڑے بڑے گورنر جنرلز کو چھوڑ دیجئے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سیاست کے رنگ میں کہتے ہیں معمولی لفٹنٹ، سپاہی یا عام آدمی جو ہے، جب وہ اپنی ڈائری لکھتا ہے یا اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے تو اس میں حقیقت نظر آتی ہے اور اس قسم کی چیزیں اکثر مل جایا کرتی ہیں۔ ہمارے علوم و فنون کی تاریخ کے تدوین کرنے میں جو آپ کے ہاں ٹریولرز آئے اُن کی بڑی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ میں نے ایک واقعہ پڑھا اور دوستوں سے بھی بیان کیا۔ کہ جیکو ماں سنہ ۱۸۲۱ء کے اندر ہندوستان آتا ہے۔ فرینچ نیچرلسٹ تھا۔ جڑی بوٹی کی تحقیق کے لیے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چٹھی لے کر کشمیر جاتا ہے وہاں پر وہ لکھتا ہے کہ آٹھ سو گھرانے ایسے ہیں جن کا ذریعہ معاش کتابت ہے اور سنہ ۱۹۲۶ء کے اندر جب ہم نے وہاں مجلس میلاد منعقد کرنے کی کوشش کی تو کاتب کو تلاش کرتے تھے اور کاتب نہیں ملتا تھا۔ ایک بوڑھا کاتب ملا۔ اُس نے کہا کہ میرے تو ہاتھ کانپتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ قوموں کے تمدن کو کس طرح مٹایا جاتا ہے اور کس طرح اُن کے دماغوں پر اور ذہنوں پر غلامی کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ آپ آپ بیتیوں کو یکجا کر جاتے۔ جو جو کسی پر گزری ہو لکھ ڈالتے اور بے باکی کے ساتھ لکھ ڈالتے۔ بعد میں یہ چیزیں بڑے کام کی ثابت ہوں گی۔ اس واسطے یہ نمبر اہمیت رکھتا ہے[1]۔

اب مجھے ایک چیز کا اعلان کرنا ہے کہ میرے بعد کچھ حضرات اور بھی تقاریر فرمائیں گے۔ غالباً وہ زیادہ مربوط ہوں گی۔ زیادہ کام کی باتیں کہیں گے۔ اُن میں سے سب سے پہلے حکیم یوسف حسن ہوں گے۔ نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر۔ پھر اس کے بعد شاہد احمد دہلوی جن کا تعلق ایک بہت بڑے انسان کے ساتھ اور ایک بہت بڑے گھرانے کے ساتھ ہے جن کی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ایرانی اور عرب سفارت خانہ کے نمائندے کچھ فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے مہمان عزیز جن کے لیے ہمارے دل میں احترام ہے اور وہ عادل رشید صاحب ہیں جو ہندوستان سے تشریف لائے ہیں۔ جو وہاں کے ادبا کی طرف سے طفیل صاحب کی خدمات کو اور نقوش کی خدمات کو سراہیں گے۔ اس کے بعد صاحبِ صدر تقریر فرمائیں گے۔

حضرات! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری ژولیدہ بیانی کو سُنا

علم الدین سالک

حکیم یوسف حسن

محترم صدر و حاضرین

عہدِ حاضرہ کے معروف ادبی رسالہ نقوش کی سو نمبری اشاعت کی تقریب پر ہم ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ادب کی تشہیر کے لیے ادیبوں کے قلم اور رسائل کی افادیت مسلمہ ہے۔ چنانچہ شیدایانِ ادب کے لیے آج کا اجتماع ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

---

[1] یہاں پر سالک صاحب نے اپنے دوست عبداللہ قریشی کی کوششوں کو بھی سراہا۔ قریشی صاحب ہمارے ہاں گزشتہ ساڑھے چار برس سے کام کر رہے تھے۔ سالک صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ان کی بے لوث مشقتوں اور مخلصانہ تعاون کا اظہار کرنا تھا (محمد طفیل)

پاکستان کو جو کچھ ادبی ورثہ ملا ہے وہ وہی ہے جو ہند و پاکستان میں گزشتہ صدی کے اہلِ قلم اور اہلِ دانش کے فہم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ اُدبا کی ایک معزز جماعت نے اس میں حصّہ لیا۔ چنانچہ اس صدی کے آخری نصف میں مخزن، ہمایوں، عصمت، نیرنگِ خیال، ساقی اور تہذیب نے جو ادب پیش کیا وہ یقینی طور پر بے مثال اور لازوال ہے۔ یہ ادب کسی بھی غیر ملکی زبان کے ادب کے مقابلہ میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گزشتہ سولہ سال میں ہم نے اس ادبی ورثہ کی حفاظت اور ترقی میں کیا کچھ کیا اور ہم کہاں تک پہنچے ہیں!

گزشتہ پندرہ سولہ سال میں پاکستان میں ادب پر کیا کچھ گزری۔ اس کی داستان ایک المیہ ہے۔ یہ زمانہ ہمارے ادبی انحطاط کا دور ہے۔ اس لیے ہمیں تلاش کرنا ہے کہ موجودہ ادبی انحطاط کے اسباب و علل کیا ہیں۔ اگر ہم اس کو معلوم کر سکیں تو پھر علاج کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سے ۲۵-۳۰ سال قبل اہلِ قلم ادبی مشاغل میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہ اصحاب اخبارات اور رسائل میں ایک پاکیزہ جذبہ کے تحت لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھتے تھے۔ ان کی بے لوث سرگرمیوں سے رسائل کے وقار اور ادب کے رجحانات میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس جذبہ کے تحت ہمارا قیمتی ادب مرتب ہوا۔ لیکن دورِ انحطاط میں جو کچھ ہوا ہے وہ ملکی تقسیم کے نتیجہ میں مسافروں میں ریل پیل، آپا دھاپی، مکان اور معاش کی تلاش میں جد و جہد ہے۔ ملک کے بیشتر مسائل صرف لوٹ کھسوٹ جلبِ منفعت اور زر اندوزی کی نذر ہو گئے۔ ہماری طبیعت کا تمام رجحان کاروباری ہو گیا اور ادبی قدریں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

عوام و خواص کی اس نئی مصروفیت کے تحت ادبی قدریں بھی کاروباری صورت اختیار کرتی چلی گئیں۔ پرانے لکھنے والے جو صرف ذوقِ ادب کے لیے وقف تھے گوشہ نشین ہو گئے۔ ادھر نئے لکھنے والوں نے ادب کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ میں اس ذریعۂ معاش کے خلاف نہیں۔ جلد یا بدیر اس نے ہمارے ملک میں جنم لینا تھا اُس نے جنم لیا۔ مگر پیش از وقت ہمارے ادیبوں کی خاصی تعداد اس رَو میں بہ گئی جس کی وجہ سے ادب میں انحطاط کے آثار پیدا ہو گئے۔ مضمون ہو یا افسانہ، نظم ہو یا غزل۔ جب معاوضہ کے تحت لکھی جاتی ہے تو اس کا رنگ پھیکا ہوتا ہے۔ وہ گہرائی اور مغز سے خالی ہوتی ہے۔ اس میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ آج کل جو ادب ہم پیش کر رہے ہیں وہ تجارتی مصروفیت سے زیادہ کچھ نہیں۔ ادب کا مقصد بہت بلند و بالا ہے۔ آپ نے کبھی کسی بنگلہ کے مختصر باغیچہ کے حسن و بناوٹ پر بھی غور فرمایا ہے جس میں صاحبِ خانہ اپنے ہاتھ سے پھولوں، پودوں اور کیاریوں کی تزئین و ترتیب میں مصروفِ کار نظر آتا ہے۔ اُس کا انہماک ایک روحانی مسرت سے لبریز ہوتا ہے جس کے تحت وہ ان کی پرورش کرتا اور ان کی رنگینیوں اور نقاشوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں فنونِ لطیفہ قلبی اور روحانی مسرتوں کے لیے کارفرما ہوتا ہے۔ اس سے سودا بازی یا تجارتی مفاد وابستہ نہیں ہوتے۔ یہاں فن برائے فن اور مسرت برائے حقیقت ہوتی ہے۔ یقین کیجیے کہ اہلِ قلم جب ادب کی تخلیق کے لیے لکھتا ہے تو اس کی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

گزشتہ سولہ سال میں ہم ادب اور زبان کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری دوسری مصروفیات اور دلچسپیوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ حکومت تو ملک کی ترقی اور استحکام میں اپنے قابلِ تعریف کارناموں سے مقبول ہو رہی ہے۔ وہ ملک کی فلاح اور ترقی کے کاموں میں بے حد مصروف اور متحرک ہے۔ اس کے باوجود اُس

نے ادب کو اپنے دائرۂ عمل سے باہر نہیں سمجھا۔ وہ ادیبوں کے مسائل سے بے خبر نہیں رہی۔ لسانی اور ادبی مسائل حکومت کے زیرِ غور ہیں جن پر برابر ہمدردانہ غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اس مسئلہ میں عوام کو دلچسپی لینی چاہیے۔

آج کی مجلس اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ انحطاط کے اس دور میں بھی ادبی رسائل نے ہمت نہیں ہاری۔ اور وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ ادبی رسائل کی انجمن کے نامور رکن محترم محمد طفیل صاحب مدیرِ نقوش نے بساطِ ادب پر عظیم نمبروں اور ادبی کارناموں کے امٹ نشان کندہ کیے ہیں اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ادب کو زندہ اور پُروقار بنانے کے لئے عوام اپنے اندر بڑا جذبہ رکھتے ہیں جس کا مقتدر نشان نقوش کا آپ بیتی نمبر ہے۔ اس رسالہ کی کامیابی نے ادبی رسایل میں حیاتِ نو پیدا کر دی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کا جمود اور سکون حرکت و زندگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اِس طرح ہم پھر ایک بار کامیابی کی منزل کی طرف رواں نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ۔ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا۔ تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے گا۔

(حکیم) یوسف حسن)

شاہد احمد دہلوی

ہمارے لیے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ نقوش اپنے کامیاب سولہ سالہ دَورِ حیات کے بعد اپنا ۱۰۰ واں شمارہ پیش کر رہا ہے۔ یہ کامیابی دوگونہ ہے۔ ایک تو یہ کہ نقوش پابندیٔ وقت کے ساتھ بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا رہا دوسرے یہ کہ جس مقصد سے نقوش جاری کیا گیا تھا اُسے پُورا کرنے میں بھی اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ میری مراد اس کی اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات سے ہے، جن کا اعتراف بعض ایسے لوگوں نے بھی کیا ہے جو کسی اچھے کام کو سراہنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہمارے ادبی رسالے اپنے عروج پر تھے۔ ہم میں سے بیشتر حضرات کو یاد ہوگا کہ اس زمانے میں عصمت، نگار، ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر، خیالستان، نیرنگ، سب رس، ادبِ لطیف، ادبی دنیا، شاہکار، سویرا اور ساقی شائع ہوتے تھے۔ ان سب رسالوں نے اردو ادب کو ترقی دینے میں معتدبہ حصہ لیا اور سیکڑوں نئے ادیبوں اور شاعروں کو روشناس کرایا۔ مگر تقسیمِ ملک کے وقت جو افراتفری ہوئی اُس کی لپیٹ میں ہمارے کئی رسالے آ گئے۔ ادب کے لیے ناسازگار حالات نے ادبی رسالوں کا دھرّا توڑ دیا۔ جو سخت جان تھے۔ سِسک سِسک کر جیتے رہے مگر ؏

یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے؟

لیکن یہ ادبی رسالوں کے ایڈیٹر بڑے من چلے ہوتے ہیں۔ اپنا رسالہ جاری رکھنے کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہیں لاہور میں ایک بزرگ مُدیر ہیں جنھوں نے طے کر لیا ہے کہ اپنا سارا اثاث البیت اپنے رسالے پر لگا دیں گے۔ مگر کون ہے جو اُن کے اس جنونِ خدمت کی قدر کرے؟ ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک اور بہت پُرانے اڈیٹر ہیں جن کے رسالے نے اب سے چالیس سال پہلے دھوم مچا رکھی تھی، اب بھی اپنا ادبی رسالہ شائع

کرتے ہیں اور جو کچھ اِدھر اُدھر سے کماتے ہیں رسالے پر لگا دیتے ہیں۔ عمر ستر سے تجاوز کر گئی ہے۔ ایک آنکھ کی بصارت زائل ہو گئی ہے، صحت کو ذیابیطس کا گھن لگ گیا ہے مگر رسالہ کو نہیں چھوڑتے، یا شاید رسالہ انھیں نہیں چھوڑتا۔ بعض دفعہ یہ بھی تو ہوتا ہے نا کہ کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔

ہاں تو تقسیم ملک کے بعد ادبی رسالوں پر یہی بپیری وقت پڑا تھا کہ اسی شہر کے ایک جیالے سپوت محمد طفیل نے نقوش کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکال دیا اور اس شان سے نکالا کہ بے اختیار اس کے لیے درازیٔ عمر کی دعا دل سے نکلی۔ ان محمد طفیل کا نام اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ معلوم ہوا کہ لاہور کے اور سیکڑوں چھوٹے ناشروں کی طرح ان کا بھی ایک ادارہ فروغِ اُردو ہے۔ نقوش کی ادارت میں احمد ندیم قاسمی کا نام درج تھا۔ ان کا نام ہی اس کی کافی ضمانت تھا کہ اس رسالے میں کوئی دوسرے درجے کی چیز شائع نہ ہو سکے گی۔ مگر جو کرشمہ دامنِ دل کو پہلی نظر میں اپنی طرف کھینچ لیتا تھا وہ تھا اس کا ظاہری روپ۔ صاف ستھری کتابت و طباعت جو آنکھوں میں کھبی جاتی۔ سرورق سادہ و پُرکار جس کے رنگوں کے امتزاج سے خوش ذوقی ٹپکتی تھی۔ غرض نقوش کی ظاہری اور باطنی خوبیوں نے ایک ہی جست میں اسے صفِ اوّل میں پہنچا دیا۔

طفیل صاحب نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا کہ ایسے ناگفتہ بہ معاشی حالات میں ایک عمدہ ادبی رسالہ جاری کر دیا۔ اندیشہ یہی تھا کہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کے بعد ہی ہمیں شاید یہ کہنا پڑے گا کہ ؏

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

مگر شکر ہے کہ ہمارا اندیشہ غلط نکلا اور نقوش دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ پھر ایکا ایکی اسے ایک جھٹکا لگا۔ احمد ندیم قاسمی بعض وجوہ کی بنا پر اس کی ادارت سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی جگہ ادیبِ شہیر سید وقار عظیم کو سونپ دی گئی۔ پاکستان کی جلد سے جلد بدلنے والی حکومتوں کی طرح اُسی زمانے میں نقوش کی ادارتیں بھی بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ خود محمد طفیل صاحب نے نقوش کی ادارت سنبھال لی۔ ادارتی تبدیلیوں سے نقوش کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ضخیم خاص نمبر اچھوتے موضوعات پر شائع کر کے نقوش تمام ادبی رسالوں سے بازی لے گیا۔ افسانہ نمبروں کے علاوہ غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، مکتوبات نمبر، ادبِ عالیہ نمبر اور لاہور نمبر جیسے نمبر شائع کر کے طفیل صاحب نے اپنی دھاک بٹھا دی کہ اُن کا اس میدان میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ پطرس مرحوم کا فقرہ نقوش کے ہر نمبر پر اودبدا کر یاد آتا ہے کہ ان کا ہر پرچہ ایک خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر شائع ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک اور دوست غلام عباس کا فقرہ بھی اکثر یاد آتا ہے کہ نقوش مٹاپے کا مریض ہو گیا ہے۔ جب اور سارے ادبی رسالے سوکھے کے مریض ہو گئے ہیں تو نقوش کا مٹاپے کا مریض ہو جانا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نقوش کی تمام تر ترقی اس کے مالک و مدیر محمد طفیل صاحب کی مرہونِ منت ہے۔ کام کرنے کے معاملے میں وہ جِنّ ہیں اتنی محنت ہم جیسے دو چار اڈیٹروں سے مل کر بھی نہیں ہو سکتی۔ انھیں بس ایک ہی دھن ہے کہ نقوش زندہ رہے قوت و توانائی کے ساتھ

اور اُردو ادب کا بول بالا کرنے کے لیے نت نئے خاص نمبر شائع کرتا رہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ صد شمارہ تقریب ہے جس میں "آپ بیتی نمبر" پیش کیا جا رہا ہے۔ اس خاص نمبر کی دستاویزی اور افادی حیثیت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ ہم سب کو جناب طفیل کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے تنہا وہ کام کیا ہے جو ہمارے حکومت سے بڑی بڑی امدادی رقمیں پانے والے، اُردو کے ترقیاتی ادارے انجام نہ دے سکے۔

انجمن ادبی رسائل، پاکستان کو اس پر فخر ہے کہ نقوش کی صد شمارہ تقریب کا اہتمام اس انجمن نے کیا۔ میں انجمن کے تمام ممبروں کی طرف سے آپ حضرات کی شرکت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی کرم فرمائی سے ہماری عزت افزائی ہوئی۔

شاہد احمد دہلوی
(سکریٹری جنرل) انجمن ادبی رسائل پاکستان

عادل رشید

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

میں انجمن ادبی رسائل پاکستان کا انتہائی ممنون ہوں کہ اُس نے مجھے یہ خوشگوار لمحہ عطا فرمایا ہے کہ میں آپ جیسی معزز اور ادب نواز ہستیوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے خیالات و جذبات کا مختصر طور پر اظہار کر سکوں۔

میرے لیے انجمن ادبی رسائل پاکستان کی یہ پُرخلوص دعوت اس بات کا واضح اور کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ادیب ہمیشہ ایک ہوتے ہیں۔ خواہ اُن کا تعلق کسی مُلک کسی قوم اور کسی نسل سے کیوں نہ ہو۔

ادب خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی زبان کا ادب کیوں نہ ہو ادب ہوتا ہے۔ اور وہ انسانیت، بھائی چارہ، دوستی، پیار اور اخلاق کی تعلیم ہمیں دیتا ہے۔ اور ادب ہمیں وہ سب کچھ عطا کرتا ہے جو بھلا ہوتا ہے اور بُرا ہرگز نہیں ہوتا۔

انجمن ادبی رسائل پاکستان یقینی طور پر قابلِ ستائش و قابلِ مبارکباد ہے کہ اُس نے اپنے ملک کے ادبی رسائل کی دشواریوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنے مُلک کے ادبی رسائل کی دشواریوں اور مشکلات کو اپنی حکومت کے سامنے رکھے، اور اپنی حکومت سے اپیل کرے کہ وہ ادبی رسائل کے لیے وہ ذرائع پیدا کرے، جس سے کہ وہ پُروقار بنیں اور ادب کی خدمت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں۔

"نقوش" آپ کے ملک کا ایک ایسا ادبی جریدہ ہے جس نے اپنی زندگی کی سو سیڑھیاں بڑی آب و تاب اور شان و شوکت کے ساتھ طے کر لی ہیں اور آج ہم سب انجمن ادبی رسائل کی تقریب میں "نقوش" کو اس کی اس کامیابی اور ترقی پر کہ اُس نے اپنے سو شماروں کے ذریعے ادب کی بیش از بیش خدمات انجام دی ہیں دلی مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

"نقوش" یقینی طور پر ایک ایسا ادبی ماہنامہ ہے جسے اس کی ادبی خدمات کے صلے میں یہ اعزاز ملنا چاہیے تھا۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آج اُسے اس کا یہ اعزاز مل رہا ہے۔

توانا اور زندہ قومیں وہ ہوتی ہیں جن کا ادب معیاری ہو، اور جو اپنے ادب کو ٹھوس صلاحیتوں کا مالک بنا سکیں۔

میں ذاتی طور پر ہمیشہ کسی ملک اور کسی قوم کی بلندی اور برتری کو اس کے ادب کے ذریعہ جانچتا اور پرکھتا ہوں۔

آپ کے ملک پاکستان کا ادب یقینی طور پر معیاری، صاف ستھرا اور پُروقار ہے۔ آپ کے ملک سے ایسے ایسے ادبی ماہنامے شائع ہوتے ہیں، جنھیں دیکھ کر ہمیں رشک آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دلی خوشی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہماری زبان اُردو کے ہوتے ہیں جنھیں میں ہمیشہ اُردو ادب کے ہی رسایل کہوں گا۔ اور آپ بھی اُردو ادب کو اردو ہی ادب کہیے۔ آپ اس ادب کو پاکستانی ادب کا خطاب دے کر اسے پاکستانی اور ہندوستانی ادب کے دو خانوں میں نہ بانٹیے۔ اسے اُردو ہی ادب رہنے دیجیے۔ اُردو ادب، اُردو ادب ہے۔ وہ پاکستانی ادب یا ہندوستانی ادب کبھی نہیں بن سکتا۔

آپ کا ملک معیاری اور خوب صورت اخبارات و رسائل کا گہوارہ ہے۔ کوشش کیجئے کہ آپ کے ملک کے یہ اخبارات و رسایلِ اخوت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے عَلَم کو اور مضبوطی کے ساتھ لے کر اس انداز سے آگے بڑھیں کہ ساری دنیا کے انسانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اور وہ اپنے سارے اختلافات بھول کر ایک دوسرے سے گلے مل جائیں۔

میں ذاتی طور پر آپ کی حکومت کو بھی خراجِ عقیدت پیش کروں گا جو اپنے ملک کے ادبی رسایل، اپنے ملک کے ادب اور اپنے ملک کے ادیبوں کی سرپرستی اور دلجوئی فرماتی ہے اور انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

یقیناً وہ حکومتیں قابلِ صد رشک ہیں اور قابلِ تعریف ہیں جو اپنے ملک کے ادب کو آگے بڑھانے اور اُسے تابندگی بخشنے میں اپنے یہاں کے ادبی قافلوں کی رہنمائی فرماتی ہیں اور انھیں ادب کے آسمانوں کو چھُو لینے میں عملی طور پر مدد دیتی ہیں۔

میں اپنے ملک کے ایک اُردو ادیب کی حیثیت سے "نقوش" اور "ادارہ نقوش" کو ان کی اس کامیابی اور ان کی اس توانائی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ میری یہ دلی مبارکباد جو کہ "نقوش" کے لیے ہے، محض میری ہی مبارکباد نہیں ہے بلکہ اس میں میرے ملک کے سارے اُردو کے ادیب شامل ہیں۔

سب سے آخر میں، مَیں اپنے اور اپنے ملک کے تمام اُردو ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے "نقوش" کے مدیر محترم جناب طفیل صاحب کی خدمت میں، اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ایک ناچیز تحفہ پیش کرنے کی سچی خوشی حاصل کر رہا ہوں۔

یہ تحفہ بھی ادیبوں کی طرف سے، ایک معیاری ماہنامہ کے مدیر کے لیے ہے اور ادیبوں کے پاس سوائے قلم کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

لہٰذا ادب کے ایک نگران اور محافظ کو ہم ہندوستانی ادیبوں کا یہ تحفہ مبارک ہو۔

اگر جناب طفیل صاحب نے ہم ادیبوں کا یہ تحفہ قبول فرما لیا تو ہم اسے اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی اور کامیابی سمجھیں گے۔

خدا حافظ۔ السلام علیکم

عادل رشید

حفیظ جالندھری

صاحبِ صدر! معزز خواتین، میرے دوستو اور بزرگو!

تقریریں ہوئیں۔ میں نے بھی سُنیں اور جو مقصد ان تقریروں کا تھا۔ اسے بھی سمجھنے کی کوشش کی۔

میرا نام آپ بیتی میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے ایک بیتی میں نے بھی لکھ کر اس آپ بیتیوں کے سمندر (نقوش) میں ڈال دی ہے اسے آپ پڑھ لیں۔

سوانح حیات کا بیان کرنا میرے لیئے بہت مشکل ہے جیسے جناب جوش نے ابھی ایک بیتی بیان کی ہے۔ ہر چند کہ میں اور جوش دو مخالف سمتوں میں ہیں۔ لیکن خیال میں ایک ہیں۔ جب بیتی ایک واقعہ کا نام ہوتا ہے تو بہت سی بیتیوں کا مجموعہ؟ بس مجھے یہی کہنا تھا:

اب مجھے یہ کہنا ہے کہ مجھ پر طفیل کے ذریعے کیا بیتی۔ طفیل میاں سے زیادہ محنت کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر طرح سے اور ہر قیمت پر ہر کسی کو پھانس ہی لینا ہے۔ ایک مرتبہ تو میں غزل نمبر میں پھنس گیا۔ غزل چونکہ میرا فن ہے اور میری اپنی جوانی یا وہ برباد جوانی جو یہاں لاہور میں گزری — اب میں ان حسرتوں کا کیا ذکر کروں۔ ویسے بھی اُن حسرتوں میں کوئی تذکرہ ایسا نہیں جو آپ حضرات کو لذت دے۔ وہ محرومیاں میری ہیں، وہ ناکامیاں میری ہیں۔

انہوں نے ابھی تک نظم نمبر نہیں نکالا۔ وہ لوگ جو غزل کہتے ہیں۔ نظم بھی کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے کبھی نظم نمبر نکالا تو میں اپنی نظمیں بھی ان کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ایک انہوں نے لاہور نمبر نکالا تھا۔ میں نے بھی اپنی نیازمندی کا اظہار، ایک نظم لکھ کر کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے سیرت یا صورت نمبر نکالا۔ میری نہ صورت اچھی، نہ سیرت اچھی۔

میں نے آپ بیتی نمبر کے لیے، اپنی بیتیوں میں سے وہ بیتی چنی کہ آپ اُسے پڑھ کر حیران ہو جائیں گے کہ اچھا یا اتنا بڑا شاعر اور اس کے ساتھ یہ بھی بیتی۔ چونکہ شاعری میں، کچھ پڑھنے لکھنے کے ساتھ، اپنے آپ کو منوانا بھی پڑتا ہے اس لیے مشاعروں میں پڑھنا، سہرے کا موقع ہو تو سہرا پڑھ دینا۔ غرض ہر اس موقع سے فائدہ اُٹھانا جس سے پبلک کے سامنے آنے کا موقع ملے۔ اس سے ہم شاعر لوگ گریز نہیں کرتے۔

اگر کسی تقریب میں بھانڈوں کو بُلایا جائے یا طوائف کو بلائیں تو اس پر زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ بھانڈ اور طوائفیں مہنگی ہیں۔ شاعر سستے ہیں۔ تو یہ ہم لوگوں کی کچھ ایسی ہی بیتیاں ہیں۔ ان میں سے ہر بیتی کے ہزاروں رنگ ہیں مجھ پر بھی یہ بیتی ہے کہ ؎

اپنی شبِ وصال کا اُلٹا زمانہ تھا
اوپر دری تھی اور تلے شامیانہ تھا

حضور! اپنی شبِ وصال کا اُلٹا زمانہ تھا۔ اوپر دری تھی اور تلے شامیانہ تھا۔ میری زندگی تو اسی طرح کٹی ہے۔ یوں بڑی لمبی داستان ہے یہ۔

میں داد دیتا ہوں جناب طفیل کو، کہ یہ ایک لڑکا سا ہمارے سامنے آیا تھا۔ پتلا، دُبلا، چھریرا، میرا خیال ہے کہ یہ بھی جالندھر[1]

---

[1] میرا جالندھر سے کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک میرا یا میرے آباؤ اجداد کا تعلق ہے وہ لاہور ہی کے تھے۔

کا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں۔ مار بھی کھاتے ہیں۔ مگر کام کرتے ہیں۔ سیالکوٹ سے تو ایک ہی آیا[1]۔ اور اس نے ایسی ضرب لگائی کہ ہم سب سر سہلاتے رہ گئے۔ باقی یو۔ پی سے بہت سے استاد آئے۔ وہ ہم سب کے اُستاد ہیں۔ یہ ہم دل سے مانتے ہیں۔

طفیل چاہے تو یہ ہم سے عالمِ نزع میں بھی مضمون لکھوا لے۔ اب کے اس نے مجھے ایسے وقت میں پھانسا جب کہ میں ایک نہایت ضروری کام میں مشغول تھا۔ شعر تو کہتا ہوں لیکن وہ نقوش میں نہیں آسکتے۔ وہ پاکستان کی تعمیر کے متعلق ہیں۔ پنجابی میں ایسے راجوں اور ترکھانوں والا کام کہنا چاہیے یعنی وہ کام، جس سے تعمیر ہو۔

ہر شاعر اور ادیب اپنے اندر ایسی ایسی آپ بیتیوں کو گم کیے بیٹھا ہے کہ اگر وہ سامنے آجائیں، تو سب کی ہستی گم ہو جائے۔ اس کے باوجود، ہم لوگ ایسی ایسی چیزیں دے جاتے ہیں کہ اس کی یہاں کیا ستائش ہوگی۔ لاکھوں روپے نچھاور کر کے بھی اس کا انعام کوئی نہیں دے سکتا۔ البتہ ہم سب موت کے بعد پھول چڑھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس لیے اس فراموش کار زمانہ میں یہی بہت سمجھا جائے۔

چونکہ اس کے بعد ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اور مجھے اپنے ایک مشن کے سلسلے میں جانا ضروری ہے لہٰذا اجازت دیجیے کہ میں نے جو چند اشعار اس موقع کے لیے کہے ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ آج میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خاکساری برتنے کے برعکس کچھ کہا ہے۔ یہ شعر تعلّی کے ہیں یعنی اپنا قصیدہ آج پہلی مرتبہ کہا ہے سنیے۔

یہ رنگ رنگ کی نغمہ طراز تصویریں
مرے ہی خواب کے نیرنگ کی ہیں تصویریں[2]

شمس اللہ تعمتی

(نمایندۂ سفارتی ایران)

قبل از این کہ بہ مطالب مربوط بپردازم، اجازہ بفرمائید از جناب آقای یاسین وتو، وزیرِ معظم فرہنگ پاکستان غربی کہ ریاست این جلسہ را بہ عہدہ دارند و از مہمانان محترم و ہمچنین از جناب آقای محمد طفیل، مدیر و سرپرست مجلۂ نقوش، تشکر و امتنان نمایم کہ در این جلسہ حضور نمایندہ خانۂ فرہنگی ایران را دعوت فرمودہ مفتخر ساختہ اند۔

فقط سہ روز پیش از طرف جناب آقای محمد طفیل اطلاع دادہ شد کہ چنین جلسہ ای بمناسبت افتتاح شمارۂ اختصاصی مجلہ در لاہور تشکیل خواہد یافت و اینکہ سخن رانی نمایندہ خانہ فرہنگی ایران نیز جزو آن برنامہ است۔ موضوع سخنرانی توضیحاتی چند دربارۂ

---

[1] یہاں حفیظ صاحب کی مراد علامہ اقبال سے ہے

[2] پوری غزل اسی پرچے میں دوسری جگہ درج ہے۔ (م۔ط)

تشریک و مجلات ادبی ایران قرار گرفت۔ البتہ این یک امر بسیار مشکل بود۔ زیرا کہ در طی دو یا سہ روز ممکن نبود کہ اقدام مناسب تری در این مورد بعمل آورد۔ در ہر حال، اطلاعاتی کہ اختصاراً دربارۂ روزنامہ و مجلات ایران تہیہ گردیدہ بعرض میرسد۔

تعداد روزنامہ ہا و مجلاتی کہ اکنون در ایران منتشر میشود اگر از یک ہزار تجاوز نکردہ باشد کمتر ہم نیست۔ مشہور ترین این جرائد عبارتند از: اطلاعات روزانہ، اطلاعات ہفتگی، اطلاعات ماہانہ، اطلاعات بانوان، اطلاعات جوانان اطلاعات کودکان، تہران ژورنال دو تہران (فرانسہ) اطلاعات (عربی)، کیہان روزانہ، کیہان ہفتگی کتاب ماہ، کیہان ورزشی، کیہان بچہ ہا، کیہان ژورنال (انگلیسی) و علاوہ بر روزنامہ ہای مشعل، خدنگ، اقدام، طلوع، پارس وغیرہ، مجلات سپید و سیاہ، روشنفکر، تہران مصور، خواندنیہا، و مجلات معروف ادبی مانند سخن۔ یغما، ارمغان، راہنمای کتاب، اندیشہ و ہنر، مجلہ دانشکدۂ ادبیات تہران مجلہ دانشکدۂ ادبیات تبریز، مجلہ دانشکدۂ اصفہان، و مجلات علمی و ادبی و فرہنگی دیگر نیز پخش میشود کہ اغلب آنہا در پیشرفت زبان و ادبیات فارسی و فرہنگ ایران خدمات بزرگ و نمایانی انجام دادہ و می دہند۔ ایران مخصوصاً بہ سرپرستی و راہنمائی شاہنشاہ جلیل و ادب دوست اعلیٰحضرت ہمایون محمد رضا شاہ پہلوی پیشرفت نمایانی در فرہنگ و ادبیات زبان فارسی کردہ و این پیش رفت با رسائل بیشتر و جدید و با افزایش روز بروز آرامہ دارد۔

دربارۂ مجلہ نقوش، حضار محترم این جلسہ اطلاعات بیشتری دارند و از بندہ بہتر می دانند کہ این مجلہ در طی پانزدہ سال انتشار خود بہ چہ مقام نائل گردیدہ و چگونہ خدمات شائستہ و با ارزشی بہ زبان و ادبیات اردو انجام دادہ است۔ شمارہ ہای اختصاصی این مجلہ از ہر حیث بی مانند بودہ است و امید است کہ شمارۂ مخصوص مجلہ نقوش کہ دارای شرح احوال بزرگان و معاریف معاصر جہان است۔ بعنوان یک صحیفہ تاریخی محفوظ و موردِ استفادۂ علاقمندان و ادب دوستان قرار گیرد۔ در تنظیم و ترتیب این مجلہ و جمع آوری شرح احوال بزرگان و معاریف جہان۔ مساعی جناب آقای محمد طفیل قابلِ تمجید و توصیف است۔ بندہ از طرف خانہ فرہنگی ایران خدمت آقای محمد طفیل ہدیۂ تبریک و تشکر تقدیم میکنم۔

(شمس اللہ قمتی)

FAUZI-UL-KHALEEL

ASSALAM-O-ALAIKUM:

Actually I had an impression to address you in Arabic but unfortunately because the common language which has to be understood between us all most of us cannot understand and address each other well. that means the Arabic Language. But I hope in the near future, Insha-allah, and by the help of our Pakistani brethren

we will be able in our Cultural Centre to propagate the Arabic Language and to make it understood by you all, Insha Allah. And excuse me if I address you in a language which is not our own, either national or religious language, but at least it is the language with which I can express myself in a way to make you understand me. To spread culture and to spread healthy culture is a great service to the humanity and indeed all the journals and magazines which are serving this purpose are serving man-kind in a most worthy way. A shrewd author who can put before the tired world an article lucid enough to engage the attention of a reader and add something to his pleasure or knowledge is a great benevolent or benefactor whose services would in no way be under-rated or depreciated. yet it is a fact of great importance that only those magzines and journals which are able to introduce healthy and wholesome understanding and materials should be encouraged. So the journals are great power to mould the character of their readers and it should be seen that the character of the readers in the degenerated world of today be given the utmost attention that these are well-mounted. A good journal is a great asset to the library funds of the country and it gives me great delight to see Mr. Mohammad Tufail so painstaking so as to make a journal a really good asset to the library funds of this country. Mr. Mohammad Tufail really deserves our hearty congratulations and the Nuqoosh is really fortunate to have such a worthy editor and such a worthy guardian who left no stone unturned through this vast world when he has intended to publish the autobiographies of a long list of notables in all spheres and shades of life, the world over. It shall be a pleasing sight to view such a remarkable attempt and the result of such an attempt bound in a volume which it would be a delight both to read and to view. This attempt shall philosophically even bring a wide world of peoples a bit closer to each other and it shall also bring good credit to the country in which such a work has been prepared and published,; yet this Nuqoosh has no mean record in the past. Its numbers viz. the Ghazal

Number, the Afsana Number, the Shakhsiyat Number, the Tanzo-o-Mazah Number, the Lahore Number, the Minto Number, the Shaukat Number, The Pitras Number, The Maka-Teeb Number, the Azadi Number, the Khas Number, the Salnamah and the Adab-i-Aliya Number-are of the features which due to their variety, solidarity, necessity and sublimity reach a mark which is well nigh enviable. This, indeed, is a proud record and all those who had a share in the making of these momumental works deserve to be proud in their great contributions which they have made for the pleasure and for the guidanee of all readers of Urdu both in this country and abroad. Again these numbers which have above been enumerated were numbers quite complete in their line and the relative subjects have received a wonderfully complete treatment and have offered an exhaustive study which could remain a record to aid scholars, the artists and the historians of this country. Comparing the past with the future it may offer a better and much improved picture as is apparent from the endeavour which the enthusiastic editor of this journal is going to make it even more which may ever further enliven and make it even more useful as a pleasant reading matter and an instructive guide. I pray that the journal may flourish and be fruitful both for those who compose and those who read it—AMEEN.

مُدیرِ نقوش

صاحبِ صدر، دوستو، بہنو اور — اور بیگم صاحبہ!

اللہ کی اِس دُنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک سے ایک جی، ٹی، ایس، ایک سے ایک علامہ، ایک سے ایک لبقراط! پھر ان لوگوں کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو صرف باتیں کر کر کے اپنے آپ کو علامہ اور لبقراط منوا لیتی ہے اور ایک قسم وہ ہے جو سر جھکائے، مخالفتوں کے تیر اپنے دل و دماغ پر روکتے ہوئے کچھ نہ کچھ کر گزرتی ہے۔

میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرا شمار صرف باتیں کرنے والوں میں ہو۔

میں ابھی اپنے ایک دوست کے ساتھ باہر گیا تھا۔ ایک بڑے معقول قسم کے افسر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے جانچتے ہوئے کہا "میں آپ سے بڑا متاثر تھا۔ مگر آپ کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ باتیں بھی آپ کی متاثر کرنے والی نہیں ہیں۔ پھر آپ کی پرسنیلٹی[1] بھی کچھ نہیں۔ کچھ داڑھی ہوتی، کچھ موٹے تازے ہوتے، کچھ عمر رسیدہ ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ"۔ اُن کے ان ریمارکس پر میں بہت ہنسا، اللہ سے شکوہ بھی کیا کہ جہاں تُو نے اتنا کچھ

---

[1] PERSONALITY

دے رکھا ہے۔ وہاں تھوڑی سی پبلسٹی بھی دے دیتا تو تیرا کیا بگڑتا۔ مگر ساتھ ہی شکر بھی ادا کیا کہ میرا شمار کبھی بھی باتیں کرنے والوں میں نہ ہوگا۔

جناب! میں تو آج باتیں سننے آیا ہوں۔ سنانے نہیں آیا۔ اس لیے کہ میں نے ایک طرح سے آپ سے بہت باتیں کی ہیں۔ غزل کی زبان میں، میں نے باتیں کیں۔ افسانوی رنگ میں، میں نے باتیں کیں۔ خطوط کی شکل میں، میں نے باتیں کیں۔ شخصیات کی آڑ میں، میں نے باتیں کیں۔ طنز و مزاح کا لبادہ میں نے اوڑھا۔ اپنی جنم بھومی لاہور کے بارے میں، سارے اتے پتے میں نے دیے۔ اب دوسروں کی آپ بیتیوں کے پسِ پردہ، اپنی بھی آپ بیتی لکھ دی ہے۔ غرض میں نے آپ سے باتیں کرنے کی ہر صورت کو اختیار کیا۔ اگر میں آپ سے باتیں کرنے کے اتنے انداز اختیار نہ کرتا تو آج آپ مجھ سے اتنے واقف نہ ہوتے۔ اتنے قریب نہ ہوتے۔

میں اپنی زندگی کے اُن لمحات کو بڑا قیمتی جانتا ہوں جو ادب کی خدمت کے سلسلے میں قدرت مجھ سے وصول کرتی ہے یقین کیجیے میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا یا مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا۔ اس کے لیے میں اپنے آپ کو داد کا مستحق نہیں سمجھتا۔ بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو مجھ سے یہ کام لے رہی ہے۔

اپنے ذہنی رُخ کی نشاندہی کے سلسلے میں میں نے اسی پرچے میں لکھا ہے:

> میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چلی جا رہی ہیں اور چلی ہی جا رہی ہیں۔ یوں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اُن اِکا دُکا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی۔ جو قطار سے الگ، مخالف سمت جا رہی ہوں۔
>
> میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں، قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اُن اِکا دُکا، اداس، پریشان مگر حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رُخ کیا جائے۔

واقعی اللہ کی اس دنیا میں، سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ جی، ٹی، ایس بھی، علامہ بھی، بقراط بھی —— اور مجھ ایسے پاگل بھی!

اب میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ اپنے پاگل پن کا ایک اور ثبوت وزیر معارف کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

محمد طفیل

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا پیغام[1]

نقوش کے ۱۰۰ ویں شمارے کی اشاعت پر میں ادارے اور اس کے مدیر کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے ذاتی محنت اور مسلسل کاوش سے نقوش کو اس معیار پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج یہ جریدہ بین الاقوامی شخصیتوں کی خود نوشت سوانح پیش کر رہا ہے۔

اگرچہ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے میں اس ادبی اجتماع میں شریک نہیں ہو سکتا، لیکن ذہنی طور پر میں اس ادبی جشن میں شریک ہوں۔ میں پاکستان کے ادیبوں اور فن کاروں کا مداح ہوں۔ ان سے ہماری بہت سی قومی امیدیں وابستہ ہیں۔ ادیب اور فنکار قوم کے

---

[1] صدر پاکستان اور وزیرِ خارجہ کے پیغامات پہلے بھی چھپ چکے ہیں۔ تکرار کی معذرت چاہتے ہیں مگر پوری روداد کے ضمن میں ان کا دوبارہ آنا بھی ضروری تھا۔

ممد ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے آج تک ہم سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے رکھا۔ یہ ایک تعمیری رجحان ہے۔

نقوش ادیبوں اور فن کاروں کا ایک نمایندہ جریدہ ہے جو صالح اور تعمیری ادب پیش کرتا رہا ہے۔ اعلیٰ ادب پیش کرنے والے جریدوں کی تعداد ہمارے ہاں بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے اِن کی اہمیت بہت زیادہ ہے میری خواہش ہے کہ ایسے جریدے تعداد میں بڑھیں اور ملک میں باذوق قاری پیدا کریں۔

محمد ایوب خاں فیلڈ مارشل

ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ پاکستان

نقوش کے سوویں شمارہ کی اشاعت کے موقع پر پیغام بھیجتے ہوئے ان شاندار خدمات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی جو اس جریدے نے اس ملک کے ادبی ارتقا کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

ایک ایسے دور میں جبکہ قیام پاکستان نے فرسودہ روایات اور پرانے رجحانات میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کر دی تھی اس جریدے نے ادبی ماحول میں خوشگوار صحت مند اور بر وقت تبدیلی پیدا کرنے اور ادب کو نئے زاویے عطا کرنے میں بہت گرانقدر کام کیا ہے یہی نہیں بلکہ اس نے ادب دوست حضرات کے ذوق کو صحت مند دھارے میں موڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خدمات ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

نقوش کے اس "آپ بیتی" نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ نقوش کی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو

محمد یٰسین وٹو، وزیرِ تعلیم مغربی پاکستان

جنابِ طفیل صاحب، انجمن کے عہدے دار صاحبان، خواتین و حضرات!

اہلِ قلم، اہلِ علم، اہلِ فکر، اہلِ نظر بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہ اہلِ اہلیت لوگوں کی محفل میں آکر کسے خوشی نہ ہوگی۔ مجھے بھی اسی حیثیت سے یہاں آکر خوشی ہوئی۔

یہاں آتے ہی ذہن نے ایک سوال کر دیا جو کئی لمحات کے لیے میرے لئے الجھن کا باعث بنا، کہ یہاں جہاں سبھی اہل لوگ موجود ہیں۔ جہاں اہلِ قلم ہیں، اہلِ علم ہیں، اہلِ فکر ہیں، اہلِ نظر ہیں۔ وہاں تم کس اہلیت کی بنا پر آ گئے۔ پہلا جواب ذہن میں یہ آیا کہ شاید اہلِ وزارت کی حیثیت سے، مگر تھوڑی دیر کے بعد یہاں آ کے میری فکر نے بھی کچھ کام کیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہیں اہلِ جرأت کی حیثیت سے اس لیے کہ اتنے عالموں، اتنے فاضلوں اور اتنے اہلِ فن حضرات کے پاس آکر، اور پھر ایسی تقریب میں آکر جہاں یہ تحریر ہو کہ "خطبۂ صدارت" فلاں شخص کو دینا ہے۔ جو ان ساری اہلیتوں سے، خود کو اس حیثیت سے نا اہل پاتا ہے کہ وہ سوچ اور فکر کے میدان میں اُن کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو سکے کہ جس میدان میں ان لوگوں نے زندگیاں کھپائی ہیں اور جو میدان اتنے عظیم اور اتنے اہم ہیں کہ جن کے مقابلے میں دنیا کی کوئی اور چیز نہیں لائی جا سکتی۔

مجھے ایسی تقاریب پر اکثر ایک گلہ بلکہ منتظمین سے شکوہ رہا ہے کہ مجھے تقریر کرنے کا موقع اُس وقت دیا جاتا ہے جب اتنا وقت

صرف کیا جا چکا ہوتا ہے کہ سامعین کسی لمبی تقریر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے مگر آج مجھے کچھ اُس شکوے کے لیے شکوہ نہیں۔ اگرچہ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ بے شک یہ مجلس اور یہ محفل اس سے بھی لمبی ہو جاتی اور مجھے اس سے بھی تھوڑا وقت ملتا جو مجھے اب اس تقریر کے لیے ملے گا کیونکہ یہاں بہت قیمتی باتیں ہوئیں اور ان لوگوں کی طرف سے جن کو میں بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ اگر میری طرف سے ایسے موقع پر کوئی خاص بات نہ کی جائے تو یقین جانئے کہ آپ کسی محرومی کے بغیر مطمئن طور پر تشریف لے جا سکیں گے۔

خواتین و حضرات! کل ہی اسمبلی کے ایئرکنڈیشنڈ ہال سے باہر نکلتے ہوئے میں ایک خواہ مخواہ قسم کی سوچ میں پڑ گیا کہ انسان نے کتنی کتنی عظیم ایجادات کی ہیں۔ مگر ان سب میں بڑی ایجاد کیا ہے؟ اور پھر جب میں اپنے دفتر کے کمرے میں گیا تو میں کبھی حیدرآباد ٹیلیفون کر رہا تھا۔ کبھی پشاور بات کر رہا تھا اور کبھی لاہور کے ہی دفتر میں بیٹھے ہوئے کسی دوست سے گفتگو کر رہا تھا تو وہ سوال میرے ذہن میں اور اُبھر آیا اور پھر یہ سوال کچھ یوں سوار ہو گیا کہ پھر ہر بات پر اُبھرتا رہا۔ جب میں نے بجلی کے قمقموں کو دیکھا تو اس سوال نے پھر مجھے پکارا کہ جواب دو کہ سب سے زیادہ اہم ایجاد انسان نے کیا کی ہے۔ میں خاصے عرصے تک اس سوال کے بارے میں سوچتا رہا اور آج جب میں آپ حضرات کی محفل میں آنے ہی والا تھا کہ میرے ذہن نے یہ جواب دیا ہے اور اس سے میں مطمئن ہوا ہوں کہ انسان کی سب سے بڑی ایجاد ”قلم ہے۔ اس لیے کہ اگر قلم نہ ہوتا اور اگر انسان قلم ایجاد نہ کر لیتا تو آج انسان کی زندگی کتنی ایجادوں سے محروم ہوتی اور اگر انسان اپنی فکر کے نتائج کو اس ایجاد کے ذریعے انسان کی مستقل میراث نہ بنا دیتا تو زندگی کتنی غریب ہوتی۔ کتنی کم مایہ ہوتی۔ اس سوچ نے مجھے یقین سا دلا دیا ہے کہ شاید میرا جواب درست ہے اور مجھے امید ہے کہ اہلِ قلم حضرات بھی اس بات سے متفق ہوں گے کہ میرا یہ جواب ایجاداتِ انسانی کے بارے میں درست ہے۔

جو باتیں بھی دنیا میں سوچی جاتی ہیں، جو باتیں بھی دنیا میں کہی جاتی ہیں اُن باتوں کے سوچنے کا، ان باتوں کے کہنے کا، وہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ اُن سوچی ہوئی باتوں کے نچوڑوں کو قلم کے سپرد کر کے اُسے ایسی مستقل حیثیت نہیں دے دیتے کہ جو جب چاہے آپ کی فکر کے موتیوں سے استفادہ کرے۔ اُس وقت تک فکری ارتقا کا سلسلہ نہیں چلتا اور وہ باتیں جو آج یہاں کہی جائیں گی وہ کچھ عرصے کے بعد کسی کو یاد نہیں رہیں گی۔ دنیا میں کتنے بڑے لوگ ہوئے ہوں گے۔ دنیا میں کتنے لوگوں نے کتنی عظیم باتیں کی ہوں گی۔ لیکن جن عظیم باتوں کو، جن عظیم کارناموں کو، جن عظیم انسانوں کو، جن عظیم واقعات کو، عظیم قلم نہیں ملے وہ باتیں عظمت کے بلند میناروں سے نیچے گر گئیں۔ ایسی بھی اَن گنت باتیں ہوئی ہوں گی جن باتوں کو آپ نہیں جانتے، میں نہیں جانتا اور شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے کہ قلم کا منہ اُن کے بارے میں خاموش رہا۔ میں نے دیہات میں متعدد ایسی خواتین و حضرات کو دیکھا ہے اور ایسے بھی اَن پڑھ بھائیوں سے ملا ہوں جن کی باتیں کوئی نہیں لکھے گا۔ مگر ان کی باتیں یقین جانیے کہ سنہری الفاظ میں لکھنے والی ہیں۔ کیونکہ سوچنا کسی کی میراث نہیں۔ فکر کسی کی میراث نہیں۔

حضرات میں اکثر اس بات کو یاد کرتا ہوں کہ میرے ایک پروفیسر نے ایک زمانے میں مجھے یہ حکم دیا تھا کہ ”تم لکھتے رہنا“ مجھے افسوس ہے کہ میں اُن کا نااہل شاگرد ثابت ہوا کہ میں اِس میدان میں بالکل کورا رہ گیا۔ مگر اس کے باوجود کہ میں اپنے خیالات کو لکھ نہیں سکا اور نہ ہی زیادہ وقت ان علمی، ادبی محفلوں میں گزار سکا۔ جن سے آپ ہر روز محظوظ ہوتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں پھر بھی میں نے اُن نقوش کو ہمیشہ پڑھنے کی کوشش کی ہے جو نقوش ہمارے سامنے آج کے رسالے نقوش سے کہیں بڑی بڑی کتابوں کی حیثیت سے

سامنے آئے ہیں جن کا ایک ایک تاثر، ایک ایک ادا، ایک ایک بات، ایک ایک ناراضی، ایک ایک خوشی، ایک ایک مطالبہ، اپنی جگہ پر کتنی کتنی کتابیں لیے ہوئے ہے اور جب میں اُن نقوش کو پڑھتا ہوں تو مجھے کئی اور کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے باوجود جب میں وہ باتیں جو ان نقوش سے پڑھوں ان نقوش میں دیکھوں جب تک وہ باتیں صفحۂ قرطاس پر نہ آجائیں اُن باتوں کا کوئی فائدہ نہیں جو سوچوں گا جو پڑھوں گا اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ اس کا کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کوئی استفادہ نہ کر سکے گا۔

میں طفیل صاحب کے نقوش کا اس لیے مداح ہوں کہ اس نقوش میں اُن نقوش کے متعلق باتیں ہوں گی وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ لوگ جان سکیں گے، لوگ پڑھ سکیں گے۔ میں تو کبھی کبھی یوں سوچتا ہوں کہ سقراط اس لیے عظیم ہے کہ اس کی باتیں قلم کے ذریعے ہم تک پہنچ گئیں۔ دوسرے مُوحد اس لیے عظیم ہیں کہ قلم کے ذریعے اُن کی بڑی بڑی باتیں، اچھی اچھی باتیں ہماری میراث بن گئی ہیں۔ ہم اپنے خیالات کو نئے ولولے دے سکتے ہیں، نئے انسپریشن دے سکتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کو اُن کی روشنی میں اس حیثیت سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی راہیں متعین کر لیں۔

میں آج بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی بار بار احساس دلا رہی ہے کہ جتنا کم کہوں شاید اتنا ہی اچھا ہو مگر طفیل صاحب کے متعلق چند باتیں کیے بغیر بات ختم کر دینا بھی مناسب نہ ہوگا۔

وہ چیونٹی یقیناً قابلِ قدر ہے ایسی چیونٹیوں سے جو ایک ہی راہ پر چل رہی ہیں۔ بغیر سوچے، بغیر یہ کہ اُن کی منزل کیا اور کہاں ہے اور بغیر یہ جانے کہ جس طرف وہ جا رہی ہیں وہ کیا پائیں گی کیا کھوئیں گی۔ یقیناً وہ چیونٹی قابلِ قدر ہے جو نئی راہیں تلاش کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ شاید ہر چیونٹی کے لیے علیحدہ راہ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ وہ چیونٹیاں یقیناً قابلِ قدر ہیں جو نئی راہیں تلاش کرتی ہیں اس لیے کہ جب وہ جوشِ عمل کے سہارے اُس میدان میں کود پڑتی ہیں تو اس کے بعد وہ کئی ایسی نئی راہیں، دوسری چیونٹیوں کے لیے تلاش کر لیتی ہیں۔ اُن راہوں پہ دوسری چیونٹیاں بغیر سوچے سمجھے چل سکتی ہیں اور یوں کئی صدیوں کے لیے، یا ایک لمبے عرصے کے لیے وہی راہیں متعین ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور چیونٹی اٹھتی ہے اور وہ بھی ایک اور راہ تلاش کر لیتی ہے اور اس طرح تدریج ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

طفیل صاحب نے اس سلسلے میں نئے تجربات کئے ہیں۔ نئے عمل کی راہیں تلاش کی ہیں اور ایسے کام کی ابتدا کی ہے جس سے واقعی ادبی میدان میں بہت فائدہ پہنچا ہے اگرچہ طفیل صاحب سے میری ملاقات آج زندگی میں پہلی مرتبہ ہوئی ہے مگر ان کے نقوش سے میری ملاقات بڑی پرانی ہے۔ اور پھر اُن کی ذات کے متعلق مجھے آج یہاں آنے سے بہت پہلے ایک ایسے دوست سے، جن کی رائے کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں، بہت سی معلومات ہوئی تھیں۔ جن پر میں نے انھیں پورا پایا۔ میں ان کے اُن فرد دوست سے متفق نہیں ہوں جس نے یہ فرمایا تھا کہ اُن کی شخصیت میں کوئی کمی ہے۔ خداوندِ تعالیٰ نے اُن پر خاص عنایت فرمائی ہے۔ جس طرح انہوں نے اپنے طلوع میں ارشاد فرمایا ہے کہ خداوندِ تعالیٰ سے بھی ان کا مضمون لکھوانے کا خیال تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ خداوندِ تعالیٰ نے انھیں اس معاملے میں بھی کامیابی عطا فرمائی ہے اور ابھی ابھی انہوں نے دعا مانگی تھی کہ خداوندِ تعالیٰ اگر انھیں شخصیت کے بارے میں بھی تھوڑا سا حصہ دے دیتا تو وہ کتنی اچھی بات ہوتی۔ میں طفیل صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ

خداوندِ تعالیٰ نے ان سے شخصیت کے بارے میں بھی بخل نہیں برتا۔ یہاں آ کر آپ کو دیکھ کر، آپ کے خلوص کو دیکھ کر یقینی طور پر میں بھی متاثر ہوا ہوں اور دوسرے دوستوں کی زبانی جو کچھ سنا ہے۔ اس سے بھی بڑی خوشی ہوئی ہے۔

آپ نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو ہزاروں لوگ ہیں، کمی اگر ہے تو کام کرنے والوں کی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں ایک ایسی غلط بات رواج پا رہی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے ایک شخص پر، ایک کام کرنے والے شخص پر اعتراض کر لیا ہے۔ اس لیے ہم اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے ہیں۔ شاید اعتراض کرنا بجائے خود وہ کوئی کام سمجھتے ہیں حالانکہ اعتراض کرنا بجائے خود نہ صرف کام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور اعتراض کرنے والے کو بھی بے عمل بناتی ہے۔ اعتراضات ہمیشہ کام کرنے والے لوگوں پر ہوئے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ بات یاد آتی ہے کہ ایک وقت میں سرسید احمد خاں پر کتنے اعتراضات ہوئے تھے۔ کتنی باتیں اس کے خلاف ہوئی تھیں لیکن آج وہ باتیں کسی کو یاد نہیں۔ سرسید بھی یاد ہے۔ سرسید کا کام بھی یاد ہے اور اعتراض کرنے والوں میں سے کوئی یاد نہیں اور اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات بھی کسی کو یاد نہیں۔ چند دن اور گذر جانے کے بعد صرف سرسید اور صرف سرسید کا کام یاد رہ جائے گا اور اعتراض کرنے والوں کے متعلق دنیا بھول جائے گی۔ صرف آپ جیسے مفکرین کبھی پرانی کتابیں پڑھیں گے تو ان کی بات کر لیا کریں گے۔ ورنہ دنیا میں کام یاد رہتا ہے، اعتراض یاد نہیں رہتا۔ آپ نے کام کیا ہے اگر آپ زیادہ باتیں کرنا نہیں جانتے تو میں آپ کا اور بھی زیادہ قائل ہو گیا ہوں کیونکہ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ اکثر عمل کے میدان میں کمزور پائے گئے ہیں اور آج دنیا کو ضرورت، ہمارے ملک کو ضرورت اس بات کی ہے کہ کام کرنے والے لوگ میسر آئیں۔

میں تھوڑا سا وقت آپ کا اس سلسلے میں اور لوں گا کہ مفکرین کے بارے میں، اہلِ قلم کے بارے میں میں کیا خیالات رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں مفکرین اور اہلِ قلم وہ لوگ ہیں، چاہے وہ کسی زبان میں لکھتے ہوں، کسی ملک میں رہتے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فکر کی بلندی کی وجہ سے ساری انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسا کہ عادل رشید صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ کسی ملک کے حالات کا اور اس کی عظمت کا جائزہ اس ملک کے ادب سے لیتے ہیں۔ یقیناً مفکرین کی سوچ کی جو عظمت ہے وہ انسانیت کی بلندی کے لیے بھی نہ صرف اہم ہے بلکہ ایک پیمانہ بھی ہے۔ یہ ایک ایسا منصب ہے جس کے لیے آپ کی ذمہ داریاں باقی انسانوں سے بڑھ جاتی ہیں کیونکہ جتنا بڑا کام کسی شخص کے سپرد ہوتا ہے، اتنی ہی بڑی ذمہ داری اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ آپ جو چاہیں گے۔ جس طرح سوچیں گے اُس کے مطابق ملک کو قوم کو اور پوری انسانیت کو ویسی سوچ دیں گے اس لیے جس طرح علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ اگر ہمیں کوئی نئی راہ اختیار کرنی ہو، کسی کام کی ابتدا کرنی ہو، کوئی خاص رنگ کسی خاص سوسائٹی میں لانا ہو، تو اس کے لیے آپ کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ فرمایا ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اور افکارِ تازہ آپ مفکر لوگ پیدا کر سکتے ہیں اور اس لیے آپ پر بے پناہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

میرے دوستوں نے حکومت اور ادیبوں کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمایا۔ آپ میرے ساتھ اس بات میں متفق ہوں گے کہ ہمارے محبوب صدر نے جب سے حکومت سنبھالی ہے انہوں نے ادیبوں کو کہیں نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہمارے معاشرے میں اس وقت جو مقام ادیب کو حاصل ہے وہ اس سے پہلے (آزادی کے بعد) کبھی حاصل نہیں رہا۔ آج کا صدر ایوب کا پیغام بھی اس بات کا شاہد ہے اور پھر ان سب باتوں سے بڑھ کر میرے دوست جنہیں اب میں دوست کہنے کا حق حاصل کر رہا ہوں اگرچہ آج پہلی ملاقات ہے اُن کے ارشادات بھی آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ میری مراد طفیل صاحب سے ہے جنہوں نے یہ فرمایا ہے کہ:

> "اب میں اپنے ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کی آبرو رکھی اور یوں عملی تعاون فرما کر اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھائی۔ یہ فخر بھی شاید کسی رسالے کو حاصل نہیں ہوا کہ خود انہوں نے کسی رسالے کو اپنا مضمون مرحمت فرمایا ہو۔ اہلِ قلم کے ساتھ جو ان کا واسطہ ہے، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔"

ہماری اپنی حکومت اور ہمارے اپنے صدر ایوب کا یہ احساس ہے کہ اہلِ قلم کی اور اہلِ فکر کی سوسائٹی میں اور ملک میں کیا اہمیت ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر وہ ہمیشہ مفکرین، اہلِ قلم اور ادیبوں کو اہمیت دیتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہوگا ان شاء اللہ حکومت ہر میدان میں آپ حضرات کے ساتھ تعاون کرتی رہے گی۔

اب مجھے آپ کے رسالوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے کہ ایسے ادبی رسالوں کی جو ہماری سوسائٹی میں ہمارے ادب میں اہمیت رکھتے ہیں، اُن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف حکومت کا، بلکہ معاشرے کے ہر پڑھے لکھے فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے رسالوں کو جو معیاری رسالے ہیں ہر دلعزیز بھی بنائیں اور جہاں کہیں ممکن ہو وہ انہیں لائبریریوں میں، اور جہاں کہیں اُن کی دسترس ہو وہ اُن کو خرید کر وہاں پہنچائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُن سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے ہاں اُردو میں اچھے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے عمدہ اور معیاری رسائل ہمارے ادب اور معاشرے کی نہایت بیش قیمت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے اس قسم کے رسائل کو باقاعدگی سے منگوا کر طلبہ میں ان کے مطالعہ کا شوق پیدا کریں تو اس سے نہ صرف طلبہ اور طالبات کو ایسا لٹریچر میسر ہوگا جو ان کی شخصیت اور سیرت کی تشکیل میں ممد ہوگا بلکہ اس سے رسائل اور جرائد کو بھی اپنے معیار بلند کرنے کا موقع ملے گا۔ ہماری یہ پوری کوشش ہوگی کہ ایسے رسائل تعلیمی اداروں میں لگائے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے مناسب لائحہ عمل پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

خواتین و حضرات!

میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ وقت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ آپ حضرات کو اور کچھ عرصہ کے لیے یہاں بٹھائے رکھنا زیادتی ہے جب کہ آپ چائے کا بھی انتظار فرما رہے ہوں گے پھر اس کے بعد اس شاعرانہ محفل کا بھی بے تابی سے انتظار فرما رہے ہوں گے جو چائے کے بعد منعقد ہونے والی ہے۔

میں آخر میں طفیل صاحب کا اور باقی منتظمینِ انجمن کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خاص طور سے منظور الٰہی صاحب کا، کہ انہوں نے مجھے طفیل صاحب سے بھی متعارف کرایا اور پھر اتنے دانشوروں سے بھی بیک وقت ملنے کا موقع ملا۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اس کے باوجود آپ نے میری باتوں کو نہایت محبت اور خلوص سے (جو آپ کے چہروں سے پڑھ رہا ہوں) سنا۔ اب میں آپ حضرات سے اجازت چاہتا ہوں۔ شکریہ!

محمد یاسین وٹو

لیجیے وہ تقریریں بھی ختم ہو گئیں جن کے سننے کے لیے پارک لگژری ہوٹل میں سیکڑوں دوست جمع تھے — اور یوں انجمن ادبی رسائل کی مساعی بھی سامنے آ گئی — واہ واہی ہو گئی۔

ذاتی طور پر مجھے سامعین کا (اور اب قارئین کا بھی) اور اراکینِ انجمن کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ کارروائی کو سنا (اور اب پڑھا) اس لیے کہ یہ حکایت کسی کے لیے بھی "لذیذ" نہ تھی۔ آپ کہیں گے، یہ حکایت میرے لیے تو لذیذ ہو گی۔ یقین جانیے یہ حکایت میرے لیے بھی لذیذ نہ تھی۔ کیوں؟ وہ یوں کہ میں نے اس نمبر پہ پورا ایک برس صرف کیا (یا ضائع کیا) دن رات پاگلوں کی طرح کام کیا۔ احباب کو بھی تنگ کیا۔ ہزار ہا روپیہ لگایا۔ بیوی کے زیور تک بیچے۔ اور انعام کے طور پر اکیس ہزار نو سو اٹھائیس روپے انتیس پیسے کا نقصان اٹھایا۔

ابھی تک مجھ سے بینک والے پوچھتے ہیں۔ آپ تو کہتے تھے کہ آپ بیتی نمبر چھپ گیا تو سارا روپیہ لوٹا دوں گا — کیا ابھی تک آپ بیتی نمبر نہیں چھپا؟ انھیں کیا جواب دوں! یہی دن رات سوچتا رہتا ہوں — مگر اس سے آپ کو کیا!

پرچہ چھپا تو خوب بکا۔ بیس روپے بھی قاری کے لیے امتحان کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر اس کی قیمت لاگت سے کم تھی۔ کوئی کیا کرتا۔

میں نے نقوش کے سلسلے میں کبھی بھی نقصان کی پروا نہیں کی۔ اگر نفع نقصان کی بنیادوں پہ سوچتا تو پرچہ کبھی کا بند ہو چکا ہوتا۔ یہ تو میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا، جب مجھے مکاتیب نمبر میں ساڑھے آٹھ ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا اور یہ میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا جب مجھے لاہور نمبر میں سات ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا اور یہ میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا جب مجھے شخصیات نمبر حصہ دوم میں تین ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ جتنی اہم دستاویز پیش کیجیے اتنا ہی زیادہ "منافع" لیجیے۔

میری نفع نقصان کی میزان اور ہے۔ وہ یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے، اگر اس کی ادب میں کوئی وقعت ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ فائدہ ہو گیا۔ اگر کسی ادبی مہم میں میری کوششیں بار آور نہیں ہوتیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ نقصان ہو گیا۔

نفع نقصان کے بارے میں، میرا یوں سوچنا مجھے بڑا بھلا لگتا ہے۔

میں یہ باتیں مدیرِ نقوش کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ محمد طفیل کی حیثیت سے نہیں — اس لیے کہ محمد طفیل کے اور بھی سو ذاتی مسائل ہیں مگر مدیرِ نقوش کا صرف ایک مسئلہ ہے۔ وہ یہ کہ — گرہ سے لگائیے۔ ادھار لیجیے۔ چوری کیجیے۔ مگر پرچہ ٹھاٹ دار چھاپیے۔

کبھی کبھی یہ دونوں شخص "آپس میں الجھ بھی پڑتے ہیں۔ سوچیں گتھم گتھا، اندیشے دست و گریباں، سود و زیاں ہم عناں! ———

—غرض کبھی مدیر نقوش مستقبل کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور کبھی محمد طفیل کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

نتیجہ؟ نتیجۃً محمد طفیل ہار جاتا ہے اور جان بوجھ کر ہارتا ہے ۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

تصویریں

" الہ دین کا چراغ کہاں ہے ؟"

یہ سوال مجھ سے ایک نہایت ہی دُبلے پتلے اور لمبے ہی لمبے آدمی نے کیا۔ جو دُبلا پتلا اور لمبا ہی لمبا ہونے کے ساتھ ساتھ، بوڑھی ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا

پہلے تو میں سہم کر رہ گیا۔ یا اللہ!۔ یہ کون!۔ کوئی ذی روح!

پھر ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جواب دیا۔ جی! وہ تو ایک جادوگر لے گیا۔

افسوس!۔ ہم تو الہ دین کا چراغ دیکھنے کے لئے حیدرآباد دکن سے چلے آ رہے ہیں۔ میرا نام نصیرالدین ہاشمی ہے۔

" اخاہ!"

" جی!"

" میں آپ کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو، میرے سامنے جو بھی کھڑا ہے۔ وہ جادوگر ہے۔"

" آپ میرا جثہ دیکھ کر ڈریں۔ میں آپ کے کارنامے دیکھ دیکھ کر ڈرا کرتا ہوں اور سوچا کرتا ہوں کہ آپ کے پاس الہ دین کا چراغ ہے جس کی مدد سے آپ جو چاہتے ہیں، کر لیتے ہیں۔"

ہاشمی صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میری پیدائش سے پہلے کے ادیب، اس لیے میں نے ان کی باتوں کو خُردوں کے ساتھ، بزرگوں کا سلوک جانا۔ ان سے میری خط و کتابت تھی۔ پندرہ برس کی اس آدھی ملاقات میں، میں نے انھیں ہمیشہ مخلص پایا۔ جو بات بھی ان سے کہی۔ اس میں جوانوں سے بھی زیادہ مستعد نکلے۔ ان کے نزدیک کسی بھی بات پر دھیان نہ دینا، جرم کا درجہ رکھتا ہے خواہ اس دھیان میں، ان کے ساتھ کچھ بھی گزر جائے۔

ادب کے سلسلے میں ان کی ہمہ جوئی اتنی کہ زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہ رہا۔ جو کچھ کر سکتے تھے۔ وہ کیا اور سچی بات یہ ہے کہ اتنا کچھ کیا کہ ادب ان کا ممنون ہے۔ خاص طور سے اپنی جنم بھومی (دکن) کے سلسلے میں بہت کچھ کیا۔ وہاں کے سارے ادیب ایک طرف اور یہ اکیلے ذرا سی جان کے ساتھ ایک طرف، پھر بھی سب پہ بھاری!

اب انھیں سامنے پایا تو بات بات پر واری نثاری ہوتے دیکھا۔ ملائم سے لہجے میں، مسکرا مسکرا کر مجھ جیسے آدم بیزار اور "زبان بند" مخلوق کو خوب خوب شرمندہ کیا۔ غرض باتوں میں پیار کی چاشنی کے ساتھ، تکلم کی شیرینی اتنی کہ من موہے۔ شفقت ایسی کہ ان کا کلمہ پڑھنے

کو بھی چاہیے۔

ایک منٹ میں بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ مگر رکھ رکھاؤ بھی اتنا کہ اپنی بزرگی نبھا لے جائیں۔ مزاج نوجوانوں کا سا بے خطر، مگر احساس بزرگوں کا سا مصلحت شناس، ویسے سادہ لوح اتنے کہ جدھر چاہیں موڑ لیے جائیں۔ مزاجاً بھی ساتھ، احساساً بھی ساتھ، رند بھی پکے، پارسا بھی پکے، ان میں سے کسی ایک رُخ کو نبھانا بہت آسان ہے۔ دونوں سے یاری "خدائی پیغمبری" نہ سہی، "انسانی پیغمبری" تو ہے۔

ہاشمی صاحب کی صاحبزادی نے اطلاع دی کہ والدِ بزرگوار ۲۶ ستمبر (دن کے ساڑھے گیارہ بجے) کو اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

معبودِ حقیقی اپنے پاس سب کو بلاتے ہیں کیا کیا جائے۔ سارے آئے بائے، ساری سائنس، ساری دعائیں، ساری عیادتیں ابھی تک قدرت کی اس ادا کے سامنے عاجز ہیں۔ دم بخود ہیں ـــ مگر تاریخ ساز آدمیوں اور اچھے ادیبوں کے سلسلے میں، میرا ایمان ہے کہ وہ کبھی نہیں مریں گے۔ اس لحاظ سے ہاشمی صاحب ابھی زندہ ہیں۔

مجھے دکھ ہے تو اس بات کا کہ وہ "جادوگر" کسی اور دیس چلا گیا ہے۔ جس کا تابع میں بھی تھا۔

محمد طفیل

۱۰۲

مئی ۱۹۶۵ء

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا دیا جلا دیا جائے۔ اس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ فلاں ادارہ نے کچھ نہیں کیا ـــ فلاں ادیب نے کچھ نہیں کیا، فلاں رسالے نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہنے لگا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا "زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے جلد سب کچھ کر ڈالیں۔"

"مثلاً؟"

"گناہوں کا ارمان ہو تو اسے بھی جلد پورا کر لیجئے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو انہیں بھی جلد سے جلد پورا کر لیں۔"

گھبرا کر میں نے اپنے سارے ارمانوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔

چند ارمان ایسے نکلے جن میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان ایسے تھے۔ جن میں دل کی آسودگی کو مچلتے دیکھا۔ چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

اپنے ارمانوں کو جب دل و دماغ کے ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظر آیا کبھی کوئی۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک بے خبر تھا۔ یادوں نے ایک ساتھ پکارا تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس "مینا بازار" میں ایک خواہش کو رد کر کے دوسری کو فوقیت دینا مشکل ہو گیا۔

میں نے سوچا، زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ دونوں

جہان کی ساتھی!

میری سوچیں، ابھی مجھے تھپکی ہی دے رہی تھیں کہ حدِ نظر تک ایک ایک کر کے دیے جل اُٹھے۔

اور میرا سینہ تن گیا!

اور ادھر۔ موت کو ایک ناآسودہ سی آرزو نے شکست دے دی!

محمد طفیل

۱۰۳

ستمبر ۱۹۶۵ء

آج تک میں اپنے "قصیدے" ہی لکھتا رہا اور شاید خود ہی پڑھتا رہا۔ مگر اس وقت میں اپنا قصیدہ نہیں لکھ رہا۔ بلکہ اپنے خلاف آپ کو کچھ سنوانا چاہتا ہوں ــ اب تو خوش ہو جائیے؟

دل تو بہت چاہتا ہے کہ خوب صورت الفاظ کی آڑ لے کر اپنی کوتاہیوں کو بھی اس انداز سے پیش کروں کہ محمد حسین آزاد کی روح خوش ہو جائے۔ مگر سطحِ آب پر نقش و نگار کا فائدہ!

الفاظ خیالات کا پردہ ہوتے ہیں۔ اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم زیادہ باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ اصلی خیالات ظاہر نہ ہوں۔

میں آپ سے کم سے کم باتیں کروں گا تاکہ آپ میرے اصلی خیالات کو جان سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں آج صرف ایک ہی مسئلہ پر بات کروں گا۔

سچ کہتا ہوں کہ میں خدا سے اتنا نہیں ڈرتا۔ جتنا کہ ادیبوں سے ڈرتا ہوں۔ اس کے باوجود میرے دوستوں کو مجھ سے شکایتیں ہیں:

ــ ایک عام شکایت یہ ہے کہ میں ادیبوں اور شاعروں کو ان کے ادبی مرتبوں کے مطابق ترتیب میں جگہ نہیں دیتا۔ یہ شکایت ایسی ہے کہ جسے میں تو میں، کوئی بھی اللہ کا بندہ دُور نہیں کر سکتا، اس لیے کہ تقریباً سارے ہی لکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ بس ایک میں ہی ادیب ہوں، باقی تو سب گھاس کھودتے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی مدیر کر بھی کیا سکتا ہے ــ سبھی کو خوش رکھنے کی نیت رکھتے ہوئے بھی کیا کر سکتا ہے؟

پھر یہ بھی ہے کہ میں مدیر کم، جواری زیادہ ہوں۔ اس لیے کہ میں آخری حد تک داؤں لگانے سے گریز نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر اگر پرچہ ترتیب پا کر چھپ چکا ہو اور آخری مرحلے پر جا کر کوئی اچھا مضمون، افسانہ یا نظم مل جائے تو میں اسے شریکِ اشاعت کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ خواہ مجھے اسے آخر ہی میں کیوں نہ ٹانکنا پڑے۔ میرے نزدیک مقدم و مؤخر کا "چکر" نہ تو کسی تخلیق کا مرتبہ گھٹا سکتا ہے اور نہ ہی بڑھا سکتا ہے۔

اوہو! آپ تو میری یاوہ گوئی میں اُلجھ کے رہ گئے اور وہ نظم تو آپ نے سُنی ہی نہیں۔ جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں:

ضمیر و ذہن پہ حلقوں کی شہرت سہی   قدم قدم پہ سہی شاعری کی ایک دکاں
ہزار بات کا میزان معتبر ہو مگر   تُلے تو کیسے تلے جنسِ نیّرِ تاباں

تری نگاہ کا ہو یا مرے نفس کا قصور
جلا کے دیکھ نہ تو مقبرے میں مشعلِ طور

میں نے اپنی زندگی کے اردگرد احتیاطوں کے کئی حصار باندھے۔ ان میں کچھ حصاروں نے میری مشکلوں کو آسان بنایا اور کئی حصار ایسے باندھے جنھوں نے میری مشکلوں میں اضافہ کیا۔ مگر ایسا حصار کوئی نہیں باندھا جو بدنیتی کی بنیادوں پہ استوار ہو۔

محمد طفیل

۱۰۴

جنوری ۱۹۶۶ء

جو کوئی ہندوستان کے لیڈروں کو بُرا بھلا کہتا ہے تو مجھے اس پر بڑا غصہ آتا ہے۔ غصہ آنے والی بات نہیں تو اور کیا ہے بھلا کوئی اپنے محسنوں کو بھی بُرا بھلا کہتا ہے۔

اگر ہندوستانی لیڈر اس رُوپ میں ہمارے سامنے نہ آتے اور وہ یوں ہم پہ یلغار نہ کرتے، اِس طرح ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے نہ بناتے تو ہم سدا مٹی کے مادھو بنے رہتے۔ انہوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ نہ صرف جگایا بلکہ متحد کر دیا اور ہم میں خود شناسی اور سرفروشی کا وہ جذبہ بیدار کر دیا جو عام حالات میں ناممکن تھا۔ واقعی ناممکن تھا۔ یہ کام وہ تھا جو اللہ اپنے پیغمبروں سے لیا کرتا تھا۔ چونکہ خدا کی ذات ہر انہونی بات پہ بھی قدرت رکھتی ہے۔ اس لیے اب کے اُس نے یہ کام ہمارے دشمنوں سے لیا ہے۔ یہ وہ کرشمہ تھا کہ مجھ ایسے کئی کافر بھی کلمہ پڑھے بغیر مسلمان ہو گئے۔

میں تو یہی کہوں گا۔ اے ہندوستان ہم تیرے ممنون ہیں!

اگر ہم مسلمان ہو گئے ہیں تو عاقبت سنور جائے گی۔ خود شناس ہو گئے ہیں تو دنیا سنور جائے گی مگر ایک مسئلہ اور بھی ہے اور وہ مسئلہ ہے ادب کا! کئی ادیب اور شاعر ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ ہم سے کٹ گئے ہیں۔ کیا ان کے بغیر ہمارے ادب میں تازگی اور بانکپن باقی رہے گا؟ اس کا جواب پاکستان کے ادیبوں کو دینا ہو گا۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ خونِ جگر سے کشید کیے ہوئے ہمارے الفاظ، اب اپنا رنگ جما کے رہیں گے اور ہماری تحریروں میں چھاپ بھی اپنی ہو گی۔

ہم پہلے یہی سمجھا کرتے تھے کہ ادیب آفاقی قدروں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ علاقائی حدود میں رہ کر نہیں سوچتا۔ وہ کائنات کے ہر فرد کے لیے لکھتا ہے۔ مگر اب کے اس جنگ میں ایسے طمانچے پڑے کہ ہوش ٹھکانے ہو گئے۔ ہمیں اپنے وجود کی بقا کے لیے قلم اٹھانا پڑا اور وقتی طور پر ساری آفاقی قدریں ہمارے دماغوں سے تن سے نکل گئیں۔ ہم بھی کیا کرتے۔ ہمارا پڑوسی ملک (جس کے عوام ہمارے بھائی بند ہیں) دشمن بن کر ہمارے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کی توپوں کے گولے ہمارے آس پاس آ کر پھٹ رہے تھے۔ اس کے ہوائی جہاز ہماری بستیوں پر بم گرا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں ختم کرنے پر تُلا بیٹھا ہو۔ ایسے نازک موقع پر پاکستان کے فنکاروں کو سوچنا پڑا کہ وہ ادب کی آفاقی قدروں

کو اپنا کر غلام بن جائیں یا آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے قلموں کو ہتھیار کی صورت میں استعمال کریں۔

ایک فیصلہ ادب کی بقا کا تھا — ایک فیصلہ ملک کی بقا کا تھا۔ یوں ہم تاریخ کے دوراہے پر کھڑے تھے مگر شرمسار نہ تھے۔ کیونکہ ہمارے فیصلے پر وقت کی مہر ثبت تھی جسے کوئی بھی محب وطن پڑھ سکتا تھا۔

محمد طفیل

---

۱۰۵ (سالنامہ) (پہلا حصہ) مقالے

اپریل، مئی، جون ۱۹۶۶ء

میرے گرد انبار ہے اُن رسائل کا، جو صدیوں پہلے نکلے تھے۔ مگر ہیں وہ آج تک زندہ، زیادہ نہیں تو یہ قصہ دو صدیوں کا تو ہے ہی۔

جب بھی کوئی سرپھرا کسی ادبی کام کا ڈول ڈالتا ہے تو اُسے ماضی کے ادبی کارناموں اور اس کے خالقوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے نہ صرف دیکھنا ہی پڑتا ہے بلکہ انھیں اور ان کے کارناموں کو ٹٹولنا بھی پڑتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے رسائل بکھرے پڑے ہیں۔ آپ بھی ذرا ہمت کریں اور ان میں سے چند ایک کو اٹھا کے تو دیکھیں — پہلے انیسویں صدی کے رسائل پر نظر ڈالتے ہیں:

محب ہند، انجمن پنجاب، دہلی سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، فتنہ، پنجاب ریویو، دلگداز، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، دبدبۂ آصفی، معارف (علی گڑھ)، تہذیب النسواں، (اور اب بیسویں صدی کے) مخزن، عصرِ جدید، زمانہ، دکن ریویو، اُردوئے معلیٰ، الندوہ، فصیح الملک، تمدن، الناظر، ادیب، الہلال، العصر، معارف، اُردو، جامعہ، اورینٹل کالج میگزین، مجلہ عثمانیہ، شاہکار، عالمگیر، شیرازہ۔

ان کے خالقوں سے تو آپ کا تعارف ہوگا ہی:

ماسٹر رامچندر، محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، سرسید احمد خاں، ریاض خیرآبادی، رجب علی، عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین سلیم، سید ممتاز علی — سر عبدالقادر، خواجہ غلام الثقلین، دیا نرائن نگم، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی، حبیب الرحمٰن شروانی، احسن مارہروی، راشد الخیری، ظفر الملک علوی، نوبت رائے نظر، ابوالکلام آزاد، [illegible] شاکر، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر محمد شفیع، محی الدین زور، تاجور نجیب آبادی، حافظ محمد عالم، چراغ حسن حسرت۔

اللہ اللہ کیا کیا ادیب تھے اور کیا کیا مدیر، ادیب ایسے کہ ان کے ایک ایک لفظ پر مرحبا کہنے کو جی چاہے اور مدیر ایسے کہ اگر ان کے کارناموں کو ذہن میں رکھ لیں تو صلِ علیٰ کہنے پر مجبور ہوں۔

ان میں سے بہتوں کو میں نے نہیں دیکھا۔ ان کے عہد میں پیدا نہیں ہوا۔ مگر ان کے حسب نسب، ان کے افعال و کردار اور ان کے

علم و فضل سے واقف ہوں۔ اس لیے کہ تحریریں شجروں کے ساتھ، آنکھیں بھی دیتی ہیں اور دماغ بھی۔ اور ہاں صدیوں کی زندگی بھی!

وقت بڑا بے مروت واقع ہوا ہے۔ وہ کسی بھی طرح کی غلط بخشیوں کو سینے سے نہیں لگا سکتا۔ یہ لوگ اور یہ رسالے اگر صدیوں کی مار کھا کے بھی زندہ ہیں تو ان میں "امرت" کا کوئی نہ کوئی قرینہ ہے جبھی تو یہ ادب کے میدانوں میں پہاڑ بن کے کھڑے ہیں۔

اور میں! — پہاڑوں کی اوٹ میں کھڑا ہوں۔

محمد طفیل

---

۱۰۵ (سالنامہ)

(دوسرا حصہ شاعری، افسانہ)

اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۶۶ء

آج اس ہستی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ جس نے تین نسلوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ — نیازؔ اور "نگار" کو بھلانا آسان نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان کے ادب پر بڑے احسانات ہیں۔

صاف دلی کے ساتھ بے جھجک گفتگو نیاز صاحب کا خاصا تھا۔ انہوں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی کہ مآل کیا ہوگا۔ وہ کافر و زندیق ٹھہرائے گئے تو بھی اپنے مسلک سے نہ ہٹے۔ وہ ادب کی اونچی مسندوں پر بٹھائے گئے تو بھی ان میں سے بے نیازی کی خو بو نہ گئی۔

یہاں ہر شخص دکان لگائے بیٹھا ہے۔ جُبّہ و عمامہ کی دکانیں الگ ہیں، علوم و فنون کی دکانیں الگ، خریدار اِس کے بھی ہیں، خریدار اُس کے بھی ہیں مگر ضد کا عالم یہ ہے کہ اِن کے خدا کو وہ نہیں مانتے اور اُن کے خدا کو یہ نہیں مانتے۔ ایسے حالات میں نیاز صاحب کا وجود خطرہ ہی تو تھا۔ اس لیے کہ یہ دونوں ہی قسم کے دکانداروں کے پول جانتے تھے۔

ان کا سر اٹھانا ہی تھا کہ "دکان دار" چیخ اُٹھے۔ آہ و بکا کا شور ہر سُو سنائی دینے لگا۔ افواہ اُڑا دی گئی کہ یہ شخص مذہب میں مداخلت کرتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مذہب میں مداخلت کی ہو مگر دین میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ بس اس نازک سے فرق کا نام نیاز فتحپوری تھا۔

تعصب کی آگ جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کے دلوں میں پرورش نہیں پاتی بلکہ اُن لوگوں کے سینوں میں پرورش پاتی ہے جو اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے نیاز صاحب قطعاً تعلیم یافتہ نہ تھے۔ انہوں نے ہر مسئلے کو، وہ مذہب کا ہو یا ادب کا، اُسے ایک طالب علم ہی کی حیثیت سے جاننے کی کوشش کی۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ وہ دنیا کے علوم و فنون گھول کے پی چکے تھے۔

مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے آخری وقت تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا۔ یہ تھی لگن اپنے مسلک سے، البتہ وہ اس بات پر رنجیدہ تھے کہ اب ضعف کی وجہ سے زیادہ دیر تک قلم سے رفاقت نہیں نبھائی جا سکتی۔ — اور اس بات کا بھی انہیں افسوس تھا کہ اُن کی وجہ سے تیمارداروں کو پریشانی ہوتی ہے۔

نیاز صاحب ایسے لوگوں میں سے تھے جن کا ایمان قلم پر تھا۔ — اور واقعی ایسے لوگوں میں سے تھے جو یہ کہتے ہیں کہ موت سے کیا ڈرنا، زندگی سے خبردار رہنا چاہیے۔

محمد طفیل

۱۰۵ (سالنامہ) (تیسرا حصّہ) جنگ

اپریل ۔ مئی ۔ جون ۱۹۶۶ء

کشمیر کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہوگئے ہیں — یہ خون آشام ماحول دیکھ کر مستقبل کا مؤرخ بھی منہ ڈھانپے کھڑا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہے کہ دنیا کے ضمیر کو کیا ہوگیا ہے۔

کوئی اندھا بھی اتنا اندھا نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں کو دیکھ نہ سکے۔ پھر دنیا کی آنکھیں تو ہر آن کھلی ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھیں تو یہ کھلی زیادتی ہے۔

یہ دَور عجیب دَور ہے کہ جس نے بے ایمانی کا نام سیاست رکھ دیا۔ یہاں تو ایٹم بم بھی اس لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ دنیا میں امن قائم رکھا جا سکے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ کشمیر کے عوام آزادیٔ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں — اس کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ جیل جا رہے ہیں۔ گولیاں کھا رہے ہیں مگر سینہ سپر ہیں — ایک کے بعد دوسرا اپنا سینہ تان دیتا ہے تاکہ ظالم کو یہ شکایت نہ رہے کہ مظلوموں کی تعداد تھوڑی تھی۔

یہ سچ ہے کہ توپ کے گولے، ہوائی جہازوں کے بم، مشین گنوں کی گولیاں دنیا کی اخلاقی امداد اور ہمدردی سے نہیں رک سکتیں — لیکن سر کٹانے کا جذبہ اس کا بھوکا ہی کب ہوتا ہے۔

جب کسی قوم میں وطن کی حرمت پر سر کٹانے کا جذبہ راسخ ہو جاتا ہے تو اُسے دنیا کی کوئی طاقت محکوم بنا کے نہیں رکھ سکتی۔

جہاں وسائل، کوششیں اور خواہشیں ناکام رہتی ہیں۔ وہاں مستحکم ایمان سہارا دیتا ہے۔

آج ہمیں اپنے اسی جذبہ کو بروئے کار لانا ہوگا اور اِس یقین کے ساتھ عمل پیرا ہونا ہوگا کہ ایمان کی قوت ہی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔

محمد طفیل

---

۱۰۶ خاص نمبر

اکتوبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء

پچھلے شمارے میں مَیں نے "مرحوم رسالوں" کا ذکر کیا تھا۔ آج ایک "زندہ رسالے" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو عوام اور حکومت کی سرد مہری کی بنا پر مرحوم بننے کا فخر حاصل کرنے والا ہے۔ میری مراد نیرنگِ خیال سے ہے۔

وہ نیرنگِ خیال جو ادب کی دنیا میں ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوئی دو ہفتے ہوئے کہ حکیم یوسف حسن نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ بھجوایا (جو نیرنگِ خیال کی شاندار کارگزاریوں پر مشتمل تھا) اور ساتھ ہی خط میں لکھا تھا کہ اب میری بوڑھی ہڈیاں موجودہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ عوام ناقدر شناس ہیں اور حکومت بے مہر۔ لہٰذا میرا اور نیرنگِ خیال کا اس دور میں زندہ رہنا مشکل ہوگیا ہے۔

آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اب جب کہ زندگی کی قندیل بجھنے ہی والی ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ تراشا آپ کو بھجوا دوں ممکن ہے اس کی کبھی ضرورت پڑ جائے۔

وہ خط اس وقت میرے سامنے نہیں، الفاظ یہ نہ ہوں گے۔ مفہوم یہی تھا۔

حکیم صاحب بھی خوب جانتے ہیں کہ میں ایک مُردہ پرست قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ جو جیتے جی تو کسی کو زبانِ تشبیہ سے بھی محتاج دیکھ کر نہیں پسیجتی۔ مگر مرنے کے بعد اس پر القا ہوتا ہے کہ ـــ "ایک جوہرِ قابل مر گیا اور اس خلا کو کوئی پُر نہ کر سکے گا"۔

مولانا صلاح الدین احمد کا قصہ لیجئے۔ انھوں نے اپنا سب کچھ بیچ کر ادب کی آبیاری پر لگا دیا۔ جب تک زندہ رہے کسی نے منہ نہ لگایا۔ بلکہ ایک جھڑپ میں ان کے ساتھ بڑا نامناسب سلوک کیا گیا۔ مگر جب مولانا مر گئے تو حکومت کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک بڑی قد آور ہستی روٹھ کر چلی گئی ہے ـــ اور اس وقت اُن کی قبر پر انعام و اکرام کی بارش کر دی گئی۔

اے اللہ! ناقدر شناسوں کی اس دنیا میں تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ ـــ اور کیا سوچ کر اپنی زندگیاں ادب کے لیے وقف کریں؟

کیا اس امید پر کہ مرنے کے بعد کسی امیر وزیر کی طرف سے ایک بیان آ جائے گا کہ "مرحوم کی ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں"؟

کاش صاحبِ اختیار لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا باضمیر ہو جو یہ اقرار کر سکے کہ مرحوم کی صلاحیتوں کو ہم نے کچلا تھا ـــ اور ـــ ادب کے قتل میں ہمارا ہاتھ ہے۔

میرے بزرگ حکیم صاحب! یہ قوم اور اس ملک کے صاحبِ اختیار لوگ تو آپ کے لیے صرف اِتنا ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کے مرنے کا انتظار کریں اور پھر آپ کی قبر پر اپنی قدر شناسی کا بورڈ لٹکا دیں۔

محمد طفیل

۱۰۷

مئی ۱۹۶۷ء

ایوانِ حکومت سے ایک بار یہ صدا بلند ہوئی تھی کہ اگر اہلِ پاکستان رومن رسم الخط کو اپنا لیں تو زبان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس خبر سے یہ خاکسار بڑا خوش ہوا تھا۔ اس لیے کہ زبان کا مسئلہ حل ہو رہا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس تجویز کے خلاف کھُسر پھُسر ہوئی۔ کچھ لوگوں نے آواز بھی بلند کی۔ پھر "چپ چاپ" ہو گئی۔ نہ حکومت نے طے شدہ مسئلے پر اصرار کیا۔ نہ پبلک کو دھیان رہا کہ "حل شدہ" مسئلہ پھر ویسا ہی "الجھ شدہ" ہو گیا ہے

ذرا سوچا تو دھیان میں یہ آیا کہ کیا ہم بڈھوں کو بھی پھر سے پڑھنا ہو گا؟ اس لیے کہ ہم تو ولی اور میر کے زمانے کے ایک بوسیدہ سے رسم الخط سے واقف ہیں۔

پھر یہ دھڑکا کہ ہمارے کلاسیکل لٹریچر کا کیا بنے گا؟ جو سارے کا سارا اسی رسم الخط میں ہے۔ جس نے مملکت کے لیے مشکلیں پیدا کر رکھی ہیں۔

پھر یوں بھی سوچا کہ ہمارے اکابر بڑے ہی سادہ لوح تھے کہ جنہوں نے خواہ مخواہ ہی اُردو زبان کی نزاش خراش میں عمریں گنوا ڈالیں — بے چارے!

پھر قائدِ اعظم کی "سادہ لوحی" کا بھی خیال آیا۔ جنھوں نے رُو میں آ کر یہ کہہ دیا تھا کہ پاکستان کی اگر کوئی قومی زبان ہو سکتی ہے تو وہ اُردو ہے اور صرف اُردو، رومن رسم الخط پر نظر اُن کی بھی نہ پڑی

اب پھر اپنے نہایت ہی پیارے صدر نے فرمایا ہے کہ اگر اُردو زبان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ سائنسی مضامین کے تدریسی مطالب کو پورا کر سکے تو ہمیں جذباتی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے — مشورہ بالکل درست ہے۔ اس لیے میرا دوبارہ خوش ہو جانا لابدی تھا۔

یہ سب کچھ سننے کے بعد، میں اپنے اُس حیدر آبادی دوست کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ جس نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی اور کہا تھا کہ نظام نے ہزاروں لاکھوں روپے صرف کر کے سائنسی اور فنی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا تھا اور اُن تمام اصطلاحات کو بھی 'اُردوایا' تھا، جو ہمارے لیے بلا وجہ کا ایک مسئلہ بنا ہُوا تھا۔ اور پھر انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُن ٹیکنیکل مضمونوں کو اُردو میں پڑھایا تو نتائج بھی شاندار تھے۔

سنتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ ایک بار انگلستان والوں کو بھی پیش آیا تھا۔ کیونکہ ہماری طرح وہ بھی، اپنے نازک ترین خیالات کے اظہار کے لیے لاطینی زبان کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے اور انگریزی کو اپنانا اپنے لیے باعثِ شرم جانتے تھے۔ مگر آج —

آج ہم بھی اُسی دوراہے پر کھڑے ہیں۔

دوستو! ایک فقرہ ذہن میں گھوم رہا ہے۔ مگر اس کا یہاں کوئی تُک نہیں وہ یہ کہ — "انسان جب اپنے نفس کو اپنی مرضی کے خلاف کسی کام کے انجام دینے پر مجبور کر دیتا ہے تو وہ کام اکثر نیک کام ہوتا ہے۔"

آئیے کچھ نیکیاں ہی سمیٹ لیں!

محمد طفیل

۱۰۸

ستمبر ۱۹۶۷ء

میر ۱۷۲۹ء میں پیدا ہُوئے، غالب ۱۷۹۷ء میں، اقبال ۱۸۷۷ء میں، یہ تھے شاعر!

محمد حسین آزاد ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے، مولانا حالی ۱۸۳۷ء میں، عبدالرحمٰن بجنوری ۱۸۸۵ء میں یہ تھے نقاد!

میر امن ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے، رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء میں، پریم چند ۱۸۸۰ء میں، یہ تھے کہانی نویس!

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۶ء میں، پطرس ۱۸۹۸ء میں، یہ تھے مزاح نگار!

مگر ۱۹۶۷ء میں!

جو شخص ایک مصرع موزوں کر لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو میر سمجھتا ہے، غالب سمجھتا ہے، اقبال سمجھتا ہے۔
جو شخص نہ افسانہ لکھ سکتا ہے نہ شعر کہہ سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے، حالی سمجھتا ہے، بجنوری سمجھتا ہے۔
جو شخص اپنی نانی اماں سے کہانیاں سنا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میرامن سمجھتا ہے، سرشار سمجھتا ہے۔ پریم چند سمجھتا ہے۔
جو شخص اپنی بے وقوفی پر نہ رو سکتا ہے، نہ ہنس سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو منشی سجاد حسین سمجھتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ سمجھتا ہے، پطرس سمجھتا ہے۔

آدمی ایک غالب کے سامنے، ایک آزاد کے سامنے، ایک پریم چند کے سامنے، ایک پطرس کے سامنے تو اپنے سر کو جھکا سکتا ہے مگر اتنے غالبوں، اتنے آزادوں اور اتنے پریم چندوں اور اتنے پطرسوں کے سامنے کیسے سر کو جھکائے۔

ریاکاری، میرے نزدیک دنیا کا بدترین فعل ہے۔ مگر یہ گناہ بھی کیا جس نے کہا "میں اس دور کا غالب ہوں"۔ میں نے حیران ہو کر کہا "بے شک!" — جس نے کہا "میں آزاد ہوں"۔ میں نے سراسیمہ ہو کر کہا "بلاشبہ"۔ جس نے کہا "میں پریم چند ہوں"۔ میں نے خوف زدہ ہو کر کہا "یقیناً" — جس نے کہا "میں پطرس ہوں" — میں نے مسکرا کر کہا "واللہ!"

بے شک، بلاشبہ، یقیناً اور واللہ میں اپنی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا مجھ ایسے ادارتی گنہگار کو کبھی نہ بخشے گا۔

چلو ادب کی خاطر، یہ بھی سہی!

مگر اے غالبو! اے آزادو! اے پریم چندو! اے پطرسو! کچھ ادب کو بھی تو آگے بڑھاؤ!

محمد طفیل

بیسویں سالگرہ

(خطوط نمبر)

۱۰۹ جلد (۱)
اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

جنگ ہوئی۔ اپنی اپنی پڑ گئی۔

یہ دعا تو سب کی تھی کہ ملک دشمن سے محفوظ رہے۔ اس کے ساتھ، ہر ایک کی کچھ فکریں اور بھی تھیں، جو سانس روکے دے رہی تھیں۔ مثلاً والدین کی فکر، بچوں کی فکر، جائداد کی فکر!

فکریں تو میری بھی بہت تھیں۔ مگر ان میں نمایاں فکر، اس دستاویزی سرمایے کی تھی جو میری تحویل میں تھا۔

وہ سرمایہ کیا تھا؟ بوسیدہ اور کٹے پھٹے کاغذ کے پرزے۔

مگر ان پرزوں میں غالب کے خطوط تھے، اقبال کے خطوط تھے، سر سید کے خطوط تھے، ابوالکلام کے خطوط تھے، شبلی کے خطوط تھے، مہدی افادی کے خطوط تھے۔ نام کہاں تک گنواؤں!

جنگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

توپوں کی دھمک اور شعلوں کی لپک میں، جب میں نے سوچا تھا کہ یہ خطوط کہیں ضائع نہ ہو جائیں تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مگر انہی دنوں جب یہ بات دھیان میں آئی تھی کہ میرے بچوں کا کیا ہوگا تو میں بڑے حوصلے میں تھا۔

اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ وہ گھڑی نہ آنا تھی، نہ آئی۔ آئی بلا ٹلی۔ یہ تو ملک کے بقا کی بات تھی اور سن تھا ۱۹۶۵ء جہاں تک خطوط کا معاملہ ہے اُس کے متعلق آج ۱۹۶۸ء میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کیسا انسان ہوں کہ جسے بچوں سے زیادہ خطوط عزیز تھے۔ یہ سوچ کر کبھی غمگین ہو جاتا ہوں اور کبھی خوش!

محمد طفیل

---

۱۰۹ — اپریل مئی ۱۹۶۸ء ج (۲)

محمد طفیل نے، محمد نقوش سے کہا —

ارے میاں! تُو کیا کر رہا ہے؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے؟ کیوں اپنا اور اپنے بچوں کا دشمن بنا ہُوا ہے؟

جب تو نے خطوط کی دو جلدیں، پہلے چھاپی تھیں تو کون سے قوم نے سُرخاب کے پَر لگا دیے تھے، جو تُو اب پھر اکٹھی تین جلدیں پیش کر رہا ہے۔ یہ دس گیارہ برس جو تُو نے خطوط اکٹھے کرنے پہ صرف کیے ہیں۔ اس کی بجائے اگر تُو "امپورٹ ایکسپورٹ" کا ہی کام کر لیتا تو زیادہ فائدے میں رہتا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا تو قوم کا لیڈر ہی بن جاتا۔

قوم کے لفظ سے یاد آیا۔ یوں دِکھے ہے جیسے یہ قوم بظاہر زندہ ہو، بہ باطن مردہ، یہ زندہ باد کے نعرے لگا سکتی ہے،
مگر زندہ باد کا ماحول پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ہر ایک کی کارگزاری پر یہ فرمانے کی عادی ہے "کچھ نہیں!"

متاعِ ہُنر کی قیمت کیا پڑی؟ دو کوڑی بھی نہیں۔ خون کے چراغ جلا کے بھی دیکھ لئے، اندھیرا جوں کا توں! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دلوں کا اندھیرا بصارت کو بھی نگل گیا ہو۔

ایسے عالم میں کوئی کیا کرے؟

ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی افیون کی گولی کھا کر بیٹھ رہے۔ دوسرے یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ خدمت کے شوق میں اپنی جان اور مال کی بازی لگائے۔

محمد نقوش سے محمد طفیل نے کہا:۔

راہیں دونوں کٹھن ہیں۔ ایک باضمیر کے لیے، دوسری بے ضمیر کے لیے!

محمد طفیل

---

۱۰۹ — اپریل مئی ۱۹۶۸ء ج-(۳)

میرا بچپن، میری خوشیوں کا دشمن تھا۔ جوانی آئی تو وہ بھی یوں کہ اُس کی آہٹ تک نہ سن سکا۔ اب میں ہوں اور میرا بڑھاپا۔ دھمک کی آواز تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔

یہ پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میں ۱۹۴۸ء میں مر گیا تھا۔ وہ یوں کہ زندگی اور موت کے درمیان چند ساعتوں کا مرحلہ رہ گیا تھا ایسے میں، میں نے اپنے ربّ سے کہا: "اس دنیا میں جیسے آیا تھا، ویسا ہی چلا جا رہا ہوں۔ کسی کو بھی میری ذات سے، کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ مہلت دیجیے۔"

اللہ تعالیٰ نے کچھ سوچا اور مجھے نئی زندگی بخش دی

صحت یاب ہُوا تو میں نے سوچا۔ خدا سے بہت بڑا وعدہ کر چکا ہوں۔ مگر وسائل؟

جی تو امنگوں سے معمور تھا مگر حالات خندہ زن تھے۔ اس ماحول میں ذہن نے کئی پٹخنیاں کھائیں۔ غرض وسائل کی غریبی میں بھی ایک بات سوجھ گئی۔ وہ یہ اگر تو جھلسا دینے والی گرمیوں میں پیاسوں کو پانی ہی پلاتا رہے گا تو بھی اپنے خدا سے شرمسار نہ ہوگا۔

دل مطمئن ہوگیا۔

جب سے ادب کی کڑی دھوپ میں پیاسوں کو "پانی" پلا رہا ہوں۔

میری کارگزاری کو سبھی نے سراہا۔ اس ضمن میں بڑے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں ہر وقت اِس خوف سے لرزتا رہتا ہوں کہ اپنی مستعار زندگی کے بدلے، میں نے جو اپنے خدا سے عہد کیا تھا۔ وہ بھی پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟

محمد طفیل

افسانہ نمبر

۱۱۰

نومبر ۱۹۶۸ء

وہ نڈر تھا۔ بیباک تھا مگر میرا دوست تھا۔

دوست اس معنی میں نہیں کہ میں اُس کا ہم پیالہ ہم نوالہ تھا۔ بس یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے تھے اور ہم میں وہ خوبی نہ تھی۔ جو آج کل کے دوستوں میں ہے یعنی پیٹھ پیچھے بُرائی!

اتفاق کی بات کہ میرا اُس کا ساتھ زندگی کے آخری دنوں میں ہُوا۔ کوئی قدرِ مشترک نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ جیسے جیسے قریب ہوتے گئے۔ ویسے ویسے ایک دوسرے سے ڈرنے لگے۔

مَیں تو اُس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی سے ڈرتا تھا سو وہ مجھ سے کیوں ڈرتا تھا۔ یہ میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

مَیں تیری خاموشی سے ڈرتا ہوں۔ میں تیرے من کی بات نہ جان سکنے کی وجہ سے ڈرتا ہوں۔

بھلا یہ بھی کوئی ڈرنے والی بات ہے۔

میرے نزدیک دوستی میں سب سے خطرناک ہتھیار مقفّل زبان ہے۔

پھر ہم اتنے قریب کیوں ہیں؟

بس ہیں۔

باتوں ہی باتوں میں وہ مجھے کبھی امرتسر لے جاتا۔ کبھی دلی، کبھی بمبئی، اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ دل اُکتاتا نہ تھا۔ اس میں ایک دو کمزوریاں بھی تھیں مگر وہ دل کا اتنا اچھا تھا کہ مجھے اس کی کوتاہیوں سے غرض نہ تھی۔

یونہی دن گزرتے رہے۔

پھر وہ دن آ گیا۔ جب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگیا۔

وہ عجیب آدمی تھا۔

اُس نے انگریز کو "نیا قانون" پڑھوایا۔ اُس نے تقسیم ملک پر "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسی یادداشت چھوڑی۔ اُس نے فسادات کے المیے پر "کھول دو" ایسے انکشافات کیے۔ اُس نے دریاؤں کے پانی بند ہونے پر "یزید" کو یاد کیا۔

میرا دل کہتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ خاموش نہ رہتا، وہ کسی نہ کسی طرح اس نسل کے ادیب کو بے ضمیری کے طعنہ سے ضرور بچا لیتا۔

محمد طفیل

۱۱۱
فروری ۱۹۶۹ء

غالب نمبر (۱)

ایک واقعہ دہراتا ہوں :

"اودھ میں بادشاہ غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت تھے اور نائب السلطنت سید محمد خاں عرف آغا میر تھے۔ انہوں نے میرزا سے ملاقات کی رضامندی ظاہر کی مگر غالب نے شرط یہ لگائی کہ دربار میں پہنچنے پر آغا میر کھڑے ہو کر میرا استقبال کریں۔"

میں غالب کے اس طنطنہ پر خورسند ہوا۔

میں نے شیخ محمد اکرام کی یہ رائے پڑھی :

"میرزا کا صرف یہی کارنامہ نہیں کہ انہوں نے ہماری نظم و نثر کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا، بلکہ ان کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی ہماری قومی روایات کا بیش بہا زیور ہے۔"

تو میں بہت خوش ہوا۔

مگر جب مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی یہ رائے پڑھی :

غالب کا سوال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو عار نہ تھا۔ جب ذوق مرگیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا۔ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرگیا۔ رندِ مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا۔ صہبائی شعر کہنا کیا جانے، نہ اس نے شراب پی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں۔ نہ جیل خانہ میں پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا۔"

ظاہر ہوا غالب اَنا پرست تھا — شیخ صاحب غالب کی زندگی کو مثالی زندگی کہتے ہیں۔

مولوی صاحب کو غالب میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

قصہ صرف اتنا ہے کہ غالب اتنا بڑا آدمی نہ تھا۔ جتنا بڑا شاعر تھا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب سے اب

تمک بڑے آدمی بے شمار گزرے مگر اُن سب میں غالب ایک تھا — ایک رہا۔
محمد طفیل

۱۱۲
اگست ۱۹۶۹ء

عام شمارہ بہت دنوں کے بعد آ رہا ہے۔ ارادہ تو اب کے بھی خاص نمبر ہی چھاپنے کا تھا مگر "بچ گئے"۔ کیونکہ بسلسلۂ غالب جو چراغ میں جلانا چاہتا تھا۔ اس میں خون کی کچھ کمی نکلی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ادب میں تیل کے چراغ نہیں جلتے خون کے چراغ جلتے ہیں۔

ایک ایسے ہی چراغ کی لَو کو دیکھ کر، دلّی سے ایک بزرگ ادیب جناب ضیاء الدین احمد بدایونی نے لکھا :

زہے زندہ دلانِ ارضِ پنجاب　　جنھیں ہے عشق اُردو سے مقرر
خصوصاً وہ طفیلِ ذی لیاقت　　کہ احساں جس کا ہے شعر و ادب پر
کیا شائع وہ غالب نمبر اُس نے　　ہے جس کو دیکھ کر خود عقل ششدر
کبھی جادوئے بنگالہ تھا مشہور　　مگر لاہور ہے اب اُس سے بڑھ کر
مضامینِ شگفتہ باغِ جنّت　　عباراتِ درخشاں سلکِ گوہر
جمال شاہد، معنی عیاناً　　نہ ہو کیوں ہر ورق پر جلوہ گستر
کریں نظارہ اربابِ بصیرت　　ادب کی روح کھنچ آئی سمٹ کر
خیالِ سال تھا مجھ کو کہ دل نے
کہا "آئینۂ خوبی" مکرر
۲ × ۶۹۴
۱۳۸۸ھ

تحسین کی بارشیں مجھ پہ بہت ہُوئی ہیں اب ایسے کلمات مجھے بر خود غلط نہیں بناتے بلکہ کولہو میں جُتنے کا مزید عزم بخشتے ہیں۔

ہندوستان سے ہی ایک اور کرمفرما نے لکھا تھا :۔

"ہم نے بارہ لاکھ روپے سے غالب اکیڈمی بنا ڈالی۔ ساری دنیا سے غالب شناسوں کو بلا لیا۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے نمبر نکالے۔ مگر افسوس کہ نقوش جیسا رسالہ نہ نکال سکے۔"

کیا اس سے بڑا خراج پاکستان کو ادا کیا جا سکتا ہے؟

اس پر بھی دل کا اصرار یہ ہے کہ کہہ دو —

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

زیادہ کیا کہوں یہاں پہ مشہور سنگ تراش مائیکل اینجلو کا ایک فقرہ یاد آ گیا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ "پتھروں میں تصویریں پہلے

سے موجود ہوتی ہیں۔ میں تو صرف فاضل حصوں کو الگ کر دیتا ہوں۔"

ایک میر کی حیثیت سے، اگر آپ کو میری کاوشوں سے متعلق میری رائے مطلوب ہے تو عرض ہے کہ "میری حیثیت ریشم کے کیڑے جیسی ہے جو اپنے لعابِ دہن سے دوسروں کے لیے ریشم تیار کرتا رہتا ہے اور جب لعاب ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے ہی کویا میں مر جاتا ہے۔ یعنی اس کی تخلیق اس کا کفن بن جاتی ہے۔"

محمد طفیل

۱۱۳

اکتوبر ۱۹۶۹ء

غالب نمبر (حصّۂ دوم)

غالب شناسوں سے، غالب کی روح نے چلا چلا کے کہا۔ کم از کم آپ تو میرے اشعار غلط نہ پڑھیں، مگر علمیت کے زعم میں، کسی نے بات نہ سُنی۔ یوں فریاد فضاؤں میں ڈولتی رہی۔

غالب نے اپنی زندگی میں ایک شعر پر اتنا واویلا کیا تھا کہ اپنے تئیں کہا "اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت!"

اس کے بعد یہاں تک ظلم ہوا کہ یاروں نے غالب کے نام پر خود غزلیں کہہ ڈالیں۔ (جیسے عبدالباری آسی) غالب کی روح کیا کیا نہ تلملائی ہوگی۔

غالب نے اپنے شارحین سے بھی التجا کی کہ میرے جو اشعار کچھ کا کچھ لکھ کر مہمل بنا دیے گئے ہیں۔ انھیں بامعنی بنانے کے لیے اپنی اپنی لیاقت نہ چھانٹیں، مگر شنوائی نہ ہوئی۔

جب غالب کا تڑپنا قدرت سے دیکھا نہ گیا تو اس نے یہ انتظام کر دیا کہ غالب کی جو بیاض اِدھر اُدھر ہو گئی تھی اُسے سب پر ظاہر کر دیا۔ شعر آئینہ ہو گئے۔

اب اس آئینے میں اہلِ علم کے چہرے فق ہیں اور غالب ہے کہ اُس کی ہنسی ہی نہیں رک رہی۔
خطرہ شادی مرگ کا ہے "غالب کے لیے بھی!" اور اُن کے لئے بھی جو غالب شناس ہیں۔

محمد طفیل

۱۱۴

جولائی ۱۹۷۰ء

اب کے جی چاہتا ہے کہ یہ صفحہ کوئی اور لکھ ڈالے۔

وجہ؟

وجہ یہ ہے کہ جس قوم میں پیدا ہوا ہوں، وہ غریب سے زیادہ عجیب ہے — سب کچھ سمجھتی ہے مگر اپنا بُرا بھلا نہیں سمجھتی۔ اُدھر جوہری اپنی اپنی دکان چمکائے ڈکار رہے ہیں۔ انہوں نے تاڑ لیا ہے کہ یہ قوم پتھر اور ہیرے کے فرق کو نہیں جانتی۔ اس لیے اسے جس بھاؤ چاہو، خرید لو۔

باہر کی منڈیوں میں بھی اس کے منہ مانگے دام لگ رہے ہیں۔ تجوریاں کھلی ہیں۔ سودے ہو رہے ہیں۔
ادھر کوئی "کتاب" کے نام پر خریدا جا رہا ہے۔ کوئی روٹی کے عوض بک رہا ہے۔
ستم یہ کہ جس جوہری کو دیکھو (بزعم خود) صرف وہی ہے جو قوم کا غمخوار ہے۔ باقی سب گردن زدنی!
لوٹ لو۔ مار دو! یہ بھی جوہری فرماتے ہیں۔ یہ عمل بھی جوہریوں ہی کا ہے۔ کان رہے نہ رہے، اپنا اُلّو ضرور سیدھا ہو۔
اور
یہ سوچ "اپنوں" کی بھی ہے اور دشمنوں کی بھی — موقع ہے، موقع ہے۔

محمد طفیل

۱۱۵

دسمبر ۱۹۷۰ء

مصطفےٰ زیدی سے میری دوستی تھی یا شناسائی، مجھے کچھ معلوم نہیں۔

کہتے ہیں اُس نے خودکشی کر لی۔ ہو سکتا ہے یہی بات ہو مگر جہاں تک اُس کے مزاج کا تعلق ہے، اُس کے مطابق اُسے شان کے ساتھ مرنا چاہیے تھا۔

ابھی یاروں نے خودکشی کی لاش کو دفنایا نہ تھا کہ اُس میں سے ایک چیخ نکلی۔ یہ خودکشی نہیں — قتل ہُوا ہے قتل!

کوئی کہتا ہے وہ جذباتی تھا۔ کوئی کہتا ہے وہ حُسن پرست تھا۔ کوئی کہتا ہے وہ شعلۂ جوالہ تھا۔ کوئی کہتا ہے وہ بد دیانت تھا۔ میں سبھی کی باتیں سُن رہا ہوں۔ ہر ایک کا منہ تک رہا ہوں۔

میں اُن میں سے کسی بات کی تردید نہیں کروں گا۔ کیونکہ ابھی آنکنے کا وقت نہیں آیا۔ وہ شعلۂ جوالہ اس لیے تھا کہ غلط باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ وہ بد دیانت اس لیے تھا کہ تین سو تین میں آ گیا تھا۔ وہ جذباتی اس لیے تھا کہ درد مند دل رکھتا تھا۔ وہ حسن پرست اس لیے تھا کہ شہناز گل والا ڈراما کھیلا گیا۔

غرض وہ بُرا تھا۔ بہت ہی بُرا، آپ سے اور مجھ سے زیادہ بُرا، اُس میں کوئی بات بھی ٹھکانے کی نہ تھی اور تو اور وہ شاعر بھی کچھ اپنی ہی طرز کا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا — میری ایک نظم سُنو:۔

احتساب

ہر اک زباں پہ ہے ادّعائے بے گنہی
مجھے خبر نہیں مقتول ہوں کہ قاتل ہوں
ابھی یہ بات مجھے زیب ہی نہیں دیتی
ابھی تو میں بھی صفِ مجرماں میں شامل ہوں

جو فرق ہے تو بس اِتنا کہ دوسروں کے لیے
شبِ جزا و سزا ایک بار آئے گی،
مرے لہو سے بہت سی گواہیاں لینے
یہ رات ہم نفسو بار بار آئے گی،

یہ رات میری ہر اک نظم کو طلب کر کے
کئی ہزار دِنوں کا حساب مانگے گی،
مری زبان، مری تربیت، مری تہذیب
مَیں مر گیا بھی تو مجھ سے جواب مانگے گی،

مَیں اپنے ذہن کا اک اک وَرق اُلٹتا ہوں
ہر اک وَرق کی جبیں پر نشانِ عصمت ہے
کسی بیاض پہ بکھرا ہُوا ہے خواب کا رنگ
وہ خواب جن میں نئے عہد کی بشارت ہے
کہیں جمال کے مہتاب کی گھنی پلکیں!
کہیں خیال کے خورشید کی تمازت ہے

مری نگاہ میں ارضی عدالتیں کیا ہیں
یہ شاعری میری سب سے بڑی عدالت ہے

لاہور ۱۹

ترنگ میں تھا۔ کہنے لگا: "ایک اور نظم سنو۔" میں نے کہا: "ابھی مجھے سنبھل تو لینے دو۔" کہنے لگا: "اکٹھا ہی سنبھل لینا۔" — ہاں تو میری دوسری نظم کا عنوان ہے :-

اے صبح کے غمخوارو

اے صبح کے غمخوارو اِس رات سے مت ڈرنا
جس رات میں خنجر ہے اُس رات سے مت ڈرنا
خورشید کے متوالو ذرّات سے مت ڈرنا
چنگیز نژادوں کی اوقات سے مت ڈرنا

ہاں شامل لب ہو گی نفرت بھی ملامت بھی
یارانہ کدورت بھی دیرینہ عداوت بھی
گزرے ہوئے لمحوں کی مرحوم رفاقت بھی
قبروں پہ کھڑے ہو کر جذبات سے مت ڈرنا

آباد ضمیروں کو افتادِ ستم کیا ہے
آسودہ ہو جب دل پھر تکلیفِ شکم کیا ہے
تدبیرِ فلک کیا ہے، تقدیرِ اُمم کیا ہے
محرم ہو تو دو دن کے حالات سے مت ڈرنا

رُودادِ سپر دامن کب تک نہ عیاں ہو گی
ناکردہ گناہوں کے مُنھ میں تو زباں ہو گی
جس وقت جرائم کی فہرست بیاں ہو گی
اُس وقت عدالت کے اثبات سے مت ڈرنا
اے صبح کے غمخوارو!

لاہور ۲۰ ۱۲/۶۹

زیدی جب نظمیں سُنا چکا تو اُس نے مجھ سے دریافت کیا "بولو چھاپو گے؟" میرا مختصر جواب تھا "نہیں" اس پر اُس نے کہا تھا۔ "تو بزدل ہے۔ عصرِ حاضر کی سچوں کا قاتل ہے۔" بات سچی تھی۔ چُپ ہو گیا لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ وہ ایک بار پھر سامنے آ کے بیٹھے اور مجھے بُرا بھلا کہے۔ اگر وہ نہ آیا تو تھوڑا سا انتظار کر کے میں خود اس کے پاس چلا جاؤں گا — فاصلہ ہی کتنا ہے!

محمد طفیل

غالب نمبر ۳

۱۱۶
۱۹۷۱ء

دنیا نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ ابھی اس نے چند انگڑائیاں ہی لی ہوں گی کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔

دنیا نے آہستہ آہستہ ترقی کی۔ دھرتی اُجڑتی، سنورتی، مٹتی اور بنتی رہی۔ غرض صدیوں کے فاصلے طے کر کے ہم پتھر کے زمانے سے مشینی دور تک آئے۔ درندے تھے انسان بن گئے۔ شقی تھے حلیم بن گئے۔ جاہل تھے عالم بن گئے۔

ہوتے ہوتے ہم میں ایک بار پھر قومیت کا شعور جاگا ۔ ایسے میں ایک مردِ قوم آشنا نے کہا۔ ہم کسی دوسری قوم کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ ہمارا مذہب الگ ہے، کلچر الگ ہے، کتاب الگ ہے، ہادیؐ الگ ہے۔

ملک تقسیم ہوگیا۔ ہمارے حصہ میں دو کونے آئے۔ ایک اس سرے پہ، دوسرا اُس سرے پہ، فاصلے کے باوجود ہم مذہب کی ڈوری میں بندھے رہے۔ ایک ساتھ مرنا ایک ساتھ جینا ہمارا چلن ہی نہیں ایمان بھی تھا۔

سیاست نے مذہب کی ڈوری کو دو ٹکڑے کر دینا چاہا۔ اپنے جنونی ہوگئے۔ اغل بغل والے بگلا بھگت تھے۔ اُن کے وارے نیارے ہوگئے۔ غرض اس بکھیڑے میں ہم پھر حلیم سے شقی اور انسان سے درندے بن گئے۔

سربازار بے حرمتی کی گئی۔ نیزوں پہ اُچھالا گیا۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر ڈالا۔

یوں ایک بار پھر قابیل خوش ہوگیا۔

محمد طفیل

۱۱۷

مئی ۱۹۷۲ء

میں پریشان ہوں۔

میں پریشان ہوں۔ کیونکہ ہم نے یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ میں پنجابی ہوں۔ میں سندھی ہوں۔ میں بلوچی ہوں۔ میں پٹھان ہوں۔

ہم پاکستانی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ قومی زبان پنجابی ہونی چاہیے۔ سندھی ہونی چاہیے۔ بلوچی ہونی چاہیے۔ پشتو ہونی چاہیے۔

اگر آپ کے مطالبے یہی کچھ تھے تو پھر پاکستان کیوں بنوایا تھا؟ کیوں خوار ہوئے؟ کیوں ذلیل ہوئے؟

پاکستان کا مطالبہ تو اس لیے تھا کہ اس میں جان، زبان اور ایمان محفوظ رہے گا۔ اگر یہ کچھ تج دینے کا ارادہ تھا تو پھر کیوں عصمتیں لٹوائیں؟ کیوں بچے کٹوائے؟

اگر اب بھی عقل سے کام نہ لیا گیا تو وہ دن آنے ہی والا ہے جس میں آپ کی ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں پھر لُٹیں گی اور آپ کے بچے پھر آپ کے سامنے ذبح ہوں گے۔ کیونکہ زبان کا چکر وہ چکر ہے جس نے مشرقی پاکستان ہم سے چھنوایا۔

جس دن ہم نے دو قومی زبانوں کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ حصہ تو اُسی دن ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ باقی جو دن گزرے وہ قدرت کی طرف سے صرف ایک مہلت تھی۔

اب ہم پھر —

اب ہم پھر اسی — میں کیا کہوں؟ میں کیسے کہوں؟ میرے قلم میں اتنا بوتا نہیں کہ وہ آپ کو آپ کی بربادی کا حال سُنا سکے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز میں اتنی سکت نہیں کہ وہ آپ کو ہوش میں لا سکے۔ کیونکہ آپ نادانی میں جنون کی حد تک پہنچے ہوئے

ہیں۔ اب تو میرے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان بھائیو صرف اتنا بتلا دو کہ حشر کی گھڑی کتنی دُور ہے؟
اے رب العالمین، اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝

محمد طفیل

۱۱۸

جولائی ۱۹۷۳ء

سوچیے!

اگر کاغذ کورا ہو تو اُس پر قرآن لکھا یا چھاپا جا سکتا ہے۔ کاغذ سادہ ہو تو اُس پر دیوانِ غالب لکھا یا چھاپا جا سکتا ہے۔ کاغذ پر کچھ لکھا نہ ہو تو اُس پر بالِ جبریل لکھی یا چھاپی جا سکتی ہے۔ ویسے یہ کتنا ظلم ہے کہ کاغذ پر جو کچھ لکھا یا چھاپا گیا۔ اُس کا بیشتر حصّہ بیکار تحریروں پر مشتمل ہے۔

اب لفظوں کی بات ہو جائے۔

ایک لفظ وہ ہے، جو مولانا روم کے قلم سے نکلا۔ ایک کلمہ وہ ہے جو سعدی کے قلم سے نکلا۔ ایک فکر وہ ہے جو ابوالکلام کے قلم سے نکلا — کیا یہ اندھیر نہیں کہ ہم نے لفظوں کے استعمال میں بھی بے رحمی کا ثبوت دیا۔ جو چاہا لکھ دیا۔ کیا لکھنا چاہیے، کیسا لکھنا چاہیے۔ اس پر توجہ نہ دی۔

میں اتنا بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ نقوش کے ذریعہ جو کچھ سامنے آیا وہ سب کا سب دائمی قدروں کا حامل ہے۔ ہاں اس میں پیش کردہ بیشتر تحریریں ایسی ہیں، جن کی ضرورت ہمیشہ سمجھی جائے گی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ سادہ کاغذ کی اہمیت کیا ہے اور یہ بھی کہ اُس پر اہم سے اہم تحریر چھاپی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک ایک کلمے کی بھی اہمیت تھی۔ کیونکہ میں اس امر سے بھی بے خبر نہ تھا کہ لفظ جب کسی فنکار کے قلم سے نکلے گا تو وہ موتی رولے گا۔

نقوش ۱۹۴۸ء میں نکلا۔ آج ۱۹۷۳ء ہے۔

اس ربع صدی میں لفظ کی تقدیس اور کاغذ کی حرمت کا جتنا میں نے خیال رکھا۔ وہ شاید اس قابل ہو کہ اہلِ علم میرے اُس سجدۂ ریاضت کو، اُس کھاتہ میں ڈال سکیں جسے قبولیت کا کھاتہ کہتے ہیں۔

محمد طفیل

۱۱۹

ستمبر ۱۹۷۴ء

افسانہ نمبر

اب کے رائٹرز گلڈ کے الیکشن خوب ہوئے۔ مُردہ جماعت زندہ ہو گئی۔ ریجنا زون، یعنی پنجاب کے انتخابات میں جو نتیجہ نکلا۔ وہ حاضر ہے۔

ہمارا گروپ	ووٹ	مخالف گروپ	ووٹ
مرکز			
۱۔ محمد طفیل	۲۲۹	۱۔ قتیل شفائی	۱۶۴
۲۔ ناصر زیدی	۱۵۰	۲۔ رؤف شیخ	۱۱۰
صوبائی اُردو			
۱۔ میرزا ادیب	۲۳۰	۱۔ سلطان رشک	۲۰۴
۲۔ سیّد وقار عظیم	۲۲۴	۲۔ ذوالفقار احمد تابش	۱۵۶
۳۔ زاہدہ صدیقی	۲۰۴	۳۔ اسرار زیدی	۱۲۸
۴۔ محمد منشا یاد	۱۷۹	۴۔ ارشد حسین ارشد	۱۰۴
صوبائی پنجابی			
۱۔ ڈاکٹر رشید انور	۲۶۰	۱۔ سلیم کاشر	۱۷۴
۲۔ راجہ رسالو	۱۹۳	۲۔ شہبانہ ملک	۱۲۳
۳۔ بشیر منذر	۱۹۲	۳۔ منظور وزیر آبادی	۱۱۶

جنابِ قتیل شفائی گروپ کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ اس لیے کہ موصوف ایک مدت سے رائٹرز گلڈ پہ قابض تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ادیبوں کی فلاح کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

اب جنابِ قتیل شفائی سیکرٹری جنرل بننا چاہتے ہیں جنہیں اپنے گھر میں مسترد کیا جا چکا ہو۔ وہ کس برتے پر دوسرے صوبوں کی قیادت کا حق ادا کریں گے؟ یہ سوال اہلِ علم سے ہے!

فقط یہ سوال!

(محمد طفیل)

۱۲۰

جنوری ۱۹۷۶ء

ہم نے دنیا کے ادب کو گھول کے پی رکھا ہے۔ بڑے متمدن ہیں صاحب!

کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے مدارج یوں طے ہوئے۔ مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات! ۔ داستان لمبی ہے۔ اسے نہیں چھیڑتے۔ لیکن وہ جو ایک مردِ قلندر نے سکوتِ لالہ و گل سے کلام کا مشورہ دیا تھا۔ وہ بلاوجہ نہ تھا۔

کبھی آپ نے چھوئی موئی کی بوٹی کو دیکھا ہے؟ غیرت کا پتلا! ۔ اسے مرد چھوئے تو وہ مارے لاج کے مرجھا جاتی ہے۔ عورت چھولے تو مزید کھل اٹھتی ہے یعنی وہ حس رکھتی ہے۔ محسوس کرتی ہے۔ غیر محرم کو برداشت نہیں کرتی۔

اسی طرح ایک پھول ہے سُورج مکھی! رفاقت کا سمبل! — وہ سورج سے توانائی حاصل کرتا ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ بھی سر اُٹھاتا ہے۔ جیسے جیسے سورج ابھرتا چلا آتا ہے۔ وہ بھی تنتا چلا جاتا ہے۔ صبح کو پھول کا رُخ مشرق کی جانب ہوتا ہے جیسے جیسے سورج مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتا ہے ویسے ویسے وہ بھی مشرق سے مغرب کی جانب مڑتا چلا جاتا ہے اور جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو وہ بھی مرجھانا شروع کر دیتا ہے تا آنکہ غروبِ آفتاب کے وقت گردن ڈال دیتا ہے۔

آپ نے بیر کے درخت کو بھی دیکھا ہوگا۔ اثر پذیری کا سمبل! — اگر بیری پھل نہ دے رہی ہو تو سورج گرہن کے دوران اس کے پاس کھڑے ہو کر، دو آدمی اگر جھوٹ موٹ بھی مکالمے بول دیں۔ یعنی ایک یہ کہے کہ بیری پھل نہیں دے رہی اسے کاٹ دینا چاہئے۔ دوسرا کہے، نہیں کاٹنا چاہیے۔ آئندہ برس ضرور پھل دے گی تو وہ آئندہ برس پھل دینے لگ جاتی ہے۔ اس پر گفتگو کا اثر ہوتا ہے۔

یہاں پر تشکیک زدہ ذہن کچھ سوچتا ہے لیکن جواب وہی ملتا ہے۔ ہم تو جناب بڑے متمدن ہیں۔ ہم نے تو دنیا کے علوم کو گھول کے پی رکھا ہے۔ اور سکوتِ لالہ و گل سے —

حالانکہ ہم تو بوٹی بھی نہیں۔ ہم تو پھول بھی نہیں، ہم تو درخت بھی نہیں!

محمد طفیل

۱۲۱

ستمبر ۱۹۷۷ء

اقبال نمبر

تین چہرے میرے تصور میں آج بھی زندہ ہیں۔

جو میرے تھے اور مر گئے، اُن میں سے دو چہروں کا تعلق میرے والدین سے ہے اور تیسرے چہرے کا تعلق علامہ اقبال سے!

ہوا یوں کہ ایک صاحب تانگے پر نقارہ رکھے، اُسے زور زور سے پیٹ رہے تھے۔ جب لوگ متوجہ اور اکٹھے ہو گئے تو اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب اُٹھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ "میں آپ کو بڑی دلخراش خبر سنانے لگا ہوں کہ آج صبح علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ سہ پہر کے قریب میو روڈ سے اٹھایا جائے گا۔"

اُس وقت میری عمر پندرہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ایک کھلنڈری عمر، اس کے باوجود یہ خبر سُنی تو سناٹے میں آگیا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔

کیا اُس عمر میں، مَیں علامہ کے مرتبے سے آگاہ تھا، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دوستوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا کہ جو مجھے بتاتا کہ لُٹ گئے۔ پھر میرا دل کیوں ویران ہو گیا؟

جب کسی کل سکون نہ ملا تو میں نے ٹھانی کہ اُس گھر چلنا چاہیے کہ جس گھر سے علامہ اقبال چلے گئے ہیں۔ چنانچہ میو روڈ پہنچا۔ اس وقت کمرے میں صرف چند نفوس تھے۔ دو تین خواتین، دو تین مرد، تین چار بچے! بعد میں تو اتنی خلقت کندھا دینے کے لیے پہنچی کہ چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے۔ پھر بھی کندھا دینا کسی کسی کو نصیب ہوا۔ ایک جمِ غفیر تھا۔ حیران و پریشان!

صبح نو بجے سے لے کر دوپہر کے بارہ بجے تک میں علامہ کی چارپائی کے ساتھ لگا بیٹھا رہا — صورت یہ تھی کہ علامہ اقبال کا چہرہ

میرے سامنے تھا اور میں اُسے مسلسل تکے جا رہا تھا۔ جیسے عمر بھر کی دُوری کا آج ہی حساب چکانا ہو اور میں اُس وقت تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب تک کہ پہرے نے میرا وہاں بیٹھنا محال نہیں بنا دیا تھا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس وقت علامہ کے جتنا قریب تھا اور کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود علامہ کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

بالکل ویسے ہی جیسے چکور چاند کا عاشق ہوتا ہے اور چاند کو چکور کا حال معلوم نہیں ہوتا۔

جو میرے تھے اور مر گئے۔ ان میں سے تین چہرے میرے تصور میں آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل

۱۲۲

جنوری ۱۹۷۷ء

ہمارے ایک بھائی الہ آباد میں رہتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں۔ میں مسلمان، وہ شاعر ہیں۔ میں مدیر ہوں۔ میرا نام محمد طفیل ہے۔ اُن کا نام رگھوپتی سہائے، میں معروف محمد نقوش کے نام سے ہوں، وہ معروف فراق گورکھپوری کے نام سے۔ نوید کہ اُن کا ایک خط آیا ہے:

"میرے دل و جگر بھائی طفیل، وہ دن تو آیا کہ میرے دل و دماغ اور کلیجے کے جو دو ٹکڑے ہو گئے تھے جن میں سے ایک پاکستان میں رہ گیا تھا اور صرف آدھا ہندوستان میں، اب وہ دونوں ٹکڑے پھر مل گئے۔ میرا دل و دماغ اور کلیجہ پورے کا پورا پاکستان میں بھی ہے اور پورے کا پورا ہندوستان میں بھی ہے۔ محبت بڑے سے بڑے فاصلے کی بھی نفی نہیں، شاعرِ اعظم ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم کئی ہیں اس لیے اور بھی ہم ایک ہیں۔ کیونکہ جو خلائیں ہمارے ٹکڑے ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں ہم محبت سے بھر دیتے ہیں۔ کچھ اس سے بڑھ کر ماہی غازی پوری کا یہ مطلع ہے ؎

تمھیں کثرت سے وحدت اور محوِ ذوقِ وحدت ہو
پھر اس سے اور بڑھ جاؤ تو وحدت ہو نہ کثرت ہو

چنانچہ یہ غزل جو آج سے کئی برس پہلے دس یا بارہ اشعار پر ختم ہو گئی تھی کسی غیبی سبب سے میرے وجدان میں پھر عود کر آئی اور کچھ کم چالیس اشعار کی غزل ہو گئی۔ اب یہ پوری غزل اپنے پیغامِ محبت کے ساتھ آپ کی خدمت میں نقوش کے لیے حاضر ہے۔ بھائی! اب میں موت اور زندگی کے درمیان سانس لے رہا ہوں۔"

آپ کا فراقؔ

۱۹۷۲ء میں میری آپا کا بھی ایک خط آیا تھا۔ آپا سے مراد عصمت چغتائی ہے۔ بے شک میں لاہور میں تھا۔ وہ بمبئی میں تھیں۔ بڑا فاصلہ تھا۔ مگر اس پر بھی کوئی فاصلہ نہ تھا۔ ذہنی قرب کی حدیں آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھنے کی آرزو بھی تھی مگر جلد دیکھ نہ پایا۔ کوئی ۲۶ برس کے گیان دھیان کے بعد آپا خود ہی لاہور آ نکلیں۔ پوچھا۔ کہو طفیل کیسے ہو؟ جواب میں میں نے بھی پوچھا۔ آپ کیسی ہیں؟ میرا جواب مختصر تھا۔ مگر

آپا کا جواب پوری ایک کتاب ہے۔ جو میں لکھ لوں تو آپ کو پڑھنے کے لیے دوں۔ بس ذرا فرصت کی بات ہے۔ اس وقت تو میں آپا کے سنہ ۱۹۷۲ء کے ایک خط کا ذکر کرنے نکلا تھا۔

"طفیل صاحب! آپ کا خط پا کر دل کی عجیب حالت ہوئی۔ کوئی کہانی بغیر چھپی نہیں تھی۔ جلدی سے لکھی کہ آپ کی فرمائش کیسے بھی پوری ہو جائے۔ بہت جلدی میں لکھی ہے۔ جی چاہتا تھا کوئی بڑی چیز بھیجتی مگر مہلت نہیں ہے۔ اور سنو دروازے ضرور کھلیں گے۔ پچیس برس سے انتظار ہے۔ ہم لوگ یہاں زمین ہموار کر رہے ہیں۔ در اصل اب تک کچھ کیا بھی تو نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دونوں ملک کوئی راستہ نکالیں۔ دونوں طرف محبت بھرے دل ہیں۔ پھر یہ دوریاں کب تک؟ پرسانِ حال کو سلام! پورے پاکستان کو دعائیں اور سلام"۔ عصمت

خدا کرے یہ پیار کی کہکشاں سدا سلامت رہے۔ صرف ذرا سی بات ہماری طرف سے کہ "ہمیں اپنی آزادی بڑی عزیز ہے ہم دونوں ایک ہیں" کے نعرے کا بھی ساتھ نہیں دے سکتے۔

بقول فراق گورکھپوری دل و دماغ اور کلیجے کے ٹکڑے پگھل گئے ہیں۔ عصمت چغتائی کی خواہش کے مطابق دروازے کھل گئے ہیں — مگر میرے کرمفرماؤ! پیار کے جو راستے کھل گئے ہیں۔ اب اُن راستوں سے ٹینکوں اور توپوں کا گزر نہ ہو۔

محمد طفیل

اقبال نمبر نیرنگ خیال

نومبر ۱۹۷۷ء

تین چار برس پہلے، میں نے حکیم صاحب کو اُکسایا تھا، نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر چھاپ دیجئے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا "بڑھاپے نے امنگوں کو روند ڈالا ہے۔"

اس نمبر کے چھاپنے پر میرا اصرار اس لئے تھا کہ یہ پہلا اقبال نمبر تھا۔ جو علامہ اقبال کی زندگی میں چھپا تھا۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے بعد میں بہت سے چراغ جلے۔

جب اقبال صدی پڑی اقبال کے سلسلے میں لمبے چوڑے منصوبے سامنے آئے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے بھی اپنے اپنے پروگراموں کا اعلان کر دیا۔ اُن کی موجودگی میں بھی، میرے نزدیک اس نمبر کی اشاعت نہ صرف ضروری تھی بلکہ بہت ضروری!

وقت نکلا جا رہا تھا۔ وعدہ کر چکا تھا کہ نمبر چھپ جائے گا۔ جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو بالوں میں انگلیاں ڈال کے سر کو کھجانے لگ گیا۔ بالآخر اپنے آپ سے سوال کیا۔ ادارۂ نقوش یہ کام کر سکتا ہے؟

اِس کشمکش میں بڑا وقت ضائع ہوا۔ میرا گھٹیا پن مجھ سے کہتا، میں کیوں کسی دوسرے رسالے کو اہمیت دوں؟ میں کیوں اپنے حریفوں میں اضافہ کروں؟

سوال انا کا پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ بہت ردوقدح ہوئی۔ بہت ردوقدح! میں نے من و تُو کے چکر سے اپنے آپ کو نکالا۔ سوچا! حکیم صاحب سے دوستی! نمبر کی اہمیت! پھر ہچر مچر کیسی؟ چنانچہ حکیم صاحب کو لکھ دیا۔ بندۂ راضی! نقوش راضی!

راضی نامہ ہو جانے پر بھی، ذہن نے ایک بار پھر پٹخنی کھائی۔ مسٹر آخر جواز؟ وہ کام جو حکیم صاحب نے کیا۔ اسے میں جوں کا توں کیوں پیش کروں؟ — محمد طفیل کا کیا بنے گا؟

میرے لئے بڑا آسان تھا کہ میں اس نمبر میں اپنی طرف سے نئے مضامین شامل کر کے 'نمبر کو پیٹینٹ' دیتا۔ مجھے ڈھونڈو اور حکیم صاحب کو ڈھونڈو کا مسئلہ پیدا کر دیتا (جبکہ حکیم صاحب کی طرف سے اجازت بھی تھی بلکہ اصرار بھی) مگر دل نہ مانا۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ حکیم صاحب کی خدمت کا عَلَم جتنا اُوپر اُٹھ سکے۔ اُٹھایا جائے۔ بس بیچ بیچ میں شیطان وسوسے ڈال دیتا تھا۔

بہر حال ہر قسم کی این و آں کے بعد، میں نے نیرنگ خیال کی فائلیں اٹھائیں۔ گرد جھاڑی، انھیں چوما، ورق ورق دیکھا۔ مضامین جو مجھے فائلوں میں اِدھر اُدھر بکھرے نظر آئے۔ انھیں بھی، اِس نمبر کی زینت بنا ڈالا۔ اس اضافے میں بڑے مضمون نگار بھی نظر آئیں گے اور بڑے مضمون بھی! — یوں محمد طفیل مطمئن ہو گیا۔ تنازع ختم ہو گیا!

ذرا سی ایک بات اور سن لیں۔ اقبال پر سیکڑوں رسالے اور ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ مگر یہ نمبر ہزاروں ہی میں ممتاز، سیکڑوں ہی پہ بھاری! — اور یہ بھی کہ جب تک اقبال زندہ ہے۔ اس پر کام کرنے والے زندہ ہیں۔ یہ نمبر بھی زندہ! حکیم صاحب بھی زندہ! موت سب کچھ چھین لیتی ہے۔ مگر وہ کسی سے اُس کے کارنامے نہیں چھینتی!

محمد طفیل

۱۲۳

اقبال نمبر (۲)

دسمبر ۱۹۷۷ء

آپ سو رہے ہیں۔ مَیں جاگ رہا ہوں۔ مَیں کیوں جاگ رہا ہوں؟

کیا اقبال سونے نہیں دیتے؟ کیا شرف النسا سونے نہیں دیتیں؟ یہ سوال ہیں۔ مَیں جواب ڈھونڈ رہا ہوں۔

شرف النسا کا قصہ یہ ہے کہ وہ پنجاب کے گورنر کی بیٹی تھیں (بہ عہد شاہ عالم) قرآن اور تلوار اُن کا ماٹو تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ قرآن ہمارا قانون ہے اور تلوار طاقت کی علامت!

مزید ملاحظہ ہو!

جب تصور کی دنیا میں، علامہ اقبال جنت کی طرف نکل گئے تو انھیں سب سے پہلے جو قصر نظر آیا۔ وہ شرف النسا کا محل تھا۔ جو لعلِ ناب سے بنا ہوا تھا۔ جس کے سامنے آفتاب کی ضو افشانیاں بھی ہیچ تھیں۔

شرف النسا تاریخ کے صفحات میں گم ہو رہی تھیں۔ لیکن اقبال نے اُسے دوبارہ زندگی دے دی۔ بالکل اُسی طرح کہ جس طرح ہم بھٹک رہے تھے۔ جی ہار رہے تھے۔ ہمیں راستہ دکھلا دیا۔ منزلِ مراد تک پہنچا دیا۔

قصہ مختصر! اقبال جتنے دن بھی جیئے دوسروں کے لیے جیئے۔ خدا کی ثنا کے لیے جیئے۔ رسولؐ کی مدحت کے لیے جیئے!

خدا سے شکوہ بھی کیا تو قوم کے لئے۔ روتے بھی رہے تو قوم کے لیے! ان کے لئے شعر گوئی تو ایک بہانہ تھی۔ ورنہ

معاملہ دُور تک تھا۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبالؔ   پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

محمد طفیل

۱۲۴

جنوری ۱۹۷۹ء

(سالنامہ)

"آپ کمزور ہو گئے ہیں؟"

"جی ہاں! اِن دنوں عشق کی فرصت نہیں ملی۔"

یہ مکالمہ جس سے ہوا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میرے دکھ درد کا شریک، میری سلامتی کا خواہاں، میری عزت کا طالب، چنانچہ وہ بہت گھبرایا۔ اُسے وسوسوں نے آن گھیرا۔ اُسے وہموں نے آن دبوچا، اُس نے میرے کچھ ادھورے اور کچھ نیم رامنی عشقوں کو ٹٹول ڈالا۔

اِدھر میں اپنی للک میں غلطاں، اپنی سوچ کے سمندروں میں غرق!

پھر میرا دوست طیش میں آ گیا۔ اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں پشیمان، میں نادم۔ بغرض اس کی زبان پر جو کچھ آیا۔ اُس نے کہہ ڈالا۔

پھر اُس نے پھنکارتے ہوئے مجھ سے براہِ راست سوال کر ڈالا: "کیا ابھی تک اس مشغلے سے دل نہیں بھرا؟" میں اِس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے جواب چاہتا تھا۔

میں عجیب کشمکش میں تھا۔ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ سچ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بالآخر ہمت کی اور کہہ ڈالا: "دل ابھی تک نہیں بھرا۔" اُس کا دھیان قلوپطرہ کی طرف نکل گیا۔ مونالیزا کی طرف نکل گیا۔ میرا دھیان نقوش کے خالی صفحات کی طرف نکل گیا۔ جن میں میں نے ابھی لاکھوں کروڑوں حروف سجانے تھے۔

میرا دوست، جو میرا ضمیر تھا۔ وہ بھی حیران تھا۔ میں بھی پشیمان تھا۔

میں بھی پشیمان تھا۔ وہ بھی حیران تھا۔

محمد طفیل

۱۲۵

اکتوبر ۱۹۸۰

میر تقی میر (نسخۂ لاہور)

تجسّس! — بس اتنی سی میری زندگی ہے۔

۱۹۶۹ء آیا تو ادب کے میدان میں ایک عجیب سی ہماہمی تھی۔ جو تھا وہ یا تو غالب پر نمبر چھاپ رہا تھا یا غالب پر کتاب! پھر اتراہٹ ایسی کہ کسی کے بھی پاؤں زمین پر ٹکتے نہ تھے۔ ایسے میں ادارۂ نقوش صرف حیران ہی ہو سکتا تھا۔

اُس عالمِ حیرانی میں، ہم نے غالب پر تین نمبر پیش کئے۔ اُن میں غالب کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی اُس بیاض کو بھی ڈھونڈ نکالا جو کہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی۔ جو انمول تھی۔

۱۹۷۷ء آیا تو اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کا غلغلہ بلند ہوا۔ حکومتوں نے خزانوں کے مُنہ کھول دیئے۔ یاروں نے بھی کھونٹیوں پر لٹکائے ہوئے قلم اُتارے۔ میری سوچ ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ جو کام دوسرے کر سکتے ہوں۔ اُسے ادارہ نقوش کیوں کرے؟ وہ کیوں نہ کسی نئی مہم پہ نکلے۔ کیوں نہ وہ محنتِ دیدہ کا کوئی اور امتحان دے؟

ایسے ماحول میں بھی ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ ہم نے اقبال پہ دو نمبر پیش کئے۔ تیسری جلد بھی پیش کر رہے ہیں۔ جس میں علامہ کی نصف صدی سے بھی پرانی اور غیر مطبوعہ تحریریں ہیں۔ یہ کام بھی وہی کر سکتا تھا۔ جسے مرنے کا سلیقہ ہو۔

اِدھر خیالات نے پھر انگڑائی لی کہ میر خدائے سخن ہے۔ حق ادا کرنا چاہیے۔ اوراقِ نقوش میں غالب اور اقبال کو سینے سے لگایا گیا۔ میر کے ساتھ زیادتی کیوں؟ اس لئے ہم نے بھی کھاتہ میر میں اپنا حساب کھول دیا۔ اس بار ہم پھر تقریباً دو صدیاں پرانے، ایک ایسے مخطوطے کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ جس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔

آپ نہ جانے کیا محسوس کرتے ہوں۔ میں تو ایسی ادبی دستاویزات کی دریافت پر ایسا محسوس کرتا ہوں۔ جیسے میں نے صدیوں کو لمحہ لمحہ بسر کیا ہو۔ جیسے میرا وجود تین صدیوں پر محیط ہو۔

اس کے باوجود!

اس کے باوجود، میں خاموشی سے اُٹھتا ہوں اور —— اپنی ایک اور نیکی کو دریا میں ڈال دیتا ہوں

محمد طفیل

۱۲۶

میر تقی میر (نمبر ۲)

نومبر ۱۹۸۰ء

مسافر اور ستارہ!

جیسے آسمان پر بے شمار ستارے ہیں۔ روشن بھی مدھم بھی، اُسی طرح آسمانِ اُدب پر بھی متعدد ستارے ہیں۔ ویسے ہی روشن، ویسے ہی مدھم!

یہ سلسلۂ میر ہم نے کوشش یہ کی ہے کہ فلکِ قرطاس پر، روشن ستاروں کی ایک ایسی کہکشاں بنا دیں کہ جس کی روشنی تادیر اُدب کو منور کرتی رہے۔

ستارے آسمان سے ٹوٹتے بھی ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں اُن کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک نظریہ رد ہو جاتا ہے۔ جب ایک تحقیق غلط ثابت ہو جاتی ہے تو اہلِ ادب اُسے ستارہ، ٹوٹنے کا عمل کہتے ہیں۔

ادب میں بھی کئی ستارے ٹوٹے۔ کئی مزید روشن ہوئے۔ بہر حال میر تقی میر، وہ قطبی ستارہ ہے جو اپنی مخصوص جگہ پر قائم ہے۔ تنہا تنہا، روشن روشن!

اُدب کے اُفق پر، اس ستارے کو ظاہر ہوئے ۲۵۰ برس گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں تو اس کی روشنی ماند نہیں پڑی۔ یہی

وجہ ہے کہ ادب کے مسافر، راستہ بجھے بغیر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔
میں بھی ایک مسافر ہوں۔
۱۹۵۱ء سے، میں بھی اس قطبی ستارے کو دیکھ رہا ہوں۔ جیسے میرا اس سے کوئی رشتہ ہو!

محمد طفیل

۱۲۷
ستمبر ۱۹۸۱ء

ادبی معرکہ نمبر (۱)

آج عید کا دن ہے۔ لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشیاں منائیں گے۔ میں تو زیادہ تر وقت نقوش کی رفاقت میں گزاروں گا۔ کیونکہ میری عید اُس دن ہوتی ہے جس دن نقوش کا کوئی نمبر مکمل ہوتا ہے۔ جتنی عیدیں میں نے منائی ہیں کم کسی نے منائی ہوں گی۔ کیونکہ میری تو یہ ۱۲۷ ویں عید ہے۔

میں نے نقوش کی ہر پیش کش کے وقت یہ بھی سوچا کہ میں جو نمبر چھاپ رہا ہوں اس کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ ایسا میں اس لیے سوچتا ہوں کہ کسی طور، اگر میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکوں کہ ضرورت نہیں ہے تو میں اُس ذہنی کرب سے بچ سکوں گا جس سے کہ مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ سوچ کے پیچھے چلتے ہیں۔

"ضرورت ہے۔"

"ضرورت نہیں ہے۔"

ذہنی گھسائی میں اگر جواب ضرورت نہیں ہے والا درست لگا تو مارے خوشی کے عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہوں۔ سیٹی بجاتا ہوں۔ فضول خرچی کرتا ہوں۔ کسی کو چھیڑتا ہوں۔

اگر جواب ضرورت ہے والا درست لگا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ نظر آتا ہے۔ سال چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ وہ بھی بامشقت اور بارو پیہ!

سوال یہ ہے کہ جب یہ کام ذہن پہ اتنا بار ہے تو پھر کیوں زندگی تجے بیٹھا ہوں؟ جوانی نذر کر دی تو باز نہ آیا۔ صحت لٹا دی تو باز نہ آیا۔ آنکھوں کا نور دیا تو باز نہ آیا۔ آخر کیوں؟ جواب بھی نہ ملا۔

آپ کو معلوم ہے کہ دماغ تیزی سے سوچتا ہے۔ سوچوں میں ربط بھی نہیں ہوتا۔ منٹ میں وہ اپنے گھر اور اپنے ملک کے بارے میں سوچتا ہے تو دوسرے لمحہ وہ امریکہ یا روس پہنچ جاتا ہے۔ زقندیں بھرنے میں اس کا نہ تو کوئی اصول ہے اور نہ منطق، یہی وجہ ہے کہ وہ روز روشن کو بھی گھپ اندھیرے کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔

ایسے اُلٹ پھیر کے لمحوں میں، میں اپنے طاقچہ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اپنی موم بتی کو اپنی دیاسلائی سے روشن کر لیتا ہوں۔

محمد طفیل

۱۲۷

ستمبر ۱۹۸۱ء

ادبی معرکے نمبر (۲)

میں نے ۱۹/۲۰ ویں شمارے سے نقوش کی ادارت کا آغاز کیا تھا۔ پتا ہی نہ چلا کہ نمبروں کی سینچری ہو گئی۔ کیا کیا ہے۔ اس پر اتنا دھیان نہیں رہتا۔ بلکہ کیا کرنا ہے۔ ساری توجہ اس پر مرکوز رہتی ہے۔ خوشیوں کی ساعتیں بھی یوں گزر گئیں۔ جیسے خوشی کی بات نہ ہو۔ اپنا ہوش نہ رہے۔ اس کی لذت سب کہاں جانتے ہیں۔

اگر عرصہ کو دھیان میں رکھتے تو سلور جوبلی مناتے۔ اس لیے کہ اس بکھیڑے میں پڑے تیس برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ نوجوانی نے بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ دیا۔ قلانچیں بھرنے کی بجائے لاٹھی ہاتھ میں پکڑنے کا وقت آ گیا۔ کہاں سے چلا تھا۔ کہاں پہنچ گیا۔

ادھر انسان کا بھی بھید نہ کھلا۔ آدمی ایک روپ سو، مدعا یہ کہ آدمی دن میں کئی بار بدلتا ہے۔ کسی لمحہ کچھ ہوتا ہے۔ کسی دوسرے لمحہ کچھ، ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا۔ یہی حال ایک اچھے آدمی کا ہے۔

بات واضح یوں ہو گی کہ ایک آدمی ابھی کچھ ہوتا ہے۔ کوئی خبر سنتے ہوئے یا ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے وہ کوئی دوسرا آدمی بن سکتا ہے۔ اس آواز پر جو کہ اُسے سنائی دی۔ اس کے اچھے یا بُرے آدمی ہونے کا انحصار ہو سکتا ہے۔

تماشا یہ بھی ہے کہ دُنیا کا ہر فرد، دوسرے فرد کے خلاف ہے۔ یہ ہماری سرشت کا ادّعا ہے۔ اگر آپ کاروبار کرتے ہیں تو ہر شخص آپ کے منہ سے نوالہ چھین رہا ہو گا۔ اگر آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں تو ہر جونیئر آپ کی کرسی کھسکا رہا ہو گا۔ اگر آپ ادیب اور شاعر ہیں تو معاملہ زیادہ سنگین ہو گا۔ لیکن عام آدمی اور ادیب میں فرق ہوتا ہے (بشرطیکہ نیتوں میں ٹیڑھ نہ ہو) عام آدمی غصہ میں آ کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کرتا ہے۔ مگر ادیب غصہ میں آ کر دوسروں کا بھلا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی کٹار نہیں چلتی۔ قلم چلتا ہے۔

قلم کی انہی جولانیوں سے یہ نمبر آراستہ ہے۔ علمی موشگافیوں کی ضرب تقسیم بلکہ تفریق سے ادب کا بھلا ہو گیا۔ یہ میرا بیان ہے۔ یاد رہے کہ ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا۔ یہ بھی میرا ایقان ہے۔

محمد طفیل

۱۲۸

نومبر ۱۹۸۱ء

انیس نمبر نسخۂ لاہور

میرے دل میں کاموں کا میلہ لگا ہے۔ لفظی دکانیں سجی ہیں۔ لفظ میرا نام لے کر مجھے پکارتے ہیں۔ مجھے رُکنا پڑتا ہے۔

لفظ مجھ سے کہتے ہیں: ہمیں اپناؤ، ہمیں اپناؤ!

میں انسان ہوں۔ میرے بس میں سب کچھ نہیں۔ اس لیے سارے لفظوں کا کہا نہیں مان سکتا۔ یا ایک ساتھ نہیں مان سکتا۔ لہٰذا انھیں اپنے دل میں بسا لیتا ہوں۔ باری باری ان کے قریب جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ احوال سنتا بھی ہوں۔ احوال سناتا بھی ہوں۔

لفظ کہتے ہیں: ہم ایک صدی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم دو صدیوں سے!

احسان مندی کے جذبے سے میری گردن جھک جاتی ہے۔

ہاں، اب کے جو احوال سُنا تو جسم کانپنے لگا۔ دل ڈوبنے لگا۔ میں نے لفظوں سے بار بار کہا: "خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ۔ خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ۔"

مگر الفاظ بضد تھے۔ سُنو سُنو!

مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ ملکوتی آواز، فردوسیِ وقت میر انیس کی ہو۔ جو وہبی قوتوں کی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ ذکر نواسۂ رسولؐ کا تھا۔ ذکر حضرت عباسؓ کا تھا، ذکر علی اصغرؑ کا تھا۔ ذکر حضرت زینبؓ کا تھا۔ ذکر حضرت کلثومؓ کا تھا۔ غرض وہ ذکر سُنا نہ جاتا تھا۔ کپکپی طاری ہو گئی۔

جب اپنے آپ کو سنبھالا، تب وہ الفاظ جو میں نے سُنے تھے، جو لفظوں کے نگینے تھے۔ انھیں یکجا کیا۔ تاکہ دولتِ بیدار کو حق داروں کے حوالے کر سکوں!

وہ تو ہو گیا۔

مگر ان الفاظ کے سننے میں جو کیفیت مجھ پر وارد ہوئی۔ وہ آپ پہ اُس وقت طاری نہیں ہو سکتی جب تک کہ میری طرح آپ بھی لفظوں کی کربلا میں کھڑے نہ ہوں۔

محمد طفیل

۱۲۹

ستمبر ۱۹۸۲

(عصری نمبر)

پرانے قصے سُن رکھے تھے کہ بادشاہ اپنی رعایا سے یوں بھی مخاطب ہوتے تھے۔

"بول کیا چاہتا ہے؟"

"جہاں پناہ! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"مانگ لے جو کچھ مانگنا ہے۔"

"جہاں پناہ! بندہ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔"

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ تیری ہر آرزو پوری کی جائے گی۔"

"جہاں پناہ! اگر کچھ دینا ہے تو میری برادری کو دے دیجیے۔"

ایک رسالے کے مدیر نے عجیب خواب دیکھا۔ وہ دیکھتا ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو پانچ بجے، جہاں کہ "ادبی معرکے نمبر" کا جلسہ برپا تھا۔ ملک کا ایک وزیر باتدبیر صدارت کر رہا تھا کہ محفل میں اچانک ملک کا بادشاہ آ گیا۔ اُس وقت رسالے کا مدیر، وزیر باتدبیر کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا تھا کہ بادشاہ سلامت آ کے رعایا میں بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ پرانے قصے کہانیوں جیسا تھا۔

پھر بادشاہ نے کہا "میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا: "میں اس شخص کا قدر دان ہوں۔ جو کہ اسٹیج پر بیٹھا ہے۔ میں یہی کہنے یہاں آیا ہوں۔"

رعایا پہلے حیران ہو گئی۔ پھر خوش ہو گئی۔

جب تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس سے نسلوں کے چلن میں فرق پڑتا ہے!

محمد طفیل

۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۲ء

رسولؐ نمبر جلد اوّل

[یہ اداریہ میں نے زیارتِ روضۂ رسولؐ سے پہلے لکھا تھا]

میں ادبی گنہگار ہوں۔ دربارِ رسولؐ تک کون سا جذبہ لے آیا۔ یہ میں نہیں جانتا مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں!

میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا اُس کی بھی توفیق نہ تھی۔ اس لیے کہ اہلِ نظر نے جو کچھ دیکھا وہ بھی میری سعی کا نہیں، تائید کا نتیجہ ہے۔

میرے حصہ میں کیا آیا؟ حیرانی اور صرف حیرانی!

آج بھی میں جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہوں، یہ توفیق نہیں انعام ہے۔ کیونکہ مجھے اپنے گناہوں کا حال اوروں سے زیادہ معلوم ہے۔

مجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے وہ لے رہا ہے۔ کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں، اور کچھ بھی نہیں ہوں!

میری گنہگاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرے اِس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے؟

میں حاضر ہوں یا رسولؐ اللہ!

میں حاضر ہوں!

میں حاضر!

محمد طفیل

۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۲

رسولؐ نمبر جلد دوم

میں نے متعدد دن اور راتیں اِس انتظار میں گزاریں کہ وہ لمحۂ عالیہ آئے کہ میں اپنے تئیں سیرتِ سرورِ کونینؐ پیش کر سکوں۔ وہ لمحہ آیا۔

میرے جذبات واحساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

خدا نے مجھے لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ ہزاروں صفحات کالے کیے ہیں۔ مگر آج لکھنے بیٹھا ہوں تو قلم رک رہا ہے۔ یا الٰہی! ماجرا؟

ذہن نے بات سمجھائی، جس کی تعریف خدائے ذوالجلال نے کی ہو، اُن کے بارے میں تیرا قلم کیا لکھے گا؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

مقابلہ عشق اور فہم کے درمیان آن ٹھہرا۔ دونوں امتحان سخت آویزش، ناتوان، حواس بے ٹھکانہ ہونے لگے۔

قدرے سنبھلا تو ہاتف نے کہا: "حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"ہُوں!"
"حدِ ادب کا مقام ہے۔"
"یا الٰہی! میں کیا کروں؟ حضورؐ! میں کیا کروں؟"

میری التجا پر دوبارہ غیبی آواز آئی: "آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے رسولؐ اللہ کے بارے میں لکھا ہو اور اُن کا حق ادا کیا ہو۔"

میں ایک بار پھر سناٹے میں آگیا۔ جھرجھری لی تو میں کہہ رہا تھا۔ "میں حضورؐ کا اُمتی ہوں۔ میں اس کام کے لیے خود حضورؐ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔"

اِس پر ہاتف نے کہا: "تو پھر لکھ!"
جسم تھر تھر کانپنے لگا۔
تب میں نے گھر والوں سے کہا: "مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنت میرے رسولؐ کی ہے۔"

محمد طفیل

۱۳۰
جنوری ۱۹۸۳ء

رسولؐ نمبر جلد سوم

مجھے سیر و تفریح کا قطعاً شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک شہر سے دُوسرے شہر جاتے ہوئے خاصا پریشان ہونا پڑتا ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیر تو دُور کی بات ہے۔

مگر اب کے میں سعودی عرب گیا۔ بڑے شوق سے گیا۔ کیونکہ یہ ملک میرے محبوب کا ملک ہے۔ جہاں کہ وہ پلے بڑھے تھے۔ جہاں کہ اُنھوں نے اپنے پیغام سے دنیا کو متوجہ کیا تھا۔

پہلے میں جدہ گیا۔ اس کے بعد مکہ گیا۔ خانۂ خدا کو دیکھا۔ حجرِ اسود کو دیکھا کہ جسے رسولؐ اللہ نے خانہ کعبہ میں رکھا تھا۔ پھر میں مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا، یہ جان کر کہ شاید اِدھر سے میرے رسولؐ گزرے ہوں!

اس کے بعد مدینہ گیا۔ روضۂ اقدس کو دیکھا۔ منبر کی جگہ کو دیکھا کہ جہاں رسولؐ اللہ کھڑے ہو کر خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ منبر کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، یہ سوچ کر کہ شاید یہیں حضورؐ کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں سجدے کرتے ہوں!

پھر مسجد قبا گیا جو رسولِ حق نے بنائی تھی۔ جو دُنیا کی پہلی مسجد تھی۔ اُس جگہ کو بھی دیکھا کہ جہاں سرورِ دو عالمؐ کھڑے ہو کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا کرتے تھے۔

خواہش صرف اتنی تھی کہ اُس جگہ آنکھیں بچھاؤں، جہاں کہ رسولِ اکرمؐ نے قدم رکھا ہو۔ اُس جگہ سجدہ کروں کہ جہاں حضورؐ نے سجدہ کیا ہو۔

بالآخر میں نے روضہ کے سامنے بیٹھ کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ دل پر جو کچھ اترا وہی حاصلِ زندگی: مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!
مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!

محمد طفیل

۱۳۰
جنوری ۱۹۸۳

رسولؐ نمبر (جلد چہارم)

میں نے ۱۹۶۴ء میں "آپ بیتی نمبر" چھاپا تھا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے میرا سب سے قیمتی اور ضخیم پرچہ تھا، جو ۱۹۶۴ء کی رعایت سے ۱۹۶۴ صفحات کا تھا۔

اُس نمبر میں دنیا کی تقریباً تمام بڑی شخصیتوں کی آپ بیتیاں تھیں جو مجھے اُن موجود شخصیتوں نے خود بھجوائی تھیں یا اُن کے سیکرٹریوں نے، مثلاً امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے، ہندوستان کے صدر رادھا کرشنن نے، پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے، ان کے علاوہ آغا خان، ایزرا پاؤنڈ، جواہر لعل نہرو، برٹرینڈ رسل، ایلیا اہرن برگ، طٰہٰ حسین نے ——— اور سر ونسٹن چرچل نے، جمال عبدالناصر نے، رضا شاہ پہلوی نے، ملکہ ایلزبتھ نے۔ غرض اس نمبر میں تمام دنیاوی بادشاہوں کے مضامین تھے۔

جب وہ نمبر شائع ہُوا تو دُنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس سے بہتر پرچہ چھاپنا ناممکن ہے۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی ارمان تھا، کوئی اور ہی خاکہ تھا۔

آج ۱۹۸۲ء میں، پورے اٹھارہ برس کے بعد اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے، وہ حاصلِ زندگی نمبر پیش کر رہا ہُوں کہ جو میرا منتہا تھا۔

۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجود اور مرحوم شخصیتوں سے اُتم ہے، افضل ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ جس سے دین اور دُنیا کا ٹانکا جُڑا ہوا ہے۔

آج میری وہ آرزو پوری ہُوئی، جس کے لیے برسوں بے کل رہا۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں، وہ کم ہوں گے۔
کیوں کہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہوں!

محمد طفیل

۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۳

رسولؐ نمبر جلد پنجم

اہلِ علم نے فرمایا

نقوش کی چار جلدیں، میرے چار امتحان، اُن کے متعلق نامور حضرات کے فیصلے!

شیخ آفتاب حسین (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت) نے لکھا: "نقوش کا رسولؐ نمبر بلاشبہ قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے۔ ان شاء اللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بروقت اور صحیح اقدام اٹھایا ہے۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا: "اسے نمبر کیوں کہیے، یہ تو اردو زبان کی سیرتِ طیبہ پر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ سبحان اللہ آپ

نے کیا دلکش اور دل آ فریں نمبر شائع کیا ہے"۔

مولانا نعیم صدیقی نے لکھا ـــ "علامہ شبلی اور سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قائم کیا تھا۔ اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل، شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا آپ نے قائم کیا"۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی نے لکھا ـــ "سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایک ایسا گلدستہ اور مجموعہ اُردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا۔ ان جلدوں کو دیکھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے"۔

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے لکھا ـــ "نقوش کا رسولؐ نمبر سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس میں جمع کردہ مضامین مستند اور بلند پایہ تحقیقی مضامین ہیں"۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ـــ "رسولؐ نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ کیا عجب کہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہ سفر ہو جائے۔ یہ نمبر ظاہری اور معنوی حیثیت سے بھی راحت دل ہے"۔

سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ـــ "اس مبارک قیمتی، قابلِ قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعے آپ نے سعادتِ دارین کا اچھا سامان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے"۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرمایا ـــ "رسولؐ نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں۔ عنایت کے بوجھ سے کچل گیا۔ خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے!"

مولانا سید مرتضیٰ حسین نے لکھا ـــ "محمد طفیل کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیش کش کا سلیقہ اور طریقہ ان کی عقیدت و محبت، ان کا عشق اور جذبہ جو رنگ لایا ہے وہ ان کے چہرے اور لبوں سے بول رہا ہے۔ یہ سرخروئی مبارک ہو"۔

اب ایک جملہ اس عاجز کی طرف سے بھی، اہلِ علم نے سراہا، اہلِ دل نے نوازا، میں ممنون! میں احسان مند! ـــ مگر میرے ارمان ابھی پورے نہیں ہوئے۔

محمد طفیل

۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۳

رسولؐ نمبر جلد ششم

وہ تین تھے، چار تھے، پانچ تھے، چھ تھے کہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کُتا۔ یہ کوئی نہیں جانتا سوائے خدا کے! وہ زمانہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر غار میں جا کر چھپ گئے۔ پھر انھیں نیند آ گئی۔ جب وہ جاگے تو صدیاں بیت چکی تھیں۔ قرآن میں اُن کا ذکر یوں آیا ہے:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۙ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ (الکہف)

(کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور کتبہ والے ہماری نشانیوں میں کچھ تعجب کی چیز تھے؟ (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب اُن نوجوانوں نے غار میں جا کر پناہ لی۔ پھر بولے، اے پروردگار ہمارے! ہمیں اپنے پاس سے رحمت (وفضل) عطا کر اور ہمارے لیے (اس) کام میں درستی کا سامان کر دے۔ سو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک (نیند کا) پردہ ڈالے رکھا۔ پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ ہم معلوم کریں کہ (ان) دونوں گروہوں میں سے کون گروہ (اس حالت میں) رہنے کی مدت سے زیادہ واقف ہے)

میں بھی جب غار میں جا کر چھپ جاؤں گا اور صدیاں بیت جائیں گی۔ جاگوں گا تو بے شک میرے بال سفید ہو چکے ہوں گے، مگر میرے جمع کردہ وہ سچے الفاظ، جو میرے رسولؐ کی زبان سے نکلے ہوں گے جوں کے توں ہوں گے۔

سچے الفاظ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے!

محمد طفیل

۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

رسولؐ نمبر جلد ہفتم

چیونٹی، ایک ننھی سی جان!

جب سلیمان علیہ السلام کی فوج ایک مقام سے گزرنے والی تھی تو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا: "اپنا بچاؤ کر لو، فوج آ رہی ہے"

یہ بات سلیمان علیہ السلام نے آسمان پر سن لی، کیونکہ وہ ایسی قدرت رکھتے تھے۔

قرآن میں یہ واقعہ یوں آیا ہے:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا۔ (سورۃ النمل)

(اور سلیمان کے لیے ان کا لشکر جمع کیا گیا جن بھی اور انسان بھی اور پرندے بھی اور انھیں (صف بندی کے لیے) روکا جاتا تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں جا گھسو کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں روند نہ ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو (سلیمان) اس بات پر مسکرا کر ہنس پڑے)

چیونٹی کی آواز، ایک نحیف آواز، حضرت سلیمان کو آسمانوں پر سنائی دیتی ہے — اور جو لفظ کُن سے پوری کائنات تخلیق کر سکتا ہو اُس نے بھی تو اپنے بندے کی آواز سنی ہوگی!

آوازیں

"چیونٹیو! گھس جاؤ اپنے گھروں میں۔"

محمد طفیل کی بھی التجا پوری ہو — اُس محمد طفیل کی کہ جو خود بہ طفیلِ محمدؐ ہے!

محمد طفیل

۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

رسولؐ نمبر جلد ہشتم

مدینہ کا شہر!

مسجدِ نبویؐ کے قریب ایک چھپر تلے کچھ لوگ رہتے ہیں مگر اُن کی حالت یہ ہے کہ تن ڈھانکنے کے لیے جو چادر ہے وہ پھٹی ہوئی اور چھوٹی ہے۔ ستر ڈھانپنا مشکل ہو رہا ہے۔ یہ حالت کسی ایک کی نہیں، سبھی کی ہے۔

کسی نے پوچھا "یہ لوگ کون ہیں؟

"اصحابِ صُفّہ"

"اصحابِ صُفّہ"

"ہاں، وہی لوگ جن کے بارے میں حضورؐ نے بتایا تھا: "یہ لوگ جنتی ہیں"

"وہ لوگ چھپر تلے پڑے ہیں، قرآن کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، احادیث پر غور کر رہے ہیں، حضورؐ کا دیدار کر رہے ہیں۔ بس ان کا اتنا ہی کام ہے۔

قرآن مجید میں ان کا ذکر یوں آیا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۝ (البقرہ)

(صدقات کے مستحق وہ فقرا ہیں جو اللہ کے راستہ میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ ملک میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں (کہ روزی کما سکیں) مانگنے میں ان کی احتیاط کی وجہ سے ناواقف ان کو مالدار سمجھتا ہے تم ان کو ان کے چہرہ مہرہ سے پہچان سکتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے)

آج جب میں سیرتِ رسولؐ کے مطالعہ سے گزر رہا ہوں دنیا کی ساری آسائشیں میری گود میں ہیں، پھر بھی میرا دل چاہتا ہے، کاش! میں بھی حضورؐ کے زمانہ میں ہوتا۔

میرا شمار بھی اصحابِ صُفّہ میں ہوتا!

محمد طفیل

۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

رسولؐ نمبر جلد نہم

جب کفار نے حضورؐ کو تنگ کیا اُس میں شدت اختیار کی تو ناچار سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک مشرک کو اونٹ کی ہڈی کھینچ

ماری، جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ مورخین کے نزدیک اسلام کی حمایت میں وہ پہلی خونریزی تھی۔

دوسرے ابوسفیان سے ایک مٹھ بھیڑ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک تیر چلا ہی دیا، حالانکہ جانبین میں سے کسی کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔

یہ ذکر ایک صحابی کا تھا۔ مگر یہ جلد اُن جلیل القدر خلفاؑ کے بارے میں ہے کہ جن کے حلم پہ ساری دنیا نثار تھی، جن کے دبدبہ پہ ساری دنیا لرزاں تھی، جن کی سخاوت پہ ساری دنیا حیران تھی، جن کے علم پہ ساری دنیا ششدر تھی۔ بس یہاں اس نکتہ پہ غور فرمایئے، تربیت یافتہ کس کے تھے؟

میں نے بھی سیرت پہ کام کا آغاز کیا (آج بھی آغاز ہی ہے) نامور سیرت نگاروں سے کسبِ فیض کیا۔ اپنی بے بضاعتی کے باوجود میں نے اپنی سوچ اور اپنے انداز کا الگ سا کام کیا۔ میرے پیش کردہ موضوعات میں ایسے عنوانات متعدد ہیں جن پہ پہلے کام نہ ہوا تھا —— اگر ہوا تھا تو اتنی تفصیل سے نہ ہوا تھا یا کسی ایک سیرت کی کتاب میں موجود نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا اس موضوع پہ کام کرنے کا کوئی جواز نہ تھا جہاں کہ ہر لفظ پہ دُرود پڑھ کر دوسرا لفظ لکھنا پڑے۔

ذرا رُکو، یہ کیا کہہ رہے ہو؟

چُپ رہتا ہوں تو مافی الضمیر کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کچھ کہتا ہوں تو ڈر لگتا ہے۔ مجھے کچھ کہنا چاہیے، ورنہ جو تلاطم میرے سینے کے اندر ہے وہ مجھے بکھیر دے گا۔

خاتم النبیینؐ کے صحابی سعد بن ابی وقاصؓ کے جذبات ذہن پہ مسلط ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کہہ رہا ہوں، جذبہ سلامت ہو تو کوئی بھی پہلا تیر چلا سکتا ہے۔

محمد طفیل

۱۳۰

رسولؐ نمبر جلد دہم

جنوری ۱۹۸۴ء

انسان عاجز ہے۔ ہر لمحہ خدا سے کچھ نہ کچھ طلب کرتا رہتا ہے، یا اللہ! مجھے یہ دے دے۔ یا اللہ! مجھے وہ دے دے۔ یا اللہ! مجھے دُنیا جہان دے دے۔

میں نے بھی جب ہوش سنبھالا تو خدا سے اتنا کچھ مانگا کہ اللہ میاں نے بھی سوچا ہوگا کہ اس شخص نے سوائے خدائی کے سب کچھ مانگا۔

میری التجاؤں میں شاید تڑپ تھی کہ وہ مستجاب ہونے لگیں۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور نہ جانے کتنی دعائیں قبول ہوئیں۔ حساب لگاؤں گا تو سارے ہندسے ختم ہو جائیں گے۔

ایک سفر میں، مَیں نے صبح کی نماز پڑھی، دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر دوسرے ہی لمحہ ہاتھ چھوڑ دیئے۔ دوست نے پوچھا: "دعا نہیں مانگتے؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر؟"

"مجھے خدا نے کیا نہیں دے رکھا، جو میں اُس سے مانگوں!"

"یہ بھی سنو!"

"فرائض کی ادائیگی کے علاوہ، مَیں جتنے سجدے کرتا ہُوں وہ شکر گزاری کے سجدے ہوتے ہیں۔"

محمد طفیل

۱۳۰

جنوری ۱۹۸۵ء

رسولؐ نمبر جلد یازدہم

میں غریب انسان ہوں۔ ہر طرح سے غریب، طبیعت کے اعتبار سے غریب، عمل کے اعتبار سے غریب، علم کے اعتبار سے غریب، مگر میں نے منزل دُور کی اور سب سے اونچی منتخب کی۔ اپنا دامن نہ دیکھا جھولی پھیلا دی۔

دُور کی اس لیے کہ سیرتِ رسولؐ کے ضابطے کڑے تھے۔ نہ بے احتیاطی کو دخل، نہ لاپروائی کی گنجائش، حرف حرف تقدس آمیز تاثر کا طالب، اونچی اس اعتبار سے کہ دُنیا نے رسولؐ سے بڑا آدمی پیدا نہ کیا۔ یا اللہ کی ایک کتاب میں نہیں لکھا ساری کتابوں میں لکھا موجود ہے۔

اِدھر اتنا بڑا امتحان، اُدھر میں اور میری نارسائیاں!

میں نے سوچا کہ اس مہم میں اگر ساری دنیا کے لوگوں کو شامل نہ کیا تو بات کچھ بھی نہیں بنے گی۔ میرے کام اور اُس ہستی میں بڑا فاصلہ رہ جائے گا۔

کوئی لاکھ جتن کرے فاصلہ تو باقی رہے گا ہی۔ قیامت تک باقی رہے گا۔ دنیا کے سارے دانشور، سارے اسکالر فاصلے کو پاٹ نہ سکیں گے۔ پھر بھی اثاثہ قابلِ ذکر تو ہونا چاہیے۔

اس ذمن میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے سیرتی ادب سے ان نمبروں کو سجا ڈالا۔ پھر بھی کسر ایک آنچ کی نہیں، ہزار آنچ کی رہ گئی۔ شاید کروڑوں، اربوں آنچوں کی! کیا کروں؟ بڑی بے بسی ہے۔

غرض دنیا کے جتنے خزانے تھے وہ حاضر کر دیے پھر بھی سیرت کا کوئی ایک گوشہ بھی تو پُوری طرح منوّر نہ ہوا۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ جتنا کچھ یہ ہے اتنا کچھ اس سے پہلے موجود نہ تھا۔

آرزوئیں بہت بے قابو ہوتی ہیں۔ یوسفؑ کی خریداری کو ایک بڑھیا بھی تو نکلی تھی، وہ یوسفؑ کو خرید تو نہ سکی۔ مگر ارمانوں کو سجاوٹ دے گئی!

مجھے راستہ دکھا گئی!

محمد طفیل

۱۲۰

جنوری ۱۹۸۵ء

رسولؐ نمبر جلد دوازدہم

میں اپنی موج سے کام کر رہا تھا۔ انسانی کوششوں کو لوگ سراہ رہے تھے، ہر طرف تحسین کے کلمات سنائی دیتے تھے۔ میں مطمئن تھا.

س کی خبر ایک فرشتے کو ہو گئی۔ وہ ہونکتا ہوا میرے پاس آیا، عجیب سی گفتگو کرنے لگا:

"سنو، سنو!"

"کیا؟"

"تو نے جیسا کام کیا ہے ویسا نہ کسی قطب نے کیا نہ کسی ابدال نے۔"

میں نے کہا: "کفر نہ بکو، کفر نہ بکو!"

وہ بولا: "کفر کی بات نہیں، سچ کہہ رہا ہوں۔"

انسان ناسمجھ ہے، بہلاووں میں آنے والا، اس لیے کُدبُدی سی لگ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے پوچھا: "تو کون ہے؟"

"میں دنیا میں راست گوئی کی علامت ہوں۔"

"تو کیسا راست گو ہے، جو مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے؟"

"میں نے ہمیشہ حوّازادوں کی رہنمائی کا فرض ادا کیا ہے!"

اگر تو رہنما ہے تو پھر منزل کون کھوٹی کرتا ہے؟"

میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے دنیا کا علم گھول کے پی رکھا ہے۔ اسی بنیاد پر کہہ رہا تھا: "نہ کسی قطب نے ایسا کام کیا نہ کسی ابدال نے!"

ایک دم میری مدد کو یزداں پہنچا، اس نے کہا: "اپنے کان بند کر لو اور اسے دیکھو۔"

فرشتہ غائب، آمنے سامنے میں اور آدم! وہ بھی خجل، میں بھی خجل!!

سیرت پر یہ میری آخری جلد ہے، آئیے قرآن کی بھی آخری سورت پڑھیں:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۝ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝

(آپ کہئے کہ میں انسانوں کے پروردگار کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں، پیچھے ہٹ جانے والے وسوسے ڈالنے والے (شیطان) کے شر سے۔ (وہی) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔)

محمد طفیل

۱۳۰

رسولؐ نمبر جلد سیزدہم

جنوری ۱۹۸۵ء

میں موت سے ڈرتا تھا۔

میں اپنے علمی، تاریخی اور ادبی کاموں سے مطمئن تھا۔ جنہیں میں نے ۴۴ برس تک عبادت سمجھ کر ادا کیا تھا۔ ۴۴ برس کے مہینوں کا حساب کر لیجئے، ہفتوں کا حساب کر لیجئے۔ دنوں کا حساب کر لیجئے۔ منٹوں کا حساب کر لیجئے۔ وہ سارے منٹ، وہ سارے دن، وہ سارے ہفتے، وہ سارے مہینے، وہ سارے سال، میرے اسی عشق میں گزرے۔ مگر دل پوری طرح مطمئن نہ تھا، جیسے کوئی کمی ہو۔ ایک دھڑکا سا موجود تھا!

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ○ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ○
قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (سورہ مومنون)

[(گنہگاروں سے) ارشاد ہوگا (کہ اچھا یہ بتلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین پر رہے ہو گے ○ وہ جواب دیں گے ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے (اور سچ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے پوچھ لیجئے (یعنی فرشتوں سے) ○ ارشاد ہوگا کہ تم (دنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے لیکن کیا خوب ہوتا کہ تم یہ بات دنیا میں سمجھتے ہوتے ○]

بے شک اوّل دن، میرے سامنے قرآن کی یہ آیت نہ تھی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا مگر یہ احساس ضرور تھا کہ یہ جو زندگی ہے جو اللہ کی دی ہوئی ہے، یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس کا کوئی مفہوم ہے!

وہ مفہوم کیا ہے؟ وہ مقصد کیا ہے؟

اُسے پانے کے لیے میں ۴۴ برس سے سفر میں ہوں۔ جب تک حالتِ سفر میں رہوں گا، مجھے موت بھی ڈرا نہ سکے گی۔

میرے نزدیک صرف سجدہ ریزی کو عبادت نہیں گنا جائے گا۔ وہ ایک فرض ہے جو ادا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک عبادت اُسے گردانا جائیگا جس سے خلقِ خدا کو فیض پہنچا ہو، جو فرض کی طرح دوسرا فرض ہو!

بیشک میری عمرِ مستعار کے منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا حساب کر لیجئے۔ میں حالت سجدۂ مسلسل میں ہوں!

محمد طفیل

۱۳۱

(میر تقی میر ۳)

اگست ۱۹۸۳ء

جب میں میر کو ملوں گا اور میری ملاقات اسداللہ خاں غالبؔ، میر تقی میرؔ اور میر ببر علی انیسؔ سے ہوگی تو وہ مجھے خوب گھٹ کے گلے ملیں گے
"ارے طفیل صاحب!"

"قبلہ میر صاحب، قبلہ اسد اللہ خان صاحب، قبلہ میر انیس صاحب! ـــ بندہ بھی ملاقات کا متمنی تھا۔"

"ہم بھی مشتاق تھے۔"

غالب کو ملاقات کا اشتیاق اس لیے تھا کہ میں نے اُن کی وہ بیاض ڈھونڈھ ڈھانڈھ کے چھاپ دی تھی، جو کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں گم ہو گئی تھی۔

میر تقی میر مجھے اس لیے یاد کرتے تھے کہ میں نے اُن کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام چھاپا جو کہ صدیوں سے اہلِ فکر کے سامنے نہ تھا۔ پھر میں نے اُن کی ۲۲۵ غیر مطبوعہ فارسی غزلیں اہلِ علم تک پہنچائیں۔

میر انیس کے دل میں میری چاہت اس لیے تھی کہ میں نے ان کے بہت سے مرثیے پہلی بار پیش کیے تھے۔

یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں ناخدائے سخن تھے۔ ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے۔ ایک ایک شعر پہ جان دیتے تھے۔ مگر ہُوا یہ کہ سبھوں کے ہزاروں اشعار آنکھوں سے اوجھل تھے۔ قسامِ ازل نے چھین رکھے تھے۔

مَیں جو ادب کا جویا ہُوں، نگری نگری گھوما، راہِ طلب میں دوستوں نے دستگیری کی۔ غالب، میر اور انیس کے نوادرات جھولی میں ڈال دیئے۔

لوگ صدیوں سے سو رہے تھے۔ مگر بعد میں آنے والا ایک شخص جاگ رہا تھا۔

بالآخر وہ ایک شخص بھی سو جائے گا۔

بے شک مقدر خود بنایا جاتا ہے۔ مگر مقدر کا ایک خانہ قدرت خود پُر کرتی ہے۔

محمد طفیل

۱۳۲

سالنامہ

جون ۱۹۸۵ء

مَیں اپنی کتھا لکھتا ہُوں۔

کتھا تو لکھ رکھی ہے مگر آپ کو ورق اُلٹنے پڑیں گے۔ وہ بھی ایک دو نہیں بلکہ نصف لاکھ سے زیادہ صفحات۔ اُن میں لگن، تڑپ اور جان کنی کے کئی مراحل سامنے آئیں گے!

یہ دیکھیں ـــــ جب میں نے سیرت ابنِ اسحاق کو تیرہ سو برس کے بعد پہلی بار اردو میں پیش کیا تو میرا سینہ تن گیا تھا۔ وہ تاریخی دستاویز جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ضائع ہو چکی ہے، اس کا منصۂ شہود پر آ جانا ایک اَن ہونی بات کا ہو جانا تھا۔ جیسے خدا کا آسمان سے زمین پر اُترآنا۔

یہ پڑھیں ـــــ یہ غالب کی وہ بیاض ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں گم ہو گئی تھی اُسے بھی پہلی بار نقوش کے صفحات پر ہی پڑھا گیا۔ اُس کی دریافت بھی، ایک دوسرے "امریکہ" کی دریافت تھی۔

یہ دیکھیں ـــــ آپ کو میر تقی میر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ملے گا۔ اس کی اشاعت بھی کسی عجوبے سے کم نہ تھی۔ میر اور غالب دونوں ایک دوسرے سے بڑے شاعر ہیں۔

یہ پڑھیں ——— آپ کو میر انیس کے متعدد غیر مطبوعہ مرثیے ملیں گے۔ ایک طبقہ کے مطابق تو انیس جملہ شاعروں سے بڑا شاعر ہے۔ مگر اتنا تو ہے کہ اردو شاعری کو دوسرا انیس نہ ملا۔

یہ دیکھیں ——— آپ کو علامہ اقبال کی بھی متعدد غیر مطبوعہ تحریریں ملیں گی۔ جبکہ ایک پورا نمبر غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل چھپ بھی رہا ہے۔ اقبال جو اس صدی کا بڑا شاعر ہے وہ اور بھی بڑا نظر آئے گا۔

یہ پڑھیں ——— پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک یہ دیکھ اور پڑھ لیجئے کہ عصری ادب کو نقوش نے کتنی اہمیت دی۔ وہ کون سا بڑا ادیب ہے جو اس میں نہیں چھپا! وہ کون سی بڑی تخلیق ہے جو اس میں نہیں چھپی! تنقید اور تحقیق کو معتبر بنایا۔ متعدد غیر فانی تخلیقات چھاپیں۔

یہ دیکھیں ——— اس میں آپ کو جملہ مشاہیر کے غیر مطبوعہ شہ پارے ملیں گے۔ مثلاً سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، داغ دہلوی، منشی پریم چند، فانی بدایونی، امیر مینائی، مولانا گرامی، محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ریاض خیر آبادی، مولانا حبیب الرحمن شروانی، عبدالرحمن بجنوری، مہدی الافادی، اکبر الہ آبادی، شرر لکھنوی، قاضی عبدالغفار، نواب بہادر یار جنگ، مولانا محمود حسن، مولانا انور شاہ، سر عبدالقادر، سجاد حیدر یلدرم، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مودودی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، غرض کسی بڑے ادیب، شاعر اور عالم کا نام ذہن میں لائیے اس کی تخلیق (غیر مطبوعہ) کو نقوش میں دیکھ لیجیے۔ کیا یہ اعزاز کسی دوسرے کو بھی حاصل ہوا؟ ادب کا قاری اتنا ضرور سوچے!

میں تو اپنے حسابوں ادب کے خزانے میں ایک ورق جمع کرانے کو بھی بڑی بات سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ اتنا کچھ۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ادب میں خدائی کا دعویٰ کر دیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے تو بڑے خدا سے ڈر لگتا ہے۔

محمد طفیل

۱۳۰

جب وہ وقت آیا کہ میری کاوشوں کی پذیرائی ہونے لگی، حاکم وقت کو بھی یہ خیال گزرا کہ یہ شخص جو سر نیہوڑائے ۲۵ برس سے ادبی جہاد میں مصروف ہے۔ اس کے بارے میں یہ تو سوچ لیا جائے، یہ تو دیکھ لیا جائے کہ وہ کس حال میں ہے!

چنانچہ حکومت کا ایک اہم کارندہ میرے پاس پہنچا اور یہ مژدہ سنایا کہ اب کے حکومت آپ کی خدمات کا اعتراف کرے گی اور آپ کو اعزاز سے نوازے گی۔

میں نے جواب میں کہا جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں وہاں چند سال اور گزر جانے دیجئے۔ ہم تو انعام اپنے مولا سے لیں گے!

وہ سابقہ حکومتوں کی عدم توجہی پر حیران ہوا اور یہ کہا اب کے مجھے بطورِ خاص بھیجا گیا ہے کہ میں آپ سے اس امر کی اجازت لوں کہ اگر انعام دیا جائے تو آپ اسے قبول کریں گے!

میں چپ رہا۔

اُدھر یہ خواہش کہ ہاں کر دی جائے۔

وہ دن آیا کہ مجھے اعزاز کے لیے اسلام آباد طلب کیا گیا۔

میں پہنچا، ہرچند کہ میری کارگزاریاں متعدد تھیں۔ اس کے باوجود یہ خیال آیا کہ یہ انعام ہے یہ میرا حق نہیں ہے۔ جب انعام اور حق کے درمیان فیصلے کا وقت آیا تو میری ماں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا دل مطمئن ہونے لگا۔ انعام کے لیے میرا نام پکارا جا رہا تھا اور میں والدین کے ایصالِ ثواب کی خاطر سورۂ فاتحہ پڑھ رہا تھا، بار بار پڑھ رہا تھا۔

اور جب یہ کہا گیا: محمد طفیل کو ان کی ادبی کارگزاریوں کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز کا اعزاز دیا جا رہا ہے۔ صدرِ مملکت میرے گلے میں ستارۂ امتیاز کا ہار ڈال رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا:

اے اماں! تیری دعائیں قبول ہو گئیں، تیری دعائیں قبول ہو گئیں۔

میں بھی رو دیا۔

والدہ بھی رو دیں

محمد طفیل

محمد طفیل اور نقوش

عکس اور شخص

(طلوع کی روشنی میں)

عبد القوی دسنوی

محمد طفیل کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ نہایت شریف تھے نیک دل تھے، ہمدرد تھے، مخلص تھے، نفیس تھے، سنجیدہ تھے، کم سخن تھے، پروقار تھے، مجسم انکسار تھے، جذباتی تھے، انفرادیت پسند تھے، محنتی تھے، باہمت تھے، بلند حوصلہ تھے خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے تھے۔

یا صاحب نظر تھے، سخن فہم تھے، علم دوست تھے، اچھے مدیر تھے، منفرد خاکہ نگار تھے، صاحب اسلوب تھے۔

یا ضدی تھے، خود سر تھے، خود پرست تھے۔

یا اور بہت کچھ تھے۔

لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی اب محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات اس محمد طفیل سے نہیں ہوئی جو ہمارے دل میں گھر کیے ہوئے ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ اُردو کے منفرد نثر نگار تھے یا محترم خاکہ نگار تھے، انہوں نے اُردو کی اس صنف کو سجایا، سنوارا، اس کے وقار کو عظمت عطا کی اور اس کی عظمت کو پُر وقار بنایا۔ انہوں نے اس کے فن کو اپنے رنگ و آہنگ، افکار و خیالات، انداز و اسلوب زبان و بیان، کردار و گفتار سے منفرد بنایا، پُرکشش کر دیا۔ اُن کی زبان کی سادگی اظہار کی برجستگی اور بے باکی، ہر قسم کی مرعوبیت سے دوری، دل کی بے نیازی، ذہن کی پاکی اور صداقت پسندی نے انھیں معتبر اور محترم بنا دیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہنے کے عادی تھے۔ وہ اپنی زبان و بیان کی مہارت سے بڑی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کی قدرت رکھتے تھے، جہاں وہ طنز کے تیر سے نیم بسمل بنا کر تڑپا دیتے تھے وہاں مسکراہٹ کی پھلجھڑی سے فضا اور ماحول کو شگفتہ، گلریز، عطر بیز، شگوفہ زار اور باغ و بہار بنا دیتے تھے۔ اُن کی نثر میں سادگی مگر دلکشی پائی جاتی ہے ہلکے پھلکے جملوں میں حیات کی تفسیر چھپی دکھائی دیتی ہے عبرت کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے صداقت کی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

انہوں نے سفر نامہ بھی لکھا اور چھوٹے چھوٹے خاکوں سے اسے آراستہ بھی کیا اور طویل شخصیت نگاری بھی کی جس کو ان کی تحریر کی سادگی اور شگفتگی نے نہایت پسندیدہ بنا دیا۔ بلاشبہ اردو میں خاکہ نگاری کو انہوں نے کئی کتابوں سے مالا مال کیا اور اس کی عظمت اور اہمیت کو واضح کیا۔

یقیناً یہ سب باتیں درست ہیں لیکن مجھے اجازت دیجئے ایک بار پھر میں کہوں کہ ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے آگاہی کے باوجود اب بھی پورے محمد طفیل سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی اگرچہ ان کی شخصیت پر پڑے کچھ پردے ضرور اُٹھے تھے! اس لئے کہ ان کی

شخصیت کا بڑا اور اہم حصہ نقوش کے عام شماروں اور خاص نمبروں کے اوراق میں پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی ہے۔ جو "طلوع" اور "اس شمارے میں" کی تحریروں سے بھی جھلکتا ہے اور محمد طفیل کی شخصیت کو مکمل کرتا ہے۔

محمد طفیل سے میری پہلی ملاقات نقوش کے ذریعہ دسنہ لائبریری میں ہوئی۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ دسنہ میرا وطن پہلے ضلع عظیم آباد کا ایک مشہور و معروف گاؤں تھا اب ضلع نالندہ کی ایک اجڑتی ہوئی بستی ہے جو تعلیم، مخصوص تہذیب، منفرد مزاج، ادب نوازی روشن خیالی، اسلام دوستی اور آپس میں اتحاد و اتفاق کی وجہ سے ایک زمانہ میں بڑی مشہور و معروف رہی ہے۔ یہاں ۱۸۹۹ء میں ایک کتب خانہ کی بنیاد پڑی تھی جو رفتہ رفتہ ہندوستان کے اہم اردو کتب خانوں میں شمار کی جانے لگی تھی۔

نوجوان جب چھٹیوں میں گاؤں میں آتے تو اس کتب خانہ میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارتے۔ یہیں نقوش منفرد شکل و صورت، مخصوص رنگ و روپ میں نظر آیا تھا، اور سب کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا، نوجوانوں میں بہت دنوں تک اس کا ذکر رہا تھا۔ اسکی مشمولات پر تبصرہ ہوتا رہا تھا، اسکے افسانوں اور نظموں پر اظہارِ خیال کیا جاتا رہا تھا۔ خاص طور سے نئے ذہن کو اس نے بہت متاثر کیا تھا۔ پھر جس طرح ترقی پسند ہونا ایک فیشن ہو گیا تھا جس سے متعلق ہو کر نوجوان اپنے آپ کو عام لوگوں کے مقابلہ میں نمایاں، پڑھا لکھا ادب کا رازداں اور کاروبار سیاست کا مرد میدان سمجھتا تھا۔ اسی طرح نوجوانوں کا پڑھا لکھا طبقہ نقوش کو اپنے پاس رکھ کر اپنے آپ کو سربلند محسوس کرتا تھا اس کی بات کر کے دوسروں پر وہ اپنا رعب ڈالتا تھا اور اس کی مشمولات پر رائے زنی کر کے اپنی بڑائی کا سکہ بٹھاتا تھا، اور اپنا وقار بناتا تھا۔

بمبئی پہنچا اور شعور زیادہ بیدار ہوا تو نقوش سے قربت اسطرح بڑھی کہ بھائی صاحب پروفیسر عبدالمجی رضا اس کے شمارے خرید کر لایا کرتے تھے یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے اس زمانے میں بمبئی میں عام طور سے نقوش کے پرچے مل جایا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کا نقوش جب سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اب اس کے مدیر وقار عظیم ہیں۔ احمد ندیم اور ہاجرہ مسرور کی طرح یہ نام بھی اجنبی نہ تھا۔ وقار عظیم نے اس کی اشاعت کی تاخیر پر افسوس کرتے ہوئے اسے سالنامہ قرار دیا تھا۔ اسی نقوش میں میری ہوش و حواس کی آنکھوں نے محمد طفیل کو تصویر کی اوٹ سے جھانکتے دیکھا تھا۔

> "دبلے پتلے، سر پر ٹوپی لگائے، بدن پر شیروانی سجائے، جیب میں ایک عدد قلم رکھے، شرمائے سے زیر لب مسکرائے ہوئے جگر مراد آبادی کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ ایک اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں کو، اردو کے پودے کی جڑوں کو طاقت پہنچانے کے لیے نچوڑ چکا تھا، دوسرا اپنی تمام صلاحیتوں اور وسائل کو اس پر قربان کر دینے کے لیے آمادہ تھا۔"

"عرض ناشر" ملاحظہ کیجیے اس وقت جبکہ محمد طفیل نقوش کے محض ناشر تھے اُس کے لیے کیا کیا عزائم رکھتے تھے وہ لکھتے ہیں:

> "نقوش میری آرزوؤں کا ماحصل آپ کے سامنے ہے" ممکن ہے آپ اسے اِدھر اُدھر سے

> الٹ پلٹ کر یہ کہہ دیں کہ — "ہاں اچھا ہی پرچہ ہے"۔ آپ کے اس خیال سے قطعِ نظر مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں نے ہمیشہ "نقوش" کے ہر نمبر کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے کیونکہ شروع سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ اُردو ادب میں معیار کے اعتبار سے نقوش وہ بلند پایہ مقام پیدا کرے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو اور اُسے حال کے علاوہ مستقبل میں بھی بھلایا نہ جا سکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اسے اپنی طرف سے اب تک اسی دلآویز خواہش کے ماتحت شائع کر رہا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ نقوش کے ادبی معیار اور نکھار کا تنہا ذمہ دار مدیر اور صرف مدیر ہی ہے لیکن ان کے معاون کی حیثیت سے جتنی کاوش اور جد و جہد مجھے بھی کرنا پڑتی ہے اُسے کچھ میرا ہی دل جانتا ہے، ایسی مشترکہ مساعی کا نچوڑ آپ کے سامنے آتا ہے جب کہیں جا کر آپ صرف اتنا ہی کہہ پاتے ہیں کہ —
>
> "ہاں اچھا ہی پرچہ ہے"۔

محمد طفیل پہلے خوش نویس تھے پھر پبلشر بنے۔ اور پھر کامیاب ترین، باوقار مدیر ثابت ہوئے جس کی عظمت کا سب نے اعتراف کیا۔ جب مارچ ۱۹۴۸ء میں نقوش احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں نکلا تو وہ خود پس پردہ محض پبلشر بنے رہے لیکن یہ سچ ہے کہ وہ پبلشر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے، چنانچہ جب اس کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو احمد ندیم قاسمی کے یہ تاثرات تھے:

> "جب اس کا پرچہ چھپ کر آیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ طفیل صاحب نے تو اپنی شخصیت کے بعض پہلو مجھ سے چھپا رکھے ہیں، بات یہ ہے کہ ہاجرہ بہن اور میں جب نقوش کا پہلا شمارہ مرتب کرنے بیٹھے تو اندر سے خوفزدہ تھے کہ یہ ناتجربہ کار اور سادہ مزاج نوجوان کہیں اتنی محنت سے مرتب کئے ہوئے مضامین نظم و نثر کو ایسے بھونڈے انداز میں نہ شائع کر بیٹھے کہ ہم دونوں کی محنت پر پانی پھر جائے۔ مگر جب رسالہ چھپا تو اس کا صوری حسن، اس انتہا پر تھا کہ پاکستان و ہند کے ادبی حلقے حسن و سادگی کے اس متوازن امتزاج پر دم بخود رہ گئے۔ حیرت ہے کہ طفیل صاحب نے اپنا یہ سلیقہ مجھ سے کیسے چھپائے رکھا جب کہ ہم ایک دوسرے کے مزاجوں کے بارے میں ایک ایک تفصیل سے باخبر ہونے کے دعویدار تھے۔ طفیل صاحب کی پوری شخصیت تو جب بھی کھل کر میرے سامنے نہ آئی، مگر ان دنوں مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ اس نوجوان کو اگر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مناسب حالات میسر آئے تو کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کے میدان میں تو وہ اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑ دے گا۔"[1]

---

[1] احمد ندیم قاسمی: طفیل صاحب: محمد نقوش مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ص ۴۸

نقوش کے ابھی دس شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ محمد طفیل نے محسوس کیا کہ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کے نظریات کے ساتھ نقوش کا جاری رہنا اور ترقی کرنا ممکن نہیں، تو انھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے درمیان، ان دونوں کی ادارت سے نقوش کو الگ کر دیا اور کسی قسم کی تلخی پیدا نہیں ہونے دی بلکہ بعد میں بھی وہی دوستی باقی رکھی جو پہلے تھی۔ دوستی کے اس رشتہ کو ایسے نازک موقع پر بھی قائم رہنے کا سلیقہ محمد طفیل کو ان کی سادگی اور سچائی کے باوجود خوب آتا تھا، وہ موقع کی نزاکت کو بھی سمجھتے تھے اور دوستی کی قدر و قیمت کو بھی جانتے تھے۔

پانچ شمارے وقار عظیم کی ادارت میں نکلے لیکن محمد طفیل کسی سبب ان سے بھی مطمئن نہیں ہو سکے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۱ء میں خود اس کے مدیر بن گئے تو احمد ندیم قاسمی کو نقوش کے مستقبل سے متعلق تشویش تھی، ان کا بیان ہے:

> "مجھے یہ ماننے میں تامل تھا کہ نقوش کے ناشر محمد طفیل اب خود ہی نقوش کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ جب یہ طے پا گیا کہ یہی محمد طفیل "نقوش" کے مدیر ہیں۔ تو سچی بات ہے مجھے نقوش کے مستقبل کے سلسلے میں تشویش لاحق ہو گئی"[1]

تنہا احمد ندیم قاسمی نہیں تھے جو نقوش کے مستقبل کے سلسلے میں مشکوک تھے بلکہ اکثر حضرات یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دیتے تھے کہ خوش نویسی کرتے کرتے ادارت کرنے کی ہمت کرنا آسان بات نہیں محمد طفیل اس کی ذمہ داری کو سنبھال نہیں سکتے۔ کچھ طنز و استہزا سے بھی کام لیتے تھے۔ ظ انصاری لکھتے ہیں:

> "۱۹۵۱ء ختم ہو رہا تھا جب اسی رسالے کے خوش نویس اور مینیجر نے جسے آنے جانے والے صرف کاتب سمجھتے تھے یہ جوا اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور مجبوراً رکھ لیا کیونکہ کوئی اہلِ قلم بلا معاوضہ آئے دن یہ دردسر پالنے کا روادار نہ تھا۔
>
> نقوش کے جب دو چار شمارے محمد طفیل کی برائے نام ادارت میں نکلے تو رسالے اور صاحبِ رسالہ دونوں پہ پھبتیاں کسی گئیں۔ انھیں بتائیے کہ رسالے کا اڈیٹر بھی ہوا کرتا ہے۔ ذرا بھئی دیکھنا یہ طفیل ہے یا طفیلی؟ بھائی طفیل کس کے طفیل میں ایڈیٹر بنے پھرتے ہو۔ ایڈیٹری کا شوق ہے کتابت کی آمدنی بھی ہاتھ سے جائے گی۔
>
> یہ مضبوط رگ پٹھے کا خوش ذوق خوش نویس اپنی حدود سے واقف تھا، اہلِ قلم کی ساری پھبتیاں سہہ گیا۔ کسی کو گستاخی یا بدزبانی سے جواب نہ دیا۔

یہ سچ ہے بہت جلد لوگوں نے محسوس کیا کہ اس میدان میں طفیل نہایت خاموشی کے ساتھ نہایت شاندار فتوحات حاصل کر رہے ہیں اور اردو ادب کو وہ سب کچھ دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں جو دوسرے کسی نے نہیں دیئے۔ انتظار حسین نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

---

[1] احمد ندیم قاسمی طفیل صاحب: محمد نقوش مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ص ۵۰

> "جب وقار صاحب نے ادارت چھوڑی تو پھر خود طفیل صاحب نے ادارت سنبھالی اس وقت ادیبوں نے بہت انگلیاں اٹھائیں کہ بھلا محمد طفیل ادبی رسالہ کی ایڈیٹری کریں گے مگر طفیل صاحب نے تو ایسی ایڈیٹری کی کہ پھر لوگ پچھلے مدیروں کو بھول ہی گئے اور ایک اعتبار سے صحیح بھولے نقوش اپنے ابتدائی دور میں تو بالکل انجمن ترقی پسند مصنفین کا اشتہار نظر آتا تھا طفیل صاحب کی ادارت میں آ کر وہ ہمعصر ادیب کا رسالہ بنا۔[1]"

محمد طفیل مرحوم نے اپریل ۱۹۵۱ء سے جنوری ۱۹۸۵ء تک نقوش کے غالباً ۱۳۲ عام شماروں، خاص نمبروں، سالناموں اور اہم نمبروں کو نصف لاکھ سے زیادہ صفحات پر پیش کیا۔ بلاشبہ ان کے عام نمبر بھی اردو کے بہت سے دوسرے اہم رسائل کے خاص نمبروں سے بہتر ہوتے رہے لیکن ان کے خاص نمبر اور سالنامے ہمیشہ بڑی اہمیت اور قدر و قیمت کے سمجھے جاتے رہے ہیں البتہ نقوش کے وہ اہم نمبر جو محمد طفیل نے اپنی خاص دلچسپی اور لگن سے مختلف شخصیات اور موضوعات سے متعلق پیش کئے ہیں ویسے موضوعات، مضامین، ترتیب و تزئین کے لحاظ سے اُردو کیا میرا تو خیال ہے بہت سی دوسری زبانیں بھی آج تک نہیں پیش کر سکی ہیں۔ ان میں خاص طور سے شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، غالب نمبر، میر تقی میر نمبر، اقبال نمبر، انیس نمبر، لاہور نمبر اور ادبی معرکے نمبر تو اپنا جواب نہیں رکھتے، ان سے اُردو کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے، اُن سے اُردو تحقیق و تنقید کی راہیں کھلی ہیں، کام کرنے والوں کے سامنے نئے موضوعات آئے ہیں، تنقید کرنے والوں کے لئے نئے میدان جولان گاہ بنے ہیں۔ مطالعہ کرنے والوں کے پیش نظر علم و عرفان، فکر و فن اور نئے پرانے تجربوں کی ایک دنیا آ گئی ہے۔

طفیل صاحب یہ سب تنہا کس طرح کر سکے ہیں، اتنا سارا مواد کس طرح حاصل کر سکے اور اُن کی ترتیب و تزئین کے لیے وقت کہاں سے لا سکے ہیں، حوصلہ کس طرح پیدا کر سکے ہیں اور انھیں نہایت سلیقہ کے ساتھ حسن ظاہری اور معنوی سے آراستہ کر کے کس طرح پیش کر سکے ہیں۔ اِن پر غور تو کیا جا سکتا ہے، لیکن انھیں دیکھ کر جو حیرت پیدا ہوتی ہے اس میں کمی نہیں لائی جا سکتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید انھیں الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا تھا یا پھر انہوں نے کسی جن کو اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا جس کی مدد سے وہ راہ کی تمام مشکلات پر نہایت آسانی سے قابو پا لیتے تھے اور نہ کبھی تھکتے تھے نہ ہمت ہارتے تھے بلکہ ہمیشہ تازہ دم رہتے تھے۔

لیکن اُردو کے لیے یا اُردو والوں کے لئے اتنا کچھ کرنے کے باوجود کبھی وہ اترائے نہیں نہ کسی قسم کی فوقیت کا اظہار کیا نہ معاوضہ چاہا نہ ہی کسی قسم کی بے جا داد و تحسین کے متمنی رہے۔ بلکہ اپنے کام سے غرض رکھی، اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے اور منزل کو پانے کے لئے فکر مند رہے اور بس۔

انہوں نے نقوش کی ادارت سنبھالی تو کچھ سوچ سمجھ کر سنبھالی بلکہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر سنبھالی اور اسی کے ہو گئے، اسی میں کھو گئے کہ

---

[1] انتظار حسین : محمد طفیل مرتبہ سید معین الرحمٰن ص ۸۷

پھر ان کی اپنی شخصیت نقوش کے بغیر نامکمل بن گئی۔ نقوش کے بغیر ان کا تصور بے معنی ہو کر رہ گیا۔ خود نقوش کا تصور اُن کے بغیر مُہمل لگنے لگا۔

نقوش کے ہر شمارے کی ابتدا سے تمت تک سرورق سے پشت ورق تک محمد طفیل کی سادگی، پاکیزگی، سچائی، خدمت گزاری اور فنکاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس کا ہر ورق محمد طفیل کی پہچان بن گیا ہے اس کی ہر سطر طفیل کا ترجمان ظاہر ہوتی ہے۔

نقوش کی ایک خوبی یہ بھی رہی ہے کہ اچھی ترتیب، قیمتی مواد، بہتر پیشکش کے ساتھ "طلوع" کی تحریریں یا "اس شمارے میں" کی باتیں محمد طفیل کی لکھی ہوتی تھیں یہ تحریریں اگرچہ مختصر اور نہایت عام فہم زبان میں ہیں لیکن سادگی اور پرکاری کی مظہر رہی ہیں۔

محمد طفیل کم گو تھے تحریر میں بھی مختصر نویسی کو پسند کرتے تھے۔ چند سادہ جملوں میں اپنی بات، نقوش کی بات اور وہ سب کچھ کہہ جاتے تھے جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اداریہ کو "طلوع" کا نام دے کر اداریہ نگاری میں اپنی انفرادیت اور جدّت شامل کر دی بلکہ اداریہ نگاری کو انھوں نے نیا انداز، نیا مزاج اور نئے حسن سے آراستہ کیا۔ اور ان تمام بے مطلب دعوؤں اور فضول باتوں سے پرہیز کرنے کی کوشش کی جن سے اداریئے طویل تو ہو جاتے تھے لیکن قاری کے لیے بوجھل ثابت ہوتے تھے۔ بار بار ایک بات کا اظہار، مدیر کی بے بسی اور بے کسی کی کہانی، قارئین کی بے حسی اور بے توجہی کی باتیں، اُردو کا دکھڑا، اُردو والوں کی بے عملی، اڈیٹر کی پریشانیوں اور الجھنوں کی باتیں، کون کہاں تک سنے اور کیوں سنے۔ محمد طفیل نے ان سب سے دور رہنے کی کوشش کی، انہوں نے بس کام کی باتوں سے کام رکھا لیکن انداز ایسا اختیار کیا کہ ان کے چند جملے طویل اداریوں پر بھاری پڑنے لگے۔ نقوش، محمد طفیل کی ادارت میں پہلے ہی شمارے سے اعتدال کی راہ پر چل نکلا، اس نے اپنا کوئی مخصوص رنگ نہیں انتخاب کیا، کسی خاص طرزِ فکر کو نہیں اپنایا، کسی جماعت سے متعلق نہیں ہوا، اگر متعلق ہوا تو صرف اُردو سے ہوا، کسی کا ہوا تو صرف اُردو کا ہوا، یہی طفیل صاحب کی سلامت روی تھی، اُن کے جذبے کی صداقت، مقصد سے والہانہ تعلق اور انتھک محنت نے نقوش کو بہت جلد کامیابیوں کی منزلوں سے ہم کنار کر دیا۔ نقوش ایک پرچہ کا نام نہیں رہا تھا ایک مقصد کا نام تھا ایک نصب العین کی پہچان تھا۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں محمد طفیل نے شخصیات نمبر پیش کیا تو ایک دنیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نقوش سے پہلے اُردو میں کسی نے اس طرح کا نمبر نکالنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس میں سرسید سے لے کر شوکت تھانوی تک تقریباً ۸۲ اشخاص کے PERSONAL SKETCHES ہیں۔ مرحومین کے بھی ہیں زندوں کے بھی ہیں۔ یہ کام بڑا مشکل تھا لیکن محمد طفیل نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ انھیں لوگوں سے یہ مضامین لکھوائے یا حاصل کئے، جو اُن حضرات سے ذاتی طور پر واقف تھے اور دلچسپی رکھتے تھے، اس لئے یہ سارے مضامین اہم بھی رہے اور دلچسپ بھی ثابت ہوئے۔

اس نمبر میں چار مضامین اردو مراکز: لاہور، دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد سے متعلق ہیں جو اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ اُن میں اُن علاقوں کی بعض ایسی شخصیتوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں جن کا ذکر عام طور سے نہیں ملتا۔ ابتدا میں چار درجن ادیبوں کی تصاویر بھی ہیں، جن کی وجہ سے اس نمبر کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ سات سو صفحات کے اس ضخیم نمبر کا طلوع لکھتے ہوئے محمد طفیل نے نہایت سادگی کے ساتھ اپنے اِن سادہ لیکن حقیقت پر مبنی خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "آخر میں مجھے آپ سے پھر یہی کہنا ہے کہ میری کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں جن شخصیتوں پر مضامین نہیں چھپ سکے اُن سے تو معذرت ضروری ہی تھی لیکن میری سادگی ملاحظہ ہو کہ میں اُن سے بھی معذرت خواہ ہوں جن کے تذکرے اس نمبر کی زینت ہیں، بہت ممکن ہے کسی کو اپنا تذکرہ نہ دیکھ کر اور کسی کو دیکھ کر افسوس ہوا ہو۔"

شخصیات نمبر ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں آیا، جس میں ۴۸ مضامین شخصیتوں سے متعلق ہیں اور چار ادبی مراکز حیدر آباد، علی گڑھ، بہار اور سرحد کا تفصیلی جائزہ ہے، ۳۲ مصنفین کی تصاویر بھی شامل ہیں اور ۸۱۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مختصر "طلوع" میں شخصیات نمبر تین کا اعلان ہے لیکن یہ نمبر کسی سبب شائع نہ ہو سکا البتہ مکاتیب نمبر کے اعلان میں کامیابی ہوئی۔ لیکن ہم اُردو والوں کے ساتھ جیسا ہوتا چلا آیا ہے نقوش کی کامیابیوں نے جہاں طفیل کے چاہنے والوں اور قدر دانوں کی تعداد بڑھا دی ان کے بعض دوستوں میں حسد کا جذبہ پیدا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقوش کی ادارت کو ابھی پانچ برس ہی گزرے تھے جس میں عام شماروں کے علاوہ تین اہم افسانہ نمبر، غزل نمبر اور منٹو نمبر شائع ہوئے تھے حاسدین کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ گیا، چنانچہ جیسے ہی دسمبر ۱۹۵۵ء میں افسانہ نمبر منظر عام پر آیا حاسدوں نے انتقام لینے کا موقع تلاش کر لیا، اور محمد طفیل کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا، ڈر تھا کہ کہیں نقوش اور اس کے اڈیٹر کو زیادہ نقصان نہ پہنچ جائے لیکن محمد طفیل کے خلوص؛ ان کی سچائی اور خدا پرستی نے انھیں اس بلائے ناگہانی سے محفوظ رکھا، اِس سلسلے میں انہوں نے نقوش مارچ ۱۹۵۶ء کے "طلوع" میں تحریر کیا ہے:

> "افسانہ نمبر کی ضخامت اور قیمت کو ذہن میں رکھ کر خیال یہ تھا کہ ادب کی خدمت کے شوق میں مارے جائیں گے بات تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ پوری ہوتے رہ گئی قصہ یہ ہوا کہ سجاد ظہیر کے افسانہ (نیند نہیں آتی) میں چند فقرے چھپ گئے تھے جو واقعی کسی صورت میں بھی نہیں چھپنے چاہئیں تھے۔ سہواً جو کچھ ہوا اس کی صدق دل سے معذرت!
>
> اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اگر اس ہنگامہ کی تہ میں صرف حُبِ رسول اور خدائے قدوس کی محبت ہی شامل ہوتی تو میرے دل میں اپنے دوستوں کی عزت بڑھ جاتی — اب بھی ممنون! — اگر برادرم شورش کاشمیری (اڈیٹر چٹان) اور محترم حمید نظامی (اڈیٹر نوائے وقت) بر وقت مدد نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ادب کے اس خدمت گذار کو ذاتی رنجشوں ہی کی بنا پر ہمیشہ کی نیند سلا دیا جاتا۔
>
> بفضل خدا آج جبکہ وہ ہنگامہ قریب ختم ہو چکا ہے میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جن "دوستوں" نے اس نادانستہ کوتاہی کو اتنی ہوا دی تھی۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ مسلمان ہیں؟ اور کیا اُن کے دل میں مجھ سے زیادہ خدا اور رسولؐ کی محبت ہے؟ — اس کا جواب اس دنیا میں ملنا مشکل ہے اس کا فیصلہ خدا

؎ طلوع، نقوش، شخصیات نمبر ۱ ص ۹

اور رسول ہی کی بارگاہ میں ہوگا جن کا نام لے کر یہ سب کچھ ہوا - یا ہونے والا تھا۔
بعض دوستوں نے محض کاروباری رقابت کے شوق میں مجھے گالیاں دے کر کمیونسٹ کہہ کر
غدار وطن بنا کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لی ؎

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں[1]"

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت محمد طفیل اپنی دیانت داری اور نیکی کی وجہ سے اس بلائے ناگہانی سے صاف بچ گئے اور ان کا بال بیکا نہیں ہوا البتہ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ادارت ہاتھ میں لینے کے چند ہی سال میں محمد طفیل شہرت اور مقبولیت کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے اور حاسدین سے اُن کی کامیابیاں دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔

نومبر ۱۹۵۷ء میں حسب اعلان، نقوش کا "مکاتیب نمبر"[1] دو حصوں میں، ایک ہزار اڑتالیس صفحات پر پیش کیا گیا جس میں خطوط کے علاوہ خطوط نویسی کے فن، تاریخ اور خطوط نویسوں کی خصوصیات اور سوانح حیات سے متعلق ۴ مضامین اور چالیس مکتوب نگاروں کی تصاویر شامل کی گئیں اس میں "طلوع" خط کے انداز میں لکھ کر جدت کا ثبوت دیا گیا ہے جس میں محمد طفیل لکھتے ہیں:

> " خطوط صرف ادب اور انشاء ہی کے آئینہ دار نہیں ہوتے بلکہ اس سے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخیں بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ میرا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے اگر آپ نے خطوط کو اس نظر سے دیکھا، تو آپ کو اُن میں بڑا مواد ملے گا اس اعتبار سے مجھے یہ چھوٹا سا دعویٰ کر لینے دیجئے کہ میری اس کاوش سے سو سالہ علمی ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یا مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔[2]"

میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے پہلے کسی رسالے کا "خطوط نمبر" نہیں چھپا، یا یہ اردو میں پہلی کوشش ہے۔ میں تو اس قدر کہنا چاہوں گا کہ محمد طفیل کی اس کوشش نے اردو کے خزانے میں بلاشبہ ۱۲۱۳ خطوط کے ایک قیمتی سرمایہ کا اضافہ کیا جس سے ایک مدت تک لوگ تحقیق کے گیسو سنوارتے رہیں گے اور تنقید کے بل درست کرتے رہیں گے۔

نقوش کا طنز و مزاح نمبر فروری ۱۹۵۹ء میں آیا اور اس شان سے آیا کہ لوگ کھلکھلا اُٹھے مسکرانے لگے، اس سے پہلے کسی مدیر نے اس موضوع پر توجہ بھی نہیں دی تھی چہ جائیکہ اس اہتمام سے ۹۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا یہ نمبر جس کے سرورق ہی سے اس صنف کی تلخی و شیرینی جھلکتی ہے۔

فہرست دیکھئے تو حیرت زدہ رہ جایئے ابتدا میں اس صنف سے متعلق آٹھ مقالات، پھر دُنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب" کے گیارہ نمونے۔ پھر اردو میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے ابتدائی دس نمونے، "اودھ پنچ کا دور" میں ۳۴ اندراجات، فقرہ اور عطر فقرہ کے متعلق

---

[1] طلوع: محمد طفیل نقوش مارچ ۱۹۵۶ء ص ۴ -

[2] مکاتیب نمبر، نقوش مرتبہ محمد طفیل ص ۱۰ -

آدھ درجن مشمولات کے ساتھ" شیرازہ کا دور" گیارہ نمونے پر مشتمل۔ "طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا دور" میں غالب سے لے کر تمکین کاظمی تک انیس ادب پارے "طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا زریں دور" پطرس سے احمد جمال پاشا تک پندرہ طنزیہ مزاحیہ پارے"۔ اردو کے طنزیہ مزاحیہ شعرا" میں جعفر زٹلی سے لے کر راجہ مہدی علی خاں تک ۴۳ شعرا کے کلام۔ مزاحیہ کردار کے عنوان سے پانچ مزاحیہ کردار خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، مرزا جی، قاضی جی" مزاحیہ کالم" ہیں۔ 'ہمدرد' سے لے کر 'نمکدان' تک ۹ کالم نگاروں کے کالم اور آخر میں "لطائف" کے عنوان سے اردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف پیش کئے گئے ہیں۔ اس نمبر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طنز و مزاح نگاروں کی تصویریں نہیں بلکہ ان کے معنی خیز کارٹون ہیں۔ جنھوں نے اس نمبر کی خوبیوں میں اضافہ کر دیا ہے اور محمد طفیل کے قد کو بلند کیا ہے۔

بلاشبہ یہ نمبر محمد طفیل کی ندرتِ فکر کا نتیجہ ہے اس لئے بہت پسند کیا گیا، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، لیکن نقوش اعتراضات کا نشانہ بھی بنا۔ محمد طفیل نے نقوش مئی ۱۹۵۹ء کے عام شمارے کے مختصر "طلوع" میں ان پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> "طنز و مزاح نمبر چھپا، اہلِ علم نے جی بھر کر داد دی، بکا بھی خوب، پہلے ہی ہفتے اڈیشن ختم۔ مجموعیت کی یہ شان، کاہے کو کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔ نقوش کی ہر دلعزیزی پہ ہمارا سر ہمیشہ ہی اللہ کی بارگاہ میں جھکا ہے۔
>
> بعض دوستوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نقوش کے نمبروں نے اس کی رسالیت کو ختم کر دیا ہے اور یہ رسالہ کی حدود سے نکل کر کتاب بن گیا ہے۔ یہ بات یوں تو بطورِ مخالفت کہی جاتی ہے مگر وہ لوگ نا سمجھی میں ہماری بڑائی ہی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ رسالے کو مستقل کتاب کا درجہ دینا نقوش کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔
>
> دوستوں کو یہ بھی دُکھ ہے کہ اس کا شوق کی نگاہوں سے کیوں استقبال ہوتا ہے۔ اِن میں بعض دوست تو وہ ہیں، جن کی "نگارشات" نقوش میں نہیں چھپتیں، بعض وہ جو خود رسالہ نکالتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایسے ہیں جو سورج کی روشنی میں اپنی آنکھیں بند کر کے، یہ سمجھ لیتے ہیں ابھی سورج چڑھا ہی نہیں۔
>
> ہم یہ اعتراض بھی سنتے ہیں کہ نقوش نے لوگوں کے ذہنوں کو بدل ڈالا ہے اس لیے دوسرے پرچے بھی اس روش پہ چلنے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ دیکھیے سینکڑوں پرچے، اکیلے نقوش کو اپنے ڈھب پہ نہ لا سکے مگر اکیلے نقوش کی وجہ سے سینکڑوں پرچے اسی ڈھب پہ نکلنا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ اب قاری زیادہ باہوش ہے۔ وہ لغویات کو پسند نہیں کرتا۔ اب تو وہی پرچے چلیں گے جن میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہوگی۔ آج اپنا اور قاری کا وقت ادب کا نام لے کر ضائع کر دینا ادب کی کوئی خدمت نہیں۔
>
> یہ بات بھی سننے میں آتی ہے ادب حاضر کی تخلیقات پر ہمارا زیادہ دھیان نہیں ہے۔ بات یہ

> ہے کہ اور سیکڑوں پرچے، ادبِ حاضر کو پیش کرتے ہیں۔ ہم زیادہ دھیان نہ بھی دیں تو کیا موجودہ ادب ڈوب جائے گا؟ ہم جو کام کر رہے ہیں وہ کسی اور کے بس کا نہیں رہا، اس لئے ہماری زیادہ تر توجہ ادب کے بنیادی مسئلوں پہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے ہر موضوع پہ تاریخی دستاویزیں بہ طور ورثہ چھوڑ جائیں ایسے کام حکومتوں کے کرنے کے ہیں یا اُن اداروں کے جنھیں حکومت لاکھوں روپیہ دیتی ہے مگر اُن اداروں میں یا تو اتنی صلاحیت نہیں یا ہمت نہیں۔
>
> ویسے ہم ادبِ حاضر کے ارتقائی نشو و نما سے کبھی بھی غافل نہیں رہے ہم برابر تازہ ادب بھی پیش کرتے رہتے ہیں اگر کوئی ایمانداری سے کام لے اور یہ دیکھے کہ ہم سال بھر میں کتنے نئے افسانے نظمیں، غزلیں اور مقالے (بہ لحاظ تعداد بھی معیار بھی) پیش کر دیتے ہیں تو وہ بہ آسانی اس نتیجے پہنچ سکتا ہے کہ اس باب میں بھی نقوش کا کوئی حریف نہیں۔ اب موجودہ عام شمارہ ہی کو دیکھ لیجئے کیا آج کل میں کسی دوسرے رسالے نے اپنا ایسا سالنامہ بھی پیش کیا ہے؟ ہم تو چپ ہیں اس لئے کہ ذاتی مصلحتیں غیر ذاتی کاموں کے سامنے ہمیشہ سر بہ سجود ہوئی ہیں۔[1]"

ستمبر ۱۹۵۹ء میں حسبِ اعلان "پطرس نمبر" شائع ہوا، جو بڑا اہم اور محترم تھا محمد طفیل نے بلاشبہ پطرس کا ہی حق ادا نہیں کیا اردو کا بھی حق ادا کر دیا۔ آئندہ پطرس کی قدر و قیمت کے تعین میں یہ نمبر ہر طرح مفید ثابت ہوتا رہے گا۔

اپریل ۱۹۶۰ء میں حسبِ اعلان ادبِ عالیہ نمبر منظرِ عام پہ آیا۔ یہ گزشتہ دس سال کے نقوش میں مطبوعات کا نہایت قیمتی انتخاب ہے جو نقوش کے ۱۲۷۰ صفحات پہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بجائے "طلوع" کے "ترتیب" کے تحت محمد طفیل لکھتے ہیں:

> "نقوش کی اشاعت کو آج بارہ برس ہو گئے ہیں۔ چند لفظوں میں اس کے دس سالہ کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہ ہوگا۔ پھر کہنا سنا تو اُن چیزوں کے بارے میں جاتا ہے جسے صرف لکھنے والا ہی جانتا ہو، پڑھنے اور لکھنے والا نہ جانتا ہو۔ اس لئے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا ہاں موجودہ نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں چند باتیں سن لیں۔
>
> کوئی دوسرا، میرے نقوش کا یوں انتخاب کرتا تو میں سٹ پٹا کر رہ جاتا اس لئے کہ نقوش میں جو کچھ چھپا ہے اس کی ادبی آبرو پر کوئی بھی حرف نہیں رکھ سکتا (ویسے برائے اعتراض جو جس کا جی چاہے کہہ لے) یہی وجہ ہے کہ مجھے نقوش کی ہر ہر سطر میں حسن ہی حسن نظر آتا ہے ایسے محبت کے مارے کو نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب اپنے ذمہ نہیں لینا چاہئے تھا مگر سوال ہے اگر میں یہ کام کسی اور کو سونپتا تو پھر میں خود کیسے زندہ رہتا۔ دونوں طرح اپنی موت!

---

[1] نقوش مئی ۱۹۵۹ء عام شمارہ (۴)

مجھے نقوش کی نسبت سے ہر اچھائی بھی منظور ہے اور ہر برائی بھی، یہی وجہ ہے کہ اس سراسر جھگڑے والے کام کو بھی سر انجام دے کر بری بھلی باتیں سننے کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں اب میرے سامنے نقوش کا ایک ایک لفظ ہے اور یہ جانِ ناتواں!

میری مشکلوں کی نوعیت مختلف ہے ایک طرف اہلِ قلم ہیں، دوسری طرف قارئین۔ ایک سے ایک منہ زور، دہل رہا ہوں نہ جانے میری اس عاجزانہ کوشش کو پسند بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ ڈھارس صرف ایک بات کی ہے وہ یہ کہ اگر یہی کام کوئی دوسرا انجام دیتا (اللہ میاں کے سوا) تو کیا ادیب اور قاری مطمئن ہو جاتے؟ میرا خیال ہے ہرگز نہ مطمئن ہوتے۔ اطمینان تو ادبی موت کی نشانی ہوا کرتا ہے جو نہ مجھے منظور ہے اور نہ نقوش کے قاری اور نقش کار کو منظور ہوگا۔[1] "

یہ ہے نقوش سے صاحبِ نقوش کی گہری وابستگی جو شروع سے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور علامت بنتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی "نقاش و نقوش" کے عنوان سے عہدِ طفیل کے نقوش سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہایت دلکش انداز میں اپنے تاثرات اس طرح ظاہر کرتے ہیں :

" تیسرے دور کا نقاش ساحر ہے یہ اپنے پرایوں کی طرف گل و ثمر پھینکتا ہے مگر خانہ برانداز چمن نہیں۔ بلکہ خانہ سازِ بہار ہے۔ یہ ماضی کے رنگ و نکہت کو سمیٹ کر لاتا ہے اور پرانے نقوشِ بہار کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ یہ غزل سرا بھی ہے اور داستان گو بھی۔ اس نے شاہدانِ بہار کا ایک صنم کدہ بھی تعمیر کیا ہے اور خارہ تنگافی کر کے جوئے شیر بھی لاتا ہے۔ اس نے ایک دیوارِ قہقہہ بھی بنوائی ہے۔ وہ تصویرِ بتاں اور حسینانِ ادب کے خطوط جمع کرتا رہتا ہے۔ وہ بہروپیہ ہے۔ دیکھو گلہائے منتخب کی ٹوکری سر پہ رکھے مالن کا بھیس بدلے چلا آ رہا ہے۔[2] "

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے نقوش کے خاص نمبروں کا جائزہ لیتے ہوئے محمد طفیل اور نقوش سے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

"محمد طفیل نے اپنے زمانۂ ادارت میں نقوش کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اور ان کی محنت نے انھیں بھی امر بنا دیا ہے۔ جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتحپوری کا نام، انجمن ترقی اردو کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام، یا صلائے عام کے ساتھ ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک چیز کے دو نام ہیں یہ اُن سے زندہ ہے وہ اس سے۔ عام طور سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں نہیں۔[3] "

---

[1] ادبِ عالیہ نمبر نقوش : ترتیب ص ۹ ۔ [2] نقاش و نقوش : سید معین الرحمٰن : محمد نقوش ص ۱۶۳ ۔

[3] نقوش ادبِ عالیہ نمبر اپریل ۱۹۶۰ء ص ۳۲ ۔

خاص نمبر نکالنا بڑا دشوار کام ہوتا ہے، محمد طفیل اگرچہ نمبر نکالنے کو نکال لیتے تھے لیکن پھر کچھ دن دم لینا چاہتے تھے تاکہ تازہ دم ہو کر کسی اہم نمبر کی طرف توجہ کریں۔ جون ۱۹۶۰ء کے عام شمارہ میں وہ لکھتے ہیں :

> "میری خوش قسمتی کہ اب کے نقوش کا عام شمارہ نکل رہا ہے خاص نمبر نکالنا اور تلوار کی دھار پر چلنا میرے نزدیک ایک ہی بات ہے ارادہ ہے کہ ابھی دو چار ایسے ہی غریبانہ قسم کے عام شمارے نکالوں، تاکہ ذرا ستا لوں اور اس قابل ہو سکوں کہ اپنے ادبی گناہوں کا کفارہ پھر کسی اہم نمبر کی صورت میں ادا کر سکوں[1]۔"

اسی شمارے میں نئے افسانہ نگار صادق حسین کی طرف نقادوں کی توجہ دلاتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء کے عام شمارے کے "طلوع" میں "طلوع" سے متعلق اس طرح کی باتیں بتاتے ہیں :

> "مشہور ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے کچھ اسی طرح لکھنے والوں کے لئے بھی جگہ اور موقع محل کی کوئی قید نہیں ہوتی، مصیبت ہے کہ میں بھی شاعروں کی طرح آمد کا منتظر رہتا ہوں۔ عموماً سفر کرتے، پیدل چلتے، ہوٹل میں بیٹھے میرے "طلوع" مکمل ہوتے ہیں۔
>
> میں نے "طلوع" میں کبھی بھی آفاقی مسائل پر گفتگو نہیں کی اور نہ مجھے کبھی اپنی قابلیت بگھارنے کا شوق چرایا، میں نے اپنی کبھی بات کی ہے تو اپنے ادب کی بات کی ہے یا پھر اپنے پرچے کی یا اپنی ذات کی۔ معاف کیجئے گا میں اپنی ذات کو پرچے اور ادب سے کوئی الگ چیز نہیں سمجھتا آپ بھی مجھے اس خوش فہمی کے سہارے جی لینے دیں[2]۔"

اسی شمارے میں لاہور نمبر نکالنے کی اطلاع دیتے ہوئے دلچسپ انداز اختیار کرتے ہیں :

> "میں لاہور نمبر پیش کرنے کے لیے بے قرار ہوں، خود کو اس وقت پوری فارم میں سمجھتا ہوں تلوار کی دھار پر ایک بار پھر چلنے کا ارادہ ہے، چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اہلِ ہنر کو اپنے جوہر دکھاؤں — یہ الگ بات ہوگی کہ آتے ہی میری وکٹ اڑ جائے۔ کرکٹ اور ادارت میں بڑی مماثلت ہے۔"

لاہور نمبر کا ذکر انہوں نے اگست ۱۹۶۱ء کے شمارے میں اس طرح کیا ہے :

> "آخری عمر میں انسان بڑا نمازی اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ نمازیں پڑھتا ہے روزے رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ ادب کے جائے نماز بچھاؤں اور کچھ نیک کام کر جاؤں یعنی اپنے سارے ہی ادھورے خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لوں، میری مراد اس کام سے ہے جس پر محنت کر چکا ہوں، یا جن کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، ان کاموں میں مثنوی نمبر، لاہور نمبر، مکاتیب نمبر (حصہ دوم) صحافت نمبر اور اردو ڈرامہ نمبر ہیں، لاہور نمبر پر بہت سا کام ہو چکا ہے۔ مزید دو تین

---

[1] طلوع نقوش جون ۱۹۶۰ء۔ [2] طلوع۔ نقوش اکتوبر ۱۹۶۱ء

> چھپنے کے لیے اس نمبر میں خود کو کھو دینا ہوگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میں اپنی جنم بھومی کے بارے میں ایک کام کی چیز پیش کر جاؤں، لاہور جو شہنشاہوں کے دلوں کی دھڑکن بنا رہا، لاہور جو ادب کا مکہ اور مدینہ ہے لاہور جو حسن اور خوب صورتی کا کعبہ ہے۔"

حسب اعلان فروری ۱۹۶۲ء میں نہایت سلیقہ کے ساتھ لاہور نمبر شائع ہوا، یہ نمبر یقیناً ہر لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھ ہے، کاش محمد طفیل کے ہاتھوں کچھ اور اہم شہروں کے نمبر شائع ہو جاتے۔

۱۲۰۴ صفحات پر پھیلا ہوا یہ نمبر لاہور سے متعلق سیاسی اور ثقافتی تاریخ، مآثر لاہور (باغات و مزارات)، شباب لاہور، عہد مغلیہ میں۔ عہد حکومت خالصہ، ۱۸۵۰ء تا حال، علمائے کرام، دینی مدرسے ۱۷۰۰ء تا حال، مساجد (عہد غزنوی سے زمانہ حال تک)، کتب خانے، شاہی قلعہ، عجائب گھر، چڑیا گھر، دروازے، انگریزی دور کی چند تعمیرات، مندر، گرجے، کالج، موسیقار، اکھاڑے، تکیے میلے، ڈرامہ اور تھیٹر، اطبا (عہد مغلیہ سے دور حاضر تک)، اردو صحافت، فارسی گو شعرا، فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر، ادیب ا مصنف، مؤرخین، چند خونچکاں مناظر، سیاسی تحریکیں، فقیر خاندان کے تاریخی نوادر، خوش نویس، چند بڑے ادیب، ادبی تحریکیں، مصور اور مصور لاہور جیسے موضوعات پر بھرپور تحریریں شائع کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ لاہور اور اس کی شاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہاں، مقبرہ آصف جاہ، شالامار، دربار داتا گنج بخش، درگاہ میاں میر صاحب، مسجد وزیر خاں، سنہری مسجد، مینار مسجد، مسجد شہید، قلعہ لاہور، دیوان خاص، زمزمہ، چوبرجی، مقبرہ آصف جاہ، مزار قطب الدین ایبک، مقبرہ ایاز، بارہ دری کامران، گلستان فاطمہ، پنجاب یونیورسٹی، پنجاب پبلک لائبریری، چڑیا گھر، عجائب گھر، گنگا رام ہسپتال، فاطمہ جناح میڈیکل کالج، ہائی کورٹ، اسمبلی ہال، منٹگمری ہال، الحمرا، میو ہسپتال، گرجا میکلوڈ رو مجسمہ مہاتما بدھ، جہانگیر، سکہ سلطان محمد غوری، مزار اقبال کی تصاویر بھی ابتدا میں شامل کر دی گئی ہیں۔

طلوع کے تحت محمد طفیل نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا اس لئے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملتی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے، گنہگار ضرور ہوں، مگر اتنا بھی نہیں!
>
> میں آج ادب کی وادیوں سے نکل کر، تاریخ کے میدان میں آن پہنچا ہوں، بے شک راہیں پرپیچ اور ان جانی تھیں مگر میرے جنون نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ اب یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ جنون اور تاریخ کے اس معرکے میں کون جیتا کون ہارا۔
>
> یوں تو ہر شہر، شہر ہی ہے مگر بعض شہر اپنی آغوش میں رہنے بسنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔ لاہور بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے، نقوش نے لاہور کا تاریخی اور تہذیبی سرمایہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے تاریخی شہر بھی "دیوانوں" کا منہ تک رہے ہیں۔"[1]

---

[1] طلوع لاہور نمبر نقوش ص ۱۶

یہ نمبر ہر اعتبار سے اُردو والوں کے لیے نہایت قیمتی ہے خاص طور سے اہلِ لاہور کے لئے قابلِ فخر کہ اس کے ایک فرزند نے یہ اہم فریضہ انجام دیا۔

پھر شوکت نمبر اور آپ بیتی نمبر آگے پیچھے شائع ہوئے۔ محمد طفیل نے تین ہمعصر ادیبوں کی وفات پر نہایت اچھے نمبر شائع کئے میرا مطلب منٹو نمبر، شوکت نمبر اور پطرس نمبر سے ہے جو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

لیکن آپ بیتی نمبر نہایت خاصے کی چیز ہے، اُردو ادب میں اس طرح کا نمبر نکالنے کا آج تک کسی کو خیال نہیں آیا، یہ دو حصوں میں ۱۹۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۴۲ مکتوبات اور پانچ آپ بیتیوں سے متعلق اہم مضامین کے علاوہ ۲۴۴ زندہ اور مرحوم سربراہانِ مملکت اولیا، صوفیہ، علماء، مورخین، مصلحین، سیاسیین، غیر ملکی ادیب، ادبا، شعراء کی آپ بیتیاں ہیں، جن میں سے کچھ کی تصاویر بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

جس قدر یہ ضخیم نمبر ہے اتنا ہی اس میں مختصر "طلوع" ہے۔ جس میں محمد طفیل لکھتے ہیں:

> "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا پاگل پن کبھی مجھے اس حد تک بھی رسوا کرائے گا کہ جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھوں گا۔ خاکسار جو ادب کی خدمت کا مدعی ہے اب کے بادشاہوں کے حضور جا پہنچا، وہی بات ہوئی کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی"۔

اور آخر میں بڑی خوب صورت بات کہی جو ہر مومن کے لئے سرمایہ حیات ہے، لکھتے ہیں:

> "اب جبکہ یہ نمبر آپ کے ملاحظہ میں آ رہا ہے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کیا اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ میاں نے میری کوئی مدد نہیں کی؟ پتا نہیں آپ کا کیا جواب ہے مگر میں بارگاہِ ربّ العزت میں اپنا سر جھکا دینا چاہتا ہوں"۔

آپ بیتی نمبر کے بعد آٹھ عام شمارے، سالنامہ (تین جلدیں) اور خاص نمبر آئے۔ پھر مکاتیب نمبر کا سلسلہ خطوط نمبر کی تین جلدوں سے آگے بڑھا۔ یہ نمبر بھی نہایت قیمتی اس وجہ سے ہے کہ خطوط کا بڑا قیمتی سرمایہ اس طرح ایک جگہ جمع ہو گیا ہے ورنہ یا تو ضائع ہو جاتا یا عام لوگوں کی رسائی سے باہر ہوتا۔

ایسا لگتا ہے کہ قوم کی سرد مہری، تنگ دلی اور بے حسی کا احساس محمد طفیل کے اندر کبھی کبھی سر اٹھاتا تھا اور سوال کرتا تھا:

> "محمد طفیل نے محمد نقوش سے کہا۔
>
> ارے میاں! تو، کیا کر رہا ہے؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، کیوں اپنا اور اپنے بچوں کا دشمن بنا ہوا ہے؟ جب تو نے خطوط کی دو جلدیں پہلے چھاپی تھیں تو کون سے قوم نے سرخاب کے پَر لگا دیئے تھے جو تو اب اکٹھی تین جلدیں پیش کر رہا ہے یہ دس گیارہ برس جو تو نے خطوط اکٹھے کرنے پر صرف کئے ہیں، اس کے بجائے اگر تو امپورٹ ایکسپورٹ کا ہی کام کر لیتا تو زیادہ فائدہ میں رہتا اور کچھ نہیں

کر سکتا تھا تو قوم کا لیڈر ہی بن جاتا[1]۔"

خطوط نمبر کے تیسرے حصے سے ایک نئی بات کا انکشاف ہوتا ہے :

> "یہ پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میں ۱۹۴۸ء میں مر گیا تھا وہ یوں کہ زندگی اور موت کے درمیان چند ساعتوں کا مرحلہ رہ گیا تھا۔ ایسے میں میں نے اپنے رب سے کہا: "اس دنیا میں جیسے آیا تھا ویسا ہی چلا جا رہا ہوں، کسی کو بھی میری ذات سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، مہلت دے دیجئے اللہ تعالیٰ نے کچھ سوچا اور مجھے نئی زندگی بخش دی۔
>
> صحتیاب ہوا تو میں نے سوچا، خدا سے بہت بڑا وعدہ کر چکا ہوں مگر وسائل؟ صحن دل امنگوں سے معمور تھا مگر حالات خندہ زن تھے اس ماحول میں ذہن نے کئی ٹھنیاں کھائیں غرض وسائل کی غریبی میں بھی ایک بات سوجھ گئی۔ وہ یہ کہ اگر تو جھلسا دینے والی گرمیوں میں پیاسوں کو پانی ہی پلاتا رہے گا تو میں اپنے خدا سے شرمسار نہ ہوگا۔ دل مطمئن ہو گیا۔
>
> جب سے ادب کی کڑی دھوپ میں پیاسوں کو پانی پلا رہا ہوں۔"

غالب صدی کے موقع پر محمد طفیل نے غالب سے متعلق نقوش کے تین اہم نمبر نکالے، پہلا نمبر فروری ۱۹۶۹ء میں پیش کیا جو ۵۸ مضامین پر مشتمل ۵۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ غالب نمبر حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۹ء میں آیا، جس میں بیاضِ غالب کے علاوہ دس مضامین شامل کیے گئے یہ نمبر ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے نقوش غالب نمبر ۳' ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا جس میں تقریباً ۵۰ اہم تحریریں یکجا کی گئی ہیں۔ ۶۱۲ صفحات کا یہ نمبر بھی ہر اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں ایک حصہ خاص طور سے بیاضِ غالب سے متعلق ہے۔

غالب نمبر ۲ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نسخہ بھوپال ثانی (بیاض غالب) کو شائع کر دیا گیا ہے جو عین غالب صدی کے ہنگامہ میں بھوپال میں دریافت ہوا تھا، جس کو دیکھنے اور پڑھنے کے لئے تمام غالب کے شیدائی پریشان تھے محمد طفیل نے اسے پہلی بار اس نمبر میں پیش کر کے تمام اردو والوں کو خاص طور سے غالب کے قدر دانوں کی پیاس بجھا دی، غالب صدی کا یہ سب سے بڑا اور یادگار تحفہ تھا جو محمد طفیل کی طرف سے پیش کیا گیا۔ ان کا یہ لکھنا بجا ہے :

> "۔ ۔ ۔ ۔ اگر میں یہ کہوں کہ پوری ایک صدی میں غالب پر جو کچھ چھپا ہے اس میں یہ سب سے قیمتی دستاویز ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نمبر میں غالب کی اولیں بیاض کو پہلی بار عکسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اہتمام یہ ہے کہ ایک صفحہ پر بخط غالب عکس اور دوسرے صفحہ پر خوب صورت کتابت۔
>
> صفحہ بہ صفحہ بلکہ مصرعہ بہ مصرع!
>
> اس بیاض کو نقطہ بہ نقطہ اور لفظ بہ لفظ پڑھ لینا بھی بہت بڑا کام ہے اگر اس سعی میں ہمیں تھوڑی

---

[1] نقوش خطوط نمبر حصہ دوم۔

بہت بھی کامیابی ہوئی تو اسے آسان کام نہ جانئے کیونکہ مروجہ دیوان اور اس بیاض میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق اس بیاض کی فضیلت ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ۱۹[1] غزلیں اور ۱۳ رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں۔"

نقوش کا غالب نمبر ۳ اس لئے اہم ہے کہ اس میں تحقیقی تنقیدی مضامین، تقریبات بہ سلسلہ بیاض غالب آدھ درجن اہم مضامین ہیں۔ اس میں بیاض غالب کے سلسلے میں محمد طفیل تحریر کرتے ہیں:

"امروہہ کے ایک صاحب ہیں نثار احمد فاروقی وہ کہتے ہیں کہ غالب کے نو دریافت کلام کا نام نسخۂ امروہہ رکھا جائے۔

رام پور کے ایک صاحب ہیں اکبر علی خاں وہ اپنے والد کی رعایت سے کہتے ہیں کہ اس دیوان کا نام نسخۂ عرشی زادہ رکھا جائے۔

بھوپال کے ایک صاحب ہیں عبدالقوی دسنوی وہ کہتے ہیں کہ اس دیوان کا نام نسخۂ بھوپال ثانی رکھا جائے۔

لاہور کے ایک صاحب ہیں محمد طفیل وہ کہتے ہیں اس دیوان کا نام نسخۂ لاہور یا نسخۂ نقوش رکھا جائے کیونکہ پہلے پہل لاہور میں چھپا۔"

آج بلاشبہ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ غالب صدی میں محمد طفیل نے اپنی غالب دلچسپی اور ۲۵ برس کے تجربے کی وجہ سے ہند و پاک میں غالبیات میں نہایت قیمتی اضافے کئے ہیں جن کی برابری کا کوئی ادارہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ جولائی ۱۹۷۲ء کے سالنامہ میں طلوع کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

"میں اتنا بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ نقوش کے ذریعہ جو کچھ سامنے آیا وہ سب کا سب دائمی قدروں کا حامل ہے، ہاں اس میں پیش کردہ بیشتر تحریریں ایسی ہیں جن کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ سادہ کاغذ کی اہمیت کیا ہے اور یہ بھی کہ اس پر اہم سے اہم تحریر چھاپی جا سکتی ہے میرے نزدیک ایک کلمے کی بھی اہمیت تھی کیونکہ میں اس امر سے بھی بے خبر نہ تھا کہ لفظ جب کسی فنکار کے قلم سے نکلے گا تو وہ موتی رولے گا۔

نقوش ۱۹۴۸ء میں نکلا آج ۱۹۷۲ء ہے۔

اس ربع صدی میں لفظ کی تقدیس اور کاغذ کی حرمت کا جتنا میں نے خیال رکھا وہ شاید اس قابل ہو کہ اہل علم میرے اس سجدۂ ریاضت کو اس کھاتا میں ڈال سکیں جسے قبولیت کا کھاتا کہتے ہیں۔"

---

[1] دراصل اس میں ۴۲ غزلیں، ۲ دو اردو رباعی اور ۴۲ شعر غیر مطبوعہ ہیں۔ عبدالقوی دسنوی

ستمبر ۱۹۷۴ء کے نقوش میں "ایک گواہی" کے تحت قرۃ العین حیدر کے فن پر فنکارانہ روشنی ڈالتے ہیں :

"وہ افسانہ نگار بہت اچھا لکھتا ہے آمنا و صدقنا وہ افسانہ نگار بہت اچھا لکھتی ہیں سر تسلیم خم، مگر جس کا دل چاہے وہ حساب کر لے کہ اس دور میں قرۃ العین حیدر سے بہتر کوئی نہیں لکھ رہا "تاریخ کی شناور یہ، ناول کی ناخدا یہ، افسانہ نگاری میں کامل یہ، رپورتاژ میں یکتا یہ! ان کی تحریریں کیا ہیں؟ علم و دانش کی اُمیدیں ہیں، ایسی امیدیں جو اوراق دل پہ آگہی کی پرت کھولتی رہیں گی۔"

جنوری ۱۹۷۶ء کے نقوش میں پشت ورق کے اندر کے حصہ میں یہ تحریر ہے :

"اُدب کی وادی سے کترا کر اِن دنوں
مدیر نقوش
ایک اور رخ سے اُردو ادب کو منور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔
جب مدیر نقوش نے
لاہور نمبر پیش کیا تھا تو اِن دنوں کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ ادب کے اس طالب علم نے تاریخ کا رُخ کیوں اختیار کیا۔ چونکہ وہ لاہور کا باسی ہے اس لیے اس نے اپنی جنم بھومی کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز کو پیش کرنا اپنا فرض جانا۔
اسی طرح
وہ ایک مسلمان بھی ہے، عملاً اگر مسلمان نہیں تو دل اس کا مسلمان ضرور ہے اس لئے وہ اپنا یہ بھی فرض سمجھتا ہے کہ رسول مقبولؐ کے بارے میں جہاں دنیا جہان کے دانشوروں نے لکھا ہے وہاں وہ بھی اس موضوع پر کام کرے اور اپنی عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنا فرض بھی ادا کرے۔
نقوش کا آئندہ شمارہ رسولؐ نمبر ہوگا۔
جو
اس موضوع پر سب سے اہم دینی دستاویز ثابت ہوگا جسے کسی بھی مورخ کے لیے نظر انداز کر دینا ناممکن ہوگا اور یہ نمبر کئی جلدوں میں ہوگا۔"

یہ غالباً نقوش میں پہلی تحریر ہے جس میں محمد طفیل نے رسولؐ نمبر کی تیاریوں کی اطلاع دی ہے۔ غور کیجئے کہ جس رسولؐ نمبر کی اشاعت کی ابتدا دسمبر ۱۹۸۲ء میں ہوئی اس کی کتابت دس برس پہلے جنوری ۱۹۷۲ء میں شروع ہو گئی تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاص نمبروں کو مرتب کرنے کے لئے محمد طفیل کس قدر پہلے سے ایک خاص انداز سے تیاری شروع کر دیتے تھے۔

جنوری ۱۹۷۷ء کے سالنامہ کے مطالعہ سے رسولؐ نمبر کے بارہ سو صفحات کی کتابت کی اطلاع ملتی ہے اس میں اقبال نمبر کے نکلنے

کی دلی خواہش بھی سر اٹھاتی ہے محمد طفیل لکھتے ہیں:

"میں اپنے طور پر رسولؐ نمبر کی تیاریوں میں مگن تھا۔ مضامین لکھوائے بھی جا رہے تھے ان کی کتابت بھی ہو رہی تھی، ایک مرحلہ پر جا کر یہ بھی سوچا کہ گرہ میں جو کچھ ہے اگر اتنا کچھ بھی اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دوں تو بھی بات بن جائے گی، مگر کسی طاقت نے مجھے روکا، اتنی جلدی کیوں؟ وہ کون سی طاقت ہے، میں نہیں جانتا، اس وادیٔ عشق میں کچھ عرصہ اور قیام رہے یہی اذن ہے۔

یہ وادی وہ ہے جس کی تھاہ نہیں جتنی مسافت بھی طے ہو جائے وہی نیک بختی، تکمیل کی خواہش ایسی جیسے آسمان پر تارے گننے کا شغل، بہرحال بساط بھر کوشش جاری رہے گی اس وقت بارہ سو صفحات کی کتابت ہو چکی ہے کوئی چار جلدوں میں یہ چاند ہویدا ہو گا۔

یہ بات تو تھی رسولؐ نمبر کی۔ اعلان ہوا ہے کہ یہ سال علامہ اقبال کا ہے۔ سوچا ہے کہ ساتھ ساتھ اس عاشقِ رسولؐ کے بارے میں بھی ایک نمبر پیش کرنا چاہیے یہ انسب بھی ہے اور فرض بھی، اگر ہم غالب کے بارے میں تین شمارے چھاپ سکتے ہیں (چوتھا مرتب شدہ رکھا ہے) تو اقبال کے بارے میں بھی بہت کچھ چھاپ سکتے ہیں۔"

ستمبر ۱۹۷۷ء میں اقبال نمبر (۱) منظرِ عام پر آیا۔ جو ۵۷۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہند و پاک کے اقبالیین کے مضامین پر مشتمل ہے۔

محمد طفیل نے ایک خاص انداز سے طلوع قلمبند کیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے:

"تین چہرے میرے تصور میں آج بھی زندہ ہیں۔

جو میرے تھے اور مر گئے اُن میں سے دو چہروں کا تعلق میرے والدین سے ہے تیسرے چہرے کا تعلق علامہ اقبال سے ہے!

ہوا یوں کہ ایک صاحب تانگے پر نقارہ رکھے اسے زور زور سے پیٹ رہے تھے۔ جب لوگ متوجہ اور اکٹھے ہو گئے تو اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب اُٹھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ میں آپ کو بڑی دلخراش خبر سنانے لگا ہوں کہ آج صبح علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ سہ پہر کے قریب میو روڈ سے اٹھایا جائے گا۔

اس وقت میری عمر پندرہ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک کھلنڈری عمر، اس کے باوجود یہ خبر سنی تو سناٹے میں آ گیا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔"

اور آخری صفحہ پر ادارہ کی طرف سے یہ تحریر شائع ہوئی:

"ہم نے بہت بڑے کینوس پر علامہ اقبال کی تصویر بنانی شروع کر دی ہے یہ نمبر تصویر کی چند لائنوں یا چند جھلکیوں پر منحصر ہے باقی تصویر آئندہ نمبروں میں بنائی جائے گی۔ تب سب نمبروں کو ملا کر بتائیے گا

کہ اس سے بہتر تصویر کس نے بنائی ہو؟”

نومبر ۱۹۷۷ء میں نیرنگ خیال کا تاریخی نمبر جسے حکیم یوسف حسن نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا محمد طفیل نے اسے اضافہ کے ساتھ پیش کیا تاکہ یہ نایاب نمبر ایک بار پھر اقبال کے شیدائیوں کے مطالعہ میں آ سکے۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں "طلوع" میں نہایت دلچسپ انداز اختیار کیا گیا ہے:

> "تین چار برس پہلے میں نے حکیم صاحب کو اکسایا تھا، نیرنگ خیال کا اقبال نمبر چھاپ دیجئے انہوں نے جواب میں فرمایا۔ بڑھاپے نے امنگوں کو روند ڈالا ہے۔
>
> اس نمبر کے چھاپنے پر میرا اصرار اس لئے تھا کہ یہ نمبر اقبال نمبر تھا جو علامہ اقبال کی زندگی میں چھپا تھا، یہی وہ چراغ تھا جس سے بعد میں بہت سے چراغ جلے۔
>
> جب اقبال صدی پر اقبال کے سلسلے میں لمبے چوڑے منصوبے سامنے آئے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے بھی اپنے اپنے پروگراموں کا اعلان کر دیا تو اُن کی موجودگی میں بھی، میرے نزدیک اس نمبر کی اشاعت نہ صرف ضروری تھی بلکہ بہت ضروری!
>
> وقت نکلا جا رہا تھا وعدہ کر چکا تھا کہ نمبر چھپ جائیگا جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہیں آئی تو بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر کھجانے لگ گیا۔ بالآخر اپنے آپ سے سوال کیا۔ ادارہ نقوش یہ کام کر سکتا ہے؟
>
> اس کشمکش میں بڑا وقت ضائع ہو گیا، میرا گھٹیا پن مجھ سے کہتا میں کیوں کسی دوسرے رسالے کو اہمیت دوں؟ میں کیوں اپنے حریفوں میں اضافہ کروں؟
>
> سوال انا کا پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ بہت ردّ و قدح ہوئی!
>
> میں نے من و تو کے چکر سے اپنے آپ کو نکالا۔ سوچا! حکیم صاحب سے دوستی! نمبر کی اہمیت! پھر ہچر مچر کیسی؟ چنانچہ حکیم صاحب کو لکھ دیا بندہ راضی! نقوش راضی!

نقوش اقبال نمبر ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء میں خطوط، تاریخ، ولادت، فکر و فن، اقبال کے حضور، مداح و ممدوح، قیام و تعلق، رحلت (گمشدہ اوراق) کے تحت ۵۱ تحریروں کے ساتھ ۶۵۳ صفحات پر مشتمل منظر عام پر آیا۔ "طلوع" میں محمد طفیل فرماتے ہیں:

> "آپ سو رہے ہیں، میں جاگ رہا ہوں۔ میں کیوں جاگ رہا ہوں؟ کیا اقبال سونے نہیں دیتے؟ کیا شرف النسا سونے نہیں دیتیں؟ یہ سوال ہیں میں جواب ڈھونڈ رہا ہوں۔
>
> شرف النسا کا قصہ یہ ہے کہ وہ پنجاب کے گورنر کی بیٹی تھیں (بہ عہد شاہ عالم) قرآن اور تلوار اُن کا ماٹو تھا، وہ سمجھتی تھیں کہ قرآن ہمارا قانون ہے اور تلوار طاقت کی علامت!
>
> مرتبہ ملاحظہ ہو!
>
> جب تصور کی دنیا میں علامہ اقبال جنت کی طرف نکل گئے تو انھیں سب سے پہلے جو قصر نظر آیا، وہ شرف النسا

کا محل تھا جو لعلِ ناب سے بنا ہوا تھا، جس کے سامنے آفتاب کی ضوفشانیاں بھی ہیچ تھیں۔"

پھر" اس شمارے میں: یہ بھی لکھتے ہیں:

> "اقبال کے سلسلے میں شور زیادہ ہے کام کم ہوا، چونکہ آج کل کام کرنے کا انداز یہی ہے اس لئے سوچنا ہوگا کہ کام زیادہ ہو رہا ہے۔ بہر حال اس شور میں میرے بھی دو چار کام سامنے آ رہے ہیں!
>
> ایک نمبر ستمبر میں پیش کیا تھا دوسرا نمبر دسمبر میں پیش کر رہا ہوں، بیچ میں ایک نمبر اور پیش کیا تھا مگر اس کا ذکر نہ کروں گا، دوستی پہ حرف آئے گا۔ بہر حال اقبال پر ان دو تین مہینوں میں ادارہ نقوش نے بھی اٹھارہ سو سے زیادہ صفحات پیش کر دیئے بلاشبہ اتنا کام کسی بھی غیر سرکاری ادارے نے نہیں کیا۔ یعنی اپنا پیٹ کاٹ کر کسی نے نہیں کیا۔ ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی ایک جلد اور پیش کریں گے وہ جلد علامہ اقبال کی دستاویزات اور ان کے نوادرات سے متعلق ہوگی ان شاء اللہ وہ جلد بھی جلد ہی پیش کر دی جائے گی، اطمینان بھی جبھی ہوگا ابھی تو منزل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ منزل پہ پہنچے نہیں!

اور اسی اقبال نمبر میں رسولؐ نمبر کے لئے اعلان ہوا:

> "تین جلدیں ترتیب پا چکی ہیں۔ یہ نمبر چار جلدوں میں مکمل ہوگا۔ ان شاء اللہ یہ نمبر بھی جلد ہی پیش کر دیا جائے گا۔
>
> —— اور اس موضوع پر ایک اہم دستاویز ہوگی!

جنوری ۱۹۷۹ء میں نقوش کا سالنامہ آیا تو اس کا "طلوع" نہایت دلچسپ اور اہم شائع ہوا۔ جس سے محمد طفیل کی نقوش سے دیوانگی کی حد تک چاہت کا پتا چلتا ہے۔ دیوانگی کا علم تو نقوش کے نمبروں کو دیکھ کر ہوتا ہے لیکن محمد طفیل کی زبان سے تو کچھ اور بات پیدا ہو گئی ہے:

> "آپ کمزور ہو گئے ہیں؟
>
> جی ہاں! ان دنوں عشق کی فرصت نہیں ملی۔"
>
> یہ مکالمہ جس سے ہوا وہ میرا دوست تھا، میرے دکھ درد کا شریک، میری سلامتی کا خواہاں، میری عزت کا طالب، چنانچہ وہ بہت گھبرایا اسے وسوسوں نے آن گھیرا، اسے وہموں نے آن دبوچا، اس نے میرے کچھ ادھورے اور نیم راضی عشقوں کو ٹٹول ڈالا۔ ادھر میں اپنی لٹک میں غلطاں، اپنی سوچ کے سمندر میں غرق! پھر میرا دوست طیش میں آ گیا۔ اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں پشیمان، میں نادم، غرض اس کی زبان پہ جو کچھ آیا اس نے کہہ ڈالا، پھر اس نے پھنکارتے ہوئے براہِ راست مجھ سے سوال کر ڈالا: "کیا ابھی تک اس مشغلے سے دل بھرا نہیں؟" میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا، وہ مجھ سے جواب چاہتا تھا۔ میں عجیب کشمکش میں تھا۔ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ سچ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بالآخر ہمت کی اور کہہ ڈالا "دل

ابھی تک نہیں بھرا۔"

اس کا دھیان قلوپطرہ کی طرف نکل گیا، مونا لیزا کی طرف نکل گیا میرا دھیان نقوش کے خالی صفحات کی طرف نکل گیا۔ جس پر میں نے ابھی لاکھوں کروڑوں حروف سجانے تھے۔

میرا دوست جو میرا ضمیر تھا وہ بھی حیران تھا۔ میں بھی پشیمان تھا، میں بھی پشیمان تھا وہ بھی حیران۔"

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں نقوش کا ایک اہم نمبر میر تقی میر نمبر (نسخہ لاہور) شائع ہوا جس میں ۱۲۰۳ھ کا ایک مخطوطہ (دیوان میر نسخہ محمود آباد) شائع کیا گیا ہے اور میر کے پورے کلام کا انتخاب اور فرہنگِ میر بھی شامل کیا گیا ہے۔

"طلوع" کا آخری حصہ دلچسپ بھی ہے اور محمد طفیل کو سمجھنے میں معاون بھی ہے:

"ادھر خیالات نے پھر انگڑائی لی کہ میر خدائے سخن ہے حق ادا کرنا چاہیے اوراقِ نقوش نے غالب اور اقبال کو تو سینے سے لگایا، میر کے ساتھ زیادتی کیوں؟ اس لیے ہم نے کھاتہ میر میں اپنا حساب کھول دیا، اس بار ہم پھر تقریباً دو صدیاں پرانے ایک ایسے مخطوطہ کو منظر عام پر لا رہے ہیں جس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔

آپ نہ جانے کیا محسوس کرتے ہوں میں تو ایسی ادبی دستاویزات کی دریافت پر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے صدیوں کو لمحہ لمحہ بسر کیا ہو جیسے میرا وجود تین صدیوں پر محیط ہو۔

اس کے باوجود!

اس کے باوجود میں خاموشی سے اٹھتا ہوں اور — اپنی ایک اور نیکی کو دریا میں ڈال دیتا ہوں۔

اسی شمارے میں اقبال نمبر کی دو جلدوں کی آمد کی اطلاع اس طرح دی گئی ہے:

علامہ اقبال پر دو جلدیں اور (یعنی تیسری اور چوتھی جلد) ان جلدوں میں علامہ اقبال کی غیر مطبوعہ تحریریں ہیں۔ میر نمبر کے بعد اب وہی پیش کی جائیں گی اور ۱۹۸۰ء میں!

ان جلدوں کے بغیر اقبال کے سلسلے میں ہمارا علم، ہماری معلومات نامکمل رہیں گی۔"

لیکن یہ تیسری اور چوتھی جلدیں آج تک کسی سبب شائع نہیں ہو سکیں۔

نومبر ۱۹۸۰ء میں میر تقی میر نمبر ۲ شائع ہوا، جس کے "اس شمارے میں" محمد طفیل لکھتے ہیں:

"میں نے بہت کم نمبروں کو اس طرح مدون و مرتب کیا، جیسا کہ اس نمبر کو مثلاً غالب پر جو نمبر پیش کئے ان کے لئے نئے مضامین لکھوائے، اقبال پر جو نمبر پیش کئے وہ بھی سب کے سب نئے مضامین تھے مگر اس نمبر کے لئے دل نہ مانا کہ نئے مضامین لکھوائے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ میر کے عشق میں اہلِ قلم نے از خود اتنے اچھے مضامین لکھ رکھے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی نئی سعی کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود بھی عنوانات کے تحت نئے مضامین لکھوانے کی ضرورت تھی وہاں لکھوائے بھی گئے چند مضامین میں حک اضافہ

کی بھی ضرورت تھی۔ وہاں یہ کچھ بھی ہوا۔"

اُور آخر میں اقبال نمبر کے سلسلے میں یہ بھی تحریر کیا :

> ابھی مجھ پہ علامہ اقبال کے سلسلے میں قرض باقی ہے۔ مزید دو شمارے مرتب کئے بیٹھا ہوں، نادر اور نایاب مواد پر مشتمل ان شاء اللہ انھیں بھی جلد پیش کروں گا۔ اتنا عرصہ جو قلمی اعتکاف کیا ہے اس کا اظہار تو ہوگا اس کا اجر تو ملے گا۔"
>
> اجر؟
>
> ہاں اجر، اگر یہ تسلی اُمید یقین بھی نہ ہوتا تو پھر کون مرتا ہے؟"

میر تقی میر نمبر ۳ اگست ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جسے میر صاحب کی فارسی اور اُردو مخطوطات سے متعلق ایک دستاویز قرار دیا گیا۔

لیکن اس تیسرے میر تقی میر نمبر سے پہلے ادبی معرکے نمبر (دو جلدوں میں)، انیس نمبر، عصری ادب نمبر اور رسولؐ نمبر کی ۱۳ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔

نقوش کا ادبی معرکے نمبر کی دو جلدیں ستمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئیں جن کی مشمولات کو "زبان کے نام پہ معرکے"، "بہ سلسلہ زبان صوبوں کے نام پہ معرکے" "تحقیق کے نام پہ معرکے"، "شعر و ادب کے نام پہ معرکے"، "موضوع زیرِ بحث پر مقالے"، "شخصی معرکے" (معرکہ سخن)، "معرکہ آرائی پر ایک ابتدائی کتاب" جیسے موضوعات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ سارے مضامین دونوں جلدوں کے ۱۲۸۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

ادبی معرکہ نمبر کے پہلے حصے کے "طلوع" میں مدیرِ نقوش نقوش سے اپنی وابستگی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

> "آج عید کا دن ہے لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشیاں منائیں گے میں تو زیادہ تر وقت نقوش کی رفاقت میں گزاروں گا کیونکہ میری عید اس دن ہوتی ہے جس دن نقوش کا کوئی نمبر مکمل ہوتا ہے جتنی عیدیں میں نے منائی ہیں کم کسی نے منائی ہوں گی کیوں کہ میری تو یہ ۱۲۷ ویں عید ہے۔
>
> میں نے نقوش کی ہر پیشکش کے وقت یہ بھی سوچا کہ میں جو نمبر چھاپ رہا ہوں اس کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ ایسا میں اس لئے سوچتا ہوں کہ کسی طور اگر میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکوں کہ ضرورت نہیں ہے تو میں اس ذہنی کرب سے بچ سکوں گا جس سے کہ مجھے دوچار ہونا پڑے گا چنانچہ سوچ کے پھندے ملتے ہیں۔
>
> "ضرورت ہے۔"
>
> "ضرورت نہیں ہے۔"
>
> ذہنی گھمسائی میں اگر جواب ضرورت نہیں ہے والا درست لگا تو مارے خوشی کے عجب عجب حرکتیں

کرتا ہوں سیٹی بجاتا ہوں فضول خرچی کرتا ہوں، کسی کو چھیڑتا ہوں ۔

اگر جواب ضرورت ہے والا درست لگا تو پریشان ہو جاتا ہوں، اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔

نظر آتا ہے ۔

سال چھ مہینے کی سزا ہو گئی وہ بھی بامشقت اور بارہ روپیہ !

سوال یہ ہے کہ جب یہ کام ذہن پر بار ہے تو پھر کیوں زندگی سے چمٹا ہوں؟ جوانی نذر کر دی تو باز نہ آیا صحت لٹا دی تو باز نہ آیا۔ آنکھوں کا نور دیا تو باز نہ آیا۔ آخر کیوں جواب کبھی نہ ملا۔

ایک خوبی اس نمبر کی یہ بھی ہے کہ اس میں ادیبوں کو کارٹونوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے یہ نمبر اور زیادہ دلچسپ بن گیا ہے۔ دوسرے حصہ کے "طلوع" میں کچھ اپنی کہانی سنائی ہے اور بہت کچھ آدمی سے متعارف کرنے کی کوشش کی ہے جو مطالعہ کے لائق ہی نہیں دل میں رکھنے کے لائق ہے :

”میں نے ۱۹ / ۲۰ ویں شمارے سے نقوش کی ادارت کا آغاز کیا تھا، پتا ہی نہ چلا کہ نمبروں کی سنچری ہو گئی۔ کیا کیا ہے اس پر دھیان نہیں رہتا بلکہ کیا کرنا ہے ساری توجہ اس پر مرکوز رہتی ہے خوشیوں کی ساعتیں بھی یوں گزر گئیں جیسے خوشی کی بات نہ ہو۔ اپنا ہوش نہ رہے۔ اس کی لذت سب کہاں جانتے ہیں۔

اگر عرصہ کو دھیان میں رکھتے تو سلور جوبلی مناتے، اس لئے کہ اس بکھیڑے میں پڑے تیس برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا، نوجوانی نے بڑھاپے کی سرحد پر قدم رکھ دیا۔ قلانچیں بھرنے کے بجائے لاٹھی ہاتھ میں پکڑنے کا وقت آ گیا، کہاں سے چلا تھا۔ کہاں پہنچ گیا۔

ادھر انسان کا بھی بھید نہ کھلا، آدمی ایک، روپ سو، مدعا یہ کہ آدمی دن میں کئی بار بدلتا ہے کسی لمحہ کچھ ہوتا ہے کسی دوسرے لمحہ کچھ ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا، یہی حال ایک اچھے آدمی کا ہے۔

بات واضح یوں ہوئی کہ ایک آدمی ابھی کچھ ہوتا ہے، کوئی خبر سنتے ہوئے یا ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے وہ کوئی دوسرا آدمی بن سکتا ہے اس آواز پر جو کہ اسے سنائی دی، اس کے اچھے یا بُرے آدمی ہونے کا انحصار ہو سکتا ہے ۔

تماشا یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر فرد، دوسرے فرد کے خلاف ہے، یہ ہماری سرشت کا ادّعا ہے اگر آپ کاروبار کرتے ہیں تو ہر شخص آپ کے منہ سے نوالہ چھین رہا ہوگا، اگر آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں تو ہر جونیئر آپ کی کرسی کھسکا رہا ہوگا، اگر آپ ادیب اور شاعر ہیں تو معاملہ زیادہ سنگین ہوگا، لیکن عام آدمی اور ادیب میں فرق ہوتا ہے (بشرطیکہ نیتوں میں ٹیڑھ نہ ہو) عام آدمی غصہ میں آ کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کرتا ہے۔ مگر ادیب غصہ میں آ کر دوسروں کا بھلا کرتا ہے، کیونکہ اس کی کٹار نہیں چلتی قلم چلتا ہے ۔

قلم کی انھیں جولانیوں سے یہ نمبر آراستہ ہے علمی موشگافیوں کی ضرب تقسیم بلکہ تفریق سے ادب کا بھلا ہو گیا۔ یہ میرا بیان ہے یاد رہے کہ ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا۔ یہ بھی میرا ایقان ہے۔"

نومبر ۱۹۸۱ء میں انیس نمبر "نسخہ، لاہور" شائع ہوا۔ یہ نمبر ۲۹ نایاب اور غیر مطبوعہ مرثیوں باقیات انیس، ترتیب و مقدمہ (ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری) تصاویر، میر انیس کا شجرہ، میر انیس مختصر تعارف (سید مسعود حسن رضوی) قطعہ تاریخ، مطالعہ انیس (سید احتشام حسین) کے ساتھ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ "طلوع" میں محمد طفیل اپنا مخصوص اور منفرد انداز اختیار کر کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں چند سطروں میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جن کے لئے اوراق چاہئیں، ملاحظہ کیجیے:

> "میرے دل میں کاموں کا میلا لگا ہے لفظی دکانیں سجی ہیں، لفظ میرا نام لے کر مجھے پکارتے ہیں، مجھے رکنا پڑتا ہے، لفظ مجھ سے کہتے ہیں "ہمیں اپناؤ، ہمیں اپناؤ" میں انسان ہوں، میرے بس میں سب کچھ نہیں اس لئے سارے لفظوں کا کہا نہیں مان سکتا یا ایک ساتھ نہیں مان سکتا، لہٰذا انھیں اپنے دل میں بسا لیتا ہوں، باری باری ان کے قریب جا کر بیٹھ جاتا ہوں احوال سنتا بھی ہوں، احوال سناتا بھی ہوں۔
>
> لفظ کہتے ہیں: ہم ایک صدی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم دو صدیوں سے! احسان مندی کے جذبے سے میری گردن جھک جاتی ہے۔
>
> ہاں اب کے جو احوال سنا تو جسم کانپنے لگا، دل ڈوبنے لگا، میں نے لفظوں سے بار بار کہا خدا کے لیے چپ ہو جاؤ! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔
>
> مگر الفاظ بضد تھے سنو، سنو!
>
> مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ملکوتی آواز فردوسیٔ وقت میر انیس کی ہو، جو ذہنی قوتوں کی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔
>
> ذکر نواسہ رسولؐ کا تھا، ذکر حضرت عباسؓ کا تھا، ذکر علی اصغر کا تھا، ذکر حضرت زینب کا تھا، ذکر حضرت کلثوم کا تھا، غرض وہ ذکر سنا نہ جاتا تھا کپکپی طاری ہو گئی۔
>
> جب اپنے آپ کو سنبھالا، تب وہ الفاظ جو میں نے سنے تھے جو لفظوں کے نگینے تھے، انھیں یکجا کیا تاکہ دولت بیدار کو حق داروں کے حوالے کر سکوں! وہ تو ہو گیا۔
>
> مگر ان الفاظ کے سننے میں جو کیفیت مجھ پر وارد ہوئی وہ آپ پہ اس وقت تک طاری نہیں ہو سکتی جب تک میری طرح آپ بھی لفظوں کے کربلا میں کھڑے نہ ہوں۔"

اور اسی نمبر میں صفحہ ۱۵۶ پہ "عمرِ مختصر" کے تحت اپنے ایک نئے عزم کا اعلان کرتے ہیں:

> "اس عمرِ مختصر میں، ابھی مجھے بڑے کام کرنا ہیں، توفیق ہوتی ہے یا نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم! زندگی نے میری خواہشوں کا ساتھ دیا تو میں میر انیس کا سارا کلام (چار جلدوں میں) چھاپوں گا۔

> اس لئے کہ جتنے نسخے ملتے ہیں، وہ بڑے ناقص ہیں، ہزاروں اغلاط سے بھرے ہوئے ہیں، اور اس کام میں میرا ساتھ ڈاکٹر اکبر حیدری ہی دیں گے۔
>
> اس کام کے لئے ہمارے ذہن میں جو نقشہ ہے وہ تو منفرد ہے اگر ہمیں کامیابی ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس موضوع پر دنیا کی لائبریریاں آپ کی جھولی میں ہوں گی!

نقوش کا عصری ادب نمبر ستمبر ۱۹۸۲ء میں آیا تو محمد طفیل بارگاہ خداوندی میں شکر گزاری کے کلمات اس طرح ادا کرتے نظر آتے ہیں:

> "نقوش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے سربراہان مملکت نے سراہا، توصیفی کلمات سے نوازا، زندہ ادب کا ترجمان قرار دیا۔
>
> اعزاز یہ بھی ہے کہ اہلِ قلم کے ہر طبقہ نے اس کی کارگزاریوں کو سراہا۔ پھر ایک نسل نے نہیں دو نسلوں نے سراہا، وہ جو کل بوڑھے تھے، وہ جو آج جوان ہیں۔ اللہ تیرا شکر۔"

اس دوران میں رسولؐ نمبر کی تیرہ ۱۳ جلدیں آئیں، رسولؐ نمبر کا اعلان کئی سال سے ہو رہا تھا۔ جب یہ جلدیں آنا شروع ہوئیں تو دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پڑھنے والوں کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، عاشقان رسولؐ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے، ہر طرف سے مسرتیں جھلملا اٹھیں، ہر طرف سے پاکیزہ جذبات مچلنے لگے، سب نے محمد طفیل کو عقیدت اور محبت کی آنکھوں سے دیکھا، دل میں محترم جگہ دی۔ بلاشبہ اس عہد کے لوگوں کو ہمیشہ فخر رہے گا کہ اس عہد نے محمد طفیل کو پیدا کیا جس نے رسولؐ نمبر کی کئی قیمتی جلدیں پیش کر کے انھیں بھی دونوں دنیا میں سرخروئی عطا کی۔ خود محمد طفیل نے اس نمبر کے لئے تحریر کیا ہے:

> "رسولؐ نمبر کا قصہ یہ ہے کہ یہ موضوع میرے دل کی گہرائیوں کا موضوع تھا اور ہے اس نمبر پر میں نے اپنے تمام نمبروں سے زیادہ محنت کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے جملہ نمبروں پر اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ اس پاک موضوع پر تو یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا آپ مانیں یا نہ مانیں، میرا خدا تو جانتا ہے وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔"

رسولؐ نمبر کی اشاعت پر محمد طفیل اِن خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> "آج ۱۹۸۲ء میں پورے اٹھارہ برس کے بعد، اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے وہ حاصل زندگی نمبر پیش کر رہا ہوں کہ جو میرا منتہا تھا۔
>
> ۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجودہ اور مرحوم شخصیتوں سے اعلیٰ ہے افضل ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے جس سے دین اور دنیا کا ٹانکا جڑا ہوا ہے۔
>
> آج میری وہ آرزو پوری ہوئی جس کے لیے برسوں بے کل رہا آج میں کہہ سکتا ہوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں وہ کم ہوں گے۔

کیونکہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہوں۔"

رسولؐ نمبر جلد ۱۳ کی اشاعت کے بعد یہ اعلان ہوا :

"رسول نمبر کی ۱۳ جلدیں چھپ چکی ہیں، مزید ۲ جلدیں چھپیں گی۔ اس طرح کل ۱۵ جلدیں ہونگی جن کے مجموعی صفحات ۱۲۰۰۰ سے زائد ہوں گے ان شاء اللہ العزیز! آخری ۲ جلدیں تمام عالم اسلام کے سیرتی ادب سے متعلق ہوں گی۔"[1]

نقوش کا میر تقی میر نمبر ۳ جب اگست ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا تو محمد طفیل کہہ رہے تھے :

"میں جو ادب کا جویا ہوں نگری نگری گھوما، راہِ طلب میں دوستوں نے دستگیری کی غالب میر اور انیس کے نوادرات جھولی میں ڈال دیئے۔

لوگ صدیوں سے سو رہے تھے مگر بعد میں آنے والا ایک شخص جاگ رہا تھا بالآخر وہ ایک شخص بھی سو جائے گا۔

بے شک مقدر خود بنایا جاتا ہے مگر مقدر کا ایک خانہ قدرت خود پُر کرتی ہے۔"

اس نمبر میں بقیہ رسولؐ نمبر کے سلسلے میں اپنی مصروفیات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان دنوں میرا بیشتر وقت رسولؐ نمبر کی بقایا جلدوں کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ میں وسیع پیمانے پر اس نمبر کی اشاعت کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔ بڑی تھوڑی تعداد میں چھاپا ہے صرف مسوداتی اشاعت کے طور پر۔ دعا کیجیے کہ ایسے دیگر نوادرات کو بھی منظر عام پر لا سکوں زندگی کا کیا بھروسہ پل پل کو دھیان میں رکھنے کے باوجود ابھی بہت کچھ میری تحویل میں ہے۔

بہر حال اس نمبر کی اشاعت سے "مطالعہ" کا ورق مکمل سمجھا جائے!"

نقوش کا سالنامہ جون ۸۵ء میں آیا تو اس شمارے میں "محمد طفیل، محمد نقوش کی زبانی یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں :

"میں ناتواں اور بے کس تھا اس کے باوجود مجھ پر اللہ تعالیٰ کے بے حد و حساب کرم اور احسانات، شمار کروں تو گنتی بھول جاؤں!

رسولؐ نمبر کی تیرہ جلدوں کے بعد یہ نمبر منظر عام پر آ رہا ہے۔ اِس کے تقاضے کچھ ہیں اُس کے تقاضے کچھ تھے، جیسے ایک سچ ہو دوسرا جھوٹ۔ مگر مجھے "جھوٹ موٹ کا ادب" بھی بے حد عزیز ہے کیوں کہ اس سے بھی آدمی کو انسان بنایا جا سکتا ہے۔"

اور آخر میں بتلاتے ہیں :

---

[1] رسولؐ نمبر جلد ۱۳ ص ۶۵۴۔

"میں اپنے اداریوں میں مرنے والے کا ماتم نہیں کرتا کیونکہ میرے جاننے والے، لکھنے والے زندہ تحریروں کے خالق ہوتے ہیں وہ اپنے فن کی تابانیوں میں سدا زندہ رہیں گے ان کا فن آمدہ تحریروں میں عکس ریز رہے گا۔ فیض احمد فیض چلے گئے تو کیا وہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے؟ نہیں ایسا نہیں، وہ اپنے عہد میں بھی زندہ تھے وہ آنے والے عہدوں میں بھی زندہ رہیں گے۔ راجندر سنگھ بیدی جو اردو افسانے کا خدا تھا وہ بھی دور ہو گیا مگر فوت نہیں ہوا۔ جب تک اردو افسانے پر بیدی کا اثر رہے گا وہ کیسے مر سکتا ہے؟

یہ لوگ اپنا اپنا رول ادا کر کے چلے گئے ہمیں بھی اپنا رول ادا کرنا ہے وہ بھی اس طرح کہ کوئی ہمارا نام مٹا نہ سکے۔

پیغمبر دوسروں کی خاطر جیتے ہیں ہمیں بھی اس سنت پر عمل کرنا چاہیے۔"

اور نقوش کی اسی جلد میں اپنی کتھا اس طرح "طلوع" میں سناتے ہیں:

"میں اپنی کتھا لکھتا ہوں۔

کتھا تو لکھ رکھی ہے مگر آپ کو ورق الٹنے پڑیں گے وہ بھی ایک دو نہیں بلکہ نصف لاکھ سے زیادہ صفحات۔ ان میں لگن تڑپ اور جان کنی کے کئی مراحل سامنے آئیں گے۔!

یہ دیکھیں — جب میں نے سیرت ابن اسحاق کو تیرہ سو برس کے بعد پہلی بار اردو میں پیش کیا تو میرا سینہ تن گیا تھا، وہ تاریخی دستاویز جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ضائع ہو چکی ہے اس کا منصۂ شہود پر آجانا ایک ان ہونی بات کا ہو جانا تھا جیسے خدا کا آسمان سے زمین پر اتر آنا تھا۔

یہ پڑھیں — یہ غالب کی وہ بیاض ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں گم ہو گئی تھی اسے بھی پہلی بار نقوش کے صفحات پر ہی پڑھا گیا۔ اس کی دریافت بھی ایک دوسرے امریکہ کی تھی۔

یہ دیکھیں — آپ کو میر تقی میر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ملے گا۔ اس کی اشاعت بھی کسی عجوبے سے کم نہ تھی۔ میر اور غالب دونوں ایک دوسرے سے بڑے شاعر ہیں۔

یہ پڑھیں — آپ کو میر انیس کے متعدد غیر مطبوعہ مرثیے ملیں گے۔ ایک طبقہ کے مطابق تو انیس جملہ شاعروں سے بڑا شاعر ہے مگر اتنا تو ہے کہ اردو شاعری کو دوسرا انیس نہ ملا۔

یہ دیکھیں — آپ کو علامہ اقبال کی بھی متعدد غیر مطبوعہ تحریریں ملیں گی جبکہ ایک پورا نمبر غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل چھپ بھی رہا ہے۔ اقبال جو اس صدی کا بڑا شاعر ہے وہ اور بھی بڑا نظر آئے گا۔

یہ پڑھیں — پہلے صفحہ سے لیکر آخری صفحے تک یہ دیکھ اور پڑھ لیجیے کہ عصری ادب کو نقوش نے کتنی اہمیت دی وہ کون سا بڑا ادیب ہے جو اس میں نہیں چھپا وہ کونسی بڑی تخلیق ہے جو اس میں نہیں چھپی۔ تنقید اور تحقیق کو معتبر بنایا، متعدد غیر فانی تخلیقات چھاپیں۔

یہ دیکھیں — اس میں آپ کو جملہ مشاہیر کے غیر مطبوعہ شہ پارے ملیں گے مثلاً سر سید احمد خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں تو اپنے حسابوں ادب کے خزانے میں ایک ورق جمع کرانے کو بھی بڑی بات سمجھتا ہوں چہ جائیکہ اتنا کچھ۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ادب میں خدائی کا دعویٰ کر دیتا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے تو بڑے خدا سے ڈر لگتا ہے۔"

محمد طفیل نقوش کے ذریعے اپنی داستانِ حیات یہیں تک سنا سکے تھے کہ اچانک شاید انھیں کسی اور اہم کام کی یاد آگئی اور وہ اس ناپائیدار دنیا سے یک بیک رخصت ہو گئے۔ پھر تو سب شائقینِ نقوش اور عاشقینِ محمد طفیل ہکا بکا رہ گئے، سناٹے میں آ گئے، ۔۔ ان کے کان طفیل کی کہانی سننے کے لیے بے چین، آنکھیں داستانِ حیات پڑھنے کے لئے مضطرب، دل محمد طفیل کے عظیم نمبروں کو دیکھ کر لذت یاب ہوتے کے لیے بے کل — تو پھر کیا ہوا؟ تو پھر کیا ہوا؟ یہی سب کے ذہن میں گونج اٹھا اور سوالیہ نشان بن گیا۔ "طفیلیات" کے شیدائی طفیل کے لیے پریشان اسے کہاں ڈھونڈیں؟ اسے کہاں پائیں؟

میں بھی حیران و پریشان اس کی تلاش میں نقوش کی نئی پرانی جلدوں کے مطالعہ میں لگ گیا کہ نقوش ان کا پرانا ساتھی تھا۔ تنہائی کا، مجلس کا، خوشی کا، غم کا — امید و ناامیدی کا سہارا تھا، یقین و عمل کا آئینہ تھا اور کامیابی و کامرانی کا حاصل تھا۔

محمد طفیل نے محمد نقوش بن کر واقعی بڑا کارنامہ انجام دیا اور نقوش نے محمد طفیل بن کر دنیائے علم و ادب میں انمول خزانہ لٹا دیا۔ اس کے "طلوع" اور "اس شمارے میں" نے مختلف انداز، مختلف حالتوں میں، مختلف خواہشوں کے ساتھ، مختلف آرزوؤں میں مبتلا جہدِ مسلسل کی آزمائشوں سے گزرتے ہوئے، محنت و مشقت کرتے ہوئے، تفکرات میں ڈوبے ہوئے عزائم سے سرشار، بلند حوصلہ، حالات پر قابو پانے کے لیے۔ کچھ اپنے اور بہت کچھ دوسرے کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کی تگ و دو میں مصروف، محمد طفیل کو کبھی پیشِ پردہ کبھی پسِ پردہ مختلف حالتوں میں بتایا، مختلف کیفیتوں میں دکھایا، اس کے ہر ورق پر محمد طفیل کی عظمت کی کہانی جھلکتی ہے، خدمتِ ادب کے لیے اس کی تڑپ ظاہر ہوتی ہے اور اس کی مدیرانہ شان جھانکتی ہے اور اپنی عظمت منواتی نظر آتی ہے۔

ان کے اداریے "طلوع" ان کی انفرادیت اور بے مثال صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ محمد طفیل اپنی سادہ زبان، عام فہم الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سے بڑی بات کہہ گئے ہیں لیکن کہیں اپنی عالمانہ بڑائی کی دھونس ڈالنے کی کوشش کرتے نظر نہیں آتے نہ اپنی کامرانیوں سے مرعوب کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے اداریے کبھی واقعات کے پیچھے پیچھے ظاہر ہوتے ہیں کبھی افسانوی انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی دلچسپ ادب پارہ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کبھی زندگی کے اہم تجربوں کے پیچھے پیچھے اپنی بات پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نقوش کی ابتدا سے آخر تک یہ سارے اداریے "طلوع" کی صورت میں اردو کی ادبی صحافت میں مختصر ہونے کے باوجود نہایت منفرد اور اہم ہیں، محمد طفیل نے ان کے ذریعے ادبی اداریہ نگاری میں ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ یہ اداریے ہر زمانے میں اپنی قدر و قیمت اور انفرادیت کی اہمیت کی وجہ سے محترم سمجھے جائیں گے اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ "طلوعِ نقوش" سے نئی ادبی صحافت نگاری کا سورج طلوع ہوا ہے۔ جس کی روشنی میں ہم مکمل محمد طفیل کو دیکھ سکتے ہیں پہچان سکتے ہیں۔

محمد نقوش کا اسلوب تحریر

طلوع اور خطوط کی روشنی میں

اکبر حیدری کاشمیری

محمد طفیل المعروف بہ محمد نقوش کی ذات محتاج کی تعارف نہیں تھی، وہ ۲۵ سال تک اُردو ادب کی پُر خلوص خدمت کرتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی اور مشہور و معروف ترین اُردو رسالہ نقوش کے ایڈیٹر تھے بلکہ چوٹی کے صاحب طرز خاکہ نگار بھی اس فن میں صاحب، جناب، آپ، محترم مکرم، معظم، محبی اور مخدومی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ یہ کتابیں ادب لطیف میں اعلیٰ شہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ مرحوم بے حد ذہین، شگفتہ مزاج اور نہایت ہی مہذب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دماغ وسیع اور سلجھا ہوا تھا، نقوش کے خاص شماروں کے لئے مواد جمع کرنے میں وہ گویا معجزنما تھے۔ ایسی ایسی چیزیں حاصل کرتے تھے جو دوسرے کے بس میں نہیں تھیں۔

طفیل صاحب تو خالق حقیقی سے جا ملے اور اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن وہ اپنے عظیم اور شاندار کارناموں کی وجہ سے زندۂ جاوید رہیں گے انہوں نے عرصۂ دراز سے بڑے بڑے ادیبوں، ناقدوں اور محققوں کے دلوں پر اپنی عظمت اور کارکردگی کے گہرے نقوش مرتب کئے ہیں۔ رسالہ نقوش پہلی مرتبہ جناب احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں مارچ ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے بعد یکم مئی ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۵۱ء تک جناب سید وقار عظیم مرحوم اس کے مدیر رہے تھے اپریل ۱۹۵۱ء سے مرحوم طفیل صاحب نے آخری وقت تک اس کی عنان ادارت اپنے ہاتھوں میں سنبھالے رکھی اور نقوش ان کی ذاتی دلچسپی اور مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے خوب سے خوب تر شائع ہوتا رہا۔ انہیں نقوش کے ساتھ اتنی بے پناہ محبت اور عقیدت تھی کہ اس کی بدولت وہ محمد نقوش، محمد اردو اور محمد رشک ہو گئے ہیں۔ انہیں محمد نقوش کہنا بے حد پسند تھا اس لئے محمد طفیل کے بدلے وہ محمد نقوش اکثر لکھا کرتے تھے۔

اُردو ادب کے لئے جتنا کام طفیل مرحوم نے کیا اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی ہے ہم نے بڑے بڑے خوبصورت رسالوں کو چھپتے دیکھا ہے لوگ ابتدائی پرچے بڑی دھوم دھام سے نکالتے ہیں۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصے میں خود اپنی موت آپ ہی مر جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے رسائل غیر معیاری ہوتے ہیں اور ان کے مالکوں میں ثبات قدم کا فقدان ہوتا ہے۔ برعکس اس کے طفیل مرحوم کے عزائم و استقلال غیر متزلزل تھے وہ جو کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ نقوش کے خوب سے خوب تر خصوصی شماروں میں سب کچھ داؤ پر لگا کر خسارے میں رہتے تھے گونا گوں مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلتے تھے اور پھر جب کوئی خصوصی نمبر شائع ہوتا تھا تو چلو بھر خون بڑھتا تھا اور اطمینان کا سانس لینے لگتے تھے۔

طفیل صاحب میں جدت طرازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ نقوش کا ہر شمارہ

لوگوں کے سامنے متنوع مضامین اور اعلیٰ علمی ہیئت کی صورت میں آجائے انہوں نے میری رائے میں نیرنگ خیال لاہور کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن سے بھی استفادہ کیا تھا۔ حکیم صاحب نے نیرنگ خیال میں خاص نمبروں کی طرح آج سے ۵۰ ـ ۵۵ سال پہلے ڈالی تھی اور عید نمبر، اقبال نمبر، تقویم نمبر اور سالنامہ کے خصوصی نمبر پیش کئے تھے۔ اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت سے پورے ملک میں حکیم صاحب نے لوگوں کے دلوں پر اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس نمبر کی ضخامت ۴۱۶ صفحات کے قریب تھی اور قیمت ۱۲ روپے یہ پرچہ میرے پاس موجود ہے۔ اسی زمانے میں دہلی میں ایک مذہبی رسالہ "پیشوا" کے نام سے چھپتا تھا جب "پیشوا" کا رسول نمبر ۱۵۰ صفحات میں چھپا تو ملک کے طول و عرض میں "پیشوا" کا چرچا ہونے لگا۔ اس خاص نمبر کی قیمت ۸ آنے تھی مرحوم طفیل نے درجنوں دیدہ زیب اور بھاری بھرکم خصوصی نمبر شائع کئے۔ ان کا ہر خصوصی شمارہ بطور سند پیش کئے جانے کے قابل ہے۔ اگر موصوف عمر بھر کچھ نہ کرتے اور صرف رسولؐ نمبر ہی شائع کرتے تو ان کا نام زندۂ جاوید رہتا ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ خاموشی سے کام کرتے تھے۔ اُنہوں نے ۱۲ سال پہلے رسولؐ نمبر کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے بھی خط لکھا بیچ میں کئی خاص شمارے شائع کئے جن میں غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، ادبی معرکے نمبر وغیرہ شامل ہیں، میں سمجھا تھا کہ طفیل صاحب نے غالباً رسولؐ نمبر کی اشاعت کا ارادہ ترک کر لیا ہوگا اسی لئے میں نے بھی اس کے لئے استفسار نہیں کیا۔ ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد جنوری ؁۱۹۸۳ء میں اچانک مجھے رسولؐ نمبر کی چار جلدیں رجسٹری ڈاک سے موصول ہوئیں پیکٹ پر ۹۵ روپے کا ٹکٹ چسپاں تھا اس کے بعد دو سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۸۵ء تک اس کی مزید ۹ جلدیں شائع ہوئیں اور اس طرح تیرہ جلدیں آج تک چھپ چکی ہیں، میرے خیال میں نقوش کے رسولؐ نمبر میں سیرت پاک پر جتنا مواد ایک جگہ چھپا ہے دنیا کے کسی کتب خانے میں اتنا مواد دستیاب نہیں ہوگا۔ ابھی حال ہی میں اُنہوں نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ رسولؐ نمبر کی "مزید جلدیں" وہ شائع کر رہے ہیں۔ ایک اور خط میں یہ مژدہ بھی سنایا تھا کہ اُنہوں نے قرآن نمبر کا ڈول بھی ڈالا تھا اب یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ "قرآن نمبر کی صورت میں دس ہزار صفحات سے زائد کی مثالی کاوش جس کی تکمیل تقریباً ہو چکی ہے ان شاء اللہ جلد منظرِ عام پر آنے کی منتظر ہے" علاوہ بریں تنقید نمبر، شعر نمبر، لاہور نمبر اضافہ شدہ، ادبی معرکے نمبر حصہ سوم، غالب نمبر حصہ چہارم، اقبال نمبر حصہ چہارم غزل نمبر اور کئی شماروں کی صورت میں تقریباً دس ہزار سے زائد صفحات نقوش کی زینت بننے کے لئے تیار ہیں اور نہ معلوم کتنے ہزار صفحات پر ان کی غیر مطبوعہ تحریریں نقوش کے قالب میں ڈھل کر ہمارے سامنے آ جائیں گی۔

محمد طفیل کے قلم میں جادو کی تاثیر تھی۔ نقوش کے ہر نمبر میں ان کی دو اسپیشل تحریریں ہوتی تھیں (۱) "طلوع" (۲) "اس شمارے میں"۔ ان دونوں تحریروں میں وہ ایسے خوبصورت اور معنی خیز چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال کرتے تھے جن پر مجھے انتہائی حیرت ہوتی تھی۔ ان دونوں تحریروں کا انداز بیان دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتا تھا طرز اسلوب کی یہ شان ان کے خطوط اور مضامین میں بھی جلوہ گر ہے اور اس فن میں وہ صاحب طرز اور منفرد ہیں۔ ذیل میں ان کے "طلوع" کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں (۱) افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء — کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بے حد ذہین اور موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر اتر آتا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔ مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔"

۲۔ غزل نمبر طبع ثانی ۱۹۵۶ء۔ "شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ۔ اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کے انتخاب سے شعر بہ شعر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتحپوری مومنؔ کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں اس کی نیت پہ شک نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ بخلوص تمام ایسا سمجھتے بھی ہوں گے یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومن غالب سے بڑا شاعر تھا یا غالبؔ مومنؔ سے۔ کلیم الدین احمد نے تو اس صنف سخن ہی کو نیم وحشی قرار دے دیا ہم ایسے جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔"

۳۔ غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء۔ "اس شمارے میں"۔ ادب کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے۔ زمان و مکان سے آزاد۔ غالبؔ نے بھی بھلا یہ کب سوچا ہوگا کہ میرے عشاق میں پنجاب کا مسمی محمد طفیل بھی ہوگا جو یوں میرے لئے اپنی جان ہلکان کرے گا۔ ادھر اقبال کی روح بھی مجھ ایسوں سے فریاد کر رہی ہے۔ آواز آ رہی ہے۔ "میرا حق ادا نہ کرو گے۔ مگر اوروں کی طرح میں نے بھی اپنی آنکھیں نیچی کر لی ہیں۔ کیوں کہ میں بھی اس قوم کا فرد ہوں جو صدیوں بعد جاگتی ہے۔ کہیں ہمارا رشتہ اصحاب کہف سے تو نہیں؟" محمد نقوش

۴۔ ادبی معرکے نمبر ۱ طلوع ستمبر ۱۹۸۱ء۔ "آج عید کا دن ہے۔ لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشیاں منائیں گے۔ میں تو زیادہ تر وقت نقوش کی رفاقت میں گزاروں گا۔ کیونکہ میری عید اسی دن ہوتی ہے جس دن نقوش کا کوئی نمبر مکمل ہوتا ہے جتنی عیدیں میں نے منائی ہیں کم، کسی نے منائی ہوں گی۔ کیونکہ یہ میری ۱۶۷ویں عید ہے۔ میں نے نقوش کی ہر پیش کش کے وقت یہ بھی سوچا کہ میں جو نمبر چھاپ رہا ہوں اس کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ ایسا میں اس لئے سوچتا ہوں کہ کسی طور اگر میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکوں کہ ضرورت نہیں ہے تو میں اس ذہنی کرب سے بچ سکوں گا جس سے کہ مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ سوچ کے پہیے چلتے ہیں۔"

(۵) رسولؐ نمبر ۱ دسمبر ۱۹۸۲ء۔ طلوع۔ "میں ادبی گنہگار ہوں۔ دربار رسولؐ تک کون سا جذبہ لے آیا۔ میں نہیں جانتا مجھے اپنے آپ پر کوئی اعتبار نہیں۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا اس کی بھی توفیق نہ تھی۔ اس لئے کہ اہل نظر نے جو کچھ دیکھا وہ بھی میری سعی کا نہیں تائید ایزدی کا نتیجہ ہے میرے حصے میں کیا آیا! حیرانی اور صرف حیرانی۔ آج بھی جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہوں یہ توفیق نہیں انعام ہے کیونکہ مجھے اپنے گناہوں کا حال اوروں سے بھی زیادہ معلوم ہے۔ مجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے وہ لے رہا ہے کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ میری گنہگاری اپنی جگہ۔ توفیق ایزدی اپنی جگہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرے اس سفر شوق کا حال، کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے؟

میں حاضر ہوں یا رسولؐ اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔"

طفیل مرحوم نے ابتدا سے آخری عمر تک نقوش کے تمام شماروں کے "طلوع" اور "اس شمارے میں" اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ نقوش کا آخری شمارہ سالنامہ نمبر ۱۳۲ ان کے انتقال کے بعد ستمبر ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا انہوں نے چند صفحات اور ایک مضمون کے علاوہ پورا شمارہ خود ہی ترتیب دیا تھا۔ طلوع بھی انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے البتہ موت نے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اس شمارے کا "اس شمارے میں" اپنے قلم سے لکھتے۔ اس نمبر کا "طلوع" بھی واقعی حیرت انگیز ہے۔ آپ بھی

ان کے طرزِ تحریر سے لطف اندوز ہوجئے، لکھتے ہیں کہ :۔

"جب وہ وقت آیا کہ میری کاوشوں کی پذیرائی ہونے لگی، حاکمِ وقت کو بھی یہ خیال گزرا کہ یہ شخص جو سر نیہوڑائے ۲۵ برس سے ادبی جہاد میں مصروف ہے اس کے بارے میں یہ تو سوچ لیا جائے ۔ یہ تو دیکھ لیا جائے کہ وہ کس حال میں ہے ... وہ دن آیا کہ مجھے اعزاز کے لئے اسلام آباد طلب کیا۔ جب انعام اور حق کے درمیان فیصلے کا وقت آیا تو میری ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا دل مطمئن ہونے لگا انعام کے لئے میرا نام پکارا جا رہا تھا اور میں والدین کے ایصالِ ثواب کی خاطر سورۂ فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بار بار پڑھ رہا تھا.... صدرِ مملکت میرے گلے میں ستارۂ امتیاز کا ہار ڈال رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا۔ اے اماں، تیری دعائیں قبول ہوگئیں تیری دعائیں قبول ہوں گی ۔

محمد نقوش، خاکہ نگاری میں بھی صاحب کمال تھے اُنہوں نے اس فن میں آٹھ کتابیں لکھ کر شائع کیں ان کے نام یہ ہیں :۔ ۱ صاحب ۲ جناب ۳ آپ، ۴ محترم ۵ مکرم ۶ معظم ۷ مجی ۸، مخدومی۔ یہ کتابیں ۱۵۵۸ صفحات پر مشتمل ہیں اور سب ہی کتابیں ظاہری اور معنوی اعتبار سے دلچسپ اور دیدہ زیب ہیں ان تصانیف سے طفیل مرحوم کی اعلیٰ ظرافت کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہیں وہ جس شخصیت کو بھی اپنا موضوع قرار دیتے تھے۔ بقول مجنوں گورکھپوری اس کے قیافے اس کی حرکات و سکنات اس کی بات چیت سے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی چند اہم شخصیتیں یہ ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر عبدالحق، فراق گورکھپوری، حضرت جوش ملیح آبادی، قدرت اللہ شہاب، مولانا کوثر نیازی، ہاجرہ مسرور، قتیل شفائی، ممتاز مفتی، حفیظ جالندھری، کرشن چندر، نیاز فتحپوری، طفیل صاحب نے اب تک ۶۸ شخصیتوں کے خاکے مرتب کئے ہیں ان کا شمار جدید شخصیت نگار کی حیثیت سے ممتاز ہے۔

ذیل میں ان کی خاکہ نگاری کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

"کھنکتی ہوئی باتیں صاحب تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں اہلِ حیا کے لئے واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں۔ اس لئے یہاں صرف عرض کروں گا کہ ابوالکلام کی جوانی کو حکیم (یوسف حسن) کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں"۔ (مکرم۔ حکیم یوسف حسن ص۲۱)

۲۔ "اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قد آور ہوں گے تو بھر بے چاری شخصیت دم توڑے گی۔ شخصیت نگار اسے پچھاڑ دے گا"۔ (جناب ص۹)

۳۔ جوش ملیح آبادی کے بارے میں کیا خوب کہتے ہیں۔

"جاگیردارانہ نظام کی پیداوار، مگر خود اس نظام کے جانی دشمن، بھاری بھرکم شخصیت، بھاری بھرکم کلام، ہلکا پھلکا مزاج، ہلکا پھلکا مذاق، نہ اچھے دوست، نہ اچھے دشمن، شاعر اور نہ صرف شاعر آدمی اور نہ صرف آدمی، اس کے باوجود قابلِ احترام قابلِ تعظیم، ایک موہنی شخصیت"

مرحوم بڑے دل گردے والے صاحب کمال اور ادیب تھے۔ فنِ صحافت کو اُنہوں نے وقار بخشا۔ ان کا مطالعہ بے حد

وسیع تھا لوگوں کے مضامین خود پڑھتے تھے۔ اور ان کے خطوط کے جواب خود ہی لکھتے تھے۔ پیکٹوں پر انہی کے ہاتھ کا ایڈریس ہوتا تھا اس طرح بہ نفسِ واحد وہ ایک بڑے ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر نقوش کا سودا کیا۔ اوّل اوّل خسارے میں رہ گئے۔ لیکن ہمت نہیں ہاری ثابت قدمی نہیں چھوڑی، وہ نقوش کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنا سرمایۂ حیات سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے بعض ایسے شمارے شائع کئے جنکی اشاعت سے وہ عظیم انسان عظیم صحافی اور عظیم ادیب بن گئے۔ نقوش کی ہی بدولت نقوش بلڈنگ، نقوش پریس، حج کی سعادت اور ستارۂ امتیاز بھی حاصل کیا۔ اس طرح زندگی میں دین و دنیا دونوں ہاتھ آگئے۔ یعنی دنیا میں امارت اور آخرت میں جنت رسولؐ نمبر اور قرآن نمبر کے صدقے میں۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بار بار یاد آتا ہے کہ:۔

"موت سب کچھ چھین لیتی ہے مگر وہ کسی سے اس کے کارنامے نہیں چھینتی"۔ (نیرنگ خیال اقبال نمبر طبع ثانی ص ۵۹) ابھی طفیل صاحب بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ نقوش کے کئی خصوصی نمبر زیرِ ترتیب ہیں۔ قرآن نمبر بھی ترتیب دیا ہے۔ ان کے پاس چار ہزار کے قریب غیر مطبوعہ خطوط بھی تھے اور انہیں خطوط نمبر کی صورت میں دو تین جلدوں میں چھاپنے کا ارادہ بھی تھا۔ "نوادرات نمبر" کا بھی اعلان کیا تھا اور مجھے کم سے کم بیس مضامین لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ دیکھئے اب ان نمبروں پر کیا گزرتی ہے۔

ع — آں قدح بہ شکست و آں ساقی نماند

ہمارے آپسی تعلقات صرف خط و کتابت کی بنیاد پر قائم تھے۔ ایک دوسرے کی صورت سے اجنبی اور ناآشنا۔ دونوں ایک دوسرے کے کاموں سے اتنا واقف تھے کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہر سال ہماری دو چار ملاقاتیں ضرور ہوتی رہتی ہیں۔ ہماری مراسلت آج سے کوئی ۱۸ ـ ۲۰ سال پہلے شروع ہوئی تھی اور یہ سلسلہ ۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو ٹوٹ گیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے مکاتیب نمبر کا پیکٹ ۲ جولائی سنہ مذکور روانہ کیا تھا۔ ٹکٹوں پر ۱۰۴۱۔ L. . P O CAMP کی مہر اور اس کے ساتھ ۳ جولائی کی تاریخ بھی ثبت ہے۔ غالباً یہ ان کی زندگی کا آخری پیکٹ تھا جس پر اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا ایڈریس بھی حسبِ معمول لکھا تھا۔ جب بھی مجھے ان کا خط یا کوئی پیکٹ موصول ہوتا تھا تو بے حد مسرت ہوتی تھی اور جب میرا کوئی تحقیقی مضمون ان کو ملتا تھا تو خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے اس لئے کہ میں ہمیشہ نقوش کے لئے سر پھوڑ اور سینہ توڑ محنت سے لکھتا تھا۔ ان کے خطوط میں مجھے ہمیشہ انشائے لطیف اور اعلیٰ ظرافت کے نمونے ملتے تھے اور ان میں بھی اسلوب کی وہی ہم آہنگی اور لب و لہجہ کی وہی شان ہوتی تھی جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ میں نے مرحوم کے اسلوب اور لہجے میں کبھی کوئی ترشی یا تلخی نہیں دیکھی مجھے اپنی اس غلطی کا بڑا احساس ہے اور میں اس پر نادم بھی ہوں کہ چند ناگزیر حالات میں ان کے ساتھ اپنے دو وعدے پورے نہیں کرسکا۔ یہ دونوں وعدے دیوان میر نسخۂ محمود آباد (مکتوبہ ۱۲۰۲ھ) اور باقیات انیسؔ کے مسودوں سے متعلق تھے۔ اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو نہ معلوم کیا کیا بکتا۔ لیکن اس شرافت انسانی کے مائی کے لال نے کبھی کوئی گلا تلخی سے نہیں کیا بلکہ لطیف اور نازک اشاروں سے مسکراتے مسکراتے ان غلطیوں کا احساس دلایا جس کے لئے میں نے اُن سے صدقِ دل سے معافی مانگی جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ مجھے راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے تک رسائی ہوئی تو ایک خط مورخہ ۳ فروری ۱۹۶۹ء کو مجھے لکھنؤ کے پتے پر لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ کو یہ ذخیرہ ہاتھ لگا ہے تو سب سے زیادہ حق نقوش کا ہے۔ اردو کے لئے "رسالہ بازی" مشغلہ ہے۔ میرے لئے

جان اور ایمان کا مسئلہ ہے؟

۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

"آپ کے بھجوائے ہوئے دونوں مضمون مل گئے۔ ۱۔ نواب حسام الدین حیدر خان نامی (۲) مرزا غالب اور فن تاریخ گوئی"۔ سچ میرا چلّو بھر خون بڑھ گیا۔ تاریخی نوادرات کے اعتبار سے آپ بڑے امیر ہیں ادھر آپ مجھے نوازتے ہیں۔ اس لئے میں بھی اپنے آپ کو کچھ کم خوش قسمت نہیں سمجھتا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ میں آپ کے حصّے کے پرچے اکٹھا کر رہا ہوں۔ جیسے ہی اجازت ملی بھجواؤں گا اودھ کی فائلوں میں جو کچھ غالب کے بارے میں ملے بھجوائیے۔ انتظار کروں گا۔"

مضمون مکمل ہو چکا تھا کہ ہم اصل بات کہنا ہی بھول گئے تھے۔ بھئے وہ بھی عین وقت پر یاد آ گئی۔ ہم نے طفیل صاحب کو انتقال سے قبل کچھ دن متوجہ کیا تھا کہ اُردو کے بلند پایہ محقق و ناقد جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس مشاہیر کے سینکڑوں خطوط موجود تھے۔ مسعود صاحب کے فوت ہونے کے بعد ان میں سے اکثر و بیشتر خطوط ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے مجھے عنایت کئے۔ طفیل صاحب نے مجھے لکھا کہ وہ تمام خطوط ان کے پاس بھیجے جائیں ان کے پاس بھی ہزاروں خطوط ہیں اور یہ تمام خطوط ایک اور خطوط نمبر کی دو تین جلدوں میں شائع کئے جائیں تاکہ محفوظ رہ سکیں۔ مسعود حسن رضوی کے نام کے خطوط مرتب کرنے کے لئے طفیل صاحب نے مجھے نقوش کے خطوط نمبر کی تین جلدیں پہلے اور مکاتیب نمبر کی دو جلدیں ۲ جولائی ۸۶ء یعنی مرنے سے دو تین دن قبل ارسال کیں۔ ان شماروں کے دیکھنے سے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُنہوں نے کہاں کہاں سے غالبؔ، سر سیدؔ، حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، وقار الملک، محسن الملک، اقبالؔ، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، آرزو لکھنوی وغیرہ کے خطوط حاصل کئے تھے۔

مکاتیب نمبر جلد اوّل میں غالب، سر سیّد، محمد حسین آزادؔ، امیر مینائی، مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر البشیر) صفیر بلگرامی، نواب محسن الملک نواب وقار الملک، داغ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا حالیؔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، شاد عظیم آبادی، شرر لکھنوی، امداد امام اثرؔ، مولانا گرامی ڈاکٹر اقبالؔ، سر عبد القادر، اکبر الٰہ آبادی، مولانا راشد الخیری، مولانا محمد علی جوہرؔ، ظفر علی خان، سید علی بلگرامی، میر ناصر علی، مہدی افادی احسن مارہروی، دتاتریہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، سید سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، فرحت اللہ بیگ، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، سائل دہلوی، سیماب اکبر آبادی، ڈاکٹر تاثیر، سلطان حیدر جوشؔ اور اختر شیرانی کی عمدہ اور یادگار تصویریں بھی موجود ہیں۔

مکاتیب نمبر امن و امان کے زمانے میں طفیل صاحب نے ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں نومبر ۱۹۵۷ء میں دو جلدوں میں شائع کئے تھے جلد اول میں ۷۷ اشخاص کے نام ۱۰۰۸ اور جلد دوم میں ۸۷ کے نام ۱۹۲ خط ہیں۔ اس طرح دونوں جلدوں میں کل ۱۲۰۰ خطوط ہیں۔ صفحات کی تعداد ۱۰۴۸ ہے مکاتیب نمبر کی اشاعت کے گیارہ سال بعد ۱۹۶۸ء میں محمد طفیل صاحب نے ایک بلند پایہ اور قابل فخر کارنامہ خطوط نمبر ۳ جلدوں میں پیش کیا تفصیلات یہ ہیں :۔

جلد اول۔ صفحات ۴۹۶، جلد دوم ۔ ۶۰۴ اور جلد سوم ۶۲۰۔ تینوں جلدوں میں ۲۲۵۲ خطوط ہیں۔

مکاتیب نمبر جلد اول کے طلوع میں لکھتے ہیں کہ :۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ مشاہیر کے خطوط جلد پیش کروں گا۔ جلد پیش نہ کر کے وعدہ خلافی بھی ہوئی۔ شرمندہ

ہوں جیسے جیسے دن گزرتے گئے میری پریشانیاں بڑھتی گئیں اگر آپ کو یقین آسکے تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے خطوط دن رات ا کر کے جمع کئے ہیں۔ واضح رہے دن رات والا فقرہ میں نے بطور محاورہ استعمال نہیں کیا ہے۔ میں نے ان خطوں کے لئے کیا کچھ نہیں کی شہر شہر گھوما۔ گھر گھر صدا دی۔ کسی نے میرے شوق کو سینے سے لگایا۔ کسی نے بات بھی نہ پوچھی یوں امید و بیم کے دوراہے پر چلتا چلتہ جان ہو گیا۔ مگر جنوں میں کمی واقع نہ ہوئی۔

خطوط نمبر جلد نمبر ۱ کے طلوع میں لکھتے ہیں کہ۔

”جنگ ہوئی۔ اپنی اپنی پڑ گئی۔ یہ دعا تو سب کی تھی کہ ملک دشمن سے محفوظ رہے اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی کچھ فکریں اور بھ تھیں۔ جو سانس روکے دے رہی تھیں۔ مثلاً والدین کی فکر، بچوں کی فکر، جائداد کی فکر! فکریں تو میری بھی بہت تھیں مگر ان میں نمایاں اس دستاویزی سرمائے کی تھی جو میری تحویل میں تھا۔

وہ سرمایہ کیا تھا۔ بوسیدہ اور کٹے پھٹے کاغذ کے پرزے۔ مگر ان پرزوں میں غالبؔ کے خطوط تھے۔ اقبال کے خطوط تھے سرسید خطوط تھے۔ ابوالکلام کے خطوط تھے۔ شبلی کے خطوط تھے۔ مہدی افادی کے خطوط تھے۔ نام کہاں تک گناؤں۔ جنگ تیز سے تیز تر ہو گئی توپوں کی دھمک اور شعلوں کی لپک میں، جب میں نے سوچا کہ یہ خطوط ضائع نہ ہو جائیں تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مگر انہی دنوں جب بات دھیان میں آئی تھی کہ میرے بچوں کا کیا ہوگا تو میں بڑے حوصلے میں تھا، اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ وہ گھڑی نہ آنا تھی۔ نہ آئی۔ آئی بلا یہ تو ملک کے بقا کی بات تھی اور ۱۹۶۵ء۔ جہاں تک خطوط کا معاملہ ہے اس کے متعلق آج ۱۹۶۸ء میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کیسا انسا ہوں کہ جیسے بچوں سے زیادہ خطوط عزیز تھے۔ یہ سوچ کر کبھی غمگین ہو جاتا ہوں اور کبھی خوش۔“

خطوط نمبر جلد دوم کے طلوع میں لکھتے ہیں کہ!۔

”محمد طفیل نے محمد نقوش سے کہا ارے میاں! تو کیا کہہ رہا ہے؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے؟ کیوں اپنے بچوں کا دشمن ہوا ہے؟

جب تو نے خطوط کی دو جلدیں ایسے چھاپی تھیں تو کون سے قوم نے سرخاب کے پر لگا دیئے تھے جو تو اب پھر اکٹھی تین جلدیں پیش کر رہا ہے یہ دس گیارہ برس جو تو نے خطوط اکٹھے کرنے پر صرف کئے ہیں۔ اس کی بجائے اگر تو ”امپورٹ ایکسپورٹ“ کا ہی کام کر لیتا زیادہ فائدے میں رہتا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا تو قوم کا لیڈر ہی بن جاتا۔

قوم کے لفظ سے یاد آیا۔ یوں دکھے ہے جیسے یہ قوم بظاہر زندہ ہو بہ باطن مردہ۔ یہ زندہ باد کے نعرے لگا سکتی ہے۔ مگر زندہ با کا ماحول پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ہر ایک کی کارگزاری پر یہ فرمانے کی عادی ہے ”کچھ نہیں“۔

متاعِ ہنر کی قیمت کیا پڑی؟ دو کوڑی بھی نہیں۔ خون کے چراغ جلا کے بھی دیکھ لئے۔ اندھیرا جوں کا توں، یوں معلوم ہوتا جیسے دلوں کا اندھیرا بصارت کو بھی نگل گیا ہو۔

ع۔ ”ایسے عالم کا کیا کرے کوئی“

ایک تو یہ ہو سکتا ہے ـــ آدمی افیون کی گولی کھا کر بیٹھ رہے۔ دوسرے یہ ہو سکتا ہے۔ کہ کچھ خدمت کے شوق میں اپنی جا

اور مال کی بازی لگائے۔

محمد نقوش سے محمد طفیل نے کہا!۔

" راہیں دونوں کٹھن ہیں۔ ایک باضمیر کے لئے دوسری بے ضمیر کے لئے۔"

خطوط نمبر جلد ۳ کے "طلوع" میں کیا گل افشانی کرتے ہیں۔

" میرا بچپن میری خوشیوں کا دشمن تھا۔ جوانی آئی تو وہ بھی یوں کہ اس کی آہٹ تک نہ سن سکا۔ اب میں ہوں اور میرا بڑھاپا۔ دستک کی آواز تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔

یہ پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میں ۱۹۴۸ء میں مر گیا تھا وہ یوں کہ زندگی اور موت کے درمیان چند ساعتوں کا مرحلہ رہ گیا تھا ایسے میں، میں نے اپنے رب سے کہا اور اس دنیا میں جیسے آیا تھا ویسا ہی چلا جا رہا ہوں کسی کو بھی میری ذات سے کوئی فائدہ نہ پہنچا مہلت دے دیجیئے اللہ تعالیٰ نے کچھ سوچا اور مجھے نئی زندگی بخش دی صحت یاب ہوا تو میں نے سوچا خدا سے بہت بڑا وعدہ کر چکا ہوں مگر وسائل؟ صحن دل امنگوں سے معمور تھا مگر حالات خندہ زن تھے۔ اس ماحول میں ذہن نے کئی قلابازیاں کھائیں غرض وسائل کی غریبی میں بھی ایک بات سوجھ گئی وہ یہ "اگر تو جھلسا دینے والی گرمیوں میں پیاسوں کو "پانی" ہی پلاتا رہے گا تو بھی اپنے خدا سے شرمسار نہ ہوگا۔ دل مطمئن ہو گیا۔ جب سے ادب کی کڑی دھوپ میں پیاسوں کو پانی پلا رہا ہوں۔

میری کارگزاری کو سب نے سراہا اس ضمن میں بڑے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں ہر وقت اس خوف سے لرزتا رہتا ہوں کہ اپنی مستعار زندگی کے بدلے میں نے جو خدا سے عہد کیا تھا۔ وہ بھی پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟"

اب ہم قارئین نقوش کے لئے محمد طفیل صاحب مغفور و مرحوم کے کچھ عکسی خطوط شامل مضمون کرتے ہیں تاکہ ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔ کہ نقوش اور محمد طفیل میں وہی ربط تھا جو روح کو جسم سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نقوش اور طفیل میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ مرحوم کو "نقوش" کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے ان کے دن کا چین اور رات کا آرام نقوش ہی کی نذر ہوتا تھا۔ نہ گھر کی پروا اور بچوں کی پرداخت کا خیال۔ چاروں پہر نقوش کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔

نقوش
۱۰۔ ایبک روڈ، انارکلی ○ لاہور
فون ۵۲۵۱۵

برادرم، سلام مسنون!

آپ نے جو مسودات مجھے بھجوائے تھے۔ وہ پاکستان تو پہنچ گئے۔ مگر ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچے۔ چار پانچ روز میں مل جائیں گے۔

احسن علی خان جو ہندوستان گئے تھے انہیں اپنی بیٹی کی انتقال کی خبر پر ایکدم پاکستان واپس آنا پڑا۔ جوان بیٹی کا انتقال ہوا۔ بے حد خوبیوں والی بیٹی کا انتقال ہوا۔ ایسے میں اُن سے (اس ماحول میں) مسودات مانگنے کی ہمت نہ کر سکا۔ جبکہ وہ اس عالم میں بھی اپنے ساتھ لا چکے ہیں۔

کل میرے ایک عزیز اسلام آباد جا رہے ہیں۔ وہ اُن سے مسودات لے آئیں گے۔ بے فکر رہیے۔ وہ تو مل ہی جائیں گے۔ یا مل گئے!

آپ نے انیس نمبر کی دوسری جلد کی خوش خبری سنائی ہے۔ خوش ہو لیا۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ پہلی جلد میں بھی ایک دو مرثیے زیادہ اشعار کے ساتھ سامنے آئیں۔ تاکہ ذرا سی کارگزاری تو بڑھے۔ ہو سکے تو ایسا کر گزریے۔ پہلی جلد کی کتابت تقریباً پوری ہو چکی ہے۔

آپ کو میر نمبر کے نسخے بھجوا دوں گا۔ اسی ہفتہ ہی۔ میں پچھلے دنوں ذرا پریشان رہا۔ میں نے کسی کام کی طرف نہ دیکھا۔ ایک بیٹے کو چوٹ لگ گئی تھی۔ فقط آپ کا

طفیل

۲۰ - ۶ - ۶۱

نقوش
۱۰۔ ایبک روڈ، انارکلی ○ لاہور
فون [illegible]

برادرم۔ سلام مسنون!

آپ کے بھجوائے ہوئے مرثیے مل گئے۔ میری بات مان لی گئی۔ میں خوش ہو گیا۔ بس میں بھی تو اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میری بات سنو اور سناؤ۔ مانو اور منواؤ!

تین مرثیوں کے علاوہ، دو قیمتی مضمون بھی ملے۔ شیخ قزلی کی تصنیف "تحفۃ الشعرا" پر مضمون اور "انیس اور حسرت"۔ شکر گزار اور ممنون!

علامہ اقبال کے خاندان پر آپ کی یلغار کا حال بھی معلوم ہوا۔ یعنی روزنامہ "آفتاب" کا تراشا ملا۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ بہرحال جب آپ کے مضامین کتابی صورت میں آئیں گے تو ایک دھماکہ ہر وقت ہوگا۔ دوسرا دھماکہ ہر وقت کہ جب کوئی اقبالیہ جھنجھلا کے قلم اٹھائے گا۔ شعراء کے ساتھ دل لگی آپ کے مضامین میں بھی ہے۔ دوسروں کے مضامین میں بھی ہو سکتی ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں۔ حقائق کے بیان میں غصہ کو چھٹک دیا کریں۔ جس دن آپ نے میری یہ بات مان لی۔ اس دن سے آپ کے پرستاروں میں زیادہ اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ مگر آپ [illegible] ہر وقت قاضی عبد الودود بنے ہوئے ہیں۔ شمشیر برہنہ!

بہرحال آج کا یہ خط محض رسیدیہ ہے۔ تاکہ آپ مطمئن ہوں کہ تیر نشانہ پہ بیٹھا۔ یعنی جو مضمون یا مضامین جس شخص تک پہنچانا تھے۔ پہنچ گئے۔

ہاں برخوردار کو جو چوٹ لگی تھی۔ اس میں خاصا افاقہ ہے۔

دونوں کو سلام دعا!

م طفیل
19/5/67

ادارۂ فروغِ اردو
۱۱- ایبک روڈ، انارکلی، لاہور
فون: ۵۳۵۲۵

محبی! سلّمہٗ!

آپ کا ۲۲ جولائی کا لکھا ہوا گرامی نامہ مجھے ۱۹ اگست کو ملا۔ راستے میں استراحت فرماتا رہا۔ چلیے ملا تو! بات بنی تو!

جی ہاں! باقیات انیس اور تذکرۂ مصحفی دونوں کا پیکٹ مل گیا تھا۔ طبیعت اچھی نہ رہی۔ اس لیے جلد جواب نہ بھجوا سکا۔ دوسرے ادھر اتنے زوروں کی بارشیں ہوئی ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ درجنوں مکان گر گئے۔ متعدد اموات ہوئیں۔ اتنی خوفناک بارشیں اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ ایک روز تو بارش کے ساتھ اتنی تیز آندھی چلی کہ سینکڑوں درخت گر گئے۔ متعدد چھتیں اڑ گئیں۔ اور ابھی وہ سلسلہ جاری ہے۔

ہاں جی! حرفے چند بطور معذرت بھیجیے۔ یہ سب کچھ کام آئے گا۔ میر نمبر اکتوبر میں چھپ جائے گا۔ پیش کروں گا۔ ادھر چھ ماہ طباعت کی حد تک کوئی کام نہیں کیا۔ البتہ مرتب بہت کچھ کیا۔ ادیبوں کے تنظیمی کام میں (رائٹرز گلڈ) میں خاصا وقت برباد ہوا۔ اب میں گلڈ سے چھٹی لے رہا ہوں تاکہ اپنے ادبی سلسلوں کو بحال کیا جا سکے۔

ایک بات کہوں؟ آپ ذرا معتدل ہو جائیں۔ تحریر میں سے غصّے کو نکال دیں۔ بے شک غلط سلط باتوں پر غصّہ آتا ہے۔ مگر غصّہ کرنے کا بھی تو ایک سلیقہ ہے۔ اِس سے لڑائی، اُس سے لڑائی، اس سے جو آپ کے اعصاب پر اثر پڑتا ہو گا وہ معلوم! کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ تحقیقی کوتاہیوں پر "چُپ شاہ" بن جائیں بلکہ یہ کہ لہجہ نرم، مفہوم گرم ہونا چاہیے۔ اب تو آپ کا لہجہ بھی گرم ہے اور مفہوم بھی!

ایک بات کا جواب دیں۔ وہ یہ کہ کلیات میر کا یہ نسخہ تقریباً دو سو برس پرانا ہے۔ اس وقت تو کسی اور کبھی کی جگہ کبھو اور کسو لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح یہاں اور وہاں کی جگہ یاں اور واں۔ اگر ہم نے یہاں اور وہاں چھاپا تو شعر تقطیع سے اتر جائیں گے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں۔ جنہیں اس وقت کسی اور طرح لکھا جاتا تھا آج اور طرح سے۔ بہرحال قدیم رنگ کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔

آج کل تو آپ بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ جو زندہ رہیں گے۔

والسلام

محمد طفیل
19/۸/۸۰

برادرم

چند خطوط، چند دوستوں کے نام

مرحوم اس کتاب کو اپنی زندگی میں کتابت کرا چکے تھے مگر طباعت کی نوبت نہ آئی۔ اب ادارہ نے اسے محمد طفیل نمبر کا حصہ بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں زیادہ تر خطوط آدم زادوں کے نام ہیں اور چند حوّا کی بیٹیوں کے نام، مگر کتاب کا نام برادرم؟ میرے خیال میں کچھ حرج بھی نہیں! اگر کوئی جھگڑا ہوا تو معاملہ بذریعۂ ثالثی سلجھایا جائے گا۔

چھوٹی بہنو، بڑے بھائیو!

میں نے ۱۹۵۵ء میں اپنے ہاں کے مینجر صاحب سے کہا کہ جن دوستوں کو میں خطوط لکھتا ہوں۔ رجسٹر میں ان کے نام اور مختصراً کوائف بھی لکھ دیا کیجئے تاکہ کل کلاں کو یہ معلوم ہو سکے کہ میں نے اپنے فلاں فلاں دوست کو یہ یہ کچھ لکھا تھا۔

انہوں نے ستم یہ کیا کہ اس دور کے سارے ہی خطوط نقل کر کے اپنے پاس رکھ لیے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں انھیں "ساری" باتوں کا علم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ کے سامنے جو خطوط ہیں۔ ان کا پچاس فی صد حصہ صرف دو تین دن کی کارستانی ہے۔

چور چوری سے جاتا ہے۔ ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو خطوط آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں وہ زیادہ تر مینجر صاحب کی ہیرا پھیری کا نتیجہ ہیں۔ اس میں میری چوری کا سلیقہ کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ خطوط نمبر (حصہ دوم) کی اشاعت کے موقع پر بہت سے دوستوں نے میرے ہی خطوط مجھے لوٹا دیئے کہ انھیں بھی چھاپئے۔ میں حیران -!

بہرحال کچھ ضرورت، کچھ ہیرا پھیری اور کچھ خواہشوں کے نتیجے میں یہ خطوط آپ کے سامنے براجمان ہیں۔ میں کیا کروں!

"قاعدے کے مطابق، بڑے لوگوں کے خطوط چھپا کرتے ہیں مگر یہ بات چھوٹے لوگوں کی حق تلفی کے مترادف بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں قربانی کا بکرا بن کر، چھوٹے لوگوں کی راہ میں حائل بھاری پتھر کو اپنے کندھوں پہ اٹھا رہا ہوں تاکہ آئندہ کے لیے اور سب کے لیے میدان صاف ہو جائے۔

اِس کتاب میں میرے بہت سے پیارے دوستوں کے نام کوئی خط نہیں۔ چونکہ یہ کتاب کسی ضابطہ منصوبے کے ماتحت نہیں چھپ رہی اس لیے اس کتاب میں اگر اس خوبی کا بھی ظہور نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟

اگر میں یہ کہوں کہ اس کتاب کی اشاعت میری شعوری کوششوں کا نتیجہ نہیں تو کوئی بھی یقین نہ کرے گا۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ اقرار کر لوں۔ جی ہاں! یہ جھک میں نے ماری ہے۔ اب آپ میرے خلاف استغاثہ کریں یا مجھے بخش دیں۔ یہ معاملہ آپ کے حسنِ اخلاق کا ہے

محمد طفیل
۱۵/۶/۷۱

دیباچہ

ڈاکٹر گیان چند ○ ڈاکٹر محمد حسن

۳۶ مالویہ نگر
بھوپال - ہندوستان
۱۰ دسمبر ۶۴ء

محبِ مکرم - تسلیم

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے خط لکھنے کے اسلوب پر اتنا رشک آیا ہے کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک آپ جیسی نثر نہ لکھ سکوں مضمون لکھنا بیکار ہے - ہرگز نہ لکھوں گا - گھر بیٹھا بیٹھا خاموشی سے مشق کرتا رہوں گا۔ اشاعت کے لیے کچھ نہ دوں گا -

اپنے خطوں کی نقل ضرور محفوظ رکھیے اور انھیں شائع کرائیے آپ کے مکاتیب غالب سے نیچے درجے پر نہیں رکھے جا سکیں گے۔

آپ کے خط کا کاغذ ہی اتنا عمدہ ہے کہ ‘جاں نذرِ دلفریبیٔ کاغذ کیے ہوئے’، کا معاملہ ہو گیا ہے -

اب کی دفعہ ‘نقوش’ پہلے سے بھی زیادہ جامہ زیب تھا۔ کمال ہے کہ اشتہار کے رنگین کاغذوں سے بھی آپ نے آرائش کا کام لے ڈالا -

آپ کا معتقد : گیان چند

برادر محترم، تسلیم

آپ کا خط ملا - ابھی ملا -

آپ نے سوچا، اسے خوب صورت طریقے سے ٹرخا دیا جائے۔ خط کی تعریف کر کے اصل معاملے کو گول کر دیا۔ اگر یہ سوقیانہ بات نہ ہوتی تو دل چاہتا ہے لکھ دوں قربان جاؤں اس ادا کے! مگر کیا کروں - میں یہ نہیں لکھ سکتا۔

میرے بھائی! — آپ میرے خطوں کو کوئی درجہ دیں یا نہ دیں - مگر اتنا ضرور کریں کہ اب کے ایک مضمون بھیج دیں - اس صورت میں زیادہ خوش ہوں گا -

اپنے خطوں کی نقل رکھ کے کیا کروں گا۔ غالب بڑا فاضل انسان تھا اور اس کے ساتھ اتنے ہی پایہ کا مسخرا تھا - اس لیے

اس لیے اس کی علمیت اور مسخرگی کام دے گئی۔ مجھے کون پوچھے گا۔ نہ عالم، نہ مسخرا، ان میں سے کوئی ایک خوبی تو ہوتی۔ آپ کے اس فقرے پر بہت ہنسا: "آپ کے مکاتیب غالب سے نیچے درجے پر نہیں رکھے جا سکیں گے"۔ آ ہا ہا ہا!

میں ہر شمارہ کے لیے، سب کو لکھنے کی دعوت نہیں دیتا۔ مگر جس سے درخواست کرتا ہوں، سوچ سمجھ کر درخواست کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ پھر میری درخواست کی آبرو بھی رہے۔ اس ضمن میں، اب آپ کے ارادے اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ خدا خیر کرے۔

اگر آپ اتنے عالم فاضل ہونے کے بعد بھی لکھنے کی مشق جاری رکھنا چاہتے ہیں تو بقول عصمت چغتائی کے "اگر آپ لوگ مشق[1] کرنے مانگتا تو کون سالا بوم مارنے سکتا ہے!"

اب اجازت دیجیے۔ باتیں ہو چکیں۔

۸/۱۲/۶۴ آپ کا محمد طفیل

برادرم تسلیمات

نوازش نامہ ملا۔ بیوی بچے کی علالت کی وجہ سے آپ کو رسید نہ بھیج سکا۔ میں آپ کے تحفے کے لیے شکر گزار ہوں۔ افسوس اس کا ہے کہ آپ سے ملاقات کا موقع مجھے میسر نہ آ سکا۔

کتاب لکھنؤ سے تو آپ واقف ہیں انہوں نے یہ پخ میرے ذمے لگائی ہے کہ ان کا ایک شمارہ میں مرتب کر دوں۔ بار بار تو آپ کو تنگ کروں گا نہیں لیکن اس شمارے کے لیے آپ کا ایک رنگا رنگ قسم کا مضمون چاہتا ہوں عنوان میری پسند کا "چند تصویر بتاں"۔ شخصیتیں آپ کی پسند کی۔ جتنی چاہیں اور جن کو چاہیں لکھیے۔ ایک بار تو اُلٹی گنگا بہ لے کہ مضمون لکھنے والے مدیر کو زحمت تحریر دیں اور باصرار۔ دیکھیے مایوس نہ کیجیے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے چند خطوط جو میرے پاس محفوظ ہیں اس شمارے میں شائع کرنے کی اجازت درکار ہے۔

پتہ وہی دہلی کا ہے۔

آپ کا محمد حسن

برادرم!

خط ملا۔ دلی شکریہ!

آپ دوست نہیں، دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ذاتی نوعیت کے خطوں کو چھاپنے کی سوچ رہے ہیں میں کہتا ہوں۔ اُن خطوں میں کیا رکھا ہے کہ جو اُن کی اشاعت پر من چل پڑا۔

---

[1] اصل یوں تھا "چھاپنے مانگتا"۔

ایک اعتبار سے مجھے اُن خطوں کی اشاعت پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ میں کوئی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہوں کہ میرے مُرید کہہ اُٹھیں ـ ہُوں! اگر کوئی اعتراض ہے تو یہ کہ میں کون غالب کا بھتیجا ہوں کہ میرے خطوں کی بھی پذیرائی ہو گی۔

ہاں آپ تو پہلے دن سے میرے خطوں کے "پیچھے پڑے ہوئے" ہیں کہ خوب ہیں۔ اگر آپ کا واقعی یہ خیال ہے کہ خوب ہیں (جسے میں ماننے کے لیے تیار نہیں) تو اُن پر ایک لمبا چوڑا نوٹ لکھ کر چھاپ دیجیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ خطوط نمبر کی ترتیب کے وقت، جو دوستوں نے مجھے، میرے ہی خطوط لوٹائے ہیں۔ انھیں اکٹھا کر کے اور آپ کے نوٹ کو دیباچہ بنا کر چھاپ دوں گا۔ عذاب ثواب آپ کی گردن پر ہو گا۔ منظور؟

مضمون لکھنا بہت مشکل ہے پیارے! میں ایک مضمون، چھ ماہ سے پہلے نہیں لکھ سکتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میری بیوی یا کسی کی بیوی (یعنی بھابی) مجھے یہ یاد دلاتی رہے کہ مضمون لکھنا ہے۔

آپ نے رسالہ "کتاب" کا ایک شمارہ مرتب کرنے کے لیے سوچا ہے۔ یہ سوچ آپ کو رُلائے گی۔ نانی یاد نہ آئی تو میرا نام بدل دینا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اتنے گنہگار نہ تھے جو آپ کو اتنی بڑی سزا دی جاتی۔ بہرحال!

۳۰/۱۱/۶۷

محمد طفیل

فہرست

مکاتیب محمد طفیل (مدیر نقوش)

نمبر شمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر
۱	آزاد جگن ناتھ	۸۵۱
۲	آصف علوی	۹۰۶
۳	آغا سرخوسفس	۹۰۱
۴	آل احمد سرور	۸۵۹
۵	آنند نرائن ملّا	۸۶۸
۶	ابن انشاؔ	۸۶۳
۷	ابن حسن برنی	۹۱۰
۸	ابو الخیر مودودی	۸۶۴
۹	ابو الفضل صدیقی	۸۵۲
۱۰	ابو محمد سحر	۸۸۴
۱۱	اثر، جعفر علی خاں لکھنوی	۸۳۸
۱۲	احسن فاروقی، ڈاکٹر	۸۳۶
۱۳	احمد جمال پاشا	۸۳۹
۱۴	احمد علی	۸۹۱
۱۵	احمد فاروقی خواجہ، ڈاکٹر	۸۵۳
۱۶	اختر الایمان	۸۶۲
۱۷	اختر انصاری	۸۶۱
۱۸	اختر اورینوی	۸۷۵
۱۹	اختر جمال، احسن علی خاں	۸۴۳
۲۰	ارتضی زیدی	۹۱۰
۲۱	ارشد میر	۸۹۵
۲۲	اشفاق احمد	۸۱۰
۲۳	اعجاز حسین، سید، ڈاکٹر	۸۶۵
۲۴	اعظمی، خلیل الرحمٰن	۸۴۸
۲۵	افتخار حسین آغا	۷۹۴
۲۶	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	۷۹۶
۲۷	الطاف حسن قریشی	۸۴۶
۲۸	امتیاز علی عرشی	۸۸۰
۲۹	انتظار حسین	۸۴۱
۳۰	انصار ناصری	۸۱۵
۳۱	انور سدید	۸۰۳
۳۲	ایم-آر-کیانی	۸۷۴
۳۳	ایوب جاوید	۸۸۵
۳۴	بانو قدسیہ	۸۷۶
۳۵	برقؔ، غلام جیلانی، ڈاکٹر	۸۹۰
۳۶	بشریٰ رحمٰن	۹۱۲
۳۷	بیگم طفیل	۸۲۹
۳۸	پروین فنا سید	۹۰۲
۳۹	پریم وار برٹنی	۹۱۴
۴۰	تمکین کاظمی	۸۹۱

نمبر شمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر
۴۱	تنویر احمد علوی	۸۰۲	۶۵	روش صدیقی	۸۶۳
۴۲	جگر مراد آبادی	۸۷۷	۶۶	ریاض احمد	۸۸۵
۴۳	جمیل اختر خان	۹۱۴	۶۷	زورؔ محی الدین، ڈاکٹر	۸۸۰
۴۴	جمیلہ ہاشمی	۷۹۹	۶۸	ساغر نظامی	۸۷۰
۴۵	جوش ملیح آبادی	۸۷۷	۶۹	ساقی (ایڈیٹر ساغر)	۷۹۸
۴۶	جوگندر پال	۸۷۵	۷۰	سبط حسن	۷۹۷
۴۷	جیلانی بانو	۸۳۳	۷۱	سجاد احمد جان، جسٹس	۷۹۳
۴۸	حافظ الدین	۸۴۷	۷۲	سحر انصاری	۹۱۱
۴۹	حامد حسن قادری	۸۸۹	۷۳	سرفراز صاحبہ	۸۰۰
۵۰	حجاب امتیاز علی	۸۵۶	۷۴	سلطان رشک	۸۹۷
۵۱	حسن جعفری، سید	۹۱۵	۷۵	سہیل عظیم آبادی	۸۵۵
۵۲	حفیظ جالندھری	۸۷۲	۷۶	سید انور	۸۰۴
۵۳	حفیظ ہوشیارپوری	۸۷۰	۷۷	شاہد احمد دہلوی	۸۳۵
۵۴	حیدر، ڈاکٹر	۸۱۱	۷۸	شریف الدین پیرزادہ	۸۴۵
۵۵	حیرت شملوی	۸۶۷	۷۹	شکیلہ اختر	۸۴۲
۵۶	خالد، عبدالعزیز	۸۴۹	۸۰	شورؔ (علیگ) پروفیسر	۸۶۸
۵۷	خدیجہ مستور	۸۸۸	۸۱	شوق، سمت پرکاش	۸۰۲
۵۸	خلیق انجم، ڈاکٹر	۸۱۱	۸۲	شوکت تھانوی	۸۵۲
۵۹	خواجہ احمد عباس	۸۳۱	۸۳	شوکت سبزواری، ڈاکٹر	۸۶۶
۶۰	خورشید خاور امروہوی	۸۹۷	۸۴	شوکت صدیقی	۸۸۳
۶۱	راجندر سنگھ بیدی	۸۸۸	۸۵	شہاب الدین، خواجہ	۸۴۵
۶۲	راجہ مہدی علی خاں	۸۲۶	۸۶	شہاب، قدرت اللہ	۷۹۱
۶۳	راز مرادآبادی	۸۸۲	۸۷	صادق حسینی	۸۴۳
۶۴	رشید احمد صدیقی	۸۷۹	۸۸	صباح الدین عبدالرحمٰن، سید	۸۹۴

نمبر شمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر
۸۹	ضیا احمد بدایونی	۷۹۸	۱۱۳	فرہاد زیدی	۹۰۷
۹۰	ضمیر جعفری، سید	۷۹۴	۱۱۴	فضل احمد کریم فضلی	۸۸۲
۹۱	طاہر فاروقی	۸۲۱	۱۱۵	فکر تونسوی	۸۶۹
۹۲	ظاہرہ اعظم	۹۱۲	۱۱۶	فیض احمد فیض	۸۷۱
۹۳	ضمیر اختر نقوی	۸۹۶	۱۱۷	قاسمی، احمد ندیم	۸۳۸
۹۴	عبدالرحمٰن چغتائی	۸۱۲	۱۱۸	قرۃ العین حیدر	۸۲۲
۹۵	عبدالرحیم چغتائی	۸۹۶	۱۱۹	کرتار سنگھ دگل	۸۴۴
۹۶	عبدالقوی دسنوی	۸۰۹، ۹۱۶	۱۲۰	کرشن چندر	۸۸۷
۹۷	عبداللہ، سید، ڈاکٹر	۹۰۷	۱۲۱	کشور ناہید	۸۹۸
۹۸	عبدالماجد دریابادی، مولانا	۸۷۹	۱۲۲	کلیم الدین احمد	۸۹۱
۹۹	عبدالمغنی پروفیسر	۹۰۹	۱۲۳	کنہیا لال کپور	۸۰۶
۱۰۰	عبدالواحد درانی	۹۰۰	۱۲۴	گیان چند، ڈاکٹر	۸۳۷
۱۰۱	عدم، عبدالحمید	۸۹۷	۱۲۵	لطیف الزمان خاں	۸۹۲
۱۰۲	عذرا مسعود	۸۹۸	۱۲۶	مالک رام	۸۲۳
۱۰۳	عصمت چغتائی	۸۸۶	۱۲۷	مجروح سلطان پوری	۹۰۸
۱۰۴	علی عباس جلالپوری	۹۰۵	۱۲۸	مجنوں گورکھپوری	۸۲۸
۱۰۵	علی عباس حسینی	۸۵۴	۱۲۹	مجید امجد	۸۷۱
۱۰۶	عندلیب شادانی	۸۷۸	۱۳۰	مجید ملک	۸۶۸
۱۰۷	غلام عباس	۸۸۳	۱۳۱	مختار مسعود	۹۰۸
۱۰۸	غلام مصطفیٰ	۸۴۱	۱۳۲	محمد اکرام شیخ	۸۶۶
۱۰۹	فاروقی، نثار احمد	۸۲۰	۱۳۳	محمد باقر، ڈاکٹر	۸۵۳
۱۱۰	فتح محمد ملک	۹۱۴	۱۳۴	محمد جاوید اقبال، پروفیسر	۹۰۰
۱۱۱	فراق گورکھپوری	۸۷۲	۱۳۵	محمد حسن، ڈاکٹر	۸۱۷
۱۱۲	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	۹۰۱	۱۳۶	محمد حمید اللہ (پیرس)	۹۰۵

نمبرشمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ	نمبرشمار	مکتوب الیہ کا نام	صفحہ نمبر
۱۳۷	محمد خان کرنل	۸۱۳	۱۵۱	ممتاز مفتی	۷۹۱
۱۳۸	محمد نواز، سید	۹۰۶	۱۵۲	منظور الٰہی	۹۰۳
۱۳۹	محمد یوسف قاری فاروقی	۸۸۶	۱۵۳	مہندر ناتھ	۸۵۱
۱۴۰	محمد یونس بھٹی لندن	۹۱۵	۱۵۴	نارنگ، گوپی چند	۸۱۵
۱۴۱	محمود عالم قریشی	۸۸۴	۱۵۵	نذیر احمد پرنسپل، ڈاکٹر	۸۹۴
۱۴۲	محمود ہاشمی	۸۷۴	۱۵۶	نعیم صدیقی	۸۵۷
۱۴۳	مختار زمن	۹۰۳	۱۵۷	واجدہ تبسم	۸۵۵
۱۴۴	مسعود حسن رضوی، سید	۸۷۸	۱۵۸	وحید قریشی، ڈاکٹر	۸۶۵
۱۴۵	مسعود مفتی	۸۰۷	۱۵۹	وزیر آغا	۸۵۰
۱۴۶	مسیح الزماں	۸۴۴	۱۶۰	ہاشم رضا، سید	۸۴۹
۱۴۷	مشتاق احمد یوسفی	۸۹۴	۱۶۱	ہاشمی، رفیع الدین	۸۹۹
۱۴۸	مشفق خواجہ	۸۵۰	۱۶۲	یوسف حسن، حکیم	۸۶۰
۱۴۹	ممتاز شیریں	۸۸۱	۱۶۳	یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	۸۴۰
۱۵۰	ممتاز مرزا	۹۰۴	۱۶۴	نامعلوم	۹۱۶

قدرت اللہ شہاب

قابلِ احترام، چہرے پہ شرافت لکھی ہوئی۔
پہلے نامور افسانہ نگار تھے۔ ناموری دوستی میں بھی تھی۔ گفتگو نرم
کرتے تھے۔ فقرے کٹیلے لکھتے تھے۔ اب دوستوں سے منہ موڑ رکھا ہے
افسانہ نگاری چھوڑ رکھی ہے۔ لَو صرف اللہ تعالےٰ سے!

مجھے ملتان والوں نے کہا۔ شہاب صاحب پر مضمون لکھو۔ پکا ارادہ تھا۔ ادھر جو ممتاز مفتی کا مضمون ملا تو گڑبڑا گیا ہوں۔ مضمون اچھا ہے۔ اُسے شوق سے چھاپ بھی رہا ہوں مگر میرا "قلم کھولنا" مشکل ہو گیا ہے۔ مَیں تو شہاب، ایک ادیب سے واقف تھا۔ یہ ولی اللہ شہاب کہیں رات کو الٹا نہ لٹکا دیں۔ کیا کروں؟

مجھے اپنی بھی "ولایت" پر بھروسا تھا۔ مگر "کنی" اتنی نہیں کہ زور آور بزرگوں کے منہ لگوں! پنڈی آنے کا ارادہ ہے۔ اس وقت دیکھوں گا کیا کروں؟ اگر میری محبت، آپ کی بزرگی میں غرق ہو گئی تو پھر ارادہ ترک کر دوں گا

میری گذارش، جس نے مجھے اس خط کے لکھنے پر اکسایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ کا افسانہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ادھر میں نے کام کو کافی حد تک مکمل کر ڈالا ہے۔ آج کل موسم بھی اچھا ہے۔ آپ کا قلم بھی رواں ہے پھر افسانہ کیوں نہیں ملا؟ یہی پوچھنے آیا ہوں۔

ثاقب کو پیار!

محمد طفیل ۷/۹۸ ۲۳

ممتاز مفتی

ایک بڑا افسانہ نگار، ایک پیارا دوست، مگر ان کا پیار رُلاتا بہت
ہے ان کی دوستی کے معیار اپنے ہیں۔ دوسروں کو اپنی دوستی کے
چوکھٹے میں سجا کر دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی اس چوکھٹے میں بن سنور کے
بیٹھے گا تو کہیں گے سر اور منہ پہ خاک ڈالو۔ مجھ سے تمہارا اجلا پن

دیکھا نہیں جاتا۔

برادر محترم، سلام مسنون!

آپ کا مضمون سنا تھا مگر اُس وقت مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔ تعریفوں کے بوجھ تلے دبا ہُوا تھا۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوست شرمندہ کر رہے تھے۔

آج جب آپ کے مضمون کو غور سے پڑھا تو مجھ پر عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں تو آپ کے خلوص کے ہاتھوں پاگل ہو گیا۔ یہ کیا کوئی کسی سے اس حد تک بھی پیار کر سکتا ہے۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آپنے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔

ایک بار آپ پھر بازی لے گئے۔ آپ کے سلسلے میں، میری زندگی میں اتنی ہاریں لکھی ہیں کہ ان کا شمار کوئی بھی نہ کر سکے گا۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ کہیں تو میں بھی، آپ سے زیادہ اُبھر کر سامنے آ سکوں مگر آج تک کامیابی نہیں ہوئی۔

میں ادبی میدان کی بات نہیں کر رہا، شخصی روابط کے ضمن میں عرض کر رہا ہوں۔

خدا آپ کو خوش رکھے۔

محمد طفیل

۲۰ ۶/۶۸

برادرم،

مَیں نے اس سے پہلے خط نہ لکھا۔ اچھا نہ کیا۔ مگر میں لکھتا کیسے، حالات نے تو مجھ سے حواس چھین لئے ہیں۔

ہمیں اتنی ذِلت اٹھانی پڑے گی۔ یہ تو کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا۔ حتّٰی کہ دشمن نے بھی، اس حد تک کامیابی کا، سوچا تک نہ ہو گا۔

اگر فتح و شکست کے معاملہ کو، دو گھڑی کے لیے بھول بھی جائیں۔ تو بھی انسانی جانوں کا اتنا زیاں، وہ بھی اتنی بیدردی کے ساتھ، بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔ ”ریوڑوں کے ریوڑوں“ کو گولی کا نشانہ بنانا، پھر تڑپتی لاشوں کے اعضا کاٹنا، اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اُف وہ!

ہم اُمید پہ ہی جینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسی لیے مارے گئے۔ اگر ہم میں کچھ عمل کا بھی چلن ہوتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔

جب ہمارا ریڈیو یہ کہہ رہا تھا کہ ہم وہاں آگے بڑھ گئے ہیں۔ وہاں بڑھ گئے تو میں نے ایک صبح اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا: ”ہم لُٹ گئے ہیں“۔ سبھی میرا منہ تکنے لگے۔ مگر اس کے تین چار دن بعد ———

اور کیا کہوں۔ بس زندہ ہوں۔

محمد طفیل

۱۰ ۱/۷۲

جسٹس سجاد احمد جان

محترم المقام،

پچھلی مرتبہ جب میں آپ سے ملا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں ایبٹ آباد سے واپس آجاؤں تو آپ کے ہاں آؤں گا۔

میں منتظر رہا کہ ٹیلیفون آئے گا کہ فلاں دن پہنچوں گا مگر آپ نے تکلف کیا۔ خلوص کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نہ کوئی جج ہوتا ہے اور نہ کوئی مدیر، بلکہ دو انسانوں کے درمیان، ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے۔ جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

آپ کے بچوں کی شادی ہوئی۔ پہلی شادی کا بلاوا بھی تھا۔ مگر میں اُن دنوں سخت بیمار تھا۔ سوچا، اس خوشی کے موقع پر، بُری خبر کیوں سناؤں۔ چنانچہ چُپ رہا۔

دوسری شادی کا حال اخباروں میں پڑھا۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ یہ نالائق آدمی ہے۔ اسے کیوں بلاؤں!

اچھا جناب! ان شکایتوں اور معروضات کے بعد عرض یہ ہے کہ بندۂ پُرتقصیر نے غالب نمبر چھاپ ڈالا ہے۔ اس کے سلسلے میں ایک تقریب کا ارادہ ہے۔ بشرطیکہ آپ صدارت قبول کرلیں۔

تقریب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان والوں نے غالب کے سلسلے میں بڑا واویلا کیا ہے۔ سرکاری طور پر، صدر ذاکر حسین اور اندرا گاندھی سے لے کر، مجھ ایسے ہیچمدانوں تک نے، ——— مگر اپنی سرکار نے کچھ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پنجاب یونیورسٹی جو کچھ کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی حمید احمد خان کے چلے جانے سے رُک سا گیا۔ اگر کچھ ہوا بھی، تو اشک شوئی کے طور پر!

ان حالات میں ضرورت ہے کہ بہ حیثیت ایک پاکستانی کے ہم اپنا اپنا کردار ادا کریں۔ میں ایک اچھا پرچہ چھاپنے کی اہلیت رکھتا ہوں (خدا کی دی ہوئی توفیق سے) سو میں نے وہ کام کر ڈالا۔ آپ کے ذمہ ملک کی رہبری ہے۔ ہر شعبہ میں رہبری، سوا ایک شعبہ (یعنی شعبۂ ادب) کی طرف، میری خاطر بھی، توجہ فرمائیں۔

۲۹ر تاریخ کو عشرہ محرم ختم ہوتا ہے۔ ۳۰ر تاریخ کو ہماری یہ تقریب ہوجائے تو اچھا ہے۔ ۳۱ر کو یونیورسٹی والے کر رہے ہیں۔ ہماری تقریب پہلے ہونی چاہیے۔ ہراول دستے کے طور پر۔ کیا ایسا ممکن ہوگا؟

آپ کا محمد طفیل
۲۰ ۳/۶۹

محترم المقام، سلام و رحمت!

جب میں اپنے خیالوں میں گم اور اپنے کام میں منہمک ہوتا ہوں، تو بارہا ایسے میں بھی آپ کا خیال آیا اس وقت میں دو منٹ کے لیے قلم رکھ دیا کرتا ہوں۔ آپ کے موجود نہ ہونے پر بھی آپ سے باتیں کرلیتا ہوں۔ وہ گھڑیاں میرے لیے، خوشی کی گھڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ جادو آپ کی شخصیت کا ہے۔

ادب کی خدمت کے مجھے ارمان تھے۔ جو ان حالات میں پورے ہوتے نظر نہیں آتے، کاغذ عنقا ہے۔ قاری بھٹک

رہا ہے۔ پہلے شرفا کا اوڑھنا بچھونا، ادب تھا۔ اب ادب نہیں رہا۔ کلب، ہوٹل اور عورت ہو گیا۔ ایسے میں، میں کیا کر سکوں گا۔ ایسے میں کوئی کیا کر سکے گا۔

کبھی جو باتیں ہمارے لیے وجۂ سکون تھیں۔ اُنھیں اب دماغ کا خلل کہا جا رہا ہے۔ کون دیوانہ ہے کون فرزانہ، کسی بات کا پتا نہیں چل رہا۔ جب کوئی قوم گومگو کے عالم میں ہوتی ہے تو وہ وقت اُس کے لئے وقتِ دعا ہوتا ہے۔

ہمارا مذہب ہمیں مایوسی سے روکتا ہے۔ اسی لئے جینے کی آرزو بھی ہے۔ ورنہ اس قوم کے لچھن ——

ناحق میں نے آپ کو آزردہ کیا۔ ایک کپ چائے منگوائیے اور غم کو غلط کیجئے۔

آپ کا محمد طفیل ۱۰/۷۳ ۵

آغا افتخار حسین

برادرم!

آپ کا مبلغ -/۲۰ کا چیک ملا۔ اگر اس سے میری زندگی بھر کی مالی اُلجھنیں دُور ہو سکتیں تو اسے ضرور بادلِ نخواستہ ہی سہی قبول کر لیتا۔ اب تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ بڑے با اخلاق ہیں۔ مگر مجھے، اتنا بھی بے اخلاق نہ جانیں!

میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ اگر چاہا ہے تو آئندہ نہ چاہوں گا، بجز جذبۂ اپنایت کے، رشتۂ خلوص کے!

آپ نے مجھے سمجھنے میں، بڑی بے دردی کا ثبوت دیا۔ سچ جانیے آپ نے مجھے (رسالے کے یہ بیس روپے کیا بھیجے کہ میں نے انھیں اپنے لئے بیس جوتے جانا!

میں نے آپ کو، اپنے بہت قریب جان لیا تھا۔ بس اتنا ہی تو خطاوار ہوں!

محمد طفیل ۳/۶۹ ۱۹

سید ضمیر جعفری

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے خط کا جواب دوں گا تو وہ رسمی سی بات ہو جائے گی۔ اس لئے میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ کے خط سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس ضمن میں اگر کہوں گا تو یہ کہوں گا کہ آپ کو جیسا اچھا، آج سے پندرہ برس پہلے پایا تھا۔ ویسا ہی آج پایا۔ حالانکہ اس عرصے میں اخلاق کے سانچے بدل گئے ہیں۔ سائنس جتنی ترقی کر رہی ہے۔ انسانیت اتنی ہی زیادہ گمراہ رہی ہے۔ انسان جتنا متمدن بنتا جا رہا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے اتنا ہی گھٹیا ہوتا جا رہا ہے۔

آپ کو خطوط نمبر پسند آگیا۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ پسند آگیا۔ پسند نہ آتا تو میں آپ کا کیا بگاڑ لیتا۔ آپ مزاح نگار ہیں چٹکیوں میں میری بارہ برس کی محنت کا خون بھی کر سکتے تھے لیکن سچا مزاح نگار ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کے دل میں خوفِ خدا بھی ہوتا ہے۔

بیچ! آپ کو اتنے عرصے کے بعد، ملنے میں، بڑا لطف آیا۔ میں تو آپ کی صورت ہی دیکھتا رہا۔ آپ کی باتیں ہی سنتا رہا —
اور ہاں کرنل محمد خان بھی بڑے "شب بیبے" آدمی معلوم ہوئے۔ معصوم گنہگار سے!

محمد طفیل

۲۷ ۷/۶۸

بھائی صاحب

جب بھائی کہا ہے تو بڑا بھائی بھی ماننا پڑے گا۔ پھر احترام بھی کرنا پڑے گا۔ مگر احترام کب نہیں کیا ہے؟ جواب کسی قسم کے پروٹوکول سے ڈر گئے۔

"نوائے وقت" والے مضمون چھاپیں گے تو آپ ہی کے کہنے پر، کیونکہ وہ لوگ مجھ سے بلاوجہ خوش" ہیں۔ وہ مجھے کمیونسٹ سمجھتے ہیں اور کمیونسٹ مجھے جماعت اسلامی کا نمائندہ، اصل میں آدمی کو ایک طرف ہو جانا چاہیے۔ اب میرا بڑا بھائی ہی مجھے بتائے کہ میں کامریڈ بنوں یا مولوی؟ صرف آدمی بن کر اس دنیا میں گزارہ نہیں ہو سکتا۔

آپ کی نظم ملی۔ دل خوش ہوا۔ وجوہ مختلف ہیں۔ ان میں سے صرف دو یہ کہ —— نظم اچھی ہے۔ پیاری ہے۔ بن مانگے ملی ہے اور اسے کہتے ہیں محبت!

آپ کا محمد طفیل

۲ ۸/۷۶

بھائی،

لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ "دل دونوں کے بجتے ہوں تو بات بنتی ہے"۔ یہ فقرہ میں نے "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔ کے خاندان سے نکالا ہے۔

جس دن آپ نے مجھے تراشہ بھیجا، اسی دن حکیم صاحب (یوسف حسن) نے بھی مجھے وہی تراشہ بھجوایا۔ معلوم ہوا کہ میں دونوں کے دلوں میں بستا ہوں۔ جسے میں اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ایک رسالے کا کمانڈر میرا خیر خواہ اور ایک شاعری کا کمانڈر میرا خیر اندیش!

میں آپ کے ایک دوست کی آپ سے شکایت کرنی چاہتا ہوں۔ مگر آج کے خط میں نہیں وہ اچھا کام میں کسی اور شبھ گھڑی کروں گا۔

میں ایک شادی میں شرکت کی غرض سے ۵ مئی کو اسلام آباد پہنچوں گا۔ لہٰذا روپوش رہنا ہو تو ہو جائیں ورنہ —— ورنہ —— حاضر ہوں گا!

آپ کا محمد طفیل

۲۶ ۴/۷۸

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ مضمون ملا۔ شکریہ ہی شکریہ!

حشمت کاشمیری پر مضمون بے حد اہم ہے۔ کہنا چاہئے کہ حشمت کو پہلی بار دریافت کیا گیا ہے۔ وہ غلط روایتیں، جو تاریخ ادب اُردو کا حصہ بن چکی تھیں۔ ان کا ازالہ پہلی بار ہوگا، اس مضمون کو پاکر، میں بھی خوش ہوں۔ آپ بھی خوش ہوں۔

جناب میری ایک اور گزارش پر بھی دھیان دیں۔ وہ یہ کہ میرؔ پر آپ کو جو کچھ ملا ہے۔ وہ میں چھاپوں گا۔ (فوٹو یعنی عکس بھی) چاہے مجھے اس کے لیے میرؔ نمبر چھاپنا پڑے۔ لہٰذا وہ سب کچھ بحق نقوش محفوظ کر لیجئے۔ اور یہ بھی کہ اُس کام کو جلد مکمل کر ڈالیں۔ تاکہ کوئی اور نہ لے اُڑے۔ ہو گیا قول؟

آپ کی کتاب مل گئی ہے (تحقیقی جائزے) میری نالائقی کہ میں اس سے پہلے آپ سے واقف نہ تھا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ اگر لوگ اس سے پہلے آپ پر ایمان نہیں لائے تھے تو اب لانا پڑے گا۔ سچ!

میری آرزو ہے کہ میں اپنی زندگی میں غالب کے بعد میرؔ اور اقبالؔ نمبر بھی چھاپ سکوں۔ اگر نہ چھاپ سکا تو کم از کم نیت کا ثواب تو ملے گا ہی!

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔ والسلام

محمد طفیل ۸ ۴/۶۹

برادرم! سلام مسنون!

اگر دیوان میرؔ چھاپا جائے تو ہندستانی اور پاکستانی ایڈیشن میں فرق ہونا چاہیے۔ کچھ اس کے بارے میں سوچیں ——— اور اگر کوئی کاروباری معاملت ہے تو وہ بھی فرما دیں تاکہ سوچا جاسکے۔ کچھ کیا جائے۔

اس قسم کی ٹھوس علمی دستاویزات کی قیمت ہمارے لیے اور ہم الیسوں کے لیے ہے۔ عام قاری کے لیے نہیں، آپ نے دیکھا کہ "بیاضِ غالب" کتنی نادر دریافت تھی۔ مگر فروخت کے اعتبار سے، نقوش کے دیگر نمبروں سے کمتر رہی۔ ٹھیس لگی! ـــ سوچ رکھا ہے کہ اس عشق میں تو یونہی ہوگا۔ اور ہوتا رہے گا۔

آپ نے بھی ہندوستان میں "دیوان میرؔ" کی فروخت دیکھ لی۔ پاکستان میں معاملہ کچھ زیادہ الگ نہ ہوگا۔ بہرحال ایک دُھن پوری ہوسکتی ہے۔ ایک لگن کو تسکین دی جاسکتی ہے۔

آخر ایک بار تو ایسی تخلیقات کی اشاعت کے کاروباری پہلوؤں پر بات کر ہی لینی چاہئے۔ سو یہ سودا زیادہ تر ادبی عاقبت کا ہے۔ دنیاوی منفعت کا نہیں۔ بہرحال کچھ فرمائیں تو!

اقبال کے بارے میں، کوئی مضمون نہ بھجوا سکیں گے؟ آج میں اقبال ہی کے سلسلے میں دوستوں کو یاد کر رہا تھا کہ آپ کو ایک دوسرے معاملے کی طرف بھی توجہ دلا دی!

امید کہ آپ اچھے ہوں گے اور گمن!

آپ کا
محمد طفیل

۲۸/۴/۷۷

سبط حسن

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ عنایت!

"گل گامش کی داستان" تو آپ کی طرف سے، مجھے عطیہ تھا۔ اس لیے آپ مجھ سے، اپنی ہی چیز کی اجازت کیوں مانگتے ہیں؟ میں آج بھی بہت خوش ہوں کہ آپ کی کرم فرمائی سے، میں نے ایک کام کا مضمون چھاپا تھا۔

لوگ تو مصنف اور مدیر کی اجازت کے بغیر سیکڑوں مضمون نقل کر ڈالتے ہیں، ایسے ماحول میں آپ کا اس حد تک خیال رکھنا، آپ کی حد درجہ شرافت اور انسانیت ہے۔

"آثار و افکار مشرق" چھپ جائے تو مجھے پڑھوائیے گا۔ بس لالچ یہ ہے کہ ایک اچھی کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہ جاؤں۔ "زبردستی کی تحریریں" بہت پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جنھیں خود پڑھنا چاہتا ہوں۔ وہ کم ملتی ہیں۔ کیا عجز ہے۔ کیا ناچاری ہے۔

لیا امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

محمد طفیل

۱/۳/۶۹

ضیا احمد بدایونی

محترم المقام، سلام مسنون!

آپ نے مجھے جس محبت سے یاد کیا تھا۔ اُس کا تقاضا تھا کہ کچھ اپنا بھی حق جتا سکوں۔ سو میں نے وہ جتایا۔ اگر کبھی مجھ سے اللہ میاں نے بھی، اتنی اپنایت ظاہر کی تو اُن سے بھی یہی درخواست کروں گا۔ میرے پروردگار! ایک مضمون؟

آپ نے اپنی مصروفیت کا جو حال لکھا ہے۔ اس کی موجودگی میں، اصرار کرنے کا ابھی اپنا حق نہیں سمجھتا۔ ورنہ مصروفیت کا عذر، میرے کرمفرما مالک رام نے بھی کیا تھا۔ مگر میں نے انہیں صاف لکھ دیا تھا کہ آپ کو میرے کام سے زیادہ کوئی کام اہم نہیں ہونا چاہئیے چنانچہ انہوں نے اس عالم میں بھی، یعنی شرما حضوری میں سہی، مضمون بھیج ہی ڈالا۔

اچھا اب غالب پر کچھ لکھ کر نہ دیجئے۔ مگر ایک وعدہ کیجئے کہ آپ جو نظام لیکچر کے سلسلے میں مقالہ تیار کریں گے۔ وہ نقوش کا ہوگا۔ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو میری اِس درخواست کو قبول کر لیجئے گا۔ میں خوش، میرا خدا خوش!

آپ کا عنایت فرمایا ہوا "مکتوبات" کا کوئی نسخہ مجھے نہیں ملا۔ آخر محکمۂ ڈاک والوں نے بھی تو عالم فاضل بننا ہے۔ وہ یوں نہ کریں تو کیا کریں؟ ہو سکے تو یہ مجموعہ ایک بار پھر بھیج دیں۔ مگر اپنے دستخطوں سے، تاکہ جعلی نہ سمجھا جائے۔

میرا دلی آنے کا قصد ہے۔ آیا تو ضرور ستاؤں گا یعنی نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوں گا۔ والسلام

محمد طفیل ۶ ۲/۶۹

ساقی ایڈیٹر ساغر

محترم، سلام مسنون!

آپ کے مضمون نگار، جناب محسن راڈ نے مضمون بہت دلچسپ لکھ ڈالا۔ فیض صاحب کو بُرا بھلا کہنے کے لیے مجھے رگید ڈالا، یا مجھے بُرا بھلا کہنے کے لیے فیض صاحب کو رگید ڈالا۔

محمد طفیل اور طفیل احمد[1] دو مختلف آدمی ہیں۔ جس کا نقوش سے تعلق ہے وہ محمد طفیل میں ہوں۔ لیکن میں نے ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا جس میں فیض صاحب کو "صاحبِ دورِ شاعر" لکھا ہو۔ وہ مضمون طفیل احمد صاحب نے لکھا ہوگا۔ جن کا نقوش سے کوئی تعلق نہیں غالباً وہ ہیں بھی کراچی میں! وہ وہاں کے رہنے والے، میں لاہور کا!

کیا آپ اس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟ اگر آپ سے نیاز حاصل نہ ہوتا تو یہ درخواست بھی نہ کرتا۔

امید کہ آپ اچھے ہوں گے

نیازمند محمد طفیل ۷ ۵/۴۸

---

[1] اسی طرح ایک صاحب طفیل ہوشیارپوری ہیں۔ وہ بھی کبھی کبھی میرے حصے میں آجاتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی

یہ کسی سے ملنے پہ آئیں گی تو دن رات ایک کر دیں گی۔ اگر کسی سے خفا ہوں گی
تو ایسی گفتگو کریں گی کہ مخاطب کا سنبھلنا مشکل ہو جائے۔ چونکہ ان کا
ماحول خانقاہی اور جاگیردارانہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ہر شخص مزار سمجھے!

بہن، سلام مسنون!

میں نے آج حاضر ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں بطور احتجاج نہ آؤں گا۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آپ اپنی کچھ شان دکھلا رہی ہیں۔ میں ذہناً دیو جانس کلبی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس کی آرزو فقط اتنی ہی تھی کہ جناب! پرے ہٹ، جائیے تا کہ جو دھوپ آپ نے روک رکھی ہے۔ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔

میں آپ کے پاس جب بھی آیا۔ اپنا بہت وقت حرج کر کے آیا۔ اس لئے کہ میرے ہاں کارندے نہیں جو میرا کام کر دیں۔

مجھے تو ہر کام خود ہی کرنا ہوتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، بڑے سے بڑا کام بھی، اس لیے میں بیک وقت بہت چھوٹا اور بہت بڑا آدمی ہوں۔ مگر مجھے ناز اس بات پہ ہے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں — اور یہ بھی کہ بڑے بڑوں پہ مجھے بہت ترس آتا ہے۔

اب میں آپ کے بلانے پر کبھی نہ آؤں گا۔ کسی دن دل چاہا تو خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ وہ دن کب آئے گا۔ اس ماہ میں بھی آسکتا ہے۔

اس سال میں بھی آسکتا ہے اور

اس خط کے جواب کی ضرورت نہیں۔

محمد طفیل ۔۔۔۔۔۔ ۱/۷ ۲۱

محترمہ! سلام مسنون!

آپ میرے نام کے ساتھ یا تو نقوش پریس اُردو بازار لکھا کریں یا پھر ایڈیٹر نقوش ایک سطر یوں دو جگہوں کو اُوپر نیچے نہ رکھ دیا کریں۔ جیسے محمد طفیل اور مدیر نقوش کو رکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں بازار الگ، یہ دونوں بدھو الگ!

مجھ سے خط و کتابت برائے خط و کتابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ خالص عاشقانہ کام ہے اور بندہ اس سے قدرے نا آشنا۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں۔ جس کا مفہوم کچھ نکلتا ہو اور میرے دل میں کچھ اور ہو۔ یوں میرے مسیح ہونے پر حرف آتا ہے نا!

—— آہا ہا! — مسیح؟

آپ کا فلسفہ "جبر و اختیار" بڑا دلچسپ ہے کہ پیاسے کی پیاس، بغیر کچھ پیے بجھ جائے۔ یعنی نیکی کئے بغیر جنت مل جائے۔ بہرحال مجھے کیا، آپ جانیں اور آپ کا فلسفہ جانے۔ اپنے سے تو دماغ پچی ہوتا نہیں۔

جمیلہ ہاشمی، مریم، طیبہ اور بعد میں محترمہ آپ کے سلسلے میں مَیں انہی دہلیزوں میں سے گزرا میرے دماغ میں (دل میں نہیں) جو آپ کی تصویر بنتی ہے وہ ایک ایسی پاکباز عورت کی ہے۔ جو تہجد کی نماز کے لیے اٹھتی ہے لیکن اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ بہر حال اللہ اللہ کیجئے۔ یہی ایک راستہ سکون کا ہے۔

موجودہ صورت میں تو اپنے سردار احمد صاحب ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز! ——— ان کی کامیابی سے مجھے بھی خوشی ہوگی۔ ہر چند کہ تُو کون! میں خواہ مخواہ والا معاملہ ہے یہ۔

آئندہ خط کا جواب نہ دوں تو ناراض نہ ہو جئے گا۔ بس بھئی بس! حاشی کو پیار ——— ایک بار پھر پیار!

محمد طفیل ۱۲ ۱۲/۷۰

محترمہ سرفراز صاحبہ

بہن، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اپنے وضاحتی خط کے بعد اگر آپ نے مجھے بھائی کے لفظ سے یاد نہ کیا ہوتا تو خط کا جواب ہی نہ دیتا۔ آپ کے لیے اب میرا مشورہ یہ ہے کہ نقوش پڑھنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اس میں آپ کے ایک پسندیدہ شاعر کا کلام نہیں چھپتا۔ میرا اصول یہ ہے کہ جو کوئی بلا وجہ روٹھے۔ اُسے روٹھنے دیجیئے۔ منانے کی ضرورت نہیں۔ خود کو قصور وار سمجھتا ہوتا تو کب کا منا چکا ہوتا۔ کیونکہ مَیں ضمیر کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا۔

نقوش کے صفحات، ہر قابلِ قدر تخلیق کے لیے وا ہیں۔ خواہ وہ تخلیق کسی کی بھی ہو۔ اس سلسلے میں دوستی بھی ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ آپ کابل گئیں تو اپنے بھائی کے لیے کیا لائیں؟[لہ] کیا آپ نے لفظی بھائی بنایا ہے یا ماں جایا ایسا! آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میری سگی بہن کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی خاتون مجھے بھائی کہہ کر پکارتی ہے تو مجھے قدرت سے شکایت کم ہو جاتی ہے۔

والسلام۔ ۷ ۲/۷۰ محمد طفیل

محترمہ!

دیکھو بھئی، مردذات کو (ایک خاتون کی زبان سے) جتنی نفرت اس فقرے سے ہو سکتی ہے اتنی نفرت کسی دوسرے فقرے سے نہیں ہو سکتی کہ ”وہ شخص تو فرشتہ ہے“ ——— گویا اس کے تمام مردانہ حقوق سلب! یعنی نہ آنکھ اٹھا کے دیکھ سکتا ہے نہ مسکرا کر بات کر سکتا ہے۔ فرشتہ جو ہوا۔ نا چیز کو تو اس قصیدے اور رشتے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ براہ کرم اس فقرے کا استعمال کسی اور مرد پر نہ کیجئے گا۔ کیونکہ وہ اُسے اپنے حق میں کلمۂ خیر نہیں، کلمۂ شر سمجھے گا۔

باقی رہا معاملہ جناب کی دیکھ بھال کا، وہ ہم نے آپ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر احسان کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے، جینے کی امنگ کو باقی رکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ گھپ اندھیرے میں جینا مشکل ہو جاتا ہے۔

[لہ] اسے میری طرف سے کوئی مطالبہ نہ سمجھیں۔ قلم سے یونہی بات نکل گئی۔ بلا ارادہ! پھر اللہ نے مجھے کیا نہیں دیا۔

جمعرات کے روز اہلیہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ بیہوش ہوگئیں۔ اب ٹھیک ہیں۔ کارڈیوگرام وغیرہ کرایا ہے۔ وہ ٹھیک نکلا۔ گیس ویس کا چکر ہوگا — ویسے بھی یہ دنیا، ہے چکر ہی، کبھی خود چکر آجاتا ہے۔ کبھی دوسرا چکر دے دیتا ہے۔

آپ بلا رہی ہیں تو بندہ حاضر بھی ہوگا — لو میں آیا۔ سب کو سلام دعا اور پیار۔

۲۳ ۱۲/۷۵

محمد طفیل

آج ۶ ستمبر ہے۔ فتح کا دن! اس کے بعد کیا ہوا۔ جو کہانی اپنی فوج کی ہے۔ وہی اپنی!

میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ اگر کوئی میرے ساتھ دس قدم چلتا ہے تو پھر راہِ شوق کے پانچویں قدم پر، رکے کیوں؟

آپ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یاد رکھنے پہ واضح ہونا پڑے گا۔ لہٰذا مولانا بھاشانی کی طرح ‘مغربی پاکستان کو میرا شلام’ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اپنے آپ سے اتنا کہہ سکتا ہوں۔ ذرا رکو، ذرا سوچو، ذرا جانو!

ہوسکتا ہے کہ آپ یہ کہہ دیں۔ یہ خط معمہ ہے۔ یہ خط معمہ نہیں، میرے خیالات معمہ ہیں۔ میری ذات کی حد تک تو بہت سوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے خیالات کی حد تک کم کسی نے ساتھ دیا۔

۶ ۹/۷۶

محمد طفیل

کون؟ — بھئی میں طفیل ہوں۔

سنو! — چٹھی ملی۔ خوش ہوگیا۔ جواب میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ یہ سوچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں جو کچھ نہیں لکھ سکا۔ وہ سب پڑھ ڈالو۔ جو لکھ رہا ہوں۔ وہ اس لئے کہ تیرا مان بڑھے۔ اگر مان باتوں سے یا تحریروں سے بڑھتا ہے۔ تو یہ بھی سہی! میرا تو خیال یہ ہے کہ مان اُس خلوص سے بڑھتا ہے کہ جو دلوں میں ہو۔

میں کل بہت افسردہ تھا۔ بہت افسردہ، مگر جب تیری چٹھی ملی تو ذرا سنبھل گیا۔ یہ بات شاعری کے طور پر نہیں لکھ رہا بلکہ حقیقت ہے۔ کیونکہ شاعری کو، میری زندگی میں کوئی دخل نہیں۔ میں تو دو اور دو چار کا پرستار ہوں۔ شاعری میں عموماً دو اور دو چار بھی نہیں۔ بلکہ دو اور دو چار ہزار ہوتے ہیں۔

میرے دوست کرشن چندر کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں تھا۔ ڈاکٹروں نے انھیں بولنے سے منع کر رکھا تھا۔ جب عصمت چغتائی، پاکستان آنے لگیں، تو کرشن سے پوچھا، پاکستان کے کسی دوست کے لیے کوئی پیغام؟ تو اُس نے نحیف آواز میں اور رک رک کر یہ کہا۔ طفیل کو میری طرف سے پیار کرنا۔

پھر جب اس سے ایک بار آل انڈیا ریڈیو والوں نے یہ کہا کہ پاکستان کے کسی ایک دوست کے بارے میں مضمون پڑھئے تو

اس نے انتخاب، میری ذات کا کیا۔ یہ سب باتیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ایسے میں، میں افسردہ کیسے نہ ہوتا؟ میں آنجہانی کے بارے میں ہفتہ کے روز ایک تقریب کر رہا ہوں۔ تاکہ انسان، انسان پر بھروسا کر سکے!

میں نے تیرا خط کئی بار پڑھا۔ کئی بار پڑھا۔ شاید اس لئے کہ یہ خط وقت پہ آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس میں بہت خلوص تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ میرے کسی اپنے کا خط تھا۔ کیا کیا توجیہہ کروں؟

$\frac{۳}{۷۷}$ ۹ محمد طفیل

تنویر احمد علوی

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے خطوط ملے۔ جب ایک دوسرے کو جان لیا جائے تو پھر رسمی خطوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے کیا؟

پھر آپ کے پہلے خط میں، میرے بارے میں جن خوش فہمیوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ بھی جواب عرض کرنے میں مانع رہیں۔ کیونکہ آپ کو مجھ میں اچھائیاں ہی اچھائیاں نظر آئیں اور مجھے برائیاں ہی برائیاں نظر آتی ہیں۔ عجیب عینکیں ہیں ہماری!

ویسے تعلقات میں، موجودہ صورت کو خوش آئند کہا گیا ہے۔ خدا کرے کہ جانبین اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔ تا آنکہ انتقال فرما جائیں مجھے دلی بہت یاد آتی ہے۔ دلی میں میرے بہت سے اپنے ہیں جنھیں ہر وقت یاد رکھتا ہوں۔ اب ان میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا یعنی دکھ بڑھ گیا۔

کبھی کچھ لکھیں تو مجھے ضرور بھجوائیں۔ والسلام

$\frac{۳}{۷۰}$ ۱۵ آپ کا محمد طفیل

سمت پرکاش شوق

برادرم، آداب!

گرامی نامہ کا شکریہ!

دوستوں کو غالب نمبر پسند آ گیا ہے تو محنت ٹھکانے لگی۔ اپنا کام تو صرف ادب کی راہوں میں، دیئے جلانا ہے۔ اُن میں روشنی کتنی ہے یہ دیکھنا اور جانچنا اہلِ نظر کا کام ہے۔

میں نے آپ کو لکھا تھا کہ فرصت میں خط لکھوں گا۔ یہ بات لکھی تو نیک نیتی سے تھی۔ مگر لکھتے وقت جانتا یہ بھی تھا کہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہوں۔ کہاں کی یکسوئی، کہاں کی فراغت!

اللہ سو روگ لگا دے مگر لگن کا روگ کسی کو نہ لگائے اگر کوئی اس کا اسیر ہو گیا تو جان لیجئے وہ دنیا جہان سے گیا۔ باقی سارے

تقاضے ایک طرف اور "یہ بی لگن" ایک طرف!

طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، آپ کے پاس پہنچیں گے۔ غالب نمبر تو چٹنی ہو گیا۔ پھر چھاپ رہا ہوں۔

فراق صاحب کی غزل ضرور بھیجیے۔

محمد طفیل ۱۱ ۴/۶۹

انور سدید

محترم!

غالب نمبر کے سلسلے میں، آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جس خلوص سے میرے کام کو سراہا۔ اس کے لیے از حد ممنون ہوں۔ اس ساتھ ہی یہ بھی احساس رکھتا ہوں کہ دوستوں کے تعاون کے بغیر، میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ میری عزت بڑھانے والے اصل میں میرے قلمی ساتھی ہی ہیں۔

آپ کے گرامی نامہ میں جو خلوص ہے۔ اس کی بنا پر، ایک بات آپ سے کہنے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ کبھی کبھی آپ کے پرچے میں 'ندیم صاحب' کے بارے میں چبھتے ہوئے فقرے چھپتے ہیں۔ اس سلسلے کو ختم ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ ادبی کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کی قوت بننا چاہئے۔ راہ کا روڑا نہیں بننا چاہئے۔ سوچا آپ کے خط کے جواب میں، اس امر کی طرف اشارہ کر کے نیکی کما لوں۔ پذیرائی کی صورت میں ممنون بھی ہوں گا۔

بہت سے پرچے ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ تو دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور نہ پڑھنے کو، آپ کا پرچہ ایسا ہے کہ دیکھنے کو جی نہ بھی چاہے پڑھنے کو چاہے ہی چاہے! یہ فضیلت کم پرچوں کے حصے میں آئی ہے۔

محمد طفیل ۲۸ ۵/۶۹

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ سوچا باتیں ہو جائیں۔ فرصت ہے؟

آپ نے حکیم صاحب کے خاکے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ خاکے سے زیادہ انٹرویو ہے۔ اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

پہلی بات یہ ہے اور شاید آخری بھی یہی کہ میرے ذہن میں، کسی شخصیت کے بارے میں ایک نکتہ ہوتا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے، میں پیرایہ ڈھونڈتا ہوں۔ کبھی کسی بات کو اپنی طرف سے لکھ دیتا ہوں۔ کبھی دوسرے کے نام "جڑ" دیتا ہوں۔ نہ الفاظ دوسرے کے ہوتے ہیں اور نہ بات اُس طرح سے کہی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ تو میرا صرف پینترا ہوتا ہے۔

اگر میں لندن کی بجائے کالا شاہ کاکو گیا ہوتا تو مجھے بات کرنے میں آسانی ہوتی طبیعت مائل ہو جاتی۔ اب ہچکچاہٹ اس لیے ہے کہ وہ تحریر یاتراہٹ کے زمرہ میں آ جائے گی۔ اس لئے کچھ لکھنے پر جی راضی نہیں۔ ویسے ایک قلمکار کے لئے یہ بات ویسی ہی ہے کہ

جیسے کسی مسلمان سے کہا جائے کہ حج نہ کرنا، لوگوں کی نگاہوں میں آ جاؤ گے ۔ غرض میری سوچیں بہت ہی اوٹ پٹانگ ہیں ۔

آپ نے میری کتاب (مکرم) پڑھ کر، جب اپنی جان کے ساتھ ظلم کر ہی لیا ہے تو دیگر شخصیت نگاروں کی روشنی میں، اس پر لکھ بھی ڈالیں جسے نقوش کے اس شمارے میں چھاپ دوں گا ۔

اپنے سہیل بخاری صاحب نے مجھے شخصیت نگار کی بجائے، انسانیت نگاری کی تہمت" سے نوازا ہے ۔ دوستی ہے یہ اور کیا عرض

۱۲/۷۰ ۸ محمد طفیل

بھائی

آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نقوش کلاسیکل ادب کے تحفظ کا سامان کر رہا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے موجودہ ادب ۔ کوئی لگاؤ نہیں ۔

جناب! میں نے بے شک خاص نمبر چھاپے ہیں لیکن متعدد نمبر ایسے چھاپے ہیں جن کا تعلق موجودہ ادب سے ہے اور اُن سے متعدد تخلیقات زندہ بھی رہیں گی ۔

اگر نقوش نے اندازاً ۴۰ ہزار صفحات چھاپے ہیں تو اُن میں سے ۲۰ ہزار صفحات موجودہ ادب سے متعلق ہوں گے ۔ اتنی تخلیقات قابلِ اعتنا نہیں ؟

بھائی! اگر آپ کے ہاتھ میں قلم ہے تو اِدھر اُدھر بھی دیکھیں ۔ دوسروں نے بھی بڑی جان کھپائی ہے ۔ دوسروں نے بھی اد کو زندگی کا مسئلہ بنایا ہُوا ہے ۔ محض سیر کی غرض سے اِس وادی میں نہیں آن نکلے ۔

بہر حال آپ جو چاہیں لکھیں ۔ اپنا تو ایمان یہ ہے کہ ——— ہمارا کام ادب کے شیش محل میں مزید نقش گری ہے ۔ نقشِ تسخیر کے حصے میں آ سکے گا ۔ یہ فیصلہ کل ہوگا ۔

سالنامہ ملا (کلاسیکل ادب والا) کیسا لگا ؟

۲/۷۷ ۱۷ محمد طفیل

سید انور

یہ مسکراتے کم ہیں ۔ قہقہے زیادہ لگاتے ہیں ۔ اگر کبھی منہ بنا لیں تو اتنے خوفناک اور ہولناک ہو جاتے ہیں کہ پناہ بہ خدا!

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑے ملنسار ہیں ۔ بڑے بُردبار ہیں ۔ بڑے با اصول ہیں ۔ بڑے سیر چشم ہیں ۔ ایک آدمی میں اتنی خوبیاں

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں خوش ہوا۔

مجھے اگر آپ سے کوئی شکایت تھی تو وہ خلوص پر مبنی تھی۔ میں آپ سے بھائیوں کی طرح ملتا رہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ آپ مجھ سے مصنف اور مدیر کے رشتے سے ملنے لگے ہیں۔ چونکہ مجھے آپ کے سلسلے میں یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ اس لئے ذہنی طور پر دُور چلا گیا میرے نئے مصنفین کی کمی نہ تھی (اور یہ اہل قلم کی عنایت ہے) دوستوں کی کمی تھی۔ سو اس کا دکھ رہا۔

اگر آپ مجھے کبھی افسانہ بھیجتے تو میں ضرور چھاپتا۔ اس لیے کہ میرا آپ سے مصنف والا رشتہ ختم نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ ذاتی کھاتہ الگ ہے۔ ادبی کھاتہ الگ۔

خط اس لیے نہ لکھا کہ میں مصنف انور کا نہیں، دوست انور کا متلاشی تھا۔ جب مجھے وہ دکھائی نہ دیا تو میں بھی کھویا رہا۔

آپ جیسا چاہیں گے۔ مجھے ویسا ہی پائیں گے۔ دشمن تو بے شک اچھا ثابت نہیں ہو سکتا مگر دوست اتنا برا نہیں ہوں۔

آپ کے ارشاد پر صاحب اور جناب بھجوا رہا ہوں۔ سفر نامہ چھپ رہا ہے۔

جی ہاں! میں بھی گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ کا امیدوار ہوں۔

محمد طفیل

۲۳ ۱/۶۵

بھائی!

آپ کا خط مل گیا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ خط سے میرا گزارہ ہو سکتا ہے تو وہ ہو گیا۔

اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ بات تو افسانہ بھیجنے ہی سے بنے گی تو پھر جلد افسانہ بھیجدیں۔ ورنہ بات رہ جائے گی۔ افسانہ نمبر چھپ جائے گا۔

آپ تو تیز رفتار طیاروں کی دنیا میں[۱] رہتے ہیں۔ پھر کیوں بیل گاڑی میں بیٹھ کر افسانہ لکھ رہے ہیں؟ جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

اپنا کام تو سمجھانا ہے۔ دوست کی سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک، نہ آئے تو ٹھیک، عاقلوں میں عقل بانٹنے کا کام کوئی مجھ سے سیکھے! آخا خا خا!

بھابی کو آداب نہیں، السلام علیکم!

محمد طفیل

۲۳/۷/۶۸

---

[۱] پی آئی اے میں ملازم ہیں۔

کنہیّا لال کپور

انھیں میں نے دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ یہ معاملہ رسمِ دنیا کا ہے۔

اگر اس کی اطلاع کپور صاحب کو نہ ہو تو عرض کر سکتا ہوں کہ ان کی لکھی ہر سطر اور ہر لفظ پڑھا ہے۔ جو میں نے نہیں پڑھا، میں اُسے ان کی تحریر ماننے کے لیے تیار نہیں!

بھائی! ——— میرا نام طفیل ہے۔ وہ طفیل جو آپ کا ہمیشہ بدخواہ رہا ہے۔ جس نے آپ کا حلیہ تک بگاڑ دیا۔ اگر اس نے یہ سب کچھ خلوص سے کیا ہو تو؟

خیر یہ بات تو ذرا یونہی قلم سے نکل گئی ہے۔ ورنہ میں اس سلسلے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا، سوائے اس کے کہ پوچھوں طنز و مزاح نمبر کیسا رہا۔ آپ نے ہمیشہ دوسروں کا مذاق اڑایا ہے۔ اگر میں نے آپ کا اڑایا تو کیا ہوا۔ بدلہ لیا ہے۔ وہ بھی پورا نہیں!

بھائی جان! ——— اب میرے ہر شمارہ میں آپ کو لکھنا ہوگا۔ زیرِ ترتیب شمارہ کے لیے جلدی سے ایک مضمون بھیجئے۔ پھر اس کے ایک ماہ بعد پطرس پر کچھ، آپ نے عرصہ ہوا جو مضمون پطرس پر 'آجکل' میں لکھا تھا اس کی بھی نقل چاہئے۔ میری ان ساری باتوں کو "بطورِ حکم" مان لیجئے، خوشامدیں تو اب تک بہت کی ہیں۔

اور کیا حال احوال ہیں؟ بھابی اور بچوں کا حال؟ بشرطیکہ گفتنی ہو!

محمد طفیل ۱۹ ۲/۵۹

برادرم!

آپ سے لڑوں یا کیا کروں؟ افسانہ چھوڑ، خط کا جواب گول کر دیا
آج کل لپٹن والوں کا اشتہار نکل رہا ہے ———

لپٹن دیجئے

لپٹن لیجئے

میں جب کہتا ہوں کہ : افسانہ دیجئے
تو آپ کیوں نہیں کہتے : افسانہ لیجئے
کیا ہماری دوستی بازاری اشتہاروں کا سا اثر بھی نہیں رکھتی؟

سچ! مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے۔

۲۳/۷/۶۸ آپ کا محمد طفیل

برادرم، تسلیمات!

آپ کے تین چار مضمون ملے۔ تین چار تولے خون بڑھ گیا۔ ممکن ہے خون تین چار چھٹانک بڑھا ہو۔ مگر میں نے تولوں والی بات محض احتیاط کی غرض سے لکھی ہے۔ کیا "بنیا پن" اسے ہی کہتے ہیں؟

آئندہ جنم میں محمد طفیل بننے کی آرزو نہ کریں۔ بے شک بڑی شہرت پائی۔ بڑی عزت کمائی مگر مسلسل سُولی پہ لٹکا رہا۔ یہ نہ ہوا وہ نہ ہوا کے چکر سے چھٹکارا نہ ملا۔ یعنی جتنے کام کئے۔ وہ سب ادھورے لگے۔ یعنی مرے بھی تو ادھورے!

اگر قدرت نے تھوڑی سی مہلت دے دی تو ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کا ارادہ ہے۔ یعنی نظرِ ثانی کے بعد نمبروں کی دوبارہ اشاعت کا منصوبہ! ارتقا کا سفر بھی عجیب سفر ہوتا ہے۔ آدمی برسوں کے بعد بھی وہیں کھڑا نظر آتا ہے۔ جہاں کہ پہلے دن تھا۔

جتنے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دل کی بیماری ہے۔ اُن میں سے نوّے فی صد لوگوں کو گیس کی تکلیف ہوتی ہے۔ کہیں آپ بھی تو ہمیں، اسی بہانے پریشان کرنا نہیں چاہتے؟

کیا آپ مجھے اپنی (بڑے سائز کی) تصویر بھجوائیں گے؟ چھاپ کر اپنا دل خوش کرنا چاہتا ہوں۔ فقط۔

۱۲ ۵/۷۸ آپ کا طفیل

مسعود مفتی

برادرم! اسلام مسنون!

ایک ہفتے سے بخار وغیرہ میں مبتلا ہوں۔ اب کچھ ٹھیک ہوں۔ ویسے ہر طرح خیریت والا معاملہ نہیں۔

آپ کا میرے طلوع کے سلسلے میں، گرامی نامہ ملا۔ شکریہ!

واقعی آپ کا ایک افسانہ ایسا ہے۔ جو میں چھاپ نہ سکا۔ اس میں بھی میری بُزدلی کو دخل کم تھا۔ عقل کو زیادہ! چلو یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اُسے بھی کسی وقت چھاپ دوں گا۔ تھوڑا سا وقت کا انتظار ہے۔ وقت کا انتظار تو رسولؐ نے بھی کیا تھا۔

میرے طلوع کے مخاطب زندہ مُردے ہیں۔ آپ ایسے دو چار دوست نہ تھے۔ قصہ فردِ واحد کا نہیں۔ برادری کا ہے۔ کوئی انعام کے لالچ میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی بیرونی ممالک کی سیر کی زد میں آیا ہوا ہے۔ کوئی چپ رہ کر اپنا "مستقبل سنوار" رہا ہے۔

یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہے کہ جیسے کوئی دشمن، بچے کو ایک آنہ کی کنکیا خرید دے تاکہ وہ کوٹھے پر سے گر سکے۔ موجودہ حکومت نے ادیبوں کو انعام کی کنکیا خرید دی ہے تاکہ وہ اپنا ادبی مستقبل تباہ کر سکیں۔

یہ دور بڑا نازک ہے۔ حساس ذہنوں کو خودکشی سے بچانے کے لئے، بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔ خون کو ارزاں کرنا پڑے گا۔

ورنہ اتنے گھپ اندھیرے ہیں، دو ایک ٹمٹماتی شمعیں بھی کچھ نہ کر سکیں گی۔ بڑا اندھیرا ہے بھائی! بڑا اندھیرا ہے۔
رونا صرف اتنا ہے کہ اِس دور میں ادیب کے ضمیر کا سودا بہت سستا ہو گیا ہے اور کوئی دُکھ نہیں!

۳۰/۱۱/۶۸ محمد طفیل

بھائی!

ضلع کی ڈپٹی کمشنری کے ساتھ، ادب کی ڈپٹی کمشنری کا بھی خیال رکھیں۔
تازہ شمارے کے لیے افسانہ "طلب" کیا تھا۔ جواب تک نہیں ملا۔ کیا یہ نمبر آپ کے افسانہ کے بغیر چھپے گا؟
اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیوں نہ آپ کے خلاف "تعزیراتِ ادب" کے سلسلے میں باز پرس کی جائے۔
اِس نوٹس کا جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر ملنا چاہیئے۔

بھاگ جاؤ لائل پور سے، رہ جاؤ لائل پور میں' دونوں خبریں پڑھیں۔
معلوم ہوتا ہے لائل پور میں آپ کا بڑا زور ہے۔ خدا کرے اس سے بھی زیادہ نیک نام ہوں۔ اس سے بھی زیادہ ہر دلعزیز۔
میں اس سے پہلے خط لکھتا مگر نمبر[1] میں "دمِ تحریر" تھا۔ اگر غالب کی تقریبات کی تصویریں ہوں تو دکھا دیجئے۔
بھابی کو سلام کیا لکھوں۔ کبھی ملا نہیں۔ بچوں کو پیار کیا لکھوں۔ کبھی دیکھا نہیں۔

۳۱/۳/۶۹ محمد طفیل

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ بھی ملا۔ افسانہ بھی!
جہاں[2] آپ گئے ہیں۔ وہ جگہ سرکاری حیثیت میں شاید اتنی اچھی نہ ہو۔ مگر وہاں افسانوی مواد بہت ہے۔ جتنا چاہیں سمیٹ لیں
چوری، ڈکیتی، زنا اور قتل وغیرہ کی جیسی لرزہ خیز وارداتیں، اُدھر ملیں گی۔ کم کہیں اور ملیں گی۔ اگر آپ ان ہولناکیوں کا تجزیہ کر سکے
تو اُردو افسانہ کو فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر آپ کی تحریروں میں خلوص بھی شامل ہو گیا، تو وہاں کے باشندوں پر احسان ہوگا۔
آپ مجھے جب بلائیں گے۔ پہنچ جاؤں گا۔ دوستوں کی باتوں کو غور سے سننے کو بھی، میں عبادت ہی سمجھتا ہوں۔ ویسے
تک آثارِ قدیمہ کو دیکھنے[3] کا تعلق ہے۔ اُس سے میرا واسطہ روز کا ہے۔ یعنی ہر روز آئینہ دیکھتا ہوں۔
خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام

۲/۶/۶۹ محمد طفیل

---

[1] غالب نمبر۔ [2] ڈپٹی کمشنر، لاڑکانہ۔ [3] دعوت کہ موہنجوداڑو آ کے دیکھو!

عبدالقوی دسنوی

برادرم!

مضمون کی رسید بھجوا نہ سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ پرچے کے آخری مراحل میں، جب بھی کوئی خط آیا یا مضمون، اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ رسید بھجوانا مسئلہ بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اُن دنوں، کسی نہ کسی وقت کا کھانا بھی گول کرنا پڑ جاتا ہے۔

اوروں کے لیے رسالہ چھاپنا آسان ہو گا۔ میرے لئے تو سزا بن جاتا ہے۔ عشق بھی کیا تو کس سے؟ جو نہ اپنی کہہ سکے، نہ میری سُن سکے۔ بہر حال میں اپنے آپ کو فریب دیئے چلا جا رہا ہوں کہ میں قابلِ ذکر کام کر رہا ہوں۔ جس دن کام کی "اصلیت مجھ پہ واضح کر دی گئی" وہ دن سزا پانے کے بعد، میری رہائی کا پہلا دن ہو گا۔

آپ کا مضمون، بہ سلسلہ غالب اہم ہے۔ چند دنوں تک غالب نمبر آپ کے پاس پہنچے گا تو آپ دیکھیں گے کہ وہ مضمون نمبر کی زینت ہو گا۔

خطوط کی بات، ابھی سے کیا کروں۔ توفیق ہوئی تو خطوط پہ تیسرا نمبر بھی پیش کروں گا۔ والسلام

محمد طفیل ۲۱/۳/۶۹

بھائی! آداب!

آپ نے سوچا میں بھی غالب کے سلسلے میں، پیچھے کیوں رہوں؟ نہ رہئے صاحب پیچھے، سب کے ساتھ دوڑیئے۔ دم خم کا ثبوت دیجئے۔ منزل پہ کون پہنچے گا یہ بات بعد کی ہے۔ ابھی تو صرف خلوص کا امتحان ہے۔

پچھلے دنوں آپ کا ایک چھوٹا سا مضمون ملا تھا۔ اپنے لیے اچھے مضمون رکھتے ہیں۔ یاروں کو ٹرخاتے ہیں۔ خوب ہے صاحب یہ بھی ادا ـــ "میری حدیث" یہ ہے کہ دوسروں کو اپنی ذات پہ ترجیح دینا چاہیے!

یہ بتائیں کہ آپ نے اپنے مضمون میں، نسخۂ عرشی زادہ سے استفادہ کیوں نہ کیا۔ اُسے بنیاد کیوں نہ بنایا؟ اس خاکسار کو کیوں نوازا؟ ویسے میں آپ کا ممنون ہوں کہ کسی ایک ہندی مہربان نے تو میرے اس کام کا نوٹس لیا۔ ورنہ سبقت کا جنون اس حد تک ہے کہ غلط سلط طریق سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کام بھی ہمارا ہے۔ وہ کام بھی ہمارا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ گالی بھی پہلے ہم نے دی تھی۔ سبحان اللہ!

محمد طفیل ۱۶/۱/۷۱

محترم، سلام مسنون!

باتیں کرنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ کچھ لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مگر اِدھر میں ادیبوں کے تنظیمی معاملات میں الجھ گیا ہوں یا سلجھ گیا ہوں۔

کئی اہم نمبر زیرِ ترتیب ہیں۔ اِس کیمیاگری میں، ایک ایک دو دو آنچ کی کسر ابھی باقی ہے۔ یوں اہلِ نظر کو اپنی رائے دینے کا موقع نہیں مل رہا۔ کسی دن بہت کچھ سامنے آجائے گا۔ وہی دن میری بھی تسکین کا ہو گا۔ ورنہ ابھی تک تو مور جنگل میں ناچ رہا ہے۔

علامہ اقبال پر بھی نمبر چھاپ رہا ہوں۔ کچھ اہم تحریریں بھیجیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ نمبر بھی کام کا نکلے۔ لہٰذا کچھ سوچیئے اور کچھ کیجیے علامہ کا تو بھوپال سے خاص تعلق رہا ہے۔ اس لئے اہلِ بھوپال کا حق کم تو نہیں بلکہ سوا ہے۔

مطلع بالآخر آپ تک پہنچ ہی گئی۔ متعدد کتابیں بھجوائیں۔ اُن میں سے ایک جا کر ملی۔ ہلال کی تحریر کا یہ حشر! ہلال کی تحریر اس لئے کہ صاحب لکھنا عرق ریزی ہی کا نہیں بلکہ "خون ریزی" کا کام ہے۔ مگر اس خون ریزی میں قتل اپنے آپ کو کرنا پڑتا ہے۔

جناب جب میری تحریر پسند ہے تو چند صفحے میری طرزِ نگارش پر لکھ بھی دیجیے۔ مَیں نے شرفاء سے سنا ہے کہ خوشیاں بانٹنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ باقی آپ جانیں!

۴/۱/۷۶ آپ کا محمد طفیل

محترم، سلام مسنون!

خطوط کے جواب برابر بھجواتا رہتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط رجسٹری سے نہ بھیجا۔ وہی آپ کو نہ ملا۔ ایک دفعہ ڈاکخانے کے ایک کارندے نے مجھ سے کہا کہ آپ نے فلاں شخص کو اپنے خط میں یہ لکھا اور فلاں کو یہ۔ تو میں بڑا حیران ہوا تھا۔ پوچھا۔ آپ کو کیسے معلوم؟ اس کا جواب یہ تھا کہ "آپ کے خطوط مجھے اچھے لگتے ہیں اس لئے کھول کے پڑھتا رہتا ہوں۔" اب بتلایئے؟

چلو آپ کے نام، یا آپ ایسے کسی اور دوست کے نام، اگر کوئی میرے خطوط پڑھے تو کوئی حرج نہیں مگر میں ہر وقت درود شریف تو نہیں پڑھتا رہتا۔ کسی وقت کسی کو یہ بھی لکھ سکتا ہوں کہ اُس دن جو آپ نے کپڑے پہنے تھے۔ وہ مجھے اچھے لگے۔

اس تمہید کی غرض و غایت یہ کہ بندہ تو خطوط کے جواب دیتا ہے۔ اگر وہ کسی دوست تک نہ پہنچے تو بندہ صد فی صد قصوروار نہیں ہوتا۔

آپ کا دوسرا مضمون بھی مل گیا تھا۔ پہلی جلد اگست میں مکمل ہو گی۔ دوسری اکتوبر میں۔ آپ کے دونوں مضمون، دونوں ہی جلدوں میں براجمان ہوں گے۔ اِن شاء اللہ!

میں نے اختر سعید خان (ایڈووکیٹ) سے کہا تھا کہ بھوپال کے دو آدمی اچھے لگے۔ ایک آپ اور دوسرے عبدالقوی دسنوی! اس پہ اختر نے کہا کہ وہ تو دسنہ کے ہیں۔ اُس پر میرا جواب یہ تھا جبھی آپ سے اچھے نہ لگے!

۳۰/۷/۷۷ آپ کا محمد طفیل

اشفاق احمد

بھائی! میں نے جب بھی سوچا تو دماغ نے یہی کہا۔ تُو اشفاق سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔ مگر دل نے تسلی یہ دی کہ نہیں

تو جیت بھی سکتا ہے۔ بہرحال میں ابھی تک یقین اور بے یقینی ہی کی منزل میں ہوں۔ مگر ایک بات بالکل واضح ہے کہ اشفاق میرا اپنا ہے اشفاق مجھے اپنا سمجھتا ہے کہ نہیں۔ میں اس سوال پر نہیں سوچتا۔ کبھی نہیں سوچا ـــ کسی کے لیے بھی نہیں سوچا۔ مجھے تو صرف اپنی ذات سے غرض ہے۔

میں نے سنا ہے کہ اِن دنوں، آپ ایران گئے ہوئے ہیں۔ خدا کرے آپ کی پرواز اس سے بھی بلند ہو۔
ایک بار۔ میں آپ سے پھر وہی بات کہوں گا۔ جو پہلے بھی کہتا رہا ہوں "قلم ہاتھ سے نہ رکھئے"۔

محمد طفیل ۱۷/۴/۶۹

ڈاکٹر حیدر

بھائی!

آپ کا مکرّمت نامہ ابھی ملا۔ ہاتھ کے ہاتھ، جواب اس لئے عرض ہے کہ کہیں وقفہ، آپ کے ایک دو فقروں کی چبھن کم نہ کر دے۔

آپ جیسا بھلا آدمی بھی یہ کہتا ہے (۱) آپ کے موڈ سے خبردار رہنا چاہیے۔ (۲) جو اکثر موقع محل دیکھے بغیر بگڑ جاتا ہے ـــ اپنی یہ تعریف سُن کے، مارے خوشی کے چُلّوں خون اُچھلا۔

میں نے اس سے پہلے خط میں لکھا تھا ـــ "اب میرے پاگل پن کا علاج کوئی بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی نہ کر سکے گا"۔ آپ کے اس خط نے میری ہی بات کی تصدیق کر دی۔ اس لئے گِلے کا بھی محل نہ رہا۔ پھر کوئی گِلہ سچی باتوں پر کرے بھی تو کیسے؟

آپ کو شاید علم نہیں کہ میں نے اپنے اس قصور کی ہمیشہ سزا بھگتی: بچپن سے لے کر اب تک، مگر دل مطمئن ہے اس لیے کہ مصلحت کوش نہیں ہوں۔ اسی لئے ہر زخم پر صلّ علیٰ کہتا ہوں۔

یہ مانتا ہوں کہ یہ میرا خود ساختہ اطمینان، اوروں کے نزدیک وجہِ جواز نہ بنے گا۔ مگر میں کیا کروں۔ جب دنیا میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو تو کیا میں خود بھی اپنا ساتھ چھوڑ دوں؟ اس کھیل میں بس ڈر اتنا ہے کہ اکیلا رہ جاؤں گا۔ مگر میں اکیلا کب تھا؟

جو احباب، مجھ سے ہنس بول لیتے ہیں۔ اُس کی بنا پر، زندگی میں ذرا سی چھلا چھل ہے۔ ورنہ میرے دل کے نہاں خانوں میں دُور دُور تک (ذہنی) رفیق نہیں۔

میرے جاننے والے بہت سے ہیں۔ دیدہ بھی نادیدہ بھی، مگر ان میں "میرے" کتنے ہیں؟ یہ سوچتا ہوں تو تعداد اکائیوں سے نہیں بڑھتی۔ اکائیوں کے ہندسے بھی کون سے؟ پہلے ہی دو تین!

معاف کیجئے میں نے آپ کو بور کیا۔ ویسے بھی ایسی باتوں کی آرائش، ـــــــ دل کے خلوت خانوں ہی میں بھلی لگے تو لگے۔ منہ در منہ کہنے نکلوں گا تو اُلٹے جھگڑے میں بھی کوئی کام نہ آئے گا ـــ میں بھی ایسی باتیں سب سے کہاں کرتا

ہوں۔ آپ نے چھیڑ دیا تو اپنا سمجھ کے پھٹ پڑا۔

میں آپ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی میری کتابِ زندگی کا ایک باب ہے۔ والسلام

۱۵/۱۰/۶۴ محمد طفیل

شہزادے! سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا تھا ——— آپ نے جلد جواب نہ دے کر حوصلے کا ثبوت دیا۔ میں نے فوراً جواب لکھ کر اپنے تئیں مطمئن ہونا چاہا۔ میرا خیال ہے۔ اگر من کی بات کہہ دی جائے تو دل و دماغ دُھل جاتے ہیں۔ کدورتیں چھٹ جاتی ہیں۔

انتقام والی حس، مجھ میں ہے تو مگر وہ ہے برائے نام، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی سے انتقام لیا ہو۔ میں تو در گذر میں ہی عافیت سمجھتا ہوں۔ مگر آپ احتجاج کو انتقام کا نام تو نہ دیں۔

میرا مُوڈ اسی وقت ٹھیک ہو گیا تھا۔ جب میں نے خط پوسٹ کر دیا تھا۔ اب آپ کے لکھنے سے مزید تاکید ہوئی ——— غرض "حکم حاکم سے اطلاع پائی" ——— البتہ اب اِس بات کا خیال ضرور آتا ہے کہ آپ کے مزاج کو جانتے ہوئے بھی، خواہ مخواہ اس لڑائی میں آپ کو بھی ایک فریق بنا لیا ——— چلو بابا، بات ختم ہوئی ——— وہ بھی صرف آپ کی حد تک!

لیجئے سب سے لڑائی ختم ہوئی۔ وہ بھی اِس ڈر سے کہ ممکن ہے آپ بھی، بعد میں اپنی بیوی کا پارٹ لینے لگیں۔ ہر چند کہ اِس معاملے میں، آپ کے غیر جانبدار رہنے کی پوری اُمید ہے۔ مگر میرا یہ احساس ابھی اپنی جگہ ہے کہ میں کون ہوتا ہوں کہ ناراض ہو ہو بیٹھوں ——— ویسے بھی اِس بڑھاپے میں بچوں والی حرکت سے باز رہنا چاہیے۔

دوسرے اب مجھے اس بات کا بھی اس بات کا بھی احساس ہو چلا ہے کہ ساری دنیا سے میرا ذہن کیوں ٹکراتا ہے۔ ہو نہ ہو میرا ہی کوئی قصور ہو گا۔ اس لئے ساری دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بجائے۔ بہتر یہ ہے کہ خود، دنیا کی مرضی کے مطابق ڈھل جاؤں۔ دعا کیجئے کہ بہروپ میں پورا اُتر سکوں۔ آمین!

میں پڑھا لکھا آدمی تو نہیں ہوں۔ مگر سوچنے سمجھنے والا دماغ رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کی سیدھی سادی باتیں بھی زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر مجھے کوئی یہ کہے کہ یہ دن ہے تو میرا ذہن اس طرف جائے گا کہ یہ دن کا کونسا حصہ ہے۔ صبح کا، دوپہر کا، سہ پہر کا، جھٹپٹے کا۔ بس اتنا سوچنا ہی مخاطب کے لئے تکلیف کا باعث بن جاتا ہے اور اُسے مجھ ایسے آدمی کا خلوص بھی مشتبہ نظر آنے لگتا ہے

آپ نے لکھا ہے کہ میں اپنی پسند، اپنی طرز اور اپنی روایات میں، اپنے دماغ کے سوا۔ اپنے دل کو بھی دخل انداز ہونے نہیں دیتا۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ مگر میرے نزدیک اس میں کچھ کسر ہے۔ پورا انسان بننے کے لئے دل و دماغ میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اچھا انسان بننے کے لئے دماغ کا ساتھ زیادہ دینا چاہیے۔ مگر غریب دل کو بیس فی صد تک تو MARGIN دینا ہی چاہئے۔ میرے نزدیک جو کوئی ایسا نہیں سوچتا۔ وہ بڑا آدمی تو بن سکتا ہے۔ بڑا انسان نہیں بن سکتا ——— آپ کہیں گے کہ ابھی یہ شخص کہتا

تھا کہ آئندہ نہ جھگڑوں گا۔ مگر پھر جھگڑ رہا ہے — ہائے اللہ! میں کیا کروں! (اس خالص زنانہ فقرے کی معذرت!)

آپ نے یہ کیا لکھ دیا — "شاید میرے خط کی ضرورت ہی نہ ہو" — اس کے جواب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ جس دن (آپ کو) میری طرف سے ایسا گمان، یقین کی صورت اختیار کرلے۔ اُس دن بے شک خط نہ لکھئے گا۔ مگر اس سے پہلے ایسی بات نہ لکھیں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب تک ملا جائے۔ دُوئی کے احساس کے بغیر ملا جائے۔

میں نے شروع میں لکھا تھا — اگر من کی بات کہہ دی جائے تو دل و دماغ دُھل جاتے ہیں۔ کدورتیں چھٹ جاتی ہیں۔ یہ بات مکتوب نگار کے لیے تو ٹھیک ہوتی ہے۔ مگر مکتوب الیہ کے لیے وسوسے پیدا کر دیتی ہے۔ سو میرا خیال ہے کہ ہمیں بات اپنی خیریت اور آپ کی خیریت مطلوب ہے تک رکھنی چاہیئے۔ اس لیے کہ جب ایک ہی مزاج کے دو آدمی قلم سنبھالیں گے تو غلط فہمیاں ہونے کا امکان رہے گا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنے اِس عجز کا بھی اقرار ہے کہ میرے دل میں آپ کے لئے جتنی جگہ ہے۔ اس کا اظہار میرے قلم سے نہیں ہوتا ہے۔ دل غنی ہے۔ مگر قلم بخیل۔ والسلام

۲۵/۱۱/۶۴ آپ کا محمد طفیل

(ابھی آپ کے انسان اور حیوان والے فلسفے کا جواب دینا ہے)

مَیں نے یہ خط کئی دن پہلے لکھا تھا۔ مگر پوسٹ نہ کیا۔ صرف اِس خیال سے کہ طبع نازک پہ گراں نہ گزرے۔ آج جل تو جلال تو — کہہ کر پوسٹ کرتا ہوں

۲/۱۲/۶۴ (ط)

کرنل محمد خاں

محترم! سلام مسنون!

نقوش کی ۲۰ویں سالگرہ پر، ایک تقریب کا انعقاد (۲۰ ماہ حال کے لگ بھگ) ہو رہا ہے۔

میرے دوستوں نے سوچا۔ ہر شعبۂ حیات کی اہم شخصیتوں سے گزارش کی جائے کہ وہ نقوش کے متعلق بات چیت کریں۔

جب "جاں نثاروں" کے متعلق فیصلہ ہونے لگا تو ایک صاحب سے کہا: "بریگیڈیئر گلزار احمد کو زحمت دی جائے"۔

میں نے کہا: "کرنل محمد خان سے گزارش کیجئے"۔

میری یہ رائے اُس کتاب کی بنا پر ہے جو میرے ایک کرم فرما نے مجھے دی تھی۔ کتاب مصدقہ تھی، اس لیے کہ اس پر آپ کے دستخط ہیں۔ رائے میری بھی مصدقہ ہو گئی۔ اس لیے اس خط پر میرے دستخط ہیں۔

زحمت کیجئے۔ میں بھی ممنون ہوں گا — میرے دوست بھی آپ سے گزارش کریں گے۔

کیپٹن صدیق سالک سے میرا سلام کہہ دیں۔ اُن سے "رُوبروئی" ہے۔ والسلام

۶/۴/۶۸ محمد طفیل

محترم، سلام مسنون!

آپ کا بڑا پیارا خط ملا تھا۔ اُسے پڑھتا رہا۔ خوش ہوتا رہا۔ اتنا عرصہ جو خط کا جواب نہیں دیا تھا تو وہی کام کرتا رہا۔ یعنی خط پڑھتا رہا۔

آپ کا یوں ہاتھ آ جانا، میرے لیے حد درجہ خوشیوں کا باعث بنا۔ سوچتا ہوں جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے۔ تب میں بھی "ریٹائر" ہو کر، اکٹھا وقت گزاریں گے۔ مستقبل کا ساتھی، میں نے ابھی تک کسی کو نہیں سمجھا تھا۔ آپ کو جانا ہے۔ کیوں؟ یہ میں ابھی نہیں جانتا۔ دل کمبخت یہ کہہ رہا ہے۔

آپ کو میرے کام میں کچھ خوبی نظر آتی ہے تو اس کے لئے مجھے آپ کا جلدی سے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کو میرے جنون میں کمی واقع ہو جائے۔ یا مجھے عقل ہی آ جائے یا بچوں کا مستقبل ہی گھیر لے۔

۲۷/۷/۶۸ آپ کا محمد طفیل

برادرِ مکرم، سلام مسنون

کئی دنوں سے آپ سے "باتاں" کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر اوٹ پٹانگ کاموں کے نرغے میں رہا۔

آج خط لکھ رہا ہوں۔ وہ بھی یہ بتانے کے لئے کہ اِن دنوں نقوش کا ایک عام شمارہ چھاپ رہا ہوں۔ منصوبہ یہ ہے کہ اس میں خاص خاص چیزیں چھاپی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دوار آن نکلا۔

کچھ آپ بالکسر سے چلیں۔ کچھ میں لاہور سے چلوں تاکہ "قربت کا راستہ" آدھا رہ جائے!

اُمید کہ آپ مزے میں ہوں گے۔

۲۳/۴/۷۸ آپ کا محمد طفیل

عبدالرحمٰن چغتائی

محترم المقام

آپ کا دعوت نامہ ملا۔ دلی شکریہ!

آپ کی تصویری تخلیقات منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ یہ امر خوشیوں کے ہزار پہلو رکھتا ہے۔

یہ آپ کی بدقسمتی ہے کہ آپ پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں۔ اگر آپ کسی زندہ ملک میں ہوتے تو لوگ آپ کی پرستش کرتے۔

میں ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہوں۔ جسے جفا کفا کر کے ہی دن گزارنے پڑتے ہیں۔ بہرحال میرے دل میں ابھی فنکار سے محبت جاگ رہی ہے۔ سوئی بھی نہیں۔ مری بھی نہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس 'تاریخی موقع پر' ایک معقول رقم پیش کر کے آپ کی قیمتی تصویروں کی ایک جلد حاصل کرتا۔ مگر میں ایسا

نہ کر سکا۔ بہرحال میں ایک جلد کا پندرہ سو روپیہ پیش کرتا ہوں۔

اس سلسلے میں ڈھارس ہے تو اتنی کہ یوسف کی خریداری کے لیے، روئی کی اَنٹی دینے والی خاتون کا جذبہ کسی بڑے سے بڑے پیسے والے سے کم نہ تھا۔

مجھے اپنے نام کے اعلان کی ضرورت نہیں۔

آپ کا محمد طفیل

انصار ناصری

برادرم بلکہ برادر محترم!

آپ کا مضمون مل گیا۔ کیوں نہ ملتا، میری جو گزارش تھی۔ پذیرائی ہونا ہی تھی۔ آپ کے مضمون سے مراد، میر صاحب قبلہ کا مضمون!

غالب نے میری گردن چھوڑی تو پھر آپ سے مفصل باتیں کروں گا "یوم حشر" جو قریب ہے (یعنی صد سالہ برسی) القصہ مختصر ان دنوں بُرا حال ہے۔ کچھ "چچا جان" کی وجہ سے، کچھ "کرفیو بھائی" کی وجہ سے!

آپ نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ جو کہ میں نے راولپنڈی کے احباب کے ایما پر لکھا تھا۔ جس میں رقم تھا کہ ایک مضمون میری شخصی نالائقیوں اور ادبی کوتاہیوں کے بارے میں لکھیں۔

خدا آپ کو تندرست رکھے۔

محمد طفیل

۱/۲/۶۹

گوپی چند نارنگ

برادرم، تسلیمات!

آپ کی شکایت بجا کہ میں آپ کو خط نہیں لکھتا۔ مگر میں کیا کروں۔ میں تو انھیں خط لکھا کرتا ہوں۔ جو میرے خط پڑھ کر بدمزا نہیں ہوتے۔ آپ کے تو اپنے خطوں میں غالب کے خطوں کی سی مٹھاس ہوتی ہے۔ یہ کمبخت غالب بھی بہت بُرا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگ آج تک شرمندہ ہو رہے ہیں۔ نہ وہ پیدا ہوتا۔ نہ آپ کو مجھ سے شکایت پیدا ہوتی کہ میں خطوں کے جواب نہیں دیتا۔ قصور غالب کا، آپ کا، میرا تو نہیں۔ میں تو بالکل "معصوم" ہوں۔

آج آپ کی کتاب "اُردو مثنویاں" ملی۔ اسے پڑھوں گا۔ پھر اس میں سے چوری کروں گا۔ تحقیقی کاموں میں چوریوں کا ایسا سلسلہ چلتا ہے کہ پھر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جو جتنا بڑا چور ہوگا۔ وہ اتنا ہی بڑا محقق ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو بتاؤں کہ میرا یار نارنگ، سارے ہی چوروں سے بازی لے گیا۔ میرے نامۂ اعمال میں، دوستوں کی مخبری نہ ہی لکھی جاتی تو اچھا ہوتا۔

آپ نے صاحب یہ نہیں منہیں جناب پر تبصرہ کر کے بھجوا بھی[1] دیا۔ دیکھئے اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کچھ نہ لکھوں گا۔ اگر آپ نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تبصرہ کیا ہوگا تو میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ یاری نبھائی ہوگی تو آپ کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ لہٰذا میں آئندہ ایسا کوئی موقع نہ دوں گا کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی ڈوبے۔ ابھی ہم نے دنیا کا لطف ہی کون سا اٹھایا ہے کہ بے موت مر جائیں۔

آپ کا مضمون "ایک چادر میلی سی" پر ملا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو ناول، افسانے کا کچھ پتا نہ ہوگا۔ جیسے ہمارے اور محققوں کو علم نہیں۔ مگر آپ تو چوکھی لڑ سکتے ہیں۔ آپ جیسا شریف زادہ، اور یہ سب کچھ، اے اللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

آپ نے جو پچھلی صدی میں یہ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ صدی میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ وہ اب مکمل ہو ہی گیا ہوگا۔ وہ بھیج دیجئے نا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ صرف وعدۂ حور کی ذیل میں لا کر نہ ماریئے۔

یہ خط آپ نے پڑھ لیا۔ اس لئے اسے ابھی پھاڑ دیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی نامحرم کے ہاتھ پڑے۔

۹/۴/۶۲ محمد طفیل

جناب!

خط لکھنے کا وعدہ تھا۔ خط لکھ نہ سکا۔ یوں تو خط یہ بھی ہے۔ مگر میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جلد خط نہ لکھ سکا۔ آپ کو بھی کیا پروا ہوگی۔ میں اپنی جگہ بلاوجہ شرمندہ ہو رہا ہوں۔ اتنے میٹھے انسان کے ہاں، دوستوں کی کیا کمی ہوگی۔

اس وقت میں بڑے غصے میں ہوں۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے موڈ خراب کر دیا ہے۔ چونکہ خط شروع کر چکا تھا۔ اس لئے اب اسے کھینچنا ہی پڑے گا۔

آج کل سالنامہ کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہونا کیا ہے۔ دو تین سیر وزن کم ہو جائے گا۔ اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤں گا۔ بیوی ایک بار پھر مجھے رولے گی۔

آپ کا بڑا اچھا مضمون میرے پاس ہے۔ اس میں وہ چھپے گا۔ اپنی تصویر بھی بھیجیں۔ (سوہنا مکھڑا) اب کے تخلیق اور صاحبِ تخلیق دونوں کو رسوا کرنے کا ارادہ ہے۔ تخلیق تو خود بخود رسوا ہو جائے گی۔ صاحبِ تخلیق کو میں رسوا کروں گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں دلی آیا تھا۔ چند دن، چند گھنٹے ثابت ہوئے۔ جانا اتنا اچانک ہوا تھا کہ اتوار کی صبح ٹرنک کال آیا۔ دلی پہنچو۔ اسی دن بارہ بجے چل پڑا ـــــ پھر لاہور سے ٹرنک کال پہنچا۔ لاہور پہنچو۔ اسی دن لاہور کے لئے چل پڑا۔ یہ تو ہوا اس غریب کے ساتھ۔ بجائے ہمدردی کے آپ ناراض ہوتے ہیں۔ ہے نا ستم!

رسید حاضر ہے۔ خود غیر حاضر ہوں۔

۲۶/۷/۶۲ محمد طفیل

---

[1] رسالہ 'شاعر' یہاں تو ملتا نہیں!

جنابِ مکرم، آداب!

آپ بہت اچھے آدمی تھے بس بیچ میں گزیٹڈ ہو گئے تھے۔ اب گلہ کس سے کروں؟ انکوائری اس لئے نہیں کراتا کہ کہیں اپنا جرم ثابت نہ ہو جائے۔

خبر دی تھی کہ 'نقوش' اقبال نمبر چھاپ رہا ہے۔ آپ ایسے چپ ہیں کہ جیسے اقبال سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ یا اپنے محسنوں کا حسنِ برتاؤ نہیں۔ کچھ خیال کیجئے جناب!

"برخوردار" انتظار حسین نے آپ کی کتاب "پرانوں کی کہانیاں" لا کر دی۔ پڑھی، بہت اچھی لگی، معلوم ہوا کہ آپ طفل آشنا بھی ہیں۔ پہلی فضیلتیں کونسی کم تھیں کہ ایک اور جھنڈا گاڑ دیا۔

یار، اقبال پر مضمون جلدی سے بھیجو، پلیز!

۲۹/۴/۷۷ آپ کا محمد طفیل

ڈاکٹر محمد حسن

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا مضمون اس وقت ملا جب دولہا دلہن بیاہ لایا تھا یعنی پرچہ چھپ چکا تھا۔ آپ کا غصہ مجھ پر ہوگا۔ میرا آپ پہ ہے۔ آپ کہتے ہوں گے مضمون طنز و مزاح نمبر میں کیوں نہیں آیا۔ میں کہتا ہوں بروقت کیوں نہیں بھیجا؟

آپ جو بات کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ خواہ کوئی شرمندہ ہو یا ڈوب مرے۔ آپ نے میرے خطوں کے بارے میں لکھا ہے:

> "بہرحال اب طنز و مزاح نمبر کا انتظار ہے اور اس سے کہیں زیادہ تمہارے خط کا کہ وہ بجائے خود طنز و مزاح کا شاہکار ہوتا ہے سچ کہتا ہوں منٹو کے بعد اس قدر تیکھی اور انوکھی نثر لکھنے کا انداز کسی اور نے پیدا نہیں کیا۔ اگر تم ایڈیٹر نہ ہوتے تو منٹو ہوتے۔"

میں اگر واقعی ایڈیٹر نہ ہوتا تو منٹو ہوتا (بقول آپ کے) اس صورت میں مجھے دنیا جہان کی گالیاں ملتیں۔ اندھا دھند شراب پیتا اور اپنی آخری عمر میں بے یار و مددگار مر جاتا۔ اس بیچارے کی آخری زندگی کتنی افسوسناک تھی یہ سب دعائیں آپ میرے لئے یوں مانگتے ہیں؟ ذرا سوچئے تو یہ دعائیں کس کے لئے مانگ رہے ہیں جو آپ کا جگری دوست ہے۔ کیا آج کل حقِ دوستی یوں ادا کیا جاتا ہے؟

بھابی کو سلام! ——— اور ہونے والے بچوں کو پیار

محمد طفیل ۱۸/۲/۵۹

برادرم، سلام مسنون!

میں ڈاکٹر محمد حسن کی یاد میں' دو منٹ خاموش رہتا ہوں۔ خدا مغفرت کرے بڑی خوبیوں کا آدمی "ہے"۔

ڈراما ملا۔ "ہنی مون کا تج"۔ "مور پنکھی" اس سے بدرجہا اچھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہے۔ اُس میں فن تھا۔ اس میں شرارت ہے۔ اہمیت دونوں کی اپنی اپنی جگہ!

آپ نے مدیرانِ کرام کا "حسنِ خوبی" سے ذکر کیا ہے۔ وہ تفریحِ طبع کے لیے تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا واقعتاً ایسا ہوتا بھی ہے؟ اور کیا اہلِ قلم بھی ایسے ہوتے ہیں؟

جہاں تک صنفِ نازک کے معاملے میں پھسل جانے کا تعلق ہے۔ یہ کمزوری سبھی کی ہے۔ غریب مدیر ہی گردن زدنی کیوں؟ افسوس کہ میں اس معاملے میں اتھارٹی کی حیثیت نہیں رکھتا ورنہ میں بھی اپنی رائے عرض کرتا۔

چپ چپ! — وہ دیکھئے آسمان سے جو جھانک رہی ہے۔ وہ کہیں اماں حوا تو نہیں؟ پہلے کھیل کی پہلی ہیروئن!

محمد طفیل ۱۰/۸/۶۲

ڈاکٹر خلیق انجم

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا خط مجھے یہاں ۱۵ / اکتوبر کو ملا۔ اگر میں اُس وقت بھی جواب دے دیتا تو آپ حیدرآباد سے چل دیئے ہوتے جیسا کہ آپ نے لکھا تھا۔

مجھے ڈاکٹر گیان چند نے بتایا تھا کہ کلیاتِ سودا میں، ابھی یہ یہ مثنویاں غیر مطبوعہ ہیں۔ راوی معتبر تھا۔ اس لئے میں نے آپ کو لکھا۔ وہ مطبوعہ نکلیں۔ جانے دیجئے۔ زحمت ہوئی۔ ملال ہوا۔

حیدرآباد میں اور کون کون سی غیر مطبوعہ اور اچھی مثنویاں موجود ہیں۔ اس کے بارے میں کوئی خبر لائے ہوں تو مجھے بھی بتا دیجئے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے قیامِ حیدرآباد میں میرے لیے کیا کیا؟

تمام قلمی اور مطبوعہ مثنویوں کی فہرست اُسی وقت چھاپنے کا ارادہ کروں گا۔ جب خود کو اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی امید ہو جائے۔ ورنہ خود کو ننگا، خود ہی کیوں کروں؟

وہ دونوں پرچے بھجوا رہا ہوں۔ جس میں آپ کے مطلوبہ مضامین ہیں اور ان کے ساتھ اپنی ایک عاجزانہ سی کوشش "جناب" بھی حیرت کہ یہ کتاب آپ کو پہلے نہ بھجوائی اور آپ کو لکھنا پڑا۔ یہ بتائیے آپ کے ہاں عفو و درگزر کا بھی کوئی خانہ ہے کہ نہیں؟

محمد طفیل ۳۰/۱۰/۶۱

برادرم، آداب!

آپ کا تفصیلی خط ملا۔ دلی شکریہ! آپ نے میری ناچیز تصنیف کے بارے میں جو کچھ لکھا۔ وہ حرف بہ حرف صحیح ہے (سوائے میری تعریف کے) میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہونے لگا بلکہ میں تو خوش ہوں۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو آپ کو گلے لگا لیتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ

چوم لیتا۔

کل یہاں بارش ہو رہی تھی۔ زوروں زور، تھا بھی اکیلا، لہٰذا آپ کے سودا سے ملاقات رہی۔ خوب باتیں ہوئیں جیسے جیسے بارش تیز ہو رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ غرض خوب گاڑھی چھنی۔ آپنی چھنی، اتنی چھنی کہ نوبت یاری تک پہنچی۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ آپ کی ریاضت سے فائدہ اُٹھا کر، کیوں نہ میں سودا کا بھی اسکیچ لکھ ڈالوں۔ صرف خود کو (تقریباً) ڈیڑھ سو برس پہلے پیدا ہونا پڑیگا اگر میں پہلے پیدا ہو سکا تو چیز خوب ہوگی۔

سودا کی تصنیفِ لطیف پہ مبارک باد کیسے دوں؟ نہ الفاظ ساتھ دے رہے ہیں نہ نیت ہم لوگ بہت بخیل ہیں نا! کسی کی تعریف جو نہیں کر سکتے۔

کیا آپ کے پاس صاحب اور جناب ہیں؟

۲۸/۷/۷۷ محمد طفیل

بھائی! اگر آپ نے شکایت کا کوئی موقعہ دیا ہوگا تو میں ناراض بھی ہوں گا۔ اگر ایسی کوئی صورت نہیں تو پھر ناراضی کیسی؟ مجھے آپ کے خلوص پر اعتماد رہا ہے۔

آپ نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ مجھے نہیں ملیں۔ یہ بھی یاد نہیں کہ آپ نے کوئی خط لکھا ہو اور میں نے اس کا جواب نہ دیا ہو دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کا نظام ایسا ناقص رہا ہے کہ ایسی کوتاہیاں بھی بدگمانیوں کا سبب نہیں۔

میں جاں نثار اختر[1] سے کبھی نہیں ملا۔ اگر اُن سے کچھ ملاقات ہے تو وہ صرف ان کے اشعار کے ذریعہ، اور وہ ملاقاتیں بھی ادھوری سی ہیں۔ کبھی کبھار ہی ان کی کوئی تخلیق نظر سے گزری۔ بے شک اُن سے شاعر کا حال معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مزاج کا علم ہوتا تھا۔ اس کے ذہن تک رسائی ہوتی تھی۔

مجھے جاں نثار اختر کے کلام میں اچھے شاعر کی تمام خصوصیات ملیں۔ شعری حُسن بھی ملا۔ پیغام بھی ملا۔ جتنا وہ عوام کے لیے تڑپے اگر اس کا عشیر عشیر بھی اپنی رفیقۂ حیات کے لئے تڑپے ہوتے تو وہ مجھے بڑے شاعر بھی نظر آتے۔ بڑے انسان بھی نظر آتے۔ تضاد ہی کی وجہ سے ہماری شاعروں سے شاعری کی روح روٹھی ہوئی ہے۔

صفیہ اختر نے اگر جاں نثار اختر کو بخشا ہوگا تو وہ صرف اُن دو نظموں کی بدولت، جو کہ انہوں نے ان کی موت کے بعد کہیں۔ اُن میں جتنا درد اور سوز ہے۔ وہ بے شک ان کی مغفرت کا باعث بنا ہوگا اور اگر جزا و سزا کا کوئی کھاتہ، مرحوم کے ہاں نہ تھا تو اس رُخ پر سوچنا بھی کیا!

اپنی بیٹی سے میرا آداب کہیے!

۱۰/۹/۷۶ آپ کا محمد طفیل

---

[1] اُن دنوں جاں نثار اختر کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب 'ہماری زبان' کا نمبر نکال رہے تھے۔

نثار احمد فاروقی

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا تفصیلی خط ابھی ملا۔ میرے تین خطوں کے جواب میں؛ خواجہ غلام الحسنین کی آپ بیتی بھی ملی۔ شکریہ!

آپ میرے ۱۸؍ اکتوبر والے جس فقرے سے خفا نظر آتے ہیں۔ وہ میرا مفہوم ہی نہ تھا۔ اللہ جانے آپ کیا سمجھے۔ معلوم ہوا آپ صرف کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ انسانوں کو نہیں پڑھتے۔ ورنہ آپ میرے اُس فقرے سے خوش ہوتے ناراض نہ ہوتے۔ میرا وہ فقرہ "اہلِ دل" سے متعلق تھا۔ "اہلِ کتاب" سے متعلق نہ تھا آئندہ سے احتیاط برتوں گا۔ اور "ذہنی بچوں" سے معرفت کی بات نہ کروں گا۔ اب میری ذہنی بچوں والی بات پر خفا ہو جانا۔ اے اللہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

آپ کے خط میں بہت سے لطیفے ہیں۔ بہت سی نصیحتیں ہیں۔ میں نہ تو لطیفے کا جواب لطیفے سے دے سکتا ہوں نہ ہی نصیحتیں کر سکتا ہوں۔ ویسے آپ کی بات ٹھیک ہے۔ "علی بھی کیا کریں۔ بوجھ ہی زیادہ ہے"۔ ویسے ہم علی نہ بن سکیں تو نہ سہی، ان کے بچے تو بن کے دکھا دیں۔ خواہ راہ حق میں شہید ہی ہونا پڑے۔ اگر پہلا کام اپنے بس میں نہیں تو دوسری لذت بھی کچھ کم تسکین بخش نہیں ہے لوگو!

آپ کی دوستانہ لغت میں "تقاضا" حلال ہے۔ چونکہ میں آپ سے بڑا عالم ہوں۔ (یعنی عمر میں بڑا ہوں) اس لیے میرا فتویٰ زیادہ معتبر ہوگا۔ میرے ہاں یہ لفظ ابھی تک حرام ہے۔ پس لازم آیا کہ مجھ سے چھوٹے عالم بھی اسے حرام ہی سمجھیں۔ ورنہ عاقبت کے خراب ہو جانے کا احتمال قوی ہے۔ باقی رہی گناہ کبیرہ اور صغیرہ والی بات اُسے بھی میں موقع محل کے اعتبار سے جائز قرار دے سکتا ہوں۔ مگر اصول کے طور پر نہیں۔ لہٰذا مومنو! اپنے سے بڑے "بزرگوں" کا کہا ضرور مانو، خواہ ان کی کوتاہ عقلی پہ تمہیں ہنسی ہی کیوں نہ آئے

جہاں آپ نے اتنے کام اپنے سر لیے ہیں۔ ایک اور لو یار! روسو کی آپ بیتی کا بھی خلاصہ کر دو۔ آپ بیتیوں میں یہ دنیا کی سب سے اہم کتاب ہے۔ اسے بھی نثار احمد فاروقی کے نام کے ساتھ چھپنا چاہیئے۔ غالب اور روسو یہ دو چیزیں پرچے کی جان ہوں گی۔ میرا خیال ہے اس کا بھی ترجمہ چھپ چکا ہے۔ شاید ڈاکٹر عابد حسین نے کیا تھا۔ میرا گماں ہے۔

میں آپ کے خط کا نمبروار جواب نہ دوں گا۔ ساری باتیں ذہن میں رکھوں گا۔ عمل کروں گا۔ بات یہ ہے پیارے کہ میں تو کام کے پھیلاؤ کے خوف سے ناکارہ ہو کے رہا جا رہا ہوں۔ یہ کرنا ہے۔ وہ کرنا ہے۔ بس اسی چکر میں ہوں۔ کیا ہوگا۔ کیا نہ ہوگا۔ کچھ معلوم نہیں کئی بار خیال آتا ہے کہ اتنا بڑا کام ہو نہ سکے گا۔ جب مایوسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو میں اپنے "یار" سے کہتا ہوں۔ "اے خدا مجھے اس کام کی تکمیل میں مدد دے"۔ چونکہ "کچھ یار" میرے اس دنیا میں بھی ہیں۔ اس لیے ایک بار پھر اوریسٹ سر ہوگی۔

بہت اچھا انگریزی کے تراجم والا کام بھی بھیجوں گا۔ ننھی سی جان پر اتنا ظلم کم ہی کسی نے کیا ہوگا اس نمبر کے بعد ہی ظالم و مظلوم کا بھی صحیح مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ مگر اس وادی میں تو مظلوم دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ مکتوب نگار بھی، مکتوب الیہ بھی، والسلام

آپ کا

۱/۱۱/۶۳ محمد طفیل

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا خط ملا۔ مگر میں آپ کو خط نہ لکھوں گا۔ وجوہ کئی ہیں۔ چھوٹی بھی، بڑی بھی، سو بات کی ایک بات یہ کہ آپ دوستی کے میدان میں پیچھے رہ گئے۔ مجھ میں تو یہ وصف تھا ہی نہیں، لہٰذا شرمندگی کیسی!

بڑا رعب دیتے ہو یار! —— "یا تو خط لکھو۔ ورنہ سلسلہ ختم۔" آپ کا مزاج بھی اللہ میاں سے ملتا جلتا ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں "یا تو نمازیں پڑھو۔ ورنہ جہنم میں ڈال دوں گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ اپن تو خدا سے بھی ڈرتے ہیں اور ان کے آپ ایسے نائبین سے بھی!

فی الحال اپنی بیگم سے میرا اسلام عرض کر دیں۔ والسلام

محمد طفیل ۹/۲/۶۸

برادرم، سلام مسنون!

آپ آئے اور چلے گئے۔ سنا تا تھا۔ دُور سے ہی سنا کے چلے گئے۔ کراچی تک آئے۔ لاہور تک نہ پہنچے۔ یعنی وضو کیا۔ نماز نہ پڑھی۔ خوش!

اب وہ وعدہ یاد دلا دوں؟ "جون میں لاہور آؤں گا۔ دو تین ماہ رہوں گا۔ سیرۃ پر نامکمل کام کو مکمل کریں گے۔ کام ہوگا۔ گپ ہوگی"۔

ان دونوں باتوں میں سے ایک پر عمل ضروری ہے۔

جن مضامین کی کتابت کرا چکا ہوں۔ وہ خاکہ بھجوا رہا ہوں۔ آپ کے مشورے سے ان مضامین میں سے کچھ کے ساتھ دل لگی کی جا سکتی ہے۔ مگر جن مضامین کی موجودگی (مزید) ضروری ہو۔ اس کے لئے آپ کو سوچنا ہوگا۔ بندہ ادب الدین ہے۔ اسلام الدین نہیں!۔

غرض یہ نمبر ایسا ہونا چاہئے۔ جیسے خود اللہ میاں نے مرتب کیا ہو۔ یہ تذکرہ اس کے محبوب کا ہوگا۔ بھلا وہ کیسے شریک نہ ہوگا!

اب مجھے بتائیے۔ آپ کب آ رہے ہیں اور اپنے ساتھ کیا کچھ لا رہے ہیں۔ دیکھو یار اب اس نمبر کو چھاپ ہی دینا ہے۔

اللہ میاں میری صحت کو خراب کر رہا ہے یعنی وہ کچھ سمجھا رہا ہے۔ لہٰذا الرٹ!

سب کو پیار، خواہ کوئی مجھ سے عمر میں بڑا ہی کیوں نہ ہو!

محمد طفیل ۱۴/۶/۶۹

طاہر فاروقی

برادرم، سلام مسنون!

آپ کہتے ہیں میں خط نہیں لکھتا۔ خط چھوڑ میں رسالہ "لکھتا" ہوں تو آپ وہ بھی پی جاتے ہیں۔ غضب خدا کا میں نے ۹۲۸ صفحے مسکراہٹوں اور قہقہوں کے بھیجے تو ڈکار بھی نہ لی۔ یہ ہوئی قدر دانی! یہی وجہ ہے کہ دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں — یا لنگوٹی باندھ جنگل

کا راستہ پکڑوں۔

لاہور میں اردو کانفرنس ہو رہی ہے۔ آپ یہاں نہیں آئے تو شرارتاً پشتو کانفرنس منعقد کرانے کی فکر میں ہوں گے۔ تاکہ ترکی بہ ترکی جواب ملے۔ بھائی! یہ اُردو کانفرنس، اردو والوں کی شرارت سے برپا نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک نحیف و نزار پنجابی (بہ وقت ضرورت سرحدی) کی دیوانگی کا نتیجہ ہوگی۔ اُردو آپ کی۔ دیوانے پنجابی!

جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ جناب حضور یو۔ پی اور لکھنؤ والوں نے، مگر شروع ہی سے پالنا پڑا ہمیں۔ جوان ہوئی تو بھی دعوے دار آپ لوگ۔ جھولوں دودھ پلائی تک کا معاوضہ بھی کبھی نہ پوچھا — یہ ٹھاٹھ ہیں آپ حضرات کے!

پشاور آنے کو جی چاہتا ہے مگر جاوید اور ان کی بیگم سے اب کے چھپنا پڑے گا۔ انہوں نے شاید میرے ساتھ زیادتی کی ہے یا میں نے ان کے ساتھ۔ قصّہ صرف اتنا ہے کہ وہ کراچی سے پشاور جاتے ہوئے لاہور میں مجھ سے نہیں ملے اور میں نے ایک سلسلے میں انھیں مبارکباد نہیں دی — اب یہ پتا نہیں چلتا۔ مجرم کون ہے؟

کبھی کوئی اچھی سی چیز اِدھر بھی بھیج دیجئے۔ کوئی کچھ نہ کہے گا۔

۲۱/۲/۵۹ محمد طفیل

محترم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکریہ!

جی ہاں! سالنامہ تو چھپ گیا ہے۔ اور اُس میں خط بھی چھپے ہیں۔ مگر وہ محمد طاہر فاروقی اور ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ میرے مہربان ہیں۔ آپ وہی کیسے ہو سکتے ہیں نہ دوست، نہ مہربان!

میرا خیال ہے کہ آپ نے بھی کسی اور ہی طفیل کو خط لکھا ہوگا۔ عجیب قصّہ ہوا۔ نہ یہ طفیل وہ ہے۔ نہ وہ فاروقی آپ ہیں۔ خدا دونوں کو دنیاوی جنّت نصیب کرے۔

۲۵/۱/۶۳ محمد طفیل

قرۃ العین حیدر

صاحبِ قلم بھی، صاحبِ علم بھی، صاحبِ ادراک بھی، صاحبِ فن بھی،
صاحبِ صورت بھی، صاحبِ سیرت بھی، اور یہ سب کچھ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر!
تحریریں لمبی عمر پانے والیں!

محترمہ، سلام مسنون!

آپ کا خط ملا تھا۔ مگر میں ان دنوں بیمار تھا، بیماری تھی طنز و مزاح نمبر کی۔ جس نے بُری طرح جکڑ رکھا تھا، ذرا ہلتا تھا

تو سارا تانا بانا بکھر جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چپ رہا۔ اب فرمائیے اگر ضرورت بدستور ہو تو پرانے مسودات کو ٹٹولوں۔ ان میں سے آپ کا مسودہ نکالوں اور بھیجوں۔

یہ میں نے سنا ہے — ادیبوں کی کانفرنس کی بڑی دھوم رہی ہم ادیب ہوتے تو کوئی ہمیں بھی بلا لیتا۔ بہرحال یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کے انعقاد میں بڑی دلچسپی لی۔ اللہ کرے اب اس کے کچھ مفید نتائج بھی ہوں۔ کوشش اچھی تھی۔ صلہ بھی ملے گا۔

بات تو کچھ بھی نہیں۔ مگر پھر بھی ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اس کے کام پر صاحب رائے حضرات کا کیا فیصلہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ طنز و مزاح نمبر پر اپنی رائے مجھے لکھیں تاکہ مجھے معلوم ہو کہ میرا تیر کس حد تک خطا گیا۔

جلدی جلدی میں ایک اچھا سا پرچہ نکالنا چاہتا ہوں۔ آپ کی شرکت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہو سکے تو کچھ کیجئے۔ اس کے بعد پطرس پر کچھ پیش کروں گا۔ ان پر بھی کسی زاویہ سے لکھیں۔ بڑے ادیبوں کے لئے ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اکٹھے ہو کر یاد تو کر لیں اور اس یاد کو کسی طرح دائمی حیثیت بخش دیں۔ میرے خیال میں اس کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔

محمد طفیل
۱۷/۲/۵۹

محترمہ، سلام مسنون!

اِن دنوں خطوط نمبر ہی چھپ رہا ہے۔ اسی میں آپ کے کہنے کے مطابق، صفحات خالی چھوڑے ہوئے ہیں۔ اُدھر آپ کے لئے انعام کی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ دعوتیں ہو رہی ہیں۔ اِدھر میرا کام رکا ہوا ہے۔ میں اٹکا ہوا ہوں۔ کام وہ بھی ضروری ہیں۔ کام یہ بھی ضروری ہے۔ لکھنؤ والے خطوں کے ضائع ہو جانے کا افسوس ہے۔ کتابوں کے زیاں کا بھی قلق ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو تو اُن کی اہمیت معلوم ہونی چاہئے تھی۔ کسی کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ یہ چیزیں پدرم مرحوم کی نشانیاں ہیں! کیسے بے درد لوگ ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی، میرے سگے بہنوئی تو نہیں مگر وہ مجھے سگا سالا ضرور سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ سب کے سب بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ گھر کا فرد جانا۔ شکیلہ بھی مجھے سگی بہن سے کم عزیز نہیں — ہمیں ایک دوسرے پر بڑا مان ہے۔

آپ نے اختر صاحب سے "مناظرہ" کر ڈالا۔ اچھا کیا۔ اپنی باتیں کہیں، دوسروں کی سُنیں۔ اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ ویسے میں نے ان لوگوں سے عقائد کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ نہ ہی انہوں نے کی۔ سبھی "کافر" اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں۔

خدا کرے آپ اچھی ہوں۔

محمد طفیل
۲۵/۳/۶۸

مالک رام

اُردو ادب کے چند ناخداؤں میں سے ایک ہیں۔ تحقیق ان کا میدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوستوں پر بھی تحقیق کر رکھی ہے۔ یوں خاصے دوستوں کو "غلط العوام" اور

متروک قرار دے چکے ہیں۔
غالب کے "رخنہ داروں" میں سے ہیں۔ زندوں کی پروا نہیں کرتے ۔
مرنے والوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔

برادرِ مکرم، سلام مسنون!

دلی کی ایک شام آپ کو یاد ہو گی جب آپ نے مرغ، بریانی، انڈے، کوفتے سامنے رکھتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں طنز و مزاح نمبر ضرور چھاپوں۔ لیجئے میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ آپ یہاں ہوتے تو آپ سے واویلے داد جلد وصول ہو جاتی۔ اب تو آپ مصر کی گلیوں میں چپ راست کر رہے ہیں اور ہم یہاں بیٹھے آپ کے خط کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔

دلی چھوڑنے کے بعد آپ کے دو خط ملے۔ دونوں ہی ٹبے رسمی تھے۔ ان پہ مجھے بڑا غصہ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے نہ آپ کو خط لکھا اور نہ رسالہ بھیجا۔ آج جب اپنے فیصلے پہ خود سوچنے لگا تو خود کو آپ کی بارگاہ میں مجرم سمجھا۔ بھلا کوئی بڑوں سے بھی خفا ہوتا ہے۔ میری خفگی کا عالم عجیب ہوتا ہے۔ میں اپنے ہر دوست کا، اپنے دل میں ایک مقام معین کر لیتا ہوں۔ جب وہ اس مقام سے نیچے آ کر مجھ سے باتیں کرتا ہے تو میں پاگل ہو جاتا ہوں۔ میری دوستی کی توہین ہو جاتی ہے اس لئے میں خفا ہو جاتا ہوں۔ اور زیادہ سے زیادہ اپنی خفگی کا اظہار یوں کرتا ہوں کہ چپ ہو جاتا ہوں۔ ورنہ بات کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کوئی تجزیہ کرنے بیٹھے تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہے گا، پاگلوں کی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں؟

ابھی جب میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں تو سینے کے داہنی طرف بڑے زور کا درد ہوا ہے اور بدستور ہے۔ نہ جانے آپ کو ستانے کا بدلہ اسی دنیا میں ملنے والا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ سنا ہے کہ جب بندہ معاف کر دیتا ہے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی معاف کر دیں تاکہ میرا درد بند ہو۔

دوسرا خط مل نہیں رہا۔ اس لیے پہلے پتا پر ہی خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے دونوں چیزیں مل جائیں گی۔ خط بھی رسالے بھی۔

۱۹/۲/۵۹

محمد طفیل

برادر محترم، تسلیمات!

آپ کے مجھے دو خط ملے۔ ایک پہلے، ایک بعد میں۔ میں نے دونوں کا جواب نہ دیا۔ اس پر معذرت خواہ نہیں ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ آپ کا پہلا خط بڑا اُچھ تُلا تھا۔ میں اس کے فقروں کو پکڑتا تھا مگر وہ ذہن سے پھسل پھسل جاتے تھے۔ بس ایک یہ ذرا سا نقشہ ذہن میں ہے کہ وہ خط صد فی صد سچا تھا۔ مگر میری نالائقیوں کی داستانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ نے جی کھول کے لکھا تھا۔ اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔

سوچتا ہوں، شاید اس خط کے دو چار فقرے یاد آجائیں۔ ہاں! غالباً ایک فقرہ تو یہ تھا کہ "میں دوستی کے قابل نہیں ہوں"۔ بخدا یہ بات صد فی صد سچ ہے۔ مگر اب تک کسی نے کہی نہ تھی۔ اس سے پہلے میں آپ کو اپنی مجبوریوں اور اپنی مصروفیات کے بارے میں لکھتا رہا کہ

اکیلا ہوں۔ کام کی یورش ہے۔ ہو سکے تو میرے سلسلے میں دوستانہ رعایت سے کام لیا کریں۔ مگر آپ کو یہ بات منظور نہ ہوئی۔

اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا کہ "میں صرف ایڈیٹر ہوں"۔ یہ بات بھی غلط نہیں کہ مجھے اپنے اس کام سے عشق ہے۔ اس عشق نے دوست چھڑائے۔ رشتہ دار چھڑائے اور ایک دن وہ بھی آئے گا کہ بیوی اور بچے بھی ساتھ چھوڑ دیں گے مگر شاید میں نادم اس وقت بھی نہ ہوں گا۔ میں تو سب سے کہتا ہوں کہ میری کوتاہیوں اور نالائقیوں سمیت مجھ سے محبت کر سکو تو کرو۔ کچھ کو میری یہ گزارش قبول ہے۔ کچھ کو نہیں۔ جنہیں قبول ہے۔ ان کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ جنہیں منظور نہیں۔ ان سے نادم تو ہوں مگر شکوہ نہیں۔

آپ نے لکھا: "میں دوستی کے قابل نہیں"۔ میں پریشان ہوا۔ آپ نے لکھا "میں صرف ایڈیٹر ہوں"۔ حیران ہوا۔ تیسرا فقرہ آپ نے یہ لکھا۔ موجودہ صورت میں مجھے نقوش کی ضرورت نہیں۔ یہ ظلم مجھ پہ نہ کرتے تو باقی سب ٹھیک تھا۔ آپ بے شک مجھے بھلا دیں مگر میرے محبوب کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔ اس کی خاطر تو میں آپ کی نظروں سے گرا ہوں۔ خدا کے لیے اس کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔ میں مر جاؤں گا۔

بچوں کو پیار۔ ۲۲/۹/۵۹ محمد طفیل

برادرِ محترم، تسلیمات!

آپ مجھے بے شک مکرم بندہ لکھیں۔ میں آپ کو برادرم ہی لکھوں گا۔ اس لیے کہ جو پہلے دن سمجھا۔ وہی لکھوں گا۔ وہی سمجھوں گا۔

میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔ خفا تو آپ ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے ایک موقع پہ لکھا تھا کہ "آپ بڑے خود غرض ہیں۔ جب بھی خط لکھتے ہیں۔ اپنی ضرورت سے لکھتے ہیں۔"

اس کے جواب میں، میں نے لکھا تھا کہ میں نے اپنی غرض سے کبھی خط نہیں لکھا۔ البتہ نقوش کے لئے خط لکھتا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ نقوش سب کا ہے۔ مجھ اکیلے کا نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ میری بدنصیبی ہے کہ نقوش نے میری ذاتی حیثیت کو ختم کر ڈالا کیونکہ یہ (نقوش) اتنی مہلت ہی نہیں دیتا کہ اپنے دوستوں اور بھائیوں کی باتیں سن سکوں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہو سکوں۔ یہ المیہ وہ ہے جس پہ رونا بھی آتا ہے۔

میری اس گزارش کے جواب میں، آپ قریب قریب خاموش رہے اور میں نے اپنے طور پہ یہ سوچ لیا کہ اگر کبھی مجھے قدرت نے توفیق دی تو بھائی کی خدمت ہی کروں گا۔ کوئی غرض وابستہ نہ رکھوں گا۔ اب جو آپ کا گرامی نامہ آیا۔ جس میں یہ لکھا ہے کہ نور الحسن صاحب لاہور پہنچ رہے ہیں اور وہ مصحفی پہ کام کریں گے۔ اگر انھیں کچھ ضرورت پڑ جائے تو خیال رکھنا۔ اس خط کو پا کر مجھے خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ آپ نے اپنائیت کا ثبوت دیا۔ اگر نور الحسن صاحب میرے پاس تشریف لائے تو میں انھیں غریب الدیار ہونے کا احساس نہ ہونے دوں گا۔

آپ بیتی نمبر علیم کے پتے پہ بھیجا تھا کسی سے معلوم کرائیں۔ پرچہ برابر بھیج رہا ہوں۔ ہر چند کہ آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پرچہ میں آپ کو آپ کی ضرورت سے نہیں، بلکہ وضع داری کے طور پر بھیج رہا ہوں یا یہ سوچ کر بھیج رہا ہوں کہ مجھے بھیجنا چاہیے۔

خدا کرے آپ مع متعلقین کے خوش ہوں۔

محمد طفیل
۲۶/۲/۶۵

راجہ مہدی علی خاں

ایک زندہ دل شخص، جو اپنی شاعری سے بھی زیادہ ہنس مکھ تھا۔ جو اپنی شاعری
سے بھی زیادہ طرح دار تھا۔ جو دوستوں سے اس حد تک مخلص تھا کہ انھیں گدگدانے کے
لیے فرضی اسکینڈل گھڑ لیا کرتا تھا۔
اس کا میرے ساتھ دھینگا مشتی کا ارادہ تھا مگر قدرت نے مہلت نہ دی۔

میرے مرحوم بھائی! سلام مسنون!

آپ کا عالم بالا سے لکھا ہوا خط ملا۔ بے حد پیارا خط، کئی دن سے میری طبیعت خراب ہے۔ دفتر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے چلا جاتا ہوں۔ قلم کو ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر آپ کا خط ملا تو جیسے طبیعت بہل گئی۔ لکھنے کو جی چاہا —— عجیب "قلم کشا" خط ہے آپ کا!

دوستی تو نام ہے برداشت کرنے کا، دوست کی نالائقیوں کو برداشت کرنے کا، اگر آپ اپنے کسی دوست کی کوتاہی نالائقی اور زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتے تو آپ کی دوستی میں کچھ کمی ہے۔ لہٰذا اس ایک آنچ کی کسر کو بھی پورا کر ڈالیے اور اس کے لئے تیار رہیے کہ اگر دوست نالائقی کا ثبوت دے تو میں اسے برداشت کروں، معاف کر دوں۔

آپ نے مجھے کتابوں کے لیے لکھا، میں نے دانستہ حکم عدولی نہیں کی۔ غالباً یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب میں آپ بیتی نمبر میں غرق تھا۔ یقین جانیے اکیلی جان پر، یہ بوجھ ناقابلِ برداشت تھا۔ تن من کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اس عرصے میں میں نے اپنے متعدد فرائض سے روگردانی کی ہوگی —— آپ کا بھی قصوروار ہوں، معاف کر دیجیے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے آپ بیتی نمبر میں بھنگیوں، کنجڑوں اور حجاموں تک کو جگہ دی۔ مگر راجہ مہدی علی خان کو بھول گیا۔ اگر میں بھول گیا تھا اور آپ بھی اس فہرست میں شامل ہونا چاہتے تھے تو آپ نے ہی یاد دلا دیا ہوتا۔ جتنا قصوروار میں ہوں۔ اتنا ہی آپ بھی ہیں۔ ہم ذہنی طور پر اتنے قریب ہیں کہ ہم ہر طرح کی بات ایک دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں۔ سیدھی طرح کوئی نہ مانے، تو زبردستی منوا سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ نے اپنے دوہرے حق کو استعمال نہ کیا۔ پہلا حق ادیب کی حیثیت سے تھا۔ دوسرا دوست کی حیثیت سے،

عرصے سے سُن رہا ہوں کہ آپ لاہور آنے والے ہیں۔ ضرور آئیے۔ اگر آپ نہ آئے تو خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ تاکہ دوست دل کا غبار نکال لے —— کیا گالیاں دینے کو بہت بے قرار ہیں؟

میرے دل میں، آپ کا بہ حیثیت ادیب بھی اونچا مقام ہے اور دوست کی حیثیت سے بھی، یہ لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آپ کا میری دوستی پر سے ایمان اُٹھتا جا رہا ہے —— اور یہ بھی جانتا ہوں، خطا میری ہے۔

ادھر ڈاکیوں کی ہڑتال تھی۔ اس لیے خط اس سے پہلے نہ لکھا۔ آج ہی ہڑتال کھلی ہے۔ پہلا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ (یعنی یہ پہلا

خط ہے۔) بقول آپ کے میرے ہزاروں "معشوق" ہیں۔ مگر دیکھ لیجئے۔ میں نے پہلے کسی معشوق کو خط نہیں لکھا۔ لکھا تو آپ کو لکھا۔ اب تو مان لیجیے کہ میرے نزدیک سب سے بڑے ...... آپ ہی ہیں!

آپ اپنے خطوں کی نقلیں رکھا کریں۔ پتا نہیں وہ چھپ سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی ہمت کر کے چھاپ ڈالے تو وہ خط اپنے خلوص اور بے باکیٔ اظہار میں بہت اونچا مقام رکھیں گے اور پھر آپ کے لکھنے کا انداز ایسا ہے کہ کوئی چُرا بھی نہیں سکتا۔ لیجیے صفحہ ختم ہوگیا۔ لہٰذا اپنا نام تو لکھ دوں۔

محمد طفیل

۲۶/۲/۶۰

راجہ جی! اسلام مسنون!

کہاں اتنی یاری تھی کہ آپ کی طرف سے ہفتہ میں دو دو خط ملتے تھے۔ مگر اب اتنی دشمنی کہ خاکسار یاد بھی نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہفتوں گزر جاتے ہیں اور میں آپ کی شکل نہیں دیکھ پاتا (میرا خیال ہے کہ خطوں سے بھی ایک دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے) آخر قصہ کیا ہے؟

ابھی جو آپ پر مضمون ادبی دنیا میں نکلا تھا۔ اس کے بین السطور میں غالباً یہ لکھا ہوا ہوگا کہ اپنے سابقہ دوستوں کو بھلا دیجئے۔ نئے دوست بنایئے۔ چنانچہ مضمون نگار کی بات آپ پوری کئے دے رہے ہیں مگر اتنا تو بتائیے مراقبے میں کے دن، کے ہفتے، کے مہینے رہیں گے؟ برسوں کی بات نہ کیجئے گا۔ میرا انتقال پُرملال ہو جائے گا۔

پچھلے دنوں آپ نے اتنی چیزیں کہیں، جیسے جھڑی لگ جائے۔ مگر اب اتنی خاموشی جیسے ملک بدر ہو چکے ہوں۔ کوئی اتا پتا جو نہیں ملتا۔ بے شک شاعر موڈ کا بندہ ہے مگر ہے تو بندہ، تو بہ کر کے بھی، لکھنے لکھانے کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔

کوئی نظم کہی ہو تو مجھے بھیجیں تاکہ میں دیکھوں کہ آپ نے کتنی ترقی کی ہے۔

آخری جو آپ کا خط ملا تھا۔ وہ بڑا مفصل تھا۔ بمشکل چھ سات لفظ ہوں گے اس میں، میں اپنے تئیں یہی سمجھتا رہا کہ میں ہی مختصر خط لکھنے والوں کا امام ہوں۔ مگر آپ کے خط نے میری غلط فہمی دُور کر دی۔

چھڈ یار! ایدر آ، جپھی پا۔

محمد طفیل

۱۹/۱۰/۶۱

آپ مجھے جانِ من لکھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں آپ کو عزیز دلم لکھا کروں۔ منظور؟ یہ منظوری صرف اسی مرتبہ کے لیے چاہتا ہوں۔ آئندہ سوچ سمجھ کے لکھا کروں گا۔ اس لئے کہ آپ میرے محبوب تھوڑی ہیں۔ دوست ہیں۔ (ویسے ابھی میں نے کسی بقراط سے یہ نہیں پوچھا کہ دوست کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے یا محبوب کا۔)

اگر میں نے آپ کی ایک دو چیزیں نہیں چھاپیں تو آپ نے دل چھوٹا کیوں کر لیا؟ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ تھرڈ کلاس

تھیں۔ دیگر مدیرانِ کرام معلوم نہیں، کسی چیز کے معیار کا فیصلہ کس طرح کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ میں پہلے ہی دن ہر ادیب اور ہر شاعر کا اپنے طور پر ایک معیار متعین کر لیتا ہوں۔ (جو فنکار کی تخلیقات ہی کے پیش نظر ہوتا ہے اور پھر وہ فنکار کی تخلیقات ہی کے پیشِ نظر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے) پھر اُن کی چیزیں، انہی کے متعین معیار سے پرکھتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی کسی غزل گو سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ مجھے فراق اور فیض کے پایہ کی غزل دے۔ اس طرح میں حضور کے کلام سے بھی متاثر ہوں۔ آپ کے اور آپ کے کلام کے بارے میں شان دار رائے رکھتا ہوں۔ چنانچہ میرے نزدیک آپ ہی کے معیار پر وہ دونوں نظمیں نہ اُتریں۔ ٹھنڈے دل سے، میرے اس فیصلے کی روشنی میں اب اپنی دو نظمیں دیکھ لیں۔ اگر پھر بھی قصور وار نکلوں تو جو چور کی سزا وہ میری!

آپ نے لکھا ہے کہ جب میں، یعنی کہ میں بیمار تھا تو آپ مجھے روز ایک خط لکھا کرتے تھے۔ تسلیم اور یہ بھی تسلیم کہ میں برابر خط نہیں لکھتا۔ آپ میرا اور اپنا مقابلہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی یہی تو وہ ادا تھی جس پہ مرا ہوا ہوں۔ اب آپ نے یہ شعر بھیجا ہے غالب بھی خوش ہو گیا ہوگا ؎

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

سو عرض ہے کہ شرم مجھ میں تھی۔ مگر جب سے ادارت سنبھالی۔ اس "فضول چیز" کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس لئے کہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی نظر نہ آئیں۔ ویسے میں نے اس شئے فضول کو بھی الگ چھپا کے رکھا ہوا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ میرے مخاطب میں اس چیز کی کمی ہے تو پھر تھوڑی سی اپنی شرم میں سے کچھ استعمال کئے لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں آپ پر کچھ استعمال نہ کرنا پڑے گا۔

دوستی میں "ڈانگ سوٹا" ضروری ہے۔ سو اس کے استعمال سے دریغ نہ فرمائیں۔ میں حاضر، میرا سر حاضر!

۶۱/۱۱/۱۳ محمد طفیل

مجنوں گورکھپوری

محترم، سلام مسنون!

مورخہ ۶/۵۸ ۵ کو تنہائی کا کچھ حصہ ملا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بقایا بھی جلد مل جائے گا۔ جلد کی مدت اتنے مہینوں میں تو ختم نہیں ہوئی۔ اگر آپ بہت جلد کا لفظ لکھ دیتے تو پھر اس سے بھی ڈیوڑھی مدت درکار ہوتی۔ خدا کرے وہ دن بھی آ جائے جب آپ کا یہ لکھا ہوا پڑھوں، تنہائی کا مکمل مسودہ اب آپ کے پاس پہنچ چکا ہے۔

آپ یہ فرماتے ہیں کہ میں اسے قسط وار چھاپنا کیوں نہیں شروع کر دیتا۔ مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس بات کا ڈر نہ ہو کہ قارئین نقوش آپ کے تساہل کی وجہ سے مجھے نہیں ماریں گے۔ پہلے ایک بار ایسا کر چکا ہوں نستعلیق قسم کے پڑھنے والے بھی جامہ سے باہر ہو گئے تھے۔ منتیں کر کر کے لوگوں سے جان چھڑائی تھی اب پھر اس ناولٹ کو شروع کر دوں، قسطیں ختم ہو جائیں اور بقایا حصہ نہ ملے تو پھر بتایئے میں کدھر جاؤں، اب تو زر کی پابندیوں کی وجہ سے گورکھپور تک پہنچنا بھی مشکل ہے۔

جب سے میں نے لکھنے والوں کو دیکھنا اور پڑھنا شروع کیا اس وقت سے آپ کے لکھنے کی رفتار بڑی سست ہے۔ میری ادبی پیدائش سے پہلے تو آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اب جا کر آپ کے تخلص کا اثر آپ کے لکھنے کی رفتار پر ہوا ہے۔ خدا کے لئے لکھئے، خواہ آپ کو اپنا تخلص بدلنا ہی پڑے۔

ان دنوں کیا آپ نے کوئی مضمون بھی نہیں لکھا؟ مضمون بھی میرے پرچے میں چھپتے ہیں۔ ناولٹ بھی چھپتے ہیں۔ جن میں ایک ناولٹ بہت زور کا رہا۔ اس کا نام بھی آپ کو معلوم ہے۔ اس کے مصنف کو بھی آپ ہی جانتے ہیں۔

پطرس پر کچھ؟

محمد طفیل

۲۰/۲/۵۹

برادرِ محترم! اسلام مسنون!

بہت سوچ سمجھ کے، آپ کو برادرِ محترم لکھا ہے۔ خدا کرے کہ ہم دونوں اس رشتے کی لاج رکھ سکیں۔ کہئے نا آمین!

آج وہ دن ہے کہ جس دن آپ لاہور سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔ ابھی آپ کو رخصت ہوئے چند گھنٹے ہی تو ہوئے ہیں مگر طبیعت میں کچھ اُداس پن چلا آ رہا ہے۔ سوچا اس کا علاج یہ ہے کہ آپ کو خط لکھنے بیٹھ جاؤں یا مجنوں جیسے دل سے ملیں۔ بھلا اس میں "مجنوں پن" کیوں نہ آئے؟

جس طرح آپ چاہتے تھے کہ لاہور میں بیٹھ کر، کراچی سے، بچوں کی آواز ٹیلیفون پر سنتے رہیں اور یہ سلسلہ آپ نے روانگی کے آخری لمحے تک چلایا۔ بالکل اسی طرح میں بھی چاہتا تھا کہ دید و شنید کا سلسلہ چلے، آخری لمحے تک چلے مگر آپ کی مصروفیات کا خیال کر کے، وقت ویران کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ آج صبح بھی آپ سے بات ہوئی تھی روانگی سے ایک سیکنڈ پہلے کیوں نہ ہوئی؟ قلق ہے تو یہ!

آپ کا یہ فرمانا کہ میں تو لاہور آیا تو عنایتی صاحب کی وجہ سے آیا ہوں یا طفیل کی وجہ سے، میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ خدا آپ کی شفقت کو قائم و دائم رکھے۔

اب جلد جلد آیا کیجئے۔ بچوں کی خاطر، ہماری خاطر!
بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب کہہ دیجئے گا۔

آپ کا محمد طفیل

۲۵/۱/۶۸

بیگم طفیل

ان کے شوہر تو ذرا رنگین مزاج بھی تھے۔ مگر انہوں نے اُسے اتنا کس کے رکھا کہ موصوف چوکڑی بھول گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا ناک کی سیدھ میں چلے کہ جتنی

ضرورت نہ تھی بیگم خوش ہو گئیں۔ چاہے اللہ میاں ناراض ہو گئے ہوں۔
طفیل کے جتنے کارنامے ہیں۔ وہ سب ان کے کھاتہ میں ڈالنے چاہئیں!

بیگم صاحبہ، روزانہ خط لکھ رہا ہوں۔ دیکھا کتنا تابعدار ہوں!

دوستوں کا خیال ہے کہ میں آج اُداس ہوں۔ ہر چند کہ بظاہر چہچہاں بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ جو اپنے احسن علی خان صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ میں یہاں ہوں اور روح میری لاہور میں ہے۔ تو وہ غلط نہیں کہا تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ میں یہاں ہوں اور رُوح کاکول میں ــــ نتیجہ وہی!

یہاں بڑے زوروں سے بارشیں ہو رہی ہیں۔ اندر سوتا ہوں۔ رات کو کھانا نہیں کھاتا۔ آم لے آتا ہوں۔ وہی کاٹ کاٹ کے کھاتا ہوں۔ پھر نیند ایسی غضب کی آتی ہے کہ آنکھ صبح کھُلتی ہے۔ ڈر جو کسی کا نہ ہُوا۔

ایک دن حجاب امتیاز علی نے بھی آموں کی دعوت کی تھی۔ متعدد قسموں کے آم تھے۔ بڑا مزا آیا۔ پھر ہر میز پر انھوں نے آموں کے پتوں کی ایک ایک ٹہنی رکھی ہُوئی تھی۔ جو آموں کی دعوت کی مناسبت سے بڑی بھلی لگی ــــ حجاب صاحبہ نے تمھیں بہت یاد کیا۔

اس سے پہلے بیگم صاحبہ مجھے کلاڈ کی دعوت میں ملی تھیں۔ خدیجہ بہن بھی موجود تھیں۔ حجاب نے شکوہ کیا کہ آپ تو ہمارے ہاں آتے ہی نہیں اس پر خدیجہ بہن بولیں یہ کسی کے ہاں نہیں جاتے۔ بڑے آدمی ہیں۔ اس لیے مجھے حجاب کے ہاں جانا پڑا۔ ویسے بھی یہ لوگ بڑے اچھے ہیں۔ اب کسی دن خدیجہ بہن کے ہاں جاؤں گا تاکہ بڑے آدمیوں کے زمرے سے نکلوں۔

سب کو سلام! سب کو پیار!

۲۸/۷/۶۵ محمد طفیل

بیگم صاحبہ، سلام مسنون!

میں نے آتے ہی اپنی خیریت کا تار دیا تھا۔ ملا ہوگا۔ اس کے بعد نجمہ اطہر صاحبہ ڈھاکہ سے لاہور گئی تھیں۔ میں نے انھیں بھی گھر کا نمبر دیا تھا کہ وہ گھر پر ٹیلی فون کر کے میری خیریت کی اطلاع دے دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ میں ۲۱ر مارچ کو لاہور پہنچوں گا۔ اس سے جلد ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اتنی بڑی جگہ ہے یہ کہ "گھن چکر" بھی بن جاؤں تو بھی سب کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ بہرحال مشرقی پاکستان کو کچھ کچھ دیکھ کر واپس آجاؤں گا۔

میں آپ کے نام خط لکھ رہا ہوں۔ مگر وہ بھیج نہیں رہا ہوں۔ اس لئے کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ اُسے آپ کے نام خطوں میں لکھ رہا ہوں جسے گورنمنٹ پاکستان چھاپے گی۔ یوں آپ کا زندگی بھر کا گِلہ دُور ہو جائے گا کہ میں نے تمھیں کبھی اہمیت نہ دی۔ یہ کتاب اُردو اور بنگالی دونوں زبانوں میں چھپے گی۔

کل رات میں ایک اسٹوڈیو میں گیا تھا۔ "گھر کی لاج" کی شوٹنگ دیکھی۔ تصویریں اُتریں۔ اس صنعت کے بہت سے لوگوں سے تعارف ہوا۔ یہ بات بڑی خوشی کی ہے کہ یہاں یہ کام بڑے سلجھے ہوئے لوگ کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اور لڑکے اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ ماحول گندہ نہیں ہے۔

ابھی تک ہم لوگ ڈھاکہ میں ہیں، آج شام ایک بڑی میٹنگ ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ دوسرے شہروں کی طرف جائیں گے۔ ہر شہر میں ڈپٹی کمشنر کے مہمان ہوں گے۔ خیال تو ہے کہ سفر اچھا گزرے گا —— یہ حصہ، پاکستان کے اُس حصے سے بالکل مختلف ہے۔ آج ذرا فرصت ملی تو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ورنہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ جن سے مل رہا ہوں۔ جہاں دعوتیں ہو رہی ہیں۔ اُن کو بھی تحریر میں لانا مشکل ہو رہا ہے اس لیے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر آج کل میں بڑا جھگڑالو ہو گیا ہوں۔ دوستوں سے لڑ مرتا ہوں آج صبح بھی چخ چخ رہی۔ ساری دنیا اتنی خود غرض ہے کہ وہ صرف اپنے مفاد کی خاطر مری جا رہی ہے۔ کسی کو اتنا خیال نہیں کہ دوسرے کے لئے بھی سوچا جائے۔ ذرا سا بھی سوچا جائے —— جب بھی کسی کو قریب سے دیکھا، چھوٹا آدمی نکلا۔

کل کے بعد تو سفر کی صورت یہ ہوگی کہ ابھی یہاں ہوں اور ابھی وہاں، منٹ منٹ کا پروگرام ہوگا۔ لہٰذا خط نہ لکھ سکوں تو مجبوری ہوگی۔

آپ خط لکھیں، تو یہ پتا، استعمال کرلیں۔ ہر چند کہ مسافروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ مگر واپسی میں ایک دن کے لیے ڈھاکہ آؤں گا۔ پھر واپسی! بچوں کو پیار

محمد طفیل

الہلال ہوٹل۔ موتی جھیل ڈھاکہ

خواجہ احمد عباس

اپنا دوست کم، دوسروں کا دوست زیادہ، پھر دوستی اور افسانہ نگاری میں
نت نئے تجربے کرنے والا ادیب بھی لیڈر بھی "فلمی" بھی!
سر سے بال غائب، بڑے آدمیوں میں شامل!

برادرم، سلام مسنون!

پچھلے دنوں آپ کا ایک قدم ہندوستان میں رہا، تو ایک قدم باہر، خدا کرے اب آپ کے پاؤں کا سنیچر نکل گیا ہو ممکن ہے میری اس خواہش میں آپ کا کچھ نقصان ہو، چونکہ ہر آدمی خود غرض ہوتا ہے، اس لئے جب بھی سوچتا ہے، اپنے بھلے کی سوچتا ہے لیکن میں نے تو یہاں اپنی بھلائی کے ساتھ ادب کی بھی بھلائی پیشِ نظر رکھی ہے۔ آپ یہاں رہیں گے تو آپ سے لڑ جھگڑ کر، منت خوشامد کر کے کچھ نہ کچھ لے ہی لیں گے۔

کہیے ان دنوں کچھ لکھا کہ نہیں؟ بیسویں صدی میں آپ کا ایک افسانہ نظر سے گزرا تھا۔ ادھر شاید یہ پرچہ ادبی لحاظ سے اونچے پایہ

کا ہو مگر ادھر — بات کی وضاحت نہیں کرتا۔ تاکہ میرے ایک ہم پیشہ دوست کی عزت رہ جائے۔ وہ پرچہ اچھا ہو نہ ہو، اس کا ایڈیٹر بہ حیثیت انسان ضرور اچھا ہے۔ ممکن ہے اس خوبی نے آپ کو بھی رام کر رکھا ہو۔

مجھے ان دنوں آپ کا افسانہ چاہیے اور جلدی چاہئے۔ کیا یہ معجزہ ظہور میں آئے گا؟ بات یہ ہے اگر آپ ایسے بڑے لکھنے والے چپ رہیں گے تو پھر نقوش میں کیا چھپے گا۔

میں اپنی طرف سے بڑی کوشش کرتا ہوں کہ نئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ لفٹ دی جائے مگر اس ڈر سے قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کہیں نئے لکھنے والوں کی فوج اپنی نا اہلیوں سے مجھے منزل سے دور نہ کر دے — جیسے غریب ادب لطیف کا حشر ! طنز و مزاح نمبر کیسا رہا؟ اسے دیکھ کر اور پڑھ کر آپ ہنسے کہ نہیں؟ اگر معاملہ برعکس ہوا تو مجھے آپ سے نہیں اپنے آپ سے ہمدردی ہوگی۔

میں آپ کے افسانے کا انتظار ابھی سے شروع کئے دیتا ہوں۔

۱۷/۲/۵۹ محمد طفیل

برادرم، تسلیم و تکریم !

آپ کا افسانہ ملا۔ پڑھا۔ اچھا افسانہ ہے یہ، آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سے مجھے ایک اصولی شکایت ہے۔ وہ یہ کہ (بات وہی پرانی) آپ نے ساری دنیا کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ آپ کی چیزیں نقل کرتے رہیں۔ بے شک آپ کے نزدیک لکھنے کا ایک مقصد ہے اور آپ کو اس کی اشاعت بھی منظور ہے۔ ساری باتیں تسلیم، مگر رونا تو یہ ہے کہ بنیادی پرچوں کی جڑوں کو کھوکھلا بنا کر، ہم کوئی خدمت انجام نہ دیں گے۔

میں نے خلوصِ نیت کے ساتھ انتخابی پرچوں کے بارے میں، ادیبوں کو متوجہ کیا۔ بیشتر دوستوں نے میرا ساتھ دیا۔ آپ نے انتخابی پرچوں کا ساتھ دیا۔ اگر آپ ہی کی طرح سارے دوست سوچنے لگ جاتے تو ہمارے پرچے بند ہو گئے ہوتے۔ ہمیں حکومت کوئی ایڈ نہیں دیتی۔ اپنے ہی خونِ جگر سے، ادب کے چراغ کو روشن رکھنے میں زور مار رہے ہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ میں اُن ادیبوں کی چیزیں نہ چھاپا کروں۔ جو سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے، ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہے۔ پھر خیال آیا یہ میری طرف سے ایک چھوٹی بات ہو جائے گی۔ طے کیا کہ جب تک گاڑی چلتی ہے چلائی جائے اور آخری پرچہ اُن ادیبوں کے نام معنون کر کے رخصت لے لی جائے۔ جنہوں نے انتخابی پرچوں کا ساتھ دیا ہو۔ (یہ معاملہ ہمیں دُور رس نتائج کی طرف سوچنے پر آمادہ کرتا ہے) دوسرے ادبی پرچوں کی نسبت، اس وقت ہماری پوزیشن بہتر ہے۔ اِس بُت کو توڑنے میں ابھی وقت لگے گا۔ مگر اُن پرچوں کا کیا قصور ہے کہ جو بہت کچھ کرنے کی دُھن میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر اُن کے لیے راستے مسدود بنا دیے گئے ہوں۔ یا اُن پرچوں کا کیا قصور ہے جنہوں نے ماضی میں بڑا کام کیا ہو اور اب (انتخابی پرچوں کی وجہ سے بھی) ان کے حصّے میں سوائے شرمندگی کے کچھ نہ آتا ہو۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ نیرنگِ خیال، سویرا، ادبِ لطیف اور ادبی دنیا سے سارے ہی انتخابی پرچے زیادہ چھپتے ہیں اور شاید نقوش سے بھی ان کی اشاعت

زیادہ ہو۔ ہم لوگ اپنے پرچوں میں، ادیبوں کے ساتھ، اپنا بھی خونِ جگر نچوڑتے ہیں اور "یار لوگ" ہمارا خون بیچتے ہیں۔ (اس کے ساتھ یہ بھی کہ جب بیشتر ادبی رسالے خسارے کا سودا ہیں) اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم پرچے صرف انتخابی پرچوں کے مالکان کی آسائشوں کے لیے یا انھیں آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے چھاپتے ہوں۔ نہ ان کا معیار ہے نہ کچھ، نہ دیدہ وری نہ تشناوری، صرف بڑے نام انھیں مطلوب ہیں۔ جو بڑا نام جہاں سے ملا۔ اُچک لیا۔ یہ ہے ان کا معیار' مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں' ان کی بے توجہی اور لاپروائیوں کے متعدد واقعات سامنے ہیں۔ کہانی کسی کی، نام کسی کا۔ اگر کسی رسالے نے، کسی بڑے ادیب کی کوئی بیس سالہ، پرانی چیز بھی چھاپ دی تو یا انتخابی پرچے اُسے بھی نئی چیز سمجھ کے لے اُڑے۔ نہ پڑھتے ہیں نہ کچھ، عجیب قسم کی خدمتِ ادب ہے یہ۔

آپ نے ایک بار یہ کہا تھا کہ اگر کچھ عرصے کے بعد' انتخابی پرچے کوئی چیز نقل کرتے ہیں تو ان کا کوئی بُرا اثر بنیادی پرچوں پر نہ پڑے گا۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ قاری پر نفسیاتی اثر یہ ہے کہ آج نہیں کل ہر اچھے رسالے کی اچھی چیز انتخابی پرچے میں آجائے گی۔ لہٰذا انتظار کر لیا جائے۔ یوں بنیادی پرچوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ قاری انتظار کر لینے ہی میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔

میری پھر آپ سے درخواست ہے کہ انتخابی پرچوں کے بارے میں' ایک بار پھر سوچیں۔ اگر ہماری مشکلوں اور دشواریوں کا خیال آجائے تو انتخابی پرچوں کو اپنی چیزوں کی اشاعت سے بذریعہ رجسٹرڈ خط روک دیں۔ اس کی نقل رائٹرز گلڈ کراچی کو اور ایک نقل مجھے بھجوا دیں اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی صداقت نہیں' کوئی خلوص نہیں تو پھر مجھ پہ لعنت بھیجئے۔

دو تین ماہ ہوئے ممتاز میرزا لاہور آئی تھیں۔ اُن سے آپ کا ذکر رہا۔ سبھی آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو دیکھنے' ملنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

۱۴/۱۰/۶۱
آپ کا محمد طفیل

جیلانی بانو

یہ اپنی عمر کے اعتبار سے اتنی معتبر نہیں ہیں۔ جتنی کہ اپنے کام کے اعتبار سے اور جتنی کہ اپنی گفتگو اور اس کے رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے!

بعض لوگوں کو اپنی دھاک بٹھانے کا شوق ہوتا ہے۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ یہ مرعوب کرتی ہیں — لوگ مرعوب ہوتے ہیں۔ مگر یہ فیصلہ قطعی کہ ایک بڑی افسانہ نگار!

بہن، آداب!

اب تو میری بہن بڑے معرکے کے افسانے لکھتی ہے۔ 'سویرا' میں جو افسانہ چھپا ہے خوب ہے۔ پختگیٔ فن کے اعتبار سے خاص طور سے، اب سوال یہ ہے کہ پختگیٔ فن کسے کہتے ہیں؟ بھئی اس کا

مجھے کچھ پتا نہیں، میں نے تو یہ بات، خوب سمجھ سوچ کر، اپنے ذہنی ترازو کی بنا پر کہہ دی ہے پختگیٔ فن کی تشریح تو کوئی نقاد تو کرے، جسے خود پتا نہ ہوگا کہ فن کیا ہوتا ہے۔ آپ میری اس دریافت سے خوش ہوں تو، ناخوش ہوں تو، اپنے ہاں کے نقادوں

میں نے ایک اور تیر ہوا میں چھوڑا ہے، یہ خشک طنز و مزاح نمبر، جب یہ نمبر یہاں سے چلا تھا تو اس وقت اس میں ہنسنے کی کئی باتیں تھیں، خدا جانے لاہور سے حیدرآباد تک کا راستہ طے کرتے کرتے اس کی مسکراہٹیں ماند پڑیں یا اور روشن ہوگئیں لکھے تو کچھ پتا چلے کہ اب وہاں اس غریب کا کیا حال ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ میرے لاڈلے کو وہاں کے لوگوں نے کس نظر سے دیکھا؟

معلوم ہوتا ہے اب آپ میں بھی بڑے لکھنے والوں کی ساری خوبیاں آگئی ہیں مثلاً ایک یہ بھی کہ وعدہ کر لیا مضمون یا افسا جائے گا مگر نہیں بھیجا جاتا یہ ٹھیک ہے کہ میں بڑا غیر حاضر دماغ آدمی ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ یہ بھی بھول جاؤں کہ جیلانی بانو مجھے کچھ بھیجنے کو کہا تھا مگر نہیں بھیجا۔

زیرِ ترتیب شمارہ کے بعد کچھ پیطرس پر پیش کر دوں گا — اور یہ پرچہ تو میں چاہتا ہوں کہ بس چھپ ہی جائے۔ پندرہ بیس اندر اندر معجزانہ طور پر! قبلہ والد صاحب کی خدمت میں آداب!

محمد طفیل ۱۸/۲/۵۹

بہن، سلام مسنون!

آپ کا خط ابھی ملا۔ مارے شرم کے فوری طور پر خط لکھ رہا ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ نقوش جیسا پرچہ نہ کسی نے چھاپا ہے چھاپ سکے گا۔ مگر آپ نے لکھا ہے کہ "یہ کام کوئی اور بھی کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ تم لکھنے کی طرف توجہ دو۔"

بابا! مجھے اپنی تحریروں کی اتنی تعریف منظور نہیں۔ میں نے جس کام کو عبادت کا درجہ دیا ہو، میں چاہتا ہوں کہ اُس کے میں بات کی جائے۔ یا اسے اہمیت دی جائے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ لکھنا کسے کہتے ہیں۔ مگر ابھی تک لکھ نہیں سکا۔ میرا موضوع مجھے لکھنے سے باز رکھتا ہے۔ جب قلم کی آغوش میں ہو تو پھر لکھنے کا لطف کیا! یہی وجہ ہے کہ مجھے لکھنے کا کچھ چاؤ نہیں۔

بھئی آپ نے کہا تھا۔ نقوش پر مضمون لکھوں گی۔ پھر کہا تھا۔ آپ کی کتابوں پر مضمون لکھوں گی۔ جلد لکھ دیجئے۔ اس لئے کہ ادب سے ریٹائر ہونے کا ارادہ ہے۔ ورنہ بچے بھوکے مر جائیں گے۔

خطوط نمبر تقریباً مکمل ہے۔ اس کے سلسلے میں بھی ایک عذاب سے گزرا ہوں۔ کوئی بھی شخص میری جانکاہی کا اندازہ نہیں، اس پر بھی کہتا ہوں۔ اللہ تیرا شکر!

جس میں آپ کا ناولٹ آئے گا۔ اس شمارے کی بھی کتابت شروع کرا دی ہے۔ جلد بھجوا دیجئے۔

انور صاحب سے سلام عرض کریں۔ اور ان سے کہہ دیں کہ اب ہاتھوں کی مہندی اُتار کے مجھے بھی خط لکھیں۔ فرحان دیکھ سکوں گا۔ یہ سوچتا رہتا ہوں۔

محمد طفیل ۱۵/۳/۶۸

بہن، آداب!

آپ کا بھیجا ہوا مضمون، "ایک منفرد خاکہ نگار" مل گیا۔ جو کہ سوا چار لکھے ہوئے صفحات پر اور پونے چار خالی صفحات پر مشتمل ہے۔ سوا چار صفحات کا شکریہ! پونے چار خالی صفحات کا شکوہ کہ خالی کیوں؟

اپنے بارے میں لکھے ہوئے مضمون کے بارے میں کیا رائے دوں؟ تعریف خدا کو بھی پسند ہے۔ تعریف مجھے بھی پسند ہے۔ یوں تو سارے قرآن میں، خدا کی وحدانیت اور ثنا کا ذکر ہے لیکن ایک سورۃ میں (سورۂ رحمٰن میں) غالباً ۳۱ بار "تم خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" کہا گیا ہے۔ چونکہ اِس دنیا میں 'انسان خدا کا نائب ہے۔ اس لئے میں بھی اپنی نحیف آواز میں کہہ سکتا تھا کہ "تم میری کس کس خوبی کو جھٹلاؤ گی؟" مگر میں یہ کچھ نہ کہوں گا۔ اِس لئے کہ میں جتنا نوازا گیا ہوں۔ اس کا حق دار نہ تھا۔

خدا نے انسان کو اپنا نائب تو بنا دیا مگر وہ ہے کچھ بھی نہیں۔ ایک بُلبلۂ پانی، یہی وجہ ہے کہ میں نہایت عاجزی سے یہ کہوں گا کہ میں اِس قابل نہ تھا۔ کہ مہربانوں کی اتنی محبت میرے حصے میں آتی۔ یہ حق نہیں انعام ہے۔ انسانوں کی طرف سے بھی قدرت کی طرف سے بھی!

ویزے کے لیے، میں نے اسلام آباد، اپنے ایک دوست کو کوائف بھجوا دیئے ہیں۔ اُمید کہ وہ ممد و معاون ثابت ہوں گے اور یوں آپ کو جلد دیکھ سکوں گا۔ لہٰذا سامان باندھو اور چل دو!

انور معظم کو "پیار" اور بیٹے کو سلام!

۱۵/۴/۷۷ — محمد طفیل

شاہد احمد دہلوی

یہ محبت کرنے والوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ جن سے خفا ہوتے تھے اُسے بخشتے نہ تھے۔ کہا کرتے تھے بخشنا آدمی کا نہیں خدا کا کام ہے۔

ان کی ذات سے اُردو ادب کی رونق ہے۔ ان کی تحریریں اور کام یاد رکھا جائے گا۔ ادب کے سلسلے میں نام ان کا زندہ، ان کے باوا دادا کا بھی زندہ!

قبلہ، سلام مسنون!

پچھلے دنوں آپ خوب مصروف رہے۔ ہم نے بھی ان دنوں نہ بلایا۔ مبادا ہنگامہ آرائی میں کوئی کسر رہ جائے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ آپ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔

آج کل لاہور کا موسم بڑا اچھا ہے۔ اِدھر آئیے۔ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ پھولوں پہ بہار آنے والی ہے۔ بابائے اردو لاہور آ رہے ہیں۔ جن کی اُردو تھی، وہ کراچی میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ آئیے نا اُردو کانفرنس میں، جس میں جانے اُردو کی کیا گت بنے۔ جو کچھ بھی ہو۔ آپ کے سامنے تو ہو۔ یہ تو منتظمین کانفرنس پہ منحصر ہے کہ اُردو کے ساتھ دانا دشمن والا سلوک کرتے ہیں یا نادان دوست والا۔ بہر حال آج

یہ مسئلہ بڑا اہم بھی ہے اور نازک بھی،

کسی بھی کام سے لگن کا نتیجہ ضروری نہیں کہ اچھے نتائج ہی پیدا کرے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اردو کو جتنا نقصان مولوی عبدالحق نے پہنچایا، کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ مشرقی پاکستان میں اردو نے جس انداز میں دم توڑ دیا اس میں مولوی صاحب کی ضد اور کام کے غلط رُخ نے کھیل بگاڑا اور وہاں کے لوگ اس بات پہ آمادہ ہوئے کہ زبان کے سلسلے میں قائداعظم تک کے فرمان کو بھی پسِ پشت ڈال د
بہرحال مجھے مولوی صاحب کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں۔ وہ اپنی سی کر گزرے۔ وہ بھی اتنی لگن کے ساتھ کہ شاید و باید! والسلام!

۲۰/۲/۵۹ محمد طفیل

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا خط جب کبھی بھی ملا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے دو دن اور بڑھ گئے ہوں

آپ بیتی نمبر کے لئے مضمون کوئٹہ ہی سے بھیج دیجئے گا۔ خوب مزے مزے میں لکھئے گا۔ موضوع جو لذیذ ہوا۔ اس موضوع کو سبھی پ
کرتے ہیں۔ کچھ ڈر رہے ہیں۔ اس لئے کہ مہاتما گاندھی بننا آسان نہیں ہے۔

اور ہاں! اپنے بارے میں بیشک ۲۰، ۲۵ صفحے لکھ ڈالیں۔ نقوش کے صفحات آپ کا قلم نہ روکیں گے۔

کوئٹے جائیے صاحب! ضرور جائیے۔ پہلے تو اللہ میاں مجھ سے بھی خوش تھے اور وہ مجھے اس کی مہلت دے دیتے تھے کہ میں بھی کسی ٹھو
مقام پر جا کے پڑ رہوں مگر اب کے سزا دیں گے۔ بہ سلسلہ شوکت نمبر، بہ سلسلہ خود نوشت سوانح نمبر!

۱/۷/۶۳ آپ کا محمد طفیل

ڈاکٹر احسن فاروقی

ایک چھوٹا سا حقہ ان کے پاس ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ادب کو بھی چلم میں رکھ کے پی چکے تھے۔ ان سا صاحبِ مطالعہ کم ہی کوئی ہوگا۔ پھر سادہ لوح اتنے کہ چھیڑیئے نہیں تو اپنے علم کا اظہار نہ کریں گے۔ چھیڑ دیں گے تو علم چھڑانا مشکل!

برادر محترم، سلام مسنون!

آپ کا مضمون ابھی ملا۔ تین تولوں کا نشہ ہوگیا۔ یہ تین صفحے کیا ہیں میرے لیے بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہیں۔ میرے بارے میں اس س
پہلے بھی بہت سے دوستوں نے لکھا۔ مگر آپ کے سوچنے کا انداز ہی سب سے جدا ہے۔ اسی پہ میں مرتا ہوں اور اسی پہ خود جیتا ہوں،
میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پہ جو دو سیکشن اور لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی لکھ دیں۔ کون مجھ سے اتنا پیار کرے گا۔

بزرگوں کی موجودگی میں، میرا قلم سنبھالنا، بڑا مشکل کام تھا۔ ڈرتے ڈرتے جو کچھ لکھا وہ آپ ایسے صاحبِ رائے اور صائب الرائے

نقاد کو بھی پسند آیا، اور کیا چاہیے۔ ان بزرگوں کی تحریروں کے پس منظر میں، میرے کام کا جائزہ لیں۔ (بشرطیکہ ضروری سمجھیں) میں لکھنے میں بڑی محنت کرتا ہوں شعروں کی طرح، نثر کو احتیاط سے لکھتا ہوں۔ وہ بھی سہلِ ممتنع میں، جیسے احباب ایک سانس میں پڑھ جاتے ہیں۔ میں اُسے لاکھوں کروڑوں سانسوں میں لکھتا ہوں۔ وہ بھی "قلمی سانس" روک روک کر تب جا کر، اس میں کچھ جان پڑتی ہے۔ تب سانٹے میں بھی حجم و وزن نظر آتا ہے۔

بہرحال یہ تو میری باتیں ہیں دیوانے کی باتیں۔ اپنے علم کی روشنی میں، میری حوصلہ افزائی فرمائیں۔

۵/۱۲/۶۷ آپ کا محمد طفیل

ڈاکٹر گیان چند

محترم المقام، آداب و تسلیمات!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ میں اب اچھا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ "نروس بریک ڈاؤن" ایک نسوانی بیماری ہے۔ حالانکہ میں آج تک اُسے خالصتاً مردانہ بیماری سمجھتا رہا۔ مگر اب آپ کے لکھنے سے محتاط ہو گیا ہوں۔ اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ مجھے کوئی نسوانی بیماری لاحق ہو۔ میں ہیضہ سے مرجانا پسند کروں گا۔ مگر یہ نہ چاہوں گا کہ مجھے پھر کبھی بھی نروس بریک ڈاؤن کا عارضہ ہو۔ اگر مجھے یہ پہلے علم ہو گیا ہوتا تو میں مارے شرم کے اس سے پہلے ہی ٹھیک ہو جاتا۔

میں تو بڑا مومن قسم کا آدمی ہوں، فوراً ایمان لے آتا ہوں ——— سچ، میں تو آپ کی داستانوں والی تصنیف ہی سے مرعوب تھا مگر آپ نے جو مجھے مثنویاں پر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اُن سے تو حیرت زدہ ہوں میں نے کئی "ادب کے فرہاد" دیکھے ہیں۔ مگر آپ اُن سب سے بازی لے گئے۔ مجھے امید نہ تھی کہ آپ اتنے پارس ہوں گے۔ میں تو اس نمبر کے سلسلے میں کہتا ہوں کہ مجھے حضرت خضر مل گئے ہیں۔

آپ نے تقریباً "پچاس قلمی مثنویوں کے بارے میں نشاندہی کی ہے۔ میرے اور آپ کے خیال کے مطابق ابھی سوا سو ڈیڑھ سو اور قلمی مثنویاں ہوں گی۔ میں پہلے ہی اپنے طور پر، رام پور، علی گڑھ، ——— حیدرآباد اور پٹنہ کی لائبریریوں میں، جو کچھ بھی اس موضوع پر ہے۔ ان کے لیے کوشاں ہوں۔ آپ کے گرامی نامہ سے مزید روشنی ملی۔ مگر میری گزارش یہ ہے کہ ان کتب خانوں کے علاوہ، جو چیزیں ادھر ادھر دفن ہوں، ان کے بارے میں "مخبری" کیجیے۔ میں اپنی سی کوشش کروں گا۔

بھوپال میں جو مثنوی ہے۔ اس کی پوری ہی نقل بھجوائیں۔ میں تمام غیر مطبوعہ مثنویاں پوری کی پوری شائع کروں گا[1] میں اپنے نمبر کو محض حوالے کی کتاب بنانا نہیں چاہتا بلکہ کوشش کروں گا کہ (زیادہ سے زیادہ) قلمی اور اہم مثنویاں سامنے آجائیں۔ بقول آپ کے یہ جان جوکھوں کا کام ضرور ہے مگر دوستوں کی عنایتوں سے کچھ ہو ہی جائے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کی وساطت سے جتنی بھی

---

[1] مطبوعہ طویل مثنویوں کے اقتباسات پیش کروں گا۔

قلمی مثنویوں کی نقل مل سکے۔ دریغ نہ فرمائیں۔ میرا کام ہلکا ہو جائے گا۔

آپ نے جس مضمون کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی تو عنایت ہو — ہاں میں ہر قلمی مثنوی کے بارے میں تمہیدی نوٹ بھی پیش کروں گا۔ مثنوی کے بارے میں بھی، صاحبِ مثنوی کے بارے میں بھی!

۲۴/۷/۶۱ محمد طفیل

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

اتنے نستعلیق، اتنے نستعلیق کہ اس لفظ کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ استادانہ شان رکھنے والے مگر کسی کو استاد نہ ماننے والے۔ زبان پر عبور مگر اس شان کے ساتھ کہ باقی سب ہیچ!

ان کی ذات اور گفتگو میں بڑی نراہٹ تھی۔ اشعار بہت یاد تھے۔ دوسروں سے زیادہ اپنے!

برادرِ محترم، سلام مسنون!

آپ کو دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں۔ کیا کوئی ایسا پروگرام نہیں بن رہا کہ آپ ادھر اپنے عزیزوں کو دیکھنے آ جائیں۔ یوں ہم بھی آپ کو دیکھ لیں اور خوش ہو لیں۔

جب میں آخری بار آپ سے لکھنؤ میں ملا تھا تو آپ بڑی ہی محبت سے بغل گیر ہوئے تھے اور پھر جو کچھ آپ نے کہا تھا وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ حالانکہ میں اس بات کو یاد رکھنا نہیں چاہتا مگر وہ میرے ذہن میں چمٹ کے رہ گئی ہے۔

آپ نے فرمایا تھا "خوب بھینچ کے ملو۔ پھر شاید ملاقات نہ ہو۔" یہ فقرہ آپ کی بیماری نے آپ سے کہلوایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں خواہش مند ہوں، آپ ادھر آئیں تاکہ آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی شفقت و محبت میں سے کچھ ہم بھی پا لیں۔

"معتقدِ میر" نے اگر کوئی غزل کہی ہو تو وہ بھی عنایت ہو۔ تاکہ قارئین نقوش کو بھی استادانہ شان کی کوئی چیز پڑھنے کو ملے۔

بہت دن ہو گئے ہیں۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں بھیجا۔ ایک آدھ غزل بھیج دیں۔ کرم ہوگا۔

طنز و مزاح نمبر نے بھی آپ کی صحت پر کچھ اچھا اثر ڈالا کہ نہیں؟ والسلام

۹/۳/۵۹ محمد طفیل

احمد ندیم قاسمی

برادرِ مکرم، سلام مسنون!

امروز میں آپ نے طنز و مزاح پر ریویو کیا۔ مجھے ممنون کیا۔ مگر بعض دوست کہتے ہیں کہ ندیم صاحب نے یہ ریویو اچھا نہیں کیا۔

خواہ مخواہ اعتراض کیے ہیں۔ مگر میں یہ بات نہیں کہتا۔ مجھے آپ کا ہر فقرہ عزیز ہے۔ آپ کی ہر بات بھلی معلوم ہوتی ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ آپ کے نزدیک میری حیثیت صرف برخوردار کی ہے۔ نہ اس سے زیادہ ہے اور نہ ہی میں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ کبھی کچھ سمجھا۔ پھر بھی آپ کے ریویو کے سلسلے میں دو ایک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

آپ نے لکھا ہے کہ شیرازہ کے دور کو پرانے مزاح نگاروں کے دور کے بعد آنا چاہیے تھا۔ ایک لحاظ سے آپ کی بات ٹھیک ہے۔ مگر جب میں نے مزاحیہ اخبارات کا ایک سیکشن بنا دیا ہو، اس صورت میں اُسے آگے لے جانا بالکل ایسے ہوتا جیسے کوئی اپنے قافلے سے بچھڑ جائے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ حاجی لق لق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ حاجی صاحب اس پرچے میں براجمان ہیں۔ غالباً ۴۴۴ صفحہ پر۔ واقعی یہ بات ٹھیک ہے کہ انتخابات کے سلسلے میں اپنی پسند اور ناپسند کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ ہمارا ابھی طریقِ کار یہی ہے۔ اگر میری پسند پہ بات آتی تو شاید چالیس فی صد "مزاح نگار" اس نمبر سے خارج ہو جاتے۔ بہر حال عرض یہ کرنا تھا کہ حاجی صاحب موجود ہیں۔ ہاں اب یہ سوال دوسرا ہے کہ جتنے طمطراق سے انھیں آنا چاہیے تھا، وہ نہیں آئے۔ وہ اس محفل میں موجود تو ہیں۔ اپنے اوصاف کی بنا پر خود اُبھر کے سامنے آجائیں گے۔ خود نمایاں ہو جائیں گے۔ فکر کی کیا بات ہے!

یہ بھی آپ نے لکھا ہے کہ مزاحیہ کرداروں کے سلسلے میں خوجی، حاجی بغلول، اور چچا چھکن کے ساتھ کسی اور کردار کا ذکر نہیں آنا چاہیے تھا۔ دیکھیے آپ نے اپنی پہلی بات کی خود تردید کر دی کہ انتخابات کے سلسلے میں اپنی پسند اور ناپسند کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ اپنی پسند کو کیوں دخل نہیں دیا — میرا اس سلسلے میں ایک اور جواب ہے۔ وہ یہ کہ ہم مزاحیہ کرداروں کے سلسلے میں پہلے ہی بڑے مفلس تھے — اب اور بھی کیا تراش خراش کرتے۔

ایک بات آپ نے یہ بھی لکھی ہے کہ اخبارات کے مزاحیہ کالموں پہ ایک مضمون ضرور ہونا چاہیے تھا — واقعی یہ مضمون آجاتا تو اچھا ہی تھا۔ اور اس کے ساتھ اور بھی کئی ضمنی عنوانات تھے۔ ان پہ بھی کچھ ہو سکتا تو میں دریغ نہ کرتا۔ کبھی دریغ نہ کرتا۔

یہ عریضہ لکھ چکا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اسے پوسٹ نہ کروں۔ مبادا میری برخورداری کی توہین ہو جائے اور اپنے دوست کی بارگاہ میں گستاخی بھی — خط لکھا ہے تو اب اسے (با دلِ نخواستہ) پوسٹ بھی کر دوں گا۔ اسے پڑھ کر بے شک یہ کہیے، پگلا ہے طفیل!

اچھا بھائی! — اب لڑائی جھگڑے کی بات ختم، آپ جو چاہیں کہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے۔ اب افسوس اس بات کا نہیں رہا کہ ایک برس تک جو پھونک پھونک کر قدم رکھا تھا اس میں لغزش کیوں آئی؟

آئیے، اب کچھ پیار کی بھی باتیں کریں۔ یہ بتائیے، اب اپنے نقوش کے لیے افسانہ کب تک مرحمت فرمائیں گے۔ ایک آدھ منظوم چیز کا بھی خواہش مند ہوں۔ ہمیشہ کی طرح مجھے ممنون فرمایا جائے۔ والسلام

محمد طفیل
۱۹/۲/۵۹

احمد جمال پاشا

ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا۔ دوسری بار حشر میں دیکھیں گے۔ ان کا ہاتھ ہوگا اور میرا گریبان یا میرا

گریبان ہوگا اور ان کا ہاتھ! اس لئے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ کر رہے ہیں یعنی وہ میری
تعریف کرتے ہیں اور میں ان کی!
محبت کرنے والے ہیں۔ محبت کا خمیازہ بھگت رہے ہیں!

برادرم، سلام مسنون!

عرصے کے بعد، آپ کا خط ملا۔ میں نے کوئی خط نہیں لکھا تو جناب نے کون سے درجنوں خط لکھ ڈالے۔ ممکن ہے صاحب! مجھی کو آپ سے کچھ اسی قسم کی شکایت ہو۔

آپ کو میری ناچیز تصنیف پسند آ گئی۔ لیجیے میں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ بھائی! یہاں تو پڑھنے سے فرصت نہیں، لکھنا کیا معنی! میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ اچھا پرچہ چھاپوں، اچھے مضمون لکھوں، مگر افسوس کہ دونوں خواہشیں، حسرتوں کے کھاتے میں چلی جاتی ہیں۔

حکم کی تعمیل میں کتابیں بھیج رہا ہوں۔ ایک کتاب وہاں بھجوا دیجیے گا۔ جہاں تبصرہ چھپے۔ مگر تبصرہ چھپنے سے پہلے اس کی ایک نقل مجھے بھی بھجوا دیجیے گا۔ پیشگی خوشی کے لیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یاروں نے کون کون سے مضمون ادھر اُدھر بھی چھپوا ڈالے ذرا مجھے بتائیں تاکہ "مقدمہ" دائر کر سکوں۔ اصل میں مضمون نگار بھی سچے ہیں۔ جھوٹا میں ہی بنوں گا۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں کوئی مضمون ایک سال تک اونگھتا رہتا ہے اور کوئی دو سال تک۔ یوں ادیب مایوس ہو کر ادھر اُدھر جھانک لیتے ہیں۔ حالانکہ انھیں میرے وعدے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میرے ہاں بھی (اللہ میاں کی طرح) دیر ہے اندھیر نہیں۔ چونکہ آج اعتماد بیٹے کو باپ پر نہیں۔ اس لیے میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ بہر حال آپ کی شناخت پر بے اعتمادوں کو پکڑوں گا۔ سب اپنے یار ہیں، میری فریاد توجہ سے سنیں گے۔

آپ اپنا مضمون بھجوا دیں ——— میرے علم میں نہ آیا تو آپ کا مطبوعہ مضمون بھی چھپ جائے گا۔ اس کے بعد گالیاں جتنی ملیں گی آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔

بیگم سروری جمال آپ کو ستانے کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں۔ مطلع کیجیے۔

محمد طفیل ۲۴/۷/۶۷

برادرم، سلام مسنون!

میں نے افسانہ نمبر بھیجا۔ اس کے بارے میں کبھی ہُوں ہاں نہ کی۔ پسند آیا یا ناپسند ہوا۔ آخر کچھ تو پتا چلے کہ لکھنؤ کے ایک نقاد اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ مگر آپ چپ ہیں۔ جیسے روزہ رکھ لیا ہو۔

پرچہ کیسا چل رہا ہے۔؟ کچھ رینگا کہ نہیں؟ اس عشق میں بڑے بڑے امتحانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ امید کہ بے خطر گزریں گے۔ مگر بھائی! پی۔ ایچ۔ ڈی کر لینا آسان ہے۔ پرچے کی آبرو بنانا اور پھر اُسے قائم رکھنا زیادہ مشکل ہے۔ خدا اُسے بخشے، جس نے

پہلے پہل رسالہ نکالا تھا۔ ہم ادب کو زندہ رکھنے کے لئے رسالہ نکالتے ہیں۔ مگر ادب رسالوں کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ عجیب ٹریجڈی ہے، دیکھ لیجیے آپ کے باوا آدم منشی سجاد حسین کیا کیا نہ ایڑیاں رگڑ کے مرے۔ یوں سوچیں تو آج ہی سارے ایڈیٹر خودکشی کر لیں۔ مگر ہم لوگوں میں غیرت کا کچھ زیادہ ہی فقدان ہے۔ واہ وا بھی بڑی بُری چیز ہے۔ جو اس کے چکر میں پڑا مارا گیا۔

آپ کی میرے پاس جو جو کتابیں ہیں۔ اُن میں سے فی الحال تذکرہ خندۂ گل واپس بھیجنے کا ارادہ ہے۔ ایک اودھ پنچ کا انتخاب ہے۔ وہ فی الحال نہ بھیجوں گا۔ اس لئے کہ مجھے اس کی ضرورت رہے گی۔ کیا آپ کو اس کا ایک اور نسخہ نہیں مل سکتا؟

آپ مجھ سے یہاں کی بھی چند ایک کتابیں منگوا لیں۔ تاکہ احسان نہ رہے۔ کیا خیال ہے مولانائے وقت کا؟

میں ہندوستان آ رہا ہوں۔ مگر لکھنؤ کا ویزا نہیں بنوایا۔ اس لئے کہ وہاں آپ ہوتے ہیں۔ بلا وجہ آپ کی مہربانیاں یاد آئیں گی نگاہیں جھکیں گی۔

۲۷/۱۲/۶۰ آپ کا محمد طفیل

غلام مصطفٰے (پی۔ سی۔ ایس)

محترم، سلام مسنون!

میں لاہور آ گیا۔ آپ کا اخلاق بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ اب اسے عمر بھر عزیز رکھنا ہوگا۔ آپ نے میری ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری اور بڑھا دی "اس کے باوجود" یہ کہوں گا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

واپسی پر بڑی پریشانی ہوئی۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے قدرت نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ آج اس کمبخت کو شہادت کا درجہ دے دیا جائے۔

پہلے پشاور سے جہاز ہی نہ چلا۔ معلوم ہوا فضا خراب ہے۔ اس لیے جہاز پنڈی تک ہی آئے گا۔ پی۔ آئی۔ اے والوں نے ٹیکسیوں کا انتظام کیا۔ بس ٹیکسی میں بیٹھنا قیامت ہو گیا۔ گھپ اندھیری رات، تیز ہوا اور بارش۔ کئی جگہ ٹیکسی خراب ہوئی۔ کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوا۔ موت سامنے کھڑی رہی۔ مگر اُسے قریب آنے کا اذن نہ ہوا، وہ بھی پریشان، ہم بھی پریشان!

یہ بات بھی تو اُسی صبح (۱۹ ۳/۶۸) کی تھی کہ میرے ہی ایک دوست کے ہاتھ سے گولی چل گئی تھی۔ جس جگہ کھڑا تھا۔ اگر وہیں کھڑا رہتا تو۔ اب آپ کو میرا وہ فقرہ تو یاد آتا ہوگا۔ خالی بندوق سے بھی ڈرنا چاہیے۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام

۲۶/۳/۶۸ محمد طفیل

انتظار حسین

برادرم، آداب!

تبصرہ پڑھا۔ جو آپ کے مخصوص رنگ کا ہے۔ مخصوص شکریہ!

اس تبصرے میں ایک ظلم ہوا، وہ یہ کہ آپ نے میری کتاب "ناچیز" کے حوالے اپنے اس تبصرے میں دے ڈالے۔ محترم کے فلیپ[1] پر جو عبارت ہے اُس کا اس کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس اعتبار سے آپ کے تبصرے کا جو بنیادی ڈھانچہ ہے۔ وہ غلط استوار ہوا۔ یوں جو چھینٹے اُڑے وہ بلا وجہ۔ غلط مبحث سے اگر آپ کو خوشی ملی ہو تو مجھے اعتراض بھی نہیں۔

اگر میں نے کسی بات کو دانستہ نظر انداز کیا ہے تو تبصرہ نگار کو اُس پر کچھ سوچنا تو چاہیے کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا۔ مثلاً میں نے سندھ کے لوگوں کے بارے میں تفصیلی بات نہیں کی یا وہاں کے (موجودہ) معاشرتی پہلوؤں پر بات نہیں کی۔ (ضمناً تو کچھ نہ کچھ ملتا ہی ہے) تو اس کی کچھ وجوہ تھیں۔ جو لکھی نہیں جا سکتی تھیں۔ حد درجہ تکلیف دہ تھیں۔ اُس کے لیے میں آپ کو نوائے وقت کی اُس اپیل کی طرف توجہ دلاؤں گا جو وہاں کے عرب طلبہ نے حال ہی میں گورنر کو پیش کی ہے۔ وہ پڑھ لیجیے۔ پھر سوچیے کہ اس ضمن میں میرا کچھ کہنا مناسب تھا یا چپ رہنا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تبصرہ بڑا اچھا ہے۔ اس لیے کہ انتظار حسین عیب جُو ہیں عیب پوش نہیں۔ اس اعتبار سے تو مجھے آپ کا ڈھیروں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

خدا کرے آپ کا "قلم" چہکتا رہے۔ مداح جو ہوں۔ صرف توازن کی دعا کروں گا۔

محمد طفیل ۱۵/۴/۶۸

شکیلہ اختر

بہن، سلام مسنون!

خط کا شکریہ! اطلاعاً عرض ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق میں نے "زرِ کثیر" خرچ کر کے، مٹی کی صراحی خرید لی ہے۔ تاکہ ٹھنڈا پانی پی سکوں۔

باقی باتوں پر عمل نہ کروں گا۔ ایک تو اسی چیز پہ "بڑی" رقم خرچ ہو گئی ہے۔ دوسرے اگر میں نے آپ کی باتوں پہ عمل کیا تو میری ساری سپاہیانہ شان ختم ہو جائے گی اور پھر یوں معلوم ہوگا۔ جیسے لکھنؤ کا بانکا، ٹھسّے سے براجمان، اپنی نسوانیت کا اعلان کر رہا ہو۔

زندگی سے زیادہ پیار بھی، ذہنی بیماری کی ایک علامت ہے۔ آئی ہے تو پھر آ جائے بسم اللہ، ڈر کا ہے کا۔ والدہ نے جس طرح موت کا استقبال کیا تھا۔ اُس نے مجھے بہادر بنا دیا ہے ان شاءاللہ میں بھی موت کا اس طرح استقبال کروں گا۔ جس طرح، کوئی اپنے پیارے کا کرتا ہے۔

آپ ایسی باتیں نہ لکھا کریں۔ جس سے میں پانی پانی ہو جاؤں۔ میں نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی۔ میں قطعاً فرشتہ نہیں ہوں۔ (یوں بھی فرشتہ کا درجہ آدمی سے زیادہ نہیں) اس لئے کہ بھائی بہن کا حق کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتہ۔ بڑی آپ ہیں مگر سمجھانا مجھے پڑتا ہے۔

ساری باتیں چھوڑیں - یہ بتائیں - ویزا بنا کہ نہیں؟ دوسری بات یہ کہ لاہور کب تک پہنچ رہی ہیں - آپ کی باتیں سننے کو ترس گیا ہوں میں نے آپ سے کہا تھا - اب خط نہ لکھوں گا - بلکہ آپ ہی جلد لاہور آنے کی ٹھانیں - مگر چپ رہنے کے لیے بھی تو چیتے کا جگر چاہیے تھا - یہ معلوم نہ تھا -

آپ کا بھائی محمد طفیل

صادق حسین

بہت نستعلیق، بہت ہمدرد، بہت غمگسار، گفتگو متاثر کرنے والی، موڈ میں ہوں تو عظیم بیگ چغتائی بھی مات!

افسانہ نویسی میں ہر چول کو ٹھیک جگہ بٹھاتے ہیں - دوستی میں بھی اسی مہارت، اور اسی رکھ رکھاؤ کے قائل! نہ افسانہ میں ایک لفظ زاید، نہ دوستی میں کوئی سقم!

برادرم، سلام مسنون!

میں تو یہاں افسردہ ہوں - مگر آپ وہاں خوش ہوں گے - اس لیے کہ وہ سرزمین آپ کے خوابوں کی دنیا ہے - ناخوش تو یہاں میں بھی نہ ہوتا - بشرطیکہ مجھے آپ بیتی نمبر چھاپنا نہ ہوتا - اس نمبر نے میرا خون نچوڑ لیا ہے - میری جیب خالی کر دی ہے - اگر یہ نمبر مجھے ایک رُخ پہ زک پہنچاتا تو سہ لیتا - مگر اس نے تو دوہری مار دی -

اس پرچے کا مستقبل اور میرے بچاؤ کا پہلو، اب صرف یہ ہے کہ خوب اشتہارات ملیں - ورنہ "گناہ بے لذت" والی بات ہو جائے گی - ہر چند کہ میں نے اپنی زندگی بے لذت اور با لذت کے چکر میں پڑے بغیر گزاری، مگر اب بڑھاپے میں سود و زیاں سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں - ممکن ہی نہیں - کھیل بگڑتا ہے -

امید ہے کہ آپ اچھے موڈ میں ہوں گے - جو سدا رہا -

محمد طفیل

۱۸/۳/۶۴

اختر جمال، احسن علی خاں

جب اختر جمال کو دیکھا تو قصہ جمال والا تھا - مگر اس خاتون کی پاکیزہ روی، اس خاتون کی بڑھیا سوچ نے حیرت میں ڈالے رکھا -

یہ ایک ایسی خاتون ہیں - جن کی میرے دل میں عزت ہے - اگر یہ مجھے بھائی کہتی ہیں تو میرے لیے بھی اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں!

اختر بہن، احسن بھائی! سلام مسنون!

آپ دونوں نے اپنوں سے بڑھ کر نوازا۔ اس کے لیے میں شکریے کا گھسا پٹا لفظ استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ اُن عنایتوں کے اظہار کے لیے کوئی اور لفظ ہوگا۔ جو یا تو مجھے معلوم نہیں۔ یا ابھی معرضِ وجود میں نہیں آیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ جنتِ ارضی کا ایک گوشہ کاکول بھی ہے۔ پہاڑوں سے گھرا ہُوا۔ سرسبز بھی، شاداب بھی، حسین بھی، دلکش بھی! یہ جگہ مجھے اپنے خوابوں ہی کی طرح حسین نظر آئی۔ مجھے تو ان لوگوں پر بھی رشک آیا۔ جو کاکول کے آس پاس ابدی نیند سو رہے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں، گھنے درختوں کی چھاؤں میں!

یہ تو میں اپنی باتیں لکھ رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی تو بتائیں کہ ہمارے جانے کے بعد کے نفل شکرانے کے ادا کیے۔ بھئی سچ سچ بتانا!

ہم سب مزے میں لاہور پہنچے۔ راستے میں بارش ہو رہی تھی۔ قدرت کی فیّاضیاں اور بھی لبھائیں۔

بچوں کو پیار اور آپ دونوں کو بھی "پیار!"

۲۷/۸/۶۴ آپ کا محمد طفیل

کرتار سنگھ دُگّل

بھائی، تسلیم

آپ کا افسانہ ملا۔ اسی وقت پڑھا۔ خوشی کے ساتھ۔ افسانہ اپنی جگہ بڑا پیارا ہے۔ مگر موضوع ایسا ہے کہ مجھے اس کے چھاپنے میں ہچکچاہٹ ہے۔ یہاں بھی ایسے لوگ ہیں۔ جنھیں صرف عجیب کہا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی بُری عادت کے مطابق، کہیں کہیں افسانے میں اپنا قلم لگا دیا ہے کوئی ترمیم پسند آئے تو "رکھ" لیجیے گا۔ ورنہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ وہی مستند!

یہ افسانہ اس شرط پر واپس ارسال ہے کہ آپ مجھے جلدی سے ایک اور افسانہ بھیجیں گے۔

بھابی کو "السلام علیکم!"

۱۸/۳/۶۷ محمد طفیل

مسیح الزّماں

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا مضمون فصیح مرثیہ گو" ملا۔ دل خوش ہُوا۔ ذہن مطمئن ہُوا کہ ایک اچھا مضمون ملا۔ آپ نے لکھا تھا کہ اس سلسلے کے سارے مضمون نقوش میں چھپیں گے وعدہ یاد رکھیے گا۔ اچھے لوگ زبان پر بیٹیوں تک رشتہ کر دیتے ہیں یہ یہاں تو معاملہ صرف مضامین کا ہے۔ اُفّوہ! میں بھی کتنا نادان ہوں کہ تخلیق کو اولاد سے کم مرتبہ جانا!

آپ کے شہر میں فراق گورکھپوری رہتے ہیں - ان دنوں میاں مجنوں گورکھپوری آئے ہوئے ہیں۔ دل سنبھالیے! وہ یہاں چند دنوں کے لیے آئے ہیں - واپس پہنچنے والے ہیں۔ گورکھپور نے یہ دو آدمی خوب پیدا کئے ہیں - مگر اس کا کیا علاج کہ گورکھپور نے فراق کے والد عبرت گورکھپوری کو بھی پیدا کر ڈالا - والسلام

محمد طفیل ۱۸/۱/۶۸

شریف الدّین پیرزادہ

محترم، سلام مسنون!

چند برس گزرے، کراچی سے ایک خط، میرے پاس آیا تھا - شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے، میری کتاب 'جناب' کے بارے میں ہو سکتا ہے، وہ آپ ہوں - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور شریف آدمی ہوں -

اِن دنوں میں خطوط نمبر چھاپ رہا ہوں۔ آپ نے قائدِ اعظمؒ کے خطوط کے بارے میں کام کیا ہے میری گزارش یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط آپ کی توجہ سے پا سکوں گا؟

آپ کے پاس دیگر مشاہیر کے بھی خطوط ہوں گے۔ عنایت فرمائیں۔

عرصے کی بات ہے کہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے (نواب حیدر آباد کی وفات کے دنوں میں) میرے سامنے آپ کو ٹیلی فون کیا تھا۔ مولانا کا ذکر، اس وقت اس لیے آیا ہے کہ انھوں نے بھی بہ سلسلہ خطوط اپنا سارا قیمتی سرمایہ میرے حوالے کیا ہوا ہے۔ جو اور ہزاروں خطوط کے ساتھ خطوط نمبر کی صورت میں چھپ رہا ہے۔

آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس تاریخی دستاویز میں "اپنا حصّہ ڈالیں"۔ چونکہ ایسے کام ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ناممکن ہوتے ہیں - اس لیے آپ کو بھی پکارا۔

آپ مصروف آدمی ہیں۔ آپ کے سپرد بڑی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ خدا آپ کو زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع دے -

تازہ نقوش بھجوا رہا ہوں - اس میں خطوط نمبر کا اعلان ہے۔ والسلام

محمد طفیل ۱۵/۱۲/۶۷

خواجہ شہاب الدّین

خواجہ صاحب قبلہ

آپ کا محبوب رسالہ اب خطوط نمبر چھاپ رہا ہے۔

مجھے اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں، آپ کے دو خطوط بھی ملے جو آپ نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں لکھے تھے۔ آپ مسلمانوں کے کتنے پرانے خدمت گزار ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

آپ کے پاس اور آپ کے مرحوم بھائی کے پاس، یہ سلسلہ خطوط بڑا نادر ذخیرہ ہوگا۔ کیا آپ ادب و تاریخ پر احسان کر کے، وہ سرمایہ مجھے عنایت فرمائیں گے۔ کہ میں اُسے پوری ذمہ داری کے ساتھ، اپنے رسالے میں چھاپ سکوں؟ تاکہ وہ محفوظ ہو جائے اور صدیوں زندہ رہے۔

آپ نقوش کے قدر دان ہیں۔ اس کی قدر و منزلت بھی جانتے ہیں۔ اس لیے خطوط کی اشاعت نقوش میں حد درجہ موزوں ہوگی لہٰذا ڈھاکے سے خطوط کا سرمایہ پنڈی لے آئیں۔ پنڈی پہنچ کر مجھے طلب فرمالیں۔ میں پوری احتیاط اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کی اشاعت کا بیڑا اُٹھاؤں گا۔

وقت کم ہے۔ فروری میں یہ پرچہ بازار میں آ جائے گا۔ اور ہاں اُس وقت آپ کو اس نمبر کے افتتاح کی بھی زحمت دوں گا۔ ضرور وقت نکالیے گا۔

اس نمبر میں ایک صدی سے لے کر موجودہ دور تک کے مشاہیر کے خطوط پیش کر رہا ہوں۔ فہرست بھجوا رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ لہٰذا آپ بھی "اپنا حصہ ڈالیں"۔ والسلام

محمد طفیل

الطاف حسن قریشی

صاحب! میں نے آپ کو ایک دن سمجھایا تھا کہ "سوال بڑے لوگوں سے کیے جاتے ہیں"۔ اس لیے مجھ ایسے عام آدمی کو نہ چھیڑا کریں۔ مگر آپ باز ہی نہیں آتے۔ آخر یہ ضد کیوں؟ اگر آپ یوں سینہ زوری سے کام لیتے رہے تو بڑے لوگوں کی محفل میں میرا دم گھٹ جائے گا۔

یا پھر سوال ممتحن بچوں سے پوچھتے ہیں۔ اب میری عمر وہ نہیں رہی کہ روایتی معنوں میں طالب علم کہلا سکوں۔ پھر یہ مشغلہ کیوں؟ مزا آتا ہے کیا؟

آپ نے لکھا کہ سوال ہے "میری زندگی کا پہلا دن" (شکر ہے کہ آپ دن تک ہی رہے) پھر یہ لکھا "یہ پانچ الفاظ، ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا سوال ہیں۔ صرف سوچنے کی ضرورت ہے اور آپ تو سوچتے ہی رہتے ہیں (مطلب یہ کہ خبطی ہیں)

بھئی ہم سوچتے اس لیے ہیں کہ کہیں دوسروں کی سوچیں ہمیں پیچھے نہ چھوڑ جائیں یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ پھر اپنوں کے بارے میں — اور — اور سب کے بارے میں سوچنے والے لوگ، تو اب پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔

ان حالات میں آپ کا اصرار ہے کہ میرے سوال کے بارے میں سوچا جائے یہ کتنی زیادتی ہے۔ پھر پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا سوال کیٹی ہے۔ واضح نہیں۔ موجودہ صورت میں، آپ کے سوال کو نہیں، آپ کو حاضر ناظر جان کر کچھ کہنا پڑے گا۔ لہٰذا سنیے:-

میری زندگی کا پہلا دن (یا اہم دن) وہ تھا۔ جب میں نے اپنے نہایت ہی پیارے دوست، احمد ندیم قاسمی سے ایک ادبی معاملے میں اختلاف کیا تھا۔ دن اور تاریخ یاد نہیں مگر یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے۔ اُن دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا۔ "نقوش"

کی ادبی پالیسی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ امن نمبر قسم کے شمارے نکل رہے تھے۔

ندیم بھائی تھے "ترقی پسند" میں تھا "قدامت پسند!" ہماری حد درجہ دلی قربت بھی، ہمارے اس ذہنی فاصلے کو کم نہ کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اُس جرم کی پاداشں میں، اُس گھڑی سے لے کر، اس ساعت تک اپنی سوچوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔

محمد طفیل ۲۲/۱۱/۶۷

برادرم!

ایک سرکلر لیٹر جو کہ آپ نے خواتین کو لکھا تھا۔ وہ میرے نام بھی آیا۔ اُس میں لکھا ہے کہ "آپ پوری طرح تعاون کرتی ہیں"۔ اس فقرے سے بڑا مزا دیا۔ پھر آپ نے لکھا کہ "آپ کی تحریروں نے قارئین میں ایک نیا ذوق پیدا کیا" اگر میں اپنے آپ کو خاتون بھی سمجھ لیتا تو بھی یہ فقرہ میرے لیے نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے تو کبھی آپ کے پرچے میں لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

آپ نے لکھا ہے کہ اب کے موضوع ہے "عورت سہارا دیتی ہے لیتی نہیں"۔ اچھا عنوان ہے میرا جواب یہ ہو سکتا تھا کہ آپ اپنے اس فقرے کے دو حصے کر لیں یعنی تیس سال کی عمر تک عورت سہارا لیتی ہے۔ تیس سال کے بعد سہارا دیتی ہے۔ ویسے آپ اور میں عمر کے اس حصے میں ہیں کہ آپ کا فقرہ درست ہو گیا کہ— عورت سہارا دیتی ہے لیتی نہیں!

میں نے سوچا کہ ملنے ملانے میں تو دیر ہو جاتی ہے۔ بہانہ ہے یاد کرنے کا، اور یہ بھی بتلانے کا کہ خط غلط جگہ آ گیا۔ کوچۂ دلدار کی بجائے "کوچۂ یوسفؔ" میں پہنچ گیا۔

آپ کا محمد طفیل ۳/۹/۷۹

حافظ الدین

محترم، سلام مسنون!

اب کے پرچہ کو بغیر طلوع کے چھپنے دیجیے۔ کچھ فرق نہ پڑے گا۔ کوئی نہ ہو جو اس صفحہ کے لیے بے قرار ہو۔

میں بیمار کیا ہوا۔ پرچہ بھی بیمار ہو گیا۔ معلوم ہوا وہ خونِ عاشق ہی تھا۔ جو اس میں رواں دواں تھا۔

پرچہ مجھے جان کی طرح عزیز ہے۔ مگر میرے عزیزوں کو، پرچے سے زیادہ میری جان عزیز، یہی سبب ہوا کہ ایک پروگرام کے تحت، مجھے یہاں بھیجا گیا۔ یہاں بیٹھ کر، میں جو کچھ بھی اپنے "محبوب" کے لیے کر سکتا تھا کر گزرا۔ مگر کچھ اس طرح کہ اب کے آنکھیں جھک ہی گئیں۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ مارے شرم کے سر ہی نہ اُٹھا سکوں۔ حصۂ نظم ہی تو کمزور ہے۔ آج میں حصۂ نظم کو رو رہا ہوں۔ کل مجھے تمام اصنافِ ادب کے بارے میں رونا پڑے گا۔ اس لیے کہ اچھی چیزوں کا حصول اب روز بہ روز ناممکن بنتا جا رہا ہے۔ جیسی چیزیں آج لکھی جا رہی ہیں۔ ویسی بھی آج کے پانچ دس برس بعد لکھی نہ جا سکیں گی۔ میرے نزدیک یہ زوال مسلسل ہے۔ (چند تجربے ضرور ہوئے جن کی بدولت چند افسانے ملے، چند نظمیں اور ایک آدھ ناول) میں نے یہ مسئلہ ادیبوں کے سامنے کئی بار رکھا ہے۔ عرض کرتے کرتے قلم اور زبان

گھس گئی۔ مگر کون سنتا ہے پہلے لکھنے والے ادیب ہوتے تھے۔ آج کے لکھنے والے بقراط ہیں۔

آپ مجھ سے مری کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ ادب کی طرح اخلاق کا بھی حال پتلا ہی ہے یہاں پہ پاکستان بھر کے فیشن زدہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں۔ عورتیں ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہر انداز میں دکھانا چاہتی ہیں۔ مرد ہیں کہ انھیں ہر انداز میں دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ میں تو مال روڈ پہ آنکھیں جھکائے گزرتا ہوں کہ جیسے سامنے، کوئی میری ہی ماں بہن ننگی چلی آ رہی ہو۔ میں آج تک اس وہم میں مبتلا رہا کہ میں ایک متوازن ذہن رکھتا ہوں۔ اس لیے کہ نہ تو میں مولانا عبدالماجد دریابادی جیسا مومن ہوں اور نہ ہی منٹو جیسا رند، اس پہ بھی میں نے ہار مان لی۔ الٰہی توبہ!

آخری عمر میں، انسان بڑا نمازی اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ نمازیں پڑھتا ہے۔ روزے رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ ادب کی جائے نماز بچھا لوں اور کچھ نیک کام کر جاؤں یعنی اپنے سارے ہی ادھورے خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لوں۔ میری مراد اس کام سے ہے۔ جس پہ محنت کر چکا ہوں۔ یا جن کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ ان کاموں میں مثنوی نمبر، لاہور نمبر، مکاتیب نمبر (حصہ دوم) صحافت نمبر اور ڈراما نمبر ہیں۔ لاہور نمبر پہ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ مزید دو تین مہینے کے لیے اس نمبر میں خود کو کھو دینا ہوگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر میں اپنی جنم بھومی کے بارے میں ایک کام کی چیز پیش کر جاؤں۔ لاہور جو شاہنشاہوں کے دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ لاہور جو ادب کا مکہ اور مدینہ ہے۔ لاہور جو حسن اور خوب صورتی کا کعبہ ہے۔

یہاں پہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ وہ اس پرچے کے علاوہ مثنوی نمبر ہی کے بارے میں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ نمبر بھی بڑے کام کا ہوگا۔ بڑے بڑے مشہور شعرا کی نایاب مگر غیر مطبوعہ مثنویاں، اس نمبر کے ذریعے سامنے آ جائیں گی۔ جوں جوں اس نمبر کے بارے میں کام کرتا جاتا ہوں۔ لطف آ رہا ہے۔ ہائے ہائے! مثنوی بھی کیا لطیف صنفِ سخن ہے۔ ہمارے شعرا بھی کیا مزے کے تھے۔ عشق کرتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ جانے ان کی عاقبت کیا ہوئی۔ مگر ہمارا ادب مالا مال کر گئے۔

امید ہے کہ اس شمارے کے سلسلے میں، اب میری ضرورت نہ پڑے گی۔ سارا ہی کام ٹھیک چل رہا ہے۔ روڑا اٹکے تو بلا لیں۔ بلندیوں سے پستیوں کی طرف لوٹ آؤں گا (زیادہ موزوں تو یہ کہ پستیوں سے بلندیوں کی طرف لوٹ آؤں گا) میرا سب سے سلام عرض کریں۔ اخلاق سلمہٗ کی صحت اب اچھی ہے۔ یہ غریب پہلے ہی "پہلوان" تھا۔ اب کے اور مہین ہو گیا۔ والسلام

۱۸/۷/۶۱

محمد طفیل

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

برادرم، مزاج معلیٰ!

آپ کی غزلیں مجھے بڑی پسند آتی ہیں۔ پہلے آپ کے مضمون پسند آتے تھے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھے مضمون بھی غزل بھی دونوں ہی ایک ساتھ بھیج دیا کریں۔ تاکہ یہ اچھا۔ وہ اچھی کے چکر سے نکل جاؤں۔

ان دنوں کچھ ایسا موڈ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ذرا سلیقے سے کام کروں۔ کچھ اور کروں۔ کچھ اور کر جاؤں۔ بس یہی سوچ سوچ کر

بلا ہُوا جا رہا ہوں۔ بات کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنی سعی، اتنی کوشش کے باوجود جہاں ہوتا ہوں۔ وہیں کھڑا رہ جاتا ہوں۔ آج صبح سے خط لکھ رہا ہوں۔ ہاتھ درد کرنے لگا ہے۔ یہ تو حال ہے "عاشقِ زار" کا۔ ہوگا خاک!

محمد طفیل ۳۰/۷/۶۲

عبدالعزیز خالد

جیسی روانی ان کے شعروں میں ہے۔ ویسی روانی ان کی گفتگو میں، جیسے شاعری میں کسی قافیہ کو نہیں چھوڑتے۔

— ویسے گفتگو میں بھی، کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ غرض نہیں چھوڑتے، ان پہ ختم!

یہ بڑے افسر ہیں۔ مگر ان کی طبیعت میں افسرانہ شان نہیں۔ یہ سچّے شاعر ہیں۔ اس لئے سچّے آدمی!

بھائی! آپ مجھے اتنی محبت سے بلاتے ہیں تو پھر دُور کیوں بیٹھوں!

پہلی بات تو مجھے آپ سے یہ کہنی ہے کہ اِس اَن پڑھ ملک میں ایسی زبان استعمال کیجیے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے پلّے پڑے۔ یوں آپ کا پیغام زیادہ لوگوں تک پہنچے گا۔ زیادہ لوگ مستفید ہوں گے۔ اگر آپ یہی زبان تیس چالیس برس پہلے استعمال کرتے تو اس سے اتنی اجنبیت محسوس نہ ہوتی۔ اُن دنوں کا عام قاری بھی عربی اور فارسی کا رچا ہُوا مذاق رکھتا تھا۔ آج سب کے سب ایسے علامہ ہیں جو عربی فارسی چھوڑ، اُردو بھی غلط لکھتے ہیں۔ لہذا نیچے اُتر آئیے تاکہ آپ کی شاعری صرف ڈکشنریاں رکھنے والے ہی نہ سمجھیں بلکہ سب کی سمجھ میں آئے۔ اگر آپ نے میری یہ بات نہ مانی تو پھر یہ مانیے کہ کم از کم مجھے، اپنی طرف سے اُردو، فارسی، عربی کی ایک ایک ڈکشنری ضرور بھیجیں تاکہ کلام سے محظوظ تو ہو سکوں — اس "غلط" رائے کے بعد یہ کہوں گا۔ اپنی کوئی تازہ چیز تو بھیجیں۔ شکریہ

محمد طفیل ۲۸/۱۱/۶۳

سیّد ہاشم رضا

برادرِ محترم سلام مسنون!

دیکھئے! میں نے بہانہ ڈھونڈھ ہی لیا آپ کو یاد کرنے کا۔ معلوم نہیں آپ بھی مجھے یاد کرتے ہوں گے کہ نہیں؟ نہیں نہیں ایسی ت نہیں، آپ کے دل میں آؤں یا نہ آؤں۔ ذہن میں تو آتا ہی ہوں گا۔ سنا ہے کہ اچھے آدمی دل میں جگہ پاتے ہیں اور بُرے دماغ میں' نکہ مجھے اپنے آپ میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔ اس لئے اپنی حدود سے بڑھوں بھی کیوں؟ ویسے مجھے آپ کے خلوص پہ شبہ کرنے کا ا کوئی حق نہیں۔

بھائی جان! آپ نے شوکت صاحب پر، جو کچھ ریڈیو پہ کہا تھا۔ اُسے ذرا بڑھا کر اپنے نقوش کے لیے بھیج دیجیے۔ میں خوش لوں گا۔ شوکت صاحب کے خطوط ہوں تو وہ بھی دیجئے۔ والسلام

آپ کا محمد طفیل ۱۵/۶/۶۳

وزیر آغا

محترم ، سلام مسنون

میں نے اوراق میں پڑھا تھا کہ آپ پرچہ بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آخر کیوں؟

جہاں تک ادبی پرچوں کے مالی معاملات کا تعلق ہے۔ وہ تو آپ پر پہلے ہی دن آشکار ہو گا۔ اس لیے کہ اللہ میاں نے ادبی پرچوں کے مقدر میں لکھ رکھا ہے کہ مالی اعتبار سے، خوش نہ رکھوں گا۔

جہاں تک خونِ دل کی ارزانی کے ساتھ بھاگ دوڑ اور سعی و کوشش کا تعلق تھا۔ اُس سے بھی آپ خوب واقف تھے۔ اس لیے کہ آپ کے لیے یہ کوئی نیا کام نہ تھا۔

اِن جانی پہچانی دشواریوں کی موجودگی میں، جب آپ نے پرچہ نکالا تھا تو اُسے اب جاری بھی رکھیے۔ جیسے بھی بن پڑے۔

مجھے آپ کے پرچے کے کچھ زیادہ ہی نئے پن سے ہلکا سا اختلاف تو ہے لیکن مجھے اوراق عزیز ہے، بہت عزیز!

۲۸/۳/۶۸

محمد طفیل

مشفق خواجہ

محترم ، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ابھی ملا۔ کرم!

میں نے ابنِ انشا صاحب کو، ایک اور سلسلے میں خط لکھا تھا۔ انہوں نے مجھ پہ مہربانی کرتے ہوئے دوستوں سے بات کر ڈالی۔ میں اُن کا ممنون ہوں۔

بھائی! اختلافات تو رہتے ہیں۔ کون سب کو مطمئن کر سکا۔ جب اللہ میاں بھی جو مختارِ کل ہیں۔ اس میں ناکام رہے ہوں تو انسان پھر انسان ہے۔ مجبورِ محض! اس سلسلے میں میری سوچ یہ ہے کہ محض بُرا کہنے کے لیے، کسی کو بُرا نہ کہا جائے۔ بس!

میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میرے کسی فعل سے دوستوں کو شکایت نہ ہو۔ یا یہ کہ جان بوجھ کر، کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤں۔ میرا موضوع بڑا "غلط" ہے۔ سوچیں بھی کیا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میری تحریریں، اسی مصلحت کے مخمصے میں گرفتار نظر آتی ہیں۔ اگر کہیں یوں نہیں ہُوا تو مجھے اپنی اُس تحریر کی ناکامی پر افسوس بھی ہے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ادب سے متعلق رہنا ہی، کچھ کم سزا نہیں ہے۔ اب میں یہ کس سے کہوں کہ خطوط نمبر تین چار مہینے اور پہلے آجاتا۔ بشرطیکہ رقم کا بندوبست کر سکتا۔ "جنازہ" سامنے رکھے بیٹھا رہا مگر کندھا دینے والا نہ ملا۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اُس سے میری غلط فہمی دور ہُوئی۔ مجھے اپنے اس نادان دوست پر غصہ آیا۔ جس نے بلاوجہ شوشہ چھوڑا۔

آپ نے عرصہ ہُوا لاہور آنے کی نوید سنائی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا ملوں گا۔ جب سے منتظر ہوں۔ والسلام

۱/۴/۶۸

محمد طفیل

جگن ناتھ آزاد

بعض لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یا اللہ اس فرشتے کو انسان بنا دے۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی، فرشتہ انسان بن گیا اور اس نے وہ کام کئے جو انسان کرتے ہیں۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آزاد مسلمان ہے۔ میں کہتا ہوں —— ہوگا!

برادر محترم، تسلیمات!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ جمہور نامہ کا ایک باب بھی ملا۔ مجھے ایک غزل اور نظم اور بھیجیں۔ میں انتظار کروں گا۔ آپ نے کتنا اچھا خط لکھا۔ میں خوش ہوا۔

میں آپ کے والد محترم کے بارے میں کیا لکھوں؟ اگر دو چار ملاقاتیں ہوئی ہوتیں تو میں انھیں بھی اپنے ذہن کی گرفت میں لے آتا۔ نقاد ہوں نہیں جو انٹ شنٹ لکھ ڈالوں۔ ہمارے نقاد بڑے مزے کے ہیں۔ وہ جو کچھ غالب اور میر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ویسے ہی جملے اور ویسے ہی فیصلے متبدیوں کے بارے میں بھی دے ڈالتے ہیں۔ خوفِ خدا نام کو نہیں! خوفِ ادب یا خوفِ خلق خاک ہوگا۔

ایک اپنے نیاز صاحب (نیاز فتحپوری) ہیں۔ وہ تو کسی کو بخشنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ابھی غریب جگر مراد آبادی کی خبر لے ڈالی۔ بھئی دیکھئے تو، کیا جگر کی شاعری میں عیوب ہی عیوب تھے؟ محاسن نہ تھے؟ عیوب کو ہوا دینا اور محاسن کی طرف سے آنکھیں چرانا، کیا بات ہوئی! —— اب باری اقبال کی ہے۔ دیکھئے اس کی علامہ کیا گت بناتے ہیں۔ یہاں معاملہ صرف شاعری کا نہیں، ایک قوم کے جذبات کا بھی ہوگا۔ بے شک ہم نے اقبال کو خدا مان لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے شاعر اور انسان کی حیثیت میں جانچا جائے۔ مگر یہ تو ضروری نہیں کہ ہم اپنی قابلیت کے زعم میں بہک ہی جائیں۔

میں محروم محترم کی نظمیں بچپن سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچپن میں وہ سب مجھے بڑی عزیز تھیں۔ یہ تو آپ کو علم ہوگا کہ بچپن کے فیصلے بڑھاپے میں بھی جا کر بدلا نہیں کرتے۔ میں نے ان کے ہاں صاف ستھرا ذہن، سیدھی سادی زبان، لہجے میں خلوص، انداز میں دلکشی پائی ہے۔

جی ہاں، اب میں خیریت سے ہوں اور طالبِ خیریت ہوں۔

۱۷/۱۰/۶۱

محمد طفیل

مہندر ناتھ

یہ صرف افسانہ نگار نہ تھے۔ بلکہ انسان تھے۔ جس سے لوگ محبت کرتے تھے۔

جو لوگوں سے محبت کرتا تھا۔

وہ کرشن چندر کا بھائی تھا۔ شاید یہ اثر خاندان کا ہو کہ وہ اپنا اتنا خیرخواہ نہ تھا۔ جتنا کہ دوسروں کا، اپنے لئے جینا آسان ہے۔ دوسروں کیلئے تڑپنا مشکل!

برادرم، آداب!

مدت کے بعد آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ کاغذی یاد بے شک اب آئی ہے مگر ویسے یاد کب نہیں رکھا۔ میری چپ کی بابت آپ سے طنز و مزاح نمبر نے سب کچھ کہہ دیا ہوگا۔ اب میں کیا کہوں۔ آپ کا دہرا وقت ضائع ہوگا۔

کئی بار سوچا ویزا کٹواؤں۔ بمبئی پہنچ جاؤں۔ زیادہ نہیں تو کم از آپ سے ضرور مل آؤں۔ اب یہ آرزو دن بہ دن دم توڑ رہی ہے۔ اس لیے کہ آپ کی گورنمنٹ ایسا نہیں چاہتی کہ دوست، دوست کو مل سکے۔ ابھی پچھلے دنوں میرے پڑوسی کا والد بیمار ہوا۔ انڈیا سے تار آیا۔ بیچارے نے درخواست دی۔ پھر تار آیا کہ حالت نازک ہے پھر بھاگ دوڑ کی۔ تا آنکہ والد کا انتقال ہو گیا اور بیچارہ ویزا حاصل نہ کر سکا۔

کیا ان دنوں کوئی افسانہ لکھا ہے؟ لکھا ہو تو جلد بھیجئے، نہ لکھا ہو تو لکھیں اور بھیجیں۔ ارادہ ہے کہ ادھر ایک اچھا سا پرچہ جلدی سے چھپ جائے۔ جیسے الہ دین کا چراغ کوئی معجزہ کر دکھائے۔

کرشن جی کو بھی خط لکھا ہے۔ دیکھیے ان کی شانِ بے نیازی سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

۱۷/۲/۵۹ محمد طفیل

شوکت تھانوی

بھائی! سلام مسنون!

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ نے بولنا پھر سے شروع کر دیا۔ ورنہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ ڈاکٹروں نے آپ کو بولنے سے منع کر دیا ہے۔ آپ کا تو اس میں کچھ نہ بگڑا۔ میں جو کبھی آپ کا دوست تھا، پریشان رہا۔

طنز و مزاح نمبر کی رسید ملی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ نمبر آپ کو ناپسند نہیں ہوا۔ چلیے محنت ٹھکانے لگی۔ ورنہ اپنی جوانی کا پورا ایک برس جو میں نے اس پہ صرف کیا تھا بیکار جاتا۔

ایک نمبر اور خلیل صاحب کے نام بھیج دوں گا، دو تین دن تک۔ اس کی وجہ یہ کہ پہلا ایڈیشن آنکھ جھپکنے میں ختم ہو گیا۔ اب دوسرا تیار ہو رہا ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔ بندہ غلام جو ٹھہرا۔

آپ کو ایک صاحب بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کا نام ہے طفیل!

۱۶/۲/۵۹

ابوالفضل صدیقی

برادرم، سلام مسنون!

اب تک میں نے آپ کے لئے دعائیں ہی مانگی ہیں۔ مگر اب آپ کا رویّہ دیکھ کر دل نے کچھ اور ٹھان لی ہے۔

یں کام کر کر کے مر جاؤں اور آپ یوں ہائے ہی نہ کریں۔ اچھا بابا، نہ بولئے۔ جب ہم واقعی مر جائیں گے تو پھر بہت یاد آئیں گے۔
شاید، آپ مجھ سے زیادہ واقف نہیں۔ میرا نام طفیل ہے۔ رسالہ نقوش نکالتا ہوں اور اس میں افسانے بھی چھپتے ہیں۔
گھر میں سب کو سلام! ——— اور صرف آپ کو نہیں، اوپر جو سلام لکھا ہے وہ صرف روایتاً۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

محمد طفیل

۱۶ ۲/۵۹

برادرم، سلام مسنون!

میں آپ کو اپنی کتابیں نہیں بھجوا رہا، اس لیے کہ آپ اپنی ذات کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دوسروں کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ کے دل میں خوفِ خدا پیدا نہ ہو اُس وقت تک اِس موضوع پر نہ لکھیں۔

ہاں! طرزِ انشا کی وجہ سے آپ کا مضمون بھلا لگ سکتا ہے۔ (جیسا کہ ایک دو لگے) اگر سوال زیرِ بحث شخصیت کا ہوتا ہے۔ چند پھبتیاں اور چند اپنی بڑائیاں، اِس کا نام اسکیچ نگاری نہیں!

پھر میری ذات پہ مضمون لکھنا چنداں ضروری نہیں، کسی دوست یا کسی بڑے افسر پر توصیفی مضمون لکھیے تاکہ آپ کا بھلا بھی ہو۔

محمد طفیل

۱۰/۶/۵۴

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

برادرم، سلام مسنون!

پہلے آپ بڑے لکھنے والے تھے۔ اب بڑے آدمی ہوئے ہیں۔ میرا یارانہ تو بڑے لکھنے والوں سے رہا ہے۔ اب بڑے آدمیوں سے کیسے نبھاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچ سوچ کے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔

کہیے تو بھائی! اپنا آخری سلام عرض کروں؟ اور آپ سے رخصت ہو لوں؟ کہا سنا معاف کرا لوں؟ ورنہ روزِ حشر کون ان جھگڑوں کو چکاتا پھرے گا۔ وہاں اور بہتیرے گریبان پہ ہاتھ ڈالنے والے ہوں گے۔

نہ خط، نہ مضمون، نہ سلام، نہ دعا۔

محمد طفیل

۱۸/۲/۵۹

ڈاکٹر محمّد باقر

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چپ ہو جاتا، مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ نمبر نہیں نکالے گا۔ بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہُوا کہ مرا۔ البتہ

ہمارے گھر والے ہمیں روئیں گے ۔ اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مفاد وابستہ ہوگا ——— میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے سچ ہونے پر سو فی صد یقین ہے۔ کسی کے لیے آپ روڑا ہیں، کسی کے لئے میں ! میدان البتہ الگ الگ ہیں۔

"مردہ نمبر" کی ترکیب مجھے پسند آئی ۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کی طرح زندگی ہی میں ہر اہم شخصیت کا جلوس نکال دیا جائے ۔ اگر کسی کا جلوس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے ۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں ۔ اگر کوئی ادیب اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہے کہ اسے خراجِ عقیدت پیش کریں ۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں ایک نمبر بھی پیش کیا جائے ۔

دیکھیے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑ لے لے کر اُبھرے بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے ۔ وہ اگر پطرس نمبر نہیں نکالے گا تو بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا ——— میں نے منٹو نمبر نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا کہ منٹو ایک بڑا تیکھا آرٹسٹ تھا اسے خراجِ عقیدت پیش کیا جائے ۔ مگر اس پر بعض نستعلیق قسم کے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا ——— پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجیے ۔ منٹو نمبر کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین چار چار ایڈیشن چھپے ۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں ہیں بلکہ ایک ادیب سے عقیدت کا اظہار ہیں ۔

معاف کیجیے گا، میں نے اکثر یہ اندازہ لگایا کہ آپ اچھی باتوں کے بُرے پہلوؤں پر ہی سوچتے رہتے ہیں ۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور بُرائی بھی ——— پلڑا کونسا بھاری ہے؟ اس کا اب فیصلہ کون کرے؟

امید ہے آپ اچھے ہوں گے ۔ آپ نے "پیاری باتیں" لکھیں ۔ میں نے "پیاری باتیں" سنائیں ۔ والسلام

محمد طفیل
۲۲/۵/۵۹

علی عباس حسینی

برادر مکرم، سلام مسنون !

آپ کے دونوں مضمون نقوش میں آئیں گے ۔ جو لوگ آپ سے مضمون مانگ رہے ہیں انھیں اور لکھ کے دیں ۔ آپ میری دولت پر کیوں ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں ۔

"صاحب" کا بھی ایک نسخہ آپ کے ارشاد پر بھجوایا گیا ہے ۔ یہ کتاب ایسی بد نصیب ہے کہ اسے جس نے بھی پڑھا بے حد پسند کیا ۔ مگر جن پر مضمون ہیں وہ سب ناراض ہیں ۔ سوائے دو ایک کے ۔ منٹو پر جو مضمون ہے اس کا ایک حصّہ تو منٹو کی زندگی ہی میں چھپا تھا جو مرحوم نے بے حد پسند کیا تھا (حالانکہ اس مضمون کا پہلا حصّہ منٹو کے زیادہ حق میں نہ تھا) چونکہ وہ صاف گوئی اور بے باکی کو پسند کرتے تھے اس لیے وہ کھری کھری پر بھی ناراض نہ ہوئے ۔

فراقؔ پر جو کچھ لکھا اسے فراقؔ کے جاننے والوں نے تو پسند کیا خود فراقؔ بگڑ گئے ۔ اس کتاب پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے

اسے کسی وقت چھاپوں گا۔ مزے کی چیز ہے جس میں خود فراق اور بے نقاب ہوئے۔

احسان دانش پر جو مضمون ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ برسوں ان کے ساتھ رہنے والوں نے بھی اس کی تعریف کی۔ عصمت نے بھی لکھا کہ یہ مضمون بڑے معرکے کا ہے۔ ایسے مضمون اور لکھئے۔ مگر احسان صاحب سے اس مضمون کے بعد زبانی سلام دعا تو رہی۔ دلی سلام دعا بھی جاتی رہی۔ اس سلسلے میں منٹو جیسی بڑائی کا ثبوت نہ دے سکے۔

شوکت صاحب پر جو مضمون ہے وہ جب میں نے لکھا تو شوکت صاحب کو سنا دیا تھا کہ میں نے آپ پر یہ لکھا ہے اجازت ہو تو چھاپ دوں۔ اس وقت تو مضمون کی بڑی تعریف کی۔ جب چھپ گیا تو گلہ کیا۔ ”دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ مضمون میرے خلاف ہے“۔ البتہ جگر صاحب اور ندیم صاحب پر جو مضمون ہیں ان پر ان صاحبوں نے رائے نہیں دی۔ البتہ جگر صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ فضلی صاحب نے (یہ ان کے جگری دوست ہیں) اس مضمون کو بڑا پسند کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ایسا مضمون میں بھی نہیں لکھ سکتا۔

مختصر یہ کہ یہ قصیدہ گوئی کی کتاب نہیں ہے۔ جن پر یہ کتاب ہے ان کا حال لکھ دیا ہے۔ جن پر یہ کتاب نہیں ہے انہوں نے اس پر بڑے شاندار ریمارکس دیئے۔ اب آپ اپنی تفصیلی رائے مجھے لکھ بھیجیں (مضمون کی صورت میں) من و عن چھاپوں گا۔ ویسے میں اب اس کتاب کو ترمیم و اضافے کے ساتھ دوبارہ چھاپ رہا ہوں۔ پہلا ایڈیشن ختم ہے۔

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ والسّلام

۱۴/۳/۵۹ محمد طفیل

واجدہ تبسم

بہن، آداب!

آج صبح سے خط لکھ لکھ کے تھک گیا ہوں۔ حالانکہ تھکنا میری کتابِ زندگی میں ہے ہی نہیں۔ مگر پھر بھی ذہن پہ اثر پڑتا ہے۔ ہاتھ تھک جاتا ہے۔ یہ آخری خط ہے جو آج میں لکھ کے اُٹھوں گا۔ پھر بھی اسی چکر میں صبح سے شام کرنا ہو گی۔ اوّل تو میں خط لکھتا ہی نہیں ہوں۔ ضروری خطوں کو بھی ہضم کر جاتا ہوں۔ جب لکھتا ہوں تو پھر باقی سارے کام ہضم! —— یہ میری زندگی کا سانحہ ہے کہ میں ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کرتا ہوں۔ دوسرے کام بیشک ہاتھ پاؤں پھیلائیں مگر میں انھیں جھڑک دیتا ہوں۔

اُدھر حیدر آباد میں بہت سے افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی بڑا ہی خوب صورت سا افسانہ چن کر مجھے جلد بھیجیں اس تحفہ کو پا کر بہت خوش ہوں گا۔ وہ بھی جتنی جلدی ممکن ہو۔ کاش آنکھ جھپکتے ہی میرے پاس ہو۔

اچھا بھئی باقی باتیں پھر، ذہن بوڑھا ہو رہا ہے —— ہاتھ بیچارے کو بھی چُھٹتے چُھٹتے دیر ہو گئی ہے۔ خدا حافظ

۱۸/۲/۵۹ محمد طفیل

سہیل عظیم آبادی

برادرم، سلام مسنون! آپ نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ آپ دلی میں ہیں۔ اور ریڈیو میں ہیں۔

جو آدمی دوسروں کی خیر خبر دیتا ہو وہ میرے لیے گم رہا۔ یہ دلکش سانحہ نہیں تو اور کیا ہے۔

جب تک آپ پٹنہ میں رہے، میرے قریب رہے۔ حالانکہ فاصلے کے اعتبار سے پٹنہ دل سے دور ہے۔ مگر دوری کا معاملہ تو فاصلے پہ منحصر نہیں ہوتا، دلوں کی قربت اور دوری پر منحصر ہوتا ہے۔

اگر آپ نے افسانے لکھنے سے توبہ نہ کی ہو تو ایک آدھ چیز ادھر بھی بھیج دیجیے۔ قارئین نقوش آپ کے افسانہ سے بدمزہ نہ ہوں گے، لطف اندوز ہوں گے۔ یہ میرا یقین ہے۔ پھر آپ کیوں ملتفت نہیں؟ بتائیے تو!

مدت کے بعد ملے ہیں تو دو چار بول پیار کے بھی کہیے!

۱۸/۲/۵۹ محمد طفیل

حجاب امتیاز علی

مدھم آواز میں میٹھی گفتگو کرنے والی خاتون، پھر فقروں ہی فقروں میں لطافت گھول دینا ان کا کمال، مجلس کی جان اور مجلس ساز! صاف ستھرا ذہن، صاف ستھری زندگی، صاف ستھرا ماحول! ایک نہج کے افسانہ کی ناخدا، سب کی خیر خواہ، سب ان کے مداح!

محترمہ، سلام مسنون! خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔

ان دنوں میں ایک ایسا نمبر ترتیب دے رہا ہوں جس میں آپ کے افسانے کی بڑی ضرورت ہے۔ سال ڈیڑھ سال سے آپ کا کوئی افسانہ نقوش میں نہیں آیا، اس لیے اس مرتبہ کرم کیجیے۔ کوئی بارہ روز تک جلدی جلدی میں ایک اچھا سا نمبر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد پھر کچھ پطرس پر چھاپیں گے۔ اس میں آپ کی اور تاج صاحب کی شرکت ضروری ہے۔ تاج صاحب قبلہ ادب سے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ (میرا مطلب ہے تخلیقی ادب سے، یوں تو وہ بہت کچھ کرتے رہتے ہیں) انھیں پھر سے اس وادی میں قدم رکھنے کے لیے مجبور کر دیں۔

تاج صاحب کی خدمت میں آداب! — پطرس پر ان سے مجھے ایک مضمون ضرور لکھوا دیں۔ یہی درخواست ان سے پہلے بھی کر چکا ہوں۔ جواب میں وہ چپ ہیں۔ اگر آپ کی سفارش بھی میرے اصرار کے ساتھ شامل ہو گئی تو پھر انھیں بھاگنے کا راستہ نہ ملے گا۔

والسلام

۱۷/۲/۵۹ محمد طفیل

نعیم صدیقی

برادر محترم، سلام مسنون!

آپ کا بڑا دلچسپ خط ملا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اس پہ دو دو باتیں ہوں۔ مگر اس ضمن میں دو باتیں مانع بھی ہیں۔ ایک آپ کا ادب

(یعنی لٹریچر نہیں) دوسرے آپ کا علم و فضل!

آپ کا ادب اس لیے کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی ذات کو اُس قوم کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ جو آپ کے خط ہی کی طرح دلچسپ ہے۔ اس سے نعرے لگوا لیجیے اسے مذہب کے نام پر کٹوا دیجیے۔ اُسے ملک کے نام پر ننگا کر دیجیے۔ یہ قوم اُف نہ کرے گی۔

جب آپ اس قوم سے یہ کہیں گے کہ مذہب یہ کہتا ہے۔ بھائی بھائی کا گلا نہ کاٹیے' ایک دوسرے کے کام آئیے۔ اخلاق اور رواداری کا مظاہرہ کیجئے تو یہ قوم حیران ہو کر منہ تکے گی۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ آخر کیوں؟

یہ بات تو ہُوئی قوم کی۔ اب "رہنماؤں" کی بات سنیئے گا!

ایک رات میرے گھر کے سامنے 'سیرت النبیؐ' پر جلسہ تھا۔ یاروں نے جلسے کے لیے وقت وہ چُنا، جو شریف آدمیوں کے سونے کا وقت ہوتا ہے۔ غیر شریف ہوتے ہوئے بھی مجھے اس رات بھی نیند آ رہی تھی۔ چونکہ جلسہ سیرت پر تھا۔ جی چاہا ثواب کماؤں! اِدھر میں کُرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اُدھر مولوی صاحب مائیکروفون پر ڈٹ گئے۔ انہوں نے وہ اُوٹ پٹانگ باتیں کیں۔ وہ اُوٹ پٹانگ باتیں کیں کہ حد ہو گئی ——— خدا خدا کر کے انہوں نے ہماری جان چھوڑی۔ اس کے بعد ایک اور مولوی صاحب چمٹ گئے۔ نہ وہ پبلک کو چھوڑتے تھے اور نہ ہی کوئی ڈھنگ کی بات کرتے تھے۔ بس غلط سلط قسم کے عقیدت کے فوارے چھوڑے چلے جا رہے تھے۔ یوں میں رسولؐ کے نام پر ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ آپ کا قبیلہ جس کے بارے میں جو چاہے کہے۔ ہم لوگ گوارا کریں گے۔ مگر رسول صلعم کے بارے میں ضعیف الاعتقادی برداشت نہیں ہوتی۔ یہ مجھ جیسا کافر کہہ رہا ہے۔

اللہ کا شکر کہ اُن میں ایک صاحب' کام کی بھی باتیں کرنے والے نکلے۔ نہ تو انہوں نے نعرہ وصول کرنے والی کوئی بات کہی۔ نہ ضعیف روایتوں پر اُترے۔ بے شک لہجے میں طنطنہ نہ تھا مگر باتیں منطقی تھیں۔ اوروں کی طرح وہ اسٹیج پر اُچھلنے کودنے کے فن سے بھی ناواقف تھے۔ مگر وہ مجھے بھائے۔ اس لیے کہ اُن کی باتوں میں بناوٹ نہ تھی۔ انداز رواں، لہجہ دھیما اور نوک پلک سے درست! ——— البتہ یہ سُن کر ضرور افسوس ہُوا کہ اُن کا نام نعیم صدیقی تھا۔ افسوس اس لیے کہ وہ اتنے قابلوں میں پھنسے ہُوئے تھے۔ ایسے ہی "قابلوں" کے بارے میں عدمؔ نے کہہ رکھا ہے ؎

یوں تو اس مردِ معزز میں کوئی عیب نہیں
مولوی فتنۂ دوراں نظر آتا ہے مجھے

خط غلط رُخ پہ چلا جا رہا ہے۔ اور آپ کی باتوں کا جواب رہ جا رہا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ "یہ دور مردِ آہن قسم کے لوگوں کا ہے۔" پھر آپ نے یہ بھی لکھا کہ "خواتین کو آہنی شخصیت بننے کے سلسلے میں زیادہ آسانیاں ہیں۔"

ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے کہ اب آپ خواتین کی صف میں داخل ہو سکیں۔ اس لئے ہو سکے تو مردِ آہن ہی بنیئے۔ میرا ارادہ تو "مردِ موم" بننے کا ہے۔

آپ نے مجھے قلمی جادوگر کا خطاب دیا۔ میں چُپ رہا۔ میں نے آپ کو مردِ معقول کہا تو آپ بول پڑے۔ یہ دوستی والی باتیں نہیں

ہیں صاحب!

کیا میں نے یہ غلط کہا تھا کہ "آپ اسلام کا جھنڈا تھامے ہُوئے ہیں" میرا خیال ہے کہ ذہناً تو آپ کو میرے اس فقرے سے اختلاف نہ ہوگا۔ مگر انکساراً ہیں کس قابل ہوں۔ کہہ رہے ہیں۔

میں نے احباب سے اپنی تحریر کے سلسلے میں شاذ ہی معذرت چاہی ہو۔ مگر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ جس اُونچی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اس کی وجہ سے ادب لحاظ کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں کیا کروں۔ میں خود تو اتنا بُرا نہیں، مگر میری تحریر بُری ہے۔ مؤدب نہیں۔

خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ معذرت قبول ہوگی؟

۳۰/۱۱/۶۷ آپ کا محمد طفیل

بندہ نواز!

آپ کا تفصیلی خط ملا۔ سوچا ایک منٹ بھی ضائع نہ کروں۔ فوراً جواب عرض کروں اور یہ بتاؤں کہ ابھی گاڑی نہیں چھوٹی۔ نیت بخیر ہے تو آپ اب بھی اس دینی گاڑی میں سوار ہو سکتے ہیں۔

آپ کیوں پہلو تہی کر رہے ہیں؟ آپ کیوں دُور بھاگ رہے ہیں؟ میں آپ سے وہ بات بھی کہے دیتا ہوں۔ جو نہیں کہنا چاہتا تھا۔

مجھے اپنے ۲۶ سالہ دورِ ادارت میں اتنی مشکلیں کبھی پیش نہیں آئیں جتنی کہ اس نمبر کے سلسلے میں، میں (جو کہ گنہگار ہوں) جس کام کو سعادت سمجھتا ہوں۔ وہ کام دین کا نام لینے والوں (جو کہ اللہ والے ہیں) کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ اُن کا کلیجہ بھی منہ کو نہیں آتا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ مضمون (سیرۃ پر مضمون) نہ لکھ سکیں گے۔ اُن میں مولانا بھی ہیں اور دوسرے عالم بھی، آخر اس سے اہم کام اور کیا ہے؟ اس کا جواب میں حشر کے دن پوچھوں گا چلو یہی سہی!

۱۵/۲/۷۷ محمد طفیل

محبِ گرامی، سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا۔ پانی پانی ہوگیا۔ دوسروں کے نام کا گزارش نامہ آپ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کے نام کا عریضہ کسی اور کے پاس، آپ بھی حیران ہوئے وہ بھی حیران ہوگا۔ اللہ کا شکر کہ اس غلطی سے آپ کو میرا حال معلوم ہوگیا۔ اللہ کا شکر یہ بھی کہ تحریری طور پر صنف کا ادل بدل نہ ہوا۔

آپ کی طرف سے جو منظومات مقدر میں ہوئیں وہ خوب، عام خاص نمبر میں سامنے آئیں گی۔ اگر میں نے رسید نہیں بھیجی تو وہ میری نالائقی، آپ کا کرم اپنی جگہ!

قرآن نمبر کے سلسلے میں آپ میری مدد کریں گے۔ احباب بھی کریں گے۔ وہ سب میرے علم میں تھا اور ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ کام ہے۔ جو آپ کا اپنا ہے۔ اپنا پسندیدہ! بندہ تو صرف اپنے گناہ بخشوانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ مگر وہ بہت کثیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خوف زدہ ہوں! موت سے نہیں، اعمال سے!

مَیں خود حاضر ہو کر، کچھ آپ سے پوچھوں گا۔ کچھ آپ کو بتاؤں گا۔ یوں یہ کام تکمیل پذیر ہوگا۔ یہ رسولؐ نمبر سے بڑا امتحان ہے۔ جس سے حیران اور پریشان ہوں مگر قادرِ مطلق نگہبان ہو تو مشکلیں آسان ہوں گی۔

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔ والسلام

۱۰/۳/۸۶ محمد طفیل

آل احمد سرور

قبلہ! آپ کی دوستی ہمیں راس نہیں آئی۔ میں بڑا اینٹھتا ہوں کہ میرے دوست بڑے عالم ہیں۔ بڑے فاضل ہیں۔ مگر ان کی علمیت اور ”فاضلیت“ کا مجھے کیا فائدہ؟ اس سے بہتر تھا کہ آپ کے پایہ کا عالم فاضل میرا دشمن ہی ہوتا۔ تاکہ وہ میرے خلاف لکھ لکھ کے میری اہمیت کو بڑھاتا رہتا۔ جس طرح رسول اللہؐ نے یہ دعا مانگی تھی کہ اے اللہ! عمرؓ یا ابوجہل میں سے کسی ایک کو میرا بنا دے۔ اسی طرح میں آج اللہ کی بارگاہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ آل احمد سرور یا رشید احمد صدیقی میں سے کسی ایک کو میرا قلمی رفیق بنا دے۔ تاکہ میں ادبی دنیا کو فتح کر ڈالوں۔

نہ جانے آپ کی مصروفیت کا عالم کیا ہے؟ میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کہوں کہ آپ کسی نہ کسی طرح اتنے بیکار ہو جائیں کہ بیٹھے میرے ہی لیے مضمون لکھتے رہیں مگر یہ بھی کیا غضب ہے کہ آپ میرے لیے کچھ بھی نہ لکھیں۔ آپ نے ایک نہیں بیسیوں وعدے کیے کہ مضمون لکھوں گا، مضمون لکھ دوں گا۔ آخری وعدہ طنز و مزاح پر لکھنے کا تھا۔ وہ غریب بھی آپ کی سرپرستی کے بغیر عالمِ وجود میں آگیا۔ ہائے کیا کیا رونا روؤں۔ یقین جانئے آپ کی بے مہریوں سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اس لیے قلم کو روکتا ہوں۔ مبادا یہ گستاخی پہ اتر آئے۔ گستاخی بھی ان کی شان میں جن کا وجود اتنی بے التفاتیوں کے باوجود مجھے بڑا عزیز ہے۔ بڑا ہی عزیز ہے۔

معلوم ہوتا ہے طنز و مزاح نمبر آپ کو پسند نہیں آیا ورنہ ایک خط تو اس کے بارے میں آ ہی جاتا اور جھوٹوں یہ بھی وعدہ ہو جاتا — مضمون لکھ رہا ہوں۔ جلد بھیج دوں گا — اب بے شک مضمون نہ بھیجا کریں۔ میں کچھ ایسا سوچ رہا ہوں کہ میں خود مضمون آپ لوگوں کے نام لکھا کروں۔

۱۸/۲/۵۹ محمد طفیل

برادر محترم، سلام شوق!

۱۔ بھوت!

۲۔ لاہور، لکھنو اور حیدر آباد شہر ہیں۔ باقی سب دیہات!

۳۔ مجاز، (کافی ہاؤس)
۴۔ معصوم سا ——— مگر ایک شعلہ! (شاید ما بدولت کے متعلق کہا تھا۔)
۵۔ لاہور کی علمی و ادبی فضا اور حیثیت
۶۔ نقوش

یہ وہ اشارے تھے۔ جن پر آپ کی لاہور میں ایک تقریر ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں ضبطِ تحریر میں بھی آجاتیں تاکہ یادگار رہتیں۔ مگر آپ نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ کوئی اچھا کام کریں گے نہیں! ۔ اگر کریں گے تو اس کا تعلق نقوش اور مدیر نقوش سے نہ ہوگا میں نے سوچ لیا ہے کہ اب آپ کا "علاج بالمثل" کرنا چاہیے۔ یہ آخری درخواست نہیں، بلکہ آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد علاج شروع کر دیا جائیگا ہم "دشمن" پر وار بے خبری میں نہیں کرتے بلکہ للکار کر! سو جناب تیار؟ ویسے بھابی جان کی خدمت میں آداب کہہ دیجئے!

۹/۴/۷۸ آپ کا محمد طفیل

حکیم یوسف حسن

نیرنگِ خیال کے ذریعہ اُردو ادب کو زندہ رکھنے کا چلن سکھلایا۔ اپنی ذات سے زیادہ ادب سے عشق رکھا۔ یوں پچاس برس تک اپنے عشق کو پروان چڑھایا۔
بے شک کبھی شعلہ جوالا تھے۔ ان دنوں طبیعت میں حد درجہ عاجزی ہے اور انسانی خوبیاں تمام موجود، ایک باغ و بہار شخصیت!

برادرِ محترم، سلام مسنون!

عید کی دو چھٹیاں تھیں۔ آج دفتر پہنچا۔ آپ کے محبت نامے کو منتظر پایا۔

میں آج جب گھر سے دفتر آ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ پہنچتے ہی پہلے اپنے بڑے بھائی کو خط لکھوں گا اس کے بعد کوئی اور کام کروں گا۔ یہ بھی عرض کرنے کا ارادہ تھا کہ آپ کو نیا سال اور عید مبارک ہو! ——— میرے دل کی دل ہی میں گئی۔ آپ پھر بازی لے گئے۔

جہاں تک پرچے پر خرچ کا سوال ہے۔ وہ تو زیادہ ہونا ہی تھا۔ خرچ کرنے میں کسر ہی کون سی چھوڑی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اتنی محنت اور اتنا روپیہ صرف کرنے پر یاروں کا ردِ عمل کیا ہے؟ معیار کے بارے میں، گٹ اپ کے بارے میں؟ کھلبلی مچی کہ نہیں؟

اگر صرف مخالفت ہو رہی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اگر صرف واہ وا ہو رہی ہے تو لوگ مسکے بازی سے کام لے رہے ہیں۔ بہر حال آپ کو واہ واسے خوش اور تھو تھو سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ فرہنگِ حقائق میں

آپ کا نام بڑا اُجلا لکھا ہُوا ہے۔

ادبی صحافت میں جتنے بھی سنگ میل گڑے ہیں۔ وہ زیادہ تر آپ ہی نے گاڑے ہوئے ہیں۔ یہ کارنامہ آپ کا، وہ کارنامہ آپ کا! میں تو جب بھی ان راستوں سے گزرتا ہُوں۔ اُن نشانوں کو سلام کرتا ہُوا گزرتا ہوں۔ والسلام

آپ کا محمد طفیل ۴/۱/۶۸

اختر انصاری

برادرم اختر صاحب، سلام مسنون!

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تخلیقات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہیے تھا۔ یہ شکایت نہ صرف سو فی صد حق بجانب ہے بلکہ حساب کی رُو سے اگر دو سو فی صد بھی درست ہو سکتا تو بھی ٹھیک تھا، تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یار کیا بتاؤں، یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگ گئی ہے اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا لاکھوں کا ادارہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ نہ کوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی پرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آتا ہے۔ کیا کروں خود بڑا پریشان ہوں کئی بار اپنے آپ پہ اتنا غصہ آتا ہے (ادارہ کی حالت پر) جی چاہتا ہے یا تو خودکشی کر لوں یا نقوش کو بند کر دوں "تاکہ میں قاعدہ کا آدمی بن جاؤں اور وہ سب کچھ کروں جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ سُود مند ہو —— یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ، میرے عزائم پر برف بن کر گر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح، اس پہ داری نثاری ہو جاتا ہوں۔ بہک جاتا ہوں، ہار جاتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سارے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجموعی یہ سودا بڑا مہنگا پڑ رہا ہے۔

میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے، وہ سب کچھ آپ سے کہہ دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی کتاب کی جلد تر اشاعت سے مجبور رہا۔ اب جلد ہی آ جائے گی۔ اس لیے کہ اس کا کچھ کام ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کا ہر ہر لفظ میری پوری توجہ سے چھپے۔ امید تو بہت ہے کہ کتاب دکھا کر اتنی تاخیر کا حق دار بن جاؤں گا۔

تازہ پرچے کے لیے —— اپنی منتخب اور نئی چیزیں بھیجیں۔ آٹھ دس، سب چھاپوں گا مگر جلدی، آٹھ دس دن تک۔

محمد طفیل ۱۲/۳/۵۹

کلیم الدین احمد

برادر مکرم، سلام مسنون!

میرا ارادہ تھا کہ میں انگریزی میں آپ کو خط لکھوں مصیبت یہ ہے کہ میں انگریزی اتنی نہیں جانتا، جتنی آپ اب سوال یہ

ہے کہ کیا میں اُردو اتنی جانتا ہوں جتنی آپ۔ اگر اس کا بھی جواب نفی میں ہو تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ میں آپ کو خط ہی نہ لکھوں۔

سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو پنجابی میں خط لکھوں۔ یہ یقیناً آپ مجھ سے زیادہ نہ جانتے ہوں گے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں رُکا۔ پنجابی القاب کا انتخاب کیا۔ ایک آدھ فقرہ سوچا مگر مضمون آگے نہ بڑھا۔ مجبوراً اُردو ہی میں آپ سے باتیں کرتا ہوں۔

طنز و مزاح نمبر آپ کو بھجوایا تھا۔ ملا ہوگا۔ اس میں آپ کے مضمون کے بارے میں یہ شرارتاً لکھ دیا ہے کہ ”آپ ہیں نہ مانوں میں مانوں قسم کی تنقید کے امام ہیں“ —— آپ کی تنقید میں جتنی بے باکی اور ”بے رحمی“ ہے اس نے مجھ سے یہ فقرہ کہلوایا۔ اگر یہ نہ لکھتا تو پتا ہے کیا ہوتا۔ سارے ہی مزاح نگار مجھ سے ناراض ہو جاتے۔ ہر ایک لٹھ لیے ہُوئے دوڑتا۔ میں نے سیاست سے کام لیا۔ آپ کو ضرور ہلکا سا چرکہ دیا۔ مگر اوروں کو تو راضی رکھا۔

آپ کو کیا معلوم، کہ اس جانِ غریب پہ کیا کیا بیتی ہے۔ آپ کا ایک مضمون احتشام حسین کے تنقیدانہ شعور پہ چھاپا تھا۔ احتشام صاحب ناراض ہُوئے اور اس کے ساتھ ان کے دوست، جب تک ادب میں یہ ٹولہ بازی رہے گی۔ ادب اپنی منزل کا سراغ نہ پائے گا —— ایک درخواست آپ سے یہی ہے کہ لکھتے وقت دماغ سے زیادہ قلم پہ قابو رکھیں۔ ورنہ ایک دن وہ آئے گا کہ آپ اور میں ادبی دنیا میں، اچھوت بن کر رہ جائیں گے والسلام

محمد طفیل ۲۰/۲/۵۹

اختر الایمان

برادرم

اگر کوئی نظم ذہن کے دریچے سے جھانک رہی ہو تو اس کا تعاقب کیجیے، گرفتار کیجیے، پھر اسے میرے حوالے کر دیجیے تاکہ میں اسے مشتہر کر دوں۔ آپ کا نام ہو جائے گا۔ میری کارگزاری میں اچھے کلمات لکھے جائیں گے۔ نقصان دونوں کا نہیں۔ فائدہ دونوں کا ہے۔

آپ نے مجھے کئی بار کہا کہ تاریک سیارہ پر ریویو کروں۔ مجھے انکار تھا نہ ہے مگر مجھے وہ کتاب تو بغرضِ تبصرہ ملے۔ اگر میں نے کتاب خرید کر تبصرہ کر دیا تو ممکن ہے اس کے پبلشر کو شکوہ گزرے۔ لہٰذا میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔

آپ کا جب بھی کوئی خط یا نظم ملتی ہے تو یوں جان پڑتا ہے جیسے اسے آپ نے دو سو صفحے فی گھنٹہ کی رفتار سے لکھا ہو۔ بعض اوقات الفاظ روٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پڑھوانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ہو سکے تو اپنی رفتار میں کمی کر دیں تاکہ میں بھی آپ کے ذہن کا ساتھ لفظ بہ لفظ دے سکوں۔

خدا کرے آپ کے معاشی حالات اب کچھ بہتر ہوں۔ بظاہر تو نہیں ہوتے نظر آتے۔ اس لیے کہ آپ رہتے بمبئی میں ہیں، فکری اڑان رکھتے ہیں عرشِ معلیٰ تک۔ جب تک آپ عرش سے اُتر کر بمبئی تک نہیں آئیں گے، معاشی حالات کیسے سدھریں گے۔

بہر حال میں آپ کے کرم کا منتظر ہوں۔

محمد طفیل
۱۰/۳/۵۹

روش صدیقی

برادرم، سلام مسنون!

آپ ایسے مختصر آدمی کو، مختصر خط لکھنا چاہیے۔ مگر میں نے تو طویل طویل خط بھی لکھ کے دیکھ لیا۔ آپ جب تک سامنے ہوتے ہیں، خلوص کے دریا بہا دیتے ہیں اور اس غلط فہمی میں ڈال دیتے ہیں کہ روش صاحب تو بس میرے ہی ہیں جب آنکھ اوجھل ہوئے تو پھر واقف ہی نہیں بنتے۔ اللہ اللہ یہ بھی کیا ادا ٹھہری شاعری چونکہ غلو ہی غلو کا نام ہے۔ اس لیے میرے نزدیک آپ بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان معنوں میں، مَیں نے اتنے پائے کا شاعر اور کوئی نہیں دیکھا۔

سنا ہے کہ آپ ریڈیو پہ بڑے ممتاز عہدہ پر ہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ پہلے آپ شعروں کو لے کر جو شہر بہ شہر پھرتے تھے، اس سے تو جان چھوٹی۔ مشاعروں کا آج کل کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ اچھے شاعر کی پروا کیے بغیر ہوٹنگ کی مشق جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے خود کئی اچھے شاعروں کے پاؤں تلے سے ڈائس نکلتے دیکھی ہے۔

یہ بھی سنا ہے کہ آپ ہر ہفتہ کی شام کو، دلی سے مراد آباد چلے جاتے ہیں۔ باقاعدگی سے جاتے ہیں۔ فرض کا احساس ہو تو یوں ہو۔ بچوں کو بھی دیکھا، بیوی کو بھی ملے۔ پھر صبح کو اُجلے ہو کر دفتر — سفر جس سے ساری دنیا عاجز ہے اس سے آپ عاجز نہیں۔

دل نہیں چاہتا کہ آپ کو بار بار یاد کیا جائے۔ مگر آپ کی باتوں کا جادو کچھ ایسا ہے کہ انسان غلطی کر ہی بیٹھتا ہے۔

اگر غزل سے توبہ نہ کی ہو تو ایک غزل مجھے بھی بھیج دیجیے گا۔ شکر گزار ہوں گا۔

محمد طفیل
۱۰/۳/۵۹

ابن انشا

برادرم، سلام مسنون!

میں نے نو من تیل کا انتظام کر لیا ہے۔ اب رادھا سے کہیے کہ وہ ناچے، میرا مطلب یہ ہے کہ میں اب ایسا پرچہ پیش کر رہا ہوں جس میں آپ کی نظم، غزل آ سکتی ہے سپاس پر اس کے بعد چھاپیں گے۔

میں نے خاص نمبروں کا اہتمام بامر مجبوری رکھا ہے۔ ورنہ دل نہیں چاہتا کہ عمر کے اس حصہ کو ان "لغویات" میں صرف کر دوں۔

اصل میں یہ کام ان لوگوں کے ہیں، جو لب گور بیٹھے ہوں۔ عزیز و اقارب، موت کی دعائیں مانگ رہے ہوں۔ گردن ہل رہی ہو، بینائی جا رہی ہو۔ اُٹھنے بیٹھنے سے عاجز ہوں۔ غرض جو کوئی بھی کام نہ کر سکتے ہوں۔ وہ بیٹھے یوں گورکنی کرتے رہیں — بیشک حقہ بھی پیتے رہیں،

کھانستے بھی رہیں ہمیں کیا!

ہائے ہائے! یہ کیفیتیں اپنے اوپر طاری کر کے کام کیے جا رہا ہوں۔ یہ سب کچھ لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا بھی زندگی سے اعتماد اُٹھ چکا ہے۔ سوچتا ہوں موت اب آئی کہ اب آئی — حالانکہ میرے یہ دن وہ سب کچھ کرنے کے تھے جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ چپ ہوتا ہوں تاکہ کسی اور کو بھی یاد کر لوں

محمد طفیل

۹/۳/۵۹

ابوالخیر مودودی

جن لوگوں نے مجھے زندگی میں مرعوب کیا۔ اُن میں مولانا کی ذات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ گفتگو ایسی کرتے تھے۔ جیسے آزاد کی نثر، اُن کا علم اتنا تھا جتنا کہ دہلی کے مولانا عبدالسلام نیازی کا، غرض اتنا علم کہ اتھاہ نہ ملے۔ درویش وہ بھی تھے۔ درویش یہ بھی تھے۔

اخلاق ایسا کہ فرشتے بھی رشک کریں!

برادرِ مکرم، سلام مسنون!

اس دن ہاتھ لگے بھی تو بات ادھوری رہ گئی۔ علامہ دقت جو آپ کو مل گئے اس لیے بات آگے بڑھتی تو کیسے بڑھتی پھر بات بڑھنے کا موقع بھی کہاں آیا۔ آپ انھیں لیے چل دیئے۔ خدا جانے اب یہ خوش قسمتی آپ کی تھی یا ہماری!

اس دن آپ نے ایک بڑے مزے کی بات کہی کہ "میں نے وہ چیزیں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں جن کا علم (بقول آپ کے) آپ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ دیکھ لیا آپ نے میں نے نقب زنی میں بھی نام پیدا کر لیا۔ باقی کام تو رہے ایک طرف۔ نقب زنی کی بات چلی ہے تو آپ کو ایک بات اور بتا دوں کسی دن آپ کے ہاں بھی ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے اور آپ جتنے بھی علمی خزانوں پر دھرنا مار کر بیٹھے ہیں وہ سب اڑا لاؤں گا۔ اور انھیں چھاپ دوں گا۔ چاہے آپ کچھ کہیں، ماریں تو، پیٹیں تو!

شخصیات نمبر میں اور اس کے بعد جو آپ کے مضمون چھپے تو لوگوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کیا تھا کہ اچھا ابوالخیر صاحب بھی برآمد کر لیے گئے ہیں۔ اب آپ کا خزانہ چھپے گا تو لوگوں کو ایک بار پھر حیرت ہوگی — اچھا خزانہ بھی — قبلہ! میرا تو کام لوگوں کو حیرت میں ڈالنا ہے ہی!

کسی دن آیا تو آپ کے ہاں چائے بھی پئیں گے۔ مگر وہ چائے نہیں جو حلق سے اُترنے بھی نہ پائے اور آدمی پہنچ جائے۔ حیرت ہے کہ آپ وہ زہر کس طرح پیتے ہیں۔

میرا خیال ہے لوگوں کو اب کے پھر حیرت میں ڈالا جائے اور آپ کا ایک آدھ مضمون چھاپا جائے۔ کیا خیال ہے؟

محمد طفیل

۲۰/۲/۵۹

ڈاکٹر وحید قریشی

برادرم، سلام مسنون

کل آپ سے اورینٹل کالج میں ملاقات ہوئی۔ آپ نے کہا۔ میری صحت اچھی نہیں تو میں آپ کے تن و توش کو دیکھ کر ششدر سا گیا۔ معلوم ہوا صحت کی اچھائی ڈیل ڈول پر منحصر نہیں ہوتی۔

نقاد جہاں بیٹھتا ہے تنقید شروع کر دیتا ہے۔ باہر کا تو عالم یہ ہے۔ گھر کا نقشہ کیا ہوتا ہے۔ اس کا حال نقاد کی بیوی ہی جانے۔ ممکن ہے اس سے بھی یوں باتیں ہوتی ہوں۔ سالن میں نمک تو ہے مگر مرچ نہیں۔ کپڑے دھوئے تو ہیں مگر سفید براق نہیں۔ بچے کو کوٹ تو پہنا دیا ہے، مگر اس کی ناک بہ رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہاں تو آپ نے کہا تھا کہ اودھ پنچ کے آخری دور کو میں نے زیادہ اجاگر نہیں کیا ————

———— قصہ یہ ہے کہ اودھ پنچ کا اہم دور ابتدائی دور ہی تھا۔ بعد کا دور بس دور ضرور تھا مگر اس کی وہ بات نہ تھی۔ دوسرے پھر اس بات کا بھی خیال تھا کہ زیادہ صفحات نہ بڑھیں۔ اگر بدقسمتی سے میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی تو سو صفحے اور بڑھ جاتے اس صورت میں طنز و مزاح نمبر نہ ہوتا، اودھ پنچ نمبر ہو جاتا۔ پہلے ہی ایک دو صاحب کہہ چکے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اودھ پنچ خولیا ہو گیا تھا"۔ —— یوں سوچیں۔ ایک آدمی کے کام کرنے کا ڈھنگ اور ہوگا، دوسرے کا اور۔ کامیابی ایسے شخص کی ہے جو زیادہ سے زیادہ ذہنوں کو ساتھ لے کے چلے۔

اصل میں بات تو میں آپ سے اور کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ میر حسن کی غزل والا مضمون بھیج دیجیے۔ مہینے گذر گئے۔ مگر وعدہ، وعدہ ہی رہا۔ میں جو چاہتا ہوں۔ وہ آپ لوگ نہیں چاہتے۔ بس یہی ساری گڑبڑ ہے جو پرچہ جلد جلد نہیں آتا۔

یار، طنز و مزاح نمبر پہ کھل کے کہو اور پھر مجھ سے بھی سنو۔ تُلا بیٹھا ہوں۔

محمد طفیل ۲۰/۲/۵۹

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

برادرم، سلام مسنون

آپ کے مضمون کی رسید اب بھیج رہا ہوں۔ جب پرچہ چھپ چکا اور آپ اپنا چھپا ہوا مضمون بھی دیکھ چکے۔ جواب میں تاخیر یوں ہوئی کہ جب آپ کا مضمون آیا تو پرچے کی اشاعت میں صرف ایک آنچ کی کسر باقی تھی۔ باقی سب کچھ تیار تھا اس وقت آپ کے مضمون نے بڑے شش و پنج میں ڈالا۔ موضوع بڑا اہم تھا۔ چھوڑا نہ جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس وقت کے سب سے پہلے مضمون کو خارج کیا اور آپ کا مضمون لایا۔ میرے نزدیک آپ کے مضمون کی یہ قیمت ٹھہری ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ایک تو وہ مضمون ہی اہم موضوع پر تھا۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ مجھے اپنے دوستوں کی ہر چیز بھلی

معلوم ہوتی ہے۔ دوستوں کے سلسلے میں یہ میری کمزوری ہے جس کا آج آپ سے ذکر کر دیا۔ کسی اور سے نہ کہیے رسوائی ہوگی ج کہ میں کبھی اس پر ایمان رکھنا چاہتا ہوں کہ ادب کے معاملے میں دوستی ووستی کوئی چیز نہیں —— مگر لغزشیں تو ہر انسان کے میں لکھ دی گئی ہیں۔

آج کل امرودوں کا موسم ہے۔ الٰہ آباد یاد آتا ہے۔ آپ یاد آتے ہیں۔ مذاق اب کم یاد آتے ہیں۔ یا تو میں گھٹیا آد ہوں یا وہ بڑھیا کوالٹی کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل ذرا کھنچ سا گیا ہے۔ مگر اس ظالم میں جو ایک بات ہے۔ شاعری کی بھین دا وہ بہت یاد دلاتی ہے۔

۲۰/۲/۵۹ محمد طفیل

ڈاکٹر شوکت سبزواری

محترم، سلام مسنون!

آپ نے لکھا ہے کہ مضمون ناپسند ہو تو واپس بھیج دیجیے۔ اب بتائیے اسے کس منہ سے واپس بھیجوں۔ آپ نے مجھ ایسے لڑکوں کو ہزار بار پڑھایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے حکم کی تعمیل، گستاخی کی حد تک جا پہنچے گی —— مگر اس سلسلے میں میرا خ یہ بھی ہے کہ آپ کا اس سے اچھا مضمون اس پرچے میں آ گیا ہے۔ اس لیے ذرا ہمت سے کام لوں تو آپ اتنے خفا بھی نہ ہوں گ

اچھا تو صاحب! آپ کا یہ مضمون واپس بھیجے دیتا ہوں۔ آج تو ڈاک کا وقت نکل گیا۔ کل اور پرسوں دو چھٹیاں ہیں؛ اترسوں یہ بات رہی۔ سو وہ بھی اس وعدہ پر کہ آپ جلد ہی اس کے بدلے کا مضمون بھیجیں گے اور یہ عذر نہ کریں گے، فرصت نہ ملی۔

ایک آدھ بار بنگال آنے کا ارادہ کیا مگر وہ ارادہ بس ارادہ ہی کی حد تک رہا۔ وجہ کچھ یہ بھی ہے وہاں کے جادوگروں سے ڈر لگتا ہے —— کیا وہ واقعی حسین جگہ ہے؟ کیا واقعی وہاں کے لوگ —— اوہو، یہ راز کی بات پوچھی بھی، تو ایک زمانہ معصومیت کی حد ہو گئی۔

طنز و مزاح نمبر پہ آپ کا، آپ کے احباب کا اور اہل (آدھے) بنگال کا کیا فیصلہ ہے؟ بتا دیجیے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہے؛ میں کبھی ادھر آؤں گا اور آپ کی کلاس میں بیٹھ کر کچھ پڑھوں گا۔ والسلام

۲۱/۲/۵۹ محمد طفیل

شیخ محمد اکرام

محترم، سلام مسنون

جب آپ لاہور میں ایڈیشنل چیف سیکرٹری ہو کر آئے، تو خیال تھا، ملیں گے اور احباب بھی اترائیں گے کہ اب تو گورنمنٹ ہی اپنی ہے۔ مگر آپ نے مجھے اس کا موقع نہ دیا اور جلدی سے کراچی چلے گئے۔ ہماری مل بیٹھنے والی ساری اسکیم غارت ہو گئی۔

خیر یہ بات تو یونہی لکھ دی ہے مگر ہوتا یہی ہے کہ کوئی ملنے والا لاہور تبدیل ہو کر آتا ہے تو میں اخبار میں ان کا نام پڑھتے

ہی پروگرام بناتا ہوں کہ ان سے ملوں گا اور جلد ملوں گا، یہ پروگرام مہینوں اور بعض اوقات برسوں بنتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب لاہور سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور پروگرام بدستور چلتا رہتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ جو صاحب دنیاوی اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں۔ ان سے ڈر لگا رہتا ہے۔ سوچتا رہتا ہوں بڑے افسر ہیں۔ ملوں گا تو نہ جانے ان کا موڈ کیا ہو۔ اچھی طرح نہ ملے تو دل کی محفل میں سے ایک کرسی خالی ہو جائے گی۔

دیکھ لیجیے۔ کافی عرصہ سے آپ کا کوئی مضمون نقوش میں نہیں آیا۔ اب تک ایک آدھ چیز آئی ہو تو وہ اتنی کافی نہیں کہ پھر کچھ نہ چھپے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی پھر کرم ہو جائے۔ ایک آدھ چیز، پھر سال ڈیڑھ سال تک صبر کر لوں گا۔

طنز و مزاح نمبر کے بارے میں بھی آپ کی رائے معلوم ہو جائے تو بڑا اچھا ہو۔ دیکھ لیجیے ہم آپ کی محبوب شخصیت غالبؔ تک کو لے آئے ہیں۔ آیندہ ڈرامہ نمبر چھاپنے کا ارادہ ہے۔ سوچتے ہیں کہ ڈرامہ میں بھی کسی طرح غالبؔ کو لپیٹ لپاٹ کے لے آئیں۔ ایک صاحب نے تو مضمون لکھ ہی دیا ہے۔ ”غالبؔ کے خطوط میں اُردو ڈرامے کا عکس“ والسلام

محمد طفیل

۲۱/۲/۵۹

عبدالحمید عدمؔ

برادر محترم، سلام مسنون!

آپ لاہور سے باہر تھے تو چھٹے ساتویں مہینے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اب آپ لاہور میں ہیں تو یہ سعادت بھی میرے مقدر میں نہیں رہی۔ قصہ یہ ہے کہ جن محفلوں میں آپ بیٹھنے والے ہیں۔ میں اُن کا اہل نہیں ہوں۔ اگر زبردستی سے دو گھڑی آن بھی بیٹھوں تو انگلیاں اٹھیں گی۔ یہ کیسا بدذوق ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے دوستوں میں میری بدذوقی کے چرچے عام ہوں۔ لہٰذا بھائی! کبھی کبھی اُدھر کا بھی رُخ کر لیا کریں۔ صرف یہ سمجھ کر، شاید کبھی میں بھی ”راہ راست“ پر آ جاؤں۔

ایک آدھ غزل مجھے نہیں، قارئین نقوش کو دیں۔ تاکہ وہ بھی جھوم جھوم جائیں۔ اپنی قسمت میں تو جھومنا ہے ہی نہیں۔

مجھے آپ کا کچھ پتا نہیں ہے کہ آپ لاہور میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ ورنہ آپ کو ڈھونڈ ہی نکالتا اور آپ کے خلوص کا ایک بار پھر قائل ہو جاتا۔ براہِ کرم میرا یہ خط ملے تو ۳۵۲۵ پر مجھے ٹیلیفون ہی کر لیں۔ یہ نمبر تو آپ کو نہ بھولے گا۔ اس لیے کہ میں نے سنا ہے کہ جہاں ہندسوں کی بات آتی ہے آپ کی صلاحیتیں سبھی کو مرعوب کر لیتی ہیں۔

محمد طفیل

۹/۳/۵۹

حیرت شملوی

محترم، سلام مسنون!

آبِ کوثر میں دھلی ہوئی زبان میں کون غزل کہتا ہے؟

ہر پھر کے نظر آپ پر پڑتی ہے!

اب یہ کیسے کہوں کہ تازہ غزل مجھے جلد بھیجیں۔ بہرحال منتظر ضرور رہوں۔ والسلام

۱۰/۳/۵۹ محمد طفیل

پروفیسر شور (علیگ)

برادرم، سلام مسنون!

اگر لڑکوں کو پڑھانے سے فرصت ملی ہو تو ایک نظم، غزل اُسے بھی پڑھوا دیں، جس کا کام آپ کی طرح اوروں کو نہیں پڑھوانا ہے۔ والسلام

۱۰/۳/۵۹ محمد طفیل

مجید ملک

محترم، سلام مسنون!

آپ بخاری صاحب کو ضرور جانتے ہوں گے۔ وہی بخاری صاحب جنہوں نے پطرس کے مضامین لکھے اور اپنے آخر دنوں میں امریکہ میں تھے۔

ان کی روح کا آپ سے یہ تقاضا ہے کہ اب حقِ دوستی ادا کریں۔ نقوش ان کی یاد میں ایک نمبر چھاپ رہا ہے۔ آپ اس میں ان کی شخصیت پر ایک مضمون لکھیں اور میرے ساتھ مل کر اس نمبر کو اس قابل بنا دیں کہ مرحوم کی بارگاہ میں بہ فخر پیش کر سکیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پطرس مر چکے ہیں۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم لوگوں کو یقین دلا سکیں کہ پطرس ابھی مرا نہیں ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔

۱۔ آپ کے پاس مرحوم کے جتنے خط ہوں وہ بھی دیں۔ مطلب یہ کہ اوّل تا آخر میرے ساتھ قدم بہ قدم چلیں تاکہ حق ادا ہو۔

۲۔ مرحوم کی جو اچھی اچھی تقریریں باہر کے ممالک میں وقتاً فوقتاً ہوئی ہیں۔ وہ سب آپ کے دفتر میں بطور ریکارڈ ہوں گی۔ ان کی مجھے ایک ایک نقل بھجوائیں اگر یہ تقریریں موجود نہ ہوں تو منگوا دیں۔ یہ بھی ضروری چیزیں ہیں۔ جن میں آپ کی مدد و توجہ کی ضرورت ہے اس کے علاوہ مجھے آپ کے مزید مشوروں کی ضرورت ہے۔

۱۲/۳/۵۹ محمد طفیل

آنند نرائن مُلّا

قبلہ، آداب!

برس دو برس میں آپ کا ایک خط آجاتا ہے تو بھی میں خوش ہو لیتا ہوں اتنا خوش کہ اس کی پوری کیفیت کا اظہار میرے بس میں

نہیں اور شاید کسی کے بھی بس میں نہ ہو۔ جو صاحب اپنی بیوی اور بیٹی تک کو خط نہ لکھیں، ضرورت پڑے تو تار دے کر خیریت پوچھیں، وہ اگر مجھے برس دو برس میں خط لکھ ڈالیں تو خوشی کی بات تو ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ کوئی اور میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا تو اب تک کب کی یاری ٹوٹ چکی ہوتی۔ میں ایسی ادا کو اپنے خلوص کی توہین سمجھ کر، کب کا دو قدم پیچھے ہٹ چکا ہوتا۔

میں نے طنز و مزاح نمبر سے پہلے والے شمارہ میں آپ کی ساری ہی چیزیں ایک ساتھ چھاپ دی تھیں، یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس لیے صبر سے کام لوں ـــــ میں نے جو سوچا تھا وہ یہ کہ ایک ایک چیز نکال کر پیش کرتا رہا تو آپ پھر پورے انداز میں اتنے سامنے نہ آئیں گے۔ اس لیے جو کچھ پاس تھا وہ سب داؤ پہ لگا دیا تھا نتیجے میں بازی جیتا ہوں، ہارا نہیں۔ ہر طرف سے خوش آمدید ہوئی ـــــ خدا کرے کہ وہ موقع پھر آئے کہ ہم ایک دوسرے کے گلے ملیں، زبان سے کچھ بھی نہ کہیں اور ایک دوسرے کے دل میں اُتر جائیں۔

جب سے آپ اکبر الہ آبادی بنے ہیں ادھر نہیں آئے (میرا مطلب ہے، جب سے جسٹس بنے ہیں) اللہ کرے پھر کوئی آپ کے ادھر آنے کی صورت بنے۔ یہیں تو آپ کی سرکار ادھر جانے نہیں دیتی۔

ہو سکے تو ایک عدد خط لکھیے کچھ چیزیں بھیجیے ـــــ ایک برس تو ہو گیا ہے آپ کا والا نامہ نہیں آیا۔

محمد طفیل ۱۲/۳/۵۹

فکر تونسوی

محترم، آداب!

آپ کا خط ملا تھا، جو بڑا میٹھا تھا۔ مگر تھا شکایتی ـــــ آپ کی شکایت بالکل بجا ہے اور اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، قصور ہے میرا، مگر میں نے ایسا دانستہ نہیں کیا۔ آپ کی ایک آدھ چیز طنز و مزاح میں ضرور آنا چاہیے تھی۔ اب مجبوری سُنیے:

میں پرچے کو جس انداز میں مرتب کرتا ہوں، وہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ مثلاً سو صفحے ابتدائی چھاپ لیے پھر پچاس صفحے بیچ میں اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق چھوڑ دیئے کہ ان صفحوں میں فلاں فلاں چیزوں کو لانا ہے۔ اس کے بعد آگے چلا دو سو صفحے اور چھاپ ڈالے۔ پھر سو صفحے چھوڑ دیے اور آگے نکل گیا۔ یوں میں آخر تک چلتا ہوں۔

اگر ایسا نہ کروں تو اتنے اتنے بڑے پرچے چھاپنا ناممکن ہو جائے۔ غور کیجیے جو چیز اس صورت میں تکمیل تک پہنچتی ہو اس کے پورے تانے بانے کو ذہن میں رکھنا کہ کوئی چوک نہ ہو، بڑا مشکل کام ہے ـــــ پھر جبکہ راستے میں چار پانچ جگہوں سے بغیر لائن کلیئر کے گاڑی چلتی رہی ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے دوست کہ اس شیرازہ بندی میں آپ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ورنہ میں آپ کو ضرور ساتھ لے کے چلتا۔

اگر میری اس وضاحت کے بعد آپ کا دل صاف ہو گیا ہو تو مجھے اطلاع دے دیجیے گا تاکہ میں عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی ذیل سے نکل جاؤں۔ طنز و مزاح نمبر پر ایک تفصیلی خط لکھو اور مجھے خوب سُناؤ تاکہ جھگڑا اس دنیا میں نمٹ جائے ورنہ مجھے اس زیادتی کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا، جو مجھ سے دانستہ سرزد نہیں ہوئی، مگر ہوئی۔

محمد طفیل ۱۲/۳/۵۹

حفیظ ہوشیارپوری

برادرم، سلام مسنون!

پچھلے دنوں آپ کے بارے میں بُری بُری خبریں آئی تھیں۔ اللہ کرے یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو۔ بھلا ہم ایسی خبریں سننے کے لیے کیسے تیار ہو سکتے ہیں کہ آپ کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔ جس نے شاعری کو توازن بخشا ہو، اس کے بارے میں ایسی خبریں۔

پاکستان میں بڑے بڑے شاعر ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ مگر غزل کا شاعر آپ سے بڑھ کر پاکستان میں کوئی نہیں ہے۔ یہ میرا خیال ہی نہیں، ایمان ہے۔

پچھلے دنوں راشدی صاحب کے ہاں آپ سے ملاقات ہوئی۔ اب راشدی صاحب بھی بیمار ہیں اور آپ بھی۔ ان سے آپ کی خیر خبر پوچھتا ہوں تو جواب نہیں آتا۔ آپ سے ان کی خیریت پوچھتا ہوں تو ویسے کا ویسا بیٹھا رہتا ہوں۔ اب میں پوچھوں تو کس سے پوچھوں

آپ کے بارے میں تو یہ علم ہے کہ آپ خط کا جواب دیا ہی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے آپ کے دوست آپ سے خفا ہیں۔ آپ کے رشتہ دار آپ سے ناراض ہیں مگر جب کوئی مسئلہ اتنی سنجیدہ صورت اختیار کر سکے کہ سبھی منہ کھولے آپ کی خیریت کے طالب ہوں، اس وقت تو ایک کاغذ کے پُرزے پر "خیریت ہے" لکھ کے پوسٹ کر دیا کریں۔

میرا تو خیال یہ ہے اگر واقعی آپ کی طبیعت خراب ہے تو ادھر آ جائیے اور آ کر دیکھیے کہ آجکل پھولوں پر کیسی بہار ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ آپ کی آدھی بیماری تو لاہور کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی ختم ہو جائے گی۔

اپنے ہاتھ سے ایک تازہ غزل تو لکھ کر بھیجیں۔ ایک پرچے کا پھر ڈول ڈالے بیٹھا ہوں۔

محمد طفیل ۱۰/۳/۵۹

ساغر نظامی

برادرم ساغر صاحب، سلام مسنون!

اب کے آپ آئے تو نصف بہتر ساتھ نہ تھیں۔ اس لیے نصف ہی ملاقات ہوئی۔ ان شاء اللہ آئندہ برس پوری ملاقات ہو گی۔ آپ بھی کہتے ہوں گے، کس بد ذوق کے ہاں جا کے ٹھہرا ہوں جو نہ شعر سنتا ہے نہ شعروں پر داد دیتا ہے۔ یہ شکایت اور بھی بڑے بڑے شاعروں کو مجھ سے ہے۔ قصہ یہ ہے کہ میں شعروں کو کاغذ پر پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ شاعر کو پڑھنے کے جو موقعے مجھے ملتے ہیں، اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جو آدمی شاعر کو پڑھ لے، اس کے لیے اس کے شعروں کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

آپ نے ازراہِ محبت خود ہی مجھے انارکلی کے جستہ جستہ حصے سنائے۔ میں لطف اندوز بھی ہوا۔ پھر نیند کا کچھ ایسا غلبہ ہوا کہ شگفتہ کا کوئی بھی حصہ نہ سن سکا۔ جس کی آپ نے مجھ سے بڑے ہی پیار میں شکایت بھی کی۔ مگر میرا تو اندازہ یہ ہے کہ شعروں کو نہ سنو، شاعر کے ذہن

میں گھس کے بیٹھو!

آفریں ہے آپ کی دریافت (ماچس لکھنوی) پر جن سے میں نے شعر نہ سُن کر ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔ نہ جانے انہوں نے دو دن کیسے کاٹے۔ بےچارے کا پیٹ اپھر گیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم لوگ سامان باندھ اسٹیشن کی طرف چلے، اب ان سے ضبط نہ ہُوا۔ انہوں نے راستے ہی میں شعر سنانے شروع کر دیئے۔ دیکھا بھائی! — اگر شاعر شعر سنانا چاہے تو کوئی کیسے بچ سکتا ہے

لطف تو اس وقت آیا، جب کوچوان نے بھی کہا، میرے بھی دو چار شعر سنیئے۔ اچھا تو وہ سب چیزیں بھیجیں جو میں نے کہی تھیں — وہ بھی جلدی!

محمد طفیل ۱۰/۳/۵۹

مجید امجد

برادرم، سلام مسنون!

ہمارے پرچے کو کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی پڑھتے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے، کہ مجید امجد کی نظم تازہ پرچے میں ضرور چھپے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ بھیجیں تو لوگ بھی پڑھیں۔

یہ ادب کی اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ابھی باذوق لوگ موجود ہیں۔ ورنہ آپ کی شاعری دیوانے کا خواب بن کے رہ جاتی۔

آپ کی شاعری کا ایک "بُرا پہلو" بھی ہے — وہ یہ کہ سطحی قسم کے لوگوں کے نزدیک آپ کی شاعری کسی کام کی نہیں۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسے شعر ہوں جس میں غور و فکر کا عمل دخل نہ ہو اور جذباتی سے انداز کے شعروں سے دل کی دھڑکنوں کا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے تو ظاہر ہے کہ آپ ایسے شاعر نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ "بُرا" پہلو تو ہُوا۔

کافی دنوں سے آپ نے لاہور کا رُخ نہیں کیا۔ کیا اہلِ لاہور سے خفا ہو گئے؟ یہ دھڑکا صرف واہمہ نہیں، حقیقت ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں کے ہوٹلوں میں "بڑے بڑے" ادیب اور شاعر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی شاعر آئے اور اس کا کلام سُنا جائے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور پھر آپ کا کلام تو واقعی ان کے ذہن کی حدود سے آگے کی چیز ہے۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ نظم کا منتظر سمجھیے — پطرس پر بعد میں کچھ چھپے گا۔

محمد طفیل ۹/۲/۵۹

فیض احمد فیض

محترم، سلام مسنون!

اب کوئی آپ کو خط لکھے تو کہاں لکھے۔ جیل میں؟ میری یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ایسا شریف آدمی بار بار جیل کیوں جاتا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے جس کا علم ہمیں نہیں ہے؟

آپ کے جیل جانے سے بہت سے نقصان ہوتے ہیں۔ بیوی بچے آپ کی شفقت و محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ احباب آپ کی صورت دیکھنے اور میٹھی میٹھی باتوں کو ترس جاتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آئندہ یہ صدمہ کسی کو بھی نہ سہنا پڑے۔

آپ کی نظر بندی میں ایک خوش کن پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ جیل جا کر شاعر بن جاتے ہیں اور باہر آ کر ایڈیٹر، باپ، شوہر اور دوست! پہلی نظر بندی میں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' اردو ادب کو ملا تھا۔ اب کے بھی پرستار کچھ آس لگائے بیٹھے ہیں۔ خدا کرے اب کے بھی آپ کا جیل جانا، ادب کے لیے مفید ہو۔ ورنہ میری طرح اور بھی کئی لوگوں کو صدمہ ہوگا۔

اگر کوئی ممانعت نہ ہو اور آپ کوئی چیز اشاعت کے لیے بھجوا سکتے ہوں۔ تو مجھے بھی یاد رکھیں: تاکہ جنھیں آپ کی شاعری سے محبت ہے خوش ہو لیں۔ اور کیا عرض کروں۔ زیادہ باتیں کرنا شاید مناسب بھی نہ ہو۔ والسلام

محمد طفیل

۹/۳/۵۹

حفیظ جالندھری

برادرِ مکرم، سلام مسنون!

کاش آپ اتنے اچھے شاعر نہ ہوتے تاکہ مجھے بار بار آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہونا پڑتا اور جواب میں صرف خاموشی نہ پاتا۔ چونکہ مجھے اچھا پرچہ پیش کرنے کی دھن رہتی ہے۔ اس لیے حاضر ہوتا رہتا ہوں۔ چاہے آپ سینے سے لگائیں چاہے جھڑک دیں۔ یہ آپ پر منحصر رہا ہے۔

آپ لاہور آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں میں تو دیدار کو بھی ترس گیا۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ صرف آپ سے "بدلہ" لینے کے لیے کراچی آؤں۔ اسٹیشن سے اتروں۔ آپ کے دفتر کے سامنے پہنچوں اور احتجاجاً واپس آ جاؤں۔ ——————

—————— مگر مجھ سے یہ بھی نہ ہوگا۔ برخوردار جو ہوا۔ خامیاں ہی خامیاں ہیں مجھ میں! اگر مجھے آپ کے آنے کا علم ہو جایا کرے تو میں آپ سے ملوں یا نہ ملوں۔ کسی طرح تو آپ کو دیکھ لیا کروں۔ تاکہ ٹھنڈک پہنچے۔

میرا خیال ہے کہ "پاک سرزمین" اور "ہم لوگ" میں جو آپ کی چیزیں چھپتی ہیں ان کے معیار پر معرکے کی پھبتی کیسی رہے گی اچھا کہ آپ کے نام سے چھاپ دیا کروں۔ یوں آپ پریشان ہو کر مجھے کچھ بھیجا کریں گے۔ ورنہ تو آپ ہاتھ ہی نہیں آتے۔

پہلے کبھی آپ کا خط یوں بھی آ جایا کرتا تھا کہ میرے کسی نمبر پر دو حرف لکھ دیے اب تو ہم اس سے بھی گئے۔ ممکن ہے آپ کو نمبر ہی نہ پسند آیا ہو۔ مگر معلوم تو ہوتا اس میں کون کون سی بات ناپسند ہوئی۔ تاکہ بندۂ ناچیز اس کی اصلاح کر لیتا۔ جنھوں نے زندگی میں کچھ کام کر دکھایا مجھے ان کی باتوں کا افسوس نہیں ہوتا۔ جو صرف زبانی علامہ ہوتے ہیں ان کا منہ نوچ لینے کو جی چاہتا ہے۔

شاید آپ کا خط آ جائے۔ جس میں یہ لکھا ہوگا۔ کوئی کام کی چیز ہوئی تو بھیج دوں گا اور یوں پھر میرا جذبۂ شوق سہم سا جائے گا۔

محمد طفیل

۲۷/۲/۵۹

فراق گورکھپوری

اُردو کے عظیم شاعر، آداب!

میں اس فراق سے مخاطب نہیں ہوں جو کبھی میرا دوست تھا، میرا بھائی تھا، بلکہ اس فراق سے مخاطب ہوں جو آج میرا بدخواہ ہے، میرا دشمن ہے۔ اللہ رے زمانہ کی نیرنگیاں!

آپ کا میرا جھگڑا تو دنیاوی چند سکوں پہ ہوا تھا بلکہ اب اس فقرے کو یوں پڑھیں کہ آپ مجھ سے چند سکوں پہ لڑ مرے تھے —— میں عرض کرتا تھا کہ میں ہندوستان میں آپ کا روپیہ نہیں بھجوا سکتا۔ میری اس مجبوری پہ آپ برہم ہو گئے۔ بعد میں آپ نے پاکستان میں جس جس کو لکھا، میں نے دیر یا سویر ادا کر دیا۔ اب جو آپ کے تھوڑے سے روپے واجب ہیں، وہ بتائیں کس کنوئیں میں ڈال دوں تاکہ آپ کے دل سے یہ خیال نکل جائے کہ میری نیت میں فتور تھا بلکہ یہ کہ آں جناب نے ہی میرے بارے میں جو جلدی میں فیصلہ کر لیا تھا، وہ غلط تھا۔

میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا تھا، اب پھر کیا، قصہ یہ ہے کہ آپ کی یہ بات مجھے بھولتی ہی نہیں ہے۔ کوئی اور میرے بارے میں ایسی اوٹ پٹانگ رائے قائم کر لے تو مجھے مطلق افسوس نہ ہوتا — میرے منہ میں طمانچہ مارا تو ایسے دوست نے جو میرے بہت قریب تھا، میرا تھا۔

اب آپ ریٹائر ہونے والے ہوں گے، وعدے کے مطابق ادھر ضرور آئیے گا۔ تاکہ میں دُو بہ دُو لڑ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لوں۔ میری یوں شکایت سے گھبرا نہ جائیے گا۔ میرے دل میں اب بھی آپ کے لیے بڑی جگہ ہے اور یہ جگہ فراق سے کم اس کے فن سے زیادہ ہے۔ دو ہاتھ اور دو پاؤں والے تو اور بھی بے شمار لوگ ہیں —— مگر ان میں فراق کوئی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں آ کر مجھ ایسا حساس آدمی بھی مار کھا جاتا ہے۔

طنز و مزاح نمبر کے بارے میں کچھ طنزیہ باتیں ہی کہیں —— اور اس کے ساتھ جلد ہی ایک پیاری سی نظم یا ایک غزل بھی —— پھر وہ ٹالنے والی بات نہ کیجیے گا۔ پہلے ہی بھرا بیٹھا ہوں۔

محمد طفیل

۲۴/۲/۵۹

میرے بھائی! —— میرے بڑے بھائی!

آداب! آپ کا محبت بھرا خط ملا۔ اتنی خوشی ہوئی۔ اتنی خوشی ہوئی کہ سرشار ہو گیا۔ اگر دونوں حکومتوں کی پالیسی معتدل ہوتی تو تعلقات یوں ویران نہ ہوتے۔ جیسا کہ ماضی میں ہوئے۔ نہ ملنا جلنا نہ بول چال!

آپ کی اس غزل کے کچھ شعر یا تو ریڈیو پر یا کسی مشاعرے میں سنے تھے۔ یا کہیں پڑھے تھے۔ اب مکمل غزل پا کر اتنا لطف آیا کہ جھوم جھوم اٹھا۔ ایک غزل کے اتنے شعر اور ایسے پیارے!

ایک کرم اور فرمائیں —— یوں تو آپ کی سینکڑوں غزلوں پہ وجد کیا جا سکتا ہے مگر آپ ہمیں اپنی دس نمائندہ غزلیں (بلکہ نمائندہ ترین غزلیں) بھجوائیں۔ بے شک مطبوعہ ہوں مگر ساتھ ہی نثر میں چند جملے (کم از کم دو صفحے، زیادہ سے زیادہ جتنے چاہیں) کہ وہ دس غزلیں آپ کو کیوں پسند ہیں؟ ان کے اسلوب پر بات ہو سکتی ہے۔ اُن کی شانِ نزول پہ بات ہو سکتی ہے۔

میں نقوش میں یہ ایک نیا سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔ (آپ کے بعد فیض صاحب سے لکھواؤں گا) یوں یہ سلسلہ آئندہ جا کر بہت بڑی اہمیت حاصل کرے گا۔ لہٰذا میری زبان میں بسم اللہ کیجئے اور دلی ریڈیو کے مطابق ادگھاٹن کیجئے فقط۔

۲۶/۸/۷۶ آپ کا محمد طفیل

ایم۔آر۔کیانی

محترم، سلام مسنون!

آپ نے میری ناچیز تصنیف "جناب" پر اپنی دلچسپ رائے بھیجی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ آپ کی بھی کوئی کتاب ہاتھ آئے تو میں بھی اپنے تئیں ایک عدد "دلچسپ خط" لکھنے کی سعادت حاصل کر لوں۔ مگر آپ نے مجھے اس کا اب تک دانستہ موقع نہیں دیا۔

میرے پاگل پن کی اور بھی کئی شہادتیں ہیں مگر تازہ واردات مجھ پہ بہ سلسلہ لاہور گزری ہے۔ مجھے اس کی علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا خبط سوار ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے پیارے لاہور کے بارے میں ایک نمبر مرتب کر مروں۔ سو ان شاءاللہ اس نمبر کی تکمیل میں مجھے اپنی دونوں خواہشیں پوری ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ ویسے ایک خواہش تو پوری ہو بھی چکی کہ میں مر پہلے گیا ہوں۔ نمبر بعد میں آ رہا ہے۔

اس وقت کچھ عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ آپ مجھے اپنے شگفتہ اور من موہنے انداز میں اپنے نہیں، میرے لاہور کے بارے میں اپنے تاثرات سے نوازیں۔ مجھے یہ وہم ہے کہ میرا یہ نمبر عرصے تک زندہ رہے گا۔ یوں آپ کی لاہور سے محبت (الفرق اللہ نہ کرے) عرصے تک زندہ رہے گی۔

مجھے آپ کی مصروفیات کا خیال بھی ہے۔ اندازہ بھی، مگر میں بھی کیا کروں میرا دل کہہ رہا ہے کہ اگر اپنے کیانی صاحب نے لاہور پر کچھ نہ لکھا تو بات نہ بنے گی۔ آپ فقط "اپنے" پر نہ تو چونکیں اور نہ ہی میرے نام کوئی نوٹس بھجوائیں۔ میں جسے پسند کرتا ہوں۔ اسے اپنا سمجھتا ہوں۔ والسلام

۱۹/۱۲/۶۱ محمد طفیل

محمود ہاشمی

پیارے بھائی!

آپ برسوں کھوئے رہے۔ اچانک پا کر بے حد خوش ہوا تھا۔ مگر حیرت یہ ہوئی کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مگر آپ وہی نکلے۔ وہی میٹھی میٹھی باتیں، وہی مونالیزا والی مسکراہٹ، وہی اپنی ناسمجھی کا اعلان، وہی بے تکلفی!

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے مجھے کیسا پایا۔ ویسے مجھے تو پہلے بھی اس کا کچھ علم نہ تھا کہ آپ کی میرے بارے میں کیا رائے تھی۔ بہرحال اگر آپ نے مجھے بدلا ہوا پایا ہو تو مجھے خوشی ہو گی۔ میں تو تبدیلی کا قائل ہوں۔ خواہ وہ بُرے رُخ ہی پہ کیوں نہ ہو۔ یکسانیت خواہ وہ پیغمبری ہی کی صورت میں کیوں نہ عطا ہو۔ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ لہٰذا اب اگر آپ کو دیکھوں اور تبدیلیوں کے ساتھ دیکھوں تو مجھے خوشی ہو گی۔

آپ نے بتایا تھا کہ اہلیہ بیمار ہیں ہسپتال میں ہیں۔ اب کیسی ہیں وہ؟ براہِ کرم اُن کے بارے میں ضرور لکھیں۔ ان کی صحت سے آپ کو خوشی ہوگی اور آپ کی خوشی سے مجھے خوشی ہوگی۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میرے دوست کے افسانوں کی کتاب چھپی ہے۔ جسے میں نے آپ کی خدمت میں پیش بھی کیا تھا۔ یقین کہ آپ کو افسانے پسند آئے ہوں گے۔ ویسے اب مجھے آپ کی رائے پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ پھر بھی قطعی طور پر مایوس نہیں ہوں۔

محمد طفیل ۱۷/۱۰/۶۳

جوگندر پال

برادرم، تسلیم

مَیں آپ کو ڈھونڈتا رہا، مگر آپ نہ ملے۔ دلی کے پتے پر رسالے بھیجے۔ جو واپس آئے۔ اب وہ پرچے نہ مانگیے گا۔ اس لیے کہ ختم ہیں۔ مگر کہیں سے انھیں دیکھ ضرور لیں۔ میری شب بیداریوں کی داستان ہیں وہ! — میری مراد "آپ بیتی" نمبر اور ۱۰۱ ویں شمارے سے ہے۔

آپ کا افسانہ ملا۔ پسند آیا۔ دلی شکریہ!

ایک بات آپ سے کہنے کو جی چاہتا ہے۔ دل چاہے مانیں، دل نہ چاہے نہ مانیں۔ ہو سکے تو بلاوجہ کی "ملفوظیت" سے بچنے کی کوشش کریں۔ ضرورتاً تو افسانہ نگار بھی مجبور ہوتا ہے۔ مگر جہاں گزارا ہو سکتا ہو۔ وہاں سے بچ نکلیں۔

سٹریپ ٹیز مجھے پسند تھا۔ اس کا موضوع ہی ایسا تھا کہ آپ وہ سب کچھ لکھنے پر مجبور تھے۔ اس لیے شکایت بھی نہیں کرتا۔ مگر میں کتنی کترا گیا تھا۔ جب وہ ایک پرچے میں چھپ گیا تو میں بھی سرخرو ہوا۔ ورنہ اسے چھاپنا پڑتا۔ اس لیے کہ بہ حیثیت افسانہ اُسے نہ چھاپنے کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔

اس افسانے میں بھی آپ نے ایک دو جگہوں پہ بلا ضرورت (ایک حد سہی) چند الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ چونکہ اب آپ کا فن وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ جہاں افسانوں کے ساتھ لفظوں کی بھی باتیں ہوں گی۔ اس لیے یہ لکھ رہا ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا محمد طفیل ۲۷/۱/۶۵

اختر اورینوی

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے بھیجے ہوئے افسانے ملے۔ ایک آپ کا، ایک میری بہن کا۔ آپ کا شکر گزار ہوں۔ شکیلہ کا نہیں۔ واقعی نہیں۔ آپ کے سلسلے میں ابھی احتیاط لازمی ہے ورنہ کہہ دیتا آپ کا بھی شکر گزار نہیں ہوں۔ یہ کہنے کے لیے ابھی مجھے اور وقت درکار ہے

آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ سونگھا ہے۔ (ہم لوگ سونگھ کر ہی اپنے بہت سے کام نکال لیتے ہیں) ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی خوش ذوق نے بڑا عمدہ پلاؤ پکایا ہو اور وہ پتیلی میں بہت سا رکھتے ہوئے بھی ڈھکا ڈھکا کے دے رہا ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اتنا اچھا افسانہ ہو اور وہ لوگوں کو قسطوں میں ملے۔ لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ مصروفیت آڑے آئی۔ بلکہ "بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے"۔ دیکھیے میں آپ کی خدمت میں کتنا گستاخ ہو چلا ہوں۔ ذرا اٹھائیے تو جوتا!

ایک بات آپ کو بتاؤں۔ آپ کی تصویر ملی۔ بڑی خوب صورت تصویر۔ ایسی تصویریں لوگ اپنے سسرال والوں کو بھیجتے ہی ہیں۔ اس لئے اس نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے چوم لوں اور کہوں' دولہا بھائی کتنے اچھے ہیں۔ کتنے پیارے ہیں۔

آپ کے خیال کے مطابق میں آج سے ڈاکٹر محمد طفیل ہو گیا ہوں — آہاہاہا — آہاہاہا — آپ نے یہ بات اس لیے لکھ دی کہ آپ میرے ہیں۔ جو میرے نہیں ہیں وہ بھلا کیوں کہیں۔ زبان بچھو نہ کاٹ جائے گا ان کے۔ میرا تو خیال ہے میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے یاد کریں گے۔ شاید یہ بھی میری خوش فہمی ہو۔ ویسے میں نے اس دنیا میں اگر بہت کچھ پا لیا ہے۔ احباب کی محبت اور خلوص میرے لیے یہی بہت ہے۔ باقی دنیا جائے بھاڑ میں۔ مجھے زمانے سے بڑی شکایتیں ہیں مگر تذکرہ فضول ہے۔ میں کام کر کر کے مر رہا ہوں تو مروں۔ دنیا کو اس سے کیا۔

جب سے آپ کی کتابیں آئی ہیں میں انھیں دیکھ نہیں سکا۔ نام بھی آپ نے بڑے خوفناک رکھے ہیں "ڈائنامیٹ اور سیمنٹ" اب" لوہے اور کوئلے" پر آپ کا مجموعہ کب آئے گا۔ بہر حال دیکھیے — میں اصل میں صبح سے لکھ رہا ہوں اور کاموں کے ساتھ آپ کے نام میرا اکیسواں خط ہے۔ اس لیے دماغ کام نہیں کر رہا۔ دیکھ لیجیے اس خط میں کتنی بکواس کی ہے۔

۲۶/۹/۵۹ آپ کا محمد طفیل

بانو قدسیہ

بہن، سلام مسنون!

خط ملا۔ مزا آیا۔ بڑا اینٹھا خط ہے سچ!

خان صاحب یہ کہتے ہیں کہ "چائے کا شکریہ ادا کر دیں۔ جلسے ولسے میں شرکت والے مسئلے کو گول کریں"۔

خاں صاحب کا مشورہ بالکل درست ہوگا۔ سینئر ادیب جو ہوئے۔ مگر جہاں تک چائے کا سوال ہے۔ وہ تو میں بہت سے لوگوں کو پلاتا ہوں۔ لہٰذا اس سلسلے میں آپ شکریہ کیوں ادا کریں؟ بہت سے "للّو پنجو" (کتنا پیارا لفظ ہے) میرے اس اخلاقِ حسنہ کا شکار ہیں۔

البتہ میں جلسوں میں عام طور سے شریک نہیں ہوتا اس لیے کہ مجھ ایسے آدمی کو ایسی عیاشی کہاں پچلے گی۔ صاف بات سنئے، دلی تقاضا تھا کہ مجھے اس جلسے میں شریک ہونا چاہیے جس میں اشفاق احمد خان اور بانو قدسیہ کے بارے میں باتیں ہوں پھر دو گھڑیاں مل بیٹھنے کی بھی خواہش تھی۔ میں نے اپنے دل کی بات مان کر، اپنے اوپر مہربانی کی۔ یوں نہ کرتا تو اُس دن بھی، روز کی طرح گھمنی لگ جاتی۔

جی چاہے تو خان صاحب سے میرا سلام کہہ دیں۔ بھلے آدمی ہیں۔ خرابی ایک ہے کہ وہ ادیب کی حیثیت سے سینئر ہو گئے۔

محمد طفیل

۳۱/۸/۶۷

جگر مراد آبادی

برادرِ محترم، سلام مسنون!

آپ کو حکومتِ ہند نے پانچ ہزار کے گراں قدر انعام سے نوازا ہے۔ مگر کیا کریں، آپ اُدھر ہیں، ہم اِدھر۔ آپ سے مٹھائی کھائیں تو کیسے کھائیں۔

پانچ ہزار سکّے تو خیر کوئی چیز نہیں ہیں۔ نہ آپ کے نزدیک روپیہ کی زیادہ اہمیت ہے نہ میرے نزدیک۔ اس میں خوشی کا جو پہلو ہے وہ یہ کہ حکومت نے اچھے ادب کی قدر کی۔ بس حکومت کی اس صحت مندانہ علامت سے جی خوش ہوا ہے۔ کہیں وہ اُردو کے پیچھے ڈنڈا لے کر بھاگ رہی تھی اور کہیں یوں قدر بھی! اگر میں شاعر ہوتا تو یہاں ایک کٹیلا سا شعر لکھتا۔

اب تک جو انعامات کے طریقے چلے آئے ہیں۔ وہ کچھ اس طرح کے ہوتے تھے کہ حکومتِ وقت کے قصیدے گاؤ اور انعام پاؤ۔ آپ لاکھ اچھے شاعر ہوں مگر قصیدے کا فن آپ کو نہ آیا۔ برعکس اس کے غزل کے نرم و نازک لہجہ میں تند و تیز تنقید ہی کی بُری طرح ڈالتا۔

حکومتیں بنتی ہیں، مٹتی ہیں۔ ممکن ہے کہ کل کلاں آپ کے حکمرانوں کو کوئی بھی نہ جانے مگر یہ بات پتھر کی لکیر ہو گئی اور آئندہ کا مؤرخ اس بات کو نہ بھولے گا کہ جگر مراد آبادی کو اس وقت کی حکومت نے یوں بھی نوازا تھا۔

اِدھر بھی اب صحت کے بڑے آثار ہیں۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ علم و ادب کی قدر ہو گی اور صحیح لائنوں پر کام کرنے والوں کی بات پوچھی جائے گی۔ ورنہ پھر فردوسیٔ اسلام تو انعام اور خطاب کے مستحق ہیں ہی! آپ بھی اپنے دوست، یہ بھی اپنے دوست' اُدھر کی حکومت آپ کو نوازتی جائے، اِدھر کی انھیں، ہرج ہی کیا ہے۔

تین چار دن ہوئے فضلی صاحب نے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ جگر صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ان کے پاس آیا ہے۔ وہ بھی خوش تھے، میں بھی خوش ہوا۔ خدا آپ کو صحت دے۔ ورنہ غزل کی امامت کون کرے گا؟

دو مہینے ہوئے آپ کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں تو اس خوش فہمی میں اب تک یہی سوچتا رہا کہ آپ کو جواب میں کیا لکھوں۔

میں نے "دافع بیماری" نمبر آپ کو بھیجا تھا۔ (میری مراد طنز و مزاح نمبر سے ہے) ممکن ہے اس نے کچھ آپ کو بھی بہلایا ہو۔ والسلام

محمد طفیل

۲۲/۲/۵۹

جوش ملیح آبادی

برادرم، سلام مسنون!

میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ ایک بڑی ہنگامہ خیز کتاب لکھ رہے ہیں، بلکہ کہہ رہے ہیں۔ میری مراد "یادوں کی برات" سے ہے۔ اپنی سوانح کا کیا نام رکھا ہے! جوش کے علاوہ اس نام کو کون رکھ سکتا ہے۔

یہ کتاب خوب ہوگی۔ اپنے زمانہ کا خوب صورت تذکرہ اور تبصرہ۔ جس نے آپ کی نثر کے نمونے دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ایک فقرہ نگینے کی طرح ٹکا ہوگا۔ یہ کتاب آپ کی سوانح ہوگی یا نہیں ہوگی، یہ سوال ضرور غور طلب ہے مگر یہ سوال غور طلب نہیں کہ اس عنوان سے جو کچھ آپ لکھیں گے وہ یادگار چیز ہوگی۔ لوگ غالب کی نثر کو یاد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اب آپ کی نثر کو بھی یاد کریں گے اور کرتے رہیں گے۔

اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے اور آپ ایسا چاہیں بھی، تو اس کتاب کا مسودہ مجھے دکھا دیجیے گا۔ ممکن ہے میرا ارادہ اسے چھاپنے کی ہمت کرے۔

کراچی میں ادیبوں کی کنونشن میں آپ شریک نہیں ہوئے۔ لاہور کی اردو کانفرنس میں آپ نہیں آئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہنگامہ ہاؤ ہو آپ کو پسند نہیں۔

پچھلی مرتبہ جب آپ لاہور آئے تو میں آپ کو دیکھنے کا گنہگار ضرور ہوا، زیادہ دیر بیٹھنا نہ ہوا۔ اُس وقت بھی آپ عالم بالا کی سیر کر رہے تھے اور ہماری اتنی اڑان کہاں تھی۔

دو چار قطعات یا ایک آدھ نظم کا طالب ہوں۔ ہو سکے تو ممنون کیجیے۔ میرے طنز و مزاح نمبر پہ کچھ طنز آپ بھی فرمائیں۔

۲۲/۲/۵۹ محمد طفیل

عندلیب شادانی

برادرِ محترم، سلام مسنون!

جب سے آپ لندن گئے، اس کے بعد سے آپ اِدھر والوں کو خاطر میں نہ لائے۔ کاش ہم بھی آپ کے ساتھ لندن گئے ہوتے یا پھر آپ ہی نہ گئے ہوتے تاکہ ایک کے بلند ہو جانے کا اور ایک کے پست ہو جانے کا جھگڑا نہ پڑتا۔

میں نے بھی سنا ہے کہ لندن والے بڑے روکھے ہوتے ہیں۔ گھنٹوں ایک ساتھ سفر کریں بات ہی نہیں کرتے۔ کوئی مرے تو ان کی بلا سے، کوئی جیے تو ان کی بلا سے، یہ سب وہاں کا اثر ہے۔ ورنہ آپ تو بڑے اچھے آدمی تھے۔

یہ بتائیے کیا آپ نے لکھنا پڑھنا اب بالکل چھوڑ دیا ہے؟ پہلے تو آپ پڑھتے تھے یا نہیں لکھتے ضرور تھے۔ اب میرا خیال ہے آپ نے لکھنا چھوڑ کر پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ کاش آپ پھر سے لکھنا اور بولنا شروع کر دیں۔

طنز و مزاح نمبر —— کیسی کوشش ہے؟

۱۹/۲/۵۹ محمد طفیل

سید مسعود حسن رضوی

حضور والا، آداب!

نیّر نے اطلاع دی ہے کہ آپ علیل ہیں۔ گھبراہٹ میں خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں کہ خدا کرے خیریت ہو اور آپ بیمار ہوں، تو میری طرح کے۔ جن دنوں زیادہ کام ہوتا ہے تو میں دوست احباب سے یہ کہہ کے جان چھڑا لیتا ہوں، بھئی کیا کروں، بیمار تھا، اس لئے

خط کا جواب نہیں دے سکا تو کونسا غضب ہو گیا۔ بجائے اس کے دوست ناراض ہوں، اُلٹی ہمدردی فرمانے لگ جاتے ہیں — یہی وجہ ہے کہ میں نے چاہا کہ آپ کی بیماری بھی میری ہی طرح کی ہو۔

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج نامی کتابیں ملیں۔ رات ہی سے سرہانے کی زینت بن گئی ہیں۔ جب تک ان کا ایک ایک لفظ پڑھ نہیں لوں گا چین نہیں آئے گا — آپ سے لکھنؤ میں زبانی بات بھی ہوئی تھی، اور آپ نے کہا تھا کہ واجد علی شاہ رنگیلا نہ تھا۔ آپ کی کتابوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ تھا۔ اب میں آپ کی باتوں پر یقین کروں یا کتابوں پر — بس یہ فرما دیجیے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں آیندہ ڈرامہ نمبر مرتب کروں۔ آپ کے پاس بڑا ذخیرہ ہوگا۔ پرانے ڈراموں کا۔ کیا آپ وہ مجھے عاریتاً دے دیں گے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں دیں گے۔

جب میں آپ کی کتابوں میں یہ پڑھتا ہوں کہ فلاں صاحب نے میری اس کتاب کے سلسلے میں بڑی مدد کی ——— ——— فلاں صاحب نے فلاں کتاب بھیجی۔ تو مجھے اُن حضرات پر بڑا غصہ آتا ہے کہ انہوں نے اُن صاحب کی مدد کی جو دوسروں کو کچھ دینے کے تو کجا، دکھانے تک کے روادار نہیں — ہو سکے تو میری اس بات کی تردید، میری فرمائش مان کر کریں۔ مگر ایسے سادہ لوح آپ کہاں!

طنز و مزاح نمبر پسند آیا کہ نہیں؟

محمد طفیل

۱۹/۲/۵۹

مولانا عبدالماجد دریابادی

قبلہ، آداب! — میں نے آپ کے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ بڑی حد تک تارک الدنیا ہوتے جاتے ہیں یعنی نہ کسی جلسے میں جاتے ہیں نہ بڑی نجی محفلوں ہی میں، اور اگر جائیں گے بھی تو صرف تماشائی کی حیثیت سے۔ بظاہر تو یہ باتیں دنیا کی لطافتوں سے محروم ہونے کی ہیں۔ مگر یوں آپ کا فیصلہ ہے تو ہم لوگ تو بے موت مارے گئے۔ اس لیے کہ آرزو رہتی تھی کہ کبھی مولانا کو کسی فنکشن میں دیکھ لیں گے، کبھی کسی دعوت میں، کبھی اپنے ہاں — اب اگر میری آپ سے ملاقات ہوئی تو میں آپ کے اس فیصلے کو بدلواؤں گا۔

کیا ان دنوں آپ کو ریڈیو والوں نے نہیں بلایا؟ اگر بلایا ہو تو اس تقریر کی نقل مجھے بھیج دیں تاکہ میں قارئین نقوش کو پہنچا سکوں۔ بفضلِ خدا صدقِ جدید نکل رہا ہے۔ مگر آپ نے میرے "کھچڑی نمبر" پر اب تک کچھ نہیں کہا۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے مگر ایسی رہنمائی نہیں جس کے لیے مجھے اپنے گریبان میں جھانکنا پڑے — خدا کرے آپ مزے میں ہوں۔

آپ کا خادم: محمد طفیل

۱۹/۲/۵۹

رشید احمد صدیقی

قبلہ، سلام مسنون!

آپ کے میدان میں میں نے خواہ مخواہ قدم دھر دیا۔ یعنی کہ طنز و مزاح نمبر چھاپ دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ نمبر آپ کو سخت ناپسند

ہونا چاہیے۔ اسلئے کہ آپکے نزدیک تو اس صنفِ ادب کا صرف جمال ہی جمال ہوگا۔ یہ کوڑا کباڑ تو نہ ہوگا، جو میں نے پیش کر دیا۔ پطرس نمبر کو آپ مرتب کرتے تو نہ جانے اس میں کیا کیا حسن پیدا کرتے۔ مگر میں نے یہ کام اس لئے کر دیا ہے تاکہ اچھے نام کرنے والوں کا راستہ ہموار ہو جائے۔ میں نے خار دار پگڈنڈیوں سے جو چبھتے ہوئے کانٹے چنے ان سے ہاتھ ضرور زخمی ہوئے۔ مگر مجھے اس کا غم نہیں۔ میں نے راستہ تو بنا دیا۔ اب اس پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر آپ لوگ چلائیں۔

دیکھئے میں نے شروع ہی میں آپ سے استدعا کی تھی کہ اس نمبر کے سلسلے میں میرا ہاتھ بٹائیں مگر آپ نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میری بات سنی تو ضرور مگر اُسے شرفِ قبولیت نہ بخشا۔ میرا خیال ہے اگر اس پرچے میں اب کچھ عیوب ہیں تو کم از کم آپ کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری خبر لینے کے درپے ہوں۔ میں نے تو شروع ہی میں اپنی نالائقی کا آپ سے اقرار کیا تھا اور مدد چاہی تھی۔ مگر میری بات لاہور سے علی گڑھ پہنچتے پہنچتے اپنا اثر کھو چکی تھی۔ سا آپ بھی کیا کرتے۔

سنا ہے کہ اُردو کا ایک مزاح نگار چل دیا ہے جسے لوگ پطرس کہتے تھے۔ ان کی تجہیز و تکفین تو ہو چکی ہے۔ ارادہ ہے کہ اس کی تربت پہ پھول چڑھائیں بشکل نقوش کے ایک نمبر کے —— شرکت فرمائیے مرنے والوں کو تو نہ بھولیں۔

خط بند کرتا ہوں مبادا آپ مجھے کلاس سے باہر نکال دیں۔

۱۸/۲/۵۹　　　آپ کا ذہنی شاگرد، محمد طفیل

ڈاکٹر محی الدین زورؔ

قبلہ! آداب! آپ کی بارگاہ میں جھک کے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ کیا کروں آپ کا مقام ہی اونچا ہے۔ یوں میں تکلفاً نہیں کرتا مجبور ہوں۔ حالانکہ میں اپنی بد دماغی کی وجہ سے کافی بدنام ہوں۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ احباب شکوہ سنج بھی ہیں مگر آپ کے سامنے آتے ہی سر سے ٹوپی اُتار لینی پڑتی ہے۔

حیدر آباد آنے کو بار ہا دل چاہا۔ مگر کبھی جیب نے ہار مان لی۔ کبھی وقت کی گنجائش نے راستہ روک لیا اور اب تو آپ کی سرکار آڑے آ رہی ہے ورنہ طنز و مزاح کی طویل بیماری کے بعد ارادہ تھا کہ لاہور سے بھاگ نکلوں۔

کچھ اہلِ قلم میرے لیے اپنے دل میں بڑی جگہ رکھتے ہیں مگر ان کے لیے مشکل یہ ہے کہ بڑے مصروف رہتے ہیں۔ جن میں ایک آپ کی ذات بھی ہے۔ اس لئے سوچ دین بنا رہتا ہوں کہ آپ سے کوئی بات کہی جائے یا نہ کہی جائے۔ اب بھی میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ مجھے آپ کے ایک مضمون کی ضرورت ہے۔

پطرس پر بھی چیزیں اکٹھی کر رہا ہوں۔ مگر وہ نمبر زیرِ ترتیب شمارہ کے بعد آئے گا۔ بشرطیکہ میں بھی اُن کی طرح مرحوم نہ ہُوا۔ آپ کے کیا احوال ہیں۔

۱۹/۲/۵۹　　　محمد طفیل

امتیاز علی عرشی

برادرِ مکرم، سلام مسنون!

یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے پہلے دن یہ کہہ دیا تھا کہ میاں مجھ سے دوستی اس شرط پہ ہو سکتی ہے کہ مجھ سے کبھی مضمون نہ مانگنا۔

بعد میں آپ کچھ رام ہوئے۔ لکھا جیسے مضمون میرے اِدھر اُدھر نکل رہے ہیں ویسا مضمون آپ کو بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ ہم اس وعدۂ حُور پہ خوش ہو گئے۔ مگر کوئی مضمون نہ آیا۔ البتہ آپ نے پیارے پیارے سے خط لکھ کر ہمیشہ راضی رکھا۔ اب اس آرٹ کا جواب کوئی آپ ایسا باہوش دے تو دے۔ مجھ غریب کے بس کی بات نہیں!

آپ کتابوں کے جھرمٹ میں بیٹھے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک کتاب کو نکالا۔ اس سے دوستی نبھائی۔ کبھی دوسری کتاب سے اپنی یاری بڑھائی۔ آپ کا یہ سلسلہ دن رات کا ہے۔ مگر ان لوگوں کی طرف بھی دیکھیے جو کتاب نہیں انسان ہیں۔

میرا خیال ہے میں ایسی باتیں نہ کروں۔ اس لیے کہ ڈر یہ ہے کہ آپ کہیں مجھ سے اور "راضی" نہ ہو جائیں۔ ورنہ مضمون حاصل کرتے کرتے خطوں سے بھی جائیں ان سے اور کچھ فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے یہ تو ہوگا کہ میرے مرنے کے بعد مولوی امتیاز علی عرشی کے بھی خط گھر سے نکلیں گے۔ جس میں لکھا ہوگا — "ویسا مضمون آپ کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔"

محمد طفیل

۱۸/۲/۵۹

ممتاز شیریں

بہن، سلام مسنون!

آپ یہاں تھیں تو آپ سے باتیں کر لیتے تھے۔ آپ سے مشورہ کر لیتے تھے، اب آپ سمندر پار ہیں۔ اب آپ تک کیسے پہنچیں۔ ہوائی جہاز پہ اُڑ کے آئیں گے، تو جتنی باتیں یہاں سے سوچ کے چلیں گے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے وہ سب ہوا ہو جائیں گی۔

آپ اُدھر گئیں۔ یہاں اپنی کراچی میں ادیبوں کی ایک کنونشن ہوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں لکھنے والے ضرور شامل ہوئے مگر کوئی ادیب نہ تھا۔ مثلاً وہ لوگ جو لکھتے ضرور ہیں مگر ان کی کتاب نہیں چھپتی۔ یا چھپتی ہے تو بکتی نہیں۔ یار لوگوں نے سوچا ڈنڈے کے زور سے کتابیں چھپ بھی جائیں گی اور بک بھی جائیں گی — اگر یوں ہو جائے تو واقعی بُرا بھی کیا ہے۔ میں اس کنونشن کے بارے میں یوں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس کے انعقاد میں میرے چند دوستوں کے نام آتے ہیں۔

میں نے آپ کو وہ پرچہ بھی نہ بھیجا جس میں آپ کا مضمون تھا۔ دوسرا نمبر بھی آپ کو نہ بھیجا۔ اس لیے کہ آپ کراچی سے جاتے ہوئے جو ایڈریس دے گئی تھیں وہ کاغذ کا پرزہ کہیں کھو بیٹھا ہوں۔ اب سوچا ہے کہ پہلے خط لکھوں اور پھر آپ کے ایڈریس کو ڈھونڈوں ورنہ یوں تو اور چپ رہتے رہتے کئی برس گزر جائیں گے۔

آپ وہاں کی دنیا کے بارے میں کچھ لکھ کر بھیجیں۔ میں آج آپ کو دو نمبر بھیج رہا ہوں ایک عام شمارہ جس میں آپ کا مضمون ہے۔ ایک طنز و مزاح نمبر جس کی ادھر کافی دھوم ہے پہلا ایڈیشن دس روز میں ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ ملے تو داد یا بے داد کا ایک خط ضرور لکھیے گا۔

شاہین صاحب کی خدمت میں سلام کہیے۔ انہوں نے ترقی کی کتنی اور منزلیں طے کی ہیں؟

محمد طفیل

۱۸/۲/۵۹

راز مراد آبادی

بھائی، آداب!

مدت سے آپ نے اپنی خوب صورت شکل نہیں دکھائی۔ پہلے تو یوں نہ ہوتا تھا۔ چوتھے پانچویں مہینے دیدار ہو ہی جایا کرتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال آپ سے نہیں کر رہا ہوں۔ اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔

جب آپ لندن میں تھے اس وقت بھی خیر خیریت کا علم ہوتا رہتا تھا۔ اب آپ قریب ہیں تو یہ دوری کیوں؟ معلوم ہوتا ہے مری کی برفباری نے آپ کو ٹھنڈا کر دیا ہے، دوستی نبھانے کی حد تک ٹھنڈا۔ اس کے علاوہ میرے اس فقرے میں اور کوئی تلمیح نہیں

علم ہوتا رہتا ہے کہ آپ فلاں مشاعرے میں بھی پائے گئے اور فلاں میں بھی۔ معلوم ہوا اب آپ کے شعر سنانے کے قابل رہ گئے ہیں پڑھانے کے نہیں۔ اگر آپ کو میری اس بات سے شرم آئی ہو (یہ فقرہ میں نے بڑے پیار سے لکھا ہے) تو پھر کوئی غزل مجھے بھیجیے تاکہ اندازہ کر سکوں کہ میری بات غلط تھی یا صحیح — ویسے میں دل سے چاہتا ہوں کہ میری ہی بات غلط ہو۔ کبھی کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بات غلط ہو۔ مگر دوستی بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔

آزاد کشمیر میں طنز و مزاح نمبر پر ریویو کر دیں تو اچھا ہے تاکہ کشمیریوں کو بھی علم ہو جائے کہ اُردو میں ایک نقوش نامی پرچہ نکلتا ہے اور جب تک انھیں کشمیر واپس نہیں مل جاتا اُسی پرچے کو پڑھا کریں تاکہ دل بہلا رہے اور گھر کی یاد زیادہ نہ ستائے، اور سنائیے کیا حال احوال ہیں۔ گفتنی اور ناگفتنی سب کہیے۔

۱۴/۳/۵۹ محمد طفیل

فضل احمد کریم فضلی

برادرِ محترم، سلام مسنون!

میں نے سوچا تھا، پہلے آپ کی غزلیں نقل کراؤں۔ اس کے بعد خط لکھوں۔ اس لیے کہ جو کام آپ نے میرے سپرد کیا تھا، جبتک وہ نہ کرتا اور صرف خیر خیریت کا خط لکھتا اچھا معلوم نہ ہوا۔ اسی سبب جواب میں بھی تاخیر کا مرتکب ہوا۔ ہر چند کہ جلد جواب نہ دینے کا ایک عذر پیش کر دیا ہے۔ پھر بھی اسے "معقول تر" نہیں سمجھتا۔

آپ نے بڑے مزے کا خط لکھا تھا اور کلیم الدین احمد صاحب کے بارے میں جو رائے لکھی تھی وہ صحیح ہے۔ انھیں ایک ایسی عینک مل چکی ہے جس میں انھیں عیوب ہی عیوب نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہتوں کے ساتھ زیادتی ہو جاتی ہے اور اہلِ قلم تلملا اُٹھتے ہیں — بہرحال یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ انہوں نے (اپنا ادب پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو) مگر انگریزی ادب کو خوب پڑھا ہے اور یہی چیز ان کے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ وہ ہر (اردو) ادب پارہ پر انگریز بن کر اُردو میں تبصرہ کرتے ہیں۔

انگریزی فراق نے بھی پڑھی ہے۔ مگر انھوں نے انگریزی کو پڑھ کر ہضم کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی چیزوں میں توازن

ہے۔ کہیں کہیں گھپلا تو خیر وہ بھی کر جاتے ہیں مگر اس میں شدت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اس کے ساتھ ان کی یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ "میں نے بھی یہ کہا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے طنز و مزاح نمبر کو پسند کیا۔ خوشی ہوئی — میں نے تو طے کر لیا ہے کہ ہر موضوع پر پورے خلوص کے ساتھ اتنی محنت کر لوں کہ کوئی اور نہ کر سکے۔ دعا کیجیے کہ مرتے دم تک میں اپنے اسی مسلک پر گامزن رہوں۔ اس میں میری کاوشوں کو پسند بھی کیا جائے گا اور ناپسند بھی مگر میرا دل ضرور مطمئن ہوگا۔

ایک تازہ غزل عنایت ہو — ان دنوں ضرورت ہے۔

نئے مکان کی مبارک باد — نام کی (بیت الغزل) اس سے زیادہ مبارکباد!

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جگر صاحب کی صحت کچھ بحال ہوئی۔ کوئی دو تین مہینے ہوئے میرے پاس بھی ان کا ایک خط آیا تھا، آپ کے پاس اب آیا ہے — اس لیے زیادہ خوشی ہوئی کہ وہ اب اچھے ہیں۔

محمد طفیل

۱۲/۳/۵۹

شوکت صدیقی

برادرم، آداب!

جب آپ مجھے کراچی میں ملے تھے تو میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ آپ افسانے بڑے اچھے لکھ سکتے ہیں۔ مگر آپ نے ابھی تک لکھے نہیں۔ خدارا لکھنا شروع کر دیجیے تاکہ نقوش میں بھی آپ کا کچھ چھپے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ کسی اور کا خط آپ پڑھ رہے ہیں۔ مگر میں نے یہ خط شوکت صدیقی صاحب کے لیے لکھا ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ لگے تو پھر البتہ مسئلہ دوسرا ہوگا اور لکھنے والا بھی کوئی غیر نہیں ہے۔ شوکت صدیقی کا دوست ہے جسے پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ جو چاہے لکھے۔

طنز و مزاح نمبر ملنے کے بعد آپ کچھ مسکرائے یا اور غمگین ہوئے۔ دوسری بات ہی ٹھیک ہوگی۔

لیجئے اب ایک سگریٹ پیجئے اور میرے اس خط کو بھی دھوئیں کی نذر کیجیے!

آپ کا اپنا محمد طفیل

۱۸/۲/۵۹

غلام عباس

بھائی! — میں نے ایک نمبر اور چھاپا ہے، جو حسبِ سابق موٹاپے کا مریض ہے۔ اسے دیکھ کر ذرا یہ تو بتائیے کہ اس بیچارے کو کچھ صحت نصیب ہوئی ہے یا بدستور بیمار ہی ہے پہلے میں آپ کو بڑا افسانہ نگار ہی مانتا تھا، اب ڈاکٹر بھی!

کیا ان دنوں کوئی افسانہ نہیں لکھا؟ لکھا بھی ہوگا تو نقوش کا نمبر کاہے کو آئے گا۔ آپ بیشک اپنے افسانے اِدھر اُدھر چھپوائیں

مگر یہ بتا دوں، نقوش میں چھپے گا تو اسے زیادہ لوگ پڑھیں گے۔ آپ شاید یہی نہیں چاہتے۔ ہاں ایک سرکاری پرچے کی برابری کا دعویٰ نہیں آتا۔ وہ چھپتا زیادہ ہے، پڑھا کم جاتا ہے۔

پھر اصرار کروں گا کہ مجھے طنز و مزاح نمبر کی صحت کے بارے میں ضرور اطلاع دی جائے اور اس کے بعد یہ بھی — ایک پرچے کے بعد دوسرا پرچہ پطرس کی یاد میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ اگر مرحوم پر بھی کچھ لکھ دیں گے تو وہ بھی میرے لیے سرمایۂ عزت ہوگا

خدا کرے آپ اچھے ہوں

۱۷/۲/۵۹

محمد طفیل

ابو محمد سحر

محترم مسنون! آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ مجموعہ صرف امیر مینائی کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل نہیں۔ جو مجموعہ (غیرتِ بہارستان) غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ صرف اس کا عنوان، اس کتاب کی زینت ہے۔ یا ان غیر مطبوعہ اشعار پر یا اس غیر مطبوعہ مثنوی پر، جو مرتب کو ملی تھی۔

میں آپ کی رائے سے اتفاق رکھتا ہوں کہ یہ مجموعہ زیادہ قابلِ قدر نہیں بن سکا۔ نہ انتخاب کے اعتبار سے، نہ غیر مطبوعہ مواد کے اعتبار سے، بہر حال اس کا جتنا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ وہ قابلِ توجہ ضرور ہے۔

آپ کے خط کا لہجہ واقعی ایسا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بڑے غصے میں ہیں۔ آپ امیر مینائی پر کام کر رہے ہیں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ ضرورت تھی اس کی۔

ہو سکے تو غیرتِ بہارستان کے سلسلے میں، اپنے اتنے زیادہ دکھ کا اظہار نہ کریں۔ منع تو نہ کروں گا۔ اس لیے کہ آپ کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے۔ خالد مینائی نے جو کچھ کیا، وہ نامعتبر سہی مگر ان کے خلوص پر شبہ تو نہیں کیا جا سکتا۔

۱۱/۷/۶۲

محمد طفیل

محمود عالم قریشی

بھائی! آپ کا محبت نامہ ملا۔ جسے سرگزشت نامہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کے بعد عید کارڈ ملا۔ جسے دیکھ کر قبل از وقت عید ہو گئی۔

آپ کا خط معلوماتی ہے۔ جسے آپ نے بڑے اچھے انداز میں لکھا ہے۔ اگر آپ وہاں کے حالات اسی طرح تفصیل کے ساتھ لکھیں اور مجھے بھیجیں تو ذرا سے استادی ہاتھ لگا کر نقوش میں پیش کر دوں گا۔ ہر چند کہ میں آپ کو استاد سمجھتا ہوں۔ مگر ذرا سی دیر کے لیے میں بھی استاد بن کر خوش ہو لوں تو آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

آپ کو جو عید کارڈ بھیجا ہے۔ اُس پر بھابی کو تو اعتراض نہیں ہوا۔ میرا تو خیال ہے کہ جب آپ دنیاوی جنت میں پہنچ ہی

گئے ہیں (اللہ میاں کی مرضی سے) تو پھر ولی اللہ بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ بُدھو کے بُدھو ہی واپس آ گئے تو اللہ میاں آپ کو دوبارہ اپنی جنت میں نہ لے جائیں گے۔ کہیں گے یہ صاحب تو ٹرائل میں فیل ہو چکے ہیں۔

ریستورانوں میں جائیے۔ نائٹ کلبوں میں جائیے۔ تھیٹر دیکھیے اور وہ سب کچھ دیکھیے جو اللہ میاں نے دیکھنے کے لیے بنایا ہے۔

ان ساری باتوں سے میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ واجد علی شاہ بن جائیں۔ مگر اتنا تو ہو یار، کہ آپ کہہ سکیں کہ میں پیرس ہو آیا۔

پچھلے دنوں بے حد مصروف رہا۔ خط نہ لکھ سکا۔ اب قدرے فراغت ہے مگر اس فراغت میں بھی جیب بول جاتی ہے۔ نقوش کے تازہ شمارے بھجوا تا ہوں۔ تاکہ آپ کو یاد رہے کہ میری مادری زبان اُردو ہے فرنچ نہیں۔

محمد طفیل

۱۱/۳/۶۳

ریاض احمد

بھائی! آج میری ۴۵ ویں سالگرہ ہے۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو آپ کو لڈو کھلاتا۔

۴۵ برسوں میں سے ۲۳ برس، ادب کے سلسلے میں ضائع کر دیئے۔ باقی بچپن اور لڑکپن میں گزر گئے۔

زندگی کیا ہے؟ کس طرح جینا چاہیے تھا۔ اس کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اب قدم بڑھاپے میں ہیں۔ جس میں لوگ ماضی کو یاد کر کر کے روتے ہیں۔ لیجیے مستقبل کا بھی مشغلہ ہاتھ آ گیا اور کیا چاہیے۔

آپ ہی کے منصب پر، لاہور میں ایک عشرت صاحب ہیں۔ کیا آپ کی اُن سے بھی یاد اللہ ہے؟ کام و خدمتِ خلق قسم کا!

میرے کرمفرما، سید اعجاز حسین شاہ صاحب بھی، مجھے کبھی یاد کرتے ہیں؟ یاد کریں تو کیوں، مجھ میں خوبی ہی کون سی ہے!

آپ کا محمد طفیل

۱۵/۸/۶۷

ایُّوب جاوید

محترم، سلام مسنون! میری آپ سے لمبی چوڑی واقفیت تو نہیں۔ مگر میں مشکل میں ہوں۔ اپنے ایک دوست کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اُن کا پتا آپ کی وساطت سے چل سکتا ہے۔ میں آپ کو زحمت نہ دیتا۔ مگر میرے دوست بڑے اچھے تھے۔ بڑا خلوص تھا اُن میں، بڑے اچھے دل کے مالک تھے۔

ایک خوبی اُن میں یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیوی سے دبتے تھے۔ ڈرتے نہ تھے۔ ورنہ دنیا کے سارے شوہر یا تو اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں یا انھیں ڈرائے رکھتے ہیں یہ درمیانی راستہ میرے اور میرے دوستوں کو معلوم نہیں۔

میں آپ سے اُن کی کیا کیا خوبیاں بیان کروں۔ عرض صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ اُن کی گمشدگی پر آزردہ ہوں۔

اوہو! نام تو میں نے بتایا ہی نہیں۔ ایوب جاوید ان کا نام ہے۔ پنڈی کے رہنے والے ہیں۔ بھلے سے آدمی ہیں۔

محمد طفیل

۳۰/۱۰/۶۴

قاری محمد یوسف فاروقی

محترم فاروقی صاحب، سلام مسنون

بابائے اُردو کے متعلق، مجھ ایسے کا کچھ کہنا، ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی بونا قطب مینار کی بلندی کا جائزہ لے رہا ہو۔

مجھے اوروں کا تو پتا نہیں، میں نے بابائے اُردو کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ میں نے بوڑھی ہڈیوں میں جوان ارادوں کو انگڑائیاں لیتے دیکھا۔ میں نے گوشت پوست کے قطعے ڈھانچے میں، پہاڑوں کی سی استقامت دیکھی۔

مرحوم نے بہت کچھ تو کر کے دکھا دیا — مگر کچھ آرزوؤں کو ساتھ لے گئے۔ وہ اُردو کے لیے جیتے تھے۔ ان کی تمام نیک نامیاں اور "تمام بُرائیاں" صرف اُردو کے لیے تھیں۔ اُن کے مقصد سے پیار کرنے والے انھیں جی جان سے چاہتے تھے اور اُن کے مقصد سے اتفاق نہ رکھنے والے انھیں دیوانہ کہتے تھے۔

ان کی زندگی میں اُردو کو وہ مقام نہ ملا جس کی خاطر، انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان کے مشن کو آگے بڑھائیں۔

اُردو کو آج پھر ایک دیوانے کی ضرورت ہے! — یہ میں نہیں کہہ رہا۔ مرحوم کی بے چین روح پکار رہی ہے۔ کیا آپ میں سے کسی کو یہ آواز سنائی دے رہی ہے؟ — اُردو کو آج پھر ایک دیوانے کی ضرورت ہے۔

۱۶/ ۷/ ۶۴

محمد طفیل

عصمت چغتائی

اپنی صنف میں سب سے زیادہ جراتِ اظہار کی مالک، تحریروں میں فن کے ساتھ
ادب بھی چبھن کے ساتھ لطف گیری بھی!
قلم کو زبان دے دی!

محترمہ، سلام مسنون!

آپ کا افسانہ ملا تھا، تازہ پرچے میں آیا بھی ہے۔ امید ہے کہ یہ پرچہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہو گا یا آج کل میں پہنچے گا۔ یہ افسانہ خوب ہے مگر اس کی گرہیں کچھ اور کھول دیتیں تو اور لطف آتا۔ یہ میرا خیال ہے۔ خدا کرے کسی اور کا نہ ہو۔

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ لکھ رہی ہیں اور اپنے پورے قافلے سے یہ کہہ رہی ہیں کہ ابھی سستانا نہیں۔ قدم بڑھاؤ مگر کچھ دیر پر ہار مان گئے ہیں کچھ سوچ رہے ہیں کچھ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مگر جو ٹھیک کہہ رہے ہیں ان کی چال میں وہ بانکپن نہیں رہا۔ آپ کے ہر قدم میں ادائیں ہیں بلحاظ معیار، پرانے لکھنے والے بہت نیچے آئے ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے ہر افسانے میں جان ہے، یہ الگ بات ہے کہ

ہر افسانہ چوتھی کا جوڑا اور نتھی کی نانی نہیں بنا، مگر یہ افسانے ہیں تو اسی دور کے، بلاشبہ ان افسانوں نے آپ کی سابقہ عظمت کو ابھارا مگر آپ کے ساتھی اپنی سابقہ عظمتوں کو بھی سنبھال نہ سکے، یہ کتنے دکھ کی بات ہے۔

جو اصل بات کہنے آیا تھا وہ تو کہی نہیں اور اُوٹ پٹانگ باتوں میں وقت ضائع کر دیا۔ بات یہ تھی کہ پطرس نمبر پیش کر رہا ہوں اور یہ ہمارا فرض ہے کہ اچھے ادیب کو سب مل کر خراجِ عقیدت پیش کریں اور اس کی عظمت کے جو گوشے سامنے نہیں آئے ہیں، سامنے لائیں۔ اگر ہم یہ بھی نہ کر سکیں، تو پھر کوئی کاہے کو لکھے، کاہے کو جئے۔

مرحوم نے آپ کے بارے میں لکھا ہے۔ آپ کے مضمون انگریزی میں ترجمہ کئے ہیں۔ جو ہم نقوش میں دے رہے ہیں کہ وہ اردو سے انگریزی ایسے کرتے تھے۔

آپ کے ان سے اچھے مراسم (اس سے زیادہ باحیا لفظ سوجھ نہیں رہا) رہے ہیں۔ مرحوم یقیناً آپ کے فن کے "قدردان" تھے۔ اب وقت بھی ہے اور فرض بھی کہ آپ بھی حق ادا کریں اور وہ یوں کہ کم از کم آپ ان پر ایک مضمون ہی لکھ دیں اور اس کے علاوہ جو کچھ چاہیں کریں، ہمیں بھی مشورہ دیں۔

ان کا کوئی خط آپ کے پاس ہو تو وہ بھی عنایت ہو۔ والسلام

آپ کا مخلص محمد طفیل

۸/۵/۵۹

کرشن چندر

ایشیا کا سب سے مشہور افسانہ نگار، پریم چند سے بھی مشہور، چار دانگ شہرت
کا مالک، اَن داتا، اور زندگی کے موڑ، کا خالق!
نثر میں شاعری کا امام!

بھائی، آداب! میں پکارتا ہوں۔ مگر میری آواز آپ تک نہیں پہنچتی۔ آپ کیوں چپ ہیں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اردو افسانہ آپ کے سامنے مر رہا ہے مگر قائد خود چپ چپ ہے۔ اردو افسانے کو زندگی بخشنے میں آپ کا خون بڑا ارزاں رہا ہے۔ اب اگر اس میں بڑھاپے کے آثار ہیں، تو آپ کی لڑکھڑاہٹ کو کون سہارا دے گا؟ اپنے جیتے جی تو اسے قبر میں اترنے سے بچا لیجئے۔ کیا پریم چند کی روح آپ سے کچھ نہیں کہہ رہی ہے؟ پریم چند تو اپنے جانشینوں میں کرشن، بیدی، عصمت اور منٹو کو چھوڑ گئے تھے، آپ کسے چھوڑ کے جائیں گے؟

میری بات مانئے، دوستوں اور ہمدردوں کا ایک قافلہ لے کر، پھر سے، اس صنفِ ادب کو موت کے منہ سے چھین لیں۔ میں اس کو نہیں مانتا کہ آج لوگ طویل چیزیں پڑھا پسند کرتے ہیں۔ اگر آج غیر معمولی افسانے لکھے جانے لگیں تو ہوا کا رُخ آج بدل سکتا ہے۔

میری گذارش غور طلب ہے۔ ورنہ آپ سے زیادہ درد مجھے تو نہ ہوگا۔ معاف کیجئے گا، پھر جو طویل چیزیں لکھی بھی جا رہی ہیں ان میں بھی کتنی جان ہے؟ یہ ساری ہی باتیں دلخراش ہیں۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گذر گیا۔ ابھی میں پطرس نمبر پیش کر رہا ہوں آیئے، ہم سب مل کر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ اگر ہم کسی بڑے لکھنے والے کو مرنے کے بعد اچھے لفظوں میں یاد بھی نہ کر سکیں، تو پھر کوئی کاہے کو لفظوں کے تاج محل تعمیر کرے گا۔

پطرس جب ڈائرکٹر جنرل تھے اس وقت آپ بھی ریڈیو پہ تھے۔ کچھ یادوں کو قلمبند کر دیجیے۔ آپ کا ادب پہ بھی احسان ہوگا اور ایک ادیب کا حق بھی ادا ہوگا۔

میں منتظر ہوں کہ مرحوم پر، آپ کا مضمون جلد آ جائے۔ یہ بات ٹال دینے والی نہیں ہے۔ سنا بھائی!

۸/۵/۵۹ آپ کا محمد طفیل

راجندر سنگھ بیدی

فن کو عظمتوں سے ہمکنار کرنے والا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج نکالتے والا، ادب کو عبادت کا درجہ دینے والا۔۔ جتنا منکسر مزاج، اتنا ہی بڑا کہانی کار۔۔

برادرم، آداب! آپ کے افسانے کی اِدھر تو بڑی دھوم رہی، اُدھر بھی ہوگی۔ سب خوش ہوگئے کہ اچھا! ابھی بیدی جی کو لکھنا آتا ہے بھُولے نہیں ہیں۔۔ یہ سوچنا بھی ٹھیک تھا۔ اتنے عرصے میں تو قلم کو زنگ لگ ہی جاتا ہے۔ یوں کسی نے سوچا تو بُرا کیا۔

آپ سیر کو آئے ہوں گے، سفر خوب رہا ہوگا، نئی دنیا دیکھی ہوگی، نئی معلومات ملی ہوں گی، اس سے فن کے نکھار میں اور مدد ملے گی۔ جو کچھ پہلے پڑھا، جو کچھ اب دیکھا اس کا اظہار کسی افسانہ میں آیا ہو تو وہ مجھے بھی دکھائیں تاکہ میں اوروں کو دکھا سکوں۔

طنز و مزاح نمبر بھیجا تھا، کچھ جچا کہ نہیں؟ اب آپ مجھے ایک تفصیلی خط لکھیں تاکہ میں بھی خوش ہو لوں

۱۷/۲/۵۹ محمد طفیل

خدیجہ مستور

نسوانی مسائل پہ ماہرانہ گرفت اور اُن پہ عبور، الجھے مسائل کو سلجھے انداز میں
پیش کرنے کا سلیقہ، غرض گھریلو مسائل کی "تحریری مزاج داں!"
خلوص کی انتہا، رُو رعایت کی دشمن!

بہن، سلام مسنون!

آپ کا خط ۱۸/۲/۵۹ والا ملا۔ جی خوش ہو گیا۔ یوں تو اس خط میں خوشی کی کئی باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ نے باقاعدہ قسم کی لڑائی کا الٹی میٹم دیا ہے۔ قبل اس کے محاذ بنے، میں اپنی شکست تسلیم کیے لیتا ہوں۔ بھائی، بہن سے لڑے، توبہ توبہ!

دوسری خوش خبری یہ تھی کہ میں ادیب ہو گیا ہوں۔ مگر میرا قلم خطوں کے سلسلے میں غیر ادیب ہوتا جاتا ہے۔ کاش بہن کی دعا قبول ہو جائے اور میں واقعی ادیب بن جاؤں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ادیب تو ابھی تک صرف چند ایک ہی ہوئے ہیں۔ جیسے ابو الکلام، ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار، زندوں میں زیادہ سے زیادہ نیاز یا پھر غلام رسول مہر — باقی تو سب لکھنے والے ہیں، ادیب کہاں ہیں — میں پطرس کو بھی ادیب نہیں مانتا۔ ہاں اچھا لکھنے والا ضرور کہوں گا — آپ کہیں گی کہ میں نے لڑائی جھگڑے کی باتیں پھر شروع کر دی ہیں۔ اس لیے اس موضوع کو بھی چھوڑتا ہوں۔ تاکہ کسی طرح سے بھی لڑائی کا دروازہ نہ کھلے، نہ کھلے۔

یہ نہ کہیے کہ میں نے بھیا کی آمد پر مبارک باد نہیں دی۔ بلکہ میرے خط کا پہلا فقرہ ہی غالباً یہ تھا کہ بھیا کے آنے کی خوشی میں ایک افسانہ لکھ دیں۔ اگر میرے اس فقرے میں مبارکباد کا مفہوم نہیں ہے تو آئندہ سر کو کھپا کر اور ذرا سوچ کر لکھا کروں گا۔ تاکہ قلم تک وہ مفہوم ضرور آئے جو دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ فی الحال میں ہی مبارک باد قبول کیے لیتا ہوں۔

چیک تو چھیڑ کا ایک بہانہ تھا — صرف بہانہ! — ورنہ بھائی بہن کی بات نہ مانے اور بہن بھائی کی بات نہ مانے، تو رشتہ صرف الفاظ کی بازی گری تک رہ جائے۔

یکم تک افسانہ ہو جائے تو لطف آ جائے — آپ نے میرے نمبر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے۔

محمد طفیل ۱۸/۲/۵۹

حامد حسن قادری

قبلہ، سلام مسنون!

آج آپ کا مختصر سا خط ملا۔ پڑھ رہا ہوں۔ خوش ہو رہا ہوں ؎

نکلا طنز و مزاح نمبر اچھے سے اچھا حسبِ دستور
سبحان اللہ طفیل صاحب ماشاء اللہ چشم بد دور

اپنے پرچے کی اب تک نثر میں تعریف سنی تھی۔ شعروں کی صورت میں اب ڈھلی۔ یعنی میرے نمبر کی تعریفوں کے جو پل باندھے گئے تھے اس میں اب کوئی کمی نہیں رہی۔ جب آپ ایسے ادب پر اتھارٹی قسم کے بزرگ خوش ہو گئے ہوں تو ہما شما کا تو ذکر ہی چھوڑیے۔

میں نے آپ کو ہزار بار آزمایا۔ آپ ہر جہت سے عمدہ آدمی نکلے۔ مگر ایک خرابی جو ہے اس نے "خرابے" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی کچھ لکھ کے نہیں دیں گے۔ سو شکوے، روؤ، پیٹو آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اگر میں کبھی حامد حسن قادری ہوتا تو اتنا لکھتا، اتنا لکھتا کہ سب سرشار ہو جاتے۔ سب خوش ہو جاتے۔

میرا خیال ہے کہ آپ میری تاریخِ وفات بھی کہہ رکھیں۔ اس لیے کہ میں کب تک یوں ہاں ہاتھ پھیلاتا رہوں گا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو غیرت آئے گی اور ڈوب مروں گا۔

آئندہ ارادہ یہ ہے کہ اردو ڈرامے پر نمبر چھاپوں۔ اس سلسلے کا آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟ مجھے پرانے اور اہم ڈراموں کی تلاش ہے۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ دیکھنے کی پھر آرزو ہے۔ کیا اب کے عرس پر آنے کا ارادہ نہیں؟

م طفیل

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محترم، سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا تھا، آپ نے جس انداز میں میرے نمبر کو سراہا ہے اس کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ یہ میں نہیں جانتا۔ طریقہ بتا دیجئے تو ابھی حساب بے باق کردوں۔

اس موضوع پہ آپ کا مضمون بے شک ملا تھا اور میں نے فوراً اپنی حیرت اور مضمون کی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ حیرت اس بات پہ ہوئی تھی کہ آپ اور مزاح؟ ثقہ سے ثقہ موضوع پہ لکھنے والا "زاہد خشک" یوں مسکراہٹوں اور لطافتوں سے بھرپور مضمون لکھے۔

آپ کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ اس میں نئے مضامین کیوں نہیں آئے۔ ضرور آتے، ارادہ تھا۔ مگر ایک تو یہ شمارہ ہی اتنا ضخیم ہوگیا کہ سنبھالے نہ سنبھلا۔ دوسرے آج کے لکھنے والے شاہانہ مزاج رکھتے ہیں۔ وہ ان باتوں کو ضروری نہیں سمجھتے، کہ کسی کے لیے کچھ کیا جائے۔ اگر سارے مزاح نگار نئے اور اچھے مضمون لکھ دیتے تو مجھ سے زیادہ اُن کا فائدہ ہوتا۔ انہوں نے سوچا نئے مضمون نہیں لکھنے چاہئیں۔ مبادا یہ (یعنی میں) ہمارے مضمونوں پہ اپنا نام لکھ دے۔ اسی احتیاط میں سارے مارے گئے۔

رونا تو یہی ہے کہ ہمارے ادیب لکھنے کے مشغلے کو ترک کرکے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے لگ گئے ہیں۔ سنا ہے اس میں بغیر کچھ کئے روپیہ بہت آتا ہے۔ نام بھی چمکتا ہے۔ لہٰذا "ادیبی" بےکار!

آپ کا مضمون کام آئے گا۔ بس ابھی ایک دو پرچوں میں سے کسی ایک میں جو ان دنوں چل رہے ہیں۔

محمد طفیل ۲۰/۲/۵۹

ڈاکٹر یوسف حسین خان

برادر مکرم، سلام مسنون! —— مجھے خوب یاد ہے، کبھی آپ حیدرآباد میں تھے۔ یہ یاد یوں ہے کہ آپ وہاں سے کبھی کبھی مضمون بھیج دیا کرتے تھے۔ اب آپ علی گڑھ میں ہوتے تو وہاں سے مجھے کوئی مضمون تو آتا۔

اگر آپ واقعی علی گڑھ میں ہیں تو پھر میں یہ پوچھنے کی جسارت کروں گا: "کیا علی گڑھ کی سرزمین ہی ایسی ہے کہ جو وہاں گیا بس یونی ورسٹی میں ہی ڈوب گیا۔ باہر کی دنیا کو پھر اس کی خیر خبر نہیں ملتی۔ سب کا حال میں یہی دیکھتا ہوں۔ یہ یونی ورسٹی ذہنی نابالغوں کو تو بالغ بنا دیتی ہے اور جو بالغ ہوتے ہیں وہ ——"

قبلہ! ادب کی دنیا کی بھی خبر لیجیے۔ یونیورسٹی کا منصب زندگی کے ساتھ ہے اور ادب سے وابستگی کا مطلب دائمی زندگی۔ جب قدرت نے آپ کو اتنی صلاحیتیں دی ہیں کہ آپ ہمیشہ زندہ رہ سکیں تو پھر کیوں ادھر توجہ نہیں کرتے؟

میں آپ کی خدمت میں کبھی اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا۔ مگر اب تو آپ کی خاموشی نے مجبور کر دیا کہ شرارت سے بھی کام لوں۔ والسلام

محمد طفیل

۱۹/۲/۵۹

احمد علی

برادرم، آداب

کیا آپ نے لکھنے سے توبہ کر لی ہے؟ اگر یہ اتنا ہی بڑا کام تھا تو ہم لوگوں کو بھی بتا دیا ہوتا تاکہ اپنی زندگی کا رُخ بدل دیتے۔ اگر آپ نے توبہ نہیں کی تو پھر نقوش کو کیوں فراموش کر رکھا ہے؟ اردو کے جتنے بھی ادیب ہیں سب نے نقوش میں لکھا ہے اور متعدد بار لکھا ہے مگر آپ نے ایک چیز بھی اسے نہیں دی۔ وجہ پوچھتا ہوں بتا دیں گے تو کم از کم میری خلش ہی دور ہو جائے گی۔

یہ بات بھی نہیں ہے کہ آپ نے کوئی چیز لکھی ہی نہ ہو۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک دو افسانے تو خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ مگر آپ نے وہ لکھے ایسے پرچوں میں جن کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اوہ میں نے جن پرچوں کی ابھی نادانستہ بُرائی کر دی ہے ان کے مدیر میرے دوست ہیں۔ اگر میرا یہ تبصرہ ان تک پہنچے گا تو وہ کیا کہیں گے۔

قبلہ ـــ ایک بار سہی، نقوش میں ایک آدھ چیز ضرور بھیج دیں اور میری زندگی میں بھیج دیں تاکہ مرتے وقت یہ ارمان اپنے ساتھ نہ لے جاؤں کہ احمد علی کا کوئی افسانہ میرے پرچہ میں نہ آیا۔

زیرِ ترتیب شمارہ کے بعد ـــ پطرس پر کچھ چھاپوں گا ـــ ہو سکے تو پطرس کے ساتھ بھی دو قدم چلیں۔

طنز و مزاح نمبر پسند آیا؟ میرے خط کا جواب دے دیجیے گا۔ میرا تعلق پولیس کے ایک خاص شعبہ سے نہیں ہے اس لئے ڈریئے نہیں۔

۱۷/۲/۵۹ محمد طفیل

تمکین کاظمی

برادرم، سلام مسنون! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کی طرح میرے سارے ہی دوست میری نالائقیوں پر یوں چپ ہو جاتے تو آج پھر میری رفیق یا تو اللہ کی ذات ہوتی یا میری نالائقی۔ باقی سب صفایا!

یہی شکایت ہو گی نا کہ میں خطوں کے جواب نہیں دیتا۔ ذرا ادھر آ جائیے، دو چار دن میرے ساتھ رہیے۔ میرا سارا دن اور میری ساری رات جس جس انداز میں تڑپ تڑپ کر (اور یا پھر قلم کی گھس گھس میں) گذرتی ہے وہ آپ دیکھ پائیں تو ساری عمر، مجھ سے جواب کی طلب والی حس ختم ہو جائے۔ اس کے باوجود، جواب نہ دے کر اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ کیا میرا یہی اقبال، میرے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

قصہ مختصر، میری نالائقیوں سے درگذر فرمائیں۔ اپنے التفات کو میری مجبوریوں کے مقابل نہ لائیں۔ مجھے تو کیا آپ کو صدمہ ہو گا۔

طنز و مزاح نمبر کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے آپ کو لبھایا کہ نہیں؟ ـــ اگر غصہ تھوک دیا ہو تو پھر یہ بھی کہوں، ایک آدھ مہکے کا مضمون قارئین نقوش بھی چاہتے ہیں۔ میں نے تقاضا اس لیے نہیں کیا، ممکن ہے رد کر دیا جائے۔ والسلام

محمد طفیل ۱۸/۲/۵۹

لطیف الزمان خاں

برادرم! اور جیو!

آپ کے ایک دو خط ملے تھے (صرف ایک دو) مگر میں جواب نہ لکھ سکا۔ ٹیلی فون بھی آیا تھا مگر ہم ملتان نہ پہنچ سکے۔ زیادہ ناراض تو نہیں؟

قصہ یہ ہے بندہ پرور! کہ اب میں آپ کی طرح نوجوان نہیں رہا۔ کہ جب چاہا اور جو چاہا کر ڈالا۔ اب میں ہزار مرتبہ سوچتا ہوں کہ میرے بعد کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے" یہی ایسا نہ ہو جائے مجھے کہیں نکلنے نہیں دیتا۔ ورنہ آپ نے وار تو بڑا زبردست کیا تھا کہ "آؤ گے تو آم کھلاؤں گا۔" بہرحال یہ پکا وعدہ ہے۔ آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مع تمام جھام کے آؤں گا۔ یعنی اہلیہ اور وغیرہ کو ساتھ لاؤں گا۔ مگر اس آنے میں آموں کا سیزن گزر جائے گا۔ چلو کوئی بات نہیں، آپ کی باتوں ہی سے خوش وقت ہو لیں گے۔ کیوں کہ وہ بھی "انور رٹول" سے کم میٹھی نہیں۔

آپ کے گلے شکوے سب بجا ہیں۔ اِدھر میں بھی اپنے آپ کو بے خطا نہیں سمجھتا لیکن میں نے یہ بھی سُن رکھا ہے۔

خطا ثابت کریں گے اپنی ہم اور خوب چھیڑیں گے
سنا ہے اُن کو غصے میں لپٹ جانے کی عادت ہے

محمد طفیل ۱۶/۸/۷۳

جناب والا!

آپ کا خط مورخہ ۴/۱ کا ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ تو بالغ ہو گئے جبھی تو لکھا کہ "انسان کی مجبوریاں عجیب ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو وہ صرف لکھ سکتا ہے اور کچھ ایسی جو صرف سنا تا ہے اور ایک قسم بات کی وہ بھی ہے جب صرف چپ رہتا ہے۔" ماشاءاللہ، ماشاءاللہ!

اب کے حضور سے ملاقات ہوئی تو دو زانو ہو کے عرض کروں گا۔ پیرو مرشد! اتنا اور بتا دیجیے کہ موقع واردات پر وہ کون سا مقام ہوتا ہے۔ جہاں انسان لکھ سکتا ہو، سنا سکتا ہو، چپ رہ سکتا ہو۔

میرا ملتان آنا، ہاتھ کی لکیروں میں لکھا نظر نہیں آتا اس لیے آپ ہی اپنی صورتیا دکھلا دیں تو اچھا ہو گا منظور؟

خط لکھنا شروع کیا تو بجلی نے جانا شروع کر دیا۔ دس پندرہ منٹ میں تین بار ایسا ہو چکا ہے۔ خدا کرے اب یہ دو لفظ لکھ لینے دے ——— ہت تیری واپڈا کی!

۱۰/۱/۷۴ محمد طفیل

برادرم، سلام مسنون

لیجیے ہو گیا الیکشن، ہمارا پہلا نعرہ یہ تھا "لے کے رہیں گے پاکستان"۔ اب جو لوگ برسرِ اقتدار آئے ہیں۔ اُن میں اکثریت دے کے

رہیں گے پاکستان" والوں کی ہے۔

جلسے جلوس خون خرابہ، جائیدادیں، عصمتیں، یہ سب کچھ ہوا۔ سب کچھ لٹا۔ تب جاکر پاکستان بنا تاکہ ہم مسلمان رہ کر، اپنی زندگی گزار سکیں، دین اور زبان کی حفاظت کر سکیں۔

اب لیڈر کہتے ہیں، اقتصادی نظام، اسلام کے پاس نہ تھا۔ اس لئے اس کمی کو سوشلزم کے ذریعے پورا کریں گے۔ کل کلاں کو لیڈر یہ کہیں گے کہ اسلام کے پاس اخلاقی نظام نہ تھا۔ اس لئے اُسے بھی امریکہ سے لاکر پورا کر دیں گے۔ اللّٰھم زد فزد!

زبان کا مسئلہ پہلے ہی طے (غارت) ہو چکا ہے۔ اب صرف عصمتوں کی واپسی کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی کوئی لیڈر (آنے والا) ضرور واپس دلا دے گا۔ (وعدوں کا کیا ہے) چلو جملہ مسئلے حل ہو گئے — میں سچ کہتا ہوں کہ یہ قوم اتنی بدنصیب ہو گئی ہے کہ اس پہ اب اللہ کو بھی ترس نہیں آتا۔

میرے پاس تھوڑا سا سرمایہ ہے۔ کوئی ایک کام شروع کر لیتا ہوں تو دوسرے کے لیے رقم نہیں بچتی۔ کراچی ڈرافٹ بھجوانے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مئی جون سے پہلے بھجوایا نہ جا سکے گا۔ کیونکہ ان دنوں پھر درسی کتابیں چھاپنے کے چکر میں آ گیا ہوں۔ جو کچھ میرے پاس ہے، اس سے زیادہ چاہیے۔

نثار صاحب کے جو بھائی آئے تھے۔ انھیں کتابوں کا ایک بنڈل دے دیا تھا۔ وہ ایک ہی لے جانے سے پریشان تھے حالانکہ پروانہ راہداری تک دے دیا تھا۔

وہ پروفیسر صاحب مجھے بھی نہیں ملتے۔ پڑھئے فاتحہ!

سلطان صاحب کا مضمون (غالب تہذیبی سنگم پر) چھاپ رہا ہوں۔ کیا وہ "غالب کے اردگرد کے ماحول" پر بھی لکھ سکیں گے؟

محمد طفیل

۹/۱۲/۷۰

جناب!

آپ کی چٹھی ملی۔ چونکہ جواب دینا اخلاقی فرض ہوتا ہے۔ سو وہ میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔

آپ نے مشورہ دیا ہے کہ "میں کسی سے ناراض نہ ہوا کروں"۔ اس میٹھے مشورے کا شکریہ! میں کوشش کروں گا۔ مشورے دینے والے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کوئی بیدرد ہی کیوں نہ ہو۔ گھاٹے میں صرف وہ شخص رہتا ہے جو کہے گئے الفاظ میں غوطہ نہ لگا سکے۔ (اور اس معاملے میں اپنے بدھو پن کا اقرار!)

میں بہت مزے میں ہوں۔ اس لئے کہ میری پریشانیاں، میری اپنی ہیں۔ سُکھ دغا دے جاتے ہیں۔ لیکن دُکھ دھوکا نہیں دیتے۔

میرے سلسلے میں کسی کے لئے بھی فکر کی بات نہیں۔ کیونکہ میری طبیعت کبھی کبھی بلا وجہ بھی بجھ جاتی ہے۔ ورنہ اللہ کی وہ کون سی عنایت ہے۔ جو ارزاں نہ ہوئی۔

محمد طفیل

۷/۹/۷۶

مشتاق احمد یوسفی

یہ مشتاق احمد خان کون ہیں۔ جنہوں نے اپنے بڑھاپے کا اعلان کیا ہے؟

ویسے تو آپ بھی بڑا اکڑ کے چلا کرتے تھے۔ اب سال نہیں تو سوا سال میں دادا جان بن جائیں گے۔ پھر کیسے کہیں گے کہ فلاں عورت کے پاؤں خوب صورت ہیں؟ میں آپ کی اس ذاتی پریشانی پر خاصا اپ سٹ ہوں۔

البتہ برخوردار ارشاد کے لیے مبارک باد کے کلمات ضرور کہوں گا خدا انھیں بہت سی خوشیاں دکھلائے اور ہمیں اُن کی خوشیوں کو برداشت کرنے کی توفیق دے:

۱۲/۸/۷۵ آپ کا محمد طفیل

بھائی یوسفی!

آپ کو خط لکھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ سو وہ اپنے پاس نہیں۔ کیا کیا جائے؟ کوئی کمک!

بہر حال امان اللہ صاحب کو چٹھی بھجوا رہا ہوں۔ نقل آپ کے بھی ملاحظہ کے لئے حاضر ہے: تاکہ پتھر پارس بن جائے۔

باقی خیریت اور دید کی خواہش!

۲۳/۲/۷۷ محمد طفیل

ڈاکٹر نذیر احمد (پرنسپل)

برادر محترم!

یہ بات اپنی جگہ کہ آپ نے لکھ دیا تھا کہ مضمون نہ لکھ سکوں گا۔ مگر میری نیاز مندانہ گزارش اپنی جگہ کہ ساتھ ضرور دیجیے۔ اقبال نمبر میں آپ کا مضمون نہ ہو، تو یہ ویسے ہی ہوگا۔ کہ جیسے پودا ہو مگر اُس میں پھول نہ ہو۔ یہ بات میں نے بر بنائے بناوٹ نہیں لکھی۔ بر بنائے حقیقت رقم کی ہے۔

قلم اٹھائیے یادداشتوں کو تازہ کیجیے۔ یا اقبال کے کلام کو گنگنائیے اور مضمون لکھ دیجیے۔

یہ کرم مجھ پہ نہ ہوگا بلکہ اقبال شناسوں پر بھی ہوگا۔ بشرطیکہ آپ قلم کا گھونگھٹ اٹھا دیں۔

۲۹/۴/۷۷ آپ کا محمد طفیل

صباح الدین عبدالرحمٰن

محب گرامی! سلام مسنون

آپ چلے گئے اور جا کر بھول گئے۔ ہم یہاں ہیں اور آپ کو یاد کرتے ہیں وجوہ کئی ہیں۔ آپ کا خلوص، آپ کا علم آپ کا پیار!

جناب بـــ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ سید سلیمان ندوی کا، بہ سلسلہ سیرۃ مسودہ نقل کرا کے بھجوا دوں گا۔ وہ مسودہ ابھی تک نہ ملا۔ (ایک شکایت ہو گئی) یہ وعدہ بھی یاد ہے نا کہ وہ مسودہ پہلے نقوش کے سیرۃ نمبر میں چھپے گا۔ اس کے بعد آپ کے ہاں!

پھر میں نے یہ بھی گزارش کی تھی کہ ہم سیرۃ نمبر میں (۱) خطبات (۲) خطوط (۳) مکالمے (۴) مناظرے اور (۵) فیصلے، عنوانات کے تحت، حضورؐ کے جملہ کلمات کو بھی محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی آپ نے فرمایا تھا کہ خدمت کی جائے گی۔ (لیجئے دوسری شکایت بھی) براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ اِن عنوانات میں سے کس کس کام کو آپ کے ذمہ ٹھہراؤں؟ اور کس کس باقی کام کو بانٹوں؟ اور کس کس کے سپرد کروں؟ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہر عنوان کے تحت، ابتداء میں ایک ایک دو دو صفحے (بالتفصیل نوٹ) ضرور لکھے جائیں۔ مثال کے طور پہ حضورؐ نے کوئی سا بھی خطبہ دیا تو اس کا پس منظر کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ!

— اور ہاں علامہ اقبال کے سلسلے کی بھی کوئی غیر مطبوعہ تحریر؟ (ادھر میں نے خاصی تحریریں اکٹھی کی ہیں) کچھ آپ کا بھی حصہ ہونا چاہیے! آپ کے محبت نامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کیونکہ "رعایت" پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ ہاں تو ارشاد؟ اور میں گوش بر آواز!

۲/۴/۷۸ آپ کا محمد طفیل

محترم المقام، سلام مسنون!

اگر میرا ذکر معارف میں آئے گا، تو اس سے بڑا اعزاز میرے لئے اور کوئی نہ ہوگا۔ اس لیے کہ روزِ حشر معارف میں میرا ذکر میری بخشش کا باعث ہوگا۔

"سیرۃ نمبر کے لئے مضامین لکھے جا رہے ہیں" — اس اطلاع سے سکون ملا۔ جب تک مضامین نہ پہنچیں گے۔ برابر بے چینی رہے گی میں اس فرض سے جلد سے جلد سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ عمرِ مستعار کا اعتبار کیا؟

اگر مجلسِ ادارت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "سیرۃ النبی جلد ہفتم کے ابواب پہلے معارف میں چھپیں گے۔ اس کے بعد نقوش میں"۔ تو آپ مجلس میں ایک بار پھر اس معاملے کو رکھیں اور ان سے کہیں کہ "میں وعدہ کر آیا ہوں کہ سیرۃ کے غیر مطبوعہ ابواب پہلے نقوش میں چھپیں گے"۔ اس لئے کہ آپ کے محبت بھرے اقرار کی بنیاد پہ، یہاں بہت سے لوگوں سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری بڑی سبکی ہوگی۔ وہ بھی بہ سلسلہ رسولِ مقبولؐ! —

آپ کا ادارہ اس نوع کی بہت سی نیکیاں کما چکا ہے۔ اب کے یہ سعادت میرے حصے میں آنے ہی دیجئے! والسلام میں زیادہ کیا کہوں۔

۳۰/۴/۷۸ آپ کا محمد طفیل

ارشد میر

بھائی! سلام مسنون! خط ملا۔ سوچتا ہوں وہ شخص جو دوسروں کو مشورے دیتا ہو۔ اُسے آج میں بھی مشورہ دے ڈالوں۔

سنیے جناب! — آپ کی محبت میں، بندہ نے ہامی بھر لی تھی۔ ورنہ مجھ ایسا خاموش خدمت گزار تو ایسے نمائشی چکروں سے بہت دُور ہے سو تقریب ملتوی!

وہ لوگ جو بظاہر دیو قامت ہیں۔ اصلاً بونے ہیں ——— ملمع ہی جن کی زندگیوں کی اساس ہو۔ وہ سچائیوں کا ساتھ دیں ——— کیوں؟

جس طرح آپ پہ انگریزی دوائی کا الٹا اثر ہوا۔ اگر آپ نے بھی تقریب پر اصرار کیا تو اُسی طرح میری طبیعت بھی بگڑ جائے گی الحمد للہ کہ میں اور آپ، دونوں تن درست ہو گئے!

آپ کا محمد طفیل ۳/۹/۷۶

بھائی! سلام مسنون!

خط ملا۔ سوچتا ہوں وہ شخص جو دوسروں کو مشورے دیتا ہو۔ اُسے آج میں بھی مشورہ دے ڈالوں!

سنیے جناب! — آپ کی محبت میں، بندہ نے ہامی بھر لی تھی۔ ورنہ مجھ ایسا خاموش خدمت گزار ایسے نمائشی چکروں سے بہت دُور ہے۔ سو تقریب ملتوی!

وہ لوگ جو بظاہر دیو قامت ہیں۔ اصلاً بونے ہیں۔ ملمع ہی جن کی زندگیوں کی اساس ہو۔ وہ سچائیوں کا ساتھ دیں — کیوں؟

جس طرح آپ پہ انگریزی دوائی کا اُلٹا اثر ہوا۔ اگر آپ نے بھی تقریب پر اصرار کیا تو اُسی طرح میری طبیعت بھی بگڑ جائے گی۔ الحمد للہ کہ میں اور آپ، دونوں تن درست ہو گئے۔

آپ کا محمد طفیل ۳/۹/۷۶

عبدالرحیم چغتائیؒ!

یک جان اور دو قالب والا مقولہ سُن رکھا تھا مگر دیکھا عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم کے رُوپ میں! بھائی بہت سے دیکھے مگر آپ جیسے نہ دیکھے!

اگر مرحوم زندہ ہوتے تو میں اُن سے عرض کرتا کہ مجھے اقبال پر مضمون لکھ کر دیں۔ اب وہ فرض آپ ادا کریں۔ وہ کون سی یادداشت ہے کہ جو جناب عبدالرحمٰن کو معلوم تھی اور جناب عبدالرحیم کو یاد نہیں!

نقوش کے اقبال نمبر کے لیے، آپ کا مضمون چاہیے اور اقبال نمبر ہی کے سلسلے میں چغتائی مرحوم کی پانچ چھ تصویریں! کیا ایسا ممکن ہوگا؟

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا محمد طفیل ۲۹/۴/۷۷

سلطان رشک

جناب! سلام مسنون!

آپ کا ۴ مارچ کا لکھا ہوا خط ملا۔ (دلی شکریہ) آپ میری تصویر کیوں مانگتے ہیں؟ میرے بارے میں مضمون کیوں چھاپتے ہیں؟

صاحب! میں نہ تصویر بھیجوں گا۔ نہ آپ مضمون چھاپیں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرا کوئی مضمون (مطبوعہ) اس لیے چھاپنا نہیں چاہتے کہ اس سے میری پبلسٹی ہوگی — کیا سوچیں ہیں آپ کی بھی!

بے شک نہ سوچو مگر سنو ضرور! — کوئی کسی کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ کوئی کسی کی پبلسٹی نہیں کر سکتا۔ کام زندہ رہتے ہیں۔ تحریریں پبلسٹی کرتی ہیں۔ باقی آپ جانیں! اپنا کام تو صرف ادبی خدمت ہے اور یہ پیشہ عرصہ ۲۶ برس سے اختیار کر رکھا ہے۔ خوش ہوں ناخوش نہیں!

محمد طفیل ۱۵/۳/۷۷

خورشید خاور امروہوی

جناب خاور صاحب

میں ارادتاً آپ کے کلام پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ آپ کا نثار احمد فاروقی سے خون کا رشتہ ہے۔ میرا یہ رشتہ تو نہیں مگر محسوس ہوتا ہے ہو سکتا ہے خون کا خاندان ایک ہو۔ یعنی گروپ!

آپ یاد کرتے ہیں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد دلاتے ہیں۔ میں ٹھٹھک جاتا ہوں۔ مگر پھر اپنی دنیا میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایسے میں بھی آپ ہی کا ایک پیارا سا شعر ذہن میں آتا ہے۔ جو ہے تو آپ کے کسی من کے چور کے بارے میں مگر ہے خوب! ؎

میں نے جب ان سے کہا وعدہ تو ایفا کیجئے
ہنس کے فرمایا کہ کیا تری قضا آئی ہے

میرے نزدیک بھی انسانیت ہی، انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ مگر اس دور میں ہے وہی عنقا، ماتم میں بھی کرتا ہوں۔ ماتم آپ بھی کرتے ہیں ؎

اس دور کو میں بھول ہی سکتا نہیں خاور
جس دور کے انسان کو بھی انسان نہیں دیکھا

زیادہ کیا لکھوں۔ سوچیں بڑی حد تک مشترک ہیں۔ اگر کسی کو خبر نہ ہو تو کان میں کہہ دوں کہ آپ کا اندیشہ یہی صحیح ہے ؎

میں پا چکا ہوں گم شدہ منزل اسی لیے
اب پھر تلاش راہنما کر رہا ہوں

آپ کا محمد طفیل ۲۸/۷/۷۶

کشور ناہید

مکرمہ!

آپ کا بولتا ہوا خط ملا۔ اپنا گونگا جواب حاضر ہے

مکرمی لفظ کے علاوہ، آپ کی چٹھی کی سات سطریں ہیں۔ سطر بہ سطر (ستر بہ ستر نہیں) جواب سن لیجئے۔

اللہ نے آپ کو بھی احتساب سے بچایا ہے۔ لہٰذا رسالے کو بھی بچائے گا۔ اس لیے نہ آپ کے اعمالنامے پر بات ہو سکتی ہے اور نہ رسالے کے مندرجات پر، یہ جواب تو آپ کی پہلی سوا تین سطروں کا ہو گیا۔

باقی رہا ایک سطر اور ایک لفظ کا جواب، سو وہ بھی عرض ہے کہ لکھنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی سی ذہنی فرصت لا دیجئے۔ تاکہ تحریری ارمان تو پورے ہوں۔ باقی نہیں تو نہ سہی!

آخری دو سطروں کا جواب یہ ہے کہ جیسی آپ اچھی ہیں۔ ویسا آپ کا رسالہ اچھا ہے۔

محمد طفیل

[اگر میرے اس طریقے میں، آپ کے لیے تقدس مآب الفاظ، بہ قدر ضرورت کم مندرج ہوں تو پہلے وہ شامل کر لیجئے گا۔ پھر خط پڑھیے گا۔]

عذرا مسعود

اچھی بہن،

آپ کا خط ملا تھا۔ میرا جواب نہ ملا ہو گا، اس لئے کہ لکھا ہی نہ تھا۔

آپ جو کچھ لکھا کریں۔ وہ اگر مجھے بھی دکھا دیا کریں گی تو آپ کے قلم کو نظر نہ لگے گی اور آپ کو نظر اس لئے نہ لگے گی کہ رشتہ نظر لگنے والا رہا نہیں، (بے شک یہ فقرہ مسعود صاحب کو بھی سنا دیں) بہرحال مجھے مضمون پڑھوائیں ضرور!

یہ عجیب بات ہے کہ ادا لاہور آئیں۔ لاہور رہیں۔ مگر اُن سے ملاقات نہ ہوئی۔ اب وہ امریکہ چلی گئی ہیں اور اُن کی خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگ رہا ہوں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ محترمہ جمیلہ ہاشمی خدا کے گھر سے بھی ہو آئیں۔ مگر دیدار نہ ہوا۔ اب تو کریلا اور نیم چڑھا والا محاورہ تانیث کی صورت میں سچ ثابت ہو گا۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ کوئی بڑا ہی باہمت شخص ہو گا۔

کیا عید پر ملاقات کا امکان ہے؟ مسعود بھائی سے کہیں زیادہ بچت اچھی نہیں ہوتی۔

۲۴/۹/۷۶ آپ کا بھائی محمد طفیل

رفیع الدین ہاشمی

محترم! اسلام مسنون!

مضمون مل گیا۔ دل خوش ہو گیا۔

اب دوسرے مضمون کا انتظار ہے۔ بار ہا ایسا بھی ہوا کہ دوستوں نے بے طلب ایک سے زیادہ مضامین عنایت فرمائے۔ مگر وہ واجبی کے زمرے میں آئے۔ آپ سے بہ اصرار مضمون مانگ رہا ہوں۔ اس لئے کہ آپ موضوع کا حق ادا کرتے ہیں۔ "اقبال اور موجودہ تصانیف" موضوع کے اعتبار سے بھی اہم مضمون ہے۔ اہلِ علم سرشار ہوں گے۔ زیادہ کیا لکھوں؟

آپ نے لکھا ہے کہ اقبال نمبر کے سلسلے میں دھاکہ ہو گا۔ اِن دنوں جب کہ بے شمار سیاسی دھماکے ہو رہے ہوں۔ ایک ادبی دھماکے کی کیا وقعت؟ ذرا سا اطمینان یہ ہے کہ سیاسی دھماکوں کی گونج وقتی ہوتی ہے۔ اور ادبی دھماکوں کی گونج برسوں بلکہ صدیوں سنائی دیتی ہے۔ بارود کی بدبو اور قلم کی خوشبو کا مقابلہ کیا؟۔

اگر آپ کا مضمون دس پندرہ روز تک مل جائے تو اچھا ہو۔ مضمون وقت پر ملے تو مدیر کو آسانی رہتی ہے۔ ورنہ اچھے مضامین منہ بسور لیتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ مضامین مجھ سے خوب باتیں کرتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

محمد طفیل ۵/۴/۷۷

ضمیر اختر نقوی

محترم، تسلیمات!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جس خلوص سے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ باعثِ اطمینان ہوا۔ نمبر اِس ترتیب سے ہی پیش کئے جا سکیں گے۔ (۱) اقبال نمبر (۲) سیرۃ نمبر (۳) انیس یا میر نمبر۔ میرا کام کرنے کا انداز، دلجمعی کا انداز ہے۔ کاتا اور لے دوڑی والا قصہ نہیں۔ یعنی موضوع کے ساتھ، برسوں تعلقات استوار رکھتا ہوں۔ تب دُوئی دور ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کی محبت اور آپ کی یقین دہانی پر، انیس نمبر کے لیے بھی سعی کروں گا۔ ویسے کرنے کے کام اور بھی بہت ہیں۔ جن کا ڈول ڈال چکا ہوں۔ بہرحال یہ کام بھی اُسی کھاتے میں سے ہے۔ مسئلہ صرف نادر مواد کے حصول کا ہو گا۔ سو وہ فراہم کرنے میں مدد دیجئے۔ لیجئے میں نے بھی بسم اللہ کر دی!

ذہن یہ کہتا ہے کہ آپ ایک مضمون "اقبال دربارِ اہلِ بیت میں" اقبال نمبر کے لیے اور دوسرا مضمون سیرۃ نمبر کے لئے "رسولؐ نہج البلاغہ کی روشنی میں" لکھیں۔ ظاہر ہے کہ انداز علمی ہی ہو گا۔ جو سبھی کے لیے پسندیدہ ہو۔ سیدھی بات کہ میں شیعہ نہیں ہوں۔ پھر بھی مجھے مضامین اچھے لگیں۔

اُمید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

محمد طفیل ۱۰/۳/۷۷

پروفیسر محمد جاوید اقبال

جنابِ من!

آدمی ایک ہوں (وہ بھی معلوم نہیں کہ ہوں کہ نہیں ہوں) باز پُرس کرنے والے بہت! دس بیس ہوں تو بھی اطمینان کا سانس لوں۔ معاملہ ہزاروں کا ہے۔ کیا کروں کیا نہ کروں! اسی سود و زیاں میں دن رات کٹ جاتے ہیں یوں جس کا جتنا جی چاہے۔ بُرا بھلا کہہ لے، میں خوش میرا خدا خوش!

آپ نے ایک سیدھا سا سوال، ایک اکیلے آدمی سے کر ڈالا۔ یعنی اپنے میگزین کے بارے میں رائے پوچھ ڈالی۔ جو شخص کبھی اپنے کام سے مطمئن نہ ہوا۔ وہ شخص دوسروں کے بارے میں کیا رائے دے؟ اگر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو جان لیجیے۔ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ اگر اِس جمہوریت کے زمانے میں، عوام کی سندِ اطمینان دلا سکے تو یہ بھی عرض کر سکتا ہوں۔ قاری واہ وا کرتے ہوں گے۔

اگر میری بے نیازی نے، آپ کی عقیدت اور نیازمندی کے آبگینے کو ٹھیس پہنچائی ہے تو آپ کا کچھ فائدہ ہی ہو گیا۔ خلش جاتی رہی۔ اور کیا چاہیے جناب! اس پر بھی آپ ملول ہوں تو کفرانِ نعمت والی بات ہو گی۔

اگر ارشد میر (ایڈووکیٹ) ملیں تو ان سے کہہ دیجیے ملزم نے اقبال جرم کر لیا۔

آپ کا محمد طفیل ۲۲/۲/۷۷

عبدالواحد دُرّانی

جناب!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اِس سے قبل آپ کا الٹی میٹم ملا تھا کہ "اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ مضامین کی نقول میرے پاس ہیں۔ وہ میں کہیں اور چھپوا رہا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ میں، آپ کے فیصلے کے حضور چُپ ہی رہ سکتا تھا۔ اِدھر اپنا حال یہ ہے کہ کوئی بھی کام مجھ سے برسوں کی ریاضت کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسے میرا عجز کہہ لیجیے یا عشق۔ ظاہر ہے کہ میں اگر کُن بھی کہہ دوں تو کچھ نہ ہو گا۔ ایک عاجز جدوجہد اور مسلسل جدوجہد پر ہی بھروسا کر سکتا ہے۔ سو اس شغل میں، جو کوئی میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تو میں بھی کیا کر سکتا ہوں۔

بندہ نواز، اپنے مضامین، کہیں اور چھپوانا چاہتے ہیں تو ضرور چھپوا لیجیے۔ میں خوش میرا خدا خوش، اِس صورت میں نہ آپ کو قصور وار سمجھوں گا اور نہ اپنے آپ کو مجرم، میری چپقلش اور رہے آپ کا مسئلہ اور "تازہ نقوش بھجوا رہا ہوں" تا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ شخص بُرا بھی تھا اور بے مروت بھی؟

آپ کا محمد طفیل ۱۰/۳/۷۷

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جنابِ من!

ایک صاحبہ ہیں منیبتہ الکبریٰ شیخ، زبان کی تیز، دل کی اچھی! - اور خیر سے ہماری بیگم کی عزیز ترین دوست!

اِدھر منیبہ کو اپنے پی - ایچ - ڈی کے مقالے کے لیے آپ کی اعانت کی ضرورت ہے۔ اُدھر گھر کے سکون کے لئے، مجھے اپنی بیگم کی خوشنودی مطلوب! - سو بھائی! ان محترمہ کا خیال رکھئے گا۔ ورنہ بیگم طعنہ دیں گی جیسے جناب! ویسے ہی جناب کے دوست!

ملاقات کو ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ کوئی سبیل نکالوں گا — ویسے آپ لوگوں کی رہائش بھی اللہ میاں کے آس پاس ہے۔ کوئی کرے بھی تو کیا۔

۳۰/۷/۷۵ آپ کا محمد طفیل

آغا سرخوش

برادرم آغا صاحب! سلام مسنون!

مدت ہوئی - آغا شاعر کا یہ شعر سنا تھا۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے غم کی

جس نے یہ شعر سنایا تھا۔ وہ صاحب تقریباً تڑپ رہے تھے لیکن بندہ پہ وہ کیفیت طاری نہ ہو سکی۔ معلوم ہوا کہ وہ زیادہ چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ اس لیے اُن کا اِس شعر پہ حق بھی، مجھ سے زیادہ ہی تھا۔ اب جب آپ نے از رہِ لطف، مجھے آغا شاعر کی حیات و شاعری پہ "آغا شاعر" نام کی کتاب دی تو میری نظر اس شعر پہ پڑی۔

آدمی آدمی سے ملتا ہے
بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں

تو میں آغا شاعر کا دل سے قائل ہو گیا۔ میرا قائل ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس لئے کہ زمانہ ان کے فنی کمالات کا معترف ہے۔ بھلا ایسا کیوں نہ ہو؟ وہ مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کے کلام میں بھی، میں نے وہی تیور پائے ہیں اور مجھے زبان کا لوچ بھی ویسا ہی ملا۔

جنہوں نے اِن کا کلام، خود اُن سے سُنا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پڑھتے وقت آغا صاحب شعر کی تصویر بن جایا کرتے تھے۔ پڑھنے میں ان کی کڑک اور دھمک کے بھی سبھی قائل ہیں۔ ندرتِ کلام کی نزاکتیں اپنی جگہ۔

جہاں انہوں نے عشق و عاشق کی شاعری کی معلوم ہوتا ہے۔ وہاں وہ عشق و عاشقی کے معاملات سے عملاً گزرے بھی ہوں گے۔ یہ بات کتاب میں لکھی نظر نہیں آتی۔ مگر ان کا کلام کہتا یہی ہے۔ اشارۃً سحاب نے بھی بتایا تھا "میرے ابا

بہت قاعدے میں رہتے۔ بشرطیکہ عورتیں انھیں خراب نہ کرتیں۔" جوانی کا بھرپور فائدہ اٹھانے والے شاعر پر اس کا ردِ عمل بھی شدید ہوا۔ فقیری اختیار کر لی گیروے رنگ کے کپڑے پہن لیے۔ دنیا تیاگ دی جبھی تو خواجہ حسن نظامی نے کہا۔ آئیے دلدار بادشاہ!

جو شخص بھی آغا شاعر سے ملا تھا وہ ان کی دوستی پر نازاں تھا۔ اگر یوں نہ ہوتا تو دتاتریہ کیفی ایسا صاحب نظر یہ نہ کہتا کہ آغا شاعر میرے پیارے دوستوں میں سے تھے۔"

ان کی باغ و بہار قسم کی شخصیت کے سلسلے میں چونکہ ہمارے حصے میں صرف دور کا جلوہ آیا ہے۔ اس لیے خواہش پیدا ہوتی ہے کاش وہ آج بھی زندہ ہوتے! کیونکہ شنیدہ مانند دیدہ نہیں ہوتا۔

محمد طفیل ۴/۲/۷۴

پروین فنا سید

بی بی! سنو،

اِس عاجز کے نام، آپ کا خاصا طویل شکایت نامہ ملا۔ جی خوش ہوا۔ اچھا ہوا کہ ایک اور ہستی کا علم ہو گیا کہ جو مجھ سے ناخوش ہے۔ اب بھی یہ ہے کہ خیر خواہوں میں، خفا ہونے والوں کی اوسط، کچھ کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے لیے دل سے دعا نکلی۔ خدایا انھیں تو استقامت بخشیو!

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آپ سے کہیں ملاقات ہوئی ہے۔ میری ذات ایک معمہ ہے۔ کبھی خود کو نہیں پہچانتا۔ کبھی دوسروں کو نہیں پہچانتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مجھے "خونخوار اور گھمبیر خاموشی" کا آئینہ دکھایا۔ چلو حساب بے باق ہوا۔ یا ابھی اصل زر میں سے کچھ باقی ہے؟

طعنوں مہنوں کے حساب میں نہیں بلکہ یہ خط، یہ بتانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اِس خاکسار پر سے اب تو فردِ جرم اٹھا لیجیے۔ کیونکہ کتاب کو چھپے، دوسرا ہفتہ گزر کر تیسرا ہفتہ شروع ہونے والا ہے۔ سچی باتیں کم کہتا ہوں مگر یہ سچی ہے۔

آپ کو جو مجھ سے حقیقی شکایت ہے۔ اس کا بھی حال سن لیجیے۔ ۹ ماہ حال کو ریڈیو والے اپنے پروگرام تیس منٹ میرے ساتھ" کے سلسلے میں مجھے پکڑ کر لے گئے۔ (ریڈیو پر جانا میرے نزدیک کسی طرح بھی فعلِ قبیح سے کم نہیں) وہ پروگرام ایسا ہے کہ شخص ناعاقبت اندیش، اپنے بارے میں کچھ باتیں کرتا ہے۔ اور بیچ بیچ میں، پسندیدہ موسیقی کے ریکارڈ سنواتا ہے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تو اس کا جواب میں نے یہ دیا۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مجھے موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مجھے ادب کے علاوہ کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں بقول ریڈیو والوں کے سامعین کو دلچسپی ہے۔ لہٰذا میں ان سے کہتا ہوں کہ کسی خوش شکل فن کار سے، کسی بڑے شاعر کا کلام سنوا دیں۔

ماشاءاللہ اِس اولاد (حرفِ وفا) کے علاوہ اور کتنی "کتابوں" کی مصنف ہیں؟

محمد طفیل ۱۹/۶/۷۴

منظور الٰہی

بھائی! آج صبح گھرے گھرے اور کالے کالے بادل اُمڈے جھوم جھام کے برس بھی گئے۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے موسم بڑا ڈگمگانے والا ہے اور حضرات معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ آپ کا مضمون ہی نقل کر دوں۔

جب مضمون نقل کرنے لگا تو اس میں لندن آ گیا۔ اب میں کیا کروں؟ مجھے اپنا لندن یاد آ گیا۔ دوہری مار پڑی۔ ایک موسم کی، دوسری یادوں کی، بہرحال میرے لیے یہ خوشی کم نہیں کہ مضمون نقل کر رہا ہوں۔

یہ بھی سنئے جناب! یہ خطرہ ہے کہ میں اگست کے پہلے ہفتے میں کراچی پہنچوں۔ معاملہ وہی دریوزہ گری والا ہے دو آفسٹ مشینوں کے لیے لائسنس حاصل کیا ہے۔ حسبِ عادت برنی صاحب کو پھر تنگ کروں گا۔ ہرچند کہ ادائی میں میرا ریکارڈ اچھا ہے۔ لیکن مانگنے والے کو بھی کچھ شرم آنی چاہیے۔ ہائے رے مجبوریاں!

اگر دو تین دن ٹھہرنے سے آپ کا مسودہ تیار ہونے کے موڈ میں ہوا تو بندہ ساتھ لے آئے گا۔ اسی لئے باقیات الصالحات میں سے، نقل مطابق اصل پہلے بھجوا رہا ہوں۔

محمد طفیل

۲۹/۷/۷۱

مختار زمن

برادرم! — آپ کا مضمون ملا۔ پڑھ کر لطف لیا۔ چونکہ میں بھی اُدھر کی ہوا کھا آیا ہوں۔ اس لیے مضمون کچھ زیادہ ہی لذیذ معلوم ہوا۔ عن قریب چھاپوں گا۔ آپ کا ایک گرامی نامہ کوئی سو، سوا سو دن پہلے ملا تھا۔ جس میں آپ نے لکھا تھا کہ غمگین پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ اس کے جواب میں میں نے فوراً دو سطریں گھسیٹی تھیں کہ ضرور لکھئے بلکہ جلد لکھیے۔ پھر آپ نے اس ضمن میں کوئی بات نہ اٹھائی۔ کیا وہ مضمون نہیں لکھا یا میرا "محبت نامہ" نہیں ملا؟ میں نے اپنے اُس خط میں نشان دہی بھی کی تھی کہ حضرت جی کے بارے میں فلاں فلاں جگہ سے کچا پکا مواد مل سکتا ہے۔ ایک مضمون تو اب کے بندہ ہی چھاپ رہا ہے۔ اچھا مضمون ہے۔

اب آپ لندن سے بیزار نظر آتے ہیں مگر جب آپ لوٹ آئیں گے تو بری طرح بہت یاد کریں گے۔ اگر سفید چمڑی والوں میں کچھ احساسِ بیگانگی پیدا ہو جائے۔ تو پھر وہ جگہ مرنے کے لئے بھی بُری نہیں۔ وہاں کسی پہ مرنے کے تو امکانات بہت ہیں مگر کسی کے لیے مرنے کا جذبہ مفقود ہے۔

وطن میں ان دنوں زوروں کی گرمی پڑ رہی ہے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی والی گرمی، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے والی گرمی، اس کے باوجود اگر گرمی سے آنکھیں چرا کر، کوئی دل پسند قسم کا کام کرنے کی ٹھان لی جائے تو پھر لطف بھی سوا ملتا ہے۔

پرسانِ حال سے میرا سلام کہئے۔ پھر مجھے بتائیے۔ اِس احاطہ میں کون کون آیا؟ [بائی بائی]

محمد طفیل

۱۵/۶/۷۱

ممتاز مرزا

کتو!

تیرا پہلا خط نہیں ملا۔ یہ دوسرا ملا ہے۔

اچھا بھئی گزری ہوئی سالگرہ مبارک ہو۔ اُس دن تم دونوں منہ بسورے کیوں پڑے رہے۔ سال گرہ کی رعایت سے جو کچھ ہونا چاہیے۔ وہ ہونا چاہئے تھا۔ دعوت، ناچ گانا وغیرہ!

اب مجھے تمہاری سال گرہ کا دن بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ سب کیا دھرا تیرا ہے۔ کیونکہ اب مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگ گیا ہے کہ تو اپنی مرضی کی مالک ہے اور یہ کوئی بُری بات نہیں، یہی سوچ کے اپنا خون کھولانا بند کر دیا ہے۔

پہلے جو میں تم سے ناراض رہا کرتا تھا، خط نہیں لکھا کرتا تھا۔ وہ مان ٹوٹ چکا ہے۔ اب میں ناراض بھی نہیں ہوا کروں گا، خط بھی لکھا کروں گا۔ غرض جو تو چاہتی ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ تعلقات کی آبرو کی ایک نہج یہ بھی ہے۔

تو حالات کی زنجیریں کاٹ نہ سکی اور میں تیرے زندگی کے "سو سالہ پلان" سے تھک گیا۔ بات تو صرف اتنی ہے۔ ہاں اگر مجھے تیرے خلوص پر شبہ ہوتا تو پھر میں تیرے خیال کو بھی دفن کر دیتا۔ اب تو تجھے ذہن کے آس پاس رکھنے میں میری اپنی بھی بھلائی ہے ورنہ یہ تاثر کہ میرے ساتھ فریب ہوا۔ مجھے پاگل بنا دیتی۔ میں نے اپنے اُن ادبی کاموں کو، جسے تمہاری رفاقت میں انجام دینا تھا۔ فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔ اور وہ "گل کدہ" والی اسکیم بھی دھری رہ گئی۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ بعض کاموں کے ہو جانے میں عافیت ہوتی ہے اور بعض کاموں کے نہ ہونے میں حسن ہوتا ہے۔ چونکہ اپنی طبیعت (اب) ہر حال میں شاکر ہے۔ اس لیے پریشان نہیں ہوں۔ یوں بھی ٹھیک! ووں بھی ٹھیک۔

میرزا جی کی خدمت میں آداب و نیاز۔

۲۳/۸/۷۱ محمد طفیل

کتو! سلام مسنون!

خط ملا۔ میرزا صاحب محترم کا بھی خط ملا۔ اب دو نو جواب سنیں!

اِن دنوں، آپ ہی کی طرح، میری منہ بولی بہن شکیلہ پٹنہ سے آئی ہوئی تھیں۔ میں نے اُسے میرزا صاحب کا خط اور آپ کا خط دکھایا تو وہ بہت جلیں۔ کہنے لگیں میرا آج وہ غرور ٹوٹ گیا جس میں میں اُڑی پھرتی تھی۔ پھر آپ دونوں کی تصویر دیکھ کے اور پریشان ہوئی۔ مجھے کہنے لگیں "یہ بتاؤ، ہم دونوں میں تمھیں کون زیادہ عزیز ہے۔"

شکیلہ میری بڑی اچھی بہن ہے۔ مجھ سے سات سال بڑی ہیں۔ مگر طبیعت بچوں والی پائی ہے۔ مجھ سے ڈرتی ہیں۔ حالانکہ میں نے اُن کی بڑائی کے احترام میں کسر نہیں چھوڑی۔

یہ اب کراچی گئی ہیں۔ واپسی پہ پھر آئیں گی۔ شاید پھر دس بارہ روز رکیں۔ ان کی سگی بہن یہاں ہے۔ رشتہ دار ہیں۔ مگر اسے بھائی کی محبت نے پریشان کر رکھا ہے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں! — کہنا یہ چاہتا تھا۔ اُن کی موجودگی میں، کچھ کام نہ کر سکا۔ وہ گھنٹوں میٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ میں گھنٹوں بیٹھا سنا کرتا تھا۔ پاگل وہ بھی، پاگل میں بھی!

آپ لوگوں کا حال پڑھ کے سخت صدمہ ہوا۔ کیا کروں۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اس فکر میں ہوں کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ مجھ پہ ترس کھائے اور وہ کچھ روپے، کتنو کو بھیجدے تو سمجھوں، تکلیف کے وقت، بھائی، بہن کے کام آیا۔

خدا آپ دونوں کو جملہ حوادث سے بچائے۔ بھئی خط برابر لکھتی رہا کرو۔ خواہ میں جواب دوں یا نہ دوں۔ بہن کا دل تو بڑا نرم اور کشادہ ہوتا ہے۔ پھر یہ خط نہ لکھنے کی کنجوسی کیوں! — ایک اور شمارہ آیا ہے پہنچا کہ نہیں؟

میرزا صاحب! آپ نے یہ خوشخبری سنائی تھی — "ہم پاکستان آئیں گے" — میں کبھی کبھی نماز پڑھتا ہوں۔ کل صبح نماز پڑھ کے ایک دعا مانگی ہے۔ دیکھئے۔

۲۱/۵/۵۹ آپ دونوں کا اپنا۔ محمد طفیل

علی عباس جلالپوری

محترم سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ دلی شکریہ!

آپ نے "کارِ جہاں دراز ہے" کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے لیے میں بھی ممنون ہوں۔ محترمہ تک بھی و تحریر پہنچا دی جائے گی۔

کبھی آپ بھی، میرے اپنے تھے۔ نقوش کی ابتدائی فائیلوں میں آپ کے کئی گرانقدر مضامین چھپے۔ اس کے بعد نہ جانے کیا پڑا کہ دُور ہو گئے۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ ہی کو قصور وار جانا، سو ہو سکتا ہے کہ کچھ زیادتی مجھی سے ہوئی ہو۔

آپ میں حد درجہ خودداری کا عنصر ہے۔ یہ "خرابی" کچھ کم سہی مجھ میں بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خودداریاں ٹکرا گئی ہوں۔ بہر حال میں آپ کے علم و فضل کا معترف ہوں۔ ادب میں آپ کا بڑا مقام ہے۔ یعنی آپ کا فیض جاری ہے۔ جزاک اللہ!

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ والسلام

۲۲/۱۰/۷۴ محمد طفیل

محمد حمید اللہ (پیرس)

محترم المقام، سلام مسنون!

نقوش ایک ادبی رسالہ ہے۔ شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔ شاید اس کا کوئی نمبر دیکھا ہو۔ اگر کوئی نمبر دیکھا ہوگا تو اس میں آپ کو میرے دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنائی دی ہو گی۔

نقوش کی ۲۵ ویں سالگرہ پر، میں نے یہ چاہا ہے کہ جب میں نے ادبی موضوعات پر کئی کئی ہزار صفحوں کے نمبر نکالے ہیں تو پھر کیوں نہ رسولؐ نمبر بھی چھاپوں۔

یہ کیا جذبہ ہے؟ یہ کیا لگن ہے؟ چپ چاپ قلب رُو کیسے ہو گیا؟ یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر یہ احساس ضرور ہے کہ اس موضوع پر مجھے بھی کام کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مجھے اپنی صلاحیتوں سے زیادہ خدا کی ذات پر بھروسا ہے۔ ایک بڑھیا بھی تو سوت کی انٹی

لے کر یوسف کی خریداری کے لیے نکلی تھی نا؟

اس نمبر کو میں اس نوع کا چھاپنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا حاصل ہو اور جسے یاد رکھا جا سکے۔ سو اس سلسلے میں میری مدد فرمائیے اس موضوع پر مجھے عربی میں ضروری مواد بہم پہنچائیں۔ جسے اُردو داں طبقے تک پہنچانا ضروری ہو (ترجمہ میں کرا لوں گا) نادر مواد کی نہ صرف نشان دہی فرمائیں بلکہ دلوائیں بھی۔ آپ خود مجھے اپنے ذہن اور قلم کی کاوشوں میں سے کیا کچھ عنایت فرمائیں گے؟ اور اس ضمن میں ضروری ہدایتیں بھی!

ہاں یہ تو فرمائیں آپ نے اپنی تصنیف "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" میں صفحہ ۲۷ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضور کے پونے تین سو خطوط "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ" میں چھپ چکے ہیں۔ دو درجن مزید مکتوبات نبوی کا پتا چلا ہے۔ ہم جملہ خطوط نمبر میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ مدد فرمائیں (آپ کی کتاب سیاسی وثیقہ جات میں بھی پورے خطوط نہیں ہیں)

محمد طفیل ۲۸/۶/۷۲

سید محمد نواز

جناب!

میں نے عرصے سے، آپ کے شہر میں نزول نہیں فرمایا۔ ارادے بہت کیے لیکن وہ پورے نہ ہوئے۔ حالانکہ ایسے ارادوں کی تکمیل میں، اللہ میاں کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پچھلے دنوں پکا ہی ارادہ کر لیا تھا کہ عروس البلاد پہنچوں۔ پھر معلوم ہوا۔ ہماری دوستی کا شہزادہ تو وہاں ہے نہیں۔ دیارِ فرنگ میں، تیمارداری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ناچار پھر اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اب وہ شہزادہ لوٹا بھی تو اسلام آباد پہنچے گا۔ ویسے میں جون ہی میں، کراچی پہنچوں گا۔ زیادہ دیر تک چاہنے والوں کو ٹرخایا نہیں جا سکتا۔

میں کراچی پہنچا تو میری شعوری کوشش یہ ہو گی کہ آپ سے ملاقات نہ ہو۔ لوگ تمنائے دید رکھتے ہیں لیکن ہم محرومئ دید ہی سے، اخلاص کی شمع روشن رکھیں گے۔

حفیظ صاحب کو رسالہ بھجوا دیا۔ اور کوئی حکم؟ خط کا شکریہ

محمد طفیل ۳۶/۵/۷۲

آصف علوی

برادرم، آداب!

پچھلے دنوں کنوئیں سے مینڈک باہر نکل گیا تھا یعنی بندہ لاہور سے لندن چلا گیا تھا۔ ۱۸ر اگست کو گیا تھا۔ ۱۲ر اکتوبر کو واپس آیا۔ گوروں کو خوب دیکھا۔ ہر رنگ میں دیکھا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لی جائیں۔ پھر سوچتا، یوں کرنا مردانگی کے خلاف ہے۔ ہمارا مذہب ہمارا اخلاق کچھ اور کہتا تھا اُن کا مذہب اور اخلاق کچھ اور سکھلاتا تھا۔ غرض یہ شخص بہت بدھو بنا۔

سیانے کہتے ہیں کہ دوست کو امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ میں اس تنبیہہ پر صد فی صد کاربند تھا مگر ایک دوست کے بہکانے میں آگیا، خط لکھ دیا کہ میرے بھتیجے کو نوکر کرا دیجئے۔ جو نہیں ہوا۔ آئیے اب اس مسئلے کو مل جل کر حل کر دیں۔ یعنی ان سے ذکر نہ کرائیں۔

میرے محب جناب حبیب انصاری کیسے ہیں؟ کہیں وہ تو الیکشن میں کھڑے نہیں ہو گئے؟ کیونکہ قوم کا غم انھیں بھی بہت ستایا کرتا تھا۔ اس مرتبہ تو ہمارا (صرف) اللہ ہی حافظ ہے۔ گو ہم فرشتے پہلے بھی نہ تھے۔ مگر ان دنوں تو یہ سوچنا پڑ گیا ہے کہ کم برا کون ہے۔ اب بھابی کے زہد و تقویٰ کا کیا عالم ہے؟ مرا ان سے آداب ضرور کہیں

۱۲/۱۱/۷۰

محمد طفیل

ڈاکٹر سید عبداللہ

برادرِ محترم! سلام مسنون!

آپ کا مقالہ ”ابنِ عربی اور اقبال“ مل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ کا لکھا ہوا ہے۔ ورنہ پہلے تو ڈاکٹر صاحب کا ارادہ مجھے ٹرخانے کا تھا۔

باقی رہا دوسرا مسئلہ کہ — ”اب تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں آپ کے ساتھ تعاون نہیں کرتا“ چلیے اس ضمن میں، میں کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ یہ مسئلہ ہے تو کچھ! — آپ کو یہ تک معلوم ہے کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر کیا لکھا ہے۔ لیکن کتابِ دل پر جو کچھ میرے بارے میں لکھا ہے اُسے بھی کسی دن زیرِ غور لائیے [صفحہ ۱۲۲[1]، سطر پہلی]

اگر میں نے کوئی پہیلی کہہ دی ہو تو مجھے عرض یہ کرنا ہوگا کہ میں بھی بہ رنگِ دیگر، آپ ہی کے مشن کو سرمایۂ زیست بنائے ہوئے ہوں۔ مگر میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے کبھی بھی سینے سے نہیں لگایا۔ ڈر لگتا ہے؟

ایسی کھلی کھلی باتیں، میں ہر ایک سے نہیں کہتا۔ جب کسی کو اپنا جان لیتا ہوں تو پھر چپ بھی نہیں رہتا۔ بولتا جاتا ہوں۔ بولتا جاتا ہوں۔

آپ کا محمد طفیل
۳۰/۴/۷۷

فرہاد زیدی

اولادِ حسین!

کئی دفعہ دل چاہا کہ خط لکھوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ جو باتیں لکھنے کی ہیں۔ انھیں لکھ نہیں سکتا۔ اور جو باتیں لکھ سکتا ہوں۔ اُن کا لکھنا کیا! بہر حال اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ یاد آتے ہو۔

میں اکتوبر کے شروع میں کراچی آؤں گا۔ کئی دوستوں کا تقاضا ہے مگر اُس فہرست میں تمہارا نام نہیں۔ بہر حال پہنچنے پر چند دوستوں اور کچھ دشمنوں سے ملوں گا ضرور!

---

[1] نقوش کے شماروں کا نمبر

غالب مرگیا۔ مگر وہ اپنے بعد اتنے مطالبے چھوڑ گیا کہ انھیں ادا تو کرتے رہیں مگر حق ادا نہیں ہوتا۔ تین نمبر تو میں نے چھاپ ڈالے۔ نیا نمبر بھجوا رہا ہوں۔ تبصرہ نہ کر سکو تو بھی اسے ایک نظر دیکھ ضرور لینا!

محمد طفیل

۲۶/۹/۷۱

مختار مسعود

برادرم، وعلیکم السلام

آپ کا خط بہ اُردو میں ملا اور خط بہ انگریزی میں' حالانکہ آپ کا خط اُردو میں اور مضمون انگریزی میں ملنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ خط مجھے پڑھنا تھا اور مضمون دوسروں نے۔ میں دوسروں سے زیادہ، اچھی باتوں کو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ میرا یوں سوچنا، میری فطرت ہے۔ اس لیے میرا گھٹیا پن، ایک جواز رکھتا ہے۔

یہ مضمون مجھے بہت پسند ہے۔ بہت پسند' اس لیے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار آپ سے کسی کی تعریف سُنی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے انا کے بادشاہ مختار مسعود اپنی جگہ سے کھسک رہے ہوں اور اُن کی جگہ درویش صفت مختار مسعود اُبھر رہے ہوں۔ یہ میرے لیے انکشاف ہے اور اُس پہ میں خوش!

مضمون کے بارے میں اور کچھ عرض نہ کروں گا۔ اس لیے کہ آپ نے ڈھیروں داد وصول کی ہوگی۔ اگر آپ کہیں "جا تجھے جان کی امان بخشی" تو پھر ڈرتے جھجکتے یہ کہوں گا کہ آپ کے شوخ قلم نے ایک دو جگہ زیادہ اُپج کا ثبوت دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شوخی بقدرِ ضرورت ہو' بقدرِ نمود نہ ہو۔ آپ کے "چھت اُڑا دینے والے قہقہے" "جوش کا جوشاندہ" وغیرہ مجھے کھل رہے ہیں۔ آپ کو میری اس گذارش پہ برہم نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ صد فی صد غلط بھی تو ٹھہرائی جا سکتی ہے۔

میں اتوار کے روز ایک سوا بجے کے قریب ریل کار سے سوار ہوں گا۔ شام کے قریب پنڈی پہنچوں گا۔ پیر کے روز مجید مفتی صاحب سے دفتر میں ملوں گا اور اُسی دن لاہور کے لیے چل دوں گا۔ مگر ان چند گھنٹوں میں بھی آپ کی ایک جھلک تو دیکھ ہی سکوں گا۔

امید کہ آپ سب اچھے ہوں گے۔

محمد طفیل

۲۷/۸/۷۱

مجروح سلطان پوری

برادرم، سلام مسنون

آپ کا ۲۲ اکتوبر کا لکھا ہوا گرامی نامہ مجھے ۹ نومبر کو ملا۔ تقریباً ۱۹ دن بعد' آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس نالائق نے جواب نہ دیا ہوگا۔ حالانکہ یہ کرشمہ ہمارے "اچھے تعلقات" کا ہے۔ دونوں حکومتیں سونگھتی ہیں کہ کہیں خطوں میں ایٹم بم تو نہیں رکھ دیا گیا۔

میں پچھلے دنوں لندن چلا گیا تھا۔ کچھ کم دو مہینے وہاں رہا۔ خیال تھا کہ واپسی پہ دلی اور بمبئی کے دوستوں کو بھی دیکھوں گا مگر وہ ارمان پورا نہ ہوا۔ دہل گیا۔ سوچا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کسی ہوائی اڈہ پر وہ ساری خوشیاں نچوڑ لی جائیں جو کہ حصہ میں آ گئی تھیں۔

کیا آپ نے اگست کے بعد نئی غزل نہیں کہی؟ ہمارے ہاں جو آپ کی آخری غزل چھپی تھی اُس کا مطلع یہ تھا ؎

سوئے مقتل کہ پئے سیرِ چمن جاتے ہیں
اہلِ دل جام بکف سر بہ کفن جاتے ہیں

ایسا یاد پڑتا ہے کہ آپ نے اس کے بعد بھی مجھے ایک غزل بھیجی تھی۔ مگر کیا کروں۔ اپنی یادداشت پہ بھروسا نہیں، اتنا بھی بھروسا نہیں جتنا کہ اعلانِ تاشقند کے بعد، اچھے تعلقات کا ہو سکتا ہے۔

بیاضِ غالب کا یہ ہے کہ بھجوائی تھی مگر وہ آپ تک نہیں پہنچی۔ کیا کروں؟ میں تو خود چاہتا ہوں کہ "میرے اشعار" دوستوں تک پہنچیں تاکہ داد ملے۔ اگر کوئی شعری سقم رہ گیا ہو تو پکڑا بھی جاؤں مگر ایسا ہونے میں دشواریاں بہت ہیں۔ آپ کا کوئی پیارا ادھر سے مطلع فرما دیجئے گا۔

آپ کی زبان سے، اپنی خاکہ نویسی کا حال سن کر، خوشی کم، پریشانی زیادہ ہوئی۔ اس لئے کہ اِس میدان میں توقعات پہ پورا اترتے رہنا، کچھ ویسا ہی ہے کہ جیسے کسی شاعر سے کہا جائے کہ "غالب سے کم تر درجہ کی غزل نہیں چلے گی۔" کیونکہ ہمارے بھی ہاں چند اچھے خاکے لکھے جا چکے ہیں۔ اور اب اُن سے بڑھ کر "سہرا" کہنا خاصا مشکل ہے۔

محبت کا شکریہ!

۹/۱۱/۷۰ محمد طفیل

پروفیسر عبدالمغنی

محترم!

مضمون (جدت و قدامت) ملا۔ پڑھ ڈالا۔ آپ کی تحریروں سے مجھے اتنی انسیت ہو گئی ہے کہ اُنہیں پہلی فرصت میں دیکھ ہی نہیں، پڑھ بھی لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہی ہوا۔ ملا اور پڑھا۔

البتہ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ میں مضمون کی آخری چار، پانچ سطریں چھاپنا نہیں چاہتا۔ ہر چند کہ نوجوانوں کو، میرا ایسا مشورہ پسند نہیں ہوتا مگر جب آپ میری طرح بڈھے ہو جائیں گے تب آپ میرے آج کے مشورے کی قدر جانیں گے۔

میں نے آپ کا ایک اور مضمون، افسانہ نگار خواتین پر بھی پڑھا تھا۔ اس میں بھی آپ نے چسکہ لے ڈالا۔ اگر ہو سکے تو قلمی بے راہ روی سے باز آ جائیے۔ کیونکہ میں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کئے بیٹھا ہوں۔

جب ایک اوتار کسی ناری کو چھیڑ دیتا ہے تو پھر اس کے تقدس کا بھرم کھل جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے جذبے کا اظہار فطرتِ انسانی کے خلاف نہیں! — اب اس کا کیا علاج کہ میرے نزدیک آپ بھی قلمی اوتار ہیں۔

۲۷/۷/۷۱ محمد طفیل

ارتضیٰ زیدی

بھائی!

آپ نے مصطفیٰ زیدی کے بارے میں جملہ سرگرمیوں سے آگاہ رکھا۔ یہ آپ کا مجھ پہ احسان ہے جس کا بدلہ چکا نہ سکوں گا۔ ہر چند کہ وہ سرگرمیاں میرے لیے راحتوں کا نہیں، دل فگاریوں کا سامان ہیں۔ پھر بھی آپ کا یاد رکھنا، وہ بھی ایسے پریشان کن حالات میں، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

لیجئے زیدی کو منہ موڑے ایک برس گزر گیا۔ یوں اور برس بھی گزر جائیں گے۔ وہ سچ کہتا تھا ؎

نگارِ شامِ غم میں تجھ سے رخصت ہونے آیا ہوں
گلے مل لے کہ یوں ملنے کی نوبت پھر نہ آئے گی

بے شک ہم نے اُس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اِس وقت اکیلا ہے۔ جبھی تو حیران ہو کر فریاد کناں ہے ؎

ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں ملا

لیکن وہ انجمن آرا سدا تو اکیلا نہیں رہے گا۔ ہم بھی اُس کے پاس پہنچیں گے۔ ہم بھی اس کی محفل سجائیں گے۔ پھر وہ یہ نہیں کہے گا ؎

نہ جانے ہم کہاں گُم ہو چکے ہیں
جو ممکن ہو تو ہم کو ڈھونڈھ نکالو

محمد طفیل

۲/۱۰/۷۱

ابنِ حسن برنی

بھائی! آداب!

چھ تاریخ کو، شامِ ہمدرد میں، اپنے مسعود صاحب نے مضمون پڑھا۔ اچھی خاصی دھوم رہی۔ واہ واہ تک معاملہ تھا۔ سبحان اللہ
نوبت نہ پہنچی۔ حالانکہ مضمون مستحق ہر ستائش کا تھا۔

لاہور کے ایک کالم نویس، انتظار حسین نے لکھا کہ یہ مضمون ایسا تھا کہ ہم ہر ہر فقرے پہ لہلوٹ ہوتے رہے۔ مگر مضمون میں
یگری زیادہ تھی یعنی آمد کم، آورد زیادہ!

ملا واحدی کے سلسلے میں، آپ کا بھی دو بار ذکر ہوا۔ مسعود لکھ کر خوش ہوئے ہوں گے۔ ہم سن کر، چونکہ مسعود جتنا غضب کا
ہیں۔ اُس سے کچھ زیادہ ہی غضب کا پڑھتے ہیں۔ اس لیے میں تو دوہرے فائدے میں رہا۔

بعض لوگ جوانی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ بعض بڈھے ہو کر بھی جوانوں والی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس لیے بات عمر کی نہیں۔ ذہنی تپش ہے۔ یا "نوجوانِ بے نظیر" کی!

اِن حالات میں، جس میں کہ وہ مضمون پڑھا گیا - کچھ زیادہ ہی نزاکتیں تھیں' ورنہ جو "مال اچھا تھا" - وہ تو پڑھا ہی نہ گیا۔
بس ایسے ہی آپ کو یاد کرنے کو جی چاہا تو بہرِ ملاقات کے لئے، تقریب قحط الرجال کی نکل آئی ۔
امید کہ آپ سب اچھے ہوں گے ۔

۱۰/۱/۷۲ محمد طفیل

سحر انصاری

حضرت والا! آداب!

آپ کی غزل :

گلی گلی مرا قصہ' مری کہانی کیوں
غریبِ شہر پہ اس درجہ مہربانی کیوں

ملی تھی ۔ پھر وہ نیک بخت میرے کاغذوں کے انبار میں غائب ہوگئی ۔ بارے اب کہیں جا کر اُس نے اپنایت کا ثبوت دے کر پردہ ترک کیا ہے اور میرے سامنے آئی ہے ۔ صد شکر!

مجھے اس غزل کے کئی شعر پسند ہیں ۔ انھیں یہاں لکھوں گا تو یہ خط نہ رہے گا ، غزلیہ بن جائے گا ۔ لہذا خط کو خط ہی رہنا چاہیے ۔ جیسے آدمی کو آدمی!

میرے جلد جواب نہ دینے پر' آپ ضرور بدگماں ہوتے ہوں گے ۔ جبھی تو مجھے بھی یوں سوچنا پڑا ہے ؎

خلوص و مہر و محبت کے باوجود سحر
ہر اعتماد کا انجام بدگمانی کیوں

بہرحال صبح کا بھولا شام کو گھر آ گیا ہے ۔ یعنی یہ کہ جتنے دنوں میں کراچی سے پیدل لاہور آدمی پہنچتا ہے عین ممکن ہے اتنے ہی دنوں میں آپ کے خط کا جواب بھی کراچی میں ہوگا ۔ بہرحال ؎

جب احتیاط کے ہاتوں ترا یہ حال ہوا
دلِ تباہ تری بات ہی نہ مانی کیوں

اور ہاں وہ خاکے بھی بذریعہ ڈاک ہی بھیج دیجئے گا کیوں کہ میرے وہ دوست جو مجھے کراچی میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ میرا انتظار کر کر کے اب جوانی سے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکے ہوں گے ۔ لہذا بندۂ نارسا یہیں ٹھیک! ورنہ نہ جانے وہ میرا کیا حشر کریں ۔

ایک چھ منے سے قد والے بڑے آدمی سے میرا سلام ضرور عرض کیجئے گا ۔ وہ بھی ان کا موڈ دیکھ کر، ورنہ آپ کی بھی میری طرح شامت آئے گی ۔

۱۸/۱۱/۷۱ محمد طفیل

ظاہرہ اعظم

محترمہ، سلام مسنون!

میرا وقت اُن لوگوں کے لیے ہے جو اُردو سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اس لئے خط پڑھنے یا خط کے جواب میں وقت کے زیاں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میری باتوں کا بُرا مانا، میں نے پڑھائی کی طرف توجہ دینے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ میرے نزدیک اولین ضرورت وہی تھی۔ ویسے جہاں تک لکھنے لکھانے کا مسئلہ ہے تو وہ یہ ہے کہ بڑے ادیب وہ بھی ہیں جو کوئی بڑا تعلیمی اعزاز نہیں رکھتے۔ اصل میں تخلیق کا تعلیمی سند سے صد فی صد والا رشتہ نہیں ہے۔

"زبان و بیان پر قدرت نہیں" والا جملہ بھی آپ کو اچھا نہیں لگا۔ جہاں تک زبان و بیان پر قدرت کا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ بڑے بڑے بھی اس کے ہاتھوں عاجز ہیں۔ اپنی نارسائی پر شکوہ سنج ہیں۔ جو آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں اقبال اور غالب وہ بھی تو اس "دیوی" کے ہاتھوں عاجز تھے۔ اگر اقبال کے جذبہ کا ساتھ الفاظ دے دیتے تو ان کا کلام انسانی کلام کے زمرے سے نکل جاتا۔ اگر غالب کے خیالات کا ساتھ (کما حقہ) الفاظ دے دیتے تو ان کے وہ اشعار بھی واضح ہو جاتے جو آج بھی معمہ ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زبان و بیان پر قدرت ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے ہاتھوں بڑے بڑے بھی عاجز ہی تھے — اب اگر آپ یہ کہتی ہیں کہ "نہیں مجھے تو زبان و بیان پر قدرت ہے"۔ تو میں کچھ نہیں کہتا۔ تسلیم!

آپ کے خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ اپنی بات منوانے کے لیے، ضد بھی کرتی ہیں۔ یہ بیباکانہ غرور اچھی چیز ہے مگر وہاں، جہاں دوسرا بھی کچھ ایسی ہی خُو بُو رکھتا ہو۔ ورنہ کیا لطف؟

مَیں نے آپ کی خدمت میں، یہ خط اس لئے بھجوایا ہے کہ آپ میرے خط سے بددل نہ ہوں۔ بلکہ یہ ہے کہ خوب لکھیں، خوب چھپیں — اور میری بات کی پروا نہ کریں۔

محمد طفیل ۱۲/۱۱/۷۰

بشریٰ رحمٰن

القاب!

کیا لکھوں؟ ذرا سوچنے دیجئے! یہ مرحلہ پھر کبھی طے ہو جائے گا۔ اگر آپ کو جلدی ہو تو ابھی لکھے دیتا ہوں۔ محترمہ، مکرمہ! آپ نے جن "خطرات" کا اظہار کیا ہے۔ وہ سراسر القاب کا مسئلہ نکلا۔ دراصل وہ ایک سرکلر لیٹر تھا۔ جو تمام کرمفرماؤں کو چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "میری بہنیں" "بندہ نواز" کے لفظ پر چونکیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا۔ جب بندہ نوازی نہیں کی تو لکھا کیوں؟ اعتراض بجا۔ اسی لئے معذرت، معذرت بلکہ بہت سی معذرتیں!

بعض لوگ احسان کرتے ہیں۔ دوسرے نہیں مانتے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن پر براہ راست احسان نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ احسان مانتے ہیں۔ آپ نے میرا جس حوالے سے دل خوش کیا۔ وہ آپ کا اسمبلی میں ادیبوں کی زبوں حالی کا مسئلہ اٹھانے

سے ہے۔ آپ نے جتنی باتیں کہیں وہ دل میں اتر گئیں بلکہ کھب گئیں۔ پشاور میں رائٹرز گلڈ کا اجلاس ہوا۔ مہمان خصوصی وزیر ثقافت تھے۔ مجھے بغیر پوچھے بطور صدر دھر لیا گیا۔ وہاں میں نے آپ کی تقریر کے حوالے دیئے۔ (ادیبوں نے تالیاں بجائیں۔) دیکھا آپ نے آپ کو ہم نے لاہور میں بھی (سہواً یا ارادتاً) یاد رکھا۔ پشاور میں بھی مزید سربلند کیا۔ مطلب یہ کہ ہم اچھی باتیں کرنے والوں کو، اچھی باتیں لکھنے والوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ورنہ ہمارا میر سے کیا رشتہ؟ غالب سے کیا رشتہ؟

"بندیٔ ناچیز" کو جس سلسلے میں یاد کیا۔ وہ آپ کو ابتدائی سطروں میں بتا دیا۔ اگر میرا خط آپ کے لیے بشارت ہے تو پھر کبھی کچھ نقوش کو بھی بھیجئے گا ورنہ ہم دور سے سلام کر کے ثواب کماتے رہیں گے!

آپ نے دوسری بات یہ پوچھی "آپ بیتی نمبر" ہے کہ نہیں! جی! ہم نے یہ نمبر پیش ضرور کیا تھا۔ دوبارہ بھی چھاپا تھا۔ مگر وہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اگر آپ نے یہ کسی کو ضرور دینا ہو تو اس کی ایک شرط ہے کہ خود آئیے۔ اگر یہ سودا مہنگا ہو تو ہندوستان کے دوست کو لکھ دیجیے، چپ ہو جاؤ!

میں دو سطری خط لکھنے کا عادی ہوں۔ قلمی بدہضمی جس دوست کو بھی ہوئی۔ وہ مارا گیا۔ مگر میں کیا کرتا؟ آپ کا خط وادیٔ خلوص سے آیا تھا!

۳۱/۸/۸۵

محمد طفیل

مجھے آپ کا اپنایت والا لہجہ میسر آیا ہے۔ ممنون!

کبھی ملاقات ہوئی تو القاب کے بارے میں سوچیں گے کہ مجھے محترمہ بشریٰ رحمٰن کہنا چاہیے یا بشریٰ رحمٰن صاحبہ یا بشریٰ! — اس میں میری پسند سے زیادہ آپ کی پسند کو دخل ہونا چاہیے۔ آپ کوئی مضمون، افسانہ یا شعر تھوڑی ہیں کہ میری پسند کو بھی دخل ہو! آپ بڑی زیرک نکلیں کہ چین سے عقل بھی لے آئیں۔ اب ہم جیسے لوگ کیا کریں جن کے پاس علم بھی واجبی، عقل بھی واجبی! یوں اب ہمارے اور آپ کے درمیان فاصلہ بڑھ جائے گا۔ یہ تحفۂ نایاب لا کر آپ نے اچھا نہیں کیا!

آپ نے لکھا کہ میں نقوش اس وقت سے پڑھ رہی ہوں۔ جب وہ آپ کی معصوم گود میں بھی سماتا نہ تھا۔ اس اعتبار سے میں خاصا بزرگ نکلا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں لڑکپن کی کارروائیوں کی زد میں رہتا ہوں مگر اس پر تلملاتا نہیں ہوں۔ کیونکہ اس مدھم روشنی ہی میں تو لوگ مجھ تک پہنچے ہیں۔

آپ بیتی نمبر جس انداز میں حاصل کرنا چاہیں۔ مہیا کر دیا جائے گا۔ ڈاک سے بھجوا دوں؟ ہم ایک دوسرے سے دور ہوں تو ہوں مگر گھر دور نہیں۔ آپ نیو گارڈن ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ بندہ نیو مسلم ٹاؤن (اے/۲۳۹) میں!

۱۰/۱۱/۸۵

محمد طفیل

پریم وار برٹنی

محترم، تسلیمات!

اگر میں نے آپ کو، بہ طور تفنن، یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنے خوب صورت نام کے ساتھ وار برٹنی کا لفظ نہ لکھیں تو کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔ میری رائے تھی۔ مگر آپ نے ویسے ہی اوٹ پٹانگ لاحقوں کے اور نام بھی گنوا ڈالے۔ بہرحال اگر اُن بزرگ شاعروں سے بھی میرا رابطہ ہوتا تو میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار اُن سے بھی کرتا۔

دوسرے یہ کہ میں با صلاحیت اور نئے لکھنے والوں کی چیزیں عموماً رعایت کے ساتھ بھی چھاپ دیتا ہوں تاکہ اُن کی علم و ادب سے رغبت ماند نہ پڑے بلکہ بڑھے۔ یہی صورت میرے نزدیک آپ کی تھی۔

جب آپ نے تیور دکھانے شروع کر دیئے۔ دھمکیاں دینا شروع کر دیں تو میں چُپ ہو گیا۔ مَیں نے سوچا کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہوں۔ اُس کا آپ کو موقعہ دیا جائے۔ اس لیے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ بلاوجہ کسی جھمیلے میں پڑوں۔

میرا مشورہ ہے کہ آپ تعمیری کاموں کی طرف زیادہ دھیان دیں اور اسی میں اپنے لیے سکون ڈھونڈیں —— باقی آپ دانا و عاقل ہیں!

مخلص محمد طفیل

۱۶/۸/۷۹

جمیل اختر خان

آپ نے ٹیلی فون پر انعام یافتہ ادیبوں کی فہرست مانگی۔ سو وہ حاضر!

آپ نے مزید کام کے لیے اکسایا —— میرے پاس تعلقات کی پونجی تھی —— وہ داؤں پہ لگائی —— دن رات جد و جہد کر سکتا تھا۔ اس سے منہ نہ موڑا۔ اس کے بعد بھی پیار کے دو بول نہ ملیں تو لطف کیا؟

دوستوں نے مایوس کیا۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے۔ بہرحال قصوروار مَیں کسی دوسرے کو نہیں گردانتا!

قصوروار مَیں ہوں —— قصوروار میں ہوں۔

اس کے باوجود اب مَیں کسی پہ اعتماد نہ کر سکوں گا۔ یہ خسارہ بھی اپنی جگہ! فقط

۶/۶/۷۹

آپ کا محمد طفیل

فتح محمد ملک

بھائی!

والدۂ محترمہ کے غم میں، مجھے بھی اپنا ساتھی جانیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ماں کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔
ماں زندہ ہو تو اس کی محبت ڈھارس دیتی ہے۔ انتقال ہو جائے تو اس کی دعائیں ساتھ دیتی ہیں۔
ماں کا ساتھ تو اولاد کے ساتھ "ہمیشہ ہمیشہ" کا ہے! —— کیا آپ محسوس نہیں کرتے؟

المیہ فقط اتنا ہے کہ ہم انھیں دیکھ نہیں سکتے!

آپ کا افسردہ بھائی
محمد طفیل

۴/۲/۷۹

سید حسن جعفری

بندہ نواز، سلام مسنون!

میں آرام کرنے کا عادی نہ تھا۔ مگر حرکت قلب کی لاپرائی سے، جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا۔ پانچ دن تک اپنے کمرے سے نہ نکلنا۔ دس تک اپنے گھر سے باہر نہ نکلنا یکمل آرام کرنا۔ تب میں نے دوسرے ڈاکٹروں سے بھی رجوع کیا۔ احتیاط سب نے بتائی۔ مگر اُس احتیاط میں آپ کو خط لکھنا شامل نہ تھا۔ یہ سراسر میری کوتاہی ہے۔

آپ نے "ستارۂ امتیاز" ملنے پر مبارک باد دی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر مجھے اس اعزاز پر کوئی خوشی نہ ہوئی کیونکہ بہت تاخیر سے دیا گیا۔ اس موقع پر حکومت کے کرم کا احساس کم، زیادتی کا زیادہ ہوا۔ یہ زیادتی کچھ اس حکومت نے نہیں کی۔ بلکہ اس سے پہلی حکومت نے اس سے بھی پہلی حکومت نے۔ خیر۔ اب تو شکوہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ جن افرادِ خانہ سے ملا ہوں۔ وہ بھی یاد آتے ہیں۔ آپ سب کے سب انسانی رُتبے میں کتنے امیر ہیں۔ اس پر رشک آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ آپ کے قدموں میں بیٹھ کر تربیت حاصل کی جائے۔ مگر اس میں وقت بہت لگے گا کیونکہ پہلی "اچھائیوں" کو ترک کرنے اور نئی کو اپنانے میں دُگنا وقت صرف ہوگا۔ دوسرے شعبدہ ہونے کا بھی احتمال ہے۔

میرے لیے دعا بھی کیا کریں۔ چاہے وہ خلیفۂ چہارم کی فضیلتوں اور برکات کا نتیجہ ہو۔

آپ کا محمد طفیل

۵/۴/۸۶

محمد یونس بھٹی، لندن

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے ہاں چند دن گزارے۔ آپ بہت اپنے لگے۔ وہ دن یاد آتے ہیں تو سکون ملتا ہے کہ اس افراتفری کی دنیا میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔ جو خلوص کا سمندر ہیں۔

اگر آپ کی رفاقت مزید میسّر آتی تو بغیر علاج کے میری صحت اچھی ہو جاتی۔ واہ وا کیا مفرّح طبیعت پائی ہے۔

بھابی جان سے میں نے ایک درخواست کی تھی کہ روضۂ رسولؐ پر جا کر میرا سلام کہنا۔ نہ جانے انھیں یاد رہا کہ نہیں! کیونکہ ابھی تک اُدھر سے وعلیکم السلام کی آواز سنائی نہیں دی!

آپ اِدھر کب آئیں گے؟ آپ کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں!

جاوید سلام کہتا ہے۔

آپ کا محمد طفیل

۱۱/۳/۸۵

نامعلوم

جناب! سلام مسنون!

آپ ایک ایسے آدمی سے مضمون مانگ رہے ہیں۔ جس نے زندگی بھر دوسروں سے مضمون مانگے ہوں۔ یہ بات تو وہی ہوئی کہ مولوی جی کے گھر میں زبردستی کوئی ایسی تقریب کر دی جائے۔ جس میں دوسرے مولویوں کو بھی بلانا پڑے اور محنتانہ بھی دینا پڑے۔

خیر مضمون کے مطالبے کو تو چھوڑیئے۔ میرا ایک مشورہ قبول کیجئے۔ فائدے میں رہیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے پرچہ نکالنے کے ارادے کو فی الفور ترک کر دیجئے۔ جتنے روپے خرچ ہو گئے ہوں۔ اُن کا فاتحہ پڑھ لیجئے۔ جتنے بچ گئے ہوں۔ اُن میں سے سو پچاس روپے خرچ کر کے احباب کی دعوت کر دیجئے اور اُن سب کے سامنے خدا کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آپ کو مزید نقصان سے بال بال بچا لیا۔

یہ دنیا ایسی ہے کہ اس میں کسی صاحب کو، کوئی نیک مشورہ دیا جائے تو وہ مانتا نہیں ہے۔ بلکہ الٹا بدگمان ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ پرچے کی اشاعت کے تصور ہی سے، خواب رنگین سے رنگین تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسالے اور اخبار روز نکلتے ہیں۔ روز بند ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا۔ جب تک یار لوگ یہ سمجھتے رہیں گے۔

۱- میرا رسالہ یا اخبار نکلتے ہی اُردو ادب اور صحافت میں دھوم مچ جائے گی۔ جدھر سے گذروں گا، پبلک بچھی چلی جائے گی۔

۲- ادارۂ کتاب میں تو پختہ قسم اور پختہ عمر کے لوگ ہیں۔ اس لیے آبرو کے لٹنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ ورنہ نیا پرچہ نکالنے والوں کی ایک قسم وہ ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ ادھر میرا پرچہ نکلا۔ اُدھر خوبصورت لڑکیوں کے خطوط کا تانتا بندھا۔

۳- ایک قسم وہ بھی ہے جو پرچہ بعد میں نکالتی ہے۔ سوچ پہلے لیتی ہے کہ میرے پرچے کا حساب فلاں فلاں بڑے بینکوں میں رہے گا اور ان میں سے ایک آدھ کا تو چیئرمین بن جانا کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔

مگر ہوتا یہ ہے۔

نہ دھوم مچتی ہے۔ نہ پبلک بچھتی ہے۔ نہ کوئی خوبصورت لڑکی خط لکھتی ہے۔

محمد طفیل مرحوم کا آخری خط[1] عبدالقوی دسنوی کے نام

ACCESSION
200714
12-12.2001

محب گرامی، سلام مسنون!

آپ کا مضمون، مکاتیب نمبر اور خطوط نمبر پر مل گیا ہے۔

جب مجھے آپ کا مضمون ملا۔ اُس وقت مجھے ۱۰۴ بخار تھا۔ مو

یہ حالت یا یہ کیفیت اکثر مجھ پر وارد ہوتی رہتی ہے۔ غرض میں اپنے کام سے ت

اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کھانا کھاتے وقت کوئی مضمون مل گیا تو میں کھ

ہمیں اپنی خوشی کے پہلو ہیں یہ!

Dr.ZAKIR HU[illegible] LIBRARY
200 '14

ایک ہفتہ کے بعد آج پہلا دن ہے کہ دفتر آیا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔ آج تو لفظ بھی غلط لکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ اطلاعاً کی جگہ احتیاطاً لکھنا چاہ رہا تھا کہ —— احتیاطاً آج اتنا کچھ ہی!

محمد طفیل ۲۴/۶/۸۶

---

[1] ہمیں جو خطوط ملے اُن میں سے یہ خط ہی سب سے آخری تاریخ کا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی طفیل صاحب نے کوئی خط لکھا ہو۔ (ادارہ)